DUE DATE

Cl No ________________ *Acc No* __________________

Late Fine **Re. 1.00** per day for first 15 days
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date


بیادگار
نقادِ اعظم
حضرت مولانا عامر عثمانی صاحب
نوّر اللہ مرقدہٗ
DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-110025

مستقل

مرتبہ

مولانا عامر عثمانی

منافقت کسی تعریف یا تعارف کی محتاج نہیں۔ منافقوں کے سر پر سینگ کبھی نہیں ہوتے۔ دورِ رسالت کے منافق بھی صحابہ ہی جیسے اطوار رکھتے تھے۔ مگر جب صحابہ کو کسی مقابلہ میں نقصان کا سامنا کرنا پڑتا تو منافقوں کے گھر میں عید ہو جاتی تھی۔ ان کے دل و دماغ فرطِ مسرت سے جھوم اٹھتے، وہ خوش ہوتے کہ کفر نے اسلام کے منہ پر طمانچہ رسید کیا ہے۔ فرق ذرا سا یہ ہے کہ دورِ رسالت کے منافق بس منافق ہی تھے زندیق نہ تھے۔ زندقہ کے لئے جہاں وافر مقدار میں بے حیائی بہت سی شیطانی عیاری اور ڈھیر کی ڈھیر ہٹ دھرمی درکار ہے، وہیں اقتدار و اختیار کی بھی احتیاج ہے۔ منافق خود مقتدر اور حاکم نہ ہو تو کم سے کم کسی صاحبِ اقتدار کی پشت پناہی اسے حاصل ہو تب وہ بڑے اطمینان سے زندیقی کے نوک پلک سنوار سکتا ہے۔ دورِ رسالت کے منافقین زندقہ کی راہ کیسے اختیار کرتے جب کہ اسلام کی قوت نے ان کے سارے بل نکال دیئے تھے۔

مگر آج معاملہ مختلف ہے۔ آج ہر منافق گویا تو بجائے خود اقتدار حاصل ہے یا دوسرے اربابِ اقتدار اس کی دستگیری کر رہے ہیں۔ اسی لئے وہ بہت آسانی سے زندقہ کی راہ اختیار کر سکتا ہے۔ اور کر رہا ہے۔ (تجلی اگست ۱۹۶۷ء)

پچھلے دنوں دیوبند میں کئی حادثے پیش آئے۔ ان میں سے ایک حادثہ اسامہ ابن فاضل صاحب کی وفات بھی ہے۔ اسامہ ابن فاضل دار العلوم دیوبند کے ایک قابلِ ناز استاذ مولانا زبیر صاحب کے بڑے بھائی ہوتے تھے۔ موصوف انتہائی شریف اور با اخلاق آدمی تھے۔ ان میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ اور کتنی ہی خوبیاں انہیں ورثہ میں ملی تھیں۔ ان کا تعلق ایک اچھے خاندان سے تھا۔ جو خاندان اپنی شرافت اور نیک نامی میں مشہور و معروف رہا ہے۔ مرحوم اسامہ صاحب نے ایک بیوہ کے علاوہ تین لڑکیاں بھی چھوڑی ہیں۔ ادارہ تجلی مولانا زبیر صاحب اور ان کی والدہ محترمہ کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا کرتا ہے کہ حق تعالیٰ مرحوم کو اپنی مخصوص رحمتوں سے نوازے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق بخشے۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ بھی مرحوم کی مغفرت کی دعا فرمائیں۔

ماہنامہ تجلی دیوبند

ایڈیٹر حسن احمد صدیقی

اٹھائیسویں سال کا دوسرا شمارہ

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائجیریا۔ کینیڈا۔ فرانس۔ انڈونیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ سالانہ
بذریعہ ہوائی ڈاک پانچ پونڈ —— بحرین۔ افریقہ۔ سعودی عرب، قطر وغیرہ سے
بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ دس شلنگ —— بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ

فہرست

اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پرچہ پر آپکی خریداری ختم ہے۔ یا منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی۔ پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں، خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی۔ پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہوگا۔ منی آرڈر بھیجکر آپ وی۔ پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

سالانہ چوبیس روپے ۲۴ — فی کاپی ڈھائی روپے ۲ — اسلامی پریس دیوبند

کتابت :- علی اکبر عثمانی

توجّہ طلب

دہلی کے ایک ہوٹل میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مسلمانوں کی ایک ٹولی بیٹھی ہوئی تھی اور مولوی اسعد میاں کو گالیوں کی سوغات سے نواز رہی تھی۔ ہر شخص حسبِ توفیق اور حسبِ حوصلہ گالیاں دینے میں مشغول تھا۔ گالیاں دینے والے شکلوں سے شریف ہی معلوم ہوتے تھے۔ اب خدا ہی جانے وہ حقیقتاً بھی شریف تھے یا نہیں۔

ایک صاحب جن کے چہرے پر ایک عدد داڑھی بھی موجود تھی، گالیوں کے دو چار غبارے فضا میں اڑانے کے بعد بولے۔

مولوی اسعد ملتِ اسلامیہ کے چہرے پر ایک ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ غداری کی ہے۔ یہ عرض کرنے کے بعد انھوں نے مولوی اسعد کی چند برائیاں بھی گنوائی تھیں۔ اور چند شواہد و قرائن پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی تھی کہ ان کی عاقبت خطرے میں ہے اور ان کا انجام بہت برا ہوگا۔

ان لوگوں کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ مولوی اسعد دہلی کے اندر اپنی پوزیشن بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ وہاں انھیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ دہلی کی گلیوں میں وہ بہت بدنام ہیں۔

بدنام آدمی کے لئے یہ تو ضروری نہیں کہ وہ برا بھی ہو۔ بعض اچھے لوگ بھی خواہ مخواہ بدنام ہو جایا کرتے ہیں اور بعض برے لوگوں کو سوسائٹی معزز گمان کرنے لگتی ہے۔ بدنامی بہر حال کوئی کسوٹی نہیں لیکن اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بدنامی ایک عذاب ہے ایک لعنت ہے۔ خدا ہر مسلمان کو اس عذاب اور اس لعنت سے محفوظ رکھے۔

ان لوگوں کی گالیاں اور بے تکی باتیں سنکر ہمیں بڑی جھلاہٹ ہوئی۔ بُرا تاؤ آیا۔ لیکن ان سے الجھنا ہم نے مناسب نہیں سمجھا۔ ایک بار دل کا تقاضا ہوا کہ مولوی اسعد کا دفاع کیا جائے۔ ان لوگوں سے باقاعدہ بحث ہو لیکن عقل اس بات کی متقاضی رہی کہ ان سے الجھنا اور ان کے منھ لگنا مناسب نہیں۔ مولوی اسعد کا دفاع کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ ایک نئی بحث کا آغاز ہو۔ ہم بحث کرنے سے نہیں ڈرتے لیکن اگر بحث کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو شکست خواہ ہمیں ہوتی یا انھیں مگر بحث کے نتیجے میں دو چار عریاں قسم کے فقرے مولوی اسعد کا مقدر ضرور بن جاتے۔ چائے پینا مصیبت بن گیا۔ خدا خدا کرکے چائے ختم ہوئی اور ہم ہوٹل سے خارج ہو گئے۔ اس واقعہ کو کئی دن گذر گئے ہیں لیکن اب تک ہمارا دل اس بات پر خون کے آنسو بہا رہا ہے کہ عوام کی ذہنیت کس قدر گندی ہو چکی ہے۔ ان کے سوچنے اور کہنے کا انداز کتنا غلط ہے۔ آخر کہنے والوں کو احتساب آخرت کا خوف کیوں نہیں۔ اس بات کا احساس کیوں نہیں کہ ان کے ہر جملہ کو نوٹ کر لیا جاتا ہے اور قیامت کے دن انھیں اپنی ہر بات کا حساب دینا ہوگا۔ مولوی اسعد کو ہم غدارِ ملت تصور نہیں کرتے۔ لیکن چلئے ہم مان لیتے ہیں کہ از راہِ بشریت ان سے کچھ ایسے گناہ بھی سرزد ہو گئے ہوں گے جن کا اندراج اسی رجسٹر میں کرنا درست ہوگا جس رجسٹر میں غداروں کی حرکتیں نوٹ کی جاتی ہیں۔ لیکن ذرا سوچئے تو سہی کیا مولوی اسعد کو گالیاں دینے سے ان کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ کیا ہوٹلوں، پارکوں اور محفلوں میں لاف و گزاف کرنا عوام کے لئے یا مولوی اسعد کے لئے مفید ہو سکتا ہے؟ — ہم جانتے ہیں کہ ہماری آواز نقار خانے میں طوطے کی صدا ثابت ہوگی۔ لیکن پھر بھی ہم یہ نصیحت ضرور کریں گے کہ اے ہمارے قابلِ احترام بھائیو! فضولیات سے بچو۔ بڑے لوگوں کو نشانۂ ملامت بنانے سے احتراز کرو۔ گالیاں دینا چونکہ شریفوں کا شیوہ نہیں ہوتا لہٰذا گالیاں دینے سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرو۔ مولوی اسعد اپنی قبر میں سوئیں گے اگر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ غداری کی ہوگی تو وہ خود اسکی سزا بھگتیں گے تم کیوں اپنی زبان گندی کرتے ہو۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم ان کے حق میں یوں دعا کیا کرو کہ —— "ہمارا ایک اچھی خاصی عقل رکھنے والا اپنا بھائی سیدھے راستہ سے بھٹک گیا ہے۔ اے پروردگار! اسے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔"

احوال واقعی

اس مہینہ کے احوال واقعی بس وہی ہیں جو گذشتہ مہینہ کے تھے۔ وہی مجبوریاں، وہی تفکرات، وہی کشمکش، وہی الجھنیں زندگی کل بھی پریشان تھی اور آج بھی پریشان ہے۔ جو تکلیفیں اور بیچارگیاں کل زندگی کے دامن سے چمٹی ہوئی تھیں وہ آج بھی دامنِ زندگی سے الجھی ہوئی ہیں۔ نہ اندھیروں کی سیاہی میں کوئی کمی واقع ہوئی نہ چراغوں کی ٹمٹماہٹ میں۔ نہ ظالم کے ظلم میں کوئی فرق پیدا ہوا نہ مظلوم کی مظلومیت میں۔ نہ یاس و قنوط کے بادل چھٹے نہ جمود و تعطل کی برف پگھلی۔ دل و دماغ جس طرح کل مفلوج تھے اسی طرح آج بھی مفلوج ہیں۔ امتِ مسلمہ جس طرح کل خانہ جنگی کا شکار تھی اسی طرح آج بھی خانہ جنگی کا شکار ہے۔ علمائے وقت کل بھی باہم دست و گریباں تھے اور آج بھی ایک دوسرے کے درپے ہیں۔ صلاحیتیں کل بھی بِک رہی تھیں آج بھی بِک رہی ہیں۔ منافقین نے ماضی میں بھی اسلام کو نقصان پہنچایا تھا اور منافقین آج بھی اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ دنیا کل بھی ہماری تفرقہ بازی کا مذاق اڑا رہی تھی اور آج بھی ہماری باہمی نفرت و عداوت پر ہنس رہی ہے۔ ہم کل بھی دنیا کے تعاقب میں سرگرداں تھے اور آج بھی اسکے پیچھے سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ نہ ہم نے دنیا کا پیچھا کرنا چھوڑا نہ دنیا ہمارے ہاتھ آئی۔ نہ جابرین نے اپنے جبر سے توبہ کی نہ مظلومین نے اپنی بزدلی کو ترک کیا۔ وہی بحث و تکرار، وہی تو تو میں، وہی تعصب و تنفر، وہی کفر کے فتوے، وہی مکر و فریب اور وہی الزام تراشیاں اور طوفان بدتمیزی۔ غرضیکہ کسی بھی چیز میں کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا۔ ہر چیز اپنی جگہ اٹل اور قائم ہے۔

تجلی کا مؤخر ہونا بھی بدستور باقی ہے۔ یہ مولانا مرحوم کے زمانے میں بھی تاخیر سے آپ کی خدمت میں پہنچتا تھا اور آج بھی تاخیر سے آپ کی خدمت میں پہونچ پاتا ہے۔ لیکن ان دونوں زمانوں میں ایک فرق ضرور ہے۔ مرحوم کے زمانے میں تجلی کا تاخیر سے موصول ہونا آپ کو اس واسطے گراں نہیں گزرتا تھا کہ دیر آید درست آید کے مصداق تجلی کا شمارہ خاصے کی چیز ہوتا۔ مرحوم کی میٹھی میٹھی باتیں، خوبصورت دلائل۔ لب و لہجہ کا بانکپن آپ کی اس کوفت کو فنا کر دیتا تھا جو تجلی کے انتظار کی دین ہوا کرتی تھی۔ آپ تجلی کا مطالعہ کرتے اور بے اختیار مرحوم کو دعائیں دینا شروع کر دیتے۔ وہ شکایتیں خود بخود دم توڑ دیتیں جو تجلی موصول ہونے سے پہلے آپ کے دل و دماغ میں رینگ رہی تھیں ——— آپ تجلی کا انتظار آج بھی انتہائی ذوق اور بیتابی کے ساتھ کرتے ہیں۔ بعض اوقات کوفت بھی ہوتی ہے تاخیر غیر معمولی ہو جانے کی وجہ سے آپ جھنجھلاتے بھی ہیں اور پھر ایک دن تجلی آپ کو مل جاتا ہے۔ آپ شروع سے آخر تک اسے پڑھ ڈالتے ہیں لیکن آپ کی جھلاہٹ اور کوفت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اس لئے کہ ہماری تحریروں میں نہ ندرت ہے نہ مٹھاس۔ ہمارا اندازِ نگارش نہ جمیل ہے نہ پرکشش۔ ہمارا علم بھی کوتاہ ہے اور فکر بھی۔ ہمارے دامن دماغ میں ایسے دلائل بھی نہیں جو آپ کو مطمئن کر دیں ہمارا اندازِ بیان آپ کی کوفت کو مٹانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ ہماری حیثیت مولانا عثمانیؒ کے سامنے بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایڈوکیٹ کے سامنے پرائمری کے کسی طالب علم کی۔ جن حضرات کو مولانا مرحوم کی تحریر کا چسکہ پڑ گیا تھا وہ ہماری ناقص اور پھیکی تحریروں سے کیسے مطمئن ہو پاتے ہوں گے؟ کیسے ہمارے ناقص دلائل ہضم کر لیتے ہوں گے؟ مگر حیرت ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود آپ حضرات تجلی سے اسی طرح وابستگی قائم کئے ہوئے ہیں لہٰذا ایڈیٹر تجلی کی تمام تر کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود تجلی سے آپ کا یہ والہانہ تعلق قابل تحسین ہے۔

بعض ناگزیر مجبوریوں کے سبب نومبر کا رسالہ وقت پر چھپ سکا، لیکن امید ہے کہ جنوری کے شمارہ کے بعد تجلی کا ہر شمارہ اپنے صحیح وقت پر منظر عام پر آجایا کریگا۔ خدا ہماری مدد فرمائے اور ہماری ہر جائز خواہش پوری ہو ——— اسی شمارہ میں عامر عثمانی نمبر کی جھلکیاں پیش کیجا رہی ہیں، انھیں ملاحظہ فرما کر اپنی آرا اور مشوروں سے نوازیں۔ انشاء اللہ اب زیادہ دیر تک عامر عثمانی نمبر کا انتظار کرنا نہیں پڑیگا۔

حسن احمد صدیقی

آغازِ سخن

ہندوستان سے بے شمار پرچے نکلتے ہیں۔ یہ پرچے اپنی اپنی نوعیت و کیفیت کے اعتبار سے علمی بھی ہیں اور تحقیقی بھی۔ دلچسپ بھی ہیں اور مذہبیت سے مالا مال بھی۔ لیکن جو مقبولیت اور محبوبیت تجلی کو حاصل ہوئی وہ کسی پرچہ کا مقدر نہیں بن سکی۔ تجلی تمام مذہبی پرچوں میں ہمیشہ نمایاں رہا۔ اسے جو شہرت، عزت اور وقعت ملی اس کا عشر عشیر بھی دوسرے پرچوں کو نصیب نہیں ہو سکا۔

لیکن یہ اس زمانہ کی بات ہے جب مولانا عامر عثمانیؒ حیات تھے اور مولانا عامر عثمانی کا دوسرا نام تجلی تھا۔ تجلی آج بھی ہے۔ مگر اس تجلی اور اس تجلی میں زمین و آسمان کا نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے جو تجلی مولانا مرحوم کے افکارات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ مولانا عامر عثمانی کے انتقال کے بعد تجلی کی صورت و شکل ہی نہیں بدلی اس کے حالات بھی بدلے اور اس کی پوزیشن بھی دگرگوں ہو گئی۔ تجلی جیسا مقبول اور ہر دلعزیز رسالہ آج جس پریشانی اور کشاکش سے گزر رہا ہے اس کا صحیح اندازہ دور بیٹھے ہوئے قارئین کو نہیں ہو سکتا۔

میں مانتا ہوں کہ سمجھدار قارئین رسالہ کی اشاعت میں تاخیر اور بے قاعدگی کی وجہ سمجھ گئے ہوں گے اور انھیں اس بات کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تجلی کی اشاعت میں تسلسل قائم نہ ہونے کا بنیادی سبب کیا ہے۔ لیکن ایسے ذکی و فہیم قارئین کی تعداد ہی کتنی ہے۔

تمام قارئین نہ حالات کی نزاکت کا شعور رکھتے ہیں اور نہ ہی زیادہ سمجھ بوجھ، لہٰذا اکثر قارئین کو بذریعہ خط یہ بتلانا پڑتا ہے کہ عامر عثمانی نمبر کیوں نہیں شائع ہو سکا اور رسالہ وقت پر کیوں نہیں چھپ پاتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاخیر اشاعت کی ایک وجہ تجلی کا بگڑا ہوا نظام بھی ہے لیکن موجودہ حالات میں اس وجہ کو اولین وجہ کہنا شاید مناسب نہ ہو۔

فی الحقیقت اور فی الحال تاخیر اشاعت اور اختلال و بے قاعدگی کی اصل وجہ سرمائے کی کمی ہے۔ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے کتابت وقت پر نہیں ہو پاتی۔ کاغذ وقت پر مہیا نہیں ہوتا۔ اور اگر کتابت وقت پر نہیں ہوگی، کاغذ وقت پر دستیاب نہیں ہوگا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ رسالہ وقت پر چھپ جائے۔

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ کتابت و طباعت صحیح وقت پر ہو جاتی ہے لیکن ٹائٹل چھپنے میں دیر لگ جاتی ہے بعض اوقات ٹائٹل بھی صحیح وقت پر چھپ کر آجاتا ہے لیکن ڈاک ٹکٹ نصیب نہیں ہو پاتے اس لئے رسالہ کی روانگی میں غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام الجھنیں اس واسطے پیش آتی ہیں کہ ہمارے پاس سرمایہ کمی ہے اور سرمایہ کے بغیر کسی رسالہ کا اپنے صحیح وقت پر چھپ جانا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہو مولانا عامر عثمانی رح ایک تھوڑی رقم چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ جتنی رقم انھوں نے چھوڑی تھی اس سے زیادہ کے وہ مقروض تھے۔

یہ بات ان لوگوں کی تو سمجھ میں نہیں آئے گی جو ازلی بدگمان ہیں۔ غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور بداعتمادی کا مظاہرہ کرنا جن کی فطرت ثانیہ بنا ہوا ہے۔ جو خود بھی کذب و مکر میں مبتلا ہیں اور ساری دنیا کو کذاب اور مکار تصور کرتے ہیں اور جن کا مستقل یہ عقیدہ ہے کہ تحریک اسلامی کے کارکنان پر امریکہ کی جانب سے من و سلویٰ نازل ہوتا رہا ہے۔

چونکہ تحریک اسلامی کی سب سے زیادہ حمایت اور سب سے زیادہ دفاع مولانا عامر عثمانی رح نے کیا ہے اور چونکہ امریکہ نے سب سے زیادہ مولانا عامر عثمانی کو اپنی رحمتوں سے نوازا ہوگا۔ لہٰذا جماعت کے حلقہ میں سب سے زیادہ سرمایہ دار عامر عثمانی ہی ہوں گے۔

ہم ایسے لوگوں کے منھ لگنا نہیں چاہتے۔ ان لوگوں کے بات سمجھ میں آئے گی بھی نہیں جن لوگوں کی عقلیں ٹیڑھی ہیں اور نہ ہی ابھی تک ایسا کوئی طریقہ ایجاد ہو سکا ہے۔

اس وقت میں صرف ان لوگوں سے مخاطب ہوں جو خود بھی صادق القول اور دیانتدار ہیں اور دوسروں کو بھی راست باز اور دیانتدار تصور کرتے ہیں۔

دروغگوئی، بے اعتباری اور جعل سازی کے جو لوگ کبھی قریب بھی نہیں پھٹکے ان ہی لوگوں سے گذارش ہے کہ مولانا عامر عثمانی کے بارے میں آپ نے کچھ بھی تصور قائم کیا ہو لیکن ان کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ انھیں غریب کہنا بھی غلط تھا اور مالدار کہنا بھی۔ وہ ایک متوسط درجہ کے آدمی تھے۔ اور متوسط درجہ کے لوگوں کو جتنی الجھنیں درپیش ہوتی ہیں، اتنی الجھنوں کا سامنا ان لوگوں کو کرنا پڑتا ہے جو بہت زیادہ مالدار ہیں اور نہ ان لوگوں کو جو بہت زیادہ غریب ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ جماعت اسلامی والوں کو امریکہ اپنی کرم فرمائیوں سے نوازتا ہے یا نہیں، مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ اسی عامر عثمانی کے پس ماندگان خالی ہاتھ اور خالی دامن نظر آتے ہیں جس کی تحریروں کا سہارا نصیب نہ ہوتا تو جماعت اسلامی ہندوستان میں پروان نہیں چڑھ سکتی تھی۔ اور جب اس عامر عثمانی رح کے پس ماندگان کس مپرسی کا شکار ہیں جس نے سب سے زیادہ جماعت اسلامی کی وکالت کی، سب سے زیادہ چوٹیں کھائیں سب سے زیادہ بدنام ہوئے تو پھر ان بے چاروں کے دامنوں میں ہی کیا ہوگا جو جماعت اسلامی کی حمایت میں دو سطریں لکھنے کی بھی جرأت نہیں کر سکے اور جنھوں نے جماعت اسلامی کی طرفداری میں کوئی ایسا اقدام نہیں کیا کہ جسے جسارت کا نام دیا جا سکے۔

الغرض مولانا مرحوم نے اپنی وفات کے بعد ایک محدود سی رقم چھوڑی تھی جو قرض ادا کرنے میں ختم ہو گئی اور قرض پھر بھی باقی رہا اس لئے کہ متروکہ رقم کم تھی اور قرض زیادہ تھا۔

کچھ رقم بینک میں بھی ہے لیکن اس رقم کے ملنے کی فی الحال کوئی توقع نہیں۔ آٹھ مہینے سے مسلسل بھاگ دوڑ ہو رہی ہے لیکن اس بھاگ دوڑ کا حاصل کچھ نہیں۔ بینک کے منیجر سے جب بھی ملتے ہیں وہ ایک اندازِ بے نیازی کے ساتھ کہہ دیتا ہے کہ بھائی صاحب ابھی دیر لگے گی۔

ممکن ہے کہ وہ رقم مولانا عامر عثمانی رح کے پوتوں کے کام آئے یا ممکن ہے اس وقت حاصل ہو جب دنیا کا نظام ہی درہم برہم ہو جائے۔

الغرض سرمایہ نہ ہونے کے سبب مختلف الجھنیں درپیش ہیں اور ان میں سب سے بڑی الجھن یہ ہے کہ رسالہ صحیح وقت پر نہیں چھپ پاتا اور اس وقت تک رسالہ صحیح وقت پر نہیں آسکتا

جب تک اقتصادی حالات متوازن نہیں ہو جاتے۔

اقتصادی حالات کو متوازن کرنے کا ایک طریقہ ہمارے سمجھ میں آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مولانا عامر عثمانی کی تحریروں کو یکجا کر کے کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔

اس طریقہ پر عمل کرنے سے تین فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک تو قارئین کے مشوروں پر عمل ہو جائے گا، انکی مانگ پوری ہو جائے۔ دوسرے ہمیں کچھ رقم فراہم ہو جائے گی جس کی ہمیں سخت ضرورت ہے اور جو تجلی کی پشت کو مضبوط کرنے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوگی۔ تیسرے وہ سرمایہ محفوظ ہو جائے گا جو مولانا مرحوم کے علم و فہم کا نچوڑ ہے اور جس کی حفاظت کرنا ہمارا اخلاقی اور دینی و علمی فریضہ بھی۔

پروگرام کے مطابق ایک کتاب مرتب کر لی گئی ہے یہ کتاب مولانا مرحوم کی گلہائے تحریر کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔

سونے پر سہاگہ والی بات یہ ہے کہ علم و آگہی کے منتشر پھولوں کو گلدستہ کی شکل میں ڈھالنے والے وہ فنکار ہیں جن کا تحریری فن قارئین تجلی سے داد تحسین اور خراج عقیدت حاصل کر چکا ہے اور جو شمس نوید عثمانی کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔

کتاب کا نام تجویز کیا گیا ہے:۔

"شرک اور شیطنت کے چور دروازے"

خواص تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اس نام کی کتاب کس موضوع سے متعلق ہوگی اور اس میں کس قسم کی تحریریں یکجا کی گئی ہوں گی۔ عوام کے لئے غالباً اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ اس کتاب میں وہ تمام تحریریں سمیٹ لی گئی ہیں جن میں مولانا عامر عثمانیؒ نے ان چور دروازوں کی نشاندہی کی ہے جہاں سے شیطان دل کی کائنات میں داخل ہو کر اس دولت کو لوٹ لیتا ہے جو دولت مسلمان کی سب سے قیمتی متاع ہے اور جسے اصطلاح عام میں "ایمان" کہا جاتا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ شیطان کن کن مورچوں سے حملہ آور ہوتا ہے اور کس طرح ہمارے دل و دماغ میں تحلیل ہو کر ہمیں ورغلاتا ہے۔

میں اس کتاب کے بارے میں تعریفی کلمات زبان سے نکالنا مناسب نہیں سمجھتا۔ البتہ اگر آپ مبالغہ آمیزی پر محمول نہ کریں تو اتنا ضرور عرض کر دوں گا کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک جامع، مکمل اور ہمہ گیر ثابت ہوگی۔

بعض جگہوں پر محترم شمس بھائی نے کچھ حاشیے بھی چڑھائے ہیں اور یہ حاشیے دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔

اس وقت کتاب کا اس سے زیادہ تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کتاب کی قدر و منزلت کا صحیح اندازہ تو اسی وقت ہوگا جب یہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگی اور آپ اس کے مطالعہ سے محظوظ ہو رہے ہوں گے۔ بزرگوں نے کہا ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید۔

آخر میں اپنے قارئین سے اتنی استدعا ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے تعاون سے نوازیں اور تعاون کی پہلی اور آخری صورت صرف یہ ہے کہ قارئین اپنے آرڈروں سے مطلع کریں رقم روانہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس اس بات کی اطلاع دیدینا کافی ہوگا کہ وہ کتنی تعداد میں کتاب منگانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

پیشگی آرڈر وصول ہو جانے سے ہمیں یہ اندازہ ہو جائیگا کہ کتاب کتنی تعداد میں چھپوانی چاہیئے۔ تاکہ تجلی کا وہ سرمایہ جو رسالہ کی کفالت بھی مشکل ہی سے کر پاتا ہے اس کتاب کی نذر نہ ہو جائے اور ہم جس پریشانی کو دور کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں اس میں مزید اضافہ ہو جائے۔ لہٰذا ہم قارئین تجلی اور دیگر علم نواز حضرات سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنی علم نوازی اور تجلی سے ہمدردی کا پورا پورا ثبوت دیکر ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

ایک بار پھر یہ بات گوش گزار کر لیجئے کہ ابھی آپ کو رقم ارسال نہیں کرنی ہے۔ صرف یہ وعدہ کرنا ہے کہ آپ کتاب ضرور خریدیں گے اور پھر وعدہ پورا کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہو جائے گا۔

٭ ٭ ٭

تفہیم القرآن

مُعَوِّذَتَین — اَلفلَق — النّاس

نام اگرچہ قرآن مجید کی یہ آخری دو سورتیں بجائے خود الگ الگ ہیں، اور مُصحف میں الگ ناموں ہی سے لکھی ہوئی ہیں، لیکن ان کے درمیان باہم اتنا گہرا تعلق ہے اور ان کے مضامین ایک دوسرے سے اتنی قریبی مناسبت رکھتے ہیں کہ ان کا ایک مشترک نام مُعَوِّذَتَین (پناہ مانگنے والی دو سورتیں) رکھا گیا ہے۔ امام بیہقی نے دلائلِ نبوّت میں لکھا ہے کہ یہ نازل بھی ایک ساتھ ہوئی ہیں۔ اسی وجہ سے دونوں کا مجموعی نام مُعَوِّذَتَین ہے۔ ہم یہاں دونوں پر ایک ہی دیباچہ لکھ رہے ہیں کیونکہ ان سے متعلقہ مسائل و مباحث بالکل یکساں ہیں۔ البتہ آگے ان کی ترجمانی و تفسیر الگ الگ کی جائے گی۔

زمانۂ نزول حضرت حسن بصری، عکرِمہ، عطاء اور جابر بن زید کہتے ہیں کہ یہ سورتیں مکی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ مگر ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مدنی ہے اور یہی قول حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور قتادہ کا بھی ہے۔ اس دوسرے قول کو جو روایات تقویت پہنچاتی ہیں ان میں سے ایک مسلم، ترمذی، نسائی اور مسند احمد بن حنبل میں حضرت عُقبہ بن عامر کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز مجھ سے فرمایا: "الم تر ایات اُنزِلت اللیلۃ لم یُرَ مثلھن، اعوذ برب الفلق۔ اعوذ برب الناس" یہ حدیث اس بنا پر ان سورتوں کے مدنی ہونے کی دلیل ہے کہ حضرت عُقبہ بن عامر ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں ایمان لائے تھے جیسا کہ ابو داؤد اور نسائی نے خود ان کے اپنے بیان سے نقل کیا ہے۔ دوسری روایات جو اس قول کی تقویت کی موجب بنی ہیں وہ ابن سعد، محی السُّنّہ بَغَوی، امام نسفی، امام بیہقی، حافظ ابن حجر، حافظ بدرالدین عینی، عبد بن حُمَید وغیرہم کی نقل کردہ یہ روایات ہیں کہ جب مدینہ میں یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور اس کے اثر سے حضور بیمار ہو گئے تھے اسی وقت یہ سورتیں نازل ہوئی تھیں۔ ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہ ۷ھ کا واقعہ ہے

اسی بنا پر سفیان بن عُیَینہ نے بھی ان سورتوں کو مدنی کہا ہے لیکن جیسا کہ ہم سورۂ اخلاص کے دیباچے میں بیان کر چکے ہیں، کسی سورۃ یا آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب لازماً یہی نہیں ہوتا کہ وہ پہلی مرتبہ اسی موقع پر نازل ہوئی تھی بلکہ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ ایک سورت یا آیت پہلے نازل ہو چکی ہوتی تھی۔ اور پھر کوئی خاص واقعہ یا صورت حال پیش آنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی کی طرف سے دوبارہ بلکہ کبھی کبھی بار بار حضورؐ کو توجہ دلائی جاتی تھی۔ ہمارے نزدیک ایسا ہی معاملہ مُعَوِّذَتَین کا بھی ہے۔ ان کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ ابتداءً مکہ میں اس وقت نازل ہوئی ہوں گی جب وہاں حضورؐ کی مخالفت خوب زور پکڑ چکی تھی۔ بعد میں جب مدینہ طیبہ میں منافقین، یہود اور مشرکین کی مخالفت کے طوفان اٹھے تو حضورؐ کو پھر انہی دونوں سورتوں کے پڑھنے کی تلقین کی گئی جیسا کہ حضرت عقبہ بن عامر کی مندرجۂ بالا روایت میں ذکر آیا ہے۔ اس کے بعد جب آپ پر جادو کیا گیا اور آپ کی علالت مزاج نے شدت اختیار کی تو اللہ کے حکم سے جبریل علیہ السلام نے آکر پھر یہی سورتیں پڑھنے کی آپ کو ہدایت کی۔ اس لئے ہمارے نزدیک ان مفسرین کا بیان ہی زیادہ معتبر ہے جو ان دونوں سورتوں کو مکی قرار دیتے ہیں۔ جادو کے معاملہ کے ساتھ ان کو مخصوص سمجھنے میں تو یہ امر بھی مانع ہے کہ ان کے ساتھ صرف سورۂ فلق کی صرف ایک آیت وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ہی تعلق رکھتی ہے۔ سورۂ فلق کی باقی آیات اور پوری سورۃ الناس کا اس معاملہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

موضوع اور مضمون

مکہ معظمہ میں یہ دونوں سورتیں جن حالات میں نازل ہوئی تھیں وہ یہ تھے کہ اسلام کی دعوت شروع ہوتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ جوں جوں آپ کی دعوت پھیلتی گئی کفار قریش کی مخالفت بھی شدید ہوتی چلی گئی۔ جب تک انہیں یہ امید رہی کہ شاید وہ کسی طرح کی سودے بازی کر کے یا بہلا پھسلا کر آپ کو اس کام سے باز رکھ سکیں گے۔ اس وقت تک تو پھر بھی عناد کی شدت میں کچھ کمی رہی۔ لیکن جب حضورؐ نے ان کو اس طرف سے بالکل مایوس کر دیا کہ آپ ان کے ساتھ دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو سکیں گے۔ اور سورۂ کافرون میں صاف صاف ان سے کہہ دیا گیا کہ جن کی بندگی تم کرتے ہو ان کی بندگی کرنے والا میں نہیں ہوں، اور جس کی بندگی میں کرتا ہوں اس کی بندگی کرنے والے تم نہیں ہو، اس لئے میرا راستہ الگ ہے اور تمہارا راستہ الگ، تو کفار کی دشمنی اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی خصوصیت کے ساتھ جن خاندانوں کے افراد (مردوں یا عورتوں، لڑکوں یا لڑکیوں نے) اسلام قبول کر لیا تھا ان کے دلوں میں تو حضورؐ کے خلاف ہر وقت بھٹیاں سلگتی رہتی تھیں، گھر گھر آپ کو کوسا جا رہا تھا۔ خفیہ مشورے کئے جا رہے تھے کہ کسی وقت رات کو چھپ کر آپ کو قتل کر دیا جائے تاکہ بنی ہاشم کو قاتل کا پتہ نہ چل سکے اور وہ بدلہ نہ لے سکیں۔ آپ کے خلاف جادو ٹونے کئے جا رہے تھے تاکہ آپ یا تو وفات پا جائیں یا سخت بیمار پڑ جائیں یا دیوانے ہو جائیں۔ شیاطین جن و انس ہر طرف پھیل گئے تھے تاکہ عوام کے دلوں میں آپ کے خلاف اور آپ کے لائے ہوئے دین اور قرآن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیں جس سے لوگ بدگمان ہو کر آپ سے دور بھاگنے لگیں۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھی جل رہی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے سوا یا اپنے قبیلے کے کسی آدمی کے سوا دوسرے کسی شخص کا چراغ جلتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ مثال کے طور پر ابوجہل جس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی مخالفت میں حد سے بڑھتا چلا جاتا تھا۔ اس کی وجہ وہ خود یہ بیان کرتا ہے کہ "ہمارا اور بنی عبد مناف (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان) کا باہم مقابلہ تھا۔ انھوں نے کھانے کھلائے تو ہم نے بھی کھلائے۔ انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں تو ہم نے بھی دیں۔ انہوں نے عطیے دیئے تو ہم نے بھی دیئے۔ یہاں تک کہ وہ اور ہم جب عزت و شرف میں برابر کی ٹکر ہو گئے تو اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی ہے جس پر آسمان سے وحی اترتی ہے۔ بھلا اس میدان میں ہم کیسے ان مقابلہ کر سکتے ہیں؟ خدا کی قسم ہم ہرگز اس کو نہ مانیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے" (ابن ہشام جلد اول۔ ص ۳۳۷ – ۳۳۸)

ان حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں طلوعِ صبح کے رب کی، تمام مخلوقات کے شر سے، رات کے اندھیرے اور جادوگروں اور جادوگرنیوں کے شر سے اور حاسدوں کے شر سے۔ اور ان سے کہہ دو کہ میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے معبود کی ہر اس وسوسہ انداز کے شر سے جو بار بار پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ شیاطین جن میں سے ہو یا شیاطین انس میں سے۔

یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی حضرت موسیٰ نے اس وقت فرمائی تھی جب فرعون نے بھرے دربار میں ان کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُم مِّن كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ "میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے ہر اس متکبر کے مقابلے میں جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا (المومن ۲۷)۔ وَإِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَن تَرْجُمُونِ "اور میں نے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے اس بات سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔" (الدخان – ۲۰)

دونوں مواقع پر اللہ کے ان جلیل القدر پیغمبروں کا مقابلہ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں بڑے سروسامان اور وسائل و ذرائع اور قوت و شوکت رکھنے والوں سے تھا۔ دونوں مواقع پر وہ طاقتور دشمنوں کے آگے اپنی دعوتِ حق پر ڈٹ گئے درانحالیکہ ان کے پاس کوئی مادی طاقت ایسی نہ تھی جس کے بل پر وہ ان کا مقابلہ کر سکتے۔ اور دونوں مواقع پر انہوں نے دشمنوں کی دھمکیوں اور خطرناک تدبیروں اور معاندانہ چالوں کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ تمہارے مقابلہ میں ہم نے ربّ کائنات کی پناہ لے لی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اولوالعزمی اور ثابت قدمی وہی شخص دکھا سکتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ اس کے رب کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے، اس کے مقابلے میں دنیا کی ساری طاقتیں ہیچ، اور اس کی پناہ جسے حاصل ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں کلمۂ حق کے اعلان سے ہرگز نہیں ہٹوں گا، تم جو چاہو کر لو، مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں، کیونکہ میں تمہارے اور اپنے اور ساری کائنات کے رب کی پناہ لے چکا ہوں۔

معوّذتین کی قرآنیت

ان دونوں سورتوں کے موضوع اور مضمون کو سمجھنے کے لئے تو اتنی بحث ہی کافی ہے جو اوپر کی جا چکی ہے۔ لیکن چونکہ حدیث و تفسیر کی کتابوں میں ان کے متعلق تین ایسے مباحث آ گئے ہیں جو دلوں میں شبہات پیدا کر سکتے ہیں، اس لئے ہم ان کو بھی صاف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

ان میں سے اولین قابل توجہ مسئلہ یہ ہے کہ آیا ان دونوں سورتوں کا قرآنی سورتیں ہونا قطعی طور پر ثابت ہے یا اس میں کسی شک کی گنجائش ہے؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے عظیم المرتبت صحابی سے متعدد روایتوں میں یہ بات منقول ہوئی ہے کہ وہ ان دونوں سورتوں کو قرآن کی سورتیں نہیں مانتے تھے اور اپنے مصحف سے انہوں نے ان کو ساقط کر دیا تھا۔ امام احمد، بزار، طبرانی، ابن مردویہ، ابو یعلیٰ، عبداللہ بن احمد بن حنبل، حُمَیدی، ابو نعیم،

ابن حبان وغیرہ محدثین نے مختلف سندوں سے اور اکثر وبیشتر صحیح سندوں سے یہ بات حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کی ہے ۔ ان روایات میں نہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ وہ ان سورتوں کو مصحف سے ساقط کردیتے تھے، بلکہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے "قرآن کے ساتھ وہ چیزیں نہ ملاؤ جو قرآن کا جز نہیں ہیں۔ یہ دونوں قرآن میں شامل نہیں ہیں۔ یہ تو ایک حکم تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپ ان الفاظ میں خدا کی پناہ مانگیں" بعض روایات میں اس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ وہ ان سورتوں کو نماز میں نہیں پڑھتے تھے ۔

ان روایات کی بنا پر مخالفین اسلام کو قرآن کے بارے میں شبہات ابھارنے کا موقع مل گیا کہ معاذ اللہ یہ کتاب تحریف سے محفوظ نہیں ہے بلکہ اس میں جب یہ دونوں سورتیں ابن مسعودؓ جیسے صحابی کے بیان کے مطابق الحاقی ہیں تو نہ معلوم اور کیا کیا حذف و اضافے اس کے اندر ہوئے ہوں گے ۔ اس طعن سے پیچھا چھڑانے کے واسطے قاضی ابوبکر باقلانی اور قاضی عیاض وغیرہ نے یہ تاویل کی کہ ابن مسعودؓ معوذتین کی قرآنیت کے منکر تھے بلکہ صرف ان کو مصحف میں درج کرنے سے انکار کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک مصحف میں صرف وہی چیز درج کی جانی چاہئے تھی جس کے ثبت کرنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہو، اور ابن مسعودؓ تک یہ اطلاع نہیں پہنچی تھی کہ حضورؐ نے اس کی اجازت دی ہے لیکن یہ تاویل درست نہیں ہے کیونکہ صحیح سندوں کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کے قرآنی سورتیں ہونے کا انکار کیا ہے ۔ کچھ دوسرے بزرگوں مثلاً امام نووی، ابن حزم اور امام فخر الدین رازی نے سرے سے اس بات ہی کو جھوٹ اور باطل قرار دیا ہے کہ ابن مسعودؓ نے ایسی کوئی بات کہی ہے ۔ مگر مستند تاریخی حقائق کو بلا سند رد کر دینا کوئی علمی طریقہ نہیں ہے ۔

اب سوال یہ ہے کہ ابن مسعودؓ کی ان روایات سے قرآن پر جو طعن وارد ہوتا ہے اس کا صحیح رد کیا ہے ؟ اس سوال کے کئی جواب ہیں جن کو ہم سلسلہ وار درج کرتے ہیں :-

(۱) حافظ بزار نے اپنی مسند میں ابن مسعودؓ کی یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اپنی اس رائے میں وہ بالکل منفرد ہیں صحابہ میں سے کسی نے بھی ان کے اس قول کی تائید نہیں کی ہے ۔

(۲) تمام صحابہ کے اتفاق سے خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے نسخے مرتب کروائے تھے اور خلافت اسلامیہ کی طرف سے جن کو دنیائے اسلام کے مراکز میں سرکاری طور پر بھیجا تھا، ان میں یہ دونوں سورتیں درج تھیں ۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے آج تک تمام دنیائے اسلام کا جس مصحف پر اجماع ہے اس میں یہ دونوں سورتیں درج ہیں۔ تنہا عبد اللہ بن مسعودؓ کی رائے، ان کی جلالت قدر کے باوجود، اس عظیم اجماع کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتی ۔

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت صحیح و معتبر احادیث کے مطابق یہ ثابت ہے کہ آپ نے ان سورتوں کو نماز میں خود پڑھا ہے، دوسروں کو پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے اور قرآن کی سورتوں کی حیثیت ہی سے لوگوں کو ان کی تعلیم دی ہے ۔ مثال کے طور پر ذیل کی احادیث ملاحظہ ہوں :-

مسلم، احمد، ترمذی اور نسائی کے حوالہ سے حضرت عقبہؓ بن عامر کی یہ روایت ہم اوپر نقل کر چکے ہیں کہ حضورؐ نے سورۂ فلق اور سورۂ ناس کے متعلق ان سے یہ فرمایا کہ آج رات یہ آیات مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔ نسائی کی ایک روایت عقبہ بن عامر سے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں سورتیں صبح کی نماز میں پڑھیں ۔ ابن حبانؒ نے انہی حضرت عقبہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے ان سے فرمایا " اگر ممکن ہو تو تمہاری نمازوں سے ان دونوں سورتوں کی قرأت چھوٹنے نہ پائے "

سعید بن منصور نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے صبح کی نماز میں یہ دونوں سورتیں پڑھیں۔ امام احمد اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ ایک اور صحابی کی یہ روایت لائے ہیں کہ حضور نے ان سے فرمایا جب تم نماز پڑھو تو اس میں یہ دونوں سورتیں پڑھا کرو۔

مسند احمد، ابوداؤد اور نسائی میں عُقبہ بن عامر کی یہ روایت آئی ہے کہ حضور نے ان سے فرمایا "کیا میں دو ایسی سورتیں تمہیں نہ سکھا دوں جو ان بہترین سورتوں میں سے ہیں جنھیں لوگ پڑھتے ہیں"؟ انہوں نے عرض کیا ضرور یا رسول اللہ۔ اس پر حضورؐ نے ان کو یہی معوّذتین پڑھائیں۔ پھر نماز کھڑی ہوئی تو حضورؐ نے یہی دو سورتیں اس میں بھی پڑھیں اور نماز کے بعد پلٹ کر جب آپ ان کے پاس سے گزرے تو فرمایا "اے عُقَب، کیسا پایا تم نے"؟ اور اس کے بعد ان کو ہدایت فرمائی کہ جب تم سونے لگو اور جب سو کر اٹھو تو ان سورتوں کو پڑھا کرو۔ مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں عُقبہ بن عامر کی ایک روایت یہ ہے کہ حضورؐ نے ان کو ہر نماز کے بعد معوذتین (یعنی قل ہو اللہ احد اور معوذتین) پڑھنے کی تلقین کی۔ نسائی، ابن مردویہ اور حاکم نے عقبہ بن عامر کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضور سواری پر چلے جا رہے تھے اور میں آپ کے قدم مبارک پر ہاتھ رکھے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے عرض کیا مجھے سورۂ ہود یا سورۂ یوسف سکھا دیجئے۔ فرمایا "اللہ کے نزدیک بندے کے لئے قل اعوذ برب الفلق سے زیادہ نافع کوئی چیز نہیں ہے" عبداللہ بن عابس الجہنی کی روایت نسائی، بیہقی، بغوی اور ابن سعد نے نقل کی ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا "ابن عابس، کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ پناہ مانگنے والوں نے جتنی چیزوں کے ذریعہ سے اللہ کی پناہ ہے، ان میں سب سے افضل کون سی چیزیں ہیں"؟ میں نے عرض کیا ضرور یا رسول اللہ۔ فرمایا "قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس۔ یہ دونوں سورتیں"۔ ابن مردویہ نے حضرت ام سلمہ کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ کو جو سورتیں سب سے زیادہ پسند ہیں وہ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو یہ غلط فہمی آخر کیسے لاحق ہوئی کہ یہ دونوں قرآن مجید کی سورتیں نہیں ہیں؟ اس کا جواب ہمیں دونوں روایتوں کو جمع کر کے دیکھنے سے ملتا ہے۔ یہ ایک روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے تھے کہ یہ تو ایک حکم تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا کہ آپ اس طرح تعوّذ کیا کریں۔ دوسری وہ روایت جو کئی مختلف سندوں سے امام بخاری نے صحیح البخاری میں، امام احمدؒ نے اپنی مسند میں، حافظ ابوبکر الحمیدی نے اپنی مسند میں، ابونعیم نے اپنی المستخرج میں اور نسائی نے اپنی سنن میں زرّ بن حُبَیش کے حوالے سے تھوڑے تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ حضرت اُبیّ بن کعبؓ سے جو علم قرآن کے لحاظ سے صحابۂ کرام میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ نقل کی ہے۔ زرّ بن حبیش کا بیان ہے کہ میں نے حضرت اُبیّ سے کہا کہ آپ کے بھائی عبداللہ بن مسعودؓ ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ آپ ان کے اس قول کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں سوال کیا تھا۔ حضور نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا قُل، تو میں نے کہا قُل۔ اس لئے ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضورؐ کہتے تھے" امام احمد کی روایت میں حضرت اُبیّ کے الفاظ یہ ہیں "میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے آپ سے قُل اعُوذُ برب الفلق کہا تھا اس لئے آپ نے بھی ایسا ہی کہا، اور انھوں نے قل اَعُوذُ برَبّ الناس کہا تھا اس لئے آپ نے بھی ایسا ہی کہا تھا۔ لہٰذا ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں جس طرح حضورؐ نے کہا"۔ ان دونوں روایتوں پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو دونوں سورتوں میں لفظ قُل (کہو) دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعوذ برب الفلق اور اعوذ برب الناس کہنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن انہوں نے حضورؐ سے اس کے متعلق سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ حضرت

ابی بن کعب کے ذہن میں بھی اس کے متعلق سوال پیدا ہوا اور انہوں نے حضورؐ سے اس کو پوچھ لیا۔ حضورؐ نے بتایا کہ جبریل علیہ السلام نے چونکہ قل کہا تھا اس لئے میں بھی قل کہتا ہوں۔ اس بات کو یوں سمجھئے کہ اگر کسی کو حکم دینا مقصود ہو اور اس سے کہا جائے کہ "کہو، میں پناہ مانگتا ہوں" تو وہ حکم کی تعمیل میں یہ نہیں کہے گا کہ میں پناہ مانگتا ہوں" بلکہ وہ "کہو" کا لفظ ساقط کر کے "میں پناہ مانگتا ہوں" کہے گا۔ بخلاف اس کے اگر کسی کو بالا دست حاکم کا پیغام بران الفاظ میں پیغام پہنچائے کہ "کہو، میں پناہ مانگتا ہوں" اور یہ پیغام اسے اپنے تک رکھنے کے لئے نہیں بلکہ دوسروں تک پہنچانے کے لئے دیا جائے تو وہ لوگوں تک پیغام کے الفاظ کو جوں کا توں پہنچائے گا۔ اس میں سے کوئی چیز ساقط کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ پس ان دونوں سورتوں کی ابتداء لفظ قل سے ہونا اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ کلام وحی ہے جسے حضورؐ انھیں الفاظ میں پہنچانے کے پابند تھے جن الفاظ میں یہ آپ کو ملا تھا۔ اس کی حیثیت محض ایک حکم کی نہ تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہو۔ قرآن مجید میں ان دو سورتوں کے علاوہ ۳۳۲ آیتیں ایسی ہیں جو لفظ قل (کہو) سے شروع ہوئی ہیں۔ ان سب میں قل کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ یہ کلام وحی ہے جسے انہی الفاظ میں پہنچانا حضورؐ کے ذمہ فرض تھا جن الفاظ میں آپ پر یہ نازل کیا گیا تھا ورنہ ہر جگہ قل اگر ایک حکم ہوتا تو حضورؐ اس لفظ کو ساقط کر کے وہ بات کہتے جس کے کہنے کا حکم دیا گیا تھا اور اسے قرآن میں درج کیا جاتا بلکہ حضورؐ صرف اس حکم کی تعمیل میں وہ بات کہہ دینے پر اکتفا فرماتے جسے کہنے کا آپ کو حکم دیا گیا تھا۔

اس مقام پر اگر آدمی کچھ غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ سکتی ہے کہ صحابۂ کرام کو بے خطا سمجھنا اور ان کی کسی بات کے لئے غلط کا لفظ سنتے ہی توہین صحابہ کا شور مچا دینا کس قدر بیجا حرکت ہے۔ یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی سے قرآن کی دو سورتوں کے بارے میں کتنی بڑی چوک ہو گئی۔ ایسی چوک اگر اتنے عظیم مرتبہ کے صحابی سے ہو سکتی ہے تو دوسروں سے بھی کوئی چوک ہو جانی ممکن ہے۔ ہم علمی تحقیق کے لئے اس کی چھان بین بھی کر سکتے ہیں۔ اور کسی صحابی کی کوئی بات یا چند باتیں غلط ہوں تو انھیں غلط بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ سخت ظالم ہوگا وہ شخص جو غلط کو غلط کہنے سے آگے بڑھ کر ان پر زبان طعن دراز کرے۔ انہی معوذتین کے بارے میں مفسرین و محدثین نے ابن مسعودؓ کی رائے کو غلط کہا ہے۔ مگر کسی نے یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ قرآن کی دو سورتوں کا انکار کر کے معاذ اللہ وہ کافر ہو گئے تھے۔

حضورؐ پر جادو کا اثر ہونا

دوسرا مسئلہ جو ان سورتوں کے معاملہ میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ روایات کی رو سے حضورؐ پر جادو کیا گیا تھا۔ اور اس کے اثر سے آپ بیمار ہو گئے تھے اور اس اثر کو دور کرنے کے لئے جبریل علیہ السلام نے آکر آپ کو یہ سورتیں پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔ اس پر قدیم اور جدید زمانے کے بہت سے عقلیت پسندوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ روایات اگر مان لی جائیں تو شریعت ساری کی ساری مشتبہ ہو جاتی ہے کیونکہ اگر نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا تھا۔ اور ان روایات کی رو سے ہو گیا تھا، تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ مخالفین نے جادو کے زور پر نبی سے کیا کیا کہلوا اور کروا لیا ہو، اور اس کی دی ہوئی تعلیم میں کتنی چیزیں خدا کی طرف سے ہوں اور کتنی جادو کے زیر اثر۔ یہی نہیں بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اس بات کو صحیح مان لینے کے بعد تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ جادو ہی کے ذریعہ سے نبی کو نبوت کے دعوے پر اکسایا گیا ہو اور نبی نے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ سمجھ لیا ہو کہ اس کے پاس فرشتہ آیا ہے۔ ان کا استدلال یہ بھی ہے کہ یہ احادیث قرآن مجید سے متصادم ہیں۔ قرآن میں تو کفار کا یہ الزام بیان کیا گیا ہے کہ نبی ایک مسحور یعنی سحر زدہ آدمی ہے (يَقُولُ الظّٰلِمُونَ اِنْ تَتَّبِعُونَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا ۔ بنی اسرائیل - ۴۷) مگر یہ احادیث کفار کے الزام کی تصدیق کرتی ہیں کہ واقعی نبی پر سحر کا اثر ہوا تھا۔

اس مسئلے کی تحقیق کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ کیا درحقیقت مستند تاریخی روایات کی رو سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہوا تھا؟ اور اگر ہوا تھا وہ کیا تھا اور کس حد تک تھا اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ جو کچھ تاریخ سے ثابت ہے اس پر وہ اعتراضات وارد بھی ہوتے ہیں یا نہیں جو کئے گئے ہیں؟ -

قرونِ اولیٰ کے مسلمان علماء کی یہ انتہائی راست بازی تھی کہ انہوں نے اپنے خیالات اور مزعومات کے مطابق تاریخ کو مسخ کرنے یا حقائق پر پردے ڈالنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ جو کچھ تاریخی طور پر ثابت تھا اسے جوں کا توں بعد کی نسلوں تک پہنچا دیا اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ ان حقائق سے اگر کوئی الٹے نتائج نکالنے پر اتر آئے تو ان کا فراہم کردہ یہ مواد کس طرح اس کے کام آسکتا ہے۔ اب اگر ایک بات نہایت مستند اور کثیر تاریخی ذرائع سے ثابت ہو تو کسی دیانت دار صاحب علم کے لئے نہ تو یہ درست ہے کہ وہ اس بنا پر تاریخ کا انکار کردے کہ اس کو مان لینے سے اس کے نزدیک فلاں فلاں قباحتیں رونما ہوتی ہیں، اور نہ یہی درست ہے کہ جتنی بات تاریخ سے ثابت ہے۔ اس کو قیاسات کے گھوڑے دوڑا کر اس کی اصلی حد سے پھیلانے اور بڑھانے کی کوشش کرے۔ اس کے بجائے اس کا کام یہ ہے کہ تاریخ کو تاریخ کی حیثیت سے مان لے اور پھر دیکھے کہ اس سے فی الواقع کیا ثابت ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔

جہاں تک تاریخی حیثیت کا تعلق ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہونے کا واقعہ قطعی طور پر ثابت ہے اور علمی تنقید سے اگر اس کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہو تو پھر دنیا کا کوئی تاریخی واقعہ بھی صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اسے حضرت عائشہؓ حضرت زید بن ارقم اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ، امام احمد، عبدالرزاق، حُمیدی، بیہقی، طبرانی، ابن سعد، ابن مردویہ، ابن ابی شیبہ، حاکم، عبد بن حمید وغیرہ محدثین نے اتنی مختلف اور کثیر التعداد سندوں سے نقل کیا ہے کہ اس کا نفس مضمون تواتر کی حد کو پہنچا ہوا ہے اگرچہ ایک ایک روایت بجائے خود خبرِ واحد ہے۔ اس کی تفصیلات جو روایات میں آئی ہیں انھیں ہم مجموعی طور پر تمام روایات سے مرتب کر کے ایک مربوط واقعہ کی صورت میں یہاں درج کرتے ہیں -

صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم ۷ھ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر لبید بن اعصم سے ملا جو انصار کے قبیلۂ بنی زریق سے تعلق رکھتا تھا[1]۔ ان لوگوں نے ان سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو، یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں۔ انھیں قبول کرو اور محمد پر ایک زور کا جادو کردو۔ اس زمانے میں حضور کے ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا۔ اس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کرلیا۔ جس میں آپؐ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں یہ ہے کہ لبید بن اعصم نے خود جادو کیا تھا۔ اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگرنیاں تھیں، ان سے اس نے جادو کروایا تھا۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، اس جادو کو ایک

[1] بعض راویوں نے اسے یہودی کہا ہے اور بعض نے منافق اور یہود کا حلیف۔ لیکن اس پر سب متفق ہیں کہ وہ بنی زریق میں سے تھا اور یہ معلوم ہے کہ بنی زریق یہودیوں کا کوئی قبیلہ نہ تھا بلکہ خزرج میں سے انصار کا ایک قبیلہ تھا۔ اس لئے یا تو وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اہل مدینہ میں سے یہودی ہو گئے تھے، یا یہودی کا حلیف ہونے کی بنا پر بعض لوگوں نے اسے بھی یہودی شمار کرلیا۔ تاہم اس کے لئے منافق کا لفظ استعمال ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر وہ مسلمان بنا ہوا تھا۔

نرکھجور کے خوشے کے غلاف میں[1] رکھ کر لبید نے بنی زُریق کے کنوئیں ذروان یا ذی اروان نامی کی تہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔ اس جادو کا اثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتے ہوتے پورا ایک سال لگا۔ دوسری ششماہی میں کچھ تغیرِ مزاج محسوس ہونا شروع ہوا۔ آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے۔ مگر اس کا زیادہ سے زیادہ اثر جو حضورؐ پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ گھلتے جا رہے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ آپ نے اسے کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا۔ ازدواج کے متعلق آپؐ خیال فرماتے کہ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے تھے۔ اور بعض اوقات آپ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ یہ تمام اثرات آپؐ کی ذات تک محدود رہے۔ حتی کہ دوسرے لوگوں کو یہ معلوم تک نہ ہو سکا کہ آپؐ پر کیا گزر رہی ہے۔ رہی آپ کے نبی ہونے کی حیثیت تو اس میں آپ کے فرائض کے اندر کوئی خلل واقع نہ ہونے پایا۔ کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں آپؐ قرآن کی آیت بھول گئے ہوں یا کوئی آیت غلط پڑھ ڈالی ہو، یا اپنی صحبتوں میں اور اپنے وعظوں اور خطبوں میں آپ کی تعلیمات کے اندر کوئی فرق واقع ہو گیا ہو یا کوئی ایسا کلام آپؐ نے وحی کی حیثیت سے آپ نے پیش کر دیا ہو جو فی الواقع آپ پر نازل نہ ہوا ہو، یا نماز آپ سے چھوٹ گئی ہو اور اس کے متعلق بھی کبھی آپ نے سمجھ لیا ہو کہ پڑھ لی ہے مگر نہ پڑھی ہو۔ ایسی کوئی بات معاذ اللہ پیش آ جاتی تو دھوم مچ جاتی اور پورا ملک عرب اس سے واقف ہو جاتا کہ جس نبی کو کوئی طاقت چت نہ کر سکی تھی اسے ایک جادوگر کے جادو نے چت کر دیا۔ لیکن آپ کی حیثیت نبوی اس سے بالکل غیر متاثر رہی اور صرف اپنی ذاتی زندگی میں آپ اپنی جگہ اسے محسوس کر کے پریشان ہوتے رہے۔ آخر کار ایک روز آپؐ حضرت عائشہؓ کے ہاں تھے کہ آپ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اسی حالت میں نیند آ گئی یا غنودگی طاری ہوئی اور پھر بیدار ہو کر آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں نے جو بات اپنے رب سے پوچھی تھی وہ اس نے مجھے بتا دی ہے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ وہ کیا بات ہے؟ آپؐ نے فرمایا دو آدمی (یعنی فرشتے دو آدمیوں کی صورت میں) میرے پاس آئے۔ ایک سرہانے کی طرف تھا اور دوسرا پائنتی کی طرف۔ ایک نے پوچھا انہیں کیا ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا ان پر جادو ہوا ہے۔ اس نے پوچھا کس نے کیا ہے؟ جواب دیا لبید بن اعصم نے۔ پوچھا کس چیز میں کیا ہے؟ جواب دیا کنگھی اور بالوں میں ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر۔ پوچھا وہ کہاں ہے؟ جواب دیا بنی زریق کے کنوئیں ذی اروان (یا ذروان) کی تہ کے پتھر کے نیچے ہے۔ پوچھا اب اس کے لئے کیا کیا جائے؟ جواب دیا کہ کنوئیں کا پانی سونت دیا جائے اور پھر پتھر کے نیچے سے اس کو نکالا جائے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت زبیرؓ کو بھیجا۔ ان کے ساتھ جبیر بن ایاس الزُّرقیؓ اور قیس بن مُحصن الزُّرقی (یعنی بنی زریق کے یہ دو اصحاب) بھی شامل ہو گئے۔ بعد میں حضورؐ خود بھی چند اصحاب کے ساتھ وہاں پہونچ گئے۔ پانی نکالا گیا اور وہ غلاف برآمد کر لیا گیا۔ اس میں کنگھی اور بالوں کے ساتھ ایک تانت کے اندر گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور موم کا ایک پتلا تھا جس میں سوئیاں چبھوئی ہوئی تھیں۔ جبریل علیہ السلام نے آکر بتایا کہ آپ معوذتین پڑھیں۔ چنانچہ آپ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے اور اس کے ساتھ ایک ایک گرہ کھولی جاتی اور پتلے میں سے ایک ایک سوئی نکالی جاتی رہی۔ خاتمہ تک پہنچتے ہی ساری گرہیں کھل گئیں۔ ساری سوئیاں نکل گئیں اور آپ جادو کے اثر سے نکل کر بالکل ایسے ہو گئے جیسے کوئی شخص بندھا ہوا تھا

---

[1] ابتداء میں کھجور کا خوشہ ایک غلاف کے اندر رہتا ہے اور نر کھجور کے غلاف کا رنگ انسان کے رنگ سے ملتا جلتا ہوتا ہے اور اس کی بو انسان کے مادۂ منویہ جیسی ہوتی ہے۔

پھر کھل گیا۔ اس کے بعد آپ نے لبید کو بلا کر باز پرس کی۔ اس نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور آپ نے اس کو چھوڑ دیا کیونکہ اپنی ذات کے لئے آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے اس معاملہ کا چرچا کرنے سے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مجھے اللہ نے شفا دے دی ہے۔ اب میں نہیں چاہتا کہ کسی کے خلاف لوگوں کو بھڑکاؤں۔

یہ ہے سارا قصہ اس جادو کا۔ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو آپؐ کے منصب نبوّت میں قادح ہو ذاتی حیثیت سے اگر آپ کو زخمی کیا جا سکتا تھا جیسا کہ جنگ احد میں ہوا، اگر آپؐ گھوڑے سے گر کر چوٹ کھا سکتے تھے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ اگر آپؐ کو بچھو کاٹ سکتا تھا جیسا کہ بچھو اور احادیث میں وارد ہوا ہے اور ان میں سے کوئی چیز بھی اس تحفظ کے منافی نہیں ہے جس کا نبی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ کیا تھا، تو آپ اپنی ذاتی حیثیت میں جادو کے اثر سے بیمار بھی ہو سکتے تھے۔ نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے یہ بات تو قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔

سورۂ اعراف میں فرعون کے جادوگروں کے متعلق بیان ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں جب وہ آئے تو انھوں نے ہزارہا آدمیوں کے اس پورے مجمع کی نگاہوں پر جادو کر دیا جو وہاں دونوں کا مقابلہ دیکھنے کے لئے جمع ہوا تھا (سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ ط آیت ۱۱۶) اور سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جو لاٹھیاں اور رسیاں انہوں نے پھینکی تھیں ان کے متعلق عام لوگوں ہی نے نہیں حضرت موسیٰ نے بھی یہی سمجھا کہ وہ ان کی طرف سانپوں کی طرح دوڑی چلی آ رہی تھیں اور اس سے حضرت موسیٰ خوف زدہ ہو گئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی کہ خوف نہ کرو تم ہی غالب رہو گے ذرا اپنا عصا پھینکو۔ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ۔ (آیات ۶۶ تا ۶۹)

رہا یہ اعتراض کہ یہ تو کفار مکہ کے اس الزام کی تصدیق ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سحر زدہ آدمی کہتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کفار آپ کو سحر زدہ آدمی کہتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ کفار آپ کو سحر زدہ آدمی اس معنی میں نہیں کہتے تھے کہ آپ کسی جادو کے اثر سے بیمار ہو گئے ہیں، بلکہ اس معنی میں کہتے تھے کہ کسی جادوگر نے معاذ اللہ آپؐ کو پاگل کر دیا ہے اور اسی پاگل پن میں آپ نبوّت کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں اور جنت و دوزخ کے افسانے سنا رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اعتراض ایسے معاملہ پر سرے سے چسپاں ہی نہیں ہوتا جس کے متعلق تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ جادو کا اثر صرف ذات محمدؐ پر ہوا تھا، نبوّت محمدؐ بالکل اس سے غیر متأثر رہی۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جو لوگ جادو کو محض اوہام کے قبیل کی چیز قرار دیتے ہیں ان کی یہ رائے صرف اس وجہ سے ہے کہ جادو کے اثرات کی کوئی سائنٹفک توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں مگر سائنٹفک طریقہ سے یہ بیان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کیسے رونما ہوتی ہیں۔ اس طرح کی توجیہ پر اگر ہم قادر نہیں ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس چیز ہی کا انکار کر دیا جائے جس کی ہم توجیہ نہیں کر سکتے۔ جادو دراصل ایک نفسیاتی اثر ہے جو نفس سے گزر کر جسم کو بھی اسی طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح جسمانی اثرات جسم سے گزر کر نفس کو متأثر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوف ایک نفسیاتی چیز ہے، مگر اس کا اثر جسم پر یہ ہوتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن میں تھرتھری چھوٹ جاتی ہے۔ دراصل جادو سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ مگر انسان کا نفس اور اس کے حواس اس سے متاثر ہو کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ حقیقت تبدیل ہو گئی ہے۔ حضرت موسیٰ کی طرف جادوگروں نے جو لاٹھیاں اور رسیاں پھینکی تھیں وہ واقعی سانپ نہیں بن گئی تھیں لیکن ہزاروں کے مجمع کی آنکھوں پر ایسا جادو ہوا کہ سب نے انھیں سانپ ہی محسوس کیا۔ اور حضرت موسیٰ تک کے حواس جادو کی اس تاثیر سے

محفوظ نہ رہ سکے۔ اسی طرح قرآن (البقرہ۔ آیت ۱۰۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ بابل میں ہاروت اور ماروت سے لوگ ایسا جادو سیکھتے تھے جو شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی اثر تھا، اور ظاہر ہے کہ اگر تجربے سے لوگوں کو اس عمل کی کامیابی معلوم ہوتی تو وہ اس کے خریدار نہ بن سکتے تھے۔ بلاشبہ یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ بندوق کی گولی اور ہوائی جہاز سے گرنے والے بم کی طرح جادو کا مؤثر ہونا بھی اللہ کے اذن کے بغیر ممکن نہیں ہے، مگر جو چیز ہزارہا سال سے انسان کے تجربے اور مشاہدے میں آرہی ہو اس کے وجود کو جھٹلا دینا محض ایک ہٹ دھرمی ہے۔

مولانا عامر عثمانیؒ

تفہیم الحدیث

حُسنِ اخلاق

حضرت ابوالدرداء سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے :-

ما من شئ فی المیزان اثقل من حسن الخلق (الادب المفرد للبخاری)

ترجمہ :-

کوئی شخص حسن اخلاق سے زیادہ وزنی نہیں ہے ترازو میں۔

تفہیم :-

اخلاق کسے کہتے ہیں

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام میں اخلاق (حسن خلق) کیا مفہوم ہوتا ہے۔ یہ سمجھ لینا اس لئے ضروری ہے کہ موجودہ دور میں باطل افکار و تصورات کے غلبۂ و تسلط نے کتنے ہی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و مصداق میں من مانی تبدیلیاں کردی ہیں اور بد قسمتی سے یہی تبدیل شدہ مفہوم و مصداق نہ صرف غیر مسلموں کے اذہان میں بلکہ بے شمار مسلمانوں کے دماغوں میں بھی جاگزیں ہو کر رہ گیا ہے اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم آگے اس باب کی متعدد روایات بیان کرنے والے ہیں۔ ان سب کو صحیح طور پر سمجھنے کا مدار اسی پر ہے کہ اخلاق کا اسلامی مفہوم و مصداق اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

انسان کی طبیعت میں اللہ نے اجتماعیت اور مدنیت رکھی ہے۔ لہذا ناگزیر ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے اسے مختلف قسم کے رشتہ و پیوند سے سابقہ پڑے۔ اولاد، زوج قریب و دور کے رشتہ دار، احباب، پڑوسی، اہل وطن، برادرانِ دین و ملت بڑے چھوٹے، ہم عمر سبھی طرح کے انسانوں سے اس کا رشتہ ہوتا ہے یہاں تک کہ جانوروں کے ساتھ بھی اسے بسا اوقات کسی نہ کسی نوع کے تعلق سے واسطہ پیش آتا ہے۔ مثلاً اس نے گائے، بھینس، مرغیاں، کبوتر، بکریاں وغیرہ پال رکھی ہیں۔ یا ایک بلی اس کے یہاں آتی جاتی ہے یا ایک کتا اس کے دروازے کی چوکیداری کرتا ہے۔ انسان و حیوان کے ان تمام تعلقات میں اسلام نے واضح ہدایات دی ہیں اور انھی ہدایات پر عمل کرنے کا نام حسن اخلاق ہے

جب ایک انسان کا دوسرے انسان یا جانور سے حسن اخلاق برتنا اسلام میں محمود ٹھیرا تو یہ بات خود بخود بدیہی و بنیادی

ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان کا جو تعلق اپنے مالکِ خالق سے ہے اس کی رو سے جتنے بھی فرائض انسان پر عائد ہوتے ہیں ان سب کو ٹھیک طور پر ادا کرنا حسنِ اخلاق کا بنیادی پتھر ہے۔ ایک انسان یا جانور کو ایذا دینا، ان کا دل دکھانا، ان کا حق مارنا اگر بداخلاقی اور ظلم ہو سکتا ہے تو اللہ اور رسول کو ناراض کرنے، انھیں اذیت دینے اور ان کی ہدایات کو نظرانداز کر دینے سے بڑھ کر بداخلاقی اور ظلم کیا چیز ہو سکتی ہے۔

اسی لئے یہ کلیہ یاد رکھئے کہ انسانوں اور حیوانوں کے ساتھ نرمی، ایثار، دوستی اور محبت کا کوئی بہتر سے بہتر سلوک بھی اسی وقت حسن اخلاق میں شمار ہو سکتا ہے جب وہ اللہ اور رسولؐ کی ناراضگی کا باعث نہ ہوگا۔ اگر کسی عزیز، دوست، یا کسی حیوان کے ساتھ آپ اس نوع کا حسن سلوک برتتے ہیں جو عام دنیا وی نقطۂ نظر سے تو اوصاف حسنہ کے ذیل میں آتا ہو لیکن فی الحقیقت وہ اللہ اور رسولؐ کی تعلیم و ترغیب کے خلاف ہو تو اسلام کی نظر میں بداخلاقی ضمیمہ میں شامل ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے اندمالِ زخم کے لئے نشتر کا استعمال کرتے ہوئے آدمی اپنی شہ رگ کاٹ لے۔ یا یہ ایسا ہی ہوگا جیسے آپ بخار اور نزلے کا علاج ایسی دوا سے کرنے لگیں جو اختلاج یا سوءِ ہضم پیدا کرنے والی ہو۔

مثال کے طور پر آج کی تہذیب میں یہ بات اخلاق کے خانے میں رکھی جاتی ہے کہ میزبان اگر شراب پیش کرے تو اسے قبول کرنا چاہئے۔ یا وہ ناچ کرائے تو اسے خندہ پیشانی سے دیکھنا چاہئے۔ یا کوئی نامحرم عورت جسمانی سہارا چاہے تو اسے سہارا پیش کرنا چاہئے۔

بلکہ یورپ میں تو یہ تک اخلاق کا جزو لازم ہے کہ مہمان اپنی میزبان عورت کا بوسہ لے۔ اسی طرح بے شمار ایسے طریقے یورپ کیا اور ایشیا کیا ہر جگہ "اخلاق" کی حیثیت سے رائج ہو گئے ہیں جو اسلام کے ساتھ رواداری برتتے تو اسلام اخلاق نہیں بداخلاقی قرار دیتا ہے۔ نیکی نہیں برائی ٹھیراتا ہے۔

اس بنیادی نکتے کو قلب و دماغ میں اور زیادہ جاگزیں کرنے کے لئے چند مثالیں اور سامنے رکھ لیں۔

ایک شخص قتل کرتا ہے — اب ظاہر ہے اسے پھانسی پر لٹکا دینے سے مقتول تو زندہ نہیں ہو جائے گا۔ لہٰذا حسن اخلاق کا تقاضا بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے پھانسی دے کر ایک اور جان ضائع نہ کی جائے۔

لیکن قاتل کو معاف کر دینا اپنے مضمرات و ثمرات کے اعتبار سے نہایت خراب ہے، اس لئے دنیا نے اسے حُسنِ اخلاق، آئین اور اوصافِ محمودہ کے اعتبار سے پسندیدہ قرار پایا۔

یہی حال چوری، ڈکیتی، غصب، رشوت ستانی اور دیگر معائب کا ہے کہ ان کے مرتکبین کے ساتھ عفو و درگذر کا سلوک کرنا جرم و عیب قرار پایا اور انھیں قرار واقعی سزا دینا ہی حُسنِ اخلاق کے دائرے میں شمار کیا گیا۔

جب یہ شکل ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ افعال و حرکات تو ہرگز ہرگز حسنِ اخلاق کے دائرے میں نہیں آ سکتے جن کے نتیجے میں آخرت کا ہولناک عذاب طے کیا گیا ہو جن سے اللہ ناخوش ہوتا ہوا اور جن کے نتائج پایانِ کار دنیا میں بھی خراب ہی نکلتے ہوں۔

اصول کی حد تک دنیا ہم سے متفق ہے لیکن وہ چونکہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھی ہے اور آخرت کا کوئی واضح اور جاندار تصور اس کے ذہن و قلب میں نہیں ہے اس لئے وہ اخلاقی امور کی تشخیص و تعیین ان کی سطحی شکل و صورت سے کرتی ہے اور مادی اعتبار سے بھی وہ بالکل قریبی ثمرات و اثرات کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی عادی ہوتی جا رہی ہے، اسی لئے اخلاق کے معاملہ میں جا بجا اس کے اور اسلام کے نظریات میں بھاری فرق ہے۔ اسلام صرف مفاد عاجلہ اور فوری نتائج کا طالب نہیں۔ وہ دور تک دیکھتا ہے اور ایک ایسی زندگی پر اطمینان رکھتا ہے جس کے مقابلہ میں یہ دنیاوی زندگی ایک لمحۂ گریزپا سے زیادہ نہیں ہے۔

اصولی نکتے پر اتنی سطریں ہم نے اس لئے سپرد قلم کی ہیں کہ آپ ہر معاملہ میں خود بھی حسنِ اخلاق اور سوءِ اخلاق کی تمیز و تشخیص کر سکیں۔ اس دور میں خاص طور پر یہ آفت آ گئی ہے کہ بے شمار بداخلاقیوں کو حسن اخلاق کا نام دے دیا گیا ہے اور خود

ہمارے مسلمان معاشرے میں حسن اخلاق کے کتنے ہی مظاہر ایسے پائے جا رہے ہیں جو اپنے بطن میں خدا اور رسولؐ کی ناراضگی کا سامان چھپائے ہوئے ہیں۔ رواداری، نرمی، درگزر اور دلداری وغیرہ بے شک اخلاق حسنہ کی جزئیات ہیں، مگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کی حد بندی بھی ضروری ہے۔ ان اوصاف کو ایسے سمندر کی شکل دیدینا جس کی طوفانی موجیں کناروں کو بھی بہالے جائیں اسلام کی نظر میں معیوب و مذموم ہے۔

میزان

ترازو کسے کہتے ہیں یہ محتاج تشریح نہیں۔ قرآن و حدیث دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ انسانوں کے اعمال کو ترازو میں تولے گا اور دونوں پلڑوں میں بھلائیاں اور برائیاں رکھی جائیں گی۔

لیکن کیا یہ ترازو اسی شکل کی ہوگی جس سے ہماری نگاہیں آشنا ہیں یا اس کی کوئی اور شکل ہوگی ــ اس کا واضح جواب دینا انسان کے بس کی بات نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی عجیب و غریب اور خیال و قیاس سے بلند تر اشیاء کا تعارف ایسی تمثیلات سے کراتا ہے جنھیں ہم سمجھ سکیں لہٰذا بعید نہیں کہ میزان کی حیثیت محض تمثیل کی ہو اور جس شے سے انسانوں کے نیک و بد اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن ہوگا وہ فی الحقیقت ایسی ہو کہ ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی اس کا خاکہ نہ آسکتا ہو - زیادہ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بے شمار اعمال ایسے ہیں جو کوئی جسم، کوئی کمیت کوئی طول و عرض نہیں رکھتے ــ پھر جو اساسی شے اعمال کو مؤثر بناتی ہے وہ تو نیت ہے۔ اور نیت ایک کیفی شے ہے لہٰذا عین ممکن ہے کہ بھلائی اور برائی کے وزن، نسبت اور قدر و قیمت کی ٹھیک ٹھیک تعیین کے لئے اللہ نے کوئی ایسا طریقہ رکھا ہو جس کا ہم تصور بھی نہ کر سکیں - مگر چونکہ ترازو ہمارے دن رات استعمال کی چیز ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ وزن بتانے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتی - لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے کہ آخرت میں ہر ہر عمل کی قدر و قیمت سامنے آجائے گی، میزان کی تمثیل اختیار فرمائی۔

تاہم یہ مان لینے میں بھی کوئی استحالہ نہیں ہے کہ سچ مچ ترازو ہی کی شباہت رکھنے والی کوئی شے اللہ نے اعمال تولنے کے لئے تخلیق فرمائی ہو اور اعمال کو جسمانی اشکال میں تبدیل کر کے ان میں تولا جائے۔

ویسے اعمال کا مجسم کرنا بھی ضروری نہیں۔ ہم بندوں ہی نے جب گرمی، سردی، کھٹاس، مٹھاس اور بے شمار غیر کمی (جن کا کوئی جسم نہیں ہوتا) اشیاء کے لئے پیمانے اور میٹر بنالئے ہیں تو اللہ کو اعمال کی قدر و قیمت کا بے مثال بیرومیٹر بنا دینے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے جبکہ یہ بے ستون کا بیکراں آسمان اور پوری کائنات ہی اس نے کن فیکون کے اعجاز سے بنا دی ہے۔

حاصل یہ کہ اعمال کی ترازو کے بارے میں کسی بھی شخص کو اس ذہنی کھینچ تان ہی میں نہیں پڑنا چاہیے کہ وہ کس شکل کی ہوگی۔ اعمال کیسے تل سکیں گے۔ نیات و کیفیات کا وزن کیونکر ممکن ہے۔ وغیر ذلک۔ یقین کرنے کی بات صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہم دنیا میں کر گئے ہیں وہ فضا میں تحلیل نہیں ہو گیا بلکہ نکتہ نکتہ محفوظ ہے اور اس کا حساب کتاب ہمیں آخرت میں دینا ہے۔

مرزا غالب خوب کہہ گئے ہیں :-

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

اخلاق کا اصطلاحی مفہوم

جیسا کہ سطور بالا سے معلوم ہوا حقیقتاً تو اخلاق کے مفہوم میں تمام عبادات بھی داخل ہیں بلکہ عبادات کو راس الاخلاق اور اُمّ الاخلاق سمجھئے۔ لیکن جب یہ ایک اصطلاح کی حیثیت سے بولتے ہیں تو اس کا مفہوم ہوا کرتا ہے تمدنی تعلقات میں نرمی، شفقت، مروت، ایثار، رواداری اور فیاضی برتنا اور تمدن کے ذیل میں صرف

انسانی تعلقات ہی نہیں آتے، بلکہ حیوانات کو بھی یہ دائرہ شامل ہے۔ ایک کتے کو آپ بے دردی سے ماریئے، ایک بلی کو بھوک سے بے حال دیکھتے ہوئے یوں ہی گزر جائیے۔ ایک فاختہ پال کر اس کے چگنے کا ٹھیک انتظام نہ کیجئے اسے بھی اسلام اتنی اہمیت دیتا ہے کہ آپ کو آخرت میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ آپ کے نامۂ اعمال میں یہ اخلاقیاں درج ہو جائیں گی۔ کیا آپ نے نہیں سنا اللہ کے رسولؐ نے اطلاع دی ہے کہ ایک عورت کو اس جرم میں اللہ نے مبتلائے عذاب فرمایا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ کر رکھا تھا اور کھانے پینے کو نہیں دی تھی جس کے نتیجے میں بلی مرگئی۔ اور کیا آپ نے نہیں سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر کے مطابق ایک نہایت بدقماش عورت کو اللہ نے صرف اس حسن اخلاق کے صلہ میں بخش دیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا دیا تھا۔

حاصل یہ ہے کہ اخلاق کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اسلام کی اخلاقی قدریں غیر اسلامی طرز فکر کی طرح اضافی نہیں ہیں۔ تہذیب و تمدن کے دنیاوی نظریات میں تو اخلاق کا معیار بدلتا رہتا ہے۔ مگر اسلام میں یہ معیار نہیں بدلتا۔ کیونکہ اسلام انسانی فکر و ذہن کی صفت نہیں ہے بلکہ اس خالق کائنات کا دین ہے جس کی سنت میں تبدیلی محال ہے۔

(۲)

عن ابی ھریرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال:۔ انما بعثت لاتمم صالحی الاخلاق (اخرجہ البخاری فی الادب المفرد واحمد وحاکم)

ترجمہ:۔ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میں اس لئے مبعوث کیا کیا گیا ہوں کہ پاکیزہ و محمود اخلاق کی تکمیل کروں۔

تفہیم:۔ جیسا کہ اس باب کی تمہید سے واضح ہو چکا۔ یہ حدیث بھی تصریح کرتی ہے کہ اسلام میں "اخلاق" کا مفہوم اس مفہوم سے زیادہ وسیع ہے جس کے لئے یہ لفظ عام طور پر مستعمل ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے جن اعمال و عقائد کی تلقین کی اور جن سے روکا چاہے وہ اصطلاحی عبادات کے دائرے کے ہوں چاہے سیاست و اقتصاد اور صنعت و تجارت کے، ان کا تعلق اخلاق ہی سے ہے۔

اتمام کسی ایسی شئے کی تکمیل کو کہتے ہیں جو پہلے سے نامکمل شکل میں موجود ہو۔ معلوم ہے کہ تمام ہی آسمانی مذاہب پاکیزہ اخلاق کی تعلیمات پر مبنی رہے ہیں لیکن وہ چونکہ آفاقی اور دائمی نہیں تھے اس لئے ان کے نظام اخلاق کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس درجہ کمال کو پہنچایا تھا جتنا کسی آفاقی و ابدی مذہب کے نظام اخلاق کو ہونا چاہیئے۔ اصلاً یہ تمام مذاہب بھی اسلام ہی تھے۔ اسلام سپردگی اور تسلیم و انقیاد کو کہتے ہیں۔ اللہ نے جو مذہب بھی جس وقت نازل کیا اس کا اصطلاحی نام چاہے نصرانیت رکھ لیا گیا ہو یا یہودیت لیکن اللہ کا مطالبہ یہی تھا کہ اللہ کے بندے خود کو مرضیاتِ الٰہی کے تابع بنا دیں اور اس اخلاق کو اختیار کریں جو اللہ کو پسند ہے۔

لیکن اصطلاحاً اسلام صرف اسی دین کا نام ہے جو آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے دنیا کو ملا اور یہ چونکہ ہر اعتبار سے مکمل، ابدی اور ہمہ گیر تھا اس لئے اسمیں پچھلے مذاہب کے محاسن اخلاق کو بھی سمو دیا گیا اور جن تکمیلی اضافوں کی ضرورت تھی ان سے مزین کر دیا گیا۔ اسی لئے یہ واضح اعلان بھی فرمایا گیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (مائدہ)	آج ہم نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کا تم پر اکمال فرما دیا اور ہم اس بات پر راضی ہوئے کہ دین کی حیثیت سے تم اسلام ہی قبول کرو۔

اور فرمایا گیا:۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ	دین اللہ کے نزدیک اسلام

اَلْاِسْلَامُ (آل عمران) ہی ہے۔

اور فرمایا گیا:۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۔

تو کیا لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی دین ڈھونڈتے ہیں حالانکہ اسلام اختیار کئے ہوئے ہے (اطاعت و فرمانبرداری) ہر وہ شے جو آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی سے یا با دل ناخواستہ اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے

٭ ٭ ٭

اور فرمایا گیا:۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ

اور کوئی شخص سوائے اسلام کے کسی دین کو پسند کرے تو اللہ کی بارگاہ میں وہ ہرگز مقبول نہ ہوگا۔

٭ ٭ ٭

ان آیات کا ربط دیکھئے تو حسن اخلاق کے باب سے کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہے لیکن ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی یکتائی اور ناگزیر حیثیت کو ختم کرنے کے لئے بظاہر فریب پروپیگنڈہ بھی زور شور سے کیا جا رہا ہو کہ سبھی مذاہب حق ہیں کیونکہ سبھی کا مقصود خالق کی عبادت اور قلب و روح کا تزکیہ ہے — تو یہ بات ضروری ہے کہ ان آیات کو ہم اکثر و بیشتر دہراتے رہیں اور تمام دینوں کو یکساں حیثیت کے لغو و باطل پروپیگنڈہ سے ہمیں اعلیٰ وجہ البصیرت بیزاری قائم رہے۔

ذرا سوچئے تو ایک محدود منتشر چیز کو وسیع تر اور مربوط و مکمل کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ ایک رسولؐ بھیجتا ہے۔ ایک کتاب نازل کرتا ہے اور اہتمام کی انتہا یہ ہے کہ اپنی نازل فرمودہ پچھلی کتابوں کے برخلاف اس کی حفاظت و نگہداشت کا بھی وعدہ فرماتا ہے۔ پھر یہ رسولؐ طویل عرصہ تک آخری مکمل ترین دین کی تبلیغ و ترویج میں ایسے اسوۂ و کردار ایسی سیاست و تہذیب، ایسی امامت و قیادت کا مظاہرہ کرتا ہے جس کی کوئی نظیر تاریخ عالم میں موجود نہیں۔

اب اگر کچھ لوگ اس آخری کامل ترین دین کو اختیار کرنے سے گریز کرتے ہوئے پچھلے کسی دین سے لپٹے رہتے ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ ان کی دانست میں خالق و مالک کا مذکورہ فعل عبث ہی رہا۔ خالق تو کہے کہ مکمل اور لائق پذیرائی شئے میں اب تمہیں دیتا ہوں لیکن ہم کہیں نہیں صاحب آپ کی یہ شے اور ہماری ناقص شے یکساں ہی ہے ہمارا مقصود بہر حال آپ کی خوشنودی ہے اس لئے آپ پر لازم ہے کہ جس دین کو بھی ہم اختیار کریں اسے وہی قدر و قیمت دیں جو اسلام کو دے رہے ہیں! — العیاذ باللہ۔

حدیثِ باب یہ نکتہ بھی ابھارتی ہے کہ پچھلا کوئی بھی دین صرف اسی لئے لائق پرہیز نہیں ہے کہ اس کی کتابوں میں ردو بدل کر دیا گیا ہے اور وہ اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں رہا ہے بلکہ اس لئے بھی لائق پرہیز ہے کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں نامتمام ہے۔ اگر انجیل و توریت جوں کی توں موجود رہتیں اور قرآن کی طرح ان کا بھی کوئی شوشہ نہ بدلا جاتا تب بھی نزول قرآن اور بعثت محمدیؐ کے بعد اسلام ہی کو اختیار کرنا امر لازم ہوتا۔ دین کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ خالق و مالک جس عقیدہ و عمل کو پسند کرے اسے اختیار کر لو اور جسے ناپسند کرے اس سے دور بھاگو۔ انجیل، توریت، اور زبور اپنے اپنے زمانوں میں محض ایک ذریعہ رہی ہیں یہ جاننے کا کہ کسی فرد یا قوم کے لئے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کیا ہیں۔ بعد میں قرآن نازل ہوا تو یہ بھی اسی طرح ایک ذریعہ ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور تعلیمات خدا کی پسند و ناپسند معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جب صریح و محکم الفاظ میں تکرار و اصرار کے ساتھ بتا دیا گیا کہ اب اللہ کے نزدیک اسلام ہی کو قبول کرنا بندوں کا فرض ہے اور اسلام کے سوا کسی دین کو قبول کروگے تو اللہ تعالیٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے۔ پھر اس سے بڑھ کر بیہودہ اور نامعقول بات کیا ہو سکتی ہے کہ کسی اور دین کو اختیار کرنا بھی اتنا ہی درست سمجھا جائے جتنا اسلام کو اختیار کرنا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ

حاکم وقت کے تازہ احکام کو تو آپ نہ مانیں اور سینہ پر لگائے جائیں کہ پچھلے منسوخ شدہ قوانین ہی ہمیں پسند ہیں۔ حاکم کہے گا ہرگز نہیں۔ تازہ قوانین ہی تمہیں قبول کرنے ہوں گے ورنہ ہم تمہیں باغی اور سرکش قرار دیں گے۔ آپ کہیں کہ نہیں صاحب تازہ قوانین کو نہ مانتے اور پچھلے ہی قوانین کو سینے سے لگائے پھرنے پر بھی آپ ضرور ہم سے خوش ہوں گے۔ آپ ضرور ہمیں انعام دیں گے۔ آپ کے حکم سے سرتابی کر کے بھی ہم وفادار ہی کہلائیں گے۔ بغاوت و سرکشی کا الزام ہم پر عائد نہیں ہوگا۔

اگر یہ مضحکہ خیز موقف کسی کا ذہن قبول کر سکتا ہے تو شوق سے وہ ہر دین کو باعث نجات سمجھے۔ لیکن اگر اس کو قبول کرنا بغیر دھاندلی اور بے عقلی کے ممکن نہیں ہے تو پھر تنہا یہی دین واجب القبول رہ جاتا ہے جس کی یکتائی کا صریح بیان مذکورہ آیت میں ہوا ہے اور جس کے بارے میں حدیث مذکورہ بتا رہی ہے کہ وہ محاسن اخلاق کا ایک مکمل ترین مجموعہ ہے، جو شخص اسے نظر انداز کر کے کسی اور دین کو قبول کرے گا وہ مکمل کو چھوڑ کر نا تمام اور کامل کو چھوڑ کر ناقص چیز قبول کرے گا۔

ہو سکتا ہے کسی کے دل میں خیال گزرے کہ ناقص شے بہرحال کچھ نہ کچھ افادیت تو رکھتی ہی ہوگی۔ جتنا اس میں نقص ہے اسی کی مناسبت سے نفع میں کمی آسکتی ہے۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ اسلام اس ناقص شے کی افادیت سے بالکل منکر ہے اور غیر مسلم کو کافر قرار دیکر یکسر نجات ہی کے امکان سے خارج کر دیتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ اول تو بعض نسخوں میں ایک یا چند ہی اجزاء ایسے ہوتے ہیں جو دوسرے اجزاء کے ضرر رساں خواص کو مغلوب کر کے مفید خواص کی کارفرمائی کا موقع بہم پہنچاتے ہیں۔ آپ کسی حکیم ڈاکٹر سے مل کر تحقیق کریں۔ کتنے ہی نسخے ایسے نکلیں گے جو بعض مہلک امراض میں مفید ہیں لیکن ان کی یہ پوزیشن نہیں ہوگی کہ انھیں اگر ناقص حیثیت میں استعمال کر لیا جائے تو تھوڑا بہت فائدہ پھر بھی حاصل ہو۔ اس کے برخلاف بعض نسخوں میں صرف ایک یا دو دوائیں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انھیں نسخے سے خارج کر دیا جائے تو نسخے کا مزاج ہی تبدیل ہو جائے اور فائدے کی بجائے وہ ضرر رساں ثابت ہو۔

سائنسی تحقیقات نے یہ حقیقت بڑے وثوق کیساتھ واضح کر دی ہے کہ کسی فارمولے کا جو مزاج اور اثر اس کی مکمل شکل میں ہوتا ہے اس کا خاتمہ فارمولے کے صرف ایک ادنیٰ سے جز کو کم کر دینے پر بھی ہو سکتا ہے بلکہ بعض فارمولے ایسے ہیں جن کے متعدد اجزاء و عناصر سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کا مدار کسی ایک یا دو اجزاء پر ہوا کرتا ہے۔ اگر یہ اجزاء نہ شامل کئے جائیں تو نتائج بالکل الٹے بھی نکل سکتے ہیں اور تریاق زہر بھی بن سکتا ہے۔

دوسرے پچھلی تمام آسمانی کتابوں میں تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ یہ یقین کرنا سخت مشکل ہے کہ ان کا کونسا حصہ آسمانی ہے اور کونسا تحریف زدہ۔ اس صورت میں سرے سے یہی اطمینان محال ہے کہ جس تمام مجموعے کو ہم دین خیال کر رہے ہیں وہ فی الاصل ایسا ہے بھی کہ اس کے اجزاء کو دینی اجزاء کہا جا سکے۔ نسخے کی دس دواؤں میں سے دو کم کر کے باقی آٹھ کے بارے میں کبھی یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہ ہو کہ یہ اصلی ہیں یا نقلی۔ یہ وہی ہیں جو مطلوب ہیں یا ان کے دھوکے میں ہم اور ہی گھاس پھونس جمع کئے بیٹھے ہیں تو پھر نقص سے بڑھ کر بات خطرناک اشتباہ اور فریب خوردگی کے مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔

تیسرے یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ کسی قانون و دستور کی پچاس دفعات کو آپ تسلیم کریں مگر صرف ایک دفعہ سے انکار کر دیں تو آپ باغی قرار پائیں گے اور اگر آپ اس بنیاد ہی کو تسلیم نہ کریں جس پر دستور کی عمارت کھڑی کی گئی ہے تو پھر آپ کامل طور پر منکر دستور

قرار پائیں گے۔ چاہے آپ دستور کی بعض دفعات سے اتفاق رکھنے کا اعلان پر اعلان ہی کرتے رہیں۔ یہی حال اسلام کا بھی ہے۔ وہ اس شخص کو کلی طور پر کافر قرار دیتا ہے جو اسلامی دستور کی اس بنیاد سے انحراف اختیار کرے کہ پسندیدہ وہ ہے جسے خدا پسندیدہ قرار دے اور برا وہ ہے جسے خدا برا ٹھیرائے اس بنیاد سے انکار رکھنے کے بعد آدمی اگر سراپا زہد و ورع بن جائے تب بھی وہ کافر ہی رہے گا۔ کیونکہ اس کے زہد و ورع کی بنیادیں جذبۂ اطاعت پر نہیں خود سری پر ہیں۔

الحاصل حدیث بالا کا نچوڑ یہ ہے کہ گذشتہ مذاہب میں پاکیزہ اخلاق کے جو اجزاء تھے انھیں اللہ نے اسلام میں جمع کر دیا ہے اور جس اضافے، جس زینت و آرائش اور جس تہذیب و تکمیل کی ضرورت تھی اس سے بھی اسلام کو آراستہ فرما دیا ہے۔ اب اللہ کی رضا حاصل کرنے کا واحد ——— قطعی طور پر واحد راستہ اسلام کا راستہ ہے۔ اکیلا ——— لاشریک کا راستہ

یہ ملحوظ رہے کہ اقوام عرب قبل اسلام بھی متعدد اخلاقی اوصاف میں نہایت ممتاز تھیں۔ مہمان نوازی، پاس عہد، دوستداری، شجاعت وغیرہ میں ان کا جواب نہیں تھا لیکن پچھلے مذاہب کی تعلیمات جتنی جتنی محو اور مسخ ہوتی گئیں جہالت اور بداخلاقی اتنی ہی اتنی ان میں راہ پاتی گئی۔ بعض اعلیٰ اخلاق اگرچہ جوں کے توں موجود رہے لیکن بہت سے رذائل نے بھی راہ پالی اور ان کی زندگی بہترین اور بدترین اخلاق کا ملغوبہ بن گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آخری پیغمبر کو مبعوث فرمایا تاکہ محاسن اخلاق کو مزید تقویت حاصل ہو، اور اخلاق مٹا دیئے جائیں۔

تکمیل اخلاق کا جہاں یہ مطلب ہے کہ بعض نئی اخلاقی قدریں عطا کی جائیں اور بعض نئے آداب و مراسم سے آشنا کیا جائے وہاں تکمیل اخلاق کا مطلب یہ بھی ہے کہ مذموم اخلاق کی نشاندہی کر کے انھیں ختم کیا جائے۔ اچھے اخلاق کے ساتھ برے اخلاق کا موجود ہونا ایسا ہی ہے جیسے مریض مفید دوائیں کے ساتھ بد پرہیزی بھی کرتا رہے۔ دوا کتنی ہی اکسیر ہو لیکن اس میں نقصان دہ اجزاء بھی شامل کر لئے جائیں یا اس کے ساتھ ضرر رساں غذاؤں کا بھی استعمال ہو تو نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جہاں محاسن اخلاق کے بعض ترقی یافتہ آداب کئے وہیں برے اخلاق کی بیخ کنی بھی فرمائی تاکہ محاسن اخلاق اپنے حقیقی اثرات و ثمرات پیدا کریں گویا ترقی یافتہ اخلاقی قدریں عطا کرنے کا مثبت کام اور برے اخلاق کی بیخ کنی کا سلبی طرز عمل ——— دونوں ہی "اتمام اخلاق" کے اجزاء ہیں۔

ہماری اس تطویل کا منشاء دراصل اس پہلو کو واضح کرنا ہے کہ اسلام صرف ایک مثبت اور ایجابی ہی عمل نہیں، منفی اور سلبی بھی ہے ——— جو لوگ صرف معروفات کی تبلیغ اور فرائض و واجبات کی تعمیل میں مگن رہنے کو کافی سمجھتے ہوئے منکرات کی بیخ کنی اور طاغوتی قوتوں کی سرکوبی پر توجہ نہیں دیتے وہ اسلام کا پورا حق ادا نہیں کرتے، ان کی مثال اس طبیب کی سی ہے جو دوا تو اچھی تجویز کرے لیکن پرہیز کا سبق نہ دے۔ یا ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو تخم تو اچھا بوئے اور پانی بھی ڈٹ کر دے لیکن زمین کو روڑوں اور پتھروں سے صاف نہ کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی ایک ایک نص صراحتہً یا اشارۃً یہ سبق دیتی ہے کہ محاسن اخلاق کو دانتوں سے پکڑنے کے ساتھ ساتھ ذمائم اخلاق اور منکرات و معاصی کو فروغ دینے والی طاقتوں سے بھی برسر پیکار رہنا برابر کا اسلامی فریضہ ہے ہمارے زمانے میں خالص ایجابی ابلاغ و تبلیغ کو ایک سنجیدہ علمی طریق کہا جاتا ہے اور باطل پر نقد و جرح کو عموماً انتشار پسندی اور فتنہ پردازی کا نام دیا جاتا ہے ہمیں اس سے اس حد تک تو اتفاق ہے کہ نقد و جرح اشتعال، تضحیک اور ترش و تلخ اسلوب پر مشتمل نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن اس سے اتفاق نہیں ہے کہ محض ایجاب و اثبات سے واسطہ رکھا جائے مذموم و باطل نظریات و تصورات پر نشتر نہ لگائے جائیں۔ جس دین کا

پہلا ہی کلمہ لا الٰہ سے شروع ہوتا ہے۔ اس دین کا حق خدمت ادا ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ احقاق حق کے ساتھ ابطال باطل کا فریضہ بھی استقلال و قوت کے ساتھ نہ ادا کیا جائے۔ باغ لگانا ہے تو زمین کو روڑوں سے بھی صاف کرنا ہوگا۔ عمارت بنانی ہے تو کھنڈر کے در و بام ضرور ڈھانے ہوں گے۔ بنیادیں بھی کھودنی ہوں۔ باطل نظریات پر جرح و تنقید، ایوان حق کی تعمیر کے لئے بنیادیں ہی کھودنے کے مرادف ہے، بغیر بنیادوں کے عمارت کھڑی کرو گے تو کے دن چلے گی، اور کتنی اونچی جاسکیگی

(۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں :-

لم یکن النبی صلے اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا وکان یقول خیارکم احسانکم اخلاقا (بخاری۔ مسلم۔ ترمذی)

ترجمہ :- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو خود بد اخلاق تھے نہ بد اخلاقی کو پسند فرماتے تھے۔ آپؐ کا کہنا تھا کہ تم میں سے بہتر وہ ہیں جن کے اخلاق عمدہ ہوں۔

تفہیم :-

فحش کاری کا اطلاق ننگے پن، بے حیائی اور فسق و فجور پر تو خصوصیت سے ہوتا ہے لیکن عمومیت کے ساتھ اس کے ذیل میں ہر طرح کی بد اخلاقی داخل ہے۔ مثلاً ہم مہمان کے ساتھ کھلی بے مروتی برتیں۔ بزرگوں کے ساتھ بے توقیری سے پیش آئیں، چھوٹوں کے ساتھ سنگدلانہ سلوک کریں یہ سب فحش میں داخل ہوگا۔ جن اعمال و افعال کو اسلام نے صاف طور پر ناپسندیدہ قرار دیا ہے ان کا ارتکاب کرنا فحش کاری ہے۔ ضروری نہیں کہ عام دنیاوی اصطلاح کے اعتبار سے بھی اس میں ننگا پن ہو۔

اللہ کے رسول سراپا اخلاق تھے اور یہ ایسا عقیدہ نہیں جو بطور حسن ظن قائم کر لیا گیا ہو بلکہ اس پر حضورؐ کی حیات مقدسہ کا ایک ایک لمحہ شاہد عادل ہے۔ عبادات ہوں یا معاملات، سیاست ہو یا تجارت۔ حضورؐ ہر میدان میں مجسمۂ اخلاق ہی نظر آئیں گے۔ حق یہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے لفظی شکل میں حضرت جبریلؑ کے ذریعہ اتارا تھا اسی کے مفہوم و معنی کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی ہئیت میں تخلیق فرما دیا تھا۔ قرآن کے معانی کو ٹھوس اور محسوس شکل و صورت میں جسے دیکھنا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتؐ کردار کا مطالعہ کرے۔ اس شخص سے زیادہ بدبخت، بیہودہ اور گمراہ کوئی شخص نہیں ہو سکتا جو قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے حضورؐ کے اقوال و افعال کو نظر انداز کر دے۔

ظاہر ہے حضورؐ جب خود سراپا اخلاق تھے تو دوسروں کو بد اخلاق دیکھنا کیسے پسند کر سکتے تھے۔ آپ نے مختلف پیرایوں میں متعدد بار یہ بات دہرائی ہے کہ تم میں سے وہی زیادہ بہتر ہے جس کا اخلاق زیادہ اچھا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق اور تقویٰ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ اللہ نے فرمایا اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ تم میں سے جو شخص زیادہ متقی ہے وہی اللہ کے نزدیک زیادہ معزز ہے۔ حضورؐ نے تقوے کی تعبیر لفظ اخلاق سے کی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں ہر وہ فعل و قول بد اخلاقی میں شامل ہے جو اللہ اور رسولؐ کو ناپسندیدہ ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضورؐ بطور دعا فرمایا کرتے تھے :-

اَللّٰھُمَّ حَسَّنْتَ خَلْقِیْ	اے اللہ! آپ نے میری پیدائش
فَاَحْسِنْ خُلُقِیْ ۔	اچھی کی تو میرے اخلاق کو بھی اچھا
(رواہ احمد)	بنا دیجئے۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو چلتے وقت متعدد نصیحتیں فرمائیں اور سب سے آخر میں یہ نصیحت فرمائی :-

یَا مُعَاذُ اَحْسِنْ خُلُقَکَ لِلنَّاسِ ۔	اے معاذ عوام کے لئے اپنے اخلاق کو بہتر رکھنا۔

یہ مختصر سی نصیحت معنوی اعتبار سے نہایت جامع ہے اور چونکہ اسلامی اصطلاح کے مطابق اخلاق کے دائرے میں عدل، مروت، ادائگی حقوق اور اچھے کاموں میں معاونت

شامل ہے۔ اس لئے ایک ایسے شخص کے لئے جسے حاکم بنا کر بھیجا جا رہا ہو اس سے بہتر اور بڑھ کر نصیحت کوئی نہیں ہو سکتی جو حضورؐ نے فرمائی۔ تمام نصیحتوں کے آخر میں اسے ارشاد فرمانا یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اس نصیحت کو بنیادی سمجھا جائے اور ذہن میں جاگزیں کر لیا جائے۔

حضورؐ کو جامع الکلم کہا گیا ہے۔ ہمارا موضوع اس وقت حضورؐ کا کلام فصاحت و بلاغت نہیں لیکن تفہیم الحدیث کے قارئین کو چاہیئے کہ حضورؐ کے ہر ارشاد کو اس پہلو سے بھی ضرور دیکھا کریں کہ کس طرح آپ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بسیط و بلیغ معانی کو سمو دیا کرتے تھے اور بے ساختہ کہے ہوئے جملوں میں بھی کیسی بلیغ معنویت اور صنعت ایجاز ہوا کرتی تھی۔ بہت کم روایتیں ایسی ہیں جن میں حضورؐ کے الفاظ من وعن ہم تک پہونچے ہوں —— مگر جب پہونچ گئے ہیں تو ایسا ہی محسوس ہوا ہے جیسے قرآن ہی کے حسنِ بیان کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک نگینہ جگ مگ کر اٹھا ہو۔ اللہ اکبر۔ ایک اُمّی۔ جسے لکھنا اور پڑھنا کچھ نہیں آتا جب زبان کھولے تو ایسے پھول برسائے جن کی نظیر گلستان تقریر میں دور دور نہ مل سکے صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ علیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

ایک اور فصیح و بلیغ حدیث ملاحظہ کیجیئے۔ حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں:۔

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یا اباذر لا عقل کالتدبیر ولا ورع کالکفّ ولا حسب کحسن الخلق (مشکوٰۃ)	اے ابوذر نہیں ہے کوئی عقل مانند تدبیر کے اور نہیں ہے کوئی تقویٰ مانند باز رہنے کے اور نہیں ہے کوئی حسب مانند خوش خلقی کے۔

تدبیر کہتے ہیں ایسے طریق کار کو جس میں بعد میں نکلنے والے نتائج کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ بے شمار کام ایسے ہیں جن کے قریبی نتائج تو خوشگوار ہوتے ہیں۔ لیکن اس خوشگواری کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں ہوتی۔ انجام کار انسان سخت نقصان اٹھاتا ہے۔ علیٰ ہذا۔ بعض کاموں کے قریبی نتائج خوشگوار نہیں ہوتے۔ مگر پایانِ کار وہ نہایت عمدہ ثمرات لاتے ہیں

ہمارے زمانے میں جس انداز فکر نے پوری دنیا پر قبضہ جما لیا ہے وہ تدبیر کی عین ضد ہے۔ یعنی فوری لذت و منفعت پر نظر اور مآل سے لاپرواہی۔ بہت تیر مارا تو دس پانچ برس بعد کی بات سوچ لی۔ مگر موجودہ زندگی کے خاتمے پر جس نئی زندگی سے دوچار ہونا ہے اس کو دائرۂ خیال سے خارج ہی کر دیا گیا ہے حالانکہ اسلام کی نگاہ میں اصل زندگی وہی ہے جس کو بہتر بنانے کے لئے ہمیں دنیاوی زندگی میں تدبیریں کرنی ہیں۔ اس اُخروی زندگی کے علاوہ بھی اسلام کے تمام احکام میں دنیاوی زندگی کے دور رس نتائج و ثمرات کا خاص خیال رکھا گیا ہے مثلاً سود ہے۔ جوا ہے۔ مرد و زن کا اختلاط ہے۔ شہوانی محرکات ہیں۔ دولت کا غیر معتدل ارتکاز ہے۔ یہ امور فوری و ہنگامی لذت و منفعت کے لئے تو خوب ہیں۔ اسی لئے موجودہ دنیا ان کی دالہ و شیدا ہے۔ لیکن اخروی زندگی سے قطع نظر اسی دنیا میں ان امور کے نتائج اس قدر خراب ہیں کہ خود تہذیب نو کے شیدائی بھی ان نتائج پر سینہ کوبی کرتے رہتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ وہ جڑوں سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور ثمرات کا رونا روتے ہیں۔ اسلام فتنوں کی جڑوں پر کلہاڑا چلاتا ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں لا عقل کالتدبیر کا مطلب صاف ہو گیا۔ یعنی اعلیٰ درجہ کی عقل وہی ہے جو اپنے طریق کار میں قریب و دور کے تمام ثمرات و عواقب کا لحاظ رکھے نہ کہ وہ جو کہ مفاد عاجلہ پر ریجھ جائے اور بعید نتائج کی پرواہ نہ کرے۔ مسلمان کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کی موعظت یہی ہے کہ تدبیر سے غافل مت ہو یعنی ہر عمل کے تمام قریبی اور دور رس نتائج کو نظر میں رکھو۔ آج اگر سود یا جوے سے تم نے کوٹھیاں اور کاریں فراہم کر لی ہیں تو یہ عقلمندی کی بات نہیں کیونکہ نتیجے میں تمہیں عذاب الیم سے دوچار ہونا پڑے گا۔ عقلمندی کی بات یہ ہے کہ جو بھی عیش کمانا چاہو حلال ذرائع سے کماؤ۔ جو بھی عمل کرو وہ ایسا نہ ہو جس پر آخرت کا مواخذہ قائم ہو۔ چند روزہ زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ لینا اور بعد مرگ کی دائمی زندگی کو نظرانداز کر دینا پرلے سرے کی حماقت ہے۔ چاہے بنا ہوا ایسے لوگ

بقراط اور ارسطو ہی نظر آتے ہوں۔

ورع کا تکلف سے مراد یہ ہے کہ زہد و ورع ترک دنیا کو نہیں کہتے۔ خود ساختہ ریاضتوں سے خود کو ضیق میں ڈالنا ورع نہیں ہے۔ ورع اصل میں یہ ہے کہ جن امور سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے روکا ہے ان سے رکے رہو۔ حرام کے پاس مت پھٹکو۔ حلال پر جمے رہو۔ یہی ہے زہد و ورع اور اخلاق و تقویٰ۔ ایک شخص شب و روز عبادت کرتا ہے مگر ایک یا ایک سے زیادہ امور ناجائز سے بھی ملوث ہے تو اس کا زہد و ورع ناقص ہے۔ اس سے بڑھ کر وہ شخص زاہد و متورع ہے جو بہت زیادہ عبادت گذار تو نہیں، مگر ممنوعات شرعیہ سے اپنا دامن بچائے رکھتا ہو۔

(حسب محسن الخلق (حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی حسب و نسب نہیں) کا منشا ظاہر ہو رہا ہے مسلمانوں ہی کے جن حلقوں نے حسب و نسب کو مستقل ایک شرف بنا رکھا ہے۔ وہ دراصل ہندومت سے متاثر ہیں۔ اسلام میں حسب و نسب کی کوئی ایسی حیثیت نہیں ہے جیسی ہندومت میں اعلیٰ ذات کی ہے۔ قرآن اور حدیث بار بار واضح فرماتے ہیں کہ اصل انسانی شرف تقویٰ میں ہے۔ حسن خلق میں ہے۔ نیکی میں ہے۔ ایک نکوکار جلاہا، پٹھان، موچی، گھسیارا، غلام حبشی اس سید اور شیخ سے بہتر ہے جس نے بدکاری پر کمر باندھ رکھی ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ اور صحابہؓ کی نظر میں اُن قریشی اشراف کی حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں رہی جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ لیکن وہ معمولی حسب و نسب والے آنکھوں کا تارا بن گئے جنھوں نے اسلام قبول کر کے حسن عمل کا ثبوت دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سید نہیں تھے۔ لیکن امتِ محمدیہ کے ایک قابل لحاظ گروہ کو چھوڑ کر تمام سوادِ اعظم نے انھیں حضورؐ کے بعد سب سے بڑا انسان تسلیم کیا اور یہی سوادِ اعظم اس پر بھی متفق ہے کہ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سید ہونے کے باوجود حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے کم رتبہ ہیں۔ حضرت علیؓ جو نہایت قریبی نسبت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم نسب ہیں انھیں بھی امت تینوں خلفاء کے بعد ہی گنتی ہے پہلے نہیں۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ عظمت و فوقیت کا جو اصول قرآن و حدیث نے دیا تھا امت نے اسی کو رہنما بنایا اور ان لوگوں کی حیثیت اسلام کے باغیوں کی سی ہو جو حسب و نسب کو سب سے بڑا شرف قرار دینے کے درپے رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔

عن عمرو ابن شعیب عن ابیه عن جدہ انه سمع النبی صلے اللہ علیه وسلم یقول اخبرکم باحبکم الیّ واقربکم منّی مجلسًا یوم القیامة فسکت القوم فاعاد مرّتین او ثلاثًا قال القوم نعم یا رسول اللہ قال احسنکم خُلُقًا۔ (اخرجه احمد و ابن حبان)

عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "کیا میں تمہیں بتاؤں کہ قیامت کے دن کون مجھے محبوب ہوگا اور کون میری مجلس میں زیادہ قریب ہوگا مجھ سے؟" پس مخاطبین خاموش رہے۔ حضورؐ نے اسی بات کو دو یا تین مرتبہ دہرایا۔ تب مخاطبین نے کہا ہاں یا رسول اللہؐ ضرور بتائیے حضورؐ نے فرمایا تم میں سے وہ شخص جس کے اخلاق زیادہ بہتر ہوں۔

⁂ ⁂ ⁂

تفہیم :-

عمرو بن شعیب کے پردادا حضرت عمرو بن العاص ایک زبردست مدبر صحابی تھے۔ وہی اس حدیث کے راوی اول ہیں۔ حضورؐ کی عادت شریفہ تھی کہ اپنے اصحاب کے آگے وقتاً فوقتاً بشارتیں، وعیدیں، موعظت کی باتیں اور اہم نکات بیان فرماتے رہتے تھے۔ جب کسی بات پر زور دینا مقصود ہوتا تو یکلخت ارشاد فرمانے کی بجائے آپ سوالیہ انداز اختیار کرتے۔ سوالیہ انداز کا فائدہ یہ ہے کہ مخاطب پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے۔ روایت میں جو یہ بیان کیا گیا کہ قوم (حاضرین مجلس) خاموش رہی تو اس کا مطلب نعوذ باللہ یہ نہیں کہ اس نے ارشاد رسولؐ پر التفات ہی نہیں کیا

صحابہ جانتے تھے کہ اس طرح کا سوالیہ انداز حضورؐ اسی وقت اختیار فرماتے ہیں جب کسی خاص بات پر متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ عموماً یہ جواب دیا کرتے تھے کہ ہاں ہاں یا رسول اللہؐ ضرور ارشاد فرمائیے۔ لیکن اس طرح کی صورت چونکہ آئے دن پیش آتی رہتی تھی۔ اس لئے کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ صحابہؓ فرط توجہ میں رسمی اظہار آمادگی بھی بھول جاتے تھے اور سراپا گوش بن کر سماعت کیلئے تیار بیٹھتے تھے اس وقت بھی ایسی ہی صورت پیش آئی اہم باتوں کو مکرر اور سہ کرر فرمانا بھی حضورؐ کی عادتِ شریفہ تھی۔

قیامت کے دن جو وصف ایک مسلمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب بنا دے اور آپ سے قریب ترین کر دے اس کی رفعت و افادیت کا کیا ٹھکانا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص میں یہ وصف موجود نہ ہوگا وہ قیامت میں قرب حضورؐ سے بھی محروم ہی رہے گا۔

قرب کی نعمت بہت بڑی نعمت ہے۔ ایک شخص خوشگوار ہوا اور شامہ نواز خوشبو کے ماحول میں بیٹھا ہو۔ آپ اس کا قرب نصیب ہو جائے تو ہوا اور خوشبو سے آپ بھی لطف اندوز ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیشہ اللہ کی جو رحمتیں رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی وہ محتاج بیان نہیں۔ قیامت کے دن شدید گرمی، نفسا نفسی اور ہنگامے کا جو سخت ماحول ہوگا اس میں کسی شخص کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب سے فیضیاب ہو جانا بھی اتنی عظیم نعمت ہے جس کا تصور بھی مشکل ہے۔

خوش مزاجی، شگفتہ روئی، تبسم، شیریں زبانی، رحم و رافت، یہ سب اخلاق حسنہ کی نہ صرف شاخیں ہیں، بلکہ لوازمات میں سے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ میں یہ تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے اور امت کو بھی آپ نے ان کی ترغیب فرمائی ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں:۔

كان النبي صلى الله عليه وسلم ليخالطنا حتى يقول لأخ لي صغير يا ابا عمير ما فعل النغير؟ (مسلم۔ ابوداؤد ترمذی۔ ابن ماجہ۔ نسائی الادب المفرد)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم بچوں سے خوب گھل مل کر باتیں کرتے تھے یہاں تک کہ میرے بھائی سے پوچھا کرتے اے ابو عمیر تمہاری چڑیا کیا کدہی ہے؟

کمسن ابو عمیر کے پاس ایک چڑیا تھی جسے وہ گاہے گاہے ساتھ لئے باہر نکلتے تھے۔

نغیر "لال" کو کہتے ہیں۔ بعض علماء نے اسے بلبل کا مرادف بتایا ہے۔ لیکن صحیح تر "لال" ہی ہے۔ جب ابو عمیر بغیر لال کے ہوتے تو حضورؐ مذکورہ فقرہ ارشاد فرماتے۔ اس فقرے میں مزاح کا ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ نُغَیر اور عُمَیر ہم قافیہ ہیں۔ ایک بچے سے جب یہ الفاظ متبسم انداز میں کہے جائیں تو ذہن ان سے ایک کیفیت نشاط قبول کرتا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ فعل کی نسبت ابو عمیر کی طرف نہیں کی گئی یعنی یوں نہیں کہا گیا کہ ابو عمیر تم اپنی چڑیا کہاں چھوڑ آئے۔ بلکہ ایسے الفاظ کہے گئے۔ گویا معصوم چڑیا ابو عمیر کے ساتھ آنے نہ آنے کی مختار ہے۔ یہ بھی مزاح لطیف کا ایک معروف اسلوب ہے۔ منشاء اس روایت کو حسن اخلاق کے تحت ذکر کرنے کا یہ ہے کہ بچوں سے شفقت، ملاطفت اور پیار سے پیش آنا بھی اخلاقِ حسنہ ہی کے زمرے میں داخل ہے۔ ایک طرف حضورؐ کے رعب و ادب کا یہ عالم تھا کہ جری سے جری آدمی آپ سے آنکھ ملانے کی تاب بمشکل لا سکتا تھا۔ صحابہؓ کی نگاہیں آپ کے حضور جھکی رہتی تھیں اور کفار کے بڑے بڑے جیالے اور سورما آپ کے آگے پہنچکر ساری ہیکڑی بھول جاتے تھے۔ مگر دوسری طرف آپکی شگفتہ روئی، نرم گفتاری اور خندہ جبینی کمال کی تھی۔ بولتے تو پھول برستے، تبسم فرماتے تو آس پاس کی فضا ایک موج نور سے دمک اٹھتی۔ یہ شاعرانہ مدح سرائی نہیں ہے۔ حضورؐ کو واقعۃً اللہ تعالیٰ نے حسن و جمال کے ایسے زاویے عطا فرمائے تھے جن کی نظیر نہیں ملتی۔

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں:۔

جاء رجل الى النبي صلى الله	ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

انا حاملك على ولد ناقة قال يا رسول الله وما اصنع بولد ناقة؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم وهل تلد الابل الا النوق۔

(ترمذی۔ ابوداؤد احمد)

کی خدمت میں آیا اور عرض کیا مجھے سواری عنایت فرمایئے حضورؐ نے فرمایا میں تمہیں اونٹنی کے بچے پہ سوار کرادوں گا۔ یہ شخص حیران ہوکر بولا حضورؐ میں اونٹنی کے بچے کا کیا کروں گا؟ حضورؐ نے فرمایا ارے میاں اونٹ کو اونٹنی کے سوا کون جنتا ہے۔

خوش طبعی اخلاق حسنہ ہی کے ذیل میں تھی۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملا کہ جو لوگ لطیف قسم کے مزاح کو بھی سنجیدگی کے خلاف سمجھتے ہیں اور ناک بھوں چڑھائے بغیر بات کرنا پسند نہیں کرتے وہ غلطی پر ہیں۔ حضورؐ کا ہر وصف، ہر طبعی صلاحیت، ہر مذاق و رجحان پوری امت کے لئے معیار ہے۔ حجت ہے۔ جتنا صالح امتزاج حضورؐ کے اندر پایا جاتا تھا اس سے زیادہ کا تصور کسی بشر کیلئے ممکن نہیں۔ مناسب مواقع پر لطیف قسم کا مزاح لوگوں سے خندہ جبینی کے ساتھ پیش آنا، شیریں زبانی، تواضع، علم و رافت شفقت۔ یہ تمام اوصاف حسن اخلاق کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اور وہ لوگ بدنصیب ہیں جو ان کے متضاد اوصاف میں سے کسی وصف کو پسندیدہ قرار دیتے ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا بعض لوگ ہمہ وقت تیوری چڑھائے رکھتے ہیں۔ ان کو سلام کیجئے تو جواب ایسی گھٹی ہوئی، مردار آواز میں دینگے جیسے انھیں ہونٹ اور حلق استعمال کرنے میں بڑی مشقت اٹھانی پڑی ہو۔ بعض لوگ گفتگو کرتے وقت پیشانی پر بل ڈالنے کے عادی ہوتے ہیں۔ خد و خال سے ترشی اور بیزاری ٹپکتی رہتی ہے۔ نظروں کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے مخاطب کو بہت حقیر سمجھ رہے ہوں۔ یہ سب طریقے اور حرکتیں عدالتی سطح کا جرم نہ سہی لیکن ایمان و اسلام کے رخ سے یقیناً معصیت ہیں۔ رسول اللہؐ کے اسوۂ و کردار کے خلاف ہیں۔ ہمیں ہر معاملہ میں حضورؐ ہی کے نقش قدم پر چلنا چاہئے یہی سب سے بڑا شرف، سب سے بڑی شائستگی، سب سے بڑھ کر معیاری طریق ہے۔

واللہ الموفق

(بقیہ بسم اللہ کی علمی و فقہی حیثیت) از صـ ۳۴

صحابہ میں عبداللہ بن معقلؓ بھی انھیں لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کا جہر یا بسملہ نہ کرنا ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ علماء و فقہاء کو فردوس کی نعمتوں سے نوازے ان کی آراء اور عقائد بہرصورت لائق احترام ہیں اور ہم یا آپ ترجیح چاہے ابوحنیفہؒ کو دیں یا مالکؒ کو یا کسی اور کو لیکن خاطی و عاصی ان میں کوئی نہیں۔ بسم اللہ کو کسی سورۃ کا سوائے نمل کے جزو نہ ماننا بلکہ مستقل آیت قرآنی قرار دینا ہمارے نزدیک چاہے کتنا ہی مناسب و موزوں ہو لیکن جو لوگ اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں وہ بھی حق پر ہی ہیں اور ہرگز جائز نہیں کہ کوئی بھی فریق اپنی رائے کی صحت پر ضد اور اصرار کرے اور دوسرے فریقوں کو ہدف ملامت بنائے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے بسم اللہ کا جزو قرآن نہ ہونا اگرچہ ایک بعید از قیاس سی رائے ہے اور سوائے امام مالک اور ان کے بعض متبعین کے شاید ہی کسی نے یہ رائے ظاہر کی ہو۔ لیکن درمختار وغیرہ میں تصریح کر دی گئی ہے کہ جو شخص بسم اللہ کے جزو قرآن ہونے کا انکار کرے اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

حالانکہ قرآن کے ایک لفظ اور حرف تک کا انکار کفر صریح ہے۔ لیکن امام مالک جیسا بلند مرتبہ فقیہ و علامہ جب بسم اللہ کو جزو قرآن نہیں مانتا تو فراخ دلی اور وسعت نظر ہی کا تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ اس قول کا بھی جواز تسلیم کیا جائے جب کہ ازروئے دلائل اس کی گنجائش موجود ہے۔ ہاں اگر کوئی سورۂ نمل میں بھی بسم اللہ کو جزو قرآن نہ مانے تو اس کی تکفیر میں کوئی تأمل نہیں کیا جائے گا۔

هذا ما عندي والعلم عند الله وعلمه اتم۔

حضرت مولانا عامر عثمانی صاحبؒ

بسم اللہ کی علمی و فقہی حیثیت

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ بسم اللہ سورۂ نمل میں جزوِ قرآن ہے اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لہٰذا آگے کی بحث کا تعلق اس متفق علیہ بات سے بالکل نہیں ہے۔

اختلاف اس میں ہے کہ یہ جو ہر سورت بسم اللہ سے شروع کی جاتی ہے اس کی کیا حیثیت ہے

(۱) بعض حضرات کی رائے ہے کہ بسم اللہ ہر سورت قرآنیہ کا جزو ہے، اس رائے کے حاملین میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔ علی بن ابی طالب، ابن عباس، ابن عمر، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم اور سعید بن جبیر، عطا، ابن المبارک، اسحاق زہری، محمد بن بن کعب اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم۔

امام احمد کے دو قولوں میں سے ایک قول اسی کا آئینہ دار ہے، اور امام شافعی کا بھی جار بایۂ متأخر قول ایسا ہی ہے مکے اور کوفے کے قرا اور فقہا یہی رائے رکھتے ہیں۔

(۲) بعض حضرات کا خیال ہے کہ بسم اللہ کسی بھی سورت قرآنی کا (سورۂ نمل کو چھوڑ کر) جزو نہیں بلکہ آیت مستقلہ ہے جو سورتوں میں فصل کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے اور اس سے آغاز کرنا بہت متبرک ہے۔ اس خیال کے بعض حاملین کے نام یہ ہیں:۔

اوزاعی، ثوری، مالک، ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم۔ صحابہ میں جن کا یہ خیال رہا ہو ان کے اسمائے گرامی اگرچہ ان مفسرین نے صاف صاف ذکر نہیں کئے جن کی تفسیروں پر اس وقت ہماری نگاہ ہے، لیکن بالواسطہ دلیل سے جو صحابہ اس خیال کے حامل معلوم ہوتے ہیں ان کا ذکر آگے آتا ہے۔

(۳) کچھ حضرات یہ گمان کرتے ہیں کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے۔ امام شافعی کا قدیم و متقدم قول اسی کے مطابق ہے لیکن شافعی محققین اسے "قول غریب" کہتے ہیں اور ان کے نزدیک امام شافعی کی وہی رائے ہے جو اوپر بیان ہوئی یعنی بسم اللہ ہر سورت کا جزو ہے۔

شوافع کے نقطۂ نظر کی تائید کرنے والی اکثر تفاسیر میں (مثلاً ابن کثیر اور فتح البیان) اس بات پر خصوصیت سے زور دیا گیا ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے، دلائل عقلی بھی دیئے گئے ہیں اور بہت سی روایات بھی جمع کی گئی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ اگر یہ قطعی اور یقینی ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ سلم جہری نمازوں میں فاتحہ کے ساتھ بسم اللہ بھی زور سے پڑھا کرتے کیونکہ کوئی ضعیف ہے۔ ضعیف روایت بھی ایسی نہیں پائی جاتی جو یہ اطلاع دے سکے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کا کوئی جز چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ تب حضورؐ کا الحمد سے قرات شروع کرنا واضح کرتا ہے کہ بسم اللہ کی اور حیثیت چاہے کچھ ہو لیکن جزو فاتحہ بہرحال نہیں ہے۔ قرات فی الصلوٰۃ میں ترک بسم اللہ کی روایات ایسی مضبوط اور ثقہ ہیں کہ دوسری تمام روایات باعتبار فن ان کے پائے کی نہیں۔ چنانچہ خود مذکورہ مفسرین کو اس کا اعتراف ہے۔ مثلاً ہندوستان کے قابل فخر عالم حضرت نواب صدیق حسن صاحب اپنی تفسیر فتح البیان میں اعتراف کرتے ہیں کہ ترک بسم اللہ کی روایات مقابلۃً اصح ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يفتتح الصلوٰة بالتكبير والقراءة بالحمد لله رب العالمين ۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی ابتداء تکبیر سے اور الحمد للہ رب العلمین کی قراءت سے کرتے تھے ۔

بخاری و مسلم میں حضرت انس سے روایت ہے ۔

صليت خلف النبي صلى الله عليه وسلم وابي بكر وعمر وعثمان فكانوا يستفتحون بالحمد لله رب العالمين ۔	میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر اور عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم) کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں ، وہ سب الحمد للہ رب العلمین سے قراءت نماز کی ابتداء کرتے تھے ۔

❊ ❊ ❊

ان روایات صحیحہ ثابتہ کے بعد یہ دعویٰ محل نظر ہی رہیگا کہ بسم اللہ سورت فاتحہ کا جزو ہے خواہ کتنے ہی دلائل عقلی و نقلی جمع کر لئے جائیں ۔ ہم صرف تقلیداً ہی نہیں تحکر و تجزیہ کے بعد امام اعظم کی رائے کو اقرب الی الصواب خیال کرتے ہیں کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا جزو نہیں ۔ البتہ ایک آیت مستقلہ ہے جو قرآن ہی کا جزو ہے ۔ لہذا پورا قرآن ختم کرنے والے کو (سورۃ نمل کے علاوہ بھی ایک بار کہیں نہ کہیں بسم اللہ پڑھ لینی چاہئے ۔

درمختار میں ہے :-

(وهي آية) واحدة (من القرآن) كله انزلت للفصل بين السور فما في النحل بعض آية اجماعا (وليست من الفاتحة ولا من كل سورة) في الاصح الخ ۔ ص۳۴۴ مصری ۔	اور بسم اللہ کل قرآن کی ایک آیت مستقلہ ہے جو سورتوں میں فصل کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے بس سورۂ نمل میں تو متفقہ طور پر جزو آیت ہے اور صحیح ترین قول کے مطابق سورۂ فاتحہ یا کسی اور سورت کا جزو نہیں ہے ۔

کشاف اور تلویح کے حواشی پر امام ابوحنیفہ رح کا مسلک یہ ذکر کیا گیا ہے کہ بسم اللہ جزو قرآن نہیں ہے لیکن اکثر علمائے احناف کے نزدیک یہ قول ضعیف ہے اور صحیح وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ۔ یعنی جزو قرآن ضرور ہے ۔ ہاں کسی صورت کا جزو نہیں ہے ۔ چنانچہ قہستانی نے کہا ہے کہ جزو قرآن نہ ہونے کا قول ضعیف ہے اور مذہب ابوحنیفہ میں اس کا اندراج محل کلام ہے ۔

امام مالک اور بعض احناف کا خیال یہ ہے کہ بسم اللہ سرے سے جزو قرآن نہیں ہے (سوائے نمل کے) چنانچہ امام مالک کے بارے میں تو تصریح یہ ہے کہ وہ نماز میں آہستہ سے بھی بسم اللہ پڑھنا ٹھیک نہیں سمجھتے تھے ۔ کیونکہ جب وہ جزو قرآن ہی نہیں تو الحمد سے قبل اسے کیوں پڑھا جائے ۔

شامی نے اس خیال کا رد کرتے ہوئے فیصلہ دیا ہے کہ وهي آية (بسم اللہ قرآن ہی کی ایک آیت مستقلہ ہے)

حاصل کلام یہ ہے کہ بسم اللہ کو اگر سورۂ فاتحہ کا جزو مانا جائے جیسا کہ ابن کثیر اور فتح البیان وغیرہ میں بہت سے صحابہ و تابعین کا عقیدہ نقل کیا گیا ہے تو لازماً یوں کہنا ہوگا کہ جہری نمازوں میں الحمد سے قبل بسم اللہ بھی زور سے پڑھی جائے ۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور تین خلفائے راشدین کا عمل تو ماقبل میں ذکر کردہ حدیث بخاری و مسلم سے معلوم ہوا کہ وہ بسم اللہ زور سے کبھی نہ پڑھتے تھے اور ابن کثیر نے " الخلفاء الاربعة " کے الفاظ لکھے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی کا عمل بھی یہی تھا تب یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف حضرت علی کا یہ عمل تھا اور دوسری طرف بعض مفسرین حضرت علی کو ان لوگوں میں شمار کراتے ہیں جن کی رائے یہ رہی ہے کہ بسم اللہ ہر سورت کا جزو ہے ۔ اس کا تو مطلب یہ ہونا چاہئے تھا کہ حضرت علی بحالت امامت نہ صرف الحمد کے ساتھ بسم اللہ زور سے پڑھتے بلکہ ہر سورت کے قبل بھی ایسا ہی کرتے لیکن جب انھوں نے ایسا نہیں کیا تو خیال ہوتا ہے کہ یا تو مذکورہ رائے کا انتساب ان کی طرف کرنے میں کوئی باریک سہو ہوا ہے یا پھر کوئی خاص نکتہ نگاہِ تاریخ سے اوجھل رہ گیا ہے ۔ ہم تو یہی خیال کرتے ہیں کہ وہ بھی بسم اللہ کو (نمل کے علاوہ) کسی سورت کا جزو نہ سمجھتے ہوں گے ورنہ جہری نمازوں میں اسے ضرور زور سے پڑھتے رہا کی حرمت

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

خدا نے اپنی کتاب میں انکشاف کیا ہے کہ اس کائنات کی تعمیر و تخلیق کا سنگ بنیاد کیا ہے؟ — اس اساس اور بنیاد کا چھوٹا سا مگر معنوی طور پر بیکراں عظمت والا نام ہے "حق"! یہ حق ہی وہ بنیاد ہے جس کے اوپر آسمانوں اور زمین کی پوری کائنات تعمیر ہوئی ہے اور جس دن اس دنیا میں ایک بھی حق شناس باقی نہ رہے گا اور ساری کائنات قیامت خیز دھماکوں کے ساتھ تہ و بالا ہو رہی ہوگی تو ایک بار پھر انسان پر خدا کے اس اعلان کی سچائی کھل رہی ہوگی کہ سچ مچ کائنات کسی بھی مادی چمک دمک یا گھن گرج پر نہیں بلکہ حق و صداقت کے بل پر ہی قائم تھی۔

عجیب یہ بات ہے تو وہی لوگ اس دنیا کے معمار — دنیا کی روح رواں تسلیم ہونے چاہئیں کہ جو اہل حق ہیں۔ وہ لوگ جن کے دل کی دھڑکنوں نے تخلیق کو دیکھ کر خالق تک رسائی حاصل کرلی اور خالق کے یقین کی راہ سے انسانی وجود کی عظمت کو پالیا —— آہ! یہ انسانی وجود جس کی نظر سے خود اپنا ہی وجود گرا ہوا ہے اور اپنے سوا اس کائنات کی ہر چیز کی عظمت تسلیم ہے جو فی الحقیقت انسان کی چاکری میں لگائی گئی ہے —— ہاں وہ انسانی وجود ہی اس کائنات کی نظروں میں حاصل کائنات ہے۔ کاش انسان جان لیتا کہ اس پوری بزم کائنات میں جو تنہا خدا اس انسان کی قدر و قیمت کو پہچانتا ہے اسی خدا کو نظر انداز کر کے اس مشت خاک نے کتنا لرزہ خیز ستم ڈھایا ہے!

لیکن نہیں! —— پوری نوع انسان اس ستم کاروں کے غول میں شامل کہاں ہے۔ آدمؑ کی اولاد میں ایسے کتنے ہی آدمی تاریخ کے ہر دریچہ سے ہماری طرف جھانک رہے ہیں اور زندگی کے ہر نشیب و فراز پر جلوہ افروز ہیں جنھوں نے حق شناسی کا ایسا حق ادا کر دیا کہ زمین تک کیا

آسمان کے بجائے سورج بھی ان کے سروں پر اس طرح شرماتے ہوئے گذرے جیسے وہ انسانوں کے قدموں کی خاک بھی خود کو نہیں سمجھتے۔ جن کے ظاہری فقر اور بے سروسامانی کے باوجود جن کی باطنی بلندیوں کو نظر بھر کر دیکھنے کی کوشش میں بھی اس زمین کے تاج پوشوں اور تخت نشینوں کا سر چکرا گیا اور آنکھیں تھک ہار کر زمیں بوس ہوگئیں۔ اس لئے کہ ان تخت نشینوں اور کج کلاہوں کے پاس ان کا سب سے بڑا ہتھیار دار و رسن تھے ——— موت کی دھمکیاں تھیں اور یہ بوریا نشینوں اور خاک نشیں سر بکف اہل حق اسی "موت" کی آرزو میں جیتے تھے! ——— باطل کا زیادہ سے زیادہ فریب یہ ہے کہ وہ انسان کو اس دنیا میں عیش و عشرت کی زندگی کا راز سکھا سکتا ہے لیکن حق کا کم سے کم وعدہ یہ ہے کہ وہ صرف جینا ہی نہیں مرنا بھی سکھائے گا ——— زندگی اس طرح انکے قدموں پر لٹائے گا کہ ان کی زد میں موت بھی آئے گی تو خود مر جائیگی ——— اور ——— اے لوگو! اگر انسان کا سب سے پہلا مسئلہ زندگی ہے اور سب سے آخری مسئلہ موت کا خوف تو تم خود فیصلہ کر دو کہ جو چیز مرنا نہ سکھلا سکے وہ زندگی کیسی زندگی کہاں سے سکھا دیگی؟ ——— اور اگر اس کی مدعی ہے تو یہ دعویٰ ایسا کھلا ہوا فریب ہے جس کو قلب و روح کے اندھوں کے سوا اور کوئی کبھی نہیں کھا سکتا ——— اہل حق کی نظروں میں تو حق نے اس فریب کا سارا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ باطل آدمی محض پرچھائیوں کا تعاقب سکھاتا ہے اور پرچھائیں ہاتھ آکر بھی ہاتھ نہیں آیا کرتی۔ اس لئے باطل نے دولت سے لے کر حکومت و اقتدار تک جس جس خس پوش غار ——— (PIT FALL) میں زندگی اور سکون کی نشاندہی کی ہے اس پر آدمی پہنچا تو اس کے خوابوں کے سارے محل اس تاریک غار میں اوندھے منہ گرتے چلے گئے وہ ان سب چیزوں کو تو پا گیا مگر اس کا سکون ——— اس کی زندگی کا اصل جوہر سکونِ دل ہاتھ سے جاتا رہا ——— لیکن اہل حق ——— حق نیوش - حق کوش اور حق گو انسانوں نے اس فریب کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔

مدینہ منورہ میں کسی نے بڑی شاندار بلڈنگ کھڑی کی اور سمجھا کہ یہ کوئی بہت شاندار حقیقت بھی ہے۔ مگر اس نے جیسے ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کیش بردار حضرت ابوہریرہ کو اسے دکھا کر انسے اس طرح خراجِ عقیدت لینا چاہا کہ وہ اس شاندار تعمیر کے لئے کوئی شاندار کتبہ تجویز کر دیں تو انھوں نے ذکر اللہ سے تر رہنے والے منہ کی ایک ہی جنبش لب سے اس بھرم کا بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیا ——— انھوں نے فرمایا لکھ سکو تو اس کے شاہ گیٹ پر یہ حقیقت لکھ دو

"یہاں اس لئے عمارتیں اٹھاؤ تاکہ وہ
ایک دن اجڑ کر کھنڈروں میں ڈھل جائیں"

اور ——— یہاں اس لئے اولاد جنو کہ موت آتے ہی ماں باپ اور ان کے جگر پارے ہمیشہ کے لئے بچھڑ کر رہ جائیں اور یہاں اس لئے خوب دولت کے ڈھیر لگاؤ تاکہ یہ خزانہ جمع کرنے والے کے ہاتھ سے نکلے اور وارثوں میں بٹ کر رہ جائے ———"

یہی حق ایک بلند ترین صحابی کے دل میں جو حقیقت کا چراغاں کر گیا ٹھیک وہی سماجی سطح کے ادنیٰ ترین انسان کی دھڑکنوں کو چھو گیا تو اس کی نظروں میں دولت مٹی ہو کر رہ گئی! اور یہی دولت کی اصل حقیقت بھی تو ہے نا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کمال یہ ہے کہ انسان کیمیا گری سیکھ کر مٹی کو سونے میں تبدیل کر دے مگر اہل حق کی نظروں میں یہ کمال نہیں کمال فریب ہے ——— ان کی نظروں میں کمال کچھ اور ہی ہے! ——— اور وہ یہ کہ دولت ہی انسان کی نظر میں مٹی ہو کر رہ جائے۔

حضرت علی کا دورِ خلافت جو اس حق کوشی کی صبح کے لئے اس کی شام کا دھندلکا تھا۔ ہاں اس دور میں کوفہ کا ایک دنیا دار دولت مند آدمی ابو احمد ایک

ایک باغ میں داخل ہوا اور دیکھا کہ باغ کا رکھوالا غلام اس شان سے کھانا کھا رہا ہے کہ ایک لقمہ جو کھاتا ہے تو ٹھیک اتنا ہی دوسرا لقمہ بنا کر سامنے بیٹھے ہوئے کتے کو کھلا رہا ہے اور اس بات کا آخری درجہ کا لحاظ کر رہا ہے کہ اس کا اور کتے کے حصّہ کا لقمہ قطعی برابر اور مساوی رہے ——— ذرا بھی چھوٹا بڑا نہ ہونے پائے ! —

اے مساوات کے فلک شگاف نعرے لگانے والو! تم کہاں ہو ؟ ذرا آؤ اور اس منظر کو دیکھنے کی کوشش کرو. تم کو باطل فلسفوں نے جس مساوات کا جل دیا ہے وہ ایک دن انسان اور انسان کے بیچ قائم ہو جائیگی اور جو آج تک کبھی وہ قائم کر کے نہ دکھا سکا ہاں حق نے وہی مساوات کس طرح ایک انسان اور ایک کتے کے درمیان قائم کر کے آج سے صدیوں پہلے دکھا دی تھی ! —

"کیا یہ کتا تم نے پال رکھا ہے ؟ ....." دولتمند کوفی نے اس واقعہ کو سمجھنے میں اپنی آخری ذہنی پرواز دکھاتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں ! ——— یہ اجنبی کتا ہے جو بھوک کا مارا میرے سامنے آکر بیٹھ گیا اور ہانپتا کانپتا ہوا مجھے دیکھنے لگا تھا جیسے کہہ رہا ہو میں بھی تمہاری طرح بھوکا ہوں اور میں بھی تمہاری طرح اللہ کی جاندار مخلوق ہوں"۔

"اچھا ! ....." دولت مند کا منھ فرط حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا لیکن آواز رک گئی۔ "پھر...."

"پھر کیا ؟ ....." غلام نے کہا "پھر مجھے شرم آئی کہ خدا کی ایک مخلوق میرے سامنے بھوکی بیٹھی ہو اور میں اپنا پیٹ بھر لوں"

"لیکن" ——— دولت مند ہکلاتے ہوئے بولا "لیکن اس قدر احتیاط سے برابر کے نوالے بنانے کا سبب آخر کیا ہے ؟ ....."

"محض اس لئے کہ میں نے نیت کر لی تھی کہ آدھا خود کھاتا ہے اور آدھا اپنے اس عارضی پردیسی مہمان کو کھلاتا ہے اس نیت کی تکمیل اور کیسے ممکن ہے کہ میں اس جرم سے بچنے کی آخری سعی کر دوں کہ کتے کی روٹی کا کوئی حصہ میرے پیٹ میں چلا جائے بس"

ابو احمد کوفی نے یہ سنا اور اس غلام کی حق کوشی پر سر دھنتا ہوا باہر نکل آیا اس باغ کے مالک کا پتہ لگایا اور اسی سے یہ باغ اور یہ غلام دونوں منھ مانگے دام دیکر خرید لئے ——— اب ایکبار پھر وہ اپنے خیال میں اس غلام کے لئے سب سے بڑے خراج عقیدت کے ساتھ داخل ہوتے ہوئے بولا "میں نے تم دونوں کو تمہارے مالک سے خرید لیا ہے اور اب میں تمہیں آزاد کہتے ہوئے یہ باغ تمہارے قدموں میں نذر کرتا ہوں"۔

غلام نے اس احسان کے جواب میں ایسی چیز پیش کی جو اس دنیا میں خدا کی نظروں میں کمیاب اور نادر ترین شے ہے اور وہ شکر کیشی اور احسان شناسی اور احسان شناسی کے جواب میں احسان کی تڑپ ہے۔ غلام نے کہا "میں آزادی کی نعمت قبول کرتا ہوں اور اس کے شکریے کے طور پر یہی باغ خود آپ ہی کو نذر کرتا ہوں ! ———"

اور ابھی حیرت زدہ دولت مند کی سماعت میں ان الفاظ کی گونج ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ خدا کا غلام باغ سے باہر تیزی سے نکل کر نجانے کہاں غائب ہو چکا تھا ! .

ایک باغ ہی کیا ایک عظیم سلطنت بھی ایک اہل حق کی نظروں میں وہ جگہ نہ پا سکی جو باطل اسے دنیا دلانا چاہتا ہے جس دن امیہ سلطنت میں عبد العزیز جیسا قیمتی انسان سلطنت کا حکمراں مقرر کر کے ساری رعایا خوشی کے پر زور اور پر شور جشن منا رہی تھی کہ اب وہ حاکموں کے ظلم و ستم سے نجات پا گئی . ہاں اسی دن عبد العزیز اپنے گھر میں اس حال میں داخل ہوئے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی بیوی نے گھبرا کر پوچھا :

"خدا را کہہ تو دیجئے کیا حادثہ پیش آگیا ہے ؟"

سسکیوں کے درمیان شوہر کی یہ آواز آئی ———

میری گردن میں امت محمدی کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ ننگے بھوکے
بیمار، مظلوم، مسافر، قیدی، بچے، بوڑھے، کم حیثیت عیالدار
اور بے عیال انسانوں کی ایک بھیڑ آج میرے سامنے کھڑی
ہے مگر کل خدا کی عدالت میں میرے پیچھے لگی ہوئی پکار رہی
ہوگی کہ ہائے ساتھ فلاں انصاف ہونے سے کیوں رہ گیا!
ہائے میں اس وقت کیسے جان بچاؤں گا۔"

اور شوہر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا کہ بیوی بھی
تڑپ کر اشکبار ہوگئی۔

کہاں ہیں دنیا کو باطل حکومت کے نت نئے ناموں
سے بھلانے والے جو حاکم اور محکوم کو یکساں سطح پر لانے کا
محض "دعدۂ فراموش" کرتے ہیں۔ وہ ذرا دیکھ سکیں تو دیکھیں
کہ حق کس طرح محکوم کو خوشی کے گیت گاتا ہوا اور حاکم کو
خوف احتساب سے رلاتا ہوا دکھا چکا ہے!۔

حق جو اہل حق کو ایسی نظر دیتا ہے جو آنے والی دولت و
حکومت کے ساتھ ساتھ آنے والی ایک اور چیز بھی دکھا دیتی
ہے ——— وہی حسین چیز جس کا نام "ذمہ داریاں" ہیں

اس حق پسندی کی سب سے جاں نواز رعنائی اور
سب سے زیادہ دل ربا ادا کیا تھی؟ اسلام سے پوچھو
"اعلاء کلمۃ الحق عند سلطان جائر" ——— استبدادی
قہرمانیت کے مالک حکمراں کی زد میں آکر اس کے گالوں
پر اعلان حق کا طمانچہ لگانا" اور اس "اعلان حق" کے جذبہ
مقدس کی کاشت اور آبیاری اہل حق کے حکمرانوں نے خود
اپنے محکوموں میں اس طرح کی تھی کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے
بھری محفلِ مسجد میں کھڑے ہو کر سوال کیا۔

" بتاؤ اگر میں راہِ حق سے ہٹ گیا تو تم لوگ کیا
کروگے؟ ۔

یکایک بجلی سی چمکی، اور ایک آدمی محفل میں کھڑا ہوگیا
جس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ "ہم تمہیں اس سے سیدھا
کر دیں گے"

اس کی اندرونی حقیقت کی تہ معلوم کرنے کے لئے
حضرت عمرؓ نے گرجدار دھمکی دیتے ہوئے کہا" خبردار کس سے
کیا کہہ رہے ہو؟"۔

فوراً اس آدمی کی اس سے زیادہ گرجتی ہوئی آواز مسجد
میں گونج اٹھی" ہاں ہم تمہیں سیدھا کر دیں گے ——— ہم!!
اور ——— فی الفور حضرت عمرؓ کی روح نے فرشِ
خاک پر فرط شکر سے آنکھیں ملتے ہوئے کہا" الحمدللہ! کہ میرے
گرد و پیش ایسے اہل حق موجود ہیں جو اگر میں کبھی ٹیڑھی چال چلوں تو مجھے بھی
سیدھا کر سکتے ہیں۔ جوش کا یہ سوز دروں تنہا عرب ہی کے ریگزار کو نہیں گرما گیا تھا
بلکہ عجم میں بھی وہ جہاں سے گزرا شعلہ فشاں گزرا۔ برق تپاں گزرا۔

دیکھو نا! ——— وہ امام احمد ابن حنبل ہیں ———
کیسی بھاری بھاری زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایرانی
سلطنت کے حکمراں سے اس مسئلہ میں ٹکرا گئے ہیں کہ وہ
کہتا تھا قرآن خدا کی مخلوق ہے اور وہ فرماتے تھے کہ قرآن
اللہ کا اپنا کلام ہے غیر مخلوق! ——— اور وہ جب
شہر کی سڑکوں سے گزرے تو راہ میں انھیں اس عہد کا
ایک چور ملا جس کا ہاتھ کٹا ہوا تھا اور کمر کوڑوں سے ادھڑی
ہوئی تھی ——— اس نے امام کو آواز دی اور کہا" اے
امام! میں نے شیطان کے راستے میں یہ استقامت دکھائی
کہ برسہا برس سے چوری کر رہا ہوں اور پولس کے کوڑوں نے
میری کھال ادھیڑ ڈالی مگر میں نہیں باز آیا دیکھنا
آپ اللہ کی راہ میں ہیں ——— آپ کو کم از کم مجھ جیسی
استقامت بھی نہ دکھلا سکے تو کیسی شرمناک بات ہوگی"۔

اہل حق کا کیسا ماحول تھا وہ کہ جہاں کے سرکاری
مجرموں کے سینے بھی حق کے ایسے عظیم شعور سے جگمگا رہے
تھے کہ ان کا ایک جملہ ہزاروں خطیبوں اور فصیحوں کی خطابت
و فصاحت پر پہاڑوں سے زیادہ بھاری تھا۔ اور اس
ایک جملہ نے امام احمد بن حنبل کے سینے میں غیرت حق کا
ایسا حشر اٹھا دیا اور ایسا تموج گرما دیا کہ حکمران ان کے پاؤں
پڑنے کے انداز میں ایک طرف یہ کہہ رہا تھا۔" ہائے! اے
امام!! آپ کہاں میرے عتاب کی زد میں آگئے! خدا کی
قسم میرے دل پر آپ کی عظمت ——— ہے ——— خدارا
آپ میرے عتاب کی زد سے ہٹنے کے لئے میری بات

مان لیجئے یا خاموش ہی ہو جائیے"۔

مگر دوسری طرف ٹھیک ماہ صیام میں روزہ دار قیدی کہہ رہا تھا "مجھے خدا کی کتاب یا رسول کی حدیث ہی خاموش کر سکتی ہے —— مجھے وہاں یہ مسئلہ دکھا دو اور بس" —— اور پھر خوں فشاں تازیانوں کی آوازیں سنائیں میں جہاں سارا مجمع اور خود ظالم حکمراں بھی دل تھامے کھڑا تھا۔ امام احمد کی آواز ہر کوڑے کے مار پر اس طرح گونج رہی تھی جیسے یہ تازیانے ان کے سازِ حق پر مضراب کا کام کر رہے ہوں — القرآن کلام اللہ —— غیر مخلوق"۔

اور —— اہل حق کی حق کوشی کا یہ مظاہرہ جنون قرونِ اولیٰ سے بہت دور سیاسی عظمت کے آخری دور میں اسپین میں اس طرح نظر آیا کہ حاکم نے شاہی محل میں سونے کی اینٹیں لگائیں تو قرطبہ کے قاضی منذر بن سعیدؒ تڑپ اٹھے کہ انسانوں کے حصہ کی دولت اینٹ پتھروں پر کیسے نچھاور ہو گئی۔ انھوں نے جمعہ کے خطبہ میں حکومت وقت پر تنقید کا تیشہ چلاتے ہوئے کہا —— "مجھے یہ گمان نہ تھا کہ اے خلیفۂ وقت! آپ پر شیطان اس حد تک مسلط ہو چکا ہے کہ وہ آپ کو کفار اور خدا کے باغیوں تک پہنچا ڈالے گا!"

یہ سنکر الناصر کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے اور اس نے قاضی موصوف کو بیچ میں ٹوک دیا۔ "ذرا سوچئے آپ کہہ کیا رہے ہیں! آپ نے مجھے کفار کے مقام تک پہنچا دیا ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں" —— اگر ایسا نہ ہوتا کہ سارے آدمی ایک سے (گمراہ) ہو کر رہ جائینگے تو ہم خدا سے بغاوت اور کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیاں چاندی کی بنا دیتے جن پر وہ چڑھتے" اور —— یہ سنتے ہی کہ اللہ کی نظر میں سونے چاندی کی اینٹوں سے تعمیر ہونے والی عمارت کا مقام کیا ہے۔ حاکم وقت کا دل بھر آیا اور وہ بھری محفل میں سر پکڑ کر رونے لگا پھر آنسوؤں کے خزانے داڑھی والا چہرہ اٹھا اور یہ آواز آئی کہ "اس تعمیر کو ڈھا دو —— مٹی کا گھر ہی مجھ مشت خاک کے لائق ہے"۔

"حق دل کی دنیا میں آتا ہے تو آدمی کو آہن و فولاد سے سخت تر بھی بنا دیتا ہے اور کبھار قیق القلب حق شناس بھی! لیکن ہمارے دلوں میں یہ کیسا جمود جمود طاری ہے —— اور کیا ہم پھر بھی اہل حق ہی ہیں؟ —— کیا اب ہم خود شناسی کی جنت سے دھتکارے جانے کے بعد خود ستائی کے اس جہنم میں داخل ہو چکے ہیں جس میں ہمیشہ نجس قلوب اور مردہ ضمیروں کی لاشیں نذر آتش ہوتی چلی آئی ہیں؟ - آدمی کو فریب سے نکالا جا سکتا ہے مگر خود فریبی سے نہیں —— اس سے آدمی خود ہی نکلنا چاہے تو صرف اللہ ہی باہر نکال سکتا ہے — اور خدا کی قسم اس ارضی جہنم سے نکل آنے کا دوسرا نام ایمان ہے ٭

ہائے یہ گردشِ دوراں

مولانا عامر عثمانیؒ

ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں
ہے فضاؤں میں دھواں، سانس بھی لینا ہے گراں

نور کے نام پہ بکتی ہے یہاں تاریکی لوگ کہتے ہیں خزاں کو بھی یہاں فصلِ بہار
علم ہے خاک بسر، زخم بہ دل، آہ بہ لب جہل نے سر پہ سجائی ہے کلاہ و دستار
جنسِ کردار کے نیلام ہیں چوراہوں پر عصمتِ لوح و قلم بیچ رہے ہیں فنکار
بے ضمیری کے لئے عام ہے صہبائے نشاط ہدفِ سنگِ ملامت ہے ضمیرِ بیدار
ناطقہ سر بگریباں ہے خرد نوحہ کناں
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

باغباں کہتا ہے جب برق چمکتی دیکھو خیر مقدم کو اٹھو صحن میں خرمن رکھ دو
آتشِ گل کو ضرورت ہو اگر ایندھن کی اس کے آغوش میں اپنا ہی نشیمن رکھ دو
خار جب آئے نظر مشقِ ستم پر مائل سامنے اطلس و کمخواب کے دامن رکھ دو
اور صیاد اگر تیغ بکف آ نکلے —! تیغ کو پیار کرو دھار پہ گردن رکھ دو
نہ سنی جائے چمن میں کہیں آوازِ فغاں
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

ہر تہی مغز کو ہے غَرّۂ علم و تحقیق ہر مہاجن کو یہاں دعوۂ رزّاقی ہے
کاسۂ سر سے بنا سکتا ہو جو ساغر ہے ایسا ہر شخص یہاں اپنی جگہ ساقی ہے
طنز و تحقیر کے تیروں کا ہدف ہیں وہ لوگ جن میں خودداری و غیرت کی رمق باقی ہے
فکرِ کوتاہ کو ملتے ہیں یہاں حور و قصور اور معتوب ہے وہ فکر جو آفاقی ہے

فہم و دانائی کے سرخیل بنے ہیں ناداں
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

جرأتِ حق نگری موجبِ تعزیر بنی ظلم سے جنگ سزاوارِ سلاسل ٹھیری
کتنے زہروں کو یہاں قند کہا جاتا ہے قندِ انصاف مگر زہرِ ہلاہل ٹھیری
بے شعوروں کی نگارش پہ جوابی تنقید جرم و تقصیر کی فہرست میں شامل ٹھیری
چاپلوسی کو ہوئی خلعتِ زربفت عطا صاف گوئی رسن و دار کے قابل ٹھیری

سرِ بازار ملا جھوٹ کو سچ کا عنواں
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

شہریاری کی حدوں سے بھی گزر کر دیکھا ہر طرف ایک سا عالم ہے کوئی فرق نہیں
زہد کے دستِ مبارک میں ہے جامِ پندار تمکنت سے شکن آلود ہے تقویٰ کی جبیں
اہلِ تحقیق ہیں اوہام کی زلفوں کے اسیر اہلِ دانش کے دماغوں میں تعصب ہے مکیں
اہلِ دل مستیٔ کردار سے محروم ہوئے برگِ افیون اگلتی ہے تصوف کی زمیں

ہیں طریقت کے مسائل پہ فرشتے حیراں
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

اہلِ ایماں نے مساجد تو سجائی ہیں بہت قصۂ دوش ہوا رشتۂ عبد و معبود
تھے کبھی عرش کی دہلیز پہ جن کے سجدے آج اپنے ہی مفادات ہیں ان کے مسجود
جن کی تکبیر تھی اک زلزلۂ کوہ شکن آج اک شیشۂ صد پارہ ہے خود ان کا وجود
اہلِ مکتب ہیں مباحث کے خم و پیچ میں گم سوزِ دل، نورِ یقیں، ذوقِ عمل ہے مفقود

عام ہے اہلِ مدارس میں عداوت کی زباں

ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

عامرِ عثمانیؒ نمبر کے لئے آپ کا تعاون درکار ہے

اگر آپ مضمون نگار ہیں تو مولانا عامر عثمانیؒ کی شخصیت پر مضمون لکھئے۔

اگر آپ شاعر ہیں تو مولانا عامر عثمانیؒ کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیجئے۔

اگر آپ ذہین اور تعلیم یافتہ ہیں تو عامر عثمانیؒ نمبر کے لئے مفید مشورے دیجئے۔

اگر آپ مصلحت کی بنا پر یا کسی خاص وجہ سے مشورے دینا مناسب نہیں سمجھتے تو ہمارے لئے دعا فرمائیے۔

بہرحال آپ جس قسم کا تعاون بآسانی دے سکتے ہوں دیجئے۔ یقین کیجئے کہ آپ کا ہر قسم کا تعاون ہماری نظروں میں قابلِ قدر ہوگا۔

اور یقین کیجئے کہ آپ کے پرخلوص تعاون کے بغیر ہم اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

اس شمارے میں کسی جگہ عامر عثمانیؒ نمبر کی جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں انھیں ملاحظہ فرمائیے اور فی الفور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازیئے۔ ہم آپ کے مشوروں کے کل بھی منتظر تھے اور آج بھی منتظر ہیں (ادارہ)

تجلی کی ڈاک

کفارت کی بحث
مختلف گزارشات
تبلیغی جماعت سے متعلق چند باتیں
نماز میں ترتیب قرأت

کفارت کی بحث

سوال ۱:- نذیر احمد لوہانی۔ ایم۔ اے (کرناٹک)

ماہ جولائی و اگست ۱۹۸۵ء کا تجلی نظر نواز ہوا۔ تجلی کی ڈاک میں شریعت اور نسلی پوزیشن کے عنوان سے سوال نمبر ۳ کا جواب تشفی بخش نہ ہونے کے باعث یہاں پر ہمارے علمی حلقے میں چند شکوک پیدا ہوئے ہیں۔ آپ نے جو اً با فرمایا ہے :-

"شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر مسلمان مرد کا نکاح ہر مسلمان عورت کے ساتھ ہو سکتا ہے کوئی رنگ نسل اور چھوت چھات نہیں۔ کفو اور غیر کفو کا مسئلہ تو اس وقت اٹھتا ہے جب بالغہ لڑکی نے ولی کی اجازت کے بغیر از خود اپنا نکاح کر لیا ہو اگر نکاح کفو میں کیا گیا ہے تو پھر تو کوئی بات ہی نہیں اور غیر کفو میں کیا گیا ہے تو پھر نکاح تو بہر حال منعقد ہو جائے گا۔ البتہ ولی کو فسخ نکاح کا اختیار باقی رہے گا اگر وہ چاہے گا تو نکاح کی اس ڈوری کو توڑ سکتا ہے۔

مثلاً ہندہ نام کی سیدہ لڑکی نے ولی کی اجازت لئے بغیر اپنا نکاح کسی مغل نوجوان سے کر لیا۔ نکاح منعقد ہو گیا لیکن ہندہ کے والد اس نکاح کو فسخ کرانا چاہیں تو فسخ کرا سکتے ہیں۔ شریعت کی طرف سے انھیں یہ اختیار حاصل ہے۔ البتہ اگر ہندہ کا نکاح کسی پٹھان سے ولی کی اجازت سے ہوا ہو تو پھر کوئی رکاوٹ اور حرج نہیں۔ کسی بھی کلمہ گو مرد کا نکاح کلمہ گو عورت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو بات بیان کی ہے وہ بالکل درست ہے۔ انھوں نے بھی بین السطور میں یہی بات بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کوئی سیدہ لڑکی یا شیخ زادی از خود اپنا نکاح کسی پٹھان نوجوان سے کرے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ نکاح اپنی نسلی پوزیشن سے گھٹ کر ہوا یعنی کہ غیر کفو میں اور اس صورت میں ولی کو نکاح توڑنے یا باقی رکھنے کا مکمل اختیار رہے" (صفحہ ۳۵ تا صفحہ ۳۸)

مندرجہ بالا سطور کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں بڑا چھوٹا اور اونچ نیچ کو اہمیت دی گئی ہے۔ آپ اوپر عرض کر چکے ہیں کہ شریعت میں اس کی اہمیت نہیں ہے۔ شریعت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر مسلمان مرد کا نکاح مسلمان عورت کے ساتھ

ہوسکتا ہے اور پھر آخر میں آپ کا یہ فرمانا کہ مولانا تھانویؒ نے جو بات بیان کی ہے وہ بالکل درست ہے۔ یہ ہماری سمجھ سے بعید ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ	لوگو! ہم نے تو ایک مرد اور
مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ	ایک عورت سے پیدا کیا
جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا	اور پھر تمہاری قومیں اور
وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ	برادریاں بنا دیں تاکہ تم
اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ	ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت
اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ اِنَّ	اللہ کے نزدیک تم میں سے
اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ○	سب سے زیادہ عزت والا
....	وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے
....	زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً
الحجرات ــــــ	اللہ سب کچھ جاننے والا اور
آیت نمبر ۱۳ ــــــ	باخبر ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تقریر کی اور فرمایا :-

" لوگو خبردار تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ مگر تقویٰ کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

ایک اور حدیث میں حضورؐ نے فرمایا :-

" اللہ قیامت کے روز تمہارا حسب نسب نہیں پوچھے گا۔ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

مندرجہ بالا احادیث اور قرآن کی رو سے نسلی پوزیشن کی اہمیت ڈھکوسلا معلوم ہوتی ہے۔ اب چونکہ آپ نے بھی جواباً عرض فرمایا ہے تشکیک کا باعث بنا ہے تو آپ سے گذارش ہے کہ کس بنا پر مولانا اشرف علی تھانویؒ نے عکسی بہشتی زیور حصہ چوتھا صفحہ دس نمبر ۲ درج کیا کہ مغل پٹھان سب ایک قوم ہیں اور شیخوں سیدوں کے ٹکر کے نہیں وغیر ذلک۔ اس کے علاوہ آپ نے بھی اس بات کو درست کہا ہے۔ لہٰذا تفصیل سے جواب دیں تاکہ تشکیک کا ازالہ ہو۔ یہاں پر چند دوست یہاں تک کہتے ہیں کہ سیدوں کا رتبہ بہت اعلیٰ ہے اور انھیں جنت میں اونچی جگہ دی جائیگی اس سلسلہ میں حضورؐ کی اپنی بیٹی بی بی فاطمہؓ نصیحت بھی قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتی۔ آپ سے مخلصانہ التماس ہے کہ اپنی پہلی فرصت میں جواب دیں۔ مزید یہ بھی بتانے کی زحمت گوارہ فرمائیں کہ مسلمانوں میں شیخ، سید، مغل، پٹھان یہ چار نسلیں کب اور کیونکر بنیں۔ امید قوی ہے کہ آپ تجلی کے اگلے شمارے میں ہمارے سوال کا جواب دیکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔

الجواب :-

کفارت کا مسئلہ ہمیشہ زیر بحث رہا ہے اور ہمیشہ لوگ اس مسئلہ میں کم فہمی، کج فکری، ذہنی عدم پختگی، تشدد اور جذباتیت کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ یہ مسئلہ آج بھی الجھن، کشاکش اور بحث و تکرار کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس لئے کہ مذکورہ کمزوریاں ہماری دنیا میں آج بھی موجود ہیں اور ہمارے معاشرے کے ان گنت افراد ان کمزوریوں کا شکار ہیں چونکہ یہ کمزوریاں دنیا سے مٹ نہیں سکتیں۔ اس لئے نہ کشاکش دور ہوسکتی ہے نہ بحث کے دروازے بند ہوسکتے ہیں اور نہ ہی الجھنوں کے رفع ہونے کا امکان ہے۔

کفارت کے بارے میں بعض حضرات افراط و تفریط کے اندر مبتلا ہیں۔ بعض لوگ ایک انتہا کا شکار ہیں اور بعض دوسری انتہا کا ایک جماعت یہ تخیل رکھتی ہے کہ ذات پات اور نسلی اونچ نیچ کو کسی بھی صورت میں نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ اس تخیل کی حامل جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ قدرت نے دنیا میں مختلف قومیں اور نسلیں پیدا کی ہیں ان میں بعض اقوام بلاشبہ اعلیٰ کہلانے کی مستحق ہیں۔ اور بعض متوسط اور ادنیٰ۔

ان سب اقوام کو ایک نظر سے دیکھنا اور سب کو ایک ہی
مقام دے دینا سمجھداری کی بات نہیں ہے۔ سید سید ہے
اور قصائی قصائی۔ ان کے درمیان لکیر کھینچنا ضروری ہے
سیدوں اور قصائیوں کو ایک صف میں کھڑا کر دینا اور ان
دونوں کو ایک جیسی نظر سے دیکھنا نہ انصاف پر مبنی ہو سکتا
ہے اور نہ دانش مندی پر۔

اگر یہ جماعت صرف یہی کہنے پر اکتفا کر لیتی تو کوئی اعتراض
واقع نہ ہوتا۔ لیکن وہ یہ کہنے کے ساتھ ساتھ اس تشدد اور
عصبیت کا مظاہرہ بھی کرتی ہے جس پر اسلام نے ضرب
لگائی تھی، اور جو اسلام کے نزدیک معیوب و معتوب تھا،
اور جس کا مظاہرہ کرنے کے بعد انسان بلاشبہ اس کالی دنیا
میں داخل ہو جاتا ہے جہاں غرور و تکبر کے اندھیروں کے
ماسوا کچھ نہیں ہوتا، افراط ہر معاملہ میں مذموم قرار دیا گیا ہے
لہذا کفارت کے معاملہ میں بھی افراط سے احتراز ضروری ہے۔

دوسری جماعت اس بارے میں تفریط کا شکار ہے۔ اسکا
دعویٰ یہ ہے کہ حسب و نسب اور نسلی مراتب سرے سے کوئی
حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ آدم کی تمام اولاد یکساں اور مساوی
حیثیت کی حامل ہے۔ کوئی بڑا نہیں کوئی چھوٹا نہیں کوئی
معتبر نہیں کوئی حقیر نہیں، کوئی کسی سے کمتر نہیں اور کسی کو
کسی پر ذرہ برابر بھی فوقیت اور بڑائی حاصل نہیں۔ سب
ایک جیسے ہیں اور سبھی کی رگوں میں ایک جیسا خون دوڑ رہا
ہے۔ لہذا سب کو ایک ہی جیسا مقام دینا چاہئے۔ سب
ایک ہی سلوک کے مستحق ہیں۔

یہ بات ظاہری طور پر بڑی خوشنما ہے۔ لیکن اندرونی
طور پر یہ بات جتنی کھوکھلی ہے اتنی پارسا بھی ہے۔ کھوکھلی
اس بنا پر کہ آجتک دنیا میں نہ کبھی ایسا ہوا ہے اور نہ کبھی ایسا
ہوگا کہ نسل و نسب کے جھگڑے اپنی موت مر جائیں۔ قوم
پرستی کا وجود ختم ہو جائے۔ احساس کمتری اور احساس
برتری کا نام نشان باقی نہ رہے اور وہ فصیل امتیاز گر جائے
جو قرنہا قرن اور برسہا برس سے قوموں کے درمیان کھڑی
ہوئی ہے اور جس کا قد بہت اونچا ہے۔

اور یہ بنا اس بنا پر کہ فرق امتیاز اور فرق مراتب کا ملیامیٹ
کر دینا ایک نادرا حرکت ہے اور اس حرکت سے ہمیں فائدہ نہیں
زبردست نقصان پہنچے گا۔ اول تو ایسا ممکن ہی نہیں کہ اونچ
نیچ اور برتری و کمتری کا وجود ہی باقی نہ رہے لیکن بالفرض
محال اگر ایسا ہو بھی جائے تو بلاشبہ ہماری الجھنیں بڑھیں
گی، ہماری خلفشاریں اور سرکشیوں کی کوئی انتہا نہیں رہے
گی۔ اور ہم کلیتہً اس سکون سے محروم ہو جائیں گے جس کا
کچھ نہ کچھ حصہ ہمارے دامن ماحول میں ابھی تک
موجود ہے۔

آپ کفارت کے سلسلہ میں اس جماعت کی پیروی
کر رہے ہیں جو اس انتہا کا شکار ہے جسے عرف عام میں
تفریط کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آپ نے جو آیت
اور حدیث نقل کی ہے وہ بحمدللہ میرے ذہن میں بھی مستحضر ہیں
اور اس وقت بھی مستحضر تھیں جب میں جولائی و اگست کے
شمارے لئے (شریعت اور نسلی پوزیشن سے متعلق) ایک سوال
کا جواب دے رہا تھا۔ میں سوال کا جواب دیکر مطمئن ہو گیا
تھا اور اب بھی مطمئن ہی ہوں جب کہ آپ کا یہ اعتراض
تمام میرے سامنے موجود ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے
محولہ جواب اور مولانا تھانویؒ کی محولہ تحریر پر کسی قسم کا کوئی
اعتراض واقع نہیں ہوتا۔ اور کم از کم یہ جواب اور یہ تحریر
ان حضرات کے نزدیک قابل اعتراض نہیں ہو سکتیں جو حضرات
اس مقام پر متمکن ہیں جو مقام مقام معتدل کہلاتا ہے میں
اس مقام سے نہ ایک بالشت آگے بڑھنا چاہتا ہوں اور
نہ ایک بالشت پیچھے ہٹنے کو اپنے لئے خیر اور مفید سمجھتا ہوں
اور آپ کے لئے بھی میرا برادرانہ اور مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ
آپ اس مقام سے آگے پیچھے ہونے کی جسارت نہ کریں
غلو اور انتہا پسندی خواہ مائل بہ افراط ہو خواہ مائل بہ تفریط
بہر حال مذموم اور واجب الترک ہے۔

لہذا ہمارے لئے مناسب تر راہ یہ ہے کہ دوسرے
مسائل کی طرح کفارت کے مسئلے میں بھی افراط اور تفریط سے
پہلو تہی کرتے ہوئے اس مقام معتدل پر گامزن ہو جائیں

حیثیں کی تھی۔ یا اور خطوط کشی امت کے ان ذکی علماء اور فقہائے کی ہے جن پر اعتماد کرنا ہم بے بضاعتوں کے لئے ضروری ہے اور جن کے تتبع اور تقلید کے بغیر ہم حق و صداقت کی منزل تک پہونچ ہی نہیں سکتے۔

آپ کا یہ جملہ کہ نسلی پوزیشن کی اہمیت ایک ڈھکوسلہ معلوم ہوتی ہے صرف وقار و سنجیدگی کی سطح سے ہٹا ہوا ہی نہیں بلکہ اس کے اندر بے خبری اور کم علمی کی جھلک بھی موجود ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کفارت کا مسئلہ بعد کے مولویوں کا پیدا کردہ ہے۔ اگر یہی تصور آپ کے گوشۂ ذہن میں سانس لے رہا ہے تو اسے آج ہی نہس نہس کر دیجئے اور یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ کفارت کا قصر معتدل ان ائمہ اور فقہاء نے تعمیر کیا ہے جنھیں تقویٰ و تقدس کے اعتبار سے درخشاں اور علم و معرفت کے اعتبار سے تابناک سمجھا جاتا ہے۔ تقویٰ و تقدس اور علم و آگہی کے ان حاملین کو بھی اس قصر معتدل کا موسس قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انھوں نے تو صرف اس کا ناک نقشہ بنانے کی جد و جہد کی ہے۔ دیواریں اٹھائی ہیں اور در و دیوار کو آراستگی بخشی ہے۔ سنگ بنیاد تو اس کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے رکھا تھا۔ مطالعہ احادیث کے دوران آپ کی نظروں سے یہ روایات ضرور گذری ہوں گی نہ بھی گذری ہوں تو اب ملاحظہ فرمالیجئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لا تنکحوا النساء الا الاکفاء (دار قطنی بیہقی)

(عورتوں کی شادیاں نہ کرو مگر ان لوگوں کے ساتھ جو کفو ہوں)

ایک روایت میں حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے یوں فرمایا:-

یا علی ثلاث، لا تؤخرها الصلوٰة اذا اتت والجنازة اذا حضرت والایم اذا وجدت کفؤا۔	اے علی تین کاموں کو مؤخر نہیں کرنا چاہئے۔ ایک نماز جب کہ اس کا وقت آجائے دوسرے جنازہ جب کہ تیار ہو جائے۔ تیسرے کنواری عورت کا نکاح جبکہ اس کا کفو مل جائے۔

(ترمذی۔ حاکم)

احیاء العلوم میں آپ کا یہ ارشاد گرامی بھی دیکھا جا سکتا ہے:-

النکاح رقٌ فلینظر احدکم این یضع کریمته	نکاح ایک قسم کی غلامی ہے اسلئے انسانوں کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ اپنی بیٹی کو کہاں دے رہا ہے یعنی کس کے حوالہ کر رہا ہے

⁂ ⁂ ⁂

بزرگان دین سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو کر یہ روایت بھی نقل ہوتی رہی ہے کہ اپنی نسل پیدا کرنے کے لئے اچھی اچھی عورتوں کا انتخاب کرو اور اپنی عورتوں کی شادیاں ایسے مردوں سے کرو جو ان کے کفو ہوں۔

صحابی رسول کا قول اگر آپ کے نزدیک کسی بھی درجہ میں مستند اور قابل اعتبار ہو سکتا ہے تو حضرت عمر فاروق رضؓ کا یہ قول بھی ملاحظہ فرمالیجئے:-

لامنعن فروج ذوات الاحساب الا من الاکفاء (کتاب الآثار)	میں شریف گھرانوں کی عورتوں کے نکاح غیر کفو میں نہیں کرنے دوں گا۔

یا دراس قسم کی بہت سی روایات معتبر کتابوں میں موجود ہیں جن سے صاف یہ ثابت ہوتا ہے خیر القرون میں شادیاں کفو میں کرنے کا بڑا اہتمام پایا جاتا تھا۔ اور لوگ غیر کفو میں رشتۂ زوجیت قائم کرنے سے بالعموم احتراز و اجتناب کیا کرتے تھے۔ ان ہی روایات کو سامنے رکھ کر علمائے دین نے مسئلۂ کفارت کو خاص اہمیت دی ہے اور ہمیشہ عوام و خواص سے مشورتاً یہ گذارش کی ہے کہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی کے وقت کفارت کو نظر انداز نہ کریں۔ مسئلہ کی بنیاد چونکہ احادیث میں موجود ہے لہذا یہ کہنا غیر درست ہی ہوگا کہ یہ بعد کے مولویوں کی خیالی اُپج ہے اور اسکی حیثیت ایک ڈھکوسلہ سے زیادہ نہیں۔

لغت کی زبان میں کفاءت برابری یعنی مساوات کو کہا جاتا ہے جو ہم پلّہ اور ہم حیثیت ہو۔ حیثیت مختلف قسم کی ہو سکتی ہے۔ مذہبی، مالی، نسبی، علمی وغیرہ وغیرہ۔

غیر مناسب نہیں ہو گا اگر یہاں یہ ظاہر کر دیا جائے کہ شریعت کے نزدیک کونسی حیثیت معتبر ہے۔ اس نے کس حیثیت کو کس حیثیت پر ترجیح دی ہے اور کس حیثیت کو کن مواقع پر نظر انداز کر دینا ضروری سمجھا ہے۔

عقلِ انسانی تو یہ کہتی ہے کہ شادی کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ بہر اعتبار کفاءت اور مساوات کو ملحوظ رکھا جائے۔ طرفین میں سے کوئی بھی فریق کسی بھی لحاظ سے برتر یا کمتر نہ ہو۔ دونوں کے رجحانات قریب قریب ایک جیسے ہوں۔ دونوں کے مزاج میں یکسانیت ہو۔ دونوں قد و قامت اور شکل و صورت کے اعتبار سے بھی بڑی حد تک مشابہ ہوں۔ دونوں کا تعلق ایک نسل اور ایک خاندان سے وابستہ ہو۔ دونوں جن ماحولوں سے نکل کر آئے ہوں وہ ماحول اپنے درمیان کوئی خاص تفاوت نہ رکھتے ہوں۔ اور اقتصادی حالات بھی دونوں کے اس درجہ مختلف نہ ہوں کہ ان پر زمین و آسمان کے فرق کا اطلاق ہو سکے۔

یہ ہے عقلِ انسانی کی عرضداشت اور ان گنت تجربات عقلِ انسانی کی اس عرضداشت پر تصدیق و مہر ثبت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ مرد و عورت کے درمیان نکاح کا مضبوط رشتہ قائم کرتے وقت مذکورہ ملفوظات کو نظر انداز کر دینے سے بسا اوقات شادی ناکام ہو جاتی ہے اور کچے دھاگوں سے بندھا ہوا بندھن جلد یا بدیر ٹوٹ جاتا ہے ممکن ہے کہ یہ اجمالی اور اختصاری گفتگو آپ کے لئے الجھن اور خلفشار کا باعث بن جائے۔ اس لئے میں تھوڑی سی تفصیل کی اجازت چاہ کر چند مثالوں کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مثالیں صرف مثالیں ہی نہیں بلکہ ان حقائق و واقعات کی پرچھائیاں بھی ہیں جو ہمارے معاشرے میں طویل و عریض جسموں کے ساتھ بکھرے ہوئے ہیں۔

پہلی مثال:۔ زید اقتصادی اعتبار سے ایک معمولی درجہ کا آدمی ہے۔ اس کی محرومیاں اس درجہ بڑھی ہوئی ہیں کہ اسے اس طبقہ میں شمار کرنا بھی غلط ہو گا جو طبقہ متوسط طبقہ کہلاتا ہے۔ اس کی پوزیشن بالکل آخری درجہ کی ہے۔ وہ جس مکان میں رہائش اختیار کئے ہوئے ہے وہ مکان بھی اس کا اپنا ذاتی مکان نہیں بلکہ کرائے کا مکان ہے اور مکان بھی کچھ اس ڈھب کا ہے کہ اس میں گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ گھٹا ہوا صحن تنگ کمرے۔ کچا فرش اور دیواریں بوسیدہ اور کچھ اس انداز کی کسی بھی وقت رکوع کر بیٹھیں۔ زید کا چونکہ یہ ذاتی مکان نہیں۔ لہٰذا وہ گوناگوں تکلیفات اور اندیشوں سے نجات پانے کے لئے اس سے زیادہ وسیع و کشادہ مکان میں منتقل ہو سکتا ہے لیکن اس کے مالی حالات ہرگز ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ وہ کسی ایسے مکان میں منتقل ہو جانے کا تصور بھی ذہن میں لا سکے جس کا کرایہ دوگنا اور چوگنا ہو۔

اس کے گھر ضروری سامان بھی قلیل اور نہ ہونے کے درجہ میں ہے۔ اور اس کے گھر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے آرام دہ کہا جا سکے۔

اتفاقاً اس کی شادی ہندہ سے ہو جاتی ہے اور ہندہ ایک سرمایہ دار کی چہیتی بیٹی ہے۔ ہندہ کے بچپن اور لڑکپن کے لمحات کچھ اس انداز میں بسر ہوئے کہ دن مسرتوں کے صحن میں گذرا اور رات راحتوں کے بستر پر کٹی۔ وہ نہیں جانتی غربت کیا چیز ہے اور مایوسیوں کا مفہوم کیا ہے۔ اس کو یہ بھی اندازہ نہیں کہ حالات کے نشتر انسانی خواہشوں کے جسم میں کس طرح اتر جاتے ہیں اور خواہشیں دل کی دیواروں سے ٹکرا کر کس طرح دم توڑ دیتی ہیں۔ اس کی اب تک کی زندگی میں کبھی کوئی تمنا پامال نہیں ہوئی تھی اس لئے وہ لفظ پامال کی ابتدا و انتہا سے واقف ہی نہیں تھی۔ اس نے خواہشوں اور تمناؤں کا پروان چڑھنا دیکھا ہے، خواہشوں اور تمناؤں کا قتل عام ہوتے نہیں دیکھا۔

زید ہندہ سے محبت کرتا ہے۔ اسے اپنی آرزوؤں کی حد سمجھتا ہے، اس پر فریفتہ ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کیا ہندہ صرف زید کی محبت پر اکتفا کرے گی اور وہ ہنسی خوشی اپنی عمر عزیز اس صحن میں کاٹ دے گی جو صحن تنگ و تاریک ہونے کے ساتھ ساتھ

غربت وافلاس کا گہوارہ بھی ہے
مرغن غذائیں کھانے والی لڑکی اس دسترخوان پر کیسے قانع ہو جائے گی جو دسترخوان چنے اور مسور کی دال کے سوا ہر چیز سے محروم ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندہ ان چیزوں پر قانع نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ ان محرومیوں اور الجھنوں کو اپنا سکتی ہے جن سے وہ قطعی طور پر نا آشنا تھی ——— لیکن چلئے فرض کر لیجئے کہ ہندہ ان سب چیزوں پر قانع ہو جاتی ہے اور ہر محرومی پر صبر کر لیتی ہے لیکن وہ مزاج کی ان نزاکتوں کو کیسے فنا کر دے گی جو سرمایہ دار کی مرہونِ منت ہوتی ہیں ——— اور زیادہ ان احساسات کا کیسے گلا گھونٹ دے گا جو غربت کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔
نتیجۃً زید اور ہندہ کے درمیان نفرت کی خلیج حائل ہو جائے گی اور ان کی زندگی میں جو تلخیاں پیدا ہوں گی ان کی تمام ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوگی جنھوں نے ان دونوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرتے وقت دونوں کے ان حالات کو نظر انداز کر دیا تھا جن کو نظر انداز کرنا سمجھداری نہیں کہلا سکتا۔
معاملہ اس کے برعکس ہو تو بھی شادی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ یعنی زید غیر معمولی طور پر امیر ہو اور ہندہ غیر معمولی طور پر غریب۔ اس صورت میں زید ہندہ کے جذبات کی قدر نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی ہندہ زید کے وہ نخرے اٹھا سکتی ہے جو "ناجائز نخروں" کی فہرست میں آتے ہیں۔
دوسری مثال:- بکر ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ اسکی تعلیم بھی معمولی نہیں، بلکہ غیر معمولی ہے۔ کئی کئی ڈگریاں اس نے حاصل کر رکھی ہیں۔ اس کی شادی ایسی لڑکی سے ہو جاتی ہے جو الف کے نام بے نہیں جانتی۔ مطلق جاہل، بالکل ان پڑھ یا یہ سمجھئے کہ بکر ایک پرہیزگار اور متورع قسم کا نوجوان ہے اسکی شادی جس لڑکی کے ساتھ کی گئی ہے وہ تقویٰ اور پرہیزگاری تو درکنار فرائض اور واجبات سے بھی غفلت اختیار کئے ہوئے ہے۔ نماز روزے جیسی بنیادی عبادات سے بھی بیزار نظر آتی ہے۔ اسلامی تعلیمات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں، کوئی لگاؤ نہیں۔ یا یہ سمجھئے کہ بکر ایک سیدھا سادا نوجوان ہے۔ فیشن پرستی اور رسم ورواج سے اسے شدید نفرت ہے فلم بینی کو وہ زہر ہلاہل تصور کرتا ہے، گانے بجانے سے اسے خدا واسطہ کا بیر ہے۔ جبکہ اس کی بیوی فیشن پرستی کی اسیر اور رسم ورواج کی غلام ہے۔ فلم دیکھنا اس کے نزدیک ضروری قسم کی تفریحات میں داخل ہے۔ گانوں اور موسیقیوں سے اسے اس درجہ لگاؤ ہے کہ یہ چیزیں اس کے لئے غذا بنکر رہ گئی ہیں۔ وہ جس ماحول سے نکل کر بکر کے گھر میں آئی ہے وہ ماحول فلم بینی، گانے بجانے کو نہ صرف یہ کہ جائز سمجھتا تھا بلکہ اس میں مستغرق تھا ——— بتائیے کہ اس قسم کی شادیاں کہ جس میں طرفین کے درمیان اس درجہ تفاوت ہو، کیا کامیاب ہو سکتی ہیں۔
جب یہ شادیاں کامیاب نہیں ہو سکتیں جن میں معمولی درجہ کی مساوات کو نظر انداز کیا گیا ہو تو پھر بھلا وہ شادی کس طرح کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے جس میں نسلی اونچ نیچ اور برادریوں کے کمتر و برتر ہونے کو کوئی اہمیت ہی نہ دی گئی ہو۔ اور بے سوچے سمجھے ایسے لڑکے اور لڑکی کو نکاح کے بندھنوں میں باندھ دیا گیا ہو جن میں ایک اعلیٰ ترین نسل سے وابستہ ہے اور دوسرا ادنیٰ ترین نسل کا فرد ہے
ہر نسل میں کچھ نہ کچھ خصوصیت اور طرۂ امتیاز ضرور موجود ہوتا ہے۔ اور یہ خصوصیات اور مزاجی کیفیات نسلاً بعد نسل جاری وساری رہتی ہیں۔ ان کے منقطع اور مسلوب ہو جانے کا کوئی سوال نہیں۔ مثلاً ایک قوم میں سلیقہ شعاری کا وصف موجود ہے۔ یہ سلیقہ شعاری کا وصف اس کی ذریات کے اندر کسی نہ کسی درجہ میں ضرور موجود رہے گا۔ یہ تو ممکن ہے کہ ایک نسل کے افراد میں الف بہت زیادہ سلیقہ مند ہو اور جیم نسبتاً کم۔ لیکن یہ بات ممکن نہیں ہے کہ اس نسل میں کوئی فرد ایسا بھی پیدا ہو جائے جو سلیقہ مندی سے کلیتہً محروم ہو۔
بعض قوموں میں بے ڈھنگا پن عام ہوتا ہے اور بے ڈھنگے پن کی یہ عمومیت ان کی تمام نسلوں میں کمی اور زیادتی کے اعتبار سے دیکھنے میں آتی ہے۔
قس علیٰ ہذا۔ اب ٹھنڈے دماغ سے سوچئے کہ جب مختلف برادریوں اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے لڑکے لڑکی کی شادی کر دی جائے گی تو کیا وہ شادی کامیاب

ہوسکتی ہے جب کہ فریقین مزاج اور خصوصیات کے اعتبار سے بالکل جداگانہ کیفیتوں کے مالک ہیں۔ ایک میں سلیقہ شعاری پائی جاتی ہے، دوسرے میں بے ڈھنگاپن ایک میں صفائی کا مادہ ہے دوسرا صفائی سے یکسر غافل ایک معتدل، متوازن اور سنجیدہ مزاج کا حامل ہے اور دوسرے کی طبیعت میں غلو، انتہا پسندی اور غیر ذمہ داری کی خو بو موجود ہے۔ پہلے فریق کو اعتدال، توازن اور سنجیدگی ورثہ میں ملے ہیں اور دوسرے فریق کی طبیعت اور مزاج میں جو رنگ ظاہر ہو رہا ہے وہ بھی توریثی ہے۔ توریثی کا مطلب یہ ہے کہ ان کی فطرتوں کا جزو لاینفک ہیں اور جزو لاینفک کا مطلب یہ ہے کہ اپنے مزاجوں کو بدلنا بھی چاہیں تو نہیں بدل سکتے — جب تک ان کی ذات دنیا میں موجود ہے وہ اجزا بھی موجود رہیں گے جنہیں جدا کرنا ممکن نہیں اور جو ہمیشہ سے ان کی ذات میں مدغم اور ان کی نسل کے ساتھ مربوط و منسلک ہیں۔

بات پیچیدہ ہوگئی۔ گذارش میں یہ کر رہا تھا کہ شریعت نے کس حیثیت کو کس حیثیت پر ترجیح دی ہے اور کس حیثیت کو کن مواقع پر نظر انداز کیا ہے۔ کفاءت کے سلسلہ میں پانچ چیزیں ایسی ہیں جنھیں شریعت نے قابلِ اعتبار اور قابل لحاظ سمجھا ہے۔ اسلام، نسب، پیشہ حریت اور مال۔

اسلام تو سب سے پہلی شرط ہے۔ اسلام سے مراد ہے مسلمان ہونا۔ کسی مسلمان مرد کی شادی غیر مسلمہ عورت سے اور کسی مسلمہ عورت کی شادی غیر مسلم مرد سے کرنا شرعًا جائز نہیں ہے۔ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر اختلافِ دین کو نظر انداز کر کے مسلمان مرد کا نکاح غیر مسلمہ عورت کے ساتھ کر دیا جائے نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم کی ایک آیت اس بات کی دلیل ہے کہ غیر مسلم یا غیر مسلمہ سے شادی کرنا جائز نہیں ہے۔ سورۂ بقرہ میں یوں ارشاد فرمایا گیا:-

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ۔

مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو جب تک ایمان نہ لے آئیں البتہ مسلمان باندی بہتر ہے مشرک عورت سے اگرچہ وہ مشرک عورت تمہیں پسند ہو اور نکاح مت کرو مشرک مردوں سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں البتہ مسلمان غلام بہتر ہے مشرک مرد سے اگرچہ وہ مشرک مرد تمہیں پسند ہو۔

⁂ ⁂ ⁂

اس آیت کے پیش نظر یہ ثابت ہوا کہ اسلام اوّلین شرط ہے۔ کافر مرد اور کافر عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں اس بارے میں تفصیلی گفتگو کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ یہ مسئلہ اس مسئلہ میں غایت درجہ کی یہ احتیاط اور اس احتیاط کا ہر حکیمانہ پہلو اس درجہ ظاہر و باہر ہے کہ شاید کسی صاحب ایمان کی نظروں سے اوجھل ہو اور شاید ہی کسی نام کے مسلمان کو بھی اس سلسلہ میں کوئی اعتراض اور تردد ہو۔

ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عورت انتہائی درجہ کی پاکباز اور متقی ہے۔ اس عورت کے پاس جس شخص نے شادی کا پیغام بھیجا ہے وہ انتہائی درجہ کا فاسق و فاجر ہے۔ اس صورت میں شریعت یہ تاکید کرتی ہے کہ اس پیغام کو رد کر دیا جائے۔ اس لئے کہ پاکباز عورت کی شادی پاکباز مرد کے ہی ساتھ کرنی چاہئے۔ اور بدکار مرد اس لائق ہیں کہ انکی شادیاں بدکار عورتوں ہی کے ساتھ کی جائیں۔ چنانچہ قرآن حکیم ہی کا ارشاد ہے:-

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ، وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ (النور)

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے ہیں اور پاکباز عورتیں پاکباز مردوں کے لئے ہیں اور پاکباز مرد پاکباز عورتوں کے لئے ہیں۔

اسلام تو اوّلین شرط ہے تقویٰ کو اوّلین شرط قرار دینا

تو مناسب نہیں ہوگا لیکن بوقت نکاح یہ لحاظ رکھنا تو ضروری ہوگا کہ طرفین کے درمیان تقویٰ و پرہیزگاری کے اعتبار سے اتنا فرق نہ ہو کہ جسے کھلے تفاوت اور کھلے تضاد کا نام دیا جاسکے۔

کفارت کے سلسلہ کی دوسری کڑی حسب و نسب ہے اور حسب و نسب کی اہمیت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے وہ روایات پیش کی جاسکتی ہیں جنہیں گزشتہ سطور میں نقل کرچکا ہوں علاوہ ازیں دوسرے نظائر بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً اس قسم کی روایات جن میں یہ فرمایا گیا کہ۔

العرب بعضهم اكفاء لبعض قبيلة بقبيلة ورجل برجل۔ — اہل عرب آپس میں بعض بعض کے کفو ہیں۔ قبیلہ قبیلہ کے مقابلہ میں اور فرد، فرد کے مقابلہ میں۔

اگر تمام اہل عرب باہم ایک دوسرے کے کفو ہوتے تو "قبیلة بقبيلة اور رجل برجل" جیسے الفاظ استعمال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ الفاظ بجائے خود اس بات کی دلیل ہیں کہ عربوں کی حیثیت ایک جیسی نہیں ہے۔ وہ متفرق اور متخالف حیثیتوں کے حامل ہیں۔ ان میں مراتب و درجات کے اعتبار سے تفاوت موجود ہے اور اس تفاوت کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم کیا ہے۔

یہاں میں یہ عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ شریعت نے بیاہ شادی کے سلسلہ میں کفارت کو ملحوظ رکھنے کی جو تاکید کی ہے وہ مشورۃً ہے نہ کہ حکماً۔ اگر یہ حکم ہوتا تو اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو شریعت گناہگار قرار دیتی لیکن ایسا نہیں ہے۔ شریعت ان لوگوں کو نافرمان گمان نہیں کرتی جو بیاہ شادی کے سلسلہ میں کفارت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ دیگر یہ کہ اگر کفو میں شادی کرنا ضروری اور لازمی ہوتا تو غیر کفو میں نکاح منعقد ہی نہیں ہوسکتا تھا جیسے کہ کسی مسلمان عورت کا نکاح مشرک مرد سے منعقد نہیں ہو پاتا۔ خواہ اسلامی طور پر نکاح پڑھا گیا ہو یا غیر اسلامی طریقہ پر۔ غیر کفو میں شادی رچانے کو شریعت فعل محمود نہیں سمجھتی۔ ہاں وہ اپنی اتباع کرنے والوں سے ازراہِ نصیحت یہ گزارش تاکیداً کرتی ہے کہ بیاہ شادی کے سلسلہ میں، ہر قسم کی کمتری اور برتری کو ملحوظ رکھیں اور کسی بھی قسم کے تفاوت کو نظرانداز نہ کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں شریعت نے شادی کے سلسلہ میں کفارت کو ملحوظ رکھنے کی جو گزارشات کی ہیں انھیں منجملہ احکامات تصور نہیں کیا گیا ہے بلکہ فقہا نے انھیں مشوروں پر محمول کیا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مشوروں کا رد ایسی غلطی نہیں ہوتا کہ جسے معصیتوں اور گناہوں کی فہرست میں شامل کیا جاسکے اور مشورے رد کرنے والے کو قیامت کے دن محاسبہ و مواخذہ کی گھاٹیوں سے گذرنا پڑے۔

لیکن اس حقیقت کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ شریعت اسلامی کا ہر مشورہ قیمتی اور قابل قبول ہوتا ہے اور ان مشوروں کو قبول کرنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے نقصان کا کوئی پہلو اور کوئی اندیشہ نہیں۔ اور ان مشوروں کا رد بہرحال نہ سہی لیکن بسا اوقات مضر اور نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر یہاں بیوی کے پرائیویٹ تعلقات کا مسئلہ ہے۔ اس بارے میں شریعت نے عام اجازت دی ہے کہ عورت مرد جس طرح بھی مناسب سمجھیں ایک دوسرے سے مقاربت حاصل کریں۔ کوئی پابندی نہیں کوئی روک ٹوک نہیں۔ ایک دوسرے کے جسم کو برہنگی کی حالت میں دیکھنا بھی اس کے نزدیک کوئی گناہ نہیں قرآن حکیم نے صاف فرمادیا ہے کہ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں اور تم اپنی کھیتیوں میں جس طرح اور جس طرف سے چاہے داخل ہوسکتے ہو۔ کسی قسم کی کوئی بندش نہیں لیکن دوسرے مواقعات پر وہ اپنے چاہنے والوں کو یہ مشورہ بھی دیتی ہے کہ اپنی عورتوں کے پاس رات کے اندھیروں میں جاؤ اور اس انداز میں مقاربت حاصل کرو کہ اس پر بے شرمی اور بے حیائی کا اطلاق نہ ہوسکے اور ایک جائز اور پاکیزہ تعلق عیاشی کا مظہر نہ بن جائے۔

بعض لوگ اسلام کے اس مشورے کو نظرانداز کردیتے ہیں اور دن کی روشنی میں وظیفۂ زوجیت ادا کرتے

چونکہ کرہی نہیں سکتے۔ لہٰذا اب دونوں صورتوں کے ماسوا امن و امان اور فتنہ و فساد کے سدباب کی کوئی اور صورت نہیں کہ یا تو وہ ہندہ کے لئے اپنے گھر کے دروازے بند کرلیں، اپنی شفقت و محبت کا گلا گھونٹ دیں، اپنے احساسات کی رگوں میں محرومیوں کے نشتر اتار دیں یا قائم شدہ نکاح کو فسخ کراکر ایسے شخص کو اپنے گھر میں نہ گھسنے دیں جسے اپنا بیٹا کہہ کر انھیں خفت و ندامت ہوتی ہے اور جسے کسی اعتبار سے وہ اپنی لخت جگر کے لائق نہیں سمجھتے۔ ان دونوں صورتوں میں پہلی صورت ظاہر ایسی بھی ہو۔ حقیقتاً خطرناک ہے اس سے جھگڑے اور نسلی فسادات گھٹیں گے نہیں بڑھیں گے۔ مٹیں گے نہیں طول پکڑیں گے۔ ان میں ایک نئی جان پڑ جائے گی۔ یہ ایک نئی ان کے ساتھ ابھریں گے۔

رہی دوسری صورت تو یہی قابل عمل ہے اور اسی کی فقہاء نے اجازت دی ہے۔ لیکن اجازت صرف اسی صورت میں دی ہے جب لڑکی ایسے لڑکے سے شادی کی کہ وہ حسب نسب، پیشہ و کارکردگی، معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے واقعتاً لڑکی کے مثیل اور ہم پایہ نہ ہو۔ اگر لڑکی کے مماثل اور ہم قبیلہ ہے تو پھر والدین کو فسخ نکاح کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔

حاصل یہ نکلا کہ اگر سادات اپنی مرضی اور خوشی سے کسی تیلی، قصائی، بوریا باف وغیرہ کو اپنا داماد بنالیں تو مذہب اسلام کو کوئی اعتراض نہیں، نہ ہی فقہاء اور علماء نے اس بارے میں کوئی روک ٹوک اور پابندی عائد کی ہے۔ لیکن لڑکی اگر اپنی شادی کرتے وقت ماں باپ کی اجازت لینی ضروری نہ سمجھے اور وہ مذکورہ لوگوں میں سے کسی کو اپنا خاوند تسلیم کرلے تو پھر والدین کسی عدالت اور انصاف گاہ کا سہارا لے کر نکاح کو کالعدم کراسکتے ہیں۔ شریعت اس صورت میں نکاح کو کالعدم کرانے کی اجازت دیتی ہے۔ اگر آپ غور و فکر سے کام لیں گے تو یہ بات آپ کے دل و دماغ پر منکشف اور واضح ہوجائیگی کہ اس اجازت اور اس تلقین و اصرار میں کوئی تضاد اور ٹکراؤ نہیں ہے جو اسلام نے چھوت چھات اور نسلی اونچ نیچ سے احتراز کرنے کے لئے کیا ہے۔ شرط یہ ہے کہ غور و فکر کرتے وقت آپ مسئلہ کے کسی کل اور جز کو نظرانداز نہ کریں۔

وہ جوابات جنکے سوالات حذف کردیئے گئے ہیں

مختلف گذارشات

(صوبہ بہار کے اقبال احمد خاں مخاطب ہوں)

آپ کے خط کے ایک حصہ میں میری تعریف و توصیف کے سلسلہ میں آپ نے مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے یہاں تک کہہ ڈالا کہ میں صحیح معنوں میں مولانا عامر عثمانی رح کا جانشین ثابت ہورہا ہوں۔ خدا جانے یہ کہتے ہوئے آپ کی نیت کیا تھی ممکن ہے کہ آپ نے شرمندہ کرنے کے لئے اتنی بڑی بات کہی ہو۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ مقصد صرف مکھن لگانا ہو۔ یا ممکن ہے کہ آپ نے مجھے سراہنے کے لئے تعریف میں غلو سے کام لیا ہو۔ چونکہ امکانات کی دنیا بہت وسیع ہے اس لئے اور بھی کتنی ہی وجوہات کا امکان کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی نیت یقیناً صالح ہوگی۔ آپ کی نیت پر مجھے کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں لیکن آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اسے میں حقیقت پر مبنی نہیں سمجھتا۔ یہ مبالغہ آمیزی ہے۔ مبالغہ آمیزی نہیں تو دلجوئی کہہ لیجئے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ میں اپنی صلاحیتوں کے حدود اربعہ سے بخوبی واقف ہوں۔ لہٰذا میں غلو آمیز تعریف سے قطعاً متأثر نہیں ہوتا۔

آپ کا خط مختلف مسائل پہ مبنی تھا۔ ترتیب وار سب باتوں کا جواب ملاحظہ فرمالیجئے۔

(۱)

مولانا عامر عثمانی رح نے اپنی زندگی میں بھی تجلی کی ڈاک کا کام مجھ سے کرایا ہے۔ ان گنت مرتبہ ایسا ہوا کہ انھوں نے خطوط میرے حوالے کئے اور یہ حکم دیا کہ میں ان خطوط کے شرعی جواب دوں۔ بات چونکہ ماضی قریب ہی کی ہے اس لئے یہ بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ خطوط کی گڈی دیتے وقت

وہ بتاکید یہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر خط میں سے صرف تین سوالوں کے جواب دیا کرو جو خط تین سے زائد سوالوں پر مشتمل ہو اسے نظر انداز بھی کر سکتے ہو۔ ورنہ سیدھی سی بات ہے کہ تین سوالوں کے جواب دیکر دوا نہ کرو۔ سب کے جواب دینا ضروری ہیں۔ یہی طریقہ بذات خود مولانا نے بھی اپنا رکھا تھا۔ وہ تین سے زائد سوالوں کے جواب دینے سے بالعموم گریز کیا کرتے تھے۔

ممکن ہے کہ آپکے دس سوالوں کے جواب بھی انھوں نے کسی موقعہ پر ایک ساتھ دے ڈالے ہوں لیکن خلاف معمول تھی۔ آدمی اپنی زندگی میں کتنے ہی کام خلاف معمول بھی کرتا ہے۔ کتنی ہی بار وہ اپنے اصولوں اور قاعدوں کو توڑ دیتا ہے۔ انھوں نے اپنے اصول اور معمول کے خلاف ایک بار نہیں دس بار بھی اگر کسی کے بہت سے سوالوں کے جواب ایک ساتھ مرحمت فرما دیئے ہوں تو اس سے ان کے معمولات و قواعد پر کوئی اثر واقع نہیں ہوتا۔ ان کے کسی بھی خلاف معمول فعل کو بطور تنبیہ پیش کرنا کم از کم میرے نزدیک مناسب نہیں ہے۔

تجلی میں کتنی ہی بار انہوں نے یہ اعلان شائع کیا کہ ایک بار میں تین سوالات سے زائد ہرگز ہرگز مت بھیجئے اگر کسی صاحب نے ایک مرتبہ میں تین سوالات سے زیادہ ارسال کئے تو ان کے خط کو ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا جائیگا یہ اعلان متعدد بار تجلی میں شائع ہوا۔ اس لئے تجلی کا فائل اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ لیکن بے شک تجلی کے صفحات اس بات کی گواہی بھی پیش کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ثلثہ کی حد بندی سے گذر کر پانچ چھ سوال روانہ کئے اور مولانا نے سب سوالوں کے جواب دیئے اور تین سے زیادہ سوالات ارسال کرنے پر کوئی شکوہ نہیں کیا۔ کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔

دراصل عام قاعدہ اور اصول تو یہی تھا کہ ان لوگوں کے سوالوں کے جواب دیئے جائیں جو شرائط و قواعد کا لحاظ رکھتے ہوں۔ لیکن کبھی کبھی کسی کسی پر اپنا خاص کرم اور احسان بھی فرمادیا کرتے تھے۔ یا کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ سائل تین سے زائد سوال بھیجتا اور اس کا دریافت کردہ ہر سوال انتہائی اہم اور قابل اشاعت ہوتا۔ لہٰذا مولانا ضرورتاً سب سوالوں کا جواب عنایت فرما دیتے۔ بہرحال صرف تین سوالوں کا جواب دینا تو عدل تھا اور تین سے زائد سوالوں کا جواب دینا ماسوا فضل کے کیا کہلائے گا۔ فضل کہئے یا ضرورت لیکن نا انصافی بہرحال نہیں کہیں گے۔ بے راہ روی کا نام بھی نہیں دیں گے۔ میں نے بھی ان ہی اصولوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے جو مولانا نے وضع کئے تھے اور جن پر زندگی بھر ان کا عمل رہا۔ یعنی یہ کہ تین سوالوں کا جواب دیا جائے۔ اگر کوئی صاحب تین سے زائد سوال ارسال کریں تو بس تین سوالوں کے جواب دے دیئے جائیں اور بقیہ سوالوں کو جواب سے محروم رکھا جائے۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ جو لوگ ہماری شرائط کو قابل التفات نہیں سمجھتے ان کے سوالوں کو قابل التفات نہ سمجھا جائے۔ لیکن اگر میں کبھی کسی کے تین سوالوں سے زائد جواب دے دوں خواہ سائل آپ ہی ہوں تو میری اس حرکت کو فضل پر محمول کر لیجئے۔ یا مصلحت اور ضرورت پر۔

آپ نے وقتاً فوقتاً تجلی کی ڈاک سے پہلے کچھ شرائط ضرور دیکھی ہوں گی۔ منجملہ ان میں ایک شرط یہ بھی ہوتی تھی کہ سوالات ارسال کرتے وقت اس بات کا لحاظ رکھئے کہ تحریر گندی نہ ہو۔ الفاظ کٹے پھٹے اور لنگڑے لولے نہ ہوں۔ جو شخص ان شرائط کو ملحوظ نہیں رکھے گا اس کے سوالات ردی کی ٹوکری میں جھونک دیئے جائیں گے۔ لیکن کتنی ہی بار یہ ہوا اور اب بھی ہوتا رہتا ہے کہ انتہائی گندی تحریریں اور انتہائی کٹے پھٹے الفاظ میں سوالات پر مشتمل خطوط آئے اور ان کے جواب دیئے گئے اور دیئے جا رہے ہیں۔ بلاشبہ اس صورت میں جواب دینا خلاف معمول اور خلاف ضابطہ ہے۔ لیکن انسان زندگی میں ایک بار نہیں بے شمار مرتبہ اپنے معمولات و ضوابط کے خلاف قدم اٹھاتا ہے۔ کبھی احساناً اور کبھی ضرورتاً۔

(۲) ہماری کوشش تو خود یہی ہوتی ہے کہ سائل کا نام اور پتہ مختصر ضرور شائع کیا جائے۔ لیکن بعض اوقات

ہم ایسا کرنے سے مجبور ہوتے ہیں جب سائل نے اپنا نام پتہ یا تو لکھا ہی نہ ہو یا اس انداز میں لکھا ہو کہ اسے اٹکل سے پڑھنا بھی ممکن نہ ہو۔ آپ کے سوالنامہ کو ہم نے ایک بار پھر دیکھا کہ کہیں کاتب کی نظروں سے چوک نہ ہو گئی ہو۔ لیکن سوالنامہ دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ کاتب کا کوئی قصور نہیں۔ قصور آپ کا اور صرف آپ کا ہے۔ آپ اپنا نام و پتہ لکھنا تو نہیں بھولے لیکن آپ نے اپنا نام لکھا کچھ اس انداز میں ہے کہ اسے کوئی صاحب کرامت آدمی ہی پڑھ سکتا ہے۔

بہرحال کوشش بسیار کے باوجود جب آپ کا نام پڑھا نہیں جا سکا تو کاتب نے جگہ خالی چھوڑ دی۔ کاپیوں کی تصحیح کرتے وقت ہم نے خالی جگہ میں (نام ندارد) لکھ دیا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ اس بات کا لحاظ رکھئے کہ اپنا نام و مکمل پتہ صاف صاف تحریر کریں اور اردو میں ضرور تحریر کریں اگر سائل کا نام صاف لکھا ہوا ہو تو پھر اس کے نام کو حذف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نام حذف کرنے میں ہمیں کیا فائدہ ہو سکتا ہے اور سائل کا نام چھاپنے میں ہمیں کونسا نقصان ہے۔ اب دیکھ لیجئے اس بار آپ نے اپنا نام کھلے اور صاف انداز میں تحریر کیا ہے جس کا پڑھنا کوئی دشوار اور مشقت طلب بات نہیں۔ لہٰذا ہم سوال کی پیشانی پر آپ کا نام دے رہے ہیں اور اس علاقہ کا نام بھی چھاپ رہے ہیں جس علاقہ کے آپ باشندے ہیں۔

(۳) صدق جدید کا پرانا فائل ہمارے پاس نہیں ہے لہٰذا آپ نے جو کچھ مولانا دریابادی کی طرف منسوب کیا ہے اس کی تحقیق کر لینا ممکن نہیں ہے۔ جب تردید و تصدیق کا کوئی ذریعہ میسر نہ ہو تو آدمی پورے اطمینان کے ساتھ کسی مسئلہ میں کیسے زبان کھول سکتا ہے۔ پھر بھی آپ کی تحریر پر اعتماد کرتے ہوئے چند باتیں گزارش کئے دے رہا ہوں چونکہ جولائی و اگست کے شمارے میں علم غیب کے مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے اور آپ اس گفتگو سے مطمئن بھی ہیں لہٰذا فی الوقت تفصیلی جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ نہ ہی تفصیل میں جانے کا موقعہ ہے۔ اجمالی طور پر یہ بات ذہن نشین کر لیجئے

کہ قرآن حکیم کی آیت میں جن چیزوں کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان کا صحیح علم صرف ذات خداوندی کو ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حاملہ کے پیٹ میں کیا ہے۔ لڑکا ہے یا لڑکی۔ یہ کہنا کہ قرآن میں تو صرف دو چیزوں کے علم صحیح کی نفی کی گئی ہے قطعاً غلط ہے اور کم از کم ہمارے نزدیک تو ہے ہی غلط۔ ہم سے مراد میں اور میرے اہل خانہ نہیں۔ بلکہ وہ تمام حضرات ہیں جو دیوبندی کہلاتے ہیں اور جو صحیح راہ اعتدال پر قائم ہیں۔ بلاشبہ آلات اور دوسرے وسائل کے ذریعہ اس بات کا کچھ نہ کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حاملہ کے پیٹ میں اولاد نرینہ یا غیر نرینہ ہے لیکن آلات اور وسائل کے ذریعہ بھی حاملہ کے پیٹ میں سانس لینے والے بچے کا قطعی اور حتمی علم حاصل نہیں ہو سکتا قطعی اس علم کو کہتے ہیں جس میں خطا کا امکان نہ ہو۔ غلطی کا شائبہ تک نہ ہو۔ بھول چوک کی توقع نہ ہو۔

اور یہ بات ممکن نہیں ہے کہ حاملہ کے پیٹ میں مقیم اولاد کے بارے میں کسی بھی طرح قطعی علم حاصل کر لیا جائے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ یہ تو ہو سکتا ہے علائم اور آلات جدیدہ کے توسل سے جو علم حاصل کیا جائے وہ روپے میں بارہ آنے صحیح ہو لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ مذکورہ چیزوں کے توسل سے حاصل شدہ علم روپے میں سولہ آنے صحیح ہو۔

مولانا دریابادی نے دو چیزوں کے بارے میں جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ قرآن حکیم نے ان کے علم غیب کی نفی کی ہے یعنی ان کا علم کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی غلط ہے۔ آثار و علائم اور آئیڈیوں کے ذریعہ ان کا علم بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً آپ نے دیکھا ہو گا کہ اکثر بڑے بڑے لیڈروں کے بارے میں اخبارات میں یہ اطلاعات شائع ہو جاتی ہیں کہ فلاں صاحب اس تاریخ میں اس پروگرام میں شریک ہوں گے اور فلاں تاریخ میں اور فلاں دن اور فلاں وقت اس شہر میں سفر کریں گے اور ان ان پروگراموں اور محفلوں میں شرکت فرمائیں گے اور بسا اوقات یہ سب کچھ صحیح ثابت

ہوتا ہے۔ یعنی لیڈر صاحب نے یہ پروگرام مرتب کیا کہ چھبے دس جنوری کو بمبئی کا سفر کرنا ہے اور وہاں ایک دوکان کا افتتاح کرنا ہے اور رات کو آٹھ بجے وہیں ایک تقریر بھی کرنی ہے پندرہ دن بعد مقررہ تاریخ آتی ہے اور لیڈر صاحب سوچے سمجھے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق بمبئی جاتے ہیں دکان کا افتتاح کراتے ہیں۔ تقریر کرتے ہیں۔ اب بتائیے پندرہ دن پہلے ہی انھیں کتنی ہی باتوں کا علم ہو گیا یا نہیں اور اخبارات پڑھنے والوں کو اس کا علم پہلے ہو گیا تھا یا نہیں کہ فلاں صاحب فلاں دن فلاں جگہ کا سفر کریں گے اور فلاں وقت یہ یہ خدمت انجام دیں گے۔

رہی دوسری بات تو اس کا قطعی علم بھی بسا اوقات پہلے ہی حاصل ہو جاتا ہے۔ ایک مریض ہسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ ڈاکٹر اس کی زندگی سے قطعاً مایوس ہو چکا ہو، اسے ایک فی صد بھی اس کے بچنے کی امید نہ ہو۔ وہ مریض کی نبض ٹٹولتا ہے آلات لگا کر اس کی رگوں میں پھرنے والی گرمی اور سردی کا جائزہ لیتا ہے۔ بلڈ پریشر کا معائنہ کرتا ہے اور پھر پر یقین لہجہ میں آپ سے عرض کرتا ہے کہ یہ شخص ایک گھنٹے کے اندر اندر دم توڑ دے گا۔ آپ اس شخص کے بارے میں ایک اگلی بات کا یقین دل میں جما لیتے ہیں کہ یہ شخص اس ہسپتال میں دم توڑے گا اور تھوڑی دیر کے بعد واقعتاً وہ شخص دم توڑ دے۔ اب ڈاکٹر صاحب کو بھی عالم الغیب کہئے اور آپ کو بھی۔ ڈاکٹر نے پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ شخص کب مرے گا اور مرنے سے پہلے ہی آپ اس نتیجہ پر پہونچ چکے تھے کہ اس کی موت کہاں واقع ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر بلا وجہ کی کھینچ تان کی جائے اور منطق کے اندھے میدان انسانی عقل کے لنگڑے گھوڑے دوڑانے کی ٹھان لی جائے تو پھر آدمی قرآن کی ایک آیت پر نہیں تمام آیات پر اشکال ہو گا۔ اور قرآن کا کوئی بھی دعویٰ ایسا نظر نہیں آئے گا جس میں کمزوری نہ ہو۔ آدمی بھینگا ہو تو دنیا کی تمام چیزیں ایک کی دو نظر آتی ہیں۔ اور اگر آدمی اپنی آنکھوں پر آتشی آئینے چڑھا لے تو اسے ہر چیز دوگنی اور چارگنی نظر آئے گی۔

یہی حال عقل کا بھی ہے۔ اگر عقل بھینگی ہے تو ایک کے دو اور دو کے چار نظر آئیں گے اور عقل کی آنکھوں پر آتشی آئینوں کی عینک چڑھی ہوئی ہے تو پھر اسے ہر چیز اپنے صحیح وجود میں نظر آ ہی نہیں سکتی۔

اندازہ ہوا کہ انسان کے عقل و فہم کا کوئی اعتبار نہیں لہٰذا آنکھیں بند کر کے قرآن کے ہر دعوے کو تسلیم کیا جائے اور اگر کوئی خارجی علم قرآن کے دعوے سے ٹکرا رہا ہے تو اسی علم کی تاویل کی جائے نہ یہ کہ قرآن کی آیات میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور ان دعووں کی توجیہ کی جانے لگے جو اٹل ہیں، قطعی ہیں، مضبوط و منضبط ہیں۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ جو علم آثار و شواہد اور وسائل و ذرائع کے توسط سے حاصل کیا جائے گا وہ قطعی ہو یا نہ ہو اس پر علم غیب کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ اور ایسا علم قرآن کی ان آیات سے بالکل بالکل اور ہرگز ہرگز نہیں ٹکراتا جن میں کھلے الفاظ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اِن اِن چیزوں کا غیبی اور پیشگی علم خالق اکبر کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں۔

علم غیب کہتے ہی اسے ہیں کہ جو کسی خارجی توسط کے بغیر حاصل ہو۔ آثار و قرائن کا سہارا لے کر کسی ہونے والی چیز کے بارے میں کوئی علم حاصل کر لینا نہ علم غیب کہلا سکتا ہے اور نہ ہی قرآنی دعوے کو کمزور بناتا ہے۔

خدا جانے مولانا دریا بادی نے یہ بات کیسے کہہ دی ہے کہ برطانیہ نے جو آلہ ایجاد کیا ہے اس کے ذریعہ سے حاملہ کے پیٹ سے جنم لینے والے بچہ کا قطعی ادراک کر لیا جاتا ہے کہ آیا وہ لڑکا ہو گا یا لڑکی۔ اگر وہ لفظ قطعی تحریر نہ کرتے تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ لیکن اس لفظ قطعی نے ان کی تحریر کو قابل اعتراض بنا دیا ہے۔ آثار و علائم اور آلات و وسائل کے توسط سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی قطعی اور حتمی نہیں ہو سکتا۔ غلطی اور خطا کا امکان بہرحال اس میں ہوتا ہے ایکسرے جسم کی اندرونی خرابیوں کے ادراک کر لینے کا ایک اچھا ذریعہ ہے لیکن ایکسرے کی مشین پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کیا جاتا۔ اس لئے کہ بعض اوقات ایکسرے کی مشین

کسی کے اندرون جسم کے بارے میں تصویری طور پر جو علم پیش کرتی ہے وہ علم حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔

بہر حال مولانا عبدالماجد دریابادی کے ارشاد گرامی سے ہمیں اتفاق نہیں۔ ہمارے نزدیک قرآن نے جن چیزوں کے پیشگی علم کو صرف خدا کا احاطۂ علم قرار دیا ہے ان میں ینزل الغیث بھی داخل ہے اور ما فی الارحام بھی۔

رہا پیش گوئی اور آبپاریوں کا معاملہ تو وہ قرآن کی آیات سے نہیں ٹکراتا۔ علم غیب تو صرف اسے کہتے ہیں جو آثار و علائم اور شواہد و قرائن سے بے نیاز ہو۔ اگر دنیا میں کبھی کوئی ایسا آدمی پیدا ہو جائے جو کسی تہہ خانہ کی گہرائی میں گوشہ نشین ہو کر یہ ظاہر کرتا رہتا ہو کہ دنیا کے کسی گوشہ میں کیا ہونے والا ہے۔ کہاں کہاں بارش ہونے والی ہے کون کون عورت حاملہ ہے اور کس سے کیا کیا پیدا ہونے والا ہے، تو ہم بھی گھبرائیں گے اور ہمیں بھی قرآن کے دعوے میں کمزوری محسوس ہوگی۔ لیکن جب تک کوئی ایسا علامۂ غیب جنم نہیں لیتا ہمیں قرآن کی کسی آیت کی تاویل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ ہی اس بات کی ضرورت ہے کہ قرآن حکیم نے چار چیزوں کے علم کی نفی کی ہو اور ہم یہ باور کرانے میں لگ جائیں کہ صرف دو چیزوں کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان کا علم خدا کے ماسوا کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور باقی دو چیزوں کا ذکر تو بس یوں ہی یا از راہ تکلف ہے۔

اگر ایسا ہوتا کہ صرف دو ہی چیزوں کے علم غیب کی نفی مقصود ہوتی تو پھر بقیہ چیزوں کو یہاں ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی اور ایک ساتھ ذکر کرنا کسی مصلحت کے پیش نظر مناسب و انسب ہوتا تو پھر ان کے درمیان کسی قسم کی کوئی حد امتیاز تو قائم کی جاتی۔ قرآن کا انداز بیان اور ترتیب کلمات ملاحظہ فرمائیے :۔

وعندہ علم الساعۃ وینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام وما تدری نفسٌ ماذا تکسب غداً وما تدری نفسٌ بای ارض تموت۔

اس آیت میں پانچ چیزوں کا تذکرہ ہے۔ اگر قیامت کا اور آخری دو باتوں کا ذکر ایک ساتھ ہوتا اور بقیہ باتوں کا ایک ساتھ تو یہ کہنے والا کسی حد تک حق بجانب ہوتا کہ دو چیزوں کے علم کی نفی کی گئی ہے اور بقیہ دو چیزیں ان میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن دیکھ لیجئے سب سے پہلے قیامت کا ذکر کیا پھر بارش کا اور پھر وغیرہ وغیرہ کا۔

اب کسی کا یہ کہنا کیونکر قابل تسلیم ہو سکتا ہے کہ پہلی بات اور آخری دو باتیں ایک الگ مسئلہ ہیں اور درمیانی دو باتیں الگ مسئلہ سے متعلق ہیں۔ دو کی نفی ہے اور تین کی نہیں۔ آپ براہ راست مولانا دریابادی سے بھی تحقیق کریں دیکھئے وہ کیا فرماتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہو خود انھیں بھی اب اس سے اتفاق نہ ہو۔

(۴) فلاح دین: دنیا دیوبند میں تو دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ دہلی سے منگائی گئی ہے ابھی مطالعہ کی نوبت نہیں آسکی۔ مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچیں گے وہ تجلی کے صفحات میں شائع کر دیا جائے گا۔ یہ کتاب صرف آپ کے حکم دینے کی وجہ سے مہیا کی گئی ہے ورنہ اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لئے فرصت ہی کہاں ہے۔ آپ نے خط کے آخر میں جو دعا کی ہے اس پر میں دل کی گہرائی سے آمین کہتا ہوں۔

تبلیغی جماعت سے متعلق چند باتیں

راجمندری کے دبیر جانی باشا مخاطب ہوں۔

میں ایسے کتنے ہی لوگوں سے واقف ہوں جو پہلے تبلیغی جماعت سے وابستہ تھے اور اب کلیۃً تبلیغی جماعت سے کنارہ کشی اختیار کر چکے ہیں۔ ان لوگوں نے تبلیغی جماعت میں کوئی خامی اور برائی محسوس کی ہوگی۔ بغیر کچھ محسوس کئے تبلیغی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

یہ بات قطعاً بچکانہ ہے کہ باہر سے ہم پر اعتراض مت کرو۔ ہم میں شامل ہو جاؤ۔ کچھ دن ہمارے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلو تاکہ ہماری حقانیت اور

اسلام پرستی تم پر واضح ہو جائے۔ یہ بات کسی بالغ ذہن رکھنے والے آدمی کی زبان سے خارج نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی جماعت کی حقانیت اور ضلالت و گمراہی کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لئے اس سے رشتۂ انسلاک قائم کرنا ہی ضروری ہے تو پھر ہمیں چند ماہ کے لئے قادیانیوں اور بریلویوں کے ساتھ بھی نشست و برخاست کرنی چاہیئے اور دوسرے تمام گمراہ اور ضال و مضل فرقوں کے ساتھ بھی میل جول رکھنا چاہیئے تاکہ ان کی صحیح حقیقت کا ادراک ہو سکے۔

تبلیغی جماعت میں دو چار چلے دیکر بلا شبہ آدمی تبلیغی جماعت کا مرید بن جاتا ہے۔ اس کا ہمیں بھی تجربہ ہے۔ لیکن ایک تبلیغی جماعت ہی کیا کسی بھی فرقے میں شامل ہو جائیے چند ماہ کے بعد اس سے تعلق منقطع کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ اس فرقے کی تمام باتیں آپ کو عین حق محسوس ہوں گی اور آپ یہ عقیدہ بنا لیں گے کہ بس دنیا میں یہی فرقہ صراط مستقیم پہ گامزن ہے باقی سب ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ کسی پکے حنفی کو غیر مقلدین کی صحبت میں ایک ماہ رہنے کا اتفاق ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ وہ شخص تقلید کرنے والوں پر کیسی کیسی کیچڑ اچھالے گا۔ کیسی کیسی گالیاں بکے گا اور چیخ چیخ کر کہے گا کہ ائمہ کی تقلید کرنے والے اور تقلید کرنے والیاں سب کی سب گمراہ اور باطل پرست ہیں بلکہ ساری دنیا ہی گمراہوں کے اندھیروں میں دھکے کھا رہی ہے۔ لے دے کے ایک غیر مقلد حضرات ہی حق پرستی کا پلہ پکڑے ہوئے ہیں۔

کسی پکے اہل سنت والجماعت آدمی کو بریلویوں کی محفل بابرکت میں بٹھا دیجئے وہ ان کے من گھڑت اور کچے پکے دلائل سنکر یہ محسوس کرے گا کہ اب تک وہ غلط راہوں میں بھٹک رہا تھا آج اسے ہدایت نصیب ہو سکی ہے۔ کچھ نہیں تو کم از کم یہ بات تو اس کے ذہن میں کودتی پڑے گی کہ ہم دیوبندی مسلک کے لوگ خواہ مخواہ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں یہ حضرات تو بڑی اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی مجلس میں تو بڑا دل لگتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ گمراہ سے گمراہ عالم کی تقریر سن لیجئے۔ اگر آپ عالم نہیں ہیں تو آپ کے دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ پھر ایک تبلیغی جماعت کی کیا خصوصیت ہے اگر وہ چند چلوں میں کسی کو متاثر کر کے اپنا بنا لے۔

یہی بات ایک عرصہ سے جماعت اسلامی والے بھی کہہ رہے ہیں کہ ہماری حقانیت اور اسلام پرستی کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ہماری دعوت پر گہری نظر نہ ڈالی جائے اور ہمارے لٹریچر کا مطالعہ نہ کیا جائے۔

ایک مدت سے یہ حضرات عوام و خواص سے یہ گزارش کر رہے ہیں کہ ہماری کتابیں پڑھو، ہمارے لٹریچر پر گہری نظر ڈالو تاکہ تمہیں اندازہ ہو سکے کہ ہم بھی اور دوسرے خدام اسلام کی طرح اسلام کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سوا ہمارا اور کوئی منشا و مقصد نہیں۔ تبلیغی جماعت میں سے کتنے ایسے افراد ہیں جنھوں نے جماعت اسلامی والوں کی گزارش کو قبول کر لیا ہو اور انھوں نے تعصبات سے ہٹ کر ایک بار مولانا مودودی کی کسی ایک کتاب کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارہ کی ہو۔ اگر ایسے افراد کی تعداد پانچ فیصد بھی نہیں ہے تو پھر تبلیغی جماعت کو نہ یہ گزارش کرنی چاہیئے کہ ہماری صحیح حقیقت کا اندازہ کرنے کے لئے ہمارے اندر شامل ہو کر دیکھو اور نہ اس بات کی توقع رکھنی چاہیئے کہ دنیا کے ہوشمند حضرات ان کی اس بچکانہ بات کو مان لیں گے اور ان سے رشتۂ و تعلق قائم کر لیں گے۔

ہم نے تبلیغی جماعت کو کبھی گمراہ نہیں سمجھا اور ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ جماعت جو کام کر رہی ہے وہ نبیوں والا کام نہیں ہے۔ ہم نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ یہ جماعت اسلام پرست جماعت ہے اور یہ جماعت جو خدمت

انجام دے رہی ہے وہ انتہائی شاندار اور قابلِ مبارکباد ہے۔ ہمیں تو صرف تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار سے اختلاف ہے۔ یہ اختلاف کل بھی تھا، آج بھی ہے اور اس وقت تک باقی رہے گا جب تک تبلیغی جماعت اپنے طریقۂ کار میں کوئی مناسب ترمیم نہیں کرتی اور اس تشدد اور زبردستی سے باز نہیں آجاتی جو حق کی نہیں باطل کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔

مروّجہ گشت کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ یہ سنت ہے انتہائی لغویات ہے۔ جو صاحب یہ دعویٰ کرتے ہوں ان سے بطور دلیل کسی ایسی روایت کا حوالہ طلب کیجئے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بالکل یہی طریقہ رائج تھا جس کو تبلیغی جماعت اختیار کئے ہوئے ہے

جو صاحب یہ کہتے ہیں کہ ہم تو نبیوں والے کام میں لگے ہوئے ہیں ان سے صرف اتنا عرض کر دیجئے کہ بیوی کے ساتھ صحبت کرنا بھی انبیاء کی سنت ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی ہر وقت اپنی بیوی سے صحبت ہی کرتا رہے اور بیوی کے احتجاج کرنے پر چیخ اٹھے کہ چپ رہو میں نبیوں والا کام کر رہا ہوں۔

تبلیغی جماعت جو کچھ کر رہی ہے وہ بلاشبہ وہ ڈیوٹی ہے۔ جو ڈیوٹی منجانب اللہ انبیاء کو سونپی گئی تھی اور زندگی بھر تمام انبیاء نے اس ڈیوٹی کو نبھایا۔ جو بھی یہ ڈیوٹی انجام دے گا اور اللہ کے دین کو پھیلائے گا وہ بلاشبہ مبارکباد کا مستحق بھی ہوگا اور انعام واکرام کا بھی۔ اشاعتِ اسلام اور تبلیغ دین کی پاکیزگی اور اچھائی ظاہر دیا ہر ہے کون بدنصیب مسلمان اس عبادت اور ڈیوٹی کو غلط قرار دے سکتا ہے۔ لیکن کسی کام کی اچھائی اور پاکیزگی کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آدمی ہر وقت اسے ہی کرتا رہے اور اس کے ماسوا کچھ اور کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ نماز کی حالت میں بندہ خدا سے قریب تر ہوتا ہے لیکن ہر حالت میں نماز پڑھنے کو جائز نہیں سمجھا گیا ہے۔ بعض اوقات مجبوریوں کے پیش نظر نماز قضا کی جا سکتی ہے بلکہ بعض اوقات تو نماز نہ پڑھنا ہی افضل اور پڑھنا گناہ ہے بیوی کے ساتھ صحبت کرنا بھی نبیوں کا کام ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اسے صدقہ قرار دیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ آدمی ہر وقت اپنی بیوی سے استمتاع کرتا رہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر چونکہ میں نبیوں کی سنت ادا کر رہا ہوں لہٰذا نامۂ اعمال میں مسلسل نیکیاں لکھی جا رہی ہوں گی۔ جس طرح ہر وقت نماز پڑھنا جائز نہیں اور جس طرح ہر وقت بیوی پر مسلط رہنا جائز نہیں، اسی طرح ہر وقت اور ہر حالت میں وہ تبلیغ دین بھی جائز نہیں جس کے مقدس و محترم اور اشرف و اعلیٰ ہونے میں کسی بھی مسلمان کو کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔

تبلیغی جماعت جس کام میں سرگرداں اور مشغول ہے وہ کام قابلِ ستائش بھی اور لائق اجر بھی، موجب طمانیت بھی ہے اور باعث رحمت بھی۔ ہم نے کبھی یہ کہنے کی جسارت نہیں کی کہ یہ جماعت گمراہ اور بد دین ہے اس کے عقائد فاسد و کاسد ہیں۔ اس کی اتباع باعث ہلاکت ہے۔

نہ ہم کبھی بعض دوسرے غیر محتاط لوگوں کی طرح یہ کہنے کی جرأت کریں گے کہ تبلیغی جماعت والوں کو اپنی مساجد میں مت گھسنے دو یہ لوگ دین کے ڈاکو ہیں۔ لیکن یہ کہنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں کہ تبلیغی جماعت کے لوگ اسلام کے نادان دوست ہیں اور نادان دوستوں سے جو نقصانات پہنچتے ہیں اس سے ساری دنیا باخبر ہے۔

مدت سے ہماری خواہش ہے کہ تبلیغی جماعت کے لوگ اپنے طریقوں میں تھوڑی سی ترمیم کر لیں اور اس تشدد دعناد سے باز آجائیں جو بہرحال مضر اور مہلک ثابت ہوتا ہے۔ ابھی تک ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی ہے بظاہر اس خواہش کے پوری ہونے کی توقع بھی نہیں۔ تاہم چونکہ امید پر دنیا قائم ہے لہٰذا ہم ابھی تک تبلیغی جماعت سے مایوس نہیں ہیں۔ ہمارے زمانے میں ایک سب سے بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ ہر جماعت اس خوش گمانی میں

بتلاتے ہے کہ بس ہم ہی حق پرست اور قرآن و حدیث کے متوالے ہیں۔ ایک ہمارا ہی طریقۂ کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور طریقۂ کار کے مشابہ ہے۔ ایک ہم ہی صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ حالانکہ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو بآسانی یہ اندازہ ہو جاتا ہے۔ تمام حق پرست اور ہدایت یافتہ جماعتیں اپنے اپنے طور پر جو کام کر رہی ہیں وہ قابلِ داد ہے۔ ہر جماعت کچھ نہ کچھ ایسی صلاحیتوں اور خصوصیتوں کی حامل ہے جو دوسری جماعتوں میں نظر نہیں آتیں۔ تبلیغی جماعت جو خدمت انجام دے رہی ہے وہ خدمت جماعت اسلامی کے بس کا روگ نہیں اور جماعت اسلامی جس کام میں لگی ہوئی ہے وہ کام تبلیغی جماعت انجام نہیں دے سکتی۔ علمائے دیوبند جن خدمات میں مصروفِ عمل ہیں ان خدمات کو نبھانے کی اہلیت نہ ہی جماعت اسلامی میں پائی جاتی ہے اور نہ ہی تبلیغی جماعت میں۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام جماعتیں حق پرست ہیں اور دنیا کو حق پرست بنانا چاہتی ہیں۔ ہم ان جماعتوں کی حق پرستی کے قائل ہیں اور ان کی خدمات کو قابلِ ستائش تصور کرتے ہیں لیکن افسوس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ان میں سے کوئی بھی جماعت، کوئی بھی گروہ تشدد اور خناس کا مظاہرہ کرے۔ فریبازی اور اکھڑپن سے کام لے اور یاور کرانے کی کوشش کرے کہ بس ہماری ہی جماعت، ہمارا ہی طائفہ صحابۂ کرام کے نقش پر چل رہا ہے۔ باقی تمام جماعتیں شیطان کی تقلید میں لگی ہوئی ہیں۔

یوسف علیہ السلام سے متعلق جو واقعہ آپ نے نقل کیا ہے تاریخی طور پر اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ سراسر ہوائی اور ذہنی گھڑت ہے۔ آپ اس قسم کے واقعات کی تحقیق کرنے کے چکر میں پڑیں گے تو عمرِ نوح بھی کفایت نہیں کرے گی۔ واعظین اپنی تقریروں اور وعظوں میں ایک نہیں ان گنت، ایسے واقعات سامعین کے کانوں میں انڈیل دیتے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ آپ کس کس واقعہ کی چھان بین کریں گے اور کب تک۔

الغرض۔ تبلیغی جماعت جو کام کر رہی ہے وہ بلاشبہ انبیاء والا کام ہے لیکن تبلیغی جماعت نے انبیاء والے کام کو اشاعت دینے کا جو طریقہ اپنایا یہ طریقہ انبیاء کے طریقۂ کار سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ انبیاء ہماری ہی طرح گشت کیا کرتے تھے۔ ہماری ہی طرح چلے بازی کیا کرتے تھے۔ ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ جو لوگ ایسی غلط باتیں کریں آپ ان سے الجھئے نہیں اس لئے کہ ناداں سے الجھنا خود نادانی ہے۔ ہاں البتہ ایسے لوگوں کی کچھ دار باتوں میں آنے کی ضرورت نہیں۔

نماز میں ترتیب قرأت

(کشمیر کے یونس ملک مخاطب ہوں)

۱ جو شخص یہ کہتا ہے کہ نماز میں ترتیب قرأت ضروری ہے اسے "نیم ملّا" تصور کیجئے۔ اور جس طرح نیم حکیم بلاشبہ خطرۂ جان ہوتا ہے، اسی طرح نیم ملّا حضرات بالیقین خطرۂ ایمان ہوا کرتے ہیں۔ اللہ ہمکو اس ذہنی اور غیر ذمہ داری سے محفوظ رکھے۔ آجکل تحقیق کے بغیر اظہارِ رائے کرنے کی وبا عام ہو گئی ہے۔ اور یہ وبا انتہا درجہ کی مضر اور مہلک ثابت ہو رہی ہے۔

ذمہ داری کا احساس رکھنے والے فقہاء نے اس سلسلہ میں یہ تصریح تو ضرور کی ہے کہ نماز میں جان بوجھ کر سورتوں کی ترتیب الٹ دینا باعث کراہیت ہے لیکن کسی بھی ذمہ دار اور ذی علم شخصیت نے یہ ناقص بات کبھی زبان سے نہیں نکالی کہ خلاف ترتیب قرأۃ نماز کو فاسد کر دیتی ہے۔ دانستہ ترتیب الٹ دینا بیشک نماز کو مکروہ کر دیتا ہے۔ مثلاً پہلی رکعت میں قل اعوذ برب الناس پڑھی اور دوسری رکعت میں قل اعوذ برب الفلق کی قرأت کی اور یہ جان بوجھ کر کیا تو ایسی نماز کو مکروہ کہنا غلط نہیں ہوگا لیکن یہ کہنا کہ ایسی نماز فاسد ہو گئی۔ کم علمی اور نادانی کی بات ہے اور اگر ترتیب دانستہ نہیں الٹی گئی تو پھر کراہیت بھی پیدا نہیں ہو گی چہ جائیکہ فاسد قرار دیا جائے۔

یہ بھی یاد رکھئے کہ خلاف ترتیب قرأۃ کرنا جان بوجھ کر صرف فرض نمازوں میں کراہیت پیدا کرتا ہے نفلوں میں اگر دانستہ ترتیب الٹ دی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ جو لوگ ترتیب کو ضروری سمجھتے ہیں اور ۴

۴ خلاف ترتیب قرأت کو مفسد صلوٰۃ کہتے ہیں وہ غیر ذمہ دار اور غیر محتاط لوگ ہیں۔ خدا ایسے لوگوں کو ذمہ داری کا احساس عطا کرے۔

ہیں ــــــ صرف یہ ہی نہیں بلکہ اس حال میں کرتے ہیں کہ اسے بے شرمی کے سوا کوئی دوسرا نام دینا غلط ہی ہوگا ایسے لوگوں کو آخرت میں کوئی سزا نہیں ملے گی اس لئے کہ وہ جو بھی کچھ کر رہے ہیں اپنی بیویوں کے ساتھ کر رہے ہیں اور بیوی کے ساتھ ہر قسم کی مقاربت ہر وقت جائز ہے۔ لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کو ایک خمیازہ ضرور بھگتنا پڑتا ہے اور وہ ہے اولاد کی بے حیائی اور بے راہ روی۔ جو لوگ دن کی روشنی میں اور غیر محتاط انداز میں اپنی عورتوں کے پاس آتے ہیں بالعموم ان کی اولاد بے شرم اور بے حیا ہوتی ہے۔ یہ بات تجربات میں آچکی ہے لہٰذا انکار و اعراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ ماہر نفسیات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجامعت مقاربت کے وقت عورت اور مرد کے جیسے تأثرات ہوتے ہیں بچہ اسی قسم کا پیدا ہوتا ہے اسی وقت خیالات کی پاکیزگی اور خیالات کی پلیدی اس بچہ میں منتقل ہو جاتی ہے جو اسی وقت کے نطفہ سے پیدا ہونے والا ہے۔ ماہر نفسیات نے تو ذرا آگے بڑھ کر یہ بھی کہا ہے کہ مقاربت کے وقت اگر عورت اور مرد اپنے سر میں درد محسوس کر رہے ہیں تو پیدا ہونے والا بچہ دماغی اعتبار سے کمزور ہوگا اور زندگی بھر اسے درد سر کی شکایت رہے گی۔

جب ماں باپ کی بیماری اولاد میں منتقل ہو سکتی ہے تو ماں باپ کے اطوار اور رجحانات اولاد میں کیوں انتقال نہیں کر سکتے۔ اور اگر کر سکتے ہیں اور واقعتاً کر سکتے ہیں تو پھر شریعت کا یہ مشورہ قیمتی اور قابل قبول کہلانے کا مستحق ہے کہ اپنی عورت کے ساتھ دن کی روشنی میں اور اس انداز میں نہ آؤ کہ دیکھنے والی آنکھ اسے بے حیائی کا نام دینے پر مجبور ہو جائے۔

ایک شخص شریعت کے اس مشورہ کو ڈھکوسلہ قرار دیتا ہے اور چیخ چیخ کر سر بازار یہ کہتا ہے کہ قرآن نے تو صاف صاف کہا ہے نساءکم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ تم اپنی کھیتیوں میں جس طرح چاہو داخل ہو۔ تو بتائیے کیا ایسے شخص کو آپ دانشمند اور معقول ذہن کا آدمی تصور کریں گے۔ اگر کریں گے تو فاش غلطی ہوگی اور اگر نہیں کریں گے تو اس شخص کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے جو کفارت کے سلسلہ میں شریعت کے مشورہ کو اس لئے ڈھکوسلہ قرار دے رہا ہے کہ شریعت نے یہ تعلیم بھی دی ہے کہ نسلی تفاخر اور نسلی تکبر قابل مذمت ہے اور خالق اکبر کی نگاہوں میں ذات پات کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

مشورہ اور حکم کے فرق کو یوں سمجھئے۔ زید ایک سرمایہ دار آدمی ہے اس کی تجوریوں میں جو مال و منال مقید ہے اسکی کوئی حد اور انتہا نہیں۔ اس مال و دولت کا سہارا لے کر وہ ایک بہت اونچی کوٹھی تعمیر کراتا ہے، فلک بوس قسم کی اور پھر اس کوٹھی پر وہ فخر کرتا ہے اور ان لوگوں کو حقیر اور ذلیل تصور کرنے لگتا ہے جو چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اپنی عمریں کاٹ رہے ہیں۔ بکر زید کے اس رویہ سے متفق نہیں ہے۔ وہ زید کو ڈانٹتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا اس کوٹھی پر فخر کرنا درست نہیں ہے۔ مکان کی اونچائی اور لمبائی سے آدمی کی شخصیت اور آدمیت اونچی اور لمبی نہیں ہوتی۔ اونچے اونچے مکانات تعمیر کر کے عزت و رفعت کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ عزت و رفعت اس شرافت اور آدمیت سے حاصل ہوتی ہے جو آدمی کی رگ رگ میں رواں ہو۔ زید بکر کی یہ قیمتی باتیں سنکر اپنی فلک بوس کوٹھی پر فخر کرنا چھوڑ دیتا ہے اور ان لوگوں کو بھی اب ذلیل و کمتر تصور نہیں کرتا جو بیچارے جھونپڑوں میں اپنی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ کچھ دن بعد زید کی لڑکی کی شادی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ زید بکر کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ تم ہمیشہ اچھے اور محتاط مشورے دیتے ہو تمہارے مشورے ہمیشہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔ میری بچی کی شادی ہے مشورہ دو کہ میں اسے کیسے آدمی کے حوالہ کروں۔ میری خواہش یہ ہے کہ وہ ہمیشہ خوش رہے اور مطمئن زندگی گزارے

اس کی ازدواجی زندگی ان الجھنوں اور خلفشاریوں سے محفوظ رہے جو الجھنیں ازدواجی زندگی کو مفلوج اور ہلاک کر دیتی ہیں۔ بکر زید کی خواہشوں کے پیش نظر اور معاشرے کے میلانات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ مشورہ دیتا ہے کہ تم اپنی بیٹی کی شادی کسی جھونپڑی میں مت کرنا بلکہ ایسے شخص سے کرنا جو تمہاری طرح کسی اونچی کوٹھی کا مالک ہو۔

زید یہ سنکر چراغ پا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تم بیوقوف آدمی ہو۔ کبھی کچھ کہتے ہو کبھی کچھ۔ ایک بار تم نے کہا تھا کہ اونچے مکانوں پر فخر کرنا جائز نہیں۔ آج کہہ رہے ہو کہ اپنی بیٹی کی شادی کسی اونچے مکان والے سے کرو۔ میں تمہاری یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہ ڈھکوسلہ ہے، دھوکہ بازی ہے، مکاری ہے۔

زید بکر کے مشورے کو ٹھکرا دیتا ہے اور اپنی بیٹی کی شادی کسی جھونپڑی والے سے کر دیتا ہے۔ بتائیے کیا یہ شادی کامیاب ہو جائے گی؟ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے نہیں ہو سکتی کہ زید کی بیٹی آرام دہ مکان میں رہنے کی عادی بن چکی ہے۔ وہ کسی ایسے جھونپڑے میں مطمئن قسم کی زندگی بسر نہیں کر سکتی جہاں آرام و راحت کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہ ہو۔

اگر زید کی حرکت دانشمندی اور معقولیت پر محمول نہیں کی جا سکتی تو پھر آپ کی اس حرکت کو دانشمندی اور سلامت روی پر محمول کر لینا کیسے درست ہوگا جو زید کی حرکت کے ساتھ مشابہت اور مماثلت رکھتی ہے۔ آپنے یہ تو پڑھا ہے کہ قرآن حکیم نے نسل پرستی کی مذمت کی ہے اور احادیث میں بھی نسل پرستی کو فعل مذموم قرار دیا ہے۔ لیکن آپنے شاید کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہیں کی کہ نسل پرستی سے روکا کس لئے گیا ہے اور اعلیٰ نسل سے وابستہ ہونے پر تفاخر کرنے کو جرم کیوں گردانا گیا ہے۔ آپ نے چونکہ تفکر و تدبر کی زحمت گوارہ نہیں کی اس لئے علت بھی آپکے سمجھ میں نہیں آئی۔ سامع بالعموم اسی وقت ٹھوکر کھاتا ہے جب وہ قائل کی بات کا منشاء اور مقصد نہ سمجھ سکے۔ بغور یہ کرنا چاہئے کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے، کس وقت کہہ رہا ہے اور کن حالات میں کہہ رہا ہے۔ اسلام نے کن حالات میں تفاخر بالنسب کی مذمت کی تھی۔ وہ حالات غالباً آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہی ہیں۔ اسی طرح وہ علت اور مبنیٰ بھی آپ کے پیش نظر نہیں ہے جس کی بنا پر تفاخر بالنسب کو ناروا قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ اسلامی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں گے تو یہ بات آپ کے دل و دماغ پر روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ اسلام نے اس گھمنڈ اور تکبر کو مٹانے کی کوشش کی تھی جو اہل عرب میں پھیلا ہوا تھا اور جس میں عوام و خواص سبھی مبتلا تھے۔ اور جب گھمنڈ اور تکبر کی کمر ٹوٹ گئی تو اسلام نے اس سلسلہ میں نرمی اختیار کر لی۔ اسلام کا منشاء پورا ہو چکا تھا، اس نے اپنے ماننے والوں کے اذہان و قلوب میں یہ بات اتار دی تھی کہ خدا کے نزدیک مقبولیت کا معیار حسب و نسب نہیں، مال و دولت نہیں، تقویٰ اور صرف تقویٰ ہے جو تقویٰ اور پرہیزگاری میں جس درجہ بڑھا ہوا ہوگا وہ خدا سے اتنا ہی قریب ہوگا۔ ایک متقی جلاہا اس سید سے لاکھ درجہ بہتر ہے جو فسق و فجور میں غرق ہو جب لوگوں کے دلوں میں یہ بات اتر گئی اور تکبر و گھمنڈ تقریباً نیست و نابود ہو گیا جو تفاخر بالنسب کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا تو اسلام نے خود دوسرے معاملات میں نسلی پوزیشن کو ملحوظ رکھا مثلاً اس نے ببانگ دہل کہا کہ امامتِ کبریٰ (خلافت) کا اولین حقدار وہ شخص ہوگا جو خاندانِ قریش سے وابستہ ہو۔ یا مثلاً اس نے بغرض تعلیم عرض کیا کہ اپنی عورتوں کے نکاح کفو میں کرو۔ وغیر ذالک۔

بات کو بیّن اور منقح کرنے کے لئے میں حضرت مولانا عامر عثمانی کی ایک پرانی تحریر نقل کر رہا ہوں جو اس موضوع پر ایک بہترین ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا نے اسی قسم کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

" عربوں میں حسب ونسب کی جو اہمیت تھی اور نسل ونسب پر جس درجہ گھمنڈ کیا جاتا تھا وہ محتاج بیان نہیں۔ نسلی تفاخر اہل عرب کی

صرف ایک عادت ہی نہیں رہ گیا تھا بلکہ وہ تو ان کی جبلت کا جز بن گیا تھا، وہ ان کے لہو میں جوہری عنصر کی طرح رچ بس گیا تھا، وہ ان کے عقل و شعور کے لئے ایسی حقیقت کی حیثیت رکھتا تھا جس کو نظر انداز کر دینے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسلام آیا اور اپنی معروف حکیمانہ تدریج کے ساتھ اس حد سے بڑھے ہوئے تفاخر اور جنونِ نسب پرستی کی اس حد تک اصلاح کرتا چلا گیا جس حد تک اسے اخوتِ مسلمانہ مساواتِ باہمی اور تطہیر معاشرہ سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ضروری تھا۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ اللہ کے نزدیک تو سب سے بہتر وہی شخص ہے جو زیادہ متقی ہو۔ یہ گویا تردید تھی اس تخیل کی کہ فضل و شرف کا مدار نسل و نسب ہے اور فرمایا گیا کہ کیا بے علم لوگ اہل علم کے برابر ہو سکتے ہیں۔ یہ گویا وضاحت تھی اس حقیقت کی کہ فضیلت و برتری کا تعلق نسل و نسب سے نہیں بلکہ علم سے ہے۔ خدا شناسی سے ہے، معرفت سے ہے۔ فرمایا گیا کہ انسانوں کو مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں صرف اسلئے تقسیم کیا گیا ہے کہ وہ پہچانے جاسکیں۔ اس سے بالتصریح ہو گئی کہ نسلی اور نسبی امتیازات اس لئے نہیں کہ ان پر بیجا فخر کیا جائے بلکہ وہ تو صرف تعارف و امتیاز کا ذریعہ ہیں۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ہم اپنی اولادوں کے جداگانہ نام رکھتے ہیں تاکہ ان میں فرق کیا جاسکے یا جیسے ہم وسیع سرزمین کو ملکوں، شہروں، دیہاتوں اور محلوں میں تقسیم کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ ایک کو دوسرے سے الگ پہچانا جا سکے۔

اور فرمایا گیا کہ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ یہ ارشاد اگرچہ براہ راست قوم پرستی اور وطن پرستی کے موجودہ مذموم تصورات کی مذمت کر رہا تھا لیکن نسل و نسب کے بیجا گھمنڈ کی قباحت اور بے حقیقتی اس سے بدرجۂ اولیٰ واضح ہو گئی۔

غرض اسلام نے اپنی تدریجی تعلیم و تربیت کے ذریعہ حد سے بڑھے ہوئے فساد انگیز تفاخر کی بیخ کنی کی لیکن وہ چونکہ خیالی نظریاتی مذہب نہیں بلکہ آخری حد تک حقیقت پسند اور عملی مذہب ہے۔ اس لئے اس کی یہ عادت کبھی نہیں رہی کہ حقائق و واقعات سے ـــــ خواہ وہ کیسے ہی ہوں۔ آنکھیں بند کر کے احکام نافذ کرتا چلا جائے۔ اور یہ نہ دیکھے کہ جس معاشرہ میں وہ احکام نافذ کر رہا ہے وہ اس حد تک ہموار اور مساعد بھی ہو چکا ہے کہ ان احکام کے حقیقی فائدوں سے بہرہ اندوز ہو سکے یا اس میں ایسے عناصر اور اجزاء موجود ہیں کہ جن کی موجودگی میں ان احکامات سے نفع کم نقصان زیادہ ہو جانے کا احتمال ہے۔ چنانچہ اس نے دیکھا کہ مسلسل تعلیم و تربیت سے اگرچہ نسل و نسب کا پہلا سا خالی تفاخر ختم ہو چکا ہے مگر یہ نہیں ہوا ہے کہ تمدن کے تمام ہی شعبوں اور گوشوں میں خاندانی و قبائلی فرق و امتیاز کا تصور قطعاً محو ہو چکا ہو اور پورا سماجی نظام نسل و نسب کے تعلق سے پیدا ہونے والی اونچ نیچ کے تخیل کو بالکل خیرآباد کہہ چکا ہو۔ تمدنی امور کے بعض دائروں میں نسل و نسب کی کارفرمائی بہرحال کسی نہ کسی درجہ میں باقی تھا اور ان امور میں اس کا لحاظ کرنا ضروری تھا جن کے انصرام و انضباط کا تعلق خود افرادِ معاشرہ کے احساسات اور ذہنیتوں سے ہو۔ چنانچہ خلافت کے باب میں حضور ؐ نے جو نسل و نسب کا لحاظ کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ امام قریشی ہونا چاہئے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفۃ المسلمین کو

پسند اور ناپسند کرنے کا تعلق بہرحال عوام کے احساسات و رجحانات سے تھا اور اس وقت کے عوام قرشی ہی خلیفہ کو پسند کر سکتے تھے۔

اسی طرح ازدواج و مناکحت کا معاملہ ہے کہ اس کا تعلق بہرحال ان ہی گھرانوں کے احساسات و رجحانات سے ہے جنہیں یہ معاملہ منعقد ہو۔ اس وقت کے مسلم عوام چونکہ اس بات پر متفق تھے کہ عرب بھر میں قرشی خاندان ہی سب سے بہتر ہے اور اس کی لڑکیاں اگر غیر قرشی لوگوں سے بیاہی جائیں تو یہ بڑے عار کی بات ہے۔ اس لئے اسلام نے جس طرح امامت وخلافت کے معاملہ میں عوامی احساسات کا پاس کیا تھا اسی طرح اس معاملہ میں بھی کیا اور مشورہ دیا کہ قرشی لڑکیاں غیر قرشی خاندانوں میں نہ بیاہی جائیں اسی کا نام "کفاءت" تھا ظاہر ہے کہ جس حد تک نسل ونسب کا تفاخر واقعتاً باقی رہ گیا تھا اس سے آنکھیں بند کر کے یہ فیصلہ کر دیا جاتا کہ سب مسلمان بلا امتیاز ایک دوسرے کے کفو ہیں تو اس فیصلہ کو وہ ذہن وقلب کس طرح قبول کر لیتے جو قریش کی نسلی ونسبی فضیلت کے تخیل سے درست بردار نہیں ہو سکے تھے۔ پھر اس کے نتیجہ میں کتنی ہی شادیاں ایسی ہوتیں جن سے خاندان میں باہم منافرت وانتشار بہی کی افزائش ہوتی اور مناکحت کے اعلیٰ مقاصد کو ٹھیس لگتی۔"

(تجلی ستمبر ۶۵ء ص ۲۳ و ۲۴)

آپ کی خدمت میں چند اور باتیں بیان کرنے سے پہلے میں مولانا مودودی کی لکھی ایک قیمتی تحریر پیش کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں جو اسی موضوع سے متعلق ہے اور جو مختصر ہونے کے ساتھ جامع الاطراف بھی ہے۔ انھوں نے ایک سائل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے عرض کیا ہے۔

عقل کا صریح تقاضا یہ ہے کہ کسی لڑکی کو کسی شخص کے نکاح میں دیتے وقت یہ دیکھا جائے کہ وہ شخص اس کے جوڑ کا ہے یا نہیں۔ اگر جوڑ کا نہ ہو تو یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ان دونوں کا نباہ ہو سکے گا۔ نکاح سے مقصود عقلاً بھی اور نقلاً بھی یہی ہے کہ زوجین کے درمیان مودت ورحمت ہو اور ایک دوسرے کے پاس سکون حاصل کر سکیں۔ آپ خود سوچ لیں کہ بے جوڑ نکاحوں سے اس مقصود کے حاصل ہونے کی کہاں تک توقع کی جا سکتی ہے اور کونسا معقول انسان ایسا ہے جو اپنے لڑکے یا لڑکی کا بیاہ کرنے میں جوڑ کا لحاظ نہ کرتا ہو؟ کیا آپ اسلامی مساوات کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ہر مرد کا ہر عورت سے اور ہر عورت کا ہر مرد سے اس بنا پر نکاح کر دیا جائے کہ دونوں مسلمان ہیں۔ بلا اس امتیاز کے کہ ان میں کوئی مناسبت پائی جاتی ہے یا نہیں۔

فقہاء نے اس جوڑ کا مفہوم مشخص کرنے کی کوشش کی ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے طریقہ پر یہ بتایا ہے کہ لڑکی اور لڑکے کے درمیان کن کن امور میں مماثلت ہونی چاہیئے۔ ہم ان تفصیلات میں بعض فقہاء سے اختلاف اور بعض سے اتفاق کر سکتے ہیں مگر فی الجملہ عقلِ عام یہ تقاضہ کرتی ہے کہ زندگی بھر کی شرکت و رفاقت کے لئے جن دو ہستیوں کا ایک دوسرے سے جوڑ ملایا جائے ان کے درمیان اخلاق، دین، خاندان معاشرتی طور طریق، معاشرتی عزت وحیثیت مالی حالات۔ ساری ہی چیزوں کی مماثلت دیکھنی چاہیئے۔

ان امور میں اگر پوری یکسانی نہ ہو تو کم از کم اتنا تفاوت بھی نہ ہو کہ زوجین اس کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ محبت ورفاقت نہ کر سکیں

یہ انسانی معاشرت کا ایک ایسا عملی مسئلہ ہے
جس میں حکمت عملی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ آدم
کی ساری اولاد کے یکساں ہونے کا نظریہ آپ
یہاں چلانا چاہیں گے تو لاکھوں گھر برباد
کر دیں گے"

(ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۵۲ء)

ان دو وقیع اور ہمہ گیر تحریروں کو نقل کرنے کے بعد اس موضوع پر مزید خامہ فرسائی کرنا اگرچہ غیر ضروری ہوگا۔ اس لئے کہ منقولہ تحریریں اپنی جگہ مکمل اور جامع مانع ہیں لیکن پھر بھی دل چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں تھوڑی سی گفتگو اور کر لی جائے خواہ اس گفتگو کا شمار حشو و زوائد ہی میں کیوں نہ ہو۔ اب جو کچھ عرض کرنا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ نکتہ نہیں ان باتوں کی تشریح ہے جو گزشتہ سطروں میں ذرا مبہم انداز میں گزارش کی گئی ہیں۔

اگر شادی صرف لڑکے اور لڑکی کے درمیان رشتہ قائم ہو جانے کو کہا کرتے تو اسلام مساوات اور برابری کو ملحوظ رکھنے کی تاکید کبھی نہ کرتا۔ لیکن شادی اتنے محدود تعلق کا نام نہیں ہے۔ شادی براہِ راست دو انسانوں میں رشتہ و تعلق قائم کرتی ہے اور بالواسطہ دو خاندانوں اور دو برادریوں کو باہم مربوط کرتی ہے۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ دو اجنبی خاندان جو ایک دوسرے سے قطعًا ناواقف اور نا آشنا ہوں وہ بھی ایک دوسرے سے نہ صرف یہ کہ آشنا ہو جاتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے اس درجہ قریب ہو جاتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔

لیکن اگر اتفاقًا شادی ناکام ہو جائے تو یہ خاندان ایک دوسرے سے اتنے بدظن اور بدگمان ہو جاتے ہیں کہ یہ بدظنی اور بدگمانی حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتی بہرحال شادی کامیاب ہو یا ناکام۔ صرف لڑکا اور لڑکی اس کا اثر قبول نہیں کرتے بلکہ لڑکے اور لڑکی کے تمام رشتہ دار اس کا اثر قبول کرتے ہیں۔ دو خاندان متأثر ہوتے ہیں۔ تجربات بتلاتے ہیں کہ میاں بیوی کے درمیان تفریق و تکرار عمومًا اس وقت ہوتی ہے جب ان دونوں کے درمیان مساوات نہ ہو۔ لفظ مساوات ایک وسیع مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے۔ بیاہ شادی کے سلسلہ میں جس مساوات کا لحاظ رکھا جاتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ پانچ اور کم سے کم تین قسموں میں منقسم کی جاتی رہی ہے۔ جن تین باتوں کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے وہ یہ ہیں مذہبی مساوات نسلی مساوات، معاشرتی و اقتصادی مساوات۔ نسلی برتری کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلاشبہ یہ ایک قابل داد تخیل ہے لیکن ہر جگہ اس فلسفہ اور تخیل کو قابل داد قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آپ کسی محفل میں اونچی ذات کے لوگوں کو مدعو کریں اور پست قوموں کو نظر انداز کر دیں تو گھٹیا درجہ کی بات ہوگی اور یہ ایک درجہ کا گناہ بھی ہوگا۔ یا آپ کسی محفل میں دو نشست گاہیں قائم کر لیں۔ اونچی نشست گاہوں پر انھیں بٹھائیں جو اونچی نسل سے متعلق ہیں اور نیچے انھیں بٹھائیں جو معاشرہ میں اسفل سمجھے جاتے ہیں تو بلاشبہ یہ حرکت بھی نا روا حرکت ہوگی اور اس کا سلسلہ بھی گناہوں سے جا کر مل جائیگا لیکن آپ ہر جگہ نسلی برتری اور نسلی کمتری کو نظر میں نہ لائیں اور بیاہ شادی کے سلسلہ میں بھی اسے کوئی حیثیت نہ دیں تو یہ بات کوئی قابل تعریف نہیں اور نہ ہی اسے تقویٰ کہہ سکیں گے۔ تقویٰ نادانیوں کو نہیں کہا جاتا۔ پرہیزگاری حماقتوں کا نام نہیں۔ دیگر تمام معاملات میں آپ تمام مسلمانوں کو مساوی حیثیت دیجئے۔ بڑی اچھی بات ہے۔ سب کو بھائی بھائی تصور کیجئے۔ لیکن بیاہ شادی کرتے وقت اس تصور کو بھلا دیجئے۔ یہی احتیاط ہے اور احتیاط ہی کا دوسرا نام تقویٰ ہے۔

آج معاشرے میں جو انتشار برپا ہے اور جو خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں اس کی اولین وجہ یہ ہے کہ خاندانوں میں بد اخلاقیوں کے مظاہرے ہو رہے ہیں اور اس کی اولین وجہ یہ ہے کہ شادیاں ناکام ہو رہی ہیں اور شادیوں کے ناکام ہونے کی اولین وجہ یہ ہے کہ نئی رشتہ داریاں قائم

کرتے وقت کفارت اور مساوات کو کلیتہً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

خدا جانے آپ کے نزدیک ناکام شادی کسے کہتے ہیں۔ میرے نزدیک تو وہ شادی بھی ناکام ہے جسکے دونوں فریق مختلف رجحانات کی طرف مائل ہوں، اگرچہ ان میں غیر معمولی محبت پائی جاتی ہو۔ باپ اسلام پسند ہے۔ اسلامی لباس، اسلامی وضع قطع، اسلامی چال ڈھال ہر معاملہ میں وہ اسلامی اطوار کو پسند کرتا ہے اور اسلامی تعلیمات سے سرمو انحراف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ماں برعکس ہے۔ وہ اتنی جدت پسند ہے کہ ہر معاملہ میں مغرب زدوں کی تقلید کرتی ہے۔ بتائیے ان کی اولاد کا کیا حشر ہوگا۔ یہ باپ کی تقلید کریں گے یا ماں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اولاد صحیح معنوں میں باپ کے نقش قدم پر چل سکے گی اور نہ ہی صحیح معنوں میں ماں کی اتباع کر سکے گی۔ بس صورتِ حال یہ ہوگی کہ مذبذبین بین ذالک لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء۔

ٹھیٹ اردو میں اس کا ترجمہ یہ کر لیجئے کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر ۔ نہ ادھر کے نہ ادھر کے۔ بیچ میں معلق۔

اب ذرا سوچئے کہ لڑکا ذات کا تیلی ہے اور اس کی شادی جس لڑکی کے ساتھ ہوئی ہے وہ ذات کی پٹھان ہے یہ دونوں آپس میں کچھ نہ کچھ تعلق اور وابستگی بھی رکھتے ہیں۔ ان کے اولاد ہوتی ہے تو کیا ان میں سے ہر ایک اپنی اولاد کے سامنے اپنی نسل اور اپنی قوم کی تعریف نہیں کریگا۔ عالم یہ ہے کہ ماں اپنے بچوں کو ہمیشہ یہ تأثر دینے کی کوشش کرتی ہے کہ تمہاری ننھیال تم پر جتنی مہربان ہے اتنی ددھیال نہیں۔ باپ ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی اولاد کے حق میں اس کے اقارب نسبتاً زیادہ مہربان اور ہمدرد ہیں۔ ماں باپ دونوں میں سے کسی نہ کسی کی بات تو دل میں اتر ہی جاتی ہے اور جس کی بات اتر جاتی ہو بس وہ اور اس کے رشتہ دار مہربان محسوس ہوتے ہیں باقی دوسرے دشمن نظر آنے لگتے ہیں، خواہ حقیقت میں وہ دشمن نہ ہوں۔

مثلاً ماں کی بات بچوں کے دل و دماغ میں اتر گئی اور وہ اپنی ددھیال سے بدگمان ہو گئے۔ اگر ماں باپ ایک ہی نسل سے متعلق ہیں تو پھر یہ گمان صرف ددھیال تک محدود رہے گا اور اگر ماں پٹھان ہے اور باپ تیلی تو پھر یہ بدگمانی اور نفرت محدود نہیں رہے گی بلکہ غیر محدود ہو جائے گی اور بچے ہر اُس آدمی سے بدگمان ہو جائیں گے جو تیلی ہو۔

اسلام نے اہل کتاب عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دی ہے لیکن ہمارے عالی مرتبت علماء نے فرمایا ہے کہ اہل کتاب سے شادی کرنا اگرچہ جائز ہے لیکن احتیاط اور مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اہل کتاب عورتوں کو اپنے گھروں میں داخل کرنے سے احتراز کیا جائے۔ کیوں؟ اسلئے کہ باپ کتنا ہی پکا مسلمان کیوں نہ ہو۔ اگر ماں یہودی یا عیسائی ہے تو اولاد کے یہودی اور عیسائی ہونے کے امکانات قوی ہیں۔

دیکھ لیجئے اسلام نے کتابیہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کی عام اجازت دی لیکن ہم چونکہ کتابیہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنا خلاف احتیاط اور منافی مصلحت سمجھتے ہیں۔ لہٰذا امت مسلمہ بالعموم کتابیہ عورتوں کو اپنی بیویاں بنانے سے اجتناب کرتی رہی ہے اور یہ اجتناب اس لئے ڈھکوسلہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ یہ مصلحت و احتیاط سے قریں ہے۔ تو پھر آپ اس مصلحت کو کیسے فریب دہی اور ڈھکوسلہ قرار دے سکتے ہیں جو ان روایات کے پیش نظر مروّج ہوئی ہے جن میں کفارت کو ملحوظ رکھنے کا اصرار کیا گیا ہے۔

میرے قابل صد احترام بھائی! ماحصل گفتگو یہ ہے کہ اسلام میں ذات پات کی کوئی حقیقت نہیں اور بلاشبہ خدا کے نزدیک مقرب اور مکرم وہ شخص ہے جو تقویٰ اور پرہیزگاری میں فائق ہو اور بلاشبہ اسلام اسے ایک نظر سے دیکھتا ہے لیکن یہ تعلیم بھی ہمیں اسلام ہی نے دی ہے کہ لوگوں سے

ان کی عقل و مراتب کے اعتبار سے گفتگو کرو۔ اور جس رسولِ خدا نے ہمیں نسل پرستی اور وطن پرستی کے مذموم جذبات سے روکنے کی کوشش کی تھی اسی نے یہ بھی فرمایا تھا کہ قریش اس قابل ہیں کہ خلافت کا مسئلہ طے کرتے وقت انھیں ترجیح دی جائے اور اسی رسولِ خدا نے یہ تاکید بھی کی تھی کہ شادی کرتے وقت نسلی اونچ نیچ سے صرف نظر نہ کرو بلکہ ان کا خیال رکھو۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اسلام نہ ہر معاملہ میں ذات پات کا قائل ہے اور نہ ہر معاملہ میں ذات پات کی نزاکتوں کو نظرانداز کرنے کا خوگر ہے۔ اس نے اس سلسلہ میں اپنا جو زاویۂ نظر پیش کیا ہے وہ افراط و تفریط کے ذرات سے پاک ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمام مسلمان اسلام کے اس زاویۂ نظر کو اپنائیں اور نسل و حسب کے معاملہ میں نہ راہِ افراط کو اختیار کریں اور نہ راہ تفریط کو۔ اسی میں خیر و سلامتی مضمر ہے۔ اس سے ہر ہر انحراف کرنے میں نقصان ہی نقصان ہے۔ پریشانی ہی پریشانی ہے۔

خدا سے دعا کیجئے کہ ہمارے معاشرے میں حقیقتاً تمام مسلمان ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھنے لگیں۔ نہ بڑی قومیں چھوٹی قوموں کو ذلیل و محقّر تصور کریں اور نہ ہی چھوٹی قومیں تعصبات کا شکار رہیں تو پھر ہر مسلمان لڑکی کی شادی ہر مسلمان لڑکے سے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا لیکن جب تک ہمارے معاشرے میں اونچ نیچ کا فرق باقی ہے۔ قومی تعصبات کے اثرات موجود ہیں کوئی سمجھدار آدمی یہ رائے نہیں دے سکتا کہ نسلی تفریق کو نظرانداز کرکے شادیاں رچائی جائیں۔

کفاءت کے سلسلہ میں اتنا کچھ لکھنے کے باوجود بھی مجھے تشنگی محسوس ہو رہی ہے اور دل چاہتا ہے کہ کچھ گفتگو اور کی جائے لیکن صفحات کافی سیاہ ہو چکے ہیں اس لئے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ بات ختم کردی جائے — خدا کرے میری دماغ ریزی ٹھکانے لگے اور میری یہ تحریر آپ کے لئے تشفی بخش اور مطمئن کن ثابت ہو۔

قلم روکنے سے پہلے میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نسلی اونچ نیچ کا میں خود بھی قائل نہیں اور نہ ہی میں نے زندگی میں کبھی ان حضرات کو ذی فہم اور دانشمند تصور کیا ہے جو نسلی عصبیت کا شکار ہیں اور جن حضرات کے نزدیک نسلی برتری و کمتری مرکزی حیثیت رکھتی ہے جو آدمی کی شخصیت کو صلاحیتوں اور خوبیوں کے پیمانے سے ناپنے کی بجائے حسب و نسب کی میزان میں تولتے ہیں۔ میں خود بھی یہ چاہتا ہوں کہ اس احساس اونچ نیچ کا قلع قمع ہو جو اسلام کی نگاہوں میں محبوب و محمود نہیں بلکہ مبغوض ہے۔ مکروہ ہے۔ قابل ملامت ہے۔ میری بھی یہی آرزو ہے کہ دنیا بھر کے تمام مسلمان آپس میں متحد ہوں، مربوط ہوں۔ ان میں کوئی تفریق نہ ہو۔ چھوت چھات نہ ہو۔ نسلی جھگڑے نہ ہوں۔ نسلی اعتبار سے کوئی معزز نہ ہو اور نسلی اعتبار سے کوئی حقیر اور ذلیل بھی نہ ہو۔ لیکن جب تک ہماری دنیا میں امتیازات و مراتب کا احساس اور حسب و نسب کی خوبو باقی ہے میں کسی کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا کہ شادیاں آنکھیں بند کرکے کی جائیں۔ نسلی اونچ نیچ کو نظرانداز کرکے کی جائیں۔ معاشرہ سے اونچ نیچ، گھاوٹ و تفریق کے فرق کو مٹا دیجئے۔ بڑی مبارک اور قابل تعریف بات ہوگی۔ لیکن اس فرق کے فنا ہونے سے پہلے ہی جو لوگ بیاہ شادی کے سلسلہ میں نسلی مساوات اور برابری کا لحاظ کرنے کو مکروہ تصور کرتے ہیں میں انھیں معاملہ فہم اور دوراندیش نہیں کہہ سکتا۔ ایک میں ہی کیا کوئی بھی ایسے لوگوں کو ذکی اور صاحبِ حکمت کہنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔

آپ نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ میری اس تحریر میں تضارب و تضاد پایا جاتا ہے جو جولائی و اگست کے شمارہ کے لئے قلم بند کی گئی تھی۔ غالباً آپ نے پل بھر کے لئے بھی غور نہیں کیا۔ اگر آپ غور و فکر کرنے کی زحمت گوارہ کرتے تو ناممکن تھا کہ میرا مدعا سمجھنے میں آپ کی فکر رسا نے ٹھوکر کھائی

کھائی ہوتی۔

بلا شبہ میں نے صاف لفظوں میں یہ گزارش کی تھی کہ ہر مسلمان مرد کی شادی ہر مسلمان عورت سے بلا تأمل ہو جاتی ہے۔ سید لوگ پٹھانوں کو اپنی بیٹیاں دے سکتے ہیں اور پٹھان لوگ سیدزادوں کو اپنا داماد بنا سکتے ہیں۔

یہ بات مصلحت اور مشوروں کے خلاف تو ہو سکتی ہے لیکن احکامات کے منافی نہیں ہے اور چونکہ احکامات کے منافی نہیں لہٰذا اسے گناہ اور ناجائز حرکت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بات بالکل الگ ایک مسئلہ ہے اس مسئلہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یعنی کہ اگر بالغہ لڑکی ولی کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح بذاتِ خود کسی مرد سے کر لے تو لڑکی کے والدین کی اجازت پر نکاح موقوف رہے گا بشرطیکہ لڑکی نے غیر کفو میں شادی کی ہو اگر کفو میں شادی کی ہے تو پھر فسخ نکاح کا کوئی اختیار اولیاء کو حاصل نہیں ہوگا۔

جولائی و اگست کے شمارہ میں مجھ سے ایک زبردست غلطی یہ سرزد ہو گئی تھی کہ میں نے سوال کے اوپر عنوان غلط جمایا تھا اور یہ بھی کہیں تحریر نہیں کیا تھا کہ اس مسئلہ کا اصل تعلق کفاءت سے نہیں حقوق اولیاء سے ہے۔ شریعت نے لڑکی کے اولیاء کو کچھ حقوق دئیے ہیں منجملہ ان میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ وہ اس نکاح کو فسخ کرا دیں جو لڑکی نے جذبات کی رو میں بہہ کر کسی ایسے لڑکے سے کر لیا ہو جو اس کے قابل نہیں تھا۔

فرنگی تہذیب سے متأثر اور بے لگام ذہنیت کے لوگ یہاں یہ اعتراض کریں گے کہ شادی والدین کی نہیں ہوتی لڑکی کی ہوتی ہے اور لڑکی اپنے اچھے برے کو خوب سمجھتی ہے۔ اسے ہی اپنے شوہر کے ساتھ زندگی گذارنی پڑتی ہے نہ کہ اس کے والدین کو۔ لہٰذا والدین کو قطعاً اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ کباب میں ہڈی بننے کی کوشش کریں اور اس نکاح کو فسخ کرانے پر کمر بستہ ہو جائیں جو لڑکی نے اپنی خوشی سے کیا ہے اور اپنے مستقبل کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے۔

اس اعتراض کو قابل التفات تصور نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ والدین اپنی بالغہ لڑکی کا نکاح اس وقت فسخ کرائیں گے جب ان کی لڑکی نے ایسے لڑکے سے رشتۂ مناکحت قائم کیا ہو جو اس کا کفو نہیں ہے اور جس کے ساتھ زندگی بسر کرنے میں لڑکی کو نقصانات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا والدین کے اندیشے قابل اعتبار سمجھے جائیں گے وہ تجربہ کار ہوتے ہیں۔ ان راہوں سے گذر چکے ہوتے ہیں جن راہوں پر ان کی لڑکی نے ابھی چلنے کا ارادہ ہی کیا ہے۔ وہ زمانے کے سرد و گرم زندگی کے نشیب و فراز اور انسانوں کی عادات و اطوار سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ وہ جو فیصلہ کریں گے وہ سنجیدگی اور حکمت پر مبنی ہوگا اور کم از کم اس فیصلہ سے زیادہ پر امن اور حکیمانہ ہوگا جو ان کی لڑکی جذبات میں آکر کر بیٹھی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ شادی براہ راست دو انسانوں کا ملن سہی لیکن بالواسطہ وہ دو خاندانوں کا ذریعۂ ربط ثابت ہوتی ہے۔

ہندہ نے زید سے نکاح کیا تو زید صرف ہندہ کا شوہر ہی نہیں بنے گا بلکہ وہ ہندہ کے والد کا داماد بھی ہوگا اور صرف ہندہ ہی کے والد کا نہیں بلکہ اس پورے خاندان کا داماد تصور کیا جائے گا جو خاندان ہندہ اور اس کے والد کا خاندان کہلاتا ہے۔ ہندہ نے عشق و محبت کی رو میں بہہ کر ایک معمولی درجہ کے آدمی سے نکاح کر ڈالا۔ ہندہ کو اس معمولی درجہ کے آدمی سے محبت ہے، اسے محبت کرنی بھی چاہیے اس لئے کہ یہ نکاح اس نے خود اپنی مرضی سے کیا ہے لیکن ہندہ کے والدین ایسے شخص کو اپنا داماد کہہ کر اپنی ہتک اور ذلت محسوس کرتے ہیں جو حسب و نسب، شرافت و نجابت اور دوسرے کسی اعتبار سے ان کا ہم پایہ نہیں۔ ہندہ کے والدین ایسے داماد سے محبت کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ جیسے اپنی رضا اور خوشی سے انھوں نے اپنی بیٹی نہ دی ہو۔ وہ ایسے لڑکے کو کیونکر اپنا بیٹا گمان کر لیں جو سوسائٹی میں ان کی رسوائی کا باعث بنا ہو لیکن ہندہ نے نکاح تو

غزل

مولانا عامر عثمانی

انکی طلب میں خود بھی تڑپنا اور ہمیں تڑپانا بھی
کہنے کو یہ دل ہی اپنا، ہے لیکن بیگانہ بھی

کس کو خبر تھی آجائے گا ایسا ایک زمانہ بھی
انسانوں کا شغل بنے گا لڑنا خون بہانا بھی

اول اول میخواروں نے جام و سبو سے کھیل کیا
آخر آخر جوشِ جنوں میں پھونک دیا میخانہ بھی

ہائے وہ فرطِ یاس کا عالم ہائے وہ رنگِ شدتِ غم
جب ناممکن ہو جاتا ہے دو آنسو ٹپکانا بھی

کفر نہ ایماں، دین نہ دنیا، یاس تعطل خوف و ہراس
ایسے بے غیرت جینے سے بہتر ہے مرجانا بھی

نام کی مسجد نام کے مندر آج بھی لاکھوں ہیں لیکن
مدت گذری ٹوٹ چکا ہے کعبہ بھی بتخانہ بھی

اہلِ جہاں کے دل پتھر ہیں، پتھر میں نرمی مت ڈھونڈنا
لاحاصل ہے ان بہروں کو دل کی بات سنانا بھی

عقل کی منطق سے فطرت کی تاویلیں کرنے والو
بات تو جب ہے شمع کی جانب رخ نہ کرے پروانہ بھی

تیرے سوا دنیا میں دیگا ان زخموں کا مرہم کون
جنکو چھپانا بھی ناممکن، ناممکن دکھلانا بھی

دل کا فسانہ کہتے کہتے موت کی ساعت آپہنچی
شوقِ بیاں تازہ ہے ابھی تک ختم نہیں افسانہ بھی

آئے تو ہیں وہ ملنے لیکن شانِ تغافل کیا کہئے
بھولے پن سے پوچھ رہے ہیں تم نے ہمیں پہچانا بھی

بادۂ الفت کی مستی کو بے ہوشی کا نام نہ دے
خاص مقامِ عشق ہے عامرؔ پہروں ہوش نہ آنا بھی

مسجد سے میخانے تک

از
ملّا ابن العرب
مکّی

تم بچے ہو، عقل کے کچے ہو۔ تم نہیں سمجھ سکو گے کہ اس تقریب میں تمہاری شرکت کتنی ضروری ہے۔ تمہارے بغیر تقریب مکمل نہیں کہلا سکتی۔ خیر یہ تو ہم اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں کہ تمہاری شرکت کتنی منفعت بخش اور تمہاری عدم شرکت کس قدر نقصان دہ ثابت ہوگی۔ لیکن اتنی بات تو سیٹھ کلن خاں نے بھی ارشاد فرمائی ہے کہ ملّا مکّی کو ضرور بلاؤ۔ ان کے وجود مسعود کے بغیر محفل میں جان پیدا نہیں ہو سکے گی۔ وہ تمہاری کسی نظم کو سننے کے بھی خواہش مند ہیں اور عزیزم یہ بھی واضح رہے کہ اس تقریب میں چند سرکاری حضرات کو بھی مدعو کیا گیا ہے خاص کر سی۔ آئی۔ ڈی سے تعلق رکھنے والوں کی ایک ٹولی بھی جلوہ گر ہو رہی ہے۔ ان حضرات کو از راہِ سیاست بلایا گیا ہے تاکہ آئندہ کسی نازک وقت میں وہ ہماری حمایت کر سکیں کہ یہ لوگ جماعت اسلامی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ تو جماعت اسلامی کے خون کے پیاسے ہیں اور انھوں نے ایک تقریب میں جماعت اسلامی کے خلاف بڑی دھواں دار تقریریں کی تھیں۔ اور دیکھو برادرم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جماعت اسلامی کا مستقبل ہندوستان میں تاریک ہے۔ اس جماعت کی حمایت کرنے کا کھلا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنا مستقبل تاریک کر لیں اور حکومت کی نگاہوں میں غدّار بن جائیں۔ صوفی تبارک علی کا انداز خالص واعظانہ تھا نہ جانے وہ کب سے بول رہے تھے۔ جب وہ اس آخری جملہ پر پہنچے تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں بے اختیار بول پڑا۔

حضور! مستقبل تو اسلام کا بھی تاریک ہے اور صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں تو کیا ہم اسلام کو طلاق دے ڈالیں۔

تم منطق بازی مت کیا کرو۔ ویسے بھی ہم اس وقت بحث کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں۔ چلو تم اٹھو — لوگ منتظر ہوں گے۔

انھوں نے خوشامدی لہجہ میں کہا۔

صوفی صاحب میری عقل کہتی ہے کہ اس تقریب میں میری حاضری کم از کم میرے فائدہ مند ثابت نہیں ہوں گی۔

عقل کی بات چھوڑیئے۔ دل یقیناً اس بات کا متقاضی ہوگا کہ اس تقریب میں شریک ہو جائے۔

بھلا یہ شعر کس کا ہے:—

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ارسطو کے قصر نمبر ۲ کا۔ میرے لہجہ میں جھلاہٹ تھی۔
پیارے دوست! میں تمہیں اپنی آٹھ سالہ رفاقت کی

قسم دیکر کہتا ہوں کہ تم فوراً تیار ہو جاؤ۔ سیٹھ کلن خاں سے میں اس بات کا وعدہ کر کے آیا ہوں کہ میں ملا کو لا کر رہوں گا۔ اگر تم میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو اس رسوائی کا طوق میرے گلے میں پڑ جائے گا۔ میری بات کی لاج رکھو۔ پلیز۔ میرے دوست۔ میرے بھائی۔

میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں لجاجت تھی اور ان کا انداز اصرار شفقت و حمتا سے لبریز تھا۔

میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ چلئے میں ساتھ چلنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہوں لیکن میرے آمادہ ہو جانے سے کیا ہوتا ہے، اہلیہ اس تقریب خاص میں شرکت کرنے کی اجازت نہیں دے گی اور تم جانتے ہو کہ میں اپنی اہلیہ کی اجازت کے بغیر مر بھی نہیں سکتا۔

لاحول ولا قوۃ۔ اہلیہ ہے یا تھانیدار۔ وہ انتہائی سڑے ہوئے انداز میں بڑبڑائے۔

تھانیدار سے با آسانی نمٹ سکتا ہوں مگر اس اہلیہ کی بچی سے نمٹنا آسان نہیں ہے۔

تو چلو بغیر اجازت ہی کے چلے چلتے ہیں کسی کو کیا خبر ہو گی۔ اگر اسے کسی طرح خبر ہو گئی تو وہ مجھے دیواروں میں چنوا دے گی۔ ورنہ کامل ایک ہفتہ تک بینگن کا بھرتہ ابھالے گی۔ اور میں دو زخ کا ایندھن بننا گوارہ کر سکتا ہوں لیکن بینگن کھانے کا عذاب برداشت نہیں کر سکتا۔

یار جھوٹ بول رہے ہو۔ صوفی اجمیر کہہ رہے تھے کہ ملا کی بیوی سے زیادہ اچھی عورت دنیا میں آج تک پیدا نہیں ہو سکی۔ بڑی ہی خوش اخلاق ہے۔

انھوں نے صحیح فرمایا۔ لیکن شاید انھیں اس بات کی خبر نہیں کہ اپنے بھیا کی موت کے بعد وہ چڑچڑی ہو کر رہ گئی ہے۔ بات بات پر غصہ۔ بات بات پر رونا — دن میں ستر مرتبہ وہ روٹھتی ہے اور ستر مرتبہ میں مناتا ہوں۔

اچھا جاؤ تم اجازت طلب کرو۔ میں شاہ دھولے کا واسطہ دیکر خدا کو مجبور کر دوں گا کہ وہ تمہاری اہلیہ کو نرم کر دے۔

ہائیں — کیا خدا کو بھی مجبور کیا جا سکتا ہے۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

کیوں نہیں — اولیاء کے اختیارات بہت وسیع ہیں۔ اور اگر اس نے اجازت نہیں دی" میں نے انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھا"

تو پھر مجبوری کا نام مہاتما گاندھی۔

ٹھیک ہے۔ میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور حل تو جلالتُ پڑھتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ ملائن چھالیاں کترنے میں مشغول تھی۔ چہرہ مبارک پر ڈھائی بج رہے تھے۔ آنکھیں اس بات کی چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ کچھ دیر پہلے روئی بھی ہے ضرور روئی ہو گی۔ اس کی آنکھیں جھوٹ کبھی نہیں بولتیں رونے کی دو ہی وجہ ہو سکتی تھیں۔ یا تو اپنے کرم فرما بھیا کی یاد آئی ہو گی یا پھر صبح والی بات کا احساس ہوا ہو گا۔ اغلب گمان یہی ہے کہ بیوہ احساس پر صبح والے حادثہ کی پرچھائیاں مچل اٹھی ہوں گی اور بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہوں گے — اب بات جب بات زبان پر آ ہی گئی تو قارئین کو یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج صبح حادثہ کیا پیش آیا تھا۔ ناچیز سے کونسا ایسا قصور سرزد ہو گیا تھا جو ملائن کو سخت ناگوار گزرا اور وہ منہ پھلا بیٹھی۔ عورت کا منہ پھولنا کوئی انوکھی اور قابل تعجب بات نہیں۔ یہ تو وقتاً فوقتاً پھولتا ہی رہتا ہے البتہ ملائن کا منہ پھولنا قابل تعجب ضرور ہے اس لئے کہ ملائن کے بارے میں بعض عقلمندوں کی پراسرار رائے یہ ہے کہ وہ عورت نہیں کوئی اور چیز ہے عورت اتنی متحمل، اتنی وفاشعار اور اتنی شوہر پرست نہیں ہو سکتی — آپ کہیں گے کہ عورت شوہر پرست نہیں ہو گی تو کیا مرد شوہر پرست ہو گا۔ میں عرض کروں گا کہ آپ ازراہ کرم خاموش رہیں۔ عقلمندوں نے جو کچھ فرما دیا ہے اسے ٹھیک ہی سمجھنا چاہئے اگرچہ وہ ٹھیک نہ ہو۔ عقلمندوں کی کسی بات پر ابن واں کرنا کفران عقل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آج اس عورت کا منہ پھولا ہوا تھا جس کو عورت سمجھنے میں بعض عقلمندوں کو تامل رہا ہے۔ دراصل حادثہ یہ پیش آیا تھا کہ

آج فجر کی نماز کے فوراً بعد صوفی شہتوت آدھمکے اور تکلفات کا قتل عام کرتے ہوئے بولے۔
مُلّا بھائی! دل و دماغ کا تقاضا تھا کہ آپ کے گھر ناشتہ کیا جائے لہٰذا چلے آئے۔
میری رگوں میں دوڑنے والا خون منجمد ہو گیا۔ ہوش و حواس جنگلی کبوتر بن کر اڑ گئے۔ بدحواسی کے عالم میں میں نے عرض کیا۔
اولاً تشریف آوری کا شکریہ اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ نے مجھ سے تکلف نہیں برتا تو میں ہی کیوں تکلفات کے جھمیلوں میں پڑوں۔ لہٰذا تکلفات کا گلا گھونٹتے ہوئے گزارش کرتا ہوں کہ فی الوقت چائے کا ایک قطرہ بھی میں آپ کو نہیں پلا سکتا۔
یار کیسی بداخلاقی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔
حالات آدمی کو بداخلاق بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔
کیا بات کرتے ہو۔ حالات آدمی کے ماتحت ہوتے ہیں یا آدمی حالات کے ماتحت ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی چٹکی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور پھر اس طرح داد طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگے جیسے وہ یہ فقرہ کسی پاتال کی گہرائی سے نکال کر لائے ہوں۔
اپنی پریشانی کا صحیح معنوں میں اظہار کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں شرمندہ ہوں۔ آپ مجھے مجبور نہ کریں۔
مجھے تمہارے حالات کی خبر ہے۔ بے شک پریشان ہو لیکن پریشانیاں اس درجہ نہیں ہیں کہ یار دوستوں کو چائے تک نہ پلا سکو۔
چائے پلانے کی اہلیت ضرور رکھتا ہوں لیکن مشکل تو یہ ہے کہ تم لوگ چائے پر کب اکتفا کرتے ہو۔
ملا بھائی! زیادتی کر رہے ہو۔ ہم نے کب تمہیں اس بات پر مجبور کیا ہے کہ چائے کے ساتھ دوسرے لوازمات بھی مہیا کرو۔ کتنی ہی مرتبہ تم نے خالی چائے پیش کی اور ہم صبر و شکر کے ساتھ پی گئے۔ کوئی شکایت نہیں — کوئی واویلا نہیں۔ آزما لو آج بھی خالی چائے پر سجدۂ شکر کر کے دکھا دیں گے۔
اچھا چلو میں بیٹھک کھولتا ہوں — مرتا کیا نہ کرتا میں نے بیٹھک کھول ہی دی — صوفی شہتوت صوفہ پر اس طرح جم کر بیٹھ گئے جیسے اب زندگی بھر اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں۔
ملا تن سرّی اور جہری ذکر میں مشغول ہے۔ وہ فارغ ہو جائے تو میں چائے کا آرڈر دوں گا۔ تھوڑی دیر لگے گی میں نے سامنے والے صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
کوئی بات نہیں۔ دیر آید درست آید۔
کبھی شیخ میکائیل کے گھر بھی ناشتہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے یوں ہی یہ بات پوچھ ڈالی۔
"چند بار" انھوں نے پرُ وقار لہجہ میں کہا۔
سنا ہے بڑے سخی آدمی ہیں۔
ہوں گے — ہمارے ساتھ تو انھوں نے کبھی سخاوت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب پہنچے خالی چائے پر ٹرخا دیا صرف ایک بار انڈوں کا حلوہ کھلایا تھا وہ بھی نہ جانے کس نیت سے۔ دس دن تک لگا تار ہمیں دست آئے تھے اور یہ تو پرانی بات ہوئی۔ اب تو انھیں چائے کے دو گھونٹ پلانے کی بھی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔ حالانکہ آمدنی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ تعویذ گنڈوں کا کام پورے عروج پر ہے — ملا بھائی یہ تعویذ گنڈے کرنے والے بھی بڑے ہی چالاک ہوتے ہیں۔ ہنس ہنس کے مارتے ہیں۔ دائیں ہاتھ سے جیب کو صاف کرتے ہیں تو بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی
جی ہاں۔ ایک سے ایک فنکار پڑا ہے۔ ناچیز نے تو اسی سلسلے کے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو دونوں ہاتھوں سے عوام کو لوٹتے ہیں اور دونوں ہی ہاتھ اس لوٹ سے قطعاً بے خبر رہتے ہیں۔
ضرور دیکھے ہوں گے۔ یہ تو لائن ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ جی بھر کے مارو اور ایک آنسو تک نہ نکلنے دو۔
کافی دیر تک اسی قسم کی فضول سی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں چائے کا آرڈر دینے کے لئے اٹھا۔ مجھے اٹھتا دیکھ کر

صوفی صاحب تڑپ کر بولے :

حکیم جالینوس کا ارشادِ گرامی ہے کہ خالی معدہ جائے تخیلات کو مجسم کر دیتی ہے۔ ایک ضعیف حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر دو چار انڈے گھر میں فالتو پڑے ہوں تو حلوہ بنوا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آگے آپ کی مرضی۔

ان کا آخری جملہ اس وقت میرے کانوں میں پڑا جب میں گھر کے صحن میں داخل ہو چکا تھا۔

میں نے ملائن کے روبرو جا کر انتہائی مؤدبانہ انداز میں عرض کیا۔

زہے نصیب! الحاج صوفی شہتوت نقش بندی قادری، جنتی تشریف لائے ہیں۔ خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ از خود انھوں نے ناشتہ کی فرمائش کی ہے۔ یعنی ہم میاں بیوی دعوت کی زحمت سے بچ گئے ہیں۔

ان سے کہہ دیجئے کہ فوراً یہاں سے تشریف لے جائیں بے غیرتی کی بھی کچھ حدیں ہوتی ہیں۔ کیا ان لوگوں کے گھر میں چولہا نہیں جلتا۔

ملائن کا لہجہ بڑا تلخ تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ کے شعلے دہک رہے تھے۔

" میں نے نرمی بھرے لہجہ میں کہا۔

بیگم ذرا آہستہ۔ صوفی شہتوت نے سن لیا تو خفا ہو جائیں گے۔ اور اگر نعوذ باللہ یہ ہم سے خفا ہو گئے تو خدا کی رحمتیں ہم سے خفا ہو جائیں گی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ صوفی شہتوت پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔ اللہ کی رحمتیں ہر وقت ان کے تعاقب میں رہتی ہیں۔

بس جانے دیجئے۔ میں ان باتوں میں آنے والی نہیں۔ صوفی شمشیر کے بارے میں بھی آپ کا دعویٰ یہی تھا کہ پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ زہد و پرہیزگاری کا پیکر ہیں۔ ایسے ہیں ویسے ہیں۔

تو کیا ان کی پرہیزگاری میں تمہیں کلام ہے" میں نے بناوٹی حیرت کا اظہار کیا"

جب انھوں نے مرزا شیخ داؤد کی بہن کو چھیڑا تھا تو اس وقت تک ان کی پرہیزگاری کہاں چلی گئی تھی۔

تم سو فیصد ہی ناقص العقل ہو تمہیں کیسے سمجھایا جائے کہ یہ صوفیا حضرات دانستہ خطائیں کرتے ہیں۔

کیا مطلب ؟

مطلب تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ البتہ صوفی ہُدہُد کہہ رہے تھے کہ اگر ہم لوگ وقتاً فوقتاً غلطیاں نہ کریں تو دنیا ہمیں خدا سمجھ بیٹھے — اور پھر باقاعدہ ہماری پوجا شروع ہو جائے لہٰذا عوام کالانعام کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے ہم اپنی بشریت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

چلئے میں مان لیتی ہوں کہ آپ کے تمام دوست اپنے وقت کے غوث اور قطب ہیں لیکن اس وقت میں کسی کے لئے ناشتہ تیار نہیں کروں گی یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

جانِ بہار۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنے اس آخری فیصلہ میں ترمیم کر لو۔ احسان ہوگا۔

خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔

اس کے لب و لہجہ کی جھلاہٹ ور بڑھ گئی تھی۔ اور اسکی آنکھوں میں وہ پانی بھر آیا تھا جسے شاعر لوگ خونِ جگر کا نام دیتے ہیں۔ آج وہ صبح صبح دل گرفتہ تھی۔ سچ پوچھئے تو اس کا کوئی قصور بھی نہیں۔ آخر کو عورت ذات ہے۔ حالات سے کیسے متأثر نہیں ہوگی۔ وہ تو پھر ہمیشہ کی محتاط اور حساس ہے۔ مجھ جیسا کھلنڈرا اور بے حس آدمی بھی اب کبھی کبھی سوچ و فکر میں ڈوب جاتا ہے۔ مولانا عامر صاحبؒ کی زندگی میں مجھے کبھی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی کبھی میں نے اپنی عمرِ عزیز کے دو لمحے کسی سوچ و فکر کی نذر کئے تھے۔ جس غیر سنجیدگی اور لاأبالی پن کا میں اسیر رہا ہوں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ شہزادوں کی سی زندگی تھی۔ کوئی غم نہیں۔ کوئی دکھ نہیں۔ کسی بات کی کوئی پرواہ نہیں۔ دل و دماغ تفکرات سے بے نیاز تھے — لیکن سالے صاحب کے انتقال کے فوراً ہی بعد حالات نے کروٹ بدلی اب نہ وہ چین ہے نہ سکون، نہ وہ بے فکری ہے نہ لاپرواہی۔ دماغ ہر وقت اسی سوچ و فکر میں الجھا رہتا ہے کہ آنے والی رات کیا رنگ دکھلائے گی اور آنے والی صبح کس عالم میں گذرے گی

عامر صاحب کی زندگی میں کبھی کسی دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن ان کی وفات کے بعد کئی بار اپنی غیرت کا گلا گھونٹنا پڑا۔ کئی بار دوسروں کی کنڈیاں کھٹکھٹائیں۔ کئی بار قرض مانگنے کی نوبت آئی۔

شہر میں مفتی محبوب سے زیادہ سخی اور امیر دل کسی کو نہیں سمجھا جاتا ـــــ سنا جاتا کہ وہ مخلوق کی خدمت کرنے ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں لیکن مجھے تو ان کے سامنے دست سوال پھیلا کر خفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک ہی مرتبہ ان کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت آئی۔ اسی مرتبہ انھوں نے اپنی نورانی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ہم سے قرض حسنہ کی توقع مت کرنا۔ ہم عامر عثمانی نہیں ہیں کہ جیسے دیا بس دے دیا ـــــ لو یہ پچاس روپے رکھ لو اور ٹھیک پندرہ روز بعد لوٹا کر اپنے شریف النسل ہونے کا ثبوت پیش کر دینا۔

مجھے مفتی محبوب صاحب سے ایسی توقع نہیں تھی۔ میں تو انھیں بیسویں صدی کا عثمان غنی تصور کرتا تھا لیکن تجربہ کی کسوٹی پر گھس کر اندازہ ہوا کہ ان کی شخصیت پر خدمت خلق اور سخاوت کا جو ملمع چڑھا ہوا ہے وہ خالص سونے کا نہیں ہے بلکہ اس میں پیتل کی آمیزش ہے۔

قارئین کہیں گے کہ اگر مجھے کبھی روپوں کی ضرورت پڑی ہی تھی تو میں نے حسن احمد صدیقی سے جا کر اپنی ضرورت کا اظہار کیوں نہ کیا۔ قارئین کی بات بلاشبہ سمجھداری پر مبنی ہے لیکن قارئین کو تجلی کے موجودہ ایڈیٹر کے مزاج کا اندازہ نہیں اگر ایک بار بھی کسی قاری کی اس شخص سے ملاقات ہو گئی تو اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ شخص انتہائی درجہ کا بداخلاق اور مغرور ہے۔

واقعی بزرگوں نے ٹھیک ہی فرمایا ہے کہ اگر کسی نالائق آدمی کو کسی لائق جگہ بٹھا دیا جائے تو وہ کم ظرفی کا مظاہرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے ایک بار نہیں کئی بار میرے ساتھ کم ظرفی کا مظاہرہ کیا۔ پھر کبھی یہ اندوہناک باتیں تفصیل کے ساتھ سناؤں گا اس وقت گی روداد ظلم و ستم بیان کرنیکا موقعہ نہیں

اور دوسرا ایڈیٹر صاحب اگر حسن اتفاق سے اعلیٰ ظرف بھی ہوتے تو میں ان کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں اور اپنے سے چھوٹے آدمی کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے

خلاصہ یہ ہے کہ عامر صاحب دنیا سے چل بسے اور مثلاً ابن العربی مکی پچاس قسم کی الجھنوں کا شکار ہو گیا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں اگر مسٹر ملا کا ذہنی توازن بگڑ جائے اور وہ مستقل طور پہ دل گرفتہ ہو کر رہ جائے تو تعجب خیز اور حیرت انگیز بات تو نہیں؟۔

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ گزشتہ ہفتہ کئی دوست آدھمکے اور حسب عادت انھوں نے ناشتہ کا اصرار کیا ملائن کو حیت حیلوں کے بعد ناشتہ تیار کرنا ہی پڑا۔ آخر میں صوفی حل من مزید نازل ہوئے تھے۔ ان کی خوراک چار پہلوانوں کی خوراک سے بھی کچھ سوا ہے۔ چنانچہ انھوں نے آکر باورچی خانہ کی جھاڑو دلوا دی۔ اس دن بھی ملائن نے بہت چیخ میخ کی۔ چوبیس گھنٹے ناچیز سے ناراض رہی پھر بمشکل تمام میں اسے منانے میں کامیاب ہوا۔ اس واقعہ کو ابھی چار روز ہی گذرے تھے کہ آج پھر یہ حادثہ پیش آگیا۔ حادثہ ہی کہئے کہ یہ صوفی شہتوت آدھمکے اور وہی ناشتہ کا اصرار ملائن کو غصہ آنا ہی تھا۔ چنانچہ آیا ـــ میں ناشتہ ناشتہ کی رٹ لگاتا رہا اور وہ انتہائی مستقل مزاجی کے ساتھ انکار کرتی رہی۔

اس کے پیہم انکار کے سامنے اگرچہ میرے اصرار کی کمر ٹوٹ گئی تھی لیکن ہمت میں پھر بھی نہیں ہارا اور میں نے اپنے ترکش کا آخری تیر پھینکتے ہوئے کہا۔

چلو میں انھیں گیٹ آؤٹ کئے دیتا ہوں لیکن یہ سوچ لو کہ صوفی شہتوت نے تمہارے اوپر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

احسان ـــــ کیسا احسان؟" وہ سر سے پاؤں تک سوالیہ نشان بن گئی"۔

شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ان کا تعلق اس طبقہ

طبقہ سے ہے جو طبقہ تمہارے بھیا کا عقیدت مند کہلاتا ہے یہ ابھی بمبئی گئے تھے۔ ناریل باڑی قبرستان جا کر انھیں اس بات کا علم ہوا کہ تمہارے بھیا کی قبر پر ابھی تک کتبہ نہیں لگ سکا۔ انھوں نے بھاگ دوڑ کی۔ ادھر سے ادھر پریشان پھرے اور کئی دن کی مسلسل تگ و دو کے بعد تمہارے بھیا کی قبر پر کتبہ نصب کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ بیچارے نے بڑی پریشانی اٹھائی۔

سچ۔

سو فیصدی۔ اب ذرا سوچو ایسے شخص کو یوں ہی نکال دینا کیا اعلیٰ درجہ کی بداخلاقی نہیں ہو گی۔ صوفی شہتوت جیسے محسن اعظم کو اسپیشل قسم کا ناشتہ کرانا ہمارا اوّلین فرض ہے۔ اگر ہم دونوں نے اس فرض سے جان چرائی تو خدا تو ہوگا ہی ناراض، تمہارے بھیا کی روح کو بھی ہم سے خفا ہونا پڑے گا۔

اس نے چند لمحے کچھ سوچا پھر مسرت آمیز لہجہ میں بولی۔

اچھا جائیے آپ انھیں باتوں میں تو لگائیے۔ میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔

شاباش۔ "خدا تمہارے سہاگ کو سلامت رکھے"۔

یہ دعا بے اختیار میری زبان سے خارج ہوئی تھی۔

مختصر بات یہ ہے کہ ملائن نے ناشتہ تیار کیا۔۔۔ ناشتہ اتنا عمدہ تھا کہ پچھلے سو سال میں مجھے اتنا عمدہ اور لذیذ ناشتہ کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور آئندہ بھی سو سال تک اس بات کی امید نہیں کی جا سکتی کہ ایسی خوش ذائقہ چیزیں نصیب ہو سکیں گی۔

صوفی شہتوت جھوم جھوم گئے۔ خود فدوی بھی انگلیاں چاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ لیکن شامت اعمال ناشتہ کی عمدگی پر ابھی سجدۂ شکر بجا لانے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی کہ قیامت آ گئی ۔۔۔ ملائن کا پارا چڑھ گیا۔ ہوا یہ کہ تو دس بجے کے قریب شیخ سراج الدین کے صاحبزادے منو میاں تشریف لائے۔ وہ سیدھے بمبئی سے آ رہے تھے۔ انھوں نے ملائن کو پوری ہسٹری سناتے ہوئے کہا کہ ابھی تک مولانا کی قبر پر کتبہ نہیں لگایا جا سکا۔ حنیف نام کے کوئی آدمی کوشش میں تو لگے ہوئے ہیں لیکن ابھی انھیں اپنی کوشش میں کامیابی نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ قبر کو پانچ سال کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ فقط والسلام۔

ملائن پر جب یہ حقیقت منکشف ہوئی تو اسے غصہ آنا ہی تھا۔ چنانچہ آیا۔ اور زبردست آیا۔ صوفی شہتوت تو کھا پی کر جا چکے تھے میں یتیم و لاچار گھر میں موجود تھا۔ وہ مجھ پر برس پڑی میں بالکل چپ رہا۔ بولتا بھی کیا غلطی سراسر اپنی ہی تھی۔ بہرحال وہ گھنٹہ دو گھنٹہ بڑبڑاتی رہی اور اس کے بعد اس نے اپنی زبان پر قفل چڑھا لیا۔ قفل کے ساتھ ساتھ اس کا منھ بھی چڑھ گیا۔

اور صبح سے اب تک اس کا منھ چڑھا ہوا تھا۔ مجھ سے قطعاً بات نہیں کر رہی تھی۔ اس نازک صورت حال میں اس بات کی کیسے امید کی جا سکتی تھی کہ وہ مجھے ایسی تقریب میں شرکت کرنے کی اجازت دیدے گی جو ایک سودخوار کے مکان میں منعقد ہو رہی ہے اور وہ بھی جماعت اسلامی کے خلاف۔

میں ملائن کے قریب پہنچا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ آئینہ تو میرے روبرو تھا نہیں کہ اپنے چہرے پر بکھرے ہوئے تاثرات کا جائزہ لے سکتا۔ البتہ یہ مجھے یقین ہے کہ اس وقت عاجزی اور انکساری میرے انگ انگ سے بے تحاشہ ٹپک رہی ہوگی اور میری داڑھی کا ہر بال خدا کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوگا کہ مجھ سے زیادہ ہونہار اور تابعدار شوہر کسی قبرستان تک میں موجود نہیں ہے میں آواز کا توازن درست کرنے کے لئے کھنکھارا پھر خالص طالبعلمانہ انداز میں بولا۔

مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

لیکن میں کچھ سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔" اس کے لہجہ میں بڑی لاپرواہی تھی"۔

"بانو۔ اس میں کس نامراد کو شک ہو سکتا ہے کہ آج صبح میں نے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ تم بطور سزا اگر مجھے بجلی کے کھمبے میں باندھ کر الٹا لٹکا دو تو وہ بھی میرے ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی۔ میں از رو ئے

شریعت بھی سزا کا مستحق ہوں، لیکن تم نے یہ ضرور سنا ہوگا کہ پروردگار ان گناہگار انسانوں کو عذاب دیتے ہوئے شرماتا ہے جنکی داڑھی میں سفید بال اگ آئے ہوں۔ اور تم بھی چونکہ بوڑھے انسانوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت و محبت کا برتاؤ کرتی رہی ہو اس لئے میری مؤدبانہ التجا ہے کہ میری داڑھی کے ان سفید اور یتیم بالوں کا خیال کرو اور میری مغفرت فرما کر اپنے رحیم و کریم ہونیکا ثبوت فراہم کرو۔ مجھے امید ہے بلکہ یقین ہے کہ۔۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا اس کے ہونٹوں پر تبسم کی قوس قزح بکھر چکی تھی۔ میں خوشی کے مارے بیہوش ہونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ دفعتاً اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ تبسم کی قوس قزح ہونٹوں سے ہجرت کر کے شاید معدہ میں جا پہنچی تھی۔ اس نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

آخر مطلب کیا ہے۔

کوئی خاص مطلب نہیں۔ بس تھوڑی دیر کے لئے گھر سے غائب ہونا چاہتا ہوں۔

کہاں جانے کا پروگرام ہے؟

سیٹھ کلن خاں کے ہاں جانے کا پروگرام ہے۔ انھوں نے بڑی چاہت و اصرار کے ساتھ مجھے مدعو کیا ہے۔ خواجہ تکلف علی کی صاحبزادی مس الجعبیہ کے اکلوتے شوہر مجھے لینے کے لئے آئے ہیں اور دروازے میں تشریف فرما ہیں۔

وہاں کوئی خاص پروگرام ہے؟

خدا کو خوش کرنے کا منصوبہ ہے۔ سب انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔

میں سمجھی نہیں۔

ضروری نہیں کہ ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ویسے بھی صوفیوں کی باتوں کو جتنا کم سمجھو گی اتنا ہی تمہارے لئے مفید ہے۔

سنجیدگی سے بتائیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟۔

بتاتو دیا کہ خدا کو خوش کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ اسکے چہرے پر سنجیدگی اور حیرت کی سلوٹیں کافی تعداد میں پھیل گئی تھیں میں گھبرا گیا اس عالم میں اگر چار منٹ بھی گذر جاتے تو وہ عین جوانی میں بوڑھی ہو جاتی اور پھر میں کسی صحرائے عشق میں مارا مارا پھرتا

اسی گھبراہٹ کی حالت میں الفاظ میری زبان سے خارج ہو کر اس کے کانوں میں داخل ہونے لگے۔

بات دراصل یہ ہے کہ گذشتہ ہفتہ صوفی ڈلڈل نے چھپونے شاہ کے مزار پر ایک زبردست مراقبہ کیا تھا۔ مراقبہ ایک سو ایک فیصد کامیاب رہا۔ عالم محویت میں انھوں نے دیکھا کہ چھپنے شاہ ایک خیزانٹ پر سوار ہو کر تشریف لائے اور انھوں نے جلال و ہیبت سے بھری آواز میں کہا۔

میاں ڈلڈل کیا بات ہے؟۔

حضور پرنور فیض گنجور صاحب غلمان وحور بندۂ حقیر ابن نخیر اولیاء کے در کا فقیر یہ پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہے کہ اس دور جاہلیہ میں خدا کو خوش کرنے کا بہترین اور مؤثر ذریعہ کیا ہے۔ چھپنے شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا۔

جاؤ مودودیوں کے خلاف تحریک چلاؤ۔ جماعت اسلامی کو گمراہ ثابت کرنے میں اپنی جان و ایمان کی بازی لگا دو۔ انتہائی مستقل مزاجی کے ساتھ جھوٹ بولو عوام و خواص میں جماعت اسلامی کے خلاف بدظنی پھیلاؤ اور اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔ پلے باندھ لو کہ مودودیوں کی جتنی مخالفت کرو گے خدا اتنا ہی تم سے خوش ہوگا۔ جس مکان میں ہر روز ملنشی مودودی کی تین سو تیرہ مرتبہ غیبت کی جائے گی اور ایک سو ایک تہمتیں لگائی جائیں گی وہاں خدا کی رحمتیں اور برکتیں اس طرح برسیں جس طرح موسلا دھار پانی برستا ہے۔

صوفی ڈلڈل نے یہ تمام انوکھے انکشافات اپنے احباب و متعلقین پر ظاہر کئے۔ سیٹھ کلن مسٹر ڈلڈل کے ماموں کی خالہ زاد بہن کے واسطہ سے صوفی ڈلڈل کے کچھ نہ کچھ ضرور لگتے ہیں اس لئے ان پر بھی یہ نادر اور انوکھی باتیں واشگاف ہوئیں۔ وہ ان باتوں کو سنتے ہی اپنے مکان میں ایک ایسا جلسہ منعقد کرنے کے لئے بیتاب ہو گئے جس میں مودودیوں پر خوب دل کھول کر طعنہ زنی کی گئی ہو۔ تاکہ گھر میں خوب برکتیں نازل ہوں اور خدا کی رحمتیں جیب میں سمٹ آئیں۔

تم ایسے اہیات جلسہ میں جا کر کیا اکھاڑ دو گے؟

(جاری)

- دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
- جب ایمان کی بہار آئی .

شمس نوید عثمانی

[illegible]

دریائے کابل سے دریائے نیل تک

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب .
صفحات ۳۰۴ ۔ مجلد قیمت چودہ روپے ۔
شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام
پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ .

کتاب کے گرد پوش پر کتاب کا تعارف کراتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ "مغربی ایشیا کے چھ مسلم اور عرب ممالک کے ایک معلوماتی و دعوتی دورہ کی مفصل روداد" ہے جس میں "ان ممالک کی دینی و فکری، سیاسی و اقتصادی صورت حال کی سچی تصویر اور وہاں کی دینی و اصلاحی تحریکات، متضاد عوامل و تاثرات اور ذہنی و روحانی کشمکش کا دیانت دارانہ جائزہ لیا گیا ہے" مختلف مقامات پر خود روداد نگار نے اس کا اظہار کیا ہے کہ اس روداد میں "صداقت و انصاف اور غیر جانب داری کا لحاظ" تمام "تر اکتوں اور باریکیوں کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ نیز یہ کہ ان کا "ذوق تاریخی رہا ہے" (۵۹)

کوئی شک نہیں کہ سفرنامہ افغانستان، ایران، لبنان، دمشق، بغداد اور اردن کی تصویر کا ہر وہ رُخ جس کا تعلق ان ممالک میں ہئیت اسلامی کے "جسم و جان" سے ہے۔ دیکھنے اور دکھانے کی خوبصورت کوشش کرتا ہے ——— زاویۂ نظر میں دماغی رسائی اور اظہار و بیان میں درد دل کی خاص چاشنی بھی ہے ——— معلومات کے نت نئے گوشوں پر سے حجاب بھی اٹھتے ہیں اور سفر کے ہر موڑ پر دعوتی کاوش بھی کی جاتی ہے اور اس لحاظ سے مجموعی طور سے کتاب نہ صرف لائق مطالعہ بلکہ استفادے کے قابل ہے لیکن تعارفی سطروں میں اور دوسرے مقامات پر کتاب کا جو "معیار تحریر" اور جو اس کے حدود کا تعین کئے گئے ہیں ان کے لحاظ سے اس ذہنی سیرابی کے دوران میں کچھ نہ کچھ تشنگی کے عنوان بھی ملے .

مثلاً صفحہ ۳۵ پر جہاں سیاحت کا راس پر صغیر میں نوجوانوں کی ذہنی تربیت کرنے والی جماعتوں کا تذکرہ کرتا ہے وہاں صرف ایک جماعت جس سے ان کا اپنا بھی کچھ تعلق ہے ذکر کرتے ہیں ——— ایک غیر جانبدارانہ جائزے اور تمام نزاکتوں کے لحاظ اور تاریخی ذوق کے دعوے کے لئے یہ بات کہاں تک ہم آہنگ ہے .

ایک نکتہ رس مؤرخ کی حیثیت سے تمام باریکیوں کا لحاظ کرنے والے سے یہ توقع ہونی چاہئے کہ صفحہ ۴۵ پر جہاں

افغانستان کی مشرقی و اسلامی اقدار کو ڈھانے والے خفیہ عوامل کی بات چھیڑی گئی اور صفحہ ۱۲۶ پر جہاں اسلامی ممالک میں برپا ذہنی کشمکش پر اظہار خیال کیا گیا وہاں افغانستان کے واقعات میں صرف ایک شخصیت کا نام لینے پر اور عالمی کشمکش کے پس پشت صرف "دین اور لادینیت" کے مسئلہ کی نشاندہی تک پہونچکر رک جانا حقائق کی تہ سے پہلے ٹھیر جانا ہے ورنہ نئی معلومات نے اس راز کو اب کافی افشا کر دیا ہے کہ دنیا میں کشمکش کی بنیاد دین یہود اور غیر یہود کے درمیان ہی اور نہ ہی اسلامی ممالک ہی دین اور لادینیت کے عنوان سے سامنے آئی ہے۔ یہ کشمکش صرف اسلام اور غیر اسلام کی نہیں بلکہ یہود نے دنیا بھر کی غیر یہودی قوموں کے خلاف گوناگوں فتنہ سامانی کا جال پھیلا رکھا ہے اور ضرورت ہے کہ اس مشترک دشمن کی نشاندہی کر کے ہمارے واقعات نگار اس کے خلاف عالمی قوتوں کو مرکز پر لانے کا میدان بنائیں۔

صفحہ ۳۸ پر یہ الفاظ" میں پورے عالم اسلام کو ایک ملک سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کو پیش آنے والا ہر حادثہ .... دردناک المیہ ہے" ایک ایسی مذہبیت کے الفاظ ہیں جو اس عہد میں ہماری مذہبیت کی عالمی وسعتوں کو کھولنے والی نہیں، حالانکہ یہ عہد وہ ہے جب خدا نے ساری دنیا کو ایک گھر اور ساری انسانیت کو ابلیس اور ابلیس کے پیکر محسوس یہودیت و صیہونیت کا مارگزیدہ بنا کر سامنے رکھ دیا ہے اور اس مارگزیدہ کے تریاق اور اس مار آستین کی سرکوبی کے لئے وہی لوگ عالمی ذہن کی ایک فضا بنا سکتے ہیں جو اسلام کی روشنی میں حقائق پر نظر ڈال سکتے ہیں اس کے علاوہ عالم اسلام اور "مسلمان" کے الفاظ کا مفہوم مسلمانوں کی موجودہ عالمی مسلمانی کے پس منظر میں نہ جانے کیا اور کہاں تک باقی رہ جاتا ہے؟ اور یہ حقیقت ہمارے ذہنوں سے نہ جانے کتنی دور، کتنی قریب ہے۔ سارے ہی انسان فطری لحاظ سے اسی طرح "پیدائشی مسلمان" ہی تو تھے جس طرح آج کے وہ نام نہاد مسلمان جن کو دین سے بے خبری اور دنیا کی فتنہ سامانی نے "نامسلمان" بنا کر رکھ دیا ہے۔ دنیا کے انسانوں کا عموماً دین فطرت سے بعد بھی آج دین کے صحیح پیغام سے محرومی کا نتیجہ ہے —— پیغام پا کر انکار والی بات تو وہاں ہونی چاہئے جہاں پیغام پہنچانے کی طرح پہنچایا جا چکا ہو۔ ہماری "تبلیغ" کی حدیں اب تو عرصہ سے محض مسلمانوں کے اسی گروہ تک سمٹ کر رہ گئی ہیں جو خود کو اپنے منھ سے مسلمان کہتا ہے اور ان "پیدائشی مسلمانوں" سے عملاً اور ذہناً کٹ کر رہ گئی ہیں جنھیں خدا اور اس کا رسول "یولد علی الفطرۃ" کے الفاظ کا مصداق بتاتا ہے۔

غیر مسلم انسانوں میں اسلام پہنچانے کا کام محض ان کتابوں کے ترجمہ سے پورا نہیں ہوتا جو نہ ان کے مذاہب میں دین حق کے باقیات کا سراغ لگا کر "کلمہ سواء" کی بنیاد پر کہی گئیں اور نہ ان میں مخاطب کی مخصوص ذہنی و نفسیاتی ساخت کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ یہ رخ کچھ ایسا نظر انداز اور غیر محسوس ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم ہیں کہ اس زیر تبصرہ کتاب میں صفحہ ۷۸ پر جہاں غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت کرنے والی ایک شخصیت اور اس کے تبلیغی تجربات کا ذکر آیا وہاں دل ترستا رہ گیا کہ ان تجربات کو دوسروں کیلئے مشعل راہ بنانے کے لئے صفحۂ قرطاس پر لایا جاتا۔ مگر یہاں ان "خوش آیند تجربوں" پر یہ تبصرہ ختم ہو گیا۔

افغانستان میں اسلامی علوم دینی کے پھولنے پھلنے کا تذکرہ خاص طور پر کیا گیا ہے اور صفحہ ۲۱ پر کابلی تاجروں کا ذکر بھی آیا اور ان کی مذہبیت کا بھی —— لیکن اس ذیل میں یہ سوالیہ نشان ذہن میں اٹھ کر محروم جواب ہی رہ گیا کہ ان کابلی تاجروں میں سود خواری کا فتنہ کہاں سے آیا۔؟

صفحہ ۲۵۰ پر اصحاب کہف کے جس غار پر سیاحت کار کا گذر ہوا اور ایسے بہت سے آثار و علامات کی نشاندہی ہوئی جنکی وجہ سے اس غار پر قرآن مجید کا بیان منطبق ہوتا ہے —— اسکے ان آثار و علامات کا کچھ تذکرہ بھی کر دیا جاتا تو کتنا اچھا تھا! —— سفرنامہ میں اس سے تاریخی انکشافات کی سنسنی خیز روح دوڑ جاتی اور انھیں مصنف کی اب کسی دوسری کتاب میں تلاش کرنے کے بجائے ناظرین کی معلومات میں "نقد" اضافہ ہو سکتا تھا۔

صفحہ ۲۷۲ پر سیاحت کار نے اپنی تقریر کی تاثیر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ "حاضرین پر تقریر کا گہرا اثر ہوا۔ تقریر ریکارڈ کی گئی۔ نہ جانے کیوں اس تحدیث نعمت میں دخواہ تقریر کی صلاحیت

کی تہمت ہو یا یہ کہ مخاطب نے اثر لیا) محدود تشکر کے الفاظ کی کمی محسوس ہوئے بغیر نہ ہوئی۔

صفحہ ۲۶ پر ہے "میں نے ان کے جیسا ترجمہ پر قادر.... کم دیکھا ہے" یہاں "ان جیسا" ہونا چاہئیے۔ ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو۔ اور غالب گمان یہی ہے۔ لیکن کچھ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بات بھی اس طرح ظاہر ہوا کرتی ہے کہ نہایت قابل اور قیمتی شخصیتوں سے کوئی ایسی غلطی ہو جاتی ہے جس سے ان میں انسان کی عاجزانہ کیفیت کا احساس تیز ہو اور پندار کے مہلکات سے حفاظت ہو۔ ایسا ہو تو یہ لغزش خانہ لغزش آدم کی طرح مقدس اشاریہ ہے۔ مولانا علی میاں کے واقعی ایک بڑے مسلمان اور بڑے انسان ہونے کا۔ اور سچ یہ ہے کہ ہمارے حسن ظن میں وہ ہیں بھی ایک بڑے انسان اور درد دل والے مسلمان۔ اس لئے توقع ہے کہ ہماری معروضات ان کے لئے مضر نہیں مفید ہوں گی۔ انشاء اللہ۔

جب ایمان کی بہار آئی

مولانا سید ابوالحسن علی میاں۔

صفحات ۱۷۲۔ قیمت دس روپے۔

شائع کردہ: مکتبہ فردوس مکارم نگر۔ لکھنؤ۔

صفحہ اول پر یہ تعارفی تحریر ہے "مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ اور آپ کے عالی ہمت رفقاء کے ایمان افروز واقعات جن کی کوششوں سے ہندوستان میں ایمان کی بہار آئی اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی یاد تازہ ہو گئی"!

سید صاحب علیہ الرحمہ کے مجاہدانہ کارناموں پر اردو میں کتابوں کی کمی نہیں۔ البتہ زیر نظر کتاب اس فہرست میں ایک قیمتی اضافہ ضرور ہے ــــ عام طور سے ان کارناموں کا تذکرہ سید صاحب اور ان کے رفقاء کی شاندار دینداری سے شروع ہوتا ہے اور "شمشیر بستاں" کے مجاہدانہ کارناموں پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن زیر تبصرہ کتاب میں اس رخ پر بھی نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے اس جہاد کو واقعی جہاد مطابق سنت ثابت کیا جائے۔

مثلاً صفحہ ۱۰۷ پر ہے۔ اس ملک میں بہت طویل عرصہ کے بعد خالص دینی بنیادوں پر جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز ہوا۔

خالص دینی بنیادوں پر جہاد کی تعریف غالباً اس جہاد پر ہی منطبق ہوتی ہے جس سے پہلے ابلاغ دین کا کام پوری طرح انجام پا چکا ہو۔ اس لئے بڑی سخت ضرورت ہے کہ سید صاحب کے تذکرہ نگار اس ملک میں انکی تحریک کے اس گوشے پر بھی بھرپور روشنی ڈالنے والی کتابیں تحریر کریں۔

ہنٹ وغیرہ پر تبت اور چین تک اس تحریک کے تبلیغی اثرات کا نفوذ تحریر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاد کو واقعی حقیقی جہاد بنانے والا یہ "پیش خیمہ" اس تحریک میں کس قدر موجود تھا۔ لیکن اس تحریک کا یہ بنیادی رخ ان تذکروں میں سمٹا ہوا محض ایک ذیلی عنوان ہی نظر آتا ہے   بنیادی نکتہ اور اصلی روح رواں کی شان سے نہیں ملتا۔ حالانکہ جیسا کہ سلام ہے خود جہاد مقصود نہیں ذریعہ ہے۔ اور تبلیغ مقصود ہے کاش مولانا علی میاں جیسا شخص جن کی نظریں تاریخ ماضی پر بھی ہیں اور حالات حاضرہ اور رجحانات تازہ پر بھی۔ وہ اس گوشے پر پورے شرح و بسط اور یکسوئی کے ساتھ قلم اٹھائیں تو واقعی پھر یہ تحریک صرف ہماری ہی نہیں غیروں کی نظر میں بھی "ایمان کی بہار" ثابت ہو سکے گی۔ اور اس کے ذریعہ غیر مسلم سے دین کی بات کہنے کا سلیقہ بھی اخلاف کے لئے سامنے آسکے گا جو نہایت قیمتی سرمایہ ہوگا۔

اس ایک تشنگی کے ماسوا یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل کتاب ہے۔ ایک قیمتی قلب اور قیمتی قلم کا تحفہ۔

حق پر کون ہے؟

صفحات ۸۸۔ قیمت دو روپیہ۔ غیر مجلد

ناشر:۔ مدرسہ رئیس العلوم رائے پور رکھنی ضلع لکھیم پور کھیری۔ یو۔ پی۔

یہ کتابچہ اس لحاظ سے منفرد اور لائق تعریف ہے کہ اس میں خود کہنے سننے کے بجائے بنیادی طور پر دیوبند اور بریلی کے اپنے لٹریچر کے حوالوں کے ساتھ دونوں کا تقابلی مطالعہ ان کے اپنے اپنے اقتباسات کے ذریعہ دیدیا گیا۔ توحید، رسالت اور آخرت کے اساسی عقائد پر دونوں مکاتیب فکر کے سربراہ کیا کہتے ہیں؟ یہ پڑھکر خود بخود دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی سامنے آجاتا ہے اس کے علاوہ ایسے اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں جنسے ایک مسئلہ میں خود بریلوی اسکول میں اختلاف اور باہمی تضاد کا پتہ چلتا ہے۔

آگے چل کر ایسے اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں ہیں جن سے ایک مسئلہ میں خود بریلوی اسکول میں اختلاف اور باہمی تضاد کا پتہ چلتا ہے۔ آگے چل کر مخالف شخصیات کے باب میں بریلوی حضرات کے انداز سخن کے نمونے دیئے گئے ہیں اور آخر میں ان کے الزامات کا مختصر سا جواب دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک نئے رخ سے اور بڑے اختصار کے ساتھ دونوں فریق کا تعارف کرا دیتی ہے۔ لیکن افسوس کہ جس کتاب کی قیمتی خصوصیت اس کا یہ جامع اختصار ہے اس کی قیمت مختصر نہیں کافی مفصل ہے! —— دو روپے اور وہ بھی غیر مجلد۔ ۸۸ صفحات کے بدلے میں۔ نجانے اس میں تبلیغی مفادات کا لحاظ کرنے کی زحمت کیوں نہیں کی گئی۔ حالانکہ تبلیغ میں ایسی باتوں کا لحاظ کرنے سے ہی خیر و برکت ہوتی ہے اور حب الدنیا کے کاروباری فتنہ کی جڑ کٹتی ہے۔



ماہر عثمانی نمبر کی

جھلکیاں

خوشنما

اور ـــــ دیدہ زیب ٹائٹل

- ـــــ بیادگار والے صفحہ پر جگر مرادآبادی کا ایک خوبصورت شعر ہوگا۔ جسے پڑھکر بعض آنکھیں عقیدت کے آنسو بہائے بغیر نہ رہیں گی۔

- ـــــ دستک۔ اس عنوان کے تحت مولانا عامر عثمانیؒ کی ایک اہم تحریر پیش کی جائے گی۔

- ـــــ توجہ طلب۔ اس مستقل عنوان کے تحت جو کچھ لکھا جاچکا ہے اسے پڑھکر آپ چونک اٹھیں گے۔ ممکن ہے کہ اسے پڑھ کر آپ چونک اٹھیں گے۔ ممکن ہے کہ اسے پڑھ کر آپ کو طیش آجائے۔ اور ممکن ہے کہ آپ رو بھی دیں۔ طیش ہم پر نہیں ان لوگوں پر آئے گا جنھوں نے مولانا عامر عثمانیؒ کے انتقال کے فوراً بعد اپنی کم ظرفیوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور یہ مظاہرہ ایک مقدس ادارے کے صحن میں ہوا تھا۔

- ـــــ احوال واقعی۔ اس عنوان کے تحت بھی ہم بہت کچھ کہیں گے، لیکن کہیں گے کیا یہ ابھی متعین نہیں کیا جا سکتا۔

- ـــــ آخری تحریر۔ مولانا عامر عثمانیؒ کا آخری اور تفصیلی خط جو انھوں نے اپنی وفات سے اٹھارہ گھنٹے قبل اپنی اہلیہ کو لکھا اور جو ان کی وفات کے تین روز بعد اہل خانہ کو موصول ہوا ـــــ یہ خط اگرچہ خالص پرائیویٹ قسم کا ہے لیکن ہم اپنے قارئین کی دلچسپی کے لئے اسے جوں کا توں نقل کردیں گے ـــــ اور اس نازک القاب کو بھی حذف کرنے کی کوشش نہیں کریں گے جو ایک شوہر نے اپنی بیوی کو مخاطب کرنے کے لئے لکھا ہے ـــــ کوشش یہ کر رہے ہیں کہ خط (بذریعہ فوٹو) ان ہی کی تحریر میں نقل ہو۔ اگر ہم اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے تو آپ سے معذرت طلب کرلیں گے معاف کیجئے کہ معذرت کی نوبت نہ آسکے۔ اور یہ خط مولانا ہی کی تحریر میں شائع ہو۔

- ـــــ آغاز سخن۔ اس نمبر کا آغاز سخن بھی بڑی اہمیت کا حامل ہوگا۔ اس چونکا دینے والی باتیں بھی ہوں گی اور رلا دینے والی بھی ـــــ ایسی باتیں جنھیں آپ کبھی فراموش نہیں کرسکیں گے۔ یہ سب باتیں اسی شخصیت سے متعلق ہوں گی جس شخصیت کو موضوع بناکر یہ نمبر نکالا جارہا ہے۔

- ـــــ مولانا عامر عثمانیؒ کے احساسات کا عکس جمیل خود ان کے تخیل کے آئینہ میں۔ اس عنوان کے ذیل میں مولانا کی ایسی غزلیں، نظمیں اور قطعات پیش کئے جائیں گے جنھیں آپ ازبر کرلیں گے اور واقعتاً ان میں کی ہر تخلیق اس قابل ہے کہ اسے اپنی لوح ذہن میں ہمیشہ کے لئے ثبت کرلیا جائے۔ اس موضوع سے ضمن میں شاہنامۂ اسلام کے چند اوراق بھی پیش کئے جائیں گے۔

○ مولانا عامر عثمانیؒ نے جماعت اسلامی کا ساتھ کیوں دیا؟

یہ ایک اہم ترین سوال ہے اور اس کا جواب مولانا ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے۔

○ ۲۵ سال تک مولانا عامر عثمانیؒ نے ایک بیمثال فقیہہ کا کردار ادا کیا۔

اس عنوان کے تحت تجلی کی ڈاک کے چند اہم سوال وجواب پیش کئے جائیں گے۔ اور ایک تجلی کی ڈاک غیر مطبوعہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ مرحوم نے اپنی زندگی میں مرتب کی تھی لیکن اسے ہم نے اس لئے شائع نہیں کیا تھا تاکہ عامر عثمانی نمبر میں پیش کرسکیں اور اس طرح اس نمبر کی اہمیت و وقعت میں اضافہ ہو جائے۔

○ مولانا عامر عثمانیؒ ـــــــ تحریر و قلم کے غازی

اس عنوان کے تحت آپ ملاحظہ فرمائیں گے وہ تحریریں جو انھوں نے فسادات کے موقعہ پر حوالۂ قرطاس کیں۔

○ مولانا عامر عثمانیؒ ـــــــ ایک بیباک مبصّر کی حیثیت سے۔

انھیں اس کی پرواہ کب تھی، کون ان سے خوش ہے اور کون ناراض۔ وہ تو سچائی اور صداقت کے پرستار تھے۔ کتابوں پر تبصرہ کرتے وقت وہ جس دیانتداری سے کام لیا کرتے تھے، وہ احباب واعدا سبھی پر عیاں ہے۔ ان بیباک اور حق پرست قلم سے نکلے ہوئے چند تبصرے آپ کی نذر کئے جائیں گے۔ انھیں آپ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں لیکن انھیں دوبارہ پڑھ کر بھی آپ ایک انوکھا کیف محسوس کریں گے۔

○ عدل و دیانت کا تقاضا ہے کہ مولانا عامر عثمانیؒ کو "مُدبّرِ اسلام" کا خطاب دیا جائے۔ اس عنوان کے تحت ان کی ایک ایسی طویل تحریر پیش کی جائے گی جس کا لفظ لفظ ان کے تدبر و تفکر اور ان کے وسعتِ علم پر دلالت کرتا ہے۔

○ ان گنت لوگ مولانا عامر عثمانیؒ کو "نقادِ اعظم" کہہ کر پکارتے ہیں۔

یہ بھی ایک موضوع ہے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ تنقید کی دنیا کے شہنشاہ تھے۔ ہم لوگوں کی تائید کرتے ہیں نہ تردید۔ ہم تو ان کا ایک تنقیدی مضمون پیش کر رہے ہیں اس کو پڑھنے کے بعد قارئین جو بھی فیصلہ کریں وہ مناسب ہی ہوگا۔

○ مولانا عامر عثمانیؒ کو محدث تو نہیں کہا جا سکتا ـــــــ لیکن ـــــــ

اس عنوان کے تحت تفہیم الحدیث کی چند قسطیں پیش کی جائیں گی۔

○ مولانا عامر عثمانیؒ ایک ذہین ترین محقق کے روپ میں۔

اس عنوان کے تحت "سایۂ رسول" کی مکمل بحث ملاحظہ فرمائیے۔

بیچ میں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ملّا ابن العرب مکی کی تازہ ترین خوش گپیاں پیش کریں گے۔ عنوان وہی ہے

سجا سے سجانے تک ۔ بطور تکلف ناسکی کی ایک منظوم قلم کی تخریب اشاعت کر لی گئی ہے ۔

○ — اور اس کے بعد — مولانا عامر عثمانیؒ احباب و اقارب کی نگاہوں میں.

اس عنوان کے تحت مختلف موضوعات پر ان کے احباب و اقارب اپنے اپنے تأثرات کا اظہار کریں گے ۔

○ — مثلاً — مولانا عامر عثمانیؒ ایک کریم طبیعت شوہر کی حیثیت سے ۔

یہ مضمون ان کی اہلیہ نسیم فاطمہ اپنے ذاتی محسوسات کی روشنی میں قلم بند کریں گی ۔

○ — یا مثلاً — مولانا عامر عثمانیؒ ایک شفیق باپ کی حیثیت سے

یہ مضمون ان کی بیٹی ناہید عثمانی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے ۔ اسی موضوع پر حسن احمد صدیقی بھی کچھ ذاتی تأثرات پیش کرے گا ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

○ — مولانا عامر عثمانیؒ — اور — اربابِ قلم

اس عنوان کے تحت وہ مضامین درج کئے جائیں گے جو ان کی شخصیت سے متعلق ہمیں موصول ہو چکے ہیں اور برابر موصول ہو رہے ہیں ۔

○ — مولانا عامر عثمانیؒ کا مقام اخبار و رسائل کی دنیا میں ۔

وفات کے فوراً بعد جن جن اخبار و رسائل میں مرحوم کی ذاتِ گرامی پر خامہ فرسائی کی گئی تھی اور جو کچھ ہدیۂ قلم کیا گیا تھا مذکورہ عنوان کے تحت نذرِ قارئین کیا جائے گا ۔

○ — مولانا عامر عثمانیؒ کی خدمت میں شاعروں کا خراجِ عقیدت ۔

اس عنوان کے تحت مرثیے اور قطعات پیش کئے جائیں گے ۔

تعزیت ناموں کی صورت میں ان گنت لوگوں کے دلی تأثرات ۔

علاوہ ازیں

دیگر بہت سے علمی اور تحقیقی مضامین اور غیر معمولی دلچسپیاں اور وہ سب کچھ جو تجلی کو دوسرے رسالوں سے ممتاز کرتا ہے اور وہ سب کچھ جس کی آپ ادارہ تجلی سے توقع کئے بیٹھے ہیں ۔

NUARY FEBRUARY

ماہنامہ

تجلی

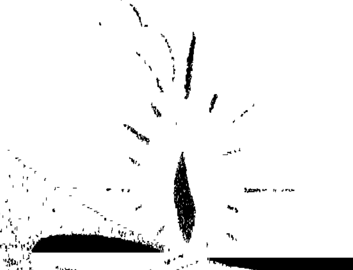
دیوبند

خدا کی راہ میں خرچ کرنا

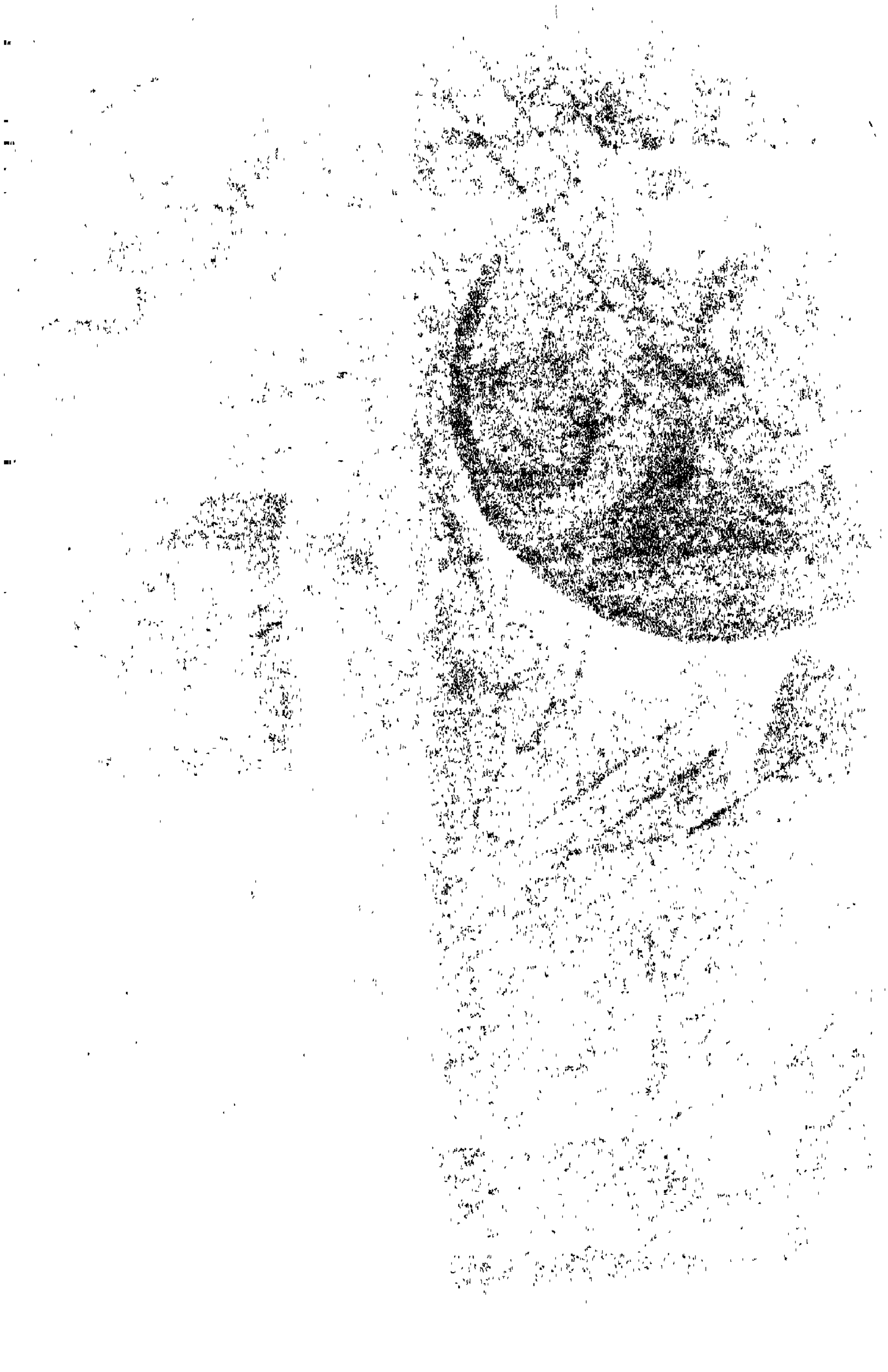
دراصل خرچ کرنا نہیں بلکہ جمع کرنا ہے

ایڈیٹر عامر عثمانی

فاضل دیوبند



تاریکیوں میں ایک چراغ




حضرت مولانا عامر عثمانی صاحب
نور اللہ مرقدہ

مستقل

دستک

علم نقاد

مولانا عامر حقانی

جہاد فقط تلواروں کے ٹکرانے ہی کو نہیں کہتے۔ نیک نیت داعیانِ حق کے لئے میدانِ سیاست بھی میدانِ جہاد ہی ہے۔ اس دلدل میں اگر وہ حریف کا شکار ہو جاتے ہیں تو ہزار بار ہوں۔ مشیتِ الٰہی اور تکوینی امور کا واحد ذمہ دار خالق کائنات ہے۔ مشیت یہی تھی کہ کتنے ہی نبیوں کو ان کی قوم ظلم و تشدد کی بھٹی میں جھونک دے، زخموں سے چور کر دے، آروں سے چیر ڈالے۔ مگر ڈیوٹی ہر نبی کی آخر تک یہی رہی کہ اپنی قوم کے آگے وہی دعوتِ حق پیش کرتا رہے جس کے نتیجہ میں پچھلے بہتیرے انبیاء جبر و جور کا نشانہ بنائے گئے حتیٰ کہ جان تک کی بازی ہار گئے اسی طرح اقامت دین کی تحریکیں اگر ہزار بار بھی سیاست کے ہاتھوں فنا کے گھاٹ اتری رہیں گی تو ڈیوٹی ان کی بہرحال یہی باقی رہے گی کہ حق کو مسندِ اقتدار پر بٹھانے کی خاطر سیاست کی دلدل میں قدم رکھیں اور اسی ابتلاء، آفت اور انجام کا سامنا کریں جو مشیت ایزدی نے مقدر کر دی ہیں جسے ہلاکت اور ابتلا سے گریز ہو وہ اقامت دین کا نام ہی کیوں لے اور یہ دعویٰ ہی کیوں کرے کہ وہ حکومتِ الٰہیہ کی منزل کا مسافر ہوں۔

راہبوں اور چلہ کشوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ مسجد و خانقاہ میں شب و روز عبادت کیجئے۔ صائم الدہر اور قائم اللیل بن جائیے، امن ہی امن کی بارش ہوگی اور عساکر طاغوتی کا کوئی سپاہی ایک تیر بھی آپ پر ضائع نہیں کرے گا۔ ہاں جب آپ اقامت دین اور حکومت الٰہیہ کی بات کریں گے تو کمانیں کھچ جائیں گی تیر چلوں پر چڑھا لئے جائیں گے۔ پھر اگر جہاد صرف زبان و بیان اور وعظ و خطابت تک محدود ہے تب بھی خیریت میں فرق آنے کا کم ہی خطرہ ہے۔ لیکن جس دم آپ نے عملی میدان میں قدم رکھا اور سیاست کا رخ اپنی منزل کی طرف موڑنا چاہا تو بس تیر ہی تیر برسیں گے، پتھر ہی پتھر ضیافت کریں گے۔

یک دم قدم بلائیں، یہ سوا ہو کوئے جاناں ☆ وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

ہمیں اس سے کوئی اختلاف نہیں کہ کتنی ہی مذہبی تحریکوں کو وقت کے جبابرہ نے کچلا ہے حق کی داعی جماعتیں انتہائی بے دردی کے ساتھ روند ڈالی گئی ہیں لیکن ایسی کوئی راہ نہیں ... داعیانِ حق کے کسی قافلے کو جھولا جھلانے بعد پوریاں بانٹتے حکومت الٰہیہ کی منزل تک ... ہو ——— اب دو ہی راستے ہیں۔ یا تو کہہ دو کہ اقامت دین اور حکومت الٰہیہ کا خواب اب کبھی نہ دیکھا جائے ——— کبھی اس کی تمنا نہ کی جائے ——— یا ——— پھر کہہ دو کہ تمام آفات و ابتلاء کا ڈر داعیانِ حق کو کسی سیاسی جہاد سے باز نہیں رکھ سکتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ تجلی

دیوبند

۲۸ ویں سال کا تیسرا شمارہ

سالانہ بیس روپے
فی کاپی ۲ روپے

مدیر: حسن احمد صدیقی، فاضل دارالعلوم دیوبند

بیرونی ممالک سے:
پاکستان، انڈونیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک پانچ پونڈ
سعودی عرب، قطر وغیرہ سے بحری ڈاک ایک پونڈ، بذریعہ ہوائی ڈاک ... پونڈ

اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہو گیا ہے۔ بذریعہ منی آرڈر ... وی۔ پی کی اجازت ... وی۔ پی ... اخلاقی فرض ہوگا۔ منی آرڈر دیکھ کر آپ وی۔ پی ... بھیج جائیں گے

فہرست مضامین

توجّہ طلب

اس بار توجہ طلب عنوان کے تحت ہم ایک واقعہ نقل کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

"بیت المقدس کی فتح کے موقعہ پر حضرت عمرؓ رومیوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کے لئے شام جارہے تھے۔ جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالار اسلام حضرت عبیدہؓ کچھ مسلمانوں کو لے کر استقبال کی غرض سے نکلے۔ جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت عمرؓ اونٹنی سے اتر آئے۔ پاؤں سے چرمی موزے اتار کر اپنے کندھے پر ڈال لئے اور اونٹنی کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے۔ اور اسی شان سے اسلام کا فرمانروا رومیوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا۔ یہ دیکھ کر حضرت عبیدہؓ نے عرض کیا:-

یا امیرالمومنین! آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اتار کر اپنے کندھے پر ڈال لئے ہیں اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اس کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر آپ پانی میں لئے چل رہے ہیں۔ یہ تو وہ موقعہ ہے کہ سارا شہر آپ کا دیدار کرنے کی غرض سے امنڈ آیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا اے عبیدہؓ! اگر تمہارے سوا کوئی دوسرا یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دیکر امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے ایک نمونہ عبرت فراہم کر دیتا واضح رہے کہ ہم سب سے زیادہ ذلیل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ ہمیں عزت دی، ہماری توقیر میں اضافہ کیا۔ جس ذریعہ سے توقیر و عزت ہمیں خدا نے عطا کی ہے اس ذریعہ کو چھوڑ کر کسی اور ذریعہ سے اگر ہم عزت و رفعت حاصل کرنا چاہیں گے تو خدا ہمیں ذلیل و رسوا کرے گا"۔

یہ سبق آموز واقعہ بزبان خود اپنی تشریح بیان کر رہا ہے۔ لہذا حاشیہ آرائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پروردگار عالم اس واقعہ سے ہم سب مسلمانوں کو سبق حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے دلوں کی گہرائی میں یہ یقین پیدا کر دے کہ مسلمانوں کو اگر عزت و عظمت حاصل ہو سکتی ہے تو صرف اور صرف اسلام کے توسط سے۔ دوسرے کسی اور ذریعہ سے نہیں۔

❁ ❁ ❁

احوالِ واقعی

پہلی بات :- پچھلے شمارہ میں تجلی کے لیٹ ہونے کی اصل وجہ قارئین پر ظاہر کر دی گئی تھی۔ وجہ ظاہر کر دینے سے ہمیں کوئی فائدہ ہوا ہو لیکن یہ نقد فائدہ ضرور ہوا کہ ہمارے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور قارئین کے سامنے اپنی پریشانیاں اور الجھنیں رکھنے کے بعد ہمیں وہ سکون حاصل ہو گیا جو سکون اپنوں سے اپنا غم بیان کر کے حاصل ہوتا ہے ـــــ آج کل ادارہ تجلی جن حالات کا شکار ہے ان حالات میں اگر تجلی دم توڑ دیتا تو بعید از قیاس بات نہ ہوتی۔ لیکن منعم حقیقی کا کرم ہے کہ تجلی الجھنوں سے بھرے ہوئے غمناک حالات میں بھی بدستور زندہ ہے اور ہم اسے بہر صورت زندہ رکھنے کی جد وجہد میں سرگرداں ہیں۔ پرچہ لیٹ ہو جانے پر قارئین کی شکایتیں بجا۔ لیکن ہماری طالبعلمانہ اور عاجزانہ گذارش ہے کہ کچھ دن اور ہماری مجبوریوں کا خیال کر لیجئے انشاء اللہ پھر شکایت کی نوبت نہیں آئیگی اور پھر انشاء اللہ تجلی ہر ماہ صحیح وقت پر آپ کی خدمت میں پہونچ جایا کریگا۔

دوسری بات :- اکتوبر و نومبر کے مشترکہ شمارے میں توجہ طلب کے عنوان کے تحت جو کچھ قلم بند کیا گیا تھا اسے ہمارے بعض قارئین نے ناپسند کیا ہے۔ ہم قارئین کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ اس انداز کی تنقید سے احتراز کرینگے۔ لہذا آپ سے اور مولانا عبد الماجد دریابادی سے معافی کے خواستگار ہیں۔ لیکن ہم مولانا کی خدمت میں یہ ضرور عرض کرینگے کہ قادیانیوں کے بارے میں جو پالیسی انھوں نے اختیار کر رکھی ہے وہ ان کے حق میں غیر مفید ثابت ہوگی۔

تیسری بات :- ایمرجنسی حالات کا تقاضا تھا کہ عامر عثمانی نمبر کے مسودہ میں کچھ ترمیم کر لی جائے اور جو باتیں حکومت کی پالیسیوں سے متصادم ہیں انھیں حذف کرنے کے بعد توقع ہے کہ اگلے سے اگلا شمارہ عامر عثمانی نمبر کا ہوگا۔

چوتھی بات :- ہمارا خیال ہے کہ "مسجد سے میخانے تک" کے سلسلہ کو بند کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں قارئین کی رائے درکار ہے۔ اگر اکثر قارئین نے ہمارے خیال کی تائید کی تو آئندہ "مسجد سے میخانے تک" کے سلسلہ کو ختم کر دیا جائیگا۔

آخری بات :- غیرت، جھجک، خود داری اور تکلف کا گلا گھونٹتے ہوئے یہ گذارش ہے کہ تجلی کا ہر قاری دو چار سالانہ خریدار مہیا کرے یا خود دو چار سال کا چندہ ارسال کر کے ہماری مدد کرے۔ تجلی نے مسلسل ۲۵ سال تک ملتِ اسلامیہ کی خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی تجلی کسی نہ کسی انداز میں اسلام کی کوئی نہ کوئی خدمت کر رہا ہے۔ تجلی کے معاونین کو اگر آخرت میں "معاونینِ اسلام" کی صف میں کھڑا کر دیا جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی ـــــ دو سال سے زیادہ مدت کے خریداری قبول کرنے والے حضرات ۱۸ روپے سالانہ کے حساب سے چندہ روانہ کر سکتے ہیں۔ ان رعایتوں کے علاوہ وہ تمام رعایتیں ان خریداروں کو حاصل رہینگی جو اسی شمارہ میں کسی جگہ تفصیل کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں۔

آغازِ سخن

حسن احمد صدیقی
فاضل دارالعلوم دیوبند

مولانا عامر عثمانیؒ کے انتقال کے بعد سے تادم تحریر تجلی کی صحیح روش متعین نہیں ہو سکی، نہ ہی تجلی کا کوئی ایسا رنگ ڈھنگ قائم ہو سکا جسے مستقل اور منفرد کہا جا سکے. مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب تجلی کسی ایک نہج پر گامزن ہو جائے، کسی خاص روش کو اپنا لے. اپنا کوئی ایسا رنگ ڈھنگ قائم کرلے جسمیں خصوصیت بھی ہو اور انفرادیت بھی جس میں مداومت بھی ہو اور استقلال بھی، جو خوش رنگ بھی ہو اور پر اثر بھی.

تجلی کا مقصد اور نصب العین تو ظاہر ہو رہا ہے اور وہ ہے اشاعت دین اور تبلیغ اسلام. گمراہی کے اندھیروں میں چراغ حق جلانے کا مقصد اس کے ماسوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ تاریکیاں مٹیں یا تاریکیوں میں تخفیف پیدا ہو؟ تجلی کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں تھا اور کچھ نہیں ہے کہ دلوں کی کائنات میں حق کا اجالا پھیلے اور وہ اندھیرے چھٹ جائیں جو کفر و شرک اور بدعت و ضلالت کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور ان سے ایسی سمتیں پیدا ہوتی ہیں جو خود بھی غلیظ ہوتی ہیں اور احساسات کو بھی غلیظ کر دیتی ہیں.

تجلی کا نصب العین بجز اس کے کچھ نہیں تھا اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کے چپہ چپہ پر اسلام کا بول بالا ہو، حق پرستی پروان چڑھے. گمراہیوں کا ملیا میٹ ہو اور [illegible] جو ایک طویل عرصہ سے ان روحوں پر طاری ہے جو زد میں مسلمانوں کے جسموں میں مکیں ہیں.

انشاء اللہ تجلی کے اس مقصد اور نصب العین میں کبھی دگرگونی اور تبدل و تغیر واقع نہیں ہوگا. اس کا مقصد اور نصب العین جو پہلے تھا وہی آج بھی ہے، اور جو آج ہے وہی کل رہے گا.

اگر خدا نخواستہ تجلی کے مقصد منشاء میں کسی بھی وقت تبدیلی پیدا ہو گئی اور وہ حق کا دفاع کرنے کی بجائے باطل کی حمایت میں اپنا تنور رنگانے لگا تو ایسے قابل افسوس اور قابل ماتم وقت میں تجلی کی موت تجلی کی زندگی سے لاکھ درجہ بہتر ہوگی. اس شمع کا بجھ جانا ہی بہتر ہے جس کے سینہ سے گمراہی اور باطل پرستی کا دھواں اٹھنے لگے.

خدا کے بھروسہ پر ہم وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تجلی الجھنوں اور دشواریوں سے ہزار دوچار ہو لیکن اس کے سینہ سے بدعت و ضلالت کے دھوئیں نہیں اٹھیں گے وہ اس مقصد سے کبھی راہ فرار اختیار نہیں کرے گا جس مقصد کی خاطر اسے وجود دیا گیا تھا.

بہرحال تجلی کا مقصد اور نصب العین جوں کا توں قائم رہے گا۔ وہ کل بھی اشاعت اسلام اور ابلاغ دین کی خاطر سانس لے رہا تھا اور آج بھی اسی لئے زندہ ہے کہ دنیا کے کونے کونے میں اسلام کی ترویج و اشاعت ہو اور گھر گھر میں حق پرستی اور اسلام پسندی کی فصلیں لہرائیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اشاعت اسلام اور خدمت دین کرنے کا طریقہ اور ڈھنگ کیا ہو؟

ہندوستان اور پاکستان سے ان گنت مذہبی شمارے نکلتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں بعض پرچوں کی اشاعت کا مقصد کچھ اور بھی ہو لیکن اکثر پرچوں کی اشاعت کا مقصد صرف یہی ہے کہ دین کی تبلیغ اور اسلام کا بول بالا ہو۔ لیکن آپ دیکھ لیجئے کہ مقصد سب کا ایک سہی، منشا ایک سہی لیکن نقطۂ نظر اور طریقہ کار سب کا جدا جدا ہے۔ یہ سب اپنے اپنے انداز میں اسلام کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ہر پرچہ میں کچھ نہ کچھ خصوصیت اور انفرادیت موجود ہے۔

بلاشبہ تجلی کا بھی کسی زمانہ میں اپنا ایک مخصوص رنگ تھا، اپنا ایک انداز تھا۔ اسے بھی ایک خصوصیت اور انفرادیت حاصل تھی۔ لیکن یہ تو اس زمانہ کی بات ہے جب مولانا عامر عثمانی رو حیات تھے اور ان کی بہت سی مخصوص اور منفرد صلاحیتوں کی وجہ سے تجلی کو ایک خصوصیت اور انفرادیت حاصل تھی۔ بلکہ تجلی تمام مذہبی پرچوں میں الگ تھلگ اور نمایاں نظر آتا تھا۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ لیکن اب یہی حقیقت افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ تجلی کی انفرادیت اور خصوصیت ایک ایسی وجود یافتہ کرن تھی جو ماضی کے اندھیروں میں گم ہو چکی ہے اور جس کے پلٹ آنے کی اب ادنیٰ توقع بھی نہیں جا سکتی۔

جب یہ حقیقت مسلم ہے ...... کہ گذشتہ کوئی چیز لوٹ کر نہیں آتی۔ ہر شخص چلا جاتا ہے اور ہر شخص کی صلاحیتیں اسی کے ساتھ دفن ہو جاتی ہیں تو اس بات کو بھی ماننا ہی پڑے گا کہ چونکہ مولانا عامر عثمانی دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنی تمام تر صلاحیتیں سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گئے تھے لہٰذا تجلی کا پچھلا رنگ امتیاز مولانا عامر عثمانی کی طرح مرحوم ہو چکا ہے۔

مرحوم چیزوں کو فراموش کرنا ممکن ہو یا نہ ہو لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ مرحوم چیزیں لوٹ کر آ جائیں۔ بہرکیف تجلی کا گذشتہ رنگ امتیاز کل کی بات ہے۔ آج تجلی کو اسی انداز پر چلانا ممکن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اب تجلی کو کوئی دوسرا رنگ دیدیا جائے جو اس کے لئے طرۂ امتیاز کی حیثیت رکھتا ہو اور جس میں کچھ نہ کچھ انفرادیت اور خصوصیت بھی موجود ہو۔

یہ بات بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تجلی کو نیا روپ اور نیا رنگ دیتے وقت کسی مخصوص روش اور مخصوص طریقۂ کار کا انتخاب کرتے وقت ہم قارئین کے مشوروں کو پیش نظر رکھیں۔ تاکہ تجلی کو نئے انداز میں ڈھالتے وقت کوئی بڑی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔

مولانا عامر عثمانیؒ کے انتقال کو کم و بیش گیارہ مہینہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ یہ مدت بعض اعتبار سے طویل ہے اور بعض اعتبار سے مختصر۔ اس طویل و مختصر مدت میں ہمیں قارئین کی طرف سے مشوروں پر مشورے موصول ہوتے رہے ہیں۔ یہ مشورے اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ انھیں بے شمار کہنا ہی مناسب ہوگا۔

یقین کیجئے اگر ہم تجلی کا مشورہ نمبر نکالنے کا منصوبہ بنائیں تو ہمیں قارئین سے مزید مشورے طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ موصول شدہ مشوروں کو یکجا کر کے ایک ضخیم نمبر تیار ہو جائے گا۔ سب مشوروں کو نقل کرنا تو ممکن نہیں۔ بعض مشورے نقل کئے جا رہے ہیں۔ یہ وہ مشورے ہیں جن پر کچھ گفت و شنید کے بعد ہم نے عمل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

(۱) مولانا عامر عثمانی کے انداز تحریر کی نقل اتارنے کی کوشش نہ کی جائے (۲) کسی پر تنقید نہ کی جائے (۳) تجلی کا منشا صرف تبلیغ اسلام ہو۔ تجلی کسی جماعت کا وکیل محسوس نہ ہو (۴) توجہ طلب عنوان کے تحت نفسیاتی مضامین شائع کئے جائیں جن سے تنقید و تنقیص کی بو آتی ہو (۵) مسجد سے میخانہ تک کے سلسلہ کو ختم کر دیا جائے (۶) مولانا عامر عثمانی کی کوئی نہ کوئی پرانی تحریر ضرور شریک اشاعت کی جائے (۷) تجلی کے پہلے صفحہ پر یادگار مولانا عامر عثمانی کی بجائے بانی تجلی مولانا عامر عثمانی لکھا جائے (۸) تجلی کو فوٹو آفسیٹ کے ذریعہ چھاپا جائے (۹) ٹائٹل ہر مہینہ ٹائٹل بدل دیا جائے (۱۰) دوسرے قلم کاروں کا

تعاون حاصل کیا جائے۔

ان مشوروں کو نقل کرنیکے بعد مشاورین حضرات سے مخاطب ہو کر بالترتیب چند باتیں عرض کرتی ہیں۔

(۱) مولانا عامر عثمانی کے انداز تحریر کی نقل کرنے کی کوشش میں نے کبھی نہیں کی میں جس انداز میں لکھتا ہوں یہ میرا اپنا انداز ہے۔ اگر قارئین کو یہ انداز پسند نہیں تو میں اس سے کچھ مختلف انداز میں لکھنے کی کوشش ضرور کروں گا، لیکن یہ بات مبنی برحقیقت نہیں ہے کہ میں مولانا عامر عثمانی کے انداز تحریر اور طرز گفتگو کی نقل اتارنے کے چکر میں ہوں۔ بعض لوگوں نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ میرے لب ولہجہ میں بڑی تیزی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ اپنی اس کمزوری کو بذات خود میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ لہٰذا میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ لب و لہجہ میں نرمی پیدا کرنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا۔

(۲) بلا وجہ تنقید سے تو ہم خود ہی احتراز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ویسے اتنی بات ہم بھی جانتے ہیں کہ تنقید فی نفسہ معیوب نہیں ہوتی۔ ہاں اگر تنقید کرتے وقت آدمی ننگی جہالت اور سطحیت کا مظاہرہ کرنے پر اتر آئے تو بلا شبہ ایسی تنقید عیب ہوتی ہے اور اس کا کرنے والا عیب دار۔ ہم اس بات کی کوشش کریں گے کہ اگر از راہ ضرورت کسی تحریر پر تنقید کرنی پڑ جائے تو سنجیدگی اور لب و لہجہ کی نرمی کو بطور خاص ملحوظ رکھیں — اور ہم اس بات کی بھی آخری حد تک کوشش کریں گے کہ تنقید برائے تنقید کبھی نہ ہو۔ بلکہ تنقید برائے اصلاح ہو — برائے نصیحت ہو۔ صوفی نذیر احمد کشمیری پر جو تنقید کی گئی تھی وہ سنجیدگی کے حدود سے متجاوز تھی۔ آئندہ اس قسم کی تنقیدوں سے احتراز کیا جائیگا

(۳) تجلی کا مقصد تبلیغ اسلام کے سوا کچھ نہیں ہے، کچھ نہیں تھا۔ بے شک تجلی نے ۲۵ برس تک جماعت اسلامی کی زبردست حمایت کی ہے۔ لیکن یہ حمایت فی ذاتہ جماعت اسلامی کی نہیں تھی بلکہ اسی اسلام کی حمایت تھی جس اسلام کی ترویج و اشاعت میں جماعت اسلامی مشغول و منہمک ہے۔ اگر جماعت اسلامی اسلام کی حامی نہ ہوتی تو جماعت اسلامی کو تجلی کی ہمدردیاں حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ جماعت اسلامی کے کرتا دھرتا لوگوں نے تجلی کو کبھی اپنا ترجمان تصور نہیں کیا اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ تجلی فی نفسہ جماعت کا نہ ترجمان تھا نہ وکیل بلکہ درحقیقت وہ اسلام کا ترجمان اور وکیل تھا

جماعت اسلامی کی حمایت اور دفاع اگر تجلی نے کیا ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ اسلام پرست ہے اور تبلیغ اسلام میں لگی ہوئی ہے۔ ورنہ جماعت اسلامی سے تجلی کو کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہے۔ جماعت اسلامی اگر کسی بھی وقت حق پرستی کی ڈگر کو چھوڑ کر کوئی دوسری ڈگر اپنا لیتی ہے تو تجلی جماعت اسلامی کے خلاف جہاد کرنے کے لئے سب سے پہلے کمربستہ ہوگا لیکن اگر وہ سیدھے راستے پر قائم ہے اور ہم وقتاً فوقتاً اس کی تعریف و طرفداری میں کچھ لکھ دیتے ہیں تو یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ہم اصلاً جماعت اسلامی کے حامی ہیں اور ہمارا مقصد و منشا جماعت کی حمایت و وکالت کے ماسوا کچھ نہیں۔ البتہ یہ کوشش ہم ضرور کریں گے کہ کسی بھی حق پرست جماعت کی حمایت میں بھی حدود سے تجاوز نہ ہونے پائے اور یہ محسوس نہ ہو کہ ہم اس جماعت کے وکیل ہیں۔

(۴) آئندہ توجہ طلب عنوان کے تحت تنقیدی مضامین شائع کرنے سے احتراز کیا جائے گا (۵) اس سلسلہ میں متیقن طور پر ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی شمارے کے احوال واقعی میں دوسرے قارئین سے ہم نے مشورہ کیا ہے اگر ان کی بھی رائے یہی ہوئی کہ مسجد سے میخانے تک کے سلسلہ کو بند کر دیا جائے تو اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے میں ہمیں کوئی تامل نہیں ہوگا (۶) ہر شمارہ میں مولانا مرحوم کی کوئی نہ کوئی پرانی تحریر ہم برابر پیش کر رہے ہیں آئندہ اور زیادہ توجہ کے ساتھ ان کی پرانی تحریریں ہدیۂ ناظرین کی جاتی رہیں گی (۷) ہم جانتے ہیں کہ یادگار کا لفظ استعمال کرنا اس وقت موزوں ہوتا جب مولانا کے انتقال کے بعد ہم کوئی رسالہ انکی یاد میں نکالتے۔ تجلی کے صفحہ پر یادگار کی بجائے بانی مبانی کا لفظ لکھنا زیادہ موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے اس جانکاری کے باوجود یادگار رکھنے کی واحد اور معقول وجہ یہ ہے کہ ہم اس تجلی کو ایک نیا تجلی ہی تصور کرتے ہیں۔ مولانا والا تجلی تو مرحوم ہو چکا ہے یہ تو ہم نے انکی یاد میں ایک نئے تجلی کا اجراء کیا ہے اس تجلی کو اس تجلی پر قیاس کرنا مبنی بر صواب نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ بھی ہماری اس بات سے متفق ہوں تو آپکے نزدیک بھی یادگار کا لفظ استعمال کرنا غلط اور غیر موزوں نہیں ہوگا (۸) اس سلسلہ میں غور کیا جا رہا ہے کہ ۹ ماہ تک مہینے کے بعد ٹائٹل بدلنے میں دشواری ہوگی البتہ وقتاً فوقتاً ٹائٹل ہم تبدیل کرتے رہیں گے۔ ابھی دوسرے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں لہٰذا اس طرف توجہ کی نوبت نہیں آئی (۱۰) کچھ لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی ﮦ

[illegible]

ﮦ لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض بزرگ قسم کے لوگ تجلی جیسے گستاخ پرچے میں کچھ لکھنے کو کسرِ شان سمجھتے ہیں [illegible]

تفہیم القرآن

مُعَوَّذَتَین

(۲)

اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت تیسرا مسئلہ ان سورتوں کے معاملہ میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جھاڑ پھونک کی اسلام میں گنجائش ہے؟ اور یہ کہ جھاڑ پھونک بجائے خود موثر بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ بکثرت صحیح احادیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہر رات کو سوتے وقت اور خاص طور سے بیماری کی حالت میں معوّذتین یا بعض روایات کے مطابق معوّذات (یعنی قل ہو اللہ اور معوّذتین) تین مرتبہ پڑھکر اپنے دونوں ہاتھوں میں پھونکتے اور سر سے لے کر پاؤں تک پورے جسم پر جہاں جہاں تک بھی آپ کے ہاتھ پہنچ سکتے، انھیں پھیرتے تھے، آخری بیماری میں جب آپ کے لئے خود ایسا کرنا ممکن نہ رہا تو حضرت عائشہؓ نے یہ سورتیں بطور خود یا حضورؐ کے حکم سے، پڑھیں اور آپ کے دست مبارک کی برکت کے خیال سے آپ ہی کے ہاتھ لے کر آپ کے جسم پر پھیرے۔ اس مضمون کی روایات صحیح سندوں کے ساتھ بخاری مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد اور موطا امام مالک میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں جن سے بڑھکر کوئی بھی حضورؐ کی خانگی زندگی سے واقف نہ ہوسکتا تھا۔

اس معاملہ میں پہلے مسئلہ شرعی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے، احادیث میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی طویل روایت آئی ہے جس کے آخر میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ میری امت کے وہ لوگ بلاحساب جنت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کراتے ہیں، نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں، نہ فال لیتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (مسلم)۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس نے داغنے سے علاج کرایا اور جھاڑ پھونک کرائی وہ اللہ پر توکل سے بے تعلق ہوگیا (ترمذی)، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے سوائے معوّذتین یا معوّذات کے (ابوداؤد، احمد، نسائی، ابن حبان، حاکم) بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضورؐ نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرمادیا تھا لیکن بعد میں اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو، اللہ کے پاک ناموں میں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جاسکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز نہیں ہے، اور بھروسہ جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے کہ وہ بجائے خود شفا دینے والی ہے، بلکہ اللہ پر اعتماد کیا جائے کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنادے گا۔ یہ مسئلہ شرعی واضح ہوجانے کے بعد اب دیکھئے کہ احادیث اس بارے میں کیا کہتی ہیں:-

طبرانی نے صغیر میں حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ کو ایک دفعہ نماز کی حالت میں بچھو نے کاٹ لیا جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا بچھو پر خدا کی لعنت، یہ نہ کسی نمازی کو چھوڑتا ہے نہ کسی اور کو۔ پھر پانی اور

نمک منگوایا اور جہاں بچھو نے کاٹا تھا وہاں آپ نمکین پانی ملتے جاتے تھے اور قل یا ایہا الکافرون، قل ہو اللہ احد قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس پڑھتے جاتے تھے۔

ابن عباسؓ کی یہ روایت بھی احادیث میں آئی ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ پر یہ دعا پڑھتے تھے أُعِيذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ "میں تم کو اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں اور ہر شیطان اور موذی سے اور ہر نظر بد سے (بخاری، مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ)

عثمان ابن ابی العاص الثقفی کے متعلق مسلم، موطا، طبرانی اور حاکم میں تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں مجھے ایک درد محسوس ہوتا ہے جو مجھکو مارے ڈالتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اپنا سیدھا ہاتھ اُس جگہ پر رکھو جہاں درد ہوتا ہے، پھر تین مرتبہ بسم اللہ کہو اور سات مرتبہ یہ کہتے ہوئے ہاتھ پھیرو کہ أَعُوذُ بِاللّٰهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أَجِدُ وَأُحَاذِرُ "میں اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ مانگتا ہوں اس چیز کے شر سے جس کو میں محسوس کرتا ہوں اور جس کے لاحق ہونے کا مجھے خوف ہے"۔ موطا میں اس پر اضافہ ہے کہ عثمانؓ بن ابی العاص نے کہا کہ اس کے بعد میرا درد جاتا رہا، اور اسی چیز کی تعلیم میں اپنے گھر والوں کو دیتا ہوں۔

مسند احمد اور طحاوی میں طلقؓ بن علی کی روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بچھو نے کاٹ لیا۔ حضورؐ نے کچھ پڑھ کر پھونکا اور اس جگہ پر ہاتھ پھیرا۔

مسلم میں ابو سعید خُدری کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو جبریل نے آکر پوچھا "اے محمدؐ کیا آپ بیمار ہو گئے؟" آپؐ نے فرمایا ہاں، انھوں نے کہا بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنٍ حَاسِدٍ، اللّٰهُ يَشْفِيكَ بِاسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ "میں اللہ کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں"۔ اسی سے ملتی جلتی روایت مسند احمد میں حضرت عبادہؓ بن صامت سے منقول ہے کہ حضورؐ بیمار تھے۔ میں عیادت کے لئے گیا تو آپ کو سخت تکلیف میں پایا۔ شام کو گیا تو آپؐ بالکل تندرست تھے۔ میں نے اس قدر جلدی تندرست ہو جانے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ جبریل آئے تھے اور انھوں نے مجھے چند کلمات سے جھاڑا۔ پھر آپؐ نے قریب قریب اُسی طرح کے الفاظ اُن کو سنائے جو اوپر والی حدیث میں نقل کئے گئے ہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ سے بھی مسلم اور مسند احمد میں ایسی ہی روایت نقل کی گئی ہے۔

امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت حفصہ ام المومنین کی روایت نقل کی ہے کہ ایک روز نبی صلے اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے اور میرے پاس ایک خاتون شفاؓ[1] نامی بیٹھی تھیں جو نملہ (ذُباب) کو جھاڑا کرتی تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا حفصہ کو بھی وہ عمل سکھا دو۔ خود شفا بنت عبد اللہ کی یہ روایت امام احمد، ابو داؤد اور نسائی نے نقل کی ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے حفصہؓ کو جس طرح لکھنا پڑھنا سکھایا ہے نملہ کا جھاڑنا بھی سکھا دو۔

مسلم میں عوفؓ بن مالک اشجعی کی روایت ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں ہم لوگ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس معاملہ میں حضورؐ کی رائے کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا جن چیزوں سے تم جھاڑتے تھے وہ میرے سامنے پیش کرو، جھاڑنے میں مضائقہ نہیں ہے جب تک اس میں شرک نہ ہو۔

مسلم، مسند احمد اور ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے روک دیا تھا۔ پھر حضرت عمرو بن حزم کے خاندان کے لوگ آئے اور کہا کہ ہمارے پاس ایک عمل تھا جس سے ہم بچھو (کا) ...

[1] ان خاتون کا اصل نام لیلیٰ تھا، مگر شفا بنت عبد اللہ کے نام سے مشہور تھیں۔ ہجرت سے پہلے ایمان لائیں۔ قریش کے خاندان بنی عدی سے ان کا تعلق تھا۔ یہ وہی خاندان ہے جس کے ایک فرد حضرت عمرؓ تھے۔ اسی طرح یہ حضرت حفصہؓ کی رشتہ دار ہوتی تھیں۔

کاٹے کو جھاڑتے تھے، مگر آپ نے فرمایا "اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں پاتا تم میں سے جو شخص اپنے کسی بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے وہ ضرور پہنچائے"۔ جابر بن عبد اللہ کی دوسری حدیث مسلم میں یہ ہے کہ آلِ حزم کے پاس سانپ کاٹے کا عمل تھا اور حضورؐ نے ان کو اجازت دے دی۔ اس کی تائید مسلم، مسند احمد اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بھی کرتی ہے کہ حضورؐ نے انصار کے خاندان کو زہریلے جانور کے کاٹے کو جھاڑنے کی اجازت مرحمت فرمائی، مسند احمد اور ترمذی اور مسلم اور ابن ماجہ میں حضرت انسؓ سے بھی اس سے ملتی جلتی روایات نقل کی گئی ہیں جن میں حضورؐ نے زہریلے جانوروں کے کاٹے، اور ذُباب کے مرض اور نظرِ بد کے جھاڑنے کی اجازت دی۔

مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت عُمیرؓ مولیٰ ابی اللحم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں میرے پاس ایک عمل تھا جس سے میں جھاڑا کرتا تھا میں نے رسول اللہ کے سامنے اسے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا فلاں فلاں چیزیں اس میں سے نکال دو، باقی سے تم جھاڑ سکتے ہو۔

مؤطا میں ہے کہ حضرت ابوبکر اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ بیمار ہیں اور ایک یہودیہ ان کو جھاڑ رہی ہے پر انھوں نے فرمایا کہ کتاب اللہ پڑھ کر جھاڑ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب اگر توراۃ یا انجیل کی آیات پڑھکر جھاڑیں تب بھی جائز ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا جھاڑ پھونک مفید بھی ہے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دوا اور علاج سے نہ صرف یہ کہ کبھی منع نہیں فرمایا بلکہ خود فرمایا کہ ہر مرض کی دوا اللہ نے پیدا کی ہے اور تم لوگ دوا کیا کرو حضورؐ نے خود لوگوں کو بعض امراض کے علاج بتائے ہیں، جیسا کہ احادیث میں کتاب الطب دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے لیکن دوا بھی اللہ ہی کے حکم اور اذن سے نافع ہوتی ہے، ورنہ اگر دوا اور طبی معالجہ ہر حال میں نافع ہوتا تو ہسپتالوں میں کوئی نہ مرتا۔ اب اگر دوا اور علاج کرنے کے ساتھ اللہ کے کلام اور اس کے اسماءِ حسنیٰ سے بھی استفادہ کیا جائے یا ایسی جگہ جہاں کوئی طبی امداد میسر نہ ہو اللہ ہی کی طرف رجوع کر کے اس کے کلام اور اسماء و صفات سے استعانت کی جائے تو مادہ پرستوں کے سوا کسی عقل کے بھی خلاف نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح نہیں ہے کہ دوا اور علاج کو، جہاں وہ میسر ہو جان بوجھ کر چھوڑ دیا جائے، اور صرف جھاڑ پھونک سے کام لینے ہی پر اکتفا کیا جائے، اور کچھ لوگ عملیات اور تعویذوں کے مطب کھول کر بیٹھ جائیں اور اسی کو کمائی کا ذریعہ بنا لیں۔

اس معاملہ میں بہت سے لوگ حضرت ابوسعیدؓ خُدری کی اُس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو بخاری، مُسلم، ترمذی، مسند احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں منقول ہوئی ہے اور اس کی تائید بخاری میں ابن عباسؓ کی بھی ایک روایت کرتی ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضورؐ نے ایک مہم پر اپنے چند اصحاب کو بھیجا جن میں حضرت ابوسعیدؓ

لہ مادہ پرست دنیا کے بھی بہت سے ڈاکٹروں نے اعتراف کیا ہے کہ دعا اور رجوع الی اللہ مریضوں کی شفایابی میں بہت کارگر چیز ہے۔ اور اس کا خود مجھے ذاتی طور پر اپنی زندگی میں دو مرتبہ تجربہ ہوا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب مجھے نظر بند کیا گیا تو چند روز بعد ایک پتھری میرے مثانے میں آکر اڑ گئی اور ۱۶ گھنٹے تک پیشاب بند رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میں ظالموں سے علاج کی درخواست نہیں کرنا چاہتا، تو ہی میرا علاج فرما دے۔ چنانچہ وہ پتھری پیشاب کے راستے سے ہٹ گئی اور بیس برس تک ہٹی رہی، یہاں تک کہ ۱۹۶۸ء میں اس نے پھر تکلیف دی اور اس کو آپریشن کر کے نکالا گیا۔

دوسری مرتبہ جب ۱۹۵۳ء میں مجھے گرفتار کیا گیا تو میری دونوں پنڈلیاں کئی مہینے سے داد کی سخت تکلیف میں مبتلا تھیں اور کسی علاج سے آرام نہیں آ رہا تھا۔ گرفتاری کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ سے پھر وہی دعا کی جو ۴۰ دن میں کی تھی اور کسی علاج اور دوا کے بغیر پنڈلیاں داد سے بالکل صاف ہو گئیں۔ آج تک پھر کبھی وہ بیماری مجھے نہیں ہوئی۔

خدری بھی تھے۔ یہ حضرات راستہ میں عرب کے ایک قبیلے کی بستی پر جاکر ٹھیرے اور انہوں نے قبیلے والوں سے کہا کہ ہماری میزبانی کرو۔ انھوں نے انکار کردیا۔ اتنے میں قبیلے کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا اور وہ لوگ اِن مسافروں کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارے پاس کوئی عمل یا دوا ہے جس سے تم ہمارے سردار کا علاج کردو؟ حضرت ابوسعید نے کہا ہے تو سہی، مگر چونکہ تم نے ہماری میزبانی سے انکار کیا ہے اس لئے جب تک تم کچھ دینے کا کرو، ہم اس کا علاج نہیں کریں گے۔ انھوں نے بکریوں کا ایک ریوڑ (بعض روایات میں ہے تیس بکریاں) دینے کا وعدہ کیا اور حضرت ابوسعید نے جاکر اس پر سورہ فاتحہ پڑھنی شروع کی اور لعاب دہن اس پر ملتے گئے[1] آخر کار بچھو کا اثر زائل ہوگیا اور قبیلے والوں نے جتنی بکریاں دینے کا وعدہ کیا تھا وہ لاکر دے دیں۔ مگر ان حضرات نے آپس میں کہا اِن بکریوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ جب تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھ نہ لیا جائے۔ نہ معلوم اس کام پر اجر لینا جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ حضورؐ نے ہنس کر فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ جھاڑنے کے کام بھی آسکتی ہے؟ بکریاں لے لو اور ان میں میرا حصّہ بھی لگاؤ۔

لیکن اس حدیث سے تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے مطب چلانے کا جواز نکالنے سے پہلے عرب کے اُن حالات کو نگاہ میں رکھنا چاہیئے جن میں حضرت ابوسعیدؓ خدری نے یہ کام کیا تھا اور حضور نے اسے نہ صرف جائز رکھا تھا بلکہ یہ بھی فرمایا تھا کہ میرا حصّہ بھی لگاؤ، تاکہ اس کے جواز کے معاملے میں اِن اصحاب کے دلوں میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ عرب کے حالات اُس زمانہ میں بھی یہ تھے اور آج تک یہ ہیں کہ پچاس پچاس، سو سو، ڈیڑھ ڈیڑھ سو میل تک آدمی کو ایک بستی سے چل کر دوسری بستی نہیں ملتی۔ بستیاں بھی اُس وقت ایسی نہ تھیں جن میں ہوٹل، سرائے یا کھانے کی دُکانیں موجود ہوں اور مسافر کئی کئی روز کی مسافت طے کر کے جب وہاں پہنچے تو سامان خورد و نوش خرید سکے۔ اِن حالات میں یہ بات عرب کے معروف اصولِ اخلاق میں شامل تھی کہ مسافر جب کسی بستی پر پہنچیں تو بستی کے لوگ ان کی میزبانی کریں۔ اس سے انکار کے معنیٰ بسا اوقات مسافروں کے لئے موت کے ہوتے تھے، اور عرب میں اس طرزِ عمل کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے اس فعل کو جائز رکھا کہ جب قبیلے والوں نے میزبانی سے انکار کردیا، اور اس شرط پر اس کا علاج کرنے پر راضی ہوئے کہ وہ ان کو کچھ دینا کریں۔ پھر جب ان میں سے ایک صاحب نے اللہ کے بھروسہ پر سورہ فاتحہ اس سردار پر پڑھی اور وہ اس سے اچھا ہوگیا تو طے شدہ اجرت قبیلے والوں نے لاکر دیدی، اور حضورؐ نے اس اجرت کے لینے کو حلال و طیّب قرار دیا۔ بخاری میں اس واقعہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جو روایت ہے اس میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ اِنَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا کِتَابُ اللّٰہِ۔ یعنی بجائے اس کے کہ تم کوئی اور عمل کرتے، تمہارے لئے یہ زیادہ برحق بات تھی کہ تم نے اللہ کی کتاب پڑھکر اس پر اجرت لی۔ یہ آپ نے اس لئے فرمایا کہ دوسرے عملیات سے اللہ کا کلام بڑھ کر ہے علاوہ بریں اس طرح عرب کے اُس قبیلے پر حق تبلیغ بھی ادا ہوگیا کہ انھیں اس کلام کی برکت معلوم ہوگئی جو اللہ کی طرف سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔ اِس واقعہ کو ان لوگوں کے لئے نظیر قرار نہیں دیا جاسکتا جو شہروں اور قصبوں میں بیٹھ کر جھاڑ پھونک کے مطب چلاتے ہیں اور اسی کو انھوں نے وسیلۂ معاش بنا رکھا ہے۔ اِس کی کوئی نظیر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم یا صحابہ و تابعین اور ائمہ سلف کے ہاں نہیں ملتی

[1] اکثر روایات میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ عمل کرنے والے حضرت ابوسعید تھے، بلکہ ان میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ حضرت ابوسعید خود اس مہم میں شریک تھے۔ لیکن ترمذی کی روایت میں دونوں باتوں کی صراحت ہے۔

سورۂ فاتحہ اور ان سورتوں کی مناسبت آخری چیز جو معوذتین کے بارے میں قابل توجہ ہے وہ قرآن کے آغاز اور اختتام کی مناسبت ہے۔ اگرچہ قرآن مجید ترتیب نزول پر مرتب نہیں کیا گیا ہے مگر ۲۳ سال کے دوران میں مختلف حالات اور مواقع اور ضروریات کے لحاظ سے نازل ہونے والی آیات اور سورتوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بطورِ خود نہیں بلکہ اُن کے نازل کرنے والے خدا کے حکم سے اُس شکل میں مرتب فرمایا جس میں ہم اب اس کو پاتے ہیں۔ اس ترتیب کے لحاظ سے قرآن کا آغاز سورۂ فاتحہ سے ہوتا ہے اور اختتام معوّذتین پر۔ اب ذرا دونوں پر ایک نگاہ ڈالئے۔ آغاز میں اللہ رب العلمین، رحمان و رحیم، اور مالک یوم الدین کی حمد و ثنا کرکے بندہ عرض کرتا ہے کہ آپ ہی کی میں بندگی کرتا ہوں اور آپ ہی سے مدد چاہتا ہوں، اور سب سے بڑی مدد جو مجھ درکار ہے وہ یہ ہے کہ مجھے سیدھا راستہ بتایئے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدھا راستہ دکھانے کے لئے اُسے پورا قرآن دیا جاتا ہے، اور اس کو ختم اس بات پر کیا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے جو ربّ الفلق، ربّ النّاس، ملک النّاس اور الٰہ النّاس ہے، عرض کرتا ہے کہ میں ہر مخلوق کے ہر فتنے اور شر سے محفوظ رہنے کے لئے آپ ہی کی پناہ لیتا ہوں، اور خصوصیت کے ساتھ شیاطین، جن و انس کے وسوسوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ راہِ راست کی پیروی میں وہی سب سے زیادہ مانع ہوتے ہیں۔ اُس آغاز کے ساتھ یہ اختتام جو مناسبت رکھتا ہے وہ کسی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

الفلق

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

کہو[1] میں پناہ مانگتا ہوں[2] صبح کے رب کی[3]، ہر اُس چیز کے شر سے جو اُس نے پیدا کی ہے[4]، اور رات کی تاریکی کے شر سے جبکہ وہ چھا جائے[5]، اور گرہوں میں پھونکنے والے (یا والیوں) کے شر سے[6]، اور حاسد کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے[7]۔

۱ے چونکہ قُلْ (کہو) کا لفظ اُس پیغام کا ایک حصہ ہے جو تبلیغ رسالت کے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے، اس لئے اگرچہ اس ارشاد کے اوّلین مخاطب تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر آپ کے بعد ہر مومن بھی اس کا مخاطب ہے۔

۲ے پناہ مانگنے کے فعل میں لازماً تین اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ ایک بجائے خود پناہ مانگنا۔ دوسرے پناہ مانگنے والا۔ تیسرا وہ جس کی پناہ مانگی جائے۔ پناہ مانگنے سے مراد کسی چیز سے خوف محسوس کر کے اپنے آپ کو اُس سے بچانے کے لئے کسی دوسرے کی حفاظت میں جانا، یا اس کی آڑ لینا، یا اُس سے لپٹ جانا، یا اس کے سایہ میں چلا جانا ہے۔ پناہ مانگنے والا بہرحال وہی شخص ہوتا ہے جو محسوس کرتا ہے کہ جس چیز سے وہ ڈر رہا ہے اس کا مقابلہ وہ خود نہیں کرسکے گا بلکہ وہ اس کا وہ حاجت مند ہے کہ اُس سے بچنے کے لئے دوسرے کی پناہ لے۔ پھر جس کی پناہ مانگی جاتی ہے وہ لازماً کوئی ایسا ہی شخص یا وجود ہوتا ہے جس کے متعلق پناہ لینے والا یہ سمجھتا ہے کہ اُس خوفناک چیز سے وہی اس کو بچا سکتا ہے۔ اب پناہ کی ایک قسم تو وہ ہے جو قوانینِ طبعی کے مطابق عالمِ اسباب کے اندر کسی محسوس مادّی چیز یا شخص یا طاقت سے حاصل کی جاتی ہے۔ مثلاً دشمن کے حملہ سے بچنے کے لئے کسی قلعہ میں پناہ لینا، یا گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے خندق یا کسی دمدمہ یا کسی دیوار کی آڑ لینا، یا کسی طاقتور ظالم سے بچنے کے لئے کسی انسان یا قوم یا حکومت کے پاس پناہ لینا، یا دھوپ سے بچنے کے لئے کسی درخت یا عمارت کے سائے میں پناہ لینا۔ بخلاف اس کے دوسری قسم وہ ہے جس میں ہر طرح کے خطرات اور ہر طرح کی مادّی، اخلاقی یا روحانی مضرتوں اور نقصان رساں چیزوں سے کسی فوق الفطری ہستی کی پناہ اِس عقیدے کی بنا پر مانگی جاتی ہے کہ وہ ہستی عالمِ اسباب پر حکمراں ہے اور بالاتر از حس و ادراک طریقے سے وہ اس شخص کی حفاظت کرسکتی ہے جو اس کی پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ پناہ کی یہ دوسری قسم ہی نہ صرف سورۂ فلق اور سورۂ ناس میں مُراد ہے بلکہ قرآن اور حدیث میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ کا ذکر کیا گیا ہے، اُس سے مراد یہی خاص قسم کی پناہ ہے۔ اور عقیدۂ توحید کا لازمہ یہ ہے کہ اس نوعیت کا تعوّذ یا استعاذہ (پناہ مانگنا) اللہ کے سوا کسی اور سے نہ کیا جائے۔ مشرکین اس نوعیت کا تحفظ اللہ کے سوا دوسری ہستیوں، مثلاً جنوں یا دیویوں اور دیوتاؤں سے مانگتے تھے اور آج بھی مانگتے ہیں۔ مادہ پرست لوگ اس کے لئے بھی مادّی ذرائع و وسائل ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، کیونکہ وہ کسی فوق الفطری طاقت کے قائل نہیں ہیں۔ مگر مومن ایسی تمام آفات و بلیات کے مقابلے میں جن کو دفع کرنے پر وہ خود اپنے آپ کو قادر نہیں سمجھتا، صرف اللہ کی طرف رجوع کرتا اور اسی کی پناہ مانگتا ہے۔ مثال کے طور پر مشرکین کے متعلق قرآن میں بیان کیا گیا ہے وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ "اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔" (الجن ۶) اور اس کی تشریح کرتے ہوئے ہم سورۂ جن حاشیہ ۷ میں

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت نقل کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب کو جب رات کسی سنسان وادی میں گذارنی پڑتی تو وہ پکار کر کہتے "ہم اس وادی کے رب کی (یعنی اُس جن کی جو اس وادی کا مالک ہے) پناہ مانگتے ہیں"۔ بخلاف اس کے فرعون کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیش کردہ عظیم نشانیوں کو دیکھ کر فَتَوَلّٰی بِرُکْنِہٖ "وہ اپنے بل بوتے پر اکڑ گیا"۔ (الذاریات ۳۹) لیکن خدا پرستوں کا رویہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس چیز کا بھی وہ خوف محسوس کرتے ہیں، خواہ وہ مادّی ہو یا اخلاقی یا روحانی، اس کے شر سے بچنے کے لئے وہ خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مریمؑ کے متعلق بیان ہوا ہے کہ جب اچانک تنہائی میں خدا کا فرشتہ ایک مرد کی شکل میں اُن کے سامنے آیا (جبکہ وہ نہ جانتی تھیں کہ یہ فرشتہ ہے) تو انھوں نے کہا اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا۔ "اگر تو خدا سے ڈرنے والا آدمی ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں"۔ (مریم ۱۸) حضرت نوحؑ نے جب اللہ تعالیٰ سے ایک بیجا دعا کی اور جواب میں اللہ کی طرف سے اُن پر ڈانٹ پڑی تو انہوں نے رَبِّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ "میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں تجھ سے ایسی چیز کی درخواست کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے"۔ (ہود ۴۷) حضرت موسیٰؑ نے جب بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور انہوں نے کہا کہ آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں تو انہوں نے جواب میں فرمایا:۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ "میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں"۔ (البقرہ ۶۷)

یہی شان ان تمام تعوّذات کی ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کتبِ حدیث میں منقول ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حضورؐ کی حسبِ ذیل دعاؤں کو ملاحظہ کیجئے۔

عن عائشۃ ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم کان یقول فی دعائہ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ اَعْمَلْ (مسلم)

حضرت عائشہ رضہ سے روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں اُن کاموں کے شر سے جو میں نے کئے اور ان کاموں کے شر سے جو میں نے نہیں کئے"۔ (یعنی اگر میں نے کوئی غلط کام کیا ہے تو اس کے بُرے نتیجہ سے پناہ مانگتا ہوں، اور اگر کوئی جو کرنا چاہیئے تھا میں نے نہیں کیا تو اُس کے نقصان سے بھی پناہ مانگتا ہوں، اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ جو کام نہ کرنا چاہیئے وہ میں بھی کر گذروں)۔

عن ابن عمر کان من دعاء رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ، وَفَجَاءَةِ نِقْمَتِكَ وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ (مسلم)

ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیری جو نعمت مجھے حاصل ہے وہ چھن جائے اور تجھ سے جو عافیت مجھے نصیب ہے وہ نصیب نہ رہے، اور تیرا غضب یکایک ٹوٹ پڑے، اور پناہ مانگتا ہوں تیری ہر طرح کی ناراضی سے۔"

عن زید ابن ارقم کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَّا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَّا يَخْشَعُ وَمِنْ نَّفْسٍ لَّا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَّا يُسْتَجَابُ (مسلم)

زید بن ارقمؓ کی روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس علم سے جو نافع نہ ہو، اس دل سے جو تیرا خوف نہ کرے، اس نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو، اور اس دعا سے جو قبول نہ کی جائے"۔

عن ابی ہریرۃ کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُوْعِ فَاِنَّهٗ بِئْسَ الضَّجِيْعُ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّهَا بِئْسَتِ

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں بھوک سے کیونکہ وہ بدترین چیز ہے جس کے ساتھ کوئی رات گذارے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں

البطانۃ (ابوداؤد)

خیانت سے کیونکہ وہ بڑی بدباطنی ہے۔"

عن انس ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم کان یقول اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْبَرَصِ وَالْجُنُوْنِ وَالْجُذَامِ وَسَیِّیُٔ الْاَسْقَامِ (ابوداؤد)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ وسلم فرمایا کرتے تھے "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں کوڑھ اور جنون اور جذام اور تمام بُری بیماریوں سے۔

عن عائشۃ ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم کان یدعو بھٰؤلاءِ الکلمات اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ النَّارِ وَمِنْ شَرِّ الْغِنٰی وَالْفَقْرِ (ترمذی وابوداؤد)

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ ان کلمات کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے: "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں آگ کے فتنے سے اور مالداری اور مفلسی کے شر سے۔"

عن قطبۃ بن مالک کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقول اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ مُنْکَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ.... وَالْاَھْوَاءِ (ترمذی)

قطبہ بن مالک کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے خدایا میں بُرے اخلاق اور بُرے اعمال اور بُری خواہشات سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

شکل بن حمید نے حضورؐ سے عرض کیا مجھے کوئی دعا بتائیے۔ فرمایا کہو:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ سَمْعِیْ وَمِنْ شَرِّ بَصَرِیْ وَمِنْ شَرِّ لِسَانِیْ وَمِنْ شَرِّ قَلْبِیْ وَمِنْ شَرِّ مَنِیِّیْ۔ (ترمذی وابوداؤد)

خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنی سماعت کے شر سے، اور اپنی بصارت کے شر سے اور اپنی زبان کے شر سے اور اپنی شہوت کے شر سے۔

عن انس بن مالک کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْھَرَمِ وَالْبُخْلِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَۃِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ (وفی روایۃ لمسلم) وَضَلَعِ الدَّیْنِ وَغَلَبَۃِ الرِّجَالِ (بخاری ومسلم)

انس بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں عاجزی اور سستی اور بزدلی اور بڑھاپے و بخل سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب اور زندگی و موت کے فتنے سے (اور مسلم کی ایک روایت میں یہ بھی ہے) اور قرض کے بوجھ سے اور اس بات سے کہ لوگ مجھ پر غالب ہوں۔"

عن خولۃ بنت حکیم السلمیۃ، سمعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ مَنْ نَزَلَ مَنْزِلًا ثُمَّ قَالَ اَعُوْذُ بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ یَضُرُّہٗ شَیْءٌ حَتّٰی یَرْتَحِلَ مِنْ ذٰلِکَ الْمَنْزِلِ (مسلم)

خولہ بنت حکیم سلمیہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص کسی نئی منزل پر اترے اور یہ الفاظ کہے کہ "میں اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ مانگتا ہوں مخلوقات کے شر سے" تو اسے کوئی چیز نقصان نہ پہنچائے گی یہاں تک کہ وہ اس منزل سے کوچ کر جائے۔

یہ حضورؐ کے چند تعوّذات بطور نمونہ ہم نے احادیث سے نقل کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا کام ہر خطرے اور شر سے خدا کی پناہ مانگنا ہے نہ کسی اور کی پناہ، اور نہ اس کا یہ کام ہے کہ خدا سے بے نیاز ہو کر وہ اپنے آپ پر بھروسہ کرے۔

؁۳ اصل میں لفظ رَبِّ الْفَلَقِ استعمال ہوا ہے۔ فلق کے اصل معنی پھاڑنے کے ہیں۔ مفسرین کی عظیم اکثریت نے اس سے مراد رات کی تاریکی کو پھاڑ کر سپیدۂ صبح نکالنا لیا ہے کیونکہ عربی زبان میں فلق الصبح کا لفظ طلوع صبح کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے، اور قرآن میں بھی اللہ تعالےٰ کے لئے فَالِقُ الْاِصْبَاحِ کے الفاظ ہوتے ہیں، یعنی "وہ جو رات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح نکالتا ہے" (الانعام۹۶)، فلق کے دوسرے معنی خلق بھی لئے گئے ہیں، کیونکہ دنیا میں جتنی چیزیں بھی پیدا ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی چیز کو پھاڑ کر نکلتی ہیں۔ تمام نباتات بیج

بیج اور زمین کو پھاڑ کر اپنی کونپل کو نکالتے ہیں۔ تمام حیوانات یا تو رحم مادر سے برآمد ہوتے ہیں، یا انڈا توڑ کر نکلتے ہیں، یا کسی اور مانع چیز کو چیر کر باہر آتے ہیں۔ تمام چشمے پہاڑ یا زمین کو شق کر کے نکلتے ہیں۔ دن رات کا پردہ چاک کر کے نمودار ہوتا ہے۔ بارش کے قطرے بادلوں کو چیر کر زمین کا رُخ کرتے ہیں۔ غرض موجودات میں سے ہر چیز کسی نہ کسی طرح کے انشقاق کے نتیجے میں عدم سے وجود میں آتی ہے، حتیٰ کہ زمین اور سارے آسمان بھی پہلے ایک ڈھیر تھے جس کو پھاڑ کر انھیں جُدا جُدا کیا گیا کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء۔۳۰)۔ پس اس معنی کے لحاظ سے فلق کا لفظ تمام مخلوقات کے لئے عام ہے۔ اب اگر پہلے معنی لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ میں طلوع صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں۔ اور دوسرے معنی لئے جائیں تو مطلب ہوگا میں تمام خلق کے رب کی پناہ لیتا ہوں۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذات چھوڑ کر اُس کا اسم صفت "رب" اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ پناہ مانگنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رب، یعنی مالک و پروردگار آقا و مربّی ہونے کی صفت زیادہ مناسبت رکھتی ہے پھر رَبِّ الْفَلَقِ سے مراد اگر طلوع صبح کا رب ہو تو اس کی پناہ لینے کے یہ معنی ہوں گے کہ جو رب تاریکی کو چھانٹ کر صبح روشن نکالتا ہے میں اس کی پناہ لیتا ہوں تاکہ وہ آفات کے ہجوم کو چھانٹ کر میرے لئے عافیت پیدا کر دے اور اگر اس سے مراد رَبِّ خَلْق ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ میں ساری خلق کے مالک کی پناہ لیتا ہوں تاکہ وہ اپنی مخلوق کے شر سے مجھے بچائے۔

۲ بہ الفاظِ دیگر تمام مخلوقات کے شر سے میں اُس کی پناہ مانگتا ہوں۔ اس فقرے میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:۔

اوّل یہ کہ شر پیدا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی۔ بلکہ مخلوقات کی پیدائش کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت مخلوقات کی طرف کی گئی ہے، یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اُن شرور سے پناہ مانگتا ہوں جو اللہ نے پیدا کئے ہیں۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اُن چیزوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو اُس نے پیدا کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو شر کے لئے پیدا نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کا ہر کام خیر اور کسی مصلحت ہی کے لئے ہوتا ہے، البتہ مخلوقات کے اندر جو اوصاف اُس نے اس لئے پیدا کئے ہیں کہ ان کی تخلیق کی مصلحت پوری ہو، اُن سے بعض اوقات اور بعض اقسام مخلوقات سے اکثر شر رونما ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ اگر صرف اِسی ایک فقرے پر اکتفا کیا جاتا اور بعد کے فقروں میں خاص قسم کی مخلوقات کے شرور سے الگ الگ خدا کی پناہ مانگنے کا نہ بھی ذکر کیا جاتا تو یہ فقرہ، دعا پورا کرنے کے لئے کافی تھا۔ کیونکہ اس میں خدا کی ساری ہی مخلوقات کے شر سے خدا کی پناہ مانگ لی گئی ہے۔ اس عام استعاذے کے بعد چند مخصوص شرور سے پناہ مانگنے کا ذکر خود بخود یہ معنی دیتا ہے کہ دلیے تو میں خدا کی پیدا کی ہوئی ہر مخلوق کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، لیکن خاص طور پر وہ چند شرور جن کا ذکر سورۂ فلق کی باقی آیات اور سورۂ ناس میں کیا گیا ہے ایسے ہیں جن سے خدا کی امان پانے کا میں بہت محتاج ہوں۔

سوم یہ کہ مخلوقات کے شر سے پناہ حاصل کرنے کے لئے موزوں ترین اور مؤثر ترین استعاذہ اگر ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ کہ اُن کے خالق کی پناہ مانگی جائے، کیونکہ وہ بہر حال اپنی مخلوق پر غالب ہے، اور اُن کے ایسے شرور کو بھی جانتا ہے جنھیں ہم جانتے ہیں اور ایسے شرور سے بھی واقف ہے جنھیں ہم نہیں جانتے۔ لہٰذا اُس کی پناہ گویا اُس حاکمِ اعلیٰ کی پناہ ہے جس کے مقابلے کی طاقت کسی مخلوق میں نہیں ہے، اور اس کی پناہ مانگ کر ہم ہر مخلوق کے ہر شر سے اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں، خواہ وہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو۔ نیز اس میں دنیا ہی کے نہیں آخرت کے بھی ہر شر سے استعاذہ شامل ہے۔

چہارم یہ کہ شر کا لفظ نقصان، ضرر، تکلیف، اَلم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور اُن اسباب کے لئے بھی جو نقصان و ضرر اور تکلیف و اَلم کے موجب ہوتے ہیں۔ مثلاً بیماری، بھوک، کسی حادثے یا جنگ میں زخمی ہونا، آگ سے جل جانا، سانپ، بچھو وغیرہ سے ڈسا جانا، اولاد کی موت کے غم میں مبتلا ہونا، اور ایسے ہی دوسرے شرور پہلے معنی میں شر ہیں، کیونکہ یہ بجائے خود تکلیف اور اذیت ہیں۔ بخلاف اس کے مثال کے طور پر کفر، شرک اور ہر قسم کے گناہ اور ظلم اور دوسرے معنی میں شر ہیں کیونکہ ان کا انجام نقصان اور ضرر ہے۔ اگرچہ بظاہر ان سے فی الوقت کوئی تکلیف نہ پہنچتی ہو، بلکہ بعض گناہوں سے لذت ملتی یا نفع حاصل ہوتا ہو۔ پس شر سے

مانگنا ان دونوں مفہومات کا جامع ہے۔
پنجم یہ کہ شر سے پناہ مانگنے میں دو مفہوم اور بھی شامل ہیں۔ ایک یہ کہ جو شر واقع ہو چکا ہے، بندہ اپنے خدا سے دعا مانگ رہا ہے کہ وہ اسے دفع کر دے۔ دوسرے یہ کہ جو شر واقع نہیں ہوا ہے، بندہ یہ دعا مانگ رہا ہے کہ خدا مجھے اس شر سے محفوظ رکھے۔

۵ مخلوقات کے شر سے عموماً خدا کی پناہ مانگنے کے بعد اب بعض خاص مخلوقات کے شر سے خصوصیت کے ساتھ پناہ مانگنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ آیت میں غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ غاسق کے لغوی معنی تاریک کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ "نماز قائم کرو زوالِ آفتاب کے وقت سے رات کے اندھیرے تک" (بنی اسرائیل - ۷۸) اور وَقَبَ کے معنی داخل ہونے یا چھا جانے کے ہیں۔ رات کی تاریکی کے شر سے خاص طور پر اس لئے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اکثر جرائم اور مظالم رات ہی کے وقت ہوتے ہیں۔ موذی جانور بھی رات ہی کو نکلتے ہیں۔ اور عرب میں طوائف الملوکی کا جو حال ان آیات کے نزول کے وقت تھا اس میں تو رات بڑی خوفناک چیز تھی، اسی کے اندھیرے میں چھاپہ مار نکلتے تھے اور بستیوں میں غارت گری کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے۔ جو لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھے وہ بھی رات ہی کے وقت آپ کو قتل کر دینے کی تجویزیں سوچا کرتے تھے تاکہ قاتل کا پتہ نہ چل سکے۔ اس لئے ان تمام شرور و آفات سے خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا جو رات کے وقت نازل ہوتی ہیں۔ یہاں اندھیری رات کے شر سے طلوع فجر کے رب کی پناہ مانگنے میں جو لطیف مناسبت ہے وہ کسی صاحب تفکر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک اشکال یہ پیش آتا ہے کہ متعدد صحیح احادیث میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت آئی ہے کہ رات کو چاند نکلا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر اس کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ اللہ کی پناہ مانگو ھٰذا الغاسق اذا وقب، یعنی یہ الغاسق اذا وقب ہے (احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن المنذر، حاکم، ابن مردویہ)۔ اس کی تاویل میں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اِذَا وَقَبَ مطلب یہاں اِذَا خَسَفَ ہے، یعنی جب کہ وہ گہنا جائے یا چاند گرہن اس کو ڈھانک لے۔ لیکن کسی روایت میں بھی یہ نہیں آیا ہے کہ جس وقت حضورؐ نے چاند کی طرف اشارہ کر کے یہ بات فرمائی تھی اس وقت وہ گرہن میں تھا۔ اور لغت عرب میں بھی اِذَا وَقَبَ کے معنی اذا خَسَفَ کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ ہمارے نزدیک اس حدیث کی صحیح تاویل یہ ہے کہ چاند نکلنے کا وقت چونکہ رات ہی کو ہوتا ہے، دن کو اگر چاند آسمان پر ہوتا بھی ہے تو روشن نہیں ہوتا۔ اس لئے حضورؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس کے (یعنی چاند کے) آنے کے وقت یعنی رات سے خدا کی پناہ مانگو، کیونکہ چاند کی روشنی مدافعت کرنے کے لئے اتنی مددگار نہیں ہوتی جتنی حملہ کرنے والے کے لئے ہوتی ہے، اور جرم کا شکار ہونے والے کے لئے اتنی مددگار نہیں ہوتی جتنی مجرم کے لئے ہوا کرتی ہے۔ اس بناء پر حدیث میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِن الشمس اذا غربت انتشرت الشیاطین، فاکتفوا صبیانکم واحبسوا مواشیکم حتی تذھب فحمۃ العشاء "جب سورج غروب ہو جائے تو شیاطین ہر طرف پھیل جاتے ہیں، لہٰذا اپنے بچوں کو گھروں میں سمیٹ لو اور اپنے جانوروں کو باندھ رکھو جب تک رات کی تاریکی ختم نہ ہو جائے۔"

۶ اصل الفاظ ہیں نَفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ۔ عُقَد جمع ہے عُقْدہ کی جس کے معنی گرہ کے ہیں، جیسی مثلاً تاگے یا رسی میں ڈالی جاتی ہے۔ نَفْث کے معنی پھونکنے کے ہیں۔ نفّاثات جمع ہے نَفّاثَہ کی جس کو اگر علّامہ کی طرح سمجھا جائے تو مراد بہت پھونکنے والے مرد ہوں گے، اور اگر اسے مؤنث کا صیغہ سمجھا جائے تو مراد بہت پھونکنے والی عورتیں بھی ہو سکتی ہیں، اور نفوس اور یا جماعتیں بھی، کیونکہ عربی میں نفس اور جماعت دونوں مؤنث ہیں۔ گرہ میں پھونکنے کا لفظ اگر، بلکہ تمام تر مفسرین کے نزدیک جادو کے لئے استعارہ ہے، کیونکہ جادوگر عموماً کسی ڈور یا تاگے میں گرہ دیتے اور اس پر پھونکتے جاتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں طلوع فجر کے رب کی پناہ مانگتا ہوں، جادوگروں یا جادوگرنیوں کے شر سے۔ اس مفہوم کی تائید وہ روایات بھی کرتی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جب جادو ہوا تھا تو جبریل علیہ السلام نے آکر حضورؐ کو معوذتین پڑھنے کی ہدایت کی تھی، اور معوذتین میں یہی ایک فقرہ ہے جو براہِ راست جادو سے تعلق رکھتا ہے، ابو مسلم اصفہانی

اور زمخشری نے نفّاثات فی العقد کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد عورتوں کی مکاری، اور مردوں کے عزائم اور آراء اور خیالات پر ان کی اثر اندازی ہے اور اس کو جادوگری سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ عورتوں کی محبت میں مبتلا ہو کر آدمی کا وہ حال ہو جاتا ہے گویا اس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ یہ تفسیر اگرچہ پُرلطف ہے لیکن اُس تفسیر کے خلاف ہے جو سلف سے منقول چلی آتی ہے اور اُن حالات سے بھی یہ مطابقت نہیں رکھتی جن میں معوّذتین نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں۔

جادو کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ اس میں چونکہ دوسرے شخص پر بُرا اثر ڈالنے کے لیے شیاطین یا ارواح خبیثہ یا ستاروں کی مدد مانگی جاتی ہے۔ اس لئے قرآن میں اسے کفر کہا گیا ہے وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ "سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ شیاطین نے کفر کیا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے (البقرہ - ۱۰۲)، لیکن اگر اس میں کلمۂ کفر یا کوئی فعل شرک نہ بھی ہو تو وہ بالاتفاق حرام ہے۔ اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے سات ایسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے وہ انسان کی آخرت کو برباد کر دینے والے ہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا سات غارت گر چیزوں سے پرہیز کرو۔ لوگوں نے پوچھا وہ کیا ہیں یا رسول اللہ؟ فرمایا خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو، کسی ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد میں دشمن کے مقابلہ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلنا، اور بھولی بھالی عفیف مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔

۵ حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ نے جو نعمت یا فضیلت یا خوبی عطا کی ہو اس پر کوئی دوسرا شخص جلے اور یہ چاہے کہ وہ اس سے سلب ہو کر حاسد کو مل جائے یا کم از کم یہ کہ اس سے ضرور چھن جائے، البتہ حسد کی تعریف میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی شخص یہ چاہے جو فضل دوسرے کو ملا ہے وہ مجھے بھی مل جائے۔ یہاں حاسد کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اس حالت میں مانگی گئی ہے جبکہ وہ حسد کرے، یعنی اپنے دل کی آگ بجھانے کے لئے قول یا عمل سے کوئی اقدام کرے کیونکہ جب تک وہ کوئی اقدام نہیں کرتا اُس وقت تک اس کا جلنا بجائے خود چاہے بُرا سہی، مگر محسود کے لئے ایسا شر نہیں بنتا کہ اس سے پناہ مانگی جائے۔ اس کے ساتھ حاسد کے شر سے امان پانے کے لئے چند چیزیں اور بھی مددگار ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اللہ پر بھروسہ کرے اور یقین رکھے کہ جب تک اللہ نہ چاہے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دوسرے یہ کہ حاسد کی باتوں پر صبر کرے، بے صبر ہو کر ایسی باتیں یا کارروائیاں نہ کرنے لگے جن سے وہ خود بھی اخلاقی طور پر حاسد ہی کی سطح پر آ جائے۔ تیسرے یہ کہ حاسد خواہ خدا سے بیخوف اور خلق سے بے شرم ہو کر کیسی ہی بیہودہ حرکتیں کرتا رہے، محسود بہرحال تقویٰ پر قائم رہے۔ چوتھے یہ کہ اپنے دل کو اس کی فکر سے بالکل فارغ کر لے اور اس کو اس طرح نظر انداز کر دے کہ گویا وہ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اُس کی فکر میں پڑنا حاسد سے مغلوب ہونے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ پانچویں یہ کہ حاسد کے ساتھ بدی سے پیش آنا تو درکنار، جب کبھی ایسا موقع آئے کہ محسود اس کے ساتھ بھلائی اور احسان کا برتاؤ کر سکتا ہو تو ضرور ایسا ہی کرے، قطع نظر اس سے کہ حاسد کے دل کی جلن محسود کے اِس نیک رویّہ سے مٹتی ہے یا نہیں چھٹے یہ کہ محسود توحید کے عقیدے کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس پر ثابت قدم رہے، کیونکہ جس دل میں توحید بسی ہوئی ہو اس میں خدا کے خوف کے ساتھ کوئی اور خوف جگہ ہی نہیں پا سکتا۔

کیا مولانا عامر عثمانی کی موت ـــــ جادو سے واقع ہوئی ہے؟!

ـــــ ایک ٹیڑھا سوال ـــــ

جس کا سیدھا سادا جواب عامر عثمانی نمبر میں ملاحظہ فرمائیے

یہ جواب متواتر شواہد کی موجودگی میں قلمبند کیا جائے گا

تفہیم الحدیث

حقوق العباد

حسن احمد صدیقی

غالباً جولائی و اگست کے شمارہ میں ہم نے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ اگلے شمارہ سے نئی تفہیم الحدیث کا سلسلہ شروع کریں گے، لیکن قابلِ افسوس اور قابلِ ندامت بات یہ ہے کہ بعض مجبوریوں کی بنا پر ہم اپنے وعدہ کو پورا نہ کرسکے اور اسی تفہیم الحدیث کو چھاپنے پر اکتفا کرتے رہے جو اس سے پہلے بھی تجلی کے صفحات کی زینت بن چکی تھی۔ کسی مطبوعہ مضمون کا دوبارہ شائع کرنا اگرچہ مناسب نہیں لیکن کسی عظیم اور بڑے آدمی کی تحریر کو بطور تبرک پیش کر دینا غیر مناسب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ مولانا مرحوم کی مطبوعہ تفہیم الحدیث پیش کرنے وقت اس بات کا اندیشہ تھا کہ ناظرین تجلی خفگی اور کوفت کا اظہار ضرور کریں گے۔ لیکن یہ عقیدت کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ اس دنیا کے انسان ہم جیسے نااہلوں سے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ ہم ہر چیز کو عقل کے پیمانے سے ناپتے ہیں لیکن عقیدت کی دنیا میں بسنے والوں کے نزدیک عقل کوئی معیار نہیں۔ ان کے نزدیک معیار دل ہے۔ دل نے جو کہہ دیا وہ مان لیا۔

مختصر یہ ہے کہ ہمارے اندیشوں کو خفت اٹھانی پڑی اور یہ ثابت ہوگیا کہ تجلی کے قارئین مولانا مرحوم کی تحریروں کو ایک بار نہیں، چند بار نہیں بلکہ بار بار پڑھنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ مرحوم کی مطبوعہ تحریر دیکھ کر انھیں کوفت تو کیا ہوتی معمولی سی اکتاہٹ بھی نہیں ہوتی بلکہ ایک گونہ خوشی ہوتی ہے اور ان کی یہ دلی خواہش ہے کہ مولانا مرحوم کی تمام مطبوعہ تحریریں وقتاً فوقتاً تجلی کے اوراق میں پیش کی جاتی رہیں۔ قارئین تجلی کی خواہش قابلِ قدر، ان کے جذبات لائق آفریں اور ان کی عقیدت قابل احترام۔ لیکن اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس وعدے کو پورا کر دیا جائے جو وعدہ کئی مہینے پہلے قارئین سے کیا گیا تھا۔ یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ احادیث کی تشریح کرتے ہوئے ناچیز آپ کو اس درجہ مطمئن کر دے گا جس درجہ مطمئن آپ مولانا مرحوم کی تشریحات پڑھ کر ہو جاتے تھے۔ یہ توقع کرنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے پاس نہ مولانا عامر عثمانیؒ جیسا فولادی دماغ ہے نہ ان جیسی فطری اور عبقری صلاحیتیں ہیں، نہ ہمارے دامن ذہن میں دلائل و براہین کا قیمتی سرمایہ ہے اور نہ ہی ہمارا اندازِ نگارش مولانا مرحوم کے اسلوب تحریر کے ہم رنگ اور ہم چنیں ہے۔ لہٰذا ہم دونوں کی مرتب کردہ تفہیم الحدیث ایک دوسرے کے مشابہ کیسے ہوسکتی ہے۔ مولانا کی تفہیم الحدیث اور ہماری تفہیم الحدیث میں وہ بھلا فرق ضرور محسوس کیا جائے گا جو ایک عالم اور طالب علم کی تفہیم و تشریح میں کیا جاتا ہے۔

مولانا مرحوم ایک جید اور بہترین عالم تھے۔ ان کا دماغ علم اور صلاحیتوں کی دولت سے مالا مال تھا۔ انھیں علماء کی بھیڑ میں جو یکتائی، یگانگت اور انفرادیت حاصل تھی اس کے انکار کی مجال ان کے کسی حریف کو بھی نہیں ہوسکتی۔ وہ اپنی مثال آپ تھے۔ ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

اور ہم ایک معمولی درجہ کے طالب علم ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ معمولی درجہ کا طالب اسے کہتے ہیں جس کا علم محدود ہو اور فہم کوتاہ، جس کا دامن دلائل کی دولت سے بھی محروم ہو اور الفاظ کی دولت سے بھی۔ ایسے ناکارہ اور بے بضاعت طالب علم کا اندازِ بیان مولانا مرحوم کی تحریر کے مقابلہ میں لانا ہی [illegible] ہوگا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے عالم کی گفتگو عالمانہ ہوتی ہے اور طالب علم کی طالبعلمانہ۔ کسی طالبعلم کی گفتگو میں اگر عالمانہ رنگ تلاش کرنا غلط ہوگا تو یہ بات بھی غلط ہوگی کہ آپ ناچیز کی تحریروں میں مولانا عامر عثمانی جیسے منفرد اور صاحبِ قلم کا رنگ تحریر تلاش کریں۔ اور یہ ناجائز توقع وابستہ کرکے بیٹھ جائیں کہ میری کی ہوئی تشریحات بھی اتنی ہی مطمئن کن اور تشفی بخش ثابت ہوں گی جتنی کہ مولانا مرحوم کی توضیحات ہوا کرتی تھیں۔

خلاف توقع جب کوئی بات سامنے آتی ہے تو آدمی کو تحیر بھی ہوتا ہے اور کسی نہ کسی درجہ میں افسوس بھی۔ اور کسی نہ کسی درجہ میں آدمی مائل بہ شکایت بھی ہو جاتا ہے لیکن اگر پیش آنے والی بات توقع کے عین مطابق ہو تو حیرت و افسوس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی شکایت کرنے کا کوئی حق پہنچتا ہے۔ مثلاً آپ ناچیز کو ایک عالم گمان کر بیٹھیں اور یہ غلط تصور دل میں جمالیں کہ حسن ایک بہترین عالم ہے اس کا انداز تحریر کسی بہترین عالم کے اندازِ تحریر سے فروتر نہیں ہو سکتا۔ یہ تصور دل میں بسا لینے کے بعد حسن کا اندازِ تحریر آپ کے سامنے آتا ہے جسے آپ کی عقل گھٹیا اور پست قرار دیتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ گھٹیا اور پست تحریر دیکھنے کے بعد آپ کو حیرت بھی ہوگی، افسوس بھی ہوگا اور آپ نالائق حسن سے اس بات کا شکوہ بھی کر بیٹھیں گے کہ ہم نے تو تیرے بارے میں یہ رائے قائم کی تھی اور تو حقیقتاً اس رائے کے برعکس ثابت ہوا۔

لیکن اگر پہلے ہی آپ کو اس بات کا یقین ہو کہ حسن ایک طالب علم ہے، عالم نہیں۔ اس کی صلاحیتیں معمولی ہیں غیر معمولی نہیں۔ وہ ایک عام مضمون نگار ہے بے نظیر نہیں۔ تو پھر حسن کی ناقص، پھوہڑی اور بے مزہ تحریریں دیکھنے کے بعد آپ کو نہ کوئی حیرانی ہوگی نہ کوئی تاسف۔

اس تمہید کے بعد میں قارئین کی خدمت میں عرض کروں گا کہ مجھ بے بضاعت اور ناچیز کے بارے میں خوش فہمیوں اور توقعات کا کوئی ایسا خاکہ تیار مت کیجئے کہ جس خاکہ میں میرے علم و فہم کی تصویر ڈھیلی ثابت ہو۔ یہ گذارش بھی ہے کہ آپ میرے لئے یہ دعا فرمائیں کہ میں جس سلسلہ کو شروع کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں یہ سلسلہ تجلی کے اوراق میں باقی رہے اور جس مقصد کی خاطر یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے وہ مقصد بھی پورا ہو۔ اور مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ پڑھنے والوں کی اصلاح ہو اور حقیر درجہ میں دین کی کچھ خدمت ہو سکے۔ ۔۔۔ مولانا مرحوم نے زندگی کے آخری ایام میں ناچیز کے بارے میں حسن ظن قائم کیا تھا اور احقر کے لئے انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ حسن تجلی کو سنبھال لیں گے ۔۔۔ میں نے مولانا عامر عثمانی رح کے اس آخری حکم کو اپنے لئے باعث صد افتخار سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو تجلی کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے حالانکہ اس بارگراں کو سنبھالنے اور چلانے کی اہلیت و صلاحیت میں اپنے اندر نہیں پاتا۔ لیکن چونکہ خدائے برتر و بالا کے بھروسہ پر میں اس ذمہ داری کو سنبھال چکا ہوں۔ لہٰذا مجھے ان موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کرنی پڑ رہی ہے جن کی اہلیت میں اپنے اندر نہیں پاتا۔ لیکن تمام تر بے بضاعتی اور بے سر و سامانی کے باوجود خدا کے ان پیغامات کو جو تجلی کے صفحات کے ذریعہ مولانا عامر عثمانی مرحوم نے آپ تک پہنچائے تھے میں بھی بقدر استطاعت اس خدمت کو انجام دینے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور آپ تمام حضرات کی دعاؤں اور پرخلوص تعاون کے نتیجہ میں تجلی کی تمام تر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی سعادت نصیب ہوگی۔

حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور قارئین کی دعاؤں کا سہارا لیکر ہم تفہیم الحدیث کا آغاز "حقوق العباد" سے کر رہے ہیں۔ مسلمانوں میں کون ایسا ہوگا جو حقوق العباد کی اہمیت سے واقف نہ ہو۔ تقریباً سبھی مسلمان اس بات سے واقف ہیں کہ حقوق العباد کی ادائیگی

سے بغیر خدا کی خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی۔ حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی بھی انتہائی ضروری ہے بلکہ اگر حقوق اللہ کے ادا کرنے میں کوئی غفلت، تساہل اور کوتاہی سرزد ہو گئی تو خداوند قدوس اپنی کرم فرمائی سے اسے نظرانداز کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر حقوق العباد میں کسی قسم کی کوتاہی عمل میں آ گئی تو صرف خدا کی کرم فرمائی سے وہ کوتاہی نظرانداز نہیں ہو سکیگی جب تک صاحب معاملہ حضرات آپس میں معافی تلافی کا اظہار نہ کریں۔ مثلاً ایک شخص نے زید کی حق تلفی کی تو ظاہر ہے جب تک میدان حشر میں زید ہی اس شخص کو معاف نہ کر دے کسی کو کیا حق ہو سکتا ہے اس شخص کی غلطی کو نظرانداز کر دینے کا۔ یہ ایک ایسی واضح بات ہے جس سے شاید ہی کوئی مسلمان ناواقف ہو۔ لہذا تفصیل میں جانیکی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاشرہ کے اندر بگاڑ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب لوگ حقوق العباد کی ادائیگی میں غفلت، سستی اور کوتاہیوں کا مظاہرہ کرنے لگیں۔ حقوق اللہ سے غافل ہونے پر بھی کسی نہ کسی درجہ میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ برائیاں اور خرابیاں اسی وقت ابھارتی ہیں جب لوگ ایک دوسرے کے حقوق کو نہ پہچانیں اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں انھیں کوئی دریغ نہ ہو۔ معاشرہ کو برائیوں اور خرابیوں سے اسوقت تک پاک نہیں کیا جا سکتا جب تک کثیر لوگ ایک دوسرے کا حق پہچاننے کا تہیہ نہ کر لیں اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے پر کمربستہ نہ ہو جائیں۔

معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہوئے ہر انسان کسی نہ کسی کے مقابلہ میں بڑا ہے اور کسی نہ کسی کے مقابلہ میں چھوٹا۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا نہیں جس کے کچھ بڑے نہ ہوں اور جس کے کچھ چھوٹے نہ ہوں۔ انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ بڑوں کے سامنے احترام کا مظاہرہ کرے اور چھوٹوں کے روبرو شفقت و ہمدردی کا۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو اس سے بڑوں کو شکایت ہوگی اور چھوٹوں کو بھی۔ اور شکایتوں کے نتیجہ میں معاشرہ کے اندر بے چینی بھی پھیلے گی اور افتراق بھی۔ اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں ہو سکتا جو اپنے بڑوں کی تعظیم نہ کرے اور اپنے چھوٹوں کے ساتھ نرمی، محبت اور شفقت کے ساتھ پیش نہ آئے۔ بظاہر تو یہ بات معمولی سی ہے لیکن آپ اگر گہرائی میں جائیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات معاشرہ کو انتشار و افتراق، بے چینیوں اور خلفشاریوں سے بچنے کے لئے ارشاد فرمائی تھی۔ ایک انسان کا اور بالخصوص ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بڑوں کے حقوق بھی پہچانے اور چھوٹوں کے حقوق بھی۔ والدین کے حقوق بھی پہچانے اور بیوی بچوں کے حقوق بھی رشتہ داروں کے حقوق بھی پہچانے۔ احباب کے حقوق بھی، پڑوسیوں کے حقوق کو بھی نظرانداز نہ کرے اور دوسرے متعلقین اور متوسلین کے حقوق بھی۔ انتہا یہ ہے کہ وہ جانوروں کے حقوق بھی ادا کرے یہی ایمان کی علامت ہے اور یہی اسلام کا منشاء ہے۔

حقوق العباد ادا کرنے پر آخرت میں تو جو اجر ملے گا وہ ملے ہی گا دنیا میں بھی ہمیں ایک نقد صلہ حاصل ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ جیسا بھی سلوک کرتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ دراصل دنیا ایک تجارت گاہ ہے۔ یہاں ایک ہاتھ سے ایک چیز دیجئے اور دوسرے ہاتھ سے وہی یا اس جیسی چیز لے لیجئے۔

ہم دوسروں سے مسکرا کر بولتے ہیں محض اس لئے کہ دوسرے بھی ہمارے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئیں۔ ہم دوسروں کی عزت کرتے ہیں محض اس لئے تاکہ دوسرے ہماری عزت کریں۔ ہم دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں تاکہ دوسرے ہماری خوشیوں میں شریک ہوں۔ ہم بیماروں کی عیادت کو بھی جاتے ہیں لیکن اس لئے تاکہ جب ہم بیمار ہو جائیں تو دوسرے لوگ بھی ہماری مزاج پرسی کریں۔ اس قسم کی ہزاروں باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا ایک تجارت گاہ ہے اور اس تجارت گاہ میں رہنے والے لوگوں کا ذہن کاروباری ہے۔ اس تجارت گاہ میں آپ کا احترام اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب آپ نے بھی دوسروں کا احترام کیا ہو۔ آپ ساری

دنیا سے بائیکاٹ کر کے ایک کمرے میں خلوت نشین ہو جائیں، کسی کے غم اور خوشی میں شریک نہوں تو یقین کر لیجئے کہ کوئی آپ کے غم اور خوشی میں بھی شریک نہیں ہوگا۔

آپ ساری دنیا کے لئے اکھڑ مزاج بن جائیں تو ساری دنیا آپ کے لئے اکھڑ مزاج بن جائے گی۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی

یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ دنیا گول ہے اور چونکہ ہر گول چیز کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر اس میں کوئی چیز رکھ کر گھمائی جائے تو وہ چیز جہاں سے چلے گی چکر کاٹ کر وہیں آجائے گی لہٰذا دنیا میں بھی جو چیز جہاں سے چلتی ہے پھر پھرا کر وہیں آجانے پر مجبور ہے۔ واقعات خود کو دہراتے رہتے ہیں۔ مثلاً زید نے ایک برائی کی۔ یہ برائی دنیا کا چکر لگانے کے بعد زید ہی کی طرف لوٹ جائے گی۔ اور جو گڑھا زید نے دوسروں کے لئے کھودا تھا اس گڑھے میں ایک دن زید کو بھی گرنا ہوگا۔

آج ہم اپنے والدین کو پریشان کریں گے کل ہماری اولاد ہمیں پریشان کرے گی۔ آج ہم کسی کی عزت اچھالیں گے کل کوئی اور ہماری عزت اچھالے گا۔ آج ہم کسی کے عیب کھولیں گے۔ کل کوئی دوسرا ہمارے عیب کھولے گا۔ آپنے سُنا ہی ہوگا کہ حق تعالیٰ حدیث قدسی میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے بندوں کے عیب چھپائے گا میں اس کے عیبوں پر پردے ڈال دوں گا۔ اور جو شخص میرے بندوں کے عیب کھولے گا۔ میں اس کے عیب کھولوں گا۔

یعنی دوسروں کے عیب کھولنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے عیب کھول رہا ہے اور دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے عیبوں کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اندازہ یہ ہوا کہ آدمی اگر اپنے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرے نتیجۃً اس کے ساتھ بھلائی ہوگی۔ دوسروں کے حقوق پہچاننے کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اس بات پر تیار کر رہا ہے کہ میرے حقوق پہچانو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ حقوق العباد ادا کرنے پر دنیا میں بھی ایک نقد انعام حاصل ہو جاتا ہے اور آخرت کا انعام الگ رہا۔

سبھی جانتے ہیں کہ دنیا میں آنے کے بعد انسان کا سب سے پہلے والدین سے سابقہ پڑتا ہے اور جتنی مصیبتیں انسان کے لئے اس کے ماں باپ اٹھاتے ہیں کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔ لہٰذا سب سے زیادہ حقوق والدین کے ہوئے۔ چنانچہ ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کے ان حقوق کو ادا کرے جن کو ادا کئے بغیر خدا کی رضا حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم سب سے پہلے والدین کے حقوق پر ہی گفتگو کریں گے۔ یہ گفتگو اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیے۔ انشاء اللہ!

ممکن ہے اس موضوع پر اس سے پہلے مولانا عامر عثمانیؒ بھی کچھ فرما چکے ہوں لیکن ظاہر ہے انھوں نے جو کچھ فرمایا ہوگا عالمانہ انداز میں فرمایا ہوگا اور ہم طالب علمانہ انداز میں عرض کریں گے۔ اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ طالبعلمانہ انداز کی بھی اپنی ایک شان ہوتی ہے — اپنا ایک ڈھنگ ہوتا ہے۔

وللہ عاقبۃ الامور

تجلی کی ڈاک

حسن احمد صدیقی

سوال ۱ :- (نام نادارد)

از مقام ساگر (ضلع شموگہ) کرناٹک۔

گذارش ہے کہ ہمارے ہاں کے امام صاحب جو حافظ بھی ہیں، رجب کے کونڈے، چہلم کے فاتحہ کا کھانا کھلاتے ہیں، اور بعد نماز فجر دعا میں روزانہ اور نماز جمعہ بعد دعائے ثانی میں الفاتحہ بآواز بلند کہتے ہیں۔ یہاں پر مسلمانوں کی جماعت ان تمام فعلوں کو شرک و بدعت سمجھتی ہے۔ ان سے جب یہ امام صاحب ملتے ہیں تو تینوں چیزوں کو شریعت کے خلاف بتاتے ہیں اس کے خلاف لمبی چوڑی بحث کرتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ ان پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ جس سے عوام الجھن میں پڑ گئے ہیں کہ امام صاحب ایک جگہ جائز اور ایک جگہ ناجائز کہتے ہیں جس کی وجہ سے باپ بیٹوں، بھائی بھائیوں اور دوست دوستوں میں سخت اختلافات پیدا ہو رہے ہیں اور امام صاحب خاموش بیٹھے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ کیا ایسے امام صاحب جو دورنگ پیش کر رہے ہیں ان کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے۔

اگر ایک دو صاحب امام صاحب پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ آپ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں تو امام صاحب جواب دیتے ہیں کہ "اگر مسجد کے صدر محترم کہیں تو آج ہی ان غلط چیزوں کو ترک کردوں گا۔"

کچھ لوگ امام صاحب کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ بیچارے امام صاحب کی نیت تو بالکل پاک و صاف آئینہ کی طرح ہے مگر عوام میں زیادہ تر طبقہ جاہلوں کا ہے۔ ایسے طبقہ کو سمجھانے کے لئے ان کو قریب لانا ہے اس کے بعد سمجھایا جا سکتا ہے۔ اور قریب تب ہی آسکتے ہیں جب تک ...... ہم ان کے ہم خیال اور ہم پیالے بن جائیں تو پھر امام صاحب انھیں سمجھا کر توحید و سنت کی دعوت دیں گے ورنہ فساد ہو جانے کا اندیشہ ہے اور یہ اچھی چیز نہیں ہے۔

ایسی مصلحت ہمیں تو معلوم نہیں ہو رہی کہ وقت کے تقاضے سے حرام حلال، بدعت سنت اور ناجائز جائز بنجاتی ہے۔ آپ عالم دین ہیں، اس معاملہ پر گہری روشنی ڈالتے ہوئے براہ کرم جنوری یعنی اسی ماہ کے تجلی میں مطلع فرمائیں۔

الجواب ۱ :- فاتحہ بازی کے چکر کو چھانٹئے اکابر نے رجب کے کونڈے۔ چہلم کا کھانا اور

بدعات وخرافات کی فہرست میں شمار کیا ہے لہذا جو شخص ان میں مبتلا ہو اسے بدعتی کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔

امام صاحب کا مذکورہ چیزوں کو غلط تسلیم کرتے ہوئے ان ہی میں غرق رہنا اس بات کی واضح علامت ہے کہ وہ صرف پیٹ کا مسئلہ حل کرنے کے لئے مُصلّٰی سنبھالے ہوئے ہیں اور جو شخص صرف پیٹ کی خاطر مصلّے پر ڈٹا ہوا ہو اسے حق اور حقانیت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر وقت اور ہمہ تن ان افعال کی طرف مائل رہے گا جو عوام کو مرغوب ہوں اور عوام جنھیں عین اسلام تصور کرتے ہوں۔

امام صاحب کا یہ فرمانا کہ مسجد کے صدر محترم کہیں تو آج ہی ان غلط چیزوں کو ترک کر دوں گا، بجائے خود اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ انھیں خدا اور خدا کے رسولؐ کی خوشنودی و ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں۔ ان کے نزدیک جائز و ناجائز کی کوئی اہمیت نہیں۔ انھیں اگر پرواہ ہے تو مسجد کے صدر محترم کے اقبالِ طبیعت کی ہے جن کے دل کو فتح کئے بغیر بظاہر نہ روٹی کا کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور نہ ہی عہدۂ امامت پر برقرار رہنے کا امکان ہے۔

ایسے پیٹ پرست امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے جو پیٹ کی خاطر ان خرابیوں کو اپنائے ہوئے ہو جن خرابیوں کی قباحت اس کے دل و دماغ پر روز روشن کی طرح واضح ہو۔ ایسے امام کو سمجھائیے کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آئے اور مذکورہ تمام خرافات کو کسی صدر محترم کی اجازت لئے بغیر ترک کر دے۔ اگر ان خرافات کو ترک کرنے کے لئے وہ تیار نہ ہو تو اسے مصلّے سے ہٹا دیجئے۔ اگر اسے ہٹانا بھی ممکن نہ ہو تو دوسری مسجد میں نماز ادا کیجئے۔ بدعات کے اندر مبتلا رہنے والے کے پیچھے نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہیں ہے۔

اب آئیے ان لوگوں پر بھی سرسری سی توجہ ڈال لیں جو امام صاحب کی بیجا وکالت میں اپنے قیمتی وقت کو ضائع کرتے رہتے ہیں۔ آپ کے کہنے کے مطابق ان لوگوں نے حمایتاً یہ ارشاد فرمایا ہے کہ امام صاحب کی نیت تو آئینہ کی طرح پاک صاف ہے مگر جاہل عوام کو خوش کرنے اور انھیں اپنے قریب لانے کے لئے وہ ان خرافات کے اندر مبتلا ہیں۔

امام صاحب کی طرفداری کرنے والے وکیلوں کو شاید یہ بات معلوم نہیں کہ برا کام اچھی نیت سے اچھا نہیں ہو جاتا جس طرح اچھا کام بری نیت سے برا ہو جاتا ہے۔

ایک شخص دنیا میں سخی مشہور ہونے کے لئے خوب خیرات کرتا ہے۔ خوب غریبوں کو کھانا کھلاتا ہے، خوب بیواؤں کی امداد کرتا ہے لیکن آخرت میں اسے کوئی اجر نہیں مل پاتا۔ محض اس لئے کہ اس کی نیت اچھی نہیں تھی اگر نیت اچھی ہوتی تو اچھے کام پر اجر ضرور مرتب ہوتا لیکن چونکہ نیت اچھی نہیں تھی لہٰذا اجر و ثواب ملنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

جو نماز دکھاوے کے لئے پڑھی جاتی ہے وہ نماز بھی اپنا اثر کھو دیتی ہے اور ایسی نماز قیامت کے دن نمازی کے منہ پر مار دی جائے گی۔ خیرات اور نماز کے اچھا ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن یہ اچھے کام حقیقتاً اسی وقت اچھے کہلائے جا سکتے ہیں جب ان کے کرنے والوں کی نیت اچھی ہو۔ نیت بری ہو تو یہ اچھے کام بھی برے ہو جائیں گے۔ لیکن برے کام کو اس پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ برا کام بہرحال برا ہی رہے گا خواہ نیت کتنی ہی صالح کیوں نہ ہو۔ بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرنے کا جذبہ بڑا ہی اچھا جذبہ ہے اس جذبہ کے احسن اور مستحسن ہونے میں کسی بھی شخص کو کوئی تردد نہیں ہو سکتا لیکن ذرا سوچئے ایک شخص بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرنے کی غرض سے سود کا کاروبار شروع کر دے یا شراب کی دوکان کھول لے تو کیا نیت اور جذبہ اچھا ہونے کی وجہ سے اس کی یہ حرکت اچھائی پر محمول کر لی جائے گی۔

ظاہر ہے کہ نہیں، لہٰذا امام صاحب کے وکیلوں کو سمجھا دیجئے کہ برا کام برا ہی رہے گا خواہ فاعل کی نیت اچھی ہی کیوں نہ ہو۔ نیت صالح ہونے کی وجہ سے خرافات عبادات میں اور بدعتیں سنتوں میں متبدل نہیں ہو سکتیں۔

ایک بات ـــ دوسری بات یہ ہے کہ امام صاحب دین کے ٹھیکیدار نہیں۔ ساری دنیا کو ہدایت عطا کر دینا ان کی ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔ ان کی ڈیوٹی تو صرف اور صرف اتنی ہے کہ جو بات حق ہو اسے سرعام کہہ دیں کوئی مانے یا نہ مانے حق بات کہنے کا اجر انھیں ضرور ملے گا ـــ یہی ڈیوٹی انبیاء کرام کی بھی تھی۔ وہ صحیح دین لوگوں کے سامنے پیش کر دیا کرتے تھے۔ دین کو لوگوں کے دلوں میں اتار دینا ان کی ڈیوٹی میں شامل نہیں تھا۔ لہٰذا صحیح دین پیش کر دینے پر انھیں اجر مل کر رہے گا خواہ ان کی امت میں کسی ایک شخص نے بھی صحیح دین قبول نہ کیا ہو۔

لوگوں کو اپنے قریب لانے کے لئے خود برائیاں اختیار کر لینا حیرتناک بات ہے۔ امام صاحب سے ذرا یہ پوچھ کر دیکھئے کہ اگر وہ کسی ایسے ماحول میں جا پھنسیں جہاں لوگ عمومی طور پر زنا اور شراب میں ڈوبے ہوئے ہوں تو ان لوگوں کی اصلاح کرنے کے لئے اور انھیں اپنے قریب لانے کے لئے کیا امام صاحب خود بھی زنا اور شراب میں ڈوب جائیں گے۔ گر امام صاحب کا جواب اثبات میں ہو تو یقین کر لیجئے کہ ان کی عقل کسی بڑے مرض کا شکار ہے۔ اور اگر ان کا جواب نفی میں ہو تو ان سے کہئے کہ جب شرابیوں کی اصلاح کے لئے خود شرابی بن جانا جائز نہیں تو بدعتیوں کی اصلاح کی خاطر خود بدعتی بن جانا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کسی نبی اور اللہ کے رسول نے لوگوں کو اپنے قریب لانے کے لئے بت پرستی کا مظاہرہ نہیں کیا اور کسی ایسی برائی کو اختیار نہیں کیا جس میں عام لوگ مبتلا ہوں۔ پیغمبروں نے بعض مصالح کے پیش نظر یہ تو ضرور کیا ہے کہ بعض برائیوں کی کھلی مخالفت نہیں کی لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی پیغمبر نے مصلحتاً بت پرستی شروع کر دی ہو اور خود بھی ان برائیوں میں ڈوب گئے ہوں جن برائیوں سے معاشرہ کو حتی الامکان ختم کرنے کے لئے وہ دنیا میں بھیجے گئے تھے

امام صاحب کے لئے یہ بات جائز ہو سکتی ہے کہ فتنۂ و انتشار سے بچنے کی خاطر بدعتوں کی کھلی مخالفت سے گریز کریں اور بدعتوں میں ڈوبے ہوئے لوگوں پر کوئی طنز و تنقید نہ کریں۔ لیکن یہ بات کسی صورت امام صاحب کے لئے جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ فتنہ و انتشار سے بچنے کے لئے خود بدعتی بن کر رہ جائیں۔ اور اپنے دامنِ ایمان کو اس غلاظت سے آلودہ کر ڈالیں جس غلاظت سے معاشرہ کو پاک کرنا بھی ان کا ایک فرض ہے۔

امام صاحب اور ان کے وکیلوں کو یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ فتویٰ ہمیشہ ظاہر پر لگتا ہے نیت اور اندرونی احوال پر نہیں۔

اس دور میں کتنے ہی لوگ ریا و نمود کے لئے نماز پڑھتے ہیں۔ دنیا کو دکھانے کے لئے روزے رکھتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ہم انھیں عبادت گزار کہنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے کہ نیت کا حال ہمیں معلوم نہیں اور قیامت سے پہلے کسی کی نیت کا حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ جو بظاہر نمازی ہو اسے نمازی کہیں اور جو بظاہر گناہگار ہو اسے گناہگار کہیں۔

امام صاحب کی نیت کیسی بھی ہو اگر وہ بظاہر بدعتوں کا شکار ہیں تو دنیا انھیں بدعتی کہنے پر مجبور بھی ہو گی اور حق بجانب بھی اس لئے کہ فتویٰ امام صاحب کے لئے بھی ظاہری احوال پر لگے گا اندرونی احوال پر نہیں۔

امید ہے کہ امام صاحب اور ان کی حمایت کرنے والوں کی بات سمجھ میں آ جائے گی اور وہ اب اپنی اصلاح کر لیں گے لیکن اگر اب بھی ان کے بات سمجھ میں نہ آئے اور وہ اپنی روش بدلنے کے لئے تیار نہ ہوں تو آپ کو ان سے دو دو ہاتھ ہونے کی ضرورت نہیں۔ پُر امن طریقہ یہ ہے کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں اور کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کو اپنا معمول بنا لیں بحث و تکرار سے فساد و انتشار کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ایک نیا شوشہ

سوال ۲: ـــ احمد رفیق صاحب۔ حیدرآباد۔

یہاں ہمارے دفتر میں ایک تبلیغی ذہن کے صاحب یہ فرماتے ہیں کہ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کوئی خاص تفسیر نہیں ہے۔

اور ویسے بھی وہ یوسف علی یا امیر علی کی تفاسیر سے نقل کی گئی ہے کیا یہ صحیح ہے۔ آپ اس بارے میں ہماری رہنمائی فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

الجواب :-

ایک طویل عرصہ تک تفہیم القرآن کے بارے میں یہ بات مشہور رہی کہ وہ تفسیر بالرائے ہے۔ جن لوگوں نے زندگی میں کبھی قرآن حکیم کی شکل تک نہیں دیکھی کہ آیا وہ کس سائز کا ہے وہ بھی چیخ چیخ کر یہ کہتے رہے کہ تفہیم القرآن تفسیر بالرائے ہے اور جن حضرات نے کسی دینی مدرسہ میں اپنی عمر عزیز کے دو لمحے کھپانے کی بھی توفیق نصیب نہیں ہو سکی تھی وہ بھی یہ ارشاد فرماتے رہے کہ ہم نے محسوس کر لیا ہے کہ واقعتاً یہ تفسیر، تفسیر بالرائے ہے۔

انتہا یہ ہے کہ سڑکوں پر خوانچہ لگانے والے اور رکشہ چلانے والے لوگ بھی تفہیم القرآن کے بارے میں اپنی اپنی رائے پلش کرنے سے باز نہیں آئے اور رائے سب کی ایک ہی تھی کہ یہ تفسیر خطرناک ہے، من گھڑت ہے۔

لیکن پھر یہ ہوا کہ ذکی اور فہیم علماء نے یہ فیصلہ کر دیا کہ تفہیم القرآن تفسیر بالرائے نہیں ہے، اسے بالرائے کہنا ظلم ہے، زیادتی ہے، بکواس ہے۔ جب علمائے وقت کا یہ فیصلہ سامنے آیا تو جہلائے وقت نے ایک نئی انگڑائی لے کر ایک نیا شوشہ چھوڑا کہ تفہیم القرآن جیسی بے نظیر تفسیر مودودی جیسا گمراہ آدمی نہیں لکھ سکتا۔ یہ تفسیر کسی اور کے ذہن کی اختراع ہے۔ کسی اور کے علم و فہم کا نچوڑ ہے —— غنیمت ہے کہ آپ کے دفتر میں کام کرنے والے صاحب نے تفہیم القرآن کو یوسف علی اور میر علی کی کاوش قرار نہیں دیا ہے۔ اگر وہ اس بدنام تفسیر کے بارے میں یہ انکشاف فرماتے کہ یہ کسی غیر مسلم اور ہریجن کی مرتب کردہ ہے تو بھی کچھ بعید نہیں تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی کے دل و دماغ بغض و حسد کے کینسر اور جہالت و حماقت کی ٹی بی میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو وہ تر اگدھا ہو کر رہ جاتا ہے۔

قیامت کے میدان میں ایسے گدھوں کو اگر اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اصولاً گدھوں سے کوئی حساب کتاب مناسب نہیں تو الگ بات ہے ورنہ لینے کے دینے تو پڑ ہی جائیں گے اور یار لوگ اپنے گدھے پن پر وہاں پچھتائے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

تفہیم القرآن کے بارے میں مختصراً یہ عرض ہے کہ اس دور کی ایک لاجواب تفسیر ہے اور یہ لاجواب تفسیر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے بیس بائیس سال کی مسلسل محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔

ایک ناقابل یقین کہانی

سوال :- از: غفار قادر۔ چنتور۔ مہاراشٹر۔

شبستان ڈائجسٹ سالنامہ ۷۶ء میں ایک مضمون "اللہ والے" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ مضمون کی پیشانی پر بھیجنے والے کا نام "ابو المنصور سرمدی" لکھا ہے۔ ویسے تو اس میں بہت ساری باتیں عقل کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں مگر ایک بات جو مجھے بہت زیادہ کھٹک رہی ہے وہ صاحب مراسلہ کے اپنے الفاظ میں ہی نقل کئے دیتا ہوں۔

"ایک مرتبہ چودھری بسنت رائے کے بیوی بچے سب بیمار ہو گئے۔ پھر شاہ نیاز کو زحمت دی گئی۔ جب شاہ نیاز وہاں گئے تو ان کی نظر ایک دیوار پر پڑی جس میں ایک طاق تھا۔ طاق میں زرکاری کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ شاہ نیاز نے چودھری بسنت سے دریافت کیا "پردہ کے پیچھے کیا ہے"؟ چودھری نے ادب سے جواب دیا "کرشن جی کی تصویر ہے" بچوں کی وجہ سے بے احتیاطی اور بے ادبی ہوتی ہے اسلئے اسے ڈھانپ دیا ہے، درشن کرنا ہوتا ہے تو پردہ اٹھا کے کر لیتے ہیں" شاہ نیاز نے حکم دیا "پردہ اٹھاؤ" پردہ اٹھا دیا گیا۔ شاہ نیاز تصویر کی طرف متوجہ ہو کر بولے "کرشن جی جس گھر میں آپ ہیں وہاں کا یہ حال" یہ کہہ کر شاہ نیاز خانقاہ واپس آ گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چودھری کے گھر سے

بیماری رخصت ہوگئی۔ کسی نے شاہ نیاز سے اس واقعہ کے متعلق استفسار کیا کہ یہ کیا بات تھی۔ شاہ نیاز نے جواب دیا "میری کرشن جی سے بہت ملاقات ہے، کرشن جی تو بڑے کامل تھے"

اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد جو شبہات میرے ذہن میں کلبلا رہے ہیں اس کی وضاحت کر کے میں آپ کا اور قارئین کا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ کچھ اس قسم کے شبہات آپ کے ذہن میں بھی آ سکتے ہیں۔ اس لئے اس واقعہ کے بارے میں مزید کچھ نہ لکھتے ہوئے آپ سے تبصرے کی درخواست کرتا ہوں۔ اور آخیر میں چھوٹا سا ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا بریلوی انداز فکر اسے ہی کہتے ہیں؟

الجواب[۳] :-

خدا کا شکر ہے کہ واقعہ پڑھنے کے بعد میرے دماغ میں کسی قسم کے شبہات پیدا نہیں ہوئے۔ میری عقل ٹھکانے ہے اور جب تک یہ عقل ٹھکانے ہے میں اس قسم کے واقعات پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

دیوبندی خیال کا کوئی آدمی ایسے عجیب تر واقعہ پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اس قسم کے عجیب و غریب واقعات کی آنکھیں بند کر کے تصدیق کرنے کے لئے تو بریلویوں کا جم غفیر موجود ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اصل بریلویوں کو بھی اس واقعہ کی صحت میں تردد ہونا چاہئے۔ اگر انھوں نے اس واقعہ کی تصدیق کر دی تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے کرشن جی کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر فوقیت دیدی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ بریلویوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ہر جگہ موجود ہیں۔ دنیا کا کوئی مقام ایسا نہیں جہاں حضور حاضر و ناظر نہوں۔

اب ذرا سوچئے کہ جس گھر میں کرشن جی کی تصویر موجود ہو وہاں سے بیماریاں لحاظ داری میں آکر رخصت ہو جائیں اور جہاں حضور پر نور جلوہ افروز ہوں وہاں سے بیماریاں رخت سفر باندھنے کے لئے تیار نہوں۔ بیماریاں کرشن جی کا کیوں لحاظ کرتی ہیں اور آنحضور کا لحاظ کرنے کے لئے کیوں تیار نہیں ہوتیں؟

سیدھا سا جواب یہ ہوگا کہ بیماریوں کے نزدیک کرشن جی قابل لحاظ ہیں اور آنحضور قابل لحاظ نہیں ہیں۔ اگر آنحضور بھی لحاظ کے قابل نہیں تو بیماریاں ان کی موجودگی میں کہیں آنے کی جسارت کیوں کرتی ہیں۔

دیوبندی ذہن کے لوگوں کو اس موضوع پر کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس قسم کے واقعات پر پل بھر کے لئے بھی یقین نہیں کر سکتے — دیوبندی نہ آنحضور کو حاضر و ناظر تصور کرتے ہیں اور نہ کرشن جی کو اتنا علیا سمجھتے ہیں کہ جہاں ان کی تصویر ہوگی وہاں آفتیں آنے کی جرأت نہیں کر سکتیں

ہماری ایک بھول

سوال[۴] :- از :- نظام الدین صاحب۔ رائچور۔

ماہ ستمبر کے شمارہ میں کھرے کھوٹے میں دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے والا کتابچہ "مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں" پر آپ کا تبصرہ دیکھنے میں آیا۔ مگر تعجب ہے کہ آپ نے کتابچہ کے نام پر کوئی توجہ نہیں دی۔ کیا آپ دارالعلوم کو "حرم پاک" کے مانند تصور کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ قریبی اشاعت میں آپ اس پر روشنی ڈالیں گے۔

الجواب[۴] :-

آجکل پوری امت مسلمہ مبالغہ آمیزی اور غلو پرستی کا شکار ہے۔ اعتدال پسندی اور صداقت پرستی کی باتیں تو افسانہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ آجکل عقیدت بھی اپنے آخری درجہ تک پہنچے بغیر نہیں رہتی۔ اور بغض بھی۔ ہر شخص انتہاپسندی اور افراط و تفریط کا شکار ہے۔ آج ہم کسی کے دشمن ہو جائیں تو اسے کافر بنائے بغیر سکون کی نیند نہیں سو سکیں گے اور اگر ہمیں کسی سے عقیدت ہو جائے تو اسے خدا ثابت کئے بغیر ہماری روٹی ہضم نہیں ہوگی۔

اس زمانہ میں کسی سے اس بات کی توقع رکھنا فضول ہی ہوگا کہ وہ افراط و تفریط سے دامن بچاتے ہوئے اعتدال پسندی کا مظاہرہ کرے۔ ستمبر کے شمارہ میں جس کتابچہ پر ہم نے تبصرہ کیا تھا وہ کتابچہ چند ایسے طلباء نے مرتب کیا تھا جو دارالعلوم دیوبند میں داخل تعلیم تھے۔ طلباء بہت زیادہ سنجیدہ اور بہت زیادہ محتاط تو نہیں ہوتے کہ ہم ان سے یہ توقع وابستہ کرکے بیٹھ جائیں کہ وہ کسی معاملہ میں احتیاط اور سنجیدگی سے کام لیں گے۔ پھر وہ طلباء جو اساتذہ اور منتظمین مدرسہ کو خوش کرنے کے لئے کوئی کتابچہ ترتیب دے رہے ہوں، ان طلباء سے اس بات کی توقع کرنا حماقت ہی ہوگا کہ وہ مبالغہ آمیزی کے جنگل میں بھٹکے بغیر اپنے موضوع کو مکمل کرلیں گے۔

دارالعلوم دیوبند ہمارے نزدیک ایک مقدس اور قابل احترام ادارہ ہے۔ اس لئے نہیں کہ ہم دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہیں۔ ہم نے اس کے فرش پر بیٹھ کر علم کی انمول دولت حاصل کی ہے۔ اسی کے طفیل سے ہم قلم چلانے کے قابل ہوئے ہیں، بلکہ ہم اسے مقدس اس لئے سمجھتے ہیں کہ اسے مقدس و محترم نہ سمجھنا علم و معرفت کی بھی توہین ہے اور لفظ تقدس کی بھی۔ ہم نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم نہ پائی ہوتی اور دارالعلوم کا ہم پر کوئی احسان نہ ہوتا تو بھی دارالعلوم کے گن گائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ کتنے ہی لوگوں نے دارالعلوم کی شکل تک نہیں دیکھی لیکن وہ اس کی بے لوث اور بے نظیر خدمات کو دیکھتے ہوئے اس کی تعریف و توصیف کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ ادارہ واقعتاً تعریف کے قابل بھی ہے اور لائق صد احترام بھی۔ لیکن کسی ادارہ کو مکرم سمجھنے کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آدمی اس کی توصیف و تعریف کے وقت حد اعتدال سے متجاوز ہوجائے۔ اور مبالغہ آمیزی کی اس منزل پر پہنچ جائے جس منزل پر پہنچنے کے بعد دنیا تعریف کرنے والے کو انتہاء پسند کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

آپ کے توجہ دلانے سے ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ ستمبر کے شمارہ میں ایک کتابچہ پر تبصرہ کرتے وقت ہماری عقل بھٹک گئی تھی۔ عقل و ہوش کی موجودگی میں یہ بات ممکن نہیں تھی کہ ہم اس کتابچہ کے نام پر کوئی اعتراض نہ کرتے۔ دارالعلوم کتنا ہی مقدس و محترم کیوں نہ ہو لیکن ظاہر ہے کہ وہ حرم پاک کے مثل نہیں ہو سکتا۔ کتابچہ کا نام تجویز کرنے والوں کی غلطی تو ہے ہی مسلم۔ لیکن بھول ہم سے بھی ہوئی کہ ہم نے اس نام پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ کتابچہ کے خالقین اپنی غلطی تسلیم کریں یا نہ کریں ہم اپنی بھول پر نادم ہیں اور آپ سے معافی کے طلبگار ہیں۔ حق تعالیٰ ہمیں غلو پرستی کے شجر ممنوعہ سے دور رکھے اور اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم غلو پرستی کی کبھی ادنیٰ تائید بھی نہ کریں۔

ولد الزنا کا مسئلہ

سوال: - از:- سلطان احمد۔ گھرنی بستی (آسام)

ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ ولد الزنا کے پیچھے نماز نہیں ہوگی۔ کیا مولوی صاحب ٹھیک فرماتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اولاد بیچاری کا اس میں کیا قصور ہے۔ گناہ تو ماں باپ کرتے ہیں۔

الجواب: -

نماز نہ ہونے والی بات تو بالکل غلط ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر ولد الزنا کے علاوہ کوئی دوسرا شخص امام بننے کی اہلیت رکھتا ہو تو اسی کو ترجیح دی جائے گی اور ولد الزنا کو امام بنانے سے احتراز کیا جائے گا۔ لیکن اگر موجودین میں کوئی بھی شخص عالم اور قرآن کا صحیح پڑھنے والا نہ ہو تو پھر اسی ولد الزنا کو امام بنانا ضروری ہوگا جو ولد الزنا ہونے کے ساتھ ساتھ عالم اور قاری بھی ہے ولد الزنا کے پیچھے نماز اس صورت میں بھی ہو جائے گی جب اس کے علاوہ کوئی اور شخص امامت کا اہل موجود ہو۔ البتہ یہ بات احتیاط کے خلاف ہوگی کہ کسی عالم اور قاری کی موجودگی میں ولد الزنا کو امامت کے لئے آگے بڑھا دیا جائے۔

اسے ایک سیدھی سادی سی مثال سے سمجھ لیجئے:-

آپ کی لڑکی جوان ہو جاتی ہے، آپ کے پاس دو رشتے آتے ہیں۔ لڑکے دونوں اچھے ہوتے ہیں لیکن ایک ان میں سے نابینا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ نابینا کو نظر انداز کر دیں گے۔ حالانکہ کسی کے اندھے ہونے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ آپ اندھے لڑکے کو صرف اس صورت میں اپنا داماد بنا سکتے ہیں جب آپ کو دوسرا رشتہ ملنے کی توقع نہ ہو۔

آپ اپنی لڑکی کسی اندھے کے حوالے نہیں کر سکتے۔ کسی ولد الزنا کو بھی نہیں سونپ سکتے۔ دوسرا اچھا رشتہ ہوتے ہوئے۔ تو پھر سوچئے اگر کوئی مولوی یا عالم یہ کہے کہ اندھے اور ولد الزنا کے علاوہ اگر کوئی دوسرا آدمی عالم و قاری موجود ہو تو اسی کو فوقیت دی جائے گی اور اندھے اور ولد الزنا کو امام بنانے سے گریز کیا جائے تو اس میں کیا قباحت ہے اور کیا قابل اعتراض بات ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے ولد الزنا کو ذلیل گمراہ نہیں کیا اور نہ ہی ولد الزنا کو کسی سزا کا مستحق گردانا گیا ہے۔ سزا تو اس کے ماں باپ کو ہی ملتی ہے اور ان ہی کو ملنی چاہئے لیکن وہ اپنے ماں باپ کی سزا سے متأثر ہو یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم جس دنیا میں زندگی گذار رہے ہیں اس میں جب کسی آدمی کو سزا دی جاتی ہے تو اس کے متعلقین اس سزا کا اثر قبول کرنے پر فطری طور پر مجبور ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر میں قتل کرتا ہوں اور قتل کی پاداش میں مجھے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میری موت سے میرے بیوی بچے ضرور متأثر ہوں گے۔ بیوی بیوہ ہوگی اور بچوں کو یتیمی کا داغ برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر کوئی یہ صورت حال دیکھ کر چیخ اٹھے اور عدالت میں جا کر میرے بیوی بچوں کی حمایت کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ اجی حسن کو تو چاہے سزا دے لو لیکن اس کی بیوی کو بیوہ اور اس کے بچوں کو یتیم نہ کرو ان کا کیا قصور تھا۔ تو ایسے شخص کو احمق ہی کہا جائے گا یا رعایتاً سادہ لوح۔

میں آپ کو احمق کہوں گا نہ سادہ لوح۔ لیکن یہ کہنے کی گستاخی ضرور کروں گا کہ آپ نے غور و فکر کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ آپ یہ جملہ زبان سے نہیں نکال سکتے تھے کہ اولاد کا کیا قصور اسے کیوں ذلیل سمجھا جائے۔ اسے کیوں سزا دی جائے۔

حیرت بجائے خود حیرتناک

سوال :- از:- شاہین تسنیم ——— واٹم باڑی (ٹمل ناڈو)

مؤرخہ ۱۲ر نومبر ۸۲ء کی اشاعت میں الجمعیۃ نے ایک اشتہار برائے خواتین یوں شائع کیا ہے:-

"خواتین کے کھیلوں کا قومی فیسٹیول" ——

جسمانی ورزش اور دیگر کھیل کود کا شاندار مقابلہ

داخلہ مفت

کیا الجمعیۃ جیسے دینی پرچے کے لئے ایسا اخلاق سوز اشتہار شائع کرنا جائز ہے؟ اگر دینی جماعتوں کے ترجمان ایسی مثال پیش کرنا شروع کر دیں تو دیگر پرچے کیا اپنے لئے جواز نہیں نکال لیں گے۔ براہ کرم قریب ترین شمارہ میں جواب شائع فرما دیں۔ میں منتظر رہوں گی۔

الجواب :-

یہ بات اتنی حیرتناک نہیں ہے کہ الجمعیۃ نے ایک نامناسب اشتہار شائع کر کے کھلی بے حیائی کا مظاہرہ کیا ہے جتنی حیرتناک بات یہ ہے کہ آپ جمعیۃ العلماء کو دینی جماعت اور اس کے آرگن کو دینی آرگن تصور کرتی ہیں۔

موجودہ جمعیۃ العلماء پر جن لوگوں کا قبضہ ہے وہ لوگ چند لقموں کی خاطر جدوجہد کرنے کے عادی ہیں۔ ان کے نزدیک اصل چیز پیٹ ہے اور یہ لوگ پیٹ کے جملہ مسائل حل کرنے کے لئے سیاست کے غلام اور ارباب اقتدار کے پیچھے بنے ہوئے ہیں۔ مذہب ان کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جمعیۃ العلماء کا ماضی بعید بے حد شاندار اور تابناک رہا ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہونا چاہئے کہ ماضی قریب میں اس نے جن بدنما اور شرمناک سفاک حرکتوں کا مظاہرہ کیا ہے اس کی توقع کسی [illegible]

نہیں کی جاسکتی جو دین کا شعور اور خوف آخرت رکھنے والے افراد پر مشتمل ہو۔

حال میں وہ جن خرابیوں کا شکار ہے ان خرابیوں میں مسلمانوں کی کوئی دوسری جماعت مبتلا نہیں اور جس گندی سیاست کو اس نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اسلام اس گندی سیاست پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہے ایسی ناکارہ جماعت کو دینی جماعت تصور کرنا کسی کے نزدیک قابل حیرت ہو یا نہ ہو ہمارے نزدیک قابل حیرت ضرور ہے۔

جمعیۃ العلماء کرتا دھرتا لوگوں کو کسی قسم کی کوئی نصیحت کرنا تو فضول ہی ہوگا۔ وہ تو قطعی طور پر چکنے گھڑے بنکر رہ گئے ہیں۔ بزرگوں نے انھیں نصیحتیں کیں، ہم تینوں نے ٹوکا۔ وقت نے طمانچے مارے لیکن انھوں نے اپنے کرتوت پر نظرثانی کرنے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کی۔ بگڑے ہوئے شہزادے ہماری نصیحت پر بھلا کیسے کان دھرلیں گے انھیں تو ان کے حال پر چھوڑیے۔ نصیحت تو ہمیں آپ کو کرنی ہے کہ گندی سیاست اور دین کے اندر فرق کیجئے کسی بھی سیاسی جماعت کو دینی جماعت کہنے سے احتراز کیجئے۔ نہ آپ سیاسی جماعتوں کو دینی جماعت گمان کریں گی اور نہ ہی آپ کو سیاسی جماعتوں کی بدعنوانیوں پر حیرانی ہوگی۔

اب رہی دوسرے پرچوں کے لئے جواز والی بات تو دوسرے پرچوں کے لئے تو جواز اس وقت نکل سکتا ہے جب جمعیۃ العلماء واقعتًا دین اسلام کا معیار تسلیم کرلی جاتی اور اس بات پر وقت کے علماء نے تائیدی دستخط کردیئے ہوتے کہ جمعیۃ العلماء کا ہر عمل حجت اور کسوٹی ہے وہ اپنے آرگن میں اگر فحش تصویریں شائع کرے گی تو تمام دینی اور سیاسی پرچوں کے لئے فحش تصویریں شائع کرنا جائز ہوگا الجمعیۃ چونکہ کوئی معیار نہیں ہے۔ لہٰذا محض اس میں گندے اشتہار چھپ جانے کی وجہ سے گندے اشتہاروں کی مخالفت ختم نہیں ہوسکتی اور دوسرے پرچوں کے لئے گندے اشتہار شائع کرنے کا کوئی جواز نہیں نکل سکتا۔

اہل حدیث کا تشدد

سوال:۔ از:۔ فضل واحد صاحب بمبئی۔

بمبئی میں ایک گروہ اہل حدیث کا ایسا ہے جو دیگر مسلک کے مسلمانوں کو خارج از اسلام سمجھتا ہے۔ کیا سارے اہل حدیث حضرات کا بھی یہی موقف ہے۔ براہ کرم اہل حدیث فرقہ کی تاریخ پر روشنی ڈالئے کہ یہ فرقہ کب وجود میں آیا اور اس کے بانی مبانی کون تھے۔ مزید کہ کیا سعودی عرب والے بھی اسی فرقہ سے منسلک ہیں؟۔

الجواب:۔

اہل حدیث دوسرے مسلک کے مسلمانوں کو ناکارہ تو ضرور سمجھتے ہیں۔ ناکارہ نہ سمجھتے تو ان کی مسجدیں اور عیدگاہیں الگ تھلگ نہ ہوتیں۔ دوسرے مسلمانوں کی صف میں کھڑے ہوکر انھیں نماز پڑھنا گوارہ نہیں اور یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو گمراہ اور ناکارہ گمان کرتے ہیں۔ لیکن یہ انوکھی بات ہمیں پہلی بار سننے کو ملی کہ ان میں کسی ایسے گروہ نے بھی جنم لیا ہے جو اپنے سوا تمام مسلمانوں کو خارج از اسلام تصور کرتا ہے۔ ضرور سمجھتا ہوگا کوئی بعید نہیں۔ اس لئے کہ جب پرانے اہل حدیث کا یہ عالم ہے کہ تشدد، ہٹ دھرمی اور طعنا طعنی ان کے مخصوص اوصاف ہیں تو نئے اہل حدیث اگر ان لوگوں سے دو قدم اور آگے بڑھ جائیں اور ان میں سے کسی ایک وصف خاص کا اضافہ ہوجائے تو کوئی حیرت ناک بات نہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں جو سارے مسلمانوں کو خارج از اسلام خیال کرتے ہوں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی عقلوں پر زنگ لگا ہوا ہے اور جن کی عقلیں زنگ آلود ہوں انھیں پاگل کہیے احمق کہیے، خبطی کہیے یا کچھ اور کہیے لیکن ہوشمند انھیں نہیں کہا جاسکتا۔ اور جن لوگوں کا شمار ہوش مندوں میں نہ ہو ان کی کسی حرکت اور کسی بات کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ جو کچھ کہیں

کہیں اسے دیہانے کی بڑ سمجھئے۔ آپ سے یہ کس نے کہا، یا کہ سعودی عرب کے لوگ بھی اہل حدیث ہیں۔ عرب میں تو عام طور پر شافعی مسلک رائج ہے۔ شوافع اور اہل حدیث میں فرق ہے۔ شوافع تو انھیں کہتے ہیں جو امام شافعی کی تقلید کریں۔ جبکہ اہل حدیث عام اصطلاح میں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کسی کی تقلید نہ کرنے کے قائل ہوں اور خاص اصطلاح میں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اماموں کی تقلید سے تو دامن بچاتے ہوں لیکن ایرے غیروں کی تقلید کرنا جن کا شیوہ ہو۔

اہل حدیث سے چونکہ ہمیں کوئی دلچسپی نہیں رہی لہذا ہم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ انھوں نے اس دنیائے ظاہر میں کب ہاتھ پاؤں نکالے۔ اگر یہ دریافت کرنا بہت ضروری ہو کہ ان کی تولید کب ہوئی تو کہیں اور سے رجوع کیجئے۔ ہم اس پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں۔

زید کے بارے میں ایک سوال

سوال ۸ :- از سید زاحار کرمانی۔ سہ پور۔

زید مسلمان ہے۔ نماز پڑھنا اس کا معمول ہے لیکن جب کوئی مسلم نوجوان قرآن پڑھانے یا سمجھانے یا سکھانے کے لئے آئے تو اسے مسجد سے نکال دیتا ہے اور جب تک نہ نکالے چین اور آرام سے نہیں بیٹھے گا۔ زید کے ساتھ مسلم نوجوان کا کیا برتاؤ ہونا چاہئے۔ جب کہ مسجد کے صدر اوقاف سے بھی نوجوان نے قرآن سکھانے کی اجازت لے لی ہو۔

الجواب ۸ :-

زید اگر تبلیغی جماعت سے متعلق ہے تو اسے معذور سمجھئے، اس لئے کہ تبلیغی جماعت والوں کے نزدیک تبلیغی نصاب کے علاوہ کسی اور چیز کی اشاعت مناسب نہیں ہے خواہ وہ قرآن ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر زید تبلیغی جماعت سے وابستہ نہیں تو یہ دیکھئے کہ اس کے اس رویہ کی وجہ کیا ہے اگر وجہ معقول ہو تو اس کی بات مانی جائے اور اس پر طنز و تعریض سے پتھر اچھالنے سے گریز کیا جائے۔ مثلاً وہ مسجد میں قرآن وغیرہ کی تعلیم اس لئے مبغوض سمجھتا ہو کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کو فرض نماز پڑھنے کی جگہ قرار دیا ہے اور نفلوں کے بارے میں بھی یہ گذارش کی ہے کہ وہ بالعموم اپنے گھر میں ادا کی جائیں۔ اور مسجد میں صرف فرض پڑھنے کے ارادے سے آیا جائے۔ تو زید کی بات نہ صرف قابل تسلیم ہونی چاہئے بلکہ قابل قدر اور قابل تعظیم بھی ہونی چاہئے۔ لیکن زید کے اس رویہ کی وجہ اگر نامعقول ہو اور اس کا منشا معیوب اور مذموم ہو تو زید کی باتوں کو دیوار پر دے ماریئے۔ مثلاً کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ زید کو قرآن حکیم ہی سے کد اور بیر ہے تو اسے کافر سمجھنے میں کسی کو کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے خواہ وہ دیکھنے میں مسلمان ہی کیوں نہ محسوس ہوتا ہو۔

آدھا تیتر آدھا بٹیر

سوال ۹ :- (ایضاً)

زید مسلمان ہے لیکن مسلم آستانوں کے علاوہ غیر مسلم بھائیوں کے آستانوں کا طواف کبھی ٹیکہ لگا کر کر لیتے ہیں۔ اور "جے ماتا" بھی دہراتے ہیں۔ زید کے متعلق مفتیان کرام کیا فرماتے ہیں۔ کیا وہ دائرۂ اسلام ہی میں ہیں ؟

الجواب ۹ :-

مفتیان کرام تو معلوم نہیں کیا فرمائیں گے۔ البتہ ناچیز یہ عرض کرتا ہے کہ زید کو آدھا تیتر آدھا بٹیر ہی کہنا درست ہوگا زید ہی جیسے لوگوں کے بارے میں قرآن حکیم کا یہ ارشاد ہے کہ مذبذبین بین ذالك لا الی هؤلاء ولا الی هؤلاء

"تذبذب میں مبتلا ہیں نہ ادھر کے نہ ادھر کے"

ایسے لوگوں کو محاورے کی زبان میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔

سوال ۱۰ :- (ایضاً)

زید مر جاتا ہے۔ زید اگر گناہگار ہے تو گناہوں کا بدلہ جہنم کی آگ سے دیا جائے گا۔ کیا یہ بدلہ روح کو دیا جائیگا یا جسم کو؟ روح تو پاک چیز ہے۔ پاک چیز داخل جنت ہونی چاہئے۔ اگر جسم کو بدلہ ملے گا تو ٹھیک بات ہے۔ وہ بہر حال خاک ہی ہے۔

الجواب:۔

آپ نے روح کے بارے میں یہ دو ٹوک فیصلہ کیسے کر دیا کہ وہ بہر حال پاک ہے۔ روح پاک بھی ہو سکتی ہے اور ناپاک بھی۔ پاکباز آدمی کی روح پاک ہوتی ہے اور گناہگار آدمی کی روح ناپاک ہوتی ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ بدکار اور فاسق و فاجر لوگوں کی جب روح خارج ہوتی ہے تو روح کے ساتھ ایک تعفن بھی نکلتا ہے اور اس تعفن کو لوگ محسوس کر لیتے ہیں۔ یہ تعفن اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ روح انتہائی غلیظ ہے، بدبودار ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ گناہگار لوگوں کے جسموں میں جب روح ہوتی ہے تو اسوقت خود انھیں اس کی بدبو کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔ تو آپ کی اس بات کا سیدھا سا جواب یہ ہوگا کہ غلاظت ہم سب کے پیٹوں میں بھری ہوئی ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جسکا پیٹ غلاظت اور فضلات کی گندگی سے پُر نہ ہو لیکن ہم میں سے کون ایسا شخص ہے جو پیٹ کے اندر بھری ہوئی غلاظت کو محسوس کر لیتا ہو، ہاں جب یہ غلاظت پیٹ سے خارج ہوتی ہے تو لامحالہ ہمیں بدبو کا احساس ہوتا ہے۔ اندازہ یہ ہوا کہ گندی چیز اپنے مخرج کو جب چھوڑتی ہے تو تعفن اسی وقت پھیلتا ہے اس سے پہلے نہیں۔ روح جب تک اندر ہے تعفن کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن جب بھی روح خارج ہوتی ہے تو اس کے ساتھ بدبو بھی ضرور خارج ہوگی اگر چہ روح واقعتاً بدبودار ہو اور ناپاک ہو۔ ناپاک روحوں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا اور پاک روحوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔ یہی حدیث و قرآن سے ثابت ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جزا و سزا کا معاملہ روحوں کے ساتھ کیا جائے نہ کہ جسموں کے ساتھ۔

اسے ایک مثال سے سمجھ لیجئے۔ زید گھوڑے پر سوار ہو کر آتا ہے اور بعض لوگوں کا قتل عام کرنا شروع کر دیتا ہے یہی زید پھر دوسرے وقت میں گھوڑے پر سوار ہو کر آتا ہے اور بعض محتاجوں کی مدد کر کے چلا جاتا ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ زید کو قاتل اور مددگار کہنا درست ہوگا یا گھوڑے کو۔ ظاہر ہے کہ آپ گھوڑے کو قاتل اور مددگار نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے گھوڑا تو صرف ایک سواری کی حیثیت رکھتا تھا قاتل اور مددگار تو وہ سوار تھا جو گھوڑے کی پیٹھ پر مسلط تھا اور اسی کو برا بھلا کہنا اور انعام و سزا سے نوازنا درست ہو سکتا ہے نہ کہ گھوڑے کو۔

جسم کی مثال تو فقط ایک سواری کی سی ہے جس پر سوار ہو کر روح دنیا میں آتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ جسم اصل کی حیثیت رکھتا ہے روح نہیں، سزا جسم کو ملنی چاہئے، روح کو نہیں تو اس کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جو یہ کہہ رہا ہو کہ انعام واکرام اور عذاب و عتاب کا مستحق تو گھوڑا ہے نہ کہ زید۔

عُشر کا مسئلہ

سوال:۔ از:۔ محمد رستم صاحب۔ مالک ہوٹل سرکنڈہ

بعض لوگ عشر نہیں نکالتے اور کچھ کا خیال ہے کہ غلّہ کے علاوہ گنّا۔ مونگ پھلی۔ کپاس۔ مرچ وغیرہ میں عشر نہیں ہے۔ کچھ لوگ پیداوار میں ڈھائی فیصد نکالتے کے عادی ہیں جب کہ اس میں عشر دسواں حصّہ نکالنا چاہئے۔

مثلاً فرض کیجئے کہ ایک کوئنٹل کپاس کی قیمت تین سو روپے ہیں۔ عشر تیس روپے دینا چاہئے۔ لیکن وہ حساب سے ساڑھے سات روپے دیتے ہیں۔

الجواب:۔

عشر سلسلۂ زکوٰۃ کا ایک اہم ترین جز ہے۔ جو لوگ عشر کو ضروری نہیں سمجھتے ان کا شمار ان لوگوں میں کرنا درست ہوگا جو اس کی ادائیگی کو ضروری تصور نہ کرتے ہوں۔

جو چیزیں خود بخود اُگ آتی ہیں جیسے خود رو گھاس وغیرہ

ان میں واقعتاً عشر نہیں ہے لیکن ایسی تمام چیزوں میں سے عشر نکالا جائے گا جو باقاعدہ بوئی جائیں اور عام طور پر باقاعدہ جن کی کاشت کی جاتی ہو۔ عشر صرف غلّہ میں سے نکالنا ضروری نہیں بلکہ زمین کی تمام پیداوار میں سے عشر نکالنا ضروری ہوگا۔ خواہ وہ غلّہ کی جنس سے ہو، پھلوں کی جنس سے ہو یا سبزی وغیرہ کی جنس سے تعلق رکھتی ہو۔ عشر کے بارے میں یہ تھوڑی سی تفصیل گوش گزار کر لیجیے کہ جو کھیتیاں بارش کے پانی سے پروان چڑھتی ہیں ان میں دسواں حصہ نکالنا ضروری ہوگا — اور جو کھیتیاں ایسے پانی سے پروان چڑھی ہوں جو پانی قیمتاً خریدا گیا ہو تو ایسے کھیتوں میں سے بیسواں حصہ نکالنا کافی ہوگا۔

ڈھائی فیصد کا حساب ہماری سمجھ میں نہیں آیا اگر وہ تین سو روپوں میں سے پندرہ روپے نکالتے تو ہم اسے اس بات پر محمول کر لیتے کہ ان کی کھیتیاں خریدے ہوئے پانی سے پروان چڑھی ہوں گی اس لئے انھوں نے بیسواں حصّہ نکالنے پر اکتفا کر لیا ہے۔ لیکن تین سو روپوں میں سے ساڑھے سات روپے نکالنے کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ براہِ راست ان ہی لوگوں سے دریافت کریں کہ ڈھائی فیصد یعنی چالیسواں حصّہ وہ کس بنیاد پر نکالتے ہیں غالبًا انھوں نے عشر کو بھی زکوٰۃ پر قیاس کر رکھا ہے اسی لئے وہ زکوٰۃ کی طرح چالیسواں حصہ نکالنے پر مکتفی ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو بلاشبہ وہ جہالت کے اندر مبتلا ہیں۔

نفلی صدقہ کا گوشت کھانا جائز ہے

سوال[۱۲] :- (ایضًا)

ایک شخص بیمار تھا۔ صحت یابی کے بعد اس نے شکرانہ کے طور پر ایک جانور ذبح کیا جس کا گوشت نہ خود کھایا نہ قریبی رشتہ داروں کو کھلایا، اس بنا پر کہ وہ صدقہ ہے۔ کیا اس نے یہ صحیح کیا؟

الجواب[۱۲] :-

شکرانے کے طور پر جانور ذبح کیا جاتا ہے، اس کا گوشت کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں اور نہ ہی رشتہ داروں کو کھلانے میں کوئی مضائقہ ہے۔ ایسا گوشت اگر مالداروں میں بھی تقسیم کر دیا جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

اس لئے کہ یہ نفلی صدقہ میں شمار ہوتا ہے اور نفلی صدقہ میں سے خود کھا لینا بھی جائز ہے اور غیر مستحق حضرات کو کھلا دینا بھی جائز ہے۔ انتہا یہ ہے کہ نفلی صدقہ کا گوشت غیر مسلم لوگوں کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ جن صاحب نے نفلی صدقہ کا گوشت کھانے سے خود بھی احتراز کیا اور رشتہ داروں کو بھی محروم رکھا انھیں سادہ لوح متقی کے ماسوا کیا کہا جائے۔

وہ جوابات جنکے سوالات حذف کر دیئے گئے

عشری زمین کی تعریف اور عشر کا نصاب

عصمت پور کے عبدالغفور صاحب مخاطب ہوں۔

عشر کی ادائیگی اسی طرح ضروری ہے جس طرح زکوٰۃ کی ادائیگی فرض اور لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بات سے بھی آپ بےخبر نہیں ہوں گے کہ عشر کا وجوب قرآن حکیم سے ثابت ہے، لہٰذا عشر کے ضروری ہونے پر تو کلام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ عشری زمین کہتے کسے ہیں اور عشر کا کوئی نصاب مقرر ہے یا نہیں اس بارے میں مختصر انداز میں چند گذارشیں کی جا رہی ہیں۔

جہاں تک عشر کی فرضیت کا سوال ہے تو وہ اسی طرح مسلم ہے جس طرح نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت مسلم اور اٹل ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ عشر اور زکوٰۃ میں صرف فرضیت کے اعتبار سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ باقی دوسری چیزوں میں عشر کے احکامات زکوٰۃ سے جدا ہیں۔ زکوٰۃ اس وقت تک فرض نہیں ہوتی جب تک یہ چند شرطیں نہ پائی جائیں۔ نصاب کا مکمل ہونا، حولانِ حول کی تکمیل اور قرض وغیرہ سے بری ہونا۔ نصاب مکمل نہ ہو تو زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔ مثلاً ایک شخص کے پاس

ساڑھے چھ تولہ سونا ہے لیکن چاندی رتی کے برابر بھی موجود نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہو سکتی ہے اس لئے کہ ساڑھے سات تولہ سونے پر زکوٰۃ فرض ہے، اس سے کم پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ ہاں اگر ساڑھے چھ تولہ سونے کے ساتھ دو چار ماشہ یا دو چار رتی چاندی بھی موجود ہے تو پھر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی۔ خالی سونے پر اس وقت تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی جب تک وہ ساڑھے سات تولہ کی مقدار کو نہ پہونچ جائے۔ بہرحال نصاب کا مکمل ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ کسی طرح ہو۔ علیٰ ہذا القیاس۔

حولان حول کا مطلب تو آپ سمجھتے ہی ہوں گے یعنی کہ ایک سال کا مکمل ہو جانا۔ سال جب تک پورا نہیں ہو جائے گا زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک شخص کی ملکیت میں یکم جنوری سنہ ۷۶ء کو ساڑھے سات تولہ سونا آیا اور یہ سونا کامل ایک سال تک اسی کی ملکیت میں رہا تو اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی۔ یکم جنوری سنہ ۷۷ء کو زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہوگا۔ یکم جنوری سنہ ۷۷ء سے قبل نہ زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت ہے۔

مقروض پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی اگرچہ وہ نصاب کا مالک ہو اور اگرچہ نصاب کا مالک بنے ہوئے اسے کامل ایک سال کا عرصہ ہو گیا ہو۔

مثلاً ایک شخص کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا ہے۔ یہ سونا ایک سال تک اس کی ملک میں رہا لیکن وہ ایک ہزار کا مقروض بھی ہے۔ اگر ایک ہزار روپیہ وہ اپنے قرض میں دے دیتا ہے تو ظاہر ہے پھر نصاب مکمل نہیں رہ سکتا۔ لہذا اس پر زکوٰۃ بھی فرض نہیں رہے گی۔ زکوٰۃ ادا کرنے سے پہلے یہ ضروری ہوگا کہ قرض ادا کیا جائے۔ اگر قرض ادا کرنے کے بعد نصاب مکمل رہتا ہے تو زکوٰۃ دی جائے گی ورنہ نہیں۔ زکوٰۃ کے لئے کچھ اور شرطیں بھی ہیں۔ مثلاً بالغ ہونا، عاقل ہونا وغیرہ۔

عشر کے لئے ان شرائط میں سے کوئی شرط نہیں ہے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عشر کا کوئی نصاب مقرر نہیں

دس سیر غلہ میں بھی عشر واجب ہوگا اور اس سے کم میں بھی۔ البتہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک عشر کا نصاب متعین ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ پانچ وسق سے کم میں عشر واجب نہیں۔ پانچ وسق ہندوستانی تول کے اعتبار سے اٹھارہ من تیس سیر کے برابر ہوتے ہیں۔ گویا کہ ۱۸ من تیس سیر سے کم غلہ وغیرہ پر عشر واجب نہیں۔

یہی رائے امام شافعیؒ کی بھی ہے اور یہی رائے اور یہی مسلک امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا بھی ہے۔ اب ہماری رائے اس سلسلہ میں یہ ہے کہ چونکہ بعض احناف (امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ وغیرہ) پانچ اوسق سے کم غلہ پر عشر نکالنے کے قائل نہیں۔ لہذا اگر پانچ اوسق سے کم پیداوار پر عشر نکالنے کو ضروری نہ سمجھا جائے تو کوئی گناہ کی بات نہیں۔ لیکن چونکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عشر کا کوئی نصاب متعین نہیں۔ قلیل سے قلیل پیداوار پر عشر واجب ہے۔ لہذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ پانچ وسق سے کم پیداوار پر بھی عشر ادا کر دیا جائے۔

عشر کے لئے حولان حول کی شرط نہیں۔ غلہ کٹتے ہی عشر واجب ہو جاتا ہے۔ سال میں اگر دو فصلیں پیدا ہوتی ہیں تو دونوں ہی کا عشر ادا کرنا پڑے گا۔ چار فصلیں پیدا ہوتی ہیں تو چاروں کا ادا کرنا پڑے گا۔ مقروض آدمی کے لئے بھی عشر ادا کرنا ضروری ہے۔ نابالغ اور مجنون کی پیداوار میں سے بھی عشر نکالنا ضروری ہوگا۔ حالانکہ فرضیت زکوٰۃ فرض نہیں نابالغ پر نہیں، مجنون پر نہیں۔ عشر کے لئے زمین کا مالک ہونا بھی ضروری نہیں۔ وقف اور کرایہ کی زمین پر بھی عشر واجب ہے۔ وغیرہ۔

اب آیئے اس موضوع پر بھی کچھ گفتگو کی جائے کہ فقہ حنفی میں عشری زمین کا اطلاق کس زمین پر ہوتا ہے ——— یہ سمجھئے کہ زید کے پاس ایک زمین ہے۔ یہ زمین زید کی خود ساختہ تو نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے پاس کہیں نہ کہیں سے آئی ہوگی۔ زید کے پاس آنے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ یہ زمین زید کو وراثت میں ملی۔ دوسری

صورت یہ ہے کہ زید نے خود خریدی ہے اور جس شخص سے خریدی ہے وہ مسلمان تھا۔ اور بیچنے والے مسلمان نے یہ زمین جس شخص سے خریدی تھی وہ بھی مسلمان ہی تھا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زید ایک ایسے شہر یا ایسے ملک کا باشندہ تھا جہاں کے رہنے والے تقریباً سبھی کافر تھے اور زید خود بھی کافر تھا۔ لیکن پھر یہ ہوا کہ اس شہر یا ملک کے رہنے والے سب اپنی مرضی سے مسلمان ہوگئے۔ زید بھی مسلمان ہوگیا۔ اور زید حالت کفر میں جس زمین کا مالک تھا، حالتِ اسلام میں بھی اس کا مالک رہا۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کسی غیر مسلم ملک کو فتح کیا اور اس ملک کی تمام زمینوں پر قبضہ کرلیا پھر امام المسلمین نے ان زمینوں کو اپنے لشکر پر تقسیم کر دیا۔ زید بھی اس لشکر کا ایک فرد تھا۔ لہذا زید کے حصہ میں بھی کچھ زمین آئی۔ ان تمام صورتوں میں زید کی زمین عشری کہلائے گی اور اسے اپنی پیداوار میں سے عشر نکالنا ضروری ہوگا۔

خراجی زمین کے بارے میں چونکہ آپ نے کوئی بات دریافت نہیں کی، لہذا خراجی زمین کی تعریف کرنا اور اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا موجب طوالت ہوگا۔ ہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں حکومتِ وقت کو مال گذاری کی شکل میں جو محصول دیا جاتا ہے اس سے عشر ساقط نہیں ہوسکتا۔ عشر ایک عبادت کی حیثیت رکھتا ہے۔ عشر خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے جب کہ حکومت وقت کو محصول دیتے وقت خدا کی خوشنودی کا کوئی تصور دل میں موجود نہیں ہوتا اور نہ ہی حکومت وقت کو محصول دینے سے خدا کی رضا حاصل ہونے کا کوئی امکان ہے حکومت کی متعین کردہ کسی ڈیوٹی پر اپنا وقت خرچ کرنے سے اگر نماز ساقط نہیں ہوتی اور انکم ٹیکس، سیل ٹیکس اور الانے فلانے ٹیکسوں کی وجہ سے اگر زکوٰۃ ساقط نہیں ہوسکتی تو مال گذاری ادا کر دینے سے وہ عشر کیسے ساقط ہوسکتا ہے جو نماز و زکوٰۃ کی طرح ایک عبادت ہے۔

تھوڑا سا غور و فکر کرنے کے بعد یہ بات آپ کے سمجھ میں آجائے گی کہ زکوٰۃ اور عشر کا اصل منشاء اس کے سوا کچھ نہیں کہ غریب اور نادار مسلمانوں کی امداد ہو۔ حکومت کو ٹیکس وغیرہ دینے سے چونکہ یہ منشاء پورا نہیں ہوپاتا لہذا ٹیکس اور مالگذاری کی رقم ادا کرنے والے کو زکوٰۃ و عشر سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

آپ کے دوسرے سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ آجکل جگہ جگہ جو بیت المال قائم ہیں انھیں زکوٰۃ اور دوسرے صدقات واجبہ کی رقم دینے میں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن ان کے کارکنان پر عاملین کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ ان کی حیثیت سفیروں کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اور سفیر ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اسلامی اداروں کی طرف سے زکوٰۃ وغیرہ کی رقمیں لانے پر مامور ہوں۔ انھیں زکوٰۃ دینے سے بلاشبہ زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔ اس لئے کہ یہ اسلامی اداروں، یتیم خانوں اور بیت المال کے لئے چندہ کرتے پھرتے ہیں اپنی ذات کے لئے نہیں۔ لیکن چونکہ ان لوگوں پر عاملین علیہا کا اطلاق نہیں ہوسکتا لہذا زکوٰۃ کی رقم ان کے حوالہ کر دینا لازم کی حیثیت نہیں رکھتا۔ صرف جائز ہے۔

بہرحال موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا کوئی بیت المال ایسا نہیں ہے جسے زکوٰۃ کی رقم دینا ضروری ہو اور جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ زکوٰۃ اس ادارہ کو نہ دینا سرکشی ہے۔ معصیت ہے۔

یہ بات زکوٰۃ دینے والے کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کس ادارے کو زکوٰۃ دینا بہتر سمجھتا ہے اور کس ادارے پر بالکل اعتماد نہیں کرتا۔ کسی بھی ادارے کو زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ہاں زکوٰۃ کا پیسہ ادارے لے سکتے ہیں اور انھیں ان مقاصد میں کھپا سکتے ہیں جن مقاصد میں زکوٰۃ کی رقم لگانا جائز ہو۔ لینے اور وصول کرنے میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اس فرق کو ہر شخص محسوس کرسکتا ہے۔ آپ بھی محسوس کرسکتے ہیں۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔

مہر سے متعلق

چھولی کے عبدالمقتدر مخاطب ہوں

عورت کسی بھی وقت مہر معاف کرسکتی ہے. شوہر کی زندگی میں بھی اور اس کی موت کے بعد بھی. مہر عورت کا حق ہے اور اپنا حق کسی بھی وقت معاف کیا جا سکتا ہے. بہشتی زیور میں کہیں بھی یہ بات موجود نہیں کہ شوہر کی موت کے بعد عورت کو مہر معاف کرنے کا حق نہیں یا مہر معاف کرنا ٹھیک نہیں.

اگر عورت نے شوہر کی زندگی میں مہر معاف نہیں کیا تھا اور شوہر نے مرنے کے بعد ترکہ خاصی تعداد میں چھوڑا ہے تو عورت کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ اپنا حق وصول کر لے. لیکن اگر عورت اپنی خوشی سے مہر معاف کرنے پر مصر ہے تو اسے اس اقدام سے روکا نہیں جا سکتا نہ ہی اسے ملامت کریں گے. اگر شوہر غریب تھا اور اس نے مرنے کے بعد کوئی قابل تقسیم چیز نہیں چھوڑی تو پھر ایک شریف عورت کا فرض ہی یہ ہے کہ حق مہر معاف کر دے تاکہ قیامت کے میدان میں اس کا شوہر مقروض کی صف میں کھڑا نظر نہ آئے.

بیوی کا ترکہ

(ایضاً)

شوہر کسی بھی حالت میں محروم وراثت نہیں ہوگا. اولاد ہو یا نہ ہو. اگر اولاد ہے تو شوہر چوتھائی ترکہ کا وارث قرار پائے گا اور اگر اولاد نہیں ہے تو شوہر کو کل ترکہ کا نصف حصہ ملے گا. والدین ۱/۶ حصّے کے مالک ہوں گے.

مثال کے طور پر مرنے والی عورت نے ترکہ میں تیرہ سو روپے چھوڑے. وارثین میں شوہر، لڑکی، مرحومہ کی والدہ اور مرحومہ کا بھائی موجود ہے. سو روپے اس کی تدفین و تکفین میں خرچ ہو جاتے ہیں بقیہ بارہ سو روپے مذکورۂ بالا وارثوں میں اس طرح تقسیم کئے جائیں گے.

تین سو روپے (چوتھائی حصہ) شوہر کو ملیگا. چھ سو روپے (نصف حصہ) لڑکی کو ملے گا. دو سو روپے (چھٹا حصہ) والدہ کو ملیگا اور سو روپے (باقی ماندہ) بھائی کو دے دئیے جائیں گے.

بینک کے سود کا مسئلہ

(ایضاً)

بینک میں روپیہ جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں البتہ بینک جو سود دیتا ہے اسے اپنی ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے. بینک سے سود کی رقم تو ضرور لے لینی چاہئے لیکن اسے اپنے اوپر خرچ کرنے کی بجائے بلا نیت ثواب ایسے مسلمانوں پر خرچ کر دینی چاہئے جو بہت زیادہ غریب اور انتہائی مفلوک الحال ہوں. مجھے نہیں معلوم کہ پاکستان اور عرب ممالک کا آپس میں لین دین کرنے کا طریقہ کیا ہے میری معلومات اس بارے میں صفر کے برابر ہیں. اسلئے میں کچھ عرض کرنے سے مجبور ہوں.

آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ غیر مسلم لوگ بینک سے سود لے کر بہت فائدے اٹھا رہے ہیں لیکن ہم اسے ناجائز تصور کرتے ہیں. اسی لئے ہم ترقی کے میدان میں بہت پیچھے ہیں.

غالباً آپ نے غور و فکر کئے بغیر یہ بات تحریر فرما دی ہے. اگر آپ معمولی غور و فکر کی بھی زحمت گوارا فرماتے تو یہ بات خود بخود آپ کے سمجھ میں آجاتی کہ غیر مسلمین کی آسائشوں اور خوش حالیوں کی اولین ترین وجہ سود کی رقمیں نہیں کچھ اور ہے. اسی طرح مسلمانوں کے ذلت و انحطاط کے اسباب سود خوری سے اجتناب نہیں بلکہ کچھ اور ہیں. تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے سود، رشوت اور دوسرے ناجائز پیسے سے دامن بچا کر بھی دنیا میں عزت اور سرخروئی حاصل کی ہے. لہٰذا یہ کہنا بھی برصواب نہیں ہو سکتا کہ چونکہ ہم لوگ ناجائز مالوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں لہٰذا ہم پس رہے ہیں، پربادہو رہے ہیں

لیکن چلئے فرض کرلیجیے کہ مسلمانوں کی پریشانیوں کی اولین ترین وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ناجائز پیسے سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور کسی صورت اس ناجائز دولت کو اپنے دامنوں میں سمیٹنا نہیں چاہتے جس کو سمیٹے بغیر ترقی کی نعمتیں حاصل نہیں کی جاسکتیں۔ اس مفروضہ کے بعد بھی ایک اسلامی تعلیمات کو پسند کرنے والا اور آخرت کی بازپرس سے ڈرنے والا ذہن یہ کہنے پر مجبور ہے کہ مسلمان ترقی نہ کرکے بھی کامیاب ہے اور دوسری قومیں ترقی یافتہ ہونے کے باوجود بھی بربادی اور ہلاکتوں کا شکار ہیں۔ دنیا میں عسرت اور تنگی کے ساتھ زندگی بسر کرلینا بہتر ہے اس ترقی اور آسائش سے جو ناجائز کمائی کے ذریعہ حاصل کی جائے۔

بنیک وغیرہ کے سود سے دامن بچانے میں بے شک کچھ نہ کچھ نقصان ضرور ہے لیکن یہ نقصان انشاء اللہ آخرت میں فائدہ مند ثابت ہوگا۔ ناجائز پیسہ جمع کرکے اگرچہ دنیا میں بہت کچھ فوائد حاصل ہوجاتے ہیں لیکن یہ تمام فوائد آخرت میں یقیناً مہنگے پڑیں گے اور خسران وضرر کا موجب ثابت ہوں گے۔

جہاں تک دوسری قوموں کا معاملہ ہے تو انھیں دنیا میں ترقی کرنے دیجئے۔ اس لئے کہ انھیں آخرت کی نعمتوں میں سے کوئی نعمت نصیب ہونے والی نہیں۔ جو کچھ انھیں ملنا ہے اسی دنیا میں ملنا ہے۔ یہاں سے رخصت ہونے کے بعد عذاب ہی عتاب ہے۔ کلفتیں ہی کلفتیں ہیں۔ لیکن ہم مسلمانوں کی نظریں صرف دنیاوی ترقی پر ہی نہیں جمی رہنی چاہئیں۔ اور نہ ہی ہمیں ہر وقت اس فکر میں ڈوبا رہنا چاہئے کہ دنیا کی راحتیں کس طرح خریدی جائیں۔ ہمارے پیش نظر تو صرف اور صرف یہ بات رہنی چاہئے کہ کونسی بات خدا اور رسول کو پسند ہے اور کس بات سے خدا اور رسول ناراض ہوتے ہیں۔ سود خوری خدا کو پسند نہیں۔ سود خدا اور رسول کے نزدیک بدترین شے ہے لہٰذا دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو سود سے احتراز کرنا چاہئے خواہ سود بام ترقی تک پہنچنے کا زینہ ہی کیوں نہ ہو۔

جمعہ کی اذان اور اقامت وغیرہ سے متعلق

(بختیارپور (بہار) کے شرف الدین صاحب مخاطب ہوں۔

جمعہ کی اذان جسے اس دور میں خطبہ کی اذان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مسجد کے بیرونی حصہ میں بھی دی جاسکتی ہے اور اندرونی حصہ میں بھی۔ بس اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ اذان ممبر کے سامنے کھڑے ہوکر دی جائے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ مؤذن مسجد کے اندرونی ہی حصہ میں کھڑا ہوکر اذان دے اس لئے کہ خطبہ اذان دینے والے مؤذن اور منبر کے درمیان زیادہ فاصلہ کو پسند نہیں کیا گیا ہے اور ہمارے اکابرین کا معمول یہی رہا ہے کہ انھوں نے خطبہ کی اذان مسجد کے اندرونی ہی حصہ میں دی۔ لہٰذا ہمارے لئے مناسب تر راہ یہی ہے کہ ہم خطبہ کی اذان منبر کے قریب کھڑے ہوکر یا تھوڑے بہت فاصلے پر کھڑے ہوکر دیں۔ زیادہ فاصلہ مناسب نہیں۔

آیت کریمہ میں جو یہ ارشاد فرمایا گیا کہ واذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ۔ اس سے یہی اذان مراد ہے جو خطبہ کے وقت دی جاتی ہے۔

اذان اور اقامت کا جواب دینا ضروری ہے۔ بعض فقہاء خطبہ کی اذان کا جواب دینے کو مکروہ قرار دیا ہے لیکن اکثر فقہاء کی رائے یہ ہے کہ خطبہ کی اذان کا جواب دینا مستحب ہے اور باقی تمام اذانوں اور اقامتوں کا جواب دینا ضروری ہے۔

اقامت شروع ہوتے ہی نماز کے لئے کھڑا ہونا چاہئے اس بات کا انتظار نہیں کرنا چاہئے کہ جب اقامت کہنے والا "حی علی الصلوٰۃ" کہے گا تب نماز کے لئے کھڑے ہوں گے۔

زانی آخرت کی سزا سے کیسے [illegible]

(بیدر شریف کے [illegible] مخاطب ہوں)

زنا واقعتاً بڑا فحش اور قبیح گناہ ہے۔ [illegible] گناہ کا ارتکاب کرکے بدترین قسم کی تا[illegible] ہے زید کا یہ جذبہ قابل قدر ہے کہ وہ آخرت کی سزا سے بچنے کے لئے دنیا کی ہر سزا برداشت کرنے کے لئے تیار ہے [illegible]

آمادہ ہے کہ کسی ایسی حکومت سے رابطہ قائم کرے جہاں اسلامی قانون نافذ ہو تاکہ وہ حکومت زید کو زنا کی پاداش میں سنگسار کر ڈالے ۔ اور زید آخرت کی سزا سے بچ جائے۔

آپ نے دریافت کیا ہے کہ زید آخرت کی سزا سے کس طرح چھٹکارا پا سکتا ہے ۔ ہمارے خیال میں زید دل کی گہرائی سے اپنے گناہ کی معافی مانگے اور آئندہ کے لئے اس گناہ کے قریب بھی نہ پھٹکنے کا پختہ عہد کرے۔ اگر اس نے معافی مانگی اور آئندہ اس بے حیائی کے قریب جانے سے احتراز کیا تو انشاءاللہ اس کا گناہ نامۂ اعمال سے مٹا دیا جائے گا اس لئے کہ حق تعالیٰ بڑے غفورٌ رحیم ہیں۔ وہ بڑی بڑی خطاؤں کو معاف کر دیتے ہیں۔ کوئی بعید نہیں اگر زید کو بھی معاف کر دیا جائے۔

اپنی پسند سے شادی کرنے کا مسئلہ

(ایضاً)

غلطی بکر ہی کی ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے شادی کرتے وقت یہ نہیں سوچا کہ اس کی اس حرکت سے اس کے والد اور اس کے بڑے بھائی کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ بکر کے لئے مناسب یہ تھا کہ اپنے بڑوں پر یہ واضح کر دیتا کہ میں فلاں لڑکی کو پسند کرتا ہوں اور اسی کے ساتھ میری شادی ہونی چاہئے۔ اس کے بڑے اس کے ارمانوں پر تیشہ کیسے چلا دیتے۔ وہ یقیناً بکر کے ارمانوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے۔

بہرحال بکر کی غلطی تھی۔ لیکن چونکہ اب شادی ہو چکی ہے لہٰذا نہ یہ صورت مناسب ہوگی کہ لڑکی کو طلاق دیدی جائے اور نہ یہ صورت مناسب ہوگی کہ بکر کے بھائی اس سے قطع تعلق کرلیں۔ اب تو صرف ایک ہی راستہ ہے کہ بکر کی نادانی کو نظر انداز کیا جائے۔ آدمی سے غلطی ہو جاتی ہے۔ غلطی کی سزا دینا کوئی ضروری تو نہیں۔ معافی کا بھی تو ایک پہلو ہے۔

چھ بھائی اور تین بہنوں کی وراثت کا مسئلہ

(ایضاً)

کل ترکہ کو پندرہ حصوں میں تقسیم کرلیا جائے۔ دو دو حصے بھائیوں کو دیئے جائیں اور ایک ایک بہنوں کو۔ بشرطیکہ کوئی دوسرا وارث موجود نہ ہو۔

قربانی ذی الحجہ کی بارہویں تاریخ تک کی جاسکتی ہے

(بمبئی کے ایم سلیمان زری والے مخاطب ہیں)

مجھے اہل حدیث کے مسلک کی تحقیق نہیں کہ وہ کس روایت کو مستدل بنا کر تیرہویں ذی الحجہ تک قربانی کرنے کو جائز تصور کرتے ہیں۔ ویسے امام شافعیؒ کا بھی مسلک یہی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام محمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ ذی الحجہ کی بارہویں تاریخ کو غروب آفتاب تک قربانی کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد غلط ہے۔ اگر آپ حنفی ہیں تو ہمیشہ ذی الحجہ کی دس۔ گیارہ۔ بارہ کو قربانی کیجئے اس کے بعد نہیں۔ اہل حدیث کو اپنے مسلک پر عمل کرنے کی آزادی ہے آپ ان کی فکر نہ کریں۔

تلاوت کے معنیٰ

(چھوڑے کے عبدالرشید خاں مخاطب ہوں)

تلاوت کے معنی مطلق پڑھنے کے ہیں خواہ یہ پڑھنا سمجھ کر ہو یا بغیر سمجھے۔ اگر تلاوت کے معنی سمجھ کر پڑھنے کے ہوتے تو عام اور خاص جلسوں میں تلاوت قرآن کرنے والے حضرات کے بارے میں یہ بات کہی جایا کرتی کہ اب فلاں صاحب بغیر سمجھے قرآن کی تلاوت کریں گے۔ لیکن بغیر سمجھے کی قید نہیں لگائی جاتی اور اس قید کے لگانے کی ضرورت اس لئے محسوس نہیں ہوتی کہ تلاوت کے معنی مجرد پڑھنے کے ہیں خواہ پڑھنے والا ایک لفظ کا مطلب سمجھنے کی بھی اہلیت نہ رکھتا ہو۔

مروجہ قرآن خوانی

(ایضاً)

آجکل جو قرآن خوانی رائج ہے اس کی حیثیت اگرچہ رسم سے زیادہ نہیں لیکن اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ یہ جواب اس قرآن خوانی سے متعلق تھا جو ازراہ برکت کرائی جاتی ہے اب رہی وہ قرآن خوانی جو ایصال ثواب کی غرض سے رواج پذیر ہے۔ اس کے بارے میں مختصراً یہ عرض ہے کہ اگر یہ قرآن خوانی محدود دائرہ میں ہو تو مستحسن ہے اور اگر حدود سے متجاوز کر جائے تو اسے بھی رسمیات کی فہرست میں شمار کیا جائے گا۔

سیاست کی تعریف

پہلے زمانہ میں حسن تدبیر کو سیاست کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ آجکل جو سیاست ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی ہے وہ جھوٹ، مکر، دھاندلی، جعل سازی تبرا اور سب و شتم کا معجونِ مرکب ہے۔ مروجہ سیاست کو حسن تدبیر کے مفہوم میں سمیٹنے کی کوشش کرنا بہت بڑی دھاندلی ہوگی۔ اسی سیاست کو اس سیاست پر قیاس نہیں کیا جا سکتا جو سیاست اسلام کی نگاہوں میں محمود اور مستحسن تھی اور جو حسن فکر اور حسنِ تدبیر سے متفرع ہوتی ہے۔

موجودہ سیاست کی لاج رکھنا چاہیں تو بہتر صورت یہ ہے کہ سیاست کو بس سیاست ہی کہئے۔ اس کا ترجمہ کرنے کی کوشش مت کیجئے۔ ترجمہ کریں گے تو مکر و فریب کے سوا کوئی اور ترجمہ کرنا مبنی برحقیقت نہیں ہو سکتا۔

غیر مسلم کا ذبیحہ

(بیترگام (کشمیر) کے جاوید اقبال مخاطب ہوں)

غیر مسلم کے ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے خواہ اس نے جانور اسلامی طریقہ پر ذبح کیا ہو۔

اس ترکہ کا مسئلہ جس کا کوئی وارث نہ ہو

(ایضاً)

اگر آپ کو یقین ہو کہ اس بڑھیا کا کوئی وارث نہیں ہے یعنی آپ مکمل تحقیق کر چکے ہوں تو پھر اس کی زمین کو فروخت کر دیجئے اور اس کی قیمت غریبوں میں تقسیم کر کے بڑھیا کو ایصال ثواب کر دیجئے۔

اس زمین کو کسی مدرسہ وغیرہ کے لئے وقف بھی کرایا جا سکتا ہے۔ بلکہ بہتر صورت یہی ہے کہ زمین کو کسی دینی مدرسہ یا مسجد کے لئے وقف کر دیا جائے۔ تاکہ یہ زمین بڑھیا کے لئے صدقۂ جاریہ ہو جائے۔ ویسے جائز یہ بھی صورت بھی ہے کہ آپ زمین کو فروخت کر کے اس کی رقم غریبوں میں تقسیم کر دیں یا کسی اسلامی ادارے میں داخل کرا دیں۔

بسم اللہ کی بجائے ۷۸۶ لکھنا

(حیدرآباد کے نیاز الدین صاحب مخاطب ہوں)

بے شک حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہر بڑے کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنا چاہئے۔ جو بڑا اور اہم کام اللہ کا نام لئے بغیر شروع کیا جائے گا اس میں نقص بھی رہیگا اور بے برکتی بھی۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

کل امر ذی بال لم یبدء باسم اللہ فھو اقطع و ابتر۔ اس حدیث میں چونکہ اس بات کی تصریح نہیں کی گئی کہ اللہ ہر اہم کام کو شروع کرتے وقت اللہ کے نام کو معرض تحریر میں لانا ضروری ہے۔ لہذا یہ کہنا غلط ہوگا کہ جس کتاب یا خط کی پیشانی پر بسم اللہ الرحیم کے الفاظ مرقوم نہیں ہیں وہ کتاب ناقص اور بے برکت ہوگی۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ہر کام کو شروع کرتے وقت ہمیں اس بات کا احساس رہنا چاہئے کہ اللہ کی مدد کے بغیر یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا اور یہ مقصد اس صورت میں بھی پورا ہو سکتا ہے کہ آدمی زبان سے بسم اللہ پڑھ لے ۷۸۶ لکھنے پر اکتفا کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اسلئے کہ ۷۸۶ لکھنا بھی بسم اللہ ہی لکھنے کے مرادف ہے اور ہر لکھنے والا بسم اللہ ہی کے تصور سے لکھتا ہے۔ آخر آپ کو ۷۸۶ لکھنا غلط کیوں لگتا ہے جبکہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے صلعم علیہ السلام کی بجائے عم رضی اللہ عنہ کی جگہ رضہ اور رحمۃ اللہ علیہ کی بجائے رح لکھنے پر صرف اکتفا کر لینا غلط نہیں تو پھر بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ لکھنا کیوں غلط

مقصدِ زندگی

اور

معاشی مصروفیات

سید اسعد گیلانی

مقصدِ زندگی انسان کے لئے دنیا کی زندگی میں سب سے قیمتی متاع کا نام ہے۔ انسان اسی کے لئے زندہ رہتا ہے اور اسی کے لئے جان دے دیتا ہے۔

یہ دور جس سے ہم گذر رہے ہیں ایک مادہ پرست تہذیب کے غلبے کے سبب مادہ پرستی کا دور ہے، ہر کام، ہر مقصد اور زندگی کا ہر معاملہ اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور کی سب سے بڑی علامت اور مظہر اس کی کاروباری مصروفیات ہیں۔ کاروبار کیا ہے؟ وہ تمام مصروفیات جو معیشت کی خاطر اختیار کی جاتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انسان شاید اس زمین پر کبھی بھی معیشت کی خاطر اختیار کی جاتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انسان شاید اس زمین پر کبھی بھی معیشت کی خاطر اتنا مصروف اور ہمہ تن مشغول نہیں رہا ہے جتنا اب اس دور میں خاندانی زندگی منتشر ہو رہی ہے۔ انسانوں کے انسانوں پر مختلف حیثیتوں سے قائم شدہ حقوق کا تصور روز بروز مٹتا جا رہا ہے۔ نیکی، ہمدردی، ایثار، قربانی مروت کی خاطر کوئی تکلیف کسی دوسرے انسان کے لئے برداشت کرنا کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ ذہنی سکون، قلبی اطمینان، رشتہ و تعلق کی ذمہ داریاں، دوستوں کی دلداریاں اور احباب کی رفاقتیں اور رابطے سب گھٹتے جا رہے ہیں اور معاشی مصروفیات دنیا کے بازاروں میں چاروں طرف بڑھتی اور پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ جذباتِ محبت و مروت رکھنے والا انسان اب سخت دل اور بے مروت مشین بنتا جا رہا ہے۔ اس دور کا یہ مادی اور مشینی پہلو عالمگیر انسانی برادری کے لئے سخت تشویشناک مسئلہ ہے۔

اگر کوئی مشین بنائی جاتی ہے تو اسکے اندر تیل یا کوئلہ اس لئے جلائے جاتے ہیں کہ وہ متحرک ہو کر وہ کام انجام دے سکے جس کے لئے وہ مشین بنائی گئی ہے لیکن اگر مشین کے اندر تیل ڈال ڈال کر جلانا اور پھر زیادہ سے زیادہ تیل جمع کرنا اور مشین میں ڈالنا اور جلانا ہی صرف کل کام رہ جائے تو یہ ایک عجیب و غریب بے مقصد اور بے معنی مشین بن کر رہ جائیگی۔ مشین بنانے والے کو آخر ایسی مشین کی کیا ضرورت ہوگی کیا وہ یہ پسند نہ کریگا کہ ایسی ناکارہ مشین کو جو صرف اس کا تیل جلاتی ہے لیکن جس کام کے لئے وہ بنائی گئی ہے وہ کام انجام نہیں دیتی۔ اس مشین کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر بالکل پگھلا دے اور اس کا نام و نشان تک مٹا دے اور اسکی بجائے پھر کوئی دوسری مفید چیز بنائے ظاہر ہے کہ ایسی ناکارہ مشین اگر انسان کے گھر میں ہو تو اسے وہ ایک دن بھی اپنے پاس نہ رکھے گا لیکن مالک الملک نے انسان کو جس نے کمانے کھانے اور پھر مزید کمانے اور مزید کھانے کو ہی مقصدِ حیات قرار دے رکھا ہے اور جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کی طرف اسے لمحہ بھر کے لئے بھی توجہ دینے کی فرصت نہیں رہ گئی ہے نہ صرف اپنی کائنات میں رکھا ہوا ہے بلکہ اسے مہلت پر مہلت مل رہی ہے

اس لئے کہ دنیا کے کمرۂ امتحان میں جو مہلت اسے دی گئی ہے وہ تو اُسے بہرحال ملے گی۔ اگرچہ تباہی اور بربادی کے اٹھنے والے طوفان بتاتے ہیں کہ قافلۂ انسانیت کسی بہت بڑی تباہی کے غار کی طرف مسلسل بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

انسانوں کے اندر مصلحین کا ایک طبقہ ہمیشہ رہا ہے جس کی پوری طرح پیروی نہ کرنے کے باوجود انسان نے ان کی زندگی کو ہمیشہ اپنے لئے نمونے کی اعلیٰ تر زندگی قرار دیا ہے۔ اگر ایسے مصلحین کی زندگیوں کو دیکھیں تو ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد ایسی دکھائی دیتی ہے جو معاشی مصروفیات کے اس بے پناہ روز و شب کے چکر سے اپنے آپ کو بڑی حد تک آزاد رکھتی رہی ہے۔ ان کے نزدیک معاشی مصروفیات ہمیشہ ثانوی حیثیت پر رہی ہیں۔ انہوں نے چونکہ ہمیشہ ایک اعلیٰ تر مقصدِ زندگی کو اپنے پیشِ نظر رکھا اور اس کے لئے جد و جہد کی، اس لئے وہ معاشی مصروفیت کے چکر کو اولیت دے ہی نہ سکتے تھے۔ انسان کے اندر رہنے والے حیوان سے زیادہ اس کے اندر رہنے والے انسان کی راہنمائی کا مقصد ہمیشہ اُن کے سامنے رہا ہے۔

آج ہم ہر طرف معاشی مصروفیت کے چکر کو بے پناہ تیزی سے چلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جس میں انسانوں کے ہجوم فرعون کے غلاموں کی طرح شب و روز جُتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ صبح جاگتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو اس جوئے میں جُت جاتے ہیں اور رات آتی ہے تو نڈھال ہو کر ذہن میں حساب و کتاب کا الجھاوا لئے ہوئے سو جاتے ہیں، اور صبح اٹھ کر پھر اسی عذابِ معاشی مصروفیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ ان کا مقصدِ زندگی اس کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ وہ اسی کو مقصدِ حیات سمجھتے ہیں اور اسی کے لئے چیونٹیوں کی طرح دن رات مصروف رہتے ہیں۔ ہم جسکو بھی دیکھتے ہیں کہ اُسے معاشی مصروفیات کے سوا کسی دوسرے مقصدِ زندگی کا شعور ہو گیا ہے اور اس شعور نے اس کی عملی زندگی پر بھی اثر ڈالا ہے اور وہ اس کے لئے اپنے دل میں ایک تڑپ کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے، بس وہیں سے اس کا یہ کاروباری چکر ذرا سست پڑنے لگتا ہے۔ عفریتِ معاش کی کنڈلی کی گرفت اس کے گرد آہستہ آہستہ ڈھیلی ہونے لگتی ہے۔ پورے عروج پر چڑھتی ہوئی معاشی پینگ کچھ اترنے لگتی ہے اور وہ دوسروں سے معاشی دوڑ میں ذرا کچھ پیچھے رہنے لگتا ہے اور معاملہ قوت لایموت اور رزقِ کفاف پر آ رکتا ہے۔ اسی طرح جب ایک مقصدِ حیات کو لے کر کام کرنے آدمی کا کاروبار چمکنے لگ جاتا ہے معاشی مصروفیت بڑھ جاتی ہے۔ بینک بیلنس میں اضافہ ہونے لگتا ہے، اور وہ اپنے احباب اور رفقاءِ مقصد سے ملاقاتیں اور میل ملاپ کچھ کم کر دیتا ہے تو اچانک جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ زبان سے اقرار کے باوجود اب اس کے سامنے مقصدِ زندگی وہ نہیں رہ گیا جس کا وہ اقرار کرتا ہے بلکہ مقصدِ زندگی دن بدن معاشی مصروفیت اور معاشی کاروبار بنتا چلا جا رہا ہے۔ پھر وہ دوستوں کی مجلس سے غائب ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ دوستوں سے رابطہ قائم رکھنے سے گھبراتا ہے۔ پھر محسوس ہوتا ہے کہ اس کا عام ذوق کچھ بدل گیا ہے۔ وہ ہم نشینی کی ذمہ داریوں سے بھی پہلو بچاتا ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ صورت تو وہی جانی پہچانی ہے لیکن اندر ہی اندر کوئی انقلابی تبدیلی کا عمل وارد ہو رہا ہے۔ دل بدل رہا ہے، نظریں بدل رہی ہیں، وہ عزیز ساتھی شکل و صورت وہی رکھتے ہوئے بالکل بدلا ہی چلا جا رہا ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ جد و جہد کا دیوِ معاش اسے ہڑپ کرتا جا رہا ہے اور ہم سے دن بدن دور ہو رہا ہے۔ پھر اگر وہ معاشی ترقی کے سوا کسی دوسرے مقصدِ حیات کا اقرار کرتا بھی رہتا ہے تو اُس کی حیثیت رسمی اور وقتی ہوتی ہے۔ ایک وقت قریب آ رہا ہوتا ہے جب اس کا یہ قول جو اب محض تضادِ قول و فعل کا خول ہوتا ہے جلد ہی اتر کر اندر سے ایک دوسرا آدمی برآمد ہو جائیگا۔

بلاشبہ موجودہ دور نے دو وقت کی حلال روٹی ایک مومن کے لئے دوبھر کر دی ہے اور دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لئے بھی اسے جسم میں سے خون اور پسینہ یک وقت نچوڑنا پڑتا ہے لیکن آخر جن لوگوں نے دو وقت کی روٹی کمانے کے علاوہ بھی اپنی زندگی میں کوئی کارنامہ سر انجام دیا ہے، یا کوئی جد و جہد [illegible] جسے تاریخ نے محفوظ رکھا اور انسانیت نے اسے سراہا [illegible] جد و جہد ہمیشہ معاشی مصروفیت کے علاوہ کوئی دوسری جد و جہد

ہوتی رہی ہے۔ انسانیت کی تاریخ تو خیر اس چیز سے ہمیشہ بے نیاز رہی ہے کوئی پیدل چلتا رہا ہے یا کار میں سفر کرتا رہا ہے پختہ بنگلوں میں رہا ہے یا کچے جھونپڑوں میں اعلیٰ کھانے اور قیمتی لباس استعمال کرتا رہا ہے یا روکھا سوکھا اور موٹا جھوٹا پہنتا ہے اور کھاتا رہا ہے۔ زمانہ تو صرف اسی کارنامے کا وزن لگاتا ہے جو کسی نے مجموعی طور پر بنی نوع انسان کی بھلائی اور رہنمائی کے لئے سرانجام دیا ہو۔ تاریخ تو کیا معاشرتی ماحول بھی اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ کوئی اپنے گھر میں کتنی شان سے رہتا ہے اور اپنے نفس پر کتنا خرچ کرتا ہے اپنی ذات سے ہٹ کر کسی اعلیٰ تر مقصد کے لئے کسی انسان کی مصروفیت اور ایثار سے ہی اس کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔

معاشی کاروبار ایسی چیز ہے جسے کوئی جس قدر چاہے پھیلاتا چلا جائے بلکہ جب وہ چل پڑتا ہے اور کاروباری آدمی کا اپنے کاروبار میں اخلاص عمل ثابت ہو جاتا ہے تو پھر وہ کاروبار خود ہی پھیل پھیل کر اپنے آدمی کو اپنے جال میں سمیٹنے لگتا ہے اس کے ہاتھ پاؤں اوقات دل و دماغ سب کچھ اس میں صید زبوں بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ پیسے بنانے کی ایک مشین بن کر رہ جاتا ہے۔

کیا انسان کے لئے یہ روپہلی مشین بن کر رہ جانا مفید و مطلوب ہے۔

یقیناً یہ مشینی زندگی اس شخص کے لئے ضرور مفید ہو گی جس کے سامنے خلوص دل سے اس کے سوا اور کوئی مقصد حیات نہ ہو کہ پیسہ کمایا جائے مزید کمایا جائے اور کما کما کر جمع کیا جائے اور جمع کر کر کے گنا جائے اور گن گن کر زندگی کی مسرت حاصل کر لی جائے۔

لیکن یہ مشینی زندگی اس شخص کے لئے مطلوب نہیں ہے جسے حسن اتفاق سے اس بات کا شعور حاصل ہو گیا ہو کہ اس کا مقصد زندگی پیسہ کمانے کے علاوہ کوئی دوسرا ہے۔ جب یہ بات سامنے آ جائے کہ مقصد زندگی کوئی دوسرا ہے تو پھر ایسی مصروفیت جو انسان کے سارے اوقات چوس لینا چاہے اور اسے صرف اپنے لئے ہی وقف کر لینا چاہے مقصد حیات کی جان لیوا رقیب بن جاتی ہے دونوں مصروفیات کے درمیان سوکنوں جیسا بیر پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں میں سے کسی ایک مصروفیت کو دوسرے کے تابع ہونا پڑتا ہے

یہ فیصلہ کرنا خود اس کا کام ہوتا ہے جو اس صورت حال سے دوچار ہوا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اور تو جس کا جی چاہے اپنی معاشی مصروفیات کو اپنے مقصد زندگی پر ترجیح دیتا رہے لیکن ایک مومن کو جس نے خدا اور رسولؐ کی اطاعت کو ہر اطاعت پر حاوی کرنے کا عہد رکھا ہو۔ اسے یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے مقصد زندگی پر اپنے روزمرہ کے دوسرے معاشی کاروبار کو ترجیح دے۔ اس لئے کہ اس نے تو اپنا نام نہ کسی ملک کی نسبت سے رکھوایا ہے، نہ نسل کی نسبت سے اور نہ پیشے کی نسبت سے بلکہ صرف اور محض مقصد زندگی کی نسبت سے ہی اس نے اپنا خاص نام مسلمان رکھوایا ہے اور وہ نسبت عجیب حاصل کی ہے جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تمہارا اعزاز و اکرام خدا کے نزدیک صرف تقویٰ اور دینداری کی نسبت سے ہے کسی کارکوٹھی اور دنیوی جاہ و جلال کی نسبت خدا کے ہاں صرف پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ حساب و کتاب کی میزان میں ایک بھاری بوجھ کا اضافہ کر کے حیثیت بندگی کو اور زیادہ مشکوک کر دیتی ہے۔

چنانچہ فرمایا گیا:۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنیا قَلِیْلٌ — اے نبی آپ ان سے کہہ دیجئے کہ دنیا کا
وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ — سرمایہ تو بہت ہی قلیل ہے اور پرہیزگاروں
اتَّقٰی (النساء) — کے لئے آخرت بہتر ہے

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا — یہ دنیوی زندگی (اور اسکا سازو سامان)
مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَۃَ هِیَ — تو بس چند دنوں کے استعمال کے لئے ہے
دَارُ الْقَرَارِ (المومن) — اور آخرت ہی اصل رہنے کی جگہ ہے۔

چنانچہ دنیا اور اس کی مال و متاع جس کے لئے تڑپ روز اتنی مصروفیت ہے کہ انسان خدا اور رسولؐ اور اپنے مقصد حیات تک کو بھولا جا رہا ہے۔ اس کی بے حقیقی کا حضورؐ نے ایک نہایت نفسیاتی طریق پر اپنے اصحاب میں شعور فرمایا۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ کا گزر بکری کے کان کٹے بچے پر ہوا جو راستے میں مُردہ پڑا تھا۔ آپؐ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا "تم میں سے کوئی مُردہ بچے صرف ایک درہم میں خریدنا پسند کرے گا" عرض کیا گیا ہم تو اسے کسی قیمت پر بھی

لینا پسند نہیں کرتے۔ حضورؐ نے فرمایا "بخدا دنیا اللہ کے نزدیک اس مردہ بچہ سے بھی زیادہ حقیر ہے۔" (صحیح مسلم)

حضرت ابو موسیٰؓ نے بھی ایک روایت کے ذریعہ ہمیں دنیا کی مصروفیت میں آخرت یعنی مقصدِ حیات کو بھول جانے کے خطرے سے متنبہ فرمایا۔ وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

" جو شخص دنیا کو محبوب و مطلوب بنائیگا وہ اپنی آخرت کا ضرور نقصان کرے گا پس عقل و دانش یہی ہے کہ فانی کے مقابلے میں باقی کو اختیار کیا جائے۔ (بیہقی)

اسی چیز کو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے حضورؐ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا حضورؐ نے میرے مونڈھے پکڑ کر ارشاد فرمایا:۔

"دنیا میں ایسے رہ کہ جیسے تو پردیسی ہے یا رستہ چلتا ہوا مسافر۔"

ایک دوسرے موقع پر حضورؐ نے اپنی امّت کے بارے میں فقر و فاقہ سے نہیں بلکہ وسعت دنیا کے سبب اندیشہ محسوس فرمایا عمرو بن عوفؓ سے روایت ہے حضورؐ نے فرمایا:۔

"میں تم پر فقر و فاقہ آنے سے نہیں ڈرتا لیکن مجھے تمہارے بارے میں یہ ڈر ہے کہ دنیا تم پر وسیع کر دی جائے جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر کی گئی تھی پھر تم اسکو بہت زیادہ چاہنے لگو جیسے کہ انہوں نے اس کو بہت زیادہ چاہا تھا اور پھر وہ تم کو برباد کر دے جیسے کہ اُس نے اُن اگلوں کو برباد کیا (صحیح بخاری و مسلم)

پھر یہ بھی فرمایا کہ:۔

" ہر اُمّت کے لئے کوئی خاص آزمائش ہوتی ہے اور میری اُمّت کی خاص آزمائش مال ہے۔" (ترمذی)

پھر فرمایا کہ:۔

" دو بھوکے بھیڑیئے جو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے گئے ہوں ان بکریوں کو اس سے زیادہ تباہ نہیں کر سکتے جتنا تباہ آدمی کے دین کو مال اور عزّت و جاہ کی حرص کرتی ہے۔ (ترمذی)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ کاروبار کوئی بُری چیز ہے یا اسے چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشینی اور رہبانیت اختیار کر لینی چاہیئے۔ گوشہ نشینی اور رہبانیت کی مذمّت اسلام سے بڑھکر اور کس نے کی ہے اور کسب حلال سے بڑھکر مستحسن چیز اور کسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں دراصل صرف وہ کاروبار زیر بحث ہے جو بڑھ کر آدمی کے تمام دیگر مصروفیات اور فرائض پر اثر انداز ہو جائے۔ اور آہستہ آہستہ انسان کی نظر سے اس کا مقصدِ حیات اوجھل ہونے لگے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر کاروبار لازماً مال کی حرص اور عزت و جاہ کی طلب پیدا کرے۔ لیکن یہ ان دونوں چیزوں کے آنے کا راستہ ضرور ہے۔ اور اگر کوئی شخص اسی راستے پر اپنے سارے اوقات لگانا شروع کر دے تو وہ ضرور ہی ایک دن ان دونوں بھیڑیوں سے دوچار ہو جائیگا جو اس راستے سے اکثر آتے اور لوگوں کے ایمان و اخلاق و اخلاص فی الدین کی بکریوں کو پھاڑ جاتے ہیں۔

ویسے بھی انسان کے حصّے میں جس قدر مال آتا ہے اس کی ذات کے لئے اس میں صرف تین ہی مدیں ہیں جن کا ذکر حضورؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے فرمایا ہے:۔

" بندہ کہتا ہے میرا مال میرا مال حالانکہ اس کے مال میں سے جو واقعی اس کا ہے وہ بس تین ہی مدیں ہیں۔ جو اس نے کھا کر ختم کر دیا، جو پہن کر پُرانا کر دیا، جو راہِ خدا میں دے کر آخرت کے لئے ذخیرہ کر لیا باقی جو کچھ ہے وہ دوسروں کے لئے چھوڑ جانے والا ہے۔ (مسلمؒ)

اسی لئے حضورؐ نے فرمایا: "بندۂ دینار خدا کی رحمت سے محروم ہوا اور بندۂ درہم خدا کی رحمت سے دور ہو۔" (ترمذیؒ)

چنانچہ نبیٔ کریمؐ نے فرمایا جسے حضرت ابو امامہؓ نے روایت کیا۔

" اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے یہ بات رکھی کہ میرے لئے وہ مکّہ کی وادی کو سونے سے بھر دے۔ میں نے عرض کیا میرے پروردگار میں اپنے لئے یہ نہیں مانگتا، بلکہ میں تو پسند کرتا ہوں کہ جب بھوک لگے تو آپ کو یاد کروں اور آپ کے سامنے گریہ وزاری کروں اور جب آپ کی طرف سے ملے اور پیٹ بھرے تو آپ کی حمد اور شکر کروں۔" (ترمذی)

حضورؐ کی تربیت کے یہی وہ اثرات تھے جنھوں نے صحابہ کرامؓ کی ایک بہت بڑی تعداد کو دنیوی جاہ و حشم سے بے نیاز کر کے

کرکے صف خلفائے اسلام پر نظر میں جانا سکھا دیا تھا۔ حضرت ابوالدرداءؓ کی بیوی روایت کرتی ہیں کہ میں نے حضرت ابو درداءؓ سے پوچھا کہ آپ بھی مال منصب وعہدہ دوسروں کی طرح کیوں طلب نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا میں نے اپنے آقا سے سنا ہے کہ:

"تمہارے سامنے ایک بڑی دشوار گذار گھاٹی ہے اس کو گرانبار اور زیادہ بوجھ والے آسانی سے پار نہ کرسکیں گے اس لئے میں پسند کرتا ہوں کہ اس گھاٹی کے عبور کرنے کے لئے ہلکا پھلکا رہوں۔" (بیہقی)

چنانچہ ایک بندۂ خدا کی نشان دہی حضورؐ نے ان الفاظ میں فرمائی۔

حضرت عبداللہؓ بن عمر سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

کامیاب اور بامراد ہوا وہ بندہ جس کو حقیقتِ اسلام نصیب ہوئی اور اس کو روزی بھی بقدر کفاف ملی اور اللہ تعالےٰ نے اس کو اس قدر قلیل روزی پر قانع بھی بنا دیا۔" (صحیح مسلم)

اللہ تعالیٰ نے بھی ایسے کاروبار سے منع فرمایا ہے جس میں انسان خدا ہی کو بھول جائے۔

لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ۔ خبردار ایسی تجارت نہ کرو کہ خدا کو بھول جاؤ۔

چنانچہ صحابہ کبار میں سے ایک نہایت اعلیٰ منصب کے صحابی کے بارے میں جو بہت بڑے تاجر بھی تھے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے:-

حضورؐ نے فرمایا: کہ جب میرے سامنے جنت پیش کی گئی تو سب صحابہ بآسانی جنت میں داخل ہوگئے لیکن عبدالرحمٰنؓ بن عوف ...... گرتا پڑتا چلا تو بمشکل جنت کے دروازے تک پہنچا۔"

یہ بات سن کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے تمام اونٹ اور غلام خدا کی راہ میں دے دیئے اور عرض کی کہ اب شاید میں صحابہؓ کے ساتھ آسانی سے داخل ہوسکوں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسا کاروبار جس میں آدمی نے اپنے آپ کو پوری طرح جکڑ رکھا ہو۔ اس لئے کہ دینی فرائض کی ادائیگی میں بھی کافی رکاوٹ ثابت ہوتا ہے بلکہ دیکھا جائے تو دین کا اپنا مزاج بھی کچھ اسی قسم کا ہے کہ وہ ایسے پھیلے ہوئے وسیع کاروبار کے مخالف پڑتا ہے۔

...... جو آدمی کو اپنے اندر بالکل ہی جذب کرلے چنانچہ دین کے اہم کام سارے کے سارے آدمی کو بار بار کاروبار کی گود سے کھینچ کر باہر نکال لے جاتے ہیں جس سے اسے کسی نہ کسی پہلو سے خسارہ ہی ہوتا ہے۔ نماز اسے پانچ بار ہر مصروفیت سے چھڑا کر اپنی طرف کھینچتی ہے اور کسی اہم ترین کاروباری عذر کو بھی نہیں سنتی۔ روزہ مسلسل ایک ماہ تک اسے بڑے بھاری پیمانے کی کاروباری مصروفیت سے کافی حد تک باز رکھتا ہے۔ حج کے لئے جانے والا آدمی چند ماہ تک کے لئے بالکل ہی کاروبار کی ہر نوعیت کو چھوڑ چھاڑ کر نکل جاتا ہے اور ایک دوسرے ہی ایسے کاروبار میں مصروف ہوجاتا ہے جہاں اسے اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے کاروبار کا خیال لانا بھی مشکل ہوتا ہے جہاد مومن کو اگر لے جائے تو زندگی کا ہی سودا چکانا چاہتا ہے۔ یہ سارے مومن کے رب کی طرف سے اس پر عائد کئے ہوئے ایسے فریضے ہیں جو اس کے بھرپور کاروبار کی موجودہ مصروفیات میں بار بار خلل انداز ہوکر اسے بتاتے ہیں کہ چاہے تو کتنا ہی مصروف بننے کی کوشش کرے تیرے مالک کی نکیل تیرے ناک میں موجود ہے۔

بزرگانِ دین میں ایسے کاروباری حضرات کی بہترین مثالیں موجود ہیں جنھوں نے دین کا کام بھی جم کر کیا اور اپنے کاروبار بھی چلائے اس کی وجہ یہ تھی کہ مال کی محبت ان کے نفس پر خفیف سی گرفت بھی نہیں رکھتی تھی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو اگر یہ اطلاع ملتی ہے کہ آپ کا تجارتی سامان سے بھرپور جہاز سمندر میں ڈوب گیا ہے تو بھی دل کی حالت دیکھ کر وہ الحمد للہ کہتے اور اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں کہ دل بے نیاز اس خبر سے غیر متاثر اور قلب مطمئن ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ انسان دنیا میں کس غرض سے بھیجا گیا ہے اور آخرت میں اس سے کس چیز کا حساب لیا جانا ہے؟ کیا اس بات کا کہ اس نے دنیا میں اپنے پیچھے کتنا شاندار تمدن

کتنے کارخانے بنائے اور کتنا بنک بیلنس جمع کیا اور اپنے وارثوں کے لئے کتنا مال چھوڑا یا اس سے یہ پوچھا جانے والا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دنیا سے اعمال کا کیا ذخیرہ لایا۔ بس جس چیز کی منزلِ مقصود پہنچ کر پرسش ہونی ہے آج اس زندگی میں اس کی فراہمی کی کوشش ہی سب سے زیادہ ضروری ہے اور جو چیز وہاں پوچھی ہی نہیں جانی ہے اس کے جمع کرنے، فراہم کرنے اور ڈھیر لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ چونکہ آخرت غیر محسوس ہے اور اس کا بگاڑ یا اس کی ویرانی آدمی کو نظر نہیں آتی اس لئے آدمی بے نیازی سے دنیا میں الجھا رہتا ہے جس کے بگاڑ سے اسے محسوس تکلیف ہوتی اور جس کی آبادی سے اُسے نمایاں آرام و راحت ملتے ہیں اس طرح دنیا نے انسان کو چاروں طرف سے گھیر کر اسے اپنی بھول بھلیوں میں ایسا مبتلا کیا ہے کہ اسکے اندر اپنے اصل گھر کی یاد اور اس کی آبادی سے دلچسپی رکھنے کا جذبہ ہی سرد کر دیا ہے۔

ظلم یہ ہے کہ کاروباری اور معاشی مصروفیت نے اپنی حد سے بڑھکر ایسے ایسے لوگوں کو لپنے گھیرے میں لے لیا ہے جن کے یوں گھر جانے کا کبھی وہم بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کاروباری مصروفیت کے ہاتھوں ہم نے بڑے زخم کھائے ہیں۔ ایسے ایسے پُر لنے دوست اور دین کے مجاہد اس کاروباری آندھی میں اپنی مصروفیت سے ہٹ کر دور اندھیروں میں جا پڑے ہیں جن کی یاد کے زخم دل پر گہرے ہیں۔ ہم نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جن کی دین کیلئے سرگرمی اور جذبۂ ذوق و شوق دیکھ کر کام کی طلب پیدا ہوتی اور رہنمائی ملتی تھی اور جن کے جذبے بڑے بیدار اور جن کے دل و دماغ دین کے لئے بڑے مستعد ہوتے تھے لیکن آج کاروبار نے گھیر گھار کر ان کو ایسا سرد کیا ہے کہ وہ چلتے پھرتے اپنے ماضی کے لاشے نظر آتے ہیں۔ اور انھیں دیکھ کر ایسی عبرت ہوتی ہے کہ انسان دنیا کے فانی اور عارضی چیز ہونے کی زندہ گواہیاں ان کے وجود سے حاصل کر لیتا ہے۔ لوگوں کا یہ حال دیکھ کر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے کہ "اے کاروبار اگر تو نے کچھ لوگوں کے بنک بیلنس بنا دیئے اور کچھ لوگوں کی معاشی گاڑی کی رفتار تیز کر دی تو دوسری طرف تو نے کتنے ہی جوش و خروش رکھنے والے سینوں کو سرد اور احباب کی مجلسوں کو سونا کر دیا ہے۔ اے کاروبارِ دنیا تو کاروبارِ آخرت سے کتنی مخالفت اور متضاد فطرت رکھتا ہے۔ تو نے چلتی ہوئی تحریکوں کو سرد کر دیا ہے اور امنڈتے ہوئے پاکیزہ انقلابوں کے رُخ موڑ دیئے ہیں۔ تیرے اندر حیرانی و سرگشتگی کے سوا کیا رکھا ہے۔ اسلامی تحریکوں کو تو یا ارکابِ اصحابِ عزیمت اور صاحبِ جنون سپاہیوں کے دستے ہی کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔

مولانا عامر عثمانیؒ

قطعات

کیسے رائیگاں جاتا میرا صبرِ مظلومی
ہر کسی کے لب تر میری پیاس تھی تنہا
وقت کے طمانچوں سے رہ گیا کھنڈر ہو کر
میکدہ کو لے ڈوبی مری تشنگی تنہا

رفتہ رفتہ ہر ساتھی ساتھ چھوڑ آیا تھا
دشتِ غم میں کاٹی ہے میں نے زندگی تنہا
میری موت کا ماتم دشتِ غم میں کرتا کون
پھوٹ پھوٹ کر روئی میری بیکسی تنہا

بوالہوس سمجھتے کیا درجۂ شہادت کو
میکدہ کی چوکھٹ پر میں نے جان دی تنہا
رند سب رہے محروم تشنگی کی لذت سے
پیاس کی مئے کہنہ میں نے ہی پی تنہا

عارضی مدت کیلئے تجلی کا سالانہ چندہ

چوبیس روپے سے گھٹا کر بائیس روپے کیا جا رہا ہے

ادارہ

- ایکسال کا چندہ ارسال کرنے والوں کی خدمت میں تنقید نمبر مفت پیش کیا جائے گا
- دو سال کا چندہ ارسال کرنے والوں کی خدمت میں طلاق نمبر مفت پیش کیا جائے گا۔
- تین سال کا چندہ ارسال کرنے والوں کی خدمت میں تنقید نمبر اور ایمان نمبر مفت پیش کیا جائے گا
- چار سال کا چندہ ارسال کرنے والوں کی خدمت میں طلاق نمبر اور تنقید نمبر مفت پیش کیا جائے گا۔
- پانچسال کا چندہ روانہ کرنے والوں کی خدمت میں طلاق نمبر، تنقید نمبر اور ایمان نمبر مفت پیش کئے جائیں گے
- چھ سال کا چندہ روانہ کرنے والوں کی خدمت میں خلافت و ملوکیت نمبر مکمل، طلاق نمبر اور مسلم پرسنل لاء نمبر مفت پیش کئے جائیں گے۔
- سات سال کا چندہ ارسال کرنے والوں کی خدمت میں خلافت و ملوکیت نمبر، طلاق نمبر ۶۳ء کا ڈاک نمبر اور مارچ و اپریل ۶۳ء کا ایک شمارہ مفت پیش کیا جائے گا۔
- آٹھ سال کا چندہ روانہ کرنے والوں کی خدمت میں خلافت و ملوکیت نمبر، طلاق نمبر، مارچ و اپریل کا شمارہ اور مئی ۶۹ء کا شمارہ اور مئی ۷۲ء کا ایک شمارہ مفت پیش کیا جائے گا۔
- نو سال کا چندہ ارسال کرنے والوں کی خدمت میں ۷۵ء کا مکمل فائل مفت پیش کیا جائے گا۔
- دس سال کا چندہ روانہ کرنے والوں کی خدمت میں ۶۵ء کا مکمل فائل اور ایمان نمبر مفت پیش کیا جائے گا۔
- بارہ سال کا چندہ روانہ کرنے والوں کی خدمت میں ۶۱ء کا مکمل فائل پیش کیا جائے گا۔ اس فائل میں ایک سالنامہ بھی ہے اور خلافت و ملوکیت نمبر کے تین حصے بھی ہیں۔
- پندرہ سال کا چندہ ارسال کرنے والوں کی خدمت میں ڈاک نمبر ۶۳ء، طلاق نمبر، ایمان نمبر، خلافت و ملوکیت نمبر جلد بنوا کر پیش کئے جائیں گے۔

لائف ممبری کی فیس پانچسو روپے ہے، جو صاحب لائف ممبر بنیں گے، انکی خدمت میں تجلی کے مذکورہ دس خاص نمبر مفت پیش کئے جائیں گے۔ خود لائف ممبر بننے کے ساتھ ساتھ جو صاحب دس لائف ممبر مہیا کریں گے، ان کی خدمت میں تجلی کا ۲۷ سالہ مکمل فائل مفت پیش کیا جائے گا۔ ——— ہر صورت میں ڈاک خرچ آپ کے ذمہ رہے گا ——— یہ رعایت ۱۲ اپریل ۷۶ء تک کیلئے ہے۔ ۱۲ اپریل ۷۶ء کے بعد آنے والے آرڈروں کی تعمیل نہیں کی جا سکے گی۔ اگر خاص نمبر پہلے نایاب ہوگئے تو ادارہ اس صورت میں بھی آپکے آرڈر کی تعمیل کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ خاص نمبر نایاب ہوگئے تو آپ کی رقم لوٹا دی جائے گی۔

جن حضرات کا سالانہ چندہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے وہ بھی اس اسکیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ان کی ارسال کردہ رقم اس مہینہ سے شمار کی جائیگی جس مہینہ سے ان کا پچھلا چندہ ختم ہو رہا ہے۔

منیجر تجلی دیوبند

غزل

از:- مجیب اللہ صاحب (بستوی)

بصد خلوص تری انجمن میں آئے ہیں
جگر کا سوز جنوں کی بہار لائے ہیں

کسی کی یاد میں آنسو ٹپک گئے ہیں جہاں
چراغ کتنے خرد نے وہاں جلائے ہیں

مرے چمن میں بہاروں کے دیکھ کر جلوے
نسیم صبح کے جھونکے بھی مسکرائے ہیں

تجلیات کا مظہر ہے دل کا آئینہ
ہم اس میں جلوۂ محبوب کو چھپائے ہیں

نہ جانے محوِ تماشائے یار ہیں کتنے
مری نگاہ نے کتنے فریب کھائے ہیں

چلو یہ عقدہ ہوا حل مجیب محفل میں
جنھیں ہم اپنا سمجھتے تھے وہ پرائے ہیں

غزل

از:- تابش صاحب (پرتاب گڑھی)

دیوانے حقائق کی اس راہ سے گذرے ہیں
جس راہ میں پتھر ہیں جس راہ میں کانٹے ہیں

کچھ اشک امرت ہیں آنکھوں سے جو ٹپکے ہیں
ورنہ مرے دامن میں موتی ہیں نہ ہیرے ہیں

مرتے ہیں نہ جیتے ہیں ہنستے ہیں نہ روتے ہیں
تقدیر کے ہاتھوں میں ہم لوگ کھلونے ہیں

اے شیشہ گرِ ہستی یہ کیسی نوازش ہے
آئینوں کی بستی میں کیوں سنگ برستے ہیں

صہبا ہے نہ ساغر ہے مطرب ہے نہ ساقی ہے
کچھ تشنہ دہن پھر بھی میخانے میں بیٹھے ہیں

جس باغ کو خوں دیکر سرسبز کیا ہم نے
اس باغ پہ تابش اب صیاد کے قبضے ہیں

ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

آجکل کر ٹک ہو رہا ہوں اس لئے انڈے دینے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں جانے کا اصل مقصد تو ان لوگوں کی زیارت کرنے کی خواہش ہے جو بین الاقوامی پوزیشن کے مالک ہیں — اور جن کے تصوف کی دھوم کعبہ سے بت خانے تک اور کربلا سے بالاکوٹ تک پھیلی ہوئی ہے۔ بڑی بڑی عظیم الشان اور عظیم المرتبت شخصیتیں نازل ہو رہی ہیں۔ مثلاً مولوی گلفام۔ صوفی تاشقند، مرزا جانِ جاں، منشی لعلِ یمن، خواجہ ذوالجلال صوفی ہل من مزید اور ان کے برادرِ کلاں صوفی ہل من شاکر جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔ صوفی آفتاب حسین صحرائی کے ایک نابالغ داماد میاں لیموں نچوڑ کا انزال تو براہِ راست بمبئی سے ہو رہا ہے۔

دفعتاً ملائن کے ہونٹوں پر تبسم کی پریاں رقص کرنے لگیں۔ میں ابھی سوچ رہا تھا کہ تبسم کی ان پریوں کا شانِ نزول کیا ہو سکتا ہے، لفظ بالغ یا لفظ انزال۔ کہ وہ بول پڑی۔

کیا ساری شخصیتیں تقریر کرنے ہی کے لئے آ رہی ہیں۔
نہیں انھیں تو برکت و رحمت کے لئے مدعو کیا جا رہا ہے

تقریر تو بس مولانا بحاد رصاحب ہی کی ہو گی جو عین جوانی کے عالم میں قوم سے معشوقِ ملت کا خطاب وصول کر چکے ہیں ممکن ہے کہ کوئی اور حضرت جی بھی کچھ فرمائیں۔ لیکن اصل تقریر معشوقِ ملت ہی کی ہو گی اور ان ہی کی ہونی بھی چاہیئے جماعت اسلامی کی مخالفت میں وہ بیچارے بہت کچھ داؤ پر لگا چکے ہیں۔ صوفی شتوال کہہ رہے تھے کہ اس بہت کچھ میں حیا اور ایمان بھی شامل ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ جس جلسہ میں مولانا مودودی کے خلاف زہر اگلنے کا پروگرام ہو اس جلسہ میں آپکی شرکت مناسب نہیں۔

میں ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے تھوڑی جا رہا ہوں مجھے تو نقلی داڑھیوں سے شغف ہوتا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ وہ بکواس کیا کرتے ہیں۔

اچھا خیر جائیے۔ لیکن خدارا جلدی آ جائیے گا آجکل چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔ بجلی بھی بہت بھاگ رہی ہے اور اس بات کا خیال رہے کہ کلن خاں بکا سود خور ہے لہذا اس کے ہاں کچھ کھانے کی ضرورت نہیں۔

ملائن نے اجازت دیتے ہوئے کہا — مجھے

امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے اجازت دیدے گی۔ میری روح جھوم اٹھی اور میں بلائیں لینے کے انداز میں بولا۔

بیگم یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ تمہاری صورت بھی بیوٹی فل ہے اور سیرت بھی، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جو تمہیں حسن صورت اور حسن سیرت سے مالامال نہ سمجھے اس کے مردود ہونے میں کوئی شک نہیں۔ میں نے الٹے سیدھے انداز میں یہ جملہ کہا اور اکسٹھ باسٹھ کرتا ہوا بیٹھک میں داخل ہوگیا۔

صوفی تبارک علی اس طرح منہ لٹکائے بیٹھے تھے جیسے کوئی وظیفہ کھینچ رہے ہوں۔ مجھے دیکھ کر چونک اٹھے پھر بولے

کہئے کیا رہا۔

طائفن نے اجازت دیدی!۔

الحمدللہ۔

لیکن اجازت مشروط ہے۔

مشروط۔ کیا مطلب؟ انھوں نے آنکھیں جھپکائیں۔

اس نے کہا کہ اس شرط پر تم جلسہ میں شرکت کر سکتے ہو کہ جب صوفی تبارک علی جلسہ کے بعد اعلیٰ درجہ کا ناشتہ کرانے کا وعدہ کریں۔

وعدہ کرنا تو مشکل بات نہیں لیکن وعدوں کو پورا کرنا مشکل ہوگا۔

کیوں صاحب مشکل کیوں ہوگا۔ میں نے چہرے پر تین سو تیرہ سلوٹیں ڈالتے ہوئے کہا۔

ایمرجنسی حالات کی وجہ سے ہوٹل نو بجے سے پہلے ہی بند ہو جاتے ہیں۔ ناشتہ کیا بوچڑ خانے میں لیجا کر کراؤں گا۔

تو چلو جلسہ سے پہلے ہی نمٹ لیتے ہیں۔

ان کے ہوش منتشر ہوگئے۔ لیکن فوراً ہی انھوں نے اپنے ہوش سمیٹتے ہوئے کہا۔

چلو پھر ہم ناشتہ تو کرا ہی دیں گے۔ لیکن یہ اعلیٰ درجہ کی قید ہٹاؤ۔ ادنیٰ درجہ کا ناشتہ کرانے کی گنجائش ہے۔

گنجائش نہ ہونے کا کیا مطلب۔

آجکل ہمارے اقتصادی حالات بہت زیادہ خراب چل رہے ہیں۔

جھوٹ بولتے ہو۔

جھوٹ بولوں تو پورے شہر میں طاعون پھیلے۔

اچھا جیب دکھاؤ۔

دیکھ لو۔ دو روپے سے زیادہ برآمد ہو جائیں تو میری داڑھی صاف کر کے غریبوں میں تقسیم کر دینا۔

میں نے ان کی جیبیں ٹٹولیں۔ واقعتاً صرف دو ہی روپے پڑے ہوئے تھے اور ان کی حالت بھی بڑی نازک تھی۔ بالکل گھجیائے ہوئے تھے۔ میں نے ان نوٹوں کا سرسری معائنہ کیا۔ پھر واپس ان کی جیب میں ڈالتے ہوئے بولا۔

اچھا پرسوں ڈھنڈیرے میں تقریر تھی، وہاں سے کیا ملا تھا۔

کل اکیس روپے آٹھ آنے۔ بیس روپے تو تقریر کرنے والوں کی طرف سے ملے تھے اور ڈیڑھ روپیہ ایک صاحب نے چلتے ہوئے پکڑا دیا تھا۔

بیس روپے تو واقعتاً بہت تھوڑے ہیں۔ میں نے مترحم انداز میں کہا۔

جی ہاں آجکل مقررین کی مارکیٹ ڈاؤن ہے۔ دراصل ربیع الاوّل اور شعبان اور رمضان کے مہینوں میں کمائی کا سیزن ہوتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے ہیں۔ آجکل تو بس یہی ہے کہ بیس، چالیس یا بہت تیر مارا پچاس۔ اس سے زیادہ نہیں پھنستے۔

ڈھنڈیرے میں مولوی گل بدن نے بھی تقریر کی تھی۔

کی تھی۔

انھیں کیا ہاتھ لگا تھا۔

سوا گیارہ روپے۔

کُل۔

انھیں پندرہ روپے سے زیادہ آجتک کسی دیہات سے حاصل نہیں ہو سکے۔ تقریر کرنا ان کے بس کا روگ نہیں۔ تقریر ان کے بس کی نہیں تو لوگ انھیں بلاتے کیوں ہیں؟

بس یہ سمجھو کہ قسمت ساتھ دے رہی ہے۔

قسمت اگر ساتھ دیتی تو معاوضہ پندرہ روپے آکر ہی اینڈ کیوں ہو جاتا۔

یہ بھی صحیح ہے۔

صوفی اکتوبر کی مارکیٹ کیسی چل رہی ہے۔

ان کی مارکیٹ پورے شباب پر ہے۔ وہ تقریر بھی اچھی کرتے ہیں۔ پھر شہروں میں کرتے ہیں۔ شہر والوں کی قدردانی کا معیار بہت اونچا ہے۔ انھیں تو ایک تقریر کا معاوضہ کبھی کبھی ہزار مل جاتا ہے۔ حیدرآباد میں انھوں نے تقریر کی تھی دو ہزار کھینچ لائے تھے۔ دو ہزار تو ہم ایک درجن تقریریں کر کے بھی نہیں بٹور سکتے۔

صوفی صاحب آجکل میں بھی تقریر کی مشق کر رہا ہوں صحیح۔ "انھوں نے تحیر کا اظہار کیا"۔

تمہاری صحت کی قسم کل رات میں نے ملائن کو اپنے سامنے بٹھا کر کامل ایک گھنٹہ تک تقریر کی۔ موضوع تھا۔ "بس دو یا تین بچے"۔

اس موضوع پر تو ہم نے کانپور میں لگاتار تین گھنٹے تقریر کی تھی۔ اور ثابت یہ کیا تھا کہ فیملی پلاننگ نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ جمعیۃ العلماء کے ایک ممبر بھی ساتھ تھے انھوں نے تو قسمیں کھا کھا کر کہا تھا کہ فیملی پلاننگ عبادت کا ایک جزء ہے اسے اپنائے بغیر جنت کی نعمتیں نصیب نہیں ہوسکتیں۔ ایک معتبر آدمی نے کہا تھا، اسی رات ہماری تقریروں سے متاثر ہو کر اسی آدمی خصّی ہو گئے تھے۔

اچھا اب اٹھ جاؤ۔ میں ہڑبڑا کر بولا کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے درجہ کا ناشتہ بھی نصیب نہ ہو"۔

وہ مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ میں مسکرانے کی وجہ نہیں سمجھ سکا اور نہ ہی میں نے سمجھنے کی کوشش کی۔

ایک بوسیدہ سے ہوٹل میں چائے والے پی کے ہم سیٹھ کلن خاں کے مکان پر پہنچے جہاں جلسہ کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ صوفی ہاروت تقریر فرما رہے تھے۔ ہم لوگ ٹہلاتے بل کھاتے اسٹیج تک پہنچے۔ ہمیں دیکھ کر لوگ چیخ اٹھے۔

لیجئے صاحب۔ ملا ابن العرب مکی تشریف لے آئے ایک کونہ سے آواز آئی۔ بڑے زندہ دل آدمی ہیں۔ دوسرے کونہ سے آواز آئی۔ کھلنڈرا ہے سالا۔

صوفی ہاروت نے تقریر کا سلسلہ منقطع کرتے ہوئے کہا۔

بھائیوں! خاموشی کے ساتھ بیٹھو۔ یہ کیا بدذوقی ہے کہ میں بول رہا ہوں اور تم سننے کے لئے تیار نہیں۔

یہ سنکر ایک صاحب جھلا گئے اور کھڑے ہو کر بولے آپ تقریر ختم کرنے کا کیا لیں گے۔ براہ کرم آپ تقریر نہ کرنے کا معاوضہ لے کر ہمارا پیچھا چھوڑ دیجیے۔

صوفی ہاروت کے چہرے پر بدحواسی کی آندھیاں چلنے لگیں۔ انھوں نے مردہ لہجے میں کہا۔

بس ایک واقعہ اور بیان کر دوں پھر تقریر ختم کرتا ہوں انھوں نے اپنے سیدھے انداز میں ایک واقعہ اور بیان کیا اور کرسی سے نیچے اتر گئے

صوفی نمکین اناؤنسری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر کہا۔

رات زیادہ ہو چکی ہے لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب میں صدر محترم معشوقِ ملّت الحاج حضرت مولانا نجناور صاحب پانی پتی کو دعوت تقریر دوں۔ لیکن حضرت والا کی تقریر سے پہلے میں بیسیوں سامعین کی فرمائش پر ملا ابن العرب مکی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ ہمیں اپنی کسی تازہ نعت یا تازہ غزل سے نوازیں۔ امید ہے کہ وہ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔

میں نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ نمکین صاحب مجھے معاف کیجئے آپ حضرت کی تقریر کرائیے۔ لوگ ان کی تقریر سننے کے لئے بے چین ہیں۔

سامعین کی فرمائش ہے کہ آپ کی ایک غزل ہو جائے صوفی نمکین چیخے۔

ہوگی —— ہو کر رہے گی۔ مختلف آوازیں فضا میں لہرائیں۔ صوفی تیار کہ ملی بھی پر تپاک لہجہ میں بولے:۔

چلو یار۔ مخلوقات کا دل کیوں توڑتے ہو۔ اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے۔

مجھے بادلِ ناخواستہ مائک کے سامنے جانا ہی پڑا۔ میں نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا، پھر کھنکھار کر مولویوں کی سنت ادا کی اور پھر قاری باسط کی آواز میں بولا۔

دوستوں اور بزرگوں، ماؤں اور بہنوں اب تو دماغ کی رگیں خشک ہو چکی ہیں۔ انشراح صدر بھی نہیں ہو پاتا۔ لہٰذا تازہ غزل کی فرمائش تو پوری نہیں کی جا سکتی ایک پرانی غزل پیش کر رہا ہوں شائد ارباب ذوق پسند فرمائیں۔

ضرور پسند فرمائیں گے صاحب۔ آپ ارشاد فرمائیں صوفی حیرت علی اپنی بلغمی آواز میں چیخے۔

میں نے دیکھا پورا مجمع ہمہ تن خاموش اور میری طرف متوجہ تھا۔ میں نے غزل کا مطلع پیش کیا۔

آدم سا بھی ہو کے رہا صید مسمّات
پھر حضرت ملّا تو ہیں اک رندِ خرابات

واہ واہ کیا کہنے۔ بڑی گہری بات کہہ ڈالی ہے پورا مجمع مچل اٹھا۔ صوفی حیرت علی بولے۔ اگر زحمت نہ ہو تو دوبارہ پڑھئے۔

میں نے دوبارہ شعر پڑھا۔

آدم سا بھی ہو کے رہا صیدِ مُسمّات
پھر حضرتِ ملّا تو ہیں اک رندِ خرابات
قاصد سے مرے یار نے کہلائی ہے یہ بات
داڑھی کو کرو صاف تو ممکن ہے ملاقات
اللہ رے سجادۂ و صوفی کے مقامات
منسوخ ہیں ان کے لئے اللہ کی آیات
کس کس سے کروں دوستو لٹے کی شکایات
ہر شخص بتاتا ہے مری روز حجامات

حجامات کیا مطلب؟ پورا مجمع سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔

تبت کے علاقہ میں حجامت کی جمع حجامات استعمال ہوتی ہے" میں نے افلاطونی لب و لہجہ میں فرمایا۔

ازراہِ کرم یہ بھی واضح فرما دیں کہ تبت ہندوستان میں ہے یا پاکستان میں" کوئی صاحب جھنجھلا کر بولے۔

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ امام مالک یہ فرماتے ہیں کہ تبت پاکستان میں ہے امام احمدؒ کا خیال ہے کہ تبت ہندوستان میں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اس مسئلہ میں خاموش ہیں۔ امام شافعیؒ کے دو قول ہیں۔ قولِ قدیم یہ تھا کہ تبت نہ ہندوستان میں ہے اور نہ پاکستان میں۔ بلکہ تبت، تبت میں ہے۔ اور قول جدید یہ ہے کہ عوام کا اس مسئلہ میں الجھنا ٹھیک نہیں۔ اہلحدیث کا مسلک چونکہ نرالا اور سب سے الگ تھلگ ہے لہٰذا وہ اس بارے میں بھی ایک عجیب و غریب رائے رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم تبت کے وجود ہی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جب تک کسی حدیث سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اللہ میاں نے تبت نام کی کوئی چیز دنیا میں پیدا کی ہے

ایک دھان پان قسم کے صاحب اچھل کر بولے حضرت حدیث میں ہو یا نہ ہو لیکن قرآن میں تو اس کا ذکر ہے۔ وہ ہے نا ایک آیت۔ تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔

مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا۔ میں نے دیکھا صوفی نزاکت کچھ بولنے کے لئے ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔ میں نے اک دم اسٹارٹ لے لیا تاکہ انھیں بکواس کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

اک دل تھا جسے فلم کی پریوں نے چرایا
اک جاں تھی جو بھارت میں ہوئی نذرِ فسادات
اس بت نے کہا میں نے تجلی کو پڑھا کر
بولا کہ مبارک تجھے مذہب کی خرافات
اک حضرت سادھو نے دکھائے وہ کرشمے
کونے میں دھری رہ گئیں مُلّا کی خرافات

میں نے لاکھوں کی تعداد میں داد وصول کی۔ لوگ بہت خوش ہوئے۔ میری غزل کے فوراً بعد حضرت

معشوق ملت نے تقریر شروع کی۔ انہوں نے حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا:۔

دوستو اور بزرگو!

آپ نے سنا ہوگا کہ آقائے نامدار، سردار دوجہاں حاصل کائنات، عجم کے چاند، عرب کے سورج، بیکسوں کے والی، محبوب خدا، حاجت روا، مشکل کشا، احمد مجتبٰے، محمد مصطفٰے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لائے تو کفر و شرک کے ایوانوں میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور دنیا کے تمام مندروں — نہیں — تمام بتخانوں کی دیواروں میں دراڑ پیدا ہوگئی اور دنیا میں جتنے بھی کافر موجود تھے اور جتنے قیامت تک پیدا ہونے والے تھے سب اپنے سر میں درد محسوس کرنے لگے۔ آپ کے دنیا میں مبعوث ہوتے ہی عرب کی کایا پلٹ گئی۔ رحمت کی بارشیں برسنے لگیں۔ کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ بکریوں کے تھنوں میں منوں دودھ اتر آیا۔ اور دوسرے ایک لاکھ معجزات ظہور میں آئے۔ دوستو محبوب خدا کی شان ہی نرالی ہے۔ آپ کا کوئی ثانی نہیں آپ کے ذکر کے بغیر کوئی محفل بابرکت نہیں ہوسکتی۔ آپ پر درود بھیجے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو پاتا۔ تمہیں شاید معلوم نہ ہو لیکن مجھے معلوم ہے کہ قرآن کے ایک صفحہ پر جلی الفاظ میں یہ لکھا ہوا ہے

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا — اس کا ترجمہ یہ ہے کہ بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر اے ایمان والو تم بھی نبی پر درود و سلام بھیجو — اس آیت کی رو سے ہر محفل میں ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے۔ لہٰذا بھائیو ایک ایک بار درود شریف پڑھ لو — اللّٰھم صل علیٰ محمد —

سب کی زبان پر درود جاری ہوگیا۔ میں نے بھی درود شریف پڑھا۔ میرے برابر میں صوفی تمنا بیٹھے ہوئے تھے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہنے لگے۔

تم دیوبندیوں کو درود بہت گراں گزرتا ہے۔
کون مردود کہتا ہے۔ "میں جھلا گیا"۔

ایک مردود تو میں ہی ہوں۔ انھوں نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا اور ابھی درود کیا تمہارے باپ نے پڑھا تھا۔

"میں نے باغیانہ انداز میں کہا"

مجبوری کی حالت میں تو پڑھ ہی لیتے ہو۔ ورنہ وہابیوں اور مودودیوں کی تقریروں میں درود کی لذت کہاں ہے۔

اماں یار تقریر نہیں سننی تو باہر نکلو۔ نہ سنتے ہو نہ سننے دیتے ہو — یہ خالص زنانی آواز تھی لیکن نکل رہی تھی ایک مرد ہی کے منہ سے۔

میں پھر معشوق ملت کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ فرما رہے تھے برائے برکت میں نے محبوب خدا کے بارے میں چند باتیں عرض کیں۔ اب میں موضوع کی طرف آتا ہوں۔ آج کی تقریر کا اصل موضوع وہ فتنہ ہے جو طاعون کی طرح ساری دنیا میں پھیل رہا ہے اور جسے ہم سب مودودیت کے نام سے جانتے ہیں۔ یہی وہ فتنہ ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ اس فتنہ سے دامن ایمان کو بچانا ہر مسلمان کا بھی فرض ہے اور ہر انسان کا بھی جس مسلمان کے سینہ میں ایمان کی رمق اور جس انسان کے سینہ میں انسانیت کی خوبو باقی ہوگی وہ فتنۂ مودودیت سے بچکر رہے گا۔

منشی مودودی نے اپنے ایجاد کردہ فتنہ کو دنیا میں پھیلانے کے ہزاروں ذرائع پیدا کئے ہیں۔ ان میں ایک ذریعہ تفہیم القرآن بھی ہے۔ یہ اس دور کی سب سے خطرناک کتاب ہے۔ بدنصیبی سے ہمارے ہی حلقہ میں کچھ ایسے نادان لوگ بھی پیدا ہوگئے ہیں جو تفہیم القرآن کو وضو کرکے ہاتھ لگاتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک خطرناک کتاب ہے۔ معاشرہ کی رگوں میں جتنا زہر تفہیم القرآن نے پھونکا ہے، تاریخ گواہ ہے کہ اتنا زہر کبھی کسی کتاب نے نہیں پھونکا۔ تفہیم القرآن کے اندر قرآن کی صرف آیتوں ہی میں تحریف کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ پوری کی پوری سورتیں بدل ڈالی ہیں۔ یقین نہ آئے تو تحقیق کر لیجئے لیکن یہ واضح رہے کہ تفہیم القرآن کو ہاتھ لگانے والا بالاتفاق گمراہ ہے۔ خواہ ہاتھ لگانا تحقیق کی غرض سے کیوں نہ ہو۔ علامہ مخدوم الدین نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص مودودی کی

ہر کتاب کو مجموعہ ممنوعہ نہ سمجھے اس کی بیوی پر خود بخود دس سو طلاقیں پڑجاتی ہیں۔ سو طلاقوں کا مطلب یہ ہے کہ حلالہ بھی کارگر نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اے صاحب ایمان بھائیو منشی مودودی کی کتابوں کے مطالعہ کو جھٹکے کے گوشت کی طرح حرام الحرام سمجھو ورنہ تمہارے ایمانوں کے حلئے بگڑ جائیں گے اور تم دوزخ میں پھینک دئیے جاؤ گے۔

سہارنپور کے علاقہ میں ایک بزرگ رہتے ہیں۔ مولانا زکریا صاحب ان سے اور ان کی جماعت سے ہمیں شدید اختلاف ہے۔ ہم انھیں اور تمام دیوبندیوں کو دہابڑا تصور کرتے ہیں، اور ہیں ہی یہ سب وہابڑے۔ لیکن پچھلے دنوں مولانا زکریا صاحب نے مودودیت کے خلاف ایک کتاب لکھ کر امت مسلمہ پر بلکہ جہاں پر ایک زبردست احسان کیا ہے اس کتاب کے صلہ میں اگر انھیں جنت کی ستر لاکھ حوریں بھی مل جائیں تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ان سے ایک کمال یہ بھی سرزد ہوا ہے کہ چونکہ مودودیت دیہاتوں میں زیادہ پھیل پھول رہی ہے۔ لہٰذا انھوں نے دیہاتی زبان میں کتاب کو مرتب کیا ہے۔ اگر وہ کتاب کو علمی اور ادبی انداز میں مرتب کرتے تو دیہاتی لوگ خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے بہرحال یہ کتاب اس دور کی سب سے زیادہ سچی کتاب ہے اس میں کچھ انکشافات کئے گئے ہیں۔ انھیں وحی اور مبین حق تصور کرنا مسلمان ہونے کی علامت ہے۔ ویسے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ آپ لوگ اسے حُبِّ علی نہ سمجھ بیٹھیں بلکہ یہ بغض معاویہ ہے۔ یعنی کہ مولانا زکریا کو جو تھوڑی بہت تعریف کا مستحق ہم نے سمجھا ہے اسی کی واحد وجہ یہ ہے کہ آجکل وہ فتنۂ مودودیت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں۔ ورنہ ہم سدا سے ان کے مخالف ہیں اور انھیں مومن کامل نہیں سمجھتے اور اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر، ناظر، عالم الغیب اور حضرت علی کو مشکل کشا اور حاجت روا کہنے کے لئے تیار نہیں ہوجاتے۔ اور دن کی روشنی میں غوث پاک کے مزار کا طواف کرتے نہیں دکھلاتے۔

دوستو! یہ مودودی لوگ صحابہ کرام کے بھی جانی دشمن ہیں۔ منشی مودودی نے ایک کتاب لکھی ہے خلافت و ملوکیت اس کتاب میں کوئی صفحہ ایسا نہیں ہے جس میں صحابہ کرام کو ذلیل کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ منہ بھر بھر کے صحابہ کرام کو گالیاں دی ہیں اور جو صحابہ کو گالیاں دے اس کے کافر ہونے میں کسی کا ذکر بھی شک نہیں۔ لہٰذا مودودی لوگ بالاجماعِ امت گمراہ ہیں اور نارِ دوزخ کے مستحق ہیں۔

ہمارے دور میں ایک قابل افسوس بات یہ بھی ہے کہ جب اسلام کی خاطر قربانیاں طلب کی جاتی ہیں تو نوجوان طبقہ تلملا کر کہتا ہے کہ ہم کیا کیا چھوڑیں۔ زندگی کی کوئی نعمت تو ہمارے پاس رہنے دو۔

ابھی چند دن پہلے کی بات ہے کہ ایک شخص میرے پاس بیعت ہونے کیلئے آیا۔ میں نے اس سے کہا تم مودودیت سے تو متاثر نہیں۔ اس نے کہا ہوں ——— میں نے کہا، قسم کھاؤ آئندہ مودودیت کا اثر قبول نہیں کرو گے۔ اس نے کچھ پس و پیش کی لیکن پھر قسم کھا کر عہد کر لیا کہ آئندہ مودودیت سے متاثر نہیں ہوں گا اور آج ہی منشی مودودی کی تمام کتابوں کو چولھے کی نذر کر دوں گا۔ اور تفہیم القرآن کو دریا میں بہا دوں گا۔ میں نے عرض کیا تمہارے اہل خانہ میں کون کون مودودیت کا شکار ہے۔ اس نے کہا حضرت سب کے سب مودودیت میں مبتلا ہیں۔ حتیٰ کہ زوجۂ محترمہ بھی ذہنی طور پر مولانا مودودی کی مریدہ ہیں۔ والدین تو مولانا مودودی کے گرویدہ ہیں۔ بہن بھائی بھی ان کے متوالے ہیں۔ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ سب کو طلاق مغلظہ دے ڈالو۔ اس نے کہا حضرت اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتا۔ میں نے کہا پھر تو خدا کی خوشنودی اور رسولِ دوجہاں کا تقرب حاصل نہیں کر سکتا۔ اتنی سی قربانی دینے سے تو گھبراتا ہے۔ اللہ کے نیک بندوں نے تو جنت تک قربان کر ڈالی ہے۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا تو میں نے اسے وہ جواب سنا ڈالا جو اسلام کی سب سے بڑی شخصیت، سراپائے سنت جناب صوفی

میٹھے شاہ نے جاگنے کی حالت میں دیکھا ہے۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ بریلوی حضرات سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب کو پروردگار نے جنت میں داخل کر دیا۔ وہ جنت میں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ وہاں ہزاروں ایسے لوگ موجود تھے جو دنیا میں مودودیت کا شکار تھے۔ وہ صاحب چھلّا اٹھے اور انھوں نے اپنا بوریہ بستر سمیٹ کر دوزخ میں چھلانگ لگا دی۔ اور اہل دوزخ سے فرمایا۔ یہ دوزخ لاکھ درجہ بہتر ہے اس جنت سے جہاں مودودیوں کی بھرمار ہو — دیکھا صاحبو! جنت بھی قربان کر دی۔ یہ ہے جرأت اور جسارت اور یہ ہے ایمان کامل ہونے کی علامت۔ یہ ہے عشق وحدانیت نعوذ باللہ۔

سبحان اللہ! کیسے کیسے لوگ گذرے ہیں۔" مجمع جھوم اٹھا۔ میں نے بھی جھوم منے کی ایکٹنگ کی"۔

معشوق ملت نے اپنے لہجہ میں ملائمت پیدا کرتے ہوئے کہا، میں گذارش یہ کر رہا تھا کہ میں نے اس شخص سے عرض کیا کہ تم اپنے تمام گھر والوں کو طلاق دے ڈالو۔ وہ مردود اس قابل نہیں کہ ان سے رشتہ داری باقی رکھی جائے۔ خدا کا کرنا دیکھئے کہ واقعۂ عبرتناک سننے کے بعد اس کا دل بھر گیا اور وہ اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ اب کبھی اپنے گھر میں جھانک کر بھی نہ دیکھوں گا۔ آج وہی شخص اجمیر کی ایک مسجد میں امامت کے عہدے پر فائز ہے۔ اس کا کوئی رشتہ دار اگر اسے لینے کے لئے جاتا ہے تو وہ کھا جانے کے انداز میں بڑبڑاتا ہے اور کہتا ہے جاؤ تم پر طلاق اور تمہاری آنے والی سات پشتوں پر بھی طلاق۔

تو بھائیو! قربانی دو۔ خصوصاً میں نوجوانوں سے مخاطب ہوں کہ وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی ہر چیز قربان کر دیں۔ تب ہی ان کا ایمان راسخ ہو سکتا ہے۔ بہرحال جماعت اسلامی ایک باعث فتنہ ہے۔ آپ دیکھ لیجئے جب سے مودودیوں کو جیل میں سزا دیا گیا ہے تب سے ہر طرف امن ہی امن ہے۔ آٹا بھی سستا ہو گیا ہے، بجلی بھی نہیں بھاگتی، اور مسجدوں سے جوتے بھی چوری نہیں ہوتے۔ اب میں سیٹھ کلن کے اتار سے مخاطب ہو کر عرض کروں گا کہ وہ کلن خاں سے پھر وابستگی قائم کر لیں۔ ان لوگوں نے کلن خاں کے گھر کھانا پینا اسلئے چھوڑ دیا تھا کہ کلن خاں نے سودی کاروبار شروع کر دیا ہے لیکن ان کے میرے عزیز یہ کھا ئیو فقہ کی ایک معتبر کتاب کی میں نے کچھ عبارت کی ہے۔ اس کتاب کے پہلے ہی صفحہ پر عربی زبان میں لکھا ہوا ہے کہ جو شخص زندگی میں زیادہ سے زیادہ دو جلسے اور کم سے کم ایک جلسہ دو دیوں کے خلاف کرا دے اسکے اگلے پچھلے تمام صغیرہ و کبیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ایک مقدس کتاب کی اس مقدس عبارت کی رو سے سیٹھ کلن خاں کے اگلے پچھلے چھوٹے بڑے اعلانیہ اور پوشیدہ تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ اب جو شخص سیٹھ کلن خاں کے گھر اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے سے احتراز کریگا وہ شرا کافر ہے۔ میں ایسے شخص کے بارے میں کسی بھی وقت کفر کا فتویٰ شائع کر سکتا ہوں۔ میں گذارش کرتا ہوں کہ آپ تمام لوگ باری باری اللہ کر کلن خاں کو گلے لگائیں اور ابھی اس بات کا قسمیہ وعدہ کریں کہ وہ کلن خاں کو خیر القرون کا ایک فرد گمان کریں گے اور اس کے گھر کھانے پینے کے سلسلہ کو جائز ہی نہیں بلکہ باعث برکت تصور کریں گے۔

میں نے دیکھا لوگ دیوانہ وار اٹھے اور کلن خاں سے معانقہ کرنے لگے۔ کلن خاں کے چہرہ پر بشاشت و شگفتگی پھیل گئی تھی اور اس کے ستے ہوئے چہرے پر مسرت و انبساط کے ایک دو جن ہنڈے روشن ہو گئے تھے

تقریر کا سلسلہ اس کے بعد بھی تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد جب ہم لوگ باہر آئے تو صوفی معراج کہنے لگے۔ ملا صاحب کہئے تقریر کیسی رہی۔

کیا کہنے۔ بڑی خوبصورت تقریر کرتے ہیں۔ کاش میں ٹیپ ریکارڈر ہوتا تو تقریر کا ایک ایک لفظ محفوظ کر لیتا۔ آخرت میں کام آتی۔

آپ کی غزل بھی خوب رہی۔ صاحب واقعی آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں "معشوق ملت کے ایک مرید خاص لہرا کر بولے"۔

جی میں دلچسپ تو ضرور ہوں لیکن — لیکن — لیکن کیا کیا آدمی نہیں ہیں — اگر آدمی ہوتا تو آدمیوں کی محفل میں جاتا۔ تم جیسے گدھوں کی محفل میں کیوں چلا آتا — یہ بات ہے — خیر سمجھیں گے۔ انھوں نے سینہ پھلا کر کہا — کیا سمجھے گے۔ میاں جی چلا گیا بیٹے اہل سنت والجماعت کے تمام زندوں مردوں کے ناک میں دم کر دوں گا۔

صوفی تبارک علی میرا ہاتھ کھینچ کر بولے۔ آؤ یار کیا جھگڑتے ہو۔ اور پھر ہم دونوں اپنے گھر کی طرف مڑ گئے (ملّا زندہ۔ صحبت باقی)

مولانا عامر عثمانیؒ نے کیا کام کیا اور اب ہمیں کیا کرنا ہے؟

شمس نوید عثمانی

دین فطرت ــــــــ دین قیم
ــــــــ دین حق ــــــــ الدین ــــــــ

یعنی ازلی و ابدی واحد دین ــــــــ اس دنیا میں انسان کا واحد راس المال اور واحد اصلی پونجی ہے ــــــــ وہ سرمایہ جو اللہ تعالیٰ کے در سے ہی مل سکتا ہے اور وہ خود ہی جسے بنفس نفیس اپنے ہاتھ سے اپنے بھکاریوں اور بھکارنوں کی جھولی میں ڈالتا ہے اور ــــــــ اگر یہ سرمایہ مل جانے کے بعد خدانخواستہ گم ہو جائے تو خود انسان عالم اسباب کے کسی بھی سبب اور ذریعے اس کو اپنے آپ نہ بنا سکتا ہے نہ کما سکتا ہے ــــــــ عقل شاید ایمان اور وحی کی نعمت کے بعد آدمی کے اندر وں کی سب سے بڑی طاقت ہے اور تجربات زندگی عقل کی سب سے بڑی جولانگاہ ہیں ــــــــ لیکن اگر "دین قیم" کا چراغ گل ہو چکا ہو تو یہی وسیع ترین جولانگاہ اس طاقتور ترین عقل کے لئے تنگ و تاریک ہو تی ہے کہ ہر قدم پر ٹھوکر لگتی ہے اور ہر نظر اندھی ہو کر گرنے لگتی ہے۔ پھر انسان ایسا اندھا ہوتا ہے کہ خود اپنی حقیقت بھی اسے نظر نہیں آتی ــــــــ وہ خدا کی نظروں سے گرتے ہی اپنی نظروں سے بھی اس طرح گرتا ہے کہ حیوانات، نباتات اور جمادات اور طاغوت و شیطنت کے غلیظ پیکر اسے اپنا "خدا" نظر آنے لگتے ہیں۔ اور خود فریبی کا وہ آخری عالم طاری ہوتا ہے کہ اسے یہ حماقت آخری درجہ کی دانائی محسوس ہوتی ہے اور اس حماقت سے اگر اسے کوئی آزاد کرانا چاہتا ہے وہ اس کی نظروں میں پرلے سرے کا احمق قرار پاتا ہے۔

واذا قیل لهم آمنوا کما آمن الناس قالوا
انؤمن کما آمن السفهاء (البقرہ)

اور جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ آدمیوں کی طرح ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ کیا احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں ہم؟

کونسی قوم ہے جسے اللہ کے در سے "دین قیم" کی نعمت نہیں ملی تھی؟ لیکن کونسی ملت ہے جس کے پاس آج امت مسلمہ کے سوا یہ اصل سرمایہ اپنی اصل حالت میں باقی رہ گیا ہو؟ ــــــــ قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر صحیفہ ماقبل تاریخ کی تاریکیوں میں لپٹ کر رہ گیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر رسول اور ہر نبی تاریخی حقیقت کے بجائے دیومالائی کہانی میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے ــــــــ حد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو حضورؐ سے محض چند سالوں کے فاصلے پر ہیں خدا کے بندے اور رسول ہونے کے بجائے خدا اور خدا کے بیٹے کی حیثیت خود عیسائیوں میں

اختیار کر گئے۔ اور خدا کی توحید ان کے یہاں ایک واضح اور روشن عام فہم سچائی کی جگہ تثلیث کی ایسی چیستاں بن کر رہ گئی کہ اس کو سمجھنے کی ہر کوشش نہ سمجھ سکنے کے ساز و سامان کا انبار در انبار ہوتے ہوئے ایک پورا علم کا شعبہ "مسیحیات" —— (CHRISTOLOGY) ہو چکی ہے اور پھر بھی کوئی نہیں جانتا کہ مسیح تھے کیا؟ دوسرا مذہب تو کچھ زمانی اعتبار سے دور کی بات ہیں۔ وہاں اس انداز پر قومیں جس شان سے بھٹک رہی ہوں گی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن

یہ تاریخی ستم ظریفی تو دیکھئے اور انسانیت کی زبوں حالی کا ماتم کیجئے کہ ہر طبقہ اور ہر گروہ قرآن مجید کی اس آیت کی منھ بولتی تصویر بنا ہوا ہے کہ "كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ" ہر ایک کا دعویٰ نہیں، ایمان ہے کہ راہ حق پر —— دینِ حق پر بس ہم ہی ہم ہیں۔

لیکن کوئی اس انسانی ٹریجڈی پر کہاں سے اشک افشانی کی توفیق پائے جہاں حال یہ ہو چکا ہو کہ لوگ دیوانوں کی دیوانگی پر غضبناک ہونے کی اس سے بھی بڑی دیوانگی دکھلائے چلے جا رہے ہوں۔ ایک آدمی مادی طور پر پاگل ہوتا ہے تو ساری دنیا اس کو دیکھ کر اسے قابل معافی سمجھتی ہے۔ مگر قومیں دینِ حق کھو کر پاگل ہوتی ہیں تو اس دیوانگی سے محفوظ لوگ بھی اس سے بحث و مناظرہ میں تو الجھتے ہیں۔ اس پر ترس کھا کر اس کے مرض کی تہ تک پہنچنے اور اس کے اصلاح حال اور علاج کی تڑپ محسوس نہیں کر پاتے۔

مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عہدِ فریبی کے بنیادی تار و پود پر ضرب کاری لگائی تھی۔ اور ان کی تحریروں کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ توحید، رسالت اور آخرت کے تین بنیادی عقائد کو تہ و بالا کرنے کے لئے ابلیس کن چور دروازوں سے حملہ آور ہوتا رہا ہے۔ ان کے مضامین ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ توحید، رسالت اور آخرت کے تینوں بنیادی عقیدوں میں اگرچہ توحید اصل بنیاد ہے مگر ابلیس اس توحید کی بنیاد اکھیڑنے کے لئے سب سے پہلے رسول کی رسالت کے عقیدے کو نشانہ بناتا ہے اور رسول کی اصل حیثیت کے لئے عقیدت و محبت کی نظروں کو اندھا کر کے سب سے پہلے رسول ہی کو پہلا "نقلی خدا" بناتا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مولانا عامر عثمانیؒ نے توحید و سنت سے منتخب مضامین پر مشتمل جو کتاب اپنی زندگی میں مکتبہ تجلی سے شائع کی تھی وہ اگرچہ اصلاً "توحید" کی تعلیم و تلقین کے لئے تھی۔ مگر اس کا عنوان تھا "بدعت کیا ہے؟" اور اس کتاب میں موصوف کا جو اپنا مقالہ شامل ہے اس کا تو عنوان ہی ان کے مافی الضمیر کا آئینہ دار تھا اور وہ یہی تھا کہ "بدعت توحید کی ضد ہے"!

اس کا مفہوم یہی تو ہوا کہ اگرچہ لغوی اور اصطلاحی طور پر تو بیشک بدعت توحید کی نہیں سنت کی ضد ہے لیکن رسول اصل تصور بگڑتے ہی الوہیت کی سرحدوں میں داخل ہوتا رہا ہے —— خدا کے بعد اور خدا کو چھوڑ کر یا خدا کے ساتھ ہم سے اگلوں نے سب سے پہلے جس ذات کو خدا بنایا وہ رسول ہی تھے —— جیسے انسانیت کی گمراہیوں کو دور کرتے کے لئے اللہ تعالیٰ بھی پہلے اپنی رحمت کا جو دروازہ —— صدر دروازہ کھولتا ہے وہ بھی رسول ہی ہوتا ہے، ایسا ابلیس بھی شرک کے پاتال میں دھکیلنے کے لئے ضلالت و گمراہی کا جو سب سے پہلا دہانہ کھولتا ہے وہ بھی رسالت کی اصل حیثیت کو مسخ کر کے رسول میں الوہی صفات کا زہرناک عقیدہ سمو دینا ہے۔ سنت نام ہے رسول کی رسالت کی اصل حیثیت کو ماننے کا اور بدعت نام ہے اس حیثیت سے ہٹنے کا اور اس کے نتیجہ کے طور پر رسول کی شخصیت میں الوہی صفات کا عقیدہ گھڑ کر شرک کے غار میں آخر کار جا گرنے کا —— اس لئے بطور مآل کار دیکھا جائے تو بدعت واقعتاً سنت کی نہیں توحید کی ضد ہے گویا شیطان سب سے بڑا استحصال کنندہ ہے جو خدا کی سب سے بڑی نعمت "رسول" کی اصل حیثیت کو "ایکسلائٹ" کرتا ہے، اور وہ اس طرح کہ:-

وہ انسانی ذہن میں سب سے پہلے یہ مسموم ترین جھوٹ اتارتا ہے کہ خدا کا رشتہ تمام بندوں سے یکساں نہیں —— اس لئے گناہگاروں کو اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے

نیک اور پارسا بندوں کا درمیانی واسطہ درکار ہے۔ وہ خدا کے متعلق گویا ایک ایسی مخلوق کا سا تصور ذہن میں جما تا ہے جو اپنے مفادات اور جذبات کے لحاظ سے کچھ سے تو قریبی تعلق رکھتی ہے اور کچھ سے دور کا ——— مثلاً ایک حکمراں انسان جو "عوام" سے دور ہوتا ہے اور خواص سے نزدیک اس کی بارگاہ تک عوام کی رسائی ان خواص کے وسیلہ سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ ابلیس بظاہر اس عقیدے کو اس خوبصورت منطق میں لپیٹ کر سامنے لاتا ہے کہ جیسے گناہ کی ہولناکی اور نیکی کی عظمت کا درس دے رہا ہو ——— لیکن خدا کے سلسلہ میں اس کی منطق وحی کی روشنی میں "آدھا سچ" ہے جو مکمل جھوٹ سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے ——— اس لئے کہ جھوٹ ایک جھوٹا بھی بولتا ہے تو اس کی برائی اور شناعت کے یقین کے ساتھ بولتا ہے۔ اس کے اعضائے جسمانی اس کی نجاست سے داغدار ضرور ہوتے ہیں مگر قلب وشعور اس کو پاکیزہ سمجھنے کا زہریلا دھوکا نہیں کھاتے۔ مگر نصف سچائی اس کے برعکس ایسا زہر ہے جسے آدمی تریاق اور امرت سمجھ کر پیتا ہے ——— گناہ کو نیکی سمجھ کر اختیار کرتا ہے ——— بے شک گناہ رجس ہے

بدترین نجاست اور خدا اور بندے میں دوری پیدا کرتا ہے۔ مگر یہ "دوری" ایسی عجیب دوری ہے جو دو طرفہ نہیں۔ ایک طرفہ ہوتی ہے ——— یعنی گناہ کے ذریعہ بندہ خدا سے دور ضرور ہو جاتا ہے مگر خدا بندے سے دور نہیں اور قریب ہو جاتا ہے۔ یہ کیسی عجیب بات معلوم ہوتی ہے مگر ہر عجیب بات کا باطل اور غلط ہونا ضروری نہیں۔ اس عجیب حقیقت کو عقل نہیں پا سکتی۔ اس کو انبیاء کرام نے پایا اور مخلوق تک پہنچایا ہے کہ جو سورج کی روشنی اور عقل کی آنکھ سے آگے خدا کی وحی کی روشنی میں روح و دل کی بصیرت سے پراسرار سچائیوں کا نظارہ کرتے تھے ——— مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے حواریوں کے سامنے یہ حقیقت رکھی تو ان کی عقل بھی اس کے عجیب ہونے پر چونک اٹھی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ سوال کیا کہ کیا واقعی خدا نیکوں سے بھی زیادہ گناہگاروں کے قریب تر ہوتا ہے؟! ——— اب یہ نبیوں کی شان تھی کہ ایک تمثیل کے پیرائے میں انھوں نے ان کی عقل کی اس

گرہ کو چٹکی بجاتے ہوئے کھول دیا

"تم یوں نہ سمجھ سکو گے!" ——— انھوں نے فرمایا "مجھے یہ بتاؤ کہ اگر تم ایک چرواہے ہوتے اور تمہارے پاس سو بھیڑیں ہوتیں۔ اور شام کو تم ان کو واپس لانے کے لئے صحرا میں اکٹھا کرتے اور یہ چاہتے کہ ننانوے بھیڑیں تو موجود ہیں مگر ایک کہیں بھٹک کر گم ہو گئی، تم سے دور ہو گئی تو تم کیا کرتے؟ ——— کیا ان ننانوے سے تمہارے دل کا تعلق زیادہ ہوتا ہے یا اس ایک فرد بھیڑ کی فکر زیادہ ہوتی جو تم سے دور نکل گئی۔ بھٹک گئی؟ ——— کیا تم ان ننانوے کے پاس بیٹھے رہتے یا ان ننانوے کو چھوڑ کر اس ایک بھٹک جانے والی بھیڑ کی کھوج میں نکل کھڑے ہوتے؟ ——— بتاؤ تم انسان اس وقت کیا کرتے۔؟

سب نے جواب دیا "ہم اسی ایک کی فکر زیادہ کرتے اور ننانوے کی طرف سے مطمئن رہتے اور اسی ایک کو ڈھونڈنے جاتے"

اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ "افسوس تمہارے حال پر کہ تم اپنے سلسلہ میں تو کتنا صحیح سوچتے ہو مگر خدا کے سلسلہ میں اس طرح سوچنا تمہیں کتنا مشکل محسوس ہو رہا ہے! تم آدمی ہو کر ایک بھٹک جانے والے جانور کی اتنی تڑپ دل میں پالتے ہو۔ تو سوچو خدا ہوتے ہوئے اپنی اشرف المخلوقات مخلوق انسان کی گمراہی اور گناہگاری پر کس قدر رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہوگا۔ اس کے نیک اور صالح بندے تو ان ننانوے بھیڑوں کی طرح اس کے پاس ہی ہیں۔ اس کی رحمت تو ان گناہگاروں کو ڈھونڈ رہی ہے جنھیں گناہوں نے اپنے خدا سے دور کر دیا۔ بھٹکا دیا۔

اور پھر ایک بندہ جب گناہوں کے بعد توبہ کرتا ہے ——— خدا سے بچھڑنے کے بعد دوبارہ خدا کی طرف واپس آتا ہے تو اپنے اس بندے کی "بازیافت" تو اس کی نظروں میں ایک نیک اور پارساترین انسان کی بڑی سے بڑی عبادت سے بھی زیادہ پیاری لگتی ہے۔

اس عظیم حقیقت کو رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے

کھوتے ہوئے ایک حدیث میں ریگستان میں بھٹک جانے والے اونٹ کو بازیافت کی کیسی دل نشیں مثال صحابہ کو سنائی تھی! ——— جس میں بتایا تھا کہ آتش بار دھوپ اور دہکتے ہوئے ریگستان میں ایک آدمی اپنے اونٹ پر چلا جا رہا ہے اور خورد و نوش کا سامان اس سواری پر لادے ہوئے ہے۔ کہ کسی درخت کی چھاؤں میں سستانے کے لئے لیٹ جاتا ہے ——— جاگتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ریت کے اس الاؤ میں اس کی سواری سارے سامانِ زندگی کے ساتھ کہیں گم ہو گئی! ——— اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھسک جاتی ہے اور اپنے آپ کو موت کے جبڑوں میں پھنسا ہوا محسوس کرتے ہی اس کی چیخیں نکل جاتی ہیں ——— وہ تڑپ کر دعا کرتا ہے اور اس اونٹ کی ناکام تلاش میں اپنے قدموں میں چھالے ڈال لیتا ہے مگر اونٹ نہیں ملتا ——— دعائیں اور تدبیریں سب ناکام و نامراد نظر آتی ہیں اور ہر طرف آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا ہے ——— مایوسی کا خوفناک اندھیرا ——— اور پھر وہ مرنے کے لئے موت کے انتظار میں اسی درخت کے سائے میں لیٹ جاتا ہے اور پھر سو جاتا ہے ——— دوبارہ آنکھ کھلتی ہے تو یکایک وہ دیکھتا ہے کہ اس کا اونٹ اس تمام ساز و سامان سمیت خود بخود اس کے پاس واپس آ چکا ہے! ———

یہ دیکھتے ہی خوشی اور کامیابی کا احساس اس کے پورے وجود میں زلزلہ سا پیدا کر دیتا ہے اور شکر و سرور کی شدت میں یہ حال ہوتا ہے کہ زبان لوٹ جاتی ہے۔ کہنا کچھ چاہتا ہے منہ سے کچھ نکلتا ہے ——— وہ کہنا چاہتا ہے کہ اے میرے رب تو میرا کیسا اچھا رب ہے اور میں تیرا کیسا بندہ ہوں" مگر نکلتا یہ ہے کہ "اے میرے رب تو کیسا اچھا بندہ ہے"......"

اور صحابہ جب حسین ترین مثال کے آئینہ میں گمشدہ اونٹ کی بازیابی کی اس انسانی خوشی کی پوری طرح محسوس کر کے آنکھوں میں آنسو بھر لاتے ہیں تو اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایمان و عرفان کے آنسوؤں سے تر زبان میں یہ فرماتے ہیں کہ "ذرا سوچو تو سہی! انسان کو اپنے اونٹ کے کھو جانے کے بعد پانے سے اتنی خوشی ہوتی ہے تو خدا کو اپنے کھوئے ہوئے بندے کو دوبارہ اپنے پاس پا کر کتنی خوشی ہونی چاہئے!

ایک حدیث میں خبر دی گئی ہے کہ اگر ایسے انسان انسانوں میں نہ ہوتے تو خدا ایک دوسری مخلوق پیدا کرتا جو اس گناہ پر توبہ کے خلا کو، توبہ و انفعال کے بغیر خدا کی نظروں میں ناقص اور ادھوری ہی رہتی ——— اندازہ کیجئے یہ توبہ و انفعال کے خونیں آنسو! کہ جن کی ایک دوسری حدیث میں شہید و غازی کے "خون" کے دوش بدوش جگہ عنایت ہوئی اور فرمایا گیا کہ دو قطرے خدا کی نظر میں محبوب ترین تحفہ ہیں جو ایک غلام اپنے حقیقی شہنشاہ کو نذر کر سکتا ہے ایک وہ قطرۂ لہو جو خدا کی راہ میں جسم سے ٹپکے دوسرا وہ قطرۂ اشک ——— قطرۂ اشکِ انفعال جو گناہ کی زخم خوردگی کے عالم میں خطاکار کی آنکھ سے ریاکاری کے بغیر اپنے خدا کے حضور میں ٹپکے۔

ان تمام سنسنی خیز سچی خبروں کے پانے کے بعد مولانا عثمانی جیسے لوگوں نے کیا غلط سوچا کہ ابلیس نے گناہ کی دو طرفہ دوری کی جو بات ذہن انسانی میں ڈالی وہ اس لئے نہ تھی کہ آدمی گناہ کی وحشت ناکی اور نیکی کی جاذبیت و حسن کو محسوس کر کے رحمت الٰہی کا مستحق قرار پائے ——— بلکہ اس دشمن ازلی نے اس خوبصورت منطق کے ظاہر فریب پردے میں یہ چاہا ہے کہ کسی طرح آدمی اور خدا کے درمیان ایسی دوری پیدا کر دے کہ آدمی خدا کی براہ راست عبادت یعنی توحید کے راس المال سے ہاتھ دھو بیٹھے اور کسی تیسرے کو درمیانی وسیلہ بنا کر شرک کے ناقابلِ تلافی نقصان ——— یعنی نقصان میں مبتلا کر کے خدا سے انسان کو ہمیشہ کے لئے دور کر دے ——— وہ آدمی واقعی دانشمند دین کا بڑا ہی دانائے راز تھا جس نے یہ کہا کہ ابلیس کا نشانہ "TARGET" صرف ایک ہی گناہ ہے۔

گنہگاروں کو وہ خدا تک پہونچ ——— براہ راست رسائی سے مایوس کر کے درمیانی واسطوں کے دلدل میں پھنساتا ہے ——— ایک دلدل جس سے جتنا نکلنا چاہو اتنا ہی اور پاؤں دھنستے جائیں ——— اور نیکیوں کو وہ "ریاکاری" اور پندار و خود پرستی کے شرک میں مبتلا کرنے پر کمر بستہ رہتا ہے ——— کسی بھی دوسرے گناہ میں ——— کتنے ہی بڑے گناہ میں انسان

مبتلا ہو تو ابلیس کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ اسے معاف کر دے ۔ ہاں شرک میں پھنسانے کے بعد وہ اطمینان کا یہ سانس لیتا ہے کہ جیتے جی توبہ کے بغیر اس کی معافی کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے اسی دنیا میں مایوس کر دیا ہے اگر یہ بات دل لگتی اور حق ہے تو غور کیجئے کہ اس شرک کے سلسلہ میں ابلیس کی سازش اور سازشی چالوں کو سمجھ لینا کتنا ضروری ہوا! شرک میں مبتلا کرنے کے سلسلہ میں بھی ابلیس کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہوگی کہ درمیانی واسطہ کا جو بُت ہو وہ اتنا شاندار اور ایسا زندہ و پرکشش ہو کہ اس کے "بُت" ہونے کا شبہ بھی آسانی سے پیدا نہ ہو سکے ۔ آدمی کسی بے جان بت کے آگے سر ٹیک دینا ہے تب بھی ابلیس کو اطمینان کہاں! وہ ڈرتا رہتا ہے کہ جس دم اس کی بے جان اور بے بس ہونے والی بات ابھر آئی یہ بیچاری اسی دم اس بت کو توڑ ڈالے گا اور خدائے زندہ کی طرف پلٹ جائے گا ۔ اس لئے بت پرستی کی آخری اور کامیاب ترین شکل ابلیس کی نظر میں یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح گناہ گاروں کی گناہ پر انکساری اور پاکبازوں کی پاکیزگی پر جوش عقیدت و احترام کے نام پر کائنات کی سب سے بڑی تخلیق خدا دنیائی انسانکو اور انسانوں میں بھی سب سے بڑے انسان "رسول" کو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان بت بنا کر حائل کر دے ! ————

آدمی محسوس یہ کرے کہ وہ اس رسول سے محبت کا معاملہ کر رہا ہے اور اپنے سلسلہ میں عاجزی کا رویّہ اختیار کر رہا ہے ۔ مگر خدا یہ سمجھے کہ وہ درحقیقت اس رسول کی عبادت کر رہا ہے اور خود اپنے اس انسانی شرف کو مٹی میں ملا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے پوری مخلوقات کی بھیڑ میں انسان کو تن تنہا عطا فرمایا ۔

اور ———— ہم سب مسلمان جانتے ہیں کہ ہم سے پہلی امتوں کے ساتھ ابلیس یہی سب کچھ کر چکا اور ہمارے نبی سے پہلے ہر رسول، ہر نبی اور پھر آگے چل کر ہر ولی کے سلسلہ میں ٹھیک یہی سازش کر چکا ۔ وہ سب اس لئے اس دنیا میں بھیجے گئے تھے کہ انسان کو خدا کے قریب ہونے کی حقیقت نت نئے طریقوں سے اچھی طرح سمجھا دیں اور اس قربت کی تکمیل کی راہیں دکھا دیں مگر ابلیس نے ان کے بارے میں یہ کہا کہ ان کے متعلق درمیانی وسیلہ کا حقیقی عقیدہ ہٹایا اور وسیلہ کا باطل عقیدہ اس کی جگہ ذہنوں میں پیوست کر دیا ۔ اسکے نتیجہ میں وہی ہستیاں جو خدا کے قرب کا راز سمجھانے والی تھیں ۔ خدا اور بندے کے درمیان ان ہی کے نام و شخصیت کو درمیانی رکاوٹ اور سد راہ بنا دینے کا عمل دیا گیا ۔

وہ وسیلہ کا حقیقی عقیدہ کیا تھا جو خدا نے انسان کو ان ہستیوں کے سلسلہ میں سکھایا تھا اور وہ باطل عقیدہ کیا ہے جس کو ابلیس نے آدمی کے ذہن میں اتارا ہے ۔ ؟

صحیح وسیلہ کے عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ دین حق کی تعلیمات خدا سے لینے کے لئے رسول اور نبی کی ضرورت ہے اور خدا اور رسول کی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے اس تعلیم کے ان استاذوں کی ضرورت ہے جو عقل و فہم اور زہد و اتقا میں اعلیٰ تر سطح کے لوگ ہوں ۔ خدا سے یہ تعلیمات وحی کی جس شکل میں انسان کو موصول ہوتی ہیں وہ صرف رسول اور نبی کے ساتھ خاص ہے ۔ کوئی بڑے سے بڑا ولی بھی اس مقام تک اپنی ولایت اور ریاضت سے اور کوئی بڑے سے بڑا دانشور بھی عقل و علم کے پر لگا کر وہاں تک ہرگز نہیں پہونچ سکتا ———— اور وحی وہ یقینی علم کا ذریعہ ہے جس میں کسی شیطان کی وسوسہ اندازی اور کسی انسان کی غلط اندیشی کو ذرا سا بھی دخل دینے کی مجال نہیں ———— اس کے ماسوا ہر جگہ اس کا خطرہ موجود ہے کہ آدمی کی عقل کو کسی جگہ شیطان لڑا بھڑا دے اور کسی عابد کو کسی وہمی مقام پر بہکا دے ۔ دین حق کی اس بے خطا وصولیابی ہی کی بنا پر انبیاء کرام کو "معصوم" قرار دیا گیا ہے ———— گویا دین کے بارے میں وہ خدا سے جو علم حاصل کرتے ہیں اس کے لینے اور دوسروں کو دینے میں کسی بھی چوک کا سرے سے امکان ہی نہیں ۔

دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ علم دین خدا سے حاصل کرنے کے لئے ہم ان انسانوں کو خدا اور بندوں کے درمیان ایک وسیلہ کی ناگزیر ضرورت ہے ۔ اور وہ وسیلہ انبیائے کرام ہیں اور انبیاء کرام کی لائی ہوئی تعلیم کی حقیقی تہ تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی میں عقل و فہم، ذہنی تفقہ اور قلب کی ...

پاکیزگی کی صفات کما حقہٗ موجود ہوں۔ اور اگر خود اس میں یہ صفات موجود نہ ہوں تو پھر وہ ان صفات کے حامل دوسرے انسانوں کا "سہارا" لے سکتا ہے۔ لیکن وسیلہ ــــ خدا اور بندوں کے درمیان علم دین کا اصل وسیلہ ان کو بھی نہیں بنا سکتا۔ ہاں خدا اور رسول کی تعلیمات جو اصل وسیلہ ہیں ان تک پہنچنے میں آنکھیں کھول کر "سہارا" لینا ضروری ہو تو لینا درست اور ضروری ہے ــــ اللہ اور رسول کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلنا اور ان کے علم پر مکمل بھروسہ کرنا۔ چون و چرا کے بغیر اس کے حق ہونے کا ایمان رکھنا چاہئے۔ لیکن ان دونوں کے سوا کسی بھی تیسرے کو نبی کی طرح "معصوم" سمجھنا درست نہیں۔ خدا اور اس کے رسول کے بعد ہر انسان خواہ وہ کتنا ہی بڑا انسان کیوں نہ ہو اس کا محتاج ہے کہ بشری کمزوری کے نتیجہ میں اگر اس سے کوئی بھول چوک ہو تو دوسرا بھائی اسے بتا دے اور دوسرے جو دین کی باتیں سمجھنے میں غلطی اور کوتاہی کر رہے ہیں وہ خود انکی مدد کرے اور دین کو انھیں بساط بھر زبان و عمل سے سمجھائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے بڑھ کر دینی دیار سا اور دین کا جاننے والا اور کون ہوگا؟ لیکن پھر بھی ان دونوں ہستیوں نے خود اس خطرہ سے بار بار چونکایا کہ ہماری اطاعت اس وقت تک کی جائے جب تک ہم خدا اور رسول کی اطاعت کر رہے ہوں۔ ایک بار حضرت عمرؓ کو یہ فکر گھن کی طرح کھائے لے رہی تھی اور دیکھنے والا ان کی بیقراری کو دیکھ کر بیقرار ہو گیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ مجھے امیرالمومنین ہونے کی بنا پر میری غلطیاں بتانا نہ چھوڑ بیٹھیں؟۔ خلافت کی مسند اقتدار پر قدم رکھتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے ان الفاظ میں یہ حقیقت فاش کر دی تھی کہ "فان احسنت فاعینونی وان زغت فقومونی" "میں اگر بھلائی پر گامزن ہوں تو میرا ساتھ دو اور میرے ہاتھ مضبوط کرو اور اگر میں ٹیڑھا چلوں تو مجھے تم لوگ سیدھا کر دو"

اور حضرت عمرؓ نے جب مسجد نبوی میں مومنوں کے سالار کارواں کی حیثیت سے مہر کو قانوناً کم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور ایک بوڑھی عورت نے قرآن مجید کی وہ آیت پڑھ کر ٹوکا کہ جس میں بیوی کو مہر کے سلسلہ میں ایک خزانہ تک دینے کی گنجائش ظاہر کی گئی ہے تو فی الفور یہ الفاظ بھری محفل میں ادا کر کے کہ "اصابت امراۃ واخطاء عمر عورت نے ٹھیک کہا اور عمر سے غلطی ہوئی"۔ گویا اسی مذکورہ بالا حقیقت پر تصدیق کی تاریخی مہر لگا دی۔

خدا سے رسول کے واسطے سے یہ دین کا علم صحیح حاصل کرنے گویا رسول کے متعلق وسیلۂ درمیانی کا صحیح عقیدہ ہے۔ لیکن جب دین کا یہ علم حاصل ہو گیا تو اس پر عمل ــــ خود عمل کرتے ہوئے خدا اور اس کے بندوں کے درمیان کوئی تیسرا نہیں رہتا۔ مثلاً نماز کیسے پڑھیں؟ اس کا علم حاصل کرنے کے لئے ہر انسان کو رسول کے وسیلہ کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن جب یہ علم ان سے مل گیا تو اسی پر عملی صورت میں نماز پڑھتے ہوئے خدا اور نمازی کے درمیان کسی تیسرے کے درمیانی واسطہ کی کوئی گنجائش دین حق نہیں۔ نماز کی طرح دعا بھی عبادت ہے۔ سر بھی خدا کے سامنے براہ راست جھکا دیا جائیگا اور ہاتھ بھی براہ راست صرف اسی کے سامنے پھیلائے جائیں گے ایاک نعبد و ایاک نستعین میں اللہ تعالیٰ نے عبادت کے ان دونوں تمام دفتروں کو دو جملوں میں سمیٹ دیا اور دونوں طرح کی عبادتوں کو ایک ہی زبان میں صرف اور صرف اللہ کے لئے خاص کر دیا ــــ اور خدا جانتا تھا کہ یہاں ابلیس کس چور دروازے سے توحید پر حملے اور شرک کی تخم ریزی کے لئے داخل ہوگا۔ اس لئے دعا کی عظمت آخری حد تک کھول دی اور یہاں تک اپنے نبیؐ سے کہلا دیا کہ دعا عبادت کا مغز ہے ــــ دعا ہی اصل حاصل عبادت ہے ــــ الدعاء مخ العبادۃ ــــ الدعا ہو العبادۃ ــــ آج اس تعلیم کی دور رس حکمت دیکھ لیجئے کہ اسی رخ سے ابلیس نے مسلمانوں کو شرک میں مبتلا کیا ہے ــــ شرک و بدعت کا بدترین گنہگار بھی نماز کے معاملہ میں "ایاک نعبد" پر عامل ہے اور یہاں عبادت کے وقت کسی محسوس و مرئی ہستی کو درمیان میں وسیلہ نہیں بناتا۔ لیکن دعا کے معاملہ میں وہ بھٹکتا ہے اور غیر اللہ کو پکار پکار کر خوشامد کرتا نظر آتا ہے کہ میری فلاں درخواست اللہ تک پہنچا دو! ــــ اگر عبادت اور دعا اس کی نظر میں ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہوتے تو کیسے ممکن تھا کہ خدا کو واحد معبود کہنے والا ایک عبادت کو خدا کے لئے خاص رکھتا اور دوسری عبادت "دعا" کو خالق اور مخلوق

دونوں کے لئے عام کر دیتے جبکہ یہ دعا عبادت ہی نہیں "حاصلِ عبادت" اور "اصل عبادت" قرار دی گئی ہو۔

ہوا یہ علم دین حاصل کرنے کے لئے "رسول" کو وسیلہ بنانا حق تھا، وہ گم کردہ راہوں کی نظروں میں باطل قرار پاگیا اور سمجھا جانے لگا کہ پیر فقیر جو کہدیں وہی علم دین ہے ——— قرآن و حدیث کی کوئی ضرورت ان کی موجودگی میں نہیں رہتی۔ اور عبادت کی عملی شکلوں میں جہاں کوئی درمیانی واسطہ اور وسیلہ نہیں تھا وہاں پاکیزہ ارواح کا ایک ان گنت قافلہ خدا اور بندے کے درمیان وسیلۂ واسطہ مان لیا گیا ——— جو وسیلہ کا عقیدہ حق تھا، باطل ٹھیرا اور جو باطل تھا وہ حق قرار پاگیا۔

اور کہاں قرار پایا؟ ——— وہاں جہاں کتاب و سنت، خدا اور رسول سے علم دین حاصل کرنے کے اس حقیقی وسیلہ کے عقیدے کو کیسے جاں نواز اہتمام سے دل نشیں کرایا گیا تھا کہ آدمؑ ——— انسان اول کی بنیادی فضیلت ہی یہ تھی جو آسمان والوں کی بھری محفل میں تنہا ان کو ملی کہ انھوں نے علم الٰہی اللہ ہی سے حاصل کیا تھا تو ابن آدم کو بھی وحی کی شکل میں اور رسول کے وسیلہ سے ملنے والے اسی قطعی اور بلا ریب و بے خطا علم کو پانے کے لئے اگر سب کچھ کھو دینا پڑے تو دریغ نہ کرنا چاہئے۔

بتایا گیا تھا کہ اس علم کے حصول کے لئے تم اپنی زبان کو اتنی سی حرکت دو گے کہ قرآن کا ایک حرف ——— ایک لفظ نہیں ایک حرف ——— زبان پر سے گذر جائے تو نیکی جیسی قیمتی دولت کے دس قیمتی سکے ڈھل جائیں گے ——— اگر اوقات زندگی کو اس کے معانی اور الفاظ کے سپرد کر دو گے تو خدا انہیں بلا مانگے اپنی اتنی نعمتیں عطا کرے گا جو مانگنے والوں کو مانگنے کے بعد بھی نہیں ملتیں ——— اور تم نے اس علم کی بات عملاً مانی تو کل میدان حشر میں یہ علم خدا سے تمہاری مغفرت و کامرانی کی بات منوا کر رہے گا۔

یہ علم قیامت کی آخری بارعب دن خود خداوندِ ذوالجلال کے ذریعہ اپنے طالب علم کا اعزاز کرائے گا۔ ایسا اعزاز کہ جس کا مطالبہ اس کی طرف سے ہر اعزاز کے بعد جاری رہے گا اے میرے رب! ابھی اور ...... ابھی اور اکرام و اعزاز کرا سکا"

اور اس وقت تک اس کی تسلی نہ ہوگی جب تک اس طالب علم کے سر پر خدا کی خوشنودی کا تاج نہ رکھوالے ——— جیسے کوئی بادشاہ کسی کو انعام دیتا چلا جائے ——— اعزاز کئے جائے اور مطالبہ جاری رہے۔ یہاں تک کہ آخرکار وہ خود اپنی خلعت فاخرہ اسے پہنادے اور اپنا تاج اس کے سر پر رکھ دے! ——— خدا بھی اس دن وسیلہ کے اس حقیقی عقیدے کو استعمال کرنے والے کو خوشنودی کی خلعت فاخرہ پہنائے گا اور آخر تاج کرامت اس کے سر پر رکھ دے گا نہ صرف اس کے بلکہ اس کے والدین ——— (بشرطیکہ وہ مومن ہوں) بھی اس اعزاز میں شریک کئے جائیں گے اور ان کی تاج پوشی کی ایسی خیرہ کن رسم منعقد ہوگی کہ اس تاج کا ایک موتی اپنی چمک دمک سے اس دنیا میں سورج کو بھی ماند کر ڈالے۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ وسیلہ کے اس حقیقی عقیدے کو سینے سے لگا کر جو کوئی رسولؐ کی صرف چالیس باتیں محفوظ رکھ کے دوسروں کو پہنچا دے گا قیامت کے دن وہ علماء کا ہمنشیں اور مثیل مانا جائے گا جو دس دس دوزخی مسلمانوں کی سفارش کے حق دار ہوں گے اور اللہ کا آخری رسولؐ اللہ سے یہ کہے گا کہ خدایا! یہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں اور میری التجا ہے کہ آپ بھی اسے اپنا مان لیجئے اور معاف کر دیجئے۔

کیسے اجر عظیم کی یہ خبر دی گئی کہ توحید و سنت کی راہ پکڑو گے تو محبوب خدا ہو جاؤ گے اور سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

"قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی
یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم ..."

لیکن وعدہ و وعید کی کسی تابناک فضا میں ہم مسلمان تاریک خیالی کی موت مارے گئے کہ وسیلہ کا یہ حقیقی عقیدہ چھوڑ کر دین کا علم اور قانون تو ہمارے لئے اپنے اپنے مرشد کا وجود ہو گیا اور دین پر عمل یعنی عبادت کے سب سے اہم شعبۂ دعا میں رسول اور اس سے چل کر ہر ولی کی روح ہمارے اور خدا کے درمیان وسیلہ بن گئی ——— گویا عالم اور ولی تو ہمارے لئے علم دین کے حصول کے لئے بمنزل نبی ہو گئے اور دعا جیسی عبادت کی

ماہ میں نبی بمنزلہ خدا ہو گئے۔

مولانا عامر عثمانیؒ نے اس ہولناک بربادی کا تجزیہ کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ توحید کا عقیدہ بگاڑنے کے لئے ابلیس رسالت کی اصل حیثیت کا عقیدہ بگاڑتا ہے ـــــ رسول کو علم دین کا حقیقی وسیلہ ماننے والوں سے کہتا ہے کہ علم دین تو جس عالم اور جس پیر سے چاہو حاصل کر لو لیکن عمل میں رسول کو اپنے اور خدا کے درمیان وسیلہ تسلیم کر و ـــــ اپنی دعا جیسے عظیم عمل میں ان کو وسیلہ بناؤ اور مدد کے لئے انھیں پکارو تو وہ اس دنیا میں خدا سے کارسازی کرائیں گے اور آخرت میں شفاعت کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنے ان نام لیواؤں اور پکارنے والوں کو خدا سے صاف بچا کر جنت میں لیجائیں گے۔

لیکن جب مولانا عثمانیؒ نے دیکھا کہ قبوری شریعت کا یہ پورا مکتب فکر شرک و بدعت کی دلدل میں پھنس جانے کے باوجود خود کو "اہل سنت" کہہ رہا ہے اور دوسری طرف بت پرستی کا کسی حد تک جواز نکالنے والے غیر مسلم بھی توحید کے مدعی بن چکے ہیں۔ تو مولانا نے سمجھ لیا کہ اس گمراہی کی بنیادی وجہ توحید و سنت کا منفی پہلو نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ لوگ یہ بھول گئے کہ توحید کیا نہیں ہے اور سنت کیا نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات ان کے سامنے نہیں رہی کہ توحید کی ضد شرک کیا ہے اور سنت کی ضد بدعت کیا ہے ـــــ اس لئے انہوں نے شرک کو شرک سمجھ کر چھوڑ دیا اور کسی شرک ہی کو شرک نہ سمجھ کر توحید قرار دے لیا۔ اسی طرح جو بدعتیں انھیں بدعت محسوس ہوئیں ان کو ترک کر دیا مگر جو بدعتیں اس قدر غیر محسوس اور مخفی تھیں کہ انھیں صرف کتاب و سنت کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہو ان کو بدعت کے بجائے سنت سمجھ کر اختیار کر لیا۔

مولانا عامر عثمانی مرحوم کا سب سے ممتاز اور دور رس اقدام یہی تھا کہ انھوں نے یہ راز پا لیا تھا کہ کسی بھی نئی تعمیر سے پہلے شکست و ریخت کا کام ضروری ہوتا ہے کسی نئے مکان کی تعمیر اگر کھنڈر کو ڈھائے اور مسمار کئے بغیر اسی پر شروع کر دی جائے تو جو مکان ہم بنانے چلے تھے نہیں بنیگا بلکہ وہی پرانا کھنڈر ایک نئے ساز و سامان کے ساتھ پھر اٹھ کھڑا ہو گا ـــــ اگر خاکہ غلط نہ مٹایا جائے اور گڑا ہوا ڈھانچہ اور سانچہ توڑا نہ جائے تو نئے رنگ، نئی شکل نہ بنا سکے وہی خاکہ نئے سرے سے رنگین ہو جائے گا ـــــ وہی ڈھانچہ نئی شکل پا جائے گا اور وہی سانچہ وہی چیز ڈھالتا رہے گا جو ہم غلط قرار دے چکے تھے۔

اسی طرح توحید و سنت کی اصل مثبت تعلیم آدمی کے لوح قلب اور پردۂ شعور پر مرتسم ہو ہی نہیں سکتی تا وقتیکہ شرک اور بدعت کی تمام بنیادوں کو پہلے مسمار نہ کر دیا جائے یہ انداز اور یہ اپروچ اس قدر حکیمانہ اور بنیادی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسولؐ نے اسی کو اختیار کیا ـــــ قرآن مجید میں ایمان باللہ کی مثبت دعوت سے پہلے کفر بالطاغوت کا مطالبہ اور الا اللہ کی مثبت حقیقت سے قبل لا الٰہ کا اعلان اسی انداز تعمیر کا واضح نمونہ ہے یعنی جو چیزیں فی الواقع معبود نہیں ہیں اول ان کا شعور اور ان کا انکار اور ان سے قلب و روح کو خالی کرنا ضروری ہے تب ہی یہ ممکن ہے کہ مثبت طور پر انسان ایمان باللہ اور الا اللہ کی ٹھوس حقیقت کا بھرپور عرفان اور مکمل ایمان حاصل کر سکے مولانا عامر عثمانی مرحوم کے سارے کار تحقیق پر نظر ڈالی جائے تو انھوں نے اسی رخ سے توحید و سنت کی تعلیم دی اور اسی زاویے سے سوچ کر دنیا کو نت نئے عنوانات اور گوناگوں اسالیب کے گوشوں سے سمجھایا کہ توحید اور سنت کیا نہیں ہے! ـــــ سالہا سال کی اس موضوع پر ان کی یہ سوچ یہ خامہ فرسائی اور اس راہ کے کانٹوں پر آبلہ پائی آخر اپنے اس عظیم مشن میں کامیاب ہوئی اور خدا اور رسولؐ، الوہیت اور رسالت، توحید اور سنت اور شرک اور بدعت کے درمیان اس کے نتیجہ میں ایک خط امتیاز اپنی پوری نورانیت کے ساتھ ملک اور بیرون ملک کے لاکھوں قلوب میں کھنچتا چلا گیا۔

اس سلسلہ میں ان کی بعض تحقیقات بالکل منفرد اور اچھوتی قسم کی رہیں کہ جن پر ہمارے محدود علم کی حد تک اتنا تحقیقی کام اتنی مرکزیت اور جامعیت کے ساتھ شاید پہلی بار ہو سکا ہو شلاً "سایۂ رسولؐ" کی حقیقت اور "دعا با لوسیلہ" پر انھوں نے قابل اطمینان

ریسرچ زمانی اور ابلیس کی اس چال کو طشت از بام کر دیا کہ شیطان کس طرح ان طریقوں سے رسولؐ کو بشریت سے نکال کر الوہیت کی سرحدوں میں داخل کرنا چاہتا ہے۔

شرک و بدعت کے مارگزیدہ حلقوں سے باہر جو لوگ اس مسئلہ میں تو متفق ہیں کہ دین کی تعلیمات اور علم الٰہی کے حصول کا رسولؐ خدا ہی وسیلہ ہیں لیکن ان لوگوں میں اس مسئلہ میں شدید اختلافات کی نحوست سایہ فگن ہے کہ ائمۂ کرام اور فقہائے عظام کا "سہارا" لے کر اس وسیلۂ رسالت سے استفادہ کرنا کہاں تک درست ہے۔ مولانا عثمانی نے ان کی رہنمائی کی اور تقلید اور عدم تقلید کے مسائل و مباحث پر بہار آفریں کام پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ ان موضوعات پر زرنگار رنگ انداز سے لکھ کر انھوں نے یہ حقیقت بے حجاب کر دی کہ تقلیدِ صحیح درحقیقت اندھی تقلید نہیں بلکہ تحقیق ہی کی ایک قطعی فطری شکل ہے۔ دلیل و برہان، عقل و نقل کے دو آتشہ انداز میں یہ بات واشگاف کر کے رکھ دی کہ کسی چیز سے استفادہ کی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس چیز میں فائدہ پہنچانے کی صلاحیت ہو۔ دوسری یہ کہ فائدہ اٹھانے والے میں یہ فائدہ اٹھانے کی صلاحیت بھی موجود ہو ——— عدم تقلید کے غیر معقول انداز کے مطالبات میں یہ دوسرا پہلو نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ تو کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ علم دین کے اصل سرچشموں میں فائدہ پہنچانے کی صلاحیت سب کے لئے موجود ہے مگر استفادہ کرنے والے انسانوں میں استفادے کی صلاحیت یکساں اور ہم وزن نہیں۔ سڑک پر دو آدمی بینا اور نابینا ——— چلنا چاہتے ہیں اور اسی سڑک پر چل کر اپنے ٹھکانے پر پہونچ سکتے ہیں۔ اس لئے اسی پر دونوں کا چلنا ناگزیر بھی ہے۔ سڑک میں تو صلاحیت موجود ہے کہ دونوں کو اپنے اوپر چلائے مگر دونوں میں اس پر چلنے کی صلاحیت یکساں نہیں۔ یہاں اگر کوئی یہ جسارت کر بیٹھے کہ نابینا بھی بینا کی طرح براہ راست سڑک سے استفادہ کرے اور کسی بھی خارجی لاٹھی یا رہنما کا سہارا ہرگز نہ لے تو اس ہمدردی کو اگر نابینا قبول کر بیٹھا تو آنکھوں کے بعد شاید ٹانگوں سے بھی جلد ہی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

جب اینٹ پتھر کی ٹھوس مادی سڑک پر دو مختلف صلاحیتوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو ایسا ستم ظریفانہ حادثہ برپا ہوتا ہے تو غور کیجئے کہ دین و شریعت جیسی غیر مرئی اور لطیف و نازک شاہراہ پر قلب و نظر اور علم و عمل کی مختلف کمزوریوں کے ساتھ چلنے والا اگر اپنے سے بہتر شخصیات کا سہارا نہ لے تو اس کے دین کی کیا کچھ درگت بن سکتی ہے۔

اس موضوع پر تقلید اور عدم تقلید کے متعلق مولانا نے مرحوم نے انتہائی متوازن تصور اجاگر کیا تاکہ رسولؐ خدا سے علم الٰہی کے حصول کا یکساں عقیدہ رکھنے والے حقیقی وسیلے کے عقیدے سے بھرپور استفادہ مل جل کر حاصل کر سکیں۔ اور مقلدین بھائیوں کی راہ میں ابلیس اختلاف و انتشار کی جو مکروہ ریشہ دوانیاں کرتا آرہا ہے ان سب کا تار و پود بکھر کر رہ جائے۔

زندگی کے آخری موڑ پر مولانا عثمانی نے اس طرف بھی بھرپور توجہ کی تھی کہ سائنس اور تعقل کے جدید علم کلام کا کام لینے میں جو افراط و تفریط کے رجحانات اٹھ رہے ہیں ان کو بروقت اعتدال و توازن کی لگام دی جائے اور بتایا جائے کہ جس طرح تقلید کے انتہا پسند رجحانات ایمانیات کی ضد ہیں اسی طرح تعقل و تحقیق کی انتہا پسندانہ روش بھی ایمان کی ساری لطافتوں کو لے ڈوبتی ہے۔ اس ذیل میں چاند پر سفر کرنے والوں اور ارتقاء کے ہم نواؤں کے لئے مولانا نے خالص قرآن و حدیث کی روشنی میں بروقت تحقیقی مواد سامنے رکھا۔

یہ تھے وہ دینی و علمی میدان جن میں مولانا عامر عثمانی مرحوم کا اشہبِ قلم مولانا مودودی کے تعزیتی الفاظ میں "شمشیر برہنہ" بنا رہا اور حق و استدلال کے نام پر اُگنے والے باطل و خرافات کے جنگلوں کو بے دریغ کاٹتا چھانٹتا چلا گیا۔

لیکن افسوس! کہ آج سارا تحقیقی سرمایہ تجلی کے فائلوں میں منتشر اور مدفون پڑا ہے ——— آج! جب کہ اردو ہی نہیں دوسری زبانوں کی دنیا میں جینے والے کروڑوں مسلمان ساری دنیا میں اس کی پیاس سے دم توڑ رہے ہیں۔

مولانا عثمانی کے چاہنے والوں نے ان کی موت پر کوئی شک نہیں قلبی دل فگاریوں کا ایسا مظاہرہ کیا کہ جس کا تصور بھی

ان کی موت سے پہلے ہم کبھی نہیں کرسکتے تھے۔ بلا مبالغہ ان کے تعزیتی پیغامات سے ہمیں ان کے آنسو اور خونِ جگر ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جو دینی کام کی بنیاد پر ان کو مولانا سے تعلق خاطر تھا کیا وہ پسند کریں گے کہ وہی دینی کام اسی طرح تجلی کے فائلوں میں ہمیشہ کے لئے زندہ دفن ہو کر رہ جائے اور جس گروہ نے اردو سے باہر یا اسلام سے باہر اسی عظیم تحقیقی کام کا ذائقہ ہی نہیں چکھا۔ ہمیشہ کے لئے اس سے محروم پڑا رہ جائے؟ ایک کام جس کی تین ممتاز ترین خصوصیات اس کی اشاعت کو اعلیٰ ترین فلاح اور اس کے ضیاع کو بدترین خسران ثابت کرنے والی ہیں۔ اس کی پہلی خصوصیت خالص حق کوشی اور مصلحت سوزی کے ساتھ تحقیق کرنا ہے۔ دوسری خصوصیت عقل اور نقل، علم اور استدلال کا دو آتشہ انداز ہے۔ اور تیسری خصوصیت ایسا اندازِ بیان ہے کہ نیچی سے نیچی ذہنی سطح کا آدمی بھی مزے لے لے کر ایک لطیف اور عمیق حقائق کو پڑھتا چلا جائے ——— گویا معنیٰ کے لحاظ سے یہ کام اعلیٰ ترین دماغوں کو مطمئن کرنے والا ہے اور الفاظ و بیان کے رخ سے ادنیٰ ترین ذہنوں کے اندر اتر جانے والا ہے اور اپنی بے لاگ حق کوشی اور مصلحت سوزی کے لحاظ سے دشمن سے دشمن اور بیگانے سے بیگانے تک کی توجہات اپنی طرف کھینچ لینے والا ہے۔

یہ کام موضوعات کے تحت باضابطہ اردو میں مدون اور مرتب ہوگا تو وہ لوگ جو اس کا مطالعہ منتشر انداز سے وقتاً فوقتاً تجلی میں کرتے چلے آئے ہیں ان کو ترتیب کے حسن کے ساتھ یکجا دوبارہ مطالعہ میں لاسکیں گے اور انگریزی میں یہ کتابیں منتقل ہوگئیں تو بیرونی ممالک میں بسنے والے کروڑوں مسلمان اور بے شمار انسان اسلام کا قیمتی مطالعہ ان کے ذریعہ کرسکیں گے۔ بتدریج اس کام کے نظم و ضبط کے لئے انتظامی اقدامات کیا ہونے چاہئیں؟ آپ غور کیجئے اور ہمیں اپنے خیالات اور مشوروں سے آگاہ کیجئے کہ آپ نے کیا سوچا ہے؟ اس منصوبہ کے لئے آپ کوئی مالی تعاون اس وقت تک ہمیں ہرگز نہ دیں جب تک تجلی کے صفحات میں ہماری طرف سے اس کا باضابطہ اعلان نہ کر دیا جائے۔ ہاں اس منصوبہ کا خاکہ آپ کے ذہنی مشوروں کا فوری طور پر محتاج ہے۔

سابقہ شمارے میں اس موضوع پر ہم نے جو تین طریقے باہمی تعاون سے اس کارگراں کو شروع کرنے کے لئے پیش کئے تھے ان میں سب سے زیادہ صحیح طریقہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ کام کا آغاز زیادہ سے زیادہ بے نفسی اور ایثار کی فضاؤں میں ہو ——— کتابوں کو ترتیب دینے والا ان کی اشاعت میں مالی تعاون دینے والا اور اس کے نظم و نسق کے انتظامی امور سرانجام دینے والا ہر فرد اخروی انعامات کے لئے اپنا اپنا فریضہ انجام دے اور ایک ایسی کمیٹی تشکیل پا جائے جو اس کے جملہ حسابات اور کاموں کا جائزہ لیتی رہے اور تمام معاونوں کو اس کی باضابطہ روئداد پیش کرتی رہے ——— دوسری شکل کاروباری تعاون اور اس کام میں مضاربت اور شیئر ہولڈنگ کی ہے جس میں ایک طرف بہت سی قانونی پیچیدگیاں سامنے آتی ہیں اور اندیشہ ہوتا ہے کہ معاونین کی للہیت اور خلوص کی وہ برکات یقیناً کم ہو جائیں گی جو ایثار اور بے نفسی کے ساتھ تعاون سے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس منصوبہ پر نازل ہوسکتی ہیں۔ پھر بھی آپ ہمیں اپنی رائے اور مشورے سے ضرور آگاہ کیجئے کہ آپ کیا پسند کرتے ہیں؟

اگر ابھی تک آپ نے نہیں سوچا تھا اب سوچئے! اور اگر اس فکر و خیال کو سمجھنے یا دوسروں کو سمجھانے کے لئے آپ یہ ضرورت محسوس کرتے ہیں ——— خواہ آپ اس ملک میں ہوں یا بیرونی ممالک میں ——— کہ ہم خود اس مشن کو اس کے پورے شرح و بسط کے ساتھ پیش کریں تو ہمیں لکھئے۔ ہم ان شاء اللہ اپنی کوشش کی آخری حد تک خط و کتابت سے اور اگر ممکن ہوا اور ضرورت ہوئی تو خود سفر کر کے آپ کے ساتھ اس فکر کو عام کرنے کے لئے پورا تعاون کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔ اسلئے کہ یہ ایک ایسی راہ ہے کہ اسے اگر محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت میں سرخروئی اور کامرانی کے لئے طے کی جائے تو اس کی گرد کی قیمت یہ کہ وہ کہ جہاں پڑ جائے گی وہ حصۂ جسم جہنم کی ہولناک آگ پر حرام ہو جائے گا۔ اور جب کسی ایک انسان کی

اصلاح ہوگئی تو یہ ایسا بڑا سرمایہ حضور کی نظر میں ہے کہ یہ ساری
دنیا اور اس میں جو کچھ بھی ہے اس کے آگے حقیر ہے۔ اور اگر
کہیں اس مشن کے نتیجہ میں ایک کفر کا شکار انسان خدا کے قدموں
میں آگیا تو طبرانی کی ایک حدیث کے مطابق یقینی جنت کا مژدۂ
جانفزا دوسرے لفظوں میں حسن خاتمہ کا مژدۂ
جانفزا رکھا ہوا ہے۔

کون ہے جس کی ایمانی فکر کا آخری حاصل یہی اور
صرف یہی نہیں کہ کسی طرح اس کا خاتمہ بالخیر ہو اور اللہ کی
جنت اس کی ہو جائے اور ان سب کی کیسی یقینی
راہ اس ایک مشن میں کھلی پڑی ہے

کھرے کھوٹے

حسن احمد صدیقی
فاضل دارالعلوم دیوبند

قرآنی ضرب الامثال

مرتب :- حکیم انیس خبیر آبادی۔
ناول سائز۔ کتابت وطباعت گھٹیا۔ کاغذ متوسط۔ قیمت دس روپے۔ ۲۴
ناشر :- دواخانہ سلطانیہ۔ عثمان پورہ حیدرآباد

اس کتاب میں ۷۷۵ عنوانات کے تحت (۱۹۴۲) آیتیں جمع کردی گئی ہیں۔ اس کتاب کی سب سے موٹی غلطی یہ ہے کہ نام اور موضوع کتاب میں کوئی مناسبت نہیں ــ اس کتاب کا نام ضرب الامثال کے علاوہ کچھ اور رکھنا چاہئے تھا۔

اگر مؤلف ضرب المثل کے مفہوم سے ناواقف ہوتے تو صبر کرلیا جاتا، لیکن ایسا نہیں ہے وہ ضرب المثل کے مفہوم سے بخوبی واقف ہیں اور اسی کتاب کے شروع میں صفحہ ۴ پر یوں فرماتے ہیں :-

" اگرچہ کہ آیات قرآنی جو میں نے منتخب کی ہیں ان پر ضرب المثل کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مگر میں نے کتاب کا نام ضرب الامثال اس لئے رکھا ہے کہ میری غرض واضح ہوجائے کہ آیات قرآنی کو مسلمان اس طرح بول چال میں لانے لگیں جیسے ضرب الاستعمال کو لاتے ہیں "۔

یہ توجیہ اور وجہ تسمیہ کسی کے نزدیک قابل قبول ہو لیکن ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ جو آیتیں ضرب الامثال کے ہیچ نہیں ہیں انھیں ضرب الامثال کے نام سے موسوم کرنا بہرحال غلط در غلط ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ وجہ تسمیہ اور یہ توجیہ نام کسی لطیفہ سے کسی درجہ میں کم نہیں۔ یہ تو بالکل ایسا ہوگیا کہ جیسے نمکین بسکٹ تیار کرنے والی کمپنی اپنے تیار کردہ بسکٹوں کے پیکٹ پر "میٹھے بسکٹ" کا لیبل لگادے اور پیکٹ کے اندر ایک گذارش نامہ پیوست کردے جس میں یہ عبارت تحریر ہو :-

" خریدار بھائیو! اگرچہ نمکین بسکٹوں پر میٹھے بسکٹوں کا اطلاق نہیں ہوسکتا لیکن ہم نے اس پیکٹ پر میٹھے بسکٹوں کا لیبل اس لئے لگادیا ہے تاکہ ان بسکٹوں کو میٹھے بسکٹوں کی جگہ استعمال میں لایا جانے لگے اور لوگ انھیں اسطرح استعمال کرنے لگیں جس طرح میٹھے بسکٹوں کو استعمال کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی کمپنی کے بارے میں دنیا دو ہی رائے قائم کرسکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کمپنی کے مالکان اور منتظمین انتہائی درجہ کے احمق ہیں یا یہ کہ کمپنی چلانے والے انتہائی درجہ کے

دھوکے باز ہیں۔ میں مؤلف کتاب کے بارے میں یہ دونوں رائے قائم کرنے سے گریز کروں گا لیکن ایک تبصرہ نگار کی حیثیت سے ان کی خدمت میں یہ گزارش کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اگلا ایڈیشن چھپنے کی نوبت آئی تو کتاب کا نام بدل دیا جائے مؤلفِ محترم نے یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی کہ اس کتاب کو جو لوگ قرآنی ضرب الامثال کا مجموعہ سمجھ کر خرید لیں گے اور مطالعہ کرنے کے بعد وہ جھلائیں گے تو ان کی جھلاہٹ کو دور کرنے کا طریقہ کیا ہوگا۔

کتاب کے اندر کتابت کی غلطیاں بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں اگرچہ مؤلف نے کتاب کے آخیر میں غلطیوں کی ایک فہرست بھی شائع کی ہے لیکن یہ فہرست بڑی حد تک ناقص اور غیر مکمل ہے۔ کتابت کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا موجب طوالت ہوگا اس لئے صرف ان غلطیوں کا تعارف کرانے پر اکتفا کر رہا ہوں جو ترجمہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

ص۳ پر یہ آیت نظر آئی۔ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ۔

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا:۔ اور تم مجھ سے وعدہ پورا کرو میں تم سے وعدہ پورا کروں۔ یہ غلط ہے ترجمہ یوں ہونا چاہئے تھا: "تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔ یا ترجمہ یوں ہوتا کہ تم مجھ سے کئے گئے وعدہ کو پورا کرو میں تم سے کئے گئے وعدہ کو پورا کروں گا۔

ص۴ یاایھا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ کا ترجمہ یوں کیا گیا:۔ اے ایمان والو! نماز اور صبر سے مدد حاصل کرو۔ با کا ترجمہ سے غلط نہیں لیکن با کا ترجمہ چونکہ ذریعہ بھی کیا جاتا ہے لہٰذا یہاں ذریعہ ہی مناسب رہتا۔ یعنی ترجمہ یوں ہوتا:۔ "نماز اور صبر کے ذریعہ مدد حاصل کرو"۔

ص۱۰۔ آیت ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرًا۔ ترجمہ کیا گیا:۔ جسے حکمت عطا ہوگی اسے یقیناً خیر کثیر عطا ہوگی۔ حالانکہ ترجمہ یوں کرنا چاہئے تھا "جسے حکمت عطا کر دی گئی اسے خیر کثیر عطا کر دیا گیا"۔

ص۲۵ آیت: واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعًا ولا تفرقوا۔ ترجمہ کیا گیا: اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور باہم ناانصافی نہ کرو۔

ولا تفرقوا کا ترجمہ باہم ناانصافی مت کرو غلط ہے۔ "آپس میں تفرقہ بازی مت پھیلاؤ" ہونا چاہئے تھا۔

ص۳۴ پر متاعٌ قلیل کا ترجمہ چند روزہ بہار کیا گیا۔ چند روزہ بہار سے آیت کا محاوری مفہوم تو ظاہر ہو جاتا ہے لیکن لفظی ترجمہ واضح نہیں ہوتا۔ جو کتاب عوام کے لئے لکھی گئی ہو اس میں اس قسم کے ترجمہ سے احتراز کرنا چاہئے جو ظاہراً الفاظ سے مناسبت نہیں رکھتا۔

ص۸۴ آیت: لئن اتانا من فضلہ لنصدقن ولنکونن من الصلحین: ترجمہ کیا گیا:۔ اگر وہ اپنے فضل سے ہمیں مال عطا کر دے تو ہم خوب اس میں سے تصدق کریں گے اور خوب کام کیا کریں گے۔

یہ ترجمہ قطعًا غلط ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہوتا "اگر وہ اپنے فضل سے ہمیں مال عطا کر دے تو ہم اس میں سے خوب خرچ کریں گے اور ہم نیک لوگوں میں سے ہو جائیں گے"۔

ص۱۰۳ پر یہ آیت نظر آئی واعتدت لھن متکأً ترجمہ کیا: اور ان کے واسطے مسندیں لگا دیں۔

یہاں اعتدت کے فاعل کو ظاہر کر دینا چاہئے تھا جو زلیخا ہے۔ اور ترجمہ یوں کیا جاتا "اور زلیخا نے ان کے واسطے مسندیں لگا دیں"۔

ص۱۰۴ آیت: افتونی فی رءیای۔ ترجمہ کیا گیا اس خواب کا حکم مجھے بتاؤ۔

یائے متکلم کی موجودگی میں ترجمہ اس کرنا اس بات کی علامت ہے کہ مؤلف عربی کی معمولی شدبد بھی نہیں رکھتے۔ اگر شدبد ہوتی تو یٰ کا ترجمہ اس طرح کرنے کا

کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز افتونی کا ترجمہ بھی غلط کیا گیا
ہے۔ آیت کا صحیح ترجمہ یوں ہونا چاہئے تھا (تم) مجھے
میرے خواب کی تعبیر بتاؤ۔

ص۱۰۰ آیت ان اللہ یجزی المتصدقین۔ ترجمہ
کیا گیا۔ بے شک اللہ رعایت کرنے والوں کو جزائے خیر
دیتا ہے۔

حالانکہ ترجمہ یوں ہونا چاہئے تھا کہ "بے شک
اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے"۔

ص۱۲۴ پر لفظ جزا کا ترجمہ معاوضہ کیا گیا ہے۔
یہ ترجمہ غلط نہ سہی لیکن غیر مناسب ضرور ہے۔

ص۱۳۷ آیت: وبرًّا بوالدتی کا ترجمہ کیا گیا
اور مجھے میری والدہ نے نیکی کرنے والا بنایا۔

اس ترجمہ کو دیکھ کر عربی زبان نوحہ کئے بغیر نہیں
رہ سکتی۔ قارئین کو شاید اس قسم کی غلطی کا اندازہ صحیح ترجمہ
دیکھ کر ہی ہوگا۔ لیجئے صحیح ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

" اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی والدہ کیساتھ نیکی
(احسان) کرنے والا بنایا"۔

یہ کہنے کی تو اب ضرورت نہیں رہے گی کہ پہلے ترجمہ میں
ماں کو فاعل بنایا گیا تھا اور دوسرے ترجمہ میں اللہ کو فاعل
بنایا گیا ہے۔ دونوں ترجموں کا فرق کوئی معمولی فرق
نہیں۔ گویا کہ ترجمہ میں جو غلطی ہوئی وہ معمولی غلطی نہیں
ہے بلکہ غیر معمولی ہے۔

ص۱۷۰ آیت وَمَا تُرِيدُ أَنْ تَكُونَ
مِنَ الْمُصْلِحِينَ: ترجمہ کیا گیا اور (صلح) اور اصلاح
نہیں چاہتے۔ حالانکہ ترجمہ یوں ہونا چاہئے تھا:۔

" اور تم نہیں چاہتے کہ تم مصلحین میں سے ہو"

ص۱۱۹ آیت مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ
فی جوفہ: ترجمہ کیا گیا: اللہ نے کسی مرد کے سینہ میں
دو دل نہیں بنائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رجل عربی زبان میں مرد
کو کہتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ رجل بول کر
آدمی اور انسان بھی مراد لے لیا جاتا ہے۔ اس آیت میں
رجل بول کر مرد نہیں بلکہ انسان مراد لیا گیا ہے۔

ترجمہ یوں کیا جاتا کہ "اللہ تعالیٰ نے کسی انسان
کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔ انسان میں عورت بھی
آجاتی۔ یہ کہنا کہ اللہ نے کسی مرد کے سینہ میں دو دل
نہیں بنائے اپنے اندر جامعیت نہیں رکھتا۔ اللہ کے فرمان
کا مطلب تو یہ ہے کہ نوع انسانی میں کوئی ایسا نہیں نہ مرد
نہ عورت کہ جس کے سینہ میں دو دل موجود ہوں۔ رجل کو
محدود معنی میں استعمال کرکے فرمان خداوندی کے مقصد
کو ٹھیس پہونچتی ہے۔

ص۲۰۶ پر سقیم کا ترجمہ مضمحل کیا گیا جو ٹھیک نہیں۔

ص۲۱۹ پر ایک آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا: "ہم تمہارے
رفیق تھے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے"
تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ترجمہ یوں ہونا چاہئے تھا
کہ:۔ "ہم دنیا کی زندگی میں بھی رفیق ہیں، آخرت میں بھی رفیق رہیں گے"
رفیق تھے کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کا قصہ تمام ہوا اور
دنیا کا قصہ تمام ہونے کے بعد یہ فرمایا جا رہا ہے۔ اور آخرت
میں بھی تمہارے رفیق رہیں گے کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی آخرت
نہیں آئی تو پھر کس زمانہ کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ میں
غلطی ہوئی۔ صحیح ترجمہ وہی ہوگا جو میں نے اوپر بیان کیا۔

ص۲۵۰ پر ان بعض الظن اثم" کا ترجمہ کیا گیا
کیونکہ بعض گمان سے گناہ ہوتے ہیں۔ یہاں لفظ "سے" زائد ہے
قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ بعض گمان بجائے خود گناہ ہوتے ہیں
نہ یہ کہ بعض گمان سے گناہ ہو جایا کرتے ہیں۔

ص۳۰۰ آیت واذا الجنۃ اُزلفت ترجمہ کیا گیا:۔
"اور جب جنت کو نزدیک کر دی جاتے"
ترجمہ یوں صحیح ہوتا " اور جب جنت نزدیک کر دی جائیگی"۔

ص۳۱۸ آیت ورفعنا لک ذکرک۔ ترجمہ کیا گیا
" اور آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کر دیا گیا۔
ترجمہ یوں ٹھیک رہتا " اور آپ کے لئے آپ کا
ذکر بلند کر دیا گیا"۔

ص ۳۲۴ پر لکم دینکم ولی دین کا ترجمہ کیا :-
"تمہیں تمہارا بدلہ ملے گا اور مجھے میرا"

اس ترجمہ سے شاید ہی کوئی اتفاق کرے۔ اور صحیح ترجمہ سے شاید ہی کوئی ناواقف ہو علاوہ اس کتاب کے مؤلف کے۔

اس قسم کی اور بھی غلطیاں کتاب کے اندر موجود ہیں۔ اکثر آیتوں کا ترجمہ درست ہے لیکن اس ترجمہ میں کوئی ندرت اور مٹھاس نہیں ہے۔ حالانکہ عوام کے لئے جو کتاب مرتب کی جا رہی ہو اس کے ترجمہ میں چاشنی کا ہونا ضروری تھا۔

کتاب میں ایک جگہ صفحات بھی غلط جوڑ دیئے گئے ہیں صفحات کی ترتیب یوں ہے جو غلط ہے۔

۱۷۷ - ۱۸۷ - ۱۷۹ - اور پھر ۱۸۶ کے بعد ۱۷۸ - ۱۸۸ ہے۔

محترم مؤلف صاحب کو اگر ناگوار نہ گزرے تو یہ بھی گذارش کروں گا کہ انھوں نے کتاب کی قیمت دس روپے رکھ کر اپنے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ میرے خیال میں کتاب کی قیمت کم از کم اور زیادہ سے زیادہ آٹھ روپے ہونی چاہئے تھی۔

تبصرہ کا حاصل یہ ہے کہ قرآنی ضرب الامثال کو وہ لوگ ضرور پسند کر لیں گے جنھیں کبھی بامحاورہ اور سلیس ترجمہ دیکھنے کا موقع نہ ملا ہو۔ باقی دوسرے حضرات سے یہ خراج تحسین حاصل نہیں کر سکتی۔

حجاب کا خاص نمبر

مدیر : مائل خیرآبادی ۔ قیمت پانچ روپے

اس دنیا میں ہر شخص کچھ نہ کچھ صلاحیتیں لے کر آیا ہے ہر شخص کی خصوصیتیں اور صلاحیتیں جدا اور مختلف ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے انداز پر دین و دنیا کے کاروبار میں مصروف عمل ہے دین کے ساتھ کاروبار کا لفظ لگانا اگر غلط ہو تو چلئے جملہ کو یوں کر لیجئے : ہر شخص اپنے اپنے انداز میں خدمت دین اور کاروبارِ دنیا میں مشغول و سرگرداں ہے۔

تجلی کی اشاعت کا اصل مقصد دین اسلام کی تبلیغ ہے اور حجاب اور ذکریٰ جیسے پرچوں کا داعی مقصد بھی صرف یہی ہے کہ اسلام کی روشنی گھر گھر پہنچے۔ ان پرچوں کے مابین اگر کوئی فرق ہے تو وہ انداز اور طریقۂ کار میں ہے۔ مقصد کے اعتبار سے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ سب ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جتنا تعلق ہمیں تجلی کے خریداروں سے ہے اتنی ہی محبت ہمیں ان حضرات سے بھی ہے جو حجاب جیسے دینی پرچوں سے وابستگی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ بہرحال حجاب بھی تجلی کی طرح خدمت دین میں لگا ہوا ہے اور اس کے مدیر جناب مائل خیرآبادی اپنی مخصوص صلاحیتوں کے اعتبار سے مسلمانوں کے گھروں میں اسلام کی روشنی پہنچا رہے ہیں۔

اس مختصر سی گزارش کے بعد میں اپنے قارئین سے حجاب کے اس خاص نمبر کا تعارف کراؤں گا جو نومبر دسمبر میں شائع ہوا ہے اور جو چار دلچسپ اور سبق آموز کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان کہانیوں کی پیشانیوں پر جو عنوانات جمائے گئے ہیں وہ یہ ہیں :-

۱۔ گل رو ۲۔ بنت حوا ۳۔ ترکستان سے ترکی تک ۴۔ نقلی شہزادہ۔

پہلی کہانی میں ایک ایسی طوائف کی داستان پیش کی گئی ہے جو عین جوانی میں اپنی حرکتوں سے تائب ہو کر دین اسلام کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ اس طوائف نے ایک بار ایک ظالم بادشاہ کے ایک ظالمانہ اور باغیانہ اصرار کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ یہ ظالم اور عیاش بادشاہ ایک معنی میں اس کا رکھوالا بھی تھا۔ اس نے ایک بار بھری محفل میں ایک شخص کی داڑھی چومنے کا اصرار کیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ داڑھی کی توہین ہو اور داڑھی والے کو خفت کا سامنا کرنا پڑے۔ بادشاہ نے اصرار کے ساتھ ہولناک سزاؤں کی دھمکیاں بھی دیں لیکن اس طوائف نے بادشاہ کے اس حکم کے آگے سر نیاز خم نہیں کیا۔ مائل خیرآبادی نے اس موقعہ پر گل رو کے منہ سے یہ مکالمہ بلوایا ہے جسے ہر قاری پسند کرے گا۔

" جن ہونٹوں کو شراب اور شرابیوں نے ناپاک
کر دیا ہو وہ ہونٹ سنتِ رسول کو چومنے کے

لائق ہی کہہ رہے ہیں"۔

دوسری کہانی میں دو ایسے پاکیزہ محبت کرنے والے لڑکے اور لڑکی کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے زندگی کے اصل مقصد کو پا لیا تھا اور زندگی کا اصل مقصد مسلمان بننے اور مسلمان بنانے کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ یہ کہانی اس بات کی تعلیم دیتی ہے کہ جب فرض اور محبت میں تصادم ہو جائے تو محبت کو فرض پر قربان کر دینا چاہئے

تیسری کہانی میں چند قازقوں کی آپ بیتی بیان کی گئی ہے جو کمیونسٹوں کے جبر و ستم کی تاب نہ لا کر سنکیانگ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ آدمی دنیا کا ہر دکھ ہر سزا ہر کٹھنائی برداشت کرے لیکن اپنے نقطۂ نظر اور اپنے موقف سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ ہو۔

چوتھی کہانی میں ایک نقلی شہزادے کی داستان موعظت پیش کی گئی ہے۔ یہ کہانی بھی دلچسپی اور مقصدیت سے مالا مال ہے۔

یہ چاروں کہانیاں مطالعہ کے قابل ہیں اور ان سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ یہ گزارش کرنے کے بعد مائل خیرآبادی صاحب نے یہ خاص نمبر نکال کر اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کرا لیا ہے۔ ان غلطیوں کی نشاندہی کر دینا بھی ضروری ہے جو دوران مطالعہ مجھے محسوس ہوئیں اور جن سے صرف نظر کرنا غلط نہ سہی تو غیر مناسب ضرور ہو گا۔

ص۱۱ پر ایک جگہ لکھا ہوا ہے:

"یہ تمام وہ گواہ آپ کو ملتے جو زبان حال سے کہتے"۔

جملہ سے روانی ہی رخصت نہیں ہوئی بلکہ اس کے اندر جھول بھی پیدا ہو گیا ہے۔

ص۳۳ پر: پنسل سے نشان کرتا رہا — نظر آیا۔ میرے خیال میں "نشان لگاتا رہا" ہونا چاہئے تھا۔

ص۳۴ مجھے شد بد جو معلوم ہوئی۔

شد بد تو خود معلومات کو کہتے ہیں۔ لہذا شد بد کے ساتھ معلوم کا لفظ کچھ جچا نہیں۔ بات یوں کہی جاتی: —

"مجھے جو کچھ شد بد حاصل ہوئی۔

ص۴۴ پر اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ یہاں نون کے نیچے زیر ہونا چاہئے زیر غلط ہے۔

ص۴۷ پر ہم آہنگی ہونا چاہئے۔

یہاں "ہونی" چاہئے ٹھیک ہوتا۔

ص۵۰ پر اب اسے آپ کے دوا زشکوک وہ بھی انشاء اللہ رفع ہو جائیں گی۔ یہاں "ہو جائینگے" ہونا چاہئے تھا

ص۵۲ پر ایک مصرعہ نظر آیا۔

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

آپ کی مناسبت سے ہے کی بجائے ہیں ہونا ضروری تھا

ص۶۱ پر۔ دل و دماغ عنایت فرمایا — یہ بھی ٹھیک ہی ہے، لیکن عنایت فرمائے بہتر ہوتا۔

ص۷۱ پر۔ چیکی واپس چلی آئی۔ اگر "چپ چاپ واپس چلی آئی" ہوتا تو یقیناً اچھا معلوم ہوتا۔

ص۷۲ پر۔ اور نماز میں نہ جانے کتنے لمبے لمبے رکوع اور سجدے کرتی۔ یہاں نہ کتنے کا محل نہیں تھا بلکہ لفظ بہت کا محل تھا۔

بہرحال یہ اور اس قسم کی کچھ اور فروگذاشتیں کتاب میں نظر آئیں۔ یہ فروگذاشتیں ہرگز ہرگز ایسی نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے کتاب کی کشش اور افادیت میں کوئی کمی واقع ہو۔ ان کی طرف نشاندہی کرنے کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ تبصرہ کا مکمل حق ادا ہو۔ دوسرا مقصد مائل خیرآبادی پر یہ ثابت کرنا تھا کہ ناچیز نے خاص نمبر کا مطالعہ بے توجہی کے ساتھ نہیں کیا بلکہ غور و خوض کے ساتھ کیا ہے جو بجائے خود اس بات کی علامت ہے کہ خاص نمبر دلچسپ اور جاذبیت سے بہرہ ور ہے۔

حجاب کے خاص نمبر (ایک تحریک چار کہانیاں) کے بارے میں یہ عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اگر یہ سارا کا سارا فروخت ہو جائے تو کوئی قابل حیرت بات نہیں ہوگی۔ ایسے دلچسپ نمبر کا نہ بکنا تو قابل تعجب ہو سکتا ہے۔ بکنا قابل تعجب نہیں۔ ناظرین تبصرہ اگر اس نمبر سے محظوظ ہونا چاہیں تو اس پتہ پر خط و کتابت کریں۔

ماہنامہ حجاب۔ رامپور ۲۴۴۹۰۱۔ یو۔ پی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

2 [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

Rubble

MARCH



ماہنامہ تجلّی دیوبند

ایڈیٹر:۔ حسن احمد صدیقی
(فاضل دیوبند)

انشاء اللہ
اگلا شمارہ حامد عثمانی نمبر ہوگا

تاریکیوں میں ایک چراغ

2/50

واضح رہے کہ یہ وہی چراغ ہے جسے الحاد و بدعت کی
برہنہ تاریکیوں میں مولانا عامر عثمانیؒ نے اپنے خونِ جگر سے روشن کیا تھا

تجلی

وقت پوچھے گا ـــــ بتاؤ

۱۹۷۶ء میں کیا کیا اہم واقعات پیش آئے ؟

اور

تاریخ بغیر کسی تأمل کے جواب دے گی ـــــ

واقعات تو اَن گنت پیش آئے تھے ـــــ

لیکن ـــــ ۱۹۷۶ء کی سب سے زیادہ بہترین

اور ـــــ خوبصورت یادگار

عامرِ عثمانی

نمبر تھا ـــــ

مستقل

دستک

مولانا عامر عثمانیؒ

ایک کسان سے پوچھئے۔ اس کے لئے دنیا کی سب سے بڑی اور مسرت بخش خبر یہ ہوگی کہ پچھلے مہینے اس کا جو بیل گم ہوگیا تھا پولیس نے اسے ڈھونڈھ نکالا ہے۔ ایک تاجر سے دریافت کیجئے۔ وہ آج کی سب سے اہم خبر اسے قرار دے گا کہ اس کا لگایا ہوا سرمایہ چوگنا ہوکر لوٹ رہا ہے۔ ایک ماں سے پوچھئے۔ اسکے نزدیک اس اطلاع سے بڑھ کر طربناک اطلاع کوئی نہیں ہو سکتی کہ جس بیٹے کو اس نے بڑی مایوس کن حالت میں ہسپتال پہنچایا تھا وہ اب خطرے سے باہر ہے۔

اسی طرح آپ ہم سے پوچھئے کہ تم آج کی سب سے اہم خبر کسے سمجھتے ہو تو ہم لومت لائم کی پرواہ کئے بغیر کہیں گے کہ پاکستان میں جماعت اسلامی کا بحال اور مولانا مودودی کا رفقاء سمیت رہا ہو جانا ہمارے لئے آج کی سب سے اہم خبر ہے۔ اور ہمارے قلب و روح نے اس خبر پر فاطر ارض و سماوات کے حضور سجدۂ شکر گذارنا ہے۔

بات کسی خاص جماعت یا فرد کی نہیں۔ بات کسی ملک کی بھی نہیں۔ بات تو ان اصول و تصورات کی ہے جو زمان و مکان کی قید سے بلند ہیں۔ جو آفاقی ہیں۔ بیکراں ہیں۔ کل الاخوان المسلمون پر قیامت توڑی گئی تھی تب بھی ہم روئے تھے صدیوں پہلے ابو حنیفہؒ کو جیل میں ڈالا گیا تھا اور احمد ابن حنبلؒ پر کوڑے برسائے گئے تھے جب بھی ہم روئے تھے —— اسماعیل شہیدؒ تہہ تیغ کئے گئے تھے جب بھی ہم روئے اور عمر فاروقؓ کے بدن میں خنجر اتارا گیا جب بھی ہم روئے۔ یہ جذباتی اتار چڑھاؤ بہت پرانا ہے اتنا پرانا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ سے قبل اس کی جھلکیاں آسمان نے دیکھی ہیں۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ پاکستان کی جماعت اسلامی کو خلاف قانون قرار دیکر مولانا مودودی کو ان کے چالیس سے زیادہ رفقاء سمیت جیل میں ڈال دیا گیا تھا اور اس وقت ہم نے محسوس کیا تھا کہ ہماری روح کے افق پر کالے بادل چھا گئے ہیں۔ آج بادل چھٹ گئے ہیں۔ آج یہ بادل چھٹ گئے تو کیسے ممکن ہے کہ ہم تحدیث نعمت کے طور پر ایک لفظ بھی نہ کہیں۔ الحمد للہ۔ فالحمد للہ۔ کہہ لے جسے غدار کہنا ہے۔ داغ لے جسے وطن پرستی کی کمین گاہ سے دار و گیر کی توپ داغنی ہے۔ نور اور ظلمت میں جہاں کہیں بھی، جب کبھی بھی معرکہ ہوگا ہم اپنا ذہنی رشتہ نور سے ضرور جوڑیں گے۔ مولانا مودودی کی جگہ کوئی بار ربیع الزماں، کوئی سید احمد، کوئی عبد العزیز ہو اور جماعت اسلامی کے عوض کوئی جمعیۃ العلماء، کوئی خلافت پارٹی، کوئی فخر الاسلام ہو۔ ہمیں ناموں سے دلچسپی نہیں۔ ہمیں تو بس یہ دیکھنا ہے کہ خدا اور رسولؐ والے اسلام کا پرچم کس کے ہاتھ میں ہے اور دنیائے دنی کے گھٹیا مفادات سے بلند ہوکر فقط اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر سر دھڑ کی بازی کون لگا رہا ہے۔ جو حق کا سپاہی ہو، انسانیت و اخلاق کا خادم ہو، معروف کا حامی اور منکرات کا ماحی ہو وہ ہمارا عزیز ہے، قرابت دار ہے، محبوب ہے۔ وہ ایران میں ہو، طوران میں ہو، کہیں بھی ہو۔ وہ ٹھوکر کھائے گا تو ہم کراہیں گے اور کامیابی سے ہمکنار ہوگا تو ہم مسکرائیں گے ؛

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ

تجلی

دیوبند

سالانہ بیس ۲۰ روپے

فی کاپی ڈھائی روپے

۲۸ ویں سال کا

چوتھا شمارہ

ایڈیٹر

حسن احمد صدیقی

فاضل

دارالعلوم

دیوبند

فہرست

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائیجیریا۔ کنیڈا فرانس۔ انڈونیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک پانچ پونڈ۔

بحرین۔ افریقہ۔ سعودی عرب۔ قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ دس شلنگ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ

○ اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو آپ کی خریداری ختم ہے [illegible]

[illegible]: علی اکبر عثمانی دیوبند

(اسلامی پریس دیوبند)

توجہ طلب

اس ماہ

توجہ طلب اور آغاز سخن کے ذیل میں
فیملی پلاننگ سے متعلق کچھ باتیں گذارش کی گئی تھیں
لیکن انھیں دیوبند اور دیوبند کے قرب وجوار کا
کوئی پریس چھاپنے کے لئے آمادہ نہیں ہوا ـــــ
لہٰذا!

احوالِ واقعی

گذشتہ شمارے میں جو کچھ لکھا گیا تھا اس کو پڑھنے کے بعد حسبِ یقین قارئین نے اپنے اپنے خیالات سے آگاہی بخشی۔ خطوط موسلا دھار بارش کی طرح برسے۔ ان تمام خطوط کو چھاپا نہیں جا سکتا۔ مختصر طور پر یہ سمجھئے کہ اکثر قارئین کی رائے یہ ہے کہ تجلی میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے، اسے اسی روش پر چلایا جائے جس روش پر وہ پچھلے ۲۷ برس سے گامزن ہے۔ ہم قارئین کو یقین دلاتے ہیں کہ تجلی اپنی سابقہ روایات کو باقی رکھے گا اور تجلی کی بے باکی اور حق پرستی میں انشاء اللہ کوئی تغیر واقع نہیں ہوگا۔

"مسجد سے میخانے تک" کے بارے میں بھی ان گنت حضرات نے اپنی رائے سے نوازا ہے۔ کثیر خطوط موصول ہوئے۔ ان میں ۳ فیصد خط ایسے ہیں جن میں مسجد سے میخانے تک کو بند کرنے کی رائے تحریر ہے۔ بقیہ ۹۷ فیصد خطوط میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ اس سلسلہ کو باقی رکھا جائے۔ ۹۵ فیصد حضرات نے تو یہ تک لکھا ہے کہ تجلی کی ڈاک اور مسجد سے میخانے تک جسم تجلی میں روح تجلی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا تجلی کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ ان دونوں مضمونوں کو باقی رکھا جائے۔ ان کا انقطاع تجلی کے وجود کو ٹھیس پہنچائے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ قارئین مطمئن رہیں مسجد سے میخانے تک بدستور جاری رہے گا۔ اور ملا ابن العرب مکی اپنی معصومانہ شرارتوں سے آپ کو مستفیض کرتے رہیں گے۔ قارئین نے یہ بات تو محسوس کر ہی لی ہوگی کہ مولانا عامر عثمانی کے انتقال نے ملا ابن العرب مکی کے ذہن کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے اور ان کی صلاحیتیں غم آلودہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان کی بعض حرکتوں پر اب ہنسنے کی بجائے رونا آتا ہے۔ ہم قارئین سے یہ گذارش کریں گے کہ وہ ملا ابن العرب مکی کو معذور تصور کریں اور اگر ان کے قلم سے نکلے ہوئے کسی لطیفہ پر ہنسنے کی بجائے رونا آئے تو صبر کریں۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آپ اس بات سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ وقت ہر زخم اور ہر ناسور کو مندمل کر دیتا ہے۔ ایک دن ملا مکی کی صلاحیتوں میں لگے ہوئے گھاؤ بھی بھر جائیں گے اور وہ جب ہنسانا چاہیں گے تو دنیا ہنسنے پر مجبور ہوگی رونے پر نہیں۔ جن حضرات نے مسجد سے میخانے تک کے سلسلہ کو بند کرنے کی رائے دی ہے ان سے ہم معذرت طلب کرتے ہیں ——— اگلا شمارہ عامر عثمانی نمبر ہوگا۔ یہ شمارہ اپریل و مئی اور جون و جولائی میں منظرِ عام پر آجائیگا یعنی دو قسطوں میں۔ یہ دونوں قسطیں کم و بیش ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہوں گی۔ پہلی قسط کی قیمت سابقہ اعلان کے مطابق چھ روپئے ہوگی اور دوسری قسط کی قیمت پانچ روپے ہوگی ——— محصول ڈاک میں بے پناہ اضافہ ہو جانے کی وجہ سے ہم تجلی کی قیمت میں اضافہ کرنے پر مجبور ہیں اگر اس وقت بھی قیمت میں اضافہ نہیں کیا گیا تو ہمیں ہر ماہ پانچ سو روپے کا نقصان اٹھانا پڑے گا جو ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ پہلے ایک ماہ کے شمارہ پر گیارہ سو کے ٹکٹ لگانے پڑتے تھے اور اب سترہ سو کے ٹکٹ لگانے پڑینگے۔ لہٰذا قیمت میں اضافہ کر دینا ناگزیر معلوم ہو رہا ہے۔ قارئین اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہمیں معذور سمجھیں گے اور شکایت کی بجائے ہماری حوصلہ افزائی کریں گے۔ نوٹ کر لیجیے کہ ۱۲ اپریل کے بعد اعلان رعایت منسوخ اور تجلی کا سالانہ چندہ بیس روپے کے بجائے چوبیس روپے اور فی شمارہ کی قیمت ڈھائی روپے کی بجائے پونے تین روپے۔

آپ تجلی کے پچھلے کئی شماروں میں "کیا ہم مسلمان ہیں؟" کی تیسری جلد کا اعلان پڑھ رہے ہیں۔ الحمد للہ یہ کتاب منظرِ عام پر آچکی ہے اور اس مرتبہ اس کتاب کو دیوبند کے ایک نئے ادارے "مکتبہ الہیات" نے شائع کیا ہے۔ اس نئے ادارے کی حوصلہ افزائی فرمائی جائے تاکہ آئندہ یہ ایسے اقدامات کر سکے جو مذہب و ملت کے لئے مفید ثابت ہوں۔ میں اس ادارہ کی عملی حوصلہ افزائی کی گذارش کے ساتھ انتہائی اعتماد کے ساتھ اس ادارہ کا پتہ تحریر کر رہا ہوں۔ اس کی قیمت ...... ہے۔

پتہ ذہن نشین کر لیجئے: ——— **مکتبہ الہیات** گدیوا اسٹاک۔ دیوبند۔ یو۔پی

"خمر کدۂ شیطنت کے چھ دروازے" کی قیمت ساڑھے تین اور چار روپے کے درمیان ہوگی۔ یہ کتاب عامر عثمانی نمبر کے بعد پیش کی جا سکے گی۔

قارئین کی توجہ مطلوب ہے

دسمبر کے شمارہ میں صد۱۲ پر تیسری سطر میں کوئی شئے کی جگہ کوئی شخص لکھا گیا۔ اس قسم کی کتابت کی غلطیاں اس شمارہ میں پھر اور بھی نظر آئیں۔ جنوری، فروری کا شمارہ بھی ایسی غلطیوں سے مبرا نہیں ہے۔ جنوری، فروری کے شمارہ میں صفحات کے نمبر بھی غلط ڈل گئے ہیں۔ بعض قارئین نے ان غلطیوں کی نشاندہی کی۔ ہم ان تمام حضرات کے شکر گذار ہیں اور پھر گذارش کرتے ہیں کہ آئندہ تصحیح پر اور زیادہ توجہ مبذول کی جائے گی ——— (ایڈیٹر)

سُرمہ کے خریداروں سے

دارالفیض رحمانی کا ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ اس نے سُرمہ کے خریداروں سے کبھی محصولڈاک وصول نہیں کیا لیکن محصولڈاک میں بے پناہ اضافہ ہوجانے کی وجہ سے آئندہ نصف محصولڈاک خریداروں کے ذمہ رہے گا۔

دارالفیض رحمانی دیوبند

ایک گذارش

کاغذ کی قلت اور اقتصادی حالات کی کمزوری کی وجہ سے عامر عثمانی نمبر محدود تعداد میں شائع کیا جارہا ہے۔ شایقین سے گذارش ہے کہ ۱۵ اپریل کے آخری ہفتہ تک اپنے آرڈر بک کرالیں۔ عین ممکن ہے کہ عامر عثمانی نمبر شائع ہوتے ہی نایاب ہوجائے اور آپ کو شکایت کی زحمت اٹھانی پڑے۔ ایجنٹ حضرات بھی اپنے آرڈروں سے اپریل ہی کے آخری ہفتہ میں مطلع کردیں:

منیجر تجلّی دیوبند

آغاز سخن

قارئین سے معذرت

ایکـ اہم سوال ـــــ اور اس اہم سوال کا دلچسپ جواب ایک مضمون کی شکل میں ملاحظہ فرمائیے ۔ یہ مضمون ملّا ابن العرب مکّی لکھ رہے ہیں جو عامر عثمانی نمبر میں شائع ہوگا ـــــ اس نمبر کے لئے اپنا آرڈر بک کرا لیجئے ۔ یہ نمبر کاغذ کی کمی کی باعث محدود تعداد میں شائع کیا جارہا ہے ـــــ عامر عثمانیؒ نمبر اگر بحفاظت منگانے کے خواہشمند ہوں تو ۴ روپے فیس روانہ کیجئے ۔ عامر عثمانی نمبر کی دونوں قسطیں بذریعہ رجسٹری روانہ کردی جائیں گی ۔

ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں !

سلام مسنون کے بعد اپنے تمام ایجنٹوں کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ آپ کے پاس تجلی کے جو پرچے بچ جاتے ہیں آپ انھیں واپس کرسکتے ہیں لیکن اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتیں نوٹ کریں :-

دیانتداری کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں ۔ کوشش یہی کریں کہ سب پرچے نکل جائیں ۔ واپس کرنیکی صورت میں ڈاک خرچ آپکے ذمہ رہیگا ۔ ہم ایسے شدہ پرچوں کی قیمت واپس نہیں کرینگے بلکہ ان کے بدلہ اگلے ماہ کے نئے شمارے روانہ کردیا کریں گے ۔

یہ بات بھی ذہن نشین کرلیجئے کہ عامر عثمانی نمبر کی دونوں قسطوں میں سے کوئی بھی قسط واپس نہیں لی جائیگی ۔ البتہ پچھلے مہینہ کے جو شمارے آپ حضرات کے پاس ہوں انھیں آپ واپس کرسکتے ہیں ۔ اور عامر عثمانی نمبر کی وی ۔ پی کرتے وقت ہم اتنی رقم کم کردیں گے جتنی رقم کے شمارے ہمارے پاس آئیں گے ۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھئے کہ اس وقت آپ صرف جنوری و فروری کا شمارہ واپس کرسکتے ہیں اور آئندہ بھی صرف ایک ماہ قبل کا شمارہ واپس کرسکتے ہیں ـــــ اہتمام یہ کرلیجئے کہ جو پرچے بیس دن کے اندر اندر آپ کے پاس سے نکل سکیں انھیں واپس کردیجئے

ایک بار پھر یہ گذارش ہے کہ دیانت داری کو نظرانداز نہ کریں اور اپنی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ ہماری پریشانیاں بھی پیش نظر رکھیں ۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ کو نقصان اٹھانا پڑے ۔ لہٰذا آپ بھی ہمیں خواہ مخواہ نقصان پہنچانے کی کوشش نہ فرمائیں ۔

ـــــ (ایڈیٹر)

تفہیم القرآن

النَّاس

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

کہو، میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود[۱] کی اُس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے[۲]، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے[۳]۔ ؏

---

[۱] یہاں بھی سورۂ فلق کی طرح اَعُوذُ بِاللہِ کہنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کو اس کی تین صفات سے یاد کر کے اُس کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے، ایک اُس کا رَبُّ النَّاس یعنی تمام انسانوں کا پروردگار و مُربّی اور مالک و آقا ہونا، دوسرے اُس کا مَلِکُ النَّاس یعنی تمام انسانوں کا بادشاہ اور حاکم و فرمانروا ہونا۔ تیسرے اس کا اِلٰہُ النَّاس یعنی انسانوں کا حقیقی معبود ہونا۔ (یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ الٰہ کا لفظ قرآن مجید میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک وہ شے یا شخص جس کو عبادت کا کوئی استحقاق نہ پہونچتا ہو مگر عملاً اس کی عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرا وہ جسے عبادت کا استحقاق پہونچتا ہو اور جو حقیقت میں معبود ہو خواہ لوگ اس کی عبادت کر رہے ہوں۔ اللہ کے لیے جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے اسی دوسرے معنی میں ہوا ہے)۔ ان تین صفات سے استعاذہ کا مطلب یہ ہوا کہ اُس میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو انسانوں کا رب بادشاہ، اور معبود ہونے کی حیثیت سے ان پر کامل اقتدار رکھتا ہے، جو اپنے بندوں کی حفاظت پر پوری طرح قادر ہے، اور جو واقعی اس شر سے انسانوں کو بچا سکتا ہے جس سے خود بچنے اور دوسرے انسانوں کو بچانے کے لیے میں اس کی پناہ مانگ رہا ہوں، یہی نہیں بلکہ چونکہ وہی رب اور بادشاہ اور الٰہ ہے، اس لیے اس کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں جس سے میں پناہ مانگوں اور جو حقیقت میں پناہ دے بھی سکتا ہو۔

[۲] اصل میں وَسْوَاسِ الْخَنَّاس کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ وَسْوَاس کے معنی ہیں بار بار وسوسہ ڈالنے والا۔ اور وسوسے کے معنی ہیں پے در پے ایسے طریقے یا طریقوں سے کسی کے دل میں کوئی بُری بات ڈالنا جس کے دل میں وہ ڈالی جا رہی ہو اُسے یہ محسوس نہ ہو سکے کہ وسوسہ کے انداز میں اس کے دل میں ایک بُری بات ڈال رہا ہے۔ وسوسے کے لفظ میں خود تکرار کا مفہوم شامل ہے، جیسے زلزلہ میں حرکت کی تکرار کا مفہوم شامل ہے۔ چونکہ انسان صرف ایک دفعہ بہکانے سے نہیں بہکتا بلکہ اسے بہکانے کے پے در پے کوشش کرنی ہوتی ہے، اس لیے ایسی کوشش کو وسوسہ اور کوشش کرنے والے کو وسواس کہا جاتا ہے یہاں لفظ خَنَّاس، تو یہ خُنُوس سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونے کے بعد چھپنے یا آنے کے بعد پیچھے ہٹ جانے کے ہیں، اور خَنَّاس چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس لیے اس کے معنی یہ فعل بکثرت کرنے والے کے ہوئے اب

یہ ظاہر بات ہے کہ وسوسہ ڈالنے والے کو بار بار وسوسہ اندازی ہی کے لئے آنا پڑتا ہے، اور ساتھ ساتھ جب اسے خنّاس بھی کہا گیا تو دونوں الفاظ کے ملنے سے خود بخود یہ مفہوم پیدا ہوگیا کہ وسوسہ ڈال ڈال کر وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور پھر پے در پے وسوسہ اندازی کیلئے پلٹ کر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک مرتبہ اس کی وسوسہ اندازی کی کوشش جب ناکام ہوتی ہے تو وہ چلا جاتا ہے، پھر وہی کوشش کرنے کے لئے دوبارہ، سہ بارہ، اور بار بار آتا رہتا ہے۔

وسواس الخنّاس کا مطلب سمجھ لینے کے بعد اب اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ اس کے شر سے پناہ مانگنے کا مطلب کیا ہے؛ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ پناہ مانگنے والا خود اس کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہے، یعنی اس شر سے کہ وہ کہیں اس کے اپنے دل میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستہ کی طرف دعوت دینے والے کے خلاف جو شخص بھی لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا پھرے اُس کے شر سے داعیِ حق خدا کی پناہ مانگتا ہے۔ داعی الی الحق کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ اس کی ذات کے خلاف اور اس کی دعوت کے خلاف جن جن لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے جا رہے ہوں ان سب تک خود پہونچے اور ایک ایک شخص کی غلط فہمیوں کو صاف کرے اس کیلئے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اپنی دعوت الی اللہ کا کام چھوڑ چھاڑ کر وسوسہ اندازوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کو صاف کرنے اور ان کے الزامات کی جواب دہی کرنے میں لگ جائے، اُس کے مقام سے یہ بھی فروتر ہے کہ جس سطح پر اس کے مخالفین اترے ہوئے ہیں اسی پر خود بھی اتر آئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دعوت حق دینے والے کو ہدایت فرمائی کہ ایسے اشرار کے شر سے بس خدا کی پناہ مانگ لے اور پھر بے فکری کے ساتھ اپنی دعوت کے کام میں لگا رہ۔ اس کے بعد ان سے نمٹنا تیرا کام نہیں بلکہ رب الناس، ملک الناس اور الٰہ الناس کا کام ہے۔

اس مقام پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ وسوسہ عمل شر کا نقطۂ آغاز ہے۔ وہ جب ایک غافل یا خالی الذہن آدمی کے اندر اثر انداز ہو جاتا ہے تو پہلے اس میں بُرائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پھر مزید وسوسہ اندازی اُس بُری خواہش کو بُری نیت اور بُرے ارادے میں تبدیل کر دیتی ہے پھر اس سے آگے جب وسوسہ کی تاثیر بڑھتی ہے تو ارادہ عزم بن جاتا ہے اور آخری قدم پھر عمل شر ہے۔ اس لئے وسوسہ اندازی کے شر سے خدا کی پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ شر کا آغاز جس مقام سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسی مقام پر اس کا قلع قمع فرما دے۔

دوسرے لحاظ سے اگر یہ دیکھا جائے تو وسوسہ اندازوں کے شر کی ترتیب یہ نظر آتی ہے کہ پہلے وہ کھلے کھلے کفر، شرک، دہریت یا اللہ اور رسول سے بغاوت اور اللہ والوں کی عداوت پر اکساتے ہیں۔ اس میں ناکامی ہو اور آدمی دین اللہ میں داخل ہی ہو جائے تو وہ اسے کسی نہ کسی بدعت کی راہ سجھاتے ہیں، یہ بھی نہ ہوسکے تو معصیت کی رغبت دلاتے ہیں۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہوسکے تو آدمی کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے گناہ کرلینے میں تو کوئی حرج نہیں، تاکہ یہی اگر کثرت سے صادر ہو جائیں تو گناہوں کا بارِ عظیم انسان پر لد جائے۔ اس سے بھی اگر آدمی بچ نکلے تو بدرجۂ آخر وہ کوشش کرتے ہیں کہ آدمی دین حق کو بس اپنے آپ تک ہی محدود رکھے، اسے غالب کرنے کی فکر نہ کرے، لیکن اگر کوئی شخص ان تمام چالوں کو ناکام کر دے تو پھر شیاطین، جن و انس کی پوری پارٹی ایسے آدمی پر پل پڑتی ہے، اس کے خلاف لوگوں کو اکساتی اور بھڑکاتی ہے، اُس پر گالیوں اور الزامات کی بوچھاڑ کراتی ہے، اسے ہر طرف بدنام اور رسوا کرنے کی کوشش کرتی ہے، پھر شیطان اس مرد مومن کو آکر غصہ دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ برداشت کر لینا تو بڑی بزدلی کی بات ہے، اُٹھ اور ان حملہ آوروں سے بھڑ جا۔ یہ شیطان کا آخری حربہ ہے جس سے وہ دعوت حق کی راہ کھوٹی کرانے اور داعیِ حق کو راہ کے کانٹوں سے الجھا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے بھی اگر داعیِ حق بچ نکلے تو شیطان اس کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہوا ہے وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ "اور اگر شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی اکساہٹ محسوس ہو تو اللہ کی پناہ مانگو" (الاعراف ۲۰۰۔ حٰم سجدہ ۳۶) وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ "کہو میرے پروردگار میں شیاطین کی اکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں" (المؤمنون ۔ ۹۷) اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ، "جو لوگ پرہیزگار ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال انھیں چھو بھی جائے

تو وہ فوراً چونک جاتے ہیں اور پھر انہیں (صحیح راستہ) صاف نظر آنے لگتا ہے۔" (الاعراف - ۲۰۱) اور اسی بنا پر جو لوگ شیطان کے اس آخری حربے سے بچ نکلیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ "یہ چیز بڑے نصیبے والے کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔" حٰم السجدہ ' ۳۵)

اس سلسلے میں ایک بات اور نگاہ میں رہنی چاہیئے۔ وہ یہ کہ انسان کے دل میں وسوسہ اندازی صرف باہر سے شیاطین جن وانس ہی نہیں کرتے بلکہ اندر سے خود انسان کا اپنا نفس بھی کرتا ہے۔ اُس کے اپنے غلط نظریات اُس کی عقل کو گمراہ کرتے ہیں۔ اس کی اپنی جائز اغراض و خواہشات اُس کی قوت دتمیز... اور قوت ارادی اور قوتِ فیصلہ کو بدراہ کرتی ہیں۔ اور باہر کے شیاطین ہی نہیں، انسان کے اندر اس کے اپنے نفس کا شیطان بھی اس کو بہکاتا ہے۔ یہی بات ہے جو قرآن میں ایک جگہ فرمائی گئی ہے وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (ق - ۱۶) اور ہم اس کے اپنے نفس سے ابھرنے والے وسوسوں کو جانتے ہیں۔" اسی بنا پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشہور خطبۂ مسنونہ میں فرمایا ہے نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔" ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے۔"

۵۳ بعض اہلِ علم کے نزدیک ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ وسوسہ ڈالنے والا دو قسم کے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، ایک جن دوسرے انسان۔ اس بات کو اگر تسلیم کیا جائے تو لفظ ناس کا اطلاق جن اور انسان دونوں پر ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے، کیونکہ قرآن میں جب رِجَالٌ (مردوں) کا لفظ جنوں کے لئے استعمال ہوا ہے، جیساکہ سورۂ جن آیت ۶ میں ہم دیکھتے ہیں، اور جب نَفَر کا استعمال جنوں کے گروہ پر ہو سکتا ہے، جیساکہ سورۂ احقاف آیت ۲۹ میں ہوا ہے، تو مجازاً ناس کے لفظ میں بھی انسان اور جن دونوں شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ رائے اس لئے غلط ہے کہ ناس اور انس اور انسان کے الفاظ لغت ہی کے اعتبار سے لفظ جن کی ضد ہیں۔ جن کے اصل معنی پوشیدہ مخلوق کے ہیں اور جن کو جن اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی آنکھ سے مخفی ہے۔ اس کے برعکس ناس اور انس کے الفاظ انسان کے لئے بولے ہی اس بنا پر جاتے ہیں کہ وہ ظاہر اور مرئی اور محسوس ہے۔ سورۂ قصص، آیت ۲۹ میں ہے۔ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا۔ یہاں آنَسَ کے معنی رأی ہیں، یعنی حضرت موسیٰ نے "کوہِ طور کے کنارے آگ دیکھی۔" سورۂ نساء، آیت ۶ میں ہے فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا۔ "اگر تم محسوس کرو کہ یتیم بچے اب ہوشمند ہوگئے ہیں۔" یہاں اٰنَسْتُمْ کے معنی اَحْسَسْتُمْ یا رَاَیْتُمْ ہیں۔ پس ناس کا اطلاق عرب کی رو سے جنوں پر نہیں ہو سکتا اور آیت کے صحیح معنی یہ ہیں کہ "اس وسوسہ انداز کے شر سے جو انسانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا خود انسانوں میں سے۔" یا دوسرے الفاظ میں وسوسہ اندازی کا کام شیاطین جن بھی کرتے ہیں اور شیاطین انس بھی، اور دونوں کے شر سے پناہ مانگنے کی اس سورۃ میں تلقین کی گئی ہے۔ اس معنی کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے اور حدیث سے بھی قرآن میں فرمایا:-

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (الانعام - ۱۱۲)	اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے شیطان جنوں اور شیطان انسانوں کو دشمن بنادیا جو ایک دوسرے پر خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں۔

اور حدیث میں امام احمد، نسائی اور ابن حبّان حضرت ابوذرؓ کی نقل کرتے ہیں کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپؐ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ فرمایا ابوذرؓ۔ تم نے نماز پڑھی؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا اٹھو اور نماز پڑھو۔ چنانچہ میں نے نماز پڑھی اور آکر بیٹھ گیا۔ حضورؐ نے فرمایا یا اباذر، تَعَوَّذْ باللہ من شر شیاطین الانس والجن؟ "اے ابوذر، شیاطین انس اور شیاطین جن کے شر سے اللہ کی پناہ مانگو۔" میں نے عرض کیا یا رسول اللہ، کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ فرمایا ہاں!-

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

پیدائش سے آغازِ نبوت تک

زید بن حارثہ کا واقعہ سب سے زیادہ جو واقعہ آپؐ کے بلند ترین اخلاق کی شہادت دیتا ہے وہ حضرت زید بن حارثہ کا ہے۔ یہ قبیلۂ کلب کے ایک شخص حارثہ بن شرحبیل (یا شراحیل) کے بیٹے تھے اور ان کی ماں سُعدیٰ بنت ثعلبہ قبیلۂ طے کی شاخ بنی معن سے تھیں۔ جب یہ آٹھ سال کے بچے تھے اس وقت ان کی ماں انھیں اپنے میکے لے گئیں۔ وہاں بنی قین بن جسر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو وہ پکڑ لے گئے ان میں حضرت زید بھی تھے۔ پھر انہوں نے طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں لے جاکر ان کو بیچ دیا خریدنے والے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ انہوں نے مکہ لاکر اپنی پھوپی صاحبہ کی خدمت میں انھیں نذر کر دیا۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح ہوا۔ تو حضورؐ نے ان کے ہاں زید کو دیکھا اور ان کی عادات و اطوار آپؐ کو اس قدر پسند آئیں کہ آپؐ نے انھیں حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا اس طرح یہ خوش قسمت لڑکا اس خیر الخلائق ہستی کی خدمت میں پہونچ گیا جسے چند سال بعد اللہ تعالےٰ نبی بنانے والا تھا اس وقت حضرت زید کی عمر پندرہ سال تھی۔ کچھ مدت بعد ان کے باپ اور چچا کو پتہ چلا کہ ہمارا بچہ مکہ میں ہے۔ وہ انھیں تلاش کرتے ہوئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم تک پہونچے اور عرض کیا کہ آپؐ جو فدیہ چاہیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں، آپ ہمارا بچہ ہمیں دیدیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ لڑکے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہوں کہ وہ تمہارے پاس جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لوں گا اور اسے یوں ہی چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو شخص میرے ساتھ رہنا چاہتا ہو اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔ انھوں نے کہا یہ تو آپ نے انصاف سے بھی بڑھکر درست بات فرمائی۔ آپ بچے کو بلا کر پوچھ لیجئے۔ حضورؐ نے زید کو بلایا اور ان سے کہا کہ ان دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا "جی ہاں، یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا۔" آپؐ نے فرمایا "اچھا تم ان کو بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمہیں پوری آزادی ہے، چاہو تو ان کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو تو میرے ساتھ رہو۔" انھوں نے جواب دیا میں آپ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔ ان کے باپ اور چچا نے کہا "زید کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟" انھوں نے جواب دیا کہ "میں نے اس شخص کے جو اوصاف دیکھے ہیں ان کا تجربہ کر لینے کے بعد اب دنیا میں کسی کو بھی اس پر ترجیح نہیں دے سکتا۔" زید کا یہ جواب سنکر ان کے باپ اور چچا بخوشی راضی ہوگئے۔ حضورؐ نے اسی وقت زید کو آزاد کر دیا اور حرم میں جاکر قریش کے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ "آپ سب لوگ گواہ رہیں، آج سے زید میرا بیٹا ہے

یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔" اسی بناء پر لوگ ان کو زید بن محمد کہنے لگے۔ یہ سب واقعات نبوت سے پہلے کے ہیں۔ حضور جب منصب نبوت پر سرفراز ہوئے اُس وقت حضرت زیدؓ کو آپؐ کی خدمت میں رہتے ہوئے ۱۵ سال گذر چکے تھے اور ایمان لانے کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال تھی (تفہیم القرآن جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۶۸)

حضرت علیؓ حضورؐ کی سرپرستی میں | اس زمانہ میں حضورؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے اُن احسانات کو بھی یاد رکھا ہو بچپن سے جوانی تک انھوں نے آپ پر کئے تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جب مکّہ اور اس کے اطراف میں شدید گرانی رونما تھی آپ کو خیال آیا کہ میرے چچا کی مالی حالت کمزور ہے وہ کثیر العیال آدمی ہیں۔ ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ آپ اپنے دوسرے چچا حضرت عباسؓ کے پاس گئے جو مالدار آدمی تھے اور اُن سے کہا کہ "آپ کے بھائی کا کنبہ بڑا ہے، مالی حالت اچھی نہیں ہے اور لوگ جس شدید گرانی کی حالت میں مبتلا ہیں وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں، چلئے ہم ان کا بار ہلکا کرنے کے لئے ان سے بات کریں اور ان کے ایک بیٹے کو آپ اپنی کفالت میں لے لیں اور ایک کو میں لے لیتا ہوں۔" حضرت عباس اس بات پر راضی ہوگئے اور دونوں چچا بھتیجوں نے ابو طالب کے پاس جاکر مدعا بیان کیا۔ انھوں نے کہا عقیل اور (بقول ابن ہشام) طالب کو میرے لئے چھوڑ دو، باقی جس کو تم میں سے جو لینا چاہے لے لے۔ اس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت علی کو اپنے ہاں لے گئے اور حضرت عباسؓ نے حضرت جعفر کو لے لیا۔ حضرت علی ان میں سب سے چھوٹے تھے حضرت جعفر اُن سے دس برس بڑے، حضرت عقیل ان سے دس برس بڑے اور طالب ان سے بھی دس برس بڑے تھے ان کے علاوہ ابو طالب کے دوسرے بچے بھی تھے۔

اس طرح حضرت علی بچپن ہی میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پرورش میں آگئے تھے اور حضورؐ نے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا اغلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی عمر اس وقت چار، پانچ برس سے زیادہ نہ تھی۔

کعبہ کی تعمیر نو | حضورؐ ۳۵ سال کے تھے اور نبوت میں ابھی پانچ سال باقی تھے کہ قریش نے کعبہ کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ اس کی عمارت بہت بوسیدہ ہوگئی تھی۔ دیواریں بھی نیچی تھیں، اور اوپر کوئی چھت بھی نہ تھی۔ کعبہ کا خزانہ اُس وقت ایک کنویں میں تھا جو عمارت کے اندر بنا ہوا تھا بعض لوگ دیواریں پھاند کر وہاں پہونچ جاتے اور چوری کر لیتے تھے۔ چنانچہ تعمیر جدید کا فیصلہ ہونے سے پہلے ایک شخص دُوَیک نے کعبہ کا مال چرا لیا تھا، یا چوروں نے مال لے کر دُوَیک کے پاس رکھوا دیا تھا اور اسی کے پاس وہ برآمد ہوا تھا۔ ان وجوہ سے قریش کے لوگ چاہتے تھے کہ بلند اور پختہ عمارت بنا کر اور چھت ڈال دیں۔ اسی زمانہ میں ایک رومی تاجر کے جہاز کو سمندر کی موجوں اور طوفانی ہواؤں نے بقول ابن اسحٰق جُدّہ کے بندرگاہ پر، اور بقول ابن سعد شُعیبَہ پر (جو جدّہ سے پہلے حجاز کا بندرگاہ تھا) لاکر پٹخ دیا جس سے اس کے ٹکڑے اڑگئے۔ اُس میں باقوم نامی ایک رومی معمار بھی تھا اور مکّہ میں ایک قبطی نجار لکڑی کا کام کرنے کیلئے بھی موجود تھا۔ جہاز ٹوٹنے کی خبر سن کر ولید بن مُغیرہ قریش کے چند آدمیوں کے ساتھ وہاں پہونچا اور جہاز کی لکڑیاں خرید لیں باقُوم سے بات چیت کرکے ان لوگوں نے اس کو بھی راضی کر لیا کہ تعمیر کعبہ کا کام انجام دے۔ اس کے بعد بنی مخزُوم میں سے ایک ایک شخص ابو وَہب بن عمرو بن عائِذ (جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے والد کا ماموں تھا) اٹھا اس نے کعبہ کا ایک پتھر نکال کر اس کی جگہ واپس رکھا اور پھر قریش کے لوگوں کو خطاب کرکے کہا "اے قریش کے لوگو، اس کی تعمیر میں اپنی حلال کمائی لگاؤ۔ اس میں زناکاری کی کمائی، سود کی کمائی، یا کسی شخص پر ظلم کرکے حاصل کی ہوئی کمائی داخل نہ ہونے پائے۔" ایک اور روایت میں اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "اس گھر کی تعمیر میں کوئی ایسا مال نہ لگاؤ جو تم نے غصب کرکے، یا قطع رحمی کرکے، یا کسی ذمّہ کو جو تمہارے اور کسی دوسرے انسان کے درمیان ہو توڑ کر حاصل کیا ہو۔"ل؎ لیکن قریش کے لوگ کعبہ کو منہدم کرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ آخرکار

ل؎ یہ ابن اسحاق کا بیان ہے۔ موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں اسے ولید بن مغیرہ کا قول لکھا ہے۔

ولید بن مغیرہ نے سابق عمارت کو ڈھانے کے لئے کدال ہاتھ میں لی اور کہا "اے اللہ، ہم دین سے منحرف نہیں ہوئے ہیں۔ ہم خیر کے سوا کچھ نہیں چاہتے" یعنی کسی بری نیت سے تیرے گھر کو نہیں ڈھا رہے یہ کہہ کر اس نے کعبہ کے ایک حصہ پر ضرب لگائی اور پھر رک گیا۔ رات بھر سب لوگ اس انتظار میں رہے کہ ولید پر کوئی آفت آتی ہے یا نہیں۔ اگر آفت آجائے تو ہم کام روک دیں گے اور جو پتھر کھڑا ہے اسے اسی کی جگہ پر لگا دیں گے۔ اگر کوئی آفت نہ آئے تو کام جاری رکھیں گے۔ صبح جب ولید پر اس فعل کا کوئی وبال نہ پڑا تو عمارت کو منہدم کرنے کا کام مختلف سمتوں سے مختلف قبیلوں نے اپنے اپنے ذمہ لیا اور بنائے ابراہیم کی بنیاد تک دیواریں توڑ دی گئیں پھر سارے قبیلوں کے لوگ پتھر اٹھا اٹھا کر لانے اور عمارت تعمیر کرنے میں شریک ہوئے۔ جب اس مقام تک پہونچ گئے جہاں حجرِ اسود نصب کیا جانا تھا تو ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ شرف اسے حاصل ہو اس پر اتنا جھگڑا ہوا کہ آپس میں لڑائی تک کا خطرہ پیدا ہو گیا چار پانچ دن تک یہی جھگڑا چلتا رہا۔ آخر ایک روز حرم میں سب مشورہ کے لئے جمع ہوئے بنی مخزوم میں سے ایک شخص ابو اُمیہ بن المغیرہ، جو اس وقت قریش میں سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا، اٹھ کر تجویز پیش کی کہ "اے قریش کے لوگو، اپنے اس اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لئے اس بات پر اتفاق پیدا کر لو کہ سب سے پہلے جو شخص اس مسجد کے دروازے[1] سے داخل ہو وہ اس کا فیصلہ کر دے۔" اس تجویز کو سب نے مان لیا۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سب سے پہلے داخل ہونے والے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھے۔ لوگوں نے آپ کو دیکھتے ہی کہا ھٰذا الامین، رَضینا، ھٰذا محمد، "یہ امین ہیں ہم راضی ہو گئے۔ یہ تو محمدؐ ہیں۔" مسند احمد کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے آپ کو دیکھتے ہی کہا اتاکم الامین "تمہارے پاس امین آ گیا۔"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا کہ اب اس قضیہ کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے تو آپؐ نے فرمایا ایک کپڑا لاؤ۔ لوگ کپڑا لے آئے۔ آپ نے حجرِ اسود کو اس کپڑے میں رکھ دیا پھر فرمایا ہر ہر قبیلہ ایک ایک طرف سے اس کپڑے کو پکڑ لے اور سب مل کر حجرِ اسود کو اٹھائیں۔ جب پتھر اس مقام تک پہونچ گیا جہاں اس کو لگانا تھا تو آپؐ نے اسے اپنے ہاتھ سے وہاں لگا دیا۔

یہ نبوّت سے صرف پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اُس وقت ساری قوم نے بالاتفاق حضورؐ کے امین ہونے کی شہادت دی تھی۔ اور ساری قوم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ آپ کس قدر دانشمند انسان ہیں کہ اتنے خطرناک قضیئے کو بہترین طریقے سے حل کر کے آپ نے اپنی قوم کو خانہ جنگی سے بچا لیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ صرف یہی ایک موقع نہ تھا جبکہ حضورؐ نے قریش کے ایک قضیئے کا فیصلہ کیا ہو بلکہ نبوّت سے قبل اکثر لوگ اپنے معاملات کا تصفیہ کرانے کے لئے آپؐ سے رجوع کرتے تھے۔

نبوّت سے پہلے حضورؐ کو قریب سے جاننے والے نبوت سے قبل جن لوگوں کو سب سے زیادہ قریب سے آپ کی زندگی دیکھنے اور آپ کے حالات جاننے کا موقع ملا تھا اُن میں کچھ تو آپ کے اپنے گھر کے لوگ تھے یعنی حضرت خدیجہؓ جو پندرہ سال سے آپ کی زوجہ محترمہ تھیں، حضرت علیؓ جنھوں نے بچپن سے آپ کے گھر میں پرورش پائی تھی، حضرت زید بن حارثہؓ جنھوں نے ماں باپ کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ رہنا قبول کیا تھا اور آپؐ نے ان کو بیٹا بنا لیا تھا، اور حضرت اُمّ اَیمن جنھوں نے بچپن سے آپ کو پالا تھا اور گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتی تھیں جنھیں حضور فرمایا کرتے تھے کہ "میری ماں کے بعد یہ میری ماں ہیں" اور جن کو آپؐ یا امّہ (اے میری ماں) کہہ کر خطاب فرماتے تھے۔ ان کے علاوہ گھر سے باہر کے متعدد اصحاب ایسے تھے جنھیں آپ کی ہم نشینی کا شرف حاصل تھا اور جو ایک مدّت سے آپ کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے۔

ان میں سب سے زیادہ آپ کے قریبی دوست حضرت ابوبکرؓ تھے۔ جاہلیت کے زمانہ میں بڑے ذی وجاہت اور رؤسائے قوم میں سے ایک رئیس تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ اپنے اخلاق کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں جاہلیت میں بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ قریش نے دیت کے معاملات ان کے سپرد کر رکھے تھے، جس دیت کا بار

[1] دروازے سے مُراد باب بنی شیبہ ہے۔ ایک روایت میں اس کا قول یہ ہے کہ جو شخص سب سے پہلے باب الصفا سے داخل ہو وہ اس کا فیصلہ کرے۔

وہ قبول کر لیتے۔ سارا قبیلہ اسے اٹھانے پر راضی ہو جاتا اور جس کو دوسرا کوئی قبول کرتا تو لوگ اس کی توثیق سے انکار کر دیتے تھے۔ انساب کے معاملہ میں بھی قریش کے لوگ سب سے زیادہ ان کے علم پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کا جو اخلاقی اثر نہ صرف قریش ہی بلکہ آس پاس کے قبائل تک میں تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب مکّہ میں مسلمانوں پر مظالم کی انتہا ہو گئی تو ابوبکر بھی ہجرت کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک یا دو دن کی مسافت طے کی تھی کہ احابیش کا سردار ابن الدّغنّہ راستے میں ملا۔ اس نے پوچھا ابوبکرؓ، تم کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا "میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے، سخت اذیتیں دی ہیں اور میری زندگی تنگ کر دی ہے"۔ اس نے کہا "کیوں؟ خدا کی قسم تم معاشرہ کی زینت ہو، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہو، نیک کام کرتے ہو، غریبوں کی مدد کرتے ہو۔ چلو، میں تم کو پناہ دیتا ہوں"۔ پھر وہ انھیں لے کر مکّہ میں آیا اور اس نے اعلان کیا کہ "میں نے ابن ابی قحافہ کو پناہ دی ہے۔ اب کوئی ان سے بھلائی کے سوا کسی اور طرح تعرّض نہ کرے"

دوسرے صاحب حضرت صُہیب بن سِنانِ رومی تھے اصل میں بنی نمر بن قاسط میں سے تھے جن کا علاقہ ایران کی حکومت میں موصل کے قریب واقع تھا۔ بچپن میں روم و ایران کی ایک لڑائی کے موقع پر گرفتار ہوئے اور ایک مدت تک رومیوں کی غلامی میں رہنے کے بعد فروخت ہوتے ہوتے مکّہ پہونچے جہاں عبداللہ بن جُدعان نے ان کو خرید لیا۔ ابن جدعان چونکہ حضرت ابوبکر کا قریبی رشتہ دار تھا اس لیے ان کے توسط سے یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے متعارف ہوئے اور آپؐ سے مانوس ہو کر اکثر آپ کی صحبت میں بیٹھنے لگے۔ ان کا مرتبہ یہ تھا کہ جب حضرت عمرؓ کی وفات ہونے لگی تو انہوں نے وصیت کی کہ جب تک شوریٰ کسی ایک خلیفہ پر متفق نہ ہو جائے یہی مسجد نبوی میں نماز پڑھاتے رہیں

تیسرے حضرت عمّار بن یاسر تھے جن کا قول بیہقی نے نقل کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شادی کا حال مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے۔ میں آپ کا ہم نشین، دوست، اور آپ سے بہت مالوف تھا۔ حضرت صہیب اور یہ ایک ساتھ ایمان لائے۔

چوتھے ضماد الاَزدی از دِشنوأۃ میں تھے جو زمانہ جاہلیت میں حضور کے دوست تھے۔

پھر وہ لوگ تھے جو قریبی رشتہ داری کی وجہ سے آپ کو خوب جانتے تھے اور جن سے آپ کو خوب جانتے تھے اور جن سے آپؐ کی زندگی کا کوئی پہلو چھپا ہوا نہ تھا، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ جو آپ کی پھوپی ام حکیم البیضاء کے نواسے تھے۔ حضرت زبیرؓ بن العوّام، جو آپ کی پھوپی حضرت صفیہؓ کے بیٹے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عمیرؓ بن ابی وقاص جو حضور کی والدہ ماجدہ کے رشتہ دار تھے۔ حضرت ابوسلمہ جو آپ کے پھوپی زاد بھائی بھی تھے اور دودھ شریک بھائی بھی۔ حضرت عبداللہؓ بن جحش جو آپؐ کی پھوپی امیمہ کے بیٹے تھے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب جو آپ کے چچازاد بھائی تھے

یہ لوگ سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے اور ان کا اسلام لانا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ حضورؐ کی زندگی کو قریب سے دیکھ کر ان کے دلوں پر آپ کے فضائل اخلاق کا نقش پہلے ہی اسی طرح ثبت ہو چکا تھا کہ انھیں آپ کو اللہ کا رسولؐ تسلیم کرنے میں کوئی تامّل نہ ہوا۔ اس ایمان کو رشتہ داری یا دوستی یا ذاتی محبت پر محمول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان چیزوں کی بنا پر کوئی شخص کسی کی خاطر اپنا دین تبدیل نہیں کیا کرتا۔

حلیہ شریف | زمانہ قبل نبوت کے حالات کو ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا حلیہ شریف بھی بیان کر دیا جائے کیونکہ آدمی کی شخصیت سے اس کے حلئے کا بھی گہرا تعلق ہوتا ہے

بخاری ومسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی، بیہقی، دارقطنی وغیرہ

ملہ احابیش تین قبیلوں کا مجموعہ تھا جن میں بنو الحارث بن عبد مناۃ بن کنانہ، بنی الہون بن خزیمہ بن مدرکہ اور خزاعہ میں سے بنو المصطلق شامل تھے۔ انہوں نے مل کر مکّہ کے زیریں علاقہ میں اَحبَش نامی ایک وادی کے اندر باہم دوستی اور امدادِ باہمی کا معاہدہ کیا تھا، اس وجہ سے یہ احابیش کہلاتے تھے۔

کتب حدیث میں حضرت علیؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت انسؓ اور حضرت براءؓ بن عازب، حضرت جابرؓ بن سمرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن بسر، حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ اور دوسرے صحابۂ کرام سے اس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں، ان کو جمع کر کے ہم مجموعی طور پر آپ کا حلیہ مبارک یہاں بیان کرتے ہیں۔

آپؐ کا قد نہ بہت لمبا تھا نہ ٹھگنا، بلکہ متوسط قامت سے کچھ نکلا ہوا تھا، اور کسی مجمع میں آپ ہوتے تو نمایاں نظر آتے تھے چہرہ نہ لمبوترا تھا نہ بالکل گول، بلکہ کچھ گولائی لئے ہوئے تھا۔ رنگ نہ گندمی تھا نہ سرخ، نہ بالکل سفید، بلکہ گورا سرخی مائل اور روشن تھا۔ سر بڑا تھا۔ سینہ چوڑا تھا اور دونوں شانوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا، جسم گٹھا ہوا تھا مگر موٹا نہ تھا۔ جوڑ بند بہت مضبوط تھے۔ بازو بھرے ہوئے اور پنڈلیاں جسم سے متناسب تھیں۔ بازوؤں اور پنڈلیوں پہ ہلکے ہلکے بال تھے، باقی جسم بالوں سے صاف تھا اور سینے پر بالوں کی ایک لکیر سی ناف تک جاتی تھی۔ سر اور ڈاڑھی کے بال گھنے تھے۔ بالوں میں نہ حبشیوں کی طرح گھونگھریالا پن تھا، نہ بالکل سیدھے تھے۔ بلکہ ہلکا سا گھونگھر تھا۔ آخر عمر تک سر اور ڈاڑھی میں مشکل سے بیس بال سفید ہوئے تھے اور وہ بھی اس وقت نمایاں ہوتے تھے جب آپؐ نے تیل نہ لگایا ہوتا تھا۔ سر کے بال کبھی نصف کان تک، کبھی کان کی لو تک اور کبھی اس سے بھی نیچے تک لمبے رکھتے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور بہت خوبصورت تھیں، سرمہ لگائے بغیر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سرمہ لگائے ہوئے ہیں۔ آنکھوں کے ڈھیلوں میں ہلکے ہلکے سرخ ڈورے سے تھے۔ پلکیں گھنی اور لمبی تھیں۔ بھویں ایک دوسرے سے الگ تھیں، ملی ہوئی نہ تھیں۔ منہ کشادہ تھا۔ عربوں میں اسی کو خوبصورتی سمجھا جاتا تھا اور چھوٹے منہ کو پسند نہ کیا جاتا تھا۔ ایڑیاں ہلکی تھیں اور ہاتھ پاؤں کی انگلیاں لمبی اور بھاری تھیں۔ پاؤں کی بیچ کی انگلی انگوٹھے سے کچھ نکلتی ہوئی تھی ہتھیلیاں اور تلوے بھرے بھرے تھے۔ پہلی نظر میں جو دیکھتا مرعوب ہو جاتا تھا، مگر جس قدر آپ سے قریب ہوتا اتنا ہی آپ ہی نرم مزاجی اور حسن اخلاق سے متاثر ہو کر آپؐ سے مالوف ہوتا جاتا تھا۔ چلتے تھے تو قدم جما کر اس طرح چلتے تھے جیسے گہرائی میں اتر رہے ہوں یا چڑھائی پر چڑھ رہے ہوں۔ کسی طرف ملتفت ہوتے تو پوری طرح ہوتے اور کسی طرف سے رخ پھیرتے تو پوری طرح پھیرتے تھے، دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے یا صرف گردن موڑ کر دیکھنے کی عادت نہ تھی چہرے پر تبسم طاری رہتا۔ کبھی ہنستے تو ٹھٹھا مار کر نہ ہنستے تھے جسمانی طاقت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ رکانہ نے جو قریش کا سب سے زیادہ طاقت ور پہلوان سمجھا جاتا تھا آپؐ سے کشتی لڑی اور آپؐ نے اسے پچھاڑ کر بے بس کر دیا۔ وہ پھر اٹھ کر مقابلہ پر آیا۔ آپؐ نے پھر اسے پچھاڑ دیا اس نے کہا "اے محمدؐ، تعجب ہے، تم مجھے پچھاڑ دیتے ہو۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ نے نہ کبھی ورزشیں کیں نہ پہلوانی کی، پھر بھی آپؐ نے اسے دو دفعہ پچھاڑ کر حیران کر دیا (بعد میں یہ صاحب بھی مسلمان ہو گئے، رضی اللہ عنہ) حضورؐ کے لڑکپن کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن جدعان کے ہاں ایک دعوت کے موقع پر ابو جہل آپؐ سے الجھ پڑا۔ وہ بھی تقریباً آپؐ ہی کے برابر کا لڑکا تھا آپؐ نے اٹھا کر اسے اس طرح پٹخا کہ اس کا گھٹنا زخمی ہو گیا اور اور اس زخم کا اثر عمر بھر اس کے گھٹنے پر باقی رہا۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ جنگ بدر میں ابو جہل مارا گیا تو حضورؐ نے فرمایا اس کی لاش مقتولوں میں تلاش کی جائے اور اس کے گھٹنے کو دیکھا جائے، اس پر ایک زخم کا نشان ہو گا چنانچہ جب اس کی لاش ملی تو نشان وہاں موجود تھا۔ پھر آپ نے خود یہ قصہ بیان فرمایا کہ اسے یہ زخم کیسے لگا تھا۔

اس تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضورؐ صرف حسن اخلاق ہی کا مجسمہ نہ تھے بلکہ مردانہ حسن اور جواں مردی کا بہترین نمونہ تھے۔

(اضافہ از مؤلف)

کیا ہم مسلمان ہیں؟

قلب پر ——

رگِ جاں پر کوئی چوٹ پڑتی ہے تو دماغ سوچنے لگتا ہے اور جہاں جسمِ انسانی کے یہ دو عظیم اعضاء —— دل اور دماغ کام کرنے لگتے ہیں اسی لمحہ آدمی کو اللہ تعالےٰ کے دستِ خاص سے اس ساری کائنات کا راس المال "ایمان" اور "ہدایت" کا لافانی خزانہ عطا ہو جاتا ہے۔ ایک دولتِ دل کہ جو کسی کو نظر آ گئی تو سیم و زر کے معانی خزانے اس کی نظر میں ہمیشہ کے لئے مٹی ہو کر رہ گئے اور جس کے ہاتھ آ گئی اُس نے دونوں ہاتھوں سے اسی دولت کو پکڑنے کے لئے جان و مال کی ساری دولت کو اسی خدا کی راہ میں گرد کی طرح جھاڑ دیا جس کے در سے یہ دولت دل عطا ہوتی آئی ہے۔

لیکن اب ہمیں اس حقیقت کا یقین ہی نہیں آتا! ——

ایسی باتیں ہم اگرچہ کانوں سے سنتے رہتے ہیں اور زبان و قلم سے بولتے بھی رہتے ہیں مگر اندر ہی اندر اس تشکیک و بدگمانی کا بچھو یہ ڈنک مارتا رہتا ہے کہ یہ محض کہنے اور سننے کی باتیں نہیں اور بس —— ورنہ اس اینٹ پتھر کی دنیا میں تو روپہلے اور سنہرے پتھروں کا ہی سکہ چلتا آیا ہے۔ عملاً اس کے برخلاف کچھ ممکن نہیں۔

لیکن —— تاریخ —— خود ہماری اپنی سب سے ٹھوس اور سب سے لطیف تاریخ ہماری اس تشکیک کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ لگاتی ہے اور اس تشکیک و بدگمانی کا منہ پھیر کر رکھ دیتی ہے۔ اس تاریخ کی بھری انجمن میں ایسے جیتے جاگتے ہم جیسے کتنے ہی انسان دولتِ دل کی اس حقیقت کی زندۂ جاوید تصویر تھے —— ان کے ماضی کفر و شرک کے ہمالیے تھے —— غفلت و خود پرستی کی سرد مہری نے زہر آلودیت کی چٹانوں سے جس کو ڈھانپ رکھا تھا۔ مگر جیسے ہی زندگی کے کسی انقلابی موڑ پر اسلام نے ان کے دل اور ان کی رگِ جاں کے کسی تار کو چھیڑا اور پھر ذکر نے سوچنا شروع کیا تو دوسرے ہی لمحے ... ہوگیا۔ اور ان کا پورا وجود صدیوں کے برف ... خدائے یگانہ کے سنگِ در پر سجدہ ریز ہو کر رہ گیا۔

وہ بھی عمرو بن العاص ہی تو تھے جو اسلام ... طوفانِ غیظ و غضب بن کر اٹھے تھے —— خود اسلام ... کیا انھیں یہ بھی کسی طرح گوارا نہ تھا کہ کوئی دوسرا ... ہی تھا وہ انسان جو حبشہ ہجرت کر جانے والے ... بار پھر کفر کے جنگل میں جلا ڈالنے کے لئے شاہِ حبشہ کے ... وفد لے کر پہنچا تھا ——

وہ بھی خالد ابن ولید ہی تو تھے جس کی تلوار ... دن میں برقِ تپاں بنی ہوئی تھی —— جو اپنے خون ... بوند میں اسلام سے نفرت کی چنگاری شعلہ زن ...

وہ بھی عکرمہ بن ابی جہل ہی تو تھے جو حدیبیہ ... سے آنے والے پہلے انسانی قافلہ کو عرب کی تاریخ ... رد کر دینے کا آخری عزم کئے ہوئے کعبہ کے سامنے اسلام ... کے خلاف وحشیانہ شعلہ نوائی دکھا رہے تھے۔

لیکن جیسے ہی ان تینوں کے سازِ دل کے تار ... کپکپائے اور پھر ان کے دماغوں نے سوچا تو تینوں ... اسلام سے بے تابانہ ہمکنار ہو گئے۔

عمرو بن العاص نے خود اس کا اقرار کیا کہ ... وقت تک لڑتے رہے جب تک ہمیں زندگی نے ... کا موقع ہی نہ دیا —— اس سوچنے کی راہ میں ... جو ہمیں اندھے بہرے خون کے سیلاب کی طرح ... اپنی شخصیت کی دھاک کے ذریعے جہنم کی طرف ...

[illegible] ت واضح ہوتی اور
اپنے سوچنے کا پہلا موقعہ دیا" اسلام ہمارے
میں اترتا چلا گیا اور پھر ہم نے اسے قبول کرنے
میں تاخیر نہیں کی۔

ابن ولید کے سازِ دل پر سب سے پہلی چوٹ اُحد کے
جہاں انھوں نے انسانی تاریخ کا یہ حسین ترین منظر
محمدؐ کی نفرت و دشمنی نے اہلِ مکہ کو درندوں سے بڑا
بنا ڈالا تھا، وہاں وہی محمدؐ ان ہی درندوں کے ہاتھوں گھائل
کے بعد اپنے بھونچکاں ہونٹوں سے ہمہ تن محویت کے عالم میں
ہے" خدایا! تو انھیں معاف کردے ــــ اس لئے کہ
جانتے نہیں ہیں!" اور پھر دھیرے دھیرے ان کا دماغ دل
کی طرف سوچتا بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایک دن وہ
اپنے دوستوں سے مل جل کر قبولِ اسلام کے فیصلہ کن عزم پر
بات کر رہے تھے۔

صفوان نے کہا "تم جس چیز کو قبول کرنے کی سوچ رہے
ہو میں تو اسے اس وقت بھی ٹھکراؤں گا جبکہ ساری دنیا بھی
اسے قبول کر رہی ہو" اور عکرمہ بن ابی جہل نے کہا "اگر ساری
دنیا اس مذہب کو قبول کر رہی ہوتی تو مجھے اتنا تعجب نہ ہوتا
جتنا تمہارے قبول کرنے کے تصور سے ہو رہا ہے!"

"وہ کیوں آخر؟" خالد نے حیرت ظاہر کی تھی۔
"اس لئے کہ تم نے تو اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ
مسلمانوں کی تلواروں سے گھائل ہو کر تمہارے چچا خاک و خون
میں تڑپتے رہے ہیں؟" عکرمہ نے جاہلیت کے خون کو گرما دینے والا
طعنہ دیتے ہوئے کہا۔

لیکن ــ دل و دماغ کے دونوں پر لگا کر خالد کی روح اس
سے اس قدر اونچی اڑ چکی تھی کہ ان میں جوش آنے کے بجائے
[illegible] گیا! وہ زہر خند کے ساتھ اس بات پر ہنستے ہوئے بولے
"یہ وار اب مجھ پر بیکار ہے ــــ یہ جاہلیت کا وہ ذہن ہے
جسے اسلام پر میری سوچ نے پاش پاش کر ڈالا ہے۔"

اللہ ــــــ اسی دنیا کے کیلنڈر میں اس دن سورج
[illegible] جب بھی خالد کو بھڑکنے والا عکرمہ خالد ابن ولید سے کہیں زیادہ

[illegible] عکرمہ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیتے ہوئے بیعت کر رہا
تھا ــ ان کے سازِ دل پر خدا نے صرف ایک مضراب لگائی کہ ان
اچانک ان کا دماغ اسلام کے متعلق پہلی بار سوچ میں پڑ گیا اور دوسرے
ہی لمحہ وہی نوجوان جو اس امت کے فرعون کی پیٹھ میں سے نکلا تھا
خوف محمدؐ کے قدموں میں جان و دل نذر کر رہا تھا ــــــ سازِ دل پر
صرف اتنی سی چوٹ لگی تھی کہ فتح مکہ دن کے جب حضورؐ مکہ پر غالب آگئے
تھے اور اسلام کی دشمنی نے عکرمہ کو ترکِ وطن پر مجبور کر دیا تھا ان کی کشتی
سمندری طوفان میں پھنس گئی ــــــ انھوں نے اپنی مدد کے لئے اپنے
سب سے بڑے دیوتا ہبل کو پکارا تو ان کے کسی ہم مذہب اور ہمسفر
عرب نے اتنا کہدیا کہ "سمندر میں اللہ ہی کو مدد کے لئے پکارنے کا طریقہ
ہے عکرمہ ــ اللہ کو پکارو" اور یکایک ان کی آنکھ کھل گئی۔ ان کی عقل
جاگ اٹھی اور سوچا "کیا؟ .... کیا سمندر میں صرف ایک اللہ کا راج ہے
ہمارے دھرم میں بھی! ــ تو پھر محمدؐ اتنا ہی تو اور کہتے ہیں کہ خشکی میں بھی
صرف اسی کی حکمرانی ہے۔ ... اتنا سوچتے ہی ان کا دل اسلام کو قبول کرنے
کے لئے تڑپ اٹھا اور خدا سے دعا کی کہ اگر میں سلامت بچ گیا تو خود کو
حضرت محمدؐ کے حوالے کر دونگا۔ اور خدا نے طوفانی موجوں کو حکم دیا
اور موجوں نے کشتی کو پلٹ کر پھر ساحل سے لگا دیا ــ اور ہائے وہ
ساحل! جس سے جنت کی سرحدیں ملی ہوئی تھیں۔

اور پھر ــــــ پھر یہ تینوں جان و مال کی دولت دینے والے
کی گلی میں لٹنے چلے گئے کہ نہیں؟۔

ــــــ ہائے میرے معبود۔ یہ ہمیں کیا ہو گیا ہے! کہ ہمارے
دل کے تاروں پر کسی مضراب کا اثر نہیں ہوتا اور ہمارا دماغ اسلام کے
متعلق کسی سوچ میں نہیں پڑتا! دل اور دماغ ــ تاثر اور سوچ کی جو
صلاحیت کفر و شرک کے باوجود زندہ رہتی تھی کیا.... کیا.... وہ
ہمارے ایمان کی آغوش میں بھی دم توڑ چکی ہے؟.... آہ!.... کیا
ہم مسلمان ہیں؟؟ ...... اگر ہیں تو پھر ہمارے سازِ دل کو خدا
کے دستِ کرم کا عکس محسوس کیوں نہیں ہوتا۔ ہم کیوں نہیں سوچتے؟

انشاءاللہ! اگلا شمارہ
عامر عثمانی نمبر ہوگا

مولانا عامر عثمانیؒ سے ایک انٹرویو

عامر عثمانی نمبر میں ملاحظہ فرمائیے

یہ انٹرویو پچاس سوالات پر مشتمل ہوگا

حسن احمد صدیقی کا قلم سوالات کرے گا

اور

مولانا عامر عثمانیؒ کا قلم ان سوالات کے

جوابات دے گا۔

اُمّتِ مُسلِمہ کے پچاس ضروری مسائل:-

اور ـــــــ ان پر مولانا مرحوم کی سنجیدہ اور علم و معرفت سے لبریز گفتگو

عامر عثمانیؒ نمبر ضرور دیکھئے گا۔

نسل و نسب کا گھمنڈ

مولانا عامر عثمانی صاحبؒ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَیَنْتَهِیَنَّ اَقْوَامٌ یَفْتَخِرُوْنَ بِآبَائِهِمُ الَّذِیْنَ مَاتُوْا اِنَّمَا هُمْ فَحْمٌ مِّنْ جَهَنَّمَ اَوْ لَیَکُوْنُنَّ اَهْوَنَ عَلَی اللّٰہِ مِنَ الْجُعَلِ الَّذِیْ یُدَهْدِهُ الْخِرَاءَ بِاَنْفِهٖ اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْکُمْ عُبِّیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ وَفَخْرَهَا بِالْآبَاءِ اِنَّمَا هُوَ مُؤْمِنٌ تَقِیٌّ اَوْ فَاجِرٌ شَقِیٌّ اَلنَّاسُ کُلُّهُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔

(رواہ الترمذی وابوداؤد)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، باز آ جانا چاہئے ان قوموں کو جو اپنے مرحوم آباؤ اجداد پر فخر کرتی ہیں (باپ دادوں پر گھمنڈ کرنے کا حاصل اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ) ہوں گی یہ قومیں کوئلہ دوزخ کا یا اللہ کے نزدیک وہ زیادہ ذلیل ہوں گی نجاست کے اس کیڑے سے جو اپنی ناک سے غلاظت کو ڈھکیلتا ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ نے تم سے دور کی نخوت جاہلیہ (اور دور کیا) گھمنڈ آباؤ اجداد کا۔ آدمی تو بس دو ہی قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایماندار و متقی یا بدکار و بدنہاد۔ انسان سب کے سب آدم کے بیٹے ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنائے گئے (اسے ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا)

تفہیم:- نسل و نسب کا غرور جس قدر عرب میں پایا جاتا تھا دنیا کے کسی ملک میں نہیں پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تقریباً ہر طرح کے علوم سے بے بہرہ اور بدوی زندگی سے مانوس ہونے کے باوجود اہل عرب میں علم الانساب اتنا مقبول تھا اور انھیں اس سے اس درجہ شغف تھا کہ عالم میں اس کی نظیر نہیں۔ اسلام آیا تو اس نے نہایت حکیمانہ تدریج کے ساتھ نسل و نسب کے غرور کا افسوں توڑا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے موقع بموقع قرآن کی اس تعلیم کو لوگوں کے دلوں میں اتارا کہ فضل و شرف کا تمام تر مدار انسان کے ذاتی اعمال و کردار پر ہے اور نسل و نسب کی کوئی حیثیت انسان کے ذلیل یا عزت دار ہونے میں نہیں ہے ـــ پیش نظر حدیث میں نسلی غرور میں گرفتار قوموں کو دوزخ کی وعید تو دی ہی گئی ہے۔ لیکن ذرا اس تمثیل کو بھی غور سے دیکھئے جو ایسی قوموں کے لئے پیش فرمائی گئی ہے۔ غرور، اکڑ، نخوت وغیرہ کی حیثیت نجاست کی سی ہے۔ نسلی غرور میں گرفتار لوگ اس گندگی کے کیڑے ہیں اور جس طرح گندگی کا کیڑا اپنی ناک سے غلاظت کو دھکیلتا ہے اور احساس نہیں رکھتا کہ ایک سراپا تعفن نجاست میں ناک دئیے ہوئے ہے۔ اسی طرح یہ مغرور لوگ احساس نہیں رکھتے کہ نسل و نسب کا غرور تو حد درجہ متعفن ہے جس سے ناک لگانا تو درکنار جس کے پاس پھٹکنا بھی کوئی ایسا شخص گوارا نہیں کر سکتا جس کی قوتِ شامہ، حِس اور انسانیت زندہ ہو۔

نسلی غرور کی قباحت و رذالت پر کم سے کم علمی و نظری حیثیت سے آج تمام دنیا کا باشعور طبقہ متفق ہے۔ اور امریکہ، افریقہ یا کسی اور ملک میں عملاً چاہے نسل و رنگ کی پالیسیاں کچھ بھی تباہی لا رہی ہوں لیکن نظری طور پر کسی میں یہ جرأت نہیں کہ نسل و رنگ کے غرور کو جائز و مستحسن قرار دے سکے۔ یہ چیز بالاتفاق مذموم و قبیح مان لی گئی ہے

اور جن بد نصیب مسلمانوں کو اطمینان صرف قرآن و حدیث سے نہیں ہو سکتا تھا ان کے لئے بھی یہ بات موجب اطمینان ہو سکتی ہے کہ اب تو ان کے پسندیدہ مغرب نے بھی اسلام ہی کی بات کو درست مان لیا ہے اور اب اس جاہلانہ اور فتنہ آمیز غرورِ نسب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں ہے جو بد قسمتی سے مسلمانوں ہی کے بعض حلقوں میں نہ صرف پایا جاتا ہے بلکہ اپنی ہلاکتوں اور فتنہ طرازیوں کا خاصا مظاہرہ بھی کرتا رہتا ہے۔

حضورؐ نے فرمایا۔ انسان اصولی طور پر دو ہی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایماندار و متقی یا فاجر و شقی۔ گویا انسانوں کی تقسیم اعمال و کردار کی نوعیت سے ہونی چاہئے ورنہ اگر نسل و نسب کے لحاظ سے تقسیم کی جائے تو قسموں کی کوئی حد نہ رہے گی۔

پھر ایک جامع و قاطع دلیل بطور تنبیہ و تفہیم ارشاد فرمائی کہ اے پدرم سلطان بود کا نعرہ لگانے والو! اور اے اپنے آباؤ اجداد پر اکڑنے والو! انسان تو کل کے کل آدم ہی کے بیٹے ہیں تم اپنے خاندان اور اپنے قبیلے کے سوا جن انسانوں کو اس لئے تحقیر کی نظر سے دیکھ رہے ہو کہ ان کا خاندان اور قبیلہ دنیاوی اعتبارات کے حساب سے تمہارے جیسا نہیں ہے وہ بھی تو حقیقت میں اسی جدِ امجد آدم کے بیٹے ہیں جس کے تم ہو پھر اکڑنا کیسا اور آدم مٹی سے بنے تھے، تم سب بھی مٹی سے بنے ہو۔ لہٰذا نسلی اعتبار سے گھمنڈ کا کیا موقع ہے کہ سبھی مٹی سے بنے ہیں۔ ہاں جس شخص کے افعال اچھے ہیں وہ بیشک اس شخص سے بہتر مانا جائیگا جسکے افعال اتنے اچھے نہیں ہیں۔ لیکن غرور و نخوت کی پھر بھی اجازت نہیں کہ غرور و نخوت تو بجائے خود نجاست ہیں۔ پاکبازوں میں تکبر کا کیا کام۔

جہانتک قول کا تعلق ہے کتب احادیث میں حضورؐ کے اس طرح کے فقرے بہت ملتے ہیں کہ "میں گواہی دیتا ہوں تمام انسان اللہ کے بندے ہیں"۔ اور "عجمی کو عربی پر یا عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں" اور "آباؤ اجداد پر اکڑنا بدترین خصلت ہے"۔ وغیرہ۔

اور جہانتک عمل کا تعلق ہے دورِ مبارک کی تاریخ کا مطالعہ کرنیوالے خوب جانتے ہیں کہ حضورؐ اور اصحابؓ کے پیدا کردہ اسلامی معاشرہ میں شرف و عزت کا معیار صرف اور صرف یہ تھا کہ کون کتنا زیادہ خوش کردار ہے۔ کس نے کتنی زیادہ تکلیفیں حق کی راہ میں جھیلی ہیں اور کون کتنی زیادہ قربانیاں ایمان و انصاف کیلئے دیتا رہا ہے۔ اسی معیار کے تحت روم، فارس، حبش اور عجم کے دیگر مقامات کے وہ لوگ جنکے نسب ناموں پر زمانہ جاہلی کا عرب شاید تھوکنا بھی گوارا نہ کرتا۔ زمانۂ اسلام میں اپنی خوش کرداریوں کی وجہ سے اتنے معزز اور محترم ہوئے کہ عرب کے سب سے محترم اور معزز قبیلے قریش نے انھیں سر آنکھوں پہ بٹھایا، ان کی قدمبوسی کی اور انھیں برگزیدہ مانا۔

عن عقبۃ بن عامر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسابکم ھذہ لیست بمسبۃ علی احد کلکم بنو آدم طف الصاع بالصاع لم تملؤہ لیس لاحد علی احد فضل الا بدین و تقوی کفی بالرجل ان یکون بذیا فاحشا بخیلا (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

ترجمہ:- عقبہ بن عامر فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمہارے نسب اس لئے نہیں ہیں کہ ان کے تعلق سے تم کسی کو طعنہ و دشنام کا نشانہ بناؤ۔ تم سب لوگ آدم کے بیٹے ہو۔ اسی طرح برابر جیسے دو بغیر بھرے صاع ہوتے ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی برتری نہیں لیکن (یہاں برتری ہوگی) دین اور تقویٰ کی بنیاد پر۔ کسی شخص کے خراب ہونیکے لئے یہ بات بہت کافی ہے کہ وہ زبان دراز، فحش گو، کنجوس ہو (روایت کیا اسے احمد نے اور بیہقی نے شعب الایمان میں)

تفہیم:- وہی نسل و نسب کے غرور کی سخت مذمت کا مضمون اس میں بھی پیرایہ بدل کر بیان ہوا ہے جو پچھلی حدیث میں بیان۔ اللہ نے فرمایا تعالیٰ۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ

اے لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے لئے مختلف ذاتیں اور مختلف قبیلے اسلئے بنائے کہ پہچانے جا سکو۔ بیشک تم میں فضیلت والا صرف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔

اور دوسری جگہ فرمایا:-

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ

اے لوگو! اس اللہ سے ڈرو جس نے تمہیں ایک ہی جان سے پیدا کیا۔

اس کے بعد کہاں گنجائش تھی کہ نسل و رنگ کے بت کی پوجا اسلامی معاشرے میں باقی رہ سکتی۔ حضورؐ نے قول و عمل دونوں سے ترغیب و تعلیم دی کہ نسل و نسب کے فخر کو ترک کیا جائے اور

وقت میری طرف سے حاصل ہو جو حسن کردار ہے حق کوش ہے فخر جتانے والا ہے۔ کوئی کہتا تھا میں قرشی ہوں، لہٰذا دوسرے کمتر قبیلوں کا کیا منہ ہے جو میری برابری کرے۔ قریش ہی میں کئی شاخیں تھیں جن میں باہم دگر اونچ نیچ تھی۔ ہاشمی سب سے زیادہ معزز تھے اور غیر قرشیوں ہی کو نہیں قریش ہی کی دوسری شاخوں کو کمتر سمجھا کرتے تھے۔ موقع بموقع یہ ذہنیت الفاظ و واقعات کا جامہ بھی پہنتی تھی اور نسبی فضیلت کے غرور میں گالی گلوچ اور جنگ و جدال کی بھی نوبت آجاتی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے قولِ رسولؐ میں کہ خدا کے بندو! یہ تمہارے نسب اس لئے نہیں ہیں کہ ان کے بل پر تم کسی کو سب و شتم کرو، صلواتیں سناؤ، پست قرار دو۔ اس کا کیا جواز ہے جبکہ تم بھی اور وہ بھی جنھیں تم ذلیل کر رہے ہو آدم ہی کے بیٹے ہیں۔ سب انسانوں کا جدِ امجد ایک ہے۔ گویا ہر قبیلے اور خاندان کا نسب آخر کار حضرت آدم پر اس طرح مل جاتا ہے جیسے مختلف ندی نالوں کے سوتے اپنے سرچشمے پر مل جاتے ہیں۔ ایک ہی سرچشمے سے پھوٹنے والی پانی کی مختلف دھاریں آگے چل کر چاہے ندی، جھیل، تالاب یا دریا کوئی بھی شکل اختیار کرلیں۔ لیکن اصل کے اعتبار سے تو ان کے پانی میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

"صاع" ایک پیمانے کا نام ہے جس سے عرب میں مختلف اجناس ناپی جاتی تھیں۔ یہاں عجم میں اس کی مثال اس ڈونگے کی سمجھ لیجئے جس سے دودھ ناپ کر بیچا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی وزن مثلاً سیر بھر دودھ ناپنے کے دو پیمانے۔ اسی طرح یکساں ہوں گے جس طرح سیر بھر کے دو باٹ یکساں ہوتے ہیں ان پیمانوں کی قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں ہوتا جب کہ وہ خالی ہوں۔ ہاں اگر انھیں بھرا جائے تب بے شک فرق ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک ڈونگے میں آپ پانی بھرلیں اور ایک میں دودھ تو ظاہر ہے دودھ والا ڈونگا زیادہ قیمتی ہوگا۔ یا ایک میں تھوڑا سا دودھ بھریں اور دوسرے میں زیادہ، تو زیادہ والا قیمتی سمجھا جائے گا۔ یہی مثال انسانوں کی ہے کہ اپنی پیدائشی حالت میں وہ چند یکساں خالی پیمانوں جیسے ہیں کہ انکی قدر و قیمت اور مرتبہ یکساں ہے محض یہ بات ان کی قدر و قیمت کو نہیں بدل دیتی کہ کچھ ان میں سے ایسے خاندانوں میں پیدا ہو گئے جنھیں عرف عام میں برتر سمجھا جاتا تھا اور کچھ ان گھرانوں میں پیدا ہوئے جنھیں کمتر خیال کیا جاتا تھا۔ وہ بہر صورت دو یکساں پیمانوں کی طرح برابر ہیں اور اب جو ان میں سے کسی کی قدر و قیمت سے بڑھ سکتی ہے تو اس شئے کی حیثیت و قیمت سے بڑھ سکتی ہے جو پیمانے میں بھری جائے۔ یہ شئے افعال و کردار سے عبارت ہے جو شخص نیک اعمال سے پیمانہ بھرے گا وہ افضل ہوگا اور جس نے برے اعمال سے بھرا اس نے گویا دودھ کے مقابلے میں گندہ پانی اور سیم و زر کے مقابلے میں کوڑا کرکٹ بھر لیا۔

آخر میں جو یہ فرمایا کہ کسی شخص کے خراب ہونے کیلئے یہ بات بہت کافی ہے کہ وہ زبان دراز، فحش گو، کنجوس ہو۔ تو یہ مزید تصریح و توثیق ہے اس بات کی کہ ایک شخص نسل و نسب کے اعتبار سے چاہے اہل دنیا کے نزدیک کیسا ہی معزز ہو لیکن اگر اس میں مثلاً دریدہ ذہنی، فحش گوئی اور بخل جیسی قبیح و مذموم صفات پائی جاتی ہیں تو وہ یقیناً برا ہے، ذلیل و پست ہے اور اس کی اعتباری اعلیٰ نسبی اس کی برائی اور پستی کو بڑائی اور سربلندی سے نہیں بدل سکتی۔ بیان فرمودہ چند صفات بطور نمونہ و مثال کے ہیں یہ نہیں کہ برائی صرف انھی صفات تک محدود ہے۔ ضمنی مفہوم یہ ہے کہ جو شخص پاکباز اور صاحب کردار ہو وہ چاہے کسی بھی خاندان اور قبیلے سے ہو معزز اور برتر ہوگا۔

خاندانی فرق و امتیاز کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ بعض معاملات میں خفیف حد تک ملحوظ فرمایا ہے لیکن صرف اس حد تک جس حد تک قرآن کی بیان فرمودہ علت لِتَعَارَفُوا گنجائش دیتی ہے اور جس حد تک معاشرے کو فساد و انتشار سے بچانے کے لئے ضروری تھا اس کی کچھ تفصیل کفاءت کے مسئلہ میں دیکھنی چاہیے۔

نسل و نسب کے تفاخر کو رسول اللہؐ نے جس صراحت سے مردود و مبغوض فرمایا ہے اور آپ کا اسوۂ مبارک جس وضاحت سے اس قبیح تصور کی تردید کرتا ہے اس کے باوجود امتِ مسلمہ میں اگر کچھ لوگ ایسے پیدا ہوتے رہے جنھوں نے "محبتِ اہل بیت" کے ظاہر فریب عنوان سے طرح طرح کے واہی عقائد گھڑ لئے اور

نسل پرستی کے جذبے کو لفظاً و معناً بیان کرنے سے لگائے رکھ

تو ان کی کوئی حیثیت اور منزلت اہل نظر میں نہیں ہے امت کے تمام ہی بڑے علماء و اتقیاء، تمام سنجیدہ مفکرین، تمام زہاد و عباد تمام صاحب نظر مؤرخین و فقہاء اور تمام قابل ذکر متکلمین اس عقیدے پر متفق رہے ہیں کہ رسول اللہ کے بعد سب سے بہتر انسان وہ نہیں ہے جسے آپؐ سے نسل و نسب کے اعتبار سے سب سے زیادہ قربت حاصل تھی، بلکہ وہ ہے جو ہاشمی نہ تھا اور جسے دنیا ابوبکر صدیقؓ کے نام سے جانتی ہے۔ پھر اس کے بعد ان عمر بن الخطابؓ کا درجہ ہے جو ہاشمی نہ تھے۔ پھر کہیں جا کر ان علی ابن ابی طالبؓ کا مقام آتا ہے جو ہاشمی تھے اور جن کا نسبی تعلق یقیناً سب سے زیادہ تھا لیکن یہ مقام بھی اس نسبی تعلق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس بلندی کردار اور عمل کے باعث ہے جس کے آپ حامل تھے (خدا ان سب پر رحمتیں نازل فرمائے)

اور اگر کوئی صاحب علم مراتب کی اس ترتیب کو نہ مانے اور حضرت علی کو پہلا دوسرا یا تیسرا درجہ دے تب بھی اس کی وہی دلیل توجہ کی مستحق ہوگی جس کا تعلق کردار و عمل سے ہوگا اور اس دلیل پر ذرا بھی توجہ نہیں کی جائے گی کہ وہ قرابت رسولؐ کی وجہ سے افضل تھے۔ قرابت کی بنیاد پر شرف و فضل کی جڑ تو اللہ تعالیٰ نے وہیں سے کاٹ دی تھی جہاں حضرت نوحؑ کے بیٹے کو اس کے کفر کی وجہ سے ان کا اہل تک ماننے سے انکار فرما دیا تھا۔ بیٹے سے زیادہ قریب رشتہ دار کیا ہوگا! انبیاء سے زیادہ مقبول و محبوب مخلوق اللہ کے نزدیک کونسی ہوسکتی ہے، لیکن بدکرداری کی بنیاد پر حضرت نوحؑ کے فطری جذبات اور ابنیت کے رشتے کو قطعاً لاحاصل قرار دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی برتری یا کمتری میں نسل و نسب کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور اصل قابل لحاظ شے انسان کا ذاتی فعل و کردار ہے۔

چند وہ احادیث جو جملہ انسانوں کی پیدائشی ہمسری اور مساوات پر دلالت کرتی ہیں یہ ہیں :-

(۱) اللھم ربنا و رب کل شئی انی اشھد ان العباد کلھم اخوة -	اے ہمارے اور ہر چیز کے رب گواہی دیتا ہوں کہ تمام بندے بھائی بھائی ہیں
(۲) الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ ؛	(۲) تمام مخلوق اللہ کی عیال ہے اللہ کو وہ لوگ سب سے زیادہ محبوب ہیں جو اسکی عیال (مخلوق) کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں
(۳) یقول اللہ ان کنتم تریدون رحمتی فارحموا خلقی	(۳) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر تم میری رحمت چاہتے ہو تو میری مخلوق پر رحم کیا کرو ؛

"عیال" ان افراد کے مجموعے کو کہتے ہیں جن کی کفالت نگہداشت اور پرورش کسی کے ذمہ ہو۔ گویا جس کے ذمہ ہوگی وہ اس کی "عیال" کہلائیں گے۔ یہ چند روایات صاف بتا رہی ہیں کہ پیدائشی اعتبار سے تمام انسان ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں اور نسل و نسب کے تفاخر کا مدار ہی اس غلط تصور اور اعتقاد پر ہے کہ کچھ لوگ پیدائشی اعتبار سے برتر اور کچھ کمتر ہوتے ہیں۔ اسلئے یہ روایات اس عقیدہ و تصور کی تردید میں گویا نص صریح کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہ تو جملہ انسانوں کی پیدائشی یکسانی مساوات کے بارے میں تھا۔ پھر انسان بے شعوری کی عمر سے نکل کر جوان ہوا تو اسلام نے اس کی تفریق وہی عمل و کردار کے اعتبار سے کی۔ ایماندار اور بے ایمان دو گروہ ایک دوسرے سے جدا کئے۔ انسان کے اعمال و افعال چونکہ عقائد و خیالات اور فکر و ارادے ہی کا مظہر اور عکس ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے ایمان جیسی کیفی اور نفسی چیز پر تفریق و تقسیم کا مدار رکھنا گویا کردار و عمل ہی پر مدار رکھنا ہے۔ اب تمام اہل ایمان ایک ہی پلے میں خواہ ان میں سے کچھ قریشی ہوں کچھ غیر قریشی کچھ بڑھئی، قصاب، درزی وغیر ذلک ——— قرآن صاف صریح الفاظ میں کہتا ہے :-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ـ	یہی بات درست ہے کہ ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں

اس آیت کی تفسیر و تائید میں متعدد احادیث وارد ہیں جن کے متن اسوقت مستحضر نہیں، لیکن جن کا مطلب یہی ہے کہ جملہ اہل ایمان بھائی بھائی ہیں اور جس طرح دو بھائیوں کے لئے نسبی اعتبار سے کوئی بڑائی چھٹائی کا سوال پیدا نہیں ہوتا اسیطرح کسی بھی مسلمان کا یہ طریق نہیں ہے کہ [illegible]

[illegible]

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں

واضح رہے کہ اگلا شمارہ عامر عثمانیؒ

نمبر ہوگا ——— انشاءاللہ العزیز

تجلی کی ڈاک

حسن احمد صدیقی
فاضل دارالعلوم دیوبند

بینک کا سود

سوال ۱:- از:- میر فرحت علی۔ حیدرآباد

ہمارے ایک ملنے جلنے والوں میں سے ایک صاحب کے بھائی صاحب امریکہ تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں انھوں نے کچھ رقم بینک میں جمع کروائی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ان کو اس کا سود تین سو (۳۰۰) ڈالرس ملا تو ان صاحب نے اس کو خرچ کرنے کے سلسلے میں وہاں اپنے مسلمان دوستوں سے مشورہ کے لئے اور تشفی بخش جواب نہ ملنے کی صورت میں انھوں نے اپنے والد صاحب کو اس کے استعمال کے متعلق خط لکھا تو والد صاحب نے جواب دیا کہ وہ روپیہ جو تم نے بینک میں جمع کیا تھا اسے بینک والوں نے صرف تجوری میں تو نہیں رکھا ہوگا اس کو بزنس یا کسی تجارت میں لگایا ہوگا۔ اس لئے جو زائد پیسے تم کو ملے ہیں وہ اس کا منافع ہے اور وہ پیسے قابل استعمال ہیں۔

میں اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔ لہٰذا آپ کو خط لکھنے کی نوبت آئی۔ آپ پہلی فرصت میں جواب عنایت کریں۔ اگر جواب تجلی میں شائع کریں تو غریب کے پاس ماہنامہ تجلی آتا ہے۔ میرے نانا صاحب سید عبدالعزیز منگواتے ہیں۔ میں دیکھ کر مطمئن ہو جاؤں گا۔

الجواب ۱:-

یہ ٹھیک ہے کہ بینک ہماری رقم کو کاروبار میں لگاتا ہے اور اسے اس کاروبار میں یقیناً فائدہ ہوتا ہے۔ یہ جانتے کے باوجود جو زائد رقم بینک سے حاصل ہوگی اسے سود ہی کہا جائے گا اور اس پر سود ہی کا اطلاق ہوگا۔ اس کو اپنے استعمال میں لانا اسی طرح ناجائز ہوگا جس طرح دوسری سودی رقموں اور حرام مال کو استعمال کرنا ناجائز سمجھا جاتا ہے۔

بینک میں روپیہ جمع کراتے وقت اگر اس کا معاہدہ کرلیا جائے کہ تم ہماری رقم کو کاروبار میں لگا سکتے ہو، ہماری طرف سے اجازت ہے اور ہم نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہیں۔ کاروبار میں نفع ہوگا تو [illegible] تو اس نفع میں ہم بھی حصہ دار ہوں گے اور اگر نقصان ہوگا تو اس نقصان کو ہم بھی برداشت کریں گے تو اس صورت میں بینک کی طرف سے ملی ہوئی زائد رقم جائز اور قابل استعمال مانی جاسکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے ایسا کوئی معاہدہ رقم جمع کراتے وقت نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو زائد رقم اسے ملی اسے سود ہی کہنا درست ہوگا ——— اور اس رقم کو استعمال کرنے سے اسی طرح احتراز کرنا ضروری ہوگا جس طرح دوسرے قسم کے مال حرام سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

مہر کی ادائیگی کا ایک طریقہ

سوال :- از: مسعود احمد صاحب۔ حیدر آباد۔

زید کا بیان ہے کہ ایک شخص نے ستر ہزار کی ملازمت حاصل کی ہے جو اس کی اہلیہ کے نام رجسٹر کرائی ہے۔ جائیداد زید کی سسرال کی ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ خالی زمین ہے جس کی قیمت سترہ ہزار روپے ہے۔

وہ چاہتا ہے کہ اس خالی زمین پر مکمل کمرے اور دالان وغیرہ کی تعمیر کروا کر مہر کی ادائیگی میں اس تعمیری لاگت کو لگا سکتا ہے یا نہیں۔

الجواب :-

زمین تو بیوی کی ملکیت ہے ہی اس میں تو کوئی کلام ہی ہی نہیں۔ اب اگر زید بیوی کی زمین پر کوئی عمارت کھڑی کروانا چاہتا ہے اور اس نقطۂ نظر سے کہ اس عمارت کے عوض مہر کی ذمہ داری سے سبکدوشی حاصل ہو جائے تو اس لئے بیوی سے یہ صراحت کر دینا ضروری ہے کہ یہ عمارت مہر کی رقم سے بنوائی گئی ہے لہذا میری زندگی میں بھی تم اس کی واحد مالک ہو اور میری موت کے بعد بھی تم ہی واحد مالک رہو گی اس میں وراثت تقسیم نہیں ہوگی۔

اگر زید بعض مصلحتوں کے پیش نظر اس قسم کی صراحت کر دینا مناسب تصور نہ کرتا ہو تو پھر یہ ضروری ہے کہ وہ یہ تفصیل کسی کاغذ پر لکھ کر بکس میں محفوظ کر دے یا کسی معتبر آدمی کے پاس رکھوا دے تاکہ اس کی وفات کے بعد وہ عمارت بیوی کو مل جائے اور تقسیم وراثت کے وقت کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو۔

سوال :- از:- ایس۔ ایم زید صاحب۔ نئی دہلی

تکبیر امام کے بالکل پیچھے کہی جائے یا امام کی بائیں جانب یا داہنی جانب۔ افضلیت کس میں ہے؟

الجواب :-

بہتر طریقہ تو یہی ہے کہ تکبیر کہنے والا امام کے بالکل پیچھے کھڑا ہو۔ لیکن اگر داہنی بائیں کھڑا ہو جائے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

رضاعی بہن کی لڑکی سے نکاح

سوال :- قاضی تاج الدین احمد صاحب۔ نہریا۔ بلاک نمبر ۳۔ کیمپ امراوتی۔ مہاراشٹر

مسئلہ: ایک لڑکی نے اپنی ایک عزیز خاتون کا دودھ عالم شیر خوارگی میں پیا تھا۔ اب ان خاتون کا سب سے چھوٹا لڑکا اس لڑکی کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ رشتہ جائز ہے؟

قرآن مجید میں رضاعی ماں اور بہن سے نکاح حرام قرار دیا گیا ہے۔ حقیقی چچا، حقیقی ماموں کے لئے حقیقی بھانجی حرام ہے۔ لیکن رضاعی ماموں یا چچا کے لئے ایسا کوئی حکم نہیں۔

پھر کیا وہ لڑکا اپنی رضاعی بہن کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے؟

الجواب :-

ہرگز نہیں کر سکتا۔

آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب۔

نسب جن رشتوں کو حرام کر دیتا ہے رضاعت بھی ان رشتوں کو حرام کر دیتی ہے۔ اس حدیث کی رو سے رضاعی بہن کے لڑکے اور رضاعی بھائی کی لڑکی کو حقیقی ماموں اور حقیقی بھتیجی پر قیاس کیا جائے گا اور ان سے نکاح کرنا اسی طرح حرام ہوگا جس طرح سگے ماموں اور سگی بھتیجی سے حرام ہوتا ہے۔

٭ ٭ ٭

دینی غلو پرستی

سوال :- از: غلام حسن صاحب متو۔

کچھ دن پہلے مسجد کے امام صاحب نے دورانِ خطبہ بلند آواز میں اعلان فرمایا کہ اگر کوئی آدمی نماز میں مشغول ہو اور کوئی دوسرا آدمی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پاک بلند آواز میں پکارے اور نماز میں مشغول آدمی یہ نام مقدس سُن لے تو اسے فرض ہے کہ وہ جس حالت میں ہو (رکوع، سجدہ، یا قیام) وہیں دورانِ نماز میں ہی درود نبیؐ پڑھے۔ کیا امام صاحب کا یہ فرمانا حق ہے۔

الجواب :-

حق اور ناحق کی بات چھوڑ دیئے۔ سوال تو یہ ہے کہ ایسے امام کو صحیح الدماغ تسلیم کیا جائے یا نہیں۔

بے شک قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ اور بے شک مسلمانوں کو اس بات کی تلقین و تاکید کی گئی ہے کہ ان کے سامنے حبیب محبوب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ محبوب خدا پر درود بھیجیں۔ لیکن ہم نے یہ انوکھی بات آج تک کسی معتبر کتاب میں نہیں پڑھی کہ آنحضورؐ کا نام سننے والا درود ضرور پڑھے خواہ وہ حالت نماز ہی میں کیوں نہ ہو۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جمعہ کے خطبہ میں جب مذکورہ بالا آیت پڑھی جاتی ہے تو بریلوی ذہن کے لوگ اسی وقت درود پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور اس خوش فہمی کے ساتھ کہ ہم قرآن کے حکم کی نقد تعمیل کر رہے ہیں۔ یہ نادان لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ قرآن کے کسی بھی حکم کو سنتے ہی اس کی تعمیل میں اسی وقت لگ جانا نہ صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے نہ دوسرے اکابرین سے۔ صحابہ کرام اس آیت کی تلاوت کرتے ہوں گے وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ۔ لیکن کسی بھی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صحابہ کرام اس آیت کو پڑھتے ہی یا سنتے ہی بیت اللہ کے طواف میں مشغول ہو جایا کرتے تھے اور بریلوی مسلک کے لوگوں کی طرح قرآن کے کسی بھی حکم کی نقد تعمیل کر کے دکھانا ان کا شیوہ تھا۔

قرآن حکیم میں جتنے بھی احکامات موجود ہیں ان کی تعمیل کے اوقات متعین ہیں۔ بے موقعہ اور بے محل کی گئی تعمیل بجائے خود ایک نافرمانی ہوتی ہے۔ اور نافرمانی بھی مضحکہ خیز ٹائپ کی۔

قرآن حکیم میں اکڑ کر چلنے کی ممانعت کی گئی ہے اور عاجزی و فروتنی کو اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن کے اس حکم کی تعمیل بھی برمحل اور برموقعہ ہی مناسب معلوم ہوگی اگر اس حکم کی تعمیل بے موقعہ اور بے محل کی گئی تو نہ قرآن کا مقصد پورا ہوگا اور نہ ہی تعمیل کرنے والے کو عقلمند قسم کا فرمانبردار کہا جائے گا مثال کے طور پر ایک شخص میدان جہاد میں سینہ تان کر چلنے سے اس لئے گریز کرتا ہے کہ قرآن حکیم میں اکڑ کر چلنے سے باز رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ شخص میدانِ جہاد میں گردن جھکا کر اور انتہائی انکساری کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے تو بتلائیے ایسے شخص کو نادانِ اعظم کہیں گے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے بارے میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ یہ شخص قرآن حکیم کی تعمیل تو کر رہا ہے لیکن بے محل کر رہا ہے لہٰذا اس کی یہ تعمیل اچھا خاصا ایک مذاق ہے، لطیفہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کے احکامات کی تعمیل جتنی ضروری ہے اتنا ہی ضروری اس بات کو ملحوظ رکھنا بھی ہے کہ قرآن کے حکم دینے کا مقصد و منشا کیا ہے اور قرآن کن اوقات میں ان احکامات کو بجا لانے کا حکم دیتا ہے۔ بے موقعہ تعمیل اور بے سوچے سمجھے اور وقت بے وقت امر خداوندی کے سامنے سر جھکانا حماقت اور دیوانگی کے ماسوا کچھ نہیں۔

ذرا غور تو کیجئے کہ ایک شخص نماز کی نیت باندھے کھڑا ہے اس وقت کوئی شخص قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت کرے :- کُلُوْا وَاشْرَبُوْا۔ (کھاؤ اور پیو) قرآن کا یہ حکم سنتے ہی نماز پڑھنے والا نیت توڑ ڈالے اور حکم کی تعمیل کی غرض سے اپنی جیب سے کھجوریں نکال کر کھانے لگے تو آپ ایسے شخص کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے ـــــ یا اگر کوئی شخص کھانا کھانے میں مشغول ہو عین اسی حالت میں کوئی شخص قرآن کی تلاوت

کرنا شروع کردے، جس کا مطلب یہ ہو کہ نماز قائم کردے۔ کھانا کھلانے حضرت تعمیل کے جوش میں اٹھ کھڑے ہوں اور اسی وقت نماز کی نیت باندھ لیں تو آپ ان حضرت کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ جو رائے ان دونوں شخصوں کے بارے میں قائم کی جائے گی وہی رائے امام صاحب کے بارے میں بھی قائم کر لیجئے۔ ہم کچھ نہیں کہتے۔

یہ بھی سنئے

سوال:۔ (ایضاً)

یہاں پر عام طور پر مسجدوں میں نماز کے بعد "عفو کن عفولئے رسولِ خدا"

پڑھا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں آتا ہے کہ یہ شرک ہے کیونکہ عفو اور درگذر کرنے والا تو بس اللہ ہے۔ مہربانی کر کے اس کی شرعی پوزیشن بیان فرمائیں۔ نیز یہ بھی لکھیں کہ ایسے وقت ہم خاموش رہیں یا مجلس سے چلے جائیں۔

الجواب:۔

یہ کھلا شرک ہے۔ اگر طاقت ہو تو اس سلسلہ کو ختم کیا جائے۔ ورنہ یہ تو ضروری ہے ہی کہ ایسی دعا میں شرکت کرنے سے احتراز کیا جائے۔ دعا نماز کا جز نہیں ہے لہذا نماز پڑھتے ہی مسجد سے نکل آیئے اور صاف کہہ دیجئے کہ خدا کے علاوہ کسی اور چیز سے گناہوں کی مغفرت چاہنا شرک ہے اور ہم اس شرک میں شریک ہونا نہیں چاہتے۔

سوال:۔ (ایضاً)

ایک عورت ہے۔ اس نے اپنا دودھ اپنے بھائی کو پلایا جب کہ وہ چھوٹا تھا۔ پھر بہت سال گذر گئے۔ اس کا بھائی بڑا ہوا۔ اس کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد اس کی لڑکی پیدا ہوئی۔ پچھلے سال اس کی لڑکی کی شادی اسی عورت کے ایک لڑکے کے ساتھ ہوئی۔ جو کہ اس کا ہم عمر تھا۔ کیا یہ شادی شرعی طور پر جائز ہے۔؟

الجواب:۔

جس طرح سگے پھوپھی بھتیجے کا مابین نکاح حرام ہے اسی طرح رضاعی پھوپھی بھتیجے کے مابین بھی نکاح حرام ہی ہے یہ شادی شرعی طور پر جائز نہیں ہوئی۔ لہذا پہلی فرصت میں دونوں کے درمیان تفریق کرا دی جائے۔

مہر اور سرکاری اسکیم

سوال:۔ ازا:۔ محمد عبد الرؤف صاحب۔ کریم نگر

حکومت آندھرا پردیش ملازم سرکار طبقہ سے ایک اسکیم نکالی ہے جس کے تحت ہر ملازم سرکار کی تنخواہ سے ہر ماہ کچھ رقم کاٹ لی جاتی ہے اور اس رقم پر بیوی حقدار کہلاتی ہے جس کا پہلے ہی دینا پڑتا ہے۔ مزید کے نام سے بھی ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم تنخواہ سے کاٹ لی جاتی ہے جس کی حقدار بھی بیوی ہی کہلاتی ہے۔ اگر یہ رقم مہر کے برابر ہو یا مہر سے زیادہ ہوتی ہو تو کیا اس صورت میں مہر کی ادائیگی ہو جائے گی۔ اس اسکیم کے تحت حکومت اپنی طرف سے یہ ہدایت بھی دیتی بلکہ اگر کوئی ملازم سرکار دوران ملازمت وصال کر جائے تو اس اسکیم کے تحت بیوہ کو ۷۵۰۰ یا ۱۰۰۰۰ روپے دیئے جائیں گے۔ اگر بالفرض کوئی ملازم سرکار مہر بغیر وصال کر جائے تو کیا اس رقم کو بیوہ مہر میں وصول کر سکتی ہے۔ تفصیلی جواب عنایت فرمائیے یہ بات یاد رہے کہ راقم ملازم سرکار کی تنخواہ سے کٹوتی ہوتی ہے جو اس کی جائز آمدنی ہے۔

الجواب:۔

ان دونوں ہی صورتوں میں مہر کی ذمہ داری سے سبکدوشی حاصل ہو جائے گی۔

بیوی کو اس بات سے آگاہ کر دینا ضروری ہوگا

کہ میری تنخواہ میں ہر ماہ اتنی اتنی رقم کاٹ کر تمہارے نام پر جمع کی جارہی ہے تم اسے مہر کا عوض تصور کرنا۔

یہ جمع شدہ رقم اگر مہر کی متعینہ رقم سے زیادہ ہو تو بقیہ رقم میں وراثت تقسیم ہوگی۔ بشرطیکہ شوہر نے اپنی زندگی میں اس بات کی صراحت نہ کردی ہو کہ بقیہ رقم بھی میں بیوی ہی کو سونپتا ہوں اور اگر اپنی زندگی ہی میں اس نے بقیہ رقم کو بھی بیوی کی ملکیت قرار دیدیا تھا تو اسے عطیہ پر محمول کرلیا جائے گا اور عطیہ میں وراثت کا نفاذ نہیں ہوتا۔

دوسری صورت میں چونکہ سود کا چکر ہے لہٰذا یہ بات ذہن میں رکھئے کہ شوہر کی موت کے بعد عورت کے لئے صرف اتنی ہی رقم کو اپنے استعمال میں لانا جائز ہے جتنی اس کے شوہر نے جمع کرائی تھی، اصل رقم سے زائد جو بھی رقم ہوگی وہ سود ہے اور اس کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں اس کو وصول کرنے کے بعد بلا نیت ثواب غریبوں میں تقسیم کردیا جائے۔

مثال کے طور پر حکومت نے مختلف قسطوں میں چار ہزار روپے وضع کئے۔ اس کے بعد شوہر کی موت واقع ہوگئی۔ شوہر کی موت کے بعد بیوہ کو اسکیم کے مطابق ساڑھے سات ہزار روپے گورنمنٹ کی طرف سے موصول ہوگئے۔ اس موصول شدہ رقم میں چار ہزار روپے اصلی ہیں اور ساڑھے تین ہزار سود ہے ان ساڑھے تین ہزار روپوں کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہوگا۔

اگر مہر کی رقم پانچ ہزار تھی اور شوہر نے ابھی چار ہزار جمع کرائے تھے کہ انتقال ہوگیا، تو اس صورت میں یقیناً ایک ہزار روپے دوسرے ترکہ میں سے عورت وصول کرے گی۔ اس صورت میں بھی ان ساڑھے تین ہزار روپوں میں سے ایک ہزار وصول کرنا جائز نہیں ہوسکتا۔

سوال ۹: ۔ (ایضاً)

کیا لائف انشورنس میں جمع کی گئی رقم کو شوہر بیوی اپنی مرضی سے مہر کی طرف منسوب کرسکتے ہیں۔ کیونکہ اس رقم کو بھی شوہر اپنی آمدنی سے ادا کرتا ہے۔ نیز تنخواہ میں سے لائف انشورنس کے لئے کٹوتی ہونے والی رقم کو مہر کی طرف منسوب کرسکتے ہیں۔ براہ کرم تفصیلی روشنی ڈالئے۔

محترمی یہ خیال میرے ذہن میں اس لئے ابھرا کہ ہماری اکثریت اس شرعی ذمہ داری سے غفلت برتتی ہے اور اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ یکمشت ذمہ داری سے سبکدوشی حاصل کرے۔ ایسی صورت میں اگر شوہر کی جائز کمائی سے جو روپیہ بیوی کے نام تنخواہ سے کٹتا ہو کیا یہ رقم اس غریب کو مہر کی ذمہ داری سے نجات دلا سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو اکثریت جو ملازم سرکار ہیں اپنے آپ کو مہر ادا کرنے کے قابل سمجھیں گے اور انھیں دینی سکون ملے گا۔ ذمہ داری کا بوجھ اترے گا۔

الجواب ۹: ۔

لائف انشورنس تو اسلامی نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے لہٰذا اس سے تو احتراز کرنا ہی بہتر اور مفید ہے۔ اخروی اعتبار سے اجتناب مفید اور انفع ہے ہی۔ دنیاوی اعتبار سے ہو یا نہ ہو۔

مہر ادا کرنے کی ایک آسان صورت یہ ہے کہ ہر ماہ بیوی کو تھوڑی بہت رقم بہ سلسلۂ مہر دیدی جائے۔ اس طرح قسط وار مہر کی پوری رقم ادا کردی جائے۔

مثلاً مہر کی کل رقم ایک ہزار روپے ہے۔ بیوی کو ہر ماہ گھر کے اخراجات کے علاوہ پچاس روپے فاضل دیدیئے جائیں اور یہ وضاحت کردی جائے کہ یہ پچاس روپے بسلسلہ مہر دیئے جارہے ہیں اس طرح بیس قسطوں میں ایک ہزار روپے ادا ہوجائیں گے۔

زیور ضروریات زندگی میں داخل نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو کوئی زیور بنا کر دیتا ہے اس خیال سے کہ مہر کی مقررہ رقم میں اتنی رقم کاٹ لوں گا جتنی رقم میں یہ زیور تیار ہوا ہے تو یہ صورت بھی جائز ہے۔ اس طرح کئی یا ایک زیور میں مہر کی رقم ادا کی جاسکتی ہے۔

مالدار لوگوں کو تو مہر کی ادائیگی میں کوئی پریشانی کا

سامنا کرنا نہیں پڑتا، وہ تو یکمشت بھی دے سکتے ہیں۔ چند قسطوں میں بھی نمٹا سکتے ہیں۔ زیور وغیرہ کے ذریعہ بھی مہر کی ذمہ داری سے سبکدوشی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اگر انھوں نے اپنی زندگی میں کسی بھی طرح مہر ادا کرنے کی کوشش نہیں کی تو ان کے ترکہ میں سب سے پہلے مہر ہی ادا کیا جاتا ہے۔

بہرحال اس قرض سے انھیں کسی نہ کسی طرح نجات مل ہی جاتی ہے۔ پریشانی تو غریب لوگوں کو اٹھانی پڑتی ہے۔ وہ زندگی میں اس قابل نہیں ہوتے کہ مہر کی رقم ادا کر دیں اور مرنے کے بعد کوئی جائداد بھی نہیں چھوڑتے کہ اس میں سے مہر کی رقم ادا کر دی جائے اور اس طرح ہی انھیں اس قرض سے نجات ملے۔ ایسے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر ماہ تھوڑی بہت رقم بیوی کو ضرور دیتے رہا کریں۔ اس وضاحت کے ساتھ یہ رقم بسلسلۂ مہر دی جا رہی ہے۔ بسلسلۂ مہر جتنے روپے بیوی کو دیئے جائیں گے انھیں خرچ کرنے کی بیوی مکمل طور پر مختار رہیگی اگر وہ ان روپوں کو اپنے ماں باپ یا بہن بھائی وغیرہ پر خرچ کرے تو شوہر کو ایں واں کرنے کا حق نہیں ہوگا ـــ بیوی اس رقم کی واحد مالک و مختار ہوگی۔ اسے اس بات کا اختیار بھی حاصل ہوگا کہ وہ رقم کو اپنے بچوں پر خرچ کر دے یا پھر شوہر ہی کو بخش دے۔

ایک مسئلہ اور محرمات کی اجمالی تفصیل

سوال نمبر ا :- از :- میر فراست علی ـــ حیدرآباد

ایک مسئلہ جو مجھے کافی دنوں سے پریشان کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ جو رشتے دار ہیں ان کے علاوہ کیا اور تمام ورثہ حلال ہیں یا کوئی اور رشتہ جو مجھ سے چھوٹ رہا ہے اس کا جواب دینے کے بعد یہ بھی بتلائیے کہ اگر :-

الف شخص ایک عورت سے شادی کرتا ہے، اسکے بعد الف کا باپ س۔ ب کی ماں سے شادی کر سکتا ہے یا نہیں جبکہ الف کی ماں اور ب کا باپ زندہ نہ ہو۔

اور جو رشتے میرے ذہن میں ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) سگی بہن (۲) سگی ماں یا سوتیلی ماں (۳) سگی خالہ۔ سگی پھوپھی۔ سگی ممانی (۴) ساس۔

اگر آپ ان سب باتوں کا تشفی بخش جواب شائع کر دیں تو مہربانی ہوگی۔

الجواب :-

محرمات کے سلسلہ میں گفتگو کرتے وقت یہ آیت پیش نظر رہنی چاہیئے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ	تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری
وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ	مائیں، تمہاری بیٹیاں ـــ
وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ	تمہاری بہنیں۔ تمہاری پھوپھیاں
وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ	تمہاری خالائیں۔ تمہاری
الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ	بھتیجیاں۔ تمہاری بھانجیاں
اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ	اور تمہاری وہ مائیں جنھوں نے
وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ	تم کو دودھ پلایا اور تمہاری
وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ	دودھ شریک بہنیں اور تمہاری
وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي	بیویوں کی مائیں اور تمہاری
فِي حُجُورِكُمْ مِنْ	بیویوں کی وہ لڑکیاں جنھوں
نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ	نے تمہاری گود میں پرورش
بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا	پائی ان بیویوں کی لڑکیاں
دَخَلْتُمْ بِهِنَّ	جن سے تم خلوت کر چکے ہوں
فَلَا جُنَاحَ	اور اگر خلوت نہیں ہوئی تو اپنی
عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ	بیویوں کو چھوڑ کر ان کی لڑکیوں
الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ	سے نکاح کر لینے میں کوئی
تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا	حرج نہیں۔
قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا	....
رَحِيمًا. وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ	
إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ	....
كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ	....
	....

اور تمہارے ساتھ بیویوں کی بیٹیاں جو تمہارے صلب سے ہوں اور یہ بھی تم پر حرام کیا گیا کہ ایک وقت دو بہنوں کو تم نکاح میں رکھو۔ مگر جو پہلے ہو گیا وہ ہو گیا، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہیں۔ البتہ وہ عورتیں مستثنیٰ قرار دی جائیں گی جو (جنگ میں) تمہارے ہاتھ آئیں۔

صرف ترجموں سے ان رشتوں کے اطراف و جوانب پر روشنی نہیں پڑ سکے گی، لہذا ترتیب وار تھوڑی سی تفسیر بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔

(۱) یہ بات ملحوظ رہے کہ ماں کا اطلاق صرف سگی ماں پر نہیں ہوتا بلکہ سگی اور سوتیلی دونوں قسم کی ماؤں پر ہوتا ہے اسی لئے یہ دونوں مائیں محرمات میں شامل ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ باپ کی ماں (دادی) اور ماں کی ماں (نانی) بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ یعنی جس طرح سگی اور سوتیلی ماں کا شمار محرمات میں ہوتا ہے اسی طرح دادی اور نانی کا شمار بھی محرمات میں ہوگا۔

(۲) بیٹی کے حکم میں اولاد کی اولاد بھی شامل ہے یعنی جس طرح اپنی بیٹی سے نکاح کرنا حرام ہے اسی طرح نواسی اور پوتی سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔

(۳) سگی بہن سے نکاح کرنا تو ہے ہی حرام لیکن ان بہنوں سے بھی نکاح کرنا جائز نہیں ہے جو ماں شریک یا باپ شریک ہوں۔

(۴) باپ اور ماں کی بہن خواہ بالکل سگی ہو یا باپ شریک محرمات میں شامل ہے۔

(۵) اسی طرح بھائی اور بہن خواہ سگی ہوں یا باپ شریک ان کی بیٹیاں بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح حرام ہیں

(۶) اس سلسلہ میں تقریباً تمام امت کا اتفاق ہے کہ جس لڑکے یا لڑکی نے کسی عورت کا دودھ پیا ہے اس کے لئے وہ عورت ماں کے حکم میں ہے اور اس عورت کا شوہر باپ کے حکم میں ہے۔ اور وہ تمام رشتے جو حقیقی ماں کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں رضاعی ماں باپ کے تعلق سے بھی حرام ہی تصور کئے جائیں گے۔ سگی بہن سے نکاح ہے لہذا رضاعی بہن سے بھی نکاح کرنا حرام ہوگا۔ سگی بھانجی سے نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہذا رضاعی بھانجی سے نکاح کرنے کو بھی حرام ہی تصور کیا جائے گا۔ وغیرہ ذلک۔

(۷) یہ بات تو اجماع امت سے مزین ہے کہ اگر بیوی سے خلوت ہو چکی تو پھر اس کی ماں شوہر پر حرام ہو جاتی ہے۔ بیوی کے مرنے کے بعد یا بیوی کو طلاق دینے کے بعد بھی اس کی ماں سے نکاح کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے محض نکاح ہوا ہو خلوت نہ ہو سکی ہو اس کی ماں بھی حرام ہو جاتی ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبل وغیرہ اس بات کے قائل ہیں کہ محض نکاح سے حرمت قائم ہو جاتی ہے خلوت ہو یا نہ ہو۔ زید نے جمیلہ سے نکاح کیا خلوت سے پہلے طلاق دیدی یا خلوت سے پہلے جمیلہ کا انتقال ہو گیا۔ جمیلہ کے انتقال کے بعد اگر زید جمیلہ کی ماں اختری سے نکاح کرنا چاہے گا تو یہ نکاح جائز نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جمیلہ سے نکاح کرنے کے بعد اختری اس پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو گئی ہے۔

حضرت علیؓ اس بات کے قائل ہیں کہ جب تک خلوت نہ ہو جائے منکوحہ کی ماں حرام نہیں ہوگی۔ خلوت سے پہلے اگر طلاق تک کی نوبت پہونچ گئی یا منکوحہ کی موت واقع ہو گئی تو ان دونوں ہی صورتوں میں منکوحہ کی ماں سے رشتۂ مناکحت قائم کرنا جائز ہوگا۔

(۸) ایسی لڑکی کا حرام ہونا اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ اس نے سوتیلے باپ کے زیر نگرانی پرورش پائی ہو۔ یہ بات تو محض اس رشتہ کی نزاکت کے لئے باری تعالیٰ نے ارشاد فرمادی ہے۔ اس بات پر ہمیں علمائے امت کا اتفاق رہا ہے کہ سوتیلی لڑکی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے خواہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو، یا کہیں اور۔

(۹) خلوت سے قبل اگر طلاق واقع ہو گئی یا منکوحہ کی وفات واقع ہو گئی تو دونوں ہی صورتوں میں اسکی بیٹی سے

نکاح کیا جا سکتا ہے خلوت ہونے کے بعد بیوی کی لڑکی مستقلاً حرام ہو جاتی ہے۔

(۱۰) متبنیٰ اور لے پالک کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ سگے بیٹے کی بیوی سے طلاق یا بیٹے کی موت کے بعد نکاح نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۱) ایک شخص دو بہنوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں نہیں لا سکتا۔

خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی بھی بیک وقت کسی ایک کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس بارے میں ایک اصول ذہن نشین کر لیجئے۔ وہ یہ کہ ایسی دو عورتیں بیک وقت کسی کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو مرد تصور کر لیا جائے تو دوسری سے اس مرد کا نکاح جائز نہ ہو۔ مثال کے طور پر خالہ اور بھانجی میں سے خالہ کو مرد تصور کر لیا جائے تو وہ ماموں بنے گی اور ماموں کا نکاح بھانجی سے جائز نہیں۔ لہٰذا خالہ اور بھانجی ایک وقت میں ایک شخص کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔

(۱۲) شادی شدہ عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا بھی حرام ہے۔ جب تک شوہر طلاق نہ دے یا شوہر کی موت واقع نہ ہو جائے۔

(مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ سے جس بات کی تصریح کی گئی ہے وہ ایک تفصیل طلب بات ہے جس کا ذکر یہاں طوالت کا موجب ہوگا۔

اس مسئلہ میں ضروری تفصیل سماعت فرمانے کے بعد اب اپنے سوال کا مختصر جواب ملاحظہ فرمائیے:

مں۔ پ سے شادی کر سکتا ہے کوئی مضائقہ نہیں۔

جناب عبدالمجید آئیکل

مُراسلہ

دسمبر ۷۶ء کے تجلی میں "تجلی کی ڈاک" کے تحت آپ نے تبلیغی جماعت سے متعلق "چند باتیں" عنوان کے تحت جو تاثرات پیش کئے ہیں انھیں پڑھ کر مجھے تشفی نہیں ہوسکی۔ جس کی بنا پر حسب ذیل باتیں لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ جواب دیکر مجھے مطمئن فرمائیں گے۔ اگر آپ تجلی کے ذریعہ جواب دینا مناسب سمجھیں تو اور زیادہ نوازش ہوگی۔

(۱) اگر کوئی تبلیغی جماعت سے کنارہ کشی اختیار کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ اس جماعت میں کوئی خامی یا برائی کا نتیجہ ہو۔ اگر آپ کی نظر میں یہی بات صحیح ہے تو پھر یہ بھی صحیح ہونا چاہئے کہ ہم کتنے ہی لوگوں سے واقف ہیں جنھوں نے اپنا تقویٰ اور پرہیز گاری کی بنا پر جو کبھی پکے مسلمان تھے مگر اب وہی اس کے برعکس دکھائی دے رہے ہیں نہ ان میں اب وہ تقویٰ رہا نہ وہ پرہیزگاری۔ کیا اس کی وجہ وہی ہوسکتی ہے جس کا مطلب آپ نے تبلیغی جماعت سے نکالا ہے۔

(۲) دوسرے پیرے گراف میں آپ نے جن باتوں کو لے کر مثالوں کے ذریعہ جو روشنی ڈالی ہے واقعاتی وضاحت ہے، جسے غیر جانبداری کی ترازو میں تولا جاسکتا ہے، جس کی رو سے جماعتی کھینچا تانی کی چیخ و پکار خود بخود دب جاتی ہے، یہ آپ کی وسیع النظری کا بیّن ثبوت ہے۔

(۳) صفحہ (۴۴) دوسرے کالم کی درمیانی سطور میں مولانا مودودی صاحب کا ذکر بھی ہوا ہے، یہاں آپ نے خواہ مخواہ جماعت اسلامی اور جماعت تبلیغ کا موازنہ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتابیں پڑھنے سے جماعت اسلامی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

بھئی! تبلیغی جماعت جس کی سرگرمیاں دینی تبلیغ کے لئے وقف ہیں تاکہ مسلمانوں میں مذہبی بیداری اور اصلاح و تقویٰ پیدا ہو۔ اس مقصد کے پیش نظر جماعت ایک محدود نظریئے کے تحت اپنا کام چلا رہی ہے۔ اگر اس میں کوئی ترمیم اس طرح کی جائے جس کی رو سے سیاسی پُٹ لگ پڑے تو ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی کی طرح یہ جماعت بھی سیاسی چال ڈھال کی ہوجائے گی جس میں طرح طرح کی اڑچنیں حائل ہوکر تبلیغی جماعت کا بنیادی مقصد فوت ہوجائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ جماعت میں کام کرنے والے سرکاری ملازمین خود بخود کٹ جائیں گے کیونکہ سرکاری ملازمین کا سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنا ممنوع ہے اور جو ذریعۂ اشاعت اسلام کا ہاتھ لگا تھا وہ ہاتھ سے چھن جائیگا۔ ویسے اسلام سیاست سے جدا نہیں لیکن اس کے لئے تبلیغی جماعت کا سہارا بنانا رہی سہی راہوں کو بگاڑنے کے برابر ہے۔

جماعتِ اسلامی کا طریق کار اس کے برعکس ہے جس قسم کا کُلی انقلاب جماعتِ اسلامی لانا چاہتی ہے اس کے لئے تبلیغی جماعت مددگار ثابت نہیں ہوسکتی جس کی بنا پر عام طور سے جماعت اسلامی کے حامی تبلیغی جماعت کی خامیاں چُننے کیلئے ڈٹ جاتے ہیں۔ مگر گہرائیوں میں ڈوبنا نہیں چاہتے۔ یہاں مجھے حضرت عامر عثمانی کا وہ قول یاد آرہا ہے کہ "ہمارے یہاں مدت دراز سے یہ افسوسناک صورت حال پائی جاتی ہے کہ دین کے اہم ترین اجزاء و عناصر سے تو غفلت برتی جاتی ہے اور فروعات پہ سارا زور صرف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اختلافات کا دائرہ جتنا بھی وسیع ہوتا چلا جائے کم ہے۔"

(تجلی دسمبر ۷۳ء صفحہ ۴۷)

(۴) اس کے بعد مروجہ گشت کے بارے میں آپ نے دلیل پوچھی ہے۔ نیز آپ کا کہنا ہے کہ "کسی کام کی اچھائی اور پاکیزگی

ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آدمی ہر وقت اِسے ہی کرتا رہے اور اس کے ماسوا کچھ اور کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔"

آیئے مرد جہ گشت کے بارے میں مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث اپنی کتاب "جماعتِ تبلیغ پر اعتراضات" میں کیا دلیل پیش کرتے ہیں دیکھیں۔

الف:۔ اشکال ۲۱ جو کثرت سے بندہ کے پاس خطوط میں پہنچا وہ یہ کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ طریقہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کے لئے جماعتیں بھیجی جائیں بلکہ سرایا اور جماعتیں کفار کے لئے بھیجی جاتی تھیں۔ مسلمانوں کے یہاں جماعتیں بھیجنے کا معمول نہیں تھا۔ اس لئے یہ بدعت ہے۔ اس اشکال کے بھی بیسیوں جوابات اس ناکارہ نے لکھے ہیں، اور اس اشکال میں بھی مجھے اہل علم کی طرف سے اس قسم کی کوئی بات پہنچتی ہے تو زیادہ حیرت ہوتی ہے جبکہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر مامور بہ ہے۔

(ب) دین کی اشاعت کے لئے جو کوشش بھی ہو وہ جہاد میں داخل ہے، پھر یہ کہنا کہ یہ طریقہ خاص طریقہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں تھا۔ اول تو فی حد ذاتہ غلط ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا لیکن بطریق تسلیم مامور بہ کے حاصل کرنے کا جو مباح طریقہ ہو سکے مامور بہ ہونے میں کیا تامل ہے۔

(ج) یا مدارس کا موجودہ طریقہ مدرسین کو اسباق کی تقسیم گھنٹوں کی پابندی سہ ماہی، ششماہی، سالانہ امتحانات وغیرہ وغیرہ جو اس زمانہ میں نہایت ضروری ہیں اور ضروری سمجھے جا رہے ہیں۔ اور واقعۃً ضروری ہیں کیا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ سب تھے؟ اسی طرح خانقاہیں اور ان کے معمولات اور ان کے طرق باوجود نہایت اہم اور ضروری اور مامور بہ ہونے کے کیا حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہی طریقے تھے؟ کیا کتابوں کی تصانیف ان کی طباعت شروح وحواشی کے سارے مروجہ طریقے حضور اقدسؐ کے زمانہ میں تھے۔ ایسے ہی ٹن کی نماز کہ جہاں گھنٹہ بجا خواہ امام ہو یا نہ ہو روزانہ کے مقتدی آچکے ہوں یا نہیں فوراً نماز شروع ہو جاتی ہے۔ یہ حضورؐ کے زمانہ میں کہاں تھا۔ ایسے کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ حضورؐ کے زمانہ میں توپ اور بندوق سے لڑائی نہیں تھی لہٰذا وہ تو بدعت ہے

تیروں سے جہاد ہونا چاہئے۔ ان امور میں کسی کو بھی کوئی بدعت نہیں کہتا اور اس سب کے بعد یہ بھی کہنا غلط ہے کہ نبی کریمؐ کے زمانہ میں مسلمانوں کے پاس جماعتوں کے بھیجنے کا طریقہ نہیں تھا اس سلسلے میں حضرت مولانا الحاج محمد یوسف صاحبؒ کی کتاب حیات الصحابہ جو اصل کتاب تو عربی میں ہے اہل علم کو خاص طور سے اس کو ملاحظہ کرنا چاہئے۔ اس میں بیسیوں واقعات نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے جماعتوں کے بھیجنے کے بہت کثرت سے ملیں گے اور اس کے اردو ترجمے بھی کثرت سے ہو گئے ہیں

(د) اس میں ایک مستقل باب باب ارسال الصحابۃ الی البلدان للتعلیم ہے۔ نمونہ کے طور پر چند نقل کرتا ہوں، حضرت عاصم بن عمر کی روایت سے نقل کیا گیا ہے کہ قبیلہ عضل اور قبیلہ قارہ کے چند آدمی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ ہمارے یہاں مسلمان ہیں چند آدمیوں کو ہمارے یہاں بھیج دیجئے جو ہمیں دین سکھلائیں، حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے چھ نفر کی جماعت روانہ کی۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا ارشاد ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ اور ابو موسیٰ کو یمن بھیجا تاکہ وہاں کے لوگوں کو دین سکھلائیں۔

(ھ) حضرت عمار بن یاسر کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے قبیلہ قیس کی جماعت کی طرف بھیجا کہ ان کو جاکر دین کی باتیں سکھلاؤں، وہ کہتے ہیں کہ جب میں وہاں گیا تو میں نے ان کو وحشی اونٹوں کی طرح پایا کہ جن کا مقصدِ زندگی اونٹ اور بکریاں تھیں، میں ان کی یہ حالت دیکھ کر حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آیا۔ اور حضور کی خدمت میں ان کی غفلت کی حالت ذکر کی تو حضورؐ نے فرمایا اے عمار! تجھے اس سے زیادہ تعجب کی بات سناؤں ایک قوم جو دین کو جانتی بھی ہوگی اور ان سے بھی زیادہ غفلت میں ہوگی اور اس قسم کے متعدد واقعات حیات الصحابہ میں لکھے ہوئے ہیں اور ظاہر ہے کہ کفار کی طرف بھی جماعتوں اور سرایا کو بھیجنا ان کی ہدایت ہی کے لئے تو تھا اور جب مسلمان دین سے بے خبری اور بے توجہی میں ان کے قریب پہنچ گئے ہوں یا ان سے بھی آگے کفر و ارتداد کی طرف بڑھ گئے ہوں تو کیا ان کی ہدایت کی ضرورت نہیں۔

(و) حضرت دہلوی نے ملفوظات میں ایک ارشاد نقل کیا ہے

کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں (قبل ہجرت) جو کام کرتے تھے یعنی چل پھر کر لوگوں کو دعوتِ حق دینا اور اس مقصد کے لئے خود ان کے پاس جانا بظاہر مدینہ طیبہ پہنچکر یہ کام آپ کا نہیں رہا۔ بلکہ وہاں آپ اپنا ایک مستقر بنا کر بیٹھے لیکن یہ آپؐ نے اس وقت کیا جبکہ مہمّ دعوت کو سنبھالنے والوں اور اس کام کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دینے والوں کی ایک خاص جماعت آپ نے تیار کر دی اور پھر اس کام ہی کا یہ تقاضا ہوا کہ آپ ایک مرکز میں بیٹھکر اس کام کو نظم کے ساتھ چلائیں اور کارکنوں سے کام لیں۔ علیٰ ہذا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ طیبہ ہی کے مرکز میں مقیم رہنا اس وقت درست ہوا جبکہ ایران اور روم کے علاقوں میں اللہ کے کلمہ کو سربلند کرنے کے لئے جہاد کرنے والے اللہ کے ہزاروں بندے پیدا ہو چکے تھے اور ضرورت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ مرکز ہی میں رہ کر اس دعوتِ حق اور جہاد فی سبیل اللہ کے نظام کو استحکام کے ساتھ چلائیں۔

(۳۱) حضرت مولانا ظفر احمد صاحب جو حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے بھانجے اور حضرت دہلوی مولانا الیاس صاحبؒ کے اخیر زمانہ میں عیادت کے لئے ایک دن کے لئے گئے تھے۔ مگر حضرت کے اس ارشاد پر کہ تمہیں اپنا وعدہ بھی یاد ہے (مولانا ظفر احمد صاحب نے عرصہ سے نظام الدین بسلسلہ تبلیغ ایک چلّہ گذارنے کا وعدہ کر رکھا تھا) مستقل وہاں قیام کر لیا اور وصال تک وہیں رہے،" اور حضرت کی شدت بیماری کی وجہ سے حضرت کو مسلسل کلام کرنا مشکل تھا وہ لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ فرمایا کہ سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابتدا اسلام کے زمانہ میں (جب دین ضعیف تھا اور دنیا قوی تھی) بے طلب لوگوں کے گھر جا جا کر ان کی مجالس میں بلا طلب پہنچکر دعوت دیتے تھے، طلب کے منتظر نہیں رہے بعض مقامات پر حضرات صحابہؓ کو از خود بھیجا ہے کہ فلاں جگہ تبلیغ کرو، اس وقت دینی ضعف کی حالت ہے تو اسے کو بھی بے طلب لوگوں کے پاس خود جانا چاہیئے، ملحدوں فاسقوں کے مجمع میں پہنچنا چاہیئے اور کلمۂ حق بلند کرنا چاہیئے (پھر کھانسی غالب ہوگئی اور بات نہ کر سکے تو فرمایا) مولانا تم میرے پاس بہت دیر سے پہنچے اب میں تفصیل سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس جو کچھ کہہ دیا اسی میں غور کرتے رہیئے فقط (ملفوظات دہلوی) یہ کہنا کہ حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ طرز نہیں تھا کتب سیر اور کتب حدیث پر قلّتِ نظر کا اثر ہے ورنہ جیسا اوپر بھی لکھوا چکا ہوں کہ حیات الصحابہ میں کثرت سے وفود کے بھیجنے کی تفاصیل موجود ہیں۔

(۳۲) اور وفد عبد القیس کا قصہ تو ساری کتب حدیث میں مشہور ہے انہوں نے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ قبیلہ مضر ہم میں اور آپ میں حائل ہے۔ ہم صرف اشہر حرم میں آسکتے ہیں، ہمیں ایمان کے امور بتا دیجئے "تاکہ اگر ہم اس پر عمل کریں گے تو جنّت میں داخل ہو جائیں گے اور جا کر اپنی قوم کو بتائیں۔ اس پر حضورؐ نے چار چیزوں کا حکم فرمایا اور چار چیزوں سے منع فرمایا۔ جس کی تفصیل آئندہ اشکال ۲۶ میں آرہی ہے۔ مسند طیالسی کی روایت میں اس قصّہ میں یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اپنی قوم کو جا کر ان چیزوں کی دعوت دو (حیات الصحابہ) اسی میں ایک بہت طویل حدیث بروایت حاکم نقل کی ہے کہ علقمہ بن الحارث کہتے ہیں کہ میں اپنی قوم کے سات آدمیوں کے ساتھ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کون ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ مومن ہیں تو حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر قول کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ پندرہ چیزیں ہیں جن میں سے پانچ کا تو آپ نے حکم فرمایا تھا اور پانچ چیزیں آپ کے قاصدوں نے بتائیں لمبی حدیث ہے مجھے تو صرف اس جملے کی طرف متوجہ کرنا تھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قاصد قوموں کے پاس جا کر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پہنچاتے تھے سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت پر وسعتِ نظر سے کون انکار کر سکتا ہے۔ تاریخ و سیرت میں ان کی وسعتِ نظر دنیا میں مشہور ہے۔ انہوں نے جو مقدمہ حضرت دہلوی کی سوانح مولفہ مولانا الحاج علی میاں پر لکھا ہے اس کے کچھ اقتباسات اپنی جگہ پر سیّد صاحب کے تذکرہ میں آئیں گے اس کے اندر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ تبلیغ و دعوت کے ان اصولوں میں سے جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں نمایاں معلوم ہوتے ہیں ایک عرض ہے یعنی حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم اس کا

انتظار نہیں فرماتے تھے کہ لوگ آپ کی خدمت میں خود حاضر ہوں بلکہ آپ اور آپ کے داعی لوگوں تک خود پہنچتے تھے اور حق کی دعوت دیتے تھے یہاں تک کہ کبھی کبھی لوگوں کے گھروں تک خود پہنچ جاتے تھے اور کلمۂ حق کی دعوت پیش فرماتے تھے (طویل مضمون ہے جو عنقریب آرہا ہے) اس کے بعد لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ داعی اور مبلغ کا خود فرض ہے کہ وہ لوگوں تک پہنچے اور حق کا پیغام پہنچائے (مقدمہ سوانح حضرت دہلویؒ)

مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی مفتی دارالعلوم دیوبند سے بھی ایک صاحب نے یہ اشکال پیش کیا کہ حضورؐ کے زمانہ میں لوگ کفار کے پاس جاتے تھے۔ آجکل لوگ مسلمانوں کے پاس جاتے ہیں۔ کیا حدیث سے یہ ثابت ہے کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں جاکر اس طرح سے تبلیغ کی ہو۔ اگر ہے تو اس کا حوالہ چاہیئے۔ مفتی صاحب نے اس کے جواب میں لکھا کہ "کوفہ اور قرقیسا میں صحابہ کرامؓ کا تبلیغ کے لئے جانا فتح القدیر جلد اوّل میں مذکور ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معقل بن یسار، عبد اللہ بن معقل وغیرہ حضرات کی جماعت کو شام بھیجا۔ یہ جماعتیں مسلمانوں کے پاس گئیں۔" (ازالۃ الخفاء ج ۲)

مفصل مضمون مفتی صاحب کا رسالہ "کیا تبلیغی کام ضروری ہے" میں چھپا ہے۔ ماخوذ صفحہ ۱۶ تا ۲۲ (تبلیغی جماعت پر چند عمومی اعتراضات اور ان کے مفصل جوابات)

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں تبلیغی جماعت کا مروجہ گشت صحیح ثابت ہوتا ہے آپ اِسے یوں کہہ کر نہ ٹالئے کہ "یہ نادان دوست ہیں اور نادان دوستوں سے جو نقصانات پہنچتے ہیں اس سے ساری دنیا باخبر ہے۔" بلکہ ان طریقوں اور عقیدوں کی بے لاگ تحقیق سے ثابت کیجیئے گا کہ یہ خلافِ سنّت ہے، تو بیشک یہ طریقہ مذموم قرار دیا جاسکتا ہے اور اصلاح کی راہیں ہموار ہوسکتی ہیں۔

(۵) صفحہ (۶۶) پر آپ نے فرمایا ہے کہ " حالانکہ اگر غور وفکر سے کام لیا جائے تو بآسانی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ تمام حق پرست اور ہدایت یافتہ جماعتیں اپنے طور پر یہ کام کر رہی ہیں وہ قابلِ داد ہے۔ ہر جماعت کے کچھ کچھ افراد ایسی صلاحیتوں اور خصوصیتوں کے حامل ہیں جو دوسری جماعتوں میں نظر نہیں آتیں۔ تبلیغی جماعت جو کام انجام دے رہی ہے وہ خدمت جماعتِ اسلامی کے بس کا روگ نہیں اور جماعتِ اسلامی جس کام میں لگی ہوئی ہے وہ کام تبلیغی جماعت انجام نہیں دے سکتی۔ علماء دیوبند جن خدمات میں مصروفِ عمل ہیں ان خدمات کو نبھانے کی اہلیت نہ ہی جماعتِ اسلامی میں پائی جاتی ہے اور نہ ہی تبلیغی جماعت میں۔"

آپ کا خود اس حقیقت کا اعتراف کرلینے کے بعد یہ بات سمجھ میں نہ آسکی کہ آپ ہاتھ دھوکر تبلیغی جماعت کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں جبکہ تجلی میں وقتاً فوقتاً تبلیغی جماعت کے سلسلہ میں کچھ نہ کچھ لکھ کر اسے زخمی کرنا آپ کا معمول سا بن گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں تبلیغی جماعت کے طریق کار سے متفق نہ ہونے والوں کے لئے ایک ہتھیار فراہم ہوگیا ہے وہ لوگ ایسی مخالفت پر تُل گئے ہیں کہ اُن کی نظر میں یہ جماعت بالکل ناکارہ ہوکر رہ گئی ہے اب ان کا خیال ہے اس میں کام کرنے والے ضدی ہیں۔ ہٹ دھرمی ہیں۔ اِن کی عقل کوری ہے۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے؟ جماعتی سطح پر فروعی اختلافات اور طریق کار میں کیڑے چُننے سے آپس کی پھوٹ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

تجلّی

حیرتناک بات یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ جیسے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تبلیغی جماعت کی ادنیٰ مخالفت نہ ہو۔ اس کے خلاف کبھی کوئی مضمون شائع نہ کیا جائے۔ اس کی کسی بھی کمزوری اور نادانی کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے اس پر کبھی کوئی ناقدانہ تبصرہ نہ ہو۔ اور دوسری طرف عالم یہ ہے کہ آپ ہی جیسے لوگوں کی طرف سے ہمیں لمبے چوڑے مراسلے موصول ہوتے ہیں اور اس حسرت و خواہش کے ساتھ موصول ہوتے ہیں کہ انھیں تجلی کے صفحات میں جگہ نصیب ہوجائے اور ساتھ ساتھ اس پر ہماری طرف سے کچھ تبصرہ اور کچھ اظہارِ خیال بھی ہوجائے۔

گویا آپ خود ذکر کرتے ہیں۔ طویل و عریض مراسلے آپ بھیجتے ہیں، انھیں چھاپنے اور ان پر کچھ عرض کرنے کا اصرار آپ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ مراسلے چھاپنے کے بعد

اگر ہم کچھ عرض کردیں تو فتنے پھیلانے کا الزام ہمارے سر، مجرم ہم، انتشار برپا کرنے والے ہم، فرقہ پرست ہم، اختلافات کے بیج بونے والے ہم۔ غرضیکہ ہر برائی کی ابتدا کرنے کا سہرا ہمارے ہی سر پر بندھتا ہے۔

دسمبر کے شمارے میں تبلیغی جماعت سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ہمیں چند باتیں عرض کرنی پڑ گئی تھیں۔ یہ باتیں اگرچہ حقیقت وصداقت پر مبنی تھیں لیکن تبلیغی جماعت کے بعض مخلصین نے ان باتوں کو غیر صحیح تصور کرتے ہوئے مخالفت پر محمول کرلیا اور پھر وہی ہوا جو عموماً ہوتا ہے۔ یعنی کہ مراسلے موسلا دھار بارش کی طرح برسنے لگے اور ان مراسلوں میں کونسا ایسا الزام ہے جو ہم پر نہیں لگایا گیا۔ کہنی ان کہنی سب کہہ ڈالی۔ خیر ہمیں تبلیغی بھائیوں سے کوئی شکایت نہیں۔ ہم تو ہمیشہ سے اس بات کے قائل ہیں کہ جو دعا دے اس کا بھی بھلا اور جو گالی دے اس کا بھی بھلا۔ دوست بھی تعریف کے مستحق اور دشمن بھی تعریف کے حقدار۔

اَن گنت مراسلے اب تک موصول ہو چکے ہیں۔ انمیں زیادہ تر مراسلے غیر سنجیدہ اور جاہلانہ باتوں پر مشتمل ہیں۔ ان مراسلوں میں وہ زبان استعمال کی گئی ہے جو چوتھے درجہ کے انسانوں کی زبان کہلاتی ہے اور جس میں جہالت، تحمق، بے حیائی اور عُریانیت کے ذرّات کافی مقدار میں شامل ہوتے ہیں۔ لے دیکے ایک آپ کا مراسلہ جہالتِ فاحشہ اور حماقتِ اجلّہ سے منزہ محسوس ہوا، اس لئے ہم اس کو قابلِ اشاعت تصور کرتے ہوئے تجلی میں جگہ دے رہے ہیں اور ازراہِ ضرورت اور ازراہِ جواب کچھ باتیں اپنی طرف سے بھی بالترتیب گزارش کر رہے ہیں انھیں پڑھنے کے بعد آپ جس نتیجہ پر پہنچیں اور جو تأثرات آپ کے دل میں پیدا ہوں ان سے ہمیں ضرور مطلع کیجئے گا۔

(۱) ——— تبلیغی جماعت سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے بعد اگر کسی کے اخلاق وکردار اور عادت وکیرکٹر میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے اور بلندی سے پستی اور ترفع سے تنزل میں اگر ابھے تو دیکھنے والوں کو یہ کہنے میں کوئی تأمل نہیں ہوگا کہ خرابی تبلیغی جماعت میں نہیں خود اس شخص میں موجود ہے۔ یہ خود ہی برا اور ناکارہ ہے۔ اس کے اندر کسی بھی اچھی جماعت میں کھپ جانے اور کھپے رہنے کی اہلیت نہیں ہے۔ یا پہلے یہ نیک تھا، پاکباز تھا۔ اور نیک اور پاکباز جماعت سے جڑنے اور جڑے رہنے کی اس میں صلاحیت تھی۔ لیکن یہ صلاحیت فنا ہو چکی ہے اب برائیاں اور خرابیاں اس کی ذات کا جز بن گئی ہیں لہٰذا اب اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ یہ کسی بھی اچھی اور نیک نیت جماعت کے ساتھ وابستگی اختیار کرلے گا۔

لیکن اگر معاملہ برعکس ہو یعنی کہ تبلیغی جماعت سے کنارہ کشی اختیار کرنے والا جتنا متقی، متدین اور متشرع پہلے تھا اتنا ہی تبلیغی جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد بھی ہے تو پھر دیکھنے والوں کا یہ کہنا غلط در غلط ہوگا کہ تبلیغی جماعت میں کوئی خرابی نہیں، کوئی نقص نہیں۔ خرابی اور تخرابی اسی شخص میں ہوگی ہمیں نظر نہیں آرہی ہے۔ ہماری آنکھیں دیکھنے سے قاصر ہیں۔

مولانا ابو الحسن علی ندوی اور مولانا احتشام الحسن کاندھلوی جیسے صاحب علم وکمال اور صاحب کردار و ورع لوگ تبلیغی جماعت سے وابستہ ہوئے اور پھر خاموشی کے ساتھ برطرف ہو گئے۔

کیوں؟ ظاہر ہے کہ ان حضرات نے تبلیغی جماعت میں کوئی نہ کوئی ایسی خرابی اور کمزوری ضرور دیکھی ہوگی جو ناقابلِ برداشت ہو۔ کسی بڑی خرابی کا مشاہدہ کئے بغیر تبلیغی جماعت سے دور ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا؟۔

ایک عام سی بات ہے کہ انسان دنیا میں جب کسی شخص، کسی ادارے یا کسی جماعت سے تعلق قائم کرتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ اور جب وہ تعلق منقطع کرلیتا ہے تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ بغیر کسی وجہ کے تعلقات قائم بھی نہیں کئے جاتے اور بغیر کسی وجہ کے تعلقات ختم بھی نہیں ہوتے۔

زید اگر ہندہ سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ اگر ہندہ میں کچھ صفات

اور خصوصیات نہ ہوتیں تو زید از خود ہندہ کی طرف مائل نہیں ہوسکتا تھا —— خواہ مخواہ بلا وجہ کوئی مرد کسی عورت کی طرف نہیں بڑھتا —— اندازہ ہوا کہ ہندہ نام کی عورت سے زید نام کا اگر کوئی مرد ازدواجی تعلقات قائم کرنے کا آرزومند ہوگا تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ بغیر کسی وجہ کے کوئی مرد کسی عورت کی طرف راغب نہیں ہوسکتا۔

کچھ دن بعد یہی زید اسی ہندہ کو طلاق دیدیتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی بھی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ اس وقت غالباً یہی کہنا مناسب ہوگا کہ ہندہ جتنی دور سے اچھی محسوس ہوتی تھی قریب آکر وہ اتنی اچھی نظر نہیں آئی۔ لہٰذا زید نے ہندہ سے تعلقات ختم کرنے کی ٹھانی —— اور اس نے تعلقات ختم کرکے ہی دم لیا —— یہ تمثیل پیش کرکے صرف یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ دنیا میں جب کوئی مرد کسی عورت سے رشتۂ زوجیت قائم کرے گا تو اس کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ بغیر کسی وجہ کے کوئی زید کسی ہندہ کو اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ اور جب دنیا کا کوئی مرد کسی عورت سے تعلقات منقطع کرے گا تو یقیناً اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی۔ بغیر کسی وجہ کے کوئی زید کسی ہندہ کو طلاق دیکر اپنے سے دور نہیں کرسکتا۔ اب آپ کے ذہن میں ایک بات پیدا ہوسکتی ہے اور وہ یہ ...... کہ زید ہندہ کو خوب اور خوب تر سمجھتے ہوئے اپنی بیوی بنا لیتا ہے۔ پھر کچھ ہی دنوں کے بعد نوبت طلاق تک پہونچ جاتی ہے تو حالات اور واقعات کا جائزہ لئے بغیر آنکھیں بند کرکے یہ فیصلہ کر دینا کیسے درست ہوگا کہ خرابی بہرحال ہندہ ہی میں ہے۔ ہندہ صرف دور سے بھلی معلوم ہوتی تھی، قریب آکر اندازہ ہوا کہ وہ بھلی نہیں بری ہے۔ ممکن ہے کہ ہندہ واقعتاً بھلی ہی ہو اور قصوروار زید ہی ہو۔ برائی زید ہی میں ہو۔

آپ کی یہ بات سولہ آنہ صحیح —— ہم خود اس بات کے قائل ہیں کہ تعلقات کبھی اور کہیں منقطع ہوں فریقین کے حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے۔ آنکھیں بند کرکے فیصلہ کرنے سے گریز کیا جائے اور فیصلہ کرتے وقت ناانصافی اور بددیانتی سے بھی محترز رہا جائے۔

یہ کہنے کے بعد اب ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ تبلیغی جماعت والے تعلقات بگڑنے کی صورت میں عموماً آنکھیں بند کرکے فیصلہ کرنے کے عادی ہیں۔ انصاف و دیانت کے سینہ میں چھرے گھونپنا ان کا مخصوص شعار بنکر رہ گیا ہے۔ قضیہ نمٹاتے وقت ان کی نظر صرف اس بات پر ہوتی ہے کہ کون اپنا ہے کون پرایا —— اور پھر اپنا بہرحال بےقصور ہے اور غیر بہرحال قصوروار۔

زید ہندہ کو طلاق دیتا ہے تو تبلیغی جماعت والے آنکھیں بند کرکے زید کو بےقصور قرار دیتے ہیں اس لئے کہ زید کا رشتہ دار ہے، ان کا بھائی بند ہے۔ لیکن خالد جب عمرہ کو طلاق دیتا ہے تو تبلیغی جماعت والے آنکھیں بند کرکے عمرہ کو بےقصور تصور کرتے ہیں محض اس بنا پر کہ عمرہ ان کی لگی سگی ہے، ان کا خون ہے۔

یہ مثال کی دنیا تھی —— اب واقعات کی دنیا میں آجائیے —— مولانا منظور نعمانی صاحب جماعت اسلامی سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں تو تبلیغی جماعت کے مخلصین آنکھیں بند کرکے کہتے ہیں: کہ جماعت اسلامی واقعتاً گمراہ ہی ہوگی، گمراہ نہ ہوتی تو مولانا منظور نعمانی کا اس میں گھس کر پھر نکلنا ممکن نہ ہوتا اور جب مولانا ابوالحسن علی ندوی تبلیغی جماعت سے قریب ہونے کے بعد دور ہوجاتے ہیں تو یہی لوگ ایمان و اخلاص سے بھرے ہوئے لہجہ میں اب یوں فرماتے ہیں کہ ہو نہ ہو مولانا ابوالحسن علی ندوی میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہے اگر خامی نہیں ہے تو تبلیغی جماعت جیسی مقبول اور نیک جماعت سے وابستہ ہونے کے بعد علیحدگی اختیار کرلینا کیا معنی رکھتا ہے

اتنی گذارشات کرنے کے بعد اب یہ عرض ہے کہ آپ خود اپنے ذرا طرز عمل کو دیکھیں ——

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

(۲) —— غنیمت ہے کہ آپ کو ہماری تحریر میں کہیں تو واقعیت انصاف اور غیر جانبداری کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اگر عام تبلیغی بھائیوں کی طرح آپ بھی ہماری تحریک کو اس اور

لاف وگزاف پر مبنی قرار دیدیتے تو کوئی آپ کا کیا بگاڑ لیتا

(۳) غالباً آپ اس بات سے واقف ہی نہیں کہ موازنہ کسے کہتے ہیں اگر آپ واقف ہوتے تو دسمبر کے شمارہ میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرسکتے تھے کہ ہم جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے درمیان کوئی موازنہ کر رہے ہیں، دسمبر کا شمارہ ایک بار پھر دیکھ ڈالئے ہمارے عرض کرنے کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ جس طرح آدمی تبلیغی جماعت میں دو چار چلّے دیکر تبلیغی جماعت کا گرویدہ ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھنے کے بعد آدمی جماعت اسلامی کا مرید ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

لہٰذا تبلیغی جماعت والوں کا یہ دعویٰ کہ ایک بار ہمارے قریب آنے والا ہم سے کبھی دور نہیں ہو پاتا قابل سماعت تک نہیں چہ جائیکہ اس سے متأثر ہوا جائے حقیقت یہ ہے کہ کسی جماعت کا پلّہ پکڑنے کے بعد پھر اس کو چھڑانا مشکل ہی ہوتا ہے لیکن تبلیغی جماعت والے اگر یہ دعویٰ کرنے پر مصر ہی ہوں کہ یہ خصوصیت صرف ہمارے اندر ہی پائی جاتی ہے کہ جو ہمارے قریب آیا وہ لا محالہ ہمارا ہو کر رہا۔ ہماری دعوت اور انداز دعوت اس درجہ پاکیزہ ہے کہ ہمارے پاس آنے والا ہم سے کبھی دور نہیں ہو سکتا تو یہ دعویٰ بھی کھوکھلا ہی قرار پائے گا اور اس کا کھلا ثبوت یہ کہ ہم ثابت کر ہی چکے کہ کتنے ہی باکمال اور ہونہار علماء نے تبلیغی جماعت سے وابستگی اختیار کرنے کے بعد باقاعدہ کنارہ کشی اور علیحدگی اختیار کر لی اور تادم تحریر وہ تبلیغی جدوجہد سے برطرف ہی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی بھی جماعت ایسی نہیں ہے جس میں گھسنے نکلنے اور جس سے متأثر اور بدظن ہونے کا سلسلہ برابر جاری وساری نہ رہتا ہو۔

کوئی بھی جماعت خواہ جماعت اسلامی ہو یا تبلیغی جماعت کسی بھی وقت اگر یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ایک بار ہمارے پاس آنے والا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہمارا ہو کر رہ جاتا ہے تو ہم اس دعوے کو فریب، چرب زبانی اور کذب مبین کا ماحصل تصور کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

آپ نے تبلیغی جماعت کے بارے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کی جدوجہد اور سرگرمیاں خالص دین اسلام کے لئے وقف ہیں اور یہ دعویٰ کرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے دبے الفاظ میں یہ بھی فرمایا ہے کہ جماعت اسلامی جس جماعت کا نام ہے وہ صرف تبلیغ اسلام کے لئے جدوجہد نہیں کرتی بلکہ اس کا دخل سیاست میں بھی ہے لہٰذا وہ جماعت سیاسی چال ڈھال رکھنے والی کہلائے گی۔

میرے بھائی سیاست اسلام کا ایک جز ہے۔ اس بات سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ ایک جگہ آپ نے خود یہ لکھا ہے کہ اسلام سیاست سے جدا نہیں۔ یہ اعتراف کرنے کے بعد کہ اسلام اور سیاست میں ایک گہرا تعلق پایا جاتا ہے تبلیغی جماعت کو دین اسلام کی خالص خدمت گذار اور جماعت اسلامی کو نیم سیاسی اور نیم مذہبی خیال کرنا دانشمندی کی کونسی قسم ہے۔ سیاست جب اسلام کا جز ٹھیری تو پھر یہ کہنا ہی مبنی بر صداقت ہوگا کہ جماعت اسلامی ایک کامل جماعت اور تبلیغی جماعت ایک ناقص جماعت ہے — یا بالفاظ دیگر یوں کہہ لیا جائے کہ جماعت اسلامی اسلام کی مکمل خدمت کر رہی ہے اور تبلیغی جماعت اسلام کی ادھوری خدمت میں مشغول ومنہمک ہے

سیاست کو اسلام کا جز تسلیم کرنے کے بعد اس جماعت کو کامل جماعت کہنا درست نہیں ہو سکتا جو سیاست کو شجر ممنوعہ تصور کرتی ہو اور سیاست کے قریب بھی پھٹکنا جس کے نزدیک معصیت سے کسی درجہ میں کم نہو۔

آپ یقیناً اس حقیقت سے بھی واقف ہوں گے کہ سیاست کی راہیں اپنائے بغیر قانون کی لاٹھی اور اقتدار کی کرسی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اگر آپ اس بات کے خواہشمند ہیں کہ اسلام قوی و مضبوط ہو، پھلے پھولے اسی کی تعلیمات اور احکامات پر لوگ عمل کرنے کے لئے مجبور ہوں تو آپ کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ آپ ان جماعتوں کے ہاتھ مضبوط کریں

جو سیاست کہلواسکے مگر اس مقام تک پہنچنے کے لئے کوشش کر رہے ہیں جس مقام تک پہنچنے کے بعد طاقت اور رعب کا سرمایہ حاصل ہو جاتا ہے

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلام صرف وعظ، محدود تقریروں اور مروّجہ تبلیغوں کے ذریعہ اسلام کو پھیلانا اور اس کے احکامات کو نافذ کر دیتا اگر ممکن ہوتا تو کم از کم اس دور کا کوئی مسلمان بے عمل اور بدکردار نظر نہیں آتا — جتنی تقریریں اور جتنی محدود انداز کی تبلیغیں موجودہ زمانہ میں ہو رہی ہیں شاید ہی کسی زمانہ میں ہو سکی ہوں۔ اور جتنی برائیاں اور خرابیاں آج معاشرہ میں سر ابھار رہی ہوں شاید ہی اس سے پہلے کبھی سر ابھار سکی ہوں۔

ہر شہر میں مقررین تقریروں کا فرض ادا کر رہے ہیں ہر مسجد جذباتی اور غیر جذباتی تقریروں سے گونج رہی ہے۔ ہر مسلمان پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ برائی کیا ہے۔ بھلائی کیا — ہر شخص کے کانوں میں سیکڑوں احادیث انڈیل دی گئی ہیں۔ گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں علم بہتا نظر آرہا ہے لیکن اس کے باوجود آپ دیکھ لیجئے کہ اسلام دن بدن سمٹتا جا رہا ہے اور کفر و بدعت کے وجود میں روز بروز پھیلاؤ اور وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ خلوص سے بھری ہوئی تقریریں لڑیوں کا وجود مٹانے سے قاصر ہیں۔ مقررین حضرات ہزار دل اخلاص وایثار کے حامل ہونے کے باوجود اتنی طاقت اور استعداد نہیں رکھتے کہ برائیوں اور گناہوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر روک لگا دیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہر دانشمند مسلمان یہ سوچنے اور کہنے پر مجبور ہوگا کہ معاشرہ سے کرپشن دور کرنے اور اسلامی احکامات کو نافذ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے ہاتھ میں لاٹھی ہو۔ تلوار ہو۔ جبتک اسلام کے ہاتھوں میں اقتدار کی لاٹھی رہی مسلمان ہزار قسم کی خرابیوں سے محفوظ رہنے پر مجبور رہے اور جب سے اسلام کے ہاتھوں کی قوت ختم ہوئی تب سے مسلمان ایسے ایسے فتنوں میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ تصور سے بھی بعض رونگٹے کانپ اٹھتے ہیں۔ آج مسلمانوں کے گھروں میں بعض چور دروازوں سے ایسی ایسی خرابیاں اور برائیاں داخل ہو گئی ہیں کہ جن کا کافروں کے گھروں میں ہونا بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

بہرحال حالات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ معاشرہ کی اصلاح و تطہیر صحیح معنوں میں اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اسلام برسر اقتدار نہ ہو، اور اسلام کو برسر اقتدار لانے کے لئے سیاست کو اپنانا ناگزیر ہے۔ ضروری اور لازمی ہے۔

جماعت اسلامی نے ماضی قریب و بعید میں ایک ہی تمنا تو کی تھی کہ اسلام کو اقتدار و قوت حاصل ہو جائے، اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی ہو جو مسلمانوں کو اسلامی احکامات سے سرتابی کرنے سے روکتی رہے۔ ہر قانون اس کا پابند ہو جائے وہ خود کسی قانون کا پابند اور ماتحت نہ رہے۔ جماعت اسلامی کی یہ تمنا اور اس تمنا کو حقیقت کے روپ میں دیکھنے کے لئے اس کی جدوجہد اگر آپ کے نزدیک جرم ہے تو آپ کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ آپ جماعت اسلامی کی اس تمنا اور جدوجہد کو جرائم کی فہرست میں درج کر لیں۔ لیکن ہم تو ببانگ دہل یہ کہتے ہیں کہ جماعت اسلامی کا صرف یہ تمنا کرنا کہ اسلام کو دنیا میں اقتدار اور طاقت حاصل ہو جائے، اس کی بخشش و مغفرت کے لئے بہت کافی ہے۔ اس سلسلہ میں ادنیٰ درجہ کی جدوجہد بھی نہ ہو تو بھی اسے محض اس بنا پر خدا اور اس کے رسول کی رضا حاصل ہو جائے گی کہ اس نے دنیا میں اس بات کی خواہش تو کی تھی کہ دنیا میں اسلام ہی اقتدار کی کرسی پر مسند نشین ہو، ہر طرف اس کا بول بالا ہو، اسی کی فرمانروائی ہو، اسی کے آگے سب گردنیں جھکانے پر مجبور ہوں۔

آپ ایک جگہ روانی میں یہ بھی تو ارشاد فرما گئے ہیں کہ تبلیغی جماعت بھی وہ راہیں اپنالے جو جماعت اسلامی نے اپنا رکھی ہیں تو تبلیغی جماعت کو وہ لوگ ضرور طلاق دے ڈالیں گے جو سرکاری ملازمتوں پر فائز ہیں اور جن کو گورنمنٹ کی طرف سے یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ کسی سیاسی جماعت سے وابستگی اختیار نہ کریں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ تبلیغی جما...

(باقی صفحہ...)

ایک مراسلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ حکومتِ لیبیا کی مشارکت سے جو فلم رسول (علیہ السلام) تیار ہو رہی ہے اور اس کے خلاف بہت سے علماء اور مسلم ادارے احتجاج کر رہے ہیں، مگر حکومتِ لیبیا کو اشکال ہے کہ احتجاج تو بہت سے لوگ کر رہے ہیں مگر اس کی حرمت پر دلائل نہیں پیش کرتے کہ احتجاج قابلِ توجہ ہو۔
اگر حکومت ... پر دلائل شرعیہ اور عقلیہ بھی قائم کر دیں، تو ضرور احتجاج قابلِ اعتناء اور مفید ہوگا لہٰذا امید ہے کہ حرمت کے دلائل مفصل طور پر بیان کر کے ممنون فرمایا جائے گا۔ بینوا توجروا

اخلاق احمد
ادارہ درسِ قرآن دیوبند

الجواب بتوفیق اللہ و عونہ

اتباع شریعت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا مفہوم یہی ہے کہ جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور آپ کے خصائل و عادات (خواہ جلوت کے ہوں یا خلوت کے انفرادی ہوں یا اجتماعی) اور آپ کے محاربات و غزوات غرض آپ کی جس چیز کی بھی نقل اتارنی (فلم) بنانے والوں کے نزدیک مناسب معلوم ہو اس کی نقل اتاریں اور اس کو فلم پر لائیں اور دنیا کے تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل اور آپ کی تمام عادات و خصائل (خواہ اجتماعی زندگی سے متعلق ہوں یا انفرادی زندگی سے متعلق ہوں خواہ امن و سکون کی حالت سے متعلق ہوں خواہ جنگ و جدال و محاربہ کی حالات سے متعلق ہوں خواہ ازدواجی و معاشرتی زندگی سے متعلق ہوں خواہ اقتصادی و سیاسی حالات سے متعلق ہوں سب ہی میں قابلِ عمل ہیں ... کے ... ہونے کا اور اسی کے مطابق زندگی گذارنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنے کی ... دی گئی ہے اس سے سرمو انحراف کرنے سے روکا ہے ... بلکہ سرمو انحراف کو گمراہی اور بد دینی بتلایا گیا ہے اور ... ہر ایک میں ہی ہمارے لئے ایک عملی نمونہ ہے۔ جب تک کہ آپ خود بھی تصریح نہ فرما دیں کہ میرا یہ قول یا میری یہ چیز ... حیثیت میں ہے تشریعی حیثیت میں نہیں ہے یا اس پر ... شرعی قائم نہ ہو جائے ہر ایک واجب الاتباع ہے، چنانچہ ... میں بہت سی آیاتِ قرآنیہ شاہدِ عدل ہیں ان میں سے ... نقل کی جاتی ہیں۔ مثلاً:-

(الف) وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ (پ ۲۷ ع س نجم)	آپ اپنی خواہش ... فرماتے بلکہ جو کہتے ہیں ... ہوتی ہے۔
(ب) وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا (پ س ع)	رسول علیہ السلام جو تعلیم ... کو اختیار کرو اور ... روکیں تو رک جاؤ۔
(ج) ان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل (پ / ع / س)	بلاشبہ میرا سیدھا راستہ ... اتباع کرو بقیہ کے ... نہ کرو
(د) لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر	بیشک تمہارے ... اچھا نمونہ ہے اس ... اور قیامت کے ...
(ہ) وما ارسلنا من رسول الا لیطاع	ہم نے کوئی ... تاکہ اس کی ...
(و) قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم ... کرو ...

اور یہ ظاہر ہے کہ فلم خواہ کسی قسم ہو، بائسکوپ ہو، تھیٹر ہو، سنیما ہو، تصویر کے ساتھ ہو یا صرف سایہ کے انداز میں ہو اس میں صورتیں نمایاں ہوں یا نہ ہوں غرض کسی انداز کی کوئی فلم ہو نفس فلم ہی لہو و لعب میں اس درجہ مستعمل و متعارف ہو چکی ہے کہ لہو و لعب اس کی حقیقت مستقلہ بن گئی ہے۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ان فلموں سے جتنی فحاشی، عریانی و بے حیائی عالم میں پھیل رہی ہے اتنی کسی چیز سے نہیں پھیل رہی ہے انھیں فلموں سے یہ برائیاں بن کر اور ڈھلکر کلبوں، ہوٹلوں میں بلکہ گھروں میں پہنچی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں اور اچھے سے اچھے دینی معاشرے اور مذہبی گھرانوں کو تباہ کرتی ہیں یہاں تک کہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ان فلموں کی وضع ہی انھیں لہو و لعب کے لئے ہے تو غالباً بیجا نہ ہوگا پس نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و غزوات و محاربات کو یا آپ کی کوئی چیز کو جبکہ ان کا دین سے ہونا اوپر ثابت ہو چکا ہے ان کو فلم میں لانا خواہ کسی انداز یا کسی مقصد کے ماتحت لایا جائے کیا دین کو لہو و لعب بنانا نہ ہوگا اور کیا یہ دونوں چیزیں اس وعید کے ماتحت داخل نہ ہونگی جس پر قرآن کریم کھلے لفظوں میں آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تبلا کر متنبہ کر چکا ہے مثلاً

(۱) الذین اتخذوا دینہم لہوا ولعبا وغرتہم الحیوۃ الدنیا فالیوم ننساھم کما نسوا لقاء یومہم ھذا وما کانوا بایتنا یجحدون	جنہوں نے بنایا اپنے دین کو کھیل اور تماشا اور دھوکہ دیا دنیا کی زندگی نے تو آج ہم ان کو بھلا دینگے جس طرح انہوں نے اس دن کے ملنے کو بھلا دیا تھا اور جس طرح سے وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔
پ ۸ س اعراف	
(۲) ذلک جزاءھم جہنم بما کفروا واتخذوا ایاتی ورسلی ھزوا۔ پ ۱۶ کہف ع ۱۱	یہ جہنم اُن کی سزا اس لئے ہے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں رسولوں کا مذاق اڑایا (اور ان کا استہزا کیا)

اور کیا پھر یہ حکم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی فلم بنانے والوں اور اس میں مدد کرنے والوں پر خصوصیت کے ساتھ متوجہ نہیں ہوگا حالانکہ اس کے متعلق کھلی کھلی وعیدیں بہت سی آیات میں مذکور ہیں۔ مثلاً

(۱) وذر الذین اتخذوا	ایسے لوگوں سے کنارہ کش رہئے جنہوں نے اپنے
[illegible]	[illegible]
... الحیوۃ الدنیا وذکر بہ ان تبسل نفس بما کسبت لیس لہا من دون اللہ ولی ولا شفیع پ ۷ س انعام	زندگی نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے اور اس قرآن کے ذریعہ سے نصیحت بھی کرتے رہئے تاکہ کوئی شخص اپنے کردار کے سبب اس طرح پھنس نہ جائے کہ کوئی غیر اللہ اس کا مددگار نہ ہو اور نہ سفارشی ہو۔

⁂ ⁂ ⁂

(۲) وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم ایات اللہ یکفر بہا ویستہزأ بہا فلا تقعدوا معہم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ انکم اذاً مثلہم ان اللہ جامع المنافقین والکافرین فی جہنم جمیعا پ ۵ س نساء ۱۶	بیشک اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں تم پر یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم لوگ سنو کہ وہ آیات الٰہی کا انکار کرتے ہوئے اس کا استہزا کرتے ہیں تو ان کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ لوگ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں ورنہ تم بھی انہی جیسے لوگوں میں شمار ہو جاؤ گے بیشک اللہ تعالیٰ منافقین و کافرین کو جہنم میں اکٹھا کرنیوالے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

(۳) واذا رأیت الذین یخوضون فی ایاتنا فاعرض عنہم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ واما ینسینک الشیطان فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین۔	اور جب اُن لوگوں کو دیکھئے جو ہماری آیات میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جایا یہانتک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جاویں اور اگر تمکو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالم لوگوں کے پاس مت بیٹھو۔
پ ۷ س انعام ع ۶	

خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی فلم (استاجِ شریعتِ محمدؐ) بنانا یا خواہ کسی انداز پر ہو اور کسی مقصد کے لئے ہو اور اس میں تصویر آئے یا نہ آئے بلکہ پردہ پر آپ کا عکس وغیرہ بھی کچھ نہ آئے جب بھی دین کے ساتھ تلعب ہے دین کو کھیل کود بنانا ہے اور دین کو کھیل کود اور لہو و لعب کے موقع پر پیش کرنا ہے جس پر طرح طرح کی وعیدیں قرآن پاک میں بھی موجود ہیں اس کو بنانا اس میں شریک ہونا اس میں کسی قسم کی مدد دینا بڑے خطرناک نتائج کا لانے والا ہے۔ دین و دنیا دونوں کی تباہی کا خطرہ ہے شریعتِ مقدسہ کسی طرح بھی اس کی اجازت نہیں دیتی یہ پہلی وجہ ہوئی (شریعۃ محمد) کے عدمِ جواز حرمت کی اور اس کے مذموم ترین اور بدترین شے ہونے کی

حرمت کی دوسری وجہ جب یہ ریل اسٹریٹ وتشریط محمد علیہ السلام ہو گی تو اس کے مناسب آپ کے جس چیز کی نقل اتارنی چاہیں اتار سکیں گے۔ مثلاً غزوۂ اُحد کی نقل اتاریں تو اس میں گھاٹی سے صحابہ کا ہٹ جانا بھی دکھلائیں گے جس کے متعلق حضور صلے اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے کہ یہاں سے ہماری فتح ہو یا شکست کسی حالت میں تم لوگ مت ہٹنا اس حکم کی خلاف ورزی کا الزام صحابہ پر آئے گا نیز میدانِ جنگ میں آپ کو چھوڑ کر صحابہ کا فرار کر جانا اور آپ کا زخمی ہو کر گر جانا پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا خود آکر مرہم پٹی کرنا وغیرہ بھی دکھلانا ہو گا تو کیا اس سے ایک ناواقف مسلمان کا ذہن (جو اسلامیات اور اسلامی تعلیم سے ناآشنا ہو گا اور اس کے سامنے باب ترتیب احکام ومسائل نہ ہوں گے مثلاً وہ جانتا ہو کہ شہادت کا اسلام میں کیا مرتبہ ہے یا اللہ کی راہ میں زخمی ہونے اور مصیبت جھیلنے اور برداشت کرنے سے کیا کیا رتبے اللہ کے پاس ملتے ہیں یا مثلاً جس کے علم میں کلے زندگی کی تکلیف کا حال اور اس کی مصیبتیں نہ ہوں یا مدینہ طیبہ کے شروع زمانہ ہجرت کی تنگی وعسرت میں کیا راز وحکمت ہے یا مثلاً اس کو نہ تو باطن کی خبر ہو نہ باطن کے اصلاح ودرستگی کی ضرورت واہمیت ذہن میں ہو مثلاً اس کو آیت کریمہ:۔

اِنَّ اللہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ
اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ
لَھُمُ الْجَنَّۃَ الآیۃ

اور اس جیسی آیت کا پتہ نہ ہو اور نہ اس کا مفہوم ومصداق ذہن میں صحابہ کی عظمت ووقعت مختصر اجمالی اور سنی سنائی، کیا یہ بات ایسے شخصوں کے ذہن میں نہیں آسکتی کہ صحابہ کیسے سرکش اور بے وفا تھے کہ حضور کے صریح حکم کی مخالفت کی اور آپؐ کو تنہا چھوڑ کر میدان سے سب بھاگ گئے حالانکہ ان صحابہ میں عشرہ مبشرہ بھی تھے جن کو جیتے جی بشارتِ جنت دربارِ رسالت سے حاصل ہے اور ان میں اصحاب بدر بھی تھے لاکھوں صحابہ بھی تھے جن کو سندِ رضا رِخداوندی (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ) حاصل ہے تو کیا سند یں یہ بشارتیں غلط نہیں ہیں اور کیا اُن کے ذہن میں یہ تو سیع سبہ نہیں آسکتے کہ اللہ کے وعدے جو ان آیات اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا اور واللہ یعصمک من الناس اور

ھو الذی ایدک بنصرہ وبالمؤمنین اور انتم الاعلون ان کنتم مومنین اور کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی وغیر ذٰلک من الآیات میں صرح ہیں کہاں گئے کہ آپ زخمی ہو گئے نعوذ باللہ کیا اللہ کے یہ سارے وعدے غلط ہی تھے اور فلم دیکھنے والے اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور ہوں گے تو وہ ان ایمانیات کے اور کھلے نصوص ونصرت کے بارے میں کیا سوچیں گے بالخصوص جبکہ ان تماشائیوں میں غیر مسلم اور وہ لوگ بھی ہوں گے جن کا مقصد ومشغلہ ہی اسلام اور اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں سے ساتھ مسخریہ اور مذاق اور تنقید وتضحیک ہوتا ہے تو پھر یہ دین کی تعلیم وتبلیغ کہاں ہو گی، یہ تو تخریب ایمان کا بڑا سامان ہو گا اور پھر یہ طریقہ جس طرح تخریب وتباہی کا سبب بنے گا ظاہر ہے، پھر اسی طرح اگر آپ کے پرائیویٹ معاملات کی نقل اتارنے لگیں جن کو آپ نے بحیثیت نبی کے دین کی تعلیم کے لئے کئے اور ان معاملات کو عریاں کر کے فلموں کے پردوں پر نمایاں کرنے لگیں تو کون مسلمان ان چیزوں کو برداشت کر سکے گا جبکہ ازواج مطہرات تمام مسلمانوں کی مائیں ہیں اور ان کے بارے میں ارشاد ربانی ناطق ہے:۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ	نبی علیہ السلام مومنین کی جانوں کے خود
اَنْفُسِھِمْ وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّھٰتُھُمْ	اُن سے بھی زیادہ حقدار ہیں اور نبی علیہ السلام
(الآیۃ پ ۲۱ س احزاب ع ۱)	کی ازواج مطہرات تم سب کی مائیں ہیں۔

کون انسان ہے جو اپنی ماؤں اور بہنوں کے بارے میں ان کے اس قسم کے مخفی معاملات کو فلم کے پردوں پر عریاں ونمایاں ہو کر مشتہر ہوتا ہوا دیکھے اور برداشت کرے اس کی غیرت کہاں جائے گی اور اس کو کہاں لے جائے گی پھر ہو سکتا ہے کہ کوئی انتہائی غیرت میں اپنی جان دیدے اسی طرح اگر کوئی شخص حضرت مریم علیہا السلام کے حاملہ ہونے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے کی نقل اتارنے لگے اور نقل اتارنے میں حضرت مریم کے سامنے تنہائی میں اُن کے غسل کرنے کی حالت میں کوئی شخص مصنوعی فرشتہ بن کر پھر بہ ہیکل انسانی ان کو حاملہ بنانے کے لئے آئے اور پھر ان کے حاملہ ہونے اور ان کے درد زہ میں مبتلا ہونے وغیرہ کا نقشہ کھینچنے لگے یا حضرت موسیٰؑ کے لکنت کا اور ان کے بھائی حضرت ہارون کے ساتھ الجھنے اور ان کی ڈاڑھی اور سر کو پکڑ کر کھینچنے وغیرہ کا نقشہ کھینچنے لگے یا حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے جنت

سے نکالے جانے کا اور پھر حضرت حوا کے روزانہ حاملہ ہونے اور ان کے بطن سے ہر صبح و شام بچہ تولد ہونے کا نقشہ کھینچنے لگے تو کون انسان ایسا ہوگا جو اس کو تضحیک اور ان حضرات مقدسین کی تنقیص نہ قرار دے گا اور کوئی ازلی بدبخت احساس نہ کرے تو نہ کرے مگر کوئی انسان جس کے دل میں ذرا خوفِ خدا ہوگا وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کو اُن تمام مقدسین کی تکریم و احترام کا تاکیدی حکم اس کے خدا و رسول سے بہ کثرات و مرات منصوص ہے۔ پس یہ فلم لہو و لعب کی چیز ہو یا نہ ہو اس سے قطع نظر خود ان چیزوں کا برسرِعام لانا کس قدر مذموم اور ناقابلِ تلافی جرم اور باعثِ وبال دنیا و آخرت ہوگا اور کس طرح کوئی مذہب اس کی اجازت دے گا، عجب نہیں کہ اس معاملہ میں اگر کچھ بھی تساہل برتا گیا تو کوئی عذاب عام نہ آجائے۔ کما قال تعالیٰ

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ	جو لوگ اللہ و رسول کے حکم کے خلاف کرتے
عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ	ہیں اُن کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کسی فتنہ
أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ	نہ مبتلا ہو جائیں یا ان پر کوئی دردناک
پ ۱۸	عذاب نازل ہو جائے۔

اس لئے یہ فلم قطعاً حرام و ناجائز ہوگی بلکہ تخریب دین و ایمان کا بڑا سامان ہوگا اور پھر جس قدر تباہی کا سبب بنے ظاہر ہے پس کسی طرح بھی اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا ہے حرمت کی یہ مستقل دوسری دلیل ہوئی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اگر کوئی شبہ کرے کہ جو واقعات اس فلم میں دکھلائے جائیں گے وہ سب تو پہلے کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں اور جس طرح سے لوگ اس واقعہ کو دیکھ کر ان کو وہ فاسد خیالات میں مبتلا ہوں گے اور اسی طرح ان کتابوں کو دیکھ کر بھی یہ سب خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں پھر اگر ان فلموں کو روک دینا بھی ضروری ہونا چاہیئے۔

جواب یہ ہے کہ اول تو فلم میں جس طرح کی چیز کا نقشہ کھینچا جاتا ہے اس طرح کتاب میں نہیں کھینچا جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ دونوں کے تاثرات مختلف ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ کسی کتاب میں جب مصنف اس قسم کے واقعہ کو لکھتا ہے تو ساتھ ساتھ دفع دخل مقدر بھی کرتا جاتا ہے اور انداز کو اختیار کرتا ہے جس سے اس قسم کے فاسد خیالات کی اصلاح ہوتی جاتی ہے اور اعتراضات خود بخود مرتفع ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی مصنف دفع دخل مقدر نہیں کرتا اور ایسا انداز و طریقہ اختیار کرتا ہے جس سے ان فاسد مادوں کا خاتمہ ہو جائے تو اس مصنف پر نکیر کی جاتی ہے اور اس کے اس طریقے کو ناجائز اور اسلاف کی توہین قرار دے کر واجب الاصلاح قرار دیا جاتا ہے اور اصلاح نہ کر لینے کی صورت میں اس کتاب کا مطالعہ کرنا ناجائز پایا جاتا ہے بلکہ اس کو نسیت کر دینے کا حکم شرعی متوجہ ہو جاتا ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اگر کوئی یہ کہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے افعال کی نقل تو بہت سے صحابہؓ سے منقول ہے جیسے حضرت علی و ابن عباس و ابن مسعود و ابن عمر رضی اللہ عنہم ان سب نے حضورؐ کی نعل کی نقل اتار کر دکھلایا ہے تو پھر تم کیوں فلم میں اس نقل اتارنے کو منع کرتے ہو اور کیوں اب اس کو حرام ناجائز کہتے ہو تو **جواب** یہ ہے کہ ان سب حضرات نے حضورؐ کو اور آپؐ کے افعال کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر نقل کیا ہے اور فلم کی یہ نقل ایسی نہیں ہے بلکہ محض کتابوں سے سمجھے ہوئے مفہوم پر یا سنی سنائی کیفیت پر بنیاد رکھ کر نقل کر دیا ہے یا نقل کریں گے اور محض کتابوں سے سمجھے ہوئے مفہوم پر بنیاد رکھ کر نقل اتارنے میں سرکارِ دوعالمؐ کی طرف غلط نسبت ہو جانے کا قوی خطرہ و ظن غالب ہے اور آپ کی جانب غلط نسبت بھی تکذیب کی وعید من کذب فلیلج النار اور من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار اور کما قال ع[۱] میں داخل ہے کما قال[۲] ابن حجر وغیرہ اس لئے اس نقل پر فلم کی اس محاکاۃ کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہوگا اور ہرگز شرعاً اس کی اجازت نہ ہوگی۔ پھر صحابۂ کرام نے جو کچھ نقل کیا ہے وہ محض متقرباً الی اللہ نقل کیا ہے اور اللہ کو راضی کرنے اور محض آخرت کا ثواب حاصل کرنے کی نیت سے کیا ہے اور یہ نقلیں ایسی نہیں ہیں۔

حرمت کی تیسری وجہ

اللہ تبارک تعالیٰ نے جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نہایت محترم و واجب التعظیم ہستی بنایا ہے آپؐ کے ساتھ عام انسانوں جیسا معاملہ کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دی ہے آپ کے ساتھ گفتگو کرنے میں بھی

عسـ۱ جمع الوسائل صفحہ ۱۰ — ۲ والمواہب علی الشمائل صـ۱۵۔

ایک مخصوص انداز اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا گیا ہے :۔

یا ایّھا الّذین اٰمنوا اذا ناجیتم	اے ایمان والو جب تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ
الرسول فقدموا بین یدی	وسلم سے سرگوشی کیا کرو تو اپنی اس سرگوشی سے
نجوٰکم صدقۃ ذٰلک خیرٌ	پہلے کچھ صدقہ دیدیا کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے
لکم پ۲۸ ع۲ س مجادلہ	اور پاک ہونے کا اچھا ذریعہ ہے۔

اسی طرح آپ کو مخاطب کرنے کے سلسلے میں خاص خاص حکم اس انداز کے دیئے گئے جن سے آپ کا ادب اور آپ کی برتری و عظمت ہر آن ملحوظ رہے مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا۔

لا تجعلوا دعاء الرّسول بینکم	تم لوگ رسول (علیہ السلام) کے بلانے کو
کدعاء بعضکم بعضاً	آپس کے ایک دوسرے کو بلانے کی طرح
پ۱۸ ع۱۵ س نور	مت سمجھو۔

اور مثلاً فرمایا گیا۔

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تقدموا	اے ایمان والو تم اللہ و رسول سے پہلے
بین یدی اللہ و رسولہ و	سبقت مت کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے
اتقوا اللہ انّ اللہ سمیع علیم	رہا کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا اور
پ۲۶ ع۱۳ س حجرات	جاننے والا ہے۔

اور مثلاً فرمایا گیا :۔

یا ایھا الذین اٰمنوا لا ترفعوا	اے ایمان والو اپنی آوازیں پیغمبر علیہ السلام
اصواتکم فوق صوت النبی	کی آواز سے بلند مت کیا کرو۔ اور نہ ان سے
و لا تجھروا لہ بالقول کجھر	ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے
بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم	سے کھل کر بولا کرتے ہو۔ کبھی تمہارے
وانتم لا تشعرون	اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی
پ۲۶ س حجرات ع۱۳	نہ ہو۔

اس آیت کریمہ میں تو ذرا سی بے ادبی کی صورت پر بھی اگرچہ وہ نادانستہ ہی کیوں نہ ہو حبط اعمال اور سلب توفیق یا سلب ایمان کی وعید ہے اس سے سرکار دو جہاں صلے اللہ علیہ وسلم پر (می فداہ و ابی امی) کی عظمت شان کا اندازہ کیجئے۔ اسی طرح بعض سادہ لوح و سادہ مزاج صحابہ نے جب آپ کو حجرہ کے باہر سے آواز دی جس میں ان کے دل میں بے ادبی کرنے کا ارادہ تو درکنار اس کا تصور بھی نہیں تھا اور آپ نے اس کو اپنے اخلاقِ کریمانہ سے انگیز بھی فرما لیا تھا مگر اللہ تعالیٰ کو آپ کے ساتھ اتنی بے ادبی اور اتنی اذیت دہی بلکہ اسکی صورت بھی گوارہ نہیں ہوئی فوراً تنبیہ فرمائی گئی اور آیت کریمہ نازل ہو گئی۔ فرمایا گیا۔

انّ الذین ینادونک	جو لوگ حجروں کے باہر سے آپ کو پکارتے ہیں ان
من وراء الحجرات اکثرھم	میں اکثر نہیں سمجھتے کہ وہ لوگ صبر کرتے
لا یعقلون ولو انھم صبروا	حتیٰ کہ آپ خود باہر ان کے پاس آجاتے
حتیٰ تخرج الیھم لکان	تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ
خیرا لھم واللہ غفورٌ	غفورٌ رحیم ہیں۔
رحیم (پ۲۶ س حجرات)	

⁂ ⁂ ⁂

اسی طرح حضرت زینب بنت جحش رضؓ کا نکاح ہوا ولیمہ کی دعوت میں سرکار دو عالم نے کچھ صحابہ کو مدعو کیا وہ حضرات حاضر ہوئے اور کھانے سے فارغ ہو کر بھی کچھ دیر بیٹھے باتیں کرتے رہ گئے اور یہ چیز سرکارِ دو جہاںؐ کو گراں گذری مگر چونکہ یہ گرانی طبعی اور اپنے بارہ میں تھی اس لئے آپؐ نے اخلاقِ کریمانہ کے باعث کچھ اظہار نہ فرمایا مگر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو بھی ظاہر فرما دیا اور آیت کریمہ نازل ہو گئی اور اس میں صحابہ کے اس فعل کو ایذا دہی سے تعبیر فرمایا گیا ارشاد ربانی ہے۔

واذا دعیتم فادخلوا فاذا	اور جب تم کو بلایا جائے تب جایا کرو پھر
طعمتم فانتشروا ولا مستانسین لحدیث ان ذٰلکم کان	جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو
	اور باتوں میں نہ لگے رہا کرو۔ بیشک
یؤذی النبی فیستحی منکم	اس سے نبی (علیہ السلام) کو ایذا پہونچتی
واللہ لا یستحی من الحق	ہے لیکن وہ تم سے شرماتے ہیں اور ظاہر
(پ۲۲ ع۴ س احزاب)	نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ نہیں شرماتے
	اور ظاہر کر دیتے ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ کوئی ایسی جرأت یا کوئی ایسا کام جو آنحضورؐ کے لئے طبعی گرانی کا بھی سبب بنے وہ آپ کی ایذا رسانی کے ہم معنی ہے اور آپ کو ایذا رسانی اتنا خطرناک و شدید جرم ہے جس کی وجہ سے دنیا و آخرت دونوں جگہ رسوائی اور اللہ کی لعنت و پھٹکار کا مستحق ہو جاتا ہے اور ایسے لوگوں کے لئے بڑا دردناک اور رسواکن عذاب منجانب رب العزت مقرر ہے جیسا کہ اسی رکوع کی ..... اگلی آیت میں مصرح ہے۔ فرمایا گیا

ان الذین یؤذون اللہ	بیشک وہ لوگ جو ایذا دیتے ہیں اللہ کو

ورسولہ لعنہم اللہ فی الدنیا — اس کے رسول کو ان پر لعنت کی
والآخرۃ واعد لہم عذابا — اللہ نے دنیا اور آخرت میں اور ان کیلئے
مہینا پ ۲۲ س احزاب — تیار کرکھا ہے ذلت کا عذاب۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے۔

والذین یؤذون رسول اللہ — جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاتے
لہم عذاب الیم۔ س توبہ — ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

صحابۂ کرام سے اس قول موجب ایذا رسانی کا صدور اول تو اس حکم کے علم سے قبل کا تھا دوئم ارادہ وقصد سے نہیں تھا بلکہ نادانستہ طور پر غایت تعلق اور فرط عقیدت ومحبت سے ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے جناب نبی کریم ؐ نے درگذر فرمادیا تھا اور اسی وجہ سے اللہ پاک نے بھی درگذر فرمادیا اور محض آپ کی ایذا رسانی کی حقیقت اور اس کا حکم شرعی بتلاکر چھوڑ دیا گیا اور معافی دیدی گئی مگر اب تو آپ کی طبعی گرانی کا سبب بننا بھی ایذا دہی کے معنی میں ہونا معلوم ہوچکا ہوگا اور ایذا دہی پر جو لعنت دھمکی کا متعین ہے وہ بھی معلوم ہو چکی ہوگی اب ایسے لوگوں کا کیا حال اور کیا حکم ہوگا ظاہر ہے، غرض مذکورہ بالا آیات کریمہ سے خوب واضح ہوگیا کہ آپ کا رتبہ سب سے برتر اور افضل ہے اور آپ کے آداب واحکام خصوصی اور نرالے ہیں دوسروں پر آپ کو قیاس نہیں کرسکتے نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ کوئی معاملہ یا کوئی بات دربار رسالت کے شان بالا وبرتر کے ذرا بھی خلاف ہوگی یا آپ کے طبع مقدس پر ذرا بھی گراں گذرے گی تو وہ بات یا معاملہ قطعاً ناجائز وحرام ہوگا اسی طرح یہ بھی واضح ہوگیا کہ ایسی کوئی بات جو آپ کے ساتھ یا آپ کے حضور میں کی جاتی جو آپ کے طبع مقدس پر ذرا بھی گراں گزرتی تو وہ عندرب العزت نہایت مبغوض ومذموم ہوگی اور قطعاً ناجائز وحرام ہوگی۔ نیز یہ بات بھی واضح ہوچکی ہے کہ اس علم میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو لازمی طور پر ایذار رسول کا سبب بنیں گی۔

لہٰذا مندرجہ ذیل آیات کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ علم بنانے والے عذاب خداوندی سے بچ نہیں سکتے (ان الذین یؤذون اللہ ورسولہ لعنہم اللہ فی الدنیا والآخرۃ الخ اور والذین یؤذون رسول اللہ لہم عذاب الیم)

حرمت کی چوتھی وجہ

یہ سب کو معلوم ہے کہ تمام مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ ہے کہ آپ نبی آخرالزماں ہیں خاتم الانبیاء والرسل ہیں آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا قیامت کے لئے آپ ہی کی نبوت کا سورج چمکتا رہے گا۔ کما قال تعالیٰ۔

ماکان محمد ابا احد من — محمد صلے اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں
رجالکم ولکن رسول اللہ — سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے
وخاتم النبیین — رسول ہیں اور سب نبیوں کے خاتم
پ ۲۲ ع ۲۔ س احزاب — کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وقال النبی صلی اللہ وسلم — جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
ختمت بی الرسالۃ (بخاری) — فرمایا کہ رسالت مجھ پر ختم کردی گئی (بخاری)
وایضا قال علیہ السلام — اور فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کی سیاست و
کانت بنو اسرائیل تسوسہم — حکومت بھی انبیاء علیہم السلام کرتے تھے جب
الانبیاء اذا ھلک نبیٌ — ایک نبی کا انتقال ہوتا تو دوسرا نبی اُن کی
خلفہ آخر لا نبی بعدی — جگہ پر آجاتا۔ اب آگاہ ہوجاؤ کہ میرے بعد کوئی
(کذا مروی فی الصحاح) — نبی نہیں آئیگا۔

پھر آپ کی نبوت کی طرح آپ کا دین بھی ناسخ ادیان ہے تمام ادیان آپ کے دین اسلام کے بعد ختم ومنسوخ کردیئے گئے اور اب قیامت تک صرف یہی دین محمدی یعنی دین اسلام رہے گا اس میں کوئی جن یا کوئی انسان یا شیطان اس کے مسخ کرنے پر کبھی قادر نہیں ہوسکتا اور اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا خود ذمہ لے لیا ہے کیونکہ اصالۃً دین کا یہی سرچشمہ ہے چنانچہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ — بیشک ہم نے ہی قرآن پاک نازل کیا
لحافظون الآیۃ — ہے اور ہم ہی اسکے محافظ ہیں

اور اس کی حفاظت کے جتنے سامان ہوسکتے تھے سب ہر طرح سے مکمل کردیئے گئے ہیں مثلاً اس دین اسلام کے نزول سے قبل شیاطین آسمان دنیا پر جاکر بہت سی غیب کی باتیں سن لیتے تھے اور پھر ان باتوں کے ذریعہ دین میں خرابی وگڑبڑی پیدا کردیتے تھے مگر جب یہ دین اسلام آیا تو ان شیاطین کا آسمان دنیا پر جانا اور باتیں اچک لانا سب روک دیا گیا جیسا کہ ان آیات کریمہ سے بھی معلوم ہوتا ہے

انا لمسنا السماء فوجدنہا — اور ہم نے آسمانوں کو ٹٹول دیکھا تو مضبوط
ملئت حرسا شدیدا وشہبا — نگہبانوں اور شہابوں (انگاروں) سے

وانا کنا نقعد منها مقاعد للسمع فمن یستمع الآن یجد له شهابا رصدا وانا لا ندری اشر ارید بمن فی الارض ام اراد بهم ربهم رشدا (پ ۲۹ س جن ع)	بھرا ہوا پایا۔ اور ہم تو پہلے آسمانوں کے ٹھکانوں میں سننے کیلئے بیٹھا کرتے تھے پھر اب جو کوئی سننے کا قصد کرتا ہے تو اپنے لئے تارا (انگارا) تاک لگائے پاتا ہے اور ہم نہیں سمجھ پاتے کہ اُس زمین والوں کے لئے برائی مقصود ہے یا اُن کے رب نے اور انکے ساتھ کوئی بہتری کرنا چاہتا ہے۔

٭ ٭ ٭

اسی طرح جس ذات مبارک پر یہ دین نازل ہوا اس ذات مقدس کو بھی شیطانی تصرفات وتلبیسات سے محفوظ کر دیا گیا اور وہ ذات مقدس جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہے چنانچہ جس طرح آپ کو اللہ نے معصوم بنایا اسی طرح شیاطین کو آپ کی صورت بنانے اور آپ کا تمثل کرنے اور آپ کی نقل اتارنے سے یکسر روک دیا ہے اور اس کو قطعاً یہ طاقت نہیں دی کہ آپ کا تمثل کسی کے سامنے خواب میں یا بیداری میں کسی حال میں بھی کر سکے چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا۔

من رآنی فی المنام فقد رأی الحق (بخاری ومسلم)	جس نے (خواب میں) مجھے دیکھا اس نے سچ ہی دیکھا۔ (بخاری ومسلم)

اور ایک موقع پر ارشاد فرمایا گیا۔

من رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطان لا یتمثل فی صورتی وفی روایۃ لا یتمثل بی۔ (بخاری مسلم مشکوٰۃ کتاب الرؤیا)	جس نے خواب میں مجھے دیکھا تو اس نے بیشک مجھے ہی دیکھا اس لئے کہ شیطان میری صورت میں نہیں ظاہر ہو سکتا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ شیطان میری صورت نہیں بنا سکتا۔ (بخاری)

یہ سب کیوں ہوا اسی لئے ہوا کہ دین اسلام قیامت تک کیلئے شیاطین کے تلبیس و دست برد سے محفوظ رہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی غیر نبی کا اپنے کو نبی آخر الزماں کی جگہ لانا یا دکھلانا یا بتلانا سب قطعاً حرام وناجائز ہے اگر کوئی شخص ایسا اقدام کرے گا تو اسی لعنت وپھٹکار میں مبتلا ہوگا جس لعنت وپھٹکار میں شیاطین مبتلا رہے اور اس فلم (شریط محمد) میں غیر نبی کا اپنے کو نبی آخر الزماں کی جگہ لانا یا بتلانا یا دکھلانا لازم ہے لہٰذا اس فلم کی کسی طرح اجازت نہیں دی جائے گی بلکہ اس فلم کو قطعاً حرام وناجائز ہی کہا جائے گا اگر اس کے باوجود کوئی شخص اس کے بنانے کی جرأت کرے گا وہ اسی لعنت وپھٹکار میں مبتلا ہو کر خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہوگا۔ اسی طرح لا تعاونوا علی الاثم والعدوان کے حکم کے مطابق اس کے معاون ومددگار بھی ہر ایک الدال علی الخیر کفاعلہ کے مطابق اسی لعنت وپھٹکار کا مستحق ہوگا بلکہ اس کے بن جانے کے بعد جتنے لوگ اس کو چلانے میں، دیکھنے میں یا کسی طرح شریک ہو کر مبتلا معصیت ہوں گے ان سب کے برابر بنانے والوں کو حسب

حدیث من سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا ووزر من عمل بہا الحدیث	جو شخص کوئی غلط چیز رائج کریگا اسپر خود اُسکا اپنا گناہ تو ہوگا ہی اُن لوگوں کے گناہ کے برابر مزید گناہ بھی اس کو ہوگا جو اسی غلط چیز پر چلیں گے۔

عذاب اور گناہ ہوگا۔

حرمت کی پانچویں وجہ

اسی آیت کریمہ "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" کے اندر بتلائی ہوئی حفاظت کی تکمیل کے پیش نظر اور اس دین اسلام کی حفاظت کے پیش نظر جناب نبی آخر الزماں کو تمام کمالات نبوت ورسالت میں یکتائی ویکتی عطا فرمانے کے ساتھ ساتھ تمام صفات بشریت میں بھی اور تمام اخلاق وعادات وانسانیت میں بھی غرض تمام خصائل وملکات میں خواہ ظاہری ہوں یا باطنی ہوں سب میں سب سے اعلیٰ وبرتر اور نمایاں مقام اور نمایاں مرتبہ دیا گیا ہے اور اسپر بہت سے نصوص شاہد عدل ہیں ان میں سے بعض پہلے مذکور ہو چکیں اور بعض یہ ہیں مثلاً آیت کریمہ انک لعلی خلق عظیم پ ۲۹ س ن اور مثلاً حدیث صحیح وکان خلقہ القرآن اور خود فرمان رسول علیہ السلام انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق وغیرہ ذلک تاکہ آپ کی ذات گرامی سب سے نمایاں وممتاز رہے اور کوئی شخص قیامت تک اور کسی زمانہ میں بھی آپ کی نقل اتار کر یا تحدی کرکے دین حنیف (اسلام) میں غلط تلبیس نہ کر سکے اور دین میں غلط تلبیس کرنا یا اس کا ذریعہ بننا ہر ایک کا حرام قطعی ہونا ظاہر ہے اس لئے نقل اتارنا اور آپ کی نقل کا پلے دنے کی کوشش کرنا قطعی حرام وناجائز ہوگا۔

حرمت کی چھٹی وجہ

اس فلم (شریط محمد) میں اگرچہ تصویریں ظاہر نہ ہوں اور صرف آواز سنائی دے مگر نقل اتارنے میں تو اپنے کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم تصور کریگا اور بتلائیگا کہ میں نبی آخر الزماں ہوں اور دیکھنے والوں کے دماغ میں اتارنے کی کوشش کریگا کہ واقعی میں نبی آخر الزماں ہوں یا کم از کم یہ ثابت کرنے کی کوشش

کہے گا کہ نبی آخرالزماں بالکل ایسے ہی تھے میں ان کی ٹوکاپی ہوں کیونکہ اس کے بغیر نقل مکمل نہ ہوگی اور نہ مقصد ہی حاصل ہوگا اور کسی شخص کا اپنے کو نبی فرض کرنا اور اپنے کو نبی تبلانا کفر ہے بالخصوص جناب نبی آخرالزماں ؐ کے بارے میں یہ ظاہر کرنا اور تبلانا کہ میں وہی ہوں کیسا کچھ کفر ہوگا اور کتنی بڑی گستاخی ہوگی ظاہر ہے اور ساتھ ہی ساتھ تلبیس وخداع بھی ہے اور دربارِ رسالت کی توہین بھی ہے اور ان سب باتوں کا بھی کفر ہونا ظاہر ہے اسی طرح اس فلم میں کوئی اپنے کو حضرت صدیق رضؓ یا کوئی اور صحابی فرض کرے گا اور مخاطب کے ذہن میں ڈالنے کی کوشش کرے گا کہ میں واقعی وہی ہوں یا وہ صحابی بالکل ایسے ہی تھے حالانکہ وہ شخص نہ تو حضرت صدیق ہوگا اور نہ کوئی اور صحابی ہوگا اور نہ ان جیسا ہوگا بلکہ اس کا مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں ہوگا۔ پھر خیال کرنے کی بات ہے کہ یہ بھی کتنی قبیح درجہ کی تلبیس ہوگی اور کس درجہ کا خداع وکذب ہوگا اور اس سے ان حضرات مقدسین ومحترمین کی کس قدر توہین ہوگی کھلی ہوئی بات ہے کہ مسلمانوں کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ ایسی فلموں کی حمایت واعانت کریں اور اگر خدانخواستہ مسلمان ایسی فلموں کے بنانے میں حصہ لیں پھر خطرہ ہے کہ کہیں قہر آسمانی میں مبتلا ہونے کا سبب نہ بن جائے اس لئے کہ سابقہ کے گمراہ ہونے اور فنا ہونے کے راستے اور دروازے اس قسم کے تھے اور چونکہ یہ امت امتِ محمدیہ ہے اور آخرالامم ہے اس کے قیامت تک قائم وموجود رہنے کی شہادتیں نصوص میں موجود ہیں۔ مثلاً فی الحدیث

لا تقوم الساعة حتی یقال علی الارض اللہ اللہ او کما قال،

قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک زمین پر اللہ اللہ کہا جائیگا۔

اور مثلاً :-

لا تزال طائفة من امتی قائمین علی الحق لا یضرھم من خذلھم ولا من خالفھم۔ (او کما قال)

(آپ نے فرمایا) میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی رہے گی جو حق پر قائم رہے گی اور اسکو وہ لوگ جو مخالفت کریں گے یا نقصان پہنچانا چاہیں گے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔

اور ظاہر ہے کہ جب لوگ عام طور سے اس فلم میں مبتلا ہو جائیں گے اور روکنے کے باوجود نہ رکیں گے اور امت میں بگاڑ شروع کر دیں گے اور روکنا استطاعت سے باہر ہو جائے گا یا عام مسلمان اس کے روکنے پر متوجہ نہیں ہوں گے تو قدرت بتقاضائے آیت کریمہ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" خود متوجہ ہوگی اور اس کے روکنے کے انتظام خود کرے گی پھر بہت ممکن ہے کہ ایسے وبال میں مبتلا کر دے کہ لوگ ڈر جائیں اور پھر اس کی جرأت نہ کر سکیں یا پھر سخت گرفت میں آجائیں جو عذابِ عام کی شکل میں ہو جائے جیساکہ ان احادیث صحیحہ کے اشاروں سے اندازہ ہوتا ہے۔

عن ابی بکر الصدیق قال سمعت رسول اللہ یقول ان الناس اذا رأوا منکراً فلم یغیروہ یوشک ان یعمھم اللہ بعقابہ او کما قال علیہ السلام

حضرت صدیق ؓ سے مروی ہے، فرمایا کہ میں نے خود سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جب لوگ کوئی منکر بات دیکھیں گے اور (قدرت رکھتے ہوئے) اس کو نہ مٹائیں گے تو قوی خطرہ ہے اللہ تعالیٰ اس جرم کی پاداش میں ان پر کوئی عذاب بھیجدے۔

⁘ ⁘ ⁘

(۲) عن جریر ابن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ یقول ما من رجل یکون فی قوم یعمل فیھم بالمعاصی یقدرون علی ان یغیروا علیہ ولا یغیرون الا اصابھم اللہ منہ بعقاب قبل ان یموتوا (او کما قال) (ابن ماجة وابو داؤد وغیرھما من الصحاح)

حضرت جریر بن عبد اللہ رضؓ سے مروی ہے فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب بھی کوئی آدمی کسی قوم کے اندر معاصی ومنکرات (برملا) کرتا ہو اور لوگ اسکے روکنے پر قدرت رکھتے ہوئے نہ روکتے ہوں تو (بلاشبہ) اللہ تعالیٰ ان کی پاداش میں اُن پر اُن کے مرنے سے قبل کوئی عام عذاب وعام سزا نازل کر دیگا۔

⁘ ⁘ ⁘

غرض ان تمام وجوہ سے اس فلم کا بنانا دیکھنا یا اس میں کسی قسم کی اعانت کرنا ہی حرام وناجائز نہ ہوگا بلکہ حسب قدرت وطاقت عالم اسلامی کے تمام مسلمانوں پر عموماً اور عالم اسلام کی تمام حکومتوں پر خصوصاً اس کے روکنے اور بند کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس میں کوتاہی پر خطرناک قسم کے ابتلا میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہے

حرمت کی ساتویں وجہ

یہ ساری گفتگو اس تقدیر پر تھی کہ نقل اتارنے والے حالات وواقعات کی صحیح ترجمانی کی کوشش کریں اور اس میں کسی قسم کا تغیر وتبدیل نہ کریں لیکن اگر کچھ بھی تغیر وتبدیل کر دیں مثلاً کسی غزوہ کا نقشہ کھینچنے میں آپ کی طرف یا صحابہ کی طرف کسی غلط چیز کو منسوب کر دیں یا ان کا لباس ہی غیر شرعی یا مغربی دکھلائیں یا جیسا ان کا لباس تھا ویسا نہ دکھلائیں

یا جیسا ان کا لباس تھا ویسا نہ دکھلائیں یا جیسی ان کی وضع قطع تھی ویسی نہ دکھلائیں یا مثلاً ازواجِ مطہرات کو یا صحابیات کو بے پردہ دکھلائیں یا ان کا لباس غیر شرعی یا مغربی دکھلائیں تو یہ سب چیزیں ان پر افترا ہوں گی اور ان کی طرف کذب کی نسبت ہو گی جو اور وجوہ حرمت سے قطع نظر خود مستقل حرمت و عدم جواز کی وجہ ہو گی اور اس کو ناجائز وحرام کہا جائے گا اور صحیح حدیث من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار کے فرمان کے مطابق جہنم اور عذاب کے مستحق ہونگے اور اس تغیر و تبدل کا وقوع اغلب اور قرین قیاس ہے بالخصوص جبکہ اس فلم کو ایسے لوگ تیار کر رہے ہیں جنکی اسلام کے ساتھ دشمنی ظاہر و باہر ہے اور قرآن جن کے بارے میں یوں ارشاد فرماتا ہے :-

(۱) ولتجدن اشد الناس عداوۃً للذین اٰمنوا الیھود والذین اشرکوا پ۶ ع ۲ س مائدہ

بیشک آپ تمام لوگوں میں زیادہ عداوت کرنیوالا مسلمانوں کے ساتھ یہود کو پائیں گے اور ان لوگوں کو پائیں گے جنھوں نے شرک کیا۔

(۲) وکیف وان یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم الاً ولا ذمۃ پ۱۰ ع ۸ س توبہ

کیسے (انکا عہد قابل رعایت رہے گا) حالانکہ انکی حالت یہ ہے کہ اگر وہ تم پر کہیں غلبہ پا جائیں تو تمہارے بارے میں نہ قرابت پاس کرینگے اور نہ قول و قرار کا۔

⁂ ⁂ ⁂

یہ فلم ایسے لوگوں کے اشاروں اور تعاون سے تیار کیجا رہی ہے جن کی دلی تمنا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کے تمام مسلمان کفر و شرک کی راہیں اپنالیں۔ قرآن ایسے لوگوں کے بارے میں کہتا ہے :-

ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواءً فلا تتخذوا منھم اولیاء۔ الاٰیۃ پ۵ ع۹ س ن

اور ان کی خواہش (تو) یہ ہے کہ تم بھی کفر کرو جس طرح انہوں نے کفر کیا اور پھر ہو جاؤ تم سب برابر لہٰذا تم ان میں سے کسی کو دلی دوست نہ بناؤ۔

یا مثلاً :-

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا بطانۃً من دونکم لا یالونکم خبالاً ودوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر قد بینا لکم الاٰیات ان کنتم تعقلون ھاانتم اولاء تحبونھم ولا یحبونکم (پ۴ ع س نساء)

اے ایمان والو نہ بناؤ رازدار اپنے غیر کو وہ لوگ کچھ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں وہ تو چاہتے ہیں کہ تم تکلیف اٹھاؤ۔ ظاہر ہوئی پڑتی ہے دشمنی ان کے ... سے اور وہ دشمنی جو چھپی ہوتی ہے انکے دلوں میں وہ اس سے زیادہ ہے، بیشک ہم نے تمکو بتا دیں پتے کی باتیں اگر تم عقل رکھتے ہو آگاہ ہو جاؤ تم لوگ تو تم لوگ تو ان سے محبت کروگے اور وہ لوگ تم سے محبت نہ کریں گے۔

⁂ ⁂ ⁂

حُرمت کی آٹھویں وجہ

اس فلم میں اگرچہ سرکارِ دوعالم کی تصویر نہ ہو لیکن اگر کسی صحابی کی بلکہ کسی بھی ذی روح کی تصویر جس میں چہرہ و سر ظاہر ہو یا کسی بھی ایسے غیر ذی روح کی تصویر ہو جس کی پرستش کی جاتی ہو یا اس کو غیر اللہ کی عبادت و پرستش کا ذریعہ بنایا یا سمجھا جاتا ہو یا اس کا غلبۂ ظن ہو تو تمام دلائل سے قطع نظر محض اس ایک وجہ سے بھی یہ فلم بنوانا بنانا دیکھنا، دکھانا اور اس میں کسی قسم کی امداد و اعانت کرنا کرانا سب قطعاً ناجائز و حرام ہو گا۔ پھر یہ تصویریں خواہ مجسمہ کی شکل میں ہوں یا غیر مجسم ہوں ظلی یا عکسی نصوص میں اسقدر سخت وعیدیں وارد ہیں کہ ان سب کا حاصل یہی ہے جو ابھی بیان کیا گیا یہاں بطور مثال صرف دو چار روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔ مثلاً

(۱) عن عائشۃ قالت انہ قدم رسول اللہ من سفر وقد سترت لی بقرام فیہ تماثیل فلما راٰہ رسول اللہ تلون وجھہ وقال یا عائشۃ اشد الناس عذاباً عند اللہ یوم القیامۃ الذین یضاھون بخلق اللہ قالت فقطعناہ فجعلناہ وسادۃ او وسادتین وفی روایۃ فتلون وجھہ ثم تناولہ فھتکہ (بخاری شریف) (وفی مسلم ترہیب منہ ۱)

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے فرمایا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایک سفر سے واپس تشریف لائے اور میں نے اپنے ایک طاقچہ پر ایک ایسا پردہ ڈال رکھا تھا جس میں جاندار کی تصویریں بنی ہوئی تھیں جب آپ نے اسکو دیکھا تو آپ کا چہرۂ انور (غصہ سے) متغیر ہو گیا اور فرمایا کہ اے عائشہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب بھگتنے والے وہ لوگ ہونگے جو اللہ کے فعل خلق کے ساتھ مشابہت کرینگے تو حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ہم نے اس پردہ کو چاک کر ڈالا اور اسکی دو ایک تکیے بنا ڈالا جو گھر میں پڑی رہا کرتی تھی، اور ایک روایت میں اسکی تصریح ہے کہ جب آپکا چہرۂ انور متغیر ہوا تو خود اس پردہ کو لیکر چاک کر ڈالا۔

⁂ ⁂ ⁂

⁂ ⁂ ⁂

(۲) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ اتانی جبرئیل فقال لی اتیتک البارحۃ

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے اور فرمایا کہ میں رات بھی آیا تھا مگر گھر

فلم ینبغی ان اکون دخلت الا انہ کان علی الباب تماثیل وکان فی البیت خمر فیہ تماثیل فمر برأس التماثیل یقطع فیصیر کھیئۃ الشجرۃ ومر بالستر فلیقطع فیجعل منہ وسادتین منبوذتین۔ (ابوداؤد، ترمذی و نسائی بحذف یسیر)

میں داخل ہونے سے صرف یہ چیز مانع ہوئی کہ دروازہ پر (جاندار کی) تصویر بھی اور حجرہ میں ایک کتا تھا۔ لہٰذا آپ تصویر کا سر کاٹ دینے کا حکم دیجئے تاکہ درخت اور گلدستہ جیسی شکل و ہیئت کا ہو جائے اور پردہ پر سے بھی سر کا حصہ کاٹ دیجئے پھر اُس سے (بیڑوں میں) پڑی رہنے والی تکیہ بنوا لیجئے۔

✤ ✤ ✤

(۳) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ الصورۃ الرأس فکل شیٔ لیس لہ رأس فلیس بصورۃ۔ (معانی الآثار ص ۳۶۶ ج ۲)

اور انہی حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ تصویر تو محض سر کی وجہ سے تصویر ہوتی ہے (اور حرمت کا حکم اخذ کرتی ہے) اگر سر نہ ہو تو (یہ حرم) تصویر بھی نہ ہو (معانی الآثار)

(۴) وھکذا فی کنز العمال ص ۴۰ ج ۸

اور اسی طرح کنز العمال میں بھی حدیثیں ہیں۔

(۵) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یترک فی بیتہ شیئاً فیہ تصلیب الا نقضہ۔ (ابوداؤد و نسائی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے اندر کبھی کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑتے تھے جس میں صلیب کی صورت ہو۔ مگر اسکو توڑ ہی ڈالتے تھے اور خراب ہی کر ڈالتے تھے۔ (ابوداؤد شریف)

(۶) واما ما عبد من دون اللہ ولو کان من الجمادات او کالشمس والقمر فینبغی ان یحرم تصویرہ (مرقات ج ۴ ص ۴۸۵)

بہرحال ہر وہ چیز جسکی پوجا کی جاتی ہو خواہ وہ جمادات کی قسم کی ہو یا مثل شمس و قمر کے ہو (تو یہی واجب ہے کہ اسکو نہ بنایا جائے) بلکہ اس کی تصویر بنانا بھی حرام ہے۔

(۷) فان کل ما عظم بالباطل من مکان او زمان او حجر او شجر او بنیۃ یجب قصد اھانتہ کما تھان الاوثان المعبودۃ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲ ص ۵۶)

بیشک ہر وہ چیز جسکو باطل و غلط طریقے سے معظم و مکرم سمجھا جاتا ہو وہ چیز خواہ مکان قسم کی ہو یا زمان کے قسم کی ہو یا پتھر یا درخت کے قبیل سے ہو یا مکان کے قبیل سے ہو اسکی اہانت کا قصد رکھنا اسی طرح واجب ہے جس طرح اوثان معبودہ کا واجب ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲ ص ۵۶)

✤ ✤ ✤

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اگر کوئی یہ کہے کہ وعید و حرمت کے جو نصوص وارد ہیں وہ مجسمہ کے یا دستی تصویروں کے بارے میں وارد ہیں یا ان تصویروں کے بارے میں وارد ہیں جن کی پرستش کی جاتی ہے یا جن کی پرستش کا ظن غالب تھا اور اب ایسا نہیں ہے اس لئے یہ وعیدیں آجکل کی تصویروں کے بارے میں شمار نہ ہوں گی تو یہ شبہ بالکل غلط اور دھوکا ہے اسلئے در پردہ یہ جو تصویریں تھیں ان پر بھی وعیدیں صحیح بخاری میں وارد ہیں اور وہ یقیناً مجسمہ نہیں تھیں اور ان کا دستی ہونا بھی لازم نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت تصویر کی یہی دو شکلیں (مجسمہ یا دستی) عموماً رائج و موجود تھیں اس لئے وعید و حرمت کی حدیثوں میں مصداق کی اس وقت یہی دو صورتیں عموماً ملتی ہیں ورنہ حرمت و وعید کی جو نصوص احقر نے ابھی اوپر نقل کی ہیں ان میں بھی حرمت و وعید مطلق ہیں ہر نوع، ہر فرد کو شامل ہیں اور مطلق اپنے اطلاق پر جاری رہتا ہی ہے اگر کچھ استثنا ملتا ہے تو صرف اسقدر ملتا ہے کہ ذی روح کی تصویریں جنکی عبادت نہیں کی جاتی ہے اور جن کو ذریعہ عبادت نہیں سمجھا جاتا اور نہ ان کے عبادت و تعظیم کا ظن غالب ہوتا ہے بس یہ مستثنیٰ ملتی ہیں باقی سب کو حرمت و وعید کی نصوص شامل و حاوی ہیں رہ گئی یہ علت کہ چونکہ ان تصویروں کی پرستش و پوجا ہوتی تھی الخ ما قال، تو اول تو یہ تسلیم نہیں کہ ان کی حرمت کی محض یہی وجہ تھیں اس لئے کہ تشبہ بعبدۃ الاوثان بھی حکم حرمت کی وجہ ہو سکتی ہے اور اگر تسلیم بھی کر لیں تو یہ علت آج بھی بحالہا و تمامہا موجود ہے کہ تصویریں خواہ مجسمہ و ہیکل ہوں یا غیر مجسمہ (دستی ہوں یا مشینی عکسی ہوں یا ظلی)، ہر حالت میں بعض قومیں ان سب کی پرستش و پوجا کھلم کھلا اسی طرح کرتی ہیں جس طرح قدیم زمانہ میں ہیکلوں اور مجسموں کی کرتی تھیں۔ اگر اس کا مشاہدہ کرنا ہو تو ہندوستان کے غیر مسلم برادران وطن کے عبادت خانوں دوکانوں بلکہ گھروں میں بھی اُن کے عبادات کے اوقات میں بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بعض مسلم برادران وطن کے یہاں بھی اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جیسے بہت سے اہل عزاء و اہل قبور و اہل بدعت ہیں کہ ان کے عزاء خانوں میں امام باڑوں میں مرثیہ گاہوں میں علماء و مشائخ اور بزرگوں کے مزاروں میں درگاہوں میں بلکہ ان کے گھروں میں بھی بے تکلف اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے بہت سے لوگ عموماً حضرت علی و حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم کی فرضی تصویروں کے سامنے بہت سے لوگ اپنے پیروں اور

معتقد فیہ بزرگوں کی تصویروں کے سامنے رکوع وسجدہ تک کرتے نظر آتے ہیں اُن سے مرادیں تک مانگتے ہیں ان کو حاجت روا اور مشکل کشا تک تسلیم کرتے ہیں لہٰذا اس علت کی بنیاد پر بھی اگر کسی ذی روح کی کوئی تصویر مع چہرہ وسر کے اس فلم میں موجود ہو بلکہ کسی ایسے غیر ذی روح کی کوئی تصویر ظاہر ہو جسکی عبادت کسی فرقہ یا کسی قوم یا ملک میں کی جاتی ہو یا اس کو غیر اللہ کی عبادت کا ذریعہ بنایا یا سمجھا جاتا ہو یا اس کا اندیشہ غالب ہو تو ہر حال میں یہ فلم بنانا یا بنوانا دیکھنا دکھانا بلکہ کسی قسم کی اعانت یا امداد کرنا سب قطعاً حرام و ناجائز ہوگا یہ وجہ اس فلم کے حرمت وعدم جواز کی آٹھویں وجہ اور مستقل وجہ ہوئی اسی طرح اور بہت سی وجوہ اس فلم کی حرمت کی ہیں جن کو طوالت کے خطرہ سے چھوڑ دیا گیا ہے اور جو بیان کی گئی ہیں ان میں بہت سے مقامات میں محض اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔ تطویل کے خطرہ سے تفصیل نہیں کی گئی ہے۔

خلاصۂ کلام

غرض یہ کہ ان سب وجوہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ـــــ

ـــــ اس فلم کا بنانا، بنوانا، دیکھنا، دکھانا اس میں کسی قسم کی اعانت یا امداد کرنا، کرانا سب قطعاً حرام و ناجائز ہے اور یہی نہیں بلکہ تمام عالم کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ناموسِ رسالت کی حفاظت پوری طرح کریں اور وقت کا فریضہ ہے کہ اس فلم کے بند کرانے اور رکوانے میں اپنی طاقت و استطاعت کے مطابق بھرپور کوشش کریں اور مناسب طریقے سے اور حسنِ تدبیر کے ساتھ پوری سعی کریں۔ مثلاً ہندوستان کے مسلمان اپنی حکومت سے درخواست کریں کہ وہ قانوناً وعملاً اس فلم کو پورے بھارت میں جاری نہ ہونے دے اگر مسلمانوں نے کوتاہی کی تو عجب نہیں کہ اس کا وبال کسی عام عذاب کی شکل میں نمودار ہو جائے کما جاء فی الحدیث۔

ان الناس اذا راوا منکرا	بیشک لوگ منکر معصیت دیکھیں گے
فلم یغیروہ یوشک ان یعمھم	(اور قدرت رہتے ہوئے) اسکی اصلاح کی
اللہ بعقابہ او کما قال	کوشش نہ کریں گے تو قوی خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ
علیہ السلام وایضاً قال	اس کوتاہی کی پاداش میں ان پر عقاب نہ بھیجے
مامن رجل یکون فی قوم یعمل	اگر ایک آدمی بھی کسی قوم میں (برملا) کوئی
فیھم بالمعاصی یقدرون	معصیت کا فعل کریگا، اور وہ اس کے
علی ان یغیروا علیہ و لا	درست کرنے اور روکنے پر قادر ہوتے
یغیروا الا اصابھم اللہ	ہوئے نہ روکے گی تو اللہ تعالیٰ اس کوتاہی
منہ بعقاب قبل ان یموتوا	کی پاداش میں ان کے مرنے سے قبل ہی
(ابن ماجہ، ابوداؤد وغیرھما)	عذاب عام نازل کردیگا۔ (ابن ماجہ وغیرہ)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم و الیہ انیب وھو یھدی الی سبیل الحق والرشاد

(بقیہ مراسلہ از صفحہ ۴۷)

ایک بھی چلّہ نہیں دیا لیکن وہ متقی و پرہیزگار قسم کا آدمی ہے اور اس نے ایک طویل مدت تک کسی اور جماعت کے پلیٹ فارم سے اسلام کی اچھی خاصی خدمت بھی کی ہے تو تبلیغی جماعت والے ایسے شخص سے نہ متأثر ہوں گے اور نہ اسے محبت وعقیدت کی نگاہوں سے دیکھیں گے کیا آپ نہیں جانتے کہ غیر ممالک میں جب جماعتیں روانہ کی جاتی ہیں تو اس وقت صرف ان لوگوں کو امیر کارواں بنایا جاتا ہے جنھوں نے درجن بھر چلّے دے رکھے ہوں۔ بڑے سے بڑے متقی بڑے سے بڑے عالم اور بڑے سے بڑے باصلاحیت آدمی کو محض اس بنا پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں کوئی چلّہ درج نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تبلیغی جماعت والے اپنے طریقہ کو سنت اور عمل سے واجب قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک وہی شخص خادم اسلام کہلانے کا مستحق ہوتا ہے جس نے زندگی کا ایک طویل حصہ چلّوں اور گشتوں کے نذر کر دیا ہو۔ اگر ان کے نزدیک مروجہ طریقہ صرف مباح کی حیثیت رکھتا ہے تو پھر یہ تشدّد اور یہ زور را زوری چہ معنی دارد؟

(ج) ہمیں توقع نہیں تھی کہ مولانا زکریا جیسے باصلاحیت عالم کے قلم سے ایسی گھٹیا مثالیں بھی نکل سکتی ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ ان مثالوں سے مرعوب ہو گئے اور آپ نے انھیں جوں کا توں نقل کر ڈالا۔ کیا آپ کے شہر میں کوئی ایسا مدرسہ ہے جس کے مہتمم یا جس اساتذہ و طلبار نے اس بات کا دعویٰ کیا ہو کہ ہمارا انداز تعلیم مسنون ہے۔ منجملۂ سنت ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ جواب نفی میں ہوگا اثبات میں اس لئے نہیں ہو سکتا کہ کبھی کسی مدرسہ نے (بقیہ صفحہ ۵۶)

مولانا مودودی کی مجلس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا معمول ہے کہ وہ روزانہ نماز عصر کے بعد کچھ دیر تک عام ملاقات کے لئے باہر تشریف رکھتے ہیں۔ اس وقت ہر شخص مولانا سے بلا روک ٹوک مل سکتا ہے اور جو بات چاہے پوچھ سکتا ہے۔ دور دراز کے رہنے والے حضرات کو شاذ و نادر ہی مولانا کی اس مجلس سے مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے لہٰذا "آئین" نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ وہ باہر کے قارئین کے لئے اس مجلس کی ایک جھلک پیش کرتا رہے۔

ایک صاحب کا سوال تھا:

"مولانا! کیا آنکھیں بند کرکے بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے؟"

مولانا نے فرمایا:

"مسلمان کو آنکھیں کھول کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنی چاہیئے۔ نماز کے دوران میں آنکھیں اگر کچھ دیر کے لئے یونہی بند ہو جائیں تو الگ بات ہے۔ ورنہ خاص طور پر آنکھیں بند کرنا اور بند رکھنا صحیح نہیں ہے۔ استغراق یا انہماک کا مقصد آنکھیں بند کرلے سے نہیں حاصل کرنا چاہیئے بلکہ جو کچھ آپ پڑھ رہے ہوں اس کے ایک ایک لفظ پر اور ان الفاظ کے معانی پر توجہ دیں۔ اس سے نماز میں انہماک اور یکسوئی بھی پیدا ہوگی اور آنکھیں بھی کھلی رہیں گی۔ آنکھیں بند کرنے کا طریق عبادت دوسرے مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ دراصل ان مذاہب میں تو تعلیم ہی دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کرلینے کی دی جاتی ہے۔ جبکہ مسلمان کو اس دنیا میں آنکھیں کھول کر خدا کے راستے پر چلنے کا حکم دیا گیا ہے"۔

ایک صاحب کا سوال دلچسپ نوعیت کا تھا۔ انہوں نے کہا:

"مولانا! کیا دوزخ میں اتنی جگہ ہوگی کہ تمام بُرے لوگ اس میں سما جائیں؟"

مولانا نے فرمایا:-

"خدا کی جنت میں بھی نیک لوگوں کے لئے بڑی کشادہ جگہ ہے اور اس کی دوزخ میں بھی نافرمانوں کے لئے جگہ کی کمی نہیں۔ نافرمانی کرنے والے دوزخ کو اپنے لئے بہت وسیع پائیں گے"۔

انہی صاحب نے کہا:-

"مولانا مجھے ایک خیال بار بار آتا ہے کہ خدا نے انسان کا خمیر ہی ایسا کیوں نہ بنا دیا کہ بہت کم لوگ دوزخ میں جاسکتے"؟۔

مولانا نے فرمایا:-

"سب سے پہلے اس بات کو سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے کاموں میں "کیوں" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ دوسری بات آپ یہ سمجھیں کہ اس دنیا کے امتحان میں کامیاب ہونے کے سلسلے میں بنیادی مسئلہ "خیر" کا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بھلے بُرے میں تمیز اور نیکی بدی میں انتخاب کی جو آزادی دی ہے، اصل مسئلہ تمیز و انتخاب کی اس آزادی کے صحیح استعمال کا ہے۔ جو لوگ اس کا صحیح استعمال نہیں کرتے وہ تعداد میں چاہے کم ہوں یا زیادہ، اس کے نتائج انھیں بھگتنے ہوں گے۔"

ان صاحب نے کہا:-

"دنیا کو ایک آزمائش گاہ کے طور پر تو ذہن قبول کرتا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ امتحان ایسا کڑا کیوں رکھا گیا ہے؟"

مولانا نے فرمایا:-

"جس امتحان میں یہاں ڈپٹی کمشنری ملتی ہے وہ اتنا سخت ہوتا ہے، تو کیا جس امتحان میں خدا کی جنت ملتی ہو وہی آسان سا رکھدیا جاتا؟"

●

ایک طالب علم نے کہا:

"مولانا کیا اسلامی تحریک شروع کرنے کا خیال بچپن ہی سے آپ کے ذہن میں تھا؟"

مولانا نے فرمایا:-

"بچپن میں تو ایسا کوئی خیال نہیں آیا۔ البتہ جب ہوش سنبھالا اور دین کا مطالعہ کیا تو مطالعے کے ساتھ ساتھ تحریک کی ضرورت واضح ہوتی چلی گئی۔"

طالب علم نے کہا:-

"آج آپ کیا محسوس فرماتے ہیں کہ آپ نے جو توقعات وابستہ کی تھیں، کیا وہ پوری ہو سکیں؟ کیا تحریک اسلامی کا کام ان توقعات کے مطابق جاری رہا ہے؟"

مولانا نے فرمایا:-

"میں سمجھتا ہوں کہ معاملہ توقعات سے بڑھ کر رہا ہے کام کا آغاز کرتے ہوئے ہم جانتے تھے کہ ہم کن حالات میں اور کن لوگوں کے درمیان یہ کام کرنے چلے ہیں۔ مسلمانوں کے مختلف لیڈر انھیں جن راہوں پر ڈالتے رہے تھے انھیں جس قسم کی باتوں کا عادی بنایا گیا تھا اور جس قسم کے لوگوں کے چراغ اس قوم میں جلتے رہے ہیں وہ سب کچھ ہمارے علم میں تھا۔ لیکن ان ساری چیزوں کے باوجود میرا احساس یہ تھا کہ ابھی مسلمان قوم خیر سے خالی نہیں ہوئی ۔ بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ یہ خیال غلط نہیں تھا۔"

●

ایک نوجوان نے کہا:-

"مولانا کیا یہ چودھویں صدی آخری صدی ہے؟"

"مولانا نے فرمایا:

"اگر ایسا ہے تو پانچ ساڑھے پانچ سال باقی رہ گئے ہیں، معلوم ہو ہی جائے گا کہ یہ آخری صدی ہے یا نہیں"۔

مزید فرمایا:-

"خدا جانے یہ تصور لوگوں میں کہاں سے پیدا ہو گیا ہے قرآن و حدیث میں تو ایسی کوئی بات نہیں ملتی"۔

●

ایک نوجوان نے کہا:-

"تعلیمی اداروں میں تحریک اسلامی کا ساتھ دینے پر ہمیں جن مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں سے ایک بڑی تکلیف دہ مخالفت بعض صورتوں میں ماں باپ کی طرف سے سامنے آتی ہے۔ ہم اسے دین و ایمان کا ایک بنیادی تقاضا سمجھتے ہیں کہ جس چیز کو ہم حق سمجھتے ہیں اس کے لئے کام کریں اور اپنے ملک میں اسلام کی سربلندی کے لئے جد وجہد کریں الجھن یہ ہے کہ جس کام پر اگر کسی کے والدین اس پر سختی کریں تو اسے کیا کرنا چاہئے؟"

مولانا نے فرمایا:-

"آپ اپنے والدین کا پورا احترام کیجئے۔ ان کی خدمت میں کوئی کوتاہی یا کمی نہ ہونے دیں۔ وہ سختی کریں تو بڑے

سے بڑے ظلم پر بھی اُف تک نہ کیجئے۔ لیکن ان کی بدولت اپنے دین وایمان کو خطرے میں نہ پڑنے دیجئے۔ یہی اپنے والدین کے حق میں آپ کی حقیقی خیر خواہی کا تقاضا بھی ہے"۔

●

ایک مرحلے پر الفاظ کے صحیح اور غلط استعمال کی بات چلی مولانا نے اس ضمن میں فرمایا کہ انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی "بے وقت موت" UNTIMELY DEATH کا تصوّر پیدا ہوگیا ہے، حالانکہ ہمارا تو ایمان ہے کہ موت اپنے وقت پر آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو منظور نہ ہو تو کسی کا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا اس لئے ہمیں UNTIMELY DEATH قسم کی کوئی بات نہیں کہنی چاہئے۔ ان الفاظ کا غلط استعمال بنیادی عقائد تک پر اثرانداز ہو سکتا ہے

یہ گفتگو آگے بڑھی تو مولانا نے ایک اور چیز کی نشاندہی فرمائی۔ بعض لوگ اپنی بات چیت میں "قدرت کی ستم ظریفی" جیسے جملے لکھتے ہیں، مولانا نے اسے صحیح قرار نہیں دیا، کیونکہ یہ بواسطہ اللہ تعالیٰ کے کاموں پر اعتراض ہے، جو ایک مسلمان کا وطیرہ نہیں ہونا چاہئے

ایک سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ ہمیں ایسے الفاظ ہرگز استعمال نہیں کرنے چاہئیں یہ سخت گستاخی ہے

مولانا نے فرمایا:۔

" حدیث میں ہے کہ زمانے کو گالی مت دو"

انسان کو الفاظ کے استعمال میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ فی الحقیقت کارخانۂ قدرت میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس لئے ہم ایسی بات کیوں کہیں جیسے ہم یہ دعویٰ کر رہے ہوں کہ نظامِ قدرت کے بارے میں معاذ اللہ ہم خدا سے زیادہ ہی جانتے ہیں"

●

ایک صاحب نے کہا:۔

" مولانا صبر کی آخری حد کیا ہے؟"

مولانا نے خاموشی سے ان کی طرف دیکھا۔ انہوں نے جیسے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے پھر کہا:

" صبر کا یہ سوال اس جد وجہد کے طویل اور صبر آزما ہونے کی وجہ سے ذہن میں آتا ہے جو ہم کر رہے ہیں"۔

مولانا نے فرمایا:۔

" صبر کی کوئی حد نہیں۔ آپ اس وقت تک صبر کے ساتھ کام کرتے چلے جائیں جب تک آپ کا کام آپ سے اس کا مطالبہ کرتا ہے۔ صبر کرنے والوں نے تو نوسو سال نوسو سال تک صبر کیا ہے اور ہر حال میں اپنا کام جاری رکھا ہے۔ صبر بے عملی کا نام نہیں۔ صبر جد وجہد جاری رکھتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ بے عمل ہوکر بیٹھ رہنے کو صبر نہیں کہا جا سکتا۔ صبر تو عمل اور عقل کا تقاضا ہے"۔

(بقیہ مراسلہ از صفحہ ۵۳)

منتظم نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم جس طریقہ سے تعلیم کے سلسلہ کو جاری رکھے ہوئے ہیں یہ طریقہ انبیاء والا طریقہ ہے۔ اس دور کے کسی مجاہد نے توپ اور بندوق کی گولیوں سے لڑائی لڑتے ہوئے کبھی یہ احمقانہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم مسنون طریقہ پر جنگ لڑ رہے ہیں۔ اگر کسی بھی وقت کوئی ایسا مہمل دعویٰ کرے گا تو ہم اسکی تردید و تکذیب کرنے پر اسی طرح مجبور رہیں گے جس طرح ہم تبلیغی جماعت کے اس دعوے کو غلط اور کھلا ثابت کر چکے ہیں کہ بس ہمارا ہی طریقہ کار قابل قبول ہے۔ باقی دوسری جماعتیں سنت رسول سے ہٹ کر کام کر رہی ہیں۔

(د) کاش حیات الصحابہ سے واقعات نقل کرتے وقت آپ نے اس عنوان پر غور نہیں کیا جو واقعات کی پیشانی پر جمایا گیا ہے اور جسے آپ نے بھی نقل کیا ہے۔ یہ عنوان بجائے خود یہ ثابت کرتا ہے کہ ذکر تبلیغ کا نہیں تعلیم کا ہو رہا ہے اور تعلیم ہی کے ضمن میں واقعات نقل کئے ہیں، عنوان یہی تو ہے:

ارسال الصحابۃ الی البطون للتعلیم

دیکھ لیجئے یہ عنوان بالفاظ صریح کہہ رہا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو دوسرے قبائل میں تعلیم کے لئے بھیجا جاتا تھا تبلیغ کے لئے نہیں۔ اس عنوان کے تحت جتنے بھی واقعات نقل کئے گئے ہیں ان سے یہ بالکل ثابت نہیں ہوتا کہ تبلیغی جماعت کا طریقۂ کار سنت کا درجہ رکھتا ہے ــــ ان واقعات میں سے کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جسے دلیل بنا کر یہ کہا جاسکے کہ ہمارا طریقۂ کار انبیاء والا طریقۂ کار ہے۔ انبیاء اسی طرح گشت کیا کرتے تھے، اسی طرح چلے دیا کرتے تھے۔ اسی طرح تبلیغ کے سلسلہ میں اکراہ اور استکراہ کے مظاہرے کیا کرتے تھے ــ م

م گفتگو ابھی ناکافی ہے اس سلسلہ کی باقی گفتگو عامر عثمانی نمبر میں ملاحظہ فرمائیں

(بقیہ ماہرِ اسلام از صفحہ ۱۲) کی صحیح تعداد کیا ہو

ویسے اندازہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد دس فیصد سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ ہم بیس فیصد تصور کر لیتے ہیں۔ اگر واقعتاً ایسے لوگوں کی تعداد بیس فیصد ہو یا بیس اور تیس فیصد کے درمیان ہو تو تبلیغی جماعت کی تائید کرنے والے کثیر ہی ہوں گے اور برطرف ہو جانے والے قلیل تر قلیل۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر جماعت اسلامی کے نقش قدم پر چلنے میں پچاس فیصد لوگ بھی تبلیغی جماعت سے کنارا کش ہو جائیں تو بھی کوئی نقصان کی بات نہیں اسلام کی ادھوری خدمت میں پوری عمر کھپا دینا اور اس خواہش میں مبتلا رہنا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ہمارے پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں نسبتاً گھاٹے کا سودا ہے اس سے کہیں زیادہ بہتر اور مفید یہ ہے اسلام کی مکمل خدمت کرنے اور اسے بہر طور سرخرو کرنے کی جد و جہد کی جائے خواہ آپ کی آواز پر لبیک کہنے والوں کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہو۔

آپ اسی بات کو اگر دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تبلیغی جماعت کے لوگوں میں ملازمت قربان کر دینے کی ہمت نہیں ہے وہ کسی ایسی راہ پر چلنے کی جرأت و سکت نہیں رکھتے جس راہ پر چل کر کوئی زبردست نقصان اٹھانا یقینی ہو یا جس راہ پر چل کر پیروں کا لہولہان ہو جانا ضروری سی بات ہو۔

وہ امن و امان کے راستوں سے گزر کر خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ وقت کے جابروں سے ٹکرانے کی ان میں ہمت پہلے تھی اور نہ اب ہے۔ وہ کسی ایسی روش کو اختیار نہیں کر سکتے جس کو اختیار کرنے کے بعد بیڑیاں، قید خانے اور دار و رسن کی سختیاں انسان کا مقدر بن جاتی ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں تبلیغی نصاب ہے اور ایک ہاتھ میں ملفوظات الیاسؒ۔ کاش کہ ان کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوتا اور ایک ہاتھ میں تلوار۔ کاش کہ ان کا ایک قدم مسجد میں ہوتا

کاش کہ وہ اس راستے پر ... کرام رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی بشارتِ عظمیٰ حاصل کی تھی تبلیغی جماعت سے ہرگز ہرگز اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ خطرناک اور خار دار راستوں پر آنے کی جرأت بھی کر سکے گی۔ یوں خلافِ توقع بھی دنیا میں ہزاروں واقعات ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ اگر کسی بھی وقت تبلیغی جماعت کے مزاج میں تبدیلی پیدا ہو گئی اور اس راہوں پر چلی آئی جہاں قربانیاں پہلے دینی پڑتی ہیں مقصد بعد میں حاصل ہوتا ہے تو ہم دل کی گہرائی سے خدا کا شکر بجا لائیں گے کہ ہماری تبلیغی جماعت اس راستہ پر گامزن ہو گئی جس راستہ پر چل کر بعض صحابہ زندگی ہی میں جنت کے مستحق قرار دیئے گئے تھے۔

نمبر ۳ کے آخیر میں آپ نے بہت زیادہ غیر انصافی سے کام لیا ہے۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس قسم کا کُل انقلاب جماعت اسلامی لانا چاہتی ہے اس کے لئے تبلیغی جماعت مددگار ثابت نہیں ہو سکتی جس کی بنا پر عام طور پر جماعت اسلامی کے حامی تبلیغی جماعت کی خامیاں چننے کے لئے ڈٹ جاتے ہیں۔

محترم آپ کا تجزیہ انصاف اور دیانت پر مبنی نہیں ہے۔ انصاف اور دیانت کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ اس بات کا اعتراف کر لیں کہ مخالفت ہمیشہ تبلیغی جماعت والوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ ڈھیلے ہمیشہ تبلیغی جماعت والے اچھالتے ہیں۔ کم از کم ہر جھگڑے میں پہل تو تبلیغی جماعت ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ جتنا تشدد، جذبۂ عداوت اور بغض تبلیغی جماعت کے بعض فرشتوں میں پائی جاتی ہے اتنی تو جماعت اسلامی کے بعض شیطانوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ زیادہ دور کیوں جایا جائے۔ حال ہی پر نظر ڈال لیجئے مولانا زکریا صاحب کی فتنۂ مودودیت کی صورت میں شیش محل میں بیٹھ کر جو تیر چلایا ہے وہ خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ (بقیہ بر صفحہ ...)

کیفِ تغزّل

جناب کیفؔ نوگانوی

ہر جلوے کو آنکھوں میں بسائے رکھئے — ان کی ہر بات کو سینے میں سجائے رکھئے
و نہ سہی ایک بھی قطرہ لیکن — جام پھر جام ہے ہونٹوں سے لگائے رکھئے
و نالۂ و فریاد پہ پابندی ہے — قفلِ خاموشی کے ہونٹوں پہ چڑھائے رکھئے
ہے مٹا دیجئے ماضی کے نقوش — عشق کہتا ہے کلیجے سے لگائے رکھئے
رف آئے گا پھر قافلۂ اہلِ وفا — دیدۂ و دل رہِ الفت میں بچھائے رکھئے
نے کو ہے معرکۂ دار و رسن — اپنے ہاتھوں میں صلیب اپنی اٹھائے رکھئے
ی ہے بہت تیرگیٔ یاس و قنوط — شمعِ امید کی لَو اور بڑھائے رکھئے

کیفؔ کس درجہ حیا سوز ہیں جلووں کے ہجوم
اپنا دامانِ نظر ان سے بچائے رکھئے

مستقل عنوان

ملّا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

زبدۃ المعارف

صوفی خوشگوار علی کے نورانی ماتھے پر تین شکنیں تھیں۔ ایک طویل آہ بھرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا:-

"کیا بات ہے قبلۂ دکعبہ ——— خیریت تو ہے؟"

"میاں گئے زمانے خیریت کے ——— اب تو خون کے گھونٹ پینا ہے اور جینا ہے۔ پہلے ذرا چائے بنوالو۔ طبیعت ذرا ٹھکانے پر آئے تو تمہیں سنائیں کہ کیسی قیامت آئی ہے۔"

"قیامت" میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں میاں حد ہوگئی ہے۔ ہم تو مارے غصے کے کانپ رہے ہیں جاؤ چائے کو تو کہدو ———"

"غصے کی حالت میں ٹھنڈا پانی اکسیر ہوتا ہے۔ صوفی صاحب۔ چائے تو آگ پر تیل کا کام کرے گی۔"

"یہ چیزیں مزاجوں سے تعلق رکھتی ہیں برخوردار۔ ہمارا مزاج گرم تر ہے۔ چائے پی لیتے ہیں تو شعور اور لاشعور ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں۔"

"شعور اور لاشعور" میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کیا آپنے نفسیات بھی پڑھی ہے!؟"

"کیوں نہیں پڑھی۔ فرائڈ کا دعویٰ تھا کہ آدمی بندر کی اولاد ہے۔ مگر ہمارا دعویٰ ہے کہ حضرت آدمؑ کی اولاد ہے۔"

"گڈ آئیڈیا ——— پھر تو ڈارون کے بارے میں بھی آپ کے کچھ خیالات ہوں گے۔"

"ابھی تک تو نہیں ہیں ——— مگر بن جائیں گے ——— تم چائے بنواؤ۔"

"ڈارون کا دعویٰ تھا کہ ہمارے ہر فعل کے پیچھے جنسی جذبہ کارفرما ہے۔ مثلاً آپ چائے پینا چاہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چائے مؤنث ہے۔"

"اور اگر پراٹھا کھانا چاہیں؟" وہ گردن ہلاکر بولے۔

"تو اس کی نفسیاتی وجہ یہ ہوگی کہ آپ کے تحت الشعور میں جنس مخالف کی طرف جو طبقاتی رجحان پایا جاتا ہے وہ مذکر اشیاء کا مطالبہ کرتا ہے ——— پراٹھے کے عوض آپ پتھر چبانے لگیں تب بھی ایک ہی بات ہوگی۔"

"پتھر تم چباؤ۔ اس وقت تو خیر خالی چائے چل جائے گی بس انڈے لے لینا۔"

"انڈے کی خواہش پر برٹرینڈ نیٹشے نے بڑا شاندار آرٹیکل لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انڈا کھانے والے عموماً بیوی کے غلام ہوتے ہیں۔ کیونکہ بیویاں انڈے نہیں دیتیں۔"

"نہ دیتی ہوں گی۔ تم چائے بنواؤ۔ چائے کے بغیر گفتگو کا لطف نہیں آتا۔"

"کیا آج گھر پر نہیں ملی؟"

"کیا بتائیں ——— چھوٹی اہلیہ بڑی تیز مزاج ہیں ——— کسی کمبخت نے ان سے کہدیا کہ صوفی خوشگوار نے مس زرینہ بیگم سے نکاح کرلیا ہے۔"

"تو کیا نہیں کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا ———

"پاگل ہو گئے ہو ——— ہمیں کیا ضرورت پڑ رہی

تھی ـــ"

"ارے ـــ پھر تو وہ غلط کہتی ہوگی ـــ"

"کون ـــ کیا!"

"زرینہ کہہ رہی تھی کہ صوفی صاحب ہمارے محرم ہیں"

"محرم! ـــ کیا گھاس کھا گئے ہو ـــ"

"پچھلی جمعرات کو میں نے آپ کے حجرے سے نکلتے دیکھا تھا تو دریافت کیا تھا کہ رات کے دس بجے درگاہ میں تمہارا کیا کام۔ وہ کہنے لگی کہ تو چنڈی جمعرات کو بڑے پیر صاحب کی فاتحہ عشاء کے بعد ہی ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ فاتحہ کے لئے تو تمہیں قل کی برجی میں ہونا چاہئے تھا مگر تم نکل رہی ہو صوفی صاحب کے حجرے سے۔ کہنے لگی کہ صوفی صاحب تو ہمارے محرم ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ رشتہ کب سے پیدا ہوا۔ کہنے لگی کہ ایک مہینہ ہوگیا۔ میں نے پوچھا اس رشتے میں کیا ہوتا ہے؟ کہنے لگی روحانی طور پر نکاح ہوتا ہے میں نے کہا صوفی صاحب کے تو پہلے ہی دو بیویاں موجود ہیں کہنے لگی ہوا کریں۔ وہ تو شرعی بیویاں ہیں۔ ہمارا نکاح طریقت کی رو سے ہوا ہے۔"

"ارے تو خدا کے بندے ـــ تم نے اس کا کیا مطلب سمجھا؟" صوفی صاحب نے بزرگانہ انداز میں تبسم فرماتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے ہر نکاح کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے ـــ بچے ـــ بچے ـــ پھر بچے۔"

"استغفراللہ۔ میاں ہم تو سمجھتے تھے کہ تم کچھ پڑھے لکھے ہو۔ مگر تم تو کورے ہی نکلے ـــ برخوردار نکاح طریقت اور ہی چیز ہے۔ تم اجمیر، کلیر سب جگہ ہو آئے مگر تصوف کی ابجد تک سے آگے نہیں بڑھے؟"

"بڑھ جاتا صوفی صاحب اگر بیوی دلربا بیبہ نہ ملی ہوتی۔ آپ نکاح طریقت کی وضاحت فرما دیں تو جانے کے ساتھ ممنون بھی پیش کر دوں گا۔"

"سالک جب غیب سے شہود کی طرف چلتا ہے ـــ"

"مس زرینہ سالک ہیں"؟ میں نے آنکھیں پھاڑیں۔

"چلو سالکہ کہہ لو ـــ ویسے طریقت کے روحانی سفر میں مذکر مؤنث کا فرق عام لوگ کرتے ہیں۔ اونچے درجے کے اہل اللہ کی نظر میں مذکیر و تانیث درجۂ اسفل کے امتیازات ہیں۔ مدارج علیا میں یہ امتیازات فنا فی الذات ہو جاتے ہیں۔"

"سمجھ گیا ـــ آپ کا مطلب ہے باقی باللہ فانی فاللہ۔"

"خوب سمجھے ـــ تو سالک جب غیب سے شہود کی طرف چلتا ہے۔"

"پیدل چلتا ہے؟"

"نہیں بھئی۔ روحانی سفر کے لئے پیدل اور بے پیدل کا سوال نہیں ہے۔ یہ سفر جسمانی نہیں معنوی ہوتا ہے۔"

"اب سمجھ گیا ـــ شاید اسی لئے مولانا روم کو مولانا مولوی معنوی کہا جاتا ہے۔"

"ہاں ـــ تو سالک جب غیب سے شہود کی طرف چلتا ہے تو اس کے شیخ کا فرض ہوتا ہے کہ اس کے نفس ناطقہ کا تعلق عقل اول سے پیدا کرے۔"

"عقل اول؟"

"یہ صوفیاء کی اصطلاح ہے۔ علت العلل جانتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"کیا بھلا؟"

"یہی شراب کی لت۔ ام الخبائث ہے نا شراب تو۔"

"جاہل مطلق ہو۔ میاں علت العلل متکلمین کی اصطلاح ہے جنھوں نے تصوف اور فلسفے کو ایک جان دو قالب کیا ہے۔ مناطقہ اسی اصطلاح کو رب الارباب کہتے ہیں۔"

"اوہ ـــ اب سمجھا۔ شاید حکماء اسی اصطلاح کو رب السوس بولتے ہیں۔"

"لعنت ہے تمہاری سمجھ پر ـــ رب السوس تو دوا کا نام ہے ـــ خیر عقل اول کا نام کچھ بھی رکھ لو۔ شیخ بہرحال اس سے سالک کے نفس ناطقہ کا رشتہ جوڑے گا۔"

"مان لیجئے نہ جوڑے۔ پھر؟"

"سالک چند ہی مقامات طے کر کے طبقۂ زمہریر میں جا پڑے گا۔"

"تو آپ مس زرینہ کے نفس ناطقہ کا رشتہ عقل اول سے جوڑ رہے ہیں؟"

"کیا سمجھتے ہو مس زرینہ کا کیا مقام ہے۔ شاہ تم قُم روہیل کھنڈ والے حیران رہ گئے جب ہم نے انھیں بتایا کہ وہ تیسرے برزخ سے دفعتاً چھٹے برزخ میں پہونچ گئی ہے"۔

"آپ ہی کا فیض ہوگا صوفی صاحب۔ شیخ اونچا ہو تو مرید جہاں تک بھی جائے کم ہی ہے۔"

"اکیلے شیخ پر مدار نہیں۔ خود سالک کی صلاحیتیں بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ مس زرینہ میں کسب فیض کی صلاحیتیں حیرت انگیز ہیں۔"

"ضرور ہوں گی ——— وہ شاید بھونا رو قوال کی چچیری بہن ہے"۔

"نہیں۔ بھونا رو قوال تو اس کے چچا کا نواسہ ہے۔ وہ خواجہ تلوار کی دختر نیک اختر ہے"۔

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ زرینہ کی ماں تو شاید طوائف تھی"۔

"ارے تم چائے تو منگواؤ ——— نہ بس ایک نقطہ نہیں پہلے چائے پھر باتیں"۔

یہ گفتگو مردانے میں ہو رہی تھی۔ مجبوراً میں گھر میں گیا۔ حالات نارمل ہوتے تو چائے بننے میں دیر ہی کیا لگتی۔ لیکن حالات نارمل نہیں تھے۔ ملائن کا موڈ خراب تھا۔ وہ کسی طرح اتنے پیسے دینے پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی کہ میں سرہند شریف کے عرس میں ہو آتا پیسے تو خیر کہیں اور سے بھی ہاتھ لگ سکتے تھے۔ مگر بڑا سوال اس کے بھیا کی اجازت کا تھا۔ اجازت کا مسئلہ اس لئے ٹیڑھا تھا کہ میں ابھی چند ہی روز ہوئے بھائی بہن دونوں سے وعدہ کر چکا تھا کہ عرس کا نام بھی اب کبھی میری زبان سے نہ سُنتا۔ اس موقعہ پر بھائی بہادر نے صفائی سے کہہ دیا تھا کہ اگر آئندہ کسی عرس میں گئے تو دو ماہ کی تنخواہ ضبط کر لی جائے گی۔ میں نے سینہ تان کر کہا تھا کہ ہاں دو کی نہیں آپ چار کی کیجئے گا میں جاؤں گا ہی نہیں تو ضبط کہاں سے کریں گے۔

اب شومئی قسمت دیکھیے کہ ایک صاحب نے اطلاع دی کہ اس بار حضرت مہتمم دارالعلوم بھی سرہند کے عرس میں جا رہے ہیں۔ میں نے پہلے تو یقین نہیں کیا مگر تحقیق کی تو اطلاع درست ثابت ہوئی۔ اگرچہ سرہند کے عرس سے میری دلچسپی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ روایات یہ بھی آ رہی ہیں کہ نہ وہاں قوالی ہوتی ہے نہ زنان عاشقان اولیاء تشریف لاتی ہیں۔ جب یہ دونوں چیزیں نہیں پائی جا رہی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہاں قبروں کی مٹی پھانکنے تو جانے سے رہا۔ عرس بغیر قوالی کے اور مجمع بغیر عورتوں کے ایسا ہی ہے جیسے انگریز بغیر پتلون کے اور شوربہ بغیر بوٹیوں کے۔

لیکن مہتمم صاحب آخر کیوں جا رہے ہیں؟ ——— یہ سوال گلے کی چھچھوندر بن کر سینے میں چپک گیا اور پھر اسی عالم اضطراب میں ایک باخبر حضرت نے یہ خوشخبری بہم پہنچائی کہ پچھلی روایات تو کبھی کی دم توڑ چکی ہیں۔ اب وہاں عورتیں بھی بہت آتی ہیں۔

"بہت آتی ہیں" میں نے حیرت زدہ ہو کر تصدیق چاہی۔

صرف بہت ہی نہیں بلکہ خاص خاص بھی۔ اجمیر و کلیر کے عرس بہت بدنام ہو گئے ہیں اس لئے ثقہ خواتین وہاں کم ہی پہنچتی ہیں۔ مگر سرہند کا عرس خاصا نیک نام ہے۔ اس لئے وہاں ———

"آپ گئے ہیں کیا؟"

"کئی مرتبہ ——— اپنا تو پیشہ ہی تلاشِ حسن ہے آرٹ کوئی کھیل تو نہیں ملا صاحب۔ بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں"

"پھر تو میں بھی پاپڑ بیلوں گا۔ کیا تاریخ ہے بھلا عرس کی؟"

"۲۹ صفر ——— آپ چلیں تو بس لطف ہی آ جائے"۔

"کیوں لطف آ جائے؟" میں نے انھیں گھورا۔

"آپ کی صلاحیتوں سے ہم خوب واقف ہیں ——— ہم تین آدمی ارادہ کر رہے ہیں ——— تین سے چار بھلے"۔

"دیکھو کوشش تو کرتے ہیں"۔

پھر میں نے ملائن سے التماس کیا تھا کہ نمبر ایک میرے سفر خرچ کا انتظام کرے اور نمبر دو اپنے بھیا جان سے اجازت

دلوائیے۔ وہ چونک کر بولی تھی۔

"ہائے اللہ۔ ابھی اس روز آپ نے کیا وعدہ کیا تھا"۔

"میں ہمیشہ حال اور مستقبل پر نظر رکھتا ہوں۔ ماضی کو یاد رکھنے سے کیا فائدہ"۔

"مگر دو مہینے کی تنخواہ ضبط ہو گئی تو ہماری لاشیں بغیر کفن ہی کے سڑا کریں گی"۔

"بات کو سمجھا کرو ــــ میں اسی لئے تو اجازت کا طالب ہوں کہ سزا کا نفاذ نہ ہو۔ ورنہ بیڑیاں کس نے میرے پیروں میں ڈال رکھی ہیں"۔

"تو کیا بھیا اجازت دے دیں گے؟"

"انھیں سمجھاتا کہ سرہند کے عرس کا معاملہ اجمیر اور کلیر جیسا نہیں ہے۔ اب کی تو حضرت مہتمم صاحب بھی جا رہے ہیں۔ شاید مولانا فخر الحسن بھی جائیں"۔

"کوئی بھی جائے مگر آپ کے جانے کا جواز آخر کس دلیل سے ہوگا"۔

"عورتیں تو مع دلیل پیدا کی گئی ہیں ــــ اہا ہاہا ـ ـ ـ موتیوں جیسے شفاف چمکدار حسین آنسو ــــ بڑے سے بڑا لاٹ صاحب بھی ان کے سیل سبک خرام میں اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا"۔

"تو میں بھیا کے سامنے روؤں؟"

"آخر کیا مضائقہ ہے۔ رونے میں تو ہاتھی گھوڑے نہیں لگتے"۔

"پھر یہ نیک کام آپ ہی کر لیں تو کیسا رہے"۔

"مرد جب روتا ہے تو تقدیر پھوٹ پھوٹ کر ہنستی ہے ــــ کیا تم میری بے بسی کا مذاق اڑا رہی ہو؟"

"آپ اور بے بس ــــ خدا کی شان ہے۔ یہ اعتراف آپ کی زبان سے سن رہی ہوں"۔

"میں خدا کی نہیں تمہاری شان دیکھنا چاہتا ہوں ــــ اپنے بھیا سے اجازت دلوا دو تو زندگی بھر تمہیں من مندر کی دیوی بنا کر پوجوں گا"۔

"مجھے بھلا اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"بے حساب جنت میں جاؤ گی۔ غلمان پنکھا جھلیں گے"۔

"مجھے دوزخ ہی میں جانے دیجئے ــــ آپ بھول رہے ہیں کہ آج شام تک آپ کو مضمون مکمل کر کے کاتب کے حوالے کر دینا ہے"۔

"مجھے سب یاد ہے ــــ دوپہر تک بھیا جان سے اجازت دلوا دو۔ شام تک مضمون بالکل تیار"۔

"یہ تو خیر ناممکن ہے۔ میں مر بھی جاؤں تو آپ بھیا سے اس قسم کی سفارش نہیں کر سکتی"۔

"تم شوہر کا دل توڑ رہی ہو ــــ زمین کا کلیجہ پھٹ جائے گا"۔

"میرا کیا بگڑے گا۔ پھٹ جانے دیجئے"۔

دیر تک ہم اسی طرح کی نیم سائنسی اور نیم فلسفیانہ باتیں کرتے رہے۔ عاجز آ کر میں نے غصہ بھی دکھلایا۔ مگر بقول شیخ سعدیؒ ــــ "تربیت نا اہل را چوں گردگاں بر گنبد است" ــــ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر کار میں نے کہا۔

"میں بغیر اجازت ہی کے رفوچکر ہو جاؤں گا ــــ نہ ملے دو مہینے تک تنخواہ۔ تم غم کھانا۔ میں ہوا کھاؤں گا"

وہ مسکرائی اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ اسے علم تھا کہ میں بغیر اجازت کے نہ جا سکوں گا۔

"دیکھو نیک بخت" میں نے باورچی خانے کی دہلیز پر پہنچ کر بڑی متانت سے کہا ــــ "آج میں قطعی طور پر سنجیدہ ہوں"۔

"رنجیدہ ہوں آپ کے دشمن ــــ رنج اٹھانا تو آپ کی کنیز کا مقدر ہے"۔

"یہ مکالمے کسی اور سے بولنا ــــ میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں"۔

"کسی اور سے کیا مطلب"؟ وہ دفعتاً چیں بہ جبیں ہو گئی۔

"میں نے رنجیدہ نہیں سنجیدہ کہا تھا"۔

"میں بہری نہیں ہوں۔ مگر کسی اور طعنہ آپ نے

کیوں دیا —"

" خدا کی مرضی ۔ آخر تمہارا حرج ہی کیا ہے اگر اپنے بھیا کی خوشامد کر ہی لو۔"

" میں کیا کہہ کر ان سے اجازت مانگوں ۔ نہ نہ اب تو میں نے کان پکڑ لئے ہیں آپ کی باتوں میں آنے سے"۔

ہزار کوشش کے باوجود وہ نہ مانی ۔ میں نے عاجز آکر دھمکیاں دیں ۔ غصہ دکھایا ۔ مگر اس کا ثمرہ اس سے زیادہ کچھ نہ نکلا کہ اس کی ضد اور بڑھ گئی ۔ اب ایسے میں یہ بھی ممکن تھا کہ میں چائے کو کہوں اور وہ صوفی خوشگوار کی وجہ پیدائش دریافت کر بیٹھے ۔

بسم اللہ کہہ کر میں نے عرض کر ہی دیا :۔

" صوفی خوشگوار چائے کے طالب ہیں ۔ ایک دو انڈا ہو تو وہ بھی چلے گا ۔"

وہ سیونگ مشین پر بیٹھی جمپر کا دامن کاڑھ رہی تھی ۔ سوئچ آف کر کے جھنجھلائے ہوئے لہجہ میں بولی :۔

" یہ ایسے ہی ایسے لوگوں نے آپ کو برباد کر رکھا ہے پتہ نہیں آپ کی دوستی کا معیار کیا ہے"۔

میں بھی جواباً بھنانے والا تھا مگر اندیشہ ہوا کہ لڑائی طول پکڑ جائے گی اور چائے کھٹائی میں جا پڑے گی ۔ بس صبر جمیل کا دامن پکڑ کر نیاز مندانہ لہجے میں کہا :۔

" دوستی کا معیار فرصت میں بتاؤں گا اس وقت تو پھرتی سے چائے بنا دو ۔ بچارے بغیر ناشتہ کئے آ گئے ہیں"۔

" اللہ کی شان — صوفی خوشگوار بھی بچارے ہو گئے آپ کو کچھ خبر بھی ہے ان کی شہرت کس قسم کی ہے"۔

" ارے بھاگوان ہمیں کسی کی شہرت سے کیا بحث — بزرگوں نے کہا ہے نیکی کر کنوئیں میں ڈال"۔

آپ کے بزرگوں نے کہا ہو گا — میرے بزرگوں نے کہا ہے کہ ہر آدمی کی اوقات پہچان کر اس سے معاملہ کرو"۔

" عورتیں اس قسم کی آئیڈیل باتیں نہیں کیا کرتیں — تمہیں معاملہ ہی کیا کرنا ہے ۔ بس چائے بنا دو دو انڈے نیم برشت"۔

" وہ آخری انڈا تھا جو آپ ناشتہ میں تناول فرما چکے چائے کی پتی بھی ختم ہے ۔ دودھ بھی یونہی دو پونا پڑا ہو گا"۔

" اس کے باوجود تم چائے اور انڈے تیار کر کے دے سکتی ہو — مجھے تمہاری صلاحیتوں پر یقین ہے"۔

اس کی آنکھوں سے تبسم جھانکا ۔ ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آئی ۔

بھیا سچ ہی کہتے ہیں کہ مجھے بھی آپ نے پاگل بنا دیا ہے ۔ ہر بار سوچ لیتی ہوں کہ اب کی آپ کی باتوں میں نہیں آؤں گی ، مگر پھر یہ کمبخت دل —"

" بھیا سے تمہاری کیا مراد ہے — کیا تم مجھے بھی پاگل سمجھنے لگی ہو"۔ یہ جملہ میں نے روہانسو ہو کر بڑے دردیلے لہجے میں کہا تھا ۔

" دیکھئے یہ ہے آپ کی چالاکی — جانتے ہیں کہ میں آپ کا مغموم چہرہ دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتی ۔ بس لٹکا دیا منہ"۔

نہیں میں واقعی بدقسمت ہوں ۔ تمہاری خاطر اجمیر و کلیر کہاں کہاں مارا پھرتا ہوں مگر تمہیں کوئی قدر نہیں ۔"

" ٹھیک کہتے ہیں ۔ حقہ اور سگریٹ بھی آپ میری ہی خاطر پیتے ہوں گے — جان جلانا تو کوئی آپ سے سیکھے"۔

" تم نہ ہوتیں تو میں پتنگ کی طرح آزاد فضاؤں میں اڑا کرتا تم میری نس نس میں آکسیجن بن کر سما گئی ہو — تم میرے روم روم میں"۔

" ذرا ٹھیرئیے میں مریم کو بلائے لیتی ہوں — بغیر ہیروئن کے ریہرسل کا کیا فائدہ"۔

" افسوس تم حقیقت کو اداکاری سمجھتی ہو — سچ کہا تھا شاعر نے :۔

مری خاک تک لٹی ، میں نہ رہی امید باقی
انھیں مرنے ہی کا اب تک نہیں اعتبار آتا

" ارے بھئی ملا صاحب " دفعتاً صوفی صاحب کی آواز آئی

وہ شاید انتظار سے تنگ آکر ابل پڑے تھے

"ابھی آیا قبلہ ——— میں نے باآواز بلند کہا ——— اچھا نیک بخت میں چلا ——— ذرا جلدی سے چائے"———

"ایک گھنٹے میں بھیجوں گی۔"

"دس گھنٹے میں ——— خدا تمہیں سلامت رکھے ——— مائی ویری ویری سوئٹ زوجہ"۔

صوفی صاحب مارے انتظار کے اونٹ رہے تھے ——— مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پڑے :-

"میاں کیا سو گئے تھے اندر جا کر ——— آنکھیں پتھرا گئیں راہ دیکھتے دیکھتے۔"

"شرمندہ ہوں صوفی صاحب ——— کیا بتاؤں بیوی بڑی رستم قسم کی ملی ہے۔ حساب لینے لگی تھی کہ کے ہزار صوفیوں سے تمہاری دوستی ہے"۔

"ہائیں ——— بیوی حساب لینے لگی تھی ——— دماغ تو درست ہے ———"

اس کا تو درست ہے، مگر میرا نہیں۔ جب وہ میری طرف دیکھتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسمریزم کر رہی ہے۔ میں چوں بھی نہیں کر سکتا"۔

"نہیں ——— کیا واقعی ؟"

"جی بالکل واقعی ——— سمجھ میں نہیں آتا کیا جادو ہے"۔

"جادو نہیں برخوردار ——— یہ اور ہی معاملہ ہو سکتا ہے"۔

"اور ہی کیا ؟"

"شاہ بریانی کا آسیب ——— بے حد خطرناک چیز ہے فوراً علاج کرانا چاہیئے"۔

"کون کرے گا علاج ——— ؟"

"ہم موجود ہیں ——— جب کہو کر دیں ——— چھ فلیتے جلانے پڑیں گے۔"

"بارہ بھی جلانے پڑیں تو پرواہ نہیں ——— کیا پروگرام رہے گا ؟"

"ایک خالی کمرے کو لوبان کی خوشبو سے مہکا کر اپنی زوجہ کو اس میں بٹھاؤ۔ دونوں ہاتھ اور پیر باندھ دو۔"

"رسیوں سے ؟"۔ میں گھبرا گیا۔

"نہیں میاں ریشمی کمر بندوں سے باندھ دو۔ پھر ہم تین فلیتے بوقت ظہر اور تین فلیتے بوقت عشا جلائیں گے۔"

"کیا اسی کمرے میں ؟"

"نہیں تو کیا ——— شرط یہ ہے کہ مکان میں کامل خلوت ہو۔ کمرے سے تیس تیس گز کے فاصلے تک کوئی ذی روح موجود نہ ہو۔"

"عاجز کا شمار کیا ذی روح میں ہے ؟"

"پھر کاہے میں ہے ——— پاگل ہوئے ہو۔ تم تو تم ایک بچہ بھی آس پاس نہیں رہ سکتا۔ تمیں تمیں گز مدور کا حصار کھنچتا ہے۔ چڑیا بھی اس حصار میں پر مارے تو چشم زدن میں بھسم ہو جائے"۔

"آپ حصار کے باہر رہیں گے یا اندر ؟"

"اس فن سے تم بالکل کورے معلوم ہوتے ہو ——— ارے عامل تو معمول کے سامنے رہتا ہے۔ تم اس خبط میں مت پڑو کہ تمہاری زوجہ پردہ نشین ہیں۔ ان کا وجود تو عمل کے دوران فنا فی الذات ہو چکا ہو گا۔ کمرے میں بس ہم ہوں گے اور شاہ بریانی کا آسیب۔"

"یہ شاہ بریانی کیا صوفی قورمہ کے خلیفہ تھے ؟"۔

"مذاق سمجھ رہے ہو ——— ارے تھکیدار جمیل سے پوچھو ان کی زوجہ پر بھی شاہ بریانی آئے تھے"۔

"خود شاہ بریانی ؟"۔

"میاں خود نہیں۔ ان کا آسیب۔ ہم نے علاج کیا تو چھٹی کا دودھ یاد آگیا بچہ جی کو۔ توبہ کر کے بھاگے کہ اب پاس پڑوس میں بھی نہیں پھٹکیں گے۔"

"مگر میں اپنی زوجہ کے ہاتھ پیر کیسے باندھوں گا۔ وہ تو خود مجھے ہی فنا فی الذات کر کے رکھ دے گی"۔

"آدمی کے بچے ہو یا چڑیا کی اولاد ہم سے کہو تو دس بیویوں کے ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دیں"۔

"مگر آپ کی چھوٹی اہلیہ آپ کو چائے نہیں دی ؟"۔

"وہ تو میاں اور معاملہ ہے۔ اس کی آنکھیں ہی اتنی غضب کی

ہیں کہ جب وہ ہماری طرف دیکھتی ہے تو ہمارا غصہ کافور ہوجاتا ہے۔"

"پھر کیا پتہ ان پر بھی شاہ بریانی کا آسیب ہو؟"

"کیا بکتے ہو ــــ ہمارے گھر میں اور آسیب ــ کچا چبا جائیں حرام زادے کو۔"

"کیا آسیبوں کے یہاں بھی حرام حلال چلتا ہے؟"

"اس سے تمہیں کیا بحث ــــ اچھا ہاتھ پیر نہ باندھنا مگر اتنا تو کر ہی سکتے ہو کہ ہمیں کمرے میں داخل کرکے باہر سے کنڈی لگا دو۔"

"یہ تو آسان ہے مگر میری زوجہ نالائق ایک ننھا سا پستول بھی گریبان میں چھپائے رکھتی ہے۔ وہ فلیتہ جلنے سے پہلے ہی آپ پر گولی چلا بیٹھی تو"

"اس کا بھی علاج آسان ہے ــــ نیند کی جو گولیاں آتی ہیں بس دو چار کھلا کر سلا دو۔ پھر سوتے ہی میں کمرہ خوشبو سے مہکا کر ہمیں بلا لو ــــ بہت سے بہت نصف گھنٹہ بوقت ظہر اور نصف گھنٹہ بعد عشاء لگے گا۔"

"نا چیز کمرے میں موجود رہے تو چلیگا؟"

"کہہ تو دیا عامل معمول کے سوا تیس تیس گز کے حصار میں کوئی بھی ذی روح موجود نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ بھسم ہوجائیگا"

"کیا ٹھیکیدار جلجل نے اپنی زوجہ کے ہاتھ پیر باندھ دیئے تھے؟"

"نہیں۔ ان کے پاس تو کلورا فارم تھا۔ ذرا سا سنگھا دیا ــــ بیوی بے ہوش ہوگئی میاں چائے اب تک نہیں آئی۔"

"آ ــــ ہاں ــــ ارے بس آتی ہی ہوگی۔ دیکھئے میں پھر دیکھتا ہوں۔"

گفتگو کو طول میں اسی لئے دے رہا تھا کہ اگر ملازمہ چائے بھیجنے میں دیر کرے تو صوفی صاحب کو وقت کا احساس نہ ہو۔ اب میں پھر گھر میں گیا۔ ملازمہ چولہے پر تھی۔ ٹوکرائی جھاڑو دے رہی تھی۔

"بہت بہت شکریہ جناب کا میں نے ملازمہ کے

ثریا نے بگڑ کر فدویانہ انداز میں کہا ــــ پلیٹ میں اکٹھے چار نیم برشت انڈے نظر آرہے تھے۔

تمہاری یہی سلیقہ مندیاں ہیں جن پر جان دیتا ہوں ایک انڈے کا بھلا کیا کھانا۔"

"یہ انڈے مریم کے یہاں سے قرض منگائے ہیں۔"

"پھر تو اور بھی مزیدار ہوں گے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ مفت کا مال ہمیشہ زیادہ مزیدار ہوا کرتا ہے۔"

"منھ دھو رکھئے۔ ایک روپیہ ساٹھ پیسے کے چار ہیں۔ کل آٹا بھی ادھار آیا تھا۔ آج گھی بھی ادھار ہی آنا ہے۔"

"میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تم میرے لئے سرہند کا سفر خرچ ہر حال میں بچاؤ گی ــــ ابھی اور چیزیں بھی ادھار ہی منگاتی رہو۔ سرہند سے لوٹ کر انشاء اللہ پائی پائی ادا کر دوں گا۔"

"کیا سرہند میں کوئی ٹکسال کھلی ہوئی ہے۔؟"

"ان معاملات کو تم نہ سمجھو گی ــــ فکر مت کیا کرو۔ تمہارے بھیا جب تک زندہ ہیں تم رانی میں راجہ۔"

"وہ آپ کی وجہ سے مجھ سے بھی ناراض رہنے لگے ــ کل کہہ رہے تھے کہ میں عاجز آگیا ہوں۔"

"عاجزی بڑی انمول نعمت ہے خانم۔ یہی تو ایک چیز ہے جو خدا کے خزانے میں بھی نہیں پائی جاتی۔ سچ کہہ کے بھی اگر ان کے عجز میں اضافہ نہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ وہ بمبئی سے لوٹ آئے ہیں۔"

"اب میں نگوڑی خانم بھی ہوگئی ــــ جائیے خدا کے لئے آپ صوفی خوشگوار کے کلیجے سے لگئے۔ میں چائے بھجوا رہی ہوں۔"

پھر ملازمہ چائے کی ٹرے لئے دروازے میں پہنچی تو صوفی خوشگوار نے اسے کنکھیوں سے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ یہ بیچاری ایک بیوہ تھی۔ تھی کیا اب بھی ہے۔ تیس بتیس سال کی عمر ہوگی۔ رنگ میلا مگر ناک نقشہ اُجلا۔ دو مہینے سے میرے یہاں کام کر رہی ہے۔ نام بھی دل آرا رہا ہوگا مگر اب دلاری کہلاتی ہے۔

چائے رکھ کر وہ لوٹ گئی تو مولوی صاحب انڈے سے شوق فرماتے ہوئے گویا ہوئے۔

"یہ تمہاری ملازمہ کسی شریف گھرانے کی معلوم ہوتی ہے ——— کہاں سے گھیر لائے؟"۔

آخری الفاظ کہتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ جلوہ گر تھی۔

"میری بیوی نے گھیری ہے ——— بڑی شریف عورت ہے"۔

تم خود بھی تو بہت شریف ہو ——— ارے میاں رہنے دیا کرو ——— اچھا اس تجویز کا کیا رہا۔ ہم نے تم سے کہا تھا کہ عامۃ المسلمین کی اصلاح کی طرف توجہ دو۔ پانچ روپے فی کس ہم عطا کیا کریں گے"۔

"اوہو ——— میں نے اسے ایک سرسری بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا"۔

"سرسری کیوں ——— کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ عامۃ المسلمین میں بے دینی اور بدکرداری کس قدر عام ہو گئی ہے"۔

"وہ تو بے شک ہو گئی ہے"۔

"پھر اس کا علاج اس کے سوا آخر کیا ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی اونچے شیخ سے بیعت ہو"۔

"یہ بھی بجا فرمایا"۔

"پھر تم کہاں سو رہے ہو ——— ہمارے فی الوقت چھ سو تو مرید ہیں۔ کم سے کم اتنے ہی اور پیدا کرو۔"

"پیدا کر دوں" ——— میں چونکا۔

"کیا مشکل ہے تمہارے لئے"۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر فرصت کہاں ملتی ہے صوفی صاحب"۔

"کونسے پتھر توڑتے رہتے ہو ——— میاں پانچ روپے فی مرید کم نہیں ہوتے ——— گھوم پھر کر دو چار روز ڈھونڈھ ہی لوگے ——— اچھا سات روپے سہی۔ اور طبقۂ نسواں کے لئے دس روپے فی نفر"۔

"فی نفر ——— میرا خیال ہے فی دوپٹہ کہئے۔ مگر طبقۂ نسواں کا ریٹ آپ نے کیوں بڑھا دیا"۔

"دو وجہیں ہیں۔ ایک تو ان کے سلسلہ میں تمہیں زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ گھروں پر گھس کر تبلیغی خدمت انجام دینا آسان نہیں۔ دوسرے صنف نازک کی اصلاح مردوں سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ وہی بچوں کو تربیت دے کر مرد بناتی ہیں"۔

"بات پتے کی ہے ——— مگر میرے لئے مزید دشواری آپ نے پیدا کر دی"۔

"کیسی دشواری؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ دلاری سے بسم اللہ کروں گا۔ وہ اپنی ملازمہ ہے۔ آسانی سے آپ کی بیعت پر آمادہ ہو جائیگی۔

"پھر کیا رکاوٹ پیش آ گئی" ——— صوفی صاحب تیوری چڑھا کر بولے۔

"وہ بیوہ ہے۔ بچے کہاں سے لائے گی جنہیں تربیت دے کر مرد بنائے ———"

"ارے میاں خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اس نے اسکی تقدیر میں بچے لکھے ہوں گے تو ضرور ہو کر رہیں گے۔ ہم اس کی شادی کرا دیں گے"۔

"وہ شادی پر آمادہ نہیں ہے۔ ملائن تو چاہتی تھی کہ کہیں کرا دے"۔

"یہ نشیب و فراز شیخ کے سوچنے کے ہوتے ہیں ہم بیعت لیکر استخارہ کے ذریعے اس کا شوہر نامزد کر دینگے نکاح آقائے نامدار کی سنت ہے۔ ہم نے دسیوں بیواؤں کے نکاح کرائے ہیں"۔

"آئیے ہم اور آپ مل کر ادارہ ٹرسٹ ام المومنات کی داغ بیل ڈالیں۔ آپ صدر رہئے گا میں سکریٹری"۔

"تم برخوردار نہایت غیر ذمہ دار آدمی ہو۔ عقل ہوتی تو کبھی کے ہمارے ساتھ لگ لئے ہوتے"۔

"میں پہلے بہت عقلمند تھا۔ صوفی صاحب بڑے بڑے ارسطو میرے آگے پانی بھرتے تھے۔ مگر آہ وہ قتالۂ عالم"۔

"کون؟ ——— آگے کہو چپ کیوں ہو گئے"۔

"کلیر شریف میں ایک فتنۂ قیامت سے رسم و راہ

ہو گئی تھی۔ نہ پوچھئے کیا چیز تھی وہ ظالم ـــــ ہزاروں کے دل چھینے مگر میری تو عقل ہی اچک کر لے گئی"۔

"کیا نام تھا"؟

"ززبائی خواجہ ذوالفقار کے مریدوں میں تھی"۔

"خواجہ ذوالفقار وہی لفنگا۔ جو اپنے آپ کو جھرونکے شاہ کا خلیفہ کہتا پھرتا ہے"۔

"جی ہاں۔ ززبائی اسی کی فیض یافتہ تھی"۔

"کیسا فیض ویض میاں وہ تو بہروپیا ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتے اس نے کیا کیا گل کھلائے ہیں"۔

"ززبائی نے بتایا تھا کہ وہ سات ولایتوں کا صاحب خدمت ہے"۔

"بکتا ہے ملعون ـــــ اسے تو معرفت کی ہوا بھی نہیں لگی"۔

"مگر ززبائی اس کے پیر دھو دھو پیتی تھی"۔

"کھا گئی ہوگی چکمہ ـــــ کب کی بات ہے؟"

"کئی سالوں کی ـــــ اب تو ززبائی ریٹائر ہو گئی ہے"۔

"یہ نام تو ایرانی معلوم ہوتا ہے ـــــ کس عمر کی تھی"۔

"پتہ نہیں ـــــ پچاس سے کم تو نہ رہی ہوگی"۔

"ہائیں ـــــ پھر تمہاری رسم و راہ کا کیا مطلب؟"

"مجھے اس کی زلفوں کے سفید والے بال بہت پسند تھے"۔

"سفید والے!"

"مطلب یہ کہ پورے بال سفید نہیں ہوئے تھے ـ کچھ لٹیں سفید تھیں۔ چہرے پر جھریاں بھی اتنے حسین انداز میں پڑی تھیں کہ جیسے باد نسیم کے سبک خرام جھونکے تالاب میں لہریے بنا رہے ہوں"۔

"تمہاری کھوپڑی میں کیا دماغ بالکل ہی نہیں ہے"؟

"جی ہاں۔ عرض تو کیا کہ وہ اللہ کی بندی میری عقل ہی اڑا کر لے گئی"۔

"ارے بیوقوفوں کے سردار بوڑھی عورتوں کے ذکر اذکار سے کون واسطہ رکھتا ہے"۔

"وہ بوڑھی تھی صوفی صاحب ـــــ مگر اس کی لڑکی مس تمر تمر اک دم جوان تھی ـــــ بس ترشا ہوا مجسمہ۔ سڈول"۔

"تو یوں کہو ـــــ مگر ہم تو تقریباً اٹھارہ سالوں سے ہر سال کلیر جا رہے ہیں۔ ان ناموں کی ماں بیٹیاں ہماری نظر سے نہیں گزریں"۔

"آپ سارے ڈیرے تو نہ جھانکتے پھرتے ہوں گے"۔

"جھانکنے کا کیا مطلب ہمارے تین چار خادم اسی کام میں لگے رہتے ہیں کہ ہمیں پوری طرح باخبر رکھیں۔ ایسا نہ کریں تو روضہ شریف پر فہرست کیسے پیش کی جا سکتی ہے"۔

"فہرست کس قسم کی؟"

"جتنی بھی زنان عاشقان اولیاء عرس میں آتی ہیں سب کی عمریں، نام اور صلاحیتیں خواجہ بندے علی کی وساطت سے قل کی پرچی میں پہنچائی جاتی ہیں۔ وہاں سے وہ روضہ پر پیش ہو کر جنت محل روانہ کر دی جاتی ہیں"۔

"خواجہ بندے علی تو شاید دس بارہ سال ہوئے مر مرا گئے"۔

"تمیز سے بات کیا کرو۔ اولیاء اللہ کا مرنا جینا کیا۔ انھیں بھی تم نے اپنے جیسا سمجھ رکھا ہے"۔

"سوری مگر یہ جنت محل کدھر ہے"۔

"عرش کے تیسرے پائے سے اس کا فاصلہ ٹھیک اتنا ہے جتنا عرش کے چوتھے پائے سے بغداد شریف کا ـــــ عالم برزخ کی تیسری منزل پر نورانی حجرہ ہے ـــــ چوتھی پر گلستان ارم۔ پانچویں پر فاختہ محل۔ چھٹی پر خواجہ اجمیری کی استراحت گاہ ہے۔ وہیں سے ایک راستہ جنت محل کی طرف جاتا ہے۔ دوسرا عرش کی طرف"۔

"آپ کی جغرافیائی معلومات پر غش غش کروں تو کیسا رہے؟"

"ضرور کرو۔ کون منع کرتا ہے ـــــ اور سنو گے کلیر اور اجمیر کا جتنا فاصلہ ہے ٹھیک اتنا ہی عالم مثال اور عالم برزخ کا ہے۔ بہشت کے پہلے درجہ کا تیسرا دروازہ جتنا اونچا

ہے اجمیری داتا کے روضہ کا گنبد بیت اللہ شریف کے میزاب رحمت سے آتنا ہی نیچا ہے۔ سورج جب علی الصباح اپنی قرارگاہ سے روانگی کے لئے نکلتا ہے تو اجمیری داتا کے روضے پر سلام عرض کرتا ہوا بہشت کے چوتھے دروازے میں داخل ہوتا ہے جو تیسرے دروازے کے مقابلے میں اتنا ہی اونچا ہے جتنا سورج کے مقابلے میں پہلی تاریخ کا چاند۔"

"مگر سائنس والے تو کہتے ہیں کہ چاند کے مقابلہ میں سورج زمین سے زیادہ فاصلہ پر ہے۔"

"کاذب ہیں وہ۔ انھیں عالم بالا کے اسرار سے کیا واسطہ تم خود دیکھو سورج کتنا بڑا نظر آتا ہے چاند اگر زیادہ قریب ہوتا تو سورج سے بڑا نظر آیا کرتا۔"

"بے شک سائنس والے تو اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ دین و مذہب کو غلط ثابت کر دکھائیں —— اب دیکھ لیجئے چاند پر جانے کے چکر میں ہیں۔"

"کیا تیر ماریں گے اگر پہونچ ہی گئے —— ہمارا ایک معمولی مرید جب چاہے مریخ ستارے پر ہو آئے خود ہم نے شروع کے دنوں میں چاند سورج کے نہ جانے کتنے سفر کئے —— اب یہ بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے —— خود سوچو، عالم برزخ تو ساتویں آسمان سے اوپر ہے۔ ہم کئی بار عالم برزخ کی سب سے اونچی چوٹی پر ہو آئے۔ چاند ستاروں میں کیا رکھا ہے۔"

"کبھی غلام کو بھی لے چلئے —— عالم برزخ کیا ہمالیہ سے بھی اونچا ہے ؟"

"میاں انڈے تو خوب بنائے ہیں تمہاری زوجہ نے ایک دو اور ہوں تو منگاؤ۔"

مجھے بیکلخت احساس ہوا کہ چار میں سے تین انڈے ان کے حلق سے اتر چکے ہیں اور چوتھے کا بقایا اب اترنے جا رہا ہے۔ مجھ بدبخت نے ابھی تک بس ایک ہی نوالہ لیا تھا۔

"میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا صوفی صاحب —— کہ انڈے کس فقہ نے جائز کر دیئے۔ یہ تو گویا مرغیوں کی نسل پر ظلم ہے۔ اگر انڈے میں سے بچہ نکال لیا جائے تو شاید گائے بکری ذبح کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے"۔

"ہم خود انڈے کے حق میں نہیں ہیں —— مگر تمہاری زوجہ اتنا اچھا بناتی ہیں کہ جب بھی تمہارے یہاں کھایا صفائے قلب میں نمایاں اضافہ محسوس ہوا۔"

"کیا غذاؤں کا بھی تعلق تزکیۂ نفس سے ہے ؟"

"کیوں نہیں۔ سونڈے دار کی یونل خلط ہضیم کو لطیفۂ قلبی سے وابستہ کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ لطیفۂ قلبی ہی ہے جو خلط ہضیم سے مل کر سالک کو برزخ کے پل سے گذارتا ہے"

"اور انڈا ؟"

"یہ خلط توحید کو مادۂ القان کی طرف صعود کرنے کی توفیق دیتا ہے —— میاں ایک دو تو اور منگاؤ۔"

"دیکھئے —— دیکھتا ہوں"

میں نے گھر میں جاکر ملائن سے عرض کیا:۔

"صوفی صاحب انڈے اور مانگ رہے ہیں۔"

"کیا چاروں آپ کھا گئے ؟"

"میری خلط توحید پہلے ہی مادۂ اتقان کی طرف صعود کر چکی ہے —— ایک میں سے بس چوتھائی کھایا تھا۔"

"صوفی صاحب سے کہئے یہاں مرغیوں کا فارم نہیں کھلا ہوا ہے —— آخر کس طرح کے دوست ہیں یہ آپ کے —— ذرا حیا شرم نہیں۔ جو آتا ہے ناشتے طلب کرتا ہوا آتا ہے"۔

"حیا شرم تو نیک بخت —— عورتوں کا زیور ہے میرے دوست سب کے سب بفضلہ تعالیٰ مرد ہیں"

"سارا اللہ کا فضل آپ ہی کے دوستوں پر ہو گیا ہے۔ مجھ بدبخت کے لئے تو عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں رہا۔"

"اچھا بس اب رونا شروع مت کر دینا —— میں صوفی صاحب کو سمجھاتا ہوں"

مردانے میں لوٹ کر میں نے صوفی صاحب سے پوچھا:

"آپ ابھی فرما رہے تھے کہ میں انڈے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"وہ اور لحاظ سے تھا۔ گویا ہمیں انڈا پسند نہیں مگر ریاضت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ذرا دلاری سے کہو پانی تو بلا

"چائے پر پانی ؟"

"اس سے بھی تزکیہ میں مدد ملتی ہے۔ پانی کی لطافت چائے کی کثافت کو نقطۂ اعتدال پر لے آتی ہے"۔

"پھر تو میں ابھی لایا"۔

"نہیں تم کیا کرو گے ——— آواز دے لو نا۔ نوکرانی آخر کس لئے ہے"۔

"وہ ذرا لحاظ دار ہے قبلہ۔ میں خود جو لے آتا ہوں"۔

"چلو چھوڑو ہم دوسری طرح کام چلالیں گے"۔

"دوسری طرح ؟"

"ایسے وظائف بھی ہیں جو مادیات کی کثافت کو لطافت میں تبدیل کر دیتے ہیں ہاں انڈے اور نہیں لائے ؟"

"پتہ نہیں ریفریجیٹر کی تالی ملائن کہاں رکھ کر بھول گئی ——— اسی میں بند تھے ——— پھر سہی"۔

"کیا پھر سہی ——— ہمارے مریدوں کا ایک وصف خاص طور سے نوٹ کر لو وہ کبھی کچھ نہیں بھولتے ——— تمہاری زوجہ شاید کسی سے بیعت نہیں ہیں ؟"۔

"مجھ سے ہی بیعت ہیں ——— میں بھی تو نقشبندی سلسلے کا مجاز ہوں"۔

"واہ بھئی ! بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں کہاں معتبر ہے جو بیوی کی بیعت میاں کے حق میں معتبر ہو جائے ——— تم تو ویسے بھی کچے ہو"۔

"پھر آپ پکا دیجئے"۔

"اسی لئے تو متعدد بار سمجھا چکا ہوں کہ سلسلے میں داخل ہو جاؤ ——— سلوک کا سلوک طے ہو جائے گا۔ روپے کے روپے ہاتھ آئیں گے"۔

"چلئے آج مان لیا۔ اب مرید ڈھونڈنا میرا کام۔ سلوک طے کرانا آپ کا کام"۔

"دلاری ہی سے بسم اللہ کر ڈالو ——— دال کا حرف طریقت کی ابجد میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خواجہ منہاج جیسا جوگی کا قلندر دال ہی کے توسط سے قطبیت کے درجے کو پہنچا تھا"۔

"کاش میرا نام بھی دال سے ہوتا ——— کوئی پرواہ نہیں اب خاندان بھر کے ہر بچے کا نام دال سے رکھوانے کی کوشش کروں گا ——— کچھ نام بتلائیے دال والے"۔

"دلدار علی۔ دولت حسین۔ دیدار حسن ——— بہت ہیں"۔

"فرض کیجئے لڑکیاں ہوں ؟"

"دردانہ خاتون ——— دینار بیگم"۔

"یہ تو فقط دو ہوئے"۔

"اور بھی سوچے جا سکتے ہیں"۔

"دل ہی تو ہے چلے گا ؟"

"یہ تو فلم کا نام ہے"۔

"اچھا داغ تمنا۔ درد جگر ———"

"ارے کہاں کی لے بیٹھے ——— دلاری کیا چوبیس گھنٹے تمہارے ہی یہاں رہتی ہے ؟"

"میں نے کبھی غور نہیں کیا ——— نہیں رہتی ہوگی تو اب رہنے لگے گی ——— میں اسے آپ سے بیعت کرا کے چھوڑوں گا"۔

"جزاک اللہ ——— تم آدمی کام کے ہو بشرطیکہ دماغی دورہ تم پر نہ پڑے ——— یہ کبھی کبھی آخر تمہیں کیا ہو جاتا ہے ؟"

"میں بے حد سوختہ بخت ہوں صوفی صاحب ! جتنے عشق کئے سب ناکام رہے۔ اب سوچ رہا ہوں تصوف ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لوں"۔

چائے ختم ہو چکی تھی۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ صوفی صاحب کسی قیامت کا مژدہ سنانے تشریف لائے تھے۔

"قبلہ وہ بات تو رہ ہی گئی ——— آپ کہہ رہے تھے کہ بڑی بے ڈھب قیامت آئی ہے"۔

"ارے ہاں ——— رات اخبار الجمعیۃ میں پڑھا تھا استاد ذوق کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا ؟"

"کہاں کے رہنے والے تھے ؟"

"کمال کرتے ہو ——— کیا محمد ابراہیم ذوق کا کلام نہیں پڑھا ؟"

"پڑھا تو نہیں البتہ سنا ہے ——— کلیر شریف میں

اب سے تین سال پہلے مس انار دانہ تشریف لائی تھیں ـــــ ہر مجرے میں ذوق ہی کا کلام پڑھتی تھیں ـــــ ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ بھاؤ بتاتے بتاتے وہ مراد آباد کے صوفی چقماق کی سفید داڑھی سے اٹکھیلیاں کرنے لگیں تو صوفی صاحب نے احتجاج کے طور پر ذوق کا یہ شعر پڑھا :-

اے ذوق تکلف ہے شرافت کی نشانی
دہقان ہیں وہ جو کہ تکلف نہیں کرتے

اس پر مس انار دانہ نے برجستہ ذوق ہی کا دوسرا شعر ان پر الٹ دیا :-

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے

بس پھر کیا تھا صوفی چقماق نے کھٹ سے مس انار دانہ کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ تقریباً مونڈھے کے قریب سے پکڑ لیا اور گردن ہلا ہلا کر یہ شعر پڑھنے لگے :-

پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
لیکن نگاہ یار کی شہ پا کے پی گیا

مس انار دانہ نازو ادا سے بولیں کہ ذرا تحمل سے کام لیجئے صوفی صاحب ۔ صوفی صاحب نے دوسرا ہاتھ بھی پکڑ کر برجستہ جواب دیا :-

فارغ تو نہ بیٹھے گا کلبہ میں جنوں میرا
یا تیرا گریباں چاک یا میرا گریباں چاک

اس پر پھولواری قہقہہ زار بن گئی اور پھر اسی لمحے نہ جانے کس نے طنابیں کاٹ دیں ۔ پھولواری کا بڑا حصہ مجمع پر آ رہا ۔ چیخیں بلند ہوئیں ۔ ہل چل مچ گئی ۔"

" تم بھی وہیں تھے ؟ " ـــــ صوفی صاحب نے بڑی دلچسپی سے پوچھا ۔

" نہ ہوتا تو یہ سب کیسے جانتا ۔ قنات کا ایک بانس میرے سر میں بھی لگا تھا ۔ بس تیل مالش کا مزا آگیا تھا ۔"

" پھر کیا ہوا ؟ " موصوف داستان کی گہرائیوں میں گم تھے ۔

" کیا پتا کیا ہوا ؟ " ـــــ یہ دلچسپیاں تو عرسوں تیں

چلتی ہی رہتی ہیں ۔ آپ ذوق کے بارے میں کچھ کہتے جا رہے تھے ۔"

" ہاں ـــــ وہ بہادر شاہ ظفر کے استاد خاقانی ہند محمد ابراہیم ذوق کے مزار کو دہلی میونسپل کارپوریشن نے پبلک خانہ میں بدل دیا ۔ حد ہوگئی شقاوت کی ۔"

" یوں کہئے حد ہوگئی جمہوریت کی ـــــ مزاروں پر فاتحہ تو فقط مسلمان پڑھتے ہیں ۔ رفع حاجت کی ضرورت تو قومی ضرورت ہے ۔"

" ارے سنو تو احمق آدمی ـــــ کونسلر حکیم شریف خاں صاحب نے اس پر کتنا سخت احتجاج کیا ہے ۔ وہ اسے پہلے تو بالکل صاف لفظوں میں انتہائی شرمناک ، جاں گداز اور افسوسناک واقعہ قرار دیتے ہیں ، پھر کہتے ہیں کہ قافلہ سالار جنگ آزادی کے استاد کی آخری یادگار کی اس بے حرمتی کو آنے والا مؤرخ کبھی معاف نہ کرے گا ۔"

" اس سے کیا ہوتا ہے ؟ "

" یار ذوقی کا ثبوت مت دو ـــــ کیا دھمکی کوئی معمولی ہے کہ آنے والا مؤرخ کبھی معاف نہ کرے گا ۔"

" جن لوگوں کو یہ دھمکی دی گئی ہے ـــــ تاریخ بیچاری تو ان سے پناہ مانگتی ہے ـــــ آنے والا مؤرخ جب لکھے گا کہ تاج محل اور لال قلعہ ہندو راجاؤں نے بنوائے تھے تو آپ اس کا کیا بگاڑ لیں گے ۔"

" کچھ بھی ہو ۔ یہ حادثہ قیامت سے کم نہیں کہ اتنے بڑے استاد سخن کا مزار پبلک بیت الخلاء میں تبدیل کر دیا جائے ـــــ کوئی باغیرت مسلمان اسے برداشت نہیں کر سکتا ۔"

" پھر میاں اور آپ کس دل گردے سے برداشت کر رہے ہیں ؟ "

" ہم ہرگز برداشت نہیں کر رہے ـــــ جب سے اخبار پڑھا ہے قلب و جگر میں آگ لگ رہی ہے ۔"

" لسی پی ہوتی ـــــ "

" دو گلاس پی چکے ہیں ـــــ میاں شربت روح افزا نہیں رکھتے گھر میں ۔"

" اب رکھا کروں گا ـــــ جس دن عاجز کی قبر کو

سنڈیاس میں تبدیل کر دیا جائے آپ، روح افزا کے دو تین
گلاس یہیں آکر پیجئے گا ۔"

" تم جیسے بے فکرے اتنی جلدی کہاں مرتے ہیں ——
ہمیں بھی مار کر مروگے ۔"

" آپ کے مرنے کا کیا سوال —— ویسے اللہ بھی کہیں
مرتے ہیں ——"

" ہاں خیر وہ تو ہے —— اچھا اب چلوں گا —— مرزا
نکیر کی صاحبزادی کو بسم اللہ کرانی ہے ۔"

" کیا مطلب —— مرزا نکیر کے تو ایک ہی صاحبزادی
ہے جہاں آرا ۔"

" اسی کو تو کرانی ہے ۔"

" وہ تو بی ۔ اے میں پڑھتی ہے ۔"

" جی ہاں —— مرزا نکیر کو بڑی مشکل سے یہ بات
سجھائی ہے کہ بچی کو گھر پر دینیات کے کچھ اسباق پڑھواؤ
ورنہ کرسٹان ہوجائے گی ۔"

" کیا وہ بچی ہے آپ کی نگاہ میں ——"

" نہیں تو کیا بوڑھی ہے —— میاں اتنا ہے نہیں تھے
تو ایک دو پیرا نتھا ہی ڈلوا لیا ہوتا ۔"

" کیا دینیات کے اسباق اسے آپ ہی دیا کریں گے ؟"

" اب کیا کریں —— اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے تو ہر طرح
کی دردسری مول لینا پڑے گی —— اچھا فی امان اللہ
اگلی صحبت میں پرانتھے کا خیال رکھنا ۔"

وہ تشریف لے گئے تو میں نے ملائن کی نبضیں ٹٹولیں ۔

" اچھا تو سفر کے لئے ناشتے میں کیا دے رہی ہو ؟"
میں نے چائے کے برتن باورچی خانہ کے تختے پر رکھتے ہوئے
بڑے ہشاش بشاش لہجے میں سوال کیا ۔

" کیا آپ مطمئن ہیں کہ بھیا سے اجازت حاصل کر سکیں گے ؟"

" امید پر دنیا قائم ہے ۔ مجھے یقین ہے تم مجھے مایوس
نہیں ہونے دوگی ۔"

" مجھ سے تو ہرگز امید مت رکھئے —— آپ
جانیں اور وہ ——"

" کیا تم پسند کروگی کہ تمہارا شریک حیات کافر ہوجائے
مایوسی کو اللہ میاں نے کفر کہا ہے ۔"

" میں خود بھی اس کفر میں آپ کی شریک ہوجاؤں گی
پھر کیا حرج ہوگا ۔"

" تو یوں کہو کہ سارے عہد و پیمان بھول گئیں —— تم نے
وعدہ کیا تھا کہ زندگی بھر عہد وفا نبھاؤں گی ——"

" وعدوں کے سلسلے میں میں آپ ہی کی تقلید بننے کا
ارادہ کر رہی ہوں   خدا کے لئے قلم کاغذ لے کر
بیٹھئے ——"

" ایا ہجوں کا کام ہے قلم کاغذ لے کر بیٹھنا —— مجھے
کیا سمجھتی ہو ۔ تمہارا بالکل ہی محتاج تو نہیں ہوں ۔ اجازت تو
ایسی لے کر دکھلاؤں گا کہ تم بھی یاد کروگی ۔"

اب میں گھر سے نکلا اور مولوی غمناک کی طرف روانہ
ہوا۔ ان سے مدیر تجلی کے تعلقات خاصے گہرے ہیں۔
خوش قسمتی سے وہ بیٹھک ہی میں ملے ۔

علیک سلیک کے بعد حرف مدعا زبان پر لایا ۔

" کہئے مولانا —— آپ بھی چل رہے ہیں نا اس سال
سرہند شریف کے عرس میں ؟"

" کس نے کہا یہ آپ سے —— نعوذ باللہ
من شرور انفسنا ——"

" کیا مطلب ؟"

" ارے بھئی میں عرسوں میں کب جاتا ہوں ۔"

" اب کی تو حضرت مہتمم صاحب بھی جا رہے ہیں
کیا آپ ان سے بھی بڑے وہابی ہوگئے ۔"

" استغفراللہ   وہ عرس میں نہیں جا رہے ہیں ——
یہ الگ بات ہے کہ زمانہ عرس ہی کا ہو ۔"

" پھر کیوں جا رہے ہیں ؟"

" منشی برہان سے معلوم ہوا کہ ان کے بعض احباب معتقدین
پاکستان سے عرس میں آرہے ہیں ۔ اب پاکستانیوں کے لئے تو
انتقال مکانی بغیر ویزا کے ممکن نہیں لہٰذا حضرت مہتمم صاحب
ان سے ملاقات کرنے سرہند جائیں گے ۔"

"مگر میں نے سنا ہے کہ اب وہاں زنانِ عاشقانِ اولیاء بھی بہت آتی ہیں۔"

"کیا بکواس ہے ——— زنانِ عاشقانِ اولیاء۔!"

"جی ہاں ——— یہ القاب میرا دیا ہوا نہیں ہے دیکھیں الافتخار خواجہ قلبت نے اپنے ملفوظات میں یہی القاب دیا ہے ——— صفحہ ۱۰۹ سطر چودہ۔"

"بھئی عورتیں تو آتی ہی ہیں ——— مگر سنا ہے ان کے لئے الگ احاطہ ہے۔ مزار پر انھیں نہیں جانے دیا جاتا۔"

"احاطہ میں وہ کیا کرتی ہیں؟"

"عجیب سوال ہے ——— کرتی کیا ہیں یہ ہمیں کیا معلوم!"

"بس تو یہی معلوم کرنے ہم اور آپ چلیں ——— آخر تحقیق و تجسس کی تو شریعت نے بھی ہدایت کی ہے۔"

"پاگل ہو تم غیر عورتوں سے ہمیں کیا مطلب؟"

"کیا آپ تسلیم نہیں کرتے کہ سارے عورت مرد حضرت آدم کی اولاد ہیں ——— پھر آخر کوئی غیر کہاں سے ہو گیا۔"

"میں تمہاری طرح پیدائشی منطقی نہیں ہوں۔ میرے نزدیک عرس کے دنوں میں سرہند بھی جانا جائز نہیں۔"

"پھر مہتمم صاحب جو جا رہے ہیں؟"

"بھئی کہہ تو دیا وہ بعض دوستوں سے ملنے جا رہے ہیں مقصد شرکت عرس نہیں تو گناہ کیسے لازم آئے گا۔"

"میں بھی آپ کو عرس میں شرکت کی غرض سے نہیں لے جانا چاہتا ——— تحقیق کریں گے کہ عورتیں وہاں جا کر کیا کرتی ہیں۔"

"میری عمر کے آدمی سے تم اس طرح کی باتیں کرتے ہو۔ افسوس تمہاری جوانی بے راہ روی میں گزر رہی ہے۔"

"آپ برا مان گئے یقین کیجئے آپ کی شان میں گستاخی ہرگز مقصود نہیں۔ میں آپ سے ایک بات سمجھنا چاہتا ہوں۔"

انھوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے گھورا۔

"کل صبح میں دیر سے اٹھا تھا ——— سورج طلوع ہونے والا تھا۔ بھاگا بھاگا ہوا پڑوس کی مسجد میں گیا اور وضو کر کے نیت باندھنے لگا۔ اسی وقت وہاں کے امام صاحب نے ٹوکا کہ اس وقت نماز کی ممانعت ہے۔ سورج نکلنے ہی والا ہے ——— میں نے پوچھا سورج کے طلوع سے کیا ہوتا ہے کہنے لگے کہ چونکہ آتش پرست طلوع اور غروب ہوتے ہوئے سورج کی پرستش کیا کرتے تھے اس لئے شریعت نے ان اوقات میں نماز کو ممنوع قرار دیا تاکہ تشبّہ نہ ہونے پائے۔"

"ٹھیک تو کہا امام صاحب نے۔"

"جی ہاں ——— مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ نہ تو مسجد میں کوئی ایسا آدمی موجود تھا جسے میری نماز سے یہ شبہ ہوتا کہ میں سورج کی پوجا کر رہا ہوں۔ نہ میرا ہی مقصد سوائے نماز کے کچھ اور تھا ——— پھر یہ ممانعت کیوں؟"

"ارے بھئی تشبہ ہوا ——— نفسِ مشابہت ہی کافی وجہ ممانعت ہے۔"

"مگر آپ ابھی فرما رہے تھے کہ مہتمم صاحب کا مقصد چونکہ عرس میں شرکت نہیں اس لئے ان کے سفرِ سرہند پر اعتراض کی گنجائش نہیں ——— کیا اس معاملہ میں تشبہ کی منطق نہیں چلے گی؟"

"اوہ ——— تو تم اس طرح مجھے ضیق میں پھانس رہے ہو ——— صاحبزادے ——— مہتمم صاحب ہم تم سے زیادہ ذی علم ہیں۔"

"اچھا یہ بتائیے ——— اگر مہتمم صاحب قبر کو سامنے رکھ کر نماز پڑھیں تو فقہاء اس بارے میں کیا کہیں گے؟"

"قبر کو سامنے رکھ کر نماز پڑھنا ہر ایک کے لئے ممنوع ہے۔ خواہ کوئی بھی ہو۔"

"لیکن مہتمم صاحب کے بارے میں تو یہ شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قبر کو سجدہ کر رہے ہوں گے۔"

"نہ کیا جا سکتا ہو ——— مگر ممنوع تو ممنوع ہی ہے۔"

"اس کے باوجود آپ کہتے ہیں کہ عرس کے موقعہ پر حضرت موصوف کا سرہند جانا گناہ نہیں ——— کیونکہ ان کا مقصد دوستوں سے ملنا ہے۔"

"دیکھو میاں بحث مباحثے کو ہم پسند نہیں کرتے۔ تمہیں بڑوں کا ادب کرنا چاہئے۔ مہتمم صاحب پر اعتراض کر کے اپنی عاقبت خراب مت کرو۔"

کون کافر ان پر اعتراض کر رہا ہے —— ناچیز تو الٹا یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ حضرت موصوف سرہند جا رہے ہیں اس لئے میں اور آپ بھی اس جائز کام میں حصہ لے ڈالیں۔ بار بار ایسا موقعہ کہاں ہاتھ آئے گا۔"

"میں تو کسی قیمت پر نہیں جاؤں گا —— تم جاؤ تو جاؤ۔"

آپ اپنے دوست سے اجازت دلوا دیں ان کی زبردستیوں سے میں تنگ آچکا ہوں۔"

"کون دوست؟"

"مدیر تجلی —— آپ کا وہ بہت لحاظ کرتے ہیں۔"

"تمہیں خبر نہیں عزیزم —— ان سے ہم نے قطع تعلق کر لیا ہے۔"

"ارے —— آخر کیوں؟"

"مولانا طمطراق کی ایک گشتی آئی تھی کہ مدرسہ سلطان العلوم کا جو بھی مدرس یا ملازم جماعت اسلامی سے یا جماعت اسلامی کے کسی حمایتی سے تعلق رکھے گا اسے کان پکڑ کر مدرسے سے نکال دیا جائے گا۔ پھر بتاؤ کیسے معاملہ نبھے۔"

"مگر حضور تو خود جماعت اسلامی کو پسند کرنے والوں میں ہیں۔"

"وہ قلب کا معاملہ ہے —— لگا رگایا روزگار تو آخر نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"ٹھیک کہتے ہیں —— اچھا اجازت چاہوں گا۔"

میں وہاں سے لوٹا تو یہ شعر زبان پر تھا:-

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انساں سے

اب ایک آخری سہارہ مولانا تیغ علی کا رہ گیا تھا۔ اسے بھی سوچا کہ آزما ہی لوں۔ مولانا تیغ علی خانقاہ درویشیہ کے ہیڈ ہیں۔ ہیڈ کیا یوں کہئے چیف آف اسٹاف خانقاہ کی اصطلاح میں انھیں حضرت جی کہا جاتا ہے۔ عرس و قوالی کے خلاف ہیں مگر مزارات کی حاضری ان کے یہاں طریقت کے نصاب میں داخل ہے۔ مدیر تجلی ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔

اپنی حالت زار پر کڑھتا ہوا ان کی خدمت میں پہنچا بڑی شفقت سے فرمانے لگے:-

"آؤ بھئی آؤ۔ بہت دنوں میں نظر آئے۔ بال بچے تو خیریت سے ہیں۔"

"آپ بزرگوں کی دعائیں ہیں —— کئی دن سے جی چاہ رہا تھا کہ آپ کے دیدار سے مشرف ہوں۔ پرسوں خواب میں بھی آپ کو دیکھا تھا۔"

"اوہو۔ کیا دیکھا تھا؟"

"آپ نورانی لباس پہنے ایک شاہی تخت پر بیٹھے ہیں۔ حوریں مورچھل ہلا رہی ہیں۔ چاروں طرف خدام مؤدب کھڑے ہیں۔ دفعتاً آپ نے مجھ سے فرمایا کہ بدبخت تم اب تک سرہند شریف نہیں پہنچے۔ حضرت مجدد راہ تک رہے ہیں۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ حضور کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ مجھ رند خانہ خراب کا انتظار بھلا حضرت مجدد کو کیوں ہونے لگا۔ جناب نے فرمایا کہ نہیں ہم نہیں سمجھتے۔ ملاءِ اعلیٰ پر تمہارے قلب کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ اس میں ایسی صلاحیتیں وافر مقدار میں پائی گئی ہیں جنھیں حضرت مجدد کی روح پر فتوح اپنی خاص عنایت سے تربیت دیکر برزخ ہفتم میں پہنچا دے گی۔"

"خواب تو ماشاءاللہ بہت بہتر ہے —— اچھا ہوتا کہ سرہند ہو ہی آتے۔"

"میں جانے کو تیار تھا —— مگر تجلی کے مدیر صاحب راستہ روک کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ انھیں سمجھا دیجئے کہ میری عاقبت برباد نہ کریں۔"

"غالباً انھوں نے اس لئے روکا ہوگا کہ اب عرس ہونے والا ہے —— عرس کے دنوں میں تو واقعی جانا ٹھیک نہیں۔"

"مجھ سے خواب میں آپ نے یہ الفاظ بھی کہے تھے کہ فوراً جاؤ تاخیر کروگے تو مشتری ستارہ برج عقرب عقرب میں داخل ہو جائے گا۔"

"ہو سکتا ہے خواب میں القار شیطانی کا بھی کچھ دخل ہو۔ ماہ صفر میں برج عقرب مشتری کے ہاتھ نہیں آ سکتا۔ مشتری تو اس ماہ میں عطارد کا ہم جلیس رہتا ہے۔"

"لعنت ہے مجھ پر —— اب آپ کے کہنے سے یاد آیا کہ خواب میں آپ نے عطارد ہی کا نام لیا تھا —— مدیر تجلی سے اجازت دلوا دیجئے غلام آج ہی سرہند روانہ ہو جاتا ہے قلب کی پرسوں سے عجیب کیفیت ہے جیسے سینے سے اب نکلا اور تب نکلا۔"

"ضبط سے کام لو۔ ایسی کیفیات اہل دل کی آزمائش ہوا کرتی ہیں۔ کیا تم نے کبھی کسی شیخ کا دامن پکڑا ہے؟"

"جی ہاں خواجہ برکت علی میرے پیر ہیں۔ ان کی بھی یہی رائے ہے کہ سرہند فوراً جاؤں —— وہ آپ کو قطب وقت قرار دیتے ہیں۔"

"ان کا حسن ظن ہے۔ ہم کیا اور ہمارا درجہ کیا۔ یہ تو بس حضرت شیخ کا تصرف ہے کہ —— خیر دیکھو ہم مدیر تجلی سے کہیں گے کہ وہ معاملات کو سمجھیں۔ ان سے کہنا کہ مولانا نے تمہیں بلایا ہے"۔

"بہت بہتر —— شکریہ۔"

"میں نے مولانا کے خادم خاص زردس الحق کو تلاش کیا۔ وہ میرا پرانا آشنا سا ہے۔ بہت سادہ دل اور بے عذر۔ وہ بلا کسی تامل کے مدیر تجلی تک یہ پیغام پہنچانے پر راضی ہو گیا مولانا تاج علی صاحب نے آپ کو فوراً یاد کیا ہے۔ انتہائی ضروری کام ہے

مدیر تجلی اسی دن مولانا سے مل تو آئے مگر ثمرہ کیا نکلا اس کا اندازہ ذیل کے واقعے سے کیجئے کہ بعد مغرب وہ غریب خانہ پر تشریف لائے ہیں تو ماتھے پر نصف درجن بل تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی بہن سے پوچھا :-

"وہ گدھا کہاں ہے؟" لہجہ بے حد خار دار تھا۔ میں دالان سے نکل کر صحن میں آیا۔

"السلام علیکم"۔

جواب میں ایک طویل سی "ہوں" کانوں تک پہنچی اور اس کے پہلو بہ پہلو ایک ایسی نظر —— جو بلیڈ سے کم دھار دار نہیں تھی۔

"تو تم سرہند جانا چاہتے ہو ——؟" وہ کرسی پر جم گئے۔

"جی وہ میرے دو تین دوست پاکستان سے سرہند کے عرس میں آ رہے ہیں ان سے ملاقات کرنی ہے۔"

"مگر تم تو کبھی پاکستان نہیں گئے —— وہاں تمہارے دوست کیسے پیدا ہو گئے۔"

"وہ —— وہ پہلے ہندوستان ہی میں تھے ایک تو مرزا رحمٰن ہیں۔ دوسرے خواجہ ذوالفقار ......"

"تیسرے کوئی دو فی ہوں گے —— آخر کب تک اپنی مٹی پلید کروگے۔ تمہیں شرم کرنی چاہئے۔"

"کیا آپ خوابوں میں یقین نہیں رکھتے۔ آپ ہی نے کسی مضمون میں لکھا تھا کہ رویا نبوت کا چالیسواں جز ہیں۔"

"میں تمہارے کان اکھاڑ کر گدی میں لگا دوں گا۔ مولانا تاج علی جیسے نیک دل بزرگوں سے ٹھٹھول کرنا بہت بری بات ہے"۔

"پھر آخر کیا کروں —— آپ سے انھوں نے ضرور کہا ہوگا کہ مجھے سرہند جانے کی اجازت دیدیجئے۔"

"میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ —— کیا سے کیا ہو گئے ہوتے اگر آوارگی میں سارا وقت برباد نہ کرتے۔"

"مجدد الف ثانی کو تو آپ بھی بہت بڑا آدمی مانتے ہیں۔"

"مگر میں تمہیں صحیح الدماغ تسلیم نہیں کرتا۔ مالیخولیا کے ادر کیا سینگ ہوتے ہیں۔ جاؤ اپنا کام کرو میں تمہاری صورت تک دیکھنا پسند نہیں کرتا"۔

"آپ مجھے سرہند کی اجازت دیدیجئے۔ کم سے کم ایک ہفتے تک میں اپنی منحوس صورت آپ کو بالکل نہیں دکھاؤں گا۔"

"بس دماغ نہ چاٹو —— اری نسیمہ کدھر ہے کھئی تو"۔ آئی بھائی جان —" وہ جھپٹ کر کمرے سے باہر آئی —" کھٹر آ جانا — کچھ مہمان آ رہے ہیں — میاں تم بھی دونوں وقت کا کھانا اور دونوں وقت کا ناشتہ وہیں کروگے —— ایک وقت بھی نظر آئے تو ..." فقرہ پورا کئے بغیر وہ چلے گئے —— اور اس طرح انھوں نے یہ امکان بھی ختم کر دیا کہ میں بلا اجازت ہی چپکے سے ایک آدھ دن کیلئے سرہند ہو آؤں۔ ہائے میری بے بسی۔ مرگ غیرت تری دہائی ہے (ملا زندہ صحبت باقی)

چند مفید کتابیں

نہایۃ التحقیق اردو شرح مسند ابوبکر صدیق رضؓ

یعنی جو کلام مبارک حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ سب کا سب یکجا۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ ایک مستند اور دقیقہ رس عالم نے مسند احمد بن حنبل کی اردو شرح کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ اور اسی سلسلہ کی پہلی کڑی نہایۃ التحقیق کے نام سے آپ کے سامنے ہے یہ بڑے سائز کے (۴۰۵) صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت صرف بائیس روپے ۲۲/- ۔ بڑی اہم بات یہ ہے کہ فاضل شارح نے شروع کتاب میں ایک طویل مقدمہ دیا ہے جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے اردو خواں طبقہ کے لئے فنِ حدیث کی باریکیوں اور اصطلاحوں اور اصولوں کو پوری تحقیق کے ساتھ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ بلند پایہ کتابوں کا نچوڑ، فنِ حدیث کی معلومات کا بیش بہا خزانہ۔ امید ہے کہ شائقین اس تحفۂ نادرہ سے فائدہ اٹھائیں گے

قیمت مجلد تیس روپے ۳۰/-

قرآن اور حدیث

قرآن اور حدیث میں کیا ربط ہے؟ سنت کا مفہوم اور مقام کیا ہے؟ رسالت کسے کہتے ہیں؟ ان ہی جیسے دسیوں سوالوں کا مدلل جواب۔ نیا ایڈیشن مع ڈسٹ کور

قیمت تین روپے پچاس پیسے ۳/۵۰

صہبائے خیال

ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر شکیل عاصم بریلوی کا مجموعۂ کلام، خوشنما گیٹ اپ کے ساتھ۔ قیمت چھ روپے ۶/-

البلاغ المبین

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف جو بدعت وسنت کی بہترین تشریح کرتی ہے۔ شریعت قبوری کے مقابلہ میں شریعت حقہ کی تعلیمات ضرور پڑھئے۔ شاہ صاحب کی سوانح بھی شامل ہے۔

قیمت مجلد چھ روپے پچاس پیسے۔ ۶/۵۰

فلاحِ ملت

بدعتوں کے رد اور صحیح عقائد کے اثبات میں ایک عام فہم، دلچسپ اور مفید کتاب جس دور میں بدعتیں عام ہوں۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ پیش لفظ مولانا عامرؒ کا ہے قیمت پانچ روپے۔ ۵/-

مسجد سے میخانے تک

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ملا ابن العرب مکی کے شہ پاروں کو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے پڑھنا بھی لطف سے خالی نہیں اس میں تبسم کی چاندنی اور طنز کی نمکینی ہی نہیں افادیت بھی ہے ملا فقط طنز برائے طنز، مزاح برائے مزاح پر بس نہیں کرتا وہ کسی نہ کسی اخلاقی مقصد پر بھی اپنی توجہ منعطف کراتا ہے۔

حصہ اول آٹھ روپے ۸/- ، حصہ دوم نو روپے ۹/-

تاریخ دیوبند

دیوبند ایک قدیم بستی ہے۔ اسکی سرزمین نے انقلابات کی بیشمار کروٹیں دیکھی ہیں، اور اب دارالعلوم کی وجہ سے بستی بین الاقوامی شہرت کی مالک بنگئی ہے۔ اس بستی کی دلچسپ اور محققانہ تاریخ جناب سید محبوب رضوی کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے۔ تاریخ نگاری میں مصنف موصوف کی بصیرت ایک امتیازی شہرت رکھتی ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپ کر ختم ہوگیا۔ اب دوسرا ایڈیشن فاضل مصنف کی نظرِ ثانی اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

صفحات (۵۱۲) قیمت مجلد دس روپے ۱۰/-

مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب تمیمی نجدی

آپ جانتے ہی ہیں کہ بدعتی حضرات اپنے سوا تمام مسلمانوں کو "وہابی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دراصل محمد بن عبدالوہابؒ کے نام نامی کی طرف نسبت ہے اور اس نسبت کو گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ سچائی کے متلاشی ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ فرما کر حقیقت سے آگاہ ہوں کہ محمد بن عبدالوہابؒ کس قدر سنت کے شیدائی، بدعت کے دشمن اور دین و ملت کے خیر خواہ تھے۔ انگریزوں نے انھیں بدنام کیا اور بدعتی لوگوں نے اس بدنامی میں چار چاند لگائے۔ اس کتاب کے مصنف "قطر" کے محکمہ شرعیہ کے قاضی احمد بن حجر ہیں اور ترجمہ صفی الرحمن الاعظمی نے کیا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ فاضل مترجم نے بیش قیمت نوٹ بھی حواشی پر بڑھائے ہیں۔

قیمت ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

شہدائے بدر

شہدائے بدر کے مختصر حالات و کوائف۔ قیمت ایک روپیہ ۱/-

تفسیر رشیدی

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے قلم سے بیس آیات قرآنیہ کی قابل مطالعہ تفسیر عارفانہ اور محققانہ۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے ۲/۵۰

مکاتیب گیلانی

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے قابل قدر خطوط کا مجموعہ۔ معقول و منقول کا خزانہ

قیمت مجلد پلاسٹک۔ دس روپے ۱۰/-

معرفت الٰہیہ

اسی کتاب کا معروف نام "خدا کی پہچان" بھی ہے۔ حضرت شاہ عبدالغنیؒ کے نہایت وقیع اور معرفت سے لبریز فرمودات حکمت و شریعت اور حسن ترتیب کا گنجینہ۔ قیمت مجلد بائیس روپے ۲۲/-

لعج

مولانا اشرف علیؒ کے خلیفہ شاہ مسیح اللہ کی نادر تصنیف موضوع نام سے ظاہر ہے۔ قیمت دو روپے ۲/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

مولانا منظور نعمانی کی مقبول کتاب اس میں وہ عام فہم زبان میں قرآنی مطالب بیان کرتے ہیں۔

قیمت:۔ سات روپے ۷/-

البدائع

مولانا اشرف علیؒ کی گراں قدر تالیف۔ جس میں نوع بہ نوع پیچیدہ سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ زبان اردو ہی ہے۔ قیمت مجلد پندرہ روپے ۱۵/-

التکشف عن مہمات التصوف

یہ بھی مولانا اشرف علیؒ کی معروف کتاب ہے مضامین نادرہ سے لبریز۔ قیمت مجلد۔ تیس روپے ۳۰/-

تربیت السالک

مولانا اشرف علیؒ کی بیش بہا کتاب دو ضخیم جلدوں میں دستیاب ہے ارباب ذوق اور تحفۂ عجیبہ سے فائدہ اٹھائیں۔

قیمت مکمل ہر دو جلد۔ چالیس روپے ۴۰/-

امام اعظم ابوحنیفہ

امام اعظمؒ کے حالات و کوائف مفتی عزیز الرحمٰن کے قلم سے مجلد نو روپے ۹/-

ورق ورق روشن

اخلاقی اسباق اور علم و حکمت کا ایسا خزانہ جو ہر دل و دماغ کو روشن کرے گا۔ اس کتاب میں مؤلف نے قرآن و حدیث، تاریخ، آثار اور معیاری لٹریچر سے اللہ، رسول اور دنیا بھر کے دانشوروں، مصلحوں اور عالموں کے بہت ہی مفید و نفیس ارشادات حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایمان یا انصاف یا اعتقاد یا انتقام کے بارے میں آپ مواد دیکھنا چاہیں تو الف کی فہرست میں یہ عنوان مل جائے گا۔ اسی طرح کسی بھی لفظ کو اس کی فہرست میں باسانی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

بہت شاندار اور لاجواب کتاب ہے۔

قیمت مجلد تیس روپے ۳۰/-

صفحات (۴۸۴)، متوسط سائز

مکتبہ تجلی دیوبند۔ یوپی

غنیۃ الطالبین ابعد — مصنف:- شیخ عبد القادر جیلانی رح
قیمت مجلد تیس روپے ۳۰/-

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات — قاہرہ کے ایک فاضل بیرسٹر عبد اللہ عنان کی تالیف۔ نئے اسلوب میں۔ تاریخ اسلام کے بعض وقائع پر علم و تحقیق کی روشنی۔ قیمت نو روپے ۹/-

تذکرہ مولانا عبد اللطیف نعمانیؒ — ملک و ملت کی ایک ممتاز شخصیت مولانا عبد اللطیف نعمانیؒ شیخ الحدیث مفتاح العلوم مئو۔ ۱۳۹۲ھ کی دینی، علمی، سیاسی، اور مجاہدانہ زندگی کے زندۂ و جاوید کارنامے اور اہلِ علم اور رہنمایانِ ملک و ملت کے خراج ہائے عقیدت۔ قیمت:- پانچ روپے۔

مکتوبات خواجہ معصوم سرہندیؒ — معارف و اسرار ہدایات و نصائح اور نکات و لطائف سے لبریز خطوط اردو لباس میں۔ مطالعہ کی بہترین چیز۔ قیمت سات روپے ۷/-

سیرت خلفائے راشدین — خلافت راشدہ کے خصائص و حقائق اور چار خلفائے راشدین کے تفصیلی حالات۔ مصنفہ:- مولانا عبد الحیؒ۔
قیمت پانچ روپے ۵/-

منتخب تقریریں — مشہور عالم دین مولانا منظور نعمانی کی اصلاحی تقریریں۔ ہر ہر صفحہ سبق آموز اور ایمان پرور۔ قیمت مجلد چھ روپے ۶/-

پیام انسانیت — زندگی کے مسائل پر نئے طرز سے سوچنے اور نئے انداز میں کوشش کرنے کی طرف دعوت دینے والی۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی کی پانچ اہم تقریریں۔ قیمت ۲/۵۰

مقام انسانیت — یہ بھی مولانا موصوف کی پانچ تقریریں ہیں۔ جن میں ضروری موضوعات پر مفکرانہ گفتگو کی گئی ہے۔ قیمت۔ دو روپے ۲/-

امثال القرآنی ضخیم ایڈیشن عمدہ کاغذ، کتابت طباعت نہایت عمدہ مجلد	۳/-
تفسیر سورہ حجرات۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رح	۰/۷۵
فارسی کی پہلی کتاب مع ٹائٹل	۱/۲۵
" " دوسری کتاب	۲/۵۰
مفہوم القرآن پارہ الم	۴/۵۰
ہمارا دین حق	۳/-
اردو ہندی لغت	۶/۵
ہندی اردو لغت	۶/-
مسئلہ خلافت (مولانا آزادؒ)	۱۰/-
مشکوٰۃ شریف صرف اردو مجلد	۲۵/-
ترمذی شریف " " "	۲۲/۵۰
مسلم شریف " " "	۱۵/-
تجرید بخاری	۱۴/-
انتخاب صحاح ستّہ	۹/-
مشارق الانوار	۴/-
معجزات خیر الانام	۴/-
غیبی آواز	۴/۵۰
دیوبند سے بریلی تک	۳/۵۰
افادات وصیہ اردو مجلد	۱۴/-
کسب معاش کا مسئلہ اسلامی نقطۂ نظر سے	۳/-
رضیہ کا شاہی دسترخوان	۴/۵۰
ریحانہ کا شاہی دسترخوان	۴/-
کھانا پکانا	۷/۵۰
مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد مجلد	۹/-
تصوف کی حقیقت (شاہ ولی اللہ رح)	۹/-
تذکرہ شیخ الہندؒ مجلد	۸/-
پیالے (مولانا محمد طیب صاحب کو پیش کئے گئے)	۹/-
ایمان کیا ہے؟ مجلد	۹/-
مفتاح عملیات (یعنی عملیات کی کنجی)	۸/-
عرفان عارف (مولانا محمد طیب کا کلام منظوم)	۹/۵۰

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یوپی)

تبلیغی جماعت والے موقعہ کی تاک میں رہتے ہیں۔ جماعت اسلامی جب مشکلوں اور مصائب کے طوفانوں سے گذرے گی۔ دوچار گھونسے تبلیغی بھائی ضرور رسید کرگذریں گے۔ اس کے باوجود بھی یہ دعویٰ رہے گا کہ ہم فرشتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ تکرار د تصادم کیا چیز ہوتا ہے۔

شیشہ کے محل میں بیٹھ کر پتھر اچھالنے کا محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے جب آدمی خود کمزور ہونے کے باوجود دوسروں سے ٹکرانے کی احمقانہ جسارت کرے۔ مولانا زکریا کی تصنیفات جس پائے کی ہیں اس سے دنیا باخبر ہے۔ ان کے تبلیغی نصاب میں جو رطب و یابس بھرا ہوا ہے اس سے کون صاحب علم بے خبر ہوگا۔ آدمی اپنی تصنیفات میں کوڑا کرکٹ ہوتے ہوئے دوسروں کی معمولی باتوں پر تنقید کرنے پر اتر آئے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوگا کہ آدمی اپنے علم اور اپنی تصنیفات کے بارے میں اعلیٰ درجہ کی غلط فہمی کا شکار ہے کہ میں اتنا بڑا آدمی ہوں کہ بلندی سے میرے خلاف کچھ لکھنے کی جسارت نہیں کرسکتا اپنا لکھا اور جو بھی دل میں آئے۔

خدا نہ کرے کہ ہمارے شیخ الحدیث صاحب اس قسم کی غلط فہمی اور خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ اس قسم کی غلط فہمی اور خوش فہمی کا شکار نہیں ہیں تو وہ مولانا مودودی پر اتنے گھٹیا اور پست انداز میں تنقید کیوں کر گذرے جو شیشہ کے محل میں بیٹھ کر دوسروں پر ڈھیلے پھینکنے کے مرادف ہے اور جس کا ہر لفظ مولانا ذکریا کے تقدس اور بزرگی کو منہ چڑا رہا ہے۔

فتنۂ مودودیت جیسی پست کتاب کی موجودگی میں آپ کا یہ فرمانا کہ نفرت و عداوت کی شروعات جماعت اسلامی کے عاملوں کی طرف سے ہوتی ہے، یا تو اعلیٰ درجہ کی سادہ لوحی ہے یا اعلیٰ درجہ کا فریب۔

(۴) ـــــ آپ نے مولانا ذکریا کی کتاب سے چند واقعات نقل کرنے کے بعد یہ تحریر فرمایا ہے کہ مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں مروجہ گشت صحیح ثابت ہوتا ہے۔

دیکھئے! آپ موضوع سے ہٹنے کی کوشش کررہے ہیں بحث جائز و ناجائز اور صحیح و غیر صحیح کی نہیں ہو رہی تھی۔ بحث تھی مسنون و غیر مسنون کی۔ یقین نہ آئے تو آپ اٹھا کر دیکھ لیجئے دسمبر کا شمارہ اس میں آپ کو یہ جملہ بھی نظر آجائے گا:۔

"مروجہ گشت کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ یہ سنت ہے انتہائی لغو بات ہے"

اس جملہ سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ہم نے گشت کے مروجہ طریقہ کو ناجائز قرار دیا تھا یا اسے غیر درست باور کرایا تھا۔ اس سے تو صاف یہ ثابت ہو رہا ہے کہ گشت کا مروجہ طریقہ ہمارے نزدیک مسنون نہیں ہے۔ ہم اسے انبیاء کے طریقۂ کار کے مماثل قرار دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اگر تبلیغی جماعت والے گشت کے مروجہ طریقہ کو اور چلّہ کشی کی مروجہ رسم کو سنت اور جہاد اصل باور کرانے کی کوشش نہ فرمائیں تو ہم جیسے گستاخوں کو قلم اٹھانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ ہم تو قلم اس وقت اٹھاتے ہیں جب کوئی افلاطون وقت تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار کو سنت ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ اور یہ باور کرانے کی جد و جہد کرتا ہے کہ خدا کو راضی کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تبلیغی جماعت سے رابطہ قائم کیا جائے اور اس کے طریقۂ کار کو جزو تبلیغ سمجھا جائے۔

جو واقعات آپ نے نقل کئے ہیں وہ سب کے سب موضوع سے ہٹے ہوئے ہیں ان میں سے کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ تبلیغی جماعت کا طریقۂ کار مسنون یا قرین سنت ہے۔ ان واقعات کو دلائل کے طور پر استعمال کرنا اس بات کی علامت ہے کہ تبلیغی جماعت والے ضرورت سے زیادہ سادہ لوح ہیں۔ ان بیچاروں کو یہ تک معلوم نہیں کہ جن واقعات پر ہم تکیہ کرکے بیٹھ گئے ہیں وہ سب کے سب ہمارے اور ہماری پالیسی کے خلاف پڑ رہے ہیں۔ آئیے ان واقعات پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔

(الف) ـــــ یہ بات تو خیر ممکن ہی نہیں ہے کہ بحث ہو اور تبلیغی جماعت کا کوئی فرد اصل موضوع سے راہ فرار اختیار نہ کرے ـــــ مولانا ذکریا ایک بڑے آدمی ہیں ـــــ مستند

عالم دین ہیں۔ بہت سی صلاحیتوں اور خصوصیتوں کے مالک ہیں۔ لیکن چونکہ تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں لہذا بحث کرتے وقت موضوعات سے بھاگنا ان کی بھی عادت ثانیہ بن ہوئی ہے۔ یہاں مولانا زکریا صاحب ثابت تو یہ کرنے جارہے تھے کہ مسلمانوں کی بستیوں میں اسی طرح جماعتیں روانہ کرنے کا معمول حضورؐ کے زمانہ میں بھی تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مسلمانوں کے قبائل میں جماعتیں روانہ کی تھیں۔ یہ ثابت کرتے کرتے دفعتًا انھوں نے ایک چھلانگ لگائی اور اصل موضوع سے ہزار میل کے فاصلہ پر جاکر یہ ارشاد فرمانے لگے کہ جب اس قسم کی کوئی بات مجھے اہل علم کی طرف سے پہنچتی ہے تو زیادہ حیرت ہوتی ہے حالانکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر مامور بہ ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مامور بہ کون مسلمان تسلیم نہیں کرتا۔ یہ بات کب کس نے زبان سے نکالی ہے کہ اشاعت اسلام اور تبلیغ دین فالتو اور فاضل قسم کی چیزیں ہیں۔ ضروریات و واجبات میں سے نہیں۔ ہر مسلمان جانتا ہے بلکہ جاننے کے ساتھ مانتا بھی ہے کہ تبلیغی جماعت جو کام کررہی ہے وہ دین کا ایک اہم ترین جزء ہے یہ اعتراف کرنے کے بعد جو لوگ تبلیغی جماعت کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس کے نصب العین اور مقصد پر انگشت نمائی نہیں کرتے بلکہ انھیں اس جماعت کے طریقۂ کار سے اختلاف ہے اور سمجھدار مسلمان کو اس طریقۂ کار سے اختلاف ہونا چاہئے جو سنت رسولؐ کے خلاف پڑ رہا ہو۔

مولانا زکریا کے الفاظ پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی ——— انھوں نے یہاں موضوع سے راہِ فرار اختیار کرکے ایک انوکھی مثال قائم کی ہے۔ یہ تو بالکل ایسا ہوگیا ہے جیسے کسی کوٹ پتلون پہننے والے کو اگر زید یہ نصیحت کرے کہ دیکھو بھائی کوٹ پتلون پہننا شرعی نقطۂ نظر سے غلط ہے لہٰذا اس کے پہننے سے احتراز کرو۔ وہ شخص یہ سنکر چراغ پا ہوجائے اور فرمانے لگے تعجب ہے کہ تم اسے غلط قرار دے رہے ہو حالانکہ ستر پوشی تو ضروری اور لازمی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ستر پوشی کے ضروری ہونے کا قائل تو زید بھی تھا البتہ زید اس بات کا قائل نہیں تھا کہ ستر پوشی کا ہر طریقہ اور ہر ذریعہ جائز اور مستحسن ہوگا۔ زید ستر پوشی کے معاملہ میں صرف اس طریقہ کو جائز اور قابل قبول تصور کرتا ہے جو آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا ہو یا جس کے اختیار کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہو۔

مولانا زکریا صاحب کی خدمت میں ہم ادب و احترام کے ساتھ عرض کریں گے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو آپ ہی کی طرح ہم بھی مامور بہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن اس مامور بہ کام کو انجام دینے کا جو طریقہ آپ لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ اس طریقہ سے ہمیں اختلاف ہے اور کم از کم اس طریقہ کو ہم سنت کہنے اور سمجھنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں

(ب) اس تحریر سے یہ ثابت ہوا کہ تبلیغی جماعت کا طریقۂ کار مباح ہے یعنی سنت اور واجب نہیں۔ اگر یہ بات ہے اور واقعتًا یہی بات ہے تو پھر تبلیغی جماعت یہ دعویٰ کیوں کرتی رہتی ہے کہ بس ہم ہی راہِ حق کے مسافر ہیں، بس ہمارا طریقۂ کار اور انداز تبلیغ قابل عمل اور قابل اختیار ہے۔ جب دین کو پھیلانے کے لئے ہر مباح طریقہ جائز اور قابل اختیار ہے تو پھر جماعت اسلامی اور ارباب مدارس بھی اپنے اپنے انداز اور اپنے اپنے طور پر دین کی خدمت میں سرگرداں ہیں کیا تبلیغی جماعت والوں نے ان حضرات کو بھی ایک لمحہ کے لئے بھی مجاہد اسلام اور خادم دین خیال کیا ہے ——؟

ہم تو غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ تبلیغی جماعت کا اصل مقصد اسلام کی اشاعت نہیں، اپنی اشاعت ہے وہ اسلام کی خدمت تو برائے نام کرتی ہے اصل خدمت تو وہ اپنے وجود کی کررہی ہے۔ اگر تبلیغی جماعت واقعتًا اسلام کی خادم ہوتی تو پھر اس کے دل میں ہر اس شخص کا احترام کا جذبہ ہوتا جو کسی بھی طریقہ سے اسلام کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ عالم یہ ہے کہ تبلیغی جماعت والے صرف ان لوگوں کو محبت و عقیدت کی نظروں سے دیکھتے ہیں جنھوں نے زندگی میں دو چار چلّے ضرور دیئے ہوں۔ اگر کسی شخص نے (باقی صفحہ ۵۳)

تبلیغی جماعت ——— ایک لمحۂ فکریہ

تالیف: مولانا محمد حارث صاحب۔ دہلوی
کاغذ متوسط۔ کتابت وطباعت مناسب
صفحات ۴۰۔ قیمت ۷۵ پیسے۔
ناشر: انجمن دعوت واصلاح ۱۰۴۲ — گلی
تہور خاں نیا بانس۔ دہلی ۶

اس چھوٹے سے کتابچہ میں تبلیغی جماعت کے بعض نقائص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس کے کردار وعمل کا حدود اربعہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کتابچہ میں مندرجہ ذیل عنوانات نظر سے گذرے۔

دنیا میں ہر خیر وخوبی ہماری وجہ سے ہے
بیرون ہند کے آنے والے۔
واپسی کے وقت مصافحہ۔
فضائل کی تعلیمی کتابوں میں ناقابل تسلیم واقعات
تبلیغی جماعت اہل علم کی سرپرستی سے محروم
جماعت میں پھوٹ
مال کی آمد وخرچ
حج اور عمرے
تبلیغی جماعت سے عدم موافقت پر بلاؤں کی دھمکیاں۔
بد دعائیں
جماعت کا مقصد ہی آجتک متعین نہیں ہو سکا
حضرت مولانا یوسف مرحوم کے لوگوں کی برطرفی
کرامتیں سنا سنا کر لوگوں کی برطرفی

ان عنوانات کے تحت جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ ابہام و اختصار کا مظہر ہی نہیں بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے تشنہ بھی ہے اور غیر مکمل اور ناکافی بھی۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہ کتابچہ ازراہِ تنقید لکھا گیا ہے اور تنقید برائے تنقید ہو، برائے ذوق ہو یا برائے اصلاح ہو اس کا بہر حال مکمل، جامع اور ہمہ گیر ہونا انتہائی ضروری ہے۔ تنقید اگر جامعیت سے محروم ہو گی، اس میں اکمال نہیں ہوگا، ہمہ گیریت نہیں ہو گی تو وہ تنقید نگار کے حق میں زہرِ قاتل اور باعث شامت بن کر رہ جائے گی۔

ہر تنقید نگار کے لئے ضروری ہے کہ کسی فرد یا جماعت پر تنقید کرتے وقت دلائل وبراہین کا ایک ڈھیر اپنے دامن میں مستحضر کر لے اور قلم اٹھاتے وقت اجمال واختصار کو قطعی طور پر نظر انداز کر دے۔ ایک اصول ذہن نشین کر لیجئے کہ کسی پر حملہ کرنے سے پہلے اپنا تحفظ ضروری ہے — ایک بات — دوسری بات یہ ہے کہ دورانِ جنگ میں کوئی ادچھا ہتھیار استعمال مت کیجئے جو خود آپ کے حق میں مضر ثابت ہو۔

اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ دور میں تبلیغی جماعت ایک بین الاقوامی جماعت تصور کی جاتی ہے اور کسی بین الاقوامی جماعت سے ٹکراتے ہوئے مذکورہ اصول کو پیشِ نظر رکھنے کے ساتھ ان باتوں کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ دوران ٹکراؤ میں کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جو اپنے حق میں اندھے کی لاٹھی ثابت ہو اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ علاوہ ازیں اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ اپنی طرف سے ظلم اور ناانصافی کا مظاہرہ ہرگز ہرگز نہ ہو۔

دشمن کو زیر کرنے کی غرض سے ایسی حرکتیں بھی ہرگز نہ

جو ظلم و زیادتی کی فہرست میں آتی ہیں مومنانہ روش نہیں ہے۔ آپ نے تبلیغی جماعت پر حملہ کرتے وقت ان سب باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے جوش میں آکر تبلیغی جماعت پر ایسے کچے ڈھیلے بھی اچھال دیئے ہیں جو غیر سنجیدگی پر دلالت کرتے ہیں۔ نمونتاً میں صرف ص۲۲ کی یہ عبارت پیش کروں گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے:

"جس بات کا حقیقت ہونا ایک بار واضح ہو جائے اس کو چھپانا اور محض اس خوف سے کہ اس کے اظہار میں میرے مفادات فنا ہوتے ہیں یا اور کوئی جذبہ دامنگیر ہے سوچئے یہ جذبہ کس قدر غیر اسلامی اور پست ہے۔ یہ کھلی ہوئی مداخلت فی الدین ہے یہ شیعہ فرقہ کی طرح تقیہ ہے"۔

آپ کی یہ عبارت قابل گرفت ہے۔ وہ اس لئے کہ کسی بھی حق بات کو چھپانا مداخلت فی الدین کے دائرے میں نہیں آتا۔ زید جہاد کی افضلیت پر پردے ڈالتا ہے محض اس بنا پر کہ کہیں لوگ جہاد کی فضیلتیں سنکر گھروں سے نہ نکل کھڑے ہوں۔ تو کیا زید مداخلت فی الدین کا مرتکب ہوا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ مداخلت فی الدین تو اسے کہیں گے جب جہاد ضروری نہ ہو اور زید جہاد کے ضروری ہونے کا پرچار کرتا پھرے۔

اس عبارت میں دوسری زیادتی آپ کے قلم سے یہ ہوئی ہے کہ آپ نے تبلیغی جماعت کی اس حق پر پردے ڈالنے کی کوشش کو شیعہ کی ایک مخصوص روش کے مترادف قرار دے دیا ہے اور اس بات کو صرف ظلم و تعدی پر محمول کرنا ہی درست ہوگا۔

بہرحال اس عبارت میں آپ کچھ رد و بدل کر لیجئے اور آئندہ تبلیغی جماعت کے بارے میں کچھ تخلیق کرتے وقت اس بات کو ملحوظ رکھئے کہ آپ تنقید برائے مخالفت اور برائے تنقیص نہیں کر رہے ہیں بلکہ آپ کے قلم اٹھانے کا منشا اور مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ تبلیغی جماعت کی

اصلاح ہو اور اس کے چہرے سے وہ داغ صاف ہو جائیں جن کی موجودگی قدرتی حسن کو غارت کر دیتی ہے۔

آپ کا یہ کتابچہ پڑھنے کے بعد یہ اندازہ تو ضرور ہو جاتا ہے کہ تبلیغی جماعت فرشتوں کی جماعت نہیں ہے وہ انسانوں پر مشتمل ایک گروہ ہے، اس میں بدرجہا نقائص اور خامیاں موجود ہیں۔ لیکن پورا کتابچہ پڑھنے کے بعد بھی یہ واضح نہیں ہوتا کہ تبلیغی جماعت کا انداز تبلیغ اور طریقۂ کار اسلامی نقطۂ نظر سے کیا حیثیت رکھتا ہے ہمارے خیال میں معائب اور دوسری ان خرابیوں کو گنوانے اور انھیں طشت ازبام کرنے سے کہیں زیادہ ضروری یہ تھا کہ آپ قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کرتے کہ تبلیغی جماعت کا طریقۂ کار تھوڑا سا فائدہ اپنے اندر رکھتا ہے اور زبردست نقصان۔ اس کی مثال قطعاً سیریڈون کی اس گولی کی سی ہے جو سر کا درد تو دور کر دیتی ہے لیکن جسم کو کچھ اور نئے امراض عطا کر دیتی ہے۔

تبصرہ کا حاصل یہ ہے کہ آپ کا یہ کتابچہ صرف یہ واضح کرنے کے لئے تو مفید ثابت ہو سکتا ہے کہ تبلیغی جماعت والے فرشتوں کی طرح محفوظ عن الخطا نہیں ہیں ان میں بھی ہزار قسم کی کمزوریاں موجود ہیں لیکن اس کتابچہ سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ یہ کتابچہ تبلیغی جماعت کے کسی فرد کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر آپ اس میں کچھ رد و بدل اور کچھ نئے اضافے کرنے کے بعد از سر نو شائع کریں تو ممکن ہے کہ یہ مفید اور مؤثر ثابت ہو۔ بحالت موجودہ اس بات کی امید کرنا فضول ہوگی کہ یہ کتابچہ عوام و خواص سے خراج تحسین حاصل کر سکے گا۔

آخری صفحہ

دانشمندانہ جدوجہد کی ضرورت

ہندوستان کے مسلمان اس وقت ایک فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ یہاں ملتِ اسلامیہ ہند کی بقا کے لئے ایک بڑی پرعزم لیکن دانشمندانہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔ یہاں مسلمانوں کے ملّی وجود، ان کی اجتماعی شخصیت و انفرادیت کی بقا کے لئے کچھ کاموں کی تکمیل ضروری ہے۔ وہ اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت سے رہیں، محفوظ ہوں، باعزت ہوں، مؤثر اور فیصلہ کن ہوں، اپنی خصوصیات کے مالک ہوں، اپنے پیغام کے حامل ہوں، انسانیت اور اس ملک کے لئے مفید و مبارک ثابت ہوں، حالات و واقعات سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ زمانہ اور ایک ترقی کرنے والے ملک کے قافلے کے ساتھ قدم ملا کر چل سکیں بلکہ ضرورت ہو تو ان کی رہنمائی اور کارواں سالاری کا فرض بھی انجام دے سکیں اور اس ملک کو بھی خطرہ اور مہلک زوال سے بچا سکیں۔ اس کے لئے چند تعلیمی و تعمیری کوششوں اور عظیم اداروں اور فکری مرکزوں کی ضرورت ہے۔ ان تحریکوں اور اداروں کا وجود اور ان کا استحکام و ترقی اس ملت کے وجود کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے، جو ہوا و پانی ایک زندہ انسان کے لئے، اگر یہ تحریکیں اور ادارے سرسبز توانا اور روبہ ترقی ہیں تو ملت کا وجود محفوظ، اس کا مستقبل روشن اور ملک میں اس کا مقام متعین ہے کسی اکثریت یا فرقہ کا تعصب و تنگ نظری یا حکومت کی کمزوری و جانب داری اس کے وجود کو ختم یا اس کے مستقبل کو تاریک نہیں بنا سکتی اور کوئی بڑے سے بڑا فرقہ وارانہ فساد اسکی قسمت پر مہر نہیں لگا سکتا لیکن اگر اس ملت کے افراد اپنے ذاتی مستقبل کی تعمیر میں ہمہ تن مشغول و منہمک ہیں۔ اسکے متمول اور با استطاعت افراد ملّی تقاضوں اور ضرورتوں سے غافل ہیں۔ وہ اپنی "خواہشات" اور "حوصلہ مندیوں" پر بے دریغ اور شاہانہ اولوالعزمیوں کے ساتھ روپیہ صرف کر سکتے ہیں لیکن احیاء و بقائے ملت کی تحریکیں اور ادارے سرمایہ کی کمی کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں یا وسائل کی کمی کی وجہ سے ان کا حال وہ ہے جو شاعر نے اپنے دردِ دل کے متعلق کہا ہے ؎

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے　　دل ہے گویا چراغ مفلس کا

تو پھر یہ افراد (خواہ سرمایہ کے لحاظ سے قارونِ وقت ہوں) ہر وقت خطرے سے دوچار ہیں۔ اللہ کی نگاہ میں ان کی پرِکاہ کے برابر بھی قیمت نہیں، حالات کی کوئی خفیف سی تبدیلی اور واقعات کی کوئی ہلکی سی لہر بھی ان کے ان چھوٹے چھوٹے مصنوعی حصاروں کو ریت کی دیواروں کی طرح بہا کر لے جائیگی اور کسی دن جب آنکھ کھلیگی تو انکو نظر آئیگا کہ وہ دیکھتے دیکھتے ہر چیز سے محروم ہو گئے ہیں اور ایک تن آسان، از خدا فراموش اور فرض ناآشنا قوم کی طرح ان کا حال بھی یہی ہوگا (مولانا ابوالحسن ندوی)

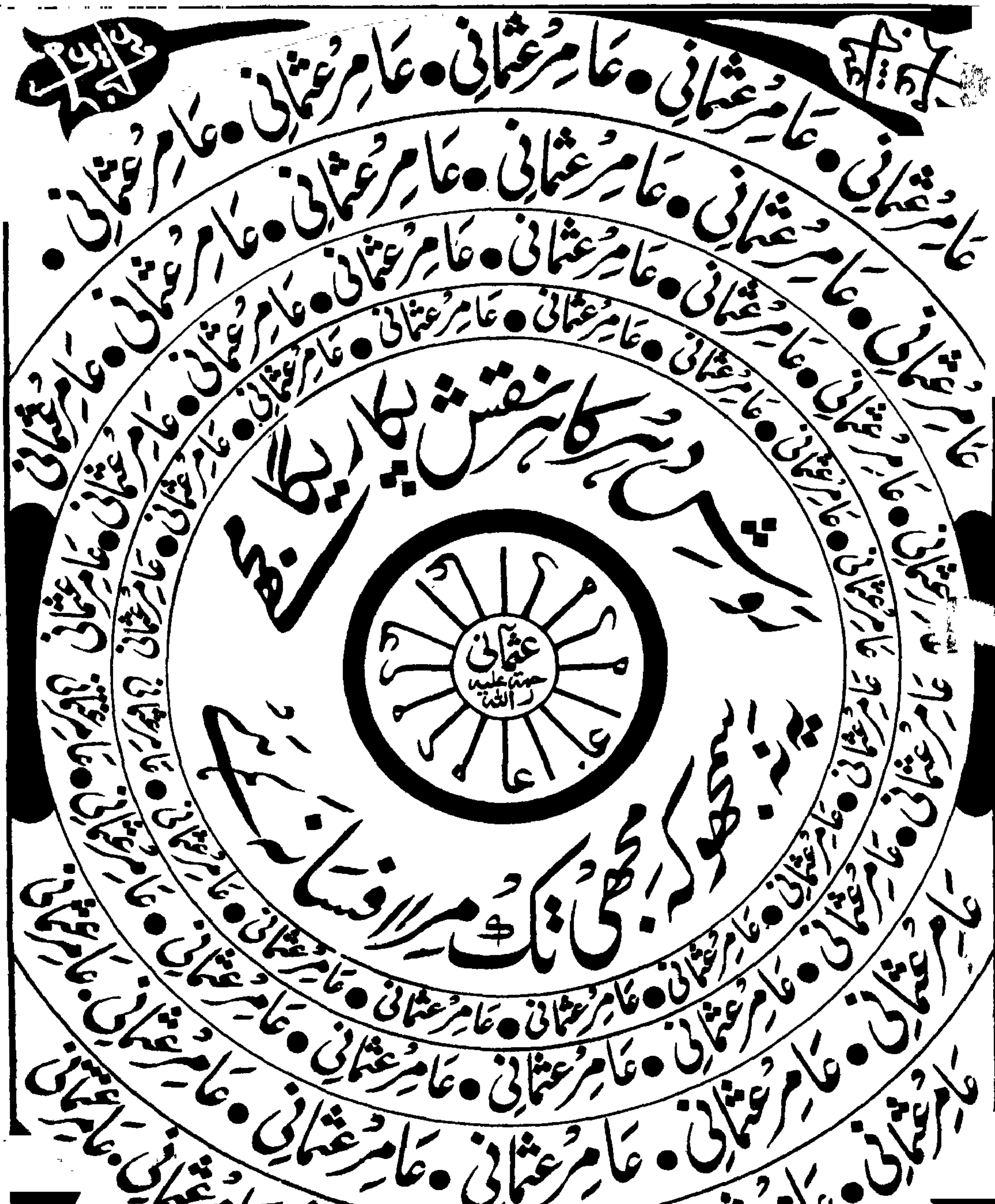
Regd. No. SHN/L-13/NP-172/76



حسن احمد صدّیقی کی جانب

روحِ عامرؒ کی خدمت میں ایک

تحفہ ــــــــ "عامرِ عثمانیؒ نمبر"


عامر عثمانی • عامر عثمانی • عامر عثمانی
نقش بیکار رہا
مرا افسانہ
عثمانی
رحمۃ اللہ علیہ

یہ چراغِ ہدایت ہے جسے قعرِ الحاد و بدعت کی برہنہ تاریکیوں میں مولانا عامر عثمانی نے اپنے خونِ جگر سے روشن کیا تھا

ماہنامہ تجلی دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایڈیٹر:- حسن احمد صدیقی (فاضلِ دار العلوم دیوبند)

سالانہ چوبیس ۲۴ روپے
فی کاپی پونے تین روپے

۲۸ ویں سال کا
چوتھا شمارہ

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائیجیریا
کنیڈا۔ فرانس۔ انڈونیشیا
سے بحری ڈاک دو پونڈ۔
بذریعہ ہوائی ڈاک دس پونڈ۔
بحرین۔ افریقہ۔ سعودی عرب قطر
وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ
دس شلنگ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک پونڈ

اگر اس دائرہ میں سرخ نشان ہے
تو سمجھیے اس پرچہ پر آپکی خریداری ختم ہے۔
یا منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی۔ پی کی
اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی
اطلاع دیں، خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی۔ پی
سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپکا اخلاقی
فرض ہوگا۔ منی آرڈر بھیجکر آپ وی۔ پی
خرچ سے بچ جائینگے

کیا اور کہاں

اکبر

مولانا عامر عثمانیؒ

دستک

یہ بات اگرچہ کچھ کم افسوسناک نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں طرح طرح کی برائیاں اس تیزی سے اپنے حجم پھیلاؤ اور تنوع میں اضافہ کرتی چلی جارہی ہیں جیسے برسات میں گھاس اُگتی ہے۔ اگر ہم بہت سادہ الفاظ میں اپنے ملک کی معاشرتی حالت کا مختصر تعارف کرانا چاہیں تو بلا تأمل اسے ایک ایسے ایک مریض سے تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے عوارضات کی فہرست میں روزانہ ایک نئے عارضے کا اضافہ ہوتا چلا جارہا ہو۔ یہ تشدد اور ظلم کے تیز و تند دھارے۔ یہ پھیلتا ہمکتا اخلاقی زوال۔ یہ خود غرضی اور مفاد پرستی کا عریاں رقص۔ یہ عدل دشمنی کے نت نئے مظاہرے اور یہ جاہلیت، فحاشی اور نفسانیت بے لگام رجحانات ـــــ ان سب پر ایک باضمیر اور حساس آدمی جتنا بھی رنج کرے کم ہی ہے۔

لیکن اس سے بھی بڑھ کر افسوس اور حرماں نصیبی کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے ملک میں مصلحین اور مفکرین کہیں نظر نہیں آتے۔ اِدھر اُدھر تک دیکھ جائیے۔ بصیرت کا چراغ لیکر کوچہ کوچہ چھان ماریئے۔ سیاسی لیڈر ملیں گے۔ آرٹسٹ ملیں گے۔ صنعت کار اور صحافی ملیں گے سادھو اور نجومی ملینگے مگر ایسے لوگ نہیں ملیں گے جنہیں آپ مصلحین تو کیا ـــ مفکرین ہی کہہ سکیں ـــ مفکرین اگرچہ معاشرے کے بگاڑ اور سدھار کے سلسلہ میں کبھی بھی کسی مرض کی دوا ثابت نہیں ہو سکے۔ معاشرے پر انقلابی اثرات ڈالنا تو ہمیشہ مصلحین ہی کا حصہ رہا ہے۔ اور رہے گا ـــ تاہم کورے مفکرین کا وجود بھی معاشرے کے لئے کم سے کم اس حد تک تو مفید و مؤثر ہو ہی جاتا ہے کہ عملی سطح پر نہ سہی نظری اور تصوراتی سطح پر جہالت اور علم خیر اور شر، ظلم اور عدل میں تمیز باقی رہتی ہے اور اعلیٰ انسانی قدروں کی فوقیت و عظمت کا ہلکا سا ادراک و احساس فکر و بصیرت کے نہاں خانے میں زندگی کا سانس لیتا رہتا ہے

مگر جب ملک بھر میں مفکرین بھی عنقا ہو جائیں تو یہ زوال کا وہ نقطۂ عروج ہے جس کے بعد کسی اصلاح اور تطہیر کی توقع دور دور تک نہیں کی جاسکتی۔

احوال واقعی

★ لیجئے آج خدا خدا کرکے "عامر عثمانی نمبر" آپ کے ہاتھوں میں پہونچ ہی گیا ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے یا نہیں۔ آپ خوش ہوئے یا نہیں۔ ہمیں اپنی محنت، جد و جہد اور لگن کا صلہ حاصل ہوگا یا نہیں اس کا اندازہ ہفتہ عشرہ کے بعد ہی ہو سکے گا جب آپ کے خطوط آنے شروع ہوں گے۔ اور محبت کی خوشبو سے بھیگے ہوئے لفافے آپ کے قیمتی تاثرات ہم تک پہونچائیں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ پُرانے مضامین کو یکجا کر کے کوئی خاص نمبر نکال دینا ایسا کارنامہ نہیں ہے کہ دنیا اس پر عش عش کرے۔ اور ہر طرف تعریف و تحسین کے تاج محل تعمیر ہونے شروع ہو جائیں۔ لیکن یقین کیجئے ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو صرف تعریف و تحسین کے لئے ہی کام کرتے ہیں جن کی جد و جہد اور کوشش و کاوش کا مقصد ہی صرف یہ ہوتا ہے کہ دنیا ان کی خدمت میں تعریف و تحمید اور تحسین و ستائش کی سوغات پیش کرے۔ ہر طرف واہ وا کی صدائیں بلند ہوں اور ہر دامنِ شہرت پر ان کا نام مرتسم ہو کر رہ جائے۔

مولانا عامر عثمانی کی چودہ سالہ صحبت نے جہاں ہمیں اور بہت سی تعلیم دی وہاں یہ زریں سبق بھی دیا کہ آدمی کام کرتے وقت صرف اپنے مقصد اور نصب العین پر نظر رکھے اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ دنیا راہوں میں پھول بکھار رہی ہے یا کانٹے۔ زمانہ تعریف کر رہا ہے یا تنقید لوگ حوصلہ افزائی کر رہے ہیں یا دل شکنی۔ وقت ہاتھوں میں پھولوں کی مالا لئے کھڑا ہے یا زہر میں بجھے ہوئے نشتر۔

دراصل دنیا کوئی معیار نہیں۔ لوگوں کی زبان کوئی کسوٹی نہیں وقت اچھے بُرے کو جانچنے کا کوئی قابلِ اعتماد ذریعہ نہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دنیا کسی کی تعریفوں کے پُل باندھنے پر تُلی ہوتی ہے اور حقیقتاً وہ شخص تعریف کا نہیں عتاب کا مستحق ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دنیا کسی کا دامنِ دل اور دامنِ جذبات مجروح اور تار تار کرنے پر کمر بستہ ہے اسکو گونا گوں قسم کی سزائیں دینے کا تہیہ کئے ہوئے ہے حالانکہ وہ شخص قطعاً اس لائق ہے کہ اس کے گن گائے جائیں اسکی خدمت میں تحسین و تکریم کے تحفے پیش کئے جائیں۔ میزبانِ کرم قائم کر کے اس کو ہیروں میں تولا جائے۔

لوگوں کی زبان بھی کوئی کسوٹی نہیں ہوتی۔ کوئی حجت نہیں ہوتی اگر لوگوں کی زبان کو حجت اور کسوٹی تصور کر لیا جائے تو پھر کھرے کھوٹے کی حقیقت کو پرکھنا قطعی ناممکن ہو کر رہ جائے گا۔ لوگوں کا عالم تو یہ ہے کہ اُن نام نہاد "مولویوں" کو رہبرِ اسلام سمجھتے ہیں جنکا دامنِ کردار ہر قسم کی بُرائیوں میں ملوث ہوتا ہے جن کے دلوں میں ہزار قسم کے وسوسے پناہ گزیں ہوتے ہیں جنکے پاس ظاہری وضع قطع اور کپڑوں کی اونچائی نیچائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور اسلام کے اُن مجاہدوں کو گمراہ اور بد دین گمان کرتے ہیں جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک سکنڈ خدمتِ اسلام میں صرف ہو رہا ہے۔ اور لوگوں کا عالم تو یہ ہے کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ایک الیکشن کے موقعہ پر زید کے بارے میں زندہ باد اور صد آفرین کی صدائیں بلند کرتے ہیں اور دوسرے الیکشن کے موقعہ پر یہی لوگ زید کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔ مُردہ باد، قوم پرست، پاجی، لعین۔

یہ سب کیوں ہوتا ہے۔؟ اس لئے کہ عوام کی زبان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی وہ آج جس کی عزت کرتے ہیں کل کو اس پر طنز و طعن کے پتھر بھی اچھال سکتے ہیں، آج جسکی تعریف کرنے میں مگن ہیں کل کو اُسے ذلیل بھی کر سکتے ہیں اس کے گلے میں ان گنت گالیوں کے طوق بھی ڈال سکتے ہیں۔

وقت کو بھی حجت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وقت نے کتنے ہی ایسے لوگوں کو سرفرازی عطا کی ہے کہ جو یہاں کی خاک بلنے کے قابل تھے اور کتنے ایسے لوگوں کو گمنامی کے غار میں پھینک دیا جو اس لائق تھے کہ انھیں سرفرازی سربلندی عطا کی جائے۔ کتابیں کہتی ہیں کہ وقت نے کتنے ہی ایسے لوگوں کو تخت و تاج کی نعمت بخشی جو فی الحقیقت دو کوڑی کی بھی حیثیت نہیں رکھتے تھے اور کتنے ہی ایسے لوگوں کو جیل میں سڑا دیا جو معاشرہ کا حُسن تھے۔ انسانیت کا حاصل تھے۔ شرافت کا معیار تھے۔ کردار کا جوہر تھے۔ آپ اپنے ارد گرد نظر ڈالئے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ بعض نیچے لوگ آسمان پر اُڑ رہے ہیں اور بعض اونچے لوگوں کو پیروں تلے روندا جا رہا ہے۔"

یہ سب کچھ محض اس بنا پر ہوتا ہے کہ وقت عادل نہیں ہے منصف نہیں ہے اچھے بُرے کو جانچنے کی قابلِ اعتماد کسوٹی نہیں ہے۔ وقت جسے عزت بخشتا ہے ضروری نہیں وہ عزت کا مستحق ہو۔ اور وقت جسے رسوا کرتا ہے ضروری نہیں کہ وہ رسوائیوں کا حقدار ہو۔

پھر ؟

پھر بھلا عامر عثمانی نمبر پیش کرتے وقت ہمارے کان صرف تعریف سننے کے لئے کیوں بے چین ہوں۔ ہم صرف دنیا اور وقت کے محاکمات پر کیوں نظریں جمائیں اس بات کے منتظر رہیں کہ ہمیں انعام و اکرام کی صورت میں اپنی کوششوں کی مکافات مل کر رہے گی جد وجہد کی جزا نصیب ہو کر رہے گی۔ وقت ہماری محنت و لگن کی قدر ضرور کرے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ دنیا تعریف کرے یا تنقید کی محفلیں سجائے۔ لوگ واہ واہ کریں یا مذاق اڑائیں۔ وقت ہماری گردنِ حیات کو پھولوں کے گجرے بخشے یا طوق و سلاسل۔ ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ ہم نے جس مقصد کے لئے عامر عثمانی نمبر نکالا ہے وہ مقصد بہرحال ہمیں حاصل ہو جائے گا۔ اور مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اُس شخص کی زندگی اور شخصیت کے تمام گوشے عیاں بیاں کر دیئے جائیں جو دنیائے تحریر کا سکندر تھا۔ جو اپنے وقت کا بے مثال تنقید نگار تھا۔ جو شعر و ادب کی آبرو تھا۔ علم جس کی صلاحیتوں سے مانوس تھا اُردو زبان جس کے وجود پر فخر کرتی تھی۔ دنیائے مذہب میں جس کا نحیف جسم اُس چراغ کی حیثیت رکھتا تھا جو خود کو جلا کر دوسروں کو روشنی عطا کرتا ہے۔ جس کی زندگی کا مقصد ہی اُن اندھیروں سے ٹکرانا ہوتا ہے جو اندھیرے ہر اُس اُجالے کے حریف ہوتے ہیں جن اُجالوں کی موجودگی میں انسانیت اپنا سفرِ حیات طے کرتی ہے۔

ایک مقصد ہمارا اور بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ نمبر اُمتِ مسلم کے لئے بھی مفید ثابت ہو۔ اس نمبر میں ایسے مضامین یکجا کئے جائیں ہر زمانہ ہر دور ہر تاریخ جن کی ضرورت محسوس کرے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ہم نے بعض ایسے مضامین شریکِ اشاعت کئے ہیں جن کی افادیت کبھی مضمحل نہیں ہو سکتی جو ہر حال میں پڑھے جائیں گے اور ہر مستقبل میں جن سے استفادہ کیا جاتا رہے گا۔

★ عامر عثمانی نمبر آپ کو کیسا لگا ؟ یہ ایک سوال ہے اور جس کا جواب تمام قارئین کو دینا ہے۔ یہ سوال قائم کر کے اس کے جواب کا مطالبہ کرنے کی واحد ترین وجہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے قارئین کی ذہنیتوں اور طبیعتوں کا صحیح اندازہ ہو سکے اور آئندہ کوئی بھی نمبر مرتب کرتے وقت ہم اپنے قارئین کے ہر جائز رجحان کو پیش نظر رکھ سکیں۔

عامر عثمانی نمبر کے بارے میں اپنی رائے بھیجتے وقت دو باتوں کا خیال ضرور رکھیئے ایک تو یہ کہ تعریف میں ذرّہ برابر مبالغہ نہ ہو۔ بعض قارئین تعریف کرتے وقت بہت زیادہ افراط اور مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں جو ہمیں بالکل بالکل پسند نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس نمبر کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ یہ نمبر جس شخص نے مرتب کیا ہے وہ ماہر و کامل نہیں مبتدی ہے طالب علم ہے اناڑی ہے۔

★ بے شک عامر عثمانی نمبر کے بارے میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اسے مئی کے آخری ہفتہ میں نذرِ قارئین کر دیا جائے گا۔ لیکن شاید اس بار بھی وعدہ پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس بار ہمیں پھر شرمندگی اُٹھانی پڑے گی۔ لیکن کریں بھی کیا۔ گردشِ دوراں کے سامنے جتنے مجبور لاچار اور بےبس آپ ہیں اُتنے ہی ہم بھی ہیں۔ بجلی صاحبہ کے مزاج میں کچھ خوئے شرافت پیدا ہوئی تو دوسرے عوارضات عداوت پر اُتر آئے مختصر یہ سمجھئے کہ نمبر کی کاپیاں مارچ کے آخری ہفتہ میں پریسوں میں پہونچا دی گئی تھیں اور کاغذ دہلی سے آج ― یعنی دس مئی کو موصول ہوا ہے۔ گویا کہ چھپائی کا آغاز آج سے یا کل سے ہوگا۔ اب یہ بات کیسے ممکن ہے کہ نمبر وعدے کے مطابق صحیح وقت پر رواں دواں ہو جائے۔ نمبر لیٹ ہو جانے پر قارئین کے شکوے بجا ― لیکن ―

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

یہ تاخیر ظاہر ہے کہ شوقیہ نہیں تھی ازراہِ تفریح نہیں تھی۔ کچھ مجبوریاں حائل تھیں کچھ بے بسیوں کا شکار تھے۔ اب ذرا دوسرے رُخ سے بھی سوچ لیجئے۔ عامر عثمانی نمبر کی دونوں قسطیں کم و بیش پانچ سو صفحات پر مشتمل ہیں اور اس ضخیم نمبر کو تن تنہا ایک شخص نے ترتیب دیا ہے اس شخص کو خدا کے کرم کے سوا کسی کا سہارا میسر نہیں تھا۔ سارے انتظامات اور ساری بھاگ دوڑ بھی اسی شخص واحد کو کرنا پڑی لہٰذا پرچہ جتنا بھی لیٹ ہو جاتا کم تھا۔

چلیئے چھوڑ دیجئے میں اعتذار کی الف لیلیٰ کا گلا گھونٹ دیتا

اگر قارئین معذرت سُن نے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ تو ایڈیٹر تجلی دست بستہ آپ کے سامنے کھڑا ہے اور معافی کا طلب گار ہے تا لائق کو ایک بار پھر معاف کر کے اپنے بڑے پن کا ثبوت دے دیجئے۔

★ محصول ڈاک میں بے پناہ اضافہ ہو جانے کی وجہ سے ہم تجلی کی قیمت میں اضافہ کرنے پر مجبور ہیں۔ قیمت میں اضافہ کا اعلان ہم گزشتہ شمارے میں بھی کر چکے ہیں۔ قارئین ایک بار پھر نوٹ کریں کہ اب تجلی کے عام شمارے کی قیمت پونے تین روپے اور سالانہ چندہ چوبیس روپے ہے ـــــ یقین ہے کہ قارئین عملاً ہماری حوصلہ افزائی کریں گے۔ اور ہمیں مایوسیوں کا شکار نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیں اپنے پروردگار کی رحمت پر تو بھروسہ ہے ہی قارئین کی محبت اور کرم فرمائی پر بھی اعتماد ہے۔ لہٰذا ہمیں سو فی صد یقین ہے کہ معمولی سی قیمت بڑھ جانے کی وجہ سے ہمارے قارئین برسوں پرانے رشتہ کو منقطع نہیں کریں گے

★ ملک کے کونے کونے سے آنے والی ڈاک یہ ثابت کرتی ہے کہ بدعتوں کے وجود میں دن بدن وسعت اور لمحہ بہ لمحہ پھیلاؤ پیدا ہو رہا ہے یہ صورتِ حال دیکھ کر ہر صحیح العقیدہ آدمی کا مضطرب ہو جانا ضروری ہے۔ ہم اپنی بے عملی کے معترف ہیں۔ لیکن یہ خدائے واحد لاشریک کا کرم ہے کہ ہمارا عقیدہ ثابت و سالم ہے اور اس میں کبھی کسی قسم کا کوئی نقص اور تزلزل واقع نہیں ہوا۔ لہٰذا بدعات اور بدعقیدگی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر ہم پریشان بھی ہیں۔ ہم بے چین بھی ہیں۔ روتے بھی ہیں۔ لیکن اگر پریشان کے مظاہرے، تحریر کے اعلان اور آنسوؤں کی نمود سے مسائل حل ہو جایا کرتے تو شاید ایک بسارا ہی اضطراب اور ایک ہماری آنکھوں کی نمی ہی ازسبکہ کافی ہوتی ـــــ

مسائل اس وقت تک حل نہیں ہوتے، باطل اس وقت تک سرنگوں نہیں ہو سکتا جب تک ہم اپنی زندگی کا ہر دن اور ہر ہر لمحہ میدانِ کارزار کے لئے وقف نہ کر دیں ہم جب تک اپنی ہتھیلیوں پہ انگارے لے کر شہر در شہر اور گلی در گلی مارے مارے نہیں پھریں گے۔ مسائل کا تجزیہ نہیں ہو گا، تاریکیاں دم نہیں توڑیں گی بدعتوں کے وجود میں تخفیف پیدا نہیں ہو گی۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ایک نئے جوش اور ایک نئے ولولے کے ساتھ بدعات و خرافات کا مقابلہ کیا جائے۔ ایک نئے جذبے اور ایک [illegible] کے ساتھ اُن تنظیموں سے ٹکرایا جائے جو ادھر سے

چراغِ حق کے جانی دشمن ہیں۔ ہم اپنے قارئین سے استدعا کریں گے کہ وہ اپنے علاقہ میں پھیلی ہوئی بدعات کی تفصیل لکھ کر بھیجیں تاکہ علم و عقل کی روشنی میں ان کا آپریشن کیا جا سکے۔

ایک غور طلب بات یہ بھی ہے کہ بدعتیں اتنی تیزی اتنی روانی اور اتنی فراوانی کے ساتھ کیونکر پھیل رہی ہیں ـــــ؟ اس مختصر سی بات کا اگر تشفی بخش جواب کاغذ پر بکھیرا جائے تو "تجلی" کا ایک نمبر بھی اس کا متحمل نہیں کر سکے گا۔ تفصیلی اور وضاحتی گفتگو کرنے کا موقع ہی نہیں ہے بس اتنا عرض کریں گے بدعات و خرافات میں دن بدن اور پل بہ پل زیادتی اور بڑھوتری ہونے کی بے شمار وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری مائیں ہماری بہنیں اور بیٹیاں انتہائی تیزی کے ساتھ بدعقیدگی کے اثرات قبول کرتی جا رہی ہیں۔ ہماری عورتوں کی بھاری اکثریت اُن خرافات میں مبتلا ہے جن خرافات کے تصور سے بھی گھن آتا ہے۔

دنیا اس بات کو جانتی ہے اور تاریخ اس بات کو مانتی ہے کہ جس گھر کی عورت بگڑ جائے اس گھر کا امن و سکون غارت ہو جاتا ہے اس گھر میں اور اس گھر سے ایسی ایسی خرابیاں داخل و خارج ہونے لگتی ہیں جو کثیر شدہ اعمال ہوتی ہیں اور جن کا دخول و خروج کسی جسم اور کسی روح کے لئے سکون کا باعث نہیں ہو سکتا۔

اگر ہم واقعتاً معاشرہ کی اصلاح و تطہیر کا جذبہ رکھتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم اُن سوراخوں پر اختیاط کا سیمنٹ چڑھا دیں جن سوراخوں سے بداخلاقی کی ہوائیں۔ بے عملی اور بدعقیدگی کے جراثیم اور بدعات و خرافات کے سنگریزے داخل ہو رہے ہیں۔ صبح سے شام تک کمرے کو صاف کرتے رہئے پھر بھی کمرہ اس وقت تک صاف نہیں ہو سکے گا جب تک اُن روشن دانوں کو بند نہ کیا جائے جہاں سے کوڑا کرکٹ اندر آ رہا ہے۔ اگر کمرے کی صفائی مطلوب ہو تو کمرے میں جھاڑو لگانے سے پہلے یہ ضروری ہو گا کہ ان روشن دانوں کو بند کرنے کا اہتمام کیا جائے جو کوڑا کرکٹ اندر بھیجنے اور اس میں اضافہ کرنے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

ہم معاشرہ کے مختلف گوشوں میں نظر ڈالنے اور مسلم گھرانوں میں جھانکنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ مسلم سوسائٹی کا [illegible] ہونے اور ایمانی طور پر [illegible] ہونے کی ایک بڑی وجہ [illegible] عورتیں بڑی بڑی غلطیوں، کمزوریوں اور بدعقیدگیوں کا شکار ہو کر [illegible]

باقی ـــــ

[illegible]

[illegible] کریں۔ انہیں اندھیر [illegible] سے نکال کر
[illegible] لائیں انہیں بتائیں کہ جن راہوں پہ تم سرپٹ دوڑ رہی
[illegible] سے لپٹے ہیں۔ ان راہوں پہ چل کر حق کی خوشبو
[illegible] پاکیزگی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور ان راہوں پہ چل کر
[illegible] کی خوشنودی بھی حاصل نہیں ہو سکتی جس کی خوشنودی
[illegible] انسان دنیا میں آیا ہے۔

[illegible] خیال ہے کہ ایک ایسے رسالہ کا اجرا کیا جائے جو بدعات و
[illegible] کے بروقت خانوں میں رہنے والی عورتوں کے خلاف کھلا جہاد
[illegible] عورتوں کی علی الاعلان مزار پرستی کر کے جن کی ایمانی
[illegible] سونپ چکی ہے اور اپنی اولاد اور اپنے گھر کو برباد کرنے کی
[illegible] انجام دے رہی ہیں۔

[illegible] گیا ہے کہ ایک رسالہ نکال کر مولانا ماہر عثمانیؒ کی صاحبزادی
[illegible] کر دیا جائے اور ان سے کہہ دیا جائے کہ تمہارے والد محترم نے
[illegible] سال تک جن بدعتوں اور بدعقیدگیوں کے خلاف مستقل ایک
[illegible] تم بھی خدا کے بھروسے پہ ان بدعتوں اور بدعقیدگیوں سے
[illegible] ان کے وجود کو مٹانے کے لئے ہر اس جسارت اور جرأت مندی
[illegible] سے والد بزرگوار کر چکے ہیں۔

[illegible] سلسلے میں قارئین کی رائے جاننے کے لئے بے تاب ہیں۔
[illegible] کی اکثریت نے ہمارے خیالات سے اتفاق کیا تو جلد ہی
[illegible] منظر عام پر نمودار ہو جائے گا۔ جو بجلی کی طرح کسی کے سامنے
[illegible] باطل کے سامنے بے لاگ باتیں کرتا اسے کڑی کڑی
[illegible] سزا دیتا ہو۔

[illegible] کے چندے سے ہم ایسے خطوں کو بالا مدگی کے ساتھ تلاش
[illegible] اس بارے میں کوئی رائے تحریر ہو۔

[illegible] ماہر عثمانیؒ کی تالیف شرک و بدعت کے جو روز اول
[illegible] چھلے پائی ہے۔ اب تک کم و بیش ہزاروں نسخے
[illegible] ہیں۔ ماہر عثمانی نمبر کے بعد یہ
[illegible] تک کی خدمت میں روانہ کر دی
[illegible]

★ [illegible]
[illegible] اس کا تمر [illegible]
جائیگی۔ مولانا ماہر عثمانی کا مجموعہ کلام "عکس باطن" کتابت [illegible]
کے مرحلے گزر رہا ہے۔

★ [illegible] عرب کی کی ضد ہے کہ اگر مولانا ماہر عثمانی کا مجموعہ
چھاپو گے تو پھر میرا بھی مجموعہ کلام چھاپو۔ نہیں چھاپو گے تو میں خودکشی کر کے
ادارہ تجلی کی بنیادیں ہلا دوں گا۔ اب بتایئے کہ کیا کیا جائے [illegible] کا
مدعا اگر [illegible] کی شاعری کو ختم کرنے کیلئے تیار ہو تو ہم ان کی [illegible]
کوشش کریں ورنہ ہم ان سے صاف صاف کہہ دیں گے کہ جاؤ گھونٹ لو اپنا گلا
لیکن یاد رکھنا کہ جب تک تم اپنی طبعی موت نہیں مرو گے۔ ادارہ تجلی تمہارے
کفن دفن کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

★ صفحات کی تنگ دامانی کی وجہ سے مسجد سے مینا خانے تک کا [illegible]
روک دیا گیا ہے جو انشاء اللہ اگلے ماہ جلوہ گر ہوگا۔ یہ وہی مسجد سے مینا خانے
تک ہے جس کے بارے میں مولانا ماہر عثمانیؒ نے اپریل [illegible] کے شمارے میں
یہ اعلان کیا تھا۔

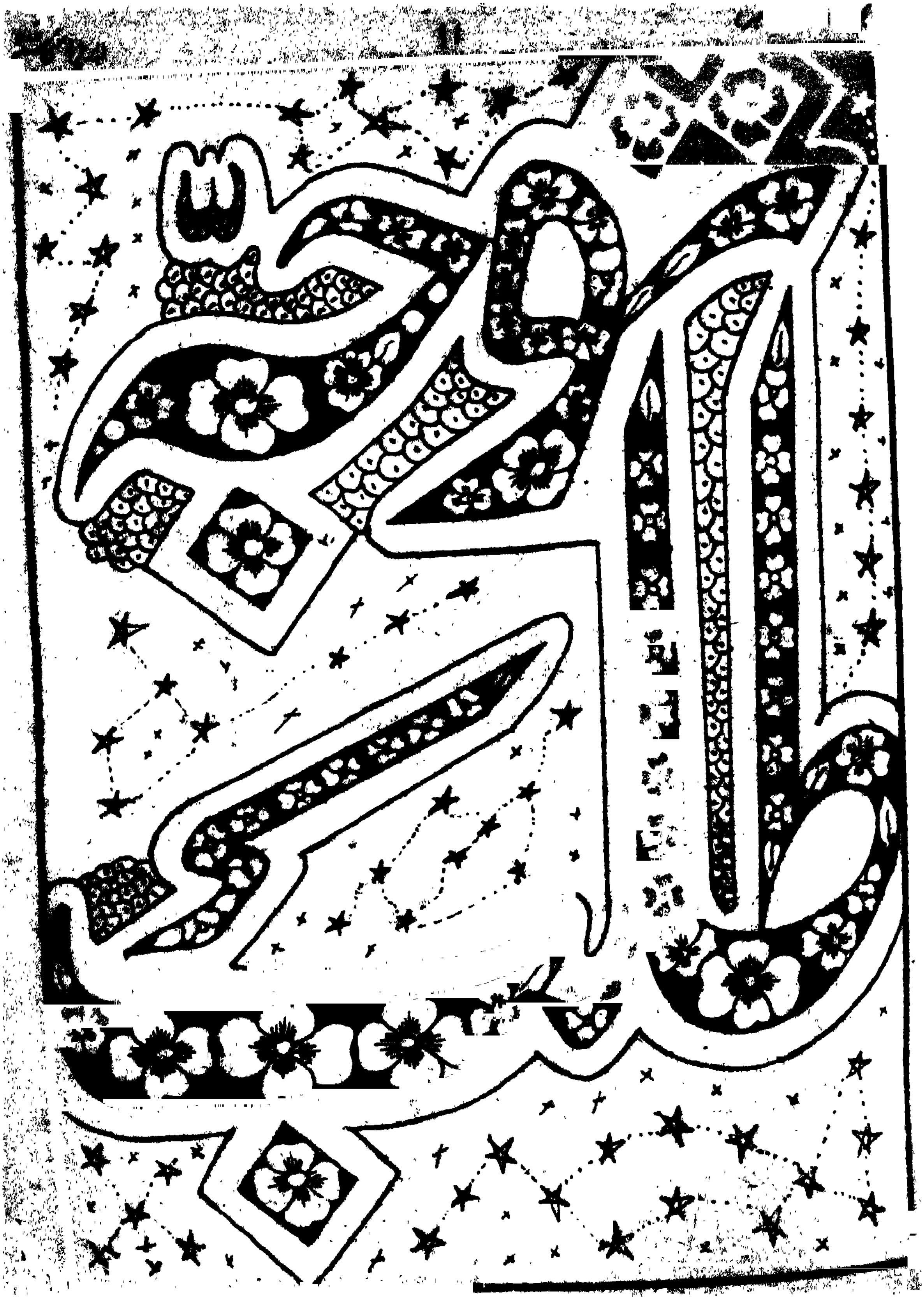
موعود وصدی کے دو مجدد۔

(۱) اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب بریلوی۔
(۲) [illegible] حضرت گنبد قضا خاں صاحب دہلوی۔

دونوں بزرگوں کی ایمان افروز کراماتوں کا مجموعہ بریلوی دوستوں کیلئے
خاص الخاص تحفہ آم کے آم گٹھلیوں کے دام جھوٹا ثابت کرنے والے کو [illegible]
سچا ثابت کرنے والے کو ڈھائی ہزار انعام۔

اس مضمون کی اشاعت میں کافی تاخیر ہوئی اور [illegible]
ہے کہ مضمون مکمل نہیں تھا۔ وہ کئی آج کل پہ ٹالتے رہے [illegible]
خوشامد کیں تب کہیں جا کر انہوں نے مضمون مکمل کرنے کا [illegible]
کیا۔ انکے [illegible] بتا سکا آپ کو ضرور پسند آئے گا۔

★ یہاں تمام قارئین کے شکر گزار ہیں [illegible]
[illegible] تک کے پانچ پانچ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]



گرو سے مرد سے اکھاڑنا ہماری عادت نہیں اور نہ ہی غیر معقول، واہی، پوچ اور مہمل خرافات باتوں کو ہوا دینا ہمارے مشاغل میں داخل ہے اور نہ ہی ہم ان غیر سنجیدہ، غلط در غلط اور جھوٹ در جھوٹ باتوں پر کان دھرنے کے عادی ہیں جو کسی کھلنڈرے کے منہ سے خارج ہو رہی ہوں۔ لیکن اسے بدنصیبی کے سوا کیا کہا جائے کہ آج ہم جن باتوں پر خامہ فرسائی کرنے چلے ہیں وہ باتیں کافی پرانی بھی ہیں اور کافی سڑی ہوئی بھی۔ وہ باتیں مہملہ واہیات بھی ہیں اور کذب و افترا کا پلندہ بھی۔ اور وہ باتیں کسی ایسے شخص کی زبان سے خارج نہیں ہوئی تھیں جو صلابت کردار اور متانت و وقار کا حامل ہو اور بالعموم جس کی باتوں کو کوئی اہمیت و حیثیت دی جاتی رہی ہو۔ بلکہ وہ باتیں ایک ایسے صاحب کے منہ سے برآمد ہوئی تھیں جو دارالعلوم جیسی پر وقار اور مقدس درسگاہ کے استاد ہونے کے باوجود اپنی غیر سنجیدگی اور اپنے جوکرپن کی وجہ سے دارالعلوم کے تمام اساتذہ میں نمایاں اور منفرد مقام رکھتے ہیں اور جن کی گل افشانیوں کو عوام و خواص نے دیوانے کی بڑ سے زیادہ کبھی کوئی حیثیت نہیں دی۔ جن کی حرکتیں تا دم تحریر احمقانہ شرارتوں اور طفلانہ اچھل کود پر محمول کی جاتی ہیں۔

دیوبندی عوام ان استاد صاحب کا احترام کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوئے۔ یہ استاد صاحب دیوبندی عوام پر یہ ثابت نہ کر سکے کہ وہ خود بھی اتنے ہی بڑے بزرگ ہیں جتنے ان کے والد محترم تھے اور یہ خود بھی اسی درجہ قابل احترام ہیں جس درجہ ان کے والد بزرگوار قابل احترام تھے۔

ممکن ہے کہ بنگلور، بمبئی، مدراس اور افریقہ کے باشندے ان استاد صاحب کو بزرگ ابن بزرگ تصور کرتے ہوں، وہ انھیں اس طرح اکرام و احترام کا مستحق سمجھتے ہوں جس طرح ان کے والد مکرم احترام و عقیدت کے مستحق تھے۔ ان کے دلوں کی گہرائی میں عقیدت و عظمت کے تناور اور فلک بوس درخت اُگے ہوئے ہوں۔ وہ موصوف کی ہر بات کو وحی اور الہام کا درجہ دیتے ہوں

اگر [illegible] لینا ہے [illegible] نہیں

وطن سے باہر اپنے دس بیس ہزار معتقد پیدا کر لینا اور اور ایک ایسا حلقہ بنا لینا جو ہر وقت رکوع اور سجدے کے لئے [illegible] کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ آدمی اپنے بے تکلف دوستوں میں، اپنے خاص رشتہ داروں میں اپنے گھر میں، اپنے وطن میں، اپنے اور دیگر ایسے دس بیس آدمی پیدا کر کے دکھلائے جو اس کے سچے عقیدت مند ہوں اور جو دل کی گہرائی سے اس کا احترام کرنے پر مجبور ہوں۔

دیوبند کے عوام نے جو متاثر اور معتقد ہونے کے معاملہ میں بہت زیادہ محتاط ہیں کبھی ان استاد صاحب کو گھاس نہیں ڈالی اور اس کی اولین ترین وجہ یہ ہے کہ یہ صاحب اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا احترام کیا جائے، ان سے عقیدت رکھی جائے انھیں بڑا آدمی سمجھا جائے

قارئین یہ بات نوٹ کر لیں کہ دارالعلوم کے اساتذہ کو تین قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو بہت زیادہ متقی اور متورع سمجھے جاتے ہیں اور واقعتاً یہ لوگ متقی ہیں متورع ہیں، تشرع اور تدین کی دولت بیش بہا سے مالا مال ہیں۔ یہ لوگ فی الحقیقت اس لائق ہیں کہ انھیں بزرگ اور صاحب کردار سمجھا جائے، ان کی عزت کی جائے، ان کے گن گائے جائیں۔

ان استادوں میں دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو گمنام زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جو نہ مشہور ہیں نہ بدنام — جو نہ بہت زیادہ پاکباز تصور کئے جاتے ہیں اور نہ بہت زیادہ عاصی۔ ان کے حلقوں میں نہ عقیدت و احترام کے گجرے پڑے ہوئے نظر آتے ہیں نہ بدنامی و رسوائی کے طوق — یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ اور کوئی تنقید نہیں ہونی چاہئے۔

ان استادوں میں تیسری قسم ان حضرات کی ہے جو دارالعلوم اور دیوبند میں اچھے خاصے بدنام ہیں۔ اور اس عزت و شہرت سے محروم ہیں جو علمائے دین کا مقدر ہوا کرتی ہے — یہی

وہ فتنے پھیلاتے رہتے ہیں۔ شرارتیں کرنا ان کے معمولات میں شامل ہے۔ بڑی شخصیتوں پر کیچڑ اچھالنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ گندی سیاست جن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ جھوٹ، فریب افترا جن کی غذا ہے۔ چھوٹوں کو منہ چڑھانا اور بڑوں کی اہانت کرنا، ہم عصروں کی راہوں میں غلاظتیں بچھانا اور معزز لوگوں کی پگڑیاں اچھالنا جن کا نصب العین بنا ہوا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ دیوبند کی گلی گلی اور دیوبند کے گھر گھر میں جن کی بدعنوانیوں کے چرچے ہیں اور دیوبند کا کوئی آدمی جنھیں گھاس ڈالنے کے لئے تیار نہیں۔

اب اسے حسن تقدیر کے سوا کیا کہا جائے کہ یہی لوگ بیرون دیوبند میں شیخ التفسیر اور شیخ التقویٰ گمان کئے جاتے ہیں۔ دنیا انھیں بزرگوں سے زیادہ مقدس، صحابۂ کرام سے زیادہ محتاط اور فرشتوں سے زیادہ پاکیزہ خیال سمجھتی ہے۔ اور ان کی اداکاری کو آنکھیں بند کر کے حقیقت پر محمول کر لیتی ہے۔

یہ تیسری قسم کے لوگ چار افراد پر مشتمل ہیں۔ انھیں محاورے کی مناسبت سے "چہار درویش" کہہ کر بھی پکارا جا سکتا ہے۔ ان چہار درویشوں نے دارالعلوم دیوبند کی مقدس وادی میں زہریلی سیاست کی ایسی ہوائیں چلا رکھی ہیں کہ اسے دارالعلوم کے تمام شریف الطبع متعلقین پریشان ہیں — یہ چہار درویش سیاست، فریب، دھاندلی اور چرب زبانی کا سہارا لے کر دارالعلوم میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں۔ درس کے لئے بڑی بڑی کتابیں ان کے سپرد ہیں انتظامیہ کے مختلف شعبوں پر ان کا تسلط ہے اور بعض سادہ لوح طلبا کے نزدیک یہ محترم اور عظیم المرتبت بھی سمجھے جاتے ہیں۔

ان چہار درویشوں میں سے ایک درویش وہ بھی ہیں جن کی بعض غیر سنجیدہ اور احمقانہ باتوں کا جائزہ لینے کے لئے میں نے یہ کاغذی محفل منعقد کی ہے۔ یہ وہ صاحب ہیں جو ہر فتنۂ و فساد، ہر اشتراک، بغاوت اور ہر لڑائی جھگڑے کے موقعہ پر ہیرو کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ اور کمالِ اداکاری یہ ہے کہ طلبا کی نظروں میں وہ پھر بھی فرشتہ اور معصوم بنے رہتے ہیں۔ ان کا دامن کردار تمام بدعنوانیوں کے باوجود کسی بہت زیادہ سفید چادر کی طرح پاک صاف دکھائی دیتا ہے اور ان کے چہروں پر تنوّر اور روحانیت کی اتنی ہی قندیلیں روشن نظر آتی ہیں جتنی فتنۂ و فساد کے موقعہ پر ہیرو کا پارٹ ادا کرنے سے پہلے تھیں۔

کمال ایمان یہ ہے کہ ہزار قسم کی بے ایمانیاں اور بدیانتیاں کرنے کے باوجود ان کے شیشۂ ایمان میں بال تک نہیں آتا اور نہ ہی کوئی دوسری قسم کی کمزوری اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے اور وہ ایک عقل باختہ طبقہ کی نظروں میں بہرحال اور بہرصورت مسلم کامل اور مومن اکمل محسوس کئے جاتے ہیں۔

اور کمالِ خوش نصیبی یہ ہے کہ تمام ترسفاکیوں اور غداریوں کے باوجود دارالعلوم کی انتظامیہ کمیٹی انھیں وقتاً فوقتاً عہدے اور مرتبے عطا کرتی ہے۔ خیر سے وہ اب ایک ناظم صاحب کے معین بھی بنا دئیے گئے ہیں —— ان صاحب کا اسم گرامی ....!

لیکن ذرا ٹھیر ئیے۔ ان کے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب ہٹانے سے پہلے بس ایک پرانی اور غمناک داستان دہرانا چاہتا ہوں۔

ہند اور بیرون ہند کے بیشتر مسلمان اس بات سے واقف ہیں کہ گزشتہ سال ۲۱ اپریل کو مولانا عامر عثمانی رح کا انتقال کا اندوہناک حادثہ پیش آیا تھا۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ انتقال سے بارہ روز قبل ایک نامعلوم قسم کی بیماری نے مولانا پر زبردست حملہ کیا اور انھیں پلنگ پر لٹا کر رکھ دیا۔ آٹھ دس روز مولانا کے اس حال میں گزرے کہ وہ مدد اور سہارے کے بغیر نہ اٹھ سکتے تھے اور نہ ہی کھا پی سکتے تھے۔ اس عرصہ کی تمام نمازیں انھوں نے بیٹھ کر پڑھی تھیں یا لیٹ کر اشاروں سے پڑھی تھیں۔ ان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ خود بیٹھ سکیں یا خود ایک ایسا کام بھی کر سکیں جس میں تحرک ضروری ہو۔ ہفتہ عشرہ تک وہ اسی کیفیت سے دوچار رہے۔ ان کی بیماری کی خبر صرف دیوبند ہی میں نہیں بلکہ پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل

تھی۔ دور دور سے لوگ مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے تھے ہر وقت عیادت کرنے والوں کا ایک تانتا بندھا رہتا تھا عیادت کرنے والے ہجوم میں کتنے ہی ایسے چہرے بھی دکھائی دیتے تھے جو مسلکی اعتبار ان کے مخالف تھے لیکن مخالف ہوتے ہوئے بھی چونکہ انھیں مرحوم کی علمی صلاحیتوں اور تحریری جولانیوں کا اعتراف تھا۔ لہذا وہ مجاہد قلم کی مزاج پرسی کے لئے دن میں کئی کئی بار حاضری دیا کرتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے وہ تمام اساتذہ بھی مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے جو ذہن و شعور کے اعتبار سے بالغ ہیں اور جن میں اخلاق، متانت اور انسانیت کی خوبو موجود ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے طلباء بھی کافی تعداد میں مولانا کی عیادت اور پرسش کیفیت کے لئے آتے ہی رہتے تھے یہ وہ طلباء تھے جو فی الواقع علم حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم میں اقامت گزیں تھے۔ علم سے انھیں تعلق تھا، علماء سے لگاؤ تھا، ہر صاحب علم کو محترم سمجھنا ہر صاحب علم کی علالت سے مضطرب ہو جانا جن کی فطرت میں داخل تھا۔ یہ طلباء محض اس بنا پر مولانا عامر عثمانی کے گرویدہ تھے کہ انھوں نے تجلی کے ذریعہ ۲۵ سال تک دین کی خدمت کی تھی — کھلے میدانوں میں دین کے ہر دشمن سے ٹکرائے تھے۔ خدمتِ دین کی خاطر اپنا سکون، اپنا چین، اپنا آرام اور اپنی خواہشوں کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ ان کے قلم نے باطل کی دھجیاں بکھیری تھیں جھوٹ کے پرخچے اڑائے تھے۔ گندی سیاست کے [illegible] کے نشتر اتارے تھے۔ قوم پرستی کی لعنت سے [illegible] دیا تھا۔ اسلامی کاز کو تقویت پہنچائی تھی۔ [illegible] تن تنہا لڑتے رہے جس محاذ پر بڑی بڑی جماعتیں بھی آنے کی جسارت نہیں کر سکتیں۔ ان کی زندگی کے بیشتر لمحات علم و دین کی خدمت اور ملک و ملت کی لوک پلک درست کرنے میں گزرے۔

[illegible] دیگر بزرگوں ... دارالعلوم دیوبند کے [illegible] صاحب تھانوی کو اس بات پر

[illegible] کہ مولانا کی علالت پر اضطراب و پریشانی کا مظاہرہ کیا جائے اور عیادت و مزاج پرسی کی غرض سے ان کے گھر تک چل کر جایا جائے۔

قارئین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ عقل بیدار، متین اور علم دوست طلباء چھپ چھپ کر، ڈر ڈر کر انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ مرحوم کی مزاج پرسی کے لئے آیا کرتے تھے۔ خوف اور سراسیمگی ان کے چہروں سے ٹپکتی تھی۔ ایک مرتبہ چند پریشان حال طلباء کے چہروں پر فکر و سراسیمگی کی وحشت دیکھ کر مولانا مرحوم نے کہا:-

تم لوگ کچھ پریشان اور فکرمند نظر آتے ہو، اس کی کیا وجہ ہے۔ اور ان طلباء سے ایک دل آزار اور افسوسناک بات سننے کو ملی۔ انھوں نے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ دارالعلوم کے چند استادوں نے اس بات کا آرڈر جاری کیا ہے کہ جو طالب علم عامر صاحب کی عیادت کے لئے ان کے گھر جائے گا اس کو سزا دی جائے گی اس کا کھانا بند کیا جائے گا اور بطور عذاب اس کا نام بھی خارج کیا جا سکتا ہے۔ عذاب کی دھمکی دینے والے چند استادوں نے خفیہ طور پر "عامر دشمنی" کی ایک ناپاک تحریک چلا رکھی ہے۔ اور کرائے کے ایسے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں جو انھیں اس بات سے مطلع کرتے رہتے ہیں کہ عامر صاحب کی عیادت کرنے کا جرم کس کس سے سرزد ہو رہا ہے

یہ بات میں نے اپنے الفاظ میں منتقل کی ہے۔ طالب علموں نے اس اندوہناک اور قابل ماتم حقیقت کو بالفاظ دیگر بیان کیا تھی۔ قارئین یقین کریں کہ مفہوم میں ادنیٰ تغیر واقع نہیں ہوا جو بات ان طلباء نے بیان کی تھی وہی الفاظ بدل کر میں نے دہرا دی ہے۔

غالباً یہ کہنا تحصیل حاصل ہی ہوگا کہ "عامر دشمنی" کی خفیہ تحریک چلانے والے وہی "چہار درویش" تھے جن کا میں اوپر تذکرہ کر چکا ہوں۔

جب مرحوم کے علم میں یہ بات آئی تو انھیں [illegible] پہنچا اور ان کے متعلقین کو بھی افسوس ہوا۔

قارئین سوچیں گے کہ دنیا کے سب سے بڑے رمضان

رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے تو یہ ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان کے مسلمان پر چھ حقوق ہیں منجملہ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کوئی مسلمان بیمار ہو جائے تو اس کی مزاج پرسی کی جائے اور موجودہ دور کی سب سے بڑی علمی یونیورسٹی کے شہزادے اپنے شاگردوں کو ایک مسلمان کی عیادت کرنے سے روک رہے تھے اور عیادت کو ایک جرم قرار دے رہے تھے اور اس جرم کی پاداش بھی انھوں نے متعین کر دی تھی اور پاداش بھی ایسی جسے ظلم و ستم اور قہر و عتاب کے ماسوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

قارئین اس بات پر حیرت کریں گے بلکہ پیچ و تاب کھائیں گے کہ پروردگار تو اس علمی یونیورسٹی کے معنوی فرشتوں کی بڑی بڑی خطائیں نظر انداز کر دیتا ہے اور ان کی اعلیٰ درجہ کی بے عملی اور بے حسی کے باوجود بھی تقدیر کی اُن کھڑکیوں کو بند نہیں کرتا جہاں سے انسان کا رزق نازل ہوتا ہے لیکن یہ معنوی فرشتے جن کے دامن کو بعض سادہ دل قسم کے مسلمان خانہ کعبہ کے غلاف سے مقدس و محترم سمجھتے ہیں صرف سئیات کے ارتکاب ہی پر نہیں بلکہ حسنات کے مظاہرے پر بھی رزق بند کرنے کی دھمکیاں دیتے ہیں اور پھر اس انداز میں دیتے ہیں کہ جیسے اصل رازق یہی حضرات ہیں۔ جیسے تقدیر کے دستر خوانوں کی باگ ڈور ان ہی کے ہاتھوں میں ہے جسے کہ بس یہی انتظام فرمانے کے فرمانروا ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے بنائے ہوئے اصولوں اور شرائط ناموں کے خلاف جب بھی طلبار کوئی زیادتی یا عملی مخالفت کا اقدام کریں تو ان کے کھانے بند کرنا اور جرموں سے ان کے تام اخراج دینا صحیح بالکل صحیح بلکہ ضروری اور اشد ضروری۔ لیکن کسی انسان کی مزاج پرسی جو رسول اللہ کی مبین سنت ہے، روٹی بند کر دینے کی دھمکیاں دینا اور دوسری ہولناک قسم کی سزاؤں سے ڈرانا۔ دیانت اور پرہیزگاری کی کونسی قسم ہے؟ کیا یہ بات دارالعلوم دیوبند کے خفیہ دستور نامے میں داخل ہے کہ جو شخص دارالعلوم کی مخالف ہو اس کی عیادت نہ کی جائے اور مر جائے تو اس کی بخشش کی دعا بھی نہ مانگی جائے

اس کے بارے میں خدا سے یہ حسن ظن نہ رکھا جائے کہ اسے وادی رحمت میں داخل کر دیا گیا ہوگا؟۔

اگر یہ بات دارالعلوم کے کسی مخفیہ دستور نامے میں شامل ہے تو میں فاضل دارالعلوم ہونے کے باوجود ببانگ دہل یہ کہوں گا کہ یہ معصیت، جہولیت اور ام الحماقت ہونے کے ساتھ ساتھ بربریت اور قہرمانی بھی ہے، تشدد اور چنگیزیت بھی۔ شرارت اور کم ظرفی بھی ہے۔ لیکن اگر دارالعلوم کا کوئی مخفیہ دستور نامہ نہیں ہے اور اس میں اس قسم کی کوئی دفعہ مذکور نہیں ہے جو سنت رسولؐ کے خلاف پڑتی ہو تو پھر اسکے سوا کیا۔۔۔ چلو کہ دارالعلوم کے ان بعض اساتذہ کا ہاتھ پکڑ کر یہ پوچھا جائے کہ جب آپ دارالعلوم کے مستقل نہیں، زمانہ تھیں، عہدے دار نہیں تو آپ کو دارالعلوم کے آنگن میں کوئی لاقانونیت سے لبریز قانون نافذ کرنے کا حق کس نے دیا اور یہ استحقاق آپ کو کس نے عطا کیا کہ آپ جس چاہیں طالبعلم کا کھانا بند کر دیں اور جس چاہیے طالب علم کو ہاتھ پکڑ کر دارالعلوم کی چار دیواری سے باہر نکال دیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ جو طلبا رحمن علم مولانا عامر عثانی کی عیادت کرنے آئے تھے یا آنے کا ارادہ اور خواہش رکھتے تھے وہ مجرم اور خطاکار نہیں تھے، وہ سزا اور عتاب کے مستحق نہیں تھے۔ بلکہ مجرم اور خطاکار وہ حضرات تھے جنھوں نے سنت رسولؐ کے اقدام پر سزاؤں کی دھمکیاں دیں۔ آنکھوں سے شعلے برسائے۔ اپنی طاقت اور استادیت کا غلط استعمال کر کے طلبار کو ایک اچھے کام سے روکا۔ لہٰذا میرے خیال میں تنخواہیں ان استادوں کی کٹنی چاہئے تھیں۔ اور دارالعلوم کی عدالت (دارالاقامہ) میں بازپرس اور احتساب ان ہی استادوں سے ہونا چاہئے تھا جو ایک مخفیہ تحریک کے بانی مبانی تھے اور جو جوشِ تعصب میں یہ بھول گئے تھے کہ یہ تحریک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کے اُسوے کی مخالف ہے۔

[illegible] دارالعلوم کے استادوں کو یہ بتلانے [illegible] چلنے [illegible] اس بات کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ [illegible]

کسی کو کبھی سے روکیں اور کسی کو کبھی بھٹکا سکیں۔ مجھ اور مجھ جیسے غیر متعلق لوگوں کو ایسے استادوں کی زبانوں پر ہاتھ رکھنے اور ان کے متحرک قدموں پر بیڑیاں ڈالنے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے لہذا اخبار کے ریوڑ کو جدھر چلے ہانکو ہم کیوں بولیں اور ہم کیوں مذبان تنقید کھولیں۔ لیکن فاضل دارالعلوم کی حیثیت سے میرا دارالعلوم سے ایک رشتہ ہے اور ہر اس عالم دین سے مجھے محبت اور عقیدت ہے جس کا سینہ تعصبات کے ناز میروں سے پاک ہو جس کی آنکھوں سے بغض و عناد کا دھواں نہ ابلتا ہو اور جس کے ہونٹوں پر بد اخلاقی اور بے ضمیری کی برف نہ جمی ہو جو دارالعلوم کا فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحب کردار انسان اور ایک صاحب ورع مسلمان بھی ہو۔

دارالعلوم میری مادر علمی ہے' میری روح رواں ہے میرا تاج محل ہے' میں نے اسی کے فرش پر بیٹھ کر علم و ہنر کی دولت حاصل کی ہے، اسی کے طفیل میں آج میں قلم چلاتا ہوں اور میری آواز ربڑ کی طرح کھنچکر پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے - یہ سب مادر علمی کا فیض ہے، دارالعلوم کی عطا ہے۔

مادر علمی نے مجھ جیسے کمزور و ناتواں اور بے بضاعت انسان کو آج اس لائق بنا دیا ہے کہ میں اپنے دل میں مچلنے والے خیالات کو الفاظ اور صداؤں کا سہارا لے کر شہر در شہر اور ملک در ملک منتشر کر سکوں تو میرا فرض ہے کہ مادر علمی کو بدنام کرنے والے ہر آوازے کا گلا گھونٹوں، ہر زہریلے اقدام کو کچلوں - ہر ناپاک ارادہ کو ملیا میٹ کرنے کی کوشش کروں۔

زندگی میں جب کوئی شخص خواہ دارالعلوم سے وابستہ ہی کیوں نہ ہو، زبانِ حال اور زبان عمل سے دارالعلوم کو رسوا کرنے کی کوشش کرے گا تو میں اپنی صلاحیتوں کے ناخنوں سے اس کے چہرے پر ایسے نشانات ضرور ڈالوں گا جنھیں دیکھ کر ذکی و فہیم لوگ سمجھ جائیں گے کہ مادر علمی بے قصور ہے' اس کا چہرہ بے داغ ہے' خطاکار وہ لوگ ہیں جو خود فراموشی یا خدا فراموشی کی دنیا میں رہ کر غفلت اور بے حسی کے رشتوں سے گلستان احساس پر کچے ڈھیلے پھینکتے رہتے ہیں اور جن کی

شخصیت سے ... واقف ... وہ ... کہ انھیں دیکھ کر آئینہ انسانیت بھی شرما جائے۔

آئیے اب اس افسوسناک داستان کو آگے بڑھایا جائے۔ دس اپریل کو مولانا عامر عثمانی دیوبند سے رخصت ہو کر بمبئی پہنچے۔ پھر بمبئی سے پونا گئے اور بارہ اپریل کو پونا میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اور ۱۳ اپریل کی دوپہر کو بارہ بجے کے قریب ان کی لاش بمبئی کے ناریل باڑی قبرستان کے حوالہ کر دی گئی۔

۱۳ اپریل ہی کو ان کی وفات کی خبر ملک بھر میں پھیل گئی۔ دیوبند کی گلیوں میں بھی سناٹے چھا گئے۔ ہر شخص کے چہرے پر درد و غم کے آثار صبر آزما انگڑائیاں لینے لگے۔ کچھ کم سوادوں کو چھوڑ کر ہر شخص مغموم اور گریاں تھا۔ یہ کم سواد وہی تھے جن کے بارے میں ایک بار مولانا عامر عثمانی نے یوں فرمایا تھا۔

آج کیا چل ہی بسا بزم جہاں سے عامر
کم سوادوں میں یہ کیوں جشن بپا ہے یارو

ان کم سوادوں کو شاید کوئی غم نہیں تھا اس لئے کہ انھیں اس دین ہی سے سچی محبت اور لگن نہیں تھی جس دین کی خدمت میں مولانا عامر عثمانیؒ نے اپنی جان کھپا دی تھی اپنا ہر عیش تج دیا تھا' اپنے آرام کو داؤ پر لگا دیا تھا - الغرض ہر متاع قربان کر دی تھی۔ ان کم سوادوں نے ایک نازیبا — بلکہ ذلیل حرکت اور کی اور وہ یہ کہ کلمۂ طیبہ کے ختم پر واویلا کرنے کی کوشش کی اور سیاسی تقوے سے لبریز لب و لہجہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ عامر صاحب گمراہ تھے، بددین تھے، مودودی تھے۔ ان کی وفات پر کلمہ طیبہ کا ختم نہیں ہوگا۔

قارئین کلمۂ طیبہ کے ختم کی حقیقت سے واقف ہونگے واقف ہوں تو یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ جب کسی دارالعلوم کے متعلق آدمی کا یا معزز و معروف مسلمان کا انتقال ہوتا ہے تو دارالعلوم کی طرف سے ایصال ثواب کا اہتمام کیا جاتا ہے ... کلمۂ طیبہ بکثرت تعداد میں پڑھ کر مرنے والے کے لئے بخشش و مغفرت کی

دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

مرحوم اگرچہ دارالعلوم سے وابستہ نہیں تھے، لیکن چونکہ وہ ایک بے مثال فاضل دارالعلوم تھے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بعد بدعات و خرافات کے خلاف جتنا جہاد انھوں نے کیا ہے اس کا بارہواں حصہ ایک درجن فاضل دارالعلوم مل کر بھی نہیں کرسکتے۔ طلاق نمبر نکال کر انھوں نے دیوبندی مسلک کی آبرو رکھی۔ بریلوی اسکول کے ماسٹروں سے تحریری مناظرہ کرکے انھوں نے دیوبندیت کو تقویت پہنچائی۔ قاسمیت کو نورِ صحت بخشا۔ لہٰذا یہ دعویٰ غلط قرار نہیں دیا جائیگا کہ مولانا عامر عثمانی دارالعلوم سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود دارالعلوم کی آبرو تھے، دارالعلوم کا وقار تھے۔ اس فکرو خیال کا احیا تھے جس فکرو خیال کو بنیاد بناکر دارالعلوم کی تأسیس کی گئی تھی۔

علاوہ ازیں دیوبند کے ایک معززترین انسان تھے اور ایک معززترین خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ یہ تمام باتیں اس بات کی متقاضی تھیں کہ مولانا کی وفات پر کلمۂ طیبہ کا ختم ہو۔ اور مولانا عامر عثمانی کے حق میں بلندیٔ درجات کی اجتماعی دعا مانگی جائے۔

بعض اصلی دیوبندیوں نے مولانا عامر عثمانی کے لئے ختم شریف کی مجلس منعقد کرنے کا اہتمام کرنا چاہا لیکن چند نقلی دیوبندی روایتی ڈنڈے اٹھاکر کھڑے ہوگئے اور حلق کے بل چیختے ہوئے فرمانے لگے ــــــ عامر عثمانی مودودی تھے، ایک گمراہ جماعت کے وکیل تھے۔ لہٰذا ختم شریف کی محفل منعقد نہیں ہوگی۔ اصل دیوبندیوں کی تعداد زیادہ تھی اور نقلی دیوبندی وہی ایک دو تین چار کے اندر [illegible] کئے ہوئے تھے۔

قصہ کوتاہ۔ اصلی دیوبندیوں کا پلہ بھاری تھا۔ لہٰذا نقلی دیوبندیوں کو منہ کی کھانی پڑی اور نودرہ کی مقدس عمارت میں کلمۂ طیبہ کا ختم ہوا اور اجتماعی طور پر مولانا عامر عثمانی کی بلندیٔ درجات کی دعا مانگی گئی۔

شہریوں کا [illegible] اس ناپاک ہنگامے کی بھنک پڑی کہ ختم شریف کے علاوہ [illegible] بھی ہو رہا تھا تو انھوں نے موقف چھانٹنے والے "کم سوادوں" کی خوب مزاج پرسی کی، ہر طرف ملامت کے پتھر اچھلے۔ بدزبان شہریوں نے گندے فقروں کی بوچھار کی اور دیکھتے ہی دیکھتے کم سوادوں کا دامن داغدار گالیوں کی سوغات سے بھر گیا۔

اب عوام الناس کے لفظی گھونسوں سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ بس سجدۂ سہو کر لیا جائے اور زبان پر ہتھیلی تلے چڑھالئے جائیں۔ چنانچہ تین درویشوں نے مصلحت کی غلامی قبول کرتے ہوئے سجدۂ سہو کر لیا اور آخرکار اس طرح انھوں نے اپنی اس انسانیت کی تکمیل کرلی جس میں کچھ بداخلاقیوں کی وجہ سے زبردست رخنہ پیدا ہوگیا تھا لیکن مجلس چہار درویش کے چوتھے ممبر کو سجدۂ سہو کی بھی توفیق نہ ہوسکی ــــــ اور ان کی انسانیت میں پڑا رخنہ دن بدن بڑھتا ہی رہا۔

عوام کی گالیوں اور لعنتوں سے گھبراکر تین درویش تو گونگے کا گڑ کھاکر بیٹھ گئے۔ اور اس طرح قصۂ چہار درویش تو تمام ہوا۔ اب قصۂ یک درویش اور سن لیجئے۔ یہ وہی درویش ہیں جن کا ذکر خیر ہم مضمون کے شروع میں کرچکے ہیں اور جن کی مخصوص قسم کی فقیری عالمگیر نہ سہی "دیوبندگیر" حیثیت ضرور رکھتی ہے۔

ان کا نام نامی ــــــ؟

مگر ــــــ ہمارا خیال ہے کہ ان کا نام ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مقصد تو صرف ان جھوٹی اور واہیات باتوں کا تجزیہ ہے جو ان صاحب نے غیر محتاط الفاظ کے غباروں میں بند کرکے ادھر ادھر اڑائی تھیں ــــــ ہماری آواز ان کے کانوں تک پہونچ جائے اور انھیں سجدۂ سہو اور توبہ کی توفیق نصیب ہوجائے۔ اس کے سوا ہمارا کوئی منشا نہیں۔ ممکن ہے کہ قارئین کا ذوق سماعت اس بات کی ضد کرے کہ ان صاحب کا نام آؤٹ کیا جائے تاکہ ہم براہ راست بھی کچھ مزاج پرسی کرسکیں۔ تو ہماری مؤدبانہ التجا یہ ہے کہ قارئین کے ذوق سماعت کی یہ ضد پوری نہیں کی جاسکے گی

قارئین کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیئے کہ ان دگزاف اور نامہ قابلِ فحش کرنے والے کا نام عبدالحمید ہے یا سبھاش چندر بوس وہ کشمیر کے لہلہاتے علاقے میں پیدا ہوئے تھے یا راجستھان کی بنجر اور خشک بھومی میں ــــــ

قارئین تو بس اتنی سی بات دائرہ دماغ میں مقید کرلیں کہ یہ صاحب دارالعلوم کے استاذ ہیں، ایک اچھے مقرر ہیں ــ بے مثال بازیگر ہیں، چرب زبانی تفنن اور غیر سنجیدگی کے سرمائے سے مالا مال ہیں اس سے زیادہ قارئین کو ادر کیا چاہیئے ــ لہٰذا اگلی گفتگو بھی نام کی نشان دہی کئے بغیر ہی ہوگی۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ کچھ اور باتیں کرنے سے پہلے ہم ایک فرضی نام متعین کرلیں ــ دراصل اب بات چیت ہم براہ راست انھیں سے مخاطب ہوکر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ان کا نام "استاد" فرض کر لیا ہے۔ یہ نام فرض کرنے کے بعد اب ہماری قارئین سے استدعا ہے کہ وہ از راہ کرم اپنی آنکھیں بند کرلیں تاکہ محترم استاد صاحب سے دو بدو گفت و شنید کرتے وقت ہمیں کسی قسم کا کوئی تکلف اور کسی قسم کی کوئی جھجک نہ ہو۔

محترم استاد صاحب! میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ مجھ سے واقف ہیں یا نہیں لیکن میں آپ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب چند دن کے لئے میرے اور آپ کے درمیان استاد اور شاگرد کا رشتہ قائم ہوا تھا۔ یہ میری بدنصیبی ہے یا خوش بختی کہ مجھے آپ سے صرف ایک کتاب پڑھنے کا موقع ملا۔ آپ نے اس کتاب کے بارہ صفحے پڑھائے اور لکھوائے تھے چالیس۔ یہ چالیس لکھوانے کی مصلحت بر وقت تو میری سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن بعد میں اس مصلحت کی ابتدا اور انتہا مجھ پر واضح ہوگئی تھی۔ پہلے یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی کہ مجلس شوریٰ ان استادوں کی ترقی روک دیتی ہے جو متعینہ صفحات تک کتاب نہیں پڑھا پاتے۔ آپ نے تعلیمات کے دفتر میں زیادہ صفحات لکھوا کر یہ ثابت کیا تھا کہ آپ کے نزدیک بمقابلہ ترقی کے دیانتداری کی کوئی حیثیت نہیں۔ آپ کی اس حرکت سے اکثر طلبا بدگمانی میں مبتلا ہوگئے تھے اور اس عقیدت اور حسنِ ظن کو زبردست ٹھیس پہونچی تھی جو آپ کی ذات سے وابستہ تھا۔

اس کے بعد پے در پے آپ کی بہت سی ایسی حرکتیں مشاہدہ میں آئیں جو پرہیزگاری کے منافی تھیں۔ اخلاق و ایمان کے برخلاف۔ تھیں، انسانیت کی ضد تھیں مطلق رہیں ــــــ میں ان حرکتوں سے پردے نہیں ہٹاؤں گا۔ اس لئے کہ میں آپ کی ذات کا دشمن نہیں ہوں اگر مجھے آپ کی ذات سے دشمنی ہوتی تو صرف وہ واقعہ آپ کو بدنام کرنے کے لئے کافی تھا جس واقعہ کی وجہ سے دیوبند کے بعض علاقوں میں آپ کی تقریروں پر پابندی لگادی گئی تھی اور جس واقعہ کی وجہ سے سہارنپور کے ایک محلہ میں تقریر کرتے وقت آپ کے چہرے پر گوبر پھینک کر مارا گیا تھا۔

میں دیوبند کے ان شہریوں کو سنجیدہ نہیں سمجھتا جو آپ کے خلاف باتیں بناتے پھرتے ہیں اور آپ کا شمار ان لوگوں میں کرتے ہیں جنھیں عقلاً اخلاقاً اور علمی طور پر کوئی حیثیت نہیں دی جاتی ــ میں سہارنپور کے ان باشندوں سے بھی خفا تھا جنھوں نے ایک معمولی سے قصور کی پاداش میں ایک گندی چیز آپ کے چہرے پر پھینک کر ماری تھی ــــــ اور اس طرح انہوں نے اعلیٰ درجہ کی بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟ آپ سے ایسی کونسی غلطی سرزد ہوگئی تھی کہ عوام آپ پر ڈھیلے اچھالنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اگر میں اس واقعہ کا اور اس جیسے چند طوفان نما واقعات کا تجزیہ کرنے بیٹھ جاؤں تو مضمون ضرورت سے زیادہ پھیل جائیگا لہٰذا ان واقعات کے تجزیہ سے قطع نظر صرف اتنی گذارش ہے کہ آپ کی غیر سنجیدگی اور آپ کا مسخرہ پن آپ کی شخصیت کو مستقل ٹھیس پہونچا رہا ہے۔ اگر اب بھی آپ نے اپنے طرز زندگی پر نظر ثانی نہیں کی تو پھر چند سال کے اندر اندر آپ کی رہی سہی ساکھ بھی فنا کے گھاٹ اتر جائے گی اور آپ ملک بھر میں رسوا ہوکر رہ جائیں گے میری التجا ہے کہ کسی بھی موضوع پر گفتگو کرتے وقت اور کسی بھی شخص کے بارے میں اپنے نظریات پیش کرتے وقت محتاط رہا کیجئے اور زبان کو احتیاط کے دائروں سے آگے نہ بڑھنے دیا کیجئے۔

میں آپ کو ایک مدت سے جانتا ہوں۔ بلکہ یہ سمجھئے کہ آپ اپنے بارے میں اتنی معلومات نہیں رکھتے جتنی معلومات مجھے آپ کے بارے میں ہے ــــــ میں اس وقت آپ کے اوصاف و محاسن کا ذکر نہیں چھیڑوں گا مجھے تو ان واہیات باتوں کو نقل کرنا ہے جو شاید بدحواسی کے عالم میں آپ کی زبان سے خارج ہوگئی تھیں۔ اور جو باتیں سنجیدگی، تعقل اور صداقت سے اسی طرح محروم ہیں جس طرح

آگ ٹھنڈک سے اور برف حرارت سے محروم ہو جاتا ہے۔

سنئے۔ آپ نے کیا فرمایا تھا ۔۔۔ آپ کے ارشادات کو میں نے چار قسموں میں تقسیم کر دیا ہے، میں انھیں جوں کا توں نقل کرنے کے بعد کچھ گذارشات بھی کروں گا اور آپ سے کچھ سوالات بھی ۔۔۔۔۔

(۱) عامر صاحب دیوبندی نہیں تھے، وہ مودودی تھے۔ لہٰذا ان کی وفات پر کلمہ طیبہ کا ختم ہرگز ہرگز نہیں ہونا چاہیئے۔

(۲) عامر صاحب کو دیوبند میں جگہ نصیب نہ ہو سکی اس لئے کہ وہ راندۂ درگاہ تھے۔

(۳) اسلم صاحب سے عامر عثمانی نے بمبئی جانے سے قبل کہا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مجھ سے کہہ رہا ہو یہاں سے نکل جا۔ دفع ہو جا ۔۔۔ دیوبند میں تیرے لئے کوئی جگہ نہیں۔

(۴) خواب میں یہ دیکھا گیا ہے کہ عامر عثمانی پر عذاب ہو رہا ہے۔

آپ اپنی کہہ چکے اب میری سن لیجئے، میں عرض کرتا ہوں۔

محترم: اگر آپ افیم کھانے کے عادی ہوتے تو میں یہ سمجھ لیتا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے بے ہوشی اور بدہوشی کے عالم میں فرمایا ہے۔ لہٰذا آپ کو معاف کیا جائے اور آپ کے ان عریاں فقروں سے درگذر کیا جائے جو بداخلاقی کا بدترین نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ علم و عقل سے بھی متصادم ہیں۔

میں جو کچھ گذارش کروں گا بالترتیب کروں گا لہٰذا اتنی زحمت تو آپ کو گوارہ کرنی پڑے ہی گی کہ آپ میری ہر گذارش پر نظر ڈالنے سے پہلے اپنے ارشادات کو بھی دیکھتے چلیں تاکہ گفتگو خلط ملط نہ ہو اور آپ پر یہ بات واضح ہو جائے کہ کس نمبر کے ضمن میں آپ کے کس "قول مبارک" کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا ہے۔

"میں حیران ہوں کہ آپ مولانا عامر عثمانی کو دیوبندی تصور نہیں کرتے ۔۔۔۔ آخر آپ کے نزدیک دیوبندی ہونے کے لئے کیا چیز ضروری ہے۔ کیا مولانا عامر عثمانی کے عقائد دیوبندیوں کے عقائد سے متصادم تھے۔ کیا مولانا عامر عثمانی نے بریلویوں کے خلاف ۲۷ سال تک قلمی جہاد کر کے ان کے ناقص مسلک کو مجروح نہیں کیا اور کیا مولانا عامر عثمانی نے وقتاً فوقتاً علمی مضامین کے ذریعہ دیوبندی مسلک کی لاج نہیں رکھی، کیا دیوبندی ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہو؟۔ آپ کے نزدیک دیوبندی ہونے کے لئے کس شرط کا پایا جانا ضروری ہے مثلاً اگر میں آپ کو دیوبندی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں تو اپنے کس خاص وصف کا حوالہ دے کر یہ ثابت کریں گے کہ آپ دیوبندی ہی ہیں۔

چلئے میں فرض کئے لیتا ہوں کہ مولانا عامر عثمانی دیوبندی نہیں تھے ان کے اندر ایسا وصف خاص موجود نہیں تھا جو انسان کو دیوبندی بناتا ہے۔ اس مفروضہ کے بعد بھی میں آپ سے یہ سوال کروں گا کیا ساری دنیا کے اندر صرف مسلمان کہلانے کے مستحق وہی حضرات ہیں جو دیوبند سے ذہنی طور پر وابستہ ہوں۔ کیا آپ ان تمام مسلمانوں کو گمراہ بیدین اور بے ایمان قرار دیں گے، جن کے دلوں میں دارالعلوم کے لئے کوئی جگہ نہ ہو یا جو دیوبندیوں کے نظریہ کو "اصل اسلام" خیال نہ کرتے ہوں۔ اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو پھر آپ کے مولانا عامر عثمانی کے بارے میں یہ واہی بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیئے کہ وہ دیوبندی تھے۔ ان کے لئے مغفرت کی دعا نہ کی جائے گی، اور اگر جواب اثبات میں ہے یعنی آپ کے فرمودات کا منشا، یہ تھا کہ جو دیوبند سے وابستہ نہیں، دیوبندی نظریہ کا قائل نہیں اسے مسلمان نہیں کہا جا سکتا تو میں آپ کی صحیح الدماغی پر شک ..... کرنے کے لئے مجبور ہو جاؤں گا ۔ اور ایک میں ہی کیا ہر شخص آپ کی ذہنیت پر ماتم کرے گا، اور آپ کی عقل کا مذاق اڑائے گا، اور دنیا آپ سے ایسی کتاب کا مطالبہ کرے گی جس میں کسی قابل اعتماد دیوبندی نے یہ شگوفہ چھوڑا ہو کہ جو دیوبندی نہیں وہ مسلمان بھی نہیں ۔ وہ اس قابل بھی نہیں کہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کی جائے اور مر جائے تو اس کے حق میں دعائے مغفرت کی جائے۔

جب تک آپ کسی قابل اعتماد دیوبندی کی کوئی ایسی تحریر نہیں دکھائیں گے جو آپ کے خیال کی تائید کرتی ہو۔ آپ کی بات میں تولہ بھر بھی وزن پیدا نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چند طالب علموں کے علاوہ آپ کو کوئی ثقہ نہیں سمجھتا۔ آپ کی باتیں بالکل اس نٹ کھٹ بچے کی باتوں کی طرح ناقابل التفات تصور کی جاتی ہیں جو شرارتاً دوسروں پر فقرے کسنے کا خوگر ہو۔ ۔۔۔ اگر آپ اپنی بات میں اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بطور ثبوت کسی معتمد دیوبندی کی ایسی تحریر پیش کیجئے جس سے یہ ثابت ہو کہ

دیوبندی حضرات قطعاً اس قابل نہیں ہیں کہ انھیں ایصال ثواب کیا جائے یا ان کی مغفرت کی دعا مانگی جائے ۔۔۔ اگر آپ نے کسی معتمد دیوبندی کو یہ پیش نہ کی تو پھر اطمینان رکھئے کہ آپ کی ہفوات پر کوئی صاحب فہم آدمی کان دھرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ لگے ہاتھوں یہ بات بھی نوٹ کر لیجئے کہ مولانا عامر عثمانی نے ۲۷ سال تک اسلام کی جو انتھک خدمت انجام دی ہے وہ ان کی بخشش کرانے کے لئے کافی ہے، آپ جیسے لوگ اگر ایصال ثواب کی زحمت گوارہ نہ کریں تو ان پر اس کا کوئی اثر واقع نہیں ہوگا۔ اور لگے ہاتھوں یہ بات بھی نوٹ کر لیجئے کہ دارالعلوم آپ کی جاگیر نہیں ہے، آپ کی ملکیت نہیں ہے۔ بے شک آپ دارالعلوم کے استاد ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آپ نے ہزاروں طلباء کو فائدہ بہم پہنچایا ہے لیکن اس کے باوجود بھی دارالعلوم آپ کے نام وقف نہیں ہوا، اس پر جتنا اختیار آپ کا ہے اتنا ہی اختیار دیوبند کے ہر شہری کا ہے، ہر مسلمان کا ہے، مولانا عامر عثمانی کے پس ماندگان بھی دیوبند ہی میں رہتے ہیں۔ وہ خیر سے مسلمان بھی ہیں۔ انھوں نے دارالعلوم کو اپنا سمجھ کر ایصال ثواب کی فرمائش کر دی تھی اگر منتظمین دارالعلوم نے اس فرمائش کو قبول کر لیا تھا تو اس میں کونسی قیامت برپا ہو گئی تھی۔ اور منتظمین نے اس فرمائش کو پورا کرکے ایسے کونسے گناہ کا ارتکاب کر دیا تھا کہ جسے آپ برداشت نہ کر سکے اور بپھر گئے اور آپ نے اپنی زبان کو مکمل طور پر آزادی عطا کر دی کہ نکال لے تو آج اپنے ارمان ـــــــ آج کے دن تجھ پر کوئی پابندی نہیں ۔۔ کوئی دارو گیر نہیں ۔۔ کوئی محاسبہ کرنے والا نہیں ۔۔

آپ نے مولانا عامر عثمانی کے بارے میں جو ہفوات بیان کی تھیں ان کا ہر لفظ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ خوف خدا اور خوفِ آخرت نام کی کوئی چیز آپ کے دل میں موجود نہیں ہے۔

(۲) میرا خیال ہے کہ آپ نے مولوی اسلم صاحب کی طرف جو کچھ منسوب کیا ہے وہ مبنی بر کذب ہے الزام ہے، زیادتی ہے۔ اس لئے کہ مولوی اسلم صاحب بہت زیادہ متقی نہ ہونے کے باوجود ایک سنجیدہ اور ذی شعور آدمی ہیں وہ اُن سر پھرے مسلمانوں میں سے نہیں ہیں جو محاسبۂ آخرت کے فکر کو بالائے طاق رکھ کر خواہ مخواہ زبان چلاتے پھرتے ہیں۔ جھوٹ اور سچ کی جن کے نزدیک کوئی اہمیت نہ ہو۔ صدق بیانی اور کذب بیانی کو جو ایک ہی درجہ دینے کے عادی ہوں۔ اور جن کے دلوں کی گذرگاہوں میں اس چیز کا کبھی گذر نہ ہوا ہو جسے "خوفِ احتساب" کہا جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ نے اپنی بندوق مولوی اسلم صاحب کی گردن پر رکھ کر چلا دی ہے، اور ان کی طرف ایسی واہیات باتیں منسوب کر ڈالی ہیں جن کی بظاہر ان سے کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

لیکن اگر آپ اس بات پر بضد ہیں کہ آپ نے اپنی طرف سے کچھ نہیں فرمایا، جو کچھ کہا ہے وہ مولوی اسلم نے کہا ہے اور آپ نے صرف بات کو منتقل کرنے کی خدمت انجام دی ہے۔ تو پھر میں بالفاظِ صریح یہ کہونگا کہ مولوی اسلم صاحب نے جھوٹ بولا ہے۔ فریب کاری سے کام لیا ہے مولانا عامر عثمانی نے ان سے جب گفتگو کی دوسرے حضرات کی موجودگی میں کی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی تہہ خانے میں یا کسی بند کمرے میں انھوں نے مولوی اسلم کو طلب کیا ہو اور وہاں اُن سے سرگوشی کرنے کے انداز میں کچھ فرمایا ہو۔ انہوں نے جب اور جو کچھ کہا دوسرے متعلقین اور منتسبین کی موجودگی میں کہا اور اس وقت موجود رہنے والے تمام حضرات اس بات کے گواہ ہیں کہ مولانا عامر عثمانی نے اس کے سوا کچھ نہیں کہا تھا۔

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی غیر مرئی قوت مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔"

اس جملہ سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان کی مٹی انہیں کھینچ رہی تھی اور کاتب ازل نے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ پونا میں انتقال کرنے کے بعد بمبئی میں دفن ہوں۔ انہوں نے اپنی زبان سے ایسا کوئی جملہ نہیں نکالا جس کا مطلب یہ نکلتا ہو کہ دیوبند کی زمین خالی کر دو یہاں سے نکلو کہیں اور دفع ہو جاؤ۔

میرا اپنا خیال تو اب بھی یہی ہے کہ جھوٹ آپ نے بولا ہے مولوی اسلم صاحب نے نہیں میں انھیں آپ کے مقابلہ میں زیادہ سنجیدہ اور زیادہ شریف آدمی سمجھتا ہوں ۔۔ لیکن اگر آپ انھیں جھوٹا باور کرانا چاہتے ہی ہیں تو میرا مشورہ ہے کہ اپنی صفائی میں ایک مضمون لکھ دیجئے، میں اسے تجلی میں چھاپ دونگا۔ آپ بری الذمہ قرار پائیں گے اور پھر اس سلسلہ میں مجرم مولوی اسلم صاحب کو سمجھا جائیگا۔ اگر آپ نے خاموشی اختیار کر لی تو میں یہ یقین کرنے پر مجبور ہوں گا کہ درحقیقت، فنکاری اور بازیگری کا مظاہرہ آپ ہی نے کیا ہے اور بے چارے مولوی اسلم صاحب کے کاندھوں پر خواہ مخواہ اپنی لسانی خطاؤں کا بوجھ رکھ دیا ہے ـــــــ اور اگر آپ نے کچھ شواہد پیش کرکے یہ ثابت کر دیا کہ جھوٹ کی کارستانی

مولوی اسلم صاحب ہی سے سرزد ہوئی ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ آپ نے آنکھیں بند کر کے مولوی اسلم صاحب کی ہوائی باتوں پر کیونکر اعتماد کر لیا اور کسی قسم کی تحقیق کئے بغیر انھیں طلبا رکے مجمع میں کیسے بیان کر دیا۔ کیا آپ نے یہ حدیث نہیں پڑھی، کہ جھوٹے آدمی کے لئے یہی بات کافی ہے کہ وہ کچھ سنے بغیر تحقیق کے دوسری جگہ بیان کر دے۔؟

(۳) یہ بات آپ کی نادانی اور کم فہمی کا مکمل تعارف کرادیتی ہے اور اسے پڑھکر اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ آپ کا علم آپ کی عقل کے تابع ہے اگر علم عقل کے تابع نہ ہوتا تو آپ ایسی کچی بات زبان سے خارج نہیں کر سکتے تھے۔

دیوبند میں عامر عثمانی صاحب کو جگہ نصیب نہ ہونا اس وقت بدنصیبی اور شرمساری کا باعث ہوتا جب کسی قلب پر آسمان سے وحی نازل ہوتی اور خالق کائنات نے اس بات کا فیصلہ کر دیا ہوتا کہ جو شخص دیوبند کی مقدس زمین میں دفن ہوگا اس کی بخشش کا ہم وعدہ کرتے ہیں ۔۔ خواہ اس نے زندگی بھر گناہ کئے ہوں خواہ اس کی عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ حقانیت کے خلاف زہر اگلنے میں گذرا ہو خواہ وہ اپنے دور کا بدترین انسان ہو۔

اگر آپ کے قلب مبارک پر اس قسم کی کوئی وحی نازل نہیں ہوئی تو پھر آپ نے یقین کے ساتھ یہ کیسے فرما دیا کہ عامر عثمانی کو دیوبند کی زمین میں دفن ہونے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ راندۂ درگاہ تھے۔

یہ گذارش کرنے کے بعد اب میں آپ سے پوچھوں گا کہ آپ کے نزدیک کیا دیوبند کی تمام زمین باعث نجات ہے۔ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو پھر آپ ہمیں اس بات کی تحریری اجازت دے کر مریں کہ اگر ہم مناسب سمجھیں تو آپ کی لاش کو دیوی کنڈ کے اس حصے میں دفن کردیں جہاں ارتھیوں اور چتاؤں کی راکھ دفن کی جاتی ہے اور اگر آپ کا جواب نہیں میں ہے اور یقیناً نہیں میں ہوگا تو ہمیں اس حقیقت سے آگاہی بخشیں کہ دیوبند کا وہ کونسا قبرستان ہے جہاں دفن ہوجانا اس بات کی علامت ہے کہ جنت داجب ہوگئی ۔۔۔ اور خدا مجبور ہوگیا عذاب نہ دینے پر ۔۔۔

از راہ کرم اس قبرستان کی نشاندہی کیجئے جس میں مولانا عامر عثمانی صاحب کو جگہ نصیب نہ ہونے کی وجہ سے آپ یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ عامر عثمانی خدا کی بارگاہ میں مقبول نہیں تھے اگر مقبول ہوتے تو ہمارے فلاں قبرستان میں ان کی قبر بنتی۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تو میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ دیوبند میں ایک ہی قبرستان ایسا ہے جس کے بارے میں لوگوں کو خوش فہمی ہے کہ جن صاحب کو اس میں جگہ نصیب ہوگئی اس کی بخشش یقینی ہے۔ خواہ وہ صاحب اپنے وقت کے لاجواب منافق ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ خوش فہمی ایک حماقت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اس لئے کہ جو مذاہب اپنے ماننے والوں کو مختلف طریقوں سے اور مختلف پیرایوں میں یہ تعلیم دیتا ہو کہ قبر میں اترنے کے بعد تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارا نسب کیا ہے تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ کہاں پیدا ہوئے۔ زندگی بھر کسی بزرگ کے ردائے غلام بے رہے۔ کس قبرستان میں دفن ہونے کی حسرت کی اور اب کس قبرستان میں تم تشریف لائے ہو۔ وہاں تو صرف نامۂ اعمال کو ٹٹولا جائے گا۔ تمہارے کارناموں اور کرتوتوں کی بابت سوالات ہوں گے۔ اصل حیثیت اپنے افعال کی ہوگی۔ وہ اسلام یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اعمال وافعال کا کوئی درجہ نہیں کوئی وقعت نہیں، اصل چیز یہ ہے کہ آدمی مر کہاں رہا ہے اور دفن کس مقام پر ہو رہا ہے ۔۔۔ آپ نے یہ شعر سنا ہوگا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بے شک یہ شاعر کا خیال ہے اور شاعر لوگ پیغمبر نہیں ہوتے کہ ان کی ہر بات پر تو حقیقت کا درجہ رکھتی ہو لیکن شاعر کا یہ منقولا خیال حقیقت کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اصل چیز نامۂ اعمال ہے کسی زمین کی خاک نہیں کسی گورستان کی چاردیواری نہیں۔ کسی بزرگ کا پڑوس نہیں۔

اگر اعمال وافعال اچھے ہیں تو ہندوؤں کے کسی مردہ گھاٹ میں دفن ہونے کے بعد بھی بندہ کو رحمت خداوندی کی دولت مل کر رہے گی اور اگر اعمال وافعال اچھے نہیں ہیں تو کسی بڑے سے بڑے قطب کے پہلو میں دفن ہونے کے بعد بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ بیڑا پار ہوا۔ اب بازپرس کا کوئی سوال ہی نہیں۔ یہ تصور قطعاً غیر اسلامی ہے کہ آدمی بزرگوں کے اردگرد دفن ہو کر جنت کا حقدار ہوجاتا ہے۔ اور جسے بزرگوں کے پاس جگہ نہ مل سکے ..... وہ راندۂ درگاہ قرار پاتا ہے۔ ایک

عالم دین کے لئے اس قسم کے واہی تصور سے بچنا ہی ضروری ہے لیکن میں فرض کئے لیتا ہوں کہ دیوبند میں قاسمی قبرستان کو یہ مقام حاصل ہے کہ مرنے کے بعد جس کو اس میں لیٹنے کی جگہ ہاتھ آگئی اس کے وارے کے نیارے ہوگئے اور وہ شخص ہلدی نہ لگے نہ پھٹکری رنگ آئے چوکھا کے مصداق بے حساب کتاب جنّت میں گیا

یہ فرض کرنے کے بعد اب میں آپ سے یہ سوال کروں گا کہ اس باعثِ نجات قبرستان میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کو دو گز زمین کیوں نصیب نہ ہوسکی؟ مولانا عامر عثمانی رح کے دل میں کبھی اس بات کی تمنا پیدا نہیں ہوئی تھی کہ انھیں قاسمی قبرستان میں دفن ہونے کی سعادت حاصل ہوجائے۔ لہٰذا ان کا دوسرے مقام پر دفن ہونا لائقِ حیرت اور باعثِ تشویش نہیں لیکن مولانا فخر الدین کی یہ آرزو تھی کہ انھیں ان کے شیخ کے پہلو میں دفن ہونے کا شرف حاصل ہوجائے۔ انہوں نے مختلف مجلسوں میں اپنی اس آرزو کا اظہار کیا تھا اور یقیناً خدا سے اس بات کی دعا بھی مانگی ہوگی کہ مجھے حشر کے دن قاسمی قبرستان سے اٹھنے کی سعادت نصیب ہو، لیکن اس کے باوجود انھیں مذکورہ قبرستان میں جگہ میسر نہ آسکی اور مرادآباد میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ یہ ہے قابلِ غور بات، بلکہ قابلِ تشویش۔ اور اس سے زیادہ قابلِ غور اور قابلِ تشویش بات یہ ہے کہ محدث جلیل حضرت مولانا انور کشمیری رح کو دیوبند میں انتقال فرمانے کے باوجود قاسمی قبرستان میں دفن کے لئے دو گز زمین نہ مل سکی اور وہ ایک الگ تھلگ قبرستان میں دفن ہوئے قاسمی قبرستان میں جگہ نہ ملنے اور بالکل الگ تھلگ دفن ہونے کی ظاہری وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن عقل یہ کہتی ہے کہ ان کا قاسمی قبرستان جیسے مقدس اور باعثِ نجات قبرستان سے دور رہ جانا قابلِ فکر اور قابلِ گریاں بات ہے۔

عقل سے مراد میری عقل نہیں ان خوش فکروں کی عقل ہے جو بے چارے اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ زندگی بھر جوا کھیلو اور بے ایمانیاں کرو۔ عیاشی میں مستغرق رہو اور جب مرو وصیت کرکے مرو کہ ہمیں قاسمی قبرستان میں دفنا دینا بس پھر مجال نہیں ہوگی اللہ میاں کی کہ وہ عذاب دے لیں۔

محترم! اگر آپ اس کو معیا ر بنالیں گے کہ جو شخص بزرگوں کے قبرستان میں دفن ہو وہ مقبول اور جو دفن نہ ہوسکے وہ مردود۔ تو پھر ہزار قسم کے فتنے سر ابھاریں گے، اور گستاخ ذہنوں میں یہ وسوسے جنم لیں گے کہ جن صحابہ کو جنّت البقیع میں جگہ حاصل نہ ہوسکی، ان کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے۔؟

حضرت عائشہ رض کی دلی تمنا تھی کہ رسولِ خدا کے پہلو میں جگہ نصیب ہو، لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ انھیں روضۂ اقدس میں جگہ نصیب نہ ہوسکی۔ جگہ نصیب نہ ہونے کا سببِ ظاہر کچھ بھی رہا ہو لیکن یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ پختہ اور سچی تمنا کے باوجود وہ روضۂ اقدس میں جگہ نہ پاسکیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکال لیں کہ حضرت عائشہ رض خدا کی بارگاہ میں مقبول نہیں تھیں؟

کتابیں ٹٹولئے آپ پر یہ بات منکشف ہوگی کہ بیسیوں جلیل القدر صحابہ کو حجاز و عرب کی مقدس زمین میں دفن ہونے کا شرف حاصل نہ ہوسکا۔ اور تاریخ آپ کو یہ بھی بتائے گی کہ منافقین اور غدارانِ اسلام کی ایک بڑی تعداد اور ابوجہل اور ابولہب جیسے اسلام کے کٹر دشمن عرب کی مقدس زمین میں دفن ہیں۔ اگر تدفین اور مقامِ تدفین ہی کو بخشش کی کسوٹی گمان کرلیا جائے تو پھر بعض جاہلوں کی عقل ان غداروں کے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہوگی جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک پل اسلام کو گزند پہونچانے میں گذر رہا تھا اور ان مجاہدین کے بارے میں غلط فہمی جنم لے گی جن کی عمرِ عزیز کا ہر سیکنڈ زبان و عمل سے اسلام کو تقویت پہنچانے میں صرف ہوا تھا — لیکن جو کسی وجہ سے الگ تھلگ دفن ہونے پر مجبور ہوئے اور انھیں بزرگوں کے بیچوں بیچ دفن ہونے کی سعادت حاصل نہ ہوسکی۔

چلئے اب ایک دوسرے رخ سے بھی سوچ لیا جائے۔ آپ نے مولانا عامر عثمانی کے بارے میں ہزیان بیانی کا مظاہرہ کرکے دیوبند کے شہریوں کی زبردست توہین کی ہے اور آپ نے اپنی ہفوات کے پس منظر میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ بمبئی کی سرزمین پر صرف ان ہی لوگوں کی قبریں بنتی ہیں جو خطا کار ہوں، محروم الرحمت ہوں، راندۂ درگاہ ہوں، اگر بمبئی کی سرزمین میں بزرگوں اور نیکو کاروں کا دفن ہونا دائرۂ امکان میں داخل ہے تو پھر آپ کو یہ شور مچانے کی زحمت کیوں اٹھانی پڑی کہ بیچارے عامر عثمانی کو دیوبند میں جگہ نصیب نہ ہوسکی اور وہ بمبئی میں جاکر دفن ہوئے۔ ظاہر ہے کہ زبان سے شوریدہ اور بے [illegible] مطلب اس کے سوا کیا تھا کہ دیوبند میں جو دفن ہوا وہ خوش نصیب اور [illegible]

میں جس کی قبریں وہ محروم التقدیر۔

ارباب مبحث اگر بالکل بے حس اور سوجھ بوجھ سے یکسر عاری نہیں ہیں تو وہ اس بات پر آپ کا گریبان پکڑ کر آپ کی لغزشوں کا محاسبہ کر سکتے ہیں اور کم از کم اس رحم وکرم میں تو کمی واقع ہو ہی سکتی ہے جس رحم وکرم کے بل بوتے پر آپ مطمئن اور خوشگوار زندگی گذار رہے ہیں —

چلئے اب ذرا تیسرے رُخ سے بھی گفتگو کر لی جائے۔ آپ نے دیوبند کی سرزمین کو اتنا مقدس سمجھ رکھا ہے جتنی مقدس واطہر مدینہ اور مکہ کی سرزمین بھی نہیں سمجھی جاتی، مدینہ اور مکہ کی قابل احترام زمین کے بارے میں بھی کسی قابلِ اعتماد عالم دین نے یہ شگوفہ نہیں چھوڑا کہ جو شخص یہاں دفن ہو جائے اس کی بخشش ومغفرت یقینی ہے اور جس کو یہاں دفن ہونے کے لئے جگہ نصیب نہ ہو سکے اُخروی طور پر اس کا برباد ہونا ایک طے شدہ بات ہے۔ مدینہ اور مکہ کی سرزمین میں مرنا اور وہیں دفن ہونا قابلِ مبارکباد بھی خوش نصیبی کا مظہر سہی لیکن مدینہ اور مکہ میں دفن نہ ہونا اس بات کی علامت نہیں ہو سکتا کہ مدفون بد نصیب تھا۔ محروم القسمت تھا، جہنمی تھا۔ جن لوگوں کو مرنے کے بعد قاسمی قبرستان میں دو گز زمین نصیب ہو جائے انھیں خوش نصیب سمجھنے اور خوش نصیب کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن جنھیں دیوبند کی زمین میں اور قاسمی قبرستان کے احاطہ میں جگہ نصیب نہ ہو سکے ان کے بارے میں یہ تصور کر لینا کہ یہ لوگ بدنصیب اور راندۂ درگاہ تھے جہالت کی اعلیٰ ترین قسم ہے —— اس قسم کی احمقانہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس کی عقل ماؤف ہو، جو ذہنی دیوالیہ پن کا شکار ہو۔

محترم! ہر وہ تصور جہالت زدہ اور حماقت آمیز ہی کہلائے گا جو ذہن میں غلط اور گمراہ کن وساوس پیدا کرے۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ دیوبند کی ارض پاک اور قاسمی قبرستان جب محمود ومردود کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور جو یہاں جگہ پالے وہ محمود اور جسے یہاں چند فٹ زمین نہ مل سکے وہ مردود تو پھر مولانا فخر الدین کو دیوبند میں اور مولانا انور شاہ کشمیری کو قاسمی قبرستان میں دفن ہونے کی سعادت کیوں نہ حاصل ہو سکی؟ آخر اس کا سبب حقیقی کیا تھا؟

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ اگر دیوبند کی کُل زمین میں قاسمی قبرستان میں نافرمان اور گناہگار لوگوں کی قبریں بالکل ناکل تمام بھی بعض خوش عقیدہ لوگوں کی طرح یہ عقیدہ بنا لیجے کہ جو اس مٹی میں نہ مل سکا اس کا بیڑا غرق ہوا —— وہ بلاشبہ معصیتوں کا شکار تھا، معصیتوں کا شکار نہ ہوتا تو اسے یہاں کی مٹی ضرور، بالضرور نصیب ہوتی —— لیکن جب ہم بارہا دن کی روشنی میں کھلی آنکھوں سے یہ دیکھ چکے ہیں اور آئے دن دیکھتے رہتے ہیں کہ اسی قاسمی قبرستان میں جس کے متبرک ہونے میں ہمیں بھی کوئی کلام نہیں نافرمانوں گناہگاروں اور چوتھے درجہ کے انسانوں کی قبریں تعمیر ہوتی رہتی ہیں تو پھر ہم کیسے اپنے ذہن میں اس جاہلانہ تصور کو پرورش کرنے لگیں کہ جو شخص یہاں دفن نہ ہو سکے وہ مردود محض اور خطا کار مسلم ہے۔

میں ضرورت پڑنے پر نام بنام یہ بتا سکتا ہوں کہ قاسمی قبرستان میں کون کون لوگ دفن ہیں، اور اپنی محدود زندگی میں ان لوگوں نے کیا کیا کرتوت کئے۔ اور دارالعلوم کو کیا اور کس انداز میں نقصان پہونچایا، ان لوگوں کے اخلاق وکردار کا حدود اربعہ کیا تھا۔ ان کے تقوے میں سیاست اور اداکاری کی آمیزش کتنی مقدار میں تھی۔ ان لوگوں کی شہر میں کیا حیثیت تھی اور انھیں کس نظر سے دیکھا جاتا تھا —— بہرکیف مجموعی طور پر یہ بعض لوگ اچھے نہیں تھے، لیکن سفارشوں اور رشتہ داریوں کے طفیل یہی لوگ اب قاسمی قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ اللہ بہت غفور الرحیم ہے اس نے ان تمام حضرات کی خطاؤں کو درگذر کر دیا ہوگا۔ اور اپنی رحمتیں ان کے دامن میں ڈال دی ہوں گی۔ آپ کا یہ دعویٰ اگرچہ بغیر دلیل کے اس قابل نہیں ہوگا کہ اسے قبول کر لیا جائے لیکن چلئے احساناً اس دعوے کو بغیر دلیل کے تسلیم کئے لیتا ہوں اور میں آپ کے دعوے کی تصدیق کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ مذکورہ تمام حضرات برحمتِ خداوندی بخش دیئے گئے اور ان کی تمام خطاؤں سے صرفِ نظر کر لیا گیا —— لیکن محترم اب مجھے ذرا یہ بتانے کی زحمت گوارہ کر لیجئے کہ وہ کونسی کتاب ہے جس میں یہ "فلسفہ" تحریر ہو کہ اللہ کی تمام رحمتیں صرف اور صرف دیوبند کے قاسمی قبرستان کے لئے وقف ہیں۔ اگر آپ اللہ کی بے پایاں رحمتوں کو محدود اور مقید کرنے کے قائل نہیں ہیں تو پھر آپ کی زبان پر یہ بات کیسے نمودار ہو گئی کہ عامر عثمانی کو جو دیوبند میں جگہ نصیب نہ ہو سکی یہ اللہ کی نگاہوں میں ان کے غیر محمود ہونے کی علامت ہے۔ آپ سینہ پھلا کر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو ممکن ہے کہ قاسمی

قبرستان میں گناہگار اور بدکردار لوگوں کو بھی جگہ میسر آجائے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قبرستان کی مقدس و مکرم زمین ایسے لوگوں کے وجود کا بوجھ برداشت کرے جو غلط عقائد کے حامل ہوں یعنی مودودیت سے جن کا تعلق ہو۔ سینہ پھیلا کر بات کرنے کا ہرگز ہرگز مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آدمی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ صداقت اور حقیقت کا پرتو ہے۔ اگر سینہ پھیلا کر آپ مذکورہ بالا بات کہیں گے تو میں بغیر سینہ پھیلائے آپ کی بات کی تردید کروں گا۔ اور میں کیا تردید کروں گا قدرت آپ کی بات کی تردید کر چکی ہے۔ اور آپ کے اُس تصور کے پرخچے اڑا چکی ہے جو جہالت اور حماقت کی کوکھ سے ہی جنم لے سکتا ہے۔

دیوبند کے ہزاروں عوام اس بات کے گواہ ہیں کہ مولانا عامر عثمانی کی وفات کے بیس بائیس روز بعد ہی منشی متین صاحب کا انتقال ہوگیا تھا اور انھیں قاسمی قبرستان میں جگہ نصیب ہوگئی تھی ـــــ دیوبند کے باشندے ہونے کے ناطے آپ اس بات سے بے خبر نہیں ہوں گے کہ منشی متین اور مولانا عامر عثمانی ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ ان کا تعلق انوکھا اور مثالی تھا ـــ کامل ۲۷ سال تک وہ ماہنامہ تجلی کے کاتب بھی رہے آپ کی معلومات میں تھوڑا سا اضافہ کرنے کی غرض سے میں یہ بھی عرض کروں گا کہ منشی متین اکثر فرمایا کرتے تھے کہ حق و باطل میں تمیز کرنے کی اہلیت مجھ میں موجود نہیں ہے۔ میں تو عامر عثمانی صاحب کا دامن پکڑے ہوئے ہوں وہ جس راستے پر چلیں گے میں ان کے ساتھ ہی رہوں گا اور جس منزل پر جا کر وہ اتریں گے میں بھی اسی منزل پر اتر جاؤں گا۔ وہ اپنے ذہن کے دریچوں میں اس فکر و خیال کو بسا چکے تھے جس فکر و خیال کو عین حق ثابت کرنے کے لئے مولانا مرحوم نے اپنوں اور بیگانوں کی دشمنیاں خریدی تھیں ـــــ شیطانوں سے ٹکرائے تھے ـــ فرعونوں کا مقابلہ کیا تھا ـــــ اور کبھی کبھی آپ جیسے کرم فرماؤں سے بھی دو دو ہاتھ ہو جاتی تھی۔ آپ تو اس کو قدرت کی ستم ظریفی ہی کہیں گے کہ اس نے مولانا عامر عثمانی مرحوم کے ہمنوا کو قاسمی قبرستان میں دفن ہونے کی سعادت عطا کر دی۔ اور ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں قدرت سے کچھ شکایت بھی ہو ـــ اور آپ قدرت سے ملاقات ہونے پر کچھ باز پُرس کرنے کا جذبہ بھی رکھتے ہوں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ قدرت نے جو کچھ کیا آپ جیسے لوگوں کو متنبہ کرنے کے لئے کیا۔ اور کچھ زنگ آلود ذہنوں کے اس غلط اور غلیظ تصور کو مٹانے کے لئے کیا کہ قدرت کی تمام تر رحمتیں اور شفقتیں صرف دیوبندیوں کے لئے وقف ہیں۔ خدا کے فضل سے میں بھی دیوبندی ہوں اور اپنے دیوبندی ہونے پر مجھے فخر بھی ہے لیکن میں اس حماقت اور خناس میں کبھی مبتلا نہیں ہوا کہ دیوبندیوں کے سوا دنیا میں کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جو خدا کی رحمتوں کا حقدار ہو ـــ بخشش کا مستحق ہو۔ قاسمی قبرستان میں تجلی کے کاتب کو جگہ دلا کر قدرت نے یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ مرحوم بزرگوں میں ایسی کوئی قدرت باقی نہیں رہ جاتی جو کسی میں مانع اور حارج بن سکے۔ اگر ان کے اندر کسی انہونی کو ہونی کرنے کی استطاعت ہوتی تو تجلی جیسے گستاخ رسالے کی کتابت کرنے والے اور ذہنی طور پر مولانا عامر عثمانی سے مرید ہو جانے والے کاتب کو بزرگوں کے پہلو میں جگہ کیسے مل جاتی ؟۔

محترم! حقیقت یہ ہے کہ آدمی کہیں مرے اور کہیں دفن ہو اس کا نامۂ اعمال اس کے ساتھ جاتا ہے، زندگی بھر اسلام کے ساتھ منافقت کا سلوک کرنے والا محض اس بنا پر جنت کا حقدار نہیں ہو سکتا کہ آپ نے اسے مولانا حسین احمد مدنی کے پہلو میں دفن کر دیا ہے اور زندگی بھر اسلام کی طرفداری اور امت مسلمہ کی حمایت کرنے والا انسان محض اس بنا پر راندۂ درگاہ قرار نہیں پا سکتا کہ اسے بزرگوں کے گورستان میں چند فٹ جگہ نصیب نہ ہو سکی۔

محترم! میری یہ طالب علمانہ گفتگو سننے کے بعد بھی اگر آپ کا دعویٰ اب بھی یہی ہے کہ دیوبند میں دفن نہ ہونا باعث ہلاکت ہے اور دیوبند کے بعض قبرستانوں میں دفن ہونا باعث نجات اور موجب مغفرت ہے تو پھر آپ ساری دنیا میں یہ اعلان کیوں نہیں کرا دیتے کہ جب کسی مودودی یا بریلوی کی وفات ہو تو وہ دیوبند کے قاسمی قبرستان میں دفن کیا جائے تاکہ اللہ میاں بزرگوں کا پڑوسی ہونے کی وجہ سے اس کی مودودیت اور بریلویت سے صرف نظر کرنے پر مجبور ہوں۔

اگر آپ ایسا کوئی اعلان کرانے کے لئے تیار نہیں ہیں تو اس کا کھلا مطلب یہ ہے کہ آپ چاہتے ہی یہ ہیں کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ایک بڑی حلقت کا نجات نہ ہو اور وہ دوزخ میں جھونک دی جائے۔ اب خدا ہی جانے کہ آپ کا یہ چاہنا اسلامی ہے یا غیر اسلامی

(۴) اس قسم کی احمقانہ بات تو وہی شخص اپنی زبان سے نکال سکتا ہے جس کے دماغ کی رگیں ڈھیلی ہوں۔ مجھے سخت حیرت ہے کہ آپ کی زبان پر ایسی بات کیسے آگئی اور آپ نے طلباء کی بھری مجلس میں ایسی باتیں کس دل گردے کے ساتھ بیان کردیں۔

میں خواب کو وحی کا درجہ نہیں دیتا۔ خواہ وہ کسی قطب سے منسوب کیوں نہ ہو۔ بزرگوں کے خواب بالعموم تو مبنی بر حقیقت نہیں ہو سکتے۔ ہمارے دامنِ علم میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ بزرگوں کے خواب وحی کا مثیل ہوتے ہیں ان میں امکانِ خطا کی گنجائش ہی نہیں۔ آپ غالباً بزرگوں کے ہر خواب پر آنکھیں بند کر کے ایمان لانے کے قائل ہیں اسی لئے تو آپ نے چند بیہودہ باتیں یقین کے ساتھ طلباء کے مجمع میں اُگل دی تھیں اور اس خوش فہمی کے ساتھ کہ آپ دنیا کو واہیات خوابوں سے روشناس کرا کے بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔

خدا ہی جانے وہ بزرگ کون ہے جس نے مولانا عامر صاحب مبتلاء عذاب دیکھا۔ اگر ایسا خواب بذاتِ خود آپ ہی نے دیکھا ہے تو پھر میرا دعویٰ یہ ہے کہ یہ خواب دیوار پر مار دینے کے لائق ہے اس لئے کہ اب تک کی زندگی میں کوئی ایک شخص بھی مجھے ایسا نظر نہیں آیا جو آپ کو بزرگ سمجھتا ہو۔ یا آپ کے بارے میں حسنِ ظن رکھتا ہو کہ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ نیکی اور تقویٰ تو بہت اونچی چیزیں ہیں آپ تو شرافت اور انسانیت کی کسوٹی پر بھی پورے نہیں اترے۔ دیوبند کے عوام نے آپ کو جب کسی خاص زاویۂ نظر سے پرکھا تو آپ کھوٹا سکہ ثابت ہوئے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اچھے خاصے مقرر ہیں، آپ کا اندازِ تقریر لاجواب کہلانے کا مستحق تو نہیں ہے لیکن اس لائق ضرور ہے کہ اس کی تعریف کی جائے، چنانچہ میں ہمیشہ آپکی اس خوبی کا مداح رہا ہوں اور آپ کو میرے ساتھیوں میں بے شمار ایسے طلباء مل جائیں گے جن کی موجودگی میں میں نے آپ کی خوبی کا ذکر کیا۔ اور آپ کو تعریف و توصیف کا مستحق گردانا۔

میرے ساتھیوں میں سے اکثر طلباء آپ کے اندازِ تقریر سے متاثر تھے اور میرے خیالات کی برملا تائید کیا کرتے تھے۔ لیکن ان طلباء کی متفقہ رائے یہ تھی کہ آپ مقرر تو ہیں بزرگ نہیں ہیں اور میں بھی اسی رائے کی تصدیق کرنے پر مجبور تھا۔ اس لئے کہ کوشش بسیار اور تجسس پیہم کے باوجود کبھی ایسی کوئی دلیل میرے ہاتھ نہیں لگ سکی جس کا سہارا لے کر آپ کو بزرگ باور کرایا جاسکے۔

میں ایک بار پھر آپ کے فنِ تقریر کی داد دوں گا اور آپ کی خوبیٔ تقریر کا اعتراف کرنے کے بعد یہ گذارش کروں گا کہ آپ سے کہیں زیادہ اچھا مقرر لینن تھا۔ مہاتما گاندھی تھے۔ جے پرکاش نرائن ہیں۔ یہ سب وہ حضرات ہیں جنھیں ایمان کی خو بو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ ان کے علاوہ مسلمانوں میں بھی ایسے مقرر گذرے ہیں جنھیں لاثانی اور بے نظیر کہا جاسکتا ہے۔ ایک مرحوم مسٹر جناح ہی کو لیجئے ان کی ایک تقریر آپ جیسے مقررین کی سو تقریروں پر بھاری ہوا کرتی تھی۔ بتائیے کیا دنیا نے ان مقررین کو بزرگوں کی فہرست میں شمار کرنے کی حماقت کا ارتکاب کیا ہے۔ کیا زمانہ سے ان کے خوابوں کو مبشرات کا درجہ دینے کی دیوانگی سرزد ہوئی ہے۔ اگر نہیں ہوئی اور فی الواقع نہیں ہونی چاہئے تو پھر یہی دنیا اور یہی زمانہ آپ جیسے لوگوں کو محض اچھا مقرر ہونے کی وجہ سے بزرگوں کا مقام کیسے عطا کر دے گا اور آپ کے ہر سچے جھوٹے خواب پر آنکھیں بند کر کے ایمان کیسے لے آئے گا۔ ؟

اگر آپ اس بے ہودہ خواب کا انتساب کسی اور طرف کرنا چاہتے ہیں تو پہلے یہ بتانے کی زحمت گوارہ فرمائیے کہ وہ بزرگ ہیں کون ان کا اسم گرامی کیا ہے۔ دیوبند کے کس کونہ میں رہتے ہیں یہ کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

بدنصیبی یہ ہے کہ میں دیوبند میں ہی مقیم ہونے کی وجہ سے کتنے ہی ایسے دیوبندی بزرگوں سے واقف ہوں جن کی بزرگی قطعی ناقابلِ اعتبار ہے جنھوں نے اپنی دوکان چلانے کے لئے بزرگوں کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ ان کی مثال ٹین کے اس ڈبہ کی سی ہے جس میں کوکم بند ہو لیکن جس کی پیشانی پر جلی الفاظ میں لکھا ہو " خالص اصلی گھی "، یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ یہ نام نہاد بزرگ اس روایتی ہاتھی کی مانند ہیں جس کے کھانے کے دانت کچھ اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے کچھ اور۔ ان بزرگوں کے چہروں پر شرافت اور تقدس کی پلاسٹک سرجری

بڑھی ہوتی ہے جو وقتاً فوقتاً غائب ہو جاتی ہے ——

گستاخی معاف کیجئے ان بزرگوں نے لبا اوقات یہ خواب بھی ضرور دیکھے ہوں گے:-

(۱) قیامت آچکی ہے میدان حشر قائم ہے ایک طرف انبیاء کی قطار لگی ہوئی ہے اور اس میں تیسرے نمبر پر مولانا اسعد مدنی کھڑے ہیں۔

(۲) دیکھا گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک کرسی پر جلوہ افروز ہیں۔ کسی پوچھنے والے نے پوچھا یا رسول اللہ! ۷۳ فرقوں میں سے ناجی فرقہ کونسا ہے۔ اور خدا کے نزدیک خدمات کس کی مقبول ہیں۔ رسول اللہؐ نے جواب دیا صرف جمعیۃ العلماء ناجی کہلانے کا حق رکھتی ہے۔ خدمات بھی اسی کی مقبول ہیں باقی سب فرقے جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

(۳) شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی زیارت ہوئی پوچھا گیا کہ مولانا قاری طیب صاحب کا ایمان زیادہ قوی ہے یا فدائے ملت کا۔ شیخ صاحب نے بغیر کسی تامل کے جواب دیا — بلاشبہ فدائے ملت کا ایمان۔ قاری طیب صاحب کے ایمان سے کہیں زیادہ قوی ہے اور اتنا قوی ہے کہ بڑے سے بڑا گناہ اور کوئی بڑی سے بڑی معصیت اس ایمان کے اندر نقص اور کمزوری پیدا نہیں کرسکتی۔ جبکہ قاری طیب صاحب کا ایمان معمولی سی معصیت ہی سے میلا ہو سکتا ہے۔

نام نہاد بزرگوں کی جس مجلس میں یہ اور اسی قسم کے ہزاروں خواب بیان ہوتے ہیں اس مجلس کی حقیقت سے میں بھی بخوبی واقف ہوں لہٰذا آپ نفی میں گردن ہلا کر مذکورہ بالا حقائق کی تردید نہیں کر سکتے اور دنیا کا کوئی سمجھدار مسلمان ان خوابوں پر ایمان نہیں لا سکتا جو صدفی صد معدہ کی خرابی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ممکن ہے اس خاص مجلس میں جو ہفتہ میں دو بار اکل و شرب اور غیبت و تہمت کے لئے منعقد ہوتی ہے کوئی ایسے صاحب بھی موجود ہوں جو واقعتاً صحیح معنی کے بزرگ کہلانے کے حقدار ہوں اور ان ہی بزرگ نے وہ خواب دیکھا ہو جسے آپ نے دنیا میں پھیلانے کی ڈیوٹی انجام دی تھی۔

اس ممکن بات کو متیقن بات سمجھنے کے بعد میں یہ کہنے کی گستاخی کروں گا کہ احمق اور پاجی ہے وہ بزرگ جو ایسے سچے خواب کی اشاعت کو پسند کرتا ہو جو دنیا میں فتنے پھیلانے کا باعث بنے اور جس کی اشاعت سے ہزاروں مسلمانوں کے احساسات کا قتل عام ہو۔ کیا ان بزرگ نے اور ان کے خوابوں کے پھیلانے والے خادم نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی الفتنۃ اشد من القتل۔ فتنہ گری قتل سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

اگر عمر فاروق رضؓ کا دور ہوتا تو ایسے فتنے پھیلانے والے تمام بزرگوں کو نظر بند کر دیا جاتا تاکہ دنیا کا سکون غارت نہ ہونے پائے۔ آج اسلامی حکومت قائم نہیں ہے اس لئے ناقص اور نابالغ قسم کے بزرگ لاف و گزاف اور بیہودہ گوئی کے باوجود بھی دن میں دندناتے پھرتے ہیں اور رات کو آرام کی نیند اڑاتے ہیں۔ دنیا میں اسلامی قانون نافذ ہوتا تو فتنے پھیلانے والے تمام بزرگوں کو جیل کی تاریک کوٹھریوں میں دھکیل دیا جاتا —— اور انھیں وقتاً فوقتاً ایسی سزائیں ملتی رہتی جو انھیں فتنہ اور تہمت طرازی سے محترز رہنے پر مجبور کر دیتیں۔

محترم مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ آپ نے ان باتوں کو طلباء کی عام مجلس میں کس دل گردے کے ساتھ بیان کر دیا تھا آپ طلباء کے کانوں میں ایسی واہیات باتیں اور ایسے من گھڑت خواب انڈیلتے وقت خدا اور اس کے رسول کی تعلیم کو کیوں نظر انداز کر بیٹھے تھے؟ مرنے کے بعد کسی مسلمان کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا کیا اسلامی تعلیم کی ضد نہیں؟

مولانا عامر عثمانی کی وفات کے بعد آپ کے ہاذ ہونے یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ آپ خدا سے کم ڈرتے تھے اور عامر عثمانی سے زیادہ یہی وجہ ہے کہ جو حرکتیں آپ عامر عثمانی کی موجودگی میں نہیں کر پائے بعد میں کر گذرے۔

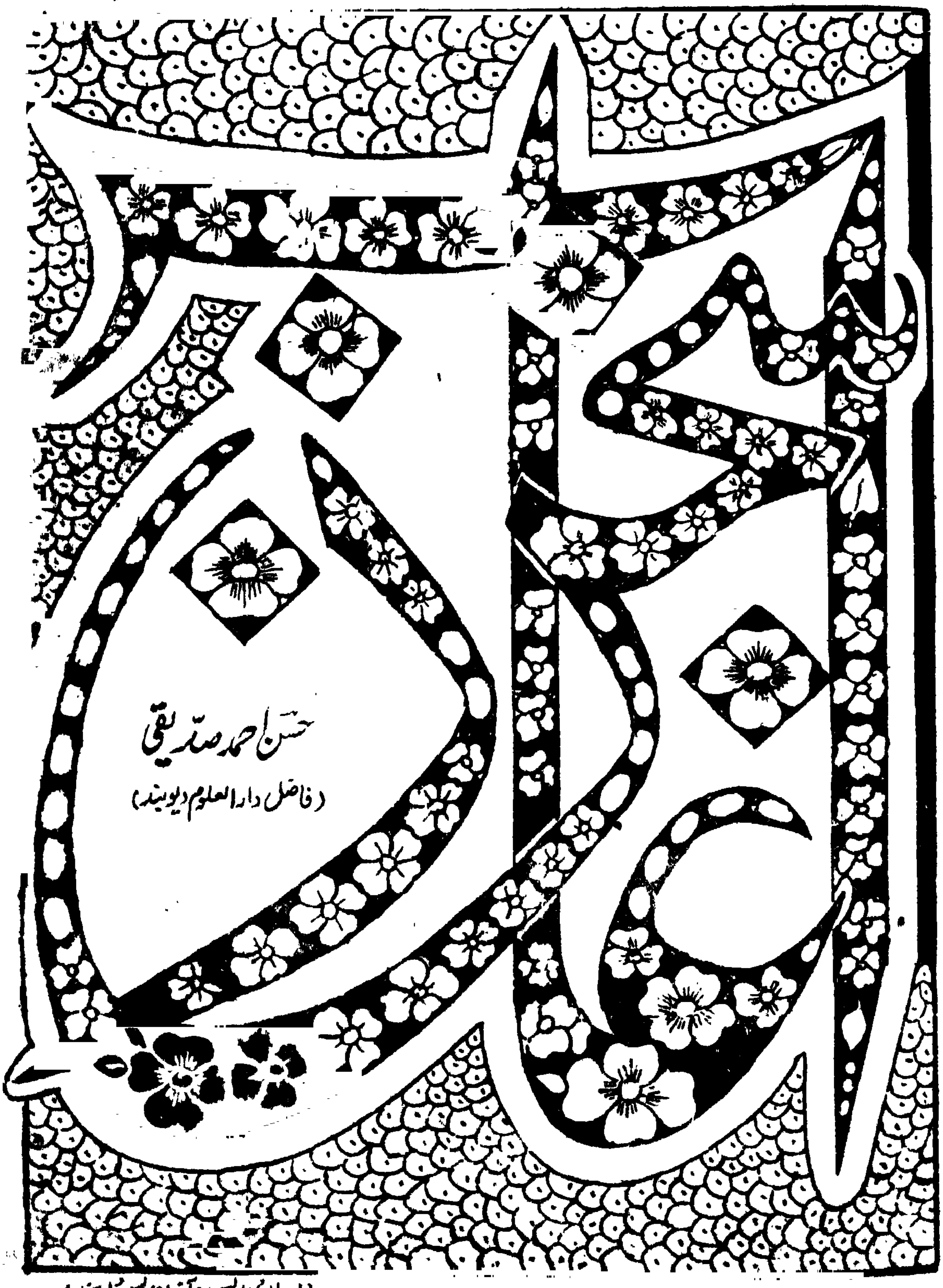
مولانا عامر عثمانی کے انتقال کے فوراً بعد ہی جماعت اسلامی کے خلاف آپ نے اور تین درویشوں نے جو دھواں دار تقریریں کی تھیں اور جماعت اسلامی سے متاثر ہر طالب علم پر جو ظلم و ستم ڈھائے تھے وہ اس بات کی بیّن مثال ہے کہ آپ نے مولانا عامر عثمانی کے روپوش ہونے کے بعد یہ یقین کر لیا تھا کہ اب کوئی احتساب

کرنے والا نہیں ہے لہٰذا اپنی اصلیت ظاہر کردو، اور جو من میں آئے کر گذرو۔ اس زمانہ میں آپ بعض حرکتیں ایسی بھی کر گذرتے تھے کہ جسے دیکھ کر انسانیت رو پڑی ہوگی اور ابلیس اس تصور سے خوش ہوا ہوگا کہ اب علمائے کرام کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں آگئی ہے۔

حاصل کلام یہ سمجھئے کہ آپ نے جو باتیں بیان فرمائی ہیں وہ من گھڑت ہیں اور من گھڑت ہونے کے ساتھ ساتھ یہ باور کرانے کے لئے بہت کافی ہیں کہ آپ ایک ایک غیر سنجیدہ اور غیر محتاط قسم کے آدمی ہیں۔ آپ نے نظریاتی اختلاف کی بنا پر مولانا عامر عثمانی کی وفات کے بعد انتقام لینے کا جو گھٹیا طریقہ ایجاد کیا ہے اسے دنیا کی ہر غنڈہ پارٹی تو پسند کر سکتی ہے لیکن کوئی بھی سنجیدہ اور شریف النفس انسان اس طریقہ کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ سکتا۔

آپ کو شاید یہ بھی احساس نہیں تھا کہ آپ کی چند واہیات جملے ایک بیوہ عورت اور چند یتیم بچوں کے دلوں پر بجلی بن کر گریں گے۔ اور ان کے زخموں کو کنگ میں اور اضافہ کر دیں گے۔ آپ نے مولانا عامر عثمانی کے بچوں سے انتقام لے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ مولانا عامر عثمانی کی شخصیت اتنی بھاری بھر کم تھی کہ اس سے ٹکرانا آپ جیسے لوگوں کے بس کا روگ نہیں تھا۔ آپ گھٹیا لوگوں کی طرح اس بات کے منتظر تھے کہ عامر عثمانی دنیا سے رخصت ہو تو ہم ان کی لاش کو منہ چڑا کر اپنی بہادری کا ثبوت فراہم کریں۔ آپ کی مثال قطعاً اس کمہار کی سی ہے جو بس نہ چلنے پر گدھے کے کان رگڑ کر خوش ہو جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مجھ سے زیادہ جرأت مند کوئی نہیں۔

گفتگو کے ابھی کتنے پہلو تشنہ ہیں۔ لیکن سر دست میں اس سے زیادہ لکھنے کے موڈ میں نہیں ہوں — التجا بس یہ ہے کہ آپ اپنی نادانیوں اور غلطیوں کا اعتراف کر لیں اور اگر آپ کا نفس اجازت دے تو مرحوم کے بیوی بچوں اور مرحوم کے معتقدین سے اپنی خطاؤں کی تحریری معافی طلب کر لیں۔ اگر آپ کو اپنی نادانیوں کا احساس ہو گیا اور آپ نے برملا اپنی غلطیوں کا اقرار کر کے معافی مانگ لی تو میں سمجھوں گا کہ عظمت اور بڑا پن آپ کی فطرت میں موجود ہے۔ لیکن اگر اب بھی آپ کو اپنی فاش غلطیوں کا احساس نہ ہوا اور اب بھی آپ نے اپنی لغزشوں کی معافی طلب نہ کی تو دنیا یہ یقین کرنے پر مجبور ہوگی کہ آپ کی صحیح حیثیت قطعی طور پر اس بالشتیے کی سی ہے جو اندھی عقیدت کی عینک استعمال کرنے کے بعد قطب مینار محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ فی الحقیقت وہ بارہ اِنچ سے زیادہ کا نہیں ہوتا —



(اسلامی پریس و آرٹ ادارہ دیوبند)

کسی ایسے انسان کے بارے میں بغرض تعارف کچھ لکھنا آسان ہوتا ہے جس کی شخصیت کا ایک ہی رخ ہو۔ ایک ہی پہلو ہو۔ ایک ہی زاویہ ہو۔ لیکن کسی ایسے انسان کا تعارف نامہ مرتب کرتے وقت بڑی بڑی الجھنیں اور دشواریاں پیش آتی ہیں جسکی ایک شخصیت میں بے شمار شخصیتیں ضم ہوں۔ جس کا معنوی جسم ہزار معنوی روحوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ جو ایک پھول ہوکر بجائے خود ایک چمن ہو۔ جو ایک ذات ہوکر بجائے خود ایک انجمن ہو۔

مولانا عامر عثمانی رح بھی کچھ اسی قسم کے انسان تھے ان کی شخصیت نے کئی کئی رخ تھے۔ کئی پہلو تھے۔ ان کی جادوئی تحریر کا متنوع رنگ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی صلاحیتیں غیر محدود بھی تھیں اور نوع بہ نوع بھی۔

ہر قلم کار اور ہر فنکار کے فن و تحریر میں کچھ نہ کچھ انفرادیت ضرور پائی جاتی ہے۔ ہر صاحب قلم کا کوئی خاص موضوع ایسا ہوتا ہے جس پر وہ جم کر گفتگو کر سکے اور جس پر خامہ فرسائی کرنے کا اسے ملکہ ہو۔

مولانا عامر عثمانی کی انفرادیت یہ تھی کہ وہ ہر موضوع پر لکھ سکتے تھے۔ ہر انداز میں اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کی قدرت انھیں حاصل تھی۔

شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام بہت اونچا ہے۔ ادیب کی حیثیت سے انھیں ماہر و کامل سمجھا جاتا ہے۔ مبصر کی حیثیت سے وہ بے مثال تھے۔ تنقید نگاری میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا محقق کی حیثیت سے ان کی عظمت و رفعت کا صحیح اندازہ لگا لینا مشکل ہے۔

وہ کسی ایک فن اور کسی ایک خوبی کے مالک نہیں تھے بلکہ بے شمار ذاتی خوبیاں اور علمی رعنائیاں ان کے قلب و قالب میں رچی ہوئی تھیں۔ بظاہر وہ ایک انسانی ڈھانچہ ہی تھے لیکن درحقیقت وہ ایک مکتب تھے، ایک لائبریری تھے۔ ایک کتب خانہ تھے۔ ایک یونیورسٹی تھے۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت ملک بھر میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔

تحریر و الفاظ کی صورت میں علم و ادراک کا جو سرمایہ انھوں نے امت مسلمہ کو بخشا ہے وہ اتنا قیمتی اور انمول ہے کہ دل و دماغ میں اپنی جان سے زیادہ اس کی حفاظت کرنے کا تقاضہ پیدا ہوتا ہے۔

نمونے کے طور پر ہم نے اسی شمارے میں ان کے کچھ منتخب مضامین شائع کئے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا عامر عثمانی شاعر بھی تھے، ادیب بھی تھے۔ فقیہ بھی تھے۔ مبصر بھی تھے۔ نقاد بھی تھے۔ محاذ تحریر کے مجاہد بھی تھے۔

بعض حضرات کی رائے تھی کہ آغاز سخن میں مولانا عامر عثمانیؒ کی شخصیت پر ایک طویل مضمون لکھا جائے۔ رائے غیر معقول تو نہیں لیکن میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ دوسرے ارباب قلم نے ان کی شخصیت پر بہت سے مضامین لکھے ہیں کہ انھیں پڑھنے کے لئے بھی قارئین کو باقاعدہ فرصت نکالنی پڑے گی۔ ان مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد مولانا مرحوم کی شخصیت کا ہر رخ عیاں بیاں اور ظاہر و باہر ہو کر رہ جائے گا اور قارئین پر یہ بات منکشف ہو جائے گی کہ مولانا عامر عثمانی کون تھے؟ کیا تھے؟ ان کی صلاحیتوں کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔ وہ کس حیثیت کے عالم تھے

ارباب قلم کے مضامین نمبر کی دوسری قسط میں پیش کئے جائیں گے۔ نمبر کی پہلی قسط میں تو ہم نے ان کی ہمہ گیر شخصیت کا تعارف ان ہی کی تحریروں سے کرایا ہے۔

ارباب قلم کی بے شمار تخلیقات کی موجودگی میں مولانا عامر عثمانی کی شخصیت پر خامہ فرسائی کرنے کی احتیاج محسوس نہیں ہوتی لیکن آغاز سخن کے صفحات کورے تو نہیں چھوڑے جاسکتے کچھ نہ کچھ تو ہمیں لکھنا ہی ہے خواہ ہماری تحریر تحصیل حاصل کا درجہ کیوں نہ رکھتی ہو۔

آئندہ صفحات میں ان کی ذاتی خوبیوں سے متعلق کچھ حقائق پیش کئے جارہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور انھیں مولانا عامر عثمانیؒ کے بارے میں کچھ ایسی باتیں معلوم ہوں گی جو اب تک اہل خانہ کے سوا شاید ہی کسی کو معلوم ہوں۔

مُرسلہ ——— تجلّی کے ایک کرم فرما

سنِ وفات

مولانا عامر عثمانی عفی عنہ

۱۳۹۵ھ

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ "مولانا" اور لفظ "عفی عنہ" قدرتی طور پر آپ کے نام کا حصہ تھے ——— سبحان اللہ

ذکر ظاہر ہے کہ مولانا عامر عثمانیؒ ہی کا ہے

۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت عمر کم و بیش ۵۵ سال کی تھی۔ جس دن آپ پیدا ہوئے تھے، اسی دن شیخ الہند صاحب کی رحلت کا سانحہ پیش آیا۔

۱۹۳۹ء میں دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔

بچپن ہی سے محنت اور لگن کے ساتھ کام کرنے کے عادی تھے۔ مزدوری کرنے میں کبھی کبھی عار محسوس نہیں کیا۔ معمولی سے معمولی کام کر کے اپنی ضروری اخراجات پورے کر لیا کرتے تھے۔ دوران طالب علمی میں پتنگیں بنا بنا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ طالب علمی کے بعد بھی کچھ عرصہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد شیشوں پر لکھنے کی مشق کی۔ اور جلد ہی وہ ایک آرٹسٹ بن گئے جس کی زندہ نظیر تجلی کے وہ ٹائٹل ہیں جن کا مشاہدہ آپ عرصہ ۲۶ سال سے کرتے چلے آرہے ہیں ـــــ اس خداداد صلاحیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے اپنی دلچسپی پوری طرح آرٹ کی طرف مبذول کر دی اور اس طرح دیوبند کے کئی مشہور کتب خانوں کی زیادہ تر کتابوں کی ٹائٹل سازی اور تصحیح وغیرہ بھی ایک عرصہ تک کرتے رہے۔ ایک طویل مدت تک یہ مشغلہ جاری رہا لیکن آگے بھی وہ مستقل طور پر جاری نہ رکھ سکے اور اس سے بھی از خود نجات حاصل کر لی۔

ایک مرتبہ پرچون کی دوکان کھولی۔ یہ دکان اپنے بچپن ہی میں دیوبند بھر میں مشہور و معروف ہو گئی تھی۔ ہر طرف اس دکان کے چرچے ہونے لگے اور ہر سو اس کی دیانت صفائی معاملات اور حسن اخلاق کی شہرت ہو گئی اور لوگوں کا ذہن ان کے بارے یہ بن گیا کہ اپنی ضرورت کا سامان اسی دکان سے خریدا جائے۔ لیکن اس دکان کو بھی عہد شباب تک پہنچنے کی نوبت نہ آسکی اور یہ اپنے لڑکپن ہی میں مرحوم ہو گئی۔ ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ وہ دیوبند کو چھوڑ کر بمبئی پہنچے اور اپنی فطری صلاحیتوں کا سہارا لیکر فلمی دنیا تک رسائی حاصل کی۔ اور ایک فلم کمپنی سے باضابطہ معاہدہ کے بعد ایک کہانی اور کچھ گانے بھی لکھے۔ اس کامیابی کے باوجود ان کو قلبی سکون اور نشاط میسر نہ آسکا۔ ادھر ان کے والد محترم حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ان کی اس حرکت سے سخت بیزار اور ناخوش تھے، اور انھوں نے مولانا کو اس بات سے مطلع کر دیا تھا کہ فلمی دنیا سے کمایا ہوا پیسہ میرے نزدیک ناجائز ہے اور میرے گھر کا کوئی فرد اسکو استعمال نہیں کریگا میں اور تمہاری والدہ تم سے خفا ہیں اور یہ خفگی اس وقت تک باقی رہے گی جب تک تم فلمی دنیا کو ٹھوکر مار کر دیوبند نہ چلے آؤ۔

راہ حق کا وہ مجاہد جو خود بھی اس زندگی پر غیر مطمئن تھا والد صاحب کے اس فیصلہ کو سنکر وہ تڑپ اٹھا اور فلمی دنیا کی تمام ترچمک دمک پر ٹھوکر مار کر دیوبند واپس آگیا۔ واپسی پر مختلف ذریعہ معاش کے بعد انھوں نے ۱۹۴۹ء میں ماہنامہ تجلی کا اجرا کیا اور ۱۹۵۰ء میں مکتبہ تجلی کی داغ بیل ڈالی۔ اور پھر آخری عمر تک تجلی اور مکتبہ تجلی ہی ان کے معاش کا ذریعہ بنے رہے۔

تجلی کا اجرا کرتے وقت انھیں اپنے اور غیروں کے ہزار طعن سننے پڑے تھے۔ انھیں دوستوں کے منھ سے بھی ہمت شکن باتیں سننے کو ملی تھیں۔ ہر شخص انھیں ملامت کر رہا تھا، ان کے ارادہ کا مذاق اڑا رہا تھا۔ انتہائی اضطراب کے عالم میں وہ مولانا منظور نعمانی سے ملے اور ان سے مشورہ کیا۔

انھوں نے بھی وہی بات کہی جو ساری دنیا کہہ رہی تھی۔

"مذہبی پرچے نہیں چلا کرتے کچھ اور کرو۔"

لیکن انھیں پرچہ نکالنے کی دھن تھی۔ دراصل وہ طالبعلمی کے زمانہ میں کئی قلمی پرچے نکال چکے تھے اور فراغت کے بعد کئی ماہناموں کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ اب ان کی تمنا یہ تھی کہ ان کا ذاتی پرچہ ہو۔ قلم آزاد ہو۔ صلاحیتیں کسی کی پابند نہ ہوں

وجدان کسی کا اسیر نہ ہو۔ دراصل حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کا مزا ہی جب ہے جب آدمی اپنی زبان سے بول رہا ہو، اپنے ذہن سے سوچ رہا ہو، اپنے قلم سے لکھ رہا ہو۔

وہ ایک ایسا پرچہ نکالنے کے خواہشمند تھے جو اول تا آخر ان کی ملکیت ہو اور اس کے ایک ایک صفحہ پر ان کا اپنا اختیار ہو۔ کوئی شریک نہ ہو، کوئی دخیل نہ ہو۔ انھوں نے انتہائی جذبہ کے ساتھ تجلی نکالنے کا ارادہ کیا لیکن دوستوں نے اپنے مشوروں کی کھنڈی چھری سے ان کے جذبۂ و ارادہ کو مجروح و پامال کر دیا۔ ایسے ناگفتہ بہ اور ناسازگار حالات میں ان پر جو کچھ گذری ہوگی اس کا صحیح ادراک تو نہیں کیا جاسکتا البتہ ان کی تحریر میں ان کا یہ بیان پڑھ کر ان کی سچی دھن، بے لوث لگن اور آہنی ہمت کا کسی نہ کسی درجہ میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"دوستوں نے کہا مذہبی رسالے پہلے ہی چلنے مشکل تھے۔ اب تبدیل شدہ حالات اور مایوس کن فضا میں کیا چلیں گے۔ پھر وہ مذہب جسے تو مذہب کہتا ہے ــــ یعنی ساڑھے تیرہ سو سال پہلا خالص بے میل اسلام تو اس کا نام لینے والے تو ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت میں اچھوت اور بے دین اور وہابی سمجھے جاتے ہیں۔ نہ تیرے پاس سرمایہ ہے نہ کافی ذرائع ہیں۔ بہت مسلمان پاکستان چلے گئے۔ یہاں جو ہیں وہ غیر مطمئن، سراسیمہ اور متزلزل ہیں۔ مذہبی رسالہ کون خریدے گا۔

دوستوں کی ہمت شکن باتیں سنکر مجھے دل برداشتہ ہوجانا چاہئے تھا خصوصاً اپنی بے زری اور دائم المریضی کو دیکھتے ہوئے۔ لیکن ایک شعلہ تھا جو دل میں بھڑکتا ہی رہا۔ ایک آندھی تھی جو چلتی ہی رہی۔ طوفان کی پروا کئے بغیر میں نے کشتی پانی میں ڈالدی ــــ "تجلی" نکالدیا۔ اب بعض کرم فرماؤں کا ارشاد ہوا کہ دیوانے تو اگر اپنا بھلا چاہو کر رسالہ کو زندہ بھی رکھ سکا تو اس سے کونسی خاص قومی منفعت ہوگی۔ چند سو یا چند ہزار مسلمانوں تک تیری آواز پہونچ بھی گئی ہمہ گیر بحران مایوسی پر اس کا کیا اثر پڑسکے گا۔ گمراہی و بدعقیدگی کی آہنی دیواروں کو تو کہاں کہاں ڈھاسکے گا

اعتراض معقول تھا۔ منطق اور حقائق قدم قدم پر میرے مخالف تھے۔

لیکن میں نے جواب دیا کہ جو کچھ بھی ہو میرے خدا نے مجھے جتنی ہمت، جتنی عقل، جتنی صلاحیت عطا کی ہے مجھ پر فقط اتنی ہی ذمہ داری ہے۔ میرے بس میں اگر مکمل اصلاح، وسیع انقلاب اور عظیم تعمیر و تبلیغ نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہاتھ پیر توڑ کر مایوس ہو بیٹھوں ــ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ میرا خدا مجھ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ دنیا بھر میں تو نے اسلامی انقلاب برپا کیوں نہیں کیا؟ کروڑوں سینوں سے جہل و طغیانی کی سیاہی کیوں نہیں دھوئی؟ بلکہ وہ پوچھے گا کہ تجھے ہم نے جتنی طاقت، جتنی صلاحیت بخشی تھی تو نے اسے ہمارے دین کی خاطر استعمال کیا یا نہیں۔ تو نے اپنی وسعت کے مطابق جد و جہد کی یا نہیں؟

یہی سیدھا سادا فلسفہ ہے جو انسان پر عمل راہ کھولتا ہے۔ ورنہ اگر ہر معمار یہ سوچ لے کہ یا تو تنہا پورا محل بنا کر چھوڑے گا ورنہ ایک اینٹ بھی نہیں رکھے گا تو کوئی عمارت نہ بن سکے اور دنیا ویران ہوجائے۔

(ماہنامہ جلد اول ص۱۳)

دوست دیکھتے رہ گئے۔ ان کے تجلی نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ مذہبی پرچوں میں اتنی مقبولیت کسی پرچہ کو حاصل نہیں ہے۔ یہ مقبولیت ان کی ہمت، لگن اور جد و جہد کا

نتیجہ تھی۔ یا یہ صلہ تھا اس حق پرستی کا جس کی خاطر انھوں نے اپنا چین وسکون تج دیا تھا۔ (اب کچھ اور سنیے)

پہلی شادی ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ پہلی بیوی کا نام حسیبہ تھا یہ مرحوم کی چچازاد بہن تھیں۔ چھ سال تک راہ حیات میں یہ مرحوم کی شریک سفر رہیں اور اس کے بعد ایک مہلک مرض میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ان کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ خاندانی بزرگوں نے اس لڑکی کا نام اُم حبیبہ تجویز کیا۔ ام حبیبہ حیات ہیں۔ ام حبیبہ کی تمام زندگی پاکستان میں اپنی دادی کے پاس گذری ہے۔ ام حبیبہ کی دادی (مولانا مرحوم کی والدہ کا نام صدیقہ ہے۔ انھیں مولٰنا مطلوب الرحمٰن جیسے بزرگ اور صاحب ورع عالم کی زوجیت کا شرف حاصل ہے۔ موصوفہ ناچیز کی پھوپھی لگتی ہیں اور تادم تحریر حیات ہیں۔ خدا ان کا سایہ ہمارے خاندان پر تادیر قائم رکھے۔

ام حبیبہ شادی شدہ ہیں اور کراچی میں اپنے شوہر تقی حسین صاحب کے ساتھ مطمئن زندگی بسر کر رہی ہیں۔ مرحومہ حسیبہ صاحبہ کے بطن سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا تھا لیکن عالم شیر خوارگی ہی میں دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

مولانا کی دوسری شادی ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ دوسری بیوی کا نام قدسیہ تھا۔ یہ محسن فاروقی صاحب (آستانہ دہلی کے ایڈیٹر) کی ہمشیرہ ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ کسی وجہ سے نباہ نہ ہو سکا اور تھوڑی بہت کشاکشی اور تکرار کے بعد ایک ہی سال کے اندر اندر نوبت طلاق تک پہونچ گئی۔ یہ ابھی حیات ہیں۔ طلاق کے بعد تاحال انھوں نے دوسرا نکاح نہیں کیا۔ ان کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ جسے جاننے والے بشریٰ رانی کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ وہی بشریٰ رانی ہیں جنھیں مولانا کے انتقال کے بعد تجلی کا معاون ایڈیٹر بنانے کا خیال تھا لیکن پھر کچھ مصلحتوں کی بنا پر اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ بشریٰ رانی بھی شادی شدہ ہیں اور اپنے شوہر خالد صاحب کے مکان میں قابل اطمینان زندگی گذار رہی ہیں۔ ان کے شوہر کا وطن سہارنپور ہے اور تا ایں لمحہ وہ سہارنپور ہی کے باشندے ہیں۔

تیسری شادی ۱۹۵۵ء میں ہوئی ماموں زادے کی بیٹی سے۔ تیسری بیوی کا نام نسیم فاطمہ ہے۔ یہ وہی نسیم فاطمہ ہیں جنھوں نے مولانا کے انتقال کے بعد مولانا کے روشن کردہ "چراغ حق" کو روشن رکھنے کا عہد کیا تھا۔ ابھی تک وہ اپنے عہد پر کاربند ہیں اور ان کی آخری خواہش یہی ہے کہ تجلی ہمیشہ زندہ رہے۔ مرحوم کی یادگار باقی رہے اور خدا کے بندے اس سے روشنی پا کر اپنی زندگیاں سدھارتے رہیں۔ نسیم فاطمہ بیس سال تک ان کی شریک حیات بنی رہیں۔ ان کے بطن سے سات لڑکیاں اور تین لڑکے پیدا ہوئے۔ ان بچوں کے نام بہ ترتیب عمر یہ ہیں۔

زینب ناہید، رقیہ خاتون، میمونہ خاتون، (زنانہ بیگم دانش عباس)، ابوسفیان، ریحانہ پروین، زینت کوثر، عکرمہ نعیم، خولہ نسیم۔

زینت کوثر کا دس مہینے کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔ باقی تمام لڑکے لڑکیاں زندہ ہیں۔ سب سے بڑی لڑکی زینب ناہید کو میری اہلیہ سمجھئے۔ دوسری لڑکی رقیہ خاتون رئیس عثمانی کے نکاح میں دی گئی تھیں۔ یہ رئیس عثمانی ہم وطن ہی نہیں ہم محلہ بھی ہیں۔ پہلے سے مولانا کی ان سے کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ لڑکی کے اور رشتے بھی آئے تھے لیکن دوسرے رشتوں کی موجودگی میں انھیں ترجیح محض ان کے نیک اور چال چلن اچھا ہونے کی وجہ سے دی گئی تھی۔ یہ ایم۔ ایس۔ سی ہیں۔ اور ریاست رامپور کی ایک درسگاہ میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ میمونہ اور فرزانہ کے علاوہ باقی بچے ابھی کم عمر ہیں۔ سب سے چھوٹی بچی خولہ کی عمر مولانا کے انتقال کے وقت ایک سال کی تھی۔

لیجئے لگے ہاتھوں مرحوم کے بہن بھائیوں کے نام بھی ملاحظہ فرما لیجیے:-

زبیر افضل عثمانی، عمر فاروق عثمانی، عثمان غنی، علی اکبر عثمانی، یوسف عثمانی، نائلہ عثمانی، اسماء عثمانی، عائشہ عثمانی، خدیجہ نوید عثمانی۔ مرحوم کے علاوہ نائلہ اور اسماء بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ؎

* موجود باقی سب حیات ہیں۔ زبیر افضل وہی ہیں جن کا نام تجلی کی ابتدائی زندگی میں ٹائٹل پر جلوہ گر ہوا کرتا تھا۔ آج کل پاکستان میں مقیم ہیں اور سخت بیمار ہیں۔ پڑھنے والے صحت و عافیت کی دعا کریں۔ عمر فاروق ۲۶ سال سے مکتبہ تجلی کو چلا رہے ہیں اور انھوں نے ہر سال مکتبہ کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔ علی اکبر دیوبند کے چند ... کاتبوں میں

اُن کی کچھ صفتیں

حقائق کی روشنی میں

ظرافت

ظرافت و مزاح ان کی فطرت میں داخل تھا۔ انھیں زندگی میں بہت کم رنجیدہ و مغموم دیکھا گیا ہے۔ ہر وقت ہنستے ہی رہتے۔ ان کی گفت گو مرصع تو نہیں ہوتی تھی لیکن اتنی دلچسپ ضرور ہوتی تھی کہ سننے والا اس میں کھو جائے۔ خشک اور غمگین ہونٹوں پر تبسم کی چاندنی بکھیر دینا ان کے لیے مشکل نہ تھا جب جس کو چاہا ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی شگفتہ مزاجی ہر عام و خاص مجلس میں انھیں "ہیرو" بنا دیتی۔ دیوبند میں ادبی اور شعری نشستیں ہوتیں۔ کثیر تعداد میں شعراء، سامعین شریک ہوتے لیکن ایسا محسوس ہوتا کہ یہاں عامر عثمانی کے سوا کوئی موجود ہی نہیں ہے۔

دوران گفت گو اور دوران خاموشی میں ہلکے پھلکے مزاح۔ فقرے اچھالنے کو شاید فرض ہی سمجھتے تھے ضروری سمجھتے تو انھیں کسی محفل میں تو خاموش دیکھا جاتا۔ میں نے جن ادبی اور علمی محفلوں میں شرکت کی وہاں یہی دیکھا کہ فضا جب کسی وجہ سے بوجھل ہوئی، عامر عثمانی بول اٹھے اور مجمع با دل ناخواستہ بھی ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔

ایک ادبی نشست میں دارالعلوم کے ایک طالب علم اپنی غزل بدیۂ ناظرین کر رہے تھے۔ اسی نشست میں ایک کثیر قسم کے دیوبندی بھی جلوہ افروز تھے۔ غزل کے اشعار کچھ دعائیہ انداز کے تھے۔ ان دیوبندی صاحب نے شعروں پر داد و تحسین کے ڈونگرے لٹانے کے بجائے بآواز بلند ہر شعر پر آمین آمین کہنا شروع کر دیا۔

عامر عثمانی صاحب انھیں حیرت سے دیکھتے رہے۔ پھر زیر لب بولے:

آج معلوم ہوا کہ آپ بھی آمین بالجہر کے قائل ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے اپنی ایک غزل بغرض اصلاح مرحوم کو دی۔ انھوں نے اس کی ضروری مرمت کرنے کے بعد کہا۔ غزل خاصی ہے لیکن میری رائے یہ ہے کہ تم شعر و شاعری کے چکر میں مت پڑو ورنہ یہ چہرے پر جتنی کتنی رونق ہے سب غائب ہو جائے گی۔

ایک بار میری چھوٹی بہن سے کہنے لگے۔

منیا! میں نے سنا تھا کہ جہیز میں تمہیں اونٹ کا بچہ بھی دیا گیا ہے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب دور دراز سے ان سے ملنے کے لیے آئے۔ انھوں نے مولانا کو دیکھ کر بڑے اچنبھے کے ساتھ کہا۔ آپ عامر عثمانی ہیں۔ کیوں آپ کو شک کیوں ہے! ظاہر ہے کہ یہ آواز مرحوم کی تھی۔ ان صاحب نے فرمایا کہ میں نے سنا تھا عامر عثمانی صاحب کے داڑھی نہیں ہے، اور آپ کے تو اتنی طویل داڑھی ہے۔

یہ سنکر مرحوم مسکرائے اور بولے

ہاں اطمینان کر لو، ورنہ کہنے والے تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو داڑھی تم دیکھ کر آئے ہو وہ مصنوعی تھی۔

اس قسم کے ہزاروں فقرے میرے ذہن کے ٹیپ ریکارڈ میں

محفوظ ہیں، جو مرحوم کی شگفتہ مزاجی اور ظرافت کی شہادت دیتے ہیں۔ میں ان سب فقروں کو فی الوقت کاغذ پر سمیٹنا نہیں چاہتا فی الحال تو ان کی ظرافت کا یقین دلانے کے لئے میں نے یہ چند فقرے نقل کر دیے ہیں۔ زندگی نے کبھی مہلت دی تو میں کچھ اور واقعات قلم بند کر کے قارئین تجلی کی خدمت میں پیش کروں گا۔

ظرافت اور شگفتہ مزاجی چونکہ ان کی ذات کا جزو لاینفک تھی اس لیے وہ آخیر عمر تک قائم رہی۔ موت کے بستر پر بھی انھوں نے بعض حرکتیں ایسی کی تھیں کہ جو سراپا لطیفہ تھیں اور جنھیں ایک حساس آدمی کبھی نہیں بھلا سکتا۔

صورت حال یہ تھی کہ نقاہت و کمزوری کی زیادتی نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ مرض بھی ضعف اور کمزوری کی طرح غیر معمولی تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ڈاکٹروں کو اس بات کی تاکید کرنی پڑی کہ آپ کم سے کم بولیں گے۔ قارئین سے یہ کہنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ دل کے مرض میں زیادہ بولنا خطرہ کا باعث ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹروں کی فہم و تشخیص کے مطابق مرض دل ہی کا تھا لہٰذا انھوں نے حتی الامکان زبان بند کرنے کی تاکید کی۔ اور یہ تاکید بالکل بجا تھی۔ لیکن معاملہ کچھ ایسا تھا کہ مرحوم حتی الامکان پانیر کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ گھر والوں نے سمجھایا کہ ڈاکٹروں نے زیادہ بولنے کو منع کیا ہے۔ لہٰذا خدا کے لئے آپ چپ رہیے۔ ڈاکٹروں کی منطق ان کے سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ جھلائے اور انھوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ بولیں گے اور زیادہ سے زیادہ بولیں گے۔ ان کی یہ بیجا جھلاہٹ دیکھ کر گھر والے بھی گڑبڑا گئے اور انھوں نے نرمی اور ہمدردی کو طلاق رجعی دینے کے بعد کہا۔ اب آپ نہیں بولیں گے اور بالکل نہیں بولیں گے۔ اگر آپ نے زبان کھولی تو آپ کو کمرہ میں تنہا چھوڑ کر دروازہ بند کر لیا جائیگا۔

وہ ذہین تھے۔ ان کے لئے یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں تھا کہ اب پورا گھر بغاوت پر آمادہ ہے۔ انھوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ زبان پر خاموشی کا قفل چڑھا لیا جائے۔ وہ یکلخت دہم ہو گئے اور اسی دن انھوں نے ایک کاغذ کے پرزے پر یوں لکھا:۔

" میں گونگا ہوں　　　عامر عثمانی

اس کے بعد جب کوئی ان کی عیادت کے لئے حاضر ہوتا تو وہ اسے کاغذ کا پرزہ دکھا دیتے۔ گویا کہ اب زبان ہلانی بھی بند کر دی۔ اب خدا ہی جانے یہ عین فرمانبرداری تھی یا خاموش انتقام۔

اسی دن شام کو ایک پرچہ پر یوں لکھا ——

حسن میاں کو بلاؤ۔

گھر والوں نے آواز لگائی اور حسن میاں آ گئے ——

حسن کو دیکھ کر انھوں نے پھر قلم کو حرکت دی اور نتیجتاً کاغذ پر یہ الفاظ بکھر گئے۔

" حقہ لاؤ۔

حسن نے کہا دل کے مرض میں تمباکو نوشی زہر کا کام کرتی ہے یہ سنکر بگڑ گئے۔ زبان پھر فرمانبرداری کی قید سے آزاد ہو گئی۔ بولے کون بیوقوف کہتا ہے۔

حسن نے سٹ پٹا کر کہا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔

بولے　　ڈاکٹر اقبال سے بڑا کوئی ڈاکٹر دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اور ڈاکٹر اقبال نے حالت سنجیدگی میں یہ فرمایا تھا —— کہ زہر بھی کرتا ہے کار تریاقی۔

اور —— اور بس۔

وقت گذر گیا یادیں باقی رہ گئیں۔ اور یہ یادیں زندگی بھر ہمارا تعاقب کرتی رہیں گی۔

سادگی

سادگی کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک پہلو یہ بھی ہے ایک دن کسی طالب علم کی طرح چلے جا رہے تھے اور بغل میں بخاری شریف دبی ہوئی تھی۔ میں نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟

جواب دیا۔ مولانا شریف الحسن صاحب کے پاس جا رہا ہوں ایک حدیث کے بارے میں تحقیق کرنی ہے۔

سادگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے:۔

ایک [illegible] انھیں ایک مزدور کے ساتھ اسی طرح چلتے ہوئے دیکھا گیا۔ کہ مزدور کے کاندھے پر ان کا ہاتھ تھا اور دوسرے

ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ یہ تھیلا ان کا نہیں بلکہ مزدور کا تھا جس میں اس کا یہ سامان تھا آری، ہتھوڑی، بسولہ وغیرہ۔ قارئین یہ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ یہ مزدور کوئی بڑھئی تھا۔ اتنا اور سن لیجئے کہ یہ مزدور مولانا کے گھر میں مزدوری کے طور پر کچھ کام کر رہا تھا اور دیوبند کا ایک انتہائی غریب اور مفلس آدمی تھا۔ اس کے کپڑوں پر جگہ جگہ پیوند اور پیوند کی شکل میں غربت و افلاس کی جیتی جاگتی نشانیاں موجود تھیں —— اور مولانا عامر عثمانی جیسا عظیم المرتبت انسان اس کے ساتھ اس انداز میں چل رہا تھا جیسے دونوں ایک ہی سطح اور ایک ہی درجے کے انسان ہوں، جیسے ان میں کوئی امتیاز نہ ہو۔

سادگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ اپنے لئے ہمیشہ ایسا کپڑا خرید کر لاتے جو کم سے کم داموں میں مل جاتا۔ انتہائی سستا اور سیدھا سادا لباس انھیں مرغوب تھا۔ اچھے اور عمدہ کپڑے سے یک گونہ نفرت تھی۔ لیکن ان لوگوں سے کبھی نفرت نہیں کی جو اچھا اور قیمتی کپڑا پہننے کے عادی ہوں۔

بخیل نہیں تھے، ورنہ یہ سمجھ لیا جاتا کہ قیمتی کپڑا خریدتے وقت دم گھٹتا ہوگا۔ عید و بقر عید کے موقع پر اور دوسری تقریبات کے لئے مشترکہ کپڑا آتا۔ پورے گھر کے لئے عمدہ سے عمدہ اور قیمتی سے قیمتی کپڑا خرید کر لاتے اور اپنے لئے وہی معمولی اور گھٹیا۔

سادگی کے کچھ پہلو یہ بھی ہیں —— سفر تھرڈ کلاس میں کیا کرتے تھے۔ اپنا ہر کام خود انجام دے لیتے۔ کپڑوں پر پیوند لگا لیتے۔ اپنے کمرے میں جھاڑو دے لیتے۔ بازار سے سودا خرید لاتے۔ سواری بہت ہی ضرورت کے وقت کرتے۔ ورنہ عموماً پیدل چلتے نظر آتے۔

ایک مرتبہ مزدوروں کے ساتھ لگ کر گھر کی دیواروں پر روغن تک کرتے دیکھا گیا۔ علاوہ ازیں میں نے کئی بار انھیں ایسے معمولی کام کرتے دیکھا ہے جنھیں میں نہیں کر سکتا، حالانکہ علم، فہم، عزت، شہرت اور مرتبہ کے اعتبار سے میری ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ مجھ جیسے لوگ جن چھوٹے کاموں کی انجام دہی میں عار اور ہتک محسوس کرتے انھوں نے ان کاموں کی انجام دہی میں کبھی عار اور ہتک محسوس نہیں کی۔ اور کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کسی چھوٹے کام کے لئے مزدور کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہوں۔

سخاوت

گلی گلی میں ان کی سخاوت کے چرچے تھے۔ یہ تو سبھی جانتے تھے کہ محتاجوں اور بے کسوں کی مدد کرنا ان کی عادت ثانیہ تھی لیکن اس بات سے کوئی واقف نہ تھا کہ بعض امدادیں انھوں نے ایسی بھی کی ہیں کہ دائیں ہاتھ سے مدد کرنے کے بعد بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو سکی۔ ان کی وفات کے بعد کئی رازوں سے پردہ اٹھا۔ کئی ایسی حقیقتیں سامنے آئیں جو خوابوں اور افسانوں سے زیادہ خوبصورت تھیں اور جو ان حقائق و واقعات کی تصدیق کر رہی تھیں جنھیں میں نے صرف کتابوں میں پڑھا تھا —— عمل کی دنیا میں مشاہدہ نہیں ہو سکا تھا۔

انتقال کے بعد ایک بیوہ کی زبان سے معلوم ہوا کہ اتنی رقم ہر ماہ مجھے دیا کرتے تھے اور یہ رقم مقررہ تاریخ کو خود مجھے پہنچا دیا کرتے تھے۔

ایک دوکاندار کی زبانی معلوم ہوا کہ فلاں فلاں مکان پر ہر ماہ اتنا آٹا اور اتنا دوسرا سامان میری دکان سے جایا کرتا تھا۔

دارالعلوم کے کتنے ہی طلباء کا وظیفہ مقرر تھا۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو یہ وظیفہ ادا کر دیا جاتا اور کسی تیسرے آدمی کو خبر نہ ہوپاتی وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو سخاوت بعد میں کہتے ہیں اور حاتم طائی کا خطاب پہلے مل جاتا ہے۔ انھیں زندگی میں سخی ہونے کے باوجود جود و کرم کا پتلا کبھی نہیں سمجھا گیا۔ البتہ ان کی وفات کے بعد کچھ نادر رازوں سے پردہ ہٹ جانے کی وجہ سے اب دنیا انھیں جواد کہے تو کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

دارالعلوم کے بعض طلباء اور شہر کی بعض بیواؤں کا وظیفہ ابھی تک برقرار ہے۔ اقتصادی حالات نے اگرچہ ہماری کمر توڑ دی ہے لیکن انشاء اللہ ہم ان وظیفوں کا سلسلہ منقطع نہیں کریں گے جو مرحوم کے جاری کردہ ہیں۔

ایک زمانہ میں ان کے مکان کی حیثیت بیت المال کی سی تھی۔ لوگ اپنی ضرورت کا اظہار کرتے اور انھیں کبھی قرض کی صورت میں کبھی اور کسی صورت میں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا۔ اس زمانے میں لوگوں نے انھیں بڑے فریب دیے۔ ہزاروں فریب کھانے کے بعد انھوں نے اپنی روش بدل دی اور اسکے بعد ان کا گھر مسلم فنڈ میں منتقل ہو گیا۔ اب صورت یہ تھی کہ کوئی چیز رہن رکھ جاؤ اور قرض لے جاؤ۔ بیسیوں چیزیں ہر وقت ان کے بکس میں نظر آتی تھیں۔ یہ چیزیں بطور رہن ان کے پاس موجود رہتیں۔ مرتہن جب کبھی قرض ادا کر دیتا مرہونہ چیز اس کے حوالہ کر دی جاتی۔ سخاوت سے متعلق کچھ واقعات ایک صاحب قلم نے ایک مضمون میں سمیٹ دیے ہیں یہ مضمون انشاء اللہ نمبر کی اگلی قسط میں جلوہ گر ہوگا۔ میں اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھتا۔

بڑاپن

علم و فہم کو گواہ بنا کر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ جو شخص دوسروں کی خطاؤں کو نظرانداز کر دے اور اپنی خطاؤں کی ہر وقت معافی مانگنے کے لئے تیار رہے وہ بلند ہے عظیم ہے رفیع المرتبت ہے۔ ان کا عالم یہ تھا کہ دوسروں کی غلطیوں کو نظرانداز کرتے اور اگر خود سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو آئیں بائیں شائیں اور اگر مگر کرنے کی بجائے جھٹ سے اپنی کوتاہیوں کی معافی طلب کر لیتے۔ دوسروں سے گستاخی سرزد ہو جاتی تو اسے نسیاً منسیاً کر دیتے۔ میں نے کئی بار انھیں چھوٹے لوگوں سے معذرت اور معافی طلب کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مجھے آواز دی (ان دنوں میں ان کے مکان کے نچلے حصہ میں رہا کرتا تھا۔ اور اس وقت ان کے اور میرے درمیان وہ نازک رشتہ قائم نہیں ہوا تھا جو بعد میں ان کی لخت جگر کے توسط سے قائم ہوا) میں فوراً ان کی آواز پر لبیک نہ کہہ سکا اور مجھے ان تک پہنچنے میں ذرا سی تاخیر ہو گئی یہ تاخیر بلا وجہ نہیں تھی۔ دراصل جب انھوں نے آواز دی میں مغرب کی نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز پوری کر کے اوپر پہنچا تو دس منٹ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ یہ دس منٹ انھیں بہت گراں گذرے، اس کی ایک وجہ ان کا ایک ارجنٹ کام تھا جو سرعت و عجلت کا متقاضی تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے پہلے جب کبھی انھوں نے یاد فرمایا میں ایک منٹ گنوائے بغیر ان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ بہرحال وجہ کچھ بھی رہی ہو انھیں دس منٹ کی تاخیر بڑی گراں گذری اور وہ مجھے دیکھتے ہی برس پڑے۔ شاید یہ پہلا اور آخری اتفاق تھا کہ انھوں نے مجھ سے تلخ لہجہ میں گفتگو کی۔ میں گردن جھکائے کھڑا رہا اور وہ بولے چلے جا رہے تھے۔ دو بار پکار چکا ہوں۔ معلوم نہیں کیا کرتے رہتے ہو ——— اپنی جگہ سے ہلنا ہی نہیں چاہتے۔ جاؤ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ ہو گیا کام۔

میں چلا آیا ——— یہ کہنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس وقت میرے دل کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی ———

قارئین کو تجربہ ہوگا کہ محسن اور مہربان لوگ جب الفاظ کی چھڑی گھماتے ہیں تو احساس کی کائنات تھرتھرا اٹھتی ہے۔ اور پلکیں اس پانی سے تربتر ہو جاتی ہیں جو بیک وقت نمک بھی ہوتا ہے اور ذومعنی بھی۔ انھوں نے ہمیشہ مجھ پر احسانات کئے تھے۔ ہمیشہ مجھے محبت دی تھی۔ میری خواہشوں کا احترام کیا تھا، اپنے لب و لہجہ کا مٹھاس بخشا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ ہی یہ واضح کیا تھا کہ وہ میرے محسن ہیں کرم فرما ہیں۔ صاحب شفقت ہیں۔

ان کے ہونٹوں پر میں اپنے لئے تلخیاں کیسے گوارہ کر لیتا میرے سینہ میں دھڑکنے والے لوتھڑے پر غم اور اداسی کا کہرا چھا گیا، لیکن یہ کہرا زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکا۔ اگلے دن وہ نیچے میرے کمرے میں آئے ——— اور سوز و گداز سے بھرے لہجہ میں بولے:

کیا ہوا ناراض ہو گئے۔

نہیں تو ——— غالباً یہی الفاظ میری زبان سے نکلے تھے۔

تو پھر؟

بھلا پھر کا جواب میرے پاس کیا تھا۔ اور اگر تھا تو وہ ٹوٹ لٹا

میری زبان پر ایک پہرے دار کی حیثیت سے بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر رہے تھے۔ چنانچہ میں چپ ہی رہا چند لمحوں تک وہ بھی چپ رہے پھر بولے:

کل جو کچھ ہوا اس پر میں شرمندہ ہوں۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ چلو چھوڑو اٹھو ذرا اصلی گھی لانا ہے۔ میں ان کے ساتھ چل دیا۔ اور راستہ طے کرتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے قدرت براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو اور کہہ رہی ہو کہ ہم نے دانستہ عامر عثمانی سے ایک غلطی کرائی تھی تاکہ تجھ پر ان کی بلندی اور عظمت واضح ہو جائے۔ میں پہلے بھی ان کی عظمت و ترفع کا قائل تھا۔ اس کے بعد عقیدت میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی — اور اس طرح قدرت کا منشاء پورا ہو گیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا مجھ پر برس پڑنا اغلاط کی فہرست میں نہیں آتا اس لئے کہ وہ میرے بڑے تھے اور بڑوں کو چھوٹوں پر اتنا حق تو ہونا ہی چاہئے کہ وہ انھیں ڈانٹیں، متنبہ کریں۔ تاہم انھوں نے شرمندگی کا اظہار کیا اور شرمندگی کے اس اظہار نے میرے دل میں ان کی رفعت کی جڑیں اور زیادہ گہری کر دیں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ان کے گھر میں تعمیر و چنائی کا کام ہو رہا تھا۔ دسیوں مزدور کام میں لگے ہوئے تھے۔ اسی دوران ایک دن ان کے کرتے کی جیب میں پانچسو روپے غائب ہو گئے۔ انھیں شبہ ایک مزدور پر ہوا۔ کچھ قرائن نے ان کے شبہ میں تقویت پیدا کر دی اور انھوں نے اس مزدور سے پوچھ تاچھ کی۔ اس نے شدت کے ساتھ انکار کیا مرحوم نے اس سے زیادہ شدت کے ساتھ کہا — نہیں روپے تم ہی نے نکالے ہیں۔

مزدور پیہم انکار کرتا رہا۔ اور وہ اس بات کا اصرار کرتے رہے کہ نہیں اپنے جرم کا اعتراف کرو۔ چوری تم ہی نے کی ہے۔

معاملہ ابھی رفع دفع نہیں ہوا تھا کہ ایک صاحب ان سے ملنے آ گئے۔ ان سے ملنے کے لئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ صاحب چلے گئے لیکن ان کے چلے جانے کے بعد مرحوم نے اس مزدور کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے دست بستہ معافی چاہتے ہوئے کہا دوست مجھے معاف کر دو میں نے تم پر الزام لگایا ہے۔ پھر مزدور کی آنکھوں میں تڑپنے والے بے شمار سوالوں کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔

ہوا یہ کہ روپے کسی طرح جیب سے گر کر نیچے رکھے ہوئے اخباروں میں دب گئے تھے۔ اب جو اخباروں کی گڈی اٹھائی تو اس کے نیچے سے روپے برآمد ہو گئے۔

غلطی تو بے شک مرحوم ہی کی تھی کہ انھوں نے مضبوط ثبوت کے بغیر مزدور کو سارق سمجھ لیا تھا۔ لیکن پھر برملا انھوں نے اپنی غلطی کی معافی چاہ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ فطری طور پر عظیم ہیں۔ بڑائی اور عظمت ان کے لہو میں تحلیل ہے آخر وہ یہ بھی تو کر سکتے تھے کہ روپے مل جانے کے بعد کسی کو ہوا بھی نہ دیتے اور چپ ہو کر بیٹھ جاتے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے انھوں نے کھلے عام اور کھلے الفاظ میں اپنی غلط فہمی کی دست بستہ معافی طلب کر لی اور اس طرح انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ بڑا آدمی اگر اپنی غلطی کا اعتراف کرے تو اس سے اس کی بڑائی میں کوئی اضمحلال پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے بڑے پن میں ایک گونہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ مزدور جو اس واقعہ سے پہلے انھیں صرف ایک بڑا عالم سمجھتا تھا، اس واقعہ کے بعد ایک بڑا انسان بھی سمجھنے لگا۔

کئی بار میں نے انھیں ایسے لوگوں سے معافیاں طلب کرتے دیکھا ہے معاشرہ جنھیں کوئی حیثیت نہیں دیتا۔ اور دنیا جنھیں ذلیل سمجھتی ہے۔ اپنی غلطی مان لینے کی صفت فی زمانہ عنقا اور نادر الوقوع ہو چکی ہے۔ میں نے کئی بار بڑے بڑے جوٹی کے پرہیزگاروں کو غلطیوں اور لغزشوں کا شکار ہوتے دیکھا ہے۔ لیکن میری آنکھوں نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا کہ ان پرہیزگاروں نے اپنی غلطیوں اور لغزشوں کا اعتراف کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ وہ واقعی خدا ترس اور پرہیزگار ہیں۔ تصنع تکلف، بناوٹ اور عاجزی و انکساری کی ایکٹنگ عام ہے

لیکن فی الحقیقت کتنے ایسے لوگ ہیں جو واقعی خود کو چھوٹا حقیر اور ذرۂ بے مقدار سمجھتے ہوں ــــ ؟

مومنانہ اعتماد

بے شک مومن کوے کی طرح چالاک نہیں ہوتا۔ وہ اکثر دنیا کے پھیلائے ہوئے دام فریب میں آجاتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مومن سچ بولتا ہے، صداقت کا پرستار ہوتا ہے۔ جھوٹ سے اسے نفرت ہوتی ہے۔ وہ اس کذب خفی اور کذب جلی کے پاس بھی جانا نہیں چاہتا جس کو اس کے مذہب نے منافقت کی نشانی قرار دیا ہے۔

اور نفسیات یہ کہتی ہے کہ جھوٹا آدمی کبھی دوسروں پر اعتماد نہیں کرتا اور سچ بولنے والا ہر کاذب کی لن ترانیوں پر بھی ایمان لانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ کاذب و صادق کو پرکھنے کی سب سے بہترین کسوٹی یہی ہے۔ جو شخص دوسروں پر بڑی حد تک اعتماد کرتا ہے سمجھ لیجیے کہ وہ خود بھی قابل اعتماد ہے اور جو دوسروں کے دعووں کو ہوائی اور کھوکھلے سمجھتا ہے یقین کریجئے کہ اس کے اپنے دعوے بھی ہوائی اور کھوکھلے ہوتے ہیں۔

مرحوم عامر عثمانی صاحب میں جہاں اور صفتیں تھیں وہاں یہ صفت بھی موجود تھی کہ وہ دوسروں کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔ دوسروں پر خصوصاً مسلمانوں پر آنکھیں بند کرکے اعتماد کرنا ان کی شخصیت کا ایک خاص پرائے۔ یہ سب ان کے حق میں ہمیشہ غیر مفید ہی رہی۔ یار لوگ ان کی اس صفت کو کمزوری پر محمول کرتے ہوئے بہت کچھ ناجائز فائدہ اٹھا لیا کرتے تھے۔

ایسے ہزاروں واقعات نقل کئے جاسکتے ہیں کہ ان کے مومنانہ اعتماد کا دنیا نے غلط فائدہ اٹھایا۔ لیکن کاغذ کی تنگ دامانی تفصیل میں جانے کی اجازت نہیں دیتی بس ایک واقعہ سن لیجیے :

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک طالب علم نے مولانا کے پاس ایک جوڑی کڑوں کی رکھوائی بطور رہن اور بطور قرض دو سو روپے مرحوم سے وصول کر لیے۔ مدت گذر گئی وہ طالب علم لوٹ کر ہی نہیں آئے۔ طویل در طویل انتظار کے بعد بھی جب ان طالب علم کی کہیں جھلک نظر نہیں پڑ سکی تو مرحوم کو خیال ہوا کہ کہیں وہ مر تو نہیں گئے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ان کے مرنے جینے کی تحقیق کس سے کی جائے۔ ان کے پاس ان کا مکمل پتہ تحریر نہیں تھا۔ مکمل کیا غیر مکمل پتہ بھی موجود نہیں تھا جس کا سہارا لے کر ان کی تلاش کی جاتی۔ مجبوراً صبر کیے بیٹھے رہے۔

ایک دن مرحوم کو خیال ہوا کہ ان کے کڑوں کے بارے میں یہ تحقیق کی جائے کہ وہ کتنے وزن کے ہیں اور بازار میں وہ کتنی قیمت میں فروخت ہو سکتے ہیں۔ فوراً ہی انھوں نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنایا اور بکس میں سے وہ کڑے نکالے۔ اہل خانہ میں سے بعض افراد نے ان کڑوں کا مشاہدہ کرتے ہی بہ یقین آواز میں کہا۔ یہ کڑے سونے کے نہیں رولڈ گولڈ کے ہیں۔ یعنی زیادہ سے زیادہ پندرہ روپے کے۔

اب مولانا کا یقین دیکھیے۔ بولے :

نہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تم لوگوں کو سونے کی پہچان ہی نہیں ہے۔ یہ یقینی طور پر سونے کے ہیں۔

گھر والوں کا دعویٰ یہی تھا کہ خالص رولڈ گولڈ ہے مرحوم گھر والوں کے دعوے کی تردید کرتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ تم لوگ پہچاننے میں غلطی کھا رہے ہو۔ یہ سونے ہی کے ہیں۔

اب گھر والوں نے کہا آخر آپ اتنے یقین کے ساتھ انھیں سونا کیوں قرار دے رہے ہیں۔

مرحوم نے مطمئن لہجہ میں کہا ـــ اس لیے کہ یہ کڑے ایک دارالعلوم کے طالب علم نے بطور رہن رکھوائے تھے ـــ مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ دارالعلوم کا طالب دھوکا نہیں دے سکتا البتہ تمہاری سمجھ ٹھوکر کھا سکتی ہے۔

گھر والوں نے کہا مناظرہ ختم آپ کسی سنار کو دکھا لیجیے سنار کی سمجھ تو ٹھوکر نہیں کھا سکتی۔ بات معقول تھی۔ انھوں نے بازار میں جاکر ایک سنار کو کڑے دکھائے اور سنار نے

وہی کہا جو اہل خانہ کہہ رہے تھے ۔ بے میل اور خالص رولڈ گولڈ ـــــ سونے کا حصہ کبھی شامل نہیں ۔ گھر واپس آئے تو اہل خانہ نے پوچھا کیسے کیا رہا ۔

بولے ۔ ہے تو رول گولڈ ہی لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس بے چارے طالب علم کو کسی سنار نے سونا کہہ کر رول گولڈ بھیڑ دیا ہو ۔ یہ تو کوئی ضروری نہیں کہ فریب کاری طالب علم ہی نے کی ہے ۔

قارئین یہ واقعہ پڑھ کر خدا جانے کیا رائے قائم کریں ـــ لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ یہ مومنانہ اعتماد تھا ۔ اور اس کی نظیریں مرحوم اسلاف کی زندگیوں میں تو نظر آتی تھیں آجکل کے بزرگوں میں نظر نہیں آتیں ۔ اور اگر کچھ نظیریں ہیں تو بس برائے نام اور برائے ذکر ـــ

معاملات

معاملات کے بڑے کھرے تھے ۔ بد عہدی کبھی نہیں کی ۔ جس سے جو معاہدہ طے ہو گیا اسی پر قائم رہے ۔ خواہ اس پر قائم رہنے میں زبردست نقصان ہی کیوں نہ ہو ۔ معاملات کے موضوع پر ان گنت واقعات بیان کیے جا سکتے تھے اگر اختصار اور صفحات کی قلت پیش نظر نہ ہوتی ۔ بس ایک واقعہ دامن قلم پر کھیرنے کے لیے بے تاب ہے ۔ یہ واقعہ بالکل عجیب ہے شاید آپ اس پر حیرت کریں ۔ حیرت خود مجھے بھی ہے لیکن ہم دونوں کی حیرت اس واقعہ کی سچائی کو مجروح نہیں کر سکتی ۔

بمبئی جانے سے قبل انھوں نے مجھ سے کہا تھا ۔

زینب میری سب سے زیادہ چہیتی بیٹی ہے ۔ میں اس کی جدائی گوارہ نہیں کر سکتا ۔ اور میں یہ بھی گوارہ نہیں کر سکتا کہ زینب دیوبند میں رہے اور تم دیوبند سے باہر ۔ لہذا میری خواہش ہے کہ تم اپنی ملازمت کو استعفیٰ دیکر یہیں چلے آؤ ۔

تکلف اور تفصیل برطرف ۔ مختصر اور سیدھی سی بات ہے کہ دیوبند کا ماحول مجھے پسند نہیں تھا ۔ یہاں کی عام بد عہدیوں اور بد اخلاقیوں سے طبیعت اکتا چکی تھی اور دل و دماغ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ دیوبند سے نجات حاصل کی جائے ۔ حسب فیصلہ نجات مل گئی تھی ـــ لیکن ایک قلیل مدت کے لیے ۔ مرحوم کے ہونٹوں پر منقولہ بالا الفاظ کو سانس لیتے دیکھا تو بے اختیار میری زبان بھی حرکت میں آگئی اور یہ جملہ مرحوم کے کانوں میں منتقل ہو گیا ۔

آپ کو معلوم ہو گا کہ مجھے یہاں کے ماحول میں گھٹن محسوس ہوتی ہے ۔

جانتا ہوں ۔ انھوں نے مطمئن لہجہ میں کہا ۔ اسی لیے اصرار نہیں کر رہا ہوں ، حکم نہیں دے رہا ہوں ۔ صرف اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے ۔ زینب پر اب میرا اختیار نہیں ہے تم اس کے مالک ہو ۔ جہاں تمہارا دل چاہے رہو ۔ البتہ میری اپنی خواہش یہ تھی کہ زینب میرے پاس رہے اور تم زینب کے پاس رہو ۔

اسی اثنا میں کچھ اور باتیں بھی ہوئی تھیں ان کا ذکر چونکہ طوالت کا موجب ہو گا ۔ اس لیے ان سے صرف نظر کرنا ہی بہتر ہے ۔

گفت و شنید کا حاصل یہ ہے کہ میں راضی ہو گیا اور مرحوم نے یہ طے کر دیا کہ میں تو بمبئی چلا جاؤں گا اور تم نگینہ جا کر اپنا سامان اٹھا لانا ۔ لیکن دہلی کے پلیٹ فارم پر انھوں نے فرمایا ـــ

حسن میاں ابھی سامان مت لانا اور نہ ہی استعفیٰ دینا ۔ میں بمبئی سے آکر ایک خط لکھوں گا اور اس خط میں ملازمت سے برطرف ہو جانے کا اصرار کر دوں گا ۔ اس خط کو تم محفوظ کر لینا ۔ آئندہ اگر ہمارے درمیان کوئی کشیدگی پیدا ہوئی تو تم دنیا سے یہ تو کہہ سکو گے کہ عامر عثمانی میرے مستقبل کا ذمہ دار ہے ، اسی کے اصرار پر میں نے ملازمت ترک کی تھی اور اپنے مستقبل کو خطرے میں ڈالا تھا ۔

ان کی زبان سے یہ جملہ سنکر میرے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی تھی یہ تو الگ مسئلہ ہے جس کا ذکر غیر ضروری ہی ہو گا ۔

یہ واقعہ بیان کر کے ثابت تو صرف یہ کرنا تھا کہ مولانا

بھر تا آں حد تک معاملہ کے صاف انسان تھے۔

معاملات میں وہ دجل و زیب کو سب سے بڑا گناہ تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی کسی سے کوئی معاہدہ کر کے اسے گزند پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔

میں یہ دعویٰ نہیں کروں گا کہ معاملات کی خوبی میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ہاں یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل محسوس نہیں ہوتا کہ معاملات کی خوبی میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے ہاں یہ کہنے میں مجھے کوئی تامل محسوس نہیں ہوتا کہ معاملات کے اچھے لوگوں سے بھری اس دنیا میں بس اتنے ہی ہیں کہ انھیں انگلیوں پر گن لیا جائے۔

رکھ رکھاؤ

رکھ رکھاؤ کی صفت انھیں وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد محترم بھی اس صفت سے مالا مال تھے۔

اس موضوع پر کئی واقعات بیان کرنے کو دل چاہتا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں اب لوح و قلم اداسی میں ڈوب چکے ہیں۔ پردۂ ذہن پر یادوں کی فلم چل رہی ہے ان کی ایک ایک صفت، ان کا ہنسنا بولنا، ان کا طرزِ گفتگو، انکی شفقت ان کی حرکات و سکنات۔ نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہیں اور اب میرے ہونٹوں پر یہ شعر رینگ رہا ہے

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ان کے کچھ اوصاف (تجلی کے دس پرچوں سے)

(۱) ہر بڑی شخصیت کی وفات پر تعزیتی مضمون لکھنا (۲) بہرحال شکر ادا کرنا (۳) امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ (۴) برملا اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا (۵) عاجزی و انکساری۔ غیرت یہ ہیں۔ صفحہ الٹیے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رح جب اس دنیائے فانی سے روانہ ہوئے تو احساس و شعور کی کائنات پر درد و غم کی گھنگھور گھٹائیں چھاگئی تھیں اور دفعتاً جب یہ گھٹائیں برسنا شروع ہوئیں تو ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان کے نیچے آہوں، کراہوں اور آنسوؤں کے سوا کوئی اور چیز موجود نہیں ہے ہر دل مضطرب تھا

تیرۂ و تار تھی پہلے ہی یہاں شام حیات
دامنِ چرخ سے ایک اور ستارہ ٹوٹا
کوئی بتلاؤ! مری قوم کے معصوموں کو
کون برباد ہوا کس کا سہارہ ٹوٹا

ہر آنکھ رو رہی تھی ہر چہرہ اداسیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولانا عامر عثمانی بھی اسی کیفیت سے دوچار تھے ان کے قلم نے بھی غم میں آنسوؤں کا خراج لٹا یا تھا ــــ یہ آنسو چشم قلم نے چھلکائے تو تجلی نے انھیں اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ ان آنسوؤں کو الفاظ کی صورت میں دیکھنا ہو تو یہ مضمون دیکھیے۔

ماہوار رسالوں کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ہر لحظہ بدلتے ہوئے تازہ حالات پر فوری تبصرہ کرسکیں۔ تجلی میں جن دوامی مسائل اور جاودانی اصولوں کی اشاعت و تبلیغ کے لئے جاری ہوا ہے اگرچہ ان کا تعلق سیاسی اور ہنگامی حالات سے نہیں لیکن ملّتِ اسلام کے بطل جلیل حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی علیہ الرحمۃ کی وفات ایسا عظیم سانحہ تھا کہ ہم سے ہوسکتا تو اس کی جانکاہ خبر سنتے ہی تجلی کے ہر صفحہ کو پیکر تعزیت اور مجسمۂ حزن و ملال بناکر آپ کے سامنے رکھدیتے۔ اس لئے نہیں کہ وہ ہمارے حقیقی چچا تھے بلکہ اس لئے کہ جادۂ علم و فضل اور شاہراہ دین و دانش کے وہ ایسے بلند مرتبہ راہرو تھے جس کا ثانی بطن گیتی صدیوں میں پیدا کرتا ہے لیکن ان کی وفات سے پہلے دسمبر کا تجلی چھپ چکا تھا اور اب جنوری کی اشاعت تک اخبارات و رسائل نے اتنا کچھ ان کے متعلق لکھ ڈالا ہے کہ ہمارا گریۂ ماتم باسی اور بعد از وقت سا معلوم ہوتا ہے ــــ پھر بھی جو کاری زخم سینۂ ملت پر علامہ کی موت نے لگایا ہے اس کی کسک اور ٹیس سالوں تک تازہ رہے گی اور ہمارا دیدۂ خوں بار ان کے غم میں عرصہ تک لبریز و آنسوؤں سے نمناک رہے گا۔

یہ آفتاب علم و دانش جو سو ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ کو وادیٔ غربت کے افق پر غروب ہوگیا۔ دس محرم ۱۳۰۵ھ کو دیوبند کے معزز ترین اور نیک نام خاندان عثمانی کے افق پر ننھا سا ستارہ بن کر طلوع ہوا تھا ــــ ننھا ستارہ جس تابش میں قدسی نور تھا، پاکیزہ دلکشی تھی انمول شادابی تھی ــــ اور بڑھتے بڑھتے یہ چاند بن گیا ــــ چاند جو فضاؤں کو آسمانی نور عطا کرتا ہے ــــ جس کی چاندنی میں رعنائی ہے، سنجیدگی ہے اور پھیلاؤ ہے ــــ دیوبند کی گلیوں نے اپنے سینوں میں ایسے قدموں کی دھمک محسوس کی جو علم و عمل اور فہم و تدبر کی اعلیٰ منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ایک معصوم کم گو، منکسر نوجوان ــــ جو نہ کبھی فضول تفریحوں میں مشغول دیکھا گیا ــــ نہ کسی لغو ہنگامے میں شریک ہوا نہ کسی سے الجھا ــــ نظریں جھکائے علمی خیالات میں غرق ــــ کتابیں سنبھالے ــــ یا تو مسجد کی طرف دیکھا گیا یا اُس دارالعلوم کی طرف جو اس کے آباء و اجداد کی اولوالعزمیوں اور دینی خدمات کا زندہ مجسمہ اپنا آغوش محبت وا کئے اس کا منتظر رہتا تھا ــــ وہ دارالعلوم جس نے اسے عزت دی اور خود اس سے عزت پائی ــــ جوانی ہر رنگ میں مسکراتی ہے لیکن اس بلند کردار اور فرشتہ خصلت نوجوان کی

جاتی اس کی سجدہ گذار پیشانی کا نور اور چہرہ کا نکھار بن کر مسکرائی اور اس سے آگے دیوبند کا ایک ایک چپہ اور بام و در اس بات کے شاہد ہیں کہ اس نوجوان صالح کی معصومیت کہیں اور کسی موقع پر بداعمالی کا شکار نہیں ہوئی ــــ پھر دنیا نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ یہ روشن چاند بہت جلد خورشید عالمتاب بننے والا ہے اور بھی لوگوں کی زبانوں پر بے ساختہ علامہ شبیر احمد عثمانی کے الفاظ ابھر آئے ــــ عثمانی خاندان پہلے ہی حضرت فضل الرحمٰن، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن اور حضرت حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہم جیسے تابناک ہیروں کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ اس خورشید تازہ نے ان جگمگاہٹوں کو نئی جلا اور خیرہ کن تابانی عطا کر دی۔

علامہ عثمانی کو فہم و فراست اور توفیق علم و عمل اور قدرت نے وافر دی ہی تھی مگر سب سے ممتاز خصوصیت آپ کی وہ انشاء پردازی اور تحریری عظمت ہے جس نے آغاز ہی میں اہل علم و انصاف سے اپنا لوہا منوا لیا ــــ بے مثال تنقید و تنقیح ہمہ گیر اسلوبِ بیان، جامعیت، سلاست گیرائی، لطافت اور نکھار آپ کی تحریروں کی روشن خصوصیات ہیں۔ دیوبند کے بزرگوں میں دینی بندگی اور مرتبۂ آخرت کے اعتبار سے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون بڑا ہوگا لیکن دینی بصیرت علمی فراست اور تفسیری وجدان میں معدودے چند کے سوا کوئی ان کی صف میں نظر نہیں آتا۔ تصانیف اگرچہ علامہ کی بہت زیادہ نہیں لیکن جتنی بھی ہیں بے مثال منفرد اور لافانی ہیں خصوصاً وہ تفسیر قرآن جو فوائد کے نام سے مشہور ہے اور ترجمۂ قرآن جس کا آغاز علامہ کے شیخ مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا مشہور زمانہ ہیں اور زبانِ اردو میں اپنی افادیت اور علمی ثقاہت کے لحاظ سے نظیر نہیں رکھتے۔ سب سے بڑی خوبی جو علامہ کی تحریروں میں نمایاں ہے وہ فی زمانہ قطعاً نایاب ہے یعنی علمی انداز اور عالمانہ اسلوب و متانت کو قائم رکھتے ہوئے ایسی سلاست، شادابی، شگفتگی، دلپذیری کہ موجودہ ادب اردو کی بنیادی قدروں پر بھی پوری اتریں اور اسلامی روایات ادب و صحافت بھی مجروح نہ ہوں، عبارتوں میں نہ تو آپ کو تکلف و تصنع ملے گا نہ بیگانہ اور دقیق الفاظ نظر آئیں گے۔ بس ایسا معلوم ہوگا کہ ایک تیز رفتار مشین ہے جس میں سے مناسب اور برمحل الفاظ

ڈھلے ڈھلائے نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ اکابرین دیوبند کی تصانیف میں آپ کی ہر تصنیف ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اور اگر دوسرے مصنفین کی ہزاروں سطروں میں علامہ کی چند سطریں خلط ملط کر دی جائیں تو ایک صاحب ذوق اور سمجھدار قاری بلا تکلف ان سطروں کو علیحدہ کر سکتا ہے۔

تصنیف کے سلسلہ میں آپ کا آخری شاہکار مسلم شریف کی شرح فتح الملہم ہے جو عربی زبان میں لکھی گئی۔ علم الحدیث اور تنقیح و تشریح کے اعتبار سے جہاں یہ ایک وحید العصر تصنیف ہے وہاں اس کی نگارش عالیہ میں وہ ملکۂ تحریر اور سلیقۂ نگارش بھی پوری طرح اُجاگر ہے جو علامہ کی اردو تحریروں میں نمایاں نظر آتا ہے۔

حضرت کے ادبی اور علمی کارناموں پر اگر ہم تفصیل سے روشنی ڈالیں تو ایک دفتر چاہیئے۔ حیرت ناک امر یہ ہے کہ تحریروں کی طرح تقریر کا ملکہ بھی علامہ میں قابلِ رشک حد تک پایا جاتا تھا۔ حیرتناک ہم نے اس لئے کہا کہ ہندوستان کی نو سو سالہ اسلامی تاریخ میں آپ کو شاید ہی چند افراد ایسے ملیں جو زبردست عالم بھی ہوں ــــ باکمال مفسر بھی ہوں جلیل القدر مصنف بھی ہوں اور اعلیٰ ترین مقرر بھی ہوں ــــ علامہ ایک مقدس صاحب باطن، زیرک اور دانا عالم، باکمال اہل قلم اور سحر بیان مفسر ہونے کے علاوہ لاجواب مقرر بھی تھے۔ آپ نے اگر کبھی ان کی تقریر نہیں سنی تو یہ جانیئے کہ ایک عجیب و غریب لذت اور ذائقے سے محروم رہے میٹھے بول، نرم لہجہ، ہموار روانی ــــ جیسے سماعت پر شبنم کے موتی ڈھلکتے چلے جائیں اور جب عظمت الٰہی کا بیان ہو تو ایک طوفانی گرج اور پُر وقار ہیبت سے دل دہل جائیں۔ روحیں دم بخود ہو جائیں۔ استدلال بے پناہ مگر سادہ، بات گہری مگر سلیس، منطق اٹل مگر عام فہم، فلسفہ لاجواب مگر صاف ستھرا۔ مزاح تبسم آفریں مگر سبق آموز ــــ جب اسٹیج پر آ کر دھیمی آواز میں کلمات حمد و نعت ادا کرتے اور ہلکی آواز میں تقریر کا آغاز ہوتا تو معلوم ہوتا کہ غالباً ضعف و کمزوری کے باعث چند فقروں سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکیں گے مگر اگلے ہی لمحے میں یہ بطن کمال سے پھوٹنے والا نازک دھارا منزل بمنزل گہرا، پھیلتا جاتا اس طرح جولاں نظر آتا کہ سامعین دم بخود دل محو غرقاب، روحیں سرشار و سرمست۔ آواز جو آہستہ سے

ابر بن کر مجمع پر ایک ردائے محویت بن کر چھا جاتی۔ تقریر کا موضوع ایک لذیذ و لطیف کیف بن کر دماغوں اور دلوں میں اترتا چلا جاتا۔

آپ کو اکبر مرحوم کے اشعار سے خاص دلچسپی تھی۔ اکثر دوران تقریر میں اکبر کے اشعار پڑھتے اور اگرچہ بعض واعظوں اور مقرروں کی طرح ترنم کبھی اختیار نہ فرمایا لیکن ادا کرنے کا انداز ایسا پُرلطف اور استعمال برمحل ہوتا کہ سامعین پھڑک اٹھتے اور محسوس ہوتا کہ شعر کی تخلیق خاص اسی موقع کے لئے کی گئی تھی۔ اکبر کی منفرد اور ممتاز شاعری اگرچہ اپنے پُرلطف طنز اور اخلاق آموز مزاح کے اعتبار سے اردو ادب میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، لیکن عوام کی بے حسی نے کبھی اسے مناسب قدر و منزلت نہیں دی۔ یہ علامہ کا حسنِ بیان ہی تھا کہ اکبر کے جس شعر کو بھی آپ نے اپنی تقریر میں شامل کر دیا وہ سامعین کے لئے ایک روحانی حقیقت بن گیا اور بہت سے وہ لوگ جو دیوان میں یہ شعر پڑھ چکے تھے ایسا محسوس کرنے لگے گویا آج پہلی مرتبہ انھیں اس سے تعارف ہوا ہے۔ علامہ کی زبان سادے سادے لفظوں میں عظیم مسائل اور اہم موضوعات کو سلجھاتی چلی جاتی۔ جب مزاح اختیار کرتے تو روحوں پر نشاط طاری ہو جاتا۔ قرآنی حقائق بیان فرماتے تو قلوب ذکر الٰہی کی محویت سے جھومنے لگتے۔ اخوت و محبت کا تذکرہ کرتے تو سامعین پر رس کی بوندیں سی ٹپکتی چلی جاتیں۔

آپ کی عام زندگی کے بارے میں ہم لکھنے بیٹھیں تو بہت کچھ لکھ سکتے ہیں لیکن تازہ صدمے کی شدت اور اضطراب و خلش کی فراوانی میں ہم اس وقت چند دلفگار کراہوں کے سوا کسی قابل نہیں۔ مختصراً اتنا اور کہہ سکتے ہیں کہ علامہ عثمانی کی موت ایک ایسے زبردست انسان کی موت ہے جسے اگر اسکی صحیح جگہ اور حیثیت مل جاتی تو آج تمام دنیا میں شور ماتم بپا ہوتا۔ لیکن ہمارا آہن سال مشرقی ہیروں کو پتھر کی جگہ رکھنے کا عادی ہے۔ سیکڑوں تابناک ستارے طلوع ہو ہو کر غروب ہو جاتے ہیں اور مشرق زندوں سے زیادہ مُردوں کو پوجتا ہے۔ ابھی یہی ہوگا کہ لوگ بڑی شان و شوکت سے ریڈیو سے سینے پیٹیں گے۔ دھوم دھام سے جنازہ اٹھے گا، فاتحہ خوانی ہوگی اور چند مہینوں بعد سب کچھ ختم، تقریریں ختم کر کے اولاد دیں اور نوکریاں مانگنے کی فکر کریں گے، اور کچھ لوگ ہوٹلوں میں بیٹھ کر بڑے دلچسپ انداز میں فرمائیں گے کہ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ (تجلی۔ جنوری ۱۹۵۰ء)

جیسا کہ علامہ شبیر احمدؒ کی رحلت پر ہم نے لکھا تھا۔ آج پھر اس بات کو دہرانا پڑتا ہے کہ ہر لحظہ کروٹ لیتی ہوئی زندگی اور منقلب حالات پر برمحل قلم اٹھانا ماہانہ جریدوں کے لئے ممکن نہیں۔ آج کم و بیش دو ہفتے ہو گئے جب ایشیا کی عظیم شخصیت سیاست کے ایک انمول گوہر، اسلام کی ایک ذی وجاہت فرزند وزیر اعظم پاکستان جناب لیاقت علی خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک سیاہ باطن، سیاہ بخت اور سیہ انجام درندے کے پستول نے وہ مقدس موت عطا کی جس پر ہزاروں زندگیاں اور سیکڑوں دنیائیں نچھاور کی جا سکتی ہیں وہ موت جو عرشِ اعظم کی طرح بلند، عصمت مریم کی طرح معصوم و مقدس، جلوۂ طور کی طرح روشن اور نورِ ایمان کی طرح سدا بہار ہے وہ موت جو سید الشہداء حضرت حمزہؓ جسد مبارک کو چھوتی ہوئی، عمرؓ و عثمانؓ اور زبیرؓ و حسینؓ کی شاہراہ حیات سے گذری اور بعد و حنین کے عالی مرتبہ شہداء کا حسن و تقدس آغوش میں لئے ساڑھے تیرہ سو برس کا طویل سفر کر کے لیاقت علی کا سینۂ بریاں تک پہونچی! — فرشتوں کا سلام پہنچے اس موت پر!—

کتنے آنسو ہوں گے جو اس وقت تک بیگم لیاقت اور مادر لیاقت اور کتنے شعلے ہوں گے جو کروڑوں مسلمانان پاکستان کی پلکوں پر اشکوں کے چراغ جل بجھ گئے ہوں گے۔

لیکن یہ زندگی، یہ بے رحم وقت کا مسافر ایک منٹ کو رُکتا نہیں۔ یہ ہر زخم کو روندتا ہوا، ہر ہنگامہ کو پھلانگتا ہوا گذرتا چلا جاتا ہے اور اسی طرح چلتا رہے گا — پرانے زخم بھرتے جائیں گے نئے انقلابات آتے جائیں گے — گردو پیش جاری رہے گی — ہر گردش نئے لیاقت اور نئے قاتل پیدا کرتی رہے گی۔ یہی دنیا کی داستان ہے، یہی ہے حاصل شام و سحر! —

لیاقت علی کی شہادت نے پاکستان سے کیا کچھ چھین لیا اس کا صحیح علم خدا کو ہے ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ ایک مدبر وزیر اعظم ایک ہنس مکھ ملاقاتی، ایک وفادار دوست، ایک مستقل مزاج کارکن، ایک راسخ العقیدہ مسلمان، اور ایک مشہور و معروف مجاہد تھے — ان کی قیادت میں پاکستان کا ننھا پودا تناور درخت کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا — ان کے کروڑوں

مسلمانوں کو دلی اعتماد تھا۔ انھوں نے اپنے دوست جواہر لال سے مل کر انسانیت دشمن طاقتوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنایا تھا ان کی تمام زندگی پاکستان کی خاطر ایک حرکتِ پیہم جہدِ مستقل بن کر رہ گئی تھی۔

ایسی ہستی کی ایک لخت شہادت سے نہ صرف پاکستان بلکہ تمام عالمِ اسلامی بلکہ تمام انسانیت کو جو بھی فائدہ یا نقصان پہنچ سکتا ہے اس کا اندازہ ہر ہوش مند کر سکتا ہے۔

کارخانۂ فطرت کی رونق اگرچہ شخصیتوں کی موت سے اثر پذیر نہیں ہوتی، طوفان آتے اور گذر جاتے ہیں — لیاقت کے نہ ہونے سے پاکستان کی تقدیر کوئی نہیں چھین سکتا — ایک تارہ ڈوب کر دوسرا تارہ ابھرتا ہے۔ اور جتنے دن، جتنی راتیں کائنات کی قسمت میں لکھی ہیں وہ پوری ہو کر رہتی ہیں — لیکن لیاقت کے بھیجے ہوئے سید قاتل اور اس کے نامعلوم ساتھیوں کو کوئی بتا دے کہ اے سیاہ بختو! چند حقیر سکوں اور چند رکیک خواہشوں کی خاطر تم نے جو دوزخ خریدی ہے اس کے خوفناک شعلے تمہیں کبھی پناہ نہ دیں گے تم چیخو گے چلاؤ گے اور (اس کے بعد کی تحریر قانوناً ضبط کرلی گئی تھی)

(تجلی نومبر ۵۱ء)

حضرت مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی کی وفات پر انہوں نے مندرجہ ذیل تاثرات کا اظہار کیا۔

ناظرینِ تجلی "فیض الرحمٰن" کے نام سے مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی کی تفسیر قسطوار ملاحظہ فرماتے رہے ہیں۔ آج ہم بصد حسرت و افسوس یہ غمناک اطلاع دینے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ مولانا موصوف دس فروری [illegible]ء کو دوپہر گیارہ بجے اس جہانِ فانی سے کوچ فرما گئے۔
إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

مولانا موصوف خاکسار راقم الحروف کے عم زاد بھائی تھے دارالعلوم دیوبند سے سندِ فراغت حاصل کر کے آپ نے کثرتِ مطالعہ اور اہلِ علم کی صحبت سے بہت کچھ فیض حاصل کیا۔

یہ فیض صرف علم تک محدود نہ تھا بلکہ آپ کا کردار پوری طرح عمل صالح کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ نہایت خلیق، نرم گفتار، متواضع، منکسر اور مرنجاں مرنج۔ بڑوں میں بیٹھتے تو سنجیدہ عالم اور خوردوں میں بیٹھتے تو شفیق دوست، باتوں میں مٹھاس، نصیحت میں پیار

عرصہ سے آپ حیدرآباد دکن کے جامعہ عثمانیہ میں عربی کے پروفیسر تھے ۵۱ء میں وظیفہ یاب ہو کر مع اہل و عیال دیوبند تشریف لائے، آپ کی منزلت و مرتبت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ دیوبند پہنچتے ہی دارالعلوم دیوبند نے آپ کو فوراً اپنے دائرہ میں لے لیا۔ درانحالیکہ عام حالات میں دارالعلوم کی ملازمت حاصل کرنا اچھے اچھے قابلوں کے لئے دیر طلب کام ہوا کرتا ہے۔

دیوبند کے آغوش میں آپ کو زیادہ دنوں زندگی گذارنے کا موقع نہیں ملا لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی عزت و عظمت کے نقوش عوام و خواص کے قلوب پر کندہ ہو گئے جس کی ایک وجہ تو وہی ہے — مگر آپ کا حُسنِ اخلاق تھا اور دوسری خصوصی وجہ وہ درسِ تفسیر تھا جو ہماری نظر میں آپ کی زندگی کا سب سے نمایاں عملِ خیر ہے۔

کئی سال سے آپ کو قرآن کریم سے اس قدر دلچسپی ہو گئی تھی کہ رفتہ رفتہ یہ عشق کی صورت اختیار کر گئی۔ حیدرآباد میں آپ نے مسجد میں بعد نمازِ فجر تفسیر کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتدا میں آپ کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ عوام اول تو دینی ذوق سے بہت کچھ عاری ہیں، پھر خطیبوں اور واعظوں سے سوءِ ظنی عام ہے۔ شروع میں حاضرین کی تعداد بہت کم رہی لیکن رفتہ رفتہ آپ کے خلوص علمی تبحر اور جذبۂ خدمت نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ دور دور سے لوگ فیضیاب ہونے کے لئے آنے لگے۔ اور آپ کا درسِ تفسیر ایک مختصر جلسہ کی شکل اختیار کر گیا۔

مدتِ ملازمت ختم ہو جانے پر حیدرآباد میں رہنا کچھ الجھنوں کے باعث آپ کے لئے دشوار ہو گیا۔ چنانچہ آپ دیوبند تشریف لے آئے اور یہاں آکر سب سے زیادہ اور سب سے مقدم اگر کوئی لگن تھی کہ جلد سے جلد درسِ تفسیر کا سلسلہ شروع کر دیں۔

پہلے محلہ گدی واڑہ کی مسجد میں آپ نے یہ سلسلہ شروع کیا یہ وہ مسجد ہے جس کے فرش پر دیوبند کے عظیم المرتبت بزرگوں کی پیشانیاں سجدہ ریز رہی ہیں۔

کچھ دنوں بعد جائے قیام تبدیل کر دینے کی وجہ سے یہ سلسلہ "علی مسجد" میں منتقل ہو گیا جو شیخ الہندؒ کے در دولت کے نزدیک ہی ایک مختصر مسجد ہے۔ اوّل اوّل یہاں بھی حاضرین کی تعداد کم رہی

لیکن رفتہ رفتہ لوگوں کا شوق بڑھا، تعداد بڑھتی گئی، جلد ہی یہ عالم ہوگیا کہ شدید جاڑوں کی کسا زفجر میں دور دور محلوں کے لوگ عملی مسجد پہنچنے لگے اور معقول تعداد میں عورتیں بھی شریک درس ہونے لگیں۔

آپ کے اندازِ بیان میں ایک ایسی نرمی اور شفقت تھی جو گداز قلب ہی کے عالم میں پیدا ہوسکتی ہے۔ قرآنی اسرار و رموز کے بیان کا طرز بہت عام فہم اور سلیس و شگفتہ، آواز عشق قرآن کے سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی۔

باوجود اپنی دائم المریضی اور سن رسیدگی کے شدید جاڑوں میں آپ پابندی کے ساتھ قرآن کے فیض کو عام کرتے رہے۔

حتیٰ کہ مرض الموت کے ابتدائی مدارج میں بخار کے عالم میں بھی جب تک پیروں نے ساتھ دیا مسجد جاتے رہے اور آخرکار جب طاقت نے جواب دیا تو مجھے یاد ہے کہ ایک دن انہوں نے اشک بھری آنکھوں کے ساتھ مجھ سے کہا تھا کہ :-

"عامر! مجھے سب سے بڑا غم یہ ہے کہ اس
بیماری نے تفسیر کا سلسلہ منقطع کر دیا"

کہنے کو یہ کوئی گہری اور اہم بات نہ تھی لیکن ان کے عمیق تاثر اور جذباتی سوز کا جب خیال کرتا ہوں تو بے اختیار ان کے عشقِ قرآنی کی وسعت و شدت کا منظر زبانِ حال سے یہ کہتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ اے بدنصیب! تو نے قرآن کو کبھی اس پیار سے گلے نہ لگایا۔ تو نے کبھی کوئی آنسو اس کتاب مبین کے آستانۂ نیاز پر بھینٹ نہیں چڑھایا جو دنیا کی سب سے عظیم کتاب اور سب سے حسین شاہکار قدرت ہے

حسرت ہے خاندانِ عثمانی کی تقدیر پر کہ اس کی محراب علم و عمل میں جلنے والے گنے چنے چراغوں میں سے ایک روشن چراغ باد فنا نے بجھا دیا ——— (تجلی مارچ ۵۲ء)

حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی رحلت کے
موقع پر ان کا قلم آنسو لٹانے پر مجبور ہوگیا تھا ———
اور یہ ہیں وہ ذو معنی آنسو۔

۵ دسمبر ۵۷ء کی سہ پہر کو استاذ محترم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کی وفات کا جو غم انگیز سانحہ پیش آچکا ہے اس سے ملک کا بچہ بچہ واقف ہے تکفین و تدفین کی تمام جزوی تفصیلات اخبارات میں آچکی ہیں۔ متعدد مقامات پر تعزیتی جلسے ہوچکے ہیں تعارفی و تعزیتی مضامین اور ملک کی قابل ذکر ہستیوں کے تاثرات ملاحظہ کیے جاچکے ہیں، کئی اخباروں کے خاص نمبر نکل چکے ہیں اور وہ سب کچھ ہوچکا ہے جو کسی محبوب ہستی کی رحلت پر پروپیگنڈے اور لفظ کاری کے موجودہ دور میں متوقع ہوسکتا ہے۔ نظم و نثر کا کوئی اسلوب نہیں ہے جسے مدعیانِ عقیدت نے نظر انداز کردیا ہو۔ بعض شاعروں نے تو فرطِ غم میں کئی کئی نظمیں اور درجنوں قطعات کہہ ڈالے ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ میرے پاس کہنے کو کیا رہ گیا ہے۔ لیکن صاحبِ دعا اور معظم استاد کی وفات کا غم اس کا متقاضی ہے کہ میں بھی چند آنسو ٹپکالوں اور تجلی کو عزاداری کی سعادت سے محروم نہ رہ جانے دوں۔

شیخ کی زندگی کیا تھی؟ سراپا جہد و عمل، عبادت، بندگی اور خدمت، تہجد سے لے کر رات بارہ ایک بجے تک وہ ایک مجاہد کی طرح سرگرم عمل رہتے تلاوتِ قرآن، نمازیں، درس حدیث، تعلیمی نظامت کی نگرانی، مہمانوں کی ضیافت، متوسلین کی خبرگیری، قومی دملی خدمت کے لئے سفر، خطبے، وعظ ارشاد و بیعت، یہ تھیں ان کی مصروفیتیں، مہمان نواز اتنے کہ ان کے "دولتکدہ" کو بلا مبالغہ "مہمان خانہ" کہہ سکتے ہیں، شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہو کہ حضرت دیوبند میں ہوں اور دسترخوان پر دس بیس مہمان موجود نہ ہوں۔ بیشمار ایسے بھی لوگ آپ کے حسنِ تواضع سے فائدہ اٹھاتے جن کا کوئی قابلِ لحاظ تعلق و تعارف آپ سے نہ ہوتا۔ دارالعلوم نے اگرچہ حضرت کی تعلیمی خدمات کا مشاہرہ دینے میں بخل نہیں کیا لیکن ظاہر ہے ایسی وسیع مہمان نوازی اس سے کیا ہوپاتی، نتیجہ یہ کہ بارہا مقروض ہوجاتے مگر کیا مجال جو پیشانی پر بل آجائے، خدا کی عطا پر مطمئن اور مال و منال کی محبت سے بے تعلق تھے۔

تنخواہ ملتی تو سب سے پہلے ان لوگوں کا حصہ روانہ کیا جاتا جن کا رزق اللہ تعالیٰ نے شیخ ہی کی فراخدلی سے وابستہ کر رکھا تھا کون جانے کتنی بیوائیں، کتنے یتیم، اور کتنے ضرورت مند ہر مہینے انکی غربا پروری سے نوازے جاتے۔ بلا سے قرض کتنا ہی ہو، بلا سے اخراجات کتنے ہی بڑھ گئے ہوں مگر متاعِ دنیا سے بے نیاز اور رضائے الٰہی کے طالب شیخ نے کبھی ان منتظر ضرورت مندوں کا حصہ روک کر

آمد و خرچ میں توازن پیدا کرنے کا خیال تک نہیں کیا۔ کیسے کرتے نبی کریمؐ کی دنیا دلی ان کے پیشِ نظر تھی، صحابہؓ کا اُسوہ اُن کے لوحِ قلب پر نقش تھا۔ اہل اللہ کی سیرت انھیں خوب یاد تھی۔

اور جانتے ہیں آپ اس مردِ مومن کی دیانت اور پرہیزگاری مرض الموت میں جب کچھ دنوں مدرسے تشریف نہ لے جا سکے اور تنخواہ آئی تو واپس فرمادی۔ اللہ اکبر یہ ہے وہ مقام جہاں کم سے کم آج کے دورِ زرپرست میں جبرئیل کے پر جلنے کا محاورہ بولا جاسکتا ہے، کیا اسے انتہائی تقویٰ اور دیانت کے سوا بھی کچھ کہا جائے گا۔ تنخواہ تو درکنار اگر مدرسے سے وہ اپنی بیماری کے دنوں میں علاج معالجہ کے لئے بھی کچھ زائد رقم لے لیتے تو اوصاف و دیانت کے منافی نہ ہوتا۔ آخر میں جس درسگاہ کی خدمت میں انہوں نے بہترین عمر صرف کردی اور جس درسگاہ کو ان کے توسل نے شہرت و عظمت اور مال و منال سبھی چیزوں سے بہرہ ور کیا کیا انصافاً ان کا حق نہ ہوتا کہ عمرِ ضعیفی میں اپنی جائز ضروریات اسی سے حاصل کریں لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں سے تقویٰ اور اباحت کے دو جداگانہ راستے پھٹتے ہیں۔ شیخ نے تقویٰ کا راستہ اختیار کیا۔ اس تفصیل کو بھی نظر میں رکھئے کہ اس تنخواہ کو نہ لینے کا ذکر ہے جو عام قانون مدرسہ کی رو سے ان کا جائز قانونی حق تھا۔ یہ ایسی چیز نہیں تھی کہ یہ حضرت کے بلند مقام و منصب کی رعایت سے انھیں دی جارہی ہو۔ بلکہ یہ وہ چیز تھی جسے مدرسہ کا ہر ملازم آئینی طور پر وصول کرتا ہے، اور جس کے وصول کرنے میں دین و دنیا کسی بھی لحاظ سے اُنگلی اٹھانے کی گنجائش نہیں۔ لیکن شیخ نے صاف کہدیا جب میں پڑھا نہیں رہا ہوں تو تنخواہ کیسی۔

مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا کہ کسی نہ کسی طرح یہ ان کا جائز حق ان تک پہنچا دینا چاہیئے، لیکن ایک مردِ عزیمت کوش کو اس کے فیصلے سے ہٹا دینا آسان نہیں تھا کہ جس کا جی چاہے جاکر معاملہ نمٹا دے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو یہ کام سونپا گیا کہ کسی مناسب وقت میں حضرت کو سمجھائیں اور ایک ہزار سے کچھ زائد کی یہ رقم ان کے حوالے کردیں۔ حضرت مہتمم صاحب اس فکر میں رہے کہ شیخ کی طبیعت کچھ سہولت پر ہو تو اظہار مدعا کریں لیکن اللہ کو یہ منظور نہیں تھا۔

اور گفتگو کا مناسب موقع میسر آنے سے پہلے ہی انھیں اللہ نے اپنے یہاں بلالیا، بعد میں حضرت مہتمم صاحب شیخ کی زوجہ مکرمہ کی خدمت میں تشریف لے گئے اور فرضِ تعزیت ادا کرنے کے بعد کہا کہ وہ رقم آپ لے لیں کیونکہ وہ شیخ کا قطعاً قانونی اور جائز حق ہے اس پر جو جواب زوجۂ مکرمہ نے دیا وہ بھی واقعی ان کی عظمت و خصوصیت کے عین مطابق ہے ایک وسیع القلب، فراخ حوصلہ سیر چشم اور زاہد و متقی شیخ کی حریمِ محترم کو بیشک اتنا ہی اونچا ہونا چاہیئے۔ انہوں نے فرمایا:۔

آپ سب کچھ ٹھیک کہتے ہیں مگر جب انہوں نے ہی زندگی میں یہ رقم نہیں لی تو ہم ان کے بعد یہ کیسے لے سکتے ہیں۔ حضرت مہتمم صاحب نے بہت کچھ سمجھایا، اور ظاہر ہے کہ اُن کے حسنِ کلام، رعنائی گفتار اور قوتِ استدلال کا کہنا ہی کیا ہے، مگر رقم نہیں لی گئی اور خاتون ذی جاہ نے ثابت کردیا کہ ایک مخلص اور دیانتدار اور خدا پرست مردِ مومن کے اہل و عیال اس کی خصوصیات کا گہرا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سلامتی ہو اُن پر۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں بہترین نعمتوں سے نوازے۔

شجاعت و پامردی جو انسانیت کا بہترین جوہر سمجھا گیا ہے حضرت کی وہ نمایاں صفت رہی ہے کہ تاریخ جنگِ آزادی کا ہر جاننے والا اور آپ کی صحبت و معیت کا ہر فیضیاب اس سے بخوبی واقف ہے، انگریزی دور کی عدالتوں میں آپ نے جس مومنانہ حق گوئی اور مجاہدانہ دلیری سے بیانات دیئے ہیں ان کی گونج آج تک باخبر حلقوں میں باقی ہے، خوف، جُبن، ڈہن، بزدلی، اور سخن سازی سے تو آپ کی طبیعت و فطرت کو کوئی واسطہ ہی نہ تھا جس وقت جس بات کو آپ کے قلب و ذہن نے حق سمجھا شیروں کی طرح اس پر جم گئے۔ اور ہر حال میں وہی کہا جسے اپنے نزدیک قرآن و سنت کے مطابق سمجھا لگی لپٹی آپ کا شیوہ نہ تھا، کھری کہتے تھے ایک سلیم و سادہ انسان کی طرح آپ کے مزاج میں اینچ پینچ نہیں تھا۔ نفاق سے چڑ تھی، خلافِ اسلام وضع کی سخت مکروہ محسوس کرتے تھے اور اپنے سامنے خلافِ سنت چیزوں کو پاکر برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ آئینہ کی طرح صاف دل تھے، دوسروں کو بھی قدرتاً صاف دل سمجھتے تھے چنانچہ ان کی موصنانہ [illegible] اور حسنِ ظن

سے نہ جانے کتنے رنگے سیاروں نے فائدے اٹھائے ہیں' نہ جانے کتنے خودغرضوں نے غرضیں پوری کی ہیں۔ دین کے معاملہ میں سخت لیکن غرباء، مساکین' طلبار اور خویش واقربار کے معاملہ میں نہایت شفیق' رحمدل' مہربان اور وسیع القلب تھے۔

ایک صفت ان میں ایسی تھی جو فی زمانہ بہت ہی کمیاب ہے یعنی اپنی تعریف ومنقبت سے سخت بیزاری۔ آج کی دنیا میں کون نہیں جانتا کہ ہمارے سیاسی لیڈر ہی نہیں' دینی رہنما اور واعظین و علماء اپنی مدح اور عزّت افزائی کے کس قدر بھوکے ہو گئے ہیں۔ ہر مستا ر آدمی اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے کہ لوگ اس کے قصیدے گائیں اسے سر آنکھوں پہ لیں اسے ہیرو اور امام سمجھنے کا عملی ثبوت دیں لیکن حضرت شیخ کا ہر جاننے والا خوب جانتا ہے کہ وہ نفسانیت کے اس وبائی اور ہمہ گیر مرض سے بفضلہ تعالیٰ بچے ہوئے تھے بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ وہ صدر محفل ہیں اور کسی شاعر نے ان کی شان میں قصیدے کی بسم اللہ ہی کی ہے کہ انہوں نے سختی سے روک دیا ہے کسر نفسی کی نمائش کرنے والے تو آج بھی بہتیرے مل جائیں گے لیکن ان بازی گروں کا حال سب پر ظاہر ہے کہ یہ ایک بیٹھ دو کاج کر جاتے ہیں یعنی عجز وبے نفسی کا بھی سکہ جما دیا اور قصیدہ یا سپاسنامہ بھی دھڑلے کے ساتھ پڑھا گیا۔ مگر حضرت شیخ تکلفاً نہیں روکا کرتے تھے بلکہ ان کا لب ولہجہ اور تیور اس بات کے گواہ ہوا کرتے تھے کہ وہ سچ مچ غصّہ میں ہیں اور پڑھنے والا اگر باز نہ آتا تھا تو اُٹھ کر اس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیتے تھے یا ایسا کرنے کی عملاً صورت نہ ہو تو اُٹھ کر چلے جاتے تھے خود میرا اپنا واقعہ ہے کہ دورۂ حدیث کے زمانہ میں ایک جلسہ حضرت کی صدارت میں ہوا۔ میں نے ایک نظم شروع کی جس کا ایک مصرعہ آج تک یاد ہے ؎

یہ فخر کچھ کم نہیں ہے عامر کہ ہوں غلامِ حسین احمد

حضرت نے ایک دو شعروں کے بعد یہ اندازہ کرتے ہی کہ نظم منقبت میں ہی گئی ہے فوراً ڈانٹ دیا کہ خرافات بند کرو حاضرین جلسہ نے بہت اصرار کیا کہ حضرت اجازت عنایت فرما دیں۔ لیکن توبہ اجازت نہیں دی اور نظم نہیں پڑھی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد ان کی عدم موجودگی میں یہ کتنے ہی جلسوں اور صحبتوں میں پڑھی گئی ہو۔

بہرحال ایک سچے اور پاک نفس مومن کی طرح حضرت شیخ کو زندگی بھر حُبّ جاہ اور قصائد مدحیہ سے بیزاری رہی چنانچہ آپ کے سامنے ہے کہ انھوں نے اپنی عمر کا بہترین حصّہ وطن کی خدمت میں اور ابنائے وطن کی بہی خواہی میں صرف کر دیا کانگریس کا ہر دیانتدار فرد ان کی مجاہدانہ خدمات کا معترف ہے لیکن کیا مجال جو اشارۃً وکنایۃً بھی کبھی عہدے' یا اعزاز یا کی طلب ظاہر کی ہو۔ طلب کیا کرتے ان کے مخلص اور مومن قلب میں اس کا وہم بھی نہیں گذرا کہ حق پرستی کی ذیل میں کی ہوئی جدوجہد کا کوئی دنیاوی اجر بھی ملنا چاہیئے۔

میں ان کی ایمان افروز زندگی کے تمام گوشے نمایا کرنے لگوں تو کئی سو صفحات بھی ناکافی ہوں گے اور پھر بھی اس مرتبۂ ومقام کا بیان نہ ہو سکے گا جو اہل طریقت کے نقطۂ نظر سے مستقل ایک حیثیت رکھتا ہے وہ محض عابد وعالم نہ تھے، سالک بھی تھے۔ ارشاد وبیعت کا سلسلہ بھی ان سے وابستہ ہے، ظاہر ہے کہ ہم جیسا عامی اور اس کوچہ سے بے خبر اس موضوع پر کیا کہہ سکتا ہے، وہی لوگ اس موضوع پر بول سکتے ہیں جنھیں وادئ طریقت کی سیر نصیب ہو۔ بس ہمارے لئے تو یہی کافی ہے کہ شیخ ایک مردِ مومن تھے ان کی زندگی میں برگزیدہ اسلاف کی جھلکیاں پائی جاتی تھیں' ان میں وہ اخلاق نظر آتا تھا جو ایمان واسلام کی پاکیزہ تعلیمات سے مربوط ہے۔ ویسے طالبانِ تفصیل کو ان کی اپنی تصنیف کردہ سوانح حیات "نقشِ حیات" دیکھنی چاہیئے اور بہت ہی شوق ہو تو وہ اردو رسائل واخبارات حاصل کرنے چاہئیں جن میں حضرت کے حالات وکوائف نوع بہ نوع انداز میں لکھے گئے۔

بس اتنا سُن لیجئے کہ چند مہینوں کی بیماری کے بعد آپ نے ۸۲ سال کی عمر میں ۵ دسمبر ؁ کی سہ پہر کو جانِ جاں آفریں کے سپرد کی۔ آپ کا تاریخی نام "چراغ محمد" تھا۔ تدفین اسی دن رات کو تقریباً ڈھائی بجے کر دی گئی اس کے باوجود اندازاً پندرہ بیس ہزار آدمی جنازے میں شریک تھے۔ ان میں دیوبند کے علاوہ باہر کے بھی وہ بے شمار لوگ تھے جو خبر وفات سُن کر افتاں وخیزاں دیوبند چلے آئے تھے۔ اگر تدفین اگلے دن ہوتی تو تعجب نہیں کہ چالیس' پچاس ہزار آدمی شریک جنازہ ہوتے کیونکہ بے شمار عقیدت مندوں کو تو پہنچنے کے لئے وقت ہی نہیں مل سکا۔ ٹیلیفون، کال اور تاروں کی کوئی

گنتی نہیں۔

یہاں چند شعر بے اختیار نوکِ قلم پر آگئے ہیں آپ ہمارے زاویۂ نظر کو سمجھ سکیں تو شاید ان میں کوئی بات نظر آجائے۔

وہ ایک تارا جو صوفگنِ تھا حیات کے مغربی افق پر
سیاہیٔ شب کے پاسبانو خوشی مناؤ کہ وہ بھی ڈوبا
وہ اک سفینہ جو ترجمان تھا بہت سی غرقاب کشتیوں کا
ہماری حالت پہ ہنسنے والو ہنسی اڑاؤ کہ وہ بھی ڈوبا
وہ اک دل جو دمک رہا تھا خلوصِ ایماں کی تابشوں سے
خلوصِ ایماں کے دشمنوں کو خبر سناؤ کہ وہ بھی ڈوبا
جنوری و فروری ۵۸ء

اور مندرجہ ذیل تحریر کو ان کے قلم نے اس وقت وجود بخشا تھا جب مولانا ابوالکلام آزاد اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے —

ضرور جتنی بڑھ رہی ہے صبح روشن کی
اندھیرا اور گھرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے

ابھی کئے دن ہوئے کہ انہی صفحات میں ہم استادِ محترم حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اشک غم بہا چکے ہیں آج پھر ایک جلیل القدر عالم عظیم المرتبت خطیب رفیع الشان انشاء پرداز اور معروف و مقبول رہنما کی رحلت ہمارے قلم کو ماتم و شیون پر آمادہ کر رہی ہے۔ مولانا مدنی کی وفات ایک قابلِ رشک عابد و زاہد اور ایک انتھک سپاہی، ایک بے غرض خادم ملک و وطن کی وفات تھی۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی رحلت ایک سحر طراز قلم کار، ایک شہرۂ آفاق ادیب، ایک اعلیٰ درجہ کے عالم، ایک شعلہ نوا خطیب ایک عظیم القدر مدبر اور ممتاز ترین فاضل کی رحلت ہے۔

حیران ہیں، دل کو روئیں کہ پیٹیں جگر کو ہم
مقدور ہو تو ساتھ رکھیں نوحہ گر کو ہم

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے مجموعی اوصاف کے لحاظ سے دنیا میں بے نظیر تھے فقید المثال تھے، یکتا و بے ہمتا تھے لیکن یہ بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ جو بعض صلاحیتیں اور اہلیتیں انھیں جس مقدار اور تناسب سے خدائے بخشندہ نے عطا کی تھیں ان کی نظیر و مثال لانے کے لئے زمانہ کو صدیوں کا سفر طے کرنا پڑتا ہے، ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے وہ ان اعاظم رجال میں سے تھے جو اپنی انفرادیت و عبقریت کے حسن کو آنکھوں کی راہ سے دل میں اتار دیتے ہیں، وہ ایک ظلمت سوز کرن تھے جس نے تاریکیوں کا دامن چاک کر کے آنے والی سحر کا جلوہ دکھایا تھا، یہ جلوہ چاہے سراب ہی ثابت ہوا ہو۔ یہ آنے والی سحر خواہ خواب بن کر رہ گئی ہو لیکن خواب دکھانا اور اس طرح دکھانا کہ دیکھنے والے مشاہدے اور حقیقت تک کو خواب کے مقابلہ میں جھٹلا دیں کسی معمولی ہستی کا کام نہیں ہے وہ ذہانت و ذکاوت اور علم و خرد کے پیکر تھے۔ ان کے پاس زبان و قلم کا جادو تھا جو کاکا توسوتوں کو جگاتا چلا گیا۔ وہ خود ہی تاریخ تھے اور خود ہی تاریخ ساز بھی ہو جاتے اگر انقلاب کے موڑ پر ان کی چشم بصیرت سے خود ان کی ہی زندہ جاوید تحریریں اوجھل نہ ہو جاتیں۔ وہ آبِ کوثر اور ماءِ تسنیم میں ڈوبی ہوئی روح نواز تحریریں جنھیں وہ سالہا سال تک ملتِ مسلمہ کے وجدان و شعور اور قلب و روح پر صبح بہار کی پاکیزہ شبنم بنا کر ٹپکا رہے تھے وہ عظیم داعیٔ حق تھے اور شاید حق کو قائم و نافذ کرنے والے بھی بن جاتے اگر ان کی لاجواب شعلہ نوائیاں عزیمت و پامردی کی ساکھ کو قائم کرنے کے بعد ایک دم چراغ تہہ داماں نہ ہو جائیں۔

ہمیں یاد ہے کہ الہلال و البلاغ کے ولولہ انگیز و حشر خیز خطبات و مواعظ پڑھتے ہوئے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ خون کی گردش المضاعف ہو جاتی تھیں۔ ہمیں یاد ہے کہ صاحب الہلال نے انگریز کے مقابلہ میں جس والہانہ بے جگری، بسالت و پامردی اور ثبات کا مظاہرہ کیا تھا اور مسلسل کیا تھا اس کے ذکر سے دل سینوں سے باہر نکل پڑنے کو بے تاب ہو جایا کرتے تھے اور ہم نے جب ان کے مقالات خطبات، مواعظ اور بیانات کو پڑھا ہے تو ہمیں اعتراف ہے وجدان و شعور ان کی شوکتِ بیان، شکوہِ گفتار، حسنِ ادا اور رعنائی انداز کے آگے سربسجدہ ہوتے چلے گئے ہیں ہمیں ایسا محسوس ہوا ہے کہ جیسے روح کے نہاں خانے میں چاندنی پھیلتی جا رہی ہے۔

" ان کے اوصاف تجلی کے دور پچھلے " کا ابھی کافی حصہ باقی ہے یہ ہماری طرف قرض سمجھئے، انشاء اگلے شمارہ میں یہ قرض چکایا جائے گا۔

(دستخط)

مولانا عامر عثمانی کا آخری خط جو انھوں نے اپنی وفات سے
اٹھارہ گھنٹے قبل لکھا تھا اور جو ان کی وفات کے تین دن بعد
اہلِ خانہ کو موصول ہوا۔ یہ خط انھوں نے اپنی بیوی کے نام تحریر
کیا تھا۔ بیوی کے نام لکھے ہوئے خطوط بالعموم پرائیویٹ
ہوا کرتے ہیں۔ یہ خط بھی بعض جملوں کی وجہ سے پرائیویٹ
کہلانے کا مستحق ہے ——— لیکن قارئین کی دلچسپی کیلئے
ہم اسے جوں کا توں نقل کر رہے ہیں۔

AMIR USMANI
Editor TAJALLI
DEOBAND - U.P

عامر عثمانی
ایڈیٹر «تجلی» دیوبند - یوپی

میرا پتہ:- منشی ... پیرو لین
بمبئی ۹ PIRU LANE. BOMBAY 9.

۱۲/اپریل ۷۵ء
بوقت پانچ بجے صبح

میری زندگی کی بہترین ساتھی اور بہترین دل ساتھی میری پیاری نسیمہ۔

شاد رہو اور میرا سلام لو۔ وہی بہترین سلام۔ اور دعا دیتا ہے۔ جس پر ہم سب جیتے تھے۔

کل گیارہ بجے سے پہلے بے اختیار جی چاہا تھا کہ تم سامنے بیٹھی ہو اور میں تم سے کم علم کے ذریعہ تم سے باتیں کروں۔ مگر انگلیاں اور جسمانی طاقت ساتھ نہ دے سکی اس لیے بس تصور ہی تصور میں تم سے باتیں کرتا رہا۔ تمھاری محبوب صورت کو تمھاری ایک ایک ادا کو تمھاری خدمتوں اور میری بیوی ہونے کو ... چاہے اور خاص طور پر میرا ... کچھ کچھ دیر بعد آنکھیں بند کر لیتا۔ تم سیدھی سامنے آجاتیں۔ میں تمھارے حسین چہرے پر اپنی نظریں جمائے زندگی کے بیس سالوں کی کتابیں اس طرح پڑھنا شروع کر دیتا جیسے ورق ورق کر کے کتاب پڑھی جاتی ہے۔ تم شروع ہی سے کس قدر اچھی ہو، کیسی خوبصورت اور دل کو لبھانے والی ہو۔ تمھارا غصہ، تمھاری محبت، تمھارا روٹھنا، تمھارا ہر ہر فعل اور ہر ہر قدم کے پیچھے پیار ... تصویروں کی طرح چل رہا ہے۔ ہزار ہزار شکر ہے اس رحمٰن و رحیم خدا کا جس نے تم جیسی بیوی مجھے عطا کی اور میں اس پر خوش نصیب ہوں کہ ان شاء اللہ جنت میں بھی تم میری ہی ہو گی۔ اللہ ہم دونوں کا خاتمہ ایمان پر کرے اور مغفرت فرمائے۔

... تم مجھے جتنی بھی تسلی ... نہیں ...

جن کے لئے ٹکٹ بنا ہی لیتے مخصوص ہے۔ کوئی ایک ہی مسافر نہیں آیا۔ اس طرح پوری شاہی کو تنہا اور آرام
کے ساتھ سفر کیا۔ خدا کی مہربانی دیکھو کہ رات کو ۱۰ بجے [illegible] مل گیا جیسے [illegible] باقی [illegible] میں
بھر دیا گیا۔ حسب عادت کے مطابق چار بجے آنکھ کھلی تو ٹھیک ساڑھے [illegible] گاڑی سورت پہنچی۔ [illegible]
ہوں [illegible] ہوں۔ طاقت بڑھتی جاتی ہے۔ ریل میں ایک غلطی یہ ہوئی کہ [illegible] نماز [illegible]
پڑھ لی۔ چلتی گاڑی میں جسم کو گرا رکھنا ذرا طاقت چاہتا ہے۔ اسکے نتیجے میں [illegible] ضعف بڑھ گیا
[illegible] آرام کا [illegible] اور [illegible] ہو گئی۔ صبح [illegible] میں [illegible] دن زیادہ [illegible]
جیسی بڑی [illegible] میں [illegible] پیدا ہوا اور زبان کی تکلیف میں بھی کچھ کمی واقع ہوئی۔

عزیزی ابراہیم کو اللہ تعالیٰ دین و دنیا کی نعمتیں دے [illegible] اور [illegible] کی طرح میری خدمت کرتے جا
رہے ہیں [illegible] بھی [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible] جاتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] ہیں۔

خیر [illegible] صبح [illegible] بجے [illegible] سے ہم [illegible] اسٹیشن پر پہنچے۔ یہاں [illegible] کو
[illegible] اسٹیشن پر نہیں آیا [illegible] نہیں [illegible] تکلیف نہیں ہوئی۔ [illegible]
نے [illegible] بیٹھ [illegible] اپنا [illegible] پر [illegible] گئے۔ یہاں [illegible] گئی [illegible] ملے۔ [illegible]
[illegible] مل گئے۔ [illegible] منزل پر [illegible] میں [illegible] تھے۔
[illegible] کو [illegible] آج [illegible] اس [illegible] ہم [illegible]
[illegible] گئے۔ [illegible] یہاں ہم [illegible] شاہی [illegible] کے ساتھ [illegible]

AMIR USMANI
Editor *TAJALLI*
DEOBAND - U. P.

عامر عثمانی
ایڈیٹر «تجلی» دیوبند - یوپی

دلی میں بڑا حسین اہتمام ہے ۔ [illegible] کے لیے وقت ہے ۔۔۔ [illegible] برابر تیار مل رہے ہیں ۔

احباب آ جا رہے ہیں ۔ طبیعت بہت شگفتہ ہے ۔ رات ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مشاعرہ کے اسٹیج پر [illegible]

تمام کے ساتھ جا بیٹھے ۔ ۔۔۔۔ [illegible] ایک سب کو ساتھ لیا ۔ شعراء [illegible]

بیٹھے [illegible] کے لیے کرسی لائی گئی [illegible] اطمینان کے ساتھ پڑھ رہا ہے ۔

ایک ایک شعر پر داد مل رہی ہے ۔ تعریفیں مل رہی ہیں ۔ [illegible]

سنا ہے ۔ الحمد للہ [illegible] ۔ [illegible] ہے ۔

مگر تکلیف کوئی نہیں ۔ [illegible]

جلدی [illegible] مشاعرہ کے اسٹیج سے [illegible]

طبیعت سی طبیعت ۔ الحمد للہ ۔ ڈاکٹر [illegible]

ہیں [illegible]

ہیں [illegible] ۔

[illegible] ۔ [illegible] شکر ہے [illegible] ۱۱۲ ہے ۔

[illegible] ۔ اب [illegible] ۔ [illegible] فرصت

نہیں ہوئی کیونکہ میرا ہر بچہ میری یہ چاہت کا قدردان اور ایک ایک ذرہ شیریں کم نہ ہو گئے تھے۔ قلب میں جس قدر شگفتگی تھی وہ خود اپنے اور شاداب کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں ہوا۔ چہرہ شگفتہ کر کے اپنے جو بچوں کو دیا کہ اب غم کا خط لے کر اپنی محبوب نسیمہ سے باتیں شروع کر دوں۔ زندہ ہوا ہر لمحہ دوری نہیں۔ دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ وہ وہ صبح کی اذان ہو گئی۔ اس کا درد بے بہا احساس میرا نماز بھی ادا کی تھیں۔ مسلمانات سانس سانس پر کچھ گنا گیا ہے خواند ہے میں۔ اب تمام جیون کر اکیلا کرنا ہے اکیلی قدموں میں سر رکھ کر۔ ہچکی آ گئے۔ دن کا گریہ رونا غم کا یہ شکر کا ہوگا۔ نسیمہ۔ وہی جو ماں سے زیادہ شفیق باپ سے بڑھ کر مہربان، بہترین بہترین، رحم و کرم کا مجسمہ، عفو و بخشش کا پیکر، گناہوں کو معاف کرنے والا، بے مثال، بے عیب، ہر لحظہ موجود، زندہ، دائم قائم اور سب کچھ سننے اور دیکھنے والا۔ میرا آقا۔ میرا خدا۔ میرا رب۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ روتے روتے میرے سے رکتا چلا آیا ہوں۔ یہ تسبیح زبان پر ہے حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ حسبنا اللہ ونعم النصیر۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمارے لیے ہمارا اللہ کافی ہے۔ وہی بہترین مددگار اور حامی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی ہے توکل علی الحی الذی لا یموت ترجمہ: اس ذات پر بھروسہ کر جو ہمیشہ زندہ ہے کبھی مرنے والی نہیں۔ یہ اس وقت کہا گیا تھا جب رسول کے دشمن چاروں طرف سے آپ کو گھیرے ہیں کھینچا چاہتے تھے کہ مار دیں۔ میں بھی اپنے بیٹے کا جنازہ لیے کہہ رہا ہوں توکلت علی الحی الذی لا یموت۔

AMIR USMANI
Editor *TAJALLI*
DEOBAND - U. P.

عامر عثمانی
ایڈیٹر «تجلی» دیوبند - یوپی

اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اسی زندہ پائندہ ذات پر بھروسہ کرتا ہوں۔ یہ فقرہ دل سے آپ شاید سو بار
نہ پڑھ پاتے، پھر۔ کتنی طاقت ہے اس میں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں پھر دوڑ کر تے ہوئے پہاڑ سے ٹکرا
سکتا ہوں۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ کیسی طاقت ہے اس میں کتنی راحت و سکون ہے۔ اسی وقت میں یہ خط
لکھتے ہوئے خود کو سراپا طاقت محسوس کر رہا ہوں۔ اب دیکھو وضو کے لئے اٹھا۔ نفل نماز کرے ہی میں۔ ابراہیم
ابھی سو رہے ہیں۔ وقت ہوا تو ابھی نماز پڑھ کر پھر آگے لکھوں گا۔ ذرا نے کتنے آدمی تو علی الصباح اٹھ گئے
ہیں۔ اگر نماز کے بعد طاقت قائم رہی تو خط آگے لکھوں گا۔ چند منٹ کو رخصت۔

لو جی۔ نماز پڑھ لی۔ کیا خوشگوار موسم اور کتنا دلکش منظر ہے۔ ابراہیم سے پوچھا۔ نماز سے فارغ
ہوتے ہی گرم دودھ کی پیالی لی گئی۔ پی کر اب انگلیاں قلم پر پا رہی ہیں۔ محسوس ہی نہیں ہو رہا ہے کہ میں بیمار
ہوں۔ ذرا سوچو۔ رات پڑھ کے ساتھ کچھ گوشت بھی کھایا۔ سویاں کھائیں۔ ناشتہ اور اب زبان کی تکلیف بھی
بہت کم ہے۔ کل صبح تک بگڑا ہوا تھا۔ کل گیا ہوگا۔ وہ لوگ خوب بگڑ کر آگیا۔ یونانی دوا سے جانے کا ارادہ ملتوی
کر دیا ہوں کیونکہ رات ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ ٹیسٹ ضرور کرانا چاہئے۔ ٹیسٹ کیا کہ بیماری تو پہلے ہی پڑھی ہو گا
ورنہ مسئلہ [illegible] بن جائے گا۔ ہاں زندہ رہنے کی [illegible] ہوگی۔ اب انشاء اللہ میرے خدا [illegible] کرے گا

بہوا کیوں خرید یہ بہ بڑی کروں۔

اچھا تو۔ وقت آج شروع ہو گئے۔ اب کیسے خط چلے گا۔ یہ سلسلہ شاید شام تک نہ ٹوٹے۔ اگر موقع ملا تو کچھ اور ملاوٹ دو منٹ ہاتھ میں سیر و ذرا کر دوں گا۔ دیکھو تو خط لکھ دیا مگر کوئی تسلی نہیں۔

ابھی ابھی ڈیلی اور ڈاکٹر صاحب نے آکر معائنہ کیا ہے۔ دوائیں تجویز کر دیں۔ بہت مطمئن ہیں۔ اب تازہ ناشتہ کا دور شروع ہوا۔ ہمارے مہربان نیت کا خیال تھا کہ چلو گھاس میں سیر و تفریح کر لی جائے۔ بیچ کیا ہوا ہے دیکھئے انشاء اللہ کل کریں گے۔

کل آج بھی بخار رہا ہے۔ رفتہ رفتہ دور ہو جاتا رہے گا۔ اتنا وقت شاید ہی ملے کہ یہاں سے اور تو آج خط لکھوں۔ بہرحال خدا کے فضل سے حضور تم سب بھائیوں بہنوں بچوں بچیوں اور احباب و اعزہ کو مطلع کر دینا۔

سب کو بہت بہت سلام دعا پیار

عامر عثمانی

آگے بڑھنے سے پہلے

اگلے شمارہ کی جھلکیاں ملاحظہ فرمالیجئے

- مسجد سے میخانے تک ●
- ان پر بستیاں ناز کرتی تھیں — کیوں؟ اسلئے کہ وہ بدعتوں کے جانی دشمن تھے ●
- بعض حضرات نے مولانا عامر عثمانی رح کو بیسویں صدی کا ابن تیمیہ کیوں کہا؟ ●
- مولانا عامر عثمانی رح ایک بے باک مبصر کی حیثیت سے ●
- مولانا عامر عثمانی رح تحریر و قلم کے غازی ●
- مولانا عامر عثمانی رح سے ایک انٹرویو ●
- مولانا عامر عثمانی رح احباب و اقارب کی نظر میں ●
- مولانا عامر عثمانی رح اور اربابِ قلم ●
- مولانا عامر عثمانی رح کا مقام اخبار و رسائل کی دنیا میں ●
- مولانا عامر عثمانی رح کی خدمت میں شاعروں کا خراجِ عقیدت ●
- مولانا عامر عثمانی رح بندگانِ خدا کی نظروں میں ●
- تعزیتی جلسے اور تجویزیں ●

[illegible] — ایک دلچسپ مضمون از [illegible]

[illegible] کے [illegible] ایک طویل [illegible]

مولانا عامر عثمانیؒ کے احساسات کا

عکسِ جمیل

خود اُن کے تخیل کے آئینہ میں

مولانا عامرؔ عثمانیؒ کے زیرِ ترتیب مجموعۂ کلام

"عکسِ باطن"

کے چند اوراق

"قادرِ مطلق کی بارگاہ میں"

یہ جانتا ہوں کہ کچھ نہیں ہے متاعِ علم و کمال میری
مگر یہ ہے تیری دسترس میں خزف کو موتی کا رنگ دیدے

عروج آئے وہ پیشانیوں پر بلندیاں بھی عرق عرق ہوں
خزاں کی ویران وسعتوں کو بہار کا جلترنگ دیدے

"اے شاہِ اُمم"

تمہارے نعت کے قربان جان و دل لیکن — تمہاری نعت کے قابل کہاں زبان و قلم
قلم کی نوک پہ الفاظ تو بہت ہیں مگر — ثبوتِ صدقِ معانی کریں کہاں سے بہم

چڑھی ہوئی ہیں زباں پر کثافتوں کی تہیں
پھر اس زبان سے کیسے تمہاری نعت کہیں

بس ایک رسم ہے جس کو نباہنے کے لئے — تکلفات سے بزمِ سخن سجائی ہے
ہمارا شعر کہاں، دولتِ خلوص کہاں — سخن فروش ہیں دادِ ہنر کمائی ہے

نہ سوز و ساز ہے دل میں نہ آنکھ میں آنسو
کھلے ہوئے ہیں عقیدت کے پھول بے خوشبو

زباں پہ دعوئ مہر و وفا بہت کچھ ہے — سجی ہوئی ہے درود و سلام کی محفل
مگر دلوں میں غمِ آخرت کا نام نہیں — غمِ حیات کی چوکھٹ پہ سجدہ ریز ہیں دل

جمی ہوئی ہیں نگاہیں نشاطِ حاضر پر
نہ باز پُرس کا خطرہ نہ احتساب کا ڈر

وہ تم کہ شکر سراپا تھے اپنے رب کے لئے — یہ ہم کہ شکر گذاری سے واسطہ ہی نہیں
وہ تم کہ حق کے لئے سر بکف تھے میداں میں — یہ ہم کہ زخم بھی کھانے کا حوصلہ ہی نہیں

تمہیں عزیز تھی ہر شے سے عزتِ اسلام
ہمارے پاس فقط رہ گیا خُدا کا نام

بتانِ قوم و وطن جن کو تم نے توڑا تھا — نئے سرے سے انہیں ہم نے پھر تراش لیا
کیا تھا تم نے اُخوّت کا جو محل تعمیر — اسے نفاق کی ضربت سے ہم نے توڑ دیا

ہماری ظلمتِ شب میں کہیں بھی نور نہیں
طلوعِ صبح کے آثار دُور دور نہیں

ہمیں تمہاری غلامی پہ فخر ہے لیکن
بھلادیا کہ غلامی کا مُدّعا کیا ہے

وفا کو ایک تخیّل بنا لیا ہم نے
ہمیں شعور نہیں مقصدِ وفا کیا ہے

طلب تصوّرِ منزل سے ہو چکی محروم
خود اپنی سمتِ سفر بھی ہمیں نہیں معلوم

حضور! پھر بھی یہ اشعار پیشِ خدمت ہیں
اگرچہ ہدیۂ ناچیز و کم عیار سہی

برائے نام سی نسبت تو تم سے باقی ہے
ہزار دامنِ ایمان تار تار سہی

تمہارا نام ہے تسکینِ روح و جاں اب بھی
تمہاری یاد سے ہوتا ہے دل جواں اب بھی

تمہاری شان زمان و مکاں سے بالاتر
تمہارا حُسن ہے بس آپ ہی جواب اپنا

جمال و نور کا پیکر ز فرق تا بقدم
مقابلہ نہ کرے تم سے ماہتاب اپنا

یہ ماہتاب فقط دُور ہی کا جلوہ ہے
تمہیں تو ہم نے بہت پاس سے بھی دیکھا ہے

قریب جتنے گئے ہیں حسین تر پایا
تمام طلعت و تابش تمام کیف و اثر

تمہاری ذات میں گم حسن عالمِ امکاں
وہ آب و تاب کہ جلووں کو رشک ہے تم پر

صبا تمہارے پسینے کو چھو کے آتی ہے
تو گلشنوں میں نوید بہار لاتی ہے

وہ حُسن جو قفسِ آب و گِل میں قید نہیں
وہ بے نیازِ فنا ہے اسے زوال کہاں

تمہارے کشورِ نور و ضیا کی سرحد سے
قدم بچا کے گذرتی ہے گردشِ دوراں

سلام تم پہ کہ سرچشمۂ حیات ہو تم
درود تم پہ کہ منشائے کائنات ہو تم

غزلیں

ہے جنسِ معانی کا خریدار یہاں کون   الفاظ کے بے روح بدن بیچ رہا ہوں
بازار میں عرفان و بصیرت کی نہیں مانگ   میں عصمتِ دوشیزۂ فن بیچ رہا ہوں
یہ تلخ حقائق ہیں کنایات نہیں ہیں   نقدِ لب و رخسار و ذقن بیچ رہا ہوں
محبوبِ غزل ناچ رہا ہے مری لَے پر   میں اس کی لچک اس کی پھبن بیچ رہا ہوں
الفاظ کے جامے کو ذرا چُست بنا کر   رنگینیٔ ہر عضوِ بدن بیچ رہا ہوں
دوشیزگیٔ گُل کی یہاں قدر کسے ہے   برتے ہوئے پھولوں کے چمن بیچ رہا ہوں
وہ پیاس کی شدت ہے کہ دو گھونٹ کے بدلے   پاکیزگیٔ گنگ و جمن بیچ رہا ہوں
گھائل بھی ہیں عُریاں بھی ہیں الفاظ کے لاشے   ان کے لئے مخمل کے کفن بیچ رہا ہوں

کیوں فکرِ معلّٰی کو خریدے گا مہاجن
میں آج کا فنکار ہوں تن بیچ رہا ہوں

رہرو وحشت کہ منزل کے نشاں اُبھرے ہیں — میکشو رقص کہ میخانہ نظر آیا ہے
کوہِ فاراں کی بلندی پہ جو چمکا تھا کبھی — پھر وہی جلوۂ جاناں نہ نظر آیا ہے
جس سے چھلکی تھی کبھی وحدتِ آدم کی شراب — مدتوں بعد وہ پیمانہ نظر آیا ہے
چھوڑ کر شہرِ ہوس عشق کے ویرانے میں — کوئی وحشی کوئی دیوانہ نظر آیا ہے
عشق اک محفلِ فردا کو سجانے کے لئے — عیشِ امروز سے بیگانہ نظر آیا ہے
یہ مرا حسنِ نظر ہے کہ تمنا کا فریب — فقر با سطوتِ شاہانہ نظر آیا ہے
گھُپ اندھیرے میں چمکتے ہوئے جگنو کی طرح — ایک بھولا ہوا افسانہ نظر آیا ہے
اک ذرا غُرفۂ ظلمت سے جو پردہ سرکا — نگہِ شوق کو کیا کیا نہ نظر آیا ہے

نیّرِ دعوتِ حق تیری تجلّی کے نثار
اپنے اندر کا صنم خانہ نظر آیا ہے

سکت ہو یا نہ ہو ہر حال میں کی ہے فغاں میں نے
نہیں ہونے دیا ان کے ستم کو رائیگاں میں نے

اجل کو دے دیا رنگِ حیاتِ جاوداں میں نے
خدا کا شکر دیدی آج ان قدموں پہ جاں میں نے

شبِ آخر سُنی یہ کس کی آوازِ فغاں میں نے
قمر تھرّا اُٹھا تاروں کو دیکھا نیم جاں میں نے

نہیں تو موت دینے میں اس درجہ تأمل ہے
کہ جیسے مانگ لی ہو دولتِ کون و مکاں میں نے

مری بربادیوں پہ رونے والے کیا خبر تجھ کو
خریدی ہیں بہت کچھ دے کے یہ بربادیاں میں نے

قیامت ہے، نہیں اس غم پہ بھی قابو مجھے عامر
دیا ہے اس کی قیمت میں نشاطِ دو جہاں میں نے

ترے ستم کی لطافتوں کو خوشی میں بھی رو منا کریں گے
جو دل کو غم سازگار ہوگا تو غم کو دل سے جُدا کریں گے

تلاش دنیائے رنگ و بو میں کہاں ترا نقشِ پا کریں گے
وہیں ترا نقشِ پا بنے گا جبیں جہاں رکھ دیا کریں گے

نہ مطمئن ہو سکیں گے ساحل نہ چین سے رہ سکیں گی موجیں
جہاں پہ ڈوبے گی اپنی کشتی ہزار طوفاں اٹھا کریں گے

یہ کیا خبر تھی کہ رفتہ رفتہ بڑھے گی اس درجہ ناصبوری
کرے گا جب کوئی پرسشِ غم جھکا کے سر رو دیا کریں گے

کشاکشِ ہجر بھی مسلّم دعا کی مقبولیت بھی ممکن
مگر ابھی تو سوال یہ ہے، وصال ہوگا تو کیا کریں گے

فریبِ امید کے سہارے گذر تو جاتے ہیں چند لمحے
خدا بُرے وقت سے بچائے نہ یہ بھی ہوگا تو کیا کریں گے

ہوئی جو شکرِ کرم سے فرصت ملی جو دادِ ستم سے مہلت
تمہارے غم کی پناہ لے کر کبھی کبھی ہنس لیا کریں گے

حیاتِ فانی کی تلخیوں کو جو غم سے تعبیر کر رہے ہیں
انھیں محبت سے واسطہ کیا، تری تمنا وہ کیا کریں گے

شرابِ راحت ہو یا مئے غم ریاضِ جنت ہو یا جہنم
ہمیں نہ آئے گی راس عامر وہ جو بھی دولت عطا کریں گے

تھی سیاہیوں کا مسکن مری زندگی کی وادی
ترے حسن کے تصدق مجھے روشنی دکھا دی
ترا غم سما گیا ہے مرے دل کی دھڑکنوں میں
کوئی عیش جب بھی آیا مرے دل نے بد دعا دی
نہ قصور صرف تیرا نہ قصور صرف میرا
ترا حسن بھی ہے مجرم مرا دل بھی ہے فسادی
جو ذرا بھی نیند آئی کبھی اہلِ کارواں کو
وہی بن گئے لٹیرے جو بنے ہوئے تھے ہادی
وہ کبھی نہ بن سکی ہے وہ کبھی نہ بن سکے گی
کسی دل کی جو عمارت تری بے رخی نے ڈھا دی
یہ کبھی کبھی عنایت ہے بمنزلِ سیاست
کہ جفائیں سہنے والا کہیں ہو نہ جائے عادی

ہمیں آخرت میں ماہرؔ یہی عمر کام آئی
جسے کہہ رہی تھی دنیا غمِ عشق میں گنوا دی

اُن کی طلب میں خود بھی تڑپنا اور انہیں تڑپانا بھی
کہنے کو یہ دل ہے اپنا ہے لیکن بیگانہ بھی
کس کو خبر تھی آجائے گا ایسا ایک زمانہ بھی
انسانوں کا شغل بنے گا لڑنا خون بہانا بھی
اوّل اوّل میخواروں نے جام و سبو سے کھیل کیا
آخر آخر جوشِ جنوں میں پھونک دیا میخانہ بھی
نام کی مسجد نام کے مندر آج بھی لاکھوں ہیں لیکن
مدت گذری ٹوٹ چکا ہے کعبہ بھی بت خانہ بھی
عشق بھی دھوکہ حسن بھی دھوکہ عقل ہی سب کچھ ہے لیکن
بات تو جب ہے شمع کی جانب رخ نہ کرے پروانہ بھی
دل کا فسانہ کہتے کہتے موت کی ساعت آپہنچی
شوقِ بیاں تازہ ہے ابھی تک ختم نہیں افسانہ بھی
اہلِ جہاں کے دل ہیں پتھر پتھر میں نرمی مت ڈھونڈو
لاحاصل ہے ان بہروں کو دل کی بات سنانا بھی
تیرے سوا دنیا میں دے گا ان زخموں کا مرہم کون
جن کو چھپانا بھی ناممکن، ناممکن دکھلانا بھی
بادۂ الفت کی مستی کو بے ہوشی کا نام نہ دے
خاص مقامِ عشق ہے ماہرؔ پہروں ہوش نہ آنا بھی

نہ سکت ہے ضبطِ غم کی نہ مجالِ اشکباری یہ عجیب کیفیت ہے نہ سکوں نہ بے قراری
مری زندگی کا حاصل ترے غم کی پاسداری ترے غم کی آبرو ہے مجھے ہر خوشی سے پیاری
ترا ایک ہی کرم ہے ترے ہر ستم پہ بھاری غمِ دو جہاں سے دی مجھے تو نے رستگاری
یہ قدم قدم بلائیں یہ سوادِ کوئے جاناں وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری
ترے جاں نواز وعدے مجھے کیا فریب دیتے ترے کام آ گئی ہے مری زود اعتباری
وہی پھول چاک داماں وہی رنگِ اہلِ گلشن ابھی صرف یہ ہوا ہے کہ بدل گئے شکاری
مری رات منتظر ہے کسی اور صبحِ نو کی یہ سحر تجھے مبارک یہ ہے ظلمتوں کی ماری
مری عافیت کے دشمن مجھے چین آ چلا ہے کوئی اور داغِ تازہ کوئی اور زخمِ کاری
مجھے لے چلا بہا کر غمِ زندگی کا دھارا غمِ عشق یاوری کر ہے مقامِ شرمساری
کبھی تو بھی کاش سمجھے مری صنعتِ فنا کو تجھے کیا بنا گئی ہے مری حاشیہ نگاری
وہ جسے قرار کہئے نہیں نصیبِ الفت شبِ ہجر بھی گزاری شبِ وصل بھی گزاری

ہے عجب طرح کی بازی یہ بساطِ عشق عامرؔ
کبھی ہار کر بھی جیتے کبھی جیت کر بھی ہاری

○

اے شوق ابھی مایوس نہ ہو مانا وہ ہمارا ہو نہ سکا
اس رنگ بدلتی دنیا میں کس درد کا چارا ہو نہ سکا

کھل کر بھی عیاں وہ ہو نہ سکے چھپنا بھی گوارہ ہو نہ سکا
ان کی ہی تجلّی عام ہوئی ان کا ہی نظارہ ہو نہ سکا

نظروں کو شکستِ فاش ہوئی دیدار کا یارا ہو نہ سکا
لیکن یہ بڑا کافر دل ہے مایوس نظارا ہو نہ سکا

ویسے تو کسی کے دامن تک بس ایک اشارا کافی تھا
پاکیزگیٔ دامن کی قسم بس ایک اشارا ہو نہ سکا

اک آگ سی پیہم آٹھ پہر رگ رگ میں سُلگتی ہے لیکن
آنسو یہ کہاں سے آتے ہیں کیوں خشک یہ دھارا ہو نہ سکا

اِک وہ کہ بھیانک طوفاں میں تنکوں کے سہارے تیر گئے
اک ہم کہ ہماری کشتی کا ساحل بھی کنارا ہو نہ سکا

قسمت کی نوازش تھی جن پر خورشید کی ضَو سے چاند بنے
ذرّے کو ضیا دی سورج نے لیکن وہ ستارا ہو نہ سکا

مت پوچھ کہ کیا کیا رنگ دیئے گستاخ حیا نے چہرے پر
جب دل پہ وہ قابو پا نہ سکے جب اُن سے کنارا ہو نہ سکا

ہیں غنچہ و گل بھی خوب مگر وہ عارضِ رنگیں کیا کہئے
کوئی بھی صحیفہ قدرت کا قرآن کا پارا ہو نہ سکا

ناموسِ الم کا داغ بنی وہ آہ جو آندھی بن نہ سکی
توہینِ مذاقِ غم ٹھہرا جو اشک شرارا ہو نہ سکا

اے وائے یہ پیہم امیدیں اے وائے یہ پیہم ناکامی
جینا بھی گوارہ ہو نہ سکا مرنا بھی گوارا ہو نہ سکا

اوروں پہ بھروسہ کیا کرتے اوروں کا سہارا کیا لیتے
آغوش میں پالا تھا جس کو وہ دل بھی ہمارا ہو نہ سکا

دیکھا ہے یہ اکثر اے عامرؔ جینے کے فدائی جی نہ سکے
مرنے کی دعائیں کیں جس نے اس کو بھی پیارا ہو نہ سکا

حسن کی بارگاہیں گلی در گلی لالہ و گل کے جلوے چمن در چمن
جنتیں اس جہاں میں بہت ہیں مگر آپ کی انجمن آپ کی انجمن

وقت کی گردشوں کا بھروسہ ہی کیا مطمئن ہو کے بیٹھیں نہ اہلِ چمن
ہم نے دیکھے ہیں ایسے بھی کچھ حادثے کھو گئے رہنما لٹ گئے راہزن

مجھ کو تسلیم ہے اپنی دیوانگی بے سبب تو نہیں میرا دیوانہ پن
دیکھ لیں اٹھ کے اربابِ فکر و نظر زلفِ جاناں ہے کتنی شکن در شکن

چند فرضی لکیروں کو سجدے نہ کر چند خاکی حدوں کا پجاری نہ بن
آدمیت ہے اک موجۂ بیکراں ساری دنیا ہے انسانیت کا وطن

کتنے شاہیں بسیرے کو ترسا کیے باغ پر چھا گئے کتنے زاغ و زغن
کتنے اہلِ وفا دار پر چڑھ گئے کتنے اہلِ ہوس بن گئے نورتن

صرف شہرِ سیاست کا ماتم نہیں ہر نگر ہر ڈگر ایک سا حال ہے
کتنی قبروں پہ چڑھتی رہیں چادریں کتنے لاشے پڑے رہ گئے بے کفن

درد پہلے تو کچھ روز دل میں رہا پھر جو پھیلا تو جزوِ لہو بن گیا
اب رگ و پے میں ہے صرف دل میں نہیں دھیمی دھیمی خلش ہلکی ہلکی چبھن

اجنبی جانئے غیر گردانیے اب نہ پہچانیے یہ الگ بات ہے
آپ ہی کی اداؤں کے مارے ہیں یہ آپ جن خستہ حالوں پہ ہیں خندہ زن

دیجیے ترکِ تقویٰ کا طعنہ مگر شیخ کا حسنِ تاویل تو دیکھیے
جب قدم زہد کے ڈگمگانے لگے رکھ دیا حسن کا نام ایماں شکن

ان چراغوں کی تھوڑی سی لو کاٹ دو ان چراغوں سے اٹھنے لگا ہے دھواں
غنچہ و گل کا دم گھٹ نہ جائے کہیں بچ گئی ہے فضا بڑھ گئی ہے گھٹن

عشق جانباز ہے خیر سر تو نہیں محفلِ حسن میں سر اٹھائے گا کون
گرم بازارِ طوق و سلاسل کرو دیکھنا ہو اگر عشق کا بانکپن

بزم میں ایک جوئے رواں ہے جنوں، رزم میں ایک برقِ تپاں ہے جنوں
یہ تماشا ہے عامر جنوں تو نہیں مچ گئی ہاؤ ہو پھٹ گئے پیرہن

خزاں بدل کے نئے روپ بار بار آئی ۔۔۔ یہاں تو خواب ہی دیکھا کیے بہار آئی

کہیں سے آئی تو دل سے صدائے یار آئی ۔۔۔ کہاں کہاں مری دیوانگی پکار آئی

مزاجِ حسن کی بے اعتباریاں نہ گئیں ۔۔۔ وفا تو عشق کی بازی میں سر بھی ہار آئی

ابھی تو پچھلی بہاروں کے زخم تازہ ہیں ۔۔۔ کوئی بچاؤ کہ پھر باغ میں بہار آئی

جو سجدہ خاص امانت تھا پائے جاناں کی ۔۔۔ ہوس اسے بھی درِ غیر پر گذار آئی

کوئی خوشی کبھی پہنچی جو دل کی دنیا تک ۔۔۔ غموں کی ایک نئی انجمن سنوار آئی

یہ اور بات ہے مینا میں کوئی بوند نہ تھی ۔۔۔ یہاں بھی جام کی گردش تو بار بار آئی

ستم ظریفیٔ فطرت کی داد دیتا ہوں ۔۔۔ اجڑ چکا مرا گلشن تو اب بہار آئی

گذر گئی جو گذرنی تھی کچھ بھی یاد نہیں ۔۔۔ یہ یاد ہے کہ تری یاد بار بار آئی

کبھی جو دل نے اٹھایا سوالِ ترکِ وفا ۔۔۔ نئے لباس میں سج بن کے یاد یار آئی

بہار جیسے چمن میں گئی تو تھی عامر
خزاں کا رنگ اڑا تھا اسے نکھار آئی

تمہیں تو کیا وہ تمہاری جھلک بھی پا نہ سکے
جو خونِ دل سے چراغِ طلب جلا نہ سکے

گلہ ہی کیا ہے اگر غیر کام آ نہ سکے
خود اپنے اشک بھی دل کی لگی بجھا نہ سکے

نہیں کہ جادۂ عیش و نشاط پا نہ سکے
مگر ہم اپنا مذاقِ نظر گرا نہ سکے

وفا کی راہ میں وہ دو قدم بھی جا نہ سکے
جو خود کو گردِ رہِ آرزو بنا نہ سکے

وہ کیا طلسم تھا، وہ کیسی انجمن تھی کہ ہم
پلٹ کے آئے تو اپنے کو ساتھ لا نہ سکے

فغاں کہ موجبِ قہر و عتاب ٹھیرے ہیں
وہ چند لفظ جو میری زباں پہ آ نہ سکے

بھٹک گئے ہیں نہ جانے کہاں مہ و خورشید
بہت دنوں سے مرے گھر کی راہ پا نہ سکے

جو دے رہی ہے ہمیں جام بے طلب دنیا
طلب کریں تو یہی زہر بھی پلا نہ سکے

وفا کی راہ میں سب کچھ لٹا دیا ہم نے
وہاں یہ عذر ہے اب بھی کہ آزما نہ سکے

نصیبِ عشق تو دیکھو سما گئے دل میں
وہی جو وسعتِ افلاک میں سما نہ سکے

حیاتِ شوق بھی اک سجدۂ مسلسل ہے
سرِ نیاز جھکایا تو پھر اٹھا نہ سکے

انھیں فروغِ گلستاں سے کیا غرض آدمیت
بھری بہار میں جو پھول مسکرا نہ سکے

مری نظر میں وہی سر ہے سر جسے عامرؔ
زمانہ کاٹ تو ڈالے مگر جھکا نہ سکے

پیغام

یا رنج و بلا کا خوف نہ کر یا نام نہ لے آزادی کا
جب ولولۂ پرواز نہیں الزام نہ لے آزادی کا

آزادی کو تلواروں کی آغوش میں پالا جاتا ہے
آزادی کو بربادی کے سانچوں میں ڈھالا جاتا ہے
میدانِ وفا میں جینے کا ارمان نکالا جاتا ہے
غیرت کے سنہری پرچم کو سر دیکے سنبھالا جاتا ہے

یا فلسفۂ لَا تَحْزَنْ کی تاویل نہ کر شمشیر اٹھا
یا اپنے سرِ ناکارہ سے یہ تہمتِ دار و گیر اٹھا

ریائے سکون و راحت میں طوفان ہزاروں آئینگے
ستی کے مسرت خانوں پر تیغوں کے علم لہرائیں گے
اں باپ کی آنکھوں کے آگے اولاد کے سر کٹ جائینگے
اربابِ وطن کے شیون سے دل لرزینگے تھرائینگے

گم ہوں گے کتابِ ہستی سے ایمانؔ وفا کے افسانے
خود شمع بجھانے کی خاطر یلغار کریں گے پروانے

کٹ جائے گا سینوں میں پرچم خنجر کی چمکتی دھاروں کا
پی پی کے لہو انسانوں کا سنّاٹا بیگا جی تلواروں کا
پُرسانِ اَلم ہوگا نہ کوئی مردوں کے سوا بیماروں کا
چھپ جائیں گے ڈر کر شمس و قمر رُخ زرد پڑیگا تاروں کا

ہر گام پہ توپیں گرجیں گی ہر بام پہ گولے برسیں گے
ہر شاخ جلا دی جائے گی ہر نخل پہ اولے برسیں گے

بڑھنا ہے اگر اس میداں میں ہر غم کو بھلا کر آگے بڑھ
ایمان و یقیں کی قسمت کی تحریر مٹا کر آگے بڑھ
آہنگ نفس سے غلغلۂ تکبیر اٹھا کر آگے بڑھ
اپنے ہی دھڑکتے سینے پر اک زخم لگا کر آگے بڑھ

وہ نعرۂ گردوں نور لگا قیصروں کے بھی سینے پھٹ جائیں
ہر جنبشِ چشم ابرو سے شیطان کے لشکر کٹ جائیں

مانا کہ بساطِ عالم پر مجبور ہے تو لاچار ہے تو
باطل کے عساکر کے آگے ٹوٹی ہوئی اک تلوار ہی تو
آباد ہیں وہ، برباد ہے تو، زردار ہیں وہ، نادار ہے تو
وہ روئے زمیں کے مالک ہیں اور دوشِ زمیں پر بار ہی تو

لیکن یہ جہاں سب تیرا ہے تاریخ سلف دہراتا چل
ایمان و عمل کے بربط پر اسلام کا نغمہ گاتا چل

شاہنامۂ اسلام

کے

چند صفحات

۷۸۶

آغاز[۱]

تعالی اللہ کیسی رات ہے کتنا اندھیرا ہے — زمانے بھر کو ہیبتناک تاریکی نے گھیرا ہے
سیہ گھنگور بادل چھا گئے ہیں بزمِ ہستی پر — ردائے تیرگی پھیلی ہے انسانوں کی بستی پر
بڑی پرہول گہری ظلمتوں میں گم ہیں نظارے — بساطِ چرخ پر روشن ثوابت ہیں نہ سیارے
سیاہی ایک بحرِ بیکراں معلوم ہوتی ہے — فضا سرتا قدم یکسر دھواں معلوم ہوتی ہے
اُجالے سو گئے ہیں وقت کی آرام گاہوں میں — ہزاروں قافلے بھٹکے ہوئے پھرتے ہیں راہوں میں
اسیرِ خوابِ غفلت ہیں جنھیں شمعیں جلانی تھیں — ہارف ہیں بے نگاہی کا جنھیں راہیں دکھانی تھیں

کہیں دیپک اگر بھولے سے کوئی ٹمٹماتا ہے
اندھیرا اور گہرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے

مری دیوانگی دیکھو کہ اس بے پار ظلمت میں — ہلاکت خیز و ہمت آزما صحرائے وحشت میں
بنامِ ربِّ کعبہ ایک مشعل لے کے نکلا ہوں — بہت چھوٹی سی شمعِ نامکمل لے کے نکلا ہوں
بہت دھیمی بہت نازک بہت کمتاب مشعل ہے — مفصل ظلمتوں کی وسعتوں میں نورِ مجمل ہے
نہ اس میں اتنی تابش ہے کہ راہیں جگمگا اٹھیں — نہ یہ اتنی منور ہے کہ جلوے مسکرا اٹھیں
نہ بل بوتا ہے اس میں آندھیوں کی چوٹ سہنے کا — نہ دم ہے اسمیں طوفانوں میں جلوہ بار رہنے کا

مگر اس سے کوئی اک راہ رو بھی راہ پا جائے
تو شاید عرصۂ محشر میں میرے کام آجائے

---

[۱] ابتدائے کلام یہ تاثر محض شاعری نہیں۔ بلکہ حقیقتاً شاہنامے کی تالیف میں ان کی حیثیت سنگِ بنیاد کی ہے۔

مقلد ہوں حفیظِ خوش بیاں کے شاہنامے کا — بہت نازک مراحل ہیں قدم رکھنا ہے خامے کا
کہاں وہ بے بدل فنکار سوز و ساز کا ماہر — کہاں یہ ناکس و بے مایہ بے علم و ہنر عاصر
کہاں وہ غزوۂ بدر و اُحد بے مثل و بے ہمتا — کہاں افسانہ پس ماندہ غلامانِ محمدؐ کا
مگر پھر بھی نہ جانے کیوں زباں بیتاب ہے میری — جنوں پیدا ہے میرا فغاں بیتاب ہے میری

نہ زعمِ علم و دانائی نہ دعوائے سخن مجھ کو
اُبھارے جا رہی ہے ایک پوشیدہ لگن مجھ کو

لگن جو دھیرے دھیرے آگ بنکر دل میں جلتی ہے — لگن جو چپکے چپکے روح کا دامن مسلتی ہے
لگن جو چٹکیاں لیتی ہے صبح و شام سینے میں — لگن جو خون کھولاتی ہے دل کے آبگینے میں
لگن جو پھانس بن بنکر کھٹکتی ہے رگ و پے میں — لگن جو گونجتی ہے بے صدا فریاد کی لے میں
لگن جو جھانکتی ہے غرفۂ بامِ محبت سے — لگن جو کھیلتی ہے جلوۂ حسنِ حقیقت سے
لگن اک سوزِ باطن، جذبِ پنہاں، رنگِ نادیدہ — لگن اک نغمۂ بے ساز و لعلِ ناتراشیدہ
لگن جس کا بیاں الفاظ کی قدرت سے باہر ہے — لگن جس کی حقیقت نطق و گویائی سے برتر ہے
تصور میں ہیں میرے چند عبرت ناک افسانے — بہت نادر بہت کمیاب سچے پاک افسانے
وہ افسانے غلافِ کعبۂ دل جن کا دامن ہے — بڑائی جن کی ثابت ہے صداقت جنکی روشن ہے
وہ افسانے حدِ معراجِ آدم باز ہے جن پر — جمالِ شاہدِ انسانیت کو ناز ہے جن پر
وہ افسانے جو طوفاں بھی ہیں بادِ صبح گاہی بھی — منور جن کے پرتو سے فقیری بھی ہے شاہی بھی
وہ افسانے لبِ تاریخ جن کو پیار کرتا ہے — رُخِ ایمانؐ اخلاص و یقیں جن سے نکھرتا ہے
وہ افسانے جو دینِ حق کا معیارِ مکمل ہیں — شبِ آلام سے جو گل ہو نہیں سکتی وہ مشعل ہے
وہ افسانے جو فطرت کی انگوٹھی کا نگینہ ہیں — جو قصرِ زندگی کی آخری منزل کا زینہ ہیں

وہ امنت نہاوداں، محکم، ہنرمند، پاک افسانے
مقدس، محترم، لاریب، حیرتناک افسانے

فریاد

اے ماہِ عرب اے نورِ عجم اے ختمِ رسل اے شاہِ امم
پامال و پریشاں امت پر کب ہوگی نگاہِ لطف و کرم
اس تیرے تغافل کے صدقے لائق تو نہیں انعام کے ہم
اتنا ہی مگر احسان سہی رہ جائے سیہ بختی کا بھرم
اے مخزنِ رحمت ابرِ کرم اے نورِ مجسم حسنِ اتم
ادنیٰ سا تصرف کافی ہے پھر کیسی فغاں پھر کس کا الم
مایوس نگاہوں سے کب تک یہ منظرِ عبرت دیکھیں ہم
اک دیر بنا تعمیر ہوا اک ٹوٹ گئی دیوارِ حرم
طوفاں ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں کشتی ہے کہ ڈوبی جاتی ہے
محرومِ عمل ملاحوں میں طاقت ہے نہ بل ہمت ہے نہ دم

ہیں خوف کی شدت سے لرزاں مشہور تھی جن کی بیباکی
ہیں پست و ذلیل و خوار و زبوں مشہور تھا جن کا جاہ و حشم

جن پاک سروں کی عظمت سے اعزاز ملا سرداری کو
اک لذتِ فانی کی خاطر وہ سر ہیں درِ اغیار پہ خم

معمار تھے جو مستقبل کے روتے ہیں گزشتہ عظمت کو
بیباک تھی جن کی بت شکنی ہنستے ہیں انھیں پتھر کے صنم

جو مال و متاعِ دنیا کو تحقیر سے دیکھا کرتے تھے
اُن شیر دلوں کی اولادیں ہیں عاشقِ حسنِ دام و درم

دل ہو بھی چکا ٹکڑے ٹکڑے حد ہو بھی چکی بربادی کی
کمزور کہاں تک جھیلیں گے اپنوں کی جفا غیروں کے ستم

بس ایک اشارہ نازک سا بس ایک توجہ ہلکی سی
پھر تیری نظر کے سنتوں کو کس چیز کا ڈر کس بات کا غم

اے نجمِ سحر! ہے عامر بھی شیدائے جمالِ نادیدہ
شاید کہ تجھے رحم آ جائے فریاد ہے لب پر آنکھ ہے نم

حمد

جس طرف نظر اٹھی، تو ہی تو نظر آیا
بھولتا سا جاتا ہوں، دیر کیا حرم کیا ہے
تیری ہر مشیت پر، دل کو مطمئن پایا
میں نشاط کیوں ڈھونڈوں، غم ملے تو کیا غم ہے

وہ درد و کرب ہو یا زخم خونچکاں اے دوست
مجھے تو مفت ہے جو کچھ بھی دے دیا تو نے
یہ کم نہیں کہ توجہ تو ہے مری جانب
زہے نصیب مرا امتحاں لیا تو نے

نتیجۂ فکر — مولانا عامر عثمانیؒ

عمر گذری ہے اسی فکر میں اے شاہِ امم
ایک ہی شعر تری شان کے قابل ہو جائے
پیکرِ جرم و خطا نام ہے جس کا عامر
وہ غلاموں کی کسی صف میں تو شامل ہو جائے

معتبر کچھ بھی نہیں زہد، نہ تقویٰ نہ وفا
ان کو جب تک تری تصدیق نہ حاصل ہو جائے
یوں تو ہر چیز سے اونچا ہے محبت کا مقام
شرط یہ ہے تری تائید بھی شامل ہو جائے

ادب

قلم کی شوخیاں بھی

اپنا ایک منفرد مقام

رکھتی ہیں

نمونے کے طور پر

ہم

ستمبر ۷۳ء کا

یہ

آغازِ سخن پیش کر رہے ہیں

کبھی کبھی تو ان خطوط کو پڑھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں جن میں تجلی کے قارئین محترم کی طرف سے رسالہ نہ پہنچنے پر احتجاج کیا جاتا ہے۔ شدید انتظار، تڑپ شکوہ، فریاد، غصہ اور جھلاہٹ کیا نہیں ہوتا ان میں۔ یہ سارے جذبات و کیفیات ظاہر ہے کہ مظہر ہوئے ہیں اس گہرے تعلق اور والہانہ وابستگی کا جسے تولا یا ناپا نہیں جا سکتا۔ بس محسوس کیا جا سکتا ہے آنکھوں کی نمی کو جذبۂ شکر کی نمود کہہ لیجئے۔ شکر اس خدائے رؤف و رحیم کا جس نے ایک ہم جیسے بے بضاعت گی کاوشوں کو ہزاروں بندگانِ خدا کی نظروں میں محبوب بنایا ورنہ کہاں ایک خشک دینی و علمی پرچہ اور کہاں یہ ناقابلِ قیاس مقبولیت، مقبولیت کا احساس اس وقت خاص طور پر ہوتا ہے جب پرچہ غیر معمولی طور پر لیٹ ہو جاتا ہے اور صدہا خطوط ساون کی جھڑی کی طرح برستے ہیں

ایمان نمبر بھی لیٹ ہوا۔ کہانی سننے کی ہے بشرطیکہ آپ "عذر گناہ بدتر از گناہ" والی کہاوت کو بے محل استعمال کرنے کے عادی نہ ہوں

بجلی کا رونا پرانا ہو چکا ہے۔ اب تو یہ ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں زیادہ ذکی الحس قارئین یہ بدگمانی نہ فرمانے لگیں کہ تجلی والوں نے "بجلی" ہماری چڑ بنا لی ہے۔ پھر بھی سچ تو سچ ہی ہے۔ ایمان نمبر کی کاپیاں جولائی کے پہلے ہفتہ میں پریس جانی شروع ہو گئی تھیں اور پوری توقع تھی کہ اعلان کے مطابق تیسرے عشرے میں ہدیۂ ناظرین کر دیا جاتا لیکن وسط جولائی سے بجلی کا حال اتنا سقیم ہوا کہ ناگفتہ بہ سے بہتر لفظ اس کے لئے کوئی نہیں ملتا۔ دس منٹ رہی۔ دو گھنٹے کو بھاگ گئی۔ نہ دن میں تسلسل نہ رات میں۔ ایک منزل کتابت شدہ کاپیاں جمانے کی ایسی بھی آتی ہیں جس میں

بجلی کا دفعتاً بھاگ جانا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے آپریشن کے دوران گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ اس حادثے سے کسی لکھائی کاپی مکمل طور پر برباد بھی ہو جاتی ہے اور ناقص تو بہر حال ہوتی ہی ہے۔ اس بار بھی یہ حادثہ پیش آ کر رہا اور مالی نقصان سے کہیں بڑھ کر وقت کے ضیاع نے صبر و سکون کی چولیں ہلا دیں۔

بجلی کی بدترین حالت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ دیوبند کے سرد مزاج عوام بھی آخر کار تنگ آمد بجنگ آمد کی سطح پر آ ہی گئے اور شروع اگست میں وہ طوفان برپا ہوا کہ بعض عالی مرتبہ شہزادوں کو بھی خوابِ خرگوش سے چونکنا پڑا۔ پہلے تو جلوس نکلا۔ کچھ توڑ پھوڑ ہوئی۔ کوئی پٹ بھی گیا۔ پھر مین کھیل اور سقانے کی ناک کے نیچے جلسہ ہوا جس میں گرما گرم تقریروں کے بعد چار افراد نے اعلان کیا کہ وہ بھوک ہڑتال پر بیٹھ رہے ہیں۔ پھر وہ بیٹھ بھی گئے۔ ساتھ ہی شہر گیر ہڑتال بھی ہوئی۔ تار اور فون کھڑکے۔ مدرسہ دارالعلوم دیوبند نے بھی احتجاجی جلسہ کیا اور لوگ کتنی دن اِدھر اُدھر بھاگے دوڑے۔

بات یہ ہے کہ بجلی کی پیداوار کم ہو تو یہ ایک معقول عذر ہو سکتا ہے لیکن معقولیت اور سرکاری انتظامیہ میں شاید اب بیر ٹھن گیا ہے۔ کبھی دیوبند چھوٹا سا تھا۔ بجا طور پر اسے بجلی کے محکمے نے "دیہات" کی فہرست میں شامل کر رکھا تھا۔ پھر یہ پھیلتا گیا۔ بڑھتا گیا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ دو دو تصنیف بیسیوں کارخانے سینما، فوگر میل، موٹریں، بلڈنگیں۔ سب کچھ وہ جس سے کوئی بستی "شہر" کا عنوان پاتی ہے۔ مگر سرکاری عینک ہی دوسری ہے۔ وہ اس طرح کی تبدیلیاں محض تفریحاً دیکھ سکتی ہے ان سے

مناسب تاریخ اخذ نہیں کر سکتی۔ اگر کر سکتی تو متعلق محکمہ کو خود ہی سابقہ تقسیم درجات پر نگاہ ثانی کر کے دیوبند کو شہروں کی فہرست میں لے لینا چاہئے تھا مگر خدا نہ کرے وہ ایسے سعادت مند کیسے ہو جائے غضب تو یہ تھا کہ نہ کوئی اعلان نہ اطلاع۔ جب جس وقت چاہا کرنٹ دبا لیا۔ آج دن میں آٹھ گھنٹے غائب رہی تو کل رات میں غائب ہو جائیگی غائب اور حاضر کی گردان بھی عجیب سے عجیب تر جیسے کوئی شریر بچہ مین سوئچ پر بیٹھ کر کھلنڈریاں کر رہا ہو کہ کبھی سوئچ نیچے کیا کبھی اوپر۔ یہ ستم ظریفی نہ ہوتی تو دیوبند کے بر طبیلے عوام شاید اس پر بھی صبر کر لیتے کہ آٹھ یا دس گھنٹے ہی انہیں بجلی میسر آتی رہے۔ تسلسل کی صورت میں کوئی توڑ معاک کا پروگرام بن سکتا تھا۔ لیکن آنکھ مچولی نے کتنی ہی مشینوں کے متعدد پرزے خراب کئے اسلامی پریس کو بھی کئی بار صدمہ پہنچا۔ ہڈیاں ٹوٹیں اور مرہم پٹی کرانی پڑی۔

بھوک ہڑتال سے پچاس آدمی بھی انتقال کر جائیں تو ہماری شاندار انتظامیہ کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ سکتی بشرطیکہ اسے یہ اطمینان ہو جائے کہ خود اس کے ہاتھ پیر سلامت رہ جائیں گے خیر و عافیت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ اسکول کالج کے لڑکوں نے ابتدائی ریہرسل ہی میں کچھ شیشے وغیرہ توڑ کر اور ایک "غریب" کو پیٹ کر بڑا پُرجوش آئندہ تاثر دیا اور بالکل توقع نہیں کی جا سکتی کہ ستم ظریفی کی اگر یہی روش جاری رہی تو یہاں بجلی کے کھمبے اپنے پیروں پر کھڑے رہ سکیں گے۔

مآل کار دو ہی تین روز میں خواجگان وقت کو محسوس کرنا پڑا کہ دیوبند ماشاء اللہ دودھ پیتا بچہ نہیں رہا۔ داڑھی مونچھ نکلنے لگی ہے خیریت اسی میں ہے کہ اسے "دیہات" سے خارج کر کے "شہر" میں داخل کر دیا جائے اور جو سلوک آس پاس کے شہروں سے ہو رہا ہے یہی اس سے بھی ہو۔

یہ داستان ابھی آگے بھی جاتی ہے۔ مگر بیچ میں رُک کر ذرا دہ مزید افتاد بھی زیب سماعت ہو جائے۔ جس نے "ایمان نمبر" کو اور زیادہ لیٹ کیا۔ نمبر یکم اگست کو پوسٹنگ کے لئے تیار تھا۔ لیکن ریل والوں نے کہا کہ بھائی ایسی بھی کیا جلدی ہے ہمیں بھی تو ہڑتال کر لینے دو۔ بس پھر ایک دو کو چھوڑ کر ساری گاڑیاں جامد ہو گئیں۔ دیوبند سے ڈاک پہلے سہارنپور جاتی ہے وہاں سے اِدھر اُدھر بٹتی ہے۔ سہارنپور تک پہونچنے کے لئے ڈاکخانے والوں نے بس کا سہارا لیا اور ہمیں چند روز اس انتظار میں رُکنا پڑا کہ ریل شاید آج کل میں کھل جائے۔

مگر تقدیر بہرحال تقدیر ہے۔ جب ہڑتال ختم ہونے کے آثار نظر نہ آئے تو ڈاکخانے والوں نے منظور کیا کہ تجلی کو تھوڑا تھوڑا کر کے بس ہی سے ڈھو دیں گے۔ بچارے کرتے بھی کیا۔ بس میں ریل جیسی گنجائش تو ہوتی نہیں۔ اندر سواریاں، اوپر سامان۔ مشکل سے تین چار بورے روز جا سکتے تھے۔ خدا انہیں خوش رکھے نخرے تو نہیں دکھاتے۔ مگر پوسٹنگ کی تکمیل میں تقریباً دس دن ضرور لگ گئے۔ کہیں کہیں تو یہ نمبر ۱۷ اور ۱۸ اگست کو پہنچا ہوگا حالانکہ یکم اگست تک مکمل ہو گیا تھا۔

اور سنئے۔ کہاوت ہے کہ مرتے کو مارے شاہ مدار۔ وہ بنڈل جو ریل سے جانے کو تیار پڑے تھے بلکہ کچھ تو اسٹیشن بھی جا چکے تھے کہ

دلفتنا اسٹیشن والوں نے بشارت دی کہ بس ہلک بوڈنگ بند ہے لمبی تان کر سو جاؤ اب گویا وہ گاڑیاں بھی جو ہڑتال کی زد سے بچی ہوئی تھیں ہمارے لئے کالعدم ہوگئیں۔ حساب لگا کر دیکھا کہ ریل کے بجائے ان بنڈلوں کو کھول کھال کر ڈاکخانے سے روانہ کیا جائے تو کیا خرچ آتا ہے۔ جواب نکلا کہ تقریباً پانچ گنا۔ ظاہر ہے۔ یہ بنڈل ایجنٹوں کے لئے تھے اور ایجنٹ پر فاضل خرچ پڑجاتے تو غضب کماتے گا کیا۔ خود ادارہ یہ سارا خرچ اٹھا لیتا اس میں بھی معقولیت نہیں تھی۔ معقولیت اس لئے نہیں تھی کہ گھاس سے یاری کرنے والے گھوڑے زندہ کتنے دن رہ سکتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ بعض اور مظلوموں کی طرح تجلی کو بھی خون کے آنسو رونے پڑیں اور اپیلیں شائع ہوں کہ خدارا واجب رقمیں جلدی بھیجو ورنہ ہمارا بیڑا غرق ہو جائیگا۔

آیئے پھر تجلی کی طرف۔

آٹھ دن تو ٹھاٹ باندھ دیئے۔ جو بیسوں گھنٹے بجلی آرہی ہے۔ کسی وقت بھاگی بھی تو فوراً لوٹ آئی جیسے کوئی ڈنڈا لئے سر پر کھڑا ہو۔ ہم نے سوچا چلو دیوبند کے دن پھرے۔ اب تجلی بھی وقت پر نکل سکے گا۔ ۱۸ر اگست کو دسمبر کے زیر دست شمارے کی پہلی کاپی چھپنی شروع ہوگئی مگر ملک کی رفتار کو خدا سلامت رکھے۔

پھر وہی ہم ہیں وہی بادیہ پیمائی ہے

اب جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں رفتہ رفتہ مریضہ کا پھر ویسا ہی حال ہوتا جا رہا ہے۔ جیسا پہلے تھا۔ انیس بیس کا فرق ہو تو ہو۔ ہمارا دوپہر کا سونا بہرحال ختم مشین کا پہیہ پھر اسی نہج پر آگیا۔ پتا نہیں دیوبند پھر دیہات میں چلا گیا ہے یا الیکٹرک مشینیں ہی چلتے چلتے تھک گئی ہیں۔ تھکنے تک تو غنیمت ہوگا۔ سستا کر پھر تازہ دم ہو جائیں گی مگر بعض راوی یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ بوڑھی ہوگئی ہیں۔ بڑھاپے کی شان ہی الگ ہے۔ جوانی کس کی لوٹی ہے جو اُن کی لوٹے گی۔ پھر تو اس ساعت سعید کا انتظار کرنا پڑے گا جب وقت کا مغنی یہ پُرسوز آواز میں گائے۔

بس آج چین سے تیماردار سو جائیں
مریض اب نہ کہے گا کہ سحر نہیں ہوتی

کل کیا ہوا ہے خدا جانے۔ فرعونیت کی یہ نرالی قسم ہے کہ محکمۂ برقی کے خداوندان نعمت کسی قسم کی وضاحت بھی نہیں کرتے۔ بجلی کم ہو۔ مشینوں میں ہو یا لنگ بگم ہو۔ اور کوئی افتاد پڑی ہو۔ خیر تو دیں کہ بات یوں ہے۔ توبہ کیجئے۔ ان کی بلا سے کسی پر کچھ بھی گذر جائے۔ نظام احمر ماضی مرحوم کے مطابق کسی پرائیوٹ کمپنی کے ہاتھ میں ہوتا تو یہ سب ممکن نہ تھا۔ خدا رحم کرے قومیانے کے شور فراواں پر۔ اب نظام سرکار عالیہ کے دست نازک میں ہے اور بجلی کے صارفین کی حیثیت گاہک کی نہیں ہے بلکہ غلاموں کی ہے جنہیں اسی طرح جمہوریت کا عذاب جھیلنا پڑے۔

بینک قومیائے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے۔ انھوں نے حکومت کے لئے سونے کے انڈے دینے شروع کر دیئے ہوں مگر ہمیں تو نقد نقصان ہی پہنچا ہے۔ بلٹیوں کی آمد و رفت کے سلسلہ میں ہمیں بسا اوقات بیش آتا رہتا ہے۔ کتنی بار ایسے نقصانات پیش آئے جنھیں بینک والوں کی غفلت اور لاپرواہی کے سوا کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا۔ فریاد کہا کریں۔ کس سے کریں۔ ہر ملازم اپنی جگہ بادشاہ ہے۔ ہیڈ کلرک چپراسی کو ڈانٹنے کی ہمت

نہیں کر سکتا حالانکہ بعض چپراسیوں کی چاق پھرت کا حال خود ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جیسے فرشتہ مغل پر جناب کے پاؤں چھلے جا رہے ہوں منیجر صاحب نام اور تنخواہ کے اعتبار سے بے شک منیجر ہوں مگر آگے نقطۂ اسلام۔ ڈانٹ ڈپٹ تو دور کی چیز ہے نارمل لہجے میں بھی انہیں عجز و انکسار کی ایکٹنگ کرنی از بسکہ ضروری ہے ورنہ وہ خوب جانتے ہیں کہ عملہ کسی بھی وقت جمہوریت زندہ باد اور آزادی پائندہ باد کے نعرے لگا کر انھیں منیجری کرنا اچھی طرح سکھا دے گا!

گیہوں قومیا یا گیا —— برگ و بار ملک کے سامنے ہیں۔ عیاں را چہ بیاں۔ تعلیم بھی قومیائی جا رہی ہے اصطلاحات کے صدقے جایئے۔ شوشلزم۔ فلاحی ریاست عوامی بہبود، ان کی مار سے عوام کی کمر خم ہے اور ہر نیا سورج نئے وساوس و خطرات کو ابھارتا ہوا طلوع ہو رہا ہے۔ عوام بھی کسی سے کم نہیں۔ جب ان میں سے کسی کو کرسی ملتی ہے تو وہ بھی اپنا سارا اگلا پچھلا حساب عوام ہی سے چکاتا ہے۔ دولت عورت شراب اس پراسرار مثلث میں خاندانی منصوبہ بندی والے شرخ تکوں کی طرح تازگی اور نئی آب و تاب آ رہی ہے۔ مولوی۔ صوفی۔ پنڈت، مہاتما سب مفاداتِ عاجلہ اور مال و متاعِ دنیا کے ارد گرد طواف کر رہے ہیں

یہ حالات ایسے تو نہیں کہ آدمی سکون سے اپنا کام جاری رکھ سکے مگر ہم کسی اور طرح سوچتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ رکاوٹیں اور دشواریاں زندگی کا لازمہ ہیں۔ مایوسی کفر ہے پامردی سے جدو جہد میں لگے رہنا ہی ہمارا فریضۂ منصبی ہے۔ نتائج و عواقب مشیت کے اختیار میں ہیں خشک واریوں کا آج کل شمار ہی کیا مگر کارساز حقیقی تو فلاذ میں بھی گلزار کھلا سکتا ہے دل اس مشیت پر صابر و شاکر اور ذہن اس کے فضل و کرم سے پر امید ہو تو اندھیروں میں بھی کرنوں کی بارش محسوس کی جا سکتی ہے۔ جو کچھ بھی ہمیں کرنا ہے بہر حال اسی چند روزہ زندگی میں کرنا ہے — اب بوڑھاپا درد والم کی کنڈی کھٹکھٹا رہا ہے۔ کہاں سے انتظار کا وقت لائیں حالانکہ سدھرنے کی جلد تو کوئی توقع نہیں۔ جب کبھی سدھرے ہماری ہڈیاں بھی خاک ہو چکی ہوں گی۔ پھر کیوں نہ ہم اس ملاح جیسے ہو جائیں جو عین طوفان کے آغوش میں ایک شکستہ سی کشتی پر بیٹھا بے فکری کی تانیں اڑا رہا تھا۔ پوچھا گیا کہ پگلے۔ تم مرنے جا رہے ہو۔ کشتی اب ڈوبی تب ڈوبی۔ یہ لہلہاتا کس خوشی میں ہے؟

ملاح نے جواب دیا — موت زندگی کو ایک پل کی مہلت نہیں دیتی۔ پھر زندگی موت کو اپنا ایک بھی لمحہ کیوں دے۔ جب تک میں زندہ ہوں زندگی میری ہے۔ اس کی خوشیاں اس کی رنگینیاں اس کی موسیقی میری ہے۔ میں آخر سانس تک اس سے لطف اندوز ہوں گا۔ کشتی ڈوبتی ہے ڈوب جائے۔ میں پہلے ہی سے غم کیوں کروں۔

یہ ہے ہمارا اندازِ فکر۔ لہٰذا نوٹ کیجئے کہ اگلے ماہ پھر ایک خاص نمبر آ رہا ہے

نظریۂ ارتقاء نمبر —— جی ہاں اگلا ہی شمارہ بہت زیادہ ضخیم تو نہ ہوگا مگر عام شماروں سے ضخیم ہی ہوگا۔ اکتوبر کے اواخر تک اسے ہم منظرِ عام پر لانے کی کوشش کریں گے۔ نظریۂ ارتقاء ایک خشک فلسفیانہ موضوع

ہے لیکن ہم حتی الوسع اسے پانی میں بھگوئیں گے کم از کم بوریت کی نوبت انشاء اللہ آپ کو نہ آئے گی۔
اپنی عادت کے مطابق دوسرے مضامین بھی اس نمبر میں دیں گے۔ مُلا تو بہر حال جان کا لاگو ہے ہی۔ اسے ہم کبھی کا داغِ مفارقت دے چکے ہوتے مگر ان ہزاروں قارئین کا کیا کریں جن کی دانست میں دسترخوان پر اچار چٹنی کی موجودگی ضروری ہے۔ کبھی کبھی مُلا بہت ہی اوٹ پٹانگ لکھتا ہے لیکن اس کی ناک میں نکیل کون ڈالے۔ جیسے عورتوں کا معاملہ ہے کہ پسلی کے مانند ہیں، سیدھی کرنے کی کوشش کروگے تو توڑ دوگے اسی طرح ملا کی تہذیب و تربیت کم سے کم ہمارے بس کا روگ نہیں۔ جو سنجیدہ حضرات اس بکواس کو دامنِ تجلی کا داغ سمجھتے ہیں وہ اگر اسے گولی مار دیں تو ہم ان کے ممنون ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ رشتے کی باریکیوں کی وجہ سے "خس کم جہاں پاک" پھر بھی نہ کہہ سکیں گے

آج ۲۵ اگست ہوگئی۔ ریلوے نے اب بھی بنڈل لینے سے انکار کر دیا۔ ان مقامات کا لوڈنگ کھلا ہی نہیں جہاں یہ بنڈل آتے ہیں اب سوائے اس کے کیا ہوگا کہ ادارہ ڈاک خانہ کا پانچ گنا محصول برداشت کرے اور مواصلات کے محکمے کو پانی پی پی کر دعائیں دیں۔

بعض سنجیدہ قارئین پسند نہیں کرتے کہ "آغازِ سخن" کے اہم کالم میں ایسے بوگس اور ذاتی موضوعات چھیڑے جائیں۔ ہم ان کی سنجیدگی کو مرحبا کہتے ہیں۔ مگر وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ فرمائیں کہ ادارہ تجلی اور قارئین تجلی ملکر ایک کنبہ بناتے ہیں اور کنبے کے ہر فرد کا حق ہے

کہ ایک دوسرے کے ضروری حالات باخبر رہے۔ اتنے ہزاروں شائقین کو تجلی کے انتظارِ شدید کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر۔ انہیں کم سے کم یہ بتانا تو ہمارا فرض ہے ہی کہ اس تکلیف کی ذمہ داری ہماری غفلت یا تساہل پر نہیں بلکہ ان حالات و حوادث پر ہے جنہیں ہم اور آپ شائستہ الفاظ میں "مشیت ایزدی" کہتے ہیں۔
شکر ہے آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ انتظار کے بعد جو شمارہ قارئین کو ملا ہو اس نے سارا ملال اور ساری کوفت نہ دھو دی ہو۔ ایں ہم بسا غنیمت است۔ اللہ کے خصوصی فضل و کرم کا شکر کن لفظوں میں ادا کیجئے۔ چوبیس سال ہونے کو آئے۔ نہ کوئی خریدار پیسے مارتا ہے نہ کوئی ایجنٹ بد دیانتی کرتا ہے۔ اس طویل عرصے میں چار پانچ ہزار کی اونچ نیچ ہوئی ہو تو وہ قابلِ ذکر نہیں۔ اس کے پیچھے بھی کسی نا بے ایمانی کارفرما نہیں رہی۔ بس حوادث، آفات اور اتفاقات کے تحت کچھ لوگوں سے واجب کی ادائیگی نہ ہو سکی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ خوفناک منزل بہر حال خدائے رؤف و رحیم نے تجلی پر کبھی آنے نہیں دی کہ وہ نادہند۔ ایجنٹوں اور خریداروں کے سلسلے میں آہ دبکا پر مجبور ہو الحمد للہ ثم الحمد للہ۔ اور تحدیثِ نعمت کے طور پر یہ بھی سن لیجئے کہ باوجود ضرورت محسوس کرنے کے وہ تصویر والے اشتہارات اور فیملی پلاننگ یا بینک اور سودی قرضوں سے متعلق اشتہارات کو برملا رد کرتا رہا ہے اور خود حکومت کی طرف سے اشتہار کی پیش کش کے سلسلے میں آنے والے مکتوب کا جواب صاف صاف لکھ دیا گیا ہے کہ مذکورہ قسم کا کوئی اشتہار قبول نہیں کیا جائے گا۔

اسے شیخی یا صالحیت کی نمائش کا نام نہ دیجئے
صالحیت کجا اور ہم جیسا گناہ گار کجا لیکن پڑھا ہے کہ پچھلے زمانے میں چور اور ڈاکو بھی کچھ اصول رکھتے تھے۔ تو کیا ہم چوروں اور ڈاکوؤں سے بھی گر جائیں کہ کوئی اصول ہی نہ ہو۔ بعض کرم فرما کہتے ہیں کہ تم جس جماعت کے گیت گاتے ہو اسی سے متعلق بعض پرچے تصویریں چھاپنے لگے ہیں اور وعورت، ملک میں فیملی پلاننگ کا ترجمان آچکا ہے۔ ان کو ہمارا جواب پہلے بھی یہی تھا اور مرتے دم تک انشاء اللہ یہی رہے گا کہ اپنی جواب دہی ہر شخص کو خود کرنی ہے۔ ہو سکتا ہے ان حضرات کو جواز کی کوئی دلیل مل گئی ہو اور قیامت کے دن خدا کو بھی قائل کر سکیں یا ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس عبادت وریاضت اور حسن عمل کا سرمایہ اتنا زیادہ ہو کہ وہ یوم الحساب سے مطمئن ہو گئے ہوں۔ پھر بھلا ہم جیسا خطاکار اور عبد ذلیل ان کی حرص کس بوتے پر کرے گا۔ انھیں ان کی صواب دید اور طرز فکر مبارک۔ ہم بہرحال طے کر چکے ہیں کہ اصول وعقائد کی قیمت پر پیسہ حاصل نہیں کریں گے چاہے روکھی سوکھی پر بسر اوقات کی نوبت آجائے۔

مری نظر میں وہی سر ہے سر جسے عامر
زمانہ کاٹ تو ڈالے مگر جھکا نہ سکے

تمام حمد اللہ ہی کے لئے ہے اور وہی ہے جو اپنے فضل سے عزم و حوصلہ عطا فرماتا ہے۔ ورنہ مٹھی بھر ہڈیوں کا ڈھیر — انسان — ہے ہی کیا — ہوا کے تنکے کا ایک ہی جھونکا اسے خشک پتے کی طرح ہوا میں اڑا سکتا ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِنْ مَاءٍ دَافِقٍ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ

پس انسان نظر تو ڈالے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے محض ایک حقیر اچھلنے والے قطرے سے جو پیٹھ اور چھاتی کے درمیان سے نکلتا ہے

کچھ ... اور نمونے بھی ملاحظہ فرمائیے

بجلی کا رونا بارہا آپ اس کالم میں سن چکے۔ رونے اگر مجھ سے کام ہو سکتے تو سگریٹ اور چائے کی طرح رونا بھی ہر شخص کے روزانہ کے پروگرام کا جزو لازم ہوتا۔ روتے روتے آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے مگر گردشِ دوراں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔

تاہم اب اطمینان کی بات یہ ہے کہ بجلی کا رونا مقامی نہیں رہا بلکہ تقریباً آل انڈیا پوزیشن اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اخبار میں طبقہ روز ہی پڑھ رہا ہے کہ آج فلاں صوبے میں اور کل فلاں صوبے میں بجلی کی کمی اور بدمزاجی خوب خوب رنگ لا رہی ہے ہم بھی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے اخبار میں طبقے ہی میں شامل ہیں لہٰذا بقول شخصے

مرگِ انبوہ جشنے دارد

مطمئن ہو گئے ہیں کہ:۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

یہ واقعہ ہے مصیبت جب عام ہو جائے تو آدمی کو تنہا اپنی بدقسمتی کا غم نہیں رہتا۔ اسے اطمینان سا محسوس ہوتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ میری طرح دوسرے بھی اسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔

پرچہ اپنے وقت پر تیار۔ مگر بجلی کے نارد ادا دامن پکڑے ہوتے ہیں کہ لاؤ ہمارا بھی خراج دیتے جاؤ۔ کس کی مجال ہے جو خراج ادا کئے بغیر گزر جائے فریاد کیجئے تو کس سے۔ یہ تک پتہ نہیں چلتا کہ آخر وجہ کیا ہے۔ بعض مرتبہ تو ایسا خیال ہونے لگتا ہے کہ شاید موصوفہ کا انتقال ہی ہو گیا۔ مگر پھر مردہ انگڑائی لے کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔ ہم پرچہ لیٹ ہونے کی معذرت کہاں تک کئے جائیں۔ دعا کیجئے مریضہ یا تو شرافت کے ساتھ اللہ کو پیاری ہو جائے یا پھر اسے صحت کاملہ نصیب ہو۔ آمین ثم آمین۔ حسب منشاء

یہ شمارہ ٹھیک وقت پر مرتب ہو کر پریس جا چکا تھا اور ہم توقع کر رہے تھے کہ پہلی یا دوسری نومبر کو سپرد ڈاک ہو جائے گا۔ لیکن تقدیر کے نوشتے اٹل ہیں۔ اکتوبر کے آخری عشرے سے ان سطور کے لکھنے تک یہاں بجلی کا حال کچھ ایسا ہے جیسے مرگی کے مریض پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد دورے پڑ رہے ہوں پریس ابھی چلا اور ابھی رک گیا۔ جو کام ایک گھنٹے میں نمٹ جانا چاہئے تھا وہ چار گھنٹے معلق پڑا ہے۔ طباعت کے پروگرام ہچکیاں لے رہے ہیں۔ نظام درہم برہم ہے۔ شکوہ کریں تو کس کا اور فریاد کریں تو کس سے۔ کچھ دن پہلے یہاں کی بجلی کمپنی سرکاری ملکیت نہیں تھی۔ اس وقت اس پر مرگی یا ہسٹریا کے دورے اس تسلسل کے ساتھ کبھی نہیں پڑے۔ لیکن جب سے اسے قومیا لیا گیا ہے رنگ ہی کچھ اور ہے۔ اب سوشلزم کی برکات پر واہ واہ کے ڈونگرے برسانے کا موقع تو اس مختصر صفحے میں ہے نہیں۔ خلاصہ بس اتنا سمجھئے کہ یہ شمارہ بجلی والوں کی عنایت سے کم و بیش ایک ہفتہ لیٹ ہو گیا۔ یہ ایک ہفتہ اگلے شمارے پر اثر انداز نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے۔ ویسے بھی رمضان المبارک کا آغاز ہو رہا ہے۔ امید نہیں ہے کہ دسمبر کا پرچہ ٹھیک وقت پر پیش کیا جا سکے۔ لہٰذا انسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ شمارے کی طرح اگلا شمارہ بھی دو ماہی بنا کر شروع جنوری میں لایا جائے۔ آپ ہماری معذرت یا ذیوں سے تنگ آ چکے ہیں اس کا ہمیں کافی دنوں سے احساس ہے لیکن یقین کیجئے آپ ہی کی طرح خود ہم بھی اپنی نارسائیوں سے تنگ آ گئے ہیں کوئی نہ کوئی انہونی ایسے آ پڑتی ہے کہ سارا عزم و ارادہ دھرا رہ جاتا ہے۔ پھر بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ زندگی ہے تو دیر سویر ہم اس آ سکے

دن کے اختلال و تاخیر پر انشاء اللہ قابو پا ہی لیں گے۔

اکتوبر و نومبر ۶۹ء

دیوبند کی نیک بخت "تجلی" کا ذکر آپ ان صفحات میں ایک سے زائد بار پڑھ چکے ہیں۔ خیر سے آج پھر اس پر تھوڑا سا بور ہو لیجئے۔

بڑا شور شر مچا۔ جلوس نکلا۔ دھواں دھار بلکہ فلک شگاف تقریریں ہوئیں۔ پھر محکمے کے بعض "اکابر" بھی دیوبند تشریف لائے۔ وعدہ کیا گیا کہ آئندہ شکایت نہ ہوگی۔ مگر "اکابر" کی گاڑی دیوبند کی میونسپل سرحد سے نکلی ہی تھی کہ معمول کے مطابق کرنٹ غائب۔ خیر اس پر تو صبر کر لیا گیا۔ اور خیال کیا گیا کہ "اکابر" جا کر اِدھر اُدھر تک سب کی خبر لیں گے اور انشاء اللہ ثم انشاء اللہ چند روز بعد سے نظام اکدم ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن فلک کج رفتار کی پرانی خصلت کون بدل سکتا ہے۔ ظالم نہ جانے تو کیا چکر چلا یا کہ دنوں پر دن گذرے چلے جا رہے ہیں مگر تجلی کی ادائے خاص میں فرق آ کر نہیں دے رہا ہے۔ "اکابر" کے گرامی قدر وعدے کو خدا جانے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

لوگ کہتے ہیں ــــ اور ہمیں بھی لوگوں ہی میں شامل سمجھئے کہ جب تک "تجلی" قومیائی نہیں گئی تھی اس پر کبھی اس قسم کے دورے نہیں پڑے تھے۔ ابھی چند ہی سال پہلے تک یہ ایک کمپنی کی ملکیت تھی اور کبھی دیوبند کی جنتا نے اس قسم کے عبرتناک نظارے نہیں دیکھے جیسے اب دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ یہ برکت سرکاری نظام کی ہے یہ کہنا تو مشکل ہے کیونکہ سرکاری لوگ ایسی باتوں پر بہت خفا ہوتے ہیں اور بس چلے تو مقدمہ بھی داغ دیتے ہیں لہٰذا کہنا یہ مناسب ہے کہ اہل دیوبند کی قسمت پھوٹ گئی ہے اور پھوٹی ہوئی قسمت کی ذمہ داری کسی طرح بھی سرکار دالا پر ڈالی نہیں جا سکتی۔

بہر حال مقصد اس داستان سرائی کا یہ ہے کہ زیر دست شمارہ بھی تجلی کے فضل و کرم سے تھوڑا لیٹ ہو گیا اور اب ہمارے پاس کوئی علاج اس کے سوا نہیں ہے کہ اگلا شمارہ جولائی کے شروع میں لانے کے بجائے اگست کے شروع میں لائیں اور دو مہینوں کی رعایت سے ضخامت بڑھا دیں۔ اس قسم کی بے ضابطگیاں اگر اپنے تساہل کا ثمرہ ہوں تو بے شک ان پر معذرت خواہی بھی اخلاق کا تقاضا ہوتی ہے لیکن بات جب مجبوری کی آ جائے تو ظاہر ہے کہ نہ معذرت سے فائدہ نہ آنسو بہانے اور سینہ پیٹنے سے حاصل کچھ خبر نہیں کہ تجلی کس مرض میں گرفتار ہے۔ نہ یہ معلوم کہ اس مرض کا کوئی علاج سائنس دریافت کر سکتی ہے یا نہیں۔ مقامی دفتر سے پوچھا تو کہا جاتا ہے کہ "اوپر سے بند ہے"۔ اوپر سے مراد ہوتی ہے ہیڈ کوارٹر۔ ہیڈ کوارٹر ظاہر ہے چاند یا مریخ میں کہیں نہیں بلکہ چند ہی میلوں پر واقع ہے اور بعض لوگ وہاں جا کر پوچھا بھی کرتے ہیں کہ یہ آخر ہو کیا رہا ہے مگر آج تک کسی نے لوٹ کر کوئی واضح اور قابل فہم بات نہیں بتائی۔ مجبوراً شاعر کا شعر یاد آتا ہے۔

محبت معنی و الفاظ میں لائی نہیں جاتی
یہ وہ نازک حقیقت ہے جو سمجھائی نہیں جاتی

ہو سکتا ہے "تجلی بھی محبت ہی جیسے کسی پُراسرار عارضے میں گرفتار ہو لہٰذا آپ سب دعائے صحت کریں۔ ہم تو دعا کرتے کرتے تھک چکے ہیں۔

جون [illegible]

تقدیر کے آگے آدمی بے بس ہے۔ دیوبند میں بجلی کا نظام اب معمولاً یہ ہے کہ سات دن "پاور" کا فیس ملے گا تین دن نہیں ملے گا۔ یاور ہی سے مشینیں چلتی ہیں۔ چار دن میں بھی کئی کئی گھنٹے درمیانی وقفے کے ہیں اور ان متعینہ وقفوں کے علاوہ بلا تعین جس وقت چاہے مشینوں کے پہیے رُک جاتے ہیں۔ یہ تو معمول ہوا۔ دسمبر میں یہ بھی جھیلنا پڑا کہ تین دن تک بجلی کی صورت ہی نظر نہیں آئی کچھ خبر نہیں کس رُخ پر نکل گئی یا چادر تان کر سو رہی اب آپ خود سوچ لیجئے کہ یہ جان لیوا ادائیں ان تمام پروگراموں سے کیا سلوک کر سکتی ہیں جن کا تعلق مشینوں کی گھر گھراہٹ سے ہو دسمبر کا شمارہ اعلان سے آٹھ روز بعد منظر عام پر آسکا۔

اب یہ شمارہ دسمبر میں پریس جا رہا ہے، مگر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب تکمیل کو پہنچے گا۔ مایوسی تو کفر ہے کوشش ہم برابر کرتے رہیں گے کہ نظام الاوقات درست ہو جائے لیکن آپ دعا بھی شاید نہیں کر رہے ہیں۔ دعا کے سوا ہم بندوں کا سہارا ہی آخر کیا ہے۔ اسباب تو مشیت باری کے غلام ہیں۔

جنوری ۶۵ء

اگر لیتھو پریس کی ایک مشین پورے دن چلتی رہی تو تجلی کے ایک عام شمارے کو مکمل کرنے میں اس کے کم و بیش بیس دن لگ جاتے ہیں۔ یہ مشین ظاہر ہے بجلی سے چلتی ہے اور بجلی کا حال ہمارے دیوبند میں کچھ دنوں سے اتنا پتلا ہے کہ شاید دق کے مریض بھی مشکل ہی سے اس کی ہمسری کر سکیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وقفۂ راحت منانا تو خیر پرانی ادا ٹھیری۔ اب جنوری ۶۶ء میں مزید چار چاند لگے کہ مسلسل چار چار اور چھ چھ گھنٹے غائب۔ کبھی تو سولہ سولہ گھنٹے بھی دیدار کے بغیر ہی گذر گئے اور سارا شہر اس اندیشے میں مبتلا ہو گیا کہ غریب کہیں بالکل ہی اللہ کو پیاری تو نہیں ہو گئی۔ تنگ آکر شہر والوں نے جلسے کا ہنگامہ بھی کھڑا کیا۔ سُنا ہے بعض کارخانہ داروں نے تو مقدمے کے نوٹس بھی دیئے ہیں۔ بہرحال وہ تو جو ہوگا سو ہوگا۔ نتیجۃً تجلی کو یہ بھگتنی پڑی کہ پرچہ تیار ہے اور مشین کے پہیے جام پڑے ہیں۔ لیکن یہ تقدیر کچھ صفحات بڑھا کر فروری کی اشاعت بھی جنوری ہی میں شامل کر دی اور چین کا سانس لیا کہ جنوری کے اواخر میں پرچہ منظر عام پر آجائے گا۔ مگر یہ امید بھی بجلی کے شتر غمزوں سے مات کھا گئی اور حاصل یہ ہے کہ پرچہ آپ کو فروری میں مل رہا ہے۔ اب اگر بجلی کو آئندہ توفیق نیک مل گئی تو اگلی اشاعتیں باقاعدہ رہیں گی۔ نہ ملی تو گردش دوراں پر نہ آپ کا بس ہے نہ ہمارا۔ ویسے چند روز سے آثار تو کچھ غنیمت نظر آرہے ہیں۔ آتی ہے تو دیر تک رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحت مستقلہ سے نواز ے۔

جنوری ۶۶ء

خدا کا شکر ہے بجلی کے حال احوال اب ایسے نہیں رہے کہ قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے کی ضرورت ہو۔ بقول میر اب تو نوبت بایں جا رسید

ہم ہوئے تو ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ہاں فرق مراتب بہرحال ہوگا۔ دارالسلطنت میں اندھیر کم، دوسرے شہروں میں اس سے کچھ سوا۔ دیوبند جیسے قصبات میں اس سے کچھ سوا۔ چوبیس چوبیس گھنٹے غائب رہنے کا ریکارڈ تو

بہر حال دیوبند ہی جیسے یتیم قصبوں میں قائم ہو سکتا ہے۔ بڑے شہروں کے باشی حافظ شیرازی کا یہ شعر اچھی طرح سن لیں:۔

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

ایسال نمبر ٹھیک وقت پر ترتیب پا گیا تھا۔ آگے عاقل را اشارہ کافی است۔ بہر حال جس دھرتی پر جنم لیا ہے وہیں کے نرم گرم بھی سہنے ہیں۔ وہیں کے دکھ سکھ بھی جھیلنے ہیں جب بجلی گم ہی اور بدبو دار تیل کے لئے قسمت ماروں کو جوئے شیر کھودنی پڑے تو بجلی بیچاری کا کیا شکوہ جو محبوب کی کمر سے بھی زیادہ باریک ہوتی ہے۔ نظر آنے والی شے ہوتی تو یہ مصرعہ ضرور پڑھتے:۔

کہاں گئی اے مرے محبوب تجھے کس کی نظر؟

تاخیر کو آپ معاف کرتے رہیں تو آپ کی اعلیٰ ظرفی۔ نہ معاف کریں تو ہماری کم ظرفی۔ تجلی بہر حال آپ کا اپنا ہے اپنوں کے ناز اٹھاتے ہی پڑتے ہیں۔ یہ ضرور دیکھئے کہ تاخیر کے باوجود تجلی کا مواد تلافی مافات کرتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کرتا تو اسے چولھے میں رکھنا بہتر ہوگا اور کرتا ہے تو پھر بقول شاعر:۔

جب گلے سے مل گئے سارا گلہ جاتا رہا!

جولائی و اگست ۶۳ء

تمام ضروریات زندگی اپنی قدر و قیمت برابر بڑھائے چلی جارہی ہیں تو کاغذ بیچارہ غافل کیوں بیٹھتا۔ وہ بھی انگڑائی لے کر اٹھا اور اڑان بھری اب سال گذشتہ کے مقابلہ میں ڈھائی گنی بلندی پر ہے۔ اخبارات و رسائل کے قارئین دیکھ ہی رہے ہیں کہ کتنے ہی پرچے اپنی قیمت بڑھانے پر مجبور ہو گئے کتنے ہی نزع میں گرفتار ہیں اور بعض بیچارے تو ہچکی لئے بغیر ہی عالم بالا کو سدھار گئے اب چیخنے رہیے کہ

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آپ سمجھ رہے ہوں گے ہم بھی قیمت بڑھانے کی تمہید گانٹھ رہے ہیں مگر فی الحال ایسا نہیں۔ یہ تمہید ہم نے ایک افتاد کے سلسلہ میں اٹھائی ہے۔ ہوا یہ کہ "نظریۂ ارتقاء نمبر" کی میعی پوسٹنگ کے وقت پیکنگ پیپر بازار سے غائب ہو گیا اور پھر تلاش بسیار کے بعد دوگنی قیمت پر مہیا ہوا تو گھٹیا اور بودا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پوسٹ شدہ پرچوں کے نہ جانے کتنے ریپر راستے ہی میں پھٹ گئے ان پر ہی خریداروں کے پتے کی چٹیں بھی تھیں جب نہ رہیں تو محکمۂ ڈاک اس کے سوا کیا کرتا کہ انہیں ہماری طرف لوٹا دے۔ واپس شدہ پرچوں کی تعداد دو سو سے کم نہ ہوگی۔ روز انہ خطوں کی بھیڑ ہے کہ پرچہ نہیں ملا۔ پرچہ خط ملنے پر دوبارہ تو بہر حال بھیج ہی دیا جاتا ہے لیکن نہ جانے کتنے شریف الطبع اور قناعت پسند قاری ایسے بھی ہوتے ہیں جو یہ تصور کئے رہتے ہیں کہ پرچہ شاید چھپا ہی نہیں پھر کیوں خط لکھ کر ادارے کو شرمسار کیا جائے۔!

ایسے تمام دوستوں سے گذارش ہے کہ وہ دفتر کو خط لکھ کر اپنا پرچہ طلب فرمالیں۔ جب تک ان کا خط نہ پہنچے گا ادارے کو کیسے پتا چلے گا کہ انہیں پرچہ نہیں پہنچا۔

دسمبر ۶۳ء

جولائی کے تجلی میں دیئے ہوئے ضمیمے سے یہ تو آپ جان ہی چکے تھے کہ راقم الحروف والد رحمۃ اللہ علیہ کی شدید علالت کی

خبر پاکر اچانک کراچی روانہ ہوگیا ہے۔ خیال تھا کہ حالت کچھ بھی ہو شروع اگست میں بہرحال واپسی ہو جائے گی اور پندرہ بیس دن اگلے دو ماہی شمارے کی تیاری کو مل جائیں گے قلم اور کاغذ بھی ساتھ ہی لیکر گیا تھا کہ وہاں خالی اوقات میں کچھ کام ہوتا رہے گا اور ممکن ہو تو وہیں سے بذریعہ ڈاک مضامین کتابت کے لئے دیوبند بھیجے جاتے رہیں گے لیکن آدمی کی بے بسی کا کیا ٹھکانا ہے حالات ایسے پیش آتے چلے گئے کہ مضامین تو درکنار ضروری خطوط کے مختصر جوابات تک لکھنے دشوار ہو گئے اور واپسی بجائے شروع اگست کے ۲۸ اگست کو ہوئی۔ گویا جس پرچے کو مکمل ہو کر ۵ ا اگست تک پریس روانہ ہو جانا چاہیئے تھا اسکا کام ۲۰ اگست تک شروع بھی نہ ہو سکا۔ پھر لطیفہ یہ ہوا کہ ہند و پاک دونوں کی سرحدوں پر سرکاری کارندوں نے بالجبر انجکشن لگا دیئے۔ غالباً ادھر ادھر ہیضہ پھیل رہا تھا اسی لئے دونوں نیک دل حکومتوں کے جذبۂ انسان دوستی نے شاید حسبۂ للہ ضروری سمجھا کہ آنے جانے والوں کو حفظ ما تقدم کا سبق پڑھایا جائے۔ عالی ظرفی کی انتہا ہے کہ اگرچہ دونوں حکومتیں بڑھتی ہوئی آبادی سے بری طرح ہول کھائے ہوئے ہیں اور خاندانی منصوبہ بندی کے مشن پر کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ لیکن موجود انسانوں سے دلی ہمدردی کا جذبہ برابر بے چین کئے ہوئے ہے۔ یہ عالی ظرفی منطقی تضاد کی حدوں سے کتنی دور ہے اس نکتہ پر لیڈر ہی لوگ زبان کھول سکتے ہیں عاجز کو تو یہ عالی ظرفی خاصی مہنگی پڑی۔ پاکستانی بارڈر پر جب پاسپورٹ چیک کرنے والوں نے یہ نادری حکم سنایا کہ پہلے انجکشن لگوا یئے بعد میں گفتگو ہوگی، تو سناٹا نکل گیا۔ معلوم تھا کہ یہ انجکشن کالرا کی مدافعت کریں یا نہ کریں مگر چند روز بخار کی نعمت سے ضرور نوازتے ہیں۔ ہاتھ کی اکڑاہٹ الگ رہی۔ غرض کیا کہ بھائی بتاریخ گواہ ہے کبھی کوئی ایڈیٹر کالرا میں نہیں مرا۔ آپ ان بیوی بچوں کو دیکھئے جو ہمارے ساتھ ہیں اگر راستے ہی میں بخار چڑھ گیا تو ان کا کیا حشر ہوگا!

جواب میں توقع تھی کہ ان کے تیور نرم پڑیں گے۔ توقع فی الجملہ پوری بھی ہوئی۔ انکے چہرے پر ایک امید افزا تبسم تحسین کیا، مگر ساتھ ہی ساتھ ایک اور صاحب انجکشن کی سرنج انگلیوں میں تولتے ہوئے آگے بڑھے اور فرمایا گیا کہ انجکشن تو لگوانا ہی ہوگا۔ یہ لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ہم نے مزید منطق لڑائی مناسب نہیں سمجھی کیونکہ جس ملک کی سرحد میں ہم کھڑے تھے وہاں ابھی تک مارشل لا کا طلسم نہیں ٹوٹا ہے اور یہاں کے کسی سرکاری کارندے کے فیصلہ کن قسم کے لہجہ کو منطق کے بل پر چیلنج کرنے کا مطلب خودکشی بھی ہو سکتا ہے مجبوراً آستین سرکاری اور انسانی ہمدردی کی آنچ میں تپتی ہوئی چند بوندیں بازوؤں میں انجیکٹ ہو گئیں۔ انجکشن کا تجربہ پہلے بھی ہوا ہے لیکن خدا جانے یہ سوزن کا نتیجہ تھا یا کالرا کے انجکشن ہوتے ہی اس قسم کے ہیں کہ گھنٹے ہی بھر بعد بازو اکڑنا شروع ہو گیا اور بخار نے بھی قدم رنجہ فرما دیا۔ بچے ساتھ تھے۔ دیوبند سے کراچی اور کراچی سے لاہور تک لمبے سفر میں انھیں پتہ چل گیا تھا کہ سفر کے دوران باپ سے بھی تقریباً تمام ہی وہ خدمات لی جا سکتی ہیں جو عام حالات میں ماں کا حصہ ہیں۔ ابھی سفر ختم نہیں ہوا تھا اس لئے وہ موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے درپے تھے۔ ہم نے اپنی پوری قابلیت انھیں یہ سمجھانے میں صرف کر دی کہ ہمارے ہاتھ میں ہوّے نے کاٹ لیا ہے اور بخار کے باعث ہم تمہاری ناز برداریوں کے قابل نہیں رہ گئے، مگر ان نیک بختوں کی نگاہ میں ہماری قابلیت کا مول دو کوڑی بھی نہ ٹھہرا۔ اس ناقدری کے جواب میں جی تو یہی چاہا کہ فوراً وہی دلیل قطعی استعمال کی جائے جو ہماری حکومتیں کرتی ہیں یعنی طاقت لیکن اس طرح کے موقعوں پر بارہا ایسا ہوا ہے اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا کہ حافظے کی سطح پر ایک پرانی یاد ابھر آئی۔ اللہ کے برگزیدہ رسول ؐ اور نوع بشر کے سب سے معظم انسان کی یاد جسکی پشت پر عین نماز کے عالم میں اسکے ننھے نواسے چڑھ جایا کرتے تھے اور اس کے جواب میں ان نواسوں کو مار یا جھڑکی نہیں ملی پیار ملا، شفقت ملی اور نانے کا تقدس کا تحفہ ملا۔ کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ خیر البشر ؐ کا طاہر و مطہر جسم نواسوں

کے ببول ویرانے سے آلودہ ہوگیا ہے، لیکن رحم و لطافت اور رحمت و شفقت کے اس پیکر مجسم کے روئے مبارک پر تمکنت آمیز تبسم ہی کھلتا رہا۔

اس حسین یاد کے بعد کیونکر ہو سکتا تھا کہ ہم بے قصور بچوں پر غصہ اتارنے لگتے۔ آخر اسوۂ حسنہ کا اطلاق تو سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ایک ہی فعل و عمل پر ہوتا ہے۔ فداہ امی وابی۔ صبر و شکر کے ساتھ نصف قیامت کی جملہ منازل طے کر کے گاڑی میں جگہ حاصل کی اور بخار کے طوفانی حملہ میں پسپا ہوتے ہوئے جسم کو تھوڑا سا سہارا نصیب ہوا۔ دراصل جسمانی تکلیف جھیل جانا زیادہ مشکل نہیں، اصل مشکل تو اس ابھرتے ہوئے سوال میں پوشیدہ تھی کہ آگے کو کیا ہوگا۔ ابھی دو گھنٹے بعد ہندوستانی بارڈر کی نصف قیامت کا سامنا باقی تھا۔ جن لوگوں کو کبھی سفر پاکستان کی سعادت نصیب نہیں ہوئی وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ دونوں بارڈروں کے مراحل طے کرنا کس قیامت صغریٰ کا دوسرا نام ہے اور جب کہ بال بچے بھی ساتھ ہوں تو اس ہفت خواں کو سر کرنے کے لئے کتنی فاضل توانائی درکار ہوتی ہے۔ اس مشت استخواں کے پاس فاضل توانائی تو کبھی رہی ہی نہیں، جو نام چارے کو تھی وہ کراچی جاتے ہوئے موسم کی شدت نے مجروح کی، پھر والد رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت نے اسے جھنجوڑا، پھر واپسی کے تعاقب میں اس کی جولیں ہیں اور باقی ماندہ بخار کی زد میں تھی۔

آپ کہیں گے معمولی بخار کو اس بزدل نے افسانہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ ذرا ان حالات کا تصور کر کے دیکھئے جن کا ہم اس وقت شکار تھے۔ قلیوں کی قومی خصوصیات سے آپ ضرور آگاہ ہوں گے۔ ان کی ترک تازیاں ان سرحدی حصاروں میں دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ دو روپے کا کام کر کے کہیں گے صاحب! کام تو زیادہ کا تھا چلئے آپ بارہ دے دیجئے۔ اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو کام سے پہلے ہی دو ٹوک معاملہ طے کر لینا چاہتے ہیں تو یہ نئے نخت اس انداز سے آپ کے سامان کا جائزہ لیں گے جیسے کوئی سی آئی ڈی آفیسر چوری یا سمگلنگ سے مال کا جائزہ لیتا ہے۔ پھر پُراسرار قسم کی اہمیت کے ساتھ کہیں گے کہ چلئے ہم سارا کام ٹھیک ٹھاک کرائے دیتے ہیں، دس روپے دیجئے گا۔ گویا چیکنگ کے آغاز سے لے کر انجام تک سارے مراحل یہی اپنی عنایت سے طے کرائیں گے اور انھوں نے نہ کرائے تو آپ عمر بھر یہیں پڑے رہیں گے۔

مہلت ہوتی تو ہم وہ سارے مکالمے آپ کو سناتے جو اس سفر میں قلیوں سے پیش آئے۔ لیکن بات مختصر کہنی ہے اس لئے تفصیلات کا اندازہ آپ ہی پر چھوڑتے ہیں۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ امرتسر پہنچنے تک بخار ہمیں بھی منجملۂ سامان بنا چھوڑتا اور قلی حضرات بکسوں اور بستروں کے ساتھ ایک زندہ لاش بھی اٹھانے کی خدمت انجام دیتے تو ان کا حسن طلب کیا کیا گل نہ کھلاتا اور برقعے میں لپٹی ہوئی ایک مشرقی خاتون کتنی کچھ پریشان نہ ہوتی۔

ہم نے اہلیہ سے عرض کیا کہ دیکھو آج تک تو ہم تمہاری مشرقیت پر ناز کرتے رہے ہیں، لیکن اگر بخار نے ہمیں بیہوش یا نیم بیہوشی کی منزل تک پہنچا ہی دیا تو تمہیں مشرقیت کی چولی اتار پھینکنی ہوگی۔ ایک مجاہدہ کی طرح آنے والی نصف قیامت کے لئے تیار رہو اور خوف کو پاس نہ پھٹکنے دو وغیرہ وغیرہ۔

یہ وغیرہ وغیرہ یونہی نہ سمجھئے۔ واقعی ہم نے اور بھی بہت کچھ وصیت کی تھی کیوں کہ ہم محسوس کر رہے تھے کہ رگ و پے میں دوڑتی ہوئی چنگاریاں تیزی سے شعلہ بنتی جا رہی ہیں، اور بدن کا ایک ایک جوڑ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا ہے۔ لیکن اللہ کے فضل و رحمت کا کیا جواب ہے کہ اس نے بخار کو خوفناک حدوں میں داخل ہونے سے روک دیا اور امرتسر کا مرحلہ کسی نہ کسی طرح ہم نے بنفس نفیس ہی طے کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آنکھوں کے آگے تارے ناچتے رہے ہوں اور زمین کی روایتی گردش صحیح صحیح نظر آنے لگی ہو۔

اگست ۶۰ء

مولانا عامر عثمانی کو

محدّث تو نہیں کہا جا سکتا

لیکن

تفہیم الحدیث

کے عنوان سے

وقتاً فوقتاً انہوں نے جو احادیث رسولؐ کی شرح کی ہے
اس کا ہر ہر لفظ مولانا کو ایک بہترین حدیث داں ہاور
کرانے پر تلا ہوا ہے۔

مضامین خود بولتے ہیں۔ لہٰذا ہم تعریف و توصیف کے
جھمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتے۔ جو لوگ تجلی کے قدیم
قارئین ہیں، انھیں تو مولانا کی عبقری صلاحیتوں کا بخوبی
اندازہ ہے۔ نئے قارئین کے لئے چند ایسے اوراق پیش کئے
جا رہے ہیں جن پر بکھرے ہوئے جملے مولاناؒ کو ایک ایسا مقام
دینے کی گذارش کرتے ہیں۔ جو مقام موجودہ دور میں
چند ہی علماء کو حاصل ہے۔ ان اوراق کا مطالعہ [illegible] اور
انشاء اللہ [illegible] مجبور کریگا

والدین کے حقوق

اکبر الکبائر

عن عمران بن حصين. قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما تقولون في الزنا وشرب الخمر والسرقة قلنا: الله ورسوله اعلم. قال هن الفواحش وفيهن العقوبة ألا أنبئكم بأكبر الكبائر؟ الشرك بالله عز وجل وعقوق الوالدين وكان متكئاً فاحتفز قال والزور (اخرجه الطبراني والبيهقي وقال الحافظ سنده حسن)

ترجمہ

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم لوگ زنا اور شراب نوشی اور چوری کے بارے میں کیا کہتے ہو، ہم نے کہا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے، فرمایا یہ سب بے حیائی کی باتیں ہیں اور ان میں عذاب ہے، لیکن سنو! کیا میں تمہیں سب سے بڑے گناہ نہ بتاؤں، ہاں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے اور والدین کی نافرمانی، آپ اس وقت ٹیک لگائے ہوئے تھے پس سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا۔ اور جھوٹا بیان!

تفہیم

زنا، شراب نوشی اور چوری وہ معصیتیں ہیں جن کی قباحت و شناعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آیات الٰہیہ اور فرمودات رسولؐ سے معلوم ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود اللہ کے رسول نے ان سے ان کے بارے میں سوال کیا تو صحابہ نے یہ جواب نہیں دیا کہ جی ہاں ہم جانتے ہیں یہ افعال بدترین گناہ ہیں بلکہ نہایت ادب سے کہا "اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں" یہ جواب ایک طرف گفتگو کے اس سلیقے کو ظاہر کرتا ہے جو صحابہؓ نے رسول اللہؐ کی صحبت و تربیت سے حاصل کیا تھا۔ دوسری طرف یہ ان کی نورانی ذہانت کا مظہر تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ان معصیتوں کے بارے میں ہمارا عقیدہ تو رسول اللہؐ کے علم میں پہلے ہی سے ہے سوال کا مقصد اس عقیدے کا دریافت کرنا نہیں ہو سکتا ضرور کوئی خاص اور اہم بات ہے جو اس سوال کا سبب بنی ہے، لہٰذا ادب کے ساتھ ایسا جواب دیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اے اللہ کے رسولؐ آپ کے سامنے ہم کیا اور ہمارا علم کیا، تیسری طرف اس حدیث کا اسلوب و پیرایہ اس اعلیٰ درجے کے حکیمانہ اور بلیغ طرز کلام کا نمونہ پیش کرتا ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے امی رسول کو

تقویٰ نصیں فرمایا تھا، کیسا مؤثر پیرایہ ہے کہ پہلے تین بڑے بڑے گناہوں کا تذکرہ فرمایا جس سے مخاطبین کا ذہن اس اہم تربات کے لئے تیار ہو گیا جو آگے بیان ہونے والی ہے پھر توثیق فرمائی کہ ہاں یہ مذکورہ معصیتیں یقیناً عذاب کو دعوت دینے والی ہیں، لیکن کان کھول کر سن لو ان سے بھی بڑی اور شدید معصیتیں میں تمہیں بتلاتا ہوں۔

آپ نے پہلے بھی دیکھا اور یہاں بھی دیکھیے کہ والدین کی نافرمانی کو شرک کے فوراً بعد بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اطاعت والدین اسلام کے مہمات میں سے ہے، اس کی طرف سے غفلت انتہائی خطرناک ہے۔

یہی روایت قدرے فرق کے ساتھ پیچھے بھی مذکور ہو چکی ہے، اس میں ابتدائی حصہ نہیں تھا، لیکن تینوں اکبر الکبائر یہی اور اسی ترتیب سے تھے (افسوس اس میں عقوق کی جگہ حقوق چھپ گیا ہے) نیز جس طرح یہاں شرک و عقوق کے بعد وکان متکئاً فاحتفز کے الفاظ ہیں اسی طرح وہاں وجلس وکان متکئاً کے الفاظ تھے۔ یہ دراصل راویوں کے اپنے الفاظ ہیں، اکثر صحابہ کمال حزم و احتیاط کے تحت بسا اوقات وہ حالت و کیفیت بھی بیان کر دیا کرتے تھے۔ جن میں کوئی ارشاد رسولؐ صادر ہوا ہے۔ اس وقت صورت یہ تھی کہ سرکار ٹیک لگائے بیٹھے تھے، اسی حالت میں آپ نے صحابہؓ سے سوال کیا اور سوال کے بعد اکبر الکبائر کے بیان میں شرک باللہ اور عقوق الوالدین کا ذکر فرمایا۔ پھر دورانِ کلام ہی میں سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور "الا وقول الزور" یا "قول الزور" کے الفاظ نشست کی اس دوسری کیفیت میں زبانِ مبارک پر آئے، اسی نشست کی تبدیلی کو صحابہ نے حدیث کے ساتھ ذکر کیا ہے، ظاہر ہے کہ ایک ہی واقعہ یا کیفیت کو مختلف لوگ اپنے الفاظ میں بیان کریں گے تو الفاظ بھی مختلف ہوں گے۔

اس تفصیل کو پیش کرنے کا مطلب یہ بتانا ہے کہ حدیث رسولؐ نقل کرنے میں اکثر صحابہ حد درجہ محتاط تھے نہ صرف حدیث کی روایت میں صحت کا اہتمام تھا بلکہ اس سے متعلق اگر کوئی حالت و کیفیت بھی یادداشت میں محفوظ ہوتی تھی تو اسے ضرور ذکر کر دیتے تھے، پھر ان سے جن لوگوں نے نقل کیا انھوں نے بھی کسی حذف و اضافہ کو گوارہ نہیں کیا اور محدثین کرام بھی اسی طریقے پر عامل رہے۔ نوّر اللہ مرقدہم

زور

فی الوقت موضوع ہمارا اگرچہ حقوق الوالدین ہے لیکن حدیث میں زور کا بھی ذکر ہے، اس لئے جی چاہتا ہے اس کی تشریح میں بھی کچھ سطور سپرد قلم کریں۔

زور کا اطلاق کذب پر بھی ہوتا ہے، باطل پر بھی اور تہمت پر بھی، یہاں تک کہ فکر و نیت کے فساد پر بھی یہ جامع لفظ صادق آتا ہے، فکری کج روی پر اس کے اطلاق کی مثال قرآن میں یہ ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا	اور کہا کافروں نے کہ یہ (قرآن)
اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ	تو کچھ بھی نہیں سوائے اس کے کہ
ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ	بہتان باندھا ہے اس شخص
عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ	(محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے اور اس
فَقَدْ جَاۗءُوْ ظُلْمًا وَّ	اختراع میں کچھ اور لوگوں نے
زُوْرًا وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ	اس کی مدد کی ہے، سو آگئے یہ کافر
الْاَوَّلِيْنَ۔	بے انصافی اور جھوٹ پر اور کہنے لگے
(الفرقان)	یہ تو نقلیں ہیں پہلوں کی۔

عام محاورے میں جھوٹ اسے کہتے ہیں کہ آدمی جان بوجھ کر خلاف واقعہ بات کہے، اگر جان بوجھ کر نہیں بلکہ نادانستہ کہتا ہے تو اسے جھوٹ نہیں بلکہ "غلط" کہتے ہیں لیکن اس آیت نے اصل حقیقت منکشف کی کہ جھوٹ کا اطلاق فکر و فہم کی کجی پر بھی کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ کافروں کو بطور واقعے کے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے یہ تو ان کے فکر و استدلال کی خامی تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کلام الٰہی کا نزول ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اور محض اندازہ و قیاس سے یہ غلط گمان قائم کر لیا تھا کہ یہ تو محمد نے یہود و نصاریٰ کے بعض علماء کی مدد سے گھڑ لیا ہے اور اس کی حیثیت قصہ کہانیوں کی سی ہے" اس فکری کجروی کو بھی

اللہ نے کذب (جھوٹ) قرار دیا۔
فساد نیت پر جھوٹ کے اطلاق کی مثال قرآن میں یہ ہے:

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۔

جب آئیں تیرے پاس منافق اور کہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں آپ اللہ کے رسول ہیں تو بیشک اللہ جانتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، لیکن وہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں

دیکھیے منافقین نے یہ بات بالکل مطابق واقعہ اور حق کہی لیکن ان کی نیت خراب تھی وہ صرف دکھاوے کو کہہ رہے تھے ورنہ ان کا قلب رسالت کے اعتراف و اذعان سے خالی تھا، اسی فساد نیت کی بنیاد پر اللہ نے ان کو جھوٹا قرار دیا۔

قاضی ابن العربیؒ نے جھوٹ کو چار قسموں پر تقسیم کیا ہے
(۱) الکذب علی اللہ :۔ اللہ کے بارے میں جھوٹ بولنا یہ جھوٹ کی سب سے بدترین قسم ہے۔
(۲) الکذب علی الرسولؐ :۔ یہ بھی کچھ کم ناپاک نہیں، اکثر حالتوں میں اس کا حاصل کذب علی اللہ ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔
(۳) الکذب علی الناس :۔ لوگوں کے بارے میں جھوٹی گواہی دینا۔ اس کی دو صورتیں ہیں اور دونوں ہی یکساں خبیث کہ ایک یہ کہ جو واقعہ ہوا ہی نہ ہو اس کا ہونا ثابت کرنا، دوسرے یہ کہ جو واقعہ ہوا ہو اس کا نہ ہونا ثابت کرنا۔
(۴) الکذب للناس :۔ اس کا تعلق گواہی دینے سے نہیں ہے بلکہ یہ وہ جھوٹ ہے جس کا استعمال ہم بدنصیب اپنے روزمرہ کے حالات میں کرتے رہتے ہیں۔ زید سے کہہ دیا کہ عمران نے ایسا کہا تھا حالانکہ اس نے نہیں کہا تھا۔ اسی طرح کے معمولی جھوٹ ہم دن رات بولتے ہیں۔ اس میں زیادہ موجب عذاب و لعنت وہ جھوٹ ہے جو معاملات میں اختیار کیا جاتا ہے، مثلاً خرید و فروخت میں، شادی بیاہ میں، معاہدوں میں، وغیرہ وغیرہ۔

جھوٹ کی حرمت مسلمات میں سے ہے لیکن کچھ مواقع ایسے بھی ہیں جن میں یہ حرمت ختم ہو جاتی ہے، یہ ایک مستقل بحث ہے اگر زندہ رہے اور توفیق مل سکی تو انشاء اللہ اس وقت اس پر تفصیلی گفتگو کریں گے جب اس موضوع کی احادیث کا تذکرہ آئے گا۔

باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک

عن ابن عمر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان ابرّ البرّ ان یصل الرجل اھل ودّ ابیہ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، احمد، ابوعوانہ)

ترجمہ :۔
حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، بہترین بھلائی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

تفہیم :۔
معروف بات ہے کہ۔ دوست کا دوست دوست ہوا کرتا ہے اگر والد کی محبت اور عزت ہمارے قلب میں ہے تو اس کا قدرتی تقاضا ہے کہ جن لوگوں کو وہ دوست رکھتے ہیں ان سے ہم بھی تعلق خاطر محسوس کریں اور ان کی تکریم میں تساہل نہ برتیں۔ حدیث اسی قدرتی تقاضے کی طرف توجہ دلا رہی ہے، باپ زندہ ہو یا مرچکا ہو دونوں صورتوں میں اس کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک بہترین نیکی ہے، بات اتنی صاف ہے کہ کسی مثال سے سمجھانے کی ضرورت نہیں، ہاں اس حدیث کے راوی اول حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ہی کا ایک واقعہ تمثیلاً سن لیجئے۔ عبداللہ بن دینار ابن عمرؓ ہی سے سن کر یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ :۔
ایک مرتبہ دوران سفر میں ایک دیہاتی عبداللہ ابن عمرؓ سے ملا۔ اس کا باپ ابن عمرؓ کے

والد حضرت عمر رضی اللہ عنہا کا دوست ہوا کرتا تھا۔ دیہاتی نے ابن عمرؓ سے پوچھا۔ کیا تم ابن عمر کے بیٹے نہیں ہو؟۔ ابن عمر نے جواب دیا ہاں انہی کا بیٹا ہوں، اس کے بعد آپ نے دیہاتی کو ایک گدھا (سواری کا) عنایت کیا جو ساتھ لائے تھے، نیز سر سے عمامہ بھی اتار کر حوالہ کر دیا۔ آپ کے بعض ساتھیوں نے کہا ارے اس کے لئے تو دو درہم بھی کافی تھے! ابن عمرؓ نے فرمایا دوستو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کیا ہے

احفظ ودا بیک لا تقطعہ فیطفئ اللہ نورک (اپنے والد کی دوستی کو نبھاؤ اسے ختم نہ کرو ورنہ اللہ تمہارا نور بجھا دیگا۔

(مسلم واحمد)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حسن سلوک سے مراد صرف تعظیم و تکریم ہی نہیں بلکہ والد کا کوئی دوست اگر ایسی پوزیشن میں ہے کہ روپے پیسے سے اس کی مدد کیجاوے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیئے، ویسے بھی یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ دوستی کے تقاضے گوناگوں ہیں، ایک تقاضا تو یہی ہے کہ جس طرح والد کا ادب کرتے ہو اسی طرح ان کے دوستوں سے بھی ادب کے ساتھ پیش آؤ۔ دوسرا تقاضا یہ ہے کہ موقع ملے تو خدمت سے گریز مت کرو۔ تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اگر وہ مصیبت میں پھنس جائیں تو اپنے امکان بھر مدد دو، مالی یا جانی جیسی بھی درکار ہو، وغیر ذلک۔

ماں اور باپ میں کون زیادہ مستحق سلوک ہے

والدین کی خدمت و اطاعت کی تاکید پر مشتمل اور بھی بہت سی روایات ہیں لیکن مقصود سب کا احاطہ نہیں، جتنا عرض کیا گیا وہ برّ الوالدین کی اہمیت اور عقوق ونافرمانی کی شناعت ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے، اب ہم اس نکتہ پر اظہار خیال کرتے ہیں کہ ماں اور باپ دونوں برابر کے حقدار ہیں یا ایک دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ حق ہے۔

محدثین اور فقہاء کے مابین اس بارے میں اختلاف نظر آتا ہے۔ بعض محدثین نے تو کہا کہ باپ پر ماں کو تین درجے فوقیت ہے۔ بعض نے کہا کہ اولاد پر ماں کا حق بہر حال باپ سے زیادہ ہے، کتنا زیادہ ہے اس کا تعین مشکل ہے۔

مگر فقہاء کا خیال یہ ہے کہ باپ کا حق ماں سے زیادہ ہے اور اسی لئے باپ سے حسن سلوک نسبتاً زیادہ ضروری ہے۔

قرآن و حدیث سے بظاہر محدثین کی رائے قوی معلوم ہوتی ہے مثلاً۔ سورۂ لقمان میں انسان کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی گئی تو اللہ نے ماں کے استحقاق کو مفصلاً بیان فرمایا۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ۔	اس کی ماں نے اسے تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور یہ مولود دو سال بعد دودھ سے جدا ہوتا ہے۔

نیز سورۂ احقاف میں بھی برّ الوالدین کے تحت والدہ ہی کے استحقاق کی وجہ کھول کر بیان کی (حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا)

متعدد احادیث میں بھی والدہ کی خصوصیت نمایاں ہے مثلاً بخاری ومسلم، احمد، ابن ماجہ اور طحاوی میں روایت آئی ہے کہ:

"حضورؐ سے پوچھا گیا کہ کون زیادہ حسن سلوک کا مستحق ہے۔ حضورؐ نے فرمایا تمہاری ماں پوچھا گیا پھر کون۔ جواب ملا۔ تمہاری ماں پوچھا گیا پھر کون۔ جواب پھر وہی ملا، تمہاری ماں۔ اس کے بعد پوچھا گیا تب کہیں جواب ملا۔ تمہارا باپ۔"

ایک روایت میں ہے کہ چوتھی بار بھی سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں ہی کا نام لیا اور پانچویں بار باپ کا نام لیا۔ تو کیا ان نصوص سے ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ محدثین کی رائے کے مطابق والدہ کی اطاعت زیادہ ضروری ہے۔ اور ضروری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں والدین متضاد رائے رکھتے ہوں اور کسی ایک کی رائے قبول کرنے سے دوسرے کی دل آزاری ہوتی ہو تو ہمیں از روئے شرع ماں ہی کی رائے قبول کرنی لازم ہے اور اگر دونوں ایک دوسرے سے مختلف حکم دیں تو بلا تامل ماں کا حکم مانتے ہوئے باپ کے حکم کو نظرانداز کر دینا مقتضائے شریعت ہے؟

نہیں ایسا نتیجہ نکالنا عملی زندگی کے ناگزیر تقاضوں کو درہم برہم کر دے گا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عورت ضعیف العقل بھی ہے اور غیر معمولی طور پر جذباتی بھی تعلیم و تربیت کے صبر آزما، تفکر طلب اور کٹھن مراحل میں اگر ماں ہی کے احکام و خواہشات کو شرعاً مقدم کر دیا جائے تو اکثر حالتوں میں اولاد کی بربادی مسلّم ہو جائیگی تعلیم و تربیت کے علاوہ گوناگوں معاملات میں باپ جن دوررس مصالح کو سمجھ کر ایک حکم نافذ کرتا ہے ماں ان کا ادراک نہیں کر سکتی اور کر بھی لے تو اس کی عقل پر ممتا کی گرفت بڑی سخت ہے، وہ مستقبل کے مفادات پر اولاد کی موجودہ راحت و آسائش کی قربانی بمشکل ہی گوارہ کر سکتی ہے، اسی لئے کتنے ہی معاملات میں باپ کے حکم کو فوقیت دینا ظاہری لحاظ سے ضروری ہے۔

تو کیا فقہاء کا فیصلہ درست رہا؟ کیا ہر حال میں باپ ہی کا حکم مانا جائے۔ اگر وہ ماں کے حکم سے ٹکرا رہا ہے۔؟

ہمارے خیال میں یہ فیصلہ بھی اتنے توسع اور عموم کے ساتھ درست نہیں

پھر کیا درست ہے؟

اس کی تنقیح کے لئے ذرا تفصیل چاہئے خیال

محدثین کا بھی صحیح ہے اور فقہاء عظام کا بھی۔ یہ کیسے ہوگیا ہے کہ ان ارباب جلالت نے بات کی تہہ کو نہ پایا ہو اور ہم جیسا کوئی نادان یہ لغو دعویٰ کرے کہ میں نے تہہ کو پایا ہے۔ استغفر اللہ۔

صورت حال یہ ہے کہ جہاں تک شریعت کے ٹھوس قانون کا تعلق ہے ماں اور باپ دونوں طاعت و خدمت کے یکساں مستحق ہیں اور اولاد کا فرض ہے کہ دونوں ہی کی فرمانبرداری کرے۔ لیکن کوئی بھی قانون جب فعل و عمل کے قالب میں ڈھلتا ہے تو اس میں متعدد جہتیں اور گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا لحاظ کر کے محدثین نے ایک بات کہی اور وہ اپنے دائرے میں بالکل بجا ہے، لیکن فقہاء نے بعض دوسرے پہلوؤں پر نظر کر کے ایک بات کہی اور وہ بھی اپنے دائرے میں یقیناً درست ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ کتنے ہی اعمال ایسے ہیں جن کی حیثیت اور مقام کا فیصلہ ان کے نتائج و عواقب پر منحصر ہوتا ہے، ایک ہی عمل انتہائی شدید جرم بن جاتا ہے اگر اس کے نتائج ہولناک نکلیں مگر یہی عمل معمولی سی برائی کہلاتا ہے اگر نتائج معمولی رہیں۔ موٹی سی مثال یہ ہے کہ آپ ایک کمزور سے آدمی کے لاٹھی رسید کرتے ہیں بیچارہ تاب نہ لا کر مر جاتا ہے اب آپ قاتل ٹھہرے اور پھانسی یا طویل قید آپ کے حصہ میں آئی۔ لیکن یہی لاٹھی ٹھیک اسی زور و قوت سے کسی مضبوط آدمی کے ماریئے وہ مرے گا تو کیا الٹا آپ کی شامت بلا دے گا، اس صورت میں نہ تو آپ قاتل ٹھہریں گے نہ کسی بڑی سزا کے مستحق۔ عمل دونوں حالتوں میں ایک ہی تھا۔ لیکن ثمرہ بدل جانے سے اس کی حیثیت بدل گئی۔ یہی معاملہ اعمال خیر کا بھی ہے۔ آپ سو روپے اللہ کی راہ میں ایسی حالت میں خرچ کرتے ہیں کہ آپ کی آمدنی بالکل معمولی ہے اور روکھی سوکھی پر گذارہ ہے تو یقیناً آپ اس شخص سے زیادہ ثواب پائیں گے جو آپ ہی

کی طرح سو روپے راہ خدا میں صرف کرتا ہے مگر تجوری میں اس کے ہزاروں جمع ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ فتح مکہ سے قبل جن مومنین رضوان اللہ علیہم نے اسلام کی مدد کی انکے پسینے کا ایک ایک قطرہ ہمارے سیروں لہو سے زیادہ قیمتی اور ان کا انفاق کردہ ایک ایک پیسہ بعد والوں کے خزانوں سے زیادہ مش بہا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ان کے طرز عمل پر عظیم الشان نتائج کا انحصار تھا، وہ خدانخواستہ بخیل و بزدل بنجاتے تو بزم گیتی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تاریک رہ جاتی وہ سمندر کی طرح جواد و سخی اور فولاد کی طرح ناقابل شکست بن گئے تو محفل کائنات میں ہمیشہ کے لئے اسلام کی نہ بجھنے والی شمع روشن ہوگئی۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

حاصل یہ کہ اکثر افعال کی قدر و قیمت کا اپنے ثمرات پر منحصر ہونا بدیہی امر ہے۔ اب ذرا غور کیجئے کہ ماں اور باپ کے درمیان اختلاف جنس کے تحت ضعف و قوت احتیاج و استغناء اور طاقت برداشت وغیرہ کا کتنا بڑا فرق ہے، عورت بیچاری جسمانی طور پر بھی کمزور اور جبلتوں کے اعتبار سے بھی نازک۔ سراپا انفعال ہی انفعال۔ اسکی قوت صبر کو چھوئی موئی سے تشبیہ دینا کوئی بڑا مبالغہ نہ ہوگا مصائب و حوادث کی جو ٹھوکر مرد کے آہنی وجود پر شاید ہلکی سی خراش ہی ڈالے وہی عورت کے وجود کو پاش پاش بھی کر سکتی ہے، جب یہ حال ہے تو ظاہر ہے کتنی ہی نافرمانیاں ماں کے حق میں اس سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہو سکتی ہیں جتنی وہ باپ کے حق میں ممکن ہیں۔

اس کے علاوہ باپ کا مردانہ وقار اور رعب و دبدبہ اولاد کے جذبۂ سرکشی کی راہ میں ایک قدرتی رکاوٹ ہے لیکن ماں بیچاری کمزور ہے، اس کے پاس صرف مامتا ہے سطوت و قوت نہیں۔ جوان اولاد کے سرکش جذبے بآسانی اس کی طرف سے لاپروا کر سکتے ہیں۔

یہی وجوہ ہیں جن کے باعث اللہ اور اس کے رسولؐ نے ماں کے استحقاق کو نمایاں کیا، اس پر توجہ دلائی، یہ ایسا ہی ہے جیسے الف آپ سے شیشے کا لیمپ مستعار مانگ کر لیجائے تو آپ یہ ضرور کہیں گے کہ بھائی ذرا سنبھال کر لیجانا نازک ہے، ٹوٹ نہ جائے۔ لیکن یہی الف اگر چمڑے کا سوٹ کیس مانگ کر لیجائیگا تو ایسی کوئی ہدایت نہ دیجئے، حالانکہ دونوں ہی چیزوں کو بحفاظت تمام استعمال میں لانا اور جوں کا توں آپ کو لوٹانا الف کا یکساں فرض ہے یہ نہیں کہ لیمپ کے متعلق چونکہ آپ نے احتیاط کا سبق دیا تھا اس لئے عیب سے بچا کر واپس لانا کوئی بڑا فرض ہے اور سوٹ کیس کو خراب کئے بغیر واپس لانا اس سے کمتر فرض قانونی و شرعی حیثیت دونوں کے لئے یکساں ہے چاہے قیمت میں دونوں برابر ہوں یا کم زیادہ۔

ایسا ہی معاملہ برالوالدین کا ہے، خدمت و اطاعت کے مستحق دونوں یکساں ہیں اور ایذا رسانی دونوں کی یکساں حرام ہے، لیکن عورت کے ضعف و نزاکت اور اس کی نافرمانی کے زیادہ امکانات کے باعث خصوصی ہدایات کی ضرورت ہوئی۔ اللہ نے توجہ دلائی کہ مت بھولو یہی وہ کمزور ہستی ہے جس نے مہینوں تمہیں پیٹ میں رکھا ہے دکھ جھیلا ہے، حیات و موت کی کش مکش سے گذری ہے پھر دو سال تمہیں اپنی چھاتی سے لگائے رکھا ہے، دودھ پلایا ہے، اس کا حق ہے کہ تم اس سے حسن سلوک سے پیش آؤ اسے دکھ مت دو، اس کی خدمت کرو۔

اللہ کے رسول نے بھی ماں کے بارے میں تاکید اور تقدم کا اسلوب اسی لئے اختیار فرمایا اور محدثین کرام جو کچھ فرماتے ہیں وہ بھی انہی پہلوؤں پر نظر رکھ کر فرماتے ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم رحمۃ واسعۃ۔

لیکن تفقہ کی فطرت یہ ہے کہ وہ قانون کی عملی تفصیلات پر زیادہ توجہ دیتا ہے، عملی تفصیلات کے اعتبار سے یہ بات بہرحال ناگزیر ہے کہ اولاد پر باپ کا کنٹرول قوی ہو، باپ ہی اولاد کی تعلیم و تربیت کی نگہداشت اور انصرام کا زیادہ اہل ہے، وہی وسائل مہیا کرتا ہے وہی ہر طرح کی اونچ نیچ سمجھ سکتا ہے اس کے سنجیدہ احکامات اگر عورت کی عقل کوتاہ اور جذباتی تقاضوں کے

عرصۂ دراز کی کوشش سے انسان نے بجلی دریافت کی، اسے تاروں میں دوڑا کر مشینیں چلائیں، قمقمے جلائے لیکن وہ بجلی کا خالق نہیں ہے صرف دریافت کنندہ ہے ہم ارادوں کی سائنس اور ارادہ و عمل کے مشینی روابط کے بارے میں اتنا بھی نہیں جانتے جتنا بجلی اور اس کے طریق عمل کے بارے میں جان لیا گیا ہے، پھر بھی بجلی کی تخلیق کا سہرا ہمارے سر نہیں بندھا تو عمل اور ارادے کی تخلیق کا سہرا کیسے بندھ سکتا ہے، ان دونوں کا خالق کوئی اور ہی ہے اور اسی اور کو اہل ایمان خدا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

رہا یہ کہ جن عقائد و اعمال کو اللہ نے اپنی شریعت میں حرام و نجس قرار دیا ان کی تخلیق وہ کیوں فرماتا ہے تو اس کا جواب ہم چند کالم پہلے مع تمثیل عرض کر چکے ہیں مزید یوں سمجھئے کہ کسی مقصد کی تحصیل کے لیے ان افعال کا حکم دینا جو بجائے خود ناپسندیدہ ہیں ہم انسانوں کے مابین بھی خوب رائج ہے۔ مثلاً بدمزہ دوائیں ہیں۔ کون ماں باپ ہوں گے جو اپنی اولاد کے لئے پسند کریں کہ اس کے منہ میں بدذائقہ چیزیں ٹھونسی جائیں ان کی تو عین پسند اور خوشی یہ ہے کہ اولاد بہتر سے بہتر چیزیں کھائے، زیادہ سے زیادہ مزے کی زندگی بسر کرے، لیکن یہی ماں باپ اولاد کو اس بدذائقہ دوا کو پینے کا حکم دیتے ہیں جسے طبیب نے تجویز کیا ہے، اس سوئی کی چبھن برداشت کرنے کی تلقین کرتے ہیں جس کے ذریعے ڈاکٹر دوا بدن میں پہنچا رہا ہے حد ہے کہ والدین اپنے چہیتے بیٹے کی ٹانگ کٹوانے پر راضی ہو جاتے ہیں، اگر ڈاکٹروں کا یہ فیصلہ ہو کہ ٹانگ کا زخم سارے بدن کو لے ڈوبے گا، اسی طرح ہم سب کا حال عام طور پر یہ ہے کہ دشوار گذار راہوں کی طویل مسافت پسند نہیں کرتے، بدن کو مشقت میں ڈالنا ہمیں بالکل مرغوب نہیں لیکن جب کسی محبوب مقصد کا حصول سنگلاخ وادیوں میں ٹھوکریں کھانے اور جسم کو پسینہ پسینہ کر دینے ہی پر منحصر ہو تو ہم یہ سب اپنی مرضی سے برداشت کر لیتے ہیں اور ہمارا اپنا ارادہ ہمارے اپنے ہی قدموں کو حکم دیتا ہے کہ خارزار میں آگے بڑھو، گھاٹیاں طے کرو، آبلوں کی خلش سہو، تو اس سے صاف ظاہر ہوا کہ ضرورت و مصلحت ایسے فیصلے کرا ہی دیتی ہے جو بجائے خود ہمیں مرغوب نہیں ہوتے اور انھیں جامۂ عمل پہناتے ہوئے ہمیں تکلیف پہنچتی ہے۔

بس کم و بیش یہی صورت ہے قضاء الٰہی کی، وہ جن چیزوں کو بندوں کے نسبت پسند نہیں کرتا انھیں شرعاً ممنوع ضرور قرار دیتا ہے۔ لیکن عالم کون و مکاں کی وسیع الذیل حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت ان میں سے بعض کا فیصلہ اور حکم بھی اس لئے کرتا ہے کہ زیادہ اہم مقصد کا حصول پیش نظر ہے، اس میں اور انسان میں جو فرق ہے وہ بھی ملحوظ رہے، انسان کا علم ظنی ہے، وہ اگر سخت بدذائقہ دوا خود پیتا ہے یا اپنے بیٹے کو پلاتا ہے تو اس سے فائدے کا حصول قطعی نہیں محض ظنی ہے۔ ہو سکتا ہے فائدہ نہ ہو، دوسرے تمام معاملات کا بھی یہی حال ہے، آدمی کسی بھی مقصد کے لئے تکلیف اٹھائے اس مقصد کا حصول ضروری تو نہیں، بارہا ساری قربانیاں اور جفاکوشیاں اکارت جاتی ہیں اور بارہا اس کا یہ قیاس ہی غلط ہوتا ہے کہ فلاں مقصد فلاں قربانی کے ذریعے حاصل ہو جائے گا۔ اس امکانِ خطا اور شک کے باوجود مکروہ اور نامرغوب چیزوں کا فیصلہ اپنے اور اپنی محبوب ہستیوں کے حق میں کر گذرنا اگر عقل و فطرت کے عین مطابق ہے تو غور کیجئے کہ اس خدا کے لئے ایسا ہی کرنا خلاف عقل کیسے ہو سکتا ہے جس کا علم یقینی ہے ظنی نہیں، جو ہر مقصد کو لازماً حاصل کر لیتا ہے۔ ایسا نہیں کہ کسی مقصد کی خاطر وہ وسائل پیدا کرے اور پھر یہ وسائل ناکام ہو جائیں۔ ایسا نہیں کہ افعال اور مقاصد

کے یا ہمی ربط کی تشخیص میں اس سے شمہ برابر غلطی ہو سکے۔ اس نے جو بھی چیزیں مقدر کیں — خواہ وہ انسانوں کی نسبت سے شرعاً حلال ہوں یا حرام، جائز ہوں یا ناجائز، محبوب ہوں یا مکروہ، خالص مصالح کی بنا پر کیں۔ اب یہ مصالح لازماً ان سے حاصل ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس نے سوچا کچھ اور ہوا اور واقع کچھ اور ہو جائے۔ تو محض گمان و قیاس کی بنیاد پر ناپسندیدہ امور کو قبول اور اختیار کرنے والے انسان سے کہیں زیادہ خدا اس کا حق دار ٹھہرا کہ یقینی اور بے خطا علم کے تحت ایسے امور مقدر کرے جو بظاہر ناپسندیدہ ہوں۔ کسی شے کا خدا کی نگاہ میں بجائے خود مبغوض ہونا اس بات کے منافی نہیں کہ وہ کسی زیادہ اہم اور محبوب ترین مقصد کی خاطر اس کا ارادہ کرے۔

بات کو پوری طرح ذہن نشین کرنے کے لئے شیطان کی مثال لیجئے۔ شیطان سرچشمہ ہے گمراہی کا، لوگوں کے دین اور عقائد و اعمال میں فساد ڈالنا اس کی عین سرشت، خدا کی نافرمانی پر ابھارنا اس کا محبوب مشغلہ، جو چیزیں اللہ کو ناپسند ہیں ان سب کے خلاف انسانوں کو ایسی چیزوں پر ابھارنا جن سے اللہ خفا ہوتا ہے اس کا مقصد حیات ہے، مگر دیکھ لیجئے کہ اللہ ہی نے اسے پیدا کیا اور اللہ ہی نے سرکشی کا رجحان اور طاقت اور مادہ اس میں پیدا فرمایا۔ آخر کیوں؟ — صرف اس لئے کہ متعدد اہم ترین مقاصد اس سے حاصل ہونے تھے۔ ایک مقصد تو اپنی عظیم قدرت کا اظہار ہے کہ دیکھو ہم متضاد ترین اشیاء کی تخلیق پر کس طرح قادر ہیں، شیطان کو بھی پیدا کرتے ہیں اور جبریل کو بھی۔ حضرت جبریل شرف و مجد میں عظیم، سعادت و طہارت میں یکتا، ہر خیر کا منبع۔ اور شیطان رذیل، شقی، نجس اور ہر شر کا مصدر، پھر انسانوں میں اسی تضاد کا ظہور اس کی حکمت نے پسند فرمایا۔ ایک طرف سید الابرار محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ دوسری طرف ابوجہل

و ابولہب لعنۃ اللہ علیہما۔ ایک طرف عیسیٰؑ اور موسیٰؑ دوسری طرف فرعون و ہامان۔ جب بشری سطح پر تضاد کی مصلحت ظاہر ہو گئی تو جن و ملک کی سطح پر تضاد کیسے نہ پیدا کیا جاتا۔ ذی روح ہی نہیں غیر ذی روح مخلوقات میں دیکھ لیجئے، روشنی اور اندھیرا، تلخی اور شیرینی، راحت اور مصیبت، پستی اور بلندی، سردی اور گرمی، زندگی اور موت متضاد چیزوں کا پیدا کرنا بے شک زبردست قوت و قدرت کا مظہر ہے اور یہی اظہار قدرت عظیم مقاصد میں سے ایک نمایاں مقصد ہے خود باری تعالیٰ کے اسماء صفت ملاحظہ ہوں۔ رحیم و رحمٰن بھی اور قہار و منتقم بھی، رؤف و کریم بھی اور شدید العقاب بھی، اب اگر وہ جن و بشر کو فرشتوں ہی کی صفت پر پیدا کرتا اور دنیا میں ظہور صرف خیر ہی کا ہوتا تو آخر اس کے اوصاف قہریہ کا ظہور کیونکر ہوتا۔

اسی حکمت کی طرف اللہ کے رسولؐ کا یہ ارشاد اشارہ کرتا ہے کہ لو لم تذنبوا لذهب الله بكم ولجاء بقوم يذنبون فيستغفرون الله فيغفر لهم (اگر تم گناہ نہیں کرو گے تو تمہیں اللہ مٹا دے گا اور تمہاری جگہ ایسی قوم پیدا کرے گا جو گناہ کرے پھر اللہ سے توبہ کرے اور اللہ اس کی توبہ قبول کر کے مغفرت سے نوازے۔

ظاہر ہے حضورؐ گناہ کی تلقین نہیں فرما سکتے، وہ تو گناہوں سے روکنے ہی کے لئے مبعوث ہوئے اور ساری زندگی اسی مقصد کی نذر کر دی، اس حدیث میں آپ نے اللہ کی وہی حکمت تکوینی بیان فرمائی ہے جس کی تفصیل ابھی ہم نے عرض کی۔ گناہوں کے بغیر اللہ کی صفت عفو اور شان مغفرت کا ظہور نہیں ہوتا۔ کفر و زندقہ کے بغیر اس کی شدت قہر پردے میں رہ جاتی ہے لہٰذا مناسب ہوا کہ کفر و معصیت کو بھی مقدر کیا جائے۔

دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ مخلوق کو خیر و فلاح اور شکر و طاعت کی نعمتوں کا احساس و شعور حاصل ہو، کھلی بات ہے کہ شر نہ ہو تو خیر کے کوئی معنی ہی نہیں۔ سرکشی نہ ہو تو،

طاعت کا مفہوم ہی سمجھ میں نہ آئے۔ انبیاء و اتقیاء کی عظمت و احترام کا داعیہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے اگر اشقیا اور ائمۂ کفر کو زمین کے سینے پر دندناتے نہ دیکھا جائے روشنی کا احساس اندھیرے کے شعور پر منحصر ہے، لہٰذا کوئی چیز نہیں اگر پستی کا تصور ذہن میں نہیں، لہٰذا انسان کو راحت اور سعادت اور نعمت کا کوئی احساس ہی نہیں ہو سکتا تھا اگر کلفت اور شقاوت اور محرومی سے وہ نا آشنا ہوتا۔ جب احساس ہی نہ ہوتا تو شکر کس چیز کا، گویا شکر اور سعادت جیسی نفیس چیزیں معطل ہو کر رہ جاتیں اگر اللہ ناشکری اور شر اور شقاوت کو جزوِ تقدیر نہ بناتا۔

تیسرا اہم مقصد یہ ہے کہ انسان امتحان کی پوزیشن میں آجائے۔ امتحان ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ لغزش اور قصور کے مواقع فراہم نہ ہوں۔ آدمی کے اندر جبنی جذبہ پیدا کیا گیا اور اس کے مواقع استعمال بھی مہیا کئے گئے پھر اسے اختیار بھی عطا کیا گیا کہ چاہو تو اسے مقرر کردہ جائز حدود میں استعمال کرو اور چاہو تو حدود سے تجاوز کر جاؤ اگر ان تینوں میں سے ایک بھی شے معدوم ہوتی تو امتحان کا معاملہ بے معنی ہو جاتا۔ نفوس انسانی میں بھلائی اور برائی دونوں کا رجحان ودیعت کیا گیا خارجی سطح پر انبیاء کی بعثت کے ساتھ ساتھ اشقیاء اور اشرار کو بھی کھل کھیلنے کی آزادی دی گئی۔ شیطان بھی سروں پر مسلط فرمایا گیا۔ جنت کی بہترین نعمتوں کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ دنیاوی نعمتوں میں بھی ایسی کشش پیدا کی گئی کہ نفس انسانی کھنچا چلا جائے لیکن نفس کو یہ اختیار بخشا گیا کہ چاہے تو جائز حدود میں رک جائے، ایسا نہیں ہے کہ وہ بے جان لوہے کی طرح مقناطیس کی طرف کھنچے چلے جانے پر مجبور ہو۔ اسے کھنچنے اور رکنے دونوں کی قدرت عطا کی گئی۔ یہی وہ کمالِ صنعت ہے جس نے دنیا کو امتحان گاہ بنایا اور سزا و جزا کا منطقی جواز پیدا کیا۔

یہ تین اہم مقاصد ایسے مہتم بالشان ہیں کہ ان میں سے ہر ایک عقل سلیم کو مطمئن کرنے کے لئے کافی شافی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اور مقاصد و منافع ہیں ہی نہیں۔ انسان کی چھوٹی سی عقل بھلا ان تمام مقاصد مضمرات اور مصالح و حکم کا احاطہ کیا کر سکتی ہے جو بدیع السمٰوات والارض خدائے ذی الجلال کے صنعتِ تخلیق میں پائے جاتے ہیں۔

دوسرا شبہ انسانی اختیار کے بارے میں تھا یہ کہ جب سب کچھ پہلے سے مقدر کیا جا چکا تو انسان اسی کے مطابق چلنے پر مجبور ہے۔ اسے کوئی اختیار نہیں کہ دوسری راہ چل سکے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ علم اور حکم ایک ہی چیز کے دو نام نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص دوسرے شخص کو ناحق قتل کر کے اس کا سامان لے اڑا ہے، اس واقعے کو آپ نے اپنی ڈائری میں لکھ لیا یا کسی سے بیان کر دیا تو اس لکھ لینے یا بیان کر دینے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اس قتل اور لوٹ مار میں آپ کا بھی دخل تھا یا آپ نے اسے پسند فرمایا تھا۔

کچھ ایسا ہی معاملہ تقدیر کا سمجھئے۔ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے، اسے پہلے سے علم تھا کہ جس مخلوق کو وہ اختیار کی دولت عطا کر کے "آدمی" کے نام سے پیدا کر رہا ہے وہ اپنے اختیار کو کن کن راہوں میں کیونکر کیونکر استعمال کرے گی۔ کون شخص شیطان کے آگے ہتھیار ڈال دیگا اور کون شخص انبیاء و اتقیاء کے اتباع کا قلادہ گردن میں ڈال کر شیطان کو مایوس کرے گا۔ کس کی زندگی فسق و فجور میں کٹے گی اور کس کے لیل و نہار نیکیوں میں گذریں گے کون کفر پر مرے گا اور کون اسلام پر۔ اس علم کو اللہ تعالیٰ نے قلم کے ذریعے لوحِ تقدیر پر لکھوا دیا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان مجبور ہے مختار نہیں۔ شبہ

لازم آیا کہ انسان کی بدکاری اور سرکشی کو اللہ پسند فرماتا ہے۔

آپ اگر یہ کہیں کہ علمِ خداوندی کا غلط ہونا چونکہ ممکن نہیں اس لئے آدمی مجبور ہے کہ ٹھیک ایسا ہی عمل کرے جیسا علم الٰہی میں پہلے سے آچکا ہے وہ اس سے مختلف عمل کر ہی نہیں سکتا ورنہ علم الٰہی غلط ہو جائے گا تو ہم یہ کہیں گے کہ مجبوری کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب خود ہمیں بھی اللہ کی طرح تقدیر کا علم ہوتا۔ ہمیں تو کچھ بھی خبر نہیں سوائے اس کے کہ ظن اور تخمین اور قیاس و منطق سے ہم مستقبل کے کچھ اندازے لگا لیتے ہیں اور یہ اندازے غلط بھی ہوتے ہیں اور درست بھی۔ پھر ہم اس اختیار سے کیسے انکار کر سکتے ہیں جو ہمیں تمام ہی معاملات میں اس طرح حاصل ہے کہ آنکھیں اسے دیکھتی ہیں، حواس اسے محسوس کرتے ہیں، اعضاء و جوارح اسے برتتے ہیں۔ دنیا کا معاملہ کم و بیش ایک فلم کا سا سمجھئے۔ فلم ایک بار بن گئی تو اب جب بھی اسے پردے پر دکھایا جائے گا یکساں مناظر سامنے آئیں گے۔ جو کچھ فلمایا جا چکا اس میں سرمو فرق ممکن نہیں۔ آپ فلم دیکھ کر اس کی جملہ تفصیلات لکھ لیں، تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان تفصیلات کو جھٹلایا جا سکے اسی طرح دنیا میں ہوتا تو لازماً وہی سب کچھ ہے جو علم الٰہی میں آچکا اور تقدیر میں درج ہو چکا۔ پوری کائنات ایک مربوط فلم کی طرح اللہ کی نظروں میں تھی جس طرح آپ دوسری مرتبہ کسی فلم کو دیکھتے ہوئے خوب جانتے ہیں کہ آگے کو کیا کیا ہونا ہے۔ اور آپ کا یہ علم حرف بحرف صحیح ثابت ہوتا ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ فلم میں پہلی بار جو ریل گاڑی پل پر سے گزرگئی تھی دوسری بار دیکھنے پر وہ پل پر سے گزرتی نظر آئے۔ اسی طرح اللہ کے علم غیب نے جب ازل سے ابد تک کے جملہ واقعات کو پہلے ہی دیکھ لیا تو اب یہ ممکن نہیں کہ دوبارہ جب بھی واقعات عالم کون و مکان میں ظہور پذیر ہوں تو اس تصویر اور خاکے سے کچھ مختلف ہوں جسے اللہ تعالیٰ دیکھ چکا

وہ تو جوں کے توں ظہور میں آتے ہیں۔ مگر یہ دنیا کی پوری فلم اس طرح نہیں بنی کہ اللہ نے ایک لگی بندھی کہانی کرداروں کے سپرد کر دی ہو اور پابندی لگا دی ہو کہ ٹھیک اسی کہانی کو جامۂ عمل پہنانا ہے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو بیشک کہہ سکتے تھے کہ آدمی نے جو کچھ کیا اللہ کی عائد کردہ پابندی کے تحت کیا، اسے اپنی مرضی سے کچھ کرنے کا اختیار دیا ہی نہیں گیا تھا مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ ہر طرح کے اچھے اور برے، خوب اور ناخوب عمل کی قدرت، صلاحیت اور اختیار دے کر کرداروں کو آزاد چھوڑ دیا گیا وہ جو چاہے کرتے پھریں۔ جیسی چاہے کہانی اسٹیج کریں۔ البتہ یہ اُفقی ضرور بتا دیا گیا کہ دیکھو میں تمہارا رب ہوں میری پسندیدہ چیزیں یہ ہیں اور ناپسندیدہ یہ یہ۔ میں تمہیں آزمانا چاہتا ہوں کہ میرے دئے ہوئے اختیار کو تم میری پسند کے مطابق استعمال کرتے ہو یا اس کے خلاف۔ تمہیں ہرگز نہیں روکوں گا اگر تم مجھے گالیاں بھی دو۔ میرے وجود ہی سے انکار کر جاؤ۔ میرے ہر حرام کو حلال کر لو، میرے ہر حکم کو پس پشت ڈال دو۔ میں نے بہرحال تمہیں چھوٹ دی اختیار دیا۔ آزادی دی مگر کان کھول کر سن لو کہ موت کے بعد تمہارا حساب بھی لوں گا، پھر فرمانبرداری اور نافرمانی کی نسبتوں سے سزا و جزا بھی دی جائے گی، بڑی بڑی نعمتیں فرمانبرداروں کے لئے تیار ہیں اور بڑے بڑے عذاب نافرمانوں کے لئے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔ جاؤ کارگہ حیات میں اپنا نامۂ اعمال تیار کرو۔

تو غور فرمائیے تقدیر کے اٹل ہونے سے یہ لازم کہاں آیا کہ انسان مجبور ہے مختار نہیں، جو کچھ وہ کرتا ہے اپنے اختیار ہی سے کرتا ہے نہ کہ جبر مشیت سے، تقدیر اٹل اس لئے ہے کہ اس میں وہ سب کچھ فلم کی طرح منقش کر دیا گیا ہے جو انسان قیامت تک کرنے والا ہے۔ فلم کے نقوش بدلا نہیں کرتے چاہے اسے مشین کی چرخی پر کتنی دفعہ گھمایا جائے۔ اسی طرح وہ فلم کیسے بدلے گی جسے اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم نے عالم مثال میں دیکھ چکا۔ قلم

کر دیا تھا۔ مگر اس ظلم کے کرداروں نے جو بھی کیا اپنے اختیار اور مرضی سے کیا۔ لہٰذا اسی کے مطابق انھیں بدلے دیئے جائیں گے اور یہ عذر ہرگز نہ سُنا جائے گا کہ تقدیر تو پہلے ہی سے طے تھی پھر ہم اس کے خلاف کیسے کرتے۔

یاد کیجئے دور صحابہؓ میں ایک سال شام، مصر اور عراق میں وبا پھیلی تھی۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی تو انتظام کے لئے خود پہنچے اور مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا، غالب رائے یہ رہی کہ وبا کی وجہ سے یہاں قیام مناسب نہیں، حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ لشکر کو کل کوچ کرنے کی اطلاع دیدیں۔ مگر حضرت ابو عبیدہؓ خفا ہو کر طیش آمیز لہجے میں بولے "افراراً من قدر اللہ (اے عمر کیا تقدیر الٰہی سے بھاگنا چاہتے ہو؟) بات بظاہر درست ہی تھی، تقدیر میں وبا کا شکار ہونا لکھا ہوگا تو وہ اٹل ہے نہ لکھا ہوگا تو ہزار وبائیں ہوں بال بیکا نہیں ہو سکتا اس منطق میں بچشم ظاہر کوئی جھول نہیں مگر باریک بینی سے غور کیا جائے تو جھول ضرور نظر آئے گا۔

تدبیر کے اس پورے دفتر کو آخر ہم کہاں گم کریں گے جس کے اوراق قرآن و حدیث میں جزو کتاب ہیں۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ جیسی آیات اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے احکام اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے بھاگ دوڑ سب تشنۂ توجیہ رہ جاتے ہیں اگر تقدیر کے اس تصور پر جم جایا جائے جس کی ترجمانی حضرت ابو عبیدہؓ کے جملے اور رویے سے ہو رہی تھی۔ ان کے کمال اخلاص اور حسن نیت میں شک نہیں لیکن فراست فاروقی اور ہی چیز تھی۔ حضرت فاروقؓ نے بہ تمام حلم و ضبط فرمایا۔ نعم افر من قضاء اللہ الیٰ قضاء اللہ (ہاں میں تقدیر الٰہی سے بھاگتا ہوں مگر تقدیر الٰہی کی طرف ہی بھاگتا ہوں) سبحان اللہ ایک ہی فقرے میں تقدیر کا پورا فلسفہ سمیٹ دیا۔ وبا سے بچنے کے لئے مقام وبا سے کوچ کر جانا اگر تقدیر الٰہی سے فرار ہو تو بیماریوں کا علاج اور پرہیز فرار ہی قرار پائے گا۔ دوا ایک داخلی تدبیر ہے

اور کوچ خارجی۔ حفظ ماتقدم کی تلقین خود باری تعالیٰ نے کی ہے۔ یہ آخرت کی خاطر دنیا میں نفس کو لگام دینا شراب اور زنا کی لذتوں سے دور رہنا، عبادتوں میں جسم تھکانا سب حفظ ماتقدم ہی کے قبیل سے تو ہے پھر آخر مقام وبا سے فرار گناہ کیوں ہوتا۔ تقدیر سے فرار اس وقت کہتے جب صحابہؓ کو یہ علم ہوتا کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے مگر یہ علم تو کسی فرد بشر کو نہ پہلے تھا نہ آئندہ ہوگا۔ لہٰذا حضرت عمرؓ نے اس تدبیر کو پسند فرمایا جو ایک باشعور اور ذی فہم مخلوق کی حیثیت سے انسان پر لازم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ کی جلالت شان کا لحاظ رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے انھیں اپنا حکم ماننے اور اپنی رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور نہیں کیا مگر خود وہاں سے مدینے چلے آئے پھر خط لکھا کہ آپ یہاں آ جائیے، حضرت ابو عبیدہؓ نے جواب دیا کہ میں مسلمانوں کو چھوڑ کر محض اپنی جان بچانے کے لئے یہاں سے لوٹنے والا نہیں۔ حضرت عمرؓ خط پڑھ کر رو پڑے ــ رونا اس لئے نہیں تھا کہ تقدیر کے سلسلے میں وہ حضرت ابو عبیدہؓ کے انداز فکر سے متفق ہو گئے تھے بلکہ رونا اس احساس خلوص کی بنا پر تھا جو حضرت ابو عبیدہؓ کے جواب اور روش میں نور مبین کی طرح چمک دمک رہا تھا۔ آپ نے انھیں لکھا کہ جہاں فوج فروکش ہے وہ جگہ مرطوب بھی ہے اور نشیب میں بھی لہٰذا وہاں سے کسی اچھی اور مناسب جگہ منتقل ہو جاؤ۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے اس مشورے کو قبول کیا اور لشکر سمیت دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔

خوب تھے اللہ کے یہ عابد و زاہد بندے، سراپا جہاد۔ مجسم طاعت۔ مگر سادہ لوحی ایک الگ چیز ہے اگر امین الامت حضرت ابو عبیدہؓ فراست فاروقی کی روشنی میں غور کرتے تو یہ انتقال مکانی بھی ٹھیک ویسا ہی عمل تھا جسے انھوں نے "تقدیر سے فرار" کہہ کر رد کر دیا تھا۔ اگر تقدیر کا تدبیر سے کوئی تعلق نہیں تو پھر

لشکر کا پڑاؤ چاہے مرطوب جگہ میں ہو یا خشک جگہ میں، علاقہ نشیبی ہو یا پہاڑ جیسا فراز لئے ہوئے، نتائج و مضمرات یکساں ہونے چاہئیں، تقدیر تو اٹل ہے پھر رطوبت یا خشکی کیا بگاڑ سکتی ہے اور عمدہ آب و ہوا یا مینار جیسی بلندی کیا تبدیلی لاسکتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اگر مقامِ وبا سے چلے گئے تو یہ بھی لازماً درج تقدیر تھا اور حضرت ابو عبیدہؓ نہیں گئے تو یہ بھی مطابق تقدیر تھا۔ تقدیر سے فرار ممکن ہی نہیں۔ انسان جسے بظاہر فرار تصور کرسکتا ہے وہ بھی لازماً تقدیر ہی کے مطابق ہے، اسی لئے جدوجہد، تدبیر علاج، دور اندیشی، غور و فکر اور مشورے کی تلقین کی گئی۔

تقدیر کے معاملے کو ایک اور انداز میں دیکھئے تو تمام الجھنیں خود بخود صاف ہوجاتی ہیں، آپ سوچتے ہیں کہ قسمتیں لکھی جاچکیں تو اب سب کچھ لازماً اسی کے مطابق ہونا ہے۔ انسان مجبور ہے کہ خواہی نخواہی وہ کرے جو درج نصیب ہوچکا ہے۔ مگر یوں نہ سوچئے بلکہ یوں سوچئے کہ جو کچھ آدمی کرتا ہے وہی درج تقدیر بھی ہوتا ہے آغاز تقدیر سے نہیں بلکہ انسانی عمل سے کیجئے، کیونکہ تقدیر ایک امر غیبی ہے اور عمل امر حاضر۔ انسانی عقل منطق اور فہم و دراست کا سفر ہمیشہ محسوسات و معقولات سے شروع ہوتا ہے نہ کہ مغیبات سے۔ عمل کی بات شروع میں رکھئے اور تقدیر کی آخر میں تو معاملہ ذرا بھی پیچیدہ نہیں رہتا ہم جو کچھ کریں گے اپنے اختیار سے کریں گے، تقویٰ یا فسق بخل یا سخاوت، گناہ یا نیکی ہر ایک پر ہمیں دسترس دی گئی ہے۔ ہمیں اس حد تک مختار بنایا گیا ہے کہ نعوذ باللہ خدا یا رسولؐ کو ہم گالی بھی دیں تو ہماری زبان پر فالج نہیں گرے گا حلق آواز نکالنے سے انکار نہیں کرے گا، آسمان و زمین شق نہیں ہوں گے، لیکن یہ جو کچھ ہم نے کیا ہمارے رب کے علم میں پہلے سے تھا اور یہ علم کتاب تقدیر میں درج کیا جاچکا تھا۔ ہم سے کوئی بھی عمل ہمارے نوشتۂ تقدیر نے جبراً نہیں کرایا بلکہ جو کچھ ہم نے اپنی مرضی سے کیا وہی تقدیر میں درج ہوا۔ آئینے یا کیمرے جیسی مثال ہے مناظر کو جوں کا توں منعکس کرلینا ان دونوں کا کام ہے مگر مناظر کے کسی بھی حصے کی کوئی ذمہ داری ادنی درجے میں بھی ان پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ ہم بدصورت ہیں تو آئینے میں ہمارا بدصورت نظر آنا آئینے کی خطا نہیں اور خوبصورت ہیں تو اس کا کوئی کریڈٹ آئینہ کو نہیں پہنچتا۔ ہماری حالتِ شراب نوشی کا فوٹو یہ معنی نہیں رکھتا کہ کیمرہ بھی ہمارے گناہ کا کسی حد تک ذمہ دار ہے اور ہماری حالتِ عبادت کی تصویر یہ مفہوم نہیں رکھتی کہ ہمیں آمادۂ عبادت کرنے میں کیمرہ بھی حصہ لے رہا ہے آئینے اور کیمرے محض عکاس ہیں۔ بس اسی طرح کتاب تقدیر ہمارے افعال و اعمال کی عکسی کاپی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ یہ آلے فقط ان چیزوں کا عکس لے سکتے ہیں جو عالم حسیات میں ظہور پذیر ہیں مگر کتاب تقدیر نے اللہ کے علم غیب کے توسط سے ان اشیاء کا عکس لے لیا ہے جو عالم حسیات میں ابھی تک ظاہر نہیں ہوئی تھیں مگر آگے کو اپنے وقت پر ظاہر ہونی تھیں۔

محدود پیمانے پر اس کی مثال اُن آلات کی سی سمجھئے جو پیشگی ہی اطلاع دیدیتے ہیں کہ طوفان آرہا ہے بارش ہونے والی ہے، آندھی اٹھنے والی ہے، یہ آلات انسان کے بنائے ہوئے ہیں اور انسان کا علم علم خداوندی کے مقابلے میں ہے ہی کیا۔ ذرے اور صحرا کی بھی نسبت نہیں۔ پھر بھی اگر دس بیس گھنٹے قبل اطلاع پالینے کی تکنک یہ ظلوم و جہول انسان دریافت کرسکتا ہے تو خدا کے بارے میں یہ سمجھنا آخر کیا دشوار ہے کہ اسے طویل مدت پہلے آنے والے احوال و کوائف کا علم حاصل تھا اور اسی علم کو اس نے حوالۂ قلم کردیا۔ حوالۂ قلم کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ بندے ایسا ہی کریں گے جیسا حوالۂ قلم ہوچکا بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسا بندے کریں گے ایسا ہی درج تقدیر ہوگیا ــــ تقدیر آئینہ ہے احوالِ کائنات کا اور کائنات کی مختار مخلوق جو کچھ بھی کرتی ہے اس کا

عکس اس میں موجود ہے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ مسئلہ تقدیر کی یہ تشریح و توجیہ محض دماغی اپج ہے اور قرآن و حدیث میں اس کی کوئی بنیاد نہیں سورۂ اعراف میں عہدِ ازل کا بیان دیکھئے :۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰي شَهِدْنَا (آیت ۱۷۲)	اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے انکی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب ؟ بولے ہاں ہے ہم اقرار کرتے ہیں (ترجمہ شیخ الہند)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ماؤں کے پیٹوں اور باپوں کی پیٹھوں سے جتنے بھی انسان پیدا ہوئے اور قیامت تک ہوں گے وہ سب ایک بار پہلے ہی وجود کے ایک ایسے مرحلے سے گذر چکے ہیں جس کے کم و کیف کو سمجھنا اگرچہ انسان کے بس کی بات نہیں لیکن جس سے انکار کی بھی کوئی گنجائش قرآن کو کتاب الٰہی ماننے والوں کے لئے نہیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنی تفسیر میں شاہ ولی اللہؒ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ :۔

"اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا۔ پھر پشت میں داخل کیا۔" (صؔ ۲۰۱)

تھوڑا علم رکھنے والے اس کا یہ مطلب بھی سمجھ سکتے ہیں کہ تخلیق اول اور عہدِ ازل کا یہ واقعہ حضرت آدمؑ کی صرف دو پشتوں کے ساتھ پیش آیا، تمام پشتوں کے ساتھ نہیں۔ لیکن حقیقت یوں نہیں ہے۔ خود شاہ ولی اللہؒ کا اور علامہ عثمانیؒ کا مدعیٰ محض دو پشتوں کے ذکر سے یہ نہیں ہے کہ بقیہ پشتوں سے عہد نہیں لیا گیا، عہد تمام نسل انسانی سے لیا گیا ہے۔ یہاں علامہ عثمانیؒ هَلُمَّ جَرًّا جیسا کوئی لفظ حوالۂ قلم کر دیتے تو بات واضح ہو جاتی مگر چونکہ تمام نسل انسانی کی بات اہلِ علم میں مسلمات کا درجہ رکھتی ہے اس لئے انھیں ایسا کوئی لفظ ضروری نہیں معلوم ہوا۔ مقصود ان کا بھی اور شاہ ولی اللہؒ کا بھی یہی ہے کہ قیامت تک کی ہر نسل انسانی کو اس کے آباء کی پشت سے نکالا گیا اور پھر اقرار لیا گیا کہ میں ہی تمہارا رب ہوں۔

کتب تفسیر میں حضرت ابی بن کعب کی تفصیلی روایت اس آیت کی تفسیر میں ملتی ہے، خود قرآن کا بیان ناطق ہے کہ تمام ہی نسلِ انسانی سے عہد لیا گیا، عہد لینے کی جو وجہ اور مصلحت خود باری تعالیٰ نے اگلی آیت میں بیان فرمائی وہ خود اس بات کو مستلزم ہے کہ ہر ہر نسل سے عہد لیا گیا ہو، اگر ایک نسل بھی مستثنا کر دی جائے تو توجیہہ قرآنی ناقص رہ جاتی ہے۔

یہاں موضوع عہدِ الست نہیں ورنہ احادیث و تفاسیر سے بہت کچھ مواد پیش کر دیا جاتا یہاں تو بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ آج ہم میں سے جو بھی انسان (خواہ وہ مذکر ہو یا مؤنث) ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے وہ حقیقتاً عدم محض سے (دائرۂ وجود میں نہیں آتا بلکہ ایک بار قبل جامۂ وجود پہن چکا ہے اور ایسا جامۂ وجود جس میں شعور اور فہم و ادراک بھی موجود تھے۔ محض ایک تصوراتی وجود ہوتا تو عہدِ الست سے کچھ حاصل نہ ہوتا، آیات متعلقہ اس پر ناطق ہیں۔ لہٰذا یہ بات کہ آج ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ آئینۂ تقدیر میں منعکس ہے یہ معنی نہیں رکھتی کہ واقعہ بعد میں پیش آئے اور عکس پہلے آ چکا ہو۔ اگرچہ قدرتِ خداوندی کا حوالہ دینے کے بجائے عہدِ الست کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ عکس پہلے نہیں بلکہ عین واقعے کے وقت ثبت ہوا ہے، قرآن نے تمام نسل انسانی کو روزِ ازل بیک وقت تخلیق کرنے اور مخاطب کرنے اور عہد لینے کی خبر دی ہے مگر یہ نہیں کہا کہ یہ عہد لیتے ہی فوراً ان نسلوں کو معدوم کر دیا گیا۔ ہو سکتا ہے یہ نسلیں وجود کی ایک ایسی سطح پر جسے ہماری محدود صلاحیتیں حیطۂ خیال میں نہیں لا سکتیں اتنے عرصے تک زندہ رکھی گئی ہوں کہ جو کچھ انھیں دنیا میں کرنا ہے

وہ سب انھوں نے کر ڈالا ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ عرصۂ طویل دعرض میں حیاتِ دنیاوی کے مطابق ہی ہو آپ دیکھتے ہیں کہ خود انسان نے ایسے طریقے دریافت کرلئے ہیں جن سے ہزار صفحے کی کتاب کا عکس ماچس کی ڈبیا میں بند ہوجاتا ہے اور باریک تار کے چھوٹے سے لچھے میں بے شمار آوازیں ٹیپ ہوجاتی ہیں پھر خدائے باکمال کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ وقت کے سائز کو سمیٹ کر انسانی نسلوں کا وہ پورا کردار ملاحظہ فرمالے جسے وہ دنیا میں ادا کرنے والی ہیں۔ کیا بیج اور نطفہ اللہ کے اس کمال کا جیتا جاگتا ثبوت نہیں کیا ایٹم نے یہ واضح نہیں کردیا کہ اللہ تعالیٰ پہاڑ کو رائی میں اور سمندروں کو قطرے میں سمو دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ دنیا کے لاکھ سال ازل کے صرف چند منٹوں میں تبدیل کر دیئے گئے ہوں اور نسل انسانی طویل مدت میں جو کچھ صفحۂ ہستی پر کرنے والی ہے وہ تھوڑے سے عرصہ میں اسٹیج ہوگیا تو اس میں عقلاً کوئی مضائقہ ہے نہ قیاساً کوئی بُعد۔ لہٰذا صورت یہی کہ جو کچھ نسل انسانی نے کیا وہی علم الٰہی میں منعکس ہوا اور اسی عکس کو قلم کے ذریعے حوالۂ تقدیر کردیا گیا نہ جبر کا سوال۔ نہ دوسری کوئی الجھن بلکہ اس توجیہ سے بعض ایسی احادیث کی منطقی توجیہہ کی قوت مل جاتی ہے جن کی تہ تک پہنچنا آسان بات نہیں ہے۔

مثلاً حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

"تم میں سے ہر ایک کا ٹھکانا پہلے لکھا جاچکا ہے کہ جنت ہوگا یا دوزخ، صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ۔ کیا ہم نوشتۂ تقدیر پر قناعت کرکے عمل چھوڑ دیں؟ آپؐ نے جواب دیا کہ عمل تو بہرحال کرو، جو شخص جس ٹھکانے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اسی کے مطابق اس پر عمل بھی آسان کردیا گیا ہے۔" (مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر)

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

"کچھ لوگوں کو اللہ نے جنت کے لئے پیدا کیا اور کچھ کو دوزخ کے لئے۔ یہ فیصلہ اس وقت لکھا تھا جب وہ اپنے باپوں کی پشتوں میں تھے (یعنی پیدائش سے قبل)" (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

"اللہ نے لکھ دیا ہے ابن آدم پر زنا میں سے اس کا حصہ کہ لازماً وہ اسے پہنچے گا پس آنکھ کا زنا دیکھنا ہے، زبان کا زنا بولنا ہے اور نفس کا زنا زنا کی تمنا کرنا ہے۔ اور ہاتھ کا زنا لمس ہے اور پاؤں کا زنا چلنا ہے (بدکاری کے لئے)" (مشکوٰۃ)

اس طرح کی تمام حدیثیں زیادہ قابلِ فہم ہوجاتی ہیں اگر متذکرہ توجیہہ کو قابلِ لحاظ تصور کرلیا جائے۔ اس صورت میں صورتِ واقعہ یوں ہوگی کہ پیدا ہونے والوں کے جنتی اور دوزخی یا شقی اور سعید ہونے کا پیشگی فیصلہ اللہ نے بلا وجہ نہیں کردیا بلکہ جو کردار نسلِ انسانی ازل کی حیاتِ مثالی میں پیش کرچکی ہے اسی کا عکس آئینۂ تقدیر میں آگیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں مسئلہ تقدیر پر اتنی ہی بحث کافی ہے۔ یہ بات تو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ امورِ غیب کے سلسلے میں بحث و نظر اور دلیل و منطق سے وہ نتائج نہیں نکل سکتے جو امورِ ظاہر کے سلسلے میں نکلتے ہیں۔ ابہام کا غبار اور خفا کا پردہ بہرحال درمیان میں حائل رہے گا یہاں ریاضی اور ٹکنالوجی اور فلسفہ و منطق اور سائنس کے جملہ علوم و فنون بے بس ہیں۔ وحی الٰہی پر اعتماد ہی وہ واحد شئے ہے جو دل و دماغ کو اطمینان اور وجدان و احساس کو تشفی بخش سکتی ہے ❊ ❊ ❊

تابع کردیئے جائیں تو بات بہت بگڑ جائے گی، اسی وجہ سے فقہاء نے اس کی فرمانبرداری کو واجب اور مقدم قرار دیا اور یہ بات اپنے مصالح و منافع کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ طاب اللہ ثراہم۔

تعدیل و توازن

کچھ اشارے ہم پہلے بھی کر آئے ہیں کہ والدین کی فرمانبرداری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے سامنے کسی اور مصلحت کا لحاظ ہی نہیں ہوگا، کچھ تفصیل رفاہِ عام کی غرض سے اب پھر پیش کرتے ہیں، اس کے بعد دوسرا موضوع شروع ہوگا۔

کسی کام کی انجام دہی شرعاً آپ پر واجب ہو یا کسی کام کا انجام دینا شرعاً حرام ہو تو دونوں ہی صورتوں میں والدین کی اطاعت ساقط ہوجاتی ہے، وہ اگر واجب کام سے روکیں یا حرام کام کا حکم دیں تو اطاعت ناجائز ہے — اس کلیے کے تحت وہ تمام صورتیں آگئیں جن میں والدین کی فرمانبرداری یا ان کے ساتھ حسن سلوک سے دوسروں کے جائز حقوق متاثر ہوتے ہوں۔

بیوی بچوں کے حوائج ضروریہ کا انتظام کرنا اور انھیں معروف حد تک آرام و آسائش سے رکھنا مرد پر واجب ہے، اب اگر ایک شخص کی آمدنی صرف اتنی ہی ہے کہ بیوی بچوں کا گذارہ کھینچ تان کے ہوتا ہے تو اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ بمشکل کفایت کرنے والی آمدنی میں سے ماں باپ کو اتنا دے دے کہ بال بچے آفت میں پڑ جائیں اور جو خشک نوالہ اور موٹا جھوٹا کپڑا انھیں نصیب تھا اس میں بھی کٹوتی ہوجائے۔

اسی طرح عورت کا شرعاً یہ حق ہے کہ اگر وہ ساس سسر کے ساتھ رہنے میں تکلیف محسوس کرتی ہے تو شوہر سے الگ رہنے کا مطالبہ کرے، الگ رکھنے کا انتظام اگر شوہر کے لئے ناممکن نہ ہو تو اس مطالبہ کو پورا کرنا اس پر واجب ہے چاہے اس کے والدین راضی ہوں یا نہ ہوں۔

زید کی آمدنی اتنی کم ہے کہ بیوی بچوں کو آسائش نصیب نہیں، آسائش سے مراد تعیش اور نوابی نہیں بلکہ وہ آسائش ہے جو ہر انسان کا جائز حق ہے، آمدنی بڑھانے کا ذریعہ یہاں ہاتھ نہیں آرہا، اب وہ سوچتا ہے کہ فلاں شہر جاؤں وہاں فلاں ذریعہ سے میرے لئے رزق کی راہ کشادہ ہوسکتی ہے، والدین کہتے ہیں مت جاؤ، جیسے کچھ بھی ہو یہیں رہو، جاؤ گے تو ہم ناراض ہوجائیں گے، تو کیا زید پر والدین کا حکم ماننا واجب ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کی مالی حالت اگر اتنی گری ہوئی ہے کہ بال بچوں کو کبھی کبھی فاقے کی بھی نوبت آجاتی ہے اور تن کا کپڑا بھی ضروری مقدار میں نصیب نہیں تب تو یہ حکم ماننا قطعاً حرام ہے اور سفر واجب و لازم۔ اگر اس درجہ حالت گری ہوئی نہیں ہے مگر معروف معیار سے کم بہرحال ہے تو یہ حکم ماننا اور نہ ماننا دونوں اس کے اختیار میں ہیں، مانے گا تو گناہگار نہ ہوگا، نہ مانے گا تب بھی قصوروار نہ ٹھہرے گا۔

حدیث میں آیا ہے انت ومالك لابيك (تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے) اس سے ظاہر پرستوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ کوئی قانونی حکم ہے اور واقعۃً اولاد کا مال اسی طرح باپ کی ملک ہے جیسے اولاد خود اس کی ملک ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں حضورؐ ہی نے فرمایا ہے کہ لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منه (کسی شخص کا مال دوسرے کے لئے حلال نہیں جب تک صاحب مال کی رضا و رغبت نہ پائی جائے) نیز دیگر آیات و احادیث اس پر ناطق ہیں کہ ایک کی خاطر دوسرے کی حق تلفی جائز نہیں پھر مذکورہ حدیث سے اگر سچ مچ ملکیت مراد لے لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ہر باپ بیٹے کی بیوی کو طلاق دینے کا حق قرار پائے اسے یہ بھی حق ہو کہ بیٹے کی ساری تنخواہ خود رکھ لے چاہے بیٹے کے بال بچے بھوکے مرا کریں۔

امام محمدؒ نے بجا فرمایا کہ والدین اولاد کے مال میں سے صرف اتنا ہی لینے کا حق رکھتے ہیں جتنا ان کی ضروریات کے لئے مکتفی ہو، اس سے زیادہ لینا اولاد کی مرضی پر منحصر

ہوگا۔ اگر اولاد کی رضا کے بغیر لیا تو وہ قرض ہوگا جس کی ادائگی ان پر لازم ہوگی اور نہیں ادا کریں گے تو آخرت کی جوابدہی ان کے ذمہ رہے گی۔ امام ابو حنیفہؒ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

لیس للاب من مال	بیٹے کے مال میں باپ کا صرف اتنا ہی
ابنہ الّا ان محتاج الیہ	حصہ ہے کہ کھانے پینے اور تن
من طعام او شراب	ڈھانکنے میں جتنے کا وہ محتاج
او کسوۃ	ہو اتنا لے لیں۔

ایک اور بات ملحوظ رہے انسان کو اپنے نفس کا حق بھی حدیث سے ثابت ہے۔ ان لنفسك علیك حقاً (یقیناً تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے) اس کے تحت بعض ایسی صورتوں میں بھی والدین کی اطاعت ضروری نہیں رہتی جن میں وجوب یا حرمت کا معاملہ نہ ہو۔ مثلاً آپ کسی حلال مقصد سے بمبئی کا سفر کرنا چاہتے ہیں، حلال سے مراد یہ ہے کہ یہ سفر ضروری نہ ہو مگر مقاصد فاسدہ پر بھی مبنی نہ ہو۔ زمانہ امن کا ہے جس میں یہ سفر ہر خطرہ سے خالی ہے، آپ کے والدین ایسی حالت میں نہیں ہیں کہ آپ کے چلے جانے سے ان کے ضروری آرام و راحت میں خلل پڑے، کافی پیسہ ہے، خادم ہیں، کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے جس کی بنیاد پر وہ آپ کو سفر سے روکیں، مگر خواہ مخواہ وہ روکتے ہیں۔ نہیں چاہتے کہ چند روز کے لئے بھی آپ ان کی نظروں سے اوجھل ہوں تو ایسی صورت میں ان کی تعمیل حکم ضروری نہیں۔ آپ اس حکم کو نظر انداز کر کے سفر کریں گے تو گنا ہگار نہ ہوں گے کیونکہ آپ نے اپنے نفس کا حق ادا کیا ان کا کوئی حق نہیں مارا، ہاں اگر نفس پر جبر کر کے ان کی اس غیر معقول خواہش پر سر تسلیم خم کر دیں تو یہ اطاعت کا اونچا درجہ ہوگا۔ جس کا ثواب آپ کو ملے گا۔ گویا ایسی حالت میں تعمیل درجۂ استحباب میں ہے نہ کہ مرتبۂ وجوب میں۔

آثار صحابہ میں دو واقعے ایسے ہیں جن سے کچھ لوگوں کو حقوق الوالدین کے فہم میں غلطی کا شکار ہونا پڑا ہے ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انھوں نے اپنے بیٹے کو حکم دیا تھا کہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے اور بیٹے نے باوجود انتہائی رنج و کرب کے طلاق دیدی تھی، دوسرا حضرت عمرؓ کا، انھوں نے بھی بیٹے کو ایسا ہی حکم دیا تھا مگر بیٹے نے نہیں مانا تھا تب حضرت عمر رسول اللہؐ کی خدمت میں تشریف لے گئے تھے اور حضورؐ نے ان کی رائے کو صائب سمجھتے ہوئے ابن عمر کو حکم دیا تھا کہ طلاق دے دو۔

ان دونوں واقعوں سے بعض حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ والدین کی خواہش پر بیوی کو طلاق دیدینا علی الاطلاق واجب ہے حالانکہ یہ اسلامی انصاف اور شریعت کی اسپرٹ کے سراسر خلاف ہے، واجب تو کیا ہوتا جائز بھی نہیں اگر والدین بغیر وجوہ معقول کے ایسا حکم دے رہے ہوں حضرت ابوبکر نے صاحبزادے کو حکم طلاق اس لئے دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی محبت میں مناسب حد دل سے گذر گئے تھے، انھیں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ حقوق اللہ میں حائل ہونے والی محبت گناہ ہے، نماز جمعہ تک سے غفلت پر نوبت پہنچ گئی تھی، اس سے زیادہ معقول وجہ کیا چاہئے۔

حضرت عمر نے کس لئے حکم دیا تھا اس کی تفصیل ہمارے سامنے نہیں مگر حضرت عمرؓ جیسے کچھ تھے وہ ہم اور آپ جانتے ہیں، ممکن ہی نہیں کہ ان جیسا عدل پرور، خدا ترس اور پیکر زہد و ورع بغیر کسی سبب شرعی کے بیٹے کو حکم طلاق دیتا پھر اللہ کے رسول کا اس پر صاد کر دینا سب سے بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ حکم کی بنیاد معقول ترین سبب شرعی پر رہی ہوگی ورنہ جانوروں تک کے حقوق پر نگاہ رکھنے والا پیغمبر کیا ابن عمر کی بیوی کا حق تلف کرنا پسند کرتا۔

یہ بالکل طے ہے کہ بغیر ایسے سبب معقول کے جسے شریعت بھی تسلیم کرتی ہو، ماں باپ کے حکم و خواہش پر کسی کی حق تلفی جائز نہیں ہے، آدمی اپنے نفس کے حق کی قربانی بے شک دے سکتا ہے مگر دوسروں کے حقوق پر اسے یا اس کے والدین کو اختیار حاصل نہیں جب تک کہ شریعت ہی کوئی مضبوط بنیاد فراہم نہ کر دے۔

شرح صحیح مسلم

کتاب الایمان

تقدیر پر ایمان

تقدیر کا مسئلہ ان نازک ترین اور دقیق مسائل میں سے ہے، جنھیں عقل و منطق کی ترازو میں تولنا ایسا ہی ہے جیسے خوشبو کو پیمانے سے ناپنے اور مزے کو کسوٹی پر گھسنے کی کوشش کی جائے۔ عقل و منطق جیسا کہ ہم پچھلے صفحات میں توضیح کرچکے ہیں جن بنیادوں پر اپنی عمارت اٹھاتی ہیں وہ بنیادیں ہی انھیں امورِ غیب کے سلسلے میں میسر نہیں اور تقدیر نہ صرف امرِ غیب ہے بلکہ اکثر دوسرے امورِ غیب سے زیادہ دقیق اور پیچیدہ ہے، پھر کیسے ممکن ہے کہ بحث و نظر کے ذریعے اس مسئلے کو دو اور دو چار کی طرح صاف کیا جاسکے، اس مسئلے پر سلف و خلف نے جو مبسوط بحثیں کی ہیں ان میں سے اکثر کے مطالعے کی سعادت ہمیں نصیب ہے، لیکن یہ دعویٰ کرنا کسی نے بھی اسے عقلی سطح پر تام حل کردیا ہے مبالغہ ہی ہوگا، حل صرف ان حدود تک ممکن ہے جہاں تک علم و فہم کی دسترس ہے۔ ان حدود کے آگے پھر ایسی وادی شروع ہو جاتی ہے جہاں علم و فہم کے طائر پر نہیں مار سکتے، لہٰذا ہم بھی بس محدود ہی پیمانے پر اس مسئلے کو زیرِ بحث لائیں گے اور قارئین سے گزارش کریں گے کہ وہ انسانی عقل و علم پر غلو آمیز بھروسہ کرنے کے بجائے وحیِ الٰہی اور تعلیماتِ نبوی پر ذہن و قلب کو مرکوز رکھیں اور اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہر وہ بات عین حق ہے جو اللہ اور رسول ﷺ سے ہم تک پہنچی خواہ اس کا منطقی تجزیہ ہمارے لئے ممکن ہو یا نہ ہو۔

حدیثِ باب میں جو کہا گیا ہے کہ و تؤمن بالقدر خیرہ و شرہ (یعنی ایمان یہ ہے کہ تو تقدیر کے خیر اور شر پر یقین رکھے) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی اس عالم میں پیش آتا ہے ۔ خواہ وہ افراد کی زندگی میں ہو یا جماعتوں کی اور خواہ اس کا تعلق ستاروں کی دنیا سے ہو یا زمین کی اندرونی تہوں سے وہ سب کا سب پہلے سے مقدر ہے۔ نفع نقصان تلخی، شیرینی، رنج، خوشی، حوادث اتفاقات، کسی کا کوئی امتیاز نہیں ۔ جن واقعات کو انسان اتفاقات پر مبنی قرار دیتا ہے وہ بھی انسان ہی کی نسبت سے "اتفاقات" ہیں مگر تقدیرِ الٰہی کی نسبت سے ٹھیک دوسرے ہی واردات و واقعات کی طرح مقدر اور معین ہیں ۔ نیز جن افعال و اعمال کو انسان جرم و گناہ کے خانہ میں رکھتا ہے اور آسمانی شریعتوں نے بھی انھیں ممنوع قرار دیا ہے وہ بھی قضاءِ الٰہی سے ہی مربوط ہیں، یعنی تقدیر کا جز ہیں اور ان کا صدور اللہ کی اجازت اور ارادے کے بغیر نہیں ہوا ہے اس حقیقت پر قرآن نے بار بار روشنی ڈالی ہے مثلاً سورۂ نساء میں اکثر لوگوں کا حال بیان کیا گیا کہ جب انھیں کوئی بھلائی (نفع، مسرت، راحت) پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے مگر جب کوئی برائی (نقصان، رنج، کلفت) پہنچتی ہے

تو کہتے ہیں کہ اے پیغمبر یہ تمہاری طرف سے ہے (آیت) تو اے پیغمبر کہہ دیجئے کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ (سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے (اللہ کی طرف سے ہونے کا لازمی مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی پیش آیا ہے خواہ وہ انسانوں کی نسبت سے اچھا تھا یا برا، نفع بخش تھا یا ضرر رساں، اللہ تعالیٰ کے ارادے ہی سے پیش آیا ہے ایسا نہیں ہے کہ اس نے ارادہ نہ کیا ہو اور واقعات ظہور میں آتے چلے گئے ہوں۔ ارادے کا ثبوت بھی صراحۃً قرآن میں موجود ہے۔ سورۃ انعام کی آیت ۱۲۵ میں فرمایا گیا فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ الآیہ (پس جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو قبول اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے اللہ گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو نہایت تنگ کر دیتا ہے) یہاں جس طرح ہدایت کو اللہ نے اپنے ارادے سے وابستہ فرمایا ٹھیک اسی طرح گمراہی کو بھی اپنے ارادے ہی سے وابستہ فرمایا حالانکہ گمراہی خود اللہ کو ناپسند ہے، گمراہی وہ بدترین شے ہے جس سے تاکید و اصرار کے ساتھ روکا گیا ہے اور پیغمبروں کی بعثت ہی گمراہی دور کرنے کے لئے ہوتی رہی ہے۔ پھر بھی اگر کسی فرد یا گروہ کا گمراہ ہونا اللہ کے ارادے کے بغیر ممکن نہیں تو ظاہر ہوا کہ تقدیر یا دوسرے الفاظ میں قضائے الٰہی نے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اللہ کے ارادے یا فیصلے کو ہی ہم محاورۃً "مشیت" سے تعبیر کرتے ہیں، ہر شے کا حتیٰ کہ درخت سے ایک پتہ ٹوٹ کر گرنے اور پودے میں ایک کونپل پھوٹنے کا بھی سوال خدا کی مشیت کے بغیر پیدا نہیں ہوتا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ارادہ ہر شے پر حاوی ہے اور کسی بھی کائن (ہونے والی شے) کے بارے میں یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ وہ مشیت الٰہی کے خلاف ہو گئی، چاہے وہ شے بدترین ہو یا بہترین، گناہ ہو یا ثواب ظلم ہو یا عدل۔

چند آیات اور تازہ کر لی جائیں تاکہ تقدیر، مشیت اور قضائے الٰہی کا یقین کبھی مضمحل نہ ہو، سورہ انعام کے چودھویں رکوع میں فرمایا گیا:۔

"وَلَوْ اَنَّنَا الآیہ۔ اور اگر ہم ان پر فرشتے اتاریں اور مردے ان سے گفتگو کریں اور ہر چیز کو ہم ان کے سامنے ہی زندہ کر دیں تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں، اِلّا یہ کہ اللہ چاہے۔"

گویا ان کا ایمان لانا اللہ کے ارادے پر موقوف ہے ورنہ کوئی معجزہ ان کے قلب و ذہن کو قبول ایمان پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ اگلی آیت میں فرمایا گیا:۔

"وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ مَا فَعَلُوْہُ — اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ حرکتیں (جن کا ذکر ماسبق میں ہوا) نہ کرتے۔"

سورۃ انفال کے دوسرے رکوع میں غزوۂ بدر کے تعلق سے ارشاد ہوا۔

"فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ الآیہ — پس اے مسلمانو تم نے ان (کفار) کو نہیں قتل کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا اور اے پیغمبر! جب تم نے لشکر کفار کی طرف (مٹھی بھر سنگریزے) پھینکے تھے تو حقیقتاً یہ تم نے نہیں پھینکے تھے بلکہ اللہ نے پھینکے تھے۔"

ظاہر ہے مادّی سطح پر تو پھینکنے کا عمل حضورؐ ہی سے صادر ہوا تھا، لیکن اس عمل کا اصل محرک اور مصدر اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی نہ کہ خود حضورؐ کی کوئی مافوق البشر قوت۔ چنانچہ ظاہری حیثیت کو ناقابلِ لحاظ قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے صریح لفظوں میں فرمایا کہ پھینکنے والے ہم تھے، ہمارے ارادے اور فیصلے ہی نے تمہارے ہاتھ سے کنکریاں پھنکوائیں اور پھر انھیں

لشکر کفار کے لئے بلائے بے درماں بنا دیا۔

اس آیت کی تمثیل یوں سمجھئے کہ زید کسی کے چانٹا مارتا ہے تو یوں نہیں کہتے کہ زید کے ہاتھ نے چانٹا مارا بلکہ یوں کہتے ہیں کہ زید نے چانٹا مارا، حالانکہ چانٹا براہِ راست ہاتھ رسید کرتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی فعل و عمل ہو اس کی نسبت ان اعضاء کی طرف نہیں کی جاتی جن سے وہ ظہور میں آرہا ہے بلکہ اُس انسان کی طرف کی جاتی ہے جس کے ارادے سے اعضاء نے حرکت و جنبش کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ارادے ہی کو اصل اہمیت حاصل ہے اور اعضاء و جوارح تو اس کے تابع ہیں۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ انسانی افعال و اعمال کے سلسلے میں مشیت ایزدی کا ہے کہ جب تک مشیت الٰہی کارفرما نہ ہو انسان کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ اللہ افعال و اعمال ہی کا نہیں اُس ارادے کا بھی خالق ہے جو انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے اور اس مشینری کا بھی جو ارادے، تصور، نیت، آمادگی اور اقدام پر قدرت دیتی ہے۔ پتھر اور درخت ارادہ و اقدام نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے اجسام میں وہ مشینری ہے ہی نہیں۔

سورۂ قصص، رکوع ۶ میں فرمایا گیا:۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ الآیہ ۔ اے پیغمبر!
کسی کو ہدایت کی راہ پر لانا تمہارے اختیار
کی چیز نہیں۔ یہ اختیار و قدرت تو اللہ ہی کا
حصہ ہے کہ جسے چاہے راہ ہدایت دکھلائے۔"

حضورؐ کتنا چاہتے تھے کہ آپ کے چچا ابوطالب ایمان لے آئیں، مگر یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ پھر آپ نے چاہا کہ وہ مرتے وقت ہی کلمہ پڑھ لیں مگر یہ بھی نہ ہوا، اب دیکھ لیجئے وہ سب کچھ موجود تھا جو دوسرے حضرات کے لئے قبول ایمان کا وسیلہ بنا، پیغمبرؐ کی ذاتی خواہش اور کوشش بھی موجود تھی۔ دعا، دوا دونوں کارفرما لیکن تقدیر الٰہی کا نوشتہ کون بدل سکتا، اسی سلسلے میں یہ آیت اتری اور فرمایا گیا وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ (اور وہی اللہ خوب جانتا ہے کہ کون لوگ راہِ راست پر آنے والے ہیں) یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ جہاں تک علم ظاہری کا تعلق ہے یعنی واقعہ پیش آگیا اور اس کے بعد انسان نے اسے جانا تو ایسے علم کا اس آیت میں ذکر نہیں کیونکہ یہ تو انسان کو بھی حاصل ہے، ابوطالب جب قبولِ ایمان ہی کے بغیر مر گئے تو کیا حضورؐ اور کیا صحابہؓ سب نے جان لیا کہ ابوطالب ہدایت پانے والوں میں نہ تھے۔ لہٰذا جس علم خصوصی کا ذکر آیت میں اللہ نے اپنے لئے کیا ہے وہ وہی علم ہے جو ابوطالب کی موت سے قبل تھا۔ بس یہی علم تقدیر الٰہی ہے اور اسی کو اللہ تعالیٰ نے تخلیق کائنات سے قبل ایک ایسی کتاب میں لکھ دیا ہے جس کی صورت ہیئت کیفیت وغیرہ کا تصور انسانی دسترس میں نہیں اور لکھنا بھی اللہ کا ایسا نہیں جس سے ہم متعارف ہوں بلکہ ایسا جس کے کیف و کم کا کوئی نقشہ انسان بنا ہی نہیں سکتا۔

سورۂ تکویر میں فرمایا گیا:۔

" یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے پورے
جہان کے لئے، جو کوئی تم میں سے چاہے
کہ سیدھا چلے اور تم جبھی چاہ سکتے ہو
کہ سارے جہان کا مالک اللہ چاہے۔"

وہی مشیت ایزدی۔ قصدِ خداوندی، قضائے الٰہی یعنی ہدایت، گمراہی، سعادت، شقاوت، برکت، نحوست سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، تقدیر کے تابع ہے، فیصلہ سے منسلک ہے۔ اسی لئے معراجِ ایمان یہ قرار پائی کہ بندہ راضی بہ رضا رہے، اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی کوشش اور مخلوق خدا کو صراطِ مستقیم پر لانے کی جدوجہد اس پر یقیناً لازم ہے لیکن اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو، خواہ اسے کامیابی ہو یا ناکامی، لوگ ایمان لائیں یا کفر پر جمے رہیں، بدکار برائیاں چھوڑ دیں یا اور زیادہ بدی پر آمادہ ہو جائیں۔ انصاف کا تخت بچھے یا ظلم ہی ظلم کی بادشاہت ہو، بندۂ مومن کو ہر حال میں راضی بہ رضا اور شاکر

رضا ہے ۔۔ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جب گناہ، ظلم، بدکاری سبھی کچھ قضاء الٰہی کے تابع ہے اور قضاءِ الٰہی پر راضی رہنا مومن پر واجب ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گویا ظلم و معصیت پر راضی رہنا واجب ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قضاء (فیصلہ) اور مقتضیٰ (جو فیصلہ کیا جائے) یا تقدیر اور مقدور دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ جو قضاء پر راضی ہو وہ مقتضیٰ پر بھی راضی ہو، مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے رحلت صحابہؓ کے لئے ایک ایسی ناپسندیدہ اور تکلیف دہ چیز تھی کہ اگر انھیں حضورؐ کی موت اور زندگی کا اختیار دیدیا جاتا تو کبھی بھی کسی قیمت پر وہ موت کا نام نہ لیتے۔ مگر جب قضاءِ الٰہی سے حضورؐ رحلت فرما گئے تو صحابہؓ صبر و رضا کا مجسمہ بن گئے وقتی طور پر بعض اجل صحابہؓ مثلاً حضرت عمرؓ صبر و رضا کی حدود سے باہر بھی ہوئے تھے مگر دوسرے صحابہ کی بروقت تنبیہ نے انھیں جھنجھوڑ دیا تھا اور فوراً ہی وہ صبر و رضا کے دائرے میں لوٹ آئے تھے، تو دیکھ لیجئے کہ مقتضیٰ پر نہیں بلکہ وہ قضاء پر راضی ہوئے، حضورؐ کا دنیا میں نہ ہونا اب بھی ان کے لئے باعث رنج و اذیت تھا مگر اس واقعہ کا ظہور جس قضائے الٰہی کے تحت ہوا اس سے بہرحال وہ راضی ہو گئے تھے۔

اسی طرح شیطان کا معاملہ ہے، اس کا سجدہ نہ کرنا اور پھر ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو کر کائنات کے ڈرامے میں مستقل ویلن بن جانا، نیکوں کو بہکانا اور بدوں کی حوصلہ افزائی کرنا کس مومن کو پسند آسکتا ہے، ظاہر ہے شیطان اور اس کا مشن قابل نفرت ہے، اہل ایمان برابر اس پر لعنت بھیجتے ہیں لیکن شیطان کی پیدائش، اس کی سرکشی، اس کا کردار سبھی کچھ قضائے الٰہی اور ارادۂ خداوندی کے بغیر تو وجود میں نہیں آگیا، لہٰذا اس قضا اور ارادے پر اہل ایمان یقیناً راضی ہیں وہ یہی یقین رکھتے ہیں کہ اللہ نے جو کچھ کیا بہتری تھا مصلحت اسی میں تھی، عالم ایجاد کی اسکیم ناقص رہتی اگر ابلیس تخلیق نہ کیا جاتا۔

کفر کا بھی معاملہ ایسا ہی ہے، اس کی نسبت اللہ کی طرف بحیثیت خلقت و ایجاد اور باعتبار فاعلیت ہے جبکہ بندوں کی طرف اس کی نسبت بطور وصف اور بطور محلیت ہے۔ اللہ نے خود قرآن میں فرمایا کہ ہم چاہتے تو پورے عالم میں ایک بھی کافر نہ ہوتا۔ ہر شخص اسلام قبول کر لیتا اس کا مطلب ظاہر ہے کہ اللہ نے ایسا نہیں چاہا اور جو کچھ چاہا وہ یہی ہے کہ اسلام بھی ہو اور کفر بھی۔ اطاعت بھی ہو اور سرکشی بھی۔ لہٰذا اہل ایمان اللہ کے اس فیصلے اور قضاء پر راضی ہیں مگر اس پر راضی نہیں کہ بندے اپنے اختیار اور کسب سے صفت کفر قبول کر لیں، سرکش بنیں، شیطان کی راہ چلیں۔ رضا کا تعلق کفر کی اس پوزیشن سے ہے کہ وہ اللہ کی ایجاد اور تخلیق ہے اور ناراضی کا تعلق اس پوزیشن سے کہ بندے اسے اپنے دل و دماغ میں اتاریں اور مختار ہو کر صراط مستقیم کے عوض جادۂ گمراہی پر چلتے رہیں

اب اس سے پہلے کہ عقیدۂ تقدیر پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا جائے بہتر ہوگا کہ چند احادیث پر بھی نظر ڈال لی جائے۔

ابوداؤد اور ترمذی میں عبداللہ ابن عمر سے مروی ہے،

"میں نے حضورؐ سے سنا کہ فرماتے تھے میری امت میں بھی خسف اور مسخ (زمین میں دھنس جانا اور صورتیں بدل جانا) واقع ہوگا یہ ان لوگوں میں ہوگا جو تقدیر کو جھٹلاتے ہیں۔"

حضرت ابو درداءؓ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اپنے پیدا کردہ ہر بندے کی پانچ چیزوں سے فارغ ہو چکا (۱) موت (۲) عمل (۳) جائے قیام (۴) مقاماتِ سفر (۵) رزق۔" (مشکوٰۃ)

یعنی یہ جملہ امور بہت پہلے مقدر کئے جا چکے۔

حضورؐ کو خیبر میں ایک یہودی نے بکری کا زہر آلود گوشت کھلا دیا تھا۔ اس کا اثر کم و بیش ہر سال بیماری کی شکل

میں ظاہر ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ نے کہا کہ آپ کو ہر سال اسی بنا پر مرض کا شکار ہونا پڑتا ہے تو حضورؐ نے جواب دیا:۔

"جو کچھ بھی مجھ پر گذرتی ہے اس کا سارا حال تقدیر الٰہی میں اُس وقت لکھا جا چکا ہے جب آدم بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔"
(مشکوٰۃ)

ترمذی کی روایت ہے کہ عبادہ بن صامت نے بیان کیا:۔ "فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ سب سے پہلے اللہ نے قلم کو پیدا کیا اور حکم دیا کہ لکھ، قلم نے کہا کیا لکھوں؟ اللہ نے فرمایا کہ جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ اب تک ہونے والا ہے۔"

الفاظ میں ما کان وما هو کائن ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جب سب سے پہلے قلم ہی کو پیدا کیا تو اس سے پہلے کچھ نہ رہا ہوگا سوائے ذاتِ باری کے، پھر اس حکم کا کیا مطلب کہ جو کچھ ہو چکا۔ جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ ما کان کے الفاظ حضورؐ نے اپنے زمانے کے نسبت سے بولے یعنی تخلیق کائنات سے میرے زمانے تک جو کچھ ہو چکا قلم سے وہ پیشگی ہی لکھوایا گیا اور میرے بعد جو ہونے والا ہے تا یوم قیامت وہ بھی لکھوایا گیا

احادیث تقدیر کے سلسلے میں بہت ہیں، یہاں بطور نمونہ چند نقل کی گئیں تاکہ یہ بات منقح ہو جائے کہ قرآن اور حدیث دونوں سے تقدیر کے باب میں جو کچھ ثابت ہے وہ صریح، قطعی اور اٹل ہے، اس سے انحراف اور انکار جائز ہی نہیں چاہے ہماری محدود عقل اس کی تہ تک پہنچ سکے یا نہ پہنچ سکے۔

تاہم بقدر ضرورت ہم بعض ان شبہات کے ازالے کی کوشش کرتے ہیں جو اس عقیدے پر پہلے بھی وارد کئے جاتے رہے ہیں اور آج بھی کئے جاتے ہیں۔

دو شبہات بالکل سامنے کے ہیں۔ ایک یہ کہ جن برائیوں سے اللہ نے خود روکا ہے انھیں موجب عذاب ٹھیرایا ہے، ان سے بچانے کے لئے انبیاء بھیجے، انھیں نجس اور کریہہ قرار دیا، آخر انھیں معرضِ وجود میں لانے کا ارادہ وہ کیسے کر سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ معصیت اور ظلم بھی اگر مشیت الٰہی کے تابع ہیں تو پھر انسان کا وہ اختیار کہاں باقی رہا جس کی بنا پر وہ سزا اور جزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

(۱) پہلے اعتراض کے سلسلے میں یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے جن افعال کو گناہ اور نجس قرار دیا ہے وہ انسانوں کی نسبت سے دیا ہے نہ کہ اپنی نسبت سے مثلاً فعل زنا ہے۔ زنا کہتے ہیں اپنی بیوی یا شرعی کنیز کے علاوہ کسی اور سے ہم بستری کرنے کو۔ اسے اللہ تعالیٰ نے سخت قابل سزا جرم قرار دیا اور اس کے رسولوں نے اس سے مخلوق خدا کو روکا، اس سے اس فعل کا شرعاً برا ہونا تو طے پا گیا لیکن یہ برائی انسان کی نسبت سے ہے انسان کو جو اختیار اللہ تعالیٰ نے دیا تھا اس سے انسان نے وہ کام لیا جس کی ممانعت کی گئی تھی، لہٰذا وہ حکم عدولی کا مجرم بنا اور سزا کا مستحق قرار پایا، مگر خود اللہ کا ارادہ اگر اس فعل سے وابستہ ہے اور وہی اصلاً ان تمام حرکات و سکنات کا خالق ہے جن کے مجموعے کا نام زنا قرار پایا گیا ہے تو اس میں برائی یا نجاست کا پہلو کوئی نہیں کیونکہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق اپنی مجرد حیثیت میں وہ امر تکوینی ہے کہ اس کے بغیر دنیا کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا اور جب دنیا کا وجود ہی اس پر منحصر ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا بنانے والے نے اپنی دنیا کا وجود ایک ایسے فعل پر منحصر کر دیا جو بجائے خود اپنی عین وضع میں قبیح اور قابل نفرت تھا۔ یہ فعل اگر بجائے خود برائی اور نجاست کے ہم معنی ہوتا تو وہ خدا جو دنیا کی بقاء کے سلسلے میں ہزار اور طریقے بھی ایجاد فرما سکتا تھا یہی طریقہ کیوں ایجاد کرتا۔ ایجاد اور اختیار کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اپنی وضع اور اپنی ذاتی حیثیت میں یہ کوئی برائی نہیں بلکہ ایک تکنیک ہے، ایک درست ایک مشینی عمل ہے۔ ایک ایسا ہی طریق کار ہے جیسا کھیتی

اگانے کے لئے زمین میں بیج ڈالنا یا باغ اگانے کیلئے پودے لگانا۔ چنانچہ دیکھ لیجئے بیوی سے ہم بستری عین مطلوب، ترکِ صحبت گناہ۔ نکاح ضروری، حلق حرام، پھر اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ زنا کی قباحت انسان کی نسبت سے ہے۔ رشتے ناطے انسانوں ہی کا باہمی معاملہ ہیں۔ عورت اگر بیوی ہوتی ہے یا کنیز یا بہن یا ماں یا اجنبیہ اس کا تعلق انسانی روابط سے ہے ورنہ اللہ کی نسبت سے تو ہر عورت بندی اور ہر مرد بندہ ہے، لہذا بندہ اگر جنسی تعلقات کے معاملے میں ان حدود کو ملحوظ نہیں رکھے گا جنھیں اللہ نے اس کے امتحان کی خاطر مقرر کیا ہے تو وہ اللہ کی نافرمانی کا مرتکب ٹھیرے گا اور چونکہ نافرمانی اس نے اپنے ارادے اور اختیار کے تحت کی ہے اس لئے سزا کا بھی مستوجب ہوگا۔ اس کے مختار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے ارادے سے زنا کیا ہے مگر وہ نہ تو اپنے ارادوں کا خالق ہے، نہ ان افعال کا جنھیں بطورِ حاصل "زنا" کہتے ہیں لہذا خلق کی نسبت اللہ ہی کی طرف رہے گی اور خلق کے اعتبار سے اس فعل میں کوئی برائی نہیں جسے بعض حالتوں میں مباشرت اور بعض حالتوں میں زنا کہا جاتا ہے۔

اب آپ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ انسان جن افعال کے مراحل طے کر کے زنا تک پہنچا ان کا خالق وہ خود کیوں نہیں ہے جبکہ ظاہراً یہ افعال اسی کے اعضاء و جوارح کی جنبش و حرکت سے عبارت ہیں اور اس جنبش و حرکت میں ارادہ بھی اسی کا کارفرما ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم لقمہ بنا کر منہ تک لے جاتے ہیں مگر ہمیں بالکل خبر نہیں کہ لقمہ بنانے کے ارادے اور عمل کے درمیان میکانکی کے اعتبار سے کیا روابط ہیں یعنی ارادہ پیدا ہونے کے بعد کون سی چیز ہے جس نے اس ارادے کو اعضا کی طرف منتقل کیا، سب سے پہلے جسم کے کس پرزے نے کیوں اور کس طرح ارادے کا اثر قبول کیا پھر اس اثر کو اس نے دوسرے کس پرزے کی طرف کیونکر بڑھایا اور پھر جسمانی مشینری کے کس کس حصے سے گزرتا ہوا یہ اثر ہاتھ کی انگلیوں تک پہنچا، سائنسدانوں نے تحقیق کیا ہے کہ زبان سے محض ایک لفظ کی ادائیگی میں جسم کے تقریباً ایک لاکھ عضلات اور ریشے وغیرہ حرکت کرتے ہیں، بتائیے ہم میں سے کون ہے جو زبان سے الفاظ کے دریا بہاتے وقت اس اندرونی پیچیدہ عمل کا ادنیٰ سا بھی شعور رکھتا ہو۔ جب ہمارے ارادے اور عمل کے درمیانی روابط خود ہمارے دسترس سے باہر ہیں تو یہ کہنا مضحکہ خیز ہوگا کہ اپنے اعمال کے خالق ہم خود ہیں۔ کسی شے کو پیدا کرنا وسیع علم چاہتا ہے، یہاں وسیع تو کجا معمولی سا علم بھی نہیں کہ ارادہ کرتے ہی اعضاء حرکت میں کیوں آ گئے اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ لقمہ بنانے کا ارادہ کرنے پر بجائے ہاتھ کے پیر حرکت میں آ جاتے۔ اور چلنے کا قصد کرتے وقت پیروں کی بجائے ہونٹ جنبش کرنے لگتے حالانکہ سائنسی ریسرچ کے ذریعے چند افراد کو اگر علم ہو بھی جائے کہ ارادے کے بعد جسم کے کون کون سے عضلات کس کیمیائی عمل سے گزرتے ہیں اور جسمانی مشین کی بناوٹ کا اپنی آخری حد تک کیا ہے، تب بھی علم اور خلق ایک چیز تو نہیں، آدمی نے جان لیا کہ پانی گرم ہو کر بھاپ بن جاتا ہے مگر اس علم نے اسے نہ پانی کا خالق بنایا نہ بھاپ کا، لہذا یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں کہ انسان اپنے اعمال کا خالق نہیں ہے۔ اب ارادے کا حال دیکھئے، ارادہ بھی اپنی بنیادی حیثیت میں ایک عمل ہی ہے اسی لئے ارادے اور اس کے متعلقات کے بارے میں وہی مصدر استعمال کیا جاتا ہے جو افعال و اعمال کے لئے مستعمل ہے، ارادہ کرنا، خیال کرنا، تصور کرنا۔ اب دیکھ لیا جائے اس عمل کے بارے میں ہماری معلومات کس درجے میں ہیں۔ معاملہ بالکل سیدھا سادا ہے کہ ہم کچھ بھی نہیں جانتے ہمیں یہ تک علم نہیں کہ سر یا دل کے کون سے حصے میں کون سی کل ہے جو ارادوں کو ڈھالتی ہے، کونسا پرزہ کیونکر خارجی اشیاء کے مشاہدے سے اثر پذیر ہوتا ہے، کیا چیز ہے جو ارادہ بن کر ہمارے رگ و پے میں اس طرح دوڑ جاتی ہے کہ اعضاء اسی کے مطابق جنبش میں آ جاتے ہیں۔

دیانت و انصاف کا تقاضا یہ ہے ـــــ کہ

مولانا عامر عثمانیؒ کو "مُدبّرِ اسلام"

کا

خطاب

دے دیا جائے

۷؍ دسمبر ۱۹۷۲ء کے بیباک میں ایک مضمون شائع ہوا تھا بعنوان "حضرت ابوذر غفاری کا ہمہ گیر پیغام مساوات" یہ مضمون مولانا جعفر پھلواری نام کے کسی صاحب نے قلم بند کیا تھا۔

اس میں کیا شک ہے کہ یہ مضمون نیک نیتی ہی سے لکھا گیا تھا اور اس میں بھی کیا کلام ہوسکتا ہے کہ بیباک کے ایڈیٹر صاحب نے اسے مقدس اور مفید سمجھتے ہوئے اپنے جریدے میں شائع کیا تھا۔ لکھنے والے اور چھاپنے والے کی نیت کتنی ہی پاک صاف کیوں نہ رہی ہو لیکن یہ مضمون اُمّتِ مسلمہ کے حق میں زہرِ قاتل کی حیثیت رکھتا تھا اور زہر بھی ایسا جو دیکھنے میں تریاق معلوم ہو اور جسے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اتارنے کے لئے سادہ لوح قسم کے مسلمان بے چین ہوجائیں۔

حق تعالیٰ مولانا عامر عثمانیؒ کو اپنی خاص الخاص رحمتوں سے نوازے انھوں نے اپنے خداداد تدبّر کا سہارا لے کر اس زہر کی حقیقت واضح کی اور کتنے ہی اذہان و قلوب کو مرگِ مفاجات کے منہ میں جانے سے بچالیا۔

پھلواری صاحب کے عقیدت اور سادہ لوحی سے لبریز مضمون پر مولانا کی مدبرانہ تنقید پر گہری نظر ڈالنے کے بعد دیانت و انصاف پے در پے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ مولانا عامر عثمانی کو "مُدَبِّرِ اسلام" کے خطاب سے نوازا جائے

کتنا میٹھا زہر

ابھی چار شخص ایمان لائے تھے۔ ابوبکرؓ، علیؓ، زیدؓ اور خدیجہؓ۔ اور پانچویں کا انتظار تھا۔ یہ پانچواں مرد مومن ابوذر غفاریؓ جو جنادہ بن کعب کے صلب اور رملہ بنت ربیعہ کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس کی فطرت سلیمہ نے پہلے اپنے قبیلہ کے پیشہ رہزنی سے توبہ کرا دی تھی۔ اس مرد مومن کا فقر و درویشی عشقِ رسولؐ، توکل، قناعت اس درجہ کا تھا کہ زبانِ رسالتؐ سے ایک ایسی بشارت اس کے حق میں نکلی جو کسی اور کے لئے نہ نکلی۔ ارشاد ہوا :۔

ما اظلمت الخضراء ولا اقلت الغبراء اصدق اللہجة من ابی ذر (ترمذی عن انس)

”آسمان نے کسی ایسے شخص پر سایہ فگن نہیں ہوا۔ اور زمین نے کسی ایسے شخص کو اپنے کاندھے پر نہیں اٹھایا جو ابوذر سے زیادہ سچی زبان رکھتا ہو“

ان کی زبان کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب فتوحات نے اور کاروباری فراغتوں نے مسلمانوں کو بے انتہا دولت کا وارث بنا دیا کہ فراوانی غیر محسوس طریقہ سے اخلاق و عادات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دولت کی ہوس اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ انسانیت کے تقاضے فراموش ہونے لگتے ہیں۔ اقتدار کی پرواہ نہیں رہتی اور نصب العین آنکھوں سے اوجھل ہونے لگتا ہے، ابوذرؓ نے سیدنا عمرؓ کے بعد ہی سے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ لوگ مال و دولت سمیٹنے لگے ہیں، جاگیریں بننے لگی ہیں، خزانے پر ہونے لگے ہیں، اور محلات و قصور بننے لگے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو یہ خدا پرست قوم زر پرست بنکر رہ جائے گی۔

دولت سمٹ کر آنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آسمان سے روپیے برستے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کی بہت سی جیبیں خالی ہو جاتی ہیں اور صرف گنتی کی چند جیبیں پر ہو جاتی ہیں۔

مال و دولت سمیٹنے کے اس تباہ کن جذبہ کا آغاز ہوا ہی تھا کہ حضرت ابوذرؓ میدان میں آگئے۔

”اے مسلمان بھائیو! تمہارے مکان، لباس، خوراک اور معاشی زندگی میں وہ سادگی نہیں۔ تم نے دولت جمع کرنی شروع کر دی ہے، خدا نے تمہیں دولت اس لئے دی تھی کہ خود بھی فائدہ اٹھاؤ اور دوسرے حقداروں کو بھی فائدہ پہنچاؤ، مگر تم اسے صرف اپنے عیش و آرام میں صرف کرنے لگے ہو، جو سیم و زر اندوختہ کرتے ہیں اور اسے راہ مولا میں صرف نہیں کرتے انہیں سخت سزا کی خوشخبری سنا دو۔ اس دن ان کے سونے چاندی کو آگ میں تپا کر ان کی پیشانی، پہلو اور پشت کو داغا جائے گا کہ یہ ہے جو کچھ تم نے اندوختہ کیا تھا، لہٰذا اپنے اندوختہ کا مزہ چکھو“۔

ابوذرؓ کی سچی زبان سے یہ سچا پیغام نکلتے ہی بے مایہ انسانوں کا ہجوم ان کے گرد جمع ہونے لگا اور سرمایہ داروں کا ماتھا ٹھنک گیا مناظرے ہوئے، مباحثے ہوئے، گفتگوئیں ہوئیں، لالچ دیا گیا، دھمکایا گیا۔ آزمائشوں میں ڈالا گیا۔ سب کچھ ہوا۔ مگر ابوذرؓ کو اپنے مقام سے ایک انچ بھی کوئی نہ ہٹا سکا۔

ایک واقعہ آزمائش کا بھی سن لیجئے :۔

امیر معاویہؓ نے ایک دن کسی کے ہاتھ ایک ہزار دینار (یعنی اشرفیاں) سیدنا ابوذرؓ کے پاس بھیجے کہ یہ آپ کے اخراجات ہیں۔ شام کے وقت قاصد پہنچا اور تھیلی دیکر آگیا۔ دوسرے دن اسی قاصد کو امیر معاویہؓ نے یہ سمجھا کر

بھیجا کہ تم کہنا کہ وہ دینار دراصل کسی اور کے لئے بھیجے گئے تھے اور میں نے غلطی سے آپ کو دیدیئے لہذا انھیں واپس دیدیجئے۔

امیر معاویہ نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ ایک ہزار دینار کوئی بھی ایک دو دن میں خرچ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا دوسرے دن اگر ابو ذر رضؓ کے پاس وہ دینار موجود ہوئے تو پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ حضرت آپ تو ایک رات کے لئے بھی سونا چاندی اپنے پاس جمع کرنا حرام سمجھتے ہیں۔ پھر یہ دینار آپ نے کیوں رکھ چھوڑے۔

مگر جب قاصد وہ دینار واپس لینے آیا تو سیدنا ابو ذر رضؓ نے فرمایا کہ وہ تو ہم نے صبح ہونے سے پہلے ہی مستحقین میں تقسیم کر دیئے ہیں، اگر چند روز کی مہلت دو تو میں دینار واپس کرنے کا بندوبست کر دوں گا۔ قاصد یہ پیغام لے کر امیر معاویہؓ کے پاس پہنچا تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا :۔

"واقعی ابو ذر سچا ہے جو کہتا ہے اسی پر عمل کرتا ہے"

یہی سچائی ابو ذر کو کھا گئی۔ ادھر ان ہی امیر معاویہ نے ان کی شکایتیں لکھ کر دربار خلافت عثمانی میں بھیجی ہیں۔ شکایات کا خلاصہ یہ تھا کہ ابو ذر رضؓ غرباء کو امراء کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ وہاں سے طلبی ہوئی۔ ابو ذر رضؓ مدینے پہنچے اور وہاں بھی غریبوں کا ہجوم ان کے گرد جمع ہونے لگا اور ان کا پیغام پھیلنے لگا۔ مسجد نبوی میں کعب رضؓ احبار سے مکالمہ ہوا۔ کعبؓ احبار نے انفرادی ملکیت اور غیر محدود مال و دولت کے جواز کی وہی دلیل دی جو آج جاگیرداری کی حمایت میں بعض علماء کرام دیتے ہیں، یعنی :۔

(۱) اگر زکوٰۃ و عشر نکال دی جائے تو جتنا سرمایہ اور جتنی زمین رکھی جائے جائز ہے۔

(۲) اگر ملکیت ذاتی کو تسلیم نہ کیا جائے تو قرآنی قانونِ وراثت کا کیا مصرف رہ جائے گا؟

ان علماء کرام کو کون سمجھائے کہ فقہی قانونِ زکوٰۃ صرف ایک ابتدائی قدم ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی طرف۔ قرآن اسی راہ سے رفتہ رفتہ اسی منزل پر لانا چاہتا ہے جہاں صرف "انفاقِ عفو" کا قانون رہ جاتا ہے۔ اور باقی سب نیچے درجے کے قوانین زکوٰۃ و عشر ختم ہو جاتے ہیں۔ قرآنی قانونِ زکوٰۃ کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ ایک طبقہ سرمایہ دار اور دوسرا بھک منگا رہے بلکہ اس کا مقصد ایسی معاشی ہمواری پیدا کرنا ہے کہ محتاجی معاشرے سے ختم ہو جائے کہ کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔ نہ زکوٰۃ لینے والا کوئی رہے نہ دینے والا فقیہوں کی سمجھ میں یہ مسئلہ نہیں آتا، مگر کاش وہ صرف اتنا دیکھ لیتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی زکوٰۃ ادا نہیں فرمائی۔ یہی آئیڈیل ہے جہاں تک امت کو کھینچ لانا ہے۔ زکوٰۃ تو وہ ادا کرے جو سال بھر کوئی مال اندوختہ رکھے۔ جس رسولؐ کے پاس آیا ہوا مال شام ہونے سے پہلے پہلے تقسیم ہو جائے اس کے لئے زکوٰۃ نکالنے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے؟

پھر ان علماء کرام کو یہ سوچنا چاہیئے کہ قرآن کا قانونِ وراثت کسی ملکیت کی توثیق کے لئے نہیں بلکہ بتدریج ملکیت کو ختم کرنے کے لئے ہے۔ بڑی سے بڑی جاگیر بھی ایک پشت میں قانونِ وراثت سے ختم ہو جاتی ہے۔ یہ شبہ بے معنی ہے کہ اگر انفرادی ملکیت اور جاگیر داری کو شرعاً صحیح نہ تسلیم کیا جائے تو قرآن کا قانونِ وراثت ختم ہو جائے گا۔ ختم نہیں ہوگا بلکہ قرآن کا عین منشا پورا ہو جائے گا۔ کل کلاں کو آپ یہ دعویٰ بھی کریں گے کہ معاشرے میں چوری اور بدکاری کو ضرور باقی رہنا چاہیئے ورنہ قرآن کی حدود اور تعزیرات ختم ہو جائیں گی۔ سوال یہ ہے کہ اگر دنیا سے چوری اور بدکاری ختم ہو جائے اور ہاتھ کاٹنے اور کوڑے لگانے کا قرآنی قانون بے مصرف ہو جائے تو اس سے قرآنی قانون ختم ہوگا یا عین منشائے قرآنی پورا ہوگا؟

اسی طرح اگر رسم غلامی کی لعنت دنیا سے ختم ہو جائے تو اس سے قرآنی قانون متعلقہ غلامی ختم ہو جاتے ہیں یا عین منشائے قرآن کی تکمیل ہوتی ہے؟

بہر حال کعب احبار رضؓ کی طرف سے اس قسم کی دلیلیں پیش کی گئیں مگر ابو ذر غفاریؓ کے سامنے ان کی کیا چل سکتی تھی۔ آخر وہی کچھ ہوا جو دلائل کی قوت ختم کر کیا جاتا ہے۔ ابو ذر غفاری رضؓ کو ربذہ میں نظر بند کر دیا گیا اور ساتھ ہی زبان بندی بھی ہوئی۔ ربذہ کے بیابان میں ابو ذر نے اپنی بقیہ حیات مستعار گذاری اور وہیں حضورؐ کی پیش گوئی پوری ہوئی کہ :۔

"ابو ذر تنہا چلتا ہے۔ تنہا ہی مرے گا اور تنہا ہی اٹھایا جائے گا۔"

جناب ابوذرؓ کے سوانح زندگی نامکمل رہیں گے اگر انکی زندگی کے آخری ایام کا حال نہ لکھا جائے سنہ ۳۶ھ کا آخری مہینہ تھا ۔۔۔ زائران پروانہ وار عازم سفر ہو چکے تھے ۔ ربذے کی تھوڑی سی آبادی بھی خالی ہو چکی تھی ۔

ابوذرؓ کے جھونپڑے میں ان کی رفیقۂ زندگی اور ایک صاحبزادی رہ گئیں تھیں ۔ لوگ حج بیت اللہ کے سفر پر روانہ ہو رہے تھے اور ابوذر سفر آخرت کی تیاری کر رہے تھے ۔ رفیقۂ زندگی اپنی بے بسی کو دیکھ کر رونے لگی تو ابوذرؓ نے رونے کی وجہ دریافت کی ۔ بیوی نے جواب دیا کہ : ۔۔

" نہ میرے پاس اتنا کپڑا ہے جس میں آپ کو کفنا سکوں اور نہ میرے بازوؤں میں اتنی سکت ہے کہ آپ کیلئے قبر کھود سکوں ۔"

مرد مومن ابوذر بولے

" اتنی سی بات کے لئے گریہ وزاری نہ کرو ۔ سنو میں ایک جماعت کے ساتھ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر تھا کہ حضورؐ نے فرمایا ۔ تم میں ایک شخص ایک چٹیل میدان میں جان دے گا اور اس کے جنازہ میں ایک گروہ مسلمانوں کا شرکت کریگا " ۔۔ اس وقت وہاں جتنے لوگ موجود تھے سب شہری آبادیوں میں وفات پا چکے ہیں ۔ اور اب صرف میں باقی رہ گیا ہوں جو اس میدان میں دم توڑ رہا ہوں تم راستے پر نظر جمائے رکھو ، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ عنقریب ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگی نہ تو میں غلط کہہ رہا ہوں نہ مجھ سے غلط کہا گیا ہے " ۔

غمزدہ بیوی سڑک پر جا کر انتظار کرنے لگیں ذرا دیر کے بعد ایک قافلہ دکھائی دیا جس کے اونٹ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے چلے آرہے تھے ۔

یہ قافلہ ان کے پاس آکر رک گیا اور ان سے پوچھا کہ مائی تم یہاں کیوں کھڑی ہو ؟ ۔

انھوں نے جواب دیا کہ ایک مرد مومن دم توڑ رہا ہے جس کی تکفین کا اجر تمہارے ہاتھ ہے ۔

" قافلے والوں نے پوچھا وہ کون آدمی ہے ؟ بولیں " ابوذرؓ " ابوذر نام سنتے ہی سب کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ " ہمارے ماں باپ ان پر قربان ہوں " اس کے بعد لپکتے ہوئے خیمۂ ابوذر میں سب لوگ پہنچ گئے ۔

ادھر تو یہ کچھ ہو رہا تھا کہ بیوی کو آنے والے قافلے کے انتظار میں سڑک پر روانہ کیا اور ادھر صاحبزادی سے ابوذرؓ نے فرمایا ۔

" بیٹی ایک بکری ذبح کر لے اور جلد گوشت کی ہانڈی چولہے پر چڑھا دے کچھ مہمان آنے والے ہیں ۔ میرے کفن دفن کے بعد ان سے کہنا کہ ابوذر نے آپ سب کو خدا کی قسم دی ہے کہ جب تک آپ یہ نہ کھائیں اس وقت تک اپنی سواری پر سوار نہ ہوں " ۔

ابوذر کی یہ مہمان نوازی معاشیات کا آخری نگرانی درس تھا ۔ بہرکیف ادھر ہانڈی چڑھی ادھر غمزدہ بیوی کے ساتھ قافلہ خیمۂ ابوذر میں داخل ہوگیا ۔ ان مہمان کو دیکھ کر یہ چند منٹ کا مہمان ابوذرؓ بولا ۔

تمہیں مبارک ہو کہ تم ہی وہ لوگ ہو جن کے متعلق حضورؐ نے خبر دی تھی ۔ مگر تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری تکفین میں کوئی ایسا آدمی شرکت نہ کرے جو موجودہ حکومت کا مقرر کردہ چودھری یا امیر یا ڈاکیہ ہو " ۔

اتفاق سے اس قافلہ میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو کسی نہ کسی عہدہ پر مامور نہ ہو ۔ صرف ایک انصاری نوجوان حکومت کی ملازمت سے بے تعلق تھا ۔ اس نے کہا " میرے تھیلے میں دو کپڑے ہیں جو میری والدہ کے ہاتھ کے کتے بنے ہیں " چند سانسوں کے بعد رخصت ہونے والے ابوذرؓ نے کہا ۔

" بس تم ہی میرے اصلی رفیق ہو " اس کے بعد فرمایا

" میری میت کے غسل و تکفین کے بعد میرا جنازہ سڑک پر رکھ دینا ۔ سواروں کی جو پہلی جماعت ادھر سے گذرے اس سے کہہ دینا کہ ایک صحابی رسولؐ ابوذرؓ کا جنازہ ہے تم بھی اس کی نماز اور دفن میں شریک ہو جاؤ " ۔

اس کے بعد اس سچی زبان والے کی زبان سے سب سے زیادہ سچی اور آخری بات یہ نکلی۔

بسم اللہ وباللہ وعلیٰ ملۃ رسول اللہ

حسب وصیت جنازہ سڑک پر رکھ دیا گیا کوفہ سے عازمین حج کا ایک قافلہ احرام باندھے ہوئے ادھر سے گزرا جس کے امیر الحجاج سیدنا عبداللہ بن مسعود تھے۔ ابو ذرؓ کی میت دیکھ کر بولے۔

"حضورؐ نے سچ فرمایا تھا کہ" ابو ذر اکیلا ہی چلتا ہے، اکیلا ہی مرے گا اور اکیلا ہی اٹھے گا"۔

امام الفقہاء ابن مسعودؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ حج کے بعد ربذہ کے راستے سے واپس ہوئے اور ابو ذرؓ کے اہل وعیال کو اپنے ساتھ مدینے لے آئے۔ سیدنا علی مرتضیٰ نے فرمایا۔

"میں نے صحابۂ رسول کو دیکھا ہے لیکن ابو ذر جیسا منفرد انسان کہیں نظر نہ آیا"۔

تجلی

اس مضمون کی بہت سی طباعتی غلطیاں ہم نے درست کر دی ہیں۔ پھر بھی یہ اغلاط سے خالی نہیں۔ مثلاً حدیث کا متن ہی غلط نقل ہے۔ مگر ہم لفظی نہیں معنوی اسقام سے بحث کریں گے۔

کوئی بھی ذی فہم پہلی ہی نظر میں اندازہ کر سکتا ہے کہ اس مضمون کو سپرد قلم کرنے کا محرک حضرت ابو ذرؓ کی محبت وعقیدت نہیں ہے بلکہ کمیونزم کے عطا کردہ طرز فکر کے لئے گواہی فراہم کرنا مقصود ہے۔ اس مقصد کا حصول اگر سنجیدہ علمی وتحقیقی معیار پر کیا جاتا تو بات قابل اعتراض نہ ہوتی لیکن مضمون نگار نے نہ صرف سنجیدگی کا خون کیا ہے بلکہ علم وتحقیق کو بھی مذاق کا ہدف بنایا ہے۔

حضرت ابو ذرؓ غفاری کا مسلک کیا تھا اور دوسرے تمام صحابہؓ کا کیا۔ یہ تو ہم آگے عرض کریں گے۔ یہاں وہ طرز تحریر بہ نگاہ توجہ دیکھ لیجئے جو علماء کے بارے میں اختیار فرمایا گیا ہے۔ اگر اس کی گنجائش ہوتی کہ "علماء" سے مراد صرف علماء سوء لے لئے جائیں جب تو اس طرز تحریر کے لئے جواز نکل سکتا تھا لیکن واقعاتی صورت حال یہ ہے کہ طبقۂ صحابہؓ کے تمام علماء، پھر طبقۂ تابعین کے تمام علماء، پھر بعد کے سارے علماء وفقہاء اس رائے پر متفق ہیں کہ جس مال میں سے حقوق واجبہ یعنی زکوٰۃ، عشر، صدقۂ فطر وغیرہ بروقت ادا کر دیئے جائیں ان پر ہرگز ہرگز اس آیت قرآنی کا اطلاق نہیں ہوتا جس میں سونا چاندی جمع کرنے والوں پر وعید وارد کی گئی ہے۔ نیز اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ ذاتی ملکیت کا قانون برحق ہے اور ضرورت سے زائد فاضل مال کو تمام کا تمام خرچ کر ڈالنا شریعت کا حکم نہیں ہے۔

لہٰذا جواز کے مسلک کو صرف بعض علماء کی طرف منسوب کرنا علم وتحقیق کو منھ چڑانا ہے اور انفرادی ملکیت کے جواز پر دلیل لانے کو "جاگیرداری کی حمایت" قرار دینا امت کے تمام علماء وفقہاء کو بدنیت اور زر پرست ٹھیرانا ہے۔ اسی قسم کے طعن وطنز کمیونسٹ ممالک میں کئے جاتے ہیں۔ بعض حضرات نے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک کے بارے میں یہ گل افشانی فرما دی کہ وہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کا تحفظ کرنے والے لیڈروں میں سے تھے (العیاذ باللہ)

کیا اسی کا نام سنجیدگی ہے اور کیا ایک سچے مسلمان سے اسی جرأت وجسارت کی توقع کی جا سکتی ہے۔

غریب "فقیہوں" پر برسنا بھی اسی علم کلام کا معروف جزو ہے جس کے ذریعہ قرآن وسنت کے بعض محکم اور قطعی احکام تک کو تحریف کی سان پر چڑھایا جاتا ہے اور اپنے اصل ہدف کو چھپانے کے لئے نام فقہاء کا لے دیا جاتا ہے۔ انصاف کیجئے کہ انفرادی ملکیت کا مسئلہ اگر کوئی ایسا مسئلہ ہوتا جسے بعد کے فقہاء نے اپنے اجتہاد وتفقہ سے نکالا ہوتا تب تو کسی درجے میں اس تحسین وتجہیل کا جواز مانا جا سکتا تھا جو فاضل مضمون نگار نے فقہاء کی کی ہے۔ لیکن یہ مسئلہ تو دور رسالت سے اپنی متعینہ شکل میں موجود ہے۔ کیا صحابہؓ کیا تابعینؒ کسی بھی طبقے اور دور کے فقہاء نے اس رائے کو صحیح نہیں مانا جسے مضمون میں حضرت ابو ذرؓ سے منسوب کیا گیا ہے اور سب اسی پر متفق رہے جس کی تردید یہ مضمون نگار کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں علی الاطلاق فقہاء پر لعن وطعن یا ان کی تحریر وتقریر کا حاصل اس کے سوا کیا نکلا کہ :-

نادک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

پھر جس انداز میں صاحب مضمون نے علماء وفقہاء کی بے عقلی پر

انسوس کرتے ہوئے انھیں عقل سکھانے کی سعی فرمائی ہے وہ کچھ ایسا ہے جیسے کوئی بہت بڑا استاد نالائق شاگردوں کی بے دانشی اور نااہلی پر اظہار افسوس کرنے کے بعد انھیں گر کی باتیں سمجھا رہا ہو۔

کیا یہی سنجیدہ علم طریق ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہ واضح کردیں کہ جاگیرداری یا سرمایہ داری یا کوئی بھی ایسا نظام جس میں ایک طرف انتہائی امارت اور دوسری طرف انتہائی غربت ہو اسلام کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔

لیکن ان حقائق کے باوجود وہ نظریہ اور وہ طرز فکر اسلام سے ہرگز کوئی تعلق نہیں رکھتا جسے اس مضمون میں حضرت ابوذرؓ کی آڑ لیکر پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم یا کوئی بھی خادم دین اگر اس طرح کے باطل فکر کی تردید کرتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز درست نہیں ہوگا کہ ہم ان نظاموں کے مدح خواں اور مؤید ہیں جنھیں اصطلاح میں جاگیردارانہ یا سرمایہ دارانہ کہا جاتا ہے اس طرح کا استنتاج دراصل ایک فریب ہے جو علم وتحقیق سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

اب آئیے علمی وتحقیقی سطح پر نفس مسئلہ کا جائزہ لیں۔

حضرت ابوذرؓ کو دنیا سے رخصت ہوئے تیرہ سو سال سے زائد گزر گئے۔ ان کے کسی مسلک و مذہب کا صحیح علم حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ کوئی علمی سنجیدگی نہیں رکھتا کہ ان کے صرف بعض ارشادات اپنی زبان میں بلا حوالہ بیان کر دیئے جائیں اور ان سے اخذ کردہ مفہوم کو ان کا مسلک قرار دے دیا جائے یہ تو گھٹیا قسم کی افسانہ طرازی ہے یا پھر اسے پروپیگنڈہ کہہ سکتے ہیں ہم ابھی علم و تحقیق کی سطح پر بتائیں گے کہ حضرت ابوذرؓ کا نظریہ و مسلک کیا تھا اور کس طرح کمیونزم کے دلدادہ حضرات اسے مسخ کر کے پیش کر رہے ہیں۔

لیکن اپنی تنقیح کاوی سے قبل ہم اسی مواد پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں جو مولانا جعفر میاں پھلواری نے حوالۂ قرطاس فرمایا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ کو صادق القول قرار دیا۔ یہ اپنی جگہ درست ہے لیکن صدق اور کذب کی بحث تو خبر کے معاملے میں پیدا ہوتی ہے نہ کہ انشاء کے۔ یہاں سوال کسی خبر کی صحت کا نہیں بلکہ ایک خاص مسلک، اجتہاد اور رائے کا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کسی شخص کا سچا ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ کہ اس کا ہر اجتہاد بھی درست ہے۔ کسی شخص کی رائے کا غلط ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ امام شافعیؒ سیکڑوں مسائل میں امام ابوحنیفہ رح سے اختلاف کرتے ہیں تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ابوحنیفہ رح کو سچا نہیں سمجھتے تھے۔ ہر علم وفن میں علماء کے بے شمار اختلافات موجود ہیں مگر کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی ان اختلافات سے سچ اور جھوٹ کا پیوند نہیں لگا سکتا۔ انتہائی صادق القول آدمی بھی فکر واجتہاد کی دسیوں غلطیوں کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اور انتہائی جھوٹا آدمی بھی بارہا فکر واجتہاد کے میدان میں صحت فکری کا ثبوت دے سکتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ مضمون کے شروع ہی میں حضرت ابوذرؓ کے راست گو ہونے والی جو حدیث ذکر کی گئی ہے وہ ایک قسم کی مغالطہ انگیزی ہے اور آگے حضرت معاویہؓ والا فقرہ بھی غالباً اسی نیت سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت ابوذرؓ کی اس رائے کو تقویت پہنچائی جائے جس کی آڑ میں مولانا موصوف انفرادی ملکیت کی نفی کا قطعی غیر اسلامی تصور پیش فرما رہے ہیں۔

آپ ذرا حضرت ابوذرؓ کے اس ارشاد گرامی کو ایک بار پھر پڑھ لیجئے جو "اے مسلمان بھائیو!" سے شروع ہوا ہے۔ کیا اس میں ذاتی ملکیت کی نفی ہے؟

دور دور نہیں۔ صحابی رسولؐ تو یہ تلقین فرما رہے ہیں کہ اپنی دولت سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاؤ۔ یہ کیا کہ بخیلوں اور خسیسوں کی طرح تنہاخوری پر جمے رہو، غرباء کو نظرانداز کردو اور صدقہ وخیرات سے ہاتھ کھینچ لو۔ صدقہ وخیرات اور "راہ مولا" متضاد الفاظ تو نہیں۔ دونوں اکثر حالتوں میں مرادف ہی ہوتے ہیں۔ پھر اس میں ذاتی ملکیت کی نفی کہاں سے نکل آئی۔ اس کے برخلاف اس سے تو منکشف ہوا کہ دولتمندوں کے مال کو حضرت ابوذرؓ جائز وحلال مال سمجھتے تھے کیونکہ خرچ کی تلقین مال کے جائز مالک ہی کو کی جاتی ہے علاوہ ازیں اللہ کی

راہ میں حلال و طیب ہی مال خرچ کیا جاتا ہے نہ کہ مالِ حرام۔ حضرت ابوذرؓ فاضل مال و دولت پر اگر اصحاب دولت کا قبضہ یا رکھنا جائز نہ سمجھتے تو کیا ان سے یہ توقع کی جانی چاہیئے کہ وہ مال حرام اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا درس دیتے رہے ہیں۔

جو کچھ اس ارشاد گرامی میں حضرت ابوذرؓ نے فرمایا وہ تو عین قرآن وسنت ہے۔ وہ تو عین اسلامی تعلیم ہے اور علماءؒ فقہاء میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اس تعلیم سے سرمو اختلاف رکھتا ہو۔ یا اس کے خلاف زبان تفقہ کھولتا ہو۔

دوسرے ارشادات جو پورے مضمون میں حضرت ابوذرؓ کے نقل کئے گئے ہیں ان میں بھی کوئی ایسا نہیں جس سے انفرادی ملکیت کی نفی نکالی جاسکے۔ نہ مولانا نے کوئی حدیث ایسی پیش فرمائی جو صراحۃً نہ سہی اشارۃً اور کنایۃً ہی ان کے طرز فکر کی تائید کر دیا لی ہو۔ پھر آخر یہ کیسا مذاق ہے جو انھوں نے مولانا ہونے کے باوجود دین اور ارباب دین سے کیا ہے۔

حضرت ابوذر صحابیؓ اور حضرت کعبؓ احبار تابعی کے جس مکالمے کا مختصر بلکہ مجمل ذکر مولانا نے فرمایا وہ بھی ایک طرف حوالے سے معرّا ہے اور دوسری طرف ادھورا اور مغالطہ انگیز ہے۔ امت کے تمام علماء و فقہاء کو نادان اور حکم شریعت سے بے بہرہ قرار دینے کی عظیم جسارت کرتے ہوئے مولانا صاحب کو کم سے کم اتنا تو اہتمام کرنا ہی چاہیئے تھا کہ تیرہ سو سال پہلے کے واقعات کو باحوالہ بیان کرتے اور اپنے خیال و رائے کے لئے دلیل نام کی بھی کوئی چیز پیش فرماتے۔

خیال و رائے ہم نے غلط کہا۔ وہ تو خیریت سے ایک بہت بڑا دعویٰ فرما رہے ہیں۔ یعنی کہہ رہے ہیں کہ قانونِ زکوٰۃ صرف ایک ابتدائی قدم ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی طرف۔ قرآن اسی راستے رفتہ رفتہ اس منزل پر لانا چاہتا ہے جہاں صرف "انفاق عفو" کا قانون رہ جاتا ہے اور باقی سب نیچے درجے کے قوانین زکوٰۃ و عشر ختم ہو جاتے ہیں۔

عجیب ہے یہ شان علمی۔ دعویٰ تو اتنا بڑا، اتنا منفرد اور اتنا تہلکہ انگیز مگر دلیل؟ ـــــ شہادت؟ ـــــ ثبوت؟ کیا قرآن نے اپنا وہ مخفی ترین منصوبہ حضرت رسولؐ سے لیکر آج تک کا کوئی عالم و فقیہ نہ پا سکا۔ خاص طور پر مولانا کے کان میں پھونک دیا ہے۔ یا قرآن کے نازل کرنے والے نے وحی کے ذریعہ انھیں اس پر مطلع کیا ہے۔ جہاں تک آیات قرآنیہ کا تعلق ہے ان میں تو کہیں اس قسم کی بات نہیں پائی جاتی بلکہ اس کی بے شمار آیات انفرادی ملکیت کی توثیق کرتے ہوئے صدقہ و خیرات اور صلہ رحمی اور انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دیتے ہیں۔

تو کیا حدیث یا اسوۂ رسولؐ سے اس راز خاص کا پتہ چلا ہے؟ یہ بھی ناممکن۔ حدیثیں تو ذاتی ملکیت کی تصدیق سے لبریز ہیں اور اسوۂ رسولؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاتی ملکیت کی نفی کا وہم و گمان تک آپ کے قلب میں کبھی نہیں گذرا۔ اگر واقعی قرآن کا منصوبہ وہی ہوتا جو مولانا نے منکشف فرمایا تو اس رسولؐ کو اس کا علم ضرور ہونا چاہیئے تھا جس پر قرآن اترا ہے اور جب علم ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اپنے اس دور میں جبکہ رسولؐ ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا تھا اس منصوبے کے سلسلے میں وہ کوئی بھی پیش قدمی نہ کرتا۔ صحابہؓ میں بعض بہت دولت مند تھے۔ مثلاً حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما لیکن رسولؐ نے انھیں اشارۃً بھی نہیں کہا کہ تم اپنا ضرورت سے زائد تمام مال بیت المال میں داخل کر دو یا غرباء میں بانٹ دو۔ حتیٰ کہ خاص خاص غزوات کے موقعہ پر پیسے کی شدید ضرورت لاحق ہوئی مگر آپ نے صرف ترغیب و تلقین پر اکتفا کیا اور جس نے جتنا دیا اس پر قناعت فرمائی حالانکہ اگر قرآنی آئیڈیل وہی ہوتا جسے آج ہم سن رہے ہیں تو حضور تمام ہی امراء وقت کے قبضے سے ان کے اموال زائدہ حکماً نکلوا دیتے خصوصاً غزوات کے موقع پر تو سب کچھ بلا رد و قدح مانگ لیتے۔ معلوم ہے کہ حضورؐ کی فرمانبرداری صرف طاقت کے ڈر سے نہیں کی جاتی تھی بلکہ دل و جان سے ازراہِ اطاعت کی جاتی تھی۔ اس صورت میں تو کسی بغاوت اور ہنگامے کا بھی خطرہ نہ تھا۔ پھر آخر کیسا قرآنی آئیڈیل تھا کہ قرآن کے سب سے بڑے اور سب سے بہتر شارح اور عارف و عالم پیغمبرؐ نے ٹھیک اس وقت بھی اس کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھایا جس وقت ہر دوسرے وقت اور زمانے سے بڑھ کر اس کے لئے حالات سازگار تھے۔ کیا دورِ رسالت کے

بہ رکبھی کوئی ایسا زمانہ آسکتا ہے کہ رعایا اپنے حاکم کی اس شدو مد سے تابعداری کرے۔ اگر نہیں آسکتا اور یقیناً نہیں آسکتا تو صاف معلوم ہو گیا کہ مذکورہ آئیڈیل مولانا کا ذاتی یا پھر کمیونزم سے مستعار لیا ہوا آئیڈیل ہے جسے وہ بڑی بے تکلفی سے اللہ اور رسولؐ کے ذمے ڈال رہے ہیں۔ جہاں تک حضور کے اپنے اسوے کا تعلق ہے وہ بے شک یہی تھا کہ جو درہم و دینار آئے آپ نے انہیں حاجت مندوں میں تقسیم فرما دیا۔ اسے تمام علمائے امت بجا طور پر فقرِ اختیاری کہتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل اگر کوئی قانونی و شرعی حیثیت رکھتا تو آپ کم سے کم ان صحابہؓ کو تو فوراً ہی اس کا حکم دیتے جو ہر وقت دل و جان سے آپ کے ہر حکم کی تعمیل پر مستعد رہتے تھے۔ مگر آپ نے ایسا حکم نہیں دیا بلکہ امت کے لئے آپ کا یہ جامع ارشاد منقول ہے ماعال من اقتصد (جو شخص میانہ روی اختیار کرے وہ محتاج نہیں ہوگا)

اور قرآن بھی ٹھیک یہی کہتا ہے۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً	نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا
اِلٰی عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا	رکھو اور نہ بالکل ہی کھلا چھوڑ دو
كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ	کہ اس کے نتیجے میں ملامت زدہ
مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔	اور شکست خوردہ بن کر رہ جاؤ

(بنی اسرائیل ــ ۲۹)

یعنی بخل بھی برا اور اتنا خرچ کرنا بھی برا کہ آدمی خود محتاج بن جائے اور آڑے وقت کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہ بچے۔

دوسرے ہر پہلو سے قطع نظر یہ بات بہرحال قرآن و حدیث دونوں سے ظاہر ہے کہ جملہ ہدایات انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہی دی جا رہی ہیں۔

پھر درہم و دینار کے سلسلہ میں تو آپ نے حضورؐ کا اسوہ دیکھا مگر یہ نظر انداز کر دیا کہ تھوڑی بہت جائداد بہرحال آپ نے اپنی ذاتی ملک میں برقرار رکھی تھی۔ بنی النضیر میں سات عدد مکان جنہیں ایک یہودی نے غزوۂ احد کے دن آپؐ کو ہبہ کیا تھا یہیں آپ کی وہ زمین بھی تھی جو بطورِ فئے آپ کے قبضے میں آئی تھی۔ خیبر کے دو قلعے الوطیح اور السلالم۔ الکتیبہ میں بھی آپ کا حصہ تھا۔ فدک کی آدھی اراضی آپ ہی کی تھی اور وادی القریٰ کا ایک تہائی بھی آپ ہی کی ملک اور قبضے میں تھا۔

یہ سب جائداد تا دمِ وفات آپ کے قبضۂ تصرف میں رہی اور اس کی آمدنی آپ اپنی مرضی کے مطابق صرف فرماتے رہے۔ بعدِ وفات اس میں وراثت کیوں نہ جاری ہوئی یہ الگ مسئلہ ہے۔ انبیاءؑ کی جہاں بعض اور خصوصیات ہیں وہیں یہ بھی ہے کہ جو ترکہ وہ چھوڑتے ہیں اس میں وراثت جاری نہیں ہوتی۔ حضورؐ نے فرمایا نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقۃ۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ مال ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوا کرتا۔ اسے ایسا ہی سمجھئے جیسے حضورؐ کی بیویاں تمام امت کے لئے ماں کے درجے میں رکھی گئیں جن سے حضورؐ کے بعد کوئی بھی نکاح نہیں کر سکتا تھا حالانکہ اور کسی مسلمان کی بیواؤں کا یہ حکم نہیں ہے۔ بہرحال غیر منقولہ جائداد کے علاوہ آپؐ بہت سے منقولہ اموال کے بھی مالک رہے ہیں۔ تفصیل یہ ہے:۔

سات گھوڑے جن میں سے ہر ایک کا نام کتبِ سیرت میں موجود ہے۔

پانچ خچر۔ تین گدھے (معلوم ہے کہ اس زمانے میں خچر اور گدھے سواری کے لئے استعمال ہوتے تھے)

تین اونٹ۔ قصویٰ۔ عضباء اور جدعاء

سو بکریاں۔ سو سے بڑھ جاتیں تو آپ انہیں ذبح کرا دیتے مقصود یہی سو رکھنے۔

نو تلواریں۔ سات زرہیں۔ ان میں سے ایک کسی یہودی کے پاس رہن رکھ کر آپ نے تیس صاع جو قرض بھی لئے تھے جن کی ادائیگی سال بھر بعد کر کے زرہ واپس لی۔

چھ کمانیں ایک اچھی قسم کا ترکش۔ دو سپر (ڈھال) دو نیزے تین چوب دست (چھوٹے نیزے جیسا ایک ہتھیار) ایک خود (مغفر) تین جبے۔ متعدد چھوٹے بڑے پیالے جن میں ایک شیشے کا بھی تھا ایک خیمہ۔ ایک مشک۔ دو قینچیاں۔ آئینہ۔ کنگھی۔ سرمہ دانی۔ چارپائی فرش۔ تکیہ۔ چادر۔ ناپ کے پیمانے۔

تقریباً سترہ یا اٹھارہ غلام جنہیں آپ نے یا تو آزاد کیا یا کسی اور کو ہبہ کیا اور اس نے آزاد کر دیا۔

مستند کتبِ حدیث میں پائی جانے والی اس تفصیل کو زیرِ بحث لانے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ ذاتی ملکیت کی توثیق اور تثبیت

سے حضورؐ کی اپنی شخصیت بھی خالی نہیں۔ اگر ذاتی ملکیت کا قصہ تمام کرنا ہی قرآن کا آئیڈیل ہوتا تو حضورؐ کم سے کم اپنی ذات کے لئے تو اس آئیڈیل کو اختیار فرماتے۔ کوئی مانع موجود نہیں تھا پھر کیا ہم یہ سمجھیں کہ جس رسولؐ پر قرآن نازل ہوا خود اس نے قرآن کے آئیڈیل کو نظر انداز فرمایا۔ ونعوذ باللہ من ذلک۔

مولانا یہ بھی فرماتے ہیں کہ :-

"قرآنی قانون زکوٰۃ کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ ایک طبقہ سردار اور دوسرا بھک منگا رہے"

بھک منگے کا لفظ مولانا نے محض اشتعال انگیزی کے لئے استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے انھیں معلوم ہی نہ ہو کہ زکوٰۃ کے مستحق صرف بھک منگے ہی نہیں ہوتے بلکہ بے شمار وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو بظاہر صاف پوش ہیں۔ معزز ہیں۔ دست سوال دراز نہیں کرتے۔ صدا نہیں لگاتے

نیز لفظ سرداری بھی ان تمام لوگوں کے لئے موزوں نہیں جنھیں اللہ نے صاحبِ نصاب بنایا ہے۔ دراصل کمیونسٹ ریفارمروں کی طرح مولانا یہ بھیانک تأثر دینا چاہتے ہیں کہ ایک طرف بڑے بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا طبقہ ہے جو زکوٰۃ بانٹ رہا ہے اور دوسری طرف لبرے لگے ہوئے فاقہ کش بھکاری ہیں جو زکوٰۃ لے رہے ہیں۔ اس تأثر کا جو کچھ مقصد ہے محتاج تشریح نہیں۔ لیکن ہر صاحبِ علم مسلمان جانتا ہے کہ نہ تو ہر صاحبِ نصاب اصطلاحی معنوں میں جاگیردار یا سرمایہ دار ہوتا ہے نہ ہر مستحقِ زکوٰۃ لازماً بھکاری اور فاقہ کش۔

قرآن میں زکوٰۃ کے جو مصارف بیان ہوئے ہیں ان سے بھی ظاہر ہے کہ مولانا کا دیا ہوا تأثر غلط ہے۔ اور یہ جو دعویٰ فرمایا گیا کہ قرآنی قانون زکوٰۃ کا :-

مقصد ایسی معاشی ہمواری پیدا کرنا ہے کہ محتاجی معاشرے سے ختم ہو جائے۔ کوئی کسی کا محتاج نہ رہے نہ زکوٰۃ لینے والا کوئی رہے اور نہ دینے والا"۔

یہ نہ صرف المی منطق ہے بلکہ اس میں حقائق ثانیہ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اسلام بے شک یہ پسند کرتا ہے کہ معاشرے میں گداگری نہ ہو۔ کوئی بھی ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے اور مخلوق خدا کو فاقوں کی نوبت نہ آئے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر اس نے تجارت صنعت، سیاست، زراعت۔ ہر شعبۂ زندگی کے لئے نہایت حکیمانہ قوانین وضع کئے ہیں۔ لیکن یہ مقصد اس نے کسی آیت یا حدیث کے ذریعہ ظاہر نہیں کیا کہ حکمران طبقہ افراد سے ذاتی ملکیت کا حق سلب کر کے جبراً "معاشی ہمواری" پیدا کرے۔ اس کے برخلاف اس نے اس اٹل حقیقت کو تسلیم کیا کہ قوانین حیات کچھ بھی نافذ کر دیئے جائیں مگر اللہ نے تمام افراد میں نہ تو صلاحیتیں یکساں رکھی ہیں نہ رزق برابر مقسوم کیا ہے۔ لہٰذا یہ صورت تو بہرحال موجود رہنی ہی ہے کہ کچھ لوگ دولتمند ہوں اور کچھ غریب، کچھ صحت سے بہرہ ور ہوں اور کچھ امراض کا شکار۔ کچھ پر روزی کی آسان راہیں کھلی چلی جائیں اور کچھ آفات و حوادث کے تھپیڑے سہتے رہیں۔ اسی صورت حال کا حکیمانہ علاج اس نے زکوٰۃ کو تجویز کیا گویا زکوٰۃ کا مقصود وہ مفروضہ معاشی ہمواری پیدا کرنا نہیں جسے ذو معنی انداز میں ذاتی ملکیت کی نفی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ معاشی ناہمواری کو ایک طبعی اور تکوینی حقیقت مان کر اس کا مناسب تدارک کرنا ہے۔

پھر یہ بھی معلوم ہے کہ اقتدار اگر اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو تو زکوٰۃ حکومت وصول کرے گی۔ لہٰذا ایسا کوئی وقت اگر آ بھی جائے کہ اسلامی مملکت میں کوئی شخص مستحقِ زکوٰۃ نہ رہے تب بھی زکوٰۃ لینے اور دینے والے دونوں ہی موجود رہیں گے۔ دیں گے افراد اور لے گی حکومت۔ حکومت زکوٰۃ کی وصولی صرف اسی ایک مقصد سے نہیں کرتی کہ مملکت کے غرباء و مساکین کی حاجت روائی کرے بلکہ اس کا دائرۂ کار اور ضروریات تو غیر محدود ہیں۔ بیماروں کے لئے مفت علاج کے ہسپتال۔ مفت تعلیم کے لئے مدارس۔ فوج، پولیس کا خرچ۔ صنعتوں کا قیام۔ وغیر ذلک۔ پھر آخر یہ فقرہ افسانوی نہیں تو کیا ہے کہ :-

"نہ زکوٰۃ لینے والا کوئی رہے نہ دینے والا"

قانونِ وراثت کے بارے میں مولانا خود تسلیم کر رہے ہیں کہ وہ ملکیت کو بتدریج ختم کرنے کیلئے ہے۔ پھر تو معلوم ہوا کہ

جس طرح اور جس حد تک ملکیت کا خاتمہ اللہ کو مقصود تھا اسکے لئے قاعدہ قانون اس نے خود نازل فرما دیا۔ اگر کسی اور حد تک یہ خاتمہ مقصود ہوتا تو اس کے لئے بھی ضرور قانون نازل کیا جاتا۔ مثلاً اگر یہی منشاء ہوتا کہ ذاتی ملکیت کا قصہ ہی تمام ہو جائے تو کس چیز نے خدا کو مجبور کیا تھا کہ انفرادی ملکیت کو ایک امر مسلّم قرار دیتے ہوئے وراثت کے قوانین نازل فرمائے اس کے بجائے وہ صاف صاف کہہ سکتا تھا کہ آج سے ذاتی ملکیت مسترد۔ ہر شخص اپنا تمام مال حکومت کے حوالے کر دے اور حکومت ہی ہر شخص کی پرورش کیا کرے یا وہ اتنا ہی فرما دیتا کہ قانون وراثت محض ایک عارضی اور عبوری قانون ہے۔ تم لوگ ایسا معاشرہ پیدا کرنے کی سعی کرو جس میں ذاتی ملکیت کا خاتمہ ہو جائے اور زکوٰۃ وغیرہ کی ضرورت ہی نہ رہے۔

معلوم ہوتا ہے مولانا کی دانست میں خدا سے چوک ہو گئی یا پھر ان کا خیال شاید یہ ہو کہ معاشی امور میں خدا کچھ کم عقل مند ہے اور مکمل عقل ان لوگوں کے حصے میں آئی ہے جو بے نہایت ظلم و استبداد کے ذریعہ نام نہاد معاشی ہمواری پیدا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور انفرادی ملکیت ان کے مزاج نازک کے لئے گالی کا درجہ رکھتی ہے۔

جرم و تعزیر کی مثال سے جو تعریض مولانا نے فرمائی اسے بھی ابلہ فریبی اور مغالطہ انگیزی کے سوا کوئی عنوان دینا مشکل ہے۔

حضرت کعب احبار یا کسی بھی اور عالم نے ضروریات سے فاضل مال کی بحث میں قرآنی قانونِ وراثت سے جو استدلال کیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ چونکہ قرآن میں قانونِ وراثت نازل ہو گیا اس لئے ہم انفرادی ملکیت کو جائز مانیں گے بلکہ یہ ہے کہ قرآن نے قانونِ وراثت نازل کر کے ضروریات سے فاضل مال و جائداد رکھنے کے اس تصور جواز کی توثیق کر دی ہے جو انسانی معاشرے میں پہلے سے موجود ہے۔ اگر یہ تصور اللہ کے نزدیک غلط اور قابل تنسیخ ہوتا تو قانون وراثت کی تنزیل نہ ہوتی بلکہ ایسا کوئی قانون نازل ہوتا جو ہر مسلمان کی تمام فاضل دولت کو اس کی ملکیت سے نکال دیتا یا ہر مسلمان کو مجبور کر دیتا کہ فاضل دولت فی الفور غرباء میں بانٹ دے یا حکومت کے حوالے کر دے۔

قانون زکوٰۃ کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس نے انفرادی ملکیت اور ضروریات سے فاضل مال کے جواز کی قطعی تصدیق کر دی۔

اب رہا حدود و تعزیرات کا معاملہ۔ تو ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا نفاذ مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ مقصود جرائم کی روک تھام ہے اگر جرائم وقوع پذیر نہ ہوں تو مقصود حاصل ہو گیا۔ پھر سزاؤں کے اجراء کی کیا ضرورت باقی رہی ــــ لیکن حدود و تعزیرات کے قوانین ــــ اس وقت بھی نہیں ہوتے، ختم تو جب ہوں جب جرائم کا امکان ہی ختم ہو جائے۔ انسانی معاشرے میں اس امکان کا خاتمہ ممکن نہیں، اس لئے سزا کے قوانین بھی جوں کے توں موجود رہیں گے۔ جہاں کوئی جرم واقع ہوا قانون حرکت میں آجائے گا۔

اسی طرح وراثت اور زکوٰۃ کے قوانین کی کارفرمائی کا انحصار مال کے ہونے نہ ہونے پر ہے۔ اگر مال ہے ہی نہیں تو یہ قوانین کارفرما بے شک نہ ہوں گے مگر موجود بہرحال رہیں گے اور جب بھی مال پایا جائے گا اس میں ان کا نفاذ ہو جائے گا اس تنقیح کی روشنی میں دیکھئے تو صاف معلوم ہو گا کہ مولانا نے جو تعریض فرمائی ہے وہ ایک طرح کا مسخرہ پن ہے جس کے ذریعہ ایک طرف وہ علماء و فقہاء کا مذاق اڑانا چاہتے ہیں دوسری طرف سادہ لوح بندگانِ خدا کو اپنی غیر اسلامی منطق سے متاثر کرنے کی کوشش ہیں۔

اب آیئے تفحص کریں کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کا مسلک کیا تھا شہرت یہ پا گیا ہے کہ وہ ضروری سامانِ زندگی سے علاوہ ہر مال و جائداد کو "کنز" قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ جو لوگ اپنی ضروریات سے زیادہ مال و متاع رکھتے ہیں ان پر اللہ بن بکنزون والی وعیدِ قرآنی صادق آتی ہے۔

یہ شہرت یافتہ مسلک فی الحقیقت ابوذرؓ پر ایک الزام ہے جیسا کہ ابھی ہم تاریخی دلائل سے منقح کریں گے۔ لیکن کچھ دیر کے لئے مان ہی لیں کہ حضرت موصوف کا یہی مسلک تھا تو پھر بھی انفرادی ملکیت کی نفی کے اس فاسد و باطل خیال کو اس سے کوئی تائید

نہیں ملتی جسے مولانا نے اپنے مضمون میں سمویا ہے۔

ضروریاتِ زندگی کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ کھانا، کپڑا، مکان، وسائلِ معاش مثلاً زمین یا مالِ تجارت یا کارخانہ یا دکانیں جنھیں کرایہ پر دیا جاسکے۔ بہرحال آپ اس فہرست کو خواہ کتنا ہی مختصر کردیں مگر اس کی حد تک تو ابوذرؓ کا یہ مسلک بھی انفرادی و ذاتی ملکیت کی توثیق و تصویب کر رہا ہے اور جب انفرادی ملکیت بجائے خود ممنوع قرار نہ پائی تو قرآنی قانونِ وراثت کا خاتمہ یا تعطل کبھی ممکن نہیں کیونکہ اپنی اور بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی کے لئے جو بھی مال روکا جائے گا اس کا کچھ نہ کچھ حصہ بہرکیف اس وقت بچا ہوا ہوگا جب ایک شخص موت سے ہمکنار ہو۔ مثلاً زید کی زمین میں سو من گیہوں اُگا۔ اب حضرت ابوذرؓ کا مسلک یہ نہیں کہتا کہ زید اپنے اہل و عیال کے لئے صرف ایک دن کی ضرورت کا گیہوں روک کر باقی سارا خیرات کردے یا حکومت کو دیدے بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ اگلی فصل آنے تک جتنا کچھ خرچ متوقع ہے اس کے مطابق گیہوں اپنے پاس رکھے باقی غرباء کو دے۔ اگلی فصل تک گھریلو اخراجات کا تخمینہ فرض کرلیجئے ہزار روپے ہوا اور یہ روپے اسی من گیہوں فروخت کرکے حاصل ہوسکتے ہوں تو اسی من گیہوں روک رکھنا مسلکِ ابوذریؓ کی رو سے بھی عین جائز ہوا۔ اب کیا زید ٹھیک اسی دن مرے گا جب یہ سارا گیہوں یا اس کی فروخت سے حاصل شدہ رقم پائی پائی خرچ ہوچکی ہو۔ ظاہر ہے کہ نہیں اور بالکل نہیں۔ وہ اسی من گیہوں روکنے کے اگلے دن بھی مرسکتا ہے۔ اگلے مہینے بھی۔ دو ماہ بعد بھی وہ جب بھی مرے گا کچھ نہ کچھ گیہوں یا روپیہ یقیناً چھوڑ کر مریگا۔ پھر وراثت کا خاتمہ کہاں ہوا۔ یہ گیہوں آخر ورثاء میں قانونِ وراثت ہی کے اعتبار سے تو بٹے گا۔

بالکل ظاہر ہے کہ قانونِ وراثت کا بالکلیہ خاتمہ انفرادی ملکیت کی کلی نفی پر ہی منحصر ہے اور اس نفی کے لئے حضرت ابوذرؓ کے مشہور مسلک میں برائے نام بھی گنجائش نہیں۔ اسی لئے ہم مولانا کے مضمون کو غیر سنجیدہ اور غیر علمی کہنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ کیسے غضب کی زیب دیتا ہے کہ ایک صحابی کی آڑ لے کر اپنے غیر اسلامی فکر کو عین اسلامی ابوذر کرنے کی کوشش کی جائے اور کتنی عبرت کی بات ہے کہ ایک نیک سیرت، بااخلاص اور دین پسند صحافی باوجود فہیم و عقیل ہونیکے اس فریب کا احساس نہ فرماسکیں اور مضمون کو اپنے جریدے میں نقل کرکے زبانِ حال سے تحسین و تائید کی غلطی کرگذریں۔

گہ بر پشت پائے خود نہ بینم

حضرت ابوذرؓ کے مسلک کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ بعد کے ناقلین تک محدود رہنے کے بجائے قدیم ترین مآخذ و مراجع کی طرف رُخ کیا جائے۔

بخاری و مسلم، مسند امام احمد اور طبقات ابن سعد سے زیادہ قدیم اور مستند مآخذ اس بحث میں میسر نہیں ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے مال و دولت سے متعلق اپنی ایک رائے کو دورِ عثمانی میں شد و مد کے ساتھ ظاہر کیا تھا۔ اس سے قبل اس رائے کا کوئی چرچا نہ تھا۔ حالانکہ وہ ابتداء ہی میں اسلام لے آئے تھے۔ مولانا پھلواری نے خود وضاحت کردی ہے کہ اسلام قبول کرنے والوں میں ان کا نمبر صرف پانچواں تھا۔

اس صورتِ حال کے مضمرات پر غور کیجئے۔ عہدِ رسالت میں عہدِ صدیقی میں اور عہدِ فاروقی میں بھی ایسے بہت سے مسلمان موجود تھے جنھیں سرمایہ دار کہنا مبالغہ سے خالی ہوگا۔ بعض لکھ پتی تھے بہت سے ہزار پتی۔ بے شمار ایسے جنھیں خوش حال یقیناً کہا جاسکتا ہے گویا ان کے پاس اپنی ضروریات سے زیادہ مال و منال موجود تھا پھر وہ آیت قرآنی بھی کہیں چلی نہیں گئی تھی جسے حضرت ابوذرؓ نے بعد میں زور شور سے اپنی رائے کی دلیل بنایا ہے (یعنی الذین یکنزون الذهب والفضة۔ اس کی مفصل بحث آگے آرہی ہے) لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس طویل زمانے میں حضرت ابوذرؓ خاموش رہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ مال رکھنے کی حرمت کا خیال اصلاً اور ابتداءً قرآن نے نہیں پیدا کیا ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کا اظہار اس طویل زمانے میں نہ ہوتا جب کہ اس اظہار کے لئے معقول وجہ موجود تھی۔ اس حرمت کی اگر واقعتہً کوئی حقیقت ہوتی تو اس کی زد میں صرف دورِ عثمانی ہی کے امراء نہ آتے بلکہ اس سے پہلے کے امراء بھی آتے اور عین عہدِ رسالت میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عثمانؓ جیسے مالدار حضرات کے خلاف حضرت ابوذرؓ کی زبان کھلتی۔ مگر نہ کھلی جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے مخصوص

خصلت: ل کی تحریک دراصل وہ صورتِ حال ہی بنی جو دورِ عثمانی میں نمایاں ہوئی تھی۔ خصوصاً اس علاقے میں جہاں حضرت معاویہ گورنر تھے۔

کون نہیں جانتا کہ فتوحات کی کثرت نے ایک طرف دولت کی ریل پیل کی دوسری طرف بے شمار نئے لوگ داخلِ اسلام ہوئے جو اپنے اپنے عادات و خصائل ساتھ لائے۔ حضرت عثمانؓ کی پالیسی نرم تھی اور نرم نہ بھی ہوتی تو کثرتِ مال کے طبعی اور نفسیاتی اثرات و نتائج تو بہرحال ظاہر ہونے ہی تھے انھیں روکنا کس کے بس کی بات تھی۔ دن بدن وسیع ہوتے ہوئے دائرۂ مملکت میں عیش و تنعم کی فراوانی ہوتی گئی۔ اس معاشرے کے خدوخال ماند پڑنے لگے جن میں سادگی، انفاق سبیل اللہ، تقویٰ اور زہد کا رنگ تھا۔ صدہا گھرانوں کی بیویاں اور لونڈیاں زیوروں سے لد گئیں۔ زکوٰۃ اور صدقات کا پہلا جیسا اہتمام نہ رہا۔ عیاشیوں کے مظاہر عام ہوگئے۔ ان حالات میں حضرت ابوذرؓ قریب کر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ہدف عیش و تنعم ہے۔ یہ رنگ رلیاں ہیں۔ یہ غیر اسلامی انداز معاشرت ہے ـــــ گویا محرک قرآن کے اندر نہیں باہر تھا۔ اس بدلتے ہوئے ماحول میں تھا جو اسلام کے رنگ معاشرت پر تیزی سے غیر اسلامی رنگ کو غالب کرنا چاہا تھا پھر قدرتاً حضرت موصوف نے اپنے احتجاج کو پرزور بنانے کیلئے ان آیات و احادیث سے حجت پکڑی جو دلیل کا کام دے سکتی تھیں ان کا حجت پکڑنا غلط نہ تھا کیونکہ اللہ اور رسول یقیناً اس قسم کی مسرفانہ اور عیش پرستانہ معاشرت پسند نہیں کرتے جس کے دروازے اب کھل گئے تھے۔ مگر انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ رخ پر کچھ زیادہ ہی ڈھل جاتی ہے اور حضرت ابوذرؓ تو خلقتاً بھی انتہا پسند تھے (جیسا کہ آگے آئے گا) لہٰذا کبھی کبھی ان کی زبان سے جوش اور طیش میں ایسے فقرے بھی نکل گئے جن کا مطلب یہ سمجھا جاسکتا تھا اور سمجھا گیا کہ وہ صرف عیاشی ہی کے مخالف نہیں بلکہ ہر حال میں فاضل مال و دولت کو واجب الانفاق خیال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، وہ تو صرف اس مال و دولت کے دشمن تھے جو بیت

سینت کر رکھا جائے اور راہِ خدا کے بجائے عیش پرستیوں میں صرف ہو۔ اللہ اور رسول بھی یقیناً ایسے مال و دولت کو موجب عذاب ہی قرار دیتے ہیں اور علماء و فقہاء بھی اس سے ہٹ کر کوئی رائے نہیں رکھتے۔

بات اور زیادہ منقح کرنے کے لئے ہمیں تفصیل میں جانا ہوگا حضرت ابوذر نے خصوصیت سے جس آیت کو مستدل بنایا تھا وہ یہ ہے:-

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ — اور جو لوگ گاڑ کر رکھتے ہیں سونا
وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا — اور چاندی اور اس کو خرچ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ — نہیں کرتے اللہ کی راہ میں سو
بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ — ان کو خوش خبری سنادے
(توبہ - ۳۴) — عذاب دردناک کی۔

پہلی بات تو یہ سن لینے کی ہے کہ اس آیت کے نزول پر جب صحابہؓ کے مابین تبادلۂ خیال ہوا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں خود حضورؐ ہی سے پوچھے آتا ہوں۔ پھر حضورؐ سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ادا کردی جائے تو مال اس آیت کا مصداق نہیں رہتا۔ اس مضمون کی روایت بہتیری کتابوں میں ہیں۔ ہم تفسیر ابن کثیر کے حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں اور ابن کثیر ہی نے بعض صحابہؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ قانونِ میراث بجائے خود مال جمع کرنے کے جواز کی دلیل ہے۔ گویا مولانا پھلواری نے جس استدلال کو بعض علماء کی "حماقتوں" میں شمار کرایا ہے وہ تیرے آج کے علماء تک محدود نہیں بلکہ صحابہؓ میں بھی پایا جاتا رہا ہے۔

دوسری بات یہ قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے سونے چاندی کے الفاظ استعمال فرمائے "مال" کا لفظ نہیں کہا۔ سونا چاندی مجازاً بے شک مال و دولت پر صادق آتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ہر جگہ مجازی ہی مفہوم لیا جائے۔ یہاں حقیقی معنی مراد لینے میں کوئی شئے مانع نہیں۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوذرؓ کے ذہن میں بھی حقیقی ہی معنی تھے، یعنی وہ دو دھاتیں جن کے نام سونا اور چاندی ہیں نہ کہ ہر قسم کا مال۔

ثبوت یہ ہے کہ مسند امام احمدؒ میں خود حضرت ابوذرؓ سے

یہ حدیث مروی ہے کہ :-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من صاحب ابل ولا بقر ولا غنم لا یؤدی زکوتہا الا جاءت یوم القیامۃ اعظم ما کانت واسمنہ تنطحہ بقرونہا وتطؤہ باخفافہا کلما نفدت اخرہا عادت اولہا حتی یقضی بین الناس ۔

حضورؐ نے فرمایا کہ اونٹوں، گایوں اور بکریوں کے مالک ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے قیامت کے روز ان کا یہ حال ہوگا کہ انکے یہ جانور اس سے زیادہ بڑے اور موٹے تازے کر کے سامنے لائے جائینگے جتنے وہ دنیا میں تھے اور یہ مالک کے سینگ ماریں گے اور پیروں سے مسلیں گے جب تک حساب کتاب چلتا رہیگا یہ عمل جاری رہیگا ایک ریوڑ ختم ہوگا تو دوسرا آجائے گا۔

کار آمد مویشیوں کے یہ بڑے بڑے گلّے کیا "مال و دولت" میں داخل نہیں ہیں۔ اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو کیسے ممکن تھا کہ حضرت ابوذرؓ خود ہی یہ حدیث بیان فرمائیں اور خود ہی یہ رائے ظاہر کریں کہ فاضل مال و دولت رکھنا حرام ہے خواہ اسکی زکوٰۃ ہی ادا کردی گئی ہو۔ ان کی رائے کا تعلق صرف سونے اور چاندی ہی سے ہو تب تو بات قابلِ فہم ہوسکتی ہے ورنہ کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔

دوسرا ثبوت ان کا ایک عمل ہے جس کا مذکور طبقات وغیرہ میں ملتا ہے۔ بیت المال سے آپ کو سالانہ وظیفہ ملا کرتا تھا اس کے ملنے پر آپ یہ کرتے کہ کنیز کے ہمراہ سال بھر کا ضروری سامان خرید لاتے اور اس کے بعد جو درہم و دینار بچتے انھیں جوں کا توں نہ رکھتے بلکہ پیسے (فلوس) بھنا لیتے اس کے بارے میں آپ سے سوال کیا گیا کہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو آپ نے جواب دیا کہ سونا چاندی جمع کرنے والوں کے لئے تو وعید ہے۔ پیسے سونے چاندی کے نہیں ہوتے۔

طبقات اور طبری دونوں میں بیان ہوا ہے کہ ملک شام سے جب آپ کے بال بچے دار الخلافہ آئے تو ان کے پاس ایک تھیلی بھی تھی جس میں پیسے بھرے ہوئے تھے۔ لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ بھلا ابوذرؓ اور ان کے پاس مال جمع ہو۔ اس پر ان کی بیوی نے وضاحت کی کہ اس میں درہم و دینار نہیں ہیں فلوس ہیں۔

کیا اس سے بھی یہ واضح نہیں ہوتا کہ آیت قرآنی کے الفاظ ذہبٌ فضۃ کو آپ ان کے لغوی معنی میں لیکر اظہارِ رائے فرماتے تھے۔ ورنہ مال تو درہم و دینار بھی ہیں اور گھٹتے ہوئے پیسے بھی۔

تیسرا ثبوت یہ ہے کہ آپ کی ملک میں متعدد گدھے بھی تھے، گھوڑیاں بھی تھیں، اونٹ بھی تھے اور زمین بھی تھی مسند احمد میں ضیعۃ کا لفظ آیا ہے جو باغ کے لئے بھی بولتے ہیں اور زراعتی زمین کے لئے بھی ہو۔ بیوی کے ہوتے لونڈی کو بھی ضرورت سے زائد مال کے خانے میں رکھنا ہوگا۔

کیا سب اشیاء اموال فاضلہ میں نہیں۔ خصوصاً جب سالانہ خرچ بیت المال سے ملتا تھا تو ان چیزوں کا فاضل ہونا ظاہر ہے۔ تو اب یا تو یوں کہئے کہ حضرت ابوذر جس چیز کو دوسروں کے لئے حرام کہتے تھے اسے اپنے لئے جائز سمجھتے تھے یا پھر وہی کہئے جو ہم کہہ رہے ہیں کہ ان کی مخالفت سونے اور چاندی کے باب میں تھی نہ کہ ہر قسم کے مال کے۔

اس تخصیص کے لئے وجوہ بھی موجود ہیں۔

ماضی و حال کا کوئی تمدن ایسا نہیں جس کے اقتصادی نظام میں سونے اور چاندی کی بنیادی اہمیت مسلّم نہ ہو۔ ان کا صحیح مصرف یہی ہے کہ انھیں گردش میں رکھا جائے اور انکے ذریعہ دوسری اشیاء حاصل کی جائیں جو افرادِ معاشرہ کے کام آئیں۔ یہ دونوں دھاتیں اگر سیف کر بکسوں اور تہ خانوں میں رکھدی جائیں تو ان میں اور مٹی کے ڈھیلوں میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ ان کی افادیت اس میں ہے انھیں خزانے کی طرح گاڑ کر یا تہ خانوں میں بند کر کے نہ رکھا جائے۔

استعمالی اشیاء میں مردوں کے لئے تو سونا حرام ہی ہے اور عورتوں کے لئے بھی سونے چاندی کے استعمالی برتن حرام ہیں۔ صرف زیور کو جائز رکھا گیا ہے۔ لیکن حضرت ابوذرؓ زیور تک کو بہ نگاہ استکراہ دیکھتے ہوں تو اس کی قابلِ فہم وجہ موجود ہے ایک بار حضورؐ کے پاس آپ بھی تھے کہ ایک

دیہاتی نے آکر قحط کی شکایت کی۔ حضورؐ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ قحط سے زیادہ مجھے اس وقت کا خوف ہے جب تم لوگوں پر مال و دولت کے دروازے کھل جائیں گے اسی کے ساتھ آپ نے فرمایا:۔

یا لیتا لیت لا یتحلون　　اے کاش میری امت سونے کے
الذھب (مسند احمد)　　زیور استعمال نہ کرتی۔

راوی حضرت ابوذرؓ ہی ہیں اور انہوں کے کانوں نے اس ارشاد کو حضور سے سنا ہے۔ بلاشبہ یہ کوئی شرعی فیصلہ نہ تھا لیکن اس سے کیا حضرت ابوذرؓ کے قلب میں سونے کے زیوروں کے بارے میں بھی یہ خیال جاگزیں نہ ہو سکتا تھا کہ ان کا استعمال حلال نہیں۔

جب وہ عہد عثمانی رض میں کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی بیگمیں اور کنیزیں زیوروں میں پیلی ہو رہی ہیں تو فطرتی بات ہے کہ انھیں حضورؐ کا یہ ارشاد یاد آجاتا ہے :۔

مزید دیکھئے کہ ایک مرتبہ اصحاب صفہ کو ایک ایسا مدرسہ سمجھ لیجئے جہاں غریب مسلمان قیام رکھتے تھے۔ عبادتیں کرتے تھے اور دین سیکھتے تھے۔ ان کا گذارا عموماً صدقہ خیرات پر تھا۔ غسل دینے کے لئے جب ان مرحوم کا لباس الگ کیا گیا تو ان کے تہبند سے ایک اشرفی برآمد ہوئی۔ حضور کو اسکی اطلاع ملی تو فرمایا کہ یہ ایک داغنے والی شئے ہے۔ پھر اتفاق سے ایک اور صاحب مرے ان کے کپڑوں سے دو اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ یہ داغنے والی دو مہریں ہیں۔

کیا یہ واقعے اور ان پر حضور کا اظہار تأثر ایسا نہیں کہ حضرت ابوذرؓ خاص سونے اور چاندی ہی کے جمع کرنے کی حرمت پر وثوق رکھتے ہوں۔

از راہ غلط فہمی آیت کے کسی لفظ کو بجائے مجازی معنی کے اس کے لغوی معنی پر محمول کرنا مستبعد تو نہیں ہے جب آیت کُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ (سورۂ بقرہ) نازل ہوئی تو عالانکہ خیط (دھاگے) سے مراد افق پر صبح میں ظاہر ہونے والی روشنی اور ظلمت کے خطوط ہیں جن کے ذریعہ سحری کا آخری وقت متعین کیا گیا لیکن بعض صحابہؓ نے خیط کے لغوی معنی سمجھ لئے اور انھوں نے اپنے پیروں میں کالے اور سفید ڈورے لپیٹ لئے کہ جب صبح کی روشنی ان کے رنگ میں تمیز کرنے کے قابل بنادے اس وقت سحری کا اختتام ہوگا

بخاری و مسلم وغیرہ میں عدی بن حاتم کی یہ روایت موجود ہے کہ میں نے اپنے تکیے کے نیچے سیاہ اور سفید دو ڈورے رکھ لئے اور جب تک اتنی روشنی نہ ہوگئی کہ ان کے رنگ میں تمیز کی جا سکے سحری کھاتا رہا۔ اس موقع پر حضورؐ کا ایک دلچسپ فقرہ بھی مروی ہے۔ صبح کو جب عدی بن حاتم نے اپنا ماجرا بیان کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ واہ صاحب آپ کا تکیہ تو بڑا لمبا چوڑا نکلا۔ مطلب یہ تھا کہ آیت میں خیط سے مراد تو افق کے روشن اور تاریک خطوط ہیں۔ تمہارے تکیے نے اتنے لمبے افق کو اپنے نیچے چھپا لیا۔

اندازہ کیجئے کہ ظاہر الفاظ سے اگر مراد سمجھنے میں ایسی غلطیاں بعض صحابہؓ سے واقع ہوئیں تو کونسا مانع ہے کہ حضرت ابوذرؓ آیت کے الفاظ ذہب و فضہ کو ان کے عین لغوی مفہوم میں لے رہے ہوں۔ خصوصاً جب کہ دوسرے قرائن سے اس لغوی تخصیص کے لئے موجود تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوذرؓ کا مسلک بنیاداً یہ نہیں تھا کہ ضرورت سے زیادہ کوئی بھی مال جائداد جمع رکھنا حرام ہے پھر جب اپنے اس مسلک کو انھوں نے ازراہِ اصلاح و تنبیہ کھل کر ظاہر کیا تو اس کے نتیجے میں ان کی ذات والا صفات دو طرح کے لوگوں کا مرجع و ہدف بن گئی۔ ایک قسم ان لوگوں کی تھی جو اس نئے مسلک کا مذاق اڑاتے تھے کیونکہ یہ مسلک اول تو ان مسلمہ عقائد کے خلاف تھا جن کی تعلیم نبی کریم اور ان کے معتمد صحابہ سے ملی تھی۔ دوسرے حضرت ابوذرؓ کی ظاہری حالت کچھ ایسی ہی تھی کہ تفریح باز قسم کے لوگ انھیں تماشا بنا سکتے تھے (وضاحت آگے آرہی ہے)

دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جنھیں زیادہ مال و دولت میسر نہ تھا اور دولتمندوں کے خلاف ان کے سینوں میں آتش حسد بھڑک رہی تھی۔ انھوں نے موقعہ غنیمت جانا اور حضرت ابوذرؓ کے

مسلک کو اپنے مفید مطلب بنانے کی خاطر ان کے گرد جمع ہو گئے اس طرح جہاں ایک ایسا ہنگامہ کھڑا ہوا جو حکومت کے لئے لائق توجہ تھا وہیں حضرت ابوذر رضی میں گرما گرمی، آخر دشی اور تندی کی کیفیت پیدا ہوئی کیونکہ وہ طبعاً ایک انتہا پسند اور اشتعال پذیر مزاج رکھتے تھے جس میں جذباتیت غالب تھی اور فکر و تفقہ مغلوب۔ اسی لئے وہ مجذوبیت کی کیفیت تک پہونچ گئے تھے (جس کی تفصیل ہم ابھی پیش کریں گے) اسی لئے وہ اپنے مسلک کی رو میں کچھ اس طرح بہہ گئے کہ غرض پرست لوگوں کو اس مسلک کی من مانی صورت گری کا موقعہ مل گیا۔ آج بھی دیکھ سکتے ہیں کہ غرض پرست اور فاسد ذہن کے لوگ کس طرح آیات و احادیث کو موڑ توڑ کر اپنے مفید مطلب بنالتے ہیں۔ پھر حضرت ابوذر رضی جیسے مجذوب صفت صحابی کی ایک رائے کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اور پروپیگنڈے کی سان پر چڑھانا کیا مشکل تھا جب کہ حضرت ابوذر رضی خود بھی اپنے اشتعال پذیر اور انتہا پسند مزاج کے باعث اس پوزیشن میں نہ تھے کہ اپنی رائے کو اس خاص حد پر روک سکیں جو حقیقۃً اس کی حد تھی بلکہ قیاس یہی تقاضا کرتا ہے کہ ان کا سونا چاندی جمع کرنے کی حرمت کا خیال غیر شعوری طور پر اُن بڑی بڑی جاگیروں اور خزانوں تک جست کر گیا جن کی ہر طرف بہتات تھی اور جن کا عیش پسند لوگوں کے قبضہ میں ہونا زاہد بوذری پر گراں تھا۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ بعد کے بعض لوگوں نے ان کی طرف یہ فتویٰ تک منسوب کر دیا کہ صاحب السمال کافر (اہل دولت کافر ہیں) استغفر اللہ ثم استغفر اللہ۔

حضرت ابوذر رضی کی اشتعال پذیری، انتہا پسندی اور مجذوبیت کا ذکر نہ ہم نے خدانخواستہ تحقیر کے طور پر کیا ہے نہ محض خیا ثنا۔ وہ بہت ہی زاہد، عابد صحابی تھے۔ بڑے مرتبے والے۔ مگر اس سے ان کے مزاج و سیرت کی نفی تو نہیں ہو سکتی۔

ان کا تعلق غفار سے تھا جو مسلّمہ طور پر ڈاکوؤں اور قاتلوں کا قبیلہ تھا۔ اسلام لانے سے قبل خود ان کا یہ حال تھا ڈٹ کر لوٹ مار کرتے۔ طبقات میں وضاحت ہے کہ انکا عالم یہ تھا کہ بعض اوقات تو اکیلے ہی کسی قبیلے پر حملہ کر بیٹھتے۔ خوب گلے کاٹتے اور اونٹ، بکری جو بھی ملتا ہنکالے جاتے۔

ڈکیتی اپنی جگہ لیکن تن تنہا قافلوں اور قبیلوں پر ٹوٹ پڑنے کی جرأت ظاہر ہے کہ طبیعت کی انتہا پسندی کا مظہر ہے۔ پھر جب اسلام لائے تو زہد و ورع میں بھی ایسی ہی انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا۔ معتبر روایتیں بتاتی ہیں (مثلاً طبقات ابن سعد اور مسند احمد ابن حنبل ملاحظہ فرمائیے) کہ نہ تو آپ داڑھی میں کنگھی کرتے تھے نہ سر کے بالوں پر توجہ کرتے تھے۔ نہ صاف ستھرا رہنے کی پرواہ تھی۔ بعض لوگ آپ کو اس حالت میں دیکھ کر پکڑ لیتے اور نہلاتے دھلاتے۔ کپڑے بدل دیتے۔ حال درست کر دیتے۔ اسی روش کی بنا پر آپ کا گندمی رنگ سیاہ پڑ گیا تھا خود فراموشی کا یہ حال تھا کہ ایک بار کسی نے دریافت کیا——

"آپ ہی ابوذر ہیں؟" جواب میں بولے "میرے گھر والے تو ایسا ہی کہتے ہیں" (مسند احمد)

ایک مرتبہ آپ اپنی لڑکی کے ساتھ جا رہے تھے۔ کسی نے پوچھا یہ آپ کی بچی ہے؟ جواب دیا — "ہاں اس کی ماں تو یہی کہتی ہے" (مسند احمد)

لباس کا معاملہ یہ تھا کہ کبھی بالکل پھٹا پرانا کبھی ایک دم قیمتی۔ حتیٰ کہ قطریہ تک (جو عرب کے نفیس اور بیش قیمت ملبوسات میں شمار ہوا ہے) آپ کے بدن پر دیکھا گیا (مسند احمد)

رہنے کے لئے گھر بار کی کوئی ضرورت نہیں۔ مسجد میں پڑ گئے ادھر ادھر جا پڑے اور بال بچوں سمیت بھی رہے تو خیمے میں۔

ایک مرتبہ آپ نماز میں کھڑے ہوئے (اکیلے) تو بس رکوع اور سجدے کئے جا رہے ہیں۔ نہ دوسری رکعت پر بیٹھے نہ چوتھی پر۔ لوگوں نے کہا کہ اللہ کے بندے تمہیں اتنا بھی پتہ نہیں کب بیٹھنا چاہئے اور کب سلام پھیرنا۔ آپ بولے بھائی مجھے پتا نہیں مگر خدا کو تو پتا ہے۔ میں یہ سب نہیں جانتا۔ میں نے تو اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو آدمی اللہ کے لئے ایک سجدہ کرتا ہے اللہ اس کے تین کام کر دیتے ہیں (ملخصاً مسند احمد)

جذب و وارفتگی کی اس کیفیت سے بہت پہلے ایک مرتبہ حضورؐ سے عرض کر بیٹھے کہ مجھے کسی صوبے کا گورنر بنا دیجئے گویا چھوٹی موٹی کوئی خدمت نہیں مانگی اکٹھی گورنری طلب کی۔ یہ بھی طبعی انتہا پسندی کا اثر تھا۔ حضورؐ نے جواب دیا:۔

"اے ابوذر میرا خیال ہے کہ تم کمزور ہو"

کمزور سے مراد یہ نہیں تھی کہ جسمانی طور پر ضعیف ہو مراد یہ تھی کہ تم گورنری کے اہل نہیں۔ پھر فرمایا:۔

"دیکھو تم کبھی دو آدمیوں کے بھی امیر نہ بننا نہ کبھی کسی یتیم کے مال کے متولی بننا" (طبقات)

اس فیصلۂ نبوی کی حکمت پر غور فرما لیجئے۔ ظاہر ہے کہ امارت و ولایت کے لئے وہی افراد موزوں ہیں جو اعتدال پسند ہوں۔ دقیقہ رس اور معاملہ فہم ہو۔ ٹھنڈے دل و دماغ رکھتے ہوں۔ حضرت ابوذرؓ کی زود رنجی اور اشتعال پذیری کے متعدد شواہد ہیں۔

ایک مرتبہ آپ حضرت بلالؓ ہی کو گالی دے بیٹھے۔ یعنی فرمایا ——— اے باندی بچے!

اس پر حضورؐ نے ڈانٹا اور کہا تم میں جاہلیت پائی جاتی ہے (مسند احمد)

پھر فرمایا ——— تمہاری دیہاتیت اب تک نہیں گئی ہے" (طبقات)

تیز و تند خطاب کرنے اور بری طرح بگڑ جانے کی عادت حضرت ابوذرؓ میں آخر تک رہی۔ اس کا نتیجہ یہاں تک ہوا کہ بعض لوگوں نے ان کا تماشا بنا لیا۔

دربار عثمانی میں حضرت کعبؓ سے ان کی جو بحث ہوئی ہے اسی کا حال دیکھ لیجئے۔ حضرت کعبؓ ان کے مسلک کی غلطی پر سنجیدہ دلائل پیش کرتے ہیں مگر وہ سنجیدگی سے اپنا موقف واضح اور مدلل کرنے کے عوض چھوٹتے ہی گالی دیتے ہیں:۔

"او یہودی بچے۔

پھر ہاتھ کا ڈنڈا مارنے کے لئے اٹھاتے ہیں۔ حضرت کعبؓ بھاگے تو یہ بھی پیچھے بھاگے۔ چہرہ غضب آلود ہے۔ منہ سے تند فقرے نکل رہے ہیں۔ تھک ہار کے حضرت کعبؓ نے حضرت عثمانؓ کے پیچھے پناہ لی مگر حضرت ابوذرؓ نے اب بھی معاف نہ کیا بلکہ ڈنڈا رسید کر ہی بیٹھے۔ روایت ہے کہ نہ صرف کعبؓ نشانہ بنے بلکہ حضرت عثمانؓ بھی لپیٹ میں آ گئے۔

اس طرح کے واقعات کیا یہ نہیں بتلاتے کہ حضرت ابوذرؓ اگرچہ نہایت زاہد و عابد صحابی تھے اور اللہ کے یہاں انہیں جتنا بھی درجہ ملے بجا ہے۔ لیکن مشیت ایزدی سے وہ اوصاف بھی ان میں پائے جاتے تھے جو سنجیدہ فقاہت اور متین تفکر سے مناسبت نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوالدرداءؓ حضرت عمرو بن العاصؓ حضرت عبادہ بن صامتؓ اور ام حرامؓ نے بصورت وفد آپ سے ملاقات کی اور اس موقف کی غلطی بتانے کی کوشش کی جو آپ سے منسوب ہو گیا تھا تو جواب میں عقل و نقل کے دلائل پیش کرنے کے عوض آپ نے شخصی نکتہ چینی اور تنقیص کا رویہ اختیار کیا۔ مثلاً ابو درداءؓ کو دیر سے ایمان لانے والا قرار دیا۔ عمرو بن العاص کو کہا کہ تم بھلا کیا جانو تم نے تو رسول اللہ کے ساتھ جہاد کیا ہے۔ وغیرہ ——— حالانکہ فہم مسائل اور اثبات مدعا میں اس طرح کے طعن کچھ مفید نہیں۔

حضرت علیؓ سے کسی نے دریافت کیا تھا کہ آنجناب حضرت ابوذر کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ ان کا جواب ابتدائی ماخذ میں ان الفاظ میں مروی ہے وعی علما عجز فیہ۔ بعد میں (مثلاً الاستیعاب وغیرہ میں) فیہ کی جگہ عنہ نظر آتا ہے مطلب لوگوں نے اپنے طور پر نکالا ہے۔ ہم اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی دانست میں حضرت ابوذرؓ نے ایک علم تو حاصل کیا مگر اس پر وہ قابو نہ پا سکے بلکہ وہ ان پر قابو پا گیا۔ یعنی عالم کی خوبی تو یہ ہے کہ علم کو صحیح تفکر اور توازن کے ساتھ استعمال کرے۔ اس کے بوجھ سے دب نہ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ قوائے فکری اس علم کی گرفت میں معطل یا عاجز ہو جائیں اردو محاورے میں جو بات اس طرح کہی جاتی ہے کہ "ایک من علم کو دس من عقل چاہئے"۔ ممکن ہے اسی طرح کا مفہوم حضرت علیؓ کے ذہن میں ہو۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ وہ زہد و ورع اور جذب و کیف جس میں حضرت ابوذرؓ سب سے آگے بڑھ گئے تھے اپنی تمام تر جوہری تقدیس کے باوجود نہ تو اسلام کا آئیڈیل تھا نہ

اس کی موجودگی میں قانونی تفقہ اور تفکر کی گنجائش تھی۔ شاید یہی مطلب ہے اس حدیث کا جسے مولانا پھلواری نے بھی نقل کیا ہے کہ ابوذر تنہا چلتا ہے تنہا ہی مرے گا اور تنہا ہی اٹھایا جائے گا۔ اس حدیث سے ابوذرؓ کی تحقیر و مذمت مقصود نہیں بلکہ تعریف ہی مقصود ہے مگر اس سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں ان کا تفرد (تنہا ہونا) دوسروں کے لئے تقلید کی چیز نہیں بن سکتا۔

اس مفصل گفتگو کے حاصل کو سمیٹ لیا جائے تو بات یوں بنی کہ اوّل تو حضرت ابوذرؓ کا مسلک و موقف وہ ثابت ہی نہیں ہوتا جسے عام طور پر مشہور کر دیا گیا ہے۔ دوسرے اگر اسے جوں کا توں مان ہی لیا جائے تب بھی اس کا برائے نام بھی جوڑ انفرادی ملکیت کی نفی سے نہیں۔

تیسرے حضرت ابوذرؓ کا جو بھی مسلک تھا وہ بہرحال جملہ صحابہؓ کے مسلک کے خلاف تھا۔ تمام اہل علم صحابہ اس پر متفق تھے کہ جس مال کی زکوٰۃ نکال دی جائے وہ وعیدِ قرآنی کے ذیل میں نہیں آتا اور جو صحابہ اہل علم نہیں تھے انھوں نے قدرتاً جمہور صحابہ ہی کا مسلک قبول کیا تھا نہ کہ حضرت ابوذرؓ کا۔ اس طرح گویا موصوفؓ کے سوا جملہ صحابہؓ وہی مسلک رکھتے تھے جس کی تصویب و تصدیق بعد کے علماء و فقہاء نے کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا پھلواری یا جو بھی لوگ اس اجماعی مسلک کو غلط قرار دیتے ہوئے فقہاء پر زبان طعن و ملامت دراز کرتے ہیں وہ فی الحقیقت جملہ صحابہ و تابعین اور تمام علمائے سلف و خلف پر حملے کے مرتکب ہیں۔

پھر جب آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ حضرت ابوذرؓ کوئی فقیہ صحابی نہیں تھے بلکہ انتہا پسندانہ زہد و ورع نے انھیں رہبانیت کی حدوں تک پہنچا دیا تھا تو یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی کسی منفرد رائے کو تمام صحابہؓ کے مقابلے میں اہمیت دینا اور اس رائے کو بھی غلط انداز میں پیش کر کے اس سے انفرادی ملکیت کی نفی نکالنا علم و تحقیق سے بعید اور معقولیت سے بعید تر ہے۔ ایسا فعل وہی شخص کر سکتا ہے جو نادر قسم کے حربوں اور ترکیبوں سے اپنی رائے کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہے اور دیانت علمی کا مطلق لحاظ نہ رکھے۔

کلام اگرچہ طویل ہو گیا مگر ایک اور غلط بیانی کی نشاندہی بھی ہم ضرور کریں گے۔ مولانا پھلواری نے یہ تأثر دیا ہے کہ مضبوط دلائل تو حضرت ابوذرؓ ہی کے پاس تھے لیکن حکومت وقت نے دھاندلی کی طاقت کے بل پر انھیں ربذہ میں نظربند کر دیا۔

حکومت آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ اس وقت حضرت عثمانؓ کی تھی یعنی خلافت راشدہ۔ اس طرح حضرت عثمانؓ ہی پر یہ گھناؤنا الزام وارد ہوا کہ انھوں نے ایک زاہد و عابد صحابی کو محض اس قصور پر نظربند کر دیا کہ وہ قرآن و سنت کے دلائل سے ایک ایسا مسلک پیش کر رہا تھا جو مولانا پھلواری کی دانست میں صحیح اسلامی مسلک ہے۔

مسلک کیا تھا اور کس حد تک دلیل قوی پر مبنی تھا یہ تو آپ ملاحظہ فرما ہی چکے۔ ہم کہیں گے کہ نظربندی کا افسانہ بھی تنقیح طلب ہے۔ علمی تاریخی تجزیہ کیجئے تو اس کا بھیانک پن بالکل فرضی اور طبع زاد معلوم ہوتا ہے جس کے حوالے سے حضرت عثمانؓ کو ایک ظالم اور غیر معقول حاکم قرار دیا جا رہا ہے۔

طبقات اور بخاری جیسی مستند اور قدیم کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت ابوذرؓ شام سے مدینے آئے تو وہاں بھی ان کے گرد بھیڑ لگنے لگی۔ اس بھیڑ میں جہاں مفاد پرست شامل تھے وہیں وہ جوان اور خوش فکرے بھی شامل تھے جو ان سے تمسخر کرتے تھے۔ انھیں چڑاتے تھے۔ گویا تماشا بناتے تھے۔ اس صورت حال نے ان کے معمولات میں بھی خلل اندازی کی اور جھلاہٹ میں بھی اضافہ کر دیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے خود حضرت عثمانؓ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں مدینے سے کہیں اور چلا جاؤں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ کیوں نہ تم ہمارے ہی پاس رہنے لگو۔ آپ نے کہا کہ نہیں میں تو مدینے ہی سے کہیں اور چلا جانا چاہتا ہوں۔ حضرت عثمانؓ نے مجبوراً کہا کہ اچھا آپ کی یہی خواہش ہے تو پھر مدینے کے آس پاس کہیں چلے جائیے تاکہ قریب رہیے (ان شئت تنحیت فکنت قریبًا)

تحقیق کے لئے تنقید نمبر کا صفحہ ۹۵ ملاحظہ ہو

اس پر وہ بولے کہ ائذن لی اخرج الی الربذۃ (آپ مجھے اذن دیجئے کہ ربذہ جا بسوں) گویا ربذہ چلے جانا ان کی اپنی خواہش تھی نہ کہ مشہور کہانی کے مطابق جلا وطنی یا نظربندی۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میری طرف سے اجازت ہے، میں آپ کے لئے بیت المال سے کچھ اونٹنیاں بھیج دوں گا جن کے دودھ سے آپ فائدہ اٹھائیں۔ (طبقات ابن سعد)

آپ بولے کہ نہیں۔ پھر ان قریشی حضرات کو جو اس وقت مجلس میں موجود تھے مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہاری دنیا تمہیں مبارک، مرے کئے جاؤ ہمیں اسکی کوئی حاجت نہیں۔

اب وہ ربذہ چلے جاتے ہیں۔ ربذہ مدینے سے صرف تین منزل پر ہے۔ ایک پر فضا دیہات جو نجد کے سب سے شاداب اور بہار قطعے "شرف" کا حصہ ہے۔ یہ حضورؐ کے زمانے سے سرکاری انتظام میں تھا۔ بیت المال کے مویشی یہاں رکھے جاتے تھے اور حضرت ابوذرؓ حضورؐ ہی کے زمانے میں اسے دیکھ بھال چلے تھے۔ گویا مویشیوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لئے یہاں قیام پذیر بھی ہوئے تھے (فتح الباری جلد ۳)

اس طرح ان کے لئے مانوس جگہ تھی۔ یہاں حکومت کی طرف سے ایک مسجد بھی تعمیر کرا دی گئی تھی (معجم البلدان)

ابن سعد طبقات میں خود حضرت ابوذرؓ کا وہ جواب نقل کرتے ہیں جو انھوں نے بعض حضرات کے پوچھنے پر دیا تھا کہ آپ ربذہ کیوں آبسے۔ اس میں بھی کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ حضرت عثمانؓ نے انہیں نظربند کر دیا تھا۔ اس کے بجائے وہی بات اس میں موجود ہے کہ مدینے میں آپ کے گرد بڑا ہجوم ہونے لگا تھا جس پر آپ خود یہ الفاظ حیرت ظاہر کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لوگوں نے مجھے پہلے دیکھا ہی نہ ہو

حاصل یہ کہ وہ ربذہ اپنی مرضی سے گئے تھے۔ اگر اس روایت کو رد بھی کر دیا جائے کہ انھوں نے خود ربذہ جانے کی اجازت چاہی تھی ——— حالانکہ اسے رد کرنے کی کوئی مضبوط وجہ موجود نہیں تب بھی یہ ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ کی طرف سے کوئی حاکمانہ دباؤ ان پر ربذہ جانے کے لئے نہیں ڈالا گیا تھا بلکہ انھیں لوگوں کے ہجوم سے بچانے اور سکون کے ساتھ عبادت و ریاضت میں لگے رہنے کی خاطر یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ ربذہ چلے جائیے وہ اسے قبول کر لیتے ہیں اور ربذہ ان کی زندگی کا آخری مسکن ثابت ہوتا ہے۔

بس یہ ہے وہ داستان جسے رنگ دیکر نظربندی اور جلا وطنی کا جامہ پہنایا جاتا ہے اور یہ تأثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دلائل سے مات کھا کر خلافتِ راشدہ نے طاقت اور دھاندلی کی راہ اختیار کی ؛

تجلی کا مرحلہ... ہوئے ہیں مولانا آزاد جو تحریری سرمایہ چھوڑ گئے ہیں اس سے لطف اندوز تو ضرور ہوا جانے مگر دین کے مسائل میں صرف فقہائے معروف کا اعتبار کیا جائے۔

سلام پڑھتے ہوئے قیام

سوال:۔ از۔ اہلیہ محمد اسعد۔

گزشتہ ہفتہ یعنی ۲۰؍ فروری ۸۵ء کو موتی پور میں حلقۂ خواتین کا اجتماع ہوا جس میں حسبِ دستور درسِ قرآن اور حدیث شریف پڑھ کر سنایا گیا۔ کچھ ماہ سے خواتین کی دلچسپی بڑھانے کے لئے حدیث شریف سنانے کے بعد نظم میں حمد یا نعت یا سلام پڑھا جاتا ہے۔ اس کے بعد دعا پر اجتماع ختم ہوتا ہے۔

چنانچہ ۲۰؍ فروری ۸۵ء کے اجتماع میں سلام پڑھنے کے وقت ایک بہن کو جوش آگیا اور وہ کھڑی ہونے کے لئے اصرار کرنے لگی۔ اگرچہ میں نے یہ کہا کہ سلام کے وقت خاص کر کے کھڑے ہونے میں اعتقاد کی خرابی ہے مگر انھوں نے کہا کہ "نہیں" اعتقاد کی وجہ سے نہیں بلکہ تعظیماً کھڑا ہونا چاہئے اور وہ کھڑی ہو گئیں میں نے بھی یہ سوچا کہ سلام و درود ہر حالت میں پڑھا جاتا ہے، اس لئے میں بھی کھڑی ہو گئی۔ اور سب لوگ کھڑے ہو کر جو دو چار سطریں تھیں وہ پڑھی گئیں، پھر ایک دوسری سلام بھی بیٹھ کر پڑھی گئی۔ شرعاً کھڑا ہونا صحیح ہوا یا غلط۔ جواب سے آگاہ کریں۔

الجواب:۔

بدعتیں اسی طرح رواج پاتی ہیں۔ عیسائیوں نے جو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بنا ڈالا اس کے بھی پیچھے عقیدت احترام ہی کا جذبہ تھا۔ ہماری بہن کا یہ کہنا کہ کھڑا ہونا اعتقاد کی بنا پر نہیں تعظیم کی بنا پر ہے، سادہ لوحی کی علامت ہے تعظیم آخر کس کی؟ اعتقاد اسی کا تو نام ہے کہ درود و سلام وغیرہ پڑھتے وقت یہ خیال کر لیا جائے کہ کوئی لائق تعظیم ہستی محفل میں آ پہنچی ہے۔

بہنیں سوچیں۔ نماز میں اللہ نے درود کو پسند فرمایا مگر قعود یعنی بیٹھنے کی حالت میں۔ اگر نماز میں درود پڑھتے ہوئے آپ کھڑی ہو جائیں تو نماز ہی گئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعت و درود کو کھڑے ہو کر پڑھنا کسی درجے میں بھی اللہ کو مطلوب نہیں۔ لہذا عقیدت و محبت میں اپنی تو پھر عقل کو جج نہ بنائیے بلکہ ان حدوں میں رہئے جو مستند فقہاء یعنی قانونِ شریعت کے ماہرین نے قرآن و حدیث کی روشنی میں مقرر کر دی ہیں۔

بدعات تو ظاہراً خوشنما ہوتی ہی ہیں ورنہ کون ان کا مبتلا ہو۔ درسِ قرآن و حدیث مبارک، اچھے اشعار میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر یہ قیام کی بدعت نہ اختیار کیجئے۔ اللہ ہم سب کو راہِ ہدایت پر قائم رکھے۔

۲۵ سال تک

مولانا عامر عثمانی نے

ایک بہترین فقیہ اور ہوشمند

مفتی کا کردار ادا کیا

علم اور تفقہ کا سہارا لے کر انھوں نے
ایسی نازک اور باریک الجھنوں کو سلجھایا ہے جنکو سلجھانا ہر ایک
عالم اور مجیب کے بس کی بات نہیں ہوتی ——— عالموں کی کوئی کمی نہیں
آپ ڈھونڈ ئیے ہزار مل جائیں گے۔
لیکن ——— ایسے علمار کتنے ہیں؟ جو نباض اور ذکی الحس ہوں۔ جنھیں نکتہ داں
اور فطرت شناس کہا جاسکے ——— جو ایک مسئلہ کی گہرائی میں چھپے ہوئے ان گنت
مسائل کا ادراک کرسکیں ——— جو علم اور ذکاوت کے ذریعہ سائل کے قلب و ذہن کو
مطمئن کر دینے کے ماہر ہوں۔
ہاتھ میں چراغ لے کر گھوم جائیے ——— علماؤں کی بھیڑ میں چند ہی ایسے حضرات
نظر آئیں گے جنھیں مولانا عامر عثمانیؒ کا مثیل کہا جاسکے۔
تجلی کی ڈاک کے ذریعہ انھوں نے جو خدمتیں کی ہیں وہ یہ ثابت کر رہی ہیں کہ مولانا
عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مکمل ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا وجود (عملی طور پر)
دار الافتار سے کم نہیں تھا۔
اگر امت مسلمہ بے حس اور احسان فراموش نہیں ہے تو مولانا عامر عثمانیؒ کی خدمات
اور عرق ریزیوں کو کبھی فراموش نہیں کرے گی ہمیں یقین ہے کہ بیسویں
صدی کی تاریخ مولانا عامر عثمانی جیسے ذکی و ذہین باشعور عالم کے
تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کہلائی جاسکتی

تجلی کے ذریعہ انھوں نے کم و بیش پانچ ہزار سوالوں کے جواب دیئے۔ ان میں بعض جوابات اپنی مخصوص نوعیت اور گوناگوں افادیت کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ انھیں بار بار پڑھا جائے اور بار بار ان سے استفادہ کیا جائے۔ لیکن میں یہ مختصر سو تجلی کی ڈاک پیش کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ یہ تجلی کی ڈاک اس اعتبار سے پر کشش اور اہمیت کی حامل سمجھی جائے گی کہ یہ غیر مطبوعہ ہے۔ جب مولانا عامر عثمانی کا انتقال ہوا تھا یہ زیر کتابت تھی اور پھر اسے چھاپنے سے اس لئے گریز کیا گیا تاکہ اس نمبر کی زینت بنا کر اس کی جاذبیت میں اضافہ کیا جا سکے۔

تجلی کی ڈاک

شرکیات

سوال:۔ از۔ محمد انور۔

ہمارے یہاں ایک واعظ ہیں جو ذیلی روایات کو مولانا انور شاہ صاحب مرحوم کشمیری سے منسوب کرتے ہیں، اور اس طرح ندا یا رسول اللہ اور شیئاً للہ کو جائز مطلق قرار دیتے ہیں۔ ذیل میں ان کی پیش کردہ روایت کو من وعن درج کئے دیتا ہوں تاکہ آپ اسی کی روشنی میں اپنا عالمانہ جواب رقم فرمائیں گے۔

یہاں بھی کچھ لوگ ہیں جو عالم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن نہ کسی کا قلم بیباک ہے اور نہ کسی کی زبان۔

نقل مطابق اصل:۔

(۱) درود حضور خواندن وندا یا رسول اللہ جائز است۔

(۲) حیات انبیاء و اولیاء و امداد از ارواح ایشاں ثابت است۔

(۳) استعانت و استمداد از اولیاء کرام بطور استنباط ذہنی درست است۔

(۴) شیئاً للہ در ختمات جائز است، و در مسجد بعد ختم بطریق آہستہ بخوانند و با اجازت پیر طریقت بہمیں عنوان بخوانند۔

الجواب:۔

پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ کسی رائے کو کسی عالم کی طرف منسوب کرنا حوالہ اور ثبوت چاہتا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے کب کس کتاب میں منقولہ عبارتیں لکھی ہیں اس کا مکمل حوالہ جب تک سامنے نہ آئے واعظ صاحب کی بات قابل التفات نہیں۔

دوسری بات یہ نوٹ کر لیجئے کہ دین کی بنیاد اللہ اور رسولؐ کے ارشادات پر ہے اور ان ارشادات کی روشنی میں اونچے درجے کے علماء و فقہاء جو بنیادی اصول و عقائد طے کر گئے ہیں ان کے خلاف کسی کا بھی قول معتبر نہیں ہے۔ اگر بعد کا کوئی عالم یا صوفی ایسا قول نقل کرتا ہے تو ممکن حد تک اس قول کی ایسی تاویل کی جائے گی جو بنیادی اصول و قواعد سے مطابقت رکھتی ہو اور اگر تاویل کی گنجائش نہ نکلے تو اسے بھول اور غلطی پر محمول کیا جائے گا کیونکہ کسی

ایک یا دو چار علماء و مشائخ کی کسی رائے کو غلط قرار دے دینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ اس رائے کو غلط قرار دیا جائے جسے سیکڑوں علماء و مشائخ نے قرآن و حدیث پر پورا غور کر کے اختیار فرمایا ہے۔

علامہ انور شاہؒ کا حال زندگی میں یہ تھا کہ جب ان سے کوئی فتویٰ دریافت کرتا تو باوجود اپنی شانِ علمی کے صاف کہہ دیتے کہ بھائی فتویٰ دینا میرا منصب نہیں ہے۔ فتویٰ جا کر مفتی صاحب سے پوچھو۔

ندا یہ یا رسول اللہ اور شیئاً للہ کے بارے میں مفتیانِ دیوبند کے صریح فتاویٰ موجود ہیں۔ یا رسول اللہ کے بارے میں یہ توسع بھی ہے کہ اگر کوئی شخص محض شاعرانہ طور پر ایسا کہے تو مجرم نہیں سمجھا جائے گا کیونکہ شاعری میں غائب محبوب کو حاضر تصور کر کے خطاب کا رواج عام ہے اور اس رواج کے پیچھے یہ ذہنیت نہیں ہے کہ محبوب واقعی سامنے آموجود ہوا ہے لیکن یا عبد القادر شیئاً للہ یا ۔۔۔ ای فلاں شیئاً للہ میں تو کسی تاویل کی بھی گنجائش نہیں۔ یہ الفاظ شاعرانہ خطاب نہیں ہو سکتے بلکہ صریحاً امداد طلبی کے الفاظ ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان الفاظ کو ادا کرنے والا یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کے الفاظ صدہا سال پہلے گزرے ہوئے شاہ عبد القادر جیلانی سُن بھی رہے ہیں اور مدد پر بھی پوری طرح قادر ہیں۔ یہ دونوں ہی عقیدے شرک کی آمیزش سے خالی نہیں۔ جہاں تک شاہ جیلانیؒ کے جسم کا تعلق ہے وہ تو صدیاں گزریں زمین میں دفن ہو چکا روح یقیناً وہاں جا چکی ہوگی جہاں اللہ نے روحوں کے قیام کا انتظام فرمایا ہے۔ پھر کون ہے جو کشمیر یا حیدر آباد یا بریلی میں آپ کے من گھڑت نعرے اور درخواست کو سنا رہا ہے۔ اللہ کے آخری رسولؐ تک کی یہ شان نہیں ہے کہ تم جہاں سے چاہے انھیں پکارو وہ فوراً سن لیں۔ پھر آخر ان سے بڑا اور صاحب کمال کون شخص پیدا ہو گیا ہے جو زیرِ زمین دفن ہو جانے کے باوجود زندوں کی پکاریں سنتا اور بخشش و عطا کے دریا بہاتا ہے۔

اکرم لغو، نامعقول اور قرآن و حدیث سے ٹکرانے والا وہم۔ جن لوگوں نے بھی یا شیئاً للہ جیسے وظائف ایجاد کئے ہیں وہ علم و زہد کے اعتبار سے کتنے ہی مشہور ہوں مگر ان کی خطائے فکری قابلِ تقلید نہیں مانی جا سکتی۔

فارسی عبارات نقل کرنے کے بعد صاحبِ تحریر جناب انور صاحب نے جو فارسی فقرہ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مسائل پر وہ مدلل کتاب لکھنے کا مژدہ سنا رہے ہیں۔ اگر یہ مژدہ حقیقت بن چکا ہے تو ہمیں ضرور وہ مدلل کتاب دکھائی جائے۔ ہم تو ترس گئے ہیں ایسی تحریریں کو جن میں اس طرح کے عقائد و افکار کے لئے دلیل و برہان کے موتی جگمگ کر رہے ہوں۔ فضول موشگافیوں اور چرب زبانیوں کی کمی نہیں مگر دلیل کا نام نشان نہیں۔ بہت تیر مارا تو دو تین نام بتا دیئے کہ ان ان لوگوں نے شیئاً للہ قسم کی چیزوں کو جائز قرار دیا ہے۔ اسے دلیل کون کہے گا یہ تو دعویٰ ہے۔ ایک دعوے کو دس آدمی دہرا دیں تو کیا یہ دلیل بن جاتا ہے ہمیں دلیل چاہیے۔ دعوے سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔

مسجد میں نکاح

سوال :- از - حافظ محمد علی الوندد۔

ہمارے علاقہ میں عموماً نکاح کی رسم اپنے اپنے گھروں کے سامنے ادا کی جاتی ہے۔ ایک جماعت جو تبلیغ کے نام سے دین و ایک حد تک محنت کر رہی ہے اس جماعت کے واعظین، مقررین، اور علماء کرام سے بارہا یہ سنا گیا کہ "نکاح کی رسم مسجد میں ادا ہونی چاہئے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سب سے بہترین جگہ مسجد ہے اور سب سے بری جگہ بازار ہے"

اور ایک حدیث ہے "مسجد جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، اگر مسجد میں نکاح ہو تو گویا جنت کے باغ میں نکاح ہوا"

غرض اسی طرح لوگوں کو ترغیب و ہدایت دیتے رہتے ہیں کہ نکاح مساجد میں کیا کریں۔ لیکن ایک مولانا صاحب کا یہ اعتراض ہے کہ نکاح مسجد میں نہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اس میں مسجد کے آداب ملحوظ نہیں رہتے اور نکاح ایک تفریحی پروگرام ہے جس میں ہر قسم کا آدمی شریک ہوتا ہے دوسرے یہ کہ نکاح اگرچہ کہ ایک مذہبی رسم ہے بلکہ تجارت کی مثل ہے جب کہ مساجد مخصوص عبادات کے لئے خاص ہیں

سوال یہ ہے کہ کیا نکاح کے لئے مناسب ترین جگہ مسجد ہی ہے؟ اور اگر مسجد کے علاوہ اور مقام پر نکاح کی رسم ادا کرنا شریعت یا سنت کے خلاف ہے یا کچھ قباحت لازم آتی ہے؟

نوٹ:- یہ یاد رہے کہ اس فعل کو مسنون بتلایا جاتا ہے۔

الجواب:-

افسوس کہ دونوں جانب بجائے علم و تفقہ کے کم علمی و کم فہمی کام کر رہی ہے۔

اس میں کیا شبہ ہے کہ مسجد مبارک ترین جگہ ہے سچے اہل ایمان کے لئے اسے باغ جنت کے مشابہ بتانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سراسر برحق ارشاد ہے۔ مگر آج جس قسم کے اہل ایمان پائے جاتے ہیں کیا وہ بھی مسجد میں پہنچکر باغ جنت کا مزا محسوس کرتے ہیں۔ کیا عام حالت آج یہ نہیں ہے کہ بے شمار بلکہ اکثر و بیشتر مسلمانوں کو تو مسجد کی شکل دیکھ کر بخار چڑھتا ہے۔ کبھی جمعہ کی نماز کو چلے گئے تو چلے گئے۔ خانہ پری کی اور بھاگ نکلے۔ جو روزانہ نماز کے عادی ہیں ان میں سے بھی اکثر و بیشتر کا یہ حال ہے کہ بدن مسجد میں ہے دل کسی اور جگہ۔ ضمیر کی تحریک یا بربنائے عادت مسجد میں آگئے ہیں مگر احساسات کی کیفیت کچھ ایسی ہی ہے جیسے پنجرے میں پرندہ۔

ایسے حالات میں حدیث رسول کا حوالہ دیکر مسجد کو باغ جنت باور کرانا حدیث کا بے محل استعمال ہے اور اس کسی فقہی حکم کی عمارت اٹھانا تو اور بھی بے دانشی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات فقہاء سے معلوم کرنے کی ہے کہ مسجد میں نکاح کرنا واجب ہے یا سنت، یا مستحب فقہاء اسے مستحب قرار دیتے ہیں سنت نہیں۔ مستحب وہ ہے جس کے ترک میں ذرا بھی کراہت نہ ہو۔ مستحب امر کی تبلیغ ایسے شد و مد سے کرنا کہ لوگ اسے ضروری تصور کریں ایک لغو حرکت ہے بلکہ موجب گناہ۔ جس فعل کا جو درجہ شریعت میں ہے اسی پر قناعت کرنی چاہئے خواہ مخواہ زہد و تقوی کی نمائش کرنا اور بیت یگانِ خدا پر اپنی طرف سے پابندیاں لگانا نیکی نہیں نادانی ہے۔

بے شک مسجد کی تعریف بیان کیجئے۔ وعظ میں یہ بھی کہہ دیجئے کہ مسجد میں نکاح کرنا مستحب ہے بشرطیکہ آداب مسجد کو ملحوظ رکھا جائے۔ مگر استحباب کی وضاحت اور شرط کی تشریح کے بغیر زور و شور سے لوگوں کو اس کا سبق دینا، مغالطے پیدا کرنا ہے جس سے پرہیز ضروری ہے۔ صحابہ میں سیکڑوں مثالیں ہیں کہ انھوں نے اپنے یا اولاد کے نکاح مسجد میں نہیں کئے۔

مولانا صاحب نے مقابلۃً جو کچھ فرمایا وہ بھی خطا سے خالی نہیں۔ تجارت تو اللہ نے قرآن میں ایمان اور اعمال صالحہ کو بھی فرمایا ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اے ایمان والو میں تمہیں
هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى	ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں
تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ	دردناک عذاب سے بچائے
اَلِيْمٍ ط تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	یہ کہ اللہ اور اس کے رسول
وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ	پر ایمان لاؤ اور اپنے جان
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ	مال سے راہ خدا میں جہاد
اَنْفُسِكُمْ۔	کرو۔

لہٰذا نکاح اگر کسی پہلو سے "تجارت" کا عنوان پاسکتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ اسے مسجد میں نہ ہونا چاہئے۔ مسجد میں اللہ کے رسول اور ان کے خلفاء راشدین نے بہتیرے ایسے امور انجام دیئے

تھے جو اصطلاحی عبادات کے دائرے میں نہیں آتے۔ لیٹ بھی جاتے تھے۔ تھک کر سو جانے کی بھی ممانعت نہیں تھی۔ لہٰذا نکاح جیسی سنت کو مسجد میں زیر عمل لایا جائے تو اسے مستحب ہونا ہی چاہئے۔ ہاں یہ کہنا بڑی حد تک درست ہے کہ آجکل شرکاء مجلس آداب مسجد کا پورا لحاظ نہیں کرتے۔ آداب مسجد کا لحاظ ضروری ہے۔ اگر اہل محلہ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ شرکاء کو آداب کا پابند کریں تو پھر مستحب کو چھوڑنا بہتر۔ مسجد کی بے ادبی تو گناہ ہے اور گناہ سے بچنے کے لئے تو واجب تک کا ترک ضروری ہو جاتا ہے چہ جائیکہ مستحب کا۔

ادلا بدلی کا نکاح

سوال ۳:- از - محمد رفیق۔

رسائل و مسائل حصہ دوم صفحہ ۲۱۴ پر نکاح شغار کے متعلق مولانا مودودی صاحب کا جو جواب درج ہے اسے ایک عالم صاحب غلط بتلاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کو فقط مولانا مودودی صاحب ہی خلاف شریعت بتلاتے ہیں، مگر بہت سے علماء اس مسئلہ میں متفق ہیں کہ نکاح ہو جاتا ہے اور جائز ہے۔ آپ تکلیف لیکر رسائل و مسائل میں مولانا صاحب کا یہ جواب پڑھ کر تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں کہ مولانا صاحب کا یہ جواب صحیح ہے یا غلط۔ تاکہ شک شبہ دور ہو جائے اور دوسرے مسلمان بھائیوں کو بھی فائدہ ہو۔

الجواب:-

نکاح شغار (ادلا بدلی کا نکاح) کی تین صورتیں مولانا مودودی نے ذکر کیں اور فرمایا۔

"پہلی صورت کے ناجائز ہونے پر تو تمام فقہاء کا اتفاق ہے البتہ باقی دو صورتوں کے معاملہ میں اختلاف واقع ہوا ہے لیکن مجھے دلائل شرعیہ کی بنا پر یہ اطمینان حاصل ہے کہ یہ تینوں صورتیں شغار ممنوع کی تعریف میں آتی ہیں اور تینوں صورتوں میں اس معاشرتی فساد کے اسباب یکساں طور پر موجود ہیں جن کی وجہ سے شغار کو منع کیا گیا ہے"۔

اب نہیں معلوم کہ متذکرہ عالم صاحب کو مولانا مودودی کی کس بات پر اعتراض ہے۔ یہ تو طے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شغار (ادل بدل) کو منع فرمایا ہے شغار کی جزئی اعتبار سے متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک شکل تو تمام فقہاء کے نزدیک حرام ہے جو یہ ہے کہ زید اپنی لڑکی بکر کے لڑکے کو اس شرط پر دے کہ بکر اپنی لڑکی زید کے لڑکے کو دے اور ان میں سے یہ لڑکی دوسری لڑکی کا مہر قرار پائے۔

اگر اس شکل کے بارے میں متذکرہ عالم صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ نکاح حلال و جائز ہے تو ان کا دعویٰ بالکل غلط ہے۔ یہ دعویٰ کر کے انھوں نے تمام فقہاء ہی کی تغلیط نہیں کی بلکہ حدیث رسولؐ کو بھی جھٹلایا۔ شغار کی مذکورہ قسم سب سے بدتر قسم ہے۔ اگر یہ بھی حلال ہو تو پھر حدیث میں آخر کس شغار کی ممانعت کی گئی ہے۔

اور اگر عالم صاحب کا مطلب یہ ہو کہ یہ شکل تو بیشک حرام ہے مگر باقی دو شکلیں حلال ہیں تو یہ ان کی اپنی رائے ہو سکتی ہے تمام فقہاء کی نہیں۔ عالم صاحب خود یہ فرماتے ہیں کہ "بہت سے علماء اس مسئلہ میں متفق ہیں" گویا انھوں نے "تمام علماء" کا لفظ تو نہیں کہا جس سے واضح ہے کہ خود انھیں بھی یہ بات معلوم ہے کہ ان دو شکلوں کا جائز ہونا تمام فقہاء کے نزدیک مسلّم نہیں۔ بہت سے انھیں جائز مانتے ہیں تو بہت سے ناجائز بھی قرار دیتے ہیں۔ پھر کیا خود مولانا مودودی نے ہی نہیں فرمایا۔ کیا وہ خود نہیں بتا گئے کہ باقی دو صورتوں کے حلال و حرام ہونے میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔

اس وضاحت کے بعد اگر مولانا مودودی اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں تو عالم صاحب کو ناگواری کیوں؟ عالم صاحب

ایک اختلافی مسئلہ میں کسی جانب کو درست اور ارجح سمجھنے کا حق رکھتے ہیں تو مولانا مودودی کیوں نہیں رکھتے ؟

عالم صاحب مولانا مودودی کی رائے سے متفق نہ ہوں اس میں ہمارے لئے کوئی وجہ شکایت نہیں ۔ مولانا مودودی یہ تلقین بھی نہیں فرمارہے کہ ہر شخص میری رائے مانے اور یہی رائے واحد صحیح رائے ہے ۔ انھوں نے ایک دیانت دار محقق کی طرح خود ہی واضح کردیا کہ شعار کی جن دو شکلوں کو میں اپنی تحقیق کی بنا پر ناجائز تصور کرتا ہوں وہ تمام علماء کے نزدیک ناجائز نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہی شکل سب کے نزدیک متفقہ طور پر ناجائز ہے جوان دو شکلوں کے علاوہ ہے ۔

اس کے باوجود اگر فلاں اور فلاں صاحب مولانا مودودی سے ناخوش ہیں تو اس کی جڑیں دراصل اس تعصب اور بدگمانی میں ہے جو ان کے قلب و ذہن میں مولانا مودودی کے خلاف جاگزیں ہے ۔ اللہ ایسے غل اور کھوٹ کباڑ سے محفوظ رکھے ۔

سوال ۴ :- از ۔ لطیف احمد ۔ مدراس ۔

آپ کا جواب ڈاک سے ملا مگر وہ اتنا مختصر ہے کہ تشفی نہیں ہوئی ۔ بعض واقعات کی آپ نے اگرچہ تردید کردی لیکن وہی صاحب جن کے اعتراضات میں نے خط میں پیش کئے تھے ، فرماتے ہیں کہ تردید کہاں تک کی جائے گی ۔ فقہ کے ان اماموں کے جن مقلدین نکالتے ہیں وہ فی الحقیقت ایسے نہیں تھے جیسے باور کرائے جاتے ہیں ۔ انھوں نے فرمایا کہ عامر صاحب تو باوجود دعوۂ حق پرستی کے بدترین مقلد ہیں اور تقلید نے ان کی خداداد بصیرت پر پانی پھیر دیا ہے عامر صاحب سے پوچھئے کہ امام شافعی تو کمزور راوی نہیں ، انھوں نے اپنے سفرنامے میں امام مالک کا حال لکھا ہے کہ ان کے پاس بے شمار دولت تھی جسے وہ سینت سینت کر تالوں میں رکھتے تھے ۔ لباس کے کم سے کم چار پانچ سو جوڑے تھے جو نہایت بیش قیمت تھے ۔ تین سو باندیاں تھیں جن میں سے ہر ایک سے لطف اندوزی کی نوبت سال میں ایک بار آتی ۔

اسی طرح امام شافعی نے مشہور امام فقہ امام محمدؒ کے تعیشانہ تکلفات کا نقشہ کھینچا ہے حالانکہ مقلدین انھیں بڑا زاہد و عابد باور کراتے ہیں ۔ یہی امام محمد امام ابو یوسف عراق میں امام شافعی سے مناظرہ کرتے ہیں اور پھر فقہی اور فروعی اختلافات کی بنا پر امام شافعی کو قتل کرانے کی اسکیمیں بناتے ہیں ۔

کہاں تک کہا جائے ۔ عامر صاحب میں ہمت ہو تو امام شافعی کو بھی جھٹلا دیں ۔

مولانا محترم یہ میرے خیالات ہرگز نہیں ۔ میرا تو کچھ مطالعہ ہی نہیں جو اس طرح کے اعتراضات وغیرہ میرے دماغ میں آئیں ۔ ان صاحب نے بڑے دعوے سے کہا ہے کہ عامر صاحب ان باتوں کو ٹلا جائیں گے یا غصہ کرکے تمہیں دبا دیں گے ۔ میں خدا کا واسطہ دیکر کہتا ہوں کہ کم سے کم ان اعتراضات کا مفصل اور کافی شافی جواب عنایت فرمادیں ۔ خواہ ڈاک سے خواہ تجلی میں ۔ تجلی میں چھاپیں گے تو اوروں کو بھی فائدہ ہوگا ۔

الجواب ۴ :-

مجھے روزانہ کم و بیش آٹھ نو خطوں کے جوابات دینے پڑتے ہیں ۔ اس لئے یہ مشکل ہے کہ نجی مراسلت میں اس تفصیل سے کام لوں جس کا میں تجلی میں خوگر ہوں ۔ بقدر کفایت جوابات میں نے بہرحال آپ کو دیدیئے تھے لیکن آپ کے فاضل دوست چونکہ ایک سوءظن اور کینہ فقہاء و مجتہدین کے خلاف لئے بیٹھے ہیں اس لئے ان کے نت نئے الزامات و اعتراضات کا جواب میں کہاں تک دیئے جاؤں گا آدمی اگر کسی خاص نیت اور مقصد سے کتابوں کو کھنگالے تو اسے اپنے منشاء کے مطابق کچھ نہ کچھ مواد مل ہی جائے گا جسے وہ توڑ مروڑ کر پروپیگنڈے کے کام میں لاسکے گا ۔ رنج کی بات ہے کہ ہم اپنے عالی مقام اسلاف کی محنتوں اور

کارناموں کا حق تشکر ادا کرنے کی بجائے ان کے عیوب ڈھونڈھیں اور انھیں رسوا کریں۔ مقلد ہوں یا غیر مقلد عجمی ہوں یا عربی۔ سب کے اسلاف دینی رخ سے ایک ہی ہیں۔ صحابہ کرام یا تابعین یا ائمہ و فقہاء سے ہم سب کا ایک ہی رشتہ ہے۔ ان سے ہی ہم سب کو دین کی وراثت منتقل ہوئی ہے۔ وہی ہمارے اور خاتم الانبیاء کے درمیان کی کڑیاں ہیں۔ انھیں بے بنیاد سوء ظن اور بے حقیقت الزامات کا ہدف بنا کر کوئی بھی شخص صرف مقلدین ہی سے دشمنی نہیں کرتا بلکہ پورے دین سے دشمنی کرتا ہے وہ شیخ چلی کی طرح اسی شاخ کو قلم کرتا ہے جس پر وہ خود بیٹھا ہے۔

عامر کو غصہ ور قرار دینا بجا بھی ہو تو آخر یہ روش انھوں نے کب دیکھی ہے کہ عامر محض غصہ دکھا کر چپ ہو جائے اور اعتراضات کا جواب نہ دے۔ تجلی کا ۲۵ سالہ فائل شاہد ہے کہ طرز تحریر خواہ گرم و تلخ ہی رہا ہو لیکن استدلال اور تحقیق و درایت سے خالی کبھی نہیں رہا۔ اس نا اہل نے ہمیشہ ہر بحث میں دلائل و شواہد پیش کئے ہیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لفظ و نظر کی خدمت انجام دی ہے۔

بہرحال طعن و طنز کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں صاف صاف عرض کر دوں کہ فی الحال تو معترض صاحب کے الزامات کا شافی جواب پیش کئے دیتا ہوں لیکن آئندہ ان سے سر نہیں ماروں گا کیونکہ وہ طالب حق نہیں ہیں متعصب بدزبان ہیں۔ ان کے منہ سے سلف صالحین کے بعض اور... کے بھپکارے نکل رہے ہیں۔

حضرت امام مالک اور دیگر ائمہ کے بارے میں جو گل افشانیاں کی گئیں ان کا تمام تر مدار امام شافعی کے سفر نامے پر ہے۔ یہ سفر نامہ "الرحلة" کے نام سے مشہور ہے۔ رحلة الامام الشافعی الی المدینة المنورة

فاضل معترض اگر مجتہدین و فقہاء کے صرف عیوب ڈھونڈھنے کی فکر میں نہ ہوتے تو یہ بات کچھ باریک نہ تھی کہ امام مالک ہوں یا امام احمد یا امام ابو یوسف۔ ان کے تفصیلی حالات فقط ایک دو جگہ نہیں دسیوں جگہ دسیوں کتابوں میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ وہ اعیان و اکابر ہیں جن کے سوانح کی تحقیق و تفتیش برابر ہوتی چلی آئی ہے اور ہر پہلو منقح ہو چکا ہے۔ طالب حق تو یہ رویہ اختیار کرے گا کہ اگر بعض تفصیلات میں تضاد و تصادم پایا جا رہا ہے تو اس کی وجہ ڈھونڈھے اور ایمانداری سے سراغ لگائے کہ زیادہ قابل اعتماد اور قرین صواب بات کونسی ہے۔ سوانح اور تاریخ کے قلمبند کرنے میں فروگذاشتیں اور غلط فہمیاں عموماً ہوتی ہی ہیں۔ متعدد بیانات ایک دوسرے سے ٹکرا ہی جاتے ہیں۔ سوانح نگار اور مؤرخ کا دھوکا کھا جانا یا مغالطے کا شکار ہو جانا کوئی نادر بات نہیں۔ نہ کوئی محقق پیغمبر ہوتا ہے کہ قصور و خطا سے بالاتر ہو۔ امام شافعی اور امام ابو حنیفہ تو کس شمار میں ہیں صحابہ اور خلفائے راشدین تک بعض امور میں پوری نیک نیتی کے ساتھ مغالطے، بھول چوک اور خطا و نسیان کا شکار ہوئے ہیں لہٰذا امام شافعی اگر کوئی خبر دیتے ہیں تو اہل حق کا فرض ہے کہ اس کی تحقیق و تفتیش کریں اور دیکھیں کہ دوسرے معتبر اور اہل علم حضرات اس باب میں کیا کہہ رہے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ایک بہت بڑا آدمی کسی معاملہ میں غلط فہمی یا مشاہدے کی خامی یا زود اعتباری یا سادہ لوحی کے دام میں پھنس جائے۔ انسان کتنا ہی بڑا ہو لیکن وحی الٰہی کے بغیر وہ معصوم عن الخطاء کبھی نہیں ہوا کرتا۔

امام مالک اور امام محمد وغیرہ کی جو قلمی تصویر متعدد ارباب تحقیق نے اپنی کتابوں میں کھینچی ہے وہ اگر اس تصویر سے مختلف ہے جو امام شافعی کے سفر نامے میں نظر آتی ہے تو ایک نیک نیت طالب علم کے لئے کوئی جواز نہیں کہ وہ سفر نامے کی تصویر کو بجبر معتبر قرار دے اور اول الذکر تصویر سے منہ پھیر لے۔ اسے بے لاگ تحقیق کرنی ہوگی کہ اس تضاد و اختلاف کی کیا وجہ ہے۔

یہ تو اصولی جواب ہوا۔ اب تفصیل میں آئیے۔
حقیقت یہ ہے کہ سفرنامہ امام شافعی ایک جعلی کتاب ہے جس کا امام شافعی سے منسوب ہونا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں رکھتا۔ دھوکا لوگوں کو اس لئے ہوا کہ امام رازی، امام بیہقی اور امام سیوطی رحمہم اللہ نے اسے اپنی تصنیفات میں لے لیا۔ یہ اتنے بڑے لوگ تھے کہ معمولی علم والے تو الگ رہے بعض بڑے بڑے عالم بھی ان سے کسی فاحش اور بھونڈی غلطی کے صدور کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے بات چل گئی اور اس حلقہ کو امام شافعی کی تصنیف سمجھ لیا گیا۔ مگر یہ سچائی نہیں تھی۔ مذکورہ تینوں حضرات کیسے ہی عالی مرتبت ہوں مگر انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دنیا میں ایسا کوئی نہیں ہے جس کے فیصلوں اور رایوں میں کبھی کبھی اس کے ذاتی رجحانات، میلانات، ذہنی تعصبات، ذہنی داعیات اور نفسانی محرکات کے کچھ نہ کچھ اثرات وجرا ثیم داخل نہ ہو جاتے ہوں ہر طرح کی آمیزش سے پاک، سراسر بے لاگ اور خالص معروضی فیصلے نادر نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ مذکورہ تینوں بزرگ مذہباً "شافعی" تھے۔ ایسے شافعی جنھیں اپنے مسلک میں خاصا متشدد کہا جا سکتا ہے انھوں نے سفرنامہ امام شافعی کے بارے میں تحقیق وتدقیق سے کام نہیں لیا۔ کیونکہ اس سے جن اعاظم واکابر پر زد پڑتی تھی وہ ان کے اپنے نہیں تھے بلکہ دوسرے فقہی مذاہب ومسالک سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی چیز انھیں سہل انگار اور متساہل بنا گئی۔ اسی چیز نے ایک غیر شعوری تعصب یا تحت الشعوری محرک کا پارٹ ادا کر کے انھیں ایک ایسے فعل پر مطمئن کر دیا جس پر مطمئن ہو جانا ان کی عالی مقامی اور حق شعاری کے شایانِ شان نہ تھا۔

آئیے دیکھیں کہ یہ سفرنامہ ناقابلِ اعتبار کس لئے ہے۔ طالبِ حق تجسس کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ امام ذہبی، امام ابن کثیر، امام نووی، خطیب بغدادی اور حافظ ابن عبداللہ جیسے مشاہیر وقت امام شافعی کے احوال وسوانح قلمبند کرتے ہیں مگر اس سفرنامے کا کہیں تذکرہ نہیں فرماتے۔ شارح مسلم امام نووی بس اتنا تو ذکر کرتے ہیں کہ امام شافعی کے سفر مدینہ کو خاصی شہرت حاصل ہے اور کسی نے اس سفر کے حالات لکھ دیئے ہیں لیکن یہ نہیں کہتے کہ یہ حالات خود امام شافعی کے لکھے ہوئے ہیں۔

یہاں اگر کوئی یہ کہے کہ مذکورہ بالا مشاہیر کا ذکر نہ کرنا کوئی دلیل نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان حضرات کو علم نہ ہو سکا ہو عدم علم کبھی عدم شے کا ثبوت نہیں ہوا کرتا۔

تو ہم کہیں گے کہ یہ چیز ہم نے دلیل کے طور پر نہیں قرینے کے طور پر ذکر کی ہے۔ دلائل تو ہمارے اور ہیں۔ بنیادی اور فنی دلیل ہماری یہ ہے کہ یہ سفرنامہ جن دو اشخاص نے مرتب فرمایا ہے وہ دونوں ہی اعتبار کے قابل نہیں۔ ایک صاحب ہیں عبدالرزاق حمران البطین۔ یہ کون تھے، کیا تھے، اس کا کوئی سراغ اسماء الرجال کی کتابوں سے نہیں ملتا۔ گویا فن کی اصطلاح میں یہ مجہول ہیں۔ مجہول کی روایت کا اعتبار کون کرے گا۔ صرف یہی نہیں ان سے جس احمد بن محمد نامی راوی نے سفرنامے کو روایت کیا ہے وہ بھی مجہول ہے اسماء الرجال اور طبقات وغیرہ کی دستیاب کتابوں میں اس کا نام نشان نہیں۔

دوسرے صاحب ہیں عبداللہ بن محمد البلوی ان کے بارے میں امام دارقطنی کا یہ ارشاد لسان المیزان اور میزان الاعتدال دونوں میں محفوظ ہے کہ یہ شخص جھوٹا تھا۔ حدیثیں گھڑا کرتا تھا یا گھڑی ہوئی حدیثیں پھیلاتا تھا۔

جب سفرنامے کے دونوں راویوں کا یہ حال ہے کہ تو معقولیت اور اصول فن کی رو سے کیا حیثیت ہے۔ ان تصدیقات کی جو بعد کے بعض اکابر شوافع کرتے چلے گئے ہیں۔ ہزار مشائخ بھی ایسے سفرناموں پر دستخط کریں تو علمی رخ سے اس کی کوئی اہمیت نہ ہوگی۔ علم اور اصول وضوابط

شخصیتوں کے تابع نہیں ہوا کرتے، شخصیتوں کو ان کے تابع ہونا پڑتا ہے۔ اگر یوں نہ ہو تو اللہ کا دین کھیل بن جائے جیسا کہ قبوری شریعت والوں نے اسے بنا لیا ہے۔

سفرنامے کی داخلی شہادتیں بھی اسے سراسر جعلی قرار دیتی ہیں۔ یعنی یہ امام شافعی کا ہے ہی نہیں بلکہ یار لوگوں نے گھڑ گھڑا کے اسے ان کی ذاتِ گرامی سے منسوب کر دیا ہے۔

شہادت اول:۔ یہ سفرنامہ بتاتا ہے، امام مالک نے مصر کے کچھ مہمانوں کو اپنی مؤطّا املا کرائی تھی اور امام شافعی بھی اس زمانہ میں وہیں تھے۔

یہ سراسر غلط ہے۔ جگہ جگہ یہ صراحت ہماری نظر سے گزری ہے کہ امام مالک محض حافظے کی بنیاد پر املا نہیں کراتے تھے بلکہ پہلے لکھ لیا کرتے تھے اور پھر اپنے کسی شاگرد سے اسے پڑھواتے تھے۔ دو چار روایات کی بات ہو تو تسلیم کیا جا سکتا تھا کہ کبھی زبانی بھی املا کرا دی ہوں گی مگر سفرنامہ پوری مؤطّا کی بات کہتا ہے جو یقیناً غلط ہے۔

امام مالک کا حال یہ تھا کہ اپنے کاتب حبیب بن حبیب سے لکھوانے کے بعد درس میں خود بھی نہیں پڑھتے تھے بلکہ کسی شاگرد کے سپرد یہ خدمت کی جاتی۔ یہاں تک کہ امیر المؤمنین خلیفۂ وقت ہارون نے اس پر ٹوکا اور کہا کہ کم سے کم امین و مامون کے لئے تو آپ خود ہی پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو امام نے بہت سے شیوخ مدینہ کے نام لئے اور فرمایا کہ ہمارے شیوخ اسی روش کو پسند کرتے تھے۔ نفس لغیر لکھے زبانی مؤطّا کو املا کرانا بلاشبہ جھوٹ ہے جسے خدا نخواستہ امام شافعی نے نہیں، اور مسخرے نے گھڑا ہے۔

شہادت دوم:۔ معترض نے سفرنامے سے امام مالک کی زندگی کا جو عیش پرستانہ اور دنیادارانہ خاکہ اخذ کیا ہے وہی بجائے خود ثبوت ہے اس سفرنامے کی بے حقیقتی کا۔ امام مالک کوئی ایسے آدمی تو نہیں جن کے احوال بس دو چار آدمیوں سے منقول ہوں۔ ان کے زہد و ورع، علم، اخلاق حسنہ، عبادت، اتقا، فضل و کمال، خدا خوفی، عشقِ رسولﷺ جلالتِ شان کے چشم دید گواہ سیکڑوں ہیں اور ان کی گواہیاں درجنوں ثقہ بزرگوں نے اپنی تحریروں میں محفوظ کر دی ہیں۔ خود وہ علامہ سیوطی جو سہل نگاری سے سفرنامے کے ناقل بن گئے ہیں اپنی تزئین الممالک بمناقب مالکؒ میں امام کا جو قلمی مجسمہ صحیح روایات کے ذریعہ تراشتے ہیں وہ اس مجسمے سے بالکل مختلف ہے جسے سفرنامے کے مصنفین نے تراشا ہے۔ مؤطّا کی شرحیں بیسیوں سے اوپر بھی لکھی گئی ہوں گی اور شارح امام مالک کی تصویر وہی پیش کرتا ہے جو سفرنامے کے خرافات سے جوڑ نہیں رکھتی۔

شہادت سوم:۔ سفرنامہ امام شافعی کو امام محمد اور امام ابو یوسف سے عراق میں مناظرہ کرتے دکھاتا ہے پھر ایک بیہودہ سازش کی خبر دیتا ہے۔ مگر امام ابو یوسف تو بلا ریب ۱۸۲ھ میں مر بھی چکے۔ امام شافعی اس کے دو سال بعد ۱۸۴ھ میں عراق پہنچتے ہیں۔ کیا انھوں نے ابو یوسف کو قبر سے اکھیڑ کر مناظرہ کیا ہو گا۔

رہے امام محمد تو کیا حافظ ذہبی کیا ابن حجر کیا ابن عبد البر کیا خطیب بغدادی کیا ابن کثیر سب وضاحت کرتے ہیں کہ امام محمد اور امام شافعی میں عداوت و مخالفت کی خبر صحیح نہیں۔ امام شافعی تو امام احمد سے شاگردانہ تعلقات رکھتے تھے۔

شہادت چہارم:۔ سفرنامہ میں سعد کو اس جماعت میں شریک دکھایا گیا ہے جسے بقول واضعین امام مالک نے مؤطّا املا کرائی۔ لیکن اسماء الرجال کے سب اساتذہ باتفاقِ رائے کہتے ہیں کہ لیث بن سعد سے امام شافعی کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی اور خود امام شافعی نے اسے اپنی ایک قابلِ افسوس محرومی قرار دیا ہے۔

شہادت پنجم:۔ سفرنامہ ہمیں خبر دیتا ہے کہ حرّان سے رخصت ہوتے وقت امام شافعی کو کسی رئیس سے کافی پیسہ ملا جسے انھوں نے اہل علم میں تقسیم کیا اور تین افراد کو تو خصوصیت سے بہت دیا جن کے نام یہ ہیں۔ امام اوزاعی، احمد بن حنبل اور سفیان بن عُیینہ

اب تاریخ دیکھئے۔ امام اوزاعی ۱۵۷ھ میں وفات

پا جاتے ہیں۔ اس وقت امام شافعی سات سال کے لڑکے ہیں۔

امام احمد ابن حنبل ۱۶۴ھ کی پیدائش ہیں۔ امام شافعی کا مذکورہ واقعہ ۱۷۱ھ سے قبل کا مذکور ہے۔ گویا احمد ابن حنبل ابھی پانچ چھ سال کے طفل تھے۔ انھوں نے طلب علم میں جتنے بھی سفر کئے ہیں، بعد میں کئے ہیں۔ پھر وہ امام شافعی کو کہاں مل گئے جبکہ سفرنامے کے بیان کے مطابق بھی امام شافعی نے حاصل شدہ پیسہ دوران سفر میں بانٹا ہے۔

سفیان بن عیینہ مکہ میں قیام پذیر ہیں ۱۵۰ھ کے بعد انھوں نے سرزمین حرمین سے باہر کا سفر نہیں کیا۔ امام شافعی مذکورہ سفر میں حجاز آتے نہیں۔ پھر کہاں کیسے انھوں نے ابن عیینہ کو نواز دیا۔

اتنے شواہد و قرائن یہ یقین کر لینے کے لئے بہت کافی ہیں کہ سفرنامہ ناول کی قسم سے ہے جس کی تصنیف سے امام شافعی علیہ الرحمۃ بری ہیں۔ اب بھی جو شخص اس سفرنامے کے اعتماد پر بعض جلیل القدر مجتہدین ائمہ پر کیچڑ اچھالتا ہے اس کے بارے میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے معقول ہے یا غیر معقول۔ نیک نیت ہے یا بدنیت۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے فرمودات

سوال ۵:- از۔ ایم۔ این صاحب۔

مرحوم مولانا ابوالکلام آزادؒ کی کتاب "غبار خاطر" کا مطالعہ کیا۔ یہ کتاب مولانا کے ان خطوط پر مشتمل ہے جو انھوں نے قلعہ احمد نگر کے جیل سے اپنے دوست احباب کے نام مختلف اوقات میں لکھے ہیں۔ یہ خطوط لکھ کر مولانا مرحوم نے اردو ادب کی کافی خدمت کی ہے۔ باقی یہ خطوط کچھ درس بھی دیتے ہیں یا نہیں، اس سے ہمیں بحث نہیں۔ خط نمبر ۲۴ میں انہوں نے ہندوستان میں موسیقی کے عروج و زوال کا بھرپور تذکرہ کیا ہے اور اگر یوں کہا جائے کہ یہ "خط" ہندوستان میں موسیقی کی مکمل تاریخ ہے تو غالباً مبالغہ ہوگا اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہوں، سلاطین اور دیگر رؤساء کے درباروں میں طائفوں اور طوائفوں کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ اور ان پر کس طرح بے دریغ خرچ کیا جاتا تھا سلاطین۔ حکمران اور رؤسا کو چھوڑ کر وہ اس زمانے کے عالم فاضل اور بہت سارے فقہاء اور محدثین کو بھی موسیقی کے دلدادہ ٹھیراتے ہیں .... تقریباً یہ سب تذکرہ انہوں نے اس انداز میں فرمایا ہے گویا طائفوں اور طوائفوں سے یہ ناچ گانے اور نغمے اسلامی شریعت کی رو سے کوئی قباحت نہیں رکھتے بشرطیکہ اس میں افراط و تفریط کا لحاظ رکھا جائے مگر میرے اندازے کے مطابق افراط و تفریط کا خیال اسی میں کیا ہر ہر چیز میں برتنا ضروری ہے۔ بہرحال میں آپ کی خدمت میں ان کے اس خط سے کچھ اقتباس من و عن نقل کر کے پیش کر رہا ہوں کہ براہِ کرم آپ اپنے خیالات سے ضرور نوازیئے کہ مولانا مرحوم کا یہ لکھنے میں کیا منشا تھا اور اسلامی نقطہ نگاہ سے مولانا کے خیالات کہاں تک درست ہیں۔ صفحہ ۲۸۳ (خط نمبر ۲۴)، پر مولانا یوں رقمطراز ہیں:-

"ایک ہی چیز حسن استعمال اور اعتدال عمل سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے اور سوء استعمال اور افراط و تفریط کے عمل سے بداخلاقی اور بدعملی کا دھبہ بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک شوق اکبر کو تھا اپنی یلغاروں کے بعد جب دم لیتا تو مجلس سماع و نشاط سے ان کی تھکن مٹاتا اور ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا کہ جب تک محل کی عورتیں اسے دھکیل دھکیل کر پردہ سے باہر نہ کر دیتیں ......"

اس بات کی عام شہرت ہو گئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرماتِ شرعیہ میں داخل ہے۔ حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہاء نے سدِ وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا اور یہ تشدد بھی باب قضا سے تھا نہ کہ باب تشریع سے

قضا کا میدان نہایت وسیع ہے۔ ہر چیز جو سوءِ استعمال سے کسی مفسدہ کا وسیلہ بن جائے قضاءً روکی جا سکتی ہے لیکن اس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (سورۃ الاعراف)

(کہیو خدا کی زینتیں جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں)

پہلے کی نقل کی ہوئی لائنوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اس حد تک موسیقی کی محفلوں کو جائز قرار دیتے ہیں جس حد تک اکبر بادشاہ منعقد کیا کرتا تھا ـــ حالانکہ اکبر بادشاہ کی ایسی محفلوں میں طوائفوں کا ہی گروہ ہوتا تھا اور بعض اوقات ابوالفضل، فیضی اور دیگر شعراء کی محفل بھی ہوتی تھی۔ اور دوسرے پیراگراف کے بارے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں کہ مولانا کا کیا منشاء ہے۔ براہ کرم آپ فرور اسلامی نقطۂ نگاہ سے اپنے خیالات سے آگاہ کیجئے

یہاں یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ مولانا اس خط کے ابتداء میں اپنے بارے میں فرماتے نہیں کہ انہوں نے خود بھی اس فن میں کافی مہارت حاصل کی ہے اور اس کے بہت دلدادہ بھی رہ چکے ہیں اور ام کلثوم (مصر کی مشہور ترین رقاصہ) اور دوسری رقاصوں کے گیت بہت پسند کئے ہیں۔ ام کلثوم کے بارے میں لکھتے ہیں :-

" اس سے کئی سال پہلے مصر میں ام کلثوم کی شہرت ہوئی اور اب تک قائم ہے۔ میں نے اس کے بے شمار ریکارڈ سُنے . . . . . اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص نے ام کلثوم کی آواز نہیں سنی ہے وہ موجودہ عربی موسیقی کی دلآویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتا . . . . "

جناب یہ کتاب "غبارِ خاطر" جو میری گود میں اس وقت پڑی ہوئی ہے " مالک رام صاحب " نے مرتب کی ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی دہلی نے یہ اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں چھاپا ہے۔ اور یہ خط مولانا مرحوم نے ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء کو احمد نگر کے جیل سے لکھا ہے۔

الجوابؕ :-

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے وہ بہت اچھے عالم اور عمدہ صاحب قلم تھے لیکن ان کی فقہی آراء کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس خط میں جن خیالات کا اظہار انھوں نے فرمایا ہے ان سے ان کی رنگین مزاجی اور لذت پسندی کا ثبوت تو مل سکتا ہے اسلامی تفکر اور فقہی بصیرت کا نہیں۔ یہ بات کہ موسیقی کو صرف سدِّ وسائل کی خاطر فقہاء نے حرام قرار دے دیا ہو۔ حقائق و واقعات سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ گانے بجانے کی حرمت پر متعدد حدیثیں موجود ہیں۔ صحابہ کی قطعی آراء موجود ہیں۔ قرونِ اولیٰ کا اجتماعی اسوہ موجود ہے۔

ام کلثوم کے گانوں کو ذوق و شوق سے سُننا اگر کارِ خیر ہے تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مشہور گانے والیوں نے کیا خطا کی ہے کہ ان کے نغموں سے لطف اندوز ہونا کارِ خیر نہ ہو۔

فنونِ لطیفہ اور آرٹ کے الفاظ مبہم بھی ہیں اور وسیع المصداق بھی۔ یہ بجا ہے کہ اسلام ہر فنِ لطیف کا دشمن نہیں۔ تلاوتِ قرآن میں یہ خوش الحانی کو تو وہ واجب ہی قرار دیتا ہے۔ خطاطی اور زردوزی جیسے فنون کا وہ ہرگز مخالف نہیں۔ مناظرِ فطرت کی مصوری کو اس نے حرام نہیں ٹھیرایا۔ شعر و ادب پر اس نے نکیر نہیں کی۔ یہ سب فنون لطیفہ ہی تو ہیں، لیکن ایسے کسی فنِ لطیف کو برداشت نہیں کر سکتا جو اس کے کسی بنیادی اصول اور اساسی قدر سے متصادم ہو۔ ناچ گانا آرٹ ہے کیبرے ڈانس بھی آج کی اصطلاح میں آرٹ ہی ہے جس میں حور کی بیٹی فن کا لباس اتار پھینکتی ہے۔ لیکن یہ چیزیں اسلام کی اقدار اخلاق اور معیارِ عزت و عصمت کے منافی ہیں اسلئے انھیں حلال نہیں مانا جا سکتا۔

زیادہ بحث غیر ضروری ہے۔ بس اس نصیحت پر ہم

(بقیہ بر صفحہ ۱۴۲)

بعض حضرات کا دعویٰ ہے

کہ

مولانا عامر عثمانی

دنیائے تنقید کے

شہنشاہ تھے

میں نہیں جانتا کہ لوگوں کا دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے یا مبالغہ آمیز ہاں میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مولانا عامر عثمانیؒ کی قلمی جدوجہد سے پہلے مذہب کی دنیا تنقید سے قطعًا ناواقف تھی مولانا عامر عثمانیؒ ہی نے دنیائے مذہب میں فنِ تنقید کی داغ بیل ڈالی زنہ کچھ بھی کہے لیکن میں اس حقیقت کا اظہار کر دینے پر خود مجبور پا رہا ہوں کہ مولانا عامر عثمانیؒ مذہبی تنقید میں افادہ آخر کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ مذہب کے کوچہ میں تنقید کے موجد بھی تھے اور تنقید کے خاتم بھی۔ ان کی وفات کے بعد ہمیں علماء کی بکھری ہوئی ایک ایک بھیڑ میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو باطل پرستی اور اوہام پسندی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر انکی ظاہری چمک دمک کی قلعی کھولنے کی اہلیت و جرأت رکھتا ہو۔ تجلی کے ۲۷ سالہ فائل میں ایسے بے شمار مضامین ریکارڈ ہیں جن کی ہر سطر مولانا عامر عثمانیؒ کی صلاحیتِ تنقید اور قوتِ استدلال کی آئینہ دار ہے۔

عوام کی عدالت میں، میں ان کا صرف ایک ہی مضمون لے کر حاضر ہوا ہوں مجھے یقین ہے کہ دیانت و سچائی کے پرستار اور علم و تحقیق کے قدردان حضرات مولانا عامر عثمانیؒ کا یہ مضمون پڑھنے کے بعد یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے کہ بلاشبہ پروردگار نے مولانا عامر عثمانیؒ کو مخصوص صلاحیتوں سے نوازا تھا وہ ایک بہترین بیباک اور لاثانی تنقید نگار تھے نقد و جرح اور بحث و مباحثہ کرنے کا انھیں استحقاق حاصل تھا ——— اور میرا قلم۔ ہزارہا قارئین کے روبرو مولانا عامر عثمانیؒ کے قلم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے بعد مولانا کی خدمت میں یہ گذارش کرتا ہے کہ آپ کے دنیا سے روپوش ہوجانے کے بعد تنقید کی دنیا میں سناٹا چھا

یہ بات قارئین کے لئے یقیناً باعثِ کوفت ہوگی کہ زیرِنظر مضمون میں اور برابر کے صفحہ میں بیشمار طباعت کی غلطیاں باقی رہ گئی ہیں۔ یہ پلیٹ ایڈیٹر کی غیر موجودگی میں چھپ گئی تھی۔ پروف چیک نہیں ہوسکے تھے۔ اپنی بنی بنائی ساکھ کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس مضمون کو دوبارہ چھپوایا جائے، لیکن ہمارے موجودہ اقتصادی حالات قطعاً اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ سیکڑوں روپے کا نقصان برداشت کر لیا جائے لہٰذا غلطیوں سے بھری ہوئی کاپی کو اس ایڈیشن میں ہم جوں کا توں چھاپ رہے ہیں۔ اگر خدا نے عامر عثمانی نمبر کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی توفیق عطا کی تو اس قسم کی تمام غلطیوں اصلاح کر لی جائے گی۔ زیرِنظر مضمون میں لفظ تعدد بار استعمال کیا گیا ہے اور قابلِ فہم بات یہ ہے کہ ہر جگہ ایک نقطہ غائب ہو جانے کی وجہ سے ذخ کا جح بن گیا ہے۔ دوسری غلطیاں اتنی واضح ہیں کہ ان کو پکڑنے کے لئے معمولی سی شد بد بھی کافی ہے۔

(معذرت کا طلب گار ادارہ)

اعلان کے مطابق آج کی صحبت میں ہمیں جن محترم جج صاحب کے فرمودات پر اظہارِ خیال کرنا ہے ان کا اسمِ گرامی ہے سید عزیز الشفیع۔ وہ تقریباً بیس سال سے دہلی میں بطور اسپیشل جج کام کر رہے ہیں اور مسلم پرسنل لا کے مقدمات براہِ راست ان سے متعلق ہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر پچھلے سال ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو اردو کے متعدد اخبارات و رسائل میں شائع ہوا اور جج موصوف کے بیان کے مطابق کافی پسند کیا گیا۔ اسی مقالے کو انہوں نے پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا اور یہی پمفلٹ پچھلے ماہ انھوں نے راقم الحروف کو بھی ارسال فرمایا تھا جس کے ساتھ ان کا گرامی نامہ بھی تھا۔ اس گرامی نامے میں انھوں نے فرمائش کی تھی کہ یہ مقالہ تجلی میں شائع کر دیا جائے یا کم سے کم اس پر تبصرہ ہو جائے۔

ہم اسے پورا تو اسلئے شائع نہیں کرتے کہ اول تو یہ متعدد جگہ چھپ ہی چکا ہے اور ماہنامہ زندگی نے اپنے خاص نمبر میں اسے پورا کا پورا نقل کر دیا ہے دوسرے ہمارے نزدیک اس کی افادیت مشکوک ہے ہم ابھی اپنے ناچیز جائزے میں اس پہلو کو زیرِ گفتگو لائیں گے۔

لیکن جج موصوف کے خیالات پر اظہارِ رائے سے قبل ہمیں ایک اور بزرگ کے تازہ فرمودات پر کچھ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ بزرگ بھی نہ صرف میدانِ عدل ہی کے ایک شہسوار ہیں بلکہ ان کا رتبہ بہت ہی بلند ہے کیونکہ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی عدالت "سپریم کورٹ" کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں اور اب لاکمیشن کے چیرمین ہیں۔

چیف جسٹس کا مطلب ہے قاضی القضاۃ۔ عدل کا سب سے بڑا مرجع و ملجا۔ ایک ایسا بھاری بھرکم اور ثقہ وجود جس کے بارے میں ملک کا بچہ بچہ یہی حسنِ ظن رکھ سکتا ہے کہ جذبۂ عدل گستری اس کی رگ رگ میں خون کی طرح جاری و ساری ہوگا اور ملک کے کسی طبقہ اور فرقے کے خلاف تعصب اور عناد و کدورت کا سایہ تک اس کے مزاج و سیرت و کردار

واقف کار پر نہ پڑا ہو۔

مگر افسوس کہ موصوف نے ——— جن کا نام نامی ڈاکٹر گجندر گڈکر ——— ابھی ۵ر فروری ۱۹۷۳ء کو احمد آباد میں ججوں اور مجسٹریٹوں اور معزز شہریوں کے سامنے لاکمیشن کے چیرمین کی حیثیت سے جو تقریر کی ہے اس سے نہ صرف یہ کہ حسنِ ظن کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیئے ہیں بلکہ اس حقیقت کو بھی واشگاف کر دیا ہے کہ آئین و قانون میں جس طرح تبدیلیاں وہ چاہتے ہیں انھیں اگر مسلمان خوشی سے ماننے پر آمادہ نہ ہوئے تو جبر و اکراہ کی راہ اختیار کی جائے گی۔

ہمارے لئے یہ انکشاف فی الحقیقت کوئی انکشاف نہیں ہے ہمیں یوم اوّل سے معلوم ہے کہ اربابِ اقتدار جو کچھ چاہیں گے وہ بہرحال کر کے رہیں گے۔ ابتداءً وہ یہ کوشش کریں گے کہ جمہوریت اور سیکولرازم کے ظاہر فریب الفاظ کی آڑ لے کر مظالم اور ظلم کے چہرے پر اصطلاحات کا دیدہ زیب پردہ پڑا رہے لیکن اس طرح مقصود حاصل نہ ہوا تو تکلف کو بالائے طاق رکھ دیں گے اور مطلق پروا نہیں کریں گے کہ اخلاق و انسانی قدروں پر کیا گزر جاتی ہے۔

مگر ان لوگوں کے لئے یہ انکشاف واقعی انکشاف ہو سکتا ہے جو اس خوش فہمی میں مبتلا رہے ہیں اور کسی نہ کسی حد تک آج بھی ہیں کہ سیکولرازم اور جمہوریت کی ناک کے نیچے جبر و استبداد کا ننگا ناچ نہیں ناچا جا سکتا اور آئین و دستور کے کاغذی حقوق کو ڈنڈے کے زور سے نہیں چھینا جا سکتا۔

عبرت حاصل کرنے کی عادت مدت ہوئی ہم چھوڑ چکے اسی لئے مشیت ہمارے مغز پر ٹھوکروں پر ٹھوکریں لگا رہی ہے مگر ہم سبق لینے کو تیار نہیں۔ ہمیں غرّہ ہے کہ ہم محبوبؐ کی امت ہیں اور خدا سے ہمارا خاندانی رشتہ ہے۔ وقت ہمارے گالوں پر پے در پے طمانچے رسید کر رہا ہے۔ زمانہ ہمیں جوتے کی نوک پر رکھ کر قہقہے لگا رہا ہے اور ہم خیر سے مہدی علیہ السلام کے منتظر ہیں۔

بہرحال عبرت اور غیرت کے لئے نہ سہی ایک نیا جشن ماتم منانے ہی کے لئے سہی ایک نظر ڈاکٹر صاحب کے فرمودات پر ڈال ہی لیجئے۔

اخبارات کی نقل کے مطابق وہ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں۔

"مسلمانوں کی ظلمت پسندی کے سبب ان کا ایک مکتب فکر خود دوسروں کے مقابلے میں زیادہ متشدد ہے پارلیمنٹ تک کو مسلم پرسنل لا میں ترمیم و تبدیلی کا حق دینے کو تیار نہیں ہے۔"

گویا ظلمت پسند تو ایک طرف سے سارے مسلمان ہی ٹھیرے البتہ وہ طبقہ کچھ زیادہ ملامت کا سزاوار ہوا جو اب تک قرآن و حدیث کو سینے سے لگائے پھرتا ہے اور پارلیمنٹ کو خدا اور رسولؐ پر فوقیت دینے کو تیار نہیں ہے۔ ذرا تجزیہ کیجئے تو اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ ڈاکٹر صاحب نے بالواسطہ اپنے خیال کا اظہار فرمایا ہے کہ قرآن و حدیث تاریکیوں کا مخزن ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان تو وہی کہلاتا ہے جو قرآن و حدیث کو حرف آخر سمجھتا اور توحید و رسالت پر ایمان رکھتا ہو اگر یہ وصف ظلمت پسندی کا ہم معنی ہے تو قرآن و حدیث کے مخزن ظلمت ہونے میں کسر کیا رہی۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب ذاتی طور پر جو بھی خیالات رکھیں اس میں وہ آزاد ہیں۔ اسلام کو وہ تاریکی کا مرادف خیال فرماتے ہیں اس کا بھی انھیں حق ہے آج اپنے دورِ بے بسی ہی میں نہیں ہم نے اپنے دورِ سطوت و اقتدار میں بھی کبھی غیر مسلموں کو اس پر مجبور نہیں کیا ہے کہ ان کا دل مانے یا نہ مانے مگر وہ اسلام کے آگے سر اطاعت خم کر ہی دیں۔ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ شاہد ہے ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ جو لوگ بتوں کو یا چاند سورج کو یا کسی اور شے کو پوجنا صحیح خیال کرتے ہوں انھیں اس خیال سے باز آنا پڑیگا اور جبراً ان سے اسلام کی حقانیت منوائی جائے گی۔ استغفراللہ ہماری تو پالیسی ہی نہیں ایمان یہ رہا ہے کہ لا اکراہ فی الدین (مذہب کے معاملہ میں زور زبردستی نہیں) لہٰذا آج ڈاکٹر گڈکر یا کوئی اور شخص اسلام کو سراپا ظلمت تصور کرتا ہے تو شکوے لو

احتجاج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ذاتی حیثیت میں نہیں بلکہ سرکاری حیثیت میں اظہارِ خیال فرما رہے ہیں اور سرکار جس دستور کی نمایندگی کر رہی ہے اس میں واضح کر دیا گیا ہے کہ تمام مذاہب حکومت کی نظر میں برابر ہوں گے۔ وہ خود کسی مذہب کے معاملہ میں جانبدار نہ ہوگی اور سارے ہی مذاہب کو یکساں تحفظ ملے گا۔

کیا یہی ہے وہ غیر جانب داری اور تحفظ جس کا مظاہرہ سابق قاضی القضاۃ اور موجودہ چیرمین آف لا کمیشن کر رہے ہیں؟

ذرا انظارہ کیجئے "پارلیمنٹ" کے الفاظ کس شان سے کہے گئے۔ گویا پارلیمنٹ تو کسی ایسے مقدس گروہ کا نام ہے جو آسمانوں سے خدائی سند لے آیا ہو۔ حالانکہ فاضل مقرر اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہی حق ا اور رسول جنھیں وہ ظلمت کے پیغامبر تصور فرماتے ہیں مسلمانوں کے نزدیک پوری کائنات سے برتر اور ہزار پارلیمنٹوں سے فائق ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی یہ اندازِ کلام اختیار کرنا کدورت اور طیش کے سوا آخر کون سے حسین اور عادلانہ جذبے کی غمازی کر سکتا ہے۔

اور یہ بھی ایک مغالطہ انگیزی ہی ہے کہ مسلم پرسنل لا کے معاملہ میں مسلمانوں کے یہاں ایک سے زائد مکتبِ فکر کی موجودگی کا پروپیگنڈہ کیا جائے۔ بے شک جزئیات میں علمائے اسلام کے درمیان اسی طرح کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں جس طرح دستور و آئین کی تعبیرات میں وکلاء اور جج صاحبان کے مابین موجود ہیں اور دنیا کا کوئی علم و فن ایسے ضمنی اور فروعی اختلافات سے خالی نہیں ہے لیکن جہاں تک مسلم پرسنل لا کے حکومت کی دست اندازی سے بالاتر ہونے کا تعلق ہے اس میں کوئی اختلاف مسلمانوں کے یہاں نہیں پایا جاتا اور غلط کہتا ہے جو شخص کہتا ہے کہ اس نکتے کی حد تک ایک سے زیادہ مکتبِ فکر کا کوئی وجود ہے۔

آخر دنیا میں کب کسی بھی علم و فن میں ایسی بے غبار اور بے بنیاد آراء کو مستقل مکتبِ فکر حیثیت دی گئی ہے۔ جنھیں چند جاہلانِ فن نے غیر علمی سطح پر ظاہر کیا ہو اور فن کے مسلمات سے ان کا کوئی ربط نہ ہو۔ ریاضی میں کسی شاعر کو، سائنس میں آرٹسٹ کو، زراعت میں کسی بیرسٹر کو اور قانون میں کسی سوداگر کو اگر یہ حیثیت نہیں دی جاتی کہ اس کے بے وزن اور بے جوڑ خیالات ایک مکتبِ فکر بنانے کے لئے کافی سمجھے جائیں تو آخر چند مغرب زدہ جہلائے اسلام کے خیالات و آراء کو سابق قاضی القضاۃ نے اتنا قابلِ لحاظ کیسے مان لیا کہ وہ گویا کسی مستقل مکتبِ فکر کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ موجود ہے کہ تمام مسلمانوں نے بلا استثناء مسلم پرسنل لا کو ایک ایسی باثر اور مقدس شے مانا ہے جس میں تحریف و ترمیم کا حق کسی کو نہیں نہ حکومت کو نہ علماء کو نہ صوفیاء و مشائخ کو۔ اور ابھی بمبئی کے کنونشن نے آج کے معیار پر بھی اس کی توثیق کر دی ہے کہ امتِ مسلمہ دیگر مسائل میں خواہ کتنے ہی مکاتبِ فکر (اسکولس آف تھاٹس) رکھتی ہو لیکن مسلم پرسنل لا کی تقدیس اور برتری کے مسئلے میں وہ ایک ہی مکتبِ فکر کی حامل ہے۔ پھر بھی اگر کوئی یہ کہے چلا جاتا ہے کہ مسلمانوں جیسے نام رکھنے والے چند جہلائے اسلام کی آراء کو بھی اسلام میں ایک مکتبِ فکر کا درجہ حاصل ہے تو وہ دھاندلی اور غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ جہلائے اسلام دنیاوی علوم و فنون میں کیسا ہی پایہ رکھتے ہوں لیکن اسلامی شریعت کے دائرے میں ان کا مقام عوام الناس کی صف میں ہے اور ان کی جہالت صرف منفی ہی نہیں بلکہ اس میں شریعت کے خلاف مثبت نوع کی جارحیت بھی پائی جاتی ہے اس لئے اس جہالت کے بطن سے جو مفسدہ جنم پائے اسے اسلام دشمنی تو کہہ سکتے ہیں اسلامی مکتبِ فکر ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

سابق قاضی القضاۃ نے مزید فرمایا:-

"اس صورتِ حال کا سختی سے مقابلہ کیا جانا چاہئے اور سیکولرازم کے مفادات کے پیشِ نظر مسلم سماج کے مترقی عناصر کو نظر انداز کر کے پورے ملک پر یکساں سول کوڈ نافذ کر دیا جانا چاہئے۔"

گویا موصوف کا موقف یہ ہے کہ کم سے کم مسلمانوں کی حد تک جمہوریت اور عدل و آئین کی بساط لپیٹ کر رکھدی جائے اور حکومت آمرانہ رویّہ اختیار کرے

اور بھی ایک قدم آگے بڑھ کر محترم نے یہ مشورہ بھی پیش فرمایا کہ آئین کی دفعہ ۲۶ میں ترمیم کر کے تبلیغ مذہب کا خاتمہ کیا جائے کیونکہ یہ دفعہ سیکولرازم اور جمہوریت کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتی۔ نیز تبدیلیٔ مذہب پر بھی پابندی عائد ہونی چاہیئے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سیکولرازم اور جمہوریت کے معنی و مصداق کو موصوف نے ٹھیک طرح نہیں سمجھے، ٹھیک اور بے ٹھیک کا سوال تو اس وقت پیدا ہو جب ان طلسماتی الفاظ کا کوئی متعین اور متفق علیہ مصداق ہوا بھی تو حال یہ ہے کہ روس اور چین اور امریکہ سبھی جمہوریت اور سیکولرازم کا ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ لامحدود آزادی سے لے کر بدترین جبر و قید تک ہر قسم کے نظام سیاست پر یہی الفاظ بطور عنوان سجائے جا رہے ہیں لہٰذا ان کا معنا دیا تقاضا یا مفہوم و مدلول کوئی کچھ بھی قرار دے دے دلائل سے اسے غلط گو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ عین ممکن ہے کل یہ کہا جائے ہر شخص کا ایک سا لباس پہننا اور ایک سا کھانا کھانا جمہوریت اور سیکولرازم کا عین تقاضا ہے تو کس ڈکشنری کے حوالے سے قائل کا منھ بند کیا جا سکے گا۔

البتہ کہنا ہمیں یہ ہے کہ دستور ہند میں سیکولرازم کا نام تو سرے سے ہے ہی نہیں اور جمہوریت کی اصطلاح بھی تشریح سے معرّا نہیں چھوڑ دی گئی ہے۔ یہ دستور غالباً موصوف کو تو ازبر ہو گا۔ کیا اس میں گول مول اصطلاحات کی آڑ لئے بغیر اس تصورِ انصاف کی وضاحت نہیں کی گئی ہے جس کا محترم و مکرم قتلِ عام کر رہے ہیں۔

انھوں نے اسی حد تک اعلان کیا:

"اگر یکساں سول کوڈ کا مسئلہ قانون کمیشن کے سامنے نہیں اٹھایا جائے تو بھی وہ اس پر غور کرنے کا مجاز ہے کیونکہ یہ بات اس کے دائرۂ کار میں لازمی طور پر داخل ہے۔"

یعنی حکومت اگر سیاسی مصالح کی بنا پر نہ سنگے جبر سے کام لینا ہی چاہتی تو یہ کام بطورِ خود سابق قاضی القضاۃ اپنی ٹیم کی وساطت سے انجام دیں گے۔

ہم اس کے بعد کیا کہیں۔ بحث و تنقید یا افہام و تفہیم وہاں ممکن ہے جہاں مدار عقل و نقل کے دلائل پر ہو مگر جہاں ڈنڈا فیصلہ کن دلیل بن جائے اور خداوندانِ نعمت آرڈر از آرڈر کے موڈ میں آجائیں وہاں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

جہاں تلوار چلتی ہے تقریریں نہیں چلتیں۔

جبر و ظلم کا مقابلہ کس طرح ہوگا۔ یہ علمائے کرام جانیں کہ معاملہ سیاست کا نہیں مذہب کا ہے اور مذہب کی راہ کے امیرِ لشکر بہر حال وہی ہیں۔ ہم اپنی بساط کی حد تک یہی کر سکتے ہیں کہ قلم کو احقاق حق اور ابطالِ باطل کے لئے وقف رکھیں۔ یہ کام جب تک ہمارے ہاتھ آزاد ہیں اور کاغذ قلم میسر ہے ضرور کرتے رہیں گے۔ آدمی اپنی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں اور اس پر نتائج کی ذمہ داری اللہ نے نہیں ڈالی۔ ہماری نحیف آواز اور ہمارے ناچیز نقوشِ قلم چاہے صدا بصحرا سے زیادہ کچھ ثابت نہ ہوں لیکن اللہ کے حضور بہر حال ہم عرض کر سکیں گے کہ تیرے دیئے قلم کو تیرے دین کی تشریح و تائید میں صرف کر آئے۔ نوشتۂ تقدیر بدلنا اور حالات کو اپنے سانچے میں ڈھالنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ اب تو مالک ہے جیسا چاہے فیصلہ صادر کر

لیجئے اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

محترم جج!

(میری مراد محترم عزیز الشفیع اسپیشل مجسٹریٹ سے ہے)

میں عامر عثمانی آپ کا شکر گزار ہوں کہ اپنے مقالہ پر تبصرے کی فرمائش کر کے آپ نے میری عزت افزائی فرمائی اس سے آپ کی خود اعتمادی اور تواضع کا پتا چلتا ہے میں اس عنایت سے جرات پا کر ایک مودبانہ گذارش آپ سے کرتا ہوں کہ واقعۃً آپ حق پرست اور عدل پسند ہیں تو کچھ دیر کے لئے بھلا دیجئے کہ حسن سید عزیز الشفیع نے مقالہ تحریر کیا ہے وہ خود آپ ہیں اور خود کو ایک ایسا جج تصور کر لیجئے جس کے سامنے سید عزیز الشفیع کے مقالے کا مقدمہ پیش ہے۔ یہ شخص آپ کا کوئی نہیں لگتا ایک اجنبی ہے جس کے مقالے پر عامر عثمانی نام کا ایک آدمی چند الزامات عائد کر کے فرد جرم قائم کرنے کا ملتجی ہے۔

آں جناب سے مخفی نہ ہوگا کہ جو بھی شخص کوئی کام کرتا ہے اپنے فہم کے مطابق ٹھیک ہی کرتا ہے اور جانتے بوجھتے اس میں خامیوں کو راہ نہیں دیتا۔ خامیاں اگر راہ پاتی ہیں تو اس کے علم و فہم کی کمی یا تساہل پسندی یا کج فکری سے پاتی ہیں۔ لہٰذا جب کوئی دوسرا آدمی ان خامیوں کی نشان دہی کرتا ہے تو وہ چونکتا ہے اور اس کا نفسیاتی ردعمل یہ ہوتا ہے کہ خامیوں سے انکار کر دے یا غلط سلط تاویلات کا سہارا لے۔

پھر اگر ایک شخص کے کسی کام پر کچھ لوگوں نے داد بھی دی ہو تو اس کا خیال کچھ زیادہ ہی پختہ ہو جاتا ہے کہ میرا کام اعلیٰ اور بے عیب ہے۔ ایسی صورت میں جب کوئی ناقد نقائص پر انگلی رکھے تو ردعمل اور زیادہ شدید ہوتا ہے اور ناقد کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

آں جناب نے مقالہ لکھا۔ ظاہر ہے اپنے علم و فہم کی حد تک اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی ہوگی۔ پھر یہ اخبارات و رسائل میں شائع ہوا اور اس پر ایڈیٹروں نے تحسین و تائید پر مشتمل نوٹ لکھے (جنھیں آپ نے کتابچے کے آغاز میں طبع کر دیا ہے) لہٰذا قدرتی بات ہے کہ اس کے کسی عیب و نقص کا آپ کو قطعاً احساس و ادراک نہ ہوگا۔ آپ بالکل مطمئن ہوں گے کہ جو کچھ میں نے سپرد قلم کیا ہے وہ علمی و فکری اعتبار سے وزن دار ہے۔ ایسی صورت میں اگر ایک عامر عثمانی جیسا بے ننگ و نام اور کمتر آدمی دفعتاً یہ کہنے لگے کہ اس مقالے میں فلاں فلاں شدید نقائص ہیں تو بہت مشکل ہے کہ آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے اس پر توجہ دے سکیں اور عامر عثمانی کے دلائل کو غیر جانبداری سے فکر و تدبر کی کسوٹی پر پرکھ سکیں۔

اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ دیر کے لئے مقالہ نگار کی شخصیت کو ایک اجنبی شخصیت تصور کر کے خود کو وہ ایماندار منصف خیال فرمالیں جسے نہایت غور سے مستغیث کے دلائل سننے ہیں اور بے لاگ فیصلہ دینا ہے۔ ایسا اگر ہوا تو میری معروضات آپ کی سمجھ میں آ سکتی ہیں اور یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ عمر کے اس دور میں جب کہ آپ خود اپنے پورے کارنامۂ حیات کے ایک ایک جزو کا حساب دینے مالک الملک ذوالجلال والاکرام کی عدالت میں جانے والے ہیں اپنے بعض افکار و خیالات کی اصلاح پر توجہ دیں میں سچ کہتا ہوں کہ اس مقالے میں بعض فقرے آپ کے قلم سے ایسے نکل گئے ہیں کہ اگر ربِّ ذی الجلال کی غیرت نے ان پر گرفت کر لی تو نہیں کہا جا سکتا کہ کیا کچھ ہو جائے۔ آپ بزرگ ہیں۔ میں آپکو سب کچھ کھول کر عرض کئے دیتا ہوں۔ بس شرط وہی ہے کہ میرے الزام و اعتراض کا ہدف آپ خود کو نہ سمجھیں بلکہ اس اجنبی شخص کو سمجھیں جسے بطور ملزم آپ کی عدالت میں حاضر کیا گیا ہے۔ اس اجنبی کا نام بھی میں الف رکھتا ہوں تاکہ جب بار بار یہ نام آپ کے سامنے آئے تو آپ کی انا کو صدمہ نہ پہنچے اور ذہنی اشتعال آپ کو بے لوث عدل سے دور نہ کر دے

می لارڈ!

مجھے اس اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہے کہ الف کے مقالے میں متعدد تجویزیں اور مشورے ایسے ہیں جو فی نفسہٖ مفید اور قابلِ قدر ہیں۔ الف کے خیالات اور اندازِ کلام کی اوپری سطح پر دردمندی واخلاص اور جذبہ بخیر خواہی کی بھی ایک تہہ بلاشبہ نظر آتی ہے اور بحیثیت مجموعی یہ ایک ایسا مقالہ ہے کہ تھوڑا علم اور قلیل بصیرت رکھنے والے قارئین یقیناً اس کی تعریف کریں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مدیرانِ جرائد نے تحسین و تائید میں مضائقہ محسوس نہیں کیا لیکن میں عامر عثمانی خود کو اس پوزیشن میں نہیں پاتا کہ اس کے کسی بھی جزو کو خواہ وہ فی ذاتہٖ قابلِ قدر ہی کیوں نہ ہو ہدیہ تبریک اور خراجِ تحسین پیش کرسکوں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں؟

میں جواب دوں گا جنابِ عالی کہ اس کا جواب آپ خود ہی تجویز فرمادیں۔ میں ادب کے ساتھ ایک سوال آپ سے کرتا ہوں۔ فرض کیجئے زید ایک خوشنما بوتل میں نہایت خوش رنگ اور خوشبودار محلول آپ کے پاس لاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میں فلاں فلاں صحت بخش اور بیش قیمت اجزاء ملائے گئے ہیں۔ بوتل کے لیبل پر سنہرے حرفوں میں لفظ "اکسیر" بھی لکھا ہوا ہے۔ آپ اسے لے کر اپنے فیملی ڈاکٹر کے حوالے کرتے ہیں کہ اس کی طبی جانچ کرلو۔ ڈاکٹر تجزیہ و تحلیل کے بعد بتاتا ہے کہ بے شک اس میں بہت سے قیمتی اور مقوّی اجزاء ضرور ہیں لیکن ناصی مقدار میں زہرِ ہلاہل بھی ملا ہوا ہے۔

حضورِ عالی فرمائیں کہ اس انکشاف پر آپ کا ردِّ عمل کیا ہوگا؟ کیا آپ یہ ضروری سمجھیں گے کہ کچھ قصیدہ عمدہ خوشبو اور نفیس رنگ اور گراں بہا اجزاء کا بھی پڑھا جائے اور اس کے بعد یہ کہا جائے کہ خرابی بس اتنی ہے کہ اس میں زہر ملادیا گیا ہے۔ یا فی الحقیقت آپ یہ حکم صادر فرمائیں گے کہ اس بوتل کو فوراً نالی میں انڈیل دیا جائے۔

میں غالباً غلطی نہیں کروں گا اگر یہ عرض کردوں کہ آپ یقیناً دوسرا رویّہ اختیار کریں گے اور پہلے رویّے کا تو تصوّر بھی آپ کے دماغ میں نہیں آسکتا کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ زہر کی آمیزش نے تمام مفید اجزاء کی افادیت ختم کردی ہے اور محلول کی ایک ایک بوند مہلک بن چکی ہے۔

بس می لارڈ! ایسا ہی کچھ معاملہ اس مقالہ کا ہے کہ اس کا مصنف الف اگرچہ اقرار و اعلان اور قصد و شعور کی حد تک بلاشبہ مسلمان ہی ہے لیکن اس کے قوائے ذہنی کی جڑوں اور اعصاب کی تہوں میں کفر کا گھن لگ چکا ہے اور اس کے لاشعور میں یہ خیال جاگزیں ہوچکا ہے کہ میں خدا سے زیادہ عقلمند اور دور اندیش اور مخلوق کا خیر خواہ ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ مسلمان اس کو کہتے ہیں جو خدا اور رسول کو حرفِ آخر مانتا ہو۔ جس کا ایمان یہ ہو کہ خدا کا دین برحق ہے۔ سراپا خیر ہے۔ نقص و عیب سے مبرّا ہے۔ جس کے نزدیک خدا کی حرام کردہ شے کسی کے حلال کرنے سے حلال نہ ہوسکے اور حلال کردہ شے کسی کے حرام کرنے سے حرام نہ بنے۔ اس عقیدے کی واضح تعلیم خود اللہ نے قرآن میں دی ہے اور یہ بھی اللہ ہی نے بتایا کہ پیغمبرؐ تک کو ہمارے احکام و آئین میں ترمیم و تغییر کا کوئی اختیار نہیں۔ وہ اگر ایسی کوئی بات کہتا ہے جسے ہم نے قرآن میں بیان نہیں کیا تو اپنے جی سے گھڑ کر نہیں کہتا بلکہ ہماری وحی کے تحت کہتا ہے۔ وحی کو نظر انداز کرکے وہ نہ کسی شے کو حرام کرسکتا ہے نہ کسی حرام کو حلّت دے سکتا ہے۔

غرض یہ بات مسلّمات میں سے ہے کہ حقیقی مسلمان وہی ہوسکتا ہے جو شعور و لاشعور اور قلب و روح کی آخری گہرائیوں تک احکامِ خداوندی کے برحق اور اٹل ہونے کا اذعان رکھتا ہو اور کسی بھی قانونِ شرعی میں نقص نکالنے یا اسے چیلنج کرنے کا تصوّر تک نہ کرسکتا ہو۔ ایسا تصوّر ہی عین کفر ہے چہ جائیکہ وہ نہاں خانۂ دماغ سے نکل کر زبان و قلم پر بھی آجائے۔

می لارڈ! میں دلی رنج کے ساتھ عرض کروں گا کہ الف کا مقالہ تمام کا تمام ایسے ہی فاسد ذہن کا آئینہ دار ہے جو خدا اور رسول کو حرفِ آخر نہیں مانتا۔ جس کے نزدیک کسی بھی وقتی اور ظاہری مصلحت کے پیشِ نظر ایسے قوانین وضع کرنے میں کوئی حرج نہیں جن سے شریعت کے بعض محکم اور قطعی احکام منسوخ اور مسترد ہو جاتے ہوں۔ وہ یہ تصور کرتا ہے کہ خدا کی حرام کردہ کسی شے کو اگر قانون کے ذریعہ حلال قرار دے دیا جائے تو وہ واقعتاً حلال ہو جاتی ہے اور قرآن کے کسی ناطق فیصلے میں تبدیلی کر دی جائے تو یہ تبدیلی برحق بن جاتی ہے۔

می لارڈ! آپ ہی انصاف فرمائیں کہ جس مقالے کے فکری تانے بانے یہ ہوں کہ جس کی تسوید و تدوین ایسی ذہنیت سے کی گئی ہو کیا اس کی ایک ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ کی جوہری حیثیت ٹھیک ان اجزاء جیسی نہیں ہو جاتی جن کا تذکرہ ابھی میں زہر آمیز محلول کی تمثیل میں پیش کر چکا ہوں۔ خدا آپ کے مراتب میں اضافہ کرے یہ مت سمجھئے کہ میں افتراء یا مبالغے سے کام لے رہا ہوں۔ بے دلیل دعوے کرنا اور الزامات تراشنا میرا کبھی شیوہ نہیں رہا ہے۔ میں ابھی آپ کے حضور دستاویزی شواہد اور ثبوت رکھتا ہوں جو آفتاب کی طرح واضح اور پہاڑ کی طرح اٹل ہیں لہٰذا گذارش بس یہ ہے کہ آپ ضمیر کی پوری بیداری کے ساتھ میری معروضات سنیں اور فیصلہ دیں کہ الف سے آپ کا کون رشتہ ہے۔

علماء پر ایک الزام

دیکھئے۔ الف اپنے مقالے کے دیباچے میں تحریر کرتا ہے:-

"در اصل علمائے کرام کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ ترقی پسند طبقہ قانونِ الٰہیہ میں ترمیم کے درپے ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ میری منشا صرف اتنی ہے کہ جو بدعات اور نقائص عدالتوں میں مروجہ قانونِ شریعت کی بنا پر داخل ہو چکے ہیں ان کا کسی نہ کسی طرح تدارک کیا جائے۔" (ص۱۶)

حضور والا! الف نے ایک بہت بڑی بات بہت نیچی سطح سے کہی جس میں احساسِ ذمہ داری کا سایہ تک نہیں پایا جاتا۔ آپ جانتے ہیں کہ "علمائے کرام" کی اصطلاح ہمارے یہاں اُس طبقے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ جس نے اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ صرف کر کے علوم اسلامیہ کی تحصیل کی ہے اور قرآن و حدیث کو اِن کی اصل زبان میں براہِ راست سمجھا ہے اس طبقے کی کسی متفقہ رائے کو غلط یا صحیح قرار دینا صرف ایسے ہی لوگوں کا حق ہو سکتا ہے جو علوم اسلامیہ سے پوری طرح واقف ہوں اور جملہ اصول و فروع اور قواعد و احکام ان کی نظر میں ہوں لیکن الف نہ صرف یہ کہ اپنے عالمِ دین نہ ہونے کا خود معترف ہے (ص۲) بلکہ اس کے مقالے کے بہتیرے مندرجات صاف بتا رہے ہیں کہ وہ علومِ اسلامیہ سے قطعاً نابلد ہے اور دین و شریعت میں اس کی معلومات نہ ہونے کے درجے میں ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ شریعت کا جو برائے نام سا علم اس نے حاصل کیا ہے وہ جہالت سے بھی زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہ ایسی ہی کتابوں سے حاصل کیا گیا ہے جن میں اسلام دشمنی اور شریعت بیزاری کا ناپاک مواد بھرا ہوا ہے۔ لہٰذا انصاف کیا جائے کہ علمِ شریعت سے تہی دامن ہوتے ہوئے وہ یہ فیصلہ دینے کا مجاز آخر کیونکر ہو گیا کہ علماءِ کرام کا فلاں خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔

محترم جج! آپ یہ گوارا کر سکتے ہیں کہ بڑے بڑے ماہرینِ قانون اور بیرسٹروں اور ججوں نے کسی قانونی مسئلہ میں بالاتفاق جو رائے قائم کی ہو اسے ایک شخص بڑی بے تکلفی سے غلط فہمی کا نام دے دے حالانکہ وہ قانونی علم سے کورا ہو۔ اور اسے وہ زبان تک نہ آتی ہو جس میں قانون کا

دفتر مدون کیا گیا ہے۔

میں دعویٰ کروں گا کہ مسلمانوں کے جس طبقے نے اپنا لقب ترقی پسند رکھ رکھا ہے اور علمائے اسلام جن کے طرزِ فکر سے بیزار ہیں وہ قانون الٰہی میں ترمیم اور شریعت مطہرہ میں تحریف کا نہ صرف خواہاں ہے بلکہ اس کے لئے کوشاں بھی ہے۔ وہ اصلاح اور روشن فکری کے نام پر اسلام کی چند بے حد قیمتی قدروں کو ملیا میٹ کر کے ان کی جگہ ان قدروں کو لانا چاہتا ہے جو سراسر باطل ہیں۔ جنھیں اسلام دشمن مفکرین نے گھڑا ہے اور جن کا رعب اس نام نہاد ترقی پسند طبقے کے دل و دماغ پر اس بری طرح چھایا ہوا ہے کہ خدا اور رسولؐ کی توہین و تخفیف میں بھی اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔

میرے اس دعوے کے شواہد اتنے زیادہ ہیں کہ اس طبقے کی کوئی بھی تحریر ان سے خالی نہیں ملتی اور محترم جج اگر کسی مرحلے میں حکم دیں کہ میں کچھ شواہد ان کے سامنے لاؤں تو بلاشبہ اس حکم کی تعمیل کروں گا لیکن سردست میں عدالت کا قیمتی وقت بچانے کے لئے صرف ان شواہد پر اکتفا کروں گا جو خود الف کے مقالے میں موجود ہیں۔ الف خود کو ترقی پسندوں ہی میں شامل کرتا ہے جیسا کہ اس کی منقولہ بالا سطروں سے ظاہر ہے۔ وہ یقیناً غلط نہیں کہتا کیونکہ وہ اگرچہ زیادہ شہرت یافتہ ترقی پسند نہیں ہے لیکن اس نے اسلام کا جو بھی تھوڑا سا علم حاصل کیا ہے وہ ترقی پسندوں ہی سے کیا ہے اور اس کے دل و دماغ میں بھی اسلامی شریعت سے بدگمانی اور خدا اور رسول کی عظمت سے لاپرواہی کے وہی برگ و بار موجود ہیں جو بڑے ترقی پسندوں کے یہاں تناور درخت کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

می لارڈ! جس طرح علماء کی کسی رائے کو صحیح یا غلط قرار دینے کے لئے علوم دینیہ میں دسترس اور اصول و کلیات میں مہارت کی ضرورت ہے اسی طرح یہ جاننے کے لئے بھی کہ کونسی چیز بدعت ہے۔ سنت کا اطمینان بخش علم ضروری ہے سیاہی کا ادراک تو وہی کر سکے گا جس نے سفیدی کو بھی جانا ہو۔ فلاں شے بدعت یا نقص یا گناہ یا عیب ہے اس کا ذمہ وارانہ فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جسے ٹھیک طور پر یہ بھی خبر ہو کہ اسلامی شریعت میں سنت اور کمال اور ثواب اور حسن کسے کہتے ہیں۔ خبر نہ ہونے کی صورت میں عین ممکن ہے کہ وہ کسی شے کو بدعت سمجھے اور فی الحقیقت سنت ہو یا وہ کسی شے کو نقائص کے خانے میں رکھے اور وہ فی الاصل محاسن میں شمار کی گئی ہو۔

مقالہ نگار کی بے خبری

یہ محض ایک منطقی امکان نہیں ہے می لارڈ بلکہ میں مقالے سے اس کی ایک مثال پیش کر کے آگے بڑھوں گا۔ الف صفحہ ۲۱ پر طلاق کی بحث میں لکھتا ہے۔

> "مروجہ قانون کے مطابق اگر کوئی محض دھمکی
> میں آکر یا مذاق میں بھی تین بار طلاق کا اعلان
> کر دے تو وہ ناقابل تنسیخ ہو جاتی ہے۔"

اور الف اسے ایک زیادتی قرار دے کر شدت سے یہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ اس قانون کو بدل دیا جائے۔

می لارڈ! اس کا مطلب ظاہر یہی تو ہوا کہ مذاقاً دی جانے والی طلاق کا واقع ہو جانا اس کے نزدیک حقیقتاً قانونِ شرعی نہیں بلکہ بطور بدعت اسے مسلم پرسنل لا میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اب میں عرض کروں گا کہ الف کا یہ خیال بے خبری پر مبنی ہے۔ یہ ضابطہ تو خود شارع علیہ السلام کا ارشاد فرمایا ہوا ہے۔

ثَلٰثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْ لُهُنَّ جِدٌّ اَلنِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ۔ (ابوداؤد شریف بَابٌ فِی الطَّلَاقِ عَلَی الْهَزْلِ)	تین چیزیں ایسی ہیں کہ سنجیدگی اور مذاق دونوں حالتوں میں وہ واقع ہو جاتی ہیں۔ نکاح اور طلاق اور رجعت۔

انصاف فرمایئے۔ کیا یہ وہی حادثہ نہیں جس کے امکان پر

قانون کو بدعت اور نقص قرار دے لیا جو قانون الٰہیہ کا مسلمہ جز و تھا۔ آں جناب کو معلوم ہی ہوگا کہ قانون الٰہیہ "صرف" قرآن تک محدود نہیں بلکہ قرآن ہی کی ہدایت صراحت کے مطابق صاحبِ قرآن یعنی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تصریحات اور ایجابی و سلبی تعلیمات بھی قانونِ الٰہیہ کا حصہ ہیں اور شریعت جس چیز کا نام ہے وہ اللہ اور رسولؐ دونوں کی تعلیمات سے تشکیل پاتی ہے۔ پھر کیسے کوئی شخص بدعات و نقائص کی صحیح تشخیص کر سکتا ہے جبکہ وہ علم شریعت سے بے بہرہ ہو۔

یہ نکتہ بھی نوٹ کیا جائے کہ یہاں قانونِ شرعی کو منسوخ کرنے کی خواہش کا ادنیٰ سا محرک بھی خارج میں موجود نہیں تھا۔ کیا مذاق میں طلاق دینا کوئی ایسا فعل ہے جسے ضرورت یا مجبوری کے زمرے میں رکھا جائے؟ صاف ظاہر ہے کہ بالکل نہیں۔ جو شخص مذاق میں طلاق دیتا ہے وہ کسی ضرورت کی تکمیل نہیں کرتا بلکہ دین و شریعت سے ٹھٹول اور تمسخر کرتا ہے ایسا شخص کسی انعام کا مستحق ہونا چاہیئے یا سزا کا۔ اس کا فیصلہ آپ ہی فرمائیں کتنا عجیب و غریب ہے وہ ذہن جو شریعت کی ایک سنجیدہ اصطلاح سے کھیل کرنے والوں کو رعایت سے نواز نے کا متمنی ہے اور قانون شریعت کا کان پکڑ کر کہتا ہے کہ جاؤ تمہیں منسوخ کیا تاکہ ان مسخروں کی تفریح میں خلل نہ آئے اندازہ کیجئے می لارڈ۔ ایسا ذہن رکھنے والا آدمی ادنیٰ ضرورتوں کے لیے بھی شریعت کے اہم سے اہم قانون میں ترمیم و تنسیخ کا متمنی نہیں ہوگا۔

علم سے افسوسناک بے توجہی

می لارڈ! الف اپنے مقالے میں بار بار یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ سماجی اصلاح کے لئے بے چین ہے۔ وہ کہتا ہے میں دین و شریعت کا باغی نہیں بلکہ مطیع و فرماں بردار ہوں اسی کی روشنی میں بعض دشواریوں اور الجھنوں کا حل چاہتا ہوں۔ اس نے کہا ہے کہ

"میں سماج کی بہتری کا سچے دل سے خواہاں ہوں" (صفحہ)

اور یہ بھی کہتا ہے کہ

"مجھے اس امر سے اتفاق ہے کہ جہاں تک قانونِ الٰہیہ کا تعلق ہے اس میں کوئی شخص بھی اس کے خلاف ردّ و بدل کی جرأت نہیں کر سکتا" (صفحہ ۱۶)

غرض وہ یقین دلاتا ہے کہ میں مخلص اور دردمند ہوں۔ لیکن اے محترم جج! اس سے دریافت تو کیجئے کہ اے اللہ کے بندے تجھے قسمت نے یہ زرّیں موقعہ عطا کیا تھا کہ تیرے سامنے مسلم پرسنل لا کے مقدمات آئیں اور تو اسلامی شریعت کی روشنی میں ان کا فیصلہ کرے۔ تیرے اندر اگر اسلام کے بارے میں اگر کوئی اخلاص تھا تو قدرتاً پہلے ہی دن سے تیری یہ کوشش ہونی چاہیئے تھی کہ اسلامی شریعت کا معتدبہ علم حاصل کرے تاکہ تیرا کوئی فیصلہ شریعت کے خلاف نہ ہو اور جو بھی الجھن تجھے پیش آئے اس کا حل ماہرین علوم شریعت کے ارشادات کی روشنی میں نکالے۔ نیز مروجہ مسلم پرسنل لا میں اگر کچھ ایسے عناصر داخل ہو گئے جو شریعت سے متصادم ہیں تو تیری کوشش یہ ہو کہ انھیں بدل کر ان کی جگہ صحت مند اور مطابق شرع عناصر داخل کئے جائیں۔

مگر آج بیس سال سے زائد تجھے اس کرسی پر بیٹھے ہوئے ہو گئے اور تو اسلامی شریعت کی اس برائے نام واقفیت پر مطمئن بیٹھا ہے جس کی سطح پرائمری سے زیادہ بلند نہیں ہے اور غضب یہ ہے کہ اپنی بے علمی اور بے خبری کا حقیقی احساس کئے بغیر ایسے بڑے بڑے مسائل میں مجتہدانہ اظہارِ خیال کر رہا ہے جن پر گفتگو یونیورسٹی سطح سے نیچے ہو ہی نہیں سکتی۔ حالانکہ اسلامی شریعت کے سرچشمے قرآن اور حدیث جس زبان میں ہیں اسے سیکھنے کے لئے دو تین سال ہی کافی تھے اور یہ زبان سیکھنے کے بعد قرآن و سنت کے مستند اور شہرۂ

آفاق شارحین کی تشریحات وتعبیرات کا مطالعہ آسان تھا نیز زبان اردو میں بھی ایسا لٹریچر وجود پذیر ہو چکا ہے کہ اگر تجھے علم شریعت کی سچی پیاس ہوتی تو عربی سیکھے بغیر بھی کم سے کم اتنا علم ضرور حاصل کر لیتا کہ بدعت اور سنت یا اسلام اور زندقہ یا اصلاح اور تحریف میں فرق کر سکے۔

مصنف عالی مقام! یہی بے توفیقی اور لاپروائی ہے جس کی بنا پر یہ شخص ایک طرف خدا اور رسول پر ایمان کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اور میرے ترقی پسند ہم نوا قانونِ الٰہیہ میں رد وبدل نہیں چاہتے صرف بدعات وخرافات کی اصلاح چاہتے ہیں اور دوسری طرف یہ بے تکلف خدا اور رسول کو اعتراض کا ہدف بناتا ہے اور ایسی تجویزیں بھی پیش کرتا ہے جو اسلامی شریعت کی بنیادیں ہلا دینے والی ہیں۔ یہی نہیں اس کا رویہ اس حد تک غیر ذمہ دارانہ ہے کہ خدا کے کلام کو صریحاً غلط معنے پہنانے اور رسول کی طرف بے تحقیق باتیں منسوب کرنے میں بھی اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ دعوۂ ایمان کے باوجود اسے ڈر نہیں لگتا کہ رب العٰلمین کی عدالت میں یہ کیا عذر پیش کر سکے گا۔

میں ان الزامات کے مقالے سے شواہد پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ اس وقت عدالت میں ملزم کا کوئی وکیل موجود نہیں ہے۔ انصاف تقاضا کرتا ہے کہ اسے بھی وکیل میسر ہو۔ لہٰذا آپ ہی اس کے مختار ہیں کہ ناچیز کی معروضات میں اگر کچھ خامیاں محسوس فرمائیں تو کسی وکیل صفائی کا انتظام کر دیں یا خود ہی اپنے فیصلے میں خامیوں کی مدلل نشان دہی فرما دیں۔

علماء کو بدنام کرنے کی کوشش

اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو عبارت شروع میں نقل کر آیا ہوں اس کا بقیہ بھی جناب کی نظروں میں آجائے۔ الف بدعات و نقائص کی تمثیل پیش کرتا ہے:

"مثلاً یہ تو ٹھیک ہے کہ ہماری بیٹیاں قانونِ شریعت کے مطابق اپنا ترکہ پانے کی جائز طور پر مستحق ہیں لیکن بدقسمتی سے اب وہ وراثتی رسم ورواج کا شکار ہو چکی ہیں اور اس طرح وہ اپنا حصہ شرع کے مطابق پانے سے محروم ہیں چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کے لئے ادھر سے اُدھر ماری ماری پھرتی ہیں اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں یہاں تک کہ ان کے ظالم شوہر طلاق دیتے وقت حق مہر ادا نہیں کرتے اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ گود کے معصوم بچوں کو زبردستی چھین لیتے ہیں یہی نہیں ان کا جہیز اور زیورات بھی غصب کر لیتے ہیں۔"

پہلی گذارش تو یہی کر دوں گا کہ لارڈ اکرالف نے مثال پیش کرنے میں دیانت سے کام نہیں لیا۔ وہ چھانٹ کر عورتوں کی چند ایسی مشکلات پیش کرتا ہے جو واقعۃً اس لائق ہیں کہ انہیں دور کرنے پر توجہ دی جائے اور کوئی بھی عالم یہ لغویات نہیں کہتا کہ ان مشکلات کو دور کرنے کی کوشش قانونِ الٰہی میں ترمیم کے مرادف ہے۔ اس طرح کی مثال پیش کر کے الف علماء کے خلاف ناروا طور پر غلط فہمیاں پیدا کرنے کا مرتکب ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کی مشکلات علماء اور نام نہاد ترقی پسندوں کے مابین محلِ نزاع ہیں ہی نہیں بلکہ وہ بالکل اور مسئلے ہیں جن پر نزاع ہے اور جن میں ترقی پسندوں کا موقف ومسلک قطعی طور پر اسلام کے خلاف ہے۔ چنانچہ اپنے پورے مقالے میں الف نے اس مثال والی دشواریوں اور زیادتیوں کا کوئی مناسب حل پیش کرنے میں سر نہیں کھپایا بلکہ اکثر ان مسائل میں سر کھپایا ہے جو مابہ النزاع ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے اپنے قارئین کو دیباچے کے ذریعہ یہ فریب دینے کی سعی کی ہے کہ ہم ترقی پسندوں کا موقف تو نہایت

معقول عادلانہ اور شریفانہ ہے اور علماء اتنے ظالم اور نامعقول اور غیر شریف ہیں کہ وہ خواہ مخواہ شور مچائے چلے چلے جاتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ بدعات و خرافات کی اصلاح ہو۔

دوسری گذارش میں یہ کروں گا کہ مثال میں دی ہوئی مشکلات کا کوئی بھی تعلق مسلم پرسنل لا، کی کسی خامی یا کمی سے نہیں بلکہ وہ صریحاً اس نظامِ عدل کی خامی کا مظہر ہیں جو قانون کو بروقت صحیح طور پر نافذ کرنے میں ناکام رہا ہے آخر کیا مسلم پرسنل نہیں کہتا کہ لڑکیوں کو ان کی شرعی وراثت لازماً دو، قریبی رشتہ دار چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کا بار اٹھائیں شوہر مہر ادا کریں اور جو جہیز قانونِ ملکیت کی رو سے عورت کی ملکیت ہو وہ تمام کا تمام مطلقہ کے حوالے کر دیا جائے۔ اگر کہتا ہے اور یقیناً کہتا ہے تو اصلاح کی ضرورت نفاذِ قانون کے اُن طریقوں میں ہوئی جو عورت کو اس کے جائز حقوق دلانے میں ناکام ہو رہے ہیں نہ کہ اس مسلم پرسنل لا میں جو عورت کے حقوقِ جائزہ پر صاد کرتا ہے۔ رسم و رواج اگر غلط چل نکلا ہے تو ججوں کا فرض ہے کہ اسے نظر انداز کر کے قانون کے مطابق فیصلے دیں۔ دو اگر عورت کو وراثت یا مہر یا جہیز دلانے کا انتظام نہیں کر پاتے تو اس کا کیا جواز ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم و اصلاح کی بحث اٹھائی جائے۔

جنابِ عالی! اس مثال والی دشواریوں کے تذکرے کا محل تو کوئی ایسا مقالہ ہو سکتا تھا جس میں موجودہ نظامِ عدل اور نفاذِ قانون کے طریقِ کار کی خامیوں پر بحث کی گئی ہو نہ کہ ایسا مقالہ جس کا عنوان "مسلم پرسنل لا کی مشکلات اور ان کا حل رکھا گیا ہو۔

شریعت کی نہیں نظامِ عدل کی ناکامی

الف نے لڑکیوں کی وراثت کے سلسلے میں صفحہ اور صفحہ پر یہ بھی لکھا ہے

"مثلاً شرع کے مطابق تمام مسلمان لڑکیوں کو اپنے باپ کی جائداد میں سے نصف حصہ لینے کا پورا حق ہے لیکن اس قانون نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ قانونِ شریعت کو نظر انداز کر کے رسم و رواج کو ترجیح دی جانے لگی ہے اور اس طرح ہماری ہزاروں مسلم بیٹیاں اودھ، کچھ، مدھیہ پردیش، کشمیر اور پنجاب میں رواجی قانون کی وجہ سے اپنے حصۂ شرعی سے محروم کر دی گئیں ۔"

میں کہتا ہوں واقعات کی یہ تصویر کشی اگر مبالغے سے پاک ہے تو اس کا واحد مطلب یہ ہے کہ قانون نے رسم و رواج کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ تحریک مسلم پرسنل لا میں ردّ و بدل کی اٹھانی چاہیئے یا اس بات کی کہ عدالتیں فیصلے قانون کے مطابق کریں اور خلافِ قانون رسم و رواج کو اہمیت نہ دیں۔ عجیب بات ہے کہ قصور تو مسلم پرسنل لا کو نظر انداز کرنے والوں کا ہو، اور علاج یہ تجویز کیا جا رہا ہو کہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کرو۔

ذہنی بگاڑ کا واضح نمونہ

الف نے اگرچہ کھل کر یہ بات نہیں کہی ہے کہ لڑکی اور لڑکے کو وراثت میں برابر حصہ ملنے کا جو قانون ہندوؤں کے لئے وضع کیا ہے وہی اب مسلمانوں کو بھی اختیار کر لینا چاہیئے لیکن قرینہ صاف طور پر بتا رہا ہے کہ اسکا یہی مقصد ہے وہ لکھتا ہے۔

" ظاہر ہے کہ ہماری مسلمان ترقی یافتہ لڑکیاں اس قدم کے اٹھنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں، چنانچہ ابھی حال ہی میں پونا کے ایک اجتماع میں لڑکیوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر انکے حقوق کی طرف توجہ نہ کی گئی تو وہ غیر مسلموں سے شادی کرنے میں دریغ نہیں کریں گی۔" (صفحہ ۱)

کیا اس عبارت آرائی کا اس کے سوا بھی کوئی مقصود ہو سکتا ہے کہ الف مسلمانوں کی وراثت میں لڑکی اور لڑکے کا حصہ مساوی مان لینے کی ترغیب دے رہا ہے۔ اس کے نزدیک یہی مصلحتِ وقت کا تقاضا ہے اور دانشمندی کا ثبوت ہے

پھر انصاف کیجئے جناب والا! کیا میں نے غلط کہا تھا کہ دیباچے میں اس شخص نے فریب سے کام لیا ہے اور دوسرے نام نہاد ترقی پسندوں کی طرح یہ بھی قانون الٰہیہ میں ردّ و بدل کا حامی ہے۔

مذہبی نقطۂ نظر سے ہٹ کر عقل عام ہی کے زاویئے سے دیکھئے تو اس شخص کی سادہ لوحی پر حیرت کرنی ہوگی۔ یہ شخص خود ہی بتا رہا ہے کہ لڑکوں کے مقابلے میں جو آدھی وراثت لڑکیوں کو پہنچتی ہے وہ بھی عدالتیں انھیں نہیں دلوا رہی ہیں۔ پھر کیا اس صورت میں عدالتوں کا رویّہ بدل جائے گا جب لڑکی کا حصّہ لڑکوں کے مساوی مان لیا جائے۔ کیا وہ یہی انتظار کر رہی ہیں کہ جب لڑکیوں کا حصّہ موجودہ شرح سے دُگنا ہو جائے اس وقت ہم انھیں عدل سے نوازیں مجھے شبہ ہے می لارڈ! کہ اس طرح کی غیر معقول اور مضحکہ خیز خوش امیدی کا مظاہرہ کوئی ہوش مند بحالتِ ہوش و حواس بھی کر سکتا ہو۔

رہا مذہبی نقطۂ نظر۔ تو یور ہائنس اس سے بے خبر نہ ہوں گے کہ لڑکیوں کی مقدارِ وراثت کوئی اجتہادی مسئلہ نہیں جس کے بارے میں یہ موشگافی کی جاسکے کہ ہم اس سے بہتر اجتہاد پیش کرتے ہیں بلکہ وہ تو صریح لفظوں میں حکم خداوندی ہے جو قرآن میں ثبت کر دیا گیا ہے۔ اس سے انحراف بلا ریب قرآن سے انحراف ہے۔ جو شخص ایسے محکم اور قطعی قانون الٰہی میں تبدیلی کا تصور کر سکتا ہو کیا اس کا یہ دعویٰ ذرا بھی سنجیدہ اور لائق التفات تصور کیا جاسکتا ہے کہ میں قرآن پر ایمان رکھتا ہوں اور قانون الٰہیہ میں ترمیم کا خواہاں نہیں ہوں۔

ذرا اندازہ فرمایئے الفؔ ان لڑکیوں کو "ترقی یافتہ" کے لقب سے ملقب کر رہا ہے جن کی ذہنی پستی اور اخلاقی گراوٹ کا یہ عالم ہے کہ ایک موہوم مالی فائدے کی حرص میں وہ پوری زندگی زنا میں گذارنے کا ارادہ ظاہر کیے ہیں۔ جی ہاں کورا زنا ——— اسلامی شریعت کا قطعی اور دو ٹوک فیصلہ ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اگر کرے گی تو یہ تعلق حرام ہوگا اس فیصلے کی موجودگی میں اگر کچھ مسلم خواتین واقعی غیر مسلموں سے شادی کا ارادہ کر رہی ہیں تو انھیں کوئی بھی ہوش مند مسلمان گمراہ اور جاہل مطلق اور بد دین تو کہہ سکتا ہے ترقی پسند نہیں کہہ سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ جناب عالی! الفؔ نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ کسی ایک شہر میں چند مسلمان عورتیں پاگل پن کی کوئی بات زبان سے نکالتی ہیں کوئی حرام فعل کر گذرتی ہیں تو اسے اس طرح بیان کرنا ہرگز درست نہ ہوگا۔ گویا یہ کوئی ابتلائے عام ہو میں چیلنج سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کی مسلم خواتین میں فی لاکھ ایک خاتون بھی ایسا گندہ ذہن ہرگز نہیں رکھتی۔

لیکن اگر فرض ہی کر لیا جائے کہ گھٹیا ترین اندازِ فکر کچھ عام بھی ہو گیا ہے تو الفؔ کو یہ خوش فہمی آخر کیوں ہو گئی کہ وہ مسلمان عورتوں کا ٹھیکیدار بنا کر بھیجا گیا ہے اور اس کا لازمی فرض ہے کہ انھیں غیر مسلموں سے شادی کرنے سے روکے خواہ اس کے لئے احکام خداوندی سے انحراف کرنا پڑے۔ میں کہتا ہوں چند عورتیں نہیں لاکھوں عورتیں اور لاکھوں مرد اگر اسلام سے اس لئے بغاوت پر آمادہ ہو جائیں کہ انھیں فلاں فلاں قانونِ شریعت پسند نہیں اور فلاں فلاں غیر شرعی قوانین میں ان کی دنیاوی منفعت ہے تو شوق سے وہ جو چاہے کرتے پھریں۔ ان کا اسلام پر قائم رہنا ہمارے سر احسان نہیں ہے اور اسلام سے بغاوت کر کے وہ جہنم میں کود جائیں تو خدا ہم سے ان کے گناہ کی باز پرس نہیں کرے گا۔ ہم مسلمانوں کی اور علمائے اسلام کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ قوانین شریعت کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی اور تبلیغ کریں۔ لوگوں کو سمجھائیں کہ یہ دنیا ہی سب کچھ نہیں ہے اور قانون شریعت پر

عمل ہی دین و دنیا کی فلاح کا ضامن ہے۔ اگر کچھ لوگ ہماری آواز پر کان نہیں دھرتے اور اپنے لئے دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں تو ہمیں یہ حق اللہ اور رسول ؐ نے نہیں دیا کہ انھیں دوسرے راستے سے روکنے کے لئے قانونِ شریعت کو توڑیں مروڑیں اور اصلاح کے جوش میں خود ہی خدا کے باغی بن جائیں۔ قرآن و سنت ناقابلِ تنسیخ ہیں چاہے کروڑوں مسلمان بھی اُن کے خلاف شور و غل مچاتے پھریں۔

قرآن سے کھیل

اب میں آپ کے سامنے مقالے سے وہ نمونے پیش کرتا ہوں جن سے میرے الزامات کی تصدیق در تصدیق ہوتی ہے۔

الف نے سب سے پہلے کثرتِ ازدواج پر بحث کی ہے اس بحث میں بنیادی خامی یہ ہے کہ دوسرے ترقی پسندوں کی طرح الف نے بھی یہ طے کر لیا ہے کہ ایک وقت میں ایک سے زائد بیویاں رکھنا فی نفسہٖ بُرائی ہے۔ حالانکہ وہ اگر صرف انبیاء کرام اور سب سے بڑے پیغمبر ؐ اور اس کے صحابہ کی زندگیوں پر نظر ڈال لیتا تو اسے محسوس ہو جاتا کہ یہ تخیل ان خدا بیزار دانشوروں کا پیدا کردہ ہے جن کے نزدیک انبیاء کی عظمت کوئی شے نہیں اور آسمانی شریعت کسی احترام کی مستحق نہیں۔ غضب ہے حضور والا! الف یہ تک محسوس نہیں کرتا کہ جس پیغمبرِ عربی ؐ پر وہ ایمان لایا ہے اس نے کتنی شادیاں کیں اور جن صحابہؓ کو وہ افضل ترین مانتا ہے ان کے یہاں کتنی کتنی بیویاں رہیں۔

میں نے "محسوس" کا لفظ استعمال کیا ہے می لارڈ۔ — میرا مطلب یہ ہے کہ وہ علم کے باوجود احساس نہیں کرتا۔ ایسا نہیں کہ اسے خبر ہی نہ ہو۔ ملاحظہ کیجئے وہ کتنی مبہم اور بے حقیقت تاویلات کا سہارا لیتا ہے

"بہتر ہوگا کہ مسلمانوں میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کا پسِ منظر معلوم کیا جائے دراصل بات یہ ہے کہ جہاد کے زمانے میں بہت سی عورتیں بیوہ ہوگئیں اور یتیم بچوں کی پرورش کا سوال پیدا ہوا تو آنحضرت ؐ نے ایسی بے بس بیواؤں اور بے باپ کے بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے مسلمانوں کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ بیواؤں کو اپنے عقد میں لے آئیں تاکہ یتیم بچوں کی پرورش ہو سکے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ صحابہؓ میں کثرتِ ازدواج کا اسے بھی کچھ علم ہے۔ اب انصاف کیجئے کہ تقریباً پندرہ سو برس پہلے رسول اللہ ؐ کے ہزاروں صحابیوں نے جو ایک سے زائد بیویاں کی تھیں اس کی واحد وجہ یہ شخص کس شان سے طے کر رہا ہے۔ دلیل و شہادت کچھ نہیں۔ حوالہ نہ کسی آیت کا نہ حدیث کا نہ تاریخ و سیرت کا۔ مزید ستم یہ کہ رسول اللہ کی طرف بھی ایک بات دل سے گھڑ کر منسوب کر دی۔ حالانکہ اجازت دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بہت سی بیویاں رکھنے کا رواج تو عرب میں پہلے سے چلا آ رہا تھا دس دس بیس بیس بیویاں۔ خود رسول اللہ نے کم سے کم گیارہ نکاح کئے اور وفات کے وقت آپ کی نو بیویاں موجود تھیں۔ اللہ نے صرف یہ کیا کہ حضور ؐ کو مستثنیٰ کر کے باقی تمام امت کو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنے سے روک دیا۔ وہ آیت قرآن ہی میں موجود ہے جو چار سے زائد پر روک لگاتی ہے۔ اور الف جو کچھ کہہ رہا ہے وہ دراصل اُن جہلاء اور سفہاء کی اندھی تقلید میں کہہ رہا ہے جنھوں نے کثرتِ ازدواج کو بُرائی ثابت کرنے کے لئے نہ قرآن کی معنوی تحریف میں تکلف کیا نہ حضور ؐ کی طرف جھوٹے انتساب میں مضائقہ سمجھا۔

میں حضور والا سے درخواست کروں گا کہ اس شخص سے پوچھئے اس نے ایک سے زیادہ شادی کا پسِ منظر معلوم

کرنے کے لئے علم و تحقیق کے کیا ذرائع اختیار کئے اور کون سا دستاویزی ثبوت یا تاریخی برہان سائنٹفک استدلال اس کی جھولی میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قرآن کی ایک ہی آیت کا حوالہ دے گا جسے میں خود جناب والا کے ملاحظے میں ابھی لاتا ہوں اور آیت کا ٹھیک وہ مطلب بیان کرے گا جو چودہ سو سال کے کسی مستند عالم قرآن اور ماہر فن نے کبھی بیان نہیں کیا بلکہ زمانۂ حاضر کے چند مسیحی مستشرقین یا ان کے بعض مسلمان شاگردوں نے بیان کیا ہے اور یہ مطلب فی الحقیقت آیت کا مطلب نہیں ہے بلکہ ان کا اپنا مفروضہ ہے جسے یہ لوگ دھاندلی اور ڈھٹائی سے آیت کے منھ میں ٹھونستے ہیں۔

پوچھئے می لارڈ ـــــــ اس سے پوچھئے۔ کیا احساسِ ذمہ داری اور دیانت کا تقاضا نہیں تھا کہ یہ اگر خود قرآن کی زبان نہیں جانتا تھا تو معروف و مستند مفسرین قرآن کے وہ ترجمے اور تفسیریں ہی دیکھ لیتا جو اس کی اپنی مادری زبان میں بھی ملک در ملک شہر و دیار میں دستیاب ہیں انھیں دیکھ کر آیت کا ٹھیک مفہوم و مصداق معلوم کرنے کے بجائے اس نے غیر مسلموں یا مسلم منافقوں اور جاہلوں سے دریافت کرنا پسند کیا اور اسی کو حرفِ آخر سمجھا۔ اور اگر اس کا جواب یہ ہو کہ میں نے معروف و مستند تفسیریں بھی دیکھی ہیں تو اس سے کہئے ایک دو ایسی تفسیروں کے نام بے جن میں آیت کا وہ مطلب بیان کیا گیا ہو جو یہ کرتا ہے۔ دو بھی نہیں چلئے ایک ہی سہی ـــــــ صرف ایک مستند تفسیر کی نشان دہی اس سے کرا دیجئے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایسا نہ کر سکے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے تمام ثقہ مفسرین آیت کا مطلب کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں اور یہ شخص فی الحقیقت قرآن کا نہیں بلکہ اپنے نفس اور پسند اور رجحان کا پیرو ہے اس لئے دیدہ و دانستہ صحیح اور حقیقی مطلب کو مکمل طور پر نظر انداز کرکے وہ مطلب بیان کر رہا ہے جس کا کوئی تعلق قرآن سے نہیں اور بلا تکلف ایک جھوٹ بھی

پیغمبرِ اسلام کی نسبت بول رہا ہے حالانکہ می لارڈ! اسے معلوم ہے کہ پیغمبر کی طرف جھوٹی نسبت کرنے والے کو جہنمی قرار دیا گیا ہے۔

قرآن کے سورۂ نساء کے بالکل آغاز میں اللہ تعالیٰ تقویٰ اور صلہ رحمی کا حکم دینے کے بعد ان لوگوں کو مخاطب کرتا ہے جو حالات کے تحت کسی ایک یا چند یتیموں کے والی اور سرپرست بن گئے ہیں۔ اس میں یہ کوئی قید نہیں کہ یہ یتیم بچے لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان یتیموں کا مال خود نہ کھا جاؤ بلکہ اسے محفوظ رکھو اور جب یہ بڑے ہو جائیں تو اسے ان کے حوالے کر دو۔ یہ چالاکی بھی مت کرو کہ ان کے کسی اچھے مال کو بُرے مال سے بدل دو یا ان کا مال اپنے مال میں خلط ملط کرکے کھا جاؤ۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کہتا ہے:-

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا	اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں
فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ	میں انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں
لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی	تمہیں پسند آئیں ان میں سے دو
وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ	دو اور تین تین اور چار چار کے
خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا	ساتھ نکاح کر لو۔ پھر اگر تمہیں ڈر
فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَکَتْ	ہو کہ ان کے ساتھ انصاف نہ کر
اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰی	پاؤ گے تو ایک ہی پر اکتفا کر دیا
اَلَّا تَعُوْلُوْا۔	اس لونڈی سے کام چلاؤ۔ جو تمہاری

اپنی مملوکہ ہو۔ اس صورت میں زیادہ توقع ہے کہ تم سے زیادتی نہ ہو

آپ مائی لارڈ خود بھی ادراک فرما سکتے ہیں کہ یہ آیت اس مفہوم و مدعا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی جو آلٹف پس منظر کے عنوان سے بیان کر رہا ہے لیکن اگر آپ چاہیں کہ اس بے تعلقی پر میں ہی دلائل پیش کروں تو لیجئے اس کی بھی تعمیل کئے دیتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جناب والا کہ جیسا میں نے عرض کیا اس آیت کا تعلق صرف ان لوگوں سے ہے جن کی سرپرستی میں کچھ یتیم آ چکے ہوں نہ کہ عام افراد و معاشرہ سے یہ ایسا

ہے جیسے اقتدار اعلیٰ آپ کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ بے انصافی ہرگز مت کرو تو اس کا واحد مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے انصاف کرو جن کے مقدمات تمہاری عدالت میں آگئے ہیں اور تم ان میں فیصلے دینے کے مجاز ہو۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ تم معاشرے میں ان لوگوں کو ڈھونڈتے پھرو جو کسی قسم کی ناانصافی کا شکار ہیں اور انھیں پکڑ پکڑ کر اپنی عدالت میں لاؤ اور اپنے طور پر ان کے مقدمات تیار کرو۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ جو ہدایات اللہ تعالیٰ ان آیات میں دے رہا ہے وہ ایسے ہی لوگوں کو دی جاسکتی ہیں جن کے دستِ تصرف میں یتیموں کے اموال آچکے ہوں۔ ان ہی سے یہ اندیشہ ہوسکتا ہے کہ بے ایمانی کرکے ان کے اموال کا کچھ حصہ یا سارا کا سارا کھا جائیں یا اچھے کی جگہ بُرا رکھ دیں یا انھیں اپنے ذاتی مال میں ملالیں خود ان لوگوں کا یہ اندیشہ کرنا کہ ہم یتیموں کے مال میں ایمانداری نہ برت سکیں گے یہی معنی رکھتا ہے کہ سرپرستی کا موقعہ انھیں مہیا ہوچکا ہے۔

لیکن آلف ان آیات کا مخاطب سارے ہی افرادِ معاشرہ کو قرار دے رہا ہے اور یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ اس آیت کے ذریعہ تمام لوگوں کو یہ ہدایت کی جارہی ہے کہ وہ معاشرہ میں پھیلے ہوئے یتیموں کو اپنی سرپرستی میں لیں اور ان کی پرورش کا اہتمام کریں۔ صاف ظاہر ہے آیت کا ایک ایک لفظ اور سیاق وسباق اس مطلب سے انکار کررہا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت میں ایسا ایک حرف موجود نہیں جس سے یہ مطلب نکالا جائے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یتیم بچوں کی بیوہ ماؤں سے نکاح کی ہدایت دے رہا ہے ملاحظہ فرمائیے اللہ تو یہ فرمارہا ہے کہ عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں ان میں سے چار تک کو اپنے نکاح میں لاسکتے ہو۔ ظاہر بات ہے کہ مقصد اگر یتیموں کی بیوہ ماؤں سے نکاح ہوتا تو بات یوں کہی جاتی کہ اے لوگو یتیم بچوں کی پرورش کے لئے ان کی بیوہ ماؤں سے نکاح کرو۔ لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ بیواؤں یا یتیموں کی ماؤں کا قطعاً تذکرہ نہیں بلکہ من النساء کا لفظ فرمایا گیا۔ یعنی عام عورتوں میں سے اور ساتھ ہی ماطاب لکم بھی کہہ دیا گیا یعنی جو تمہیں پسند آئیں اچھی لگیں۔ مرغوب ہوں۔ اس سے اس سے ظاہر ہے کہ یہاں اجازتِ نکاح کا جوڑ بچوں والی بیواؤں سے لگانا نامعقولیت کی انتہا ہے جسے دھاندلی اور تحریف اور چرب زبانی ہی کہا جاسکتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ او ماملکت ایمانکم کا فقرہ بھی آیت میں موجود ہے یعنی اگر ایک بیوی کی بھی منصفانہ کفالت تمہارے بس میں نہیں ہے تو پھر اپنی جنسی ضرورت کو ان باندیوں سے پورا کرنے پر اکتفا کرو جو قانونِ شرعی کے مطابق تمہاری ملکیت قرار پائی ہیں۔ مِی لارڈ! الف سے پوچھا جائے کہ اگر یتیموں کی بیوہ ماؤں سے نکاح کرکے یتیموں کی پرورش کا مضمون اس آیت میں بیان ہوا ہوتا تو یہ لونڈیوں سے کام چلانے کا قصہ کہاں سے نکل آیا۔ کیا معاشرے میں پھیلے ہوئے یتیموں کی پرورش کا بھی کوئی تعلق اس بات سے ہوسکتا ہے کہ جو لوگ ایک بیوی کا بار برداشت نہ کرسکتے ہوں وہ اپنی لونڈیوں پر اکتفا کریں۔

چوتھی بات یہ کہ قرآن وہی کہہ رہا ہو جو آلف بیان بیان کررہا ہے تو اس فقرے کا کوئی جواز نہیں ثابت کیا جاسکتا کہ

"اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں میں انصاف نہ کرسکو گے"

اس کے بجائے کوئی اس قسم کا فقرہ نظر آتا کہ

"یتیموں کی منصفانہ پرورش کے لئے تمہیں فلاں طریقہ اختیار کرنا چاہیئے"

اور پھر یہ نہ کہا جاتا کہ عورتوں میں سے جنھیں تم پسند کرو انھیں نکاح میں لاؤ بلکہ یہ کہا جاتا کہ

"یتیم بچوں کی بیوہ ماؤں سے نکاح کرو چاہے وہ تمہیں پسند نہ ہوں کیونکہ بیوائیں خوبصورت ہوں یا بدصورت، جوان ہوں یا ادھیڑ ان سے نکاح بہرحال ضروری ہے کہ اس طرح یتیم بچوں کی پرورش ہوگی۔

اور پھر باندیوں کا ذکر ہرگز نہ آتا کیونکہ اس کا محل ہی نہیں تھا۔

پانچویں بات یہ کہ می لارڈ یہ آیت ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ یہ اجازت پہلے سے موجود تھی۔ اس آیت کے ذریعہ تو چار سے زیادہ بیویوں کی مخالفت کی گئی ہے۔ کتنا ظلم ہے جناب والا! کہ ایک مسلمان قرآن کی کسی آیت کے مقصود و مدعا کو اوندھا کر دے اور سیاق و سباق الفاظ اور شانِ نزول سب کو نظر انداز کرے غلط سلط معنی پر اصرار کرے۔

نزولِ آیت کا صحیح پس منظر

میں عرض کرتا ہوں کہ جس صورتِ حال کے سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی اسے تو خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا ہے۔ احادیثِ صحیحہ میں مذکور ہے کہ یتیم ہو جانے کی بنا پر بعض لڑکیوں کی سرپرستی ان کے کسی عزیز کو مل جاتی اور جو نقد مال انھیں باپ کے ترکے سے ملا ہوتا اس کے علاوہ بھی بعض غیر منقولہ اموال میں وہ اس عزیز کی شریک ہوتیں۔ مثلاً باغ یا زمین یا دکان باپ نے چھوڑی تو یتیم لڑکی اور یہ عزیز دونوں ہی اس میں حصہ دار ہوتے۔ اب کبھی تو ایسا ہوتا کہ زیرِ سرپرستی لڑکی حسنِ صورت کی بنا پر سرپرست کو پسند آتی اور وہ اس سے بہت تھوڑے مہر پر نکاح کر لیتا۔ بیچاری کا کون بیٹھا تھا جو مزاحمت کرتا۔ یا پھر ایسا ہوتا کہ لڑکی بدصورت ہے مگر اچھی خاصی مالدار ہے تو سرپرست سوچتا کہ کہیں اور بیاہ دیا تو مال ہاتھ سے گیا لہٰذا کیوں نہ خود ہی نکاح کر لوں۔ بس اسی نیت سے وہ نکاح کر لیتا اور انس و محبت سے کوئی واسطہ نہ رکھتا۔

اس ظالمانہ صورتِ حال کے لئے اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اے لوگو یتیم لڑکیوں سے نکاح کرتے ہو تو ان کے ساتھ انصاف بھی برتو اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو بھلائی اسی میں ہے کہ دوسری عورتوں میں سے اپنی پسند کے مطابق بیویاں لاؤ۔ ایک لاؤ، دو لاؤ، تین لاؤ۔ چار لاؤ۔ ہاں شرط یہ ہے کہ ان کے حقوقِ واجبہ ادا کرنا بھی تمہارے لئے ممکن ہو۔ اگر تم میں یہ استطاعت نہیں کہ کئی بیویوں کا خرچ برداشت کر سکو تو پھر ایک ہی مناسب ہے اور اگر ایک کی بھی کفالت تمہاری استطاعت میں نہیں تو پھر اپنی جنسی احتیاج ان لونڈیوں سے پوری کر لو جو شرعاً تمہاری ملک ہیں۔

اے کثیر المناقب جج! دیکھ لیجئے بات کیا ہے اور الف کیا بنا رہا۔ مجھے اعتراف ہے کہ آیت اپنے الفاظ کی حد تک صرف اسی مخصوص صورتِ حال میں منحصر نہیں ہے جسے میں نے احادیثِ صحیحہ سے اخذ کیا۔ اور بھی کچھ تفسیریں اہلِ علم نے کی ہیں اور ان سب کی گنجائش اس میں موجود ہے لیکن ایسی کوئی تفسیر و تاویل اس آیت کی نہیں کی گئی اور کی جانی ممکن بھی نہیں ہے جس سے الف کی من گھڑت اور بے جوڑ آفرینی کو برائے نام بھی جواز مل سکے۔ اس سے آپ یہ بھی پوچھیں کہ اگر تیرے دعوے میں دس فیصدی بھی سچائی ہے تو اتنا ہی بتا دے کہ جس پیغمبر پر تجھے ایمان کا دعویٰ ہے اس نے کتنی شادیاں ایسی بیواؤں سے کی تھیں جو اپنے ساتھ چھوٹے یتیم بھی لائی ہوں اور حضورؐ نے ان کی پرورش بھی کی ہو۔ معلوم ہے می لارڈ کہ حضورؐ نے کم سے کم گیارہ شادیاں کی ہیں یہ سب بیوائیں نہیں تھیں اور جو بیوائیں تھیں وہ بھی سب بچوں والیاں نہیں تھیں اور جو بچوں والیاں تھیں ان کے سلسلے میں بھی تاریخ و سیرت شاہد ہے کہ نکاح بچوں کی پرورش کے نقطۂ نظر سے نہیں کیا گیا تھا اور نکاح کے بعد یہ بچے حضورؐ کی اپنی نگرانی میں پرورش نہیں پائے۔ حالانکہ الف ایک سے زیادہ شادی کا جو پس منظر بیان کر رہا ہے اس کی رو سے تو پہلے سے موجود بیوی کے بعد کسی بھی عورت سے پیغمبر کو اسی صورت میں شادی کرنی چاہیئے تھی جبکہ وہ بیوہ ہو اور لائقِ پرورش یتیم بچے بھی رکھتی ہو۔ اور ان بچوں کی پرورش بھی حضورؐ ہی اپنی نگرانی میں کریں۔

حضورؐ کے بعد جب اُن کے صحابہؓ کو دیکھتے ہیں تو وہاں بھی اکثر و بیشتر یہی صورت نظر آتی ہے کہ دوسری اور تیسری بیوی کنواری ہی لائی گئی ہے۔ یا بیوہ ہے تو بچوں والی نہیں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ الف پس منظر کا نام دے کر ایک من گھڑت تاریخ پیش کر رہا ہے اور حقائق کو قطعاً نظر انداز کر گیا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ وہ نہ تو قرآن پر مخلصانہ اعتماد رکھتا ہے نہ پیغمبر کے اسوے سے حسن ظن کی دولت اسے نصیب ہے۔ نہ آخرت کے حساب کی کوئی پرواہ ہے بلکہ وہ عقائد و تصورات ہی اسے عزیز ہیں جو جاہل استادوں اور واہی کتابوں سے اس نے حاصل کئے ہیں۔

میں نے عدالت کے قیمتی وقت کا لحاظ کر کے اپنی تقریر کو دائرۂ اختصار میں رکھا ہے لیکن عدالت اگر مطالبہ کرے کہ میں اپنے ہر ہر ذیلی دعوے کے لئے مفصل شواہد پیش کر دوں۔ مثلاً میں وہ احادیث صحیحہ سامنے لاؤں جن کا اجمالی ذکر کر چکا ہوں یا حضور کی شادیوں کے بارے میں مزید تفصیلات گوش گذار کر دوں تو بلاشبہ میں ہر آن اس کے لئے تیار ہوں۔

رسول اللہؐ کی طرف جھوٹا انتساب

می لارڈ! یہ ایک نمونہ آپ نے دیکھا کہ الف کس جسارت سے اللہ کی کتاب سے کھیل رہا ہے۔ دوسرا نمونہ دیکھئے وہ صفحہ ۲۵ پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھتا ہے:-

"انھوں نے ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ اگر
سو طلاقیں بیک وقت ایک ہی دفعہ میں دی جائیں
تو وہ ایک ہی شمار کی جائے گی۔"

میں چیلنج کرتا ہوں حضور عالی کہ آلف جھوٹا ہے۔ جناب خود ہی ارشاد فرمائیں کہ کیا آپ اپنے کسی تحریری فیصلے میں ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے کسی جج کی طرف آپ ایسے قول کی نسبت بھی کر سکتے ہیں جس کی تحقیق آپ کو نہ ہو۔ اور محض کسی راستہ چلتے سے اسے سن لیا ہو؟ حالانکہ آپ میں اور اعلیٰ عدالتوں کے ججوں میں مراتب کا اتنا بڑا فرق نہیں ہے جتنا غلام اور آقا یا پیغمبر اور امتی میں ہوتا ہے لیکن پھر بھی میں یقین کرتا ہوں کہ آپ یا کوئی بھی ذمہ دار جج ایسی جسارت نہیں کر سکتا لیکن الف کو دیکھئے کہ وہ کس بے تکلفی سے اپنے پیغمبر کی طرف ایک خانہ زاد قول منسوب کر رہا ہے۔ ذمہ داری کا ذرا بھی احساس اس کے اندر ہوتا تو اس کے لئے یہ تحقیق کر لینے میں کوئی دشواری نہیں تھی کہ یہ قول پیغمبر کا ہے بھی یا نہیں۔ اگر وہ عربی نہیں جانتا تو خدا کے فضل سے اس کی مادری زبان ہی میں حدیثوں کے مجموعے ہر جگہ دستیاب ہیں۔ وہ کسی مستند مجموعے میں کتاب الطلاق کھول کر ایک ہی مختصر نشست میں اطمینان کر سکتا تھا کہ میں جو حدیث راہ چلتے سن آیا ہوں وہ واقعۂ حدیث ہے یا ایجادِ بندہ۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور بلا تکلف لکھ دیا کہ ایک بار رسول اللہ نے یہ بھی فرمایا تھا

غلط ہے می لارڈ! ایسا حضورؐ نے کبھی نہیں فرمایا۔ اس سے کہیے وہ کتاب لائے جو اس کی تصدیق کر سکے۔ یہ جانتا ہے کہ رسول اللہؐ کی طرف غلط طور پر کوئی بات منسوب کرنا شدید گناہ ہے اس کے باوجود اس گناہ کا بے خوفی سے ارتکاب کرنا اس کے سوا کیا معنی رکھتا ہے کہ اس شخص سے کسی معاملہ میں حقیقی دیانت اور احساسِ ذمہ داری اور خوفِ خدا کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس نے دین و شریعت کو کھلونا سمجھ لیا ہے۔

شریعت کے خلاف گواہوں کی کمک

تیسرا نمونہ ملاحظہ ہو:-

صفحہ ۱۹ پر آلف نے اپنے اس باطل خیال کو تقویت پہنچانے کے لئے کہ کثرتِ ازدواج پر پابندی لگانا ہی عین انصاف ہے جسٹس ڈھون کی رولنگ نقل کی ہے جس میں یہ فقرہ ہے۔

"پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی
کرنا اس پر سراسر ظلم ہے۔"

جسٹس ڈھون غیر مسلم ہیں لہٰذا وہ جو بھی رائے رکھیں اس

یہ بحث اس مقدمے سے تعلق نہیں رکھتی۔ لیکن آلف سے پوچھئے کہ وہ کس قسم کا مسلمان ہے کہ ایک غیر مسلم کے ایسے قول کی تائید و تحسین کر رہا ہے جس کا صاف مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اکثر انبیاء ظالم تھے اور محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم تو نعوذ باللہ سب سے ہی بڑے ظالم تھے کہ بیک وقت بہت سی بیویاں آپ کی زوجیت میں رہیں۔

اللہ اللہ۔ ایک مسلمان اور اس کی یہ روش۔ الف سے کہئے می لارڈ کہ اسلام سے آخر وہ کیوں چڑا ہوا ہے، اگر اس کی نظر میں پیغمبر اسلام کی یہی توقیر ہے۔ غضب ہے کہ جس رسول کو وہ اپنا آقا اور مطاع اور سردار مانتا ہے اسی کے اسوے اور کردار کو داغ دار ثابت کرنے کے لئے کفار تک سے استشہاد کرنے اور حجت پکڑنے میں دریغ نہیں کرتا۔ توہین و تحقیر کی یہ وہ قسم ہے می لارڈ جس سے ارذل قسم کا تصور بھی شاید نہ کیا جا سکے۔

آگے ایک اور مسئلہ میں آلف اہانت کا کم و بیش ایسا ہی اسلوب اختیار کرتا ہے وہ صفحہ ۴۴ پر لکھتا ہے۔

"حال ہی میں کیرالہ ہائی کورٹ کے جج جناب خالد صاحب نے شوہروں کے اس غیر محدود طلاق دینے کے حق کو وحشیانہ قرار دیا ہے۔"

میں عرض کرتا ہوں کہ شوہروں کو طلاق دینے کی آزادی اگر حاصل ہے تو اس میں علماء کا کوئی قصور نہیں بلکہ وہ تو اللہ کی دی ہوئی ہے جیسے آیت قرآنیہ میں واضح کر دیا گیا۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے بتایا کہ عقد و نکاح مرد کے ہاتھ میں ہے وہ اس گرہ کو بندھی رہنے دے یا کھول ڈالے۔ پھر صاحب قرآن صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی شوہر کی اس آزادی کو سلب نہیں کیا حالانکہ ان کی نظر میں طلاق جائز چیزوں میں سے بدترین چیز تھی اور حالانکہ وہ ہزار خالدوں اور ڈھونوں سے بڑھ کر عورتوں کے سچے ہمدرد تھے اور انہیں یہ مقام بھی حاصل تھا کہ وہ کچھ فیصلہ دیں اسے لازماً تسلیم کیا جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ طلاق دینے میں شوہر کا آزاد ہونا اللہ اور رسول کی مرضی کا مظہر ہے۔ اب اگر خالد صاحب اسے وحشیانہ قرار دیتے ہیں تو ان کا کوئی شکوہ نہیں کیونکہ انہوں نے تھوڑی بہت اسلامی معلومات جن درسگاہوں سے حاصل کی ہیں وہاں تو حدود کو وحشی قرار دینا فیشن میں داخل ہے۔ چوری کی سزا، زنا کی سزا، شراب نوشی کی سزا ان سب کے بارے میں ظالمانہ اور وحشیانہ ہونے کا فتویٰ صادر کیا جا چکا ہے لہٰذا طلاق ہی کے معاملے میں ان کو کیا ٹوکا جائے۔ مگر شکایت آلف کے طرزِ عمل سے ہے جو خدا اور رسول کو نعوذ باللہ وحشی قرار دینے والوں کو مسندِ امامت پر بٹھا کر ان کے کلام سے حجت پکڑ رہا ہے۔

شریعت کا قانونِ وراثت ناقص ہے

چوتھے نمونے پر نگاہ ڈال لیجئے۔

قانونِ وراثت کی بحث میں صفحہ ۲۸ پر آلف کہتا ہے

"ضروری ہے کہ قانون میں واضح اصلاح کی جائے اور مرحوم بیٹے کی اولاد کو دوسرے بیٹے کے مساوی حصہ دیا جائے۔"

میں عرض کر آیا ہوں کہ دیباچے میں اس نے یہ بات محض مغالطہ دینے کے لئے کہی ہے کہ میں اور میرے ترقی پسند ہمنوا قانونِ الٰہیہ میں ترمیم نہیں چاہتے بلکہ بدعات و نقائص کا ازالہ چاہتے ہیں۔ اس عبارت میں اس نے خود ہی اس کی تصدیق کر دی۔ وہ جس قانون میں "واضح اصلاح" کا طالب ہے وہ کسی ایسی بدعت سے عبارت نہیں جو غلط رسم و رواج کے ذیل میں چل نکل ہو۔ بلکہ وہ ایک ایسا قانون ہے جس کی پشت پر اللہ کی کتاب اور رسول کی حدیثیں اور چودہ سو سال کے تمام علماء دین اور واقفانِ قانونِ شریعت اس پر متفق الرائے ہیں اسے ناقص اور ضرر رساں قرار دے کر اصلاح کی خواہش کا اظہار یہ معنی رکھتا ہے کہ عین قانونِ الٰہیہ ہی میں ترمیم مطلوب ہے وہیں اس

ڈھٹائی اور جسارت کا بھی مظہر ہے کہ الف کی نظر میں ماہرینِ علومِ شریعت کی وقعت تو کجا خود شریعت کی کوئی وقعت نہیں ہے اور وہ خدا اور رسول تک کے بارے میں یہ خیال رکھتا ہے کہ قانون سازی میں ان سے غلطیاں ہوئی ہیں۔

ستم ہے سرکارِ عالی ——— ستم در ستم کہ الف بیس سال سے مسلم پرسنل لا کے مقدمے طے کر رہا ہے اور اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ اسلامی قانونِ وراثت کی عمارت کن اصولوں پر کھڑی ہے اور اصلاح کے نام پر وہ ایک ضابطۂ شرعی میں جس تغیر کو ضروری ٹھہرا رہا ہے وہ اس عمارت کو ڈھا دینے کی کیسی بھونڈی کوشش ہے۔

قرآن سے کھلا انحراف

پانچواں نمونہ می لارڈ میں ایسا پیش کرتا ہوں جسے پیش کرتے ہوئے میری زبان کانپ رہی ہے اور دل اچھل کر حلق میں آ جانا چاہتا ہے۔ الف لکھتا ہے :-

"اسلامی قانون کے مطابق شوہر کے ترکے میں سے اولاد کے ہوتے ہوئے بیوہ کو صرف ⅛ حصہ ملتا ہے جو بعض اوقات کثیر الاولاد ہونے کی وجہ سے برائے نام رہ جاتا ہے۔ قانونِ میرج ایکٹ کے تحت نصف حصہ پانے کی مستحق ہو جاتی ہے اس لئے بیوہ کا حصہ اتنا کم ہو کہ اس سے گذارہ نہ ہو سکے تو قانون میں اتنی لچک کی ضرورت ہے کہ اس کے گذارہ کے مطابق اس کا حصہ بڑھا دیا جا سکے" (صفحہ ۲۹)

میرے خدا ——— آج وقت بھی آ گیا کہ اسلام کا دعوٰہ رکھنے والا ایک بندہ خدا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے کہ تو نے بچوں والی بیواؤں کو ہمیشہ کے لئے صرف آٹھویں حصے کا حقدار قرار دے کر غلطی کی۔ تجھے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ کبھی کبھی بیوہ زیادہ بچوں والی بھی ہوتی ہے اور آٹھواں حصہ اسے کفایت نہیں کرتا لہٰذا ایسی صورت میں اسے آٹھواں نہیں بلکہ آدھا ملنا چاہئے بلکہ یہ گنجائش ہونی چاہئے کہ ہم مناسب سمجھیں تو اور بھی زیادہ دے دیں۔

می لارڈ! میں فریاد کرتا ہوں۔ میں التجا کرتا ہوں کہ خدا کی اس توہین و تنقیص کو آپ بھی محسوس فرمائیں۔ آپ سے مخفی تو نہ ہوگا کہ اللہ کا ناطق حکم یہ ہے۔

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ	اگر تمہارے اولاد نہ ہو تو تمہاری
إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ	بیویوں کو تمہارے ترکے سے
فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ	چوتھا حصہ ملے گا اور اگر اولاد
فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ	ہو تو آٹھواں۔

(النساء۔ آیت ۱۲)

یہ کس کا فرمان ہے آپ ہی کہئے۔ آپ ہی کہئے محترم منصف! میری تو روح پر لرزہ طاری ہے کہ ہائے آج اسی دن کے لئے مجھ تیرہ بخت کو زندہ رہنا تھا کہ ایک مسلمان بھائی میری آنکھوں کے آگے خدا کو سبق پڑھانے کی جسارت کرے اور میں بس خون کے گھونٹ پیتا رہ جاؤں۔

اور یہ وہ شخص ہے جو بڑے معصوم لہجے میں یہ بھی کہے چلا جا رہا ہے کہ میں قانونِ الٰہیہ میں ترمیم کا خواہاں نہیں ہوں۔ میں خدا اور رسول سے سرکشی نہیں کرتا۔ مجھے مومن و مسلم ہی مانا جائے دہائی ہے اے دیدہ ور منصف! کیا اس سے بڑھ کر بھی قانونِ الٰہیہ میں ترمیم و تنسیخ کی کوئی مثال ہو سکتی ہے۔

بے محل نہ ہوگا اگر ایک نظر الف کی تجویز کے عقلی و منطقی پہلو پر بھی ڈال لیں۔ زید اگر اتنے کم عمر بچے چھوڑ کر مرتا ہے جن کی پرورش اور کفالت بیوہ کو کرنی ہے تو اس کے ترکے میں کیا ان بچوں کے حصے نہیں ہیں؟ کیا بیوہ کو آٹھواں حصہ ملنے کے بعد باقی مال اور کہیں چلا جائے گا۔ فرض کیجئے زید نے چھ بچے چھوڑے جن میں صرف ایک بالغ ہے اور پانچ نابالغ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس میں کتنے لڑکے

ہیں اور کتنی لڑکیاں۔ ہر صورت میں صرف بالغ بچہ اپنا حصہ الگ کر سکتا ہے۔ باقی مال سب کا سب وہیں رہے گا کل میں سے آٹھواں بیوہ کا ذاتی ہے اور باقی ان بچوں کا۔ بتائیے پھر کیا مفاد ہوا آلف کی تجویز کا؟ بچے زیادہ ہوں یا کم۔ اگر باپ نے مال چھوڑا ہے تو بہرحال وہ ان ہی کا ہے اور ذوی الفروض کے حصے دینے کے بعد کوئی اور اس کا مالک نہیں۔

اگر آلف کا مطلب یہ ہو کہ بچوں کے حصوں پر مرنے والے کے بھائی قبضہ کرلیں گے اور بیوہ کے پاس فقط اس کا اپنا حصہ رہ جائے گا تو وہ یہ کیوں نہیں سوچتا کہ کفالت بھی تو پھر ان ہی افراد کے ذمے ہوگی جنھوں نے بچوں کے حصوں پر قبضہ کیا ہے بہرحال ان بچوں کا حصہ کوئی ناجائز طور پر دبالے اور بچوں کی کفالت کا بار ماں ہی پر پڑ رہا ہے تو یہ ایک ظلم ہوگا جس کی دادرسی کے لئے پہلے ہی قانونِ شرعی موجود ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر مرنے والے کے قریبی اعزا ایسے ہی ظالم ہیں جو خلافِ قانون طور پر یتیم بچوں کے حصے دبا سکتے ہیں تو پھر ان سے یہ توقع کیوں کرلی گئی کہ وہ بیوہ کا حصہ نہیں دبائیں گے۔ آلف آٹھویں سے زیادہ کی بات کرتا ہے۔ وہ تو آٹھواں کیا پھوٹی کوڑی بھی نہیں دیں گے۔ کچھ ڈاکو اگر موقع پاکر ایک تجوڑی توڑ ڈالیں تو یہ کون بے وقوف امید کرسکتا ہے کہ وہ نوٹوں کی صرف گڈیاں اٹھائیں گے جو ان کے یتیم بھتیجوں کی ہے اور وہ گڈی چھوڑ جائیں گے جس پر بیوہ بھاوج کا نام لکھا ہے۔

یتیم بھتیجوں کے سلسلے میں جو لوگ شقی ہوں بھاوج کے سلسلے میں ان کا زیادہ شقی ہونا محتاجِ دلیل نہیں۔ کوئی بھی عملی فائدہ نہیں اُس تجویز کا جو آلف پیش کرتا ہے ہاں نقد نقصان یہ ضرور ہے کہ اس نے قانونِ الٰہی کی تحقیر کی اور خدا کا استاد بن جانا چاہا۔

یہ ہیں وہ نمونے عالی جاہ جن سے ہر ایک آلف کے ایک فاسد طرزِ فکر کا کھلا مظہر ہے۔ اب میں ایک اور بنیادی خرابی کی طرف آپ کو توجہ دلاؤں گا۔ وہ یہ کہ الف تحقیق اور حقیقت پسندی کو اہمیت دینے کے بجائے مفروضات سے کام چلانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا مثلاً اس نے ایک طرف خواہ مخواہ یہ فرض کرلیا ہے کہ نکاح و طلاق کے تمام جھگڑوں میں سارا قصور مردوں ہی کا ہوتا ہے اور عورتیں ہر حال میں مظلوم ہی ہوتی ہیں۔ اسی مفروضے کو حقیقت ثابتہ مان کر فکر و نظر کے تانے بانے پھیلاتا اور اصلاحی تجاویز پیش کرتا ہے۔

دوسری طرف اس نے وراثت، نکاح اور طلاق کے مسائل میں یہ معلوم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی کہ ان کی نظریاتی بنیادیں اور وضعی نوعیتیں اسلام میں کیا ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہ معاملات کی اسلامی روح تک پہنچتا ہے نہ مسائل کی تہہ تک۔

میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ می لارڈ وراثت کے قوانین ہوں یا نکاح و طلاق کے ان کی وضعی اور جوہری نوعیت اسلام اور غیر اسلام کے مابین بڑا فرق ہے۔ مثلاً نکاح غیر مسلمین کے یہاں خصوصاً ان مغربی مفکرین کے یہاں جن فکر سے آلف متاثر ہے محض ایک معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے جو عورت اور مرد کے درمیان اسی طرح طے پاتا ہے جس طرح دوسرے دنیاوی معاملات طے پاتے ہیں۔ اس میں تقدیس یا تعبد کا کوئی عنصر شامل نہیں۔ اسی لئے یہ حضرات اس معاہدے کے اختیار اور عدمِ اختیار میں دونوں فریق کو مساوی درجہ دیتے ہیں اور مرد کے تفوق کے قائل نہیں ہیں۔

نکاح وطلاق کی اسلامی نوعیت

اس کے برخلاف اسلام میں نکاح خالی ایک معاہدہ ہی نہیں ہے، عبادت بھی ہے۔ شارع علیہ السلام

نے فرمایا کہ نکاح میری سنت ہے جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ۔ اور آپ نے فرمایا تم میں سے جو نکاح کی استطاعت رکھتا ہو وہ ضرور نکاح کرے ۔ ظاہر ہے نکاح کوئی ایسی چیز نہ تھی جو پہلی بار صرف حضورؐ ہی نے شروع کی ہو ۔ وہ تو پچھلے تمام انبیاء کی شریعتوں میں موجود تھی ۔ اس کے باوجود حضورؐ کا اسے اپنی سنت کہنا یہی معنیٰ رکھتا ہے کہ اس معاہدے کو دوسرے دنیاوی معاہدات و معاملات پر قیاس مت کرو بلکہ اسے عبادت سمجھو جس سے گریز و فرار موجبِ گرفت ہوگا ۔ آپ جانتے ہی ہیں جناب عالی کہ اسلامی شریعت میں کوئی نکاح دو گواہوں کے بغیر منعقد نہیں ہوتا ۔ حالانکہ خرید و فروخت یا قرض لین دین یا تجارت و استجارت کے کسی بھی معاہدے کے لئے دو گواہوں کی شرط اسلام نے عائد نہیں کی ۔ یہ فرق اسی لئے ہے کہ معاہدۂ نکاح اپنی وضعی اور جوہری نوعیت میں دوسرے دنیاوی معاہدات سے مختلف ہے ۔

پھر اس معاہدے کے دونوں فریق کو اسلام مساوی سطح پر ہرگز نہیں رکھتا بلکہ ہر ایک کی ذمہ داریاں اور حقوق و فرائض الگ الگ تجویز کرتا ہے ۔ مرد کی حیثیت اس معاہدے میں ایک خریدار کی ہے جو عورت سے مال کے بدلے اس کے جسم پر تصرف کا حق خریدتا ہے اس مال کو "مہر" کہتے ہیں ۔ مہر کے بغیر کوئی نکاح منعقد ہوتا ہی نہیں حتیٰ کہ اگر مہر کا تعین یا تذکرہ کئے بغیر نکاح کر لیا گیا تب بھی شریعت کہتی ہے کہ مرد پر مہرِ مثل عائد کر دیا جائے گا اور جو مرد دل میں یہ نیت رکھے کہ میں مہر ادا نہیں کروں گا اسے شریعت انتہائی گنا ہگار ٹھیراتی ہے ۔ بہر حال نکاح کی یہ بنیادی نوعیت ملحوظ رکھی جائے تو یہ بات آپ سے آپ صاف ہو جاتی ہے کہ طلاق کا مکمل اختیار بلا شبہ مرد ہی کو ہونا چاہیئے ۔ طلاق آخر فسخ نکاح ہی کا نام ہے ۔ فسخ نکاح کا مطلب اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ شوہر نے اپنے حق سے دست برداری دیدی جس کو اس نے مال کے بدلے حاصل کیا تھا ۔ کھلی بات ہے کہ کسی حق کو قائم رکھنے یا اس سے دست بردار ہونے کا اختیار ساری دنیا صاحبِ حق ہی کو عطا کرتی ہے ۔ دنیا کہیں کوئی مہذب قانون ایسا نہیں جو یہ کہتا ہو کہ جس فرد نے اپنی کوئی شئے فروخت کر دی ہے اسے بھی یہ اختیار حاصل ہو کہ جب چاہے اس شئے کو واپس لے لے اور خریدنے والے کو بے حق کر دے نہ ایسا کوئی قانون ہے جس کی رو سے ایک شئے کے جائز مالک کا اختیار حکومت یا کسی ادارے یا فرد کی طرف منتقل ہو جائے ۔

میں مثال سے اپنا مفہوم واضح کروں گا ۔ زید بکر سے ایک مکان خریدتا ہے اور خریداری کے لئے جتنے ضابطے مقرر ہیں ان سب کی تکمیل کر کے اس مکان کو اپنی رہائش گاہ بنا لیتا ہے ۔ اب کیا کوئی قانون یا تصورِ انصاف بکر کے لئے یہ حق تسلیم کر سکتا ہے کہ وہ جب جی چاہے زید کو مکان سے نکال دے اور صاف صاف کہہ دے کہ تمہارا حقِ ملکیت ختم اب کسی اور کو یہ مکان بیچوں گا ؟ ۔ نہیں یہ صریحاً ناقابلِ تسلیم ہے اور سوائے یہ کہنے کے چارہ نہیں کہ بکر کا اختیار ختم ہو چکا ۔ اسی کے ساتھ یہ بھی مسلم ہے کہ زید جب تک چاہے اس مکان میں رہے اور جب چاہے اسے خالی کر کے یہ اعلان کر دے کہ میں اپنے حق سے دست بردار ہوتا ہوں اور بکر کو اختیار دیتا ہوں کہ وہ اس مکان کو پھر سے اپنا سمجھے اور جہاں چاہے فروخت کرے ۔ ایسا کوئی قانون آپ کے یہاں نہیں جو حق سے دست بردار ہونے کی یہ آزادی سلب کرتا ہو ۔ آپ مقروض کو یہ اختیار تو ہرگز نہیں دیتے اور نہیں دے سکتے کہ وہ چاہے ادائیگی کرے چاہے تو نہ کرے لیکن قرض خواہ سے یہ سلب نہیں کرتے کہ وہ اپنا قرض وصول کرنے نہ کرنے کا مختار رہے ۔ اس کا جی چاہے تو معاف بھی کر سکتا ہے ۔

اسی طرح تمام معاملات میں عقلِ عام اور قانون و آئین ہمیشہ سے یہ کہتے آئے ہیں اور آج بھی یہی کہتے ہیں کہ

کسی شے پر حق قائم کرنے کے لئے تو طرح طرح کی شرطیں عائد کی جاسکتی ہیں مگر حق سے دست بردار ہونے کے لئے شرائط خارج از بحث ہیں۔ کوئی بھی شخص اپنے حق سے جب چاہے ہاتھ اٹھا سکتا ہے اور اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہاتھ اٹھانے کے لئے وہ حکومت یا کسی دوسرے ادارے کی اجازت کا محتاج ہو۔

جائدادوں اور کارخانوں اور مکانوں کے سلسلے میں روز ہی طرح طرح کے جھگڑے اور قضیئے پیش آتے ہیں خرید و فروخت اور لین دین کے معاملات میں قسم قسم کے مناقشات عام ہیں ان میں انصاف کرنے کے لئے قوانین موجود ہیں اور بوقت ضرورت نئے قوانین بھی بنتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا آج تک ایسا قانون بھی بنایا گیا ہے جس کی رو سے کوئی شخص یہ اعلان نہ کرسکے کہ میں نے اپنا قرض معاف کیا یا اس مکان کو چھوڑے دیتا ہوں جو نزاع پیدا کر رہا ہے یا میں اس زمین کو جسے میں نے پیسے دے کر خریدا تھا مالک کو لوٹاتا ہوں اور اس سے کوئی پیسہ طلب نہیں کرتا۔

صاف ظاہر ہے می لارڈ کہ ایسا کوئی قانون نہ بنا ہے نہ بنانے کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن نکاح و طلاق کی اسلامی نوعیت اور حقیقت کو ٹھیک طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آلف ایسا ہی قانون بنوانے کا طالب ہے اور مرد اگر طلاق کے اصطلاحی الفاظ میں اپنے اس حق سے دست برداری کا اعلان کرتا ہے جو اُس نے مہر کے بدلے حاصل کیا تھا تو آلف اسے بیوی کی حق تلفی قرار دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ شوہروں کی آزادی سلب کرلی جائے۔

کتنی واضح مثال ہے می لارڈ کہ اگر کسی شخص کی زندگی کے لئے اس کے بدن میں خون داخل کرنے کی ضرورت ہے تو ایسا ہی خون داخل کیا جائے گا جو ماہرین فن کے میڈیکل ٹیسٹ کے بعد اس شخص کے لئے موزوں ہو۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ جو بھی خون ہاتھ آئے وہ بلا تامل داخل کردیا جائے۔ ایسی جلدبازی اس شخص کو یا تو زیادہ مریض کردے گی یا موت ہی کے گھاٹ اتار دے گی۔

ٹھیک اسی طرح قوانین کے مجموعے میں اصلاح کی غرض سے ایسا ہی کوئی قانون داخل کیا جاسکتا ہے جو اس مجموعے کے مزاج اور جوہر اور کیمیائی عناصر سے مناسبت رکھتا ہو اگر وہ مناسبت رکھنے کے بجائے متصادم اور متخالف ہو تو ظاہر ہے کہ ثمرہ اور انتشار اور پراگندگی کے سوا کچھ بھی نہ نکلے گا۔

اسی لئے میں عرض کرتا ہوں کہ بیویوں پر شوہروں کی کسی بھی زیادتی کا علاج اس رخ سے سوچنا شوہروں سے حقِ طلاق چھین کر کسی اور کے سپرد کردیا جائے اصلاح نہیں بلکہ نکاح کی وضعی نوعیت ہی کو بدل ڈالنا ہے اور اسلامی تصورات سے نکال کر اسے غیر اسلامی سطح پر لے آنا ہے اور اسی طرح کسی رشتہ دار کو مالی نفع پہنچانے کی غرض سے ایسی کوئی تجویز پیش کرنا جو اسلامی قانونِ وراثت کے رہنما اصول کے خلاف ہو اصلاح نہیں بلکہ تخریب اور فساد انگیزی ہے۔ اگر آلف یہ سمجھتا ہے کہ کسی ظلم کو دفع کرنے کے لئے اسلامی قوانین کی جڑیں کھودنا بھی روا ہے تو اس سے کہیے کہ مسلمان ہی کہلائے جانے کا تکلف آخر کیوں۔ کھل کر کیوں نہیں کہتا کہ میں نہ وحی کا قائل ہوں نہ خدا اور رسول کو عیب و خطا سے پاک تصور کرتا ہوں۔ مجھے تو اپنے ہی عقلِ کل ہونے کا دعویٰ ہے اور میں ظلم اور انصاف کی تشخیص میں قرآن یا حدیث کی پروا نہیں کرتا۔

کثرتِ ازدواج

جنابِ عالی! اب میں چاہتا ہوں کہ براہِ راست بھی ان بعض خیالات پر گفتگو کروں جنھیں الف نے مختلف عنوانات کے تحت پیش کیا ہے۔

سب سے پہلے وہ کثرتِ ازدواج پر اظہارِ خیال کرتا ہے

اس سلسلے میں مجھے زیادہ زور اسی نکتہ پر دینا ہے جس کا اجمالی ذکر کر آیا ہوں یعنی یہ کہ الف کے غور و فکر کی سمت اور بنیاد ہی غلط ہے۔ وہ ایک سے زائد بیویوں کو خواہ مخواہ ایک بُرائی فرض کر کے باب اجتہاد کھولتا ہے اسے بنا ء الفاسد علے الفاسد کے سوا کیا کہا جائے۔ ایسا تو نہیں کہ عورتیں راستوں میں پھر رہی ہوں اور مسلمان زبردستی پکڑ پکڑ کر انھیں بیویاں بنا رہے ہوں۔ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے کوئی شخص دوسری بیوی لاتا ہے تو یہ بیوی اپنی اور اپنے سرپرستوں کی مرضی سے آتی ہے۔ مردوں سے کثرتِ ازدواج کا حق چھیننا صرف مردوں ہی کی حق تلفی نہیں بلکہ عورتوں پر بھی بے جا پابندی ہے۔ انھیں یہ حق آخر کیوں نہ ہو کہ ضرورت سمجھیں تو کسی ایسے مرد سے شادی کر لیں جس کی پہلی بیوی موجود ہو۔ کثرتِ ازدواج کے مخالفین نے مغرب کی تقلید میں صرف یہ تو رٹ لیا ہے کہ مرد دوسری بیوی تفریحِ طبع کی خاطر لاتے ہیں اور عیاشی و بوالہوسی کے سوا ان کا کوئی مطمحِ نظر نہیں لیکن ان تمام جائز مصالح اور مقتضیات کو نظر انداز کر دیا ہے جو عموماً دوسری شادی کی وجہ بنتے ہیں اور جن میں صرف مرد ہی کی نہیں عورت عورت کی بھی فلاح مضمر ہوتی ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ جس لڑکی یا عورت کو غیر شادی شدہ اچھا مرد میسر آسکتا ہو وہ اور اس کے سرپرست آخر کسی شادی شدہ مرد سے کیوں رشتہ جوڑیں گے۔ ایسا رشتہ اسی وقت جوڑا جاتا ہے جب دوسرا بہتر رشتہ موجود نہیں ہوتا اور لڑکی یا اس کے سرپرست سمجھتے ہیں کہ فلاں شخص کی دوسری بیوی بن جانے میں بھی فائدہ ہی ہے۔ اب اس کا کیا علاج ہے کہ الف جیسا ذہن رکھنے والے لوگ حقائق ثابتہ اور مصالح قویہ کو نظر انداز کر کے مرد کی صرف پہلی بیوی کے جذبات کو ہر شے پر مقدم کرتے ہیں اور ان عورتوں کے جذبات و ضروریات کا لحاظ نہیں کرتے جو جبراً نہیں بلکہ خوشی سے دوسری بیوی بن جانا چاہتی ہیں۔

رہا یہ کہ شوہر دوسری بیوی لا کر پہلی بیوی کے حقوق واجب کو تلف کرنے لگے تو یہ مسلم پرسنل لا کا قصور نہیں مسلم پرسنل لا تو شدت سے ہدایت دیتا ہے کہ کسی بیوی کی حق تلفی نہ ہو اور اگر ہو گی تو اس بیوی کو حق ہو گا کہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ اب اگر کچھ مرد اس ہدایت کو نظر انداز کرتے ہیں تو مسلم پرسنل لا کی کھال کھینچنے کے بجائے ضرورت نظامِ عدل میں ایسی اصلاحات کی ہے جن کے زیرِ سایہ مظلوم عورت آسانی سے ظالم شوہر کا مزاج درست کر سکے اور شوہر مجبور ہو کہ یا تو حقوق ادا کرتا رہے یا مظلومہ کو آزاد کرے۔

بیویوں میں عدل کا مسئلہ

اور اس سلسلے میں جو کہا جاتا ہے کہ قرآن بیویوں میں عدل کی شرط لگاتا ہے اور عدل چونکہ عملاً ممکن نہیں ہے اس لئے ایک سے زائد بیوی کا جواز نہیں یہ ایک فریب کاری ہے جو قرآن کو دیدہ دانستہ نظر انداز کر کے کی جاتی ہے۔ جس قرآن نے بیویوں کے درمیان عدل کی قید لگائی ہے وہی یہ بھی کہتا ہے کہ :-

> "تم ہرگز عدل نہ کر سکو گے بیویوں کے مابین
> خواہ اس کی کتنی ہی کوشش کرو تو ہماری ہدایت
> تمہیں یہ ہے کہ اصلاحِ حال کی کوشش بہر حال
> کرتے رہو اور ایسا نہ ہو کہ ایک بیوی سے اتنے
> بے پروا بن جاؤ کہ وہ ادھر میں لٹکی رہے۔
> (سورۂ نساء۔ آیت ۱۲۹)

اس سے معلوم ہوا کہ پورا عدل ممکن نہ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کئی بیویوں کی ممانعت نہیں فرماتا بلکہ اجازت دیتا ہے اور اسے کافی سمجھتا ہے کہ جتنا عدل آدمی کی قدرت میں ہو کرے اور ہر بیوی سے اتنا تعلق ضرور رکھے جو حقوقِ ضروریہ ادا کرنے کے لئے کافی ہو۔

ہر ذی علم جانتا ہے کہ جہاں تک محبت اور قلبی رغبت

تعلق ہے اس میں مساوات نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی ممکن نہیں تھی۔ آپ کو جو گہری جذباتی وابستگی حضرت عائشہؓ سے رہی کسی سے بھی نہ رہی لیکن معلق کرکے آپ نے کسی زوجہ کو نہیں ڈالا۔ لہٰذا کوئی شک اس میں نہیں کہ متعدد بیویوں میں جس عدل کو ضروری قرار دیا گیا ہے وہ حقوق واجبہ کی ادائیگی ہے نہ کہ جذباتی تعلق کی مساوات۔ حقوق واجبہ کی ادائیگی بہرحال ممکن ہے اور واقع بھی لہٰذا تعددِ ازدواج پر پابندی عائد کرنا قرآن وسنت کی مخالفت ہی ہے نہ کہ اصلاح۔ رہے وہ لوگ جو دوسری بیوی لاکر پہلی بیوی کو معلق ڈال دیتے ہیں تو مسلم پرسنل لا کب کہتا ہے کہ پہلی بیوی گھٹ گھٹ کر مرتی رہے اور کوئی دفاعی قدم نہ اٹھا سکے۔ وہ تو کہتا ہے کہ وہ عدالت میں فریاد لے جائے اور عدالت شوہر کو مجبور کرے کہ یا تو وہ حقوق واجبہ ادا کرتا رہے ورنہ بیوی کو آزاد کر دے۔

مردوں سے ناانصافی

آلف یہ بھی لکھتا ہے:-

"میرے علم میں ایسی مثالیں ہیں کہ دوسری شادی پہلی بیوی کو طلاق دے کر محض تفریح طبع یا حصولِ دولت کے لئے کی جاتی ہے اور پہلی بیوی اور اس کے بچوں کے مستقبل کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس لئے میرے خیال میں قانون میں اصلاح کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی دوسری شادی پر پابندی لگادی جائے۔"

گویا چڑ صرف اسی سے نہیں کہ کوئی شخص بیک وقت ایک سے زائد بیویاں رکھے بلکہ یہ بھی مطالبہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ناپسندیدہ بیوی کو چھوڑ کر دوسری کسی عورت کو بیوی بنا ہی نہ پائے جب تک حکومت اجازت نہ دے دے۔ یہ دراصل ذہن کا وہی بگاڑ ہے جس کا میں ذکر کر آیا ہوں۔ آلف یہ ماننے والا نہیں کہ شوہر طلاق دے کر اپنے حق سے دست برداری دیتا ہے نہ کہ عورت کا کوئی حق چھینتا ہے۔ حالانکہ اسلام کا مسلمہ نظریہ یہی ہے آلف چونکہ اس نظریہ سے متفق نہیں بلکہ اسے سمجھنے کی کوشش ہی اس نے نہیں کی اس لئے وہ برابر اس پر زور دیئے چلا جارہا ہے کہ طلاق دینا عورت پر ظلم ہے۔

پھر مائی لارڈ! اس پر بھی غور کیا جائے کہ آلف ایسی مثالوں کا ذکر کر رہا ہے جن میں بچوں والی عورتوں کو طلاق دی گئی ہے۔ میں کہتا ہوں بچوں والی بیویوں کو بہت کم شوہر طلاق دیتے ہیں اور جو دیتے ہیں وہ ایسی ہی صورتوں میں دیتے ہیں جبکہ بیوی کی بعض خصلتیں قطعاً ناقابل برداشت ہوتی ہیں اور باوجود تنبیہ وتادیب کے وہ کسی طرح اپنی روش نہیں بدلتی ہے۔ پھر ایسی صورت میں بھی شوہر بچوں سے بالکل ہی بے تعلق نہیں ہو جاتا کیونکہ بہرحال اس کے لختِ جگر ہیں اور قدرتی محبت اس کے اندر موجود ہے اگر واقعی ایسے کچھ لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنے بچوں کے مستقبل کو بالکل ہی نظر انداز کر دیں اور ان کی پرورش میں کوئی حصہ نہ لیں تو یقین کیجئے کہ ان سے اس صورت میں بھی کوئی اچھی توقع نہیں کی جاسکتی جبکہ وہ طلاق نہ دیں اور بچے ان کے گھر ہی میں رہیں۔ کیا آپ ایسے بہتیرے لوگوں کو نہیں جانتے جن کے بچے گلیوں میں پھرتے ہیں۔ باپ کو ان کی تعلیم وتربیت کا ذرا فکر نہیں ہوتا کیسا مستقبل وہاں تو حال تک کی پروا نہیں۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے اس سے کہ بیوی کو طلاق دیں یا گھر میں رکھیں۔

ایسی مثال بہت ہی شاذ ہو سکتی ہیں کہ کوئی بال بچوں والا آدمی معقول وجوہ کے بغیر محض عیاشی کے نقطۂ نظر سے بچوں والی بیوی کو طلاق دے دے اور بچے لاوارث بنے پھریں اگر ان کا وقوع مان بھی لیا جائے تو پھر بھی آلف کے موقف کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

اول یوں کہ گنتی کے چند سفاک اور بے حس لوگوں کی غلط روش کا بدلہ تمام مردوں کے جائز حق کو ضبط کرکے لینا معقولیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ کیا نادر الوقوع امکانات بھی مفادِ عامہ پر مبنی کسی قانون کو مسترد کرنے کا جواز مہیا کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں مذکورہ بالا مثالوں سے کہیں زیادہ مثالیں اس بات کی موجود ہیں کہ شوہر اپنی بیویوں کو مار ڈالتے

ہیں اور بیویاں اپنے شوہروں کو زہر دے دیتی ہیں۔ اس سے بھی کہیں زیادہ مثالیں اس بات کی موجود ہیں کہ شوہر اکلوتی بیوی کو طرح طرح کی جسمانی اور ذہنی و روحانی صدمات پہنچاتے ہیں تو کیا قانون اس کا تدارک اس طرح سوچ سکتا ہے کہ ہر شخص ایک شادی بھی حکومت کی اجازت کے بغیر نہ کرے اور حکومت اچھی طرح جانچ لے کہ یہ جوڑا ایک دوسرے کو کھا تو نہیں جائے گا۔ حضور والا! یہ شاذ قسم کی مثالوں کو پھیلا کر اور بھیانک بنا کر پیش کرنا دراصل ایک تکنیک ہے اپنا مقصد حاصل کرنے کی۔ الف جیسے لوگ ہر قیمت پر یہ چاہتے ہیں کہ غیر اسلامی فکر زوال و ترقی یا بربریت و شائستگی یا خیر و شر کے جو معیار پیش کرتا ہے انھیں کو مسلمان بھی مان لیں اور دنیا کہے کہ ہاں اب ہوئے یہ ترقی پسند اور مہذب۔

دوسرے میں کہتا ہوں کہ چلئے میں نے مان لیا اس طرح کی مثالیں قابلِ لحاظ تعداد میں پائی جا رہی ہیں۔ مگر کیا اس قسم کے بے حس، عیاش طبع اور عاقبت ناشناس شوہروں کو طلاق سے روک کر آپ اس کے سوا بھی کوئی کارنامہ انجام دیں گے کہ وہ باہر تو بدکاری کرتے پھریں اور گھر میں بیوی کے ساتھ وہ بدترین سلوک روا رکھیں کہ بے چاری کانٹوں اور انگاروں پر زندگی گزارے۔ ظاہر ہے کہ جب انھیں آپ اتنا بے حس اور بوالہوس قرار دے رہے ہیں کہ صرف اور صرف تفریح طبع کی نیت سے انھوں نے اپنے بچوں کے مستقبل کو نظر انداز کر دیا تو کیا آپ کا طلاق سے باز رکھنے والا قانون ان کی کایا پلٹ دے گا کہ اب وہ بیوی سے انسانیت کا سلوک کریں گے اور بوالہوسی سے توبہ کرلیں گے خوب ہے یہ انصاف اور عورت کی ہمدردی کہ ایسے بُرے شوہروں سے چھٹکارا پانا تو اس کے لئے ممنوع قرار دیا جائے اور اصرار یہ کیا جائے کہ وہ بدستور ان شوہروں کے گھر میں قید رہے۔

الف شاید یہ بھی بھول رہا ہے کہ جنسی تعلق محض مرد کی ضرورت نہیں بلکہ عورت کی بھی ضرورت ہے۔ ذرا ارشاد تو فرمایا جائے کہ ان مثالوں میں قانون عورت کی جنسی کفالت کا کیا ذریعہ تجویز کرے گا۔ یہ شوہر تو ان سے اس حد تک بیزار ہیں کہ قانون آڑے نہ آتا تو طلاق دے ڈالتے۔ قانون انھیں بس طلاق سے روک سکتا ہے مگر اس پر مجبور نہیں کر سکتا کہ بیوی کی جنسی خواہش بھی واجبی حد تک پوری کرتے رہیں۔ پھر کیا اسی کا نام عورت کی غم خواری ہے کہ نہ تو اسے شوہر کے گھر میں تسکین و مسرت کا کوئی حبہ میسر آئے نہ وہ آزاد ہو کہ کسی اور بھلے آدمی کی بیوی بن سکے۔

مائی لارڈ! میں انتہائی رنج کے ساتھ عرض کروں گا کہ الف جیسا ذہن رکھنے والے مسلمان اپنی کسی بھی اصلاحی تجویز کے تمام مضرات و عواقب پر نگاہ نہیں ڈالتے بلکہ سطحیات پر ٹھیر جاتے ہیں اور صرف وہی واقعات اور ان کے وہی پہلو انھیں نظر آتے ہیں جو ان کے حسبِ مطلب ہوں حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کم سے کم مسلمانوں میں طلاق کے حادثے عموماً عورتوں کی حماقت اور بددماغی اور سرکشی سے پیش آتے ہیں۔ میں مردوں کو یکسر بے خطا قرار نہیں دیتا۔ مرد بھی ایک سے ایک بیہودہ اور بددماغ اور وحشی پڑا ہے لیکن آخر کہاں کا انصاف ہے کہ مجرم صرف مرد کو مان کر اصلاح کا جھنڈا اٹھایا جائے اور ہر اصلاحی تجویز کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی جائے کہ بس مرد ہی خطاکار ہے

دوسری شادی کی اجازت کا معیار

الف نے دوسری شادی کی اجازت کا مدار اس بات پر رکھا ہے کہ مرد اپنی ضرورت کو حق بجانب ہونے کا ثبوت پیش کرے۔ ضرورت کی تشریح میں وہ کہتا ہے:۔

> "مثلاً اس کی بیوی بانجھ ہے اور اولاد سے محروم ہے یا اس کی صحت اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ وہ گھر کا کام کرنے اور انتظام کے بالکل ناقابل ہے۔" (صفحہ [illegible])

یہی کہنا ہے کہ اولیٰ تو "ضرورت" بس اس نوع کی مثالو

میں محدود کر دینا فطرتِ انسانی سے ناواقفیت کا ثبوت ہے بلکہ یوں کہئے کہ الف نے حقائقِ ثابتہ سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔

میں ایک مثال پر جناب کی توجہ مبذول کراؤں گا زید جوان ہے۔ اس نے ریحانہ سے شادی کی۔ شادی کے بعد پتہ چلا کہ ریحانہ کے جسم سے نہایت ناگوار بدبو خارج ہوتی ہے جو دواؤں سے بھی نہیں جاسکی۔ پھر یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ نہایت خر دماغ اور ضدی ہے۔ یہ بھی نظر آیا کہ کیریکٹر بھی مضبوط نہیں ہے۔ مردوں کو ایسی ہی نظروں سے گھورتی ہے جیسی نظروں سے بُرے مرد عورتوں کو گھورتے ہیں۔ گھرداری کا بھی سلیقہ نہیں ہے۔ فہمائش اور تنبیہ کا بھی اثر نہیں لیتی بلکہ زبان چلاتی ہے۔ بھیجا چاٹتی ہے۔ لڑنے مرنے کو تیار رہتی ہے اسی دوران زید کو کوئی لڑکی پسند آئی جو حسین بھی ہے۔ نیک سیرت بھی۔ سلیقہ شعار بھی اور وہ خود زید کو ناپسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتی۔ زید ایک شکیل اور فرخندہ سیرت جوان ہے مالدار بھی ہے۔ یہ لڑکی تیار ہے کہ زید سے شادی کرلے اس کے سرپرست بھی مخالف نہیں ہیں۔ اب می لارڈ! آپ انصاف فرمائیں کہ آلف کا تجویز کردہ قانون ایک دم بیچ میں کود پڑتا ہے کہ خبردار! تم نہ بیوی کو طلاق دے سکتے ہو نہ اس کی موجودگی میں دوسری لڑکی سے نکاح کرسکتے ہو کیونکہ تمہارے پاس اپنی ضرورت میں حق بجانب ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔ گویا اس قانون کی نظر میں وہ بیوی تو خاص رعایت کی مستحق ہے جس کے اوصاف بیان کئے مگر وہ زید جس کی زندگی اس بیوی نے تلخ کردی ہے، یہ حق نہیں رکھتا کہ حلال کے ذریعہ سے اپنی تسکین و راحت کا سامان کرسکے۔

دوسری مثال یوں لیجئے کہ زید کی بیوی بدکردار ہے شوہر محسوس کر رہا ہے وہ پاک باز نہیں اور یہ بھی کہ تنبیہ و نصیحت کے باوجود وہ مشتبہ حرکتوں سے باز نہیں آتی ب اسلام تو ایسے حالات میں سیدھا سارا ستہ بتاتا ہے پہلے نرمی سے سمجھاؤ پھر سختی کرو، پھر مارو اور پھر اس پر بھی نہ سدھرے تو طلاق دے کر مہر اور جہیز کے ساتھ رخصت کردو (وہ جہیز جو عورت کی ملکیت ہو)، مگر آلف کا تجویز کردہ قانون یہ کہتا ہے کہ مرد جسے خود اللہ نے عورت پر بالادست (قوام) بنایا ہے اپنی بوٹیاں نوچا کرے اور نہ تو اسے طلاق دے سکے اور نہ دوسری بیوی لاسکے۔ آلف اگر اپنی تجویز میں یہ اضافہ بھی کردے کہ بیوی کی بدچلنی اجازتِ طلاق کے لئے معقول عذر سمجھی جائے گی تو می لارڈ! آپ خود انصاف فرماسکتے ہیں کہ کیا اس نوع کی بدکرداری کے ثبوت مہیا کرنا آسان ہوتا ہے؟ عدالت ہو یا کوئی مصالحتی بورڈ۔ اس پر مطمئن کرنا کہ زید اپنی بیوی پر جن شبہات کا اظہار کر رہا ہے۔ وہ واقعی حق بجانب ہیں اور محض طلاق دینے کی نیت سے پیدا نہیں کئے گئے سخت مشکل ہے۔ خصوصاً جب چالاک عورت سینہ ٹھونک کر کہے یہ شخص جھوٹا ہے میں سراپا مریم اور سیتا ہوں۔

واقعات کی کتنی ہی قسمیں ایسی ہیں می لارڈ! کہ مرد ان میں عدالتی سطح پر "ضرورتِ طلاق" یا ضرورتِ نکاحِ ثانی کا اثبات نہیں کرسکتا مگر فی الحقیقت ضرورت اور شدید ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آلف جس پیغمبر پر ایمان لایا ہے یا جن صحابہ کو محترم مانتا ہے انہوں نے بہت سی شادیاں کیں حالانکہ ایسی ضرورتیں انھیں لاحق نہیں تھیں جنھیں الف معیار بنا رہا ہے۔

دوسرے اس سے پوچھئے کہ اس کا مجوزہ قانون مرد کو کتنے دنوں بعد یہ فیصلہ کرنے کی اجازت دیتا ہے کہ اس کی بیوی بانجھ ہے۔ کسی عورت کے دس سال تک بچہ نہ پیدا ہو تب بھی یہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بانجھ ہے۔ ایک شوہر شادی کے آٹھ سال بعد اگر عدالت یا بورڈ سے کہے گا کہ میری بیوی بانجھ ہے تو یہ آسانی اسے جواب مل سکتا ہے کہ عزیزم صبر کرو۔ ممکن ہے اگلے سال باپ بن جاؤ۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ دس بارہ سال کا انتظار کرکے زید نے درخواست دی کہ میری بیوی بانجھ ہے لہٰذا دوسری شادی کی اجازت دی جائے تو بیوی خم ٹھونک کر سامنے آئی کہ جناب میں بانجھ نہیں ہوں

یہ شخص خود رجولیت سے محروم ہوگا۔ اس میں قدرت نے اولاد پیدا کرنے والا مادہ ہی نہ رکھا ہوگا۔

اب فرمایئے قانون تو شل ہو کر رہ جائے گا کیونکہ دونوں کے دعوے تشنۂ ثبوت ہیں۔ اب مجبوراً یہ کرنا پڑے گا کہ "ماہرین" دونوں کا طبّی معائنہ کریں اور تب پتہ چلے کہ بیوی صاحبہ بانجھ ہیں یا شوہر صاحب باوجود "مرد" ہونے کے ان جرثوموں سے خالی ہیں جو بچہ کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔

کتنی بیہودہ بات! ——— الف کا مزاج و ذوق اسے گوارا کرے تو کرے اسلامی معیارِ شرافت اور تصورِ حیا ہرگز اسے برداشت نہیں کرتا کہ اس طرح کے قضیے عدالتوں یا مصالحتی بورڈوں میں اچھلیں اور زن و شوہر کو "معائنوں" کی میز پر لٹایا جائے۔ ہمارے معاشرے میں جو عورتیں بانجھ ہوتی ہیں وہ اوّل تو خود ہی مرد کو اجازت دے دیتی ہیں کہ تم اور شادی کرلو یا پھر مرد صبر کر لیتا ہے۔ پاکیزہ اور شریفانہ دستور مگر داہ رے مصلحو۔ تم اس پاکیزگی کو رسوائی اور بے شرمی میں بدل دینا چاہتے ہو۔

غرض تعددِ ازدواج اور اجازتِ طلاق کے مسائل میں الف کا نہ تو بنیادی طرزِ فکر فساد سے پاک ہے نہ اسلاحی تجویز واقعی اصلاح کی حامل ہے۔ فائدے ایک دو اس نوع کی تجویزوں میں ہوں تو مضرتیں اتنی زیادہ ہیں کہ فوائد کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔

تین طلاقیں

تین طلاقوں کا موضوع بھی الف نے لیا ہے۔ ویسے تو اس موضوع سے الجھنا بیکار ہی ہے کہ الف تو ایک بھی طلاق کا اختیار مرد سے چھین کر سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کو دیدینے کے حق میں ہے پھر دو اور تین کی کیا بحث،

تاہم فاضل جج یہ بہرحال دیکھ لیں گے کہ جب کوئی آدمی ناکافی معلومات اور نارسا فکر سے کر بڑے بڑے مسائل میں موشگافی کرتا ہے تو کیسی کیسی پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں۔

ایک وقت میں دی ہوئی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں یا ایک۔ یہ مسئلہ اس وقت میرا موضوع بحث نہیں اس بارے میں تو میں اجمالاً صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ قرآن و سنت کے تمام وہ ماہرین اور اساتذہ جن کی تقلید اتنے یا رہ تیرہ سو سال سے کرتی آ رہی ہے اس بات پر متفق ہیں کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا اگرچہ گناہ ہے مگر طلاقیں بہرحال تین واقع ہو جاتی ہیں۔ اس رائے کے لئے احادیث و آثار میں بہت مضبوط دلائل موجود ہیں۔ تاہم کچھ لوگوں نے اگر غور و فکر اور کافی تحقیق و تدقیق کے بعد یہ گمان کیا ہے کہ طلاق ایک ہی پڑنی چاہیئے تو اس میں یہ گمان غلط قرار دینے کے باوجود ہرگز نہ کہوں گا کہ یہ لوگ قرآن و حدیث پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے کہ بہرحال قرآن میں صاف طور پر یہ نہیں کہا گیا کہ بیک وقت تین طلاقیں دو گے تو تین ہی مانی جائیں گی اور احادیث میں بھی بعض روایات ایسی موجود ہیں کہ ایک محقق نیک نیتی کے ساتھ غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ناانصافی ہوگی اگر ہم اس پر قرآن و حدیث سے دانستہ انحراف کا الزام لگائیں۔

یہ ہے اس مسئلے کی علمی حقیقت۔ مگر جب الف جیسا کوئی آدمی مناسب تحقیق اور سنجیدہ تفکر کے بغیر یہ گمان کرتا ہے کہ تین کا وقوع ظلم ہے اور اس گمان کے لئے نہایت غیر ذمہ داری کے ساتھ ایک حدیث بھی گھڑ دیتا ہے تو اسے بہرحال دیدہ دلیری کہیں گے۔ الف کی گھڑی ہوئی حدیث میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔

ایک دعوے کا تجزیہ

علاوہ ازیں نکاح و طلاق کی اسلامی نوعیت کو جب الف جانتا ہی نہیں تو اس کے خیالات میں سلامتی اور علمی وزن کی تلاش بیکار ہی ہے۔ اب مثلاً وہ کہتا ہے:۔

"مقدمات کے سلسلے میں میرے مشاہدات
میں یہ عموماً آیا ہے کہ بہت سے لوگ اپنی بیوی
کو بیک وقت تین طلاق دے کر دوسری
شادی کے خیال سے بلا کسی خاص وجہ کے
چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔"

یعنی الف کے خیال میں شوہر نہ قوّام ہے نہ بیوی کے جسم پر حقِ تصرف کا مالک بلکہ وہ بیوی کے شکنجے میں پھنسا ہوا ایک قیدی ہے جو اگر طلاق کے ذریعہ تعلق کو ذریعہ ختم کر دے تو اسکے لئے یہ کہنا درست ہوگا کہ چھٹکارا پایا۔

سوچئے کا یہ ڈھنگ اسلامی نہیں۔ ہے می لارڈ! میں تفصیلاً عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے نزدیک طلاق کے معنی یہ ہیں کہ شوہر اپنے حق سے دست بردار ہو رہا ہے نہ یہ کہ بیوی کا حق چھین رہا ہے۔ اپنے حق سے دست بردار ہونے کو چھٹکارا نہیں کہتے۔

دوسری بات میں یہ عرض کروں گا کہ اس طرح کی مثالوں میں "عموماً" لفظ کا استعمال کرنا مبالغہ ہے حقیقت نہیں۔ بیشک الف اس نوع کے مقدمات کا بیس سالہ تجربہ رکھتا ہے اور مجھ جیسے ناچیز کا اس کے تجربات کو چیلنج کرنا قابلِ اعتراض قرار دیا جا سکتا ہے لیکن محترم ومکرم جج! جو شخص خدا اور رسول جیسی ہستیوں کے معاملہ میں اس حد تک غیر ذمہ دارانہ اور ژولیدہ فکر ہو جس کا مشاہدہ آپ کر چکے اس سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ تجربات کے تجزیہ و تحلیل اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں وہ صحیح فکری اور بالغ نظری کا ثبوت دے گا۔ ایسا شخص تو ہزار سالہ تجربات سے بھی ایسے نتائج اخذ کر سکتا ہے جو نادرست اور جانب دارانہ ہوں۔ میں کہتا ہوں بلا خاص وجہ کے بیوی کو طلاق دینے والے مرد مسلمانوں میں شاذ ہیں۔ قلیل ہیں۔ ضروری نہیں کہ جن واقعات کو الف نے نظر میں رکھا ہے ان میں طلاق واقعی بلا ضرورت دی گئی ہو۔ الف کا معیارِ ضرورت آپ دیکھ ہی چکے اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ کسی ضرورت کا واقعتہً موجود ہونا اور اسے عدالت کو باور کرانا دو الگ چیزیں ہیں۔ کیوں نہیں ہو سکتا کہ شوہر نے معقول وجہ بیان کی ہو مگر وہ الف کے نزدیک معقول نہ رہی ہو یا اس وجہ کے ثبوت پر کافی ثبوت نہ آیا ہو یا یوں ہوا ہو کہ مرد ثبوت و شہادت نہ رکھنے کی بنا پر وجہ کو زبان پر نہ لایا ہو یا وہ وجہ ایسی ہو کہ مرد کی اخلاقی حس اور غیرت و حیا اسے بیان کرنا پسند نہ کرتی ہو۔ بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں یہ اندرونی معاملات ہیں۔ الف کا یہ دعویٰ مضبوط نہیں ہے کہ عموماً بہت سے لوگ بلا خاص وجہ کے طلاق سے شغل کرتے ہیں۔ خصوصاً جب الف کے دماغ سے عورتوں کی محض ایک ہی تصویر چپکی ہوئی ہے کہ وہ ہر حال میں مظلوم و معصوم ہیں تو کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ مردوں کی مشکلات بھی اس کے لئے کوئی معنے رکھیں گی۔

تیسری بات میں یہ عرض کروں گا کہ یہاں "تین طلاق" کا خصوصیت سے ذکر کرنا الفاظ کا بے فائدہ استعمال ہے۔ جو شوہر "چھٹکارا" ہی پانے کی نیت رکھتا ہو اس کے لئے تو ایک اور تین یکساں ہی ہیں۔ اس فرق کا کوئی اثر تو اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب طلاق کے بعد مرد رجوع کرنا چاہے لیکن رجوع ہی اسے نہ کرنا ہو تو ایک طلاق بھی وہی نتیجہ پیدا کرے گی جو تین یا ہزار پیدا کر سکتی ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ تین طلاقوں کے زیرِ عنوان یہ فرمودہ کیا معنویت رکھتا ہے۔

متصل بعد لکھا گیا ہے:۔

"ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اس کا مہر بھی ادا
نہیں کرتے اور جہیز وغیرہ بھی غصب کر لیتے ہیں۔"

الف سے پوچھئے اس میں علماء کی یا مسلم پرسنل لا کی کیا خطا ہے یہ ملکی نظام عدل کی خامی ہوئی۔ علماء نے کب کہا کہ ایسے بدنہاد شوہر رعایت سے نوازے جائیں۔ قانون کی رو سے جب مہر کی ادائیگی واجب اور فعل غصب جرم ہے تو اصلاح اس نظام عدل کی کیجئے جو مظلوم عورت کو ظالم شوہر سے وہ حقوق نہیں دلا پا رہا ہے جو دلانے چاہئیں یہ خوب ہے کہ مظلومیت اور مصیبت کے جو مناظر نفاذِ قانون کی ناکامیوں سے تشکیل پائیں انھیں بھی ایسے سیاق و سباق میں بیان کیا جائے کہ قصور وار مسلم پرسنل لا محسوس ہو اور چھینٹیں علما کے دامن پر آئیں۔

حلالہ

تین طلاق پر اظہارِ خیال کیا گیا تو بھلا حلالہ کیوں نہ زیرِ بحث آتا۔ مگر الف کی وہ روش برابر قائم ہے کہ جس مسئلے پر رائے زنی کرو اس کی تحقیق کی تکلیف بالکل نہ اٹھاؤ۔ حضور کی طرف کسی قول کا انتساب کرنے میں بھی الف کو جھجک نہیں۔ ایک مثال میں پیش کر ہی آیا۔ ایک مثال یہاں بھی موجود ہے:

"رسول اللہ صلعم نے خود حلالہ کو لعن سے منسوب فرمایا۔" (ص ۲۶)

یہ حدیث بے بنیاد تو نہیں ہے لیکن الف اگر اسے اس کی اصل جگہ دیکھ لیتا تو اسے خود پتہ چل جاتا کہ حضورؐ نے یہ بات کس سیاق و سباق میں فرمائی تھی۔ میں ابھی اس کے سلسلے میں عرض کرتا ہوں۔ مگر بات ذرا تفصیل سے کرنی ہوگی۔ الف کہتا ہے:

"بیک وقت تین طلاقوں کے دینے کو روکنے کے لئے شریعت نے اس کا علاج حلالے کی شکل میں کیا ہے۔" (ص ۲۵)

یہاں "بیک وقت" کا آخر کیا مطلب ہوا؟ می لارڈ! تین طلاقیں چاہے بیک وقت دی جائیں یا مختلف اوقات میں بہر حال ان کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ حلالے کے بغیر یہ مرد و زن دوبارہ باہم نکاح نہیں کر سکتے۔ پھر یہاں "بیک وقت" کی قید کا اضافہ اس کے سوا کیا معنی رکھتا ہے کہ الف الفاظ کے استعمال میں لاپروا ہے حالانکہ قانونی مسائل میں تو ایک ایک لفظ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

مزید یہ کہ حلالے کی نوعیت شریعت میں وہ نہیں ہے جو الف نے سمجھی بلکہ وہ ایک سزا اور تادیب ہے مرد کے لئے۔ مرد کو اللہ نے اختیار دیا کہ ایک طلاق دے کر بیوی کو آزاد کر سکتے ہو لیکن تمہیں یہ حق بھی ہے کہ رجوع کرلو دوسری اگر دی تب بھی ہم تمہیں ایک موقعہ اور رجعت کا دیتے ہیں لیکن تیسری بھی اگر تم نے دیدی تو اب رعایت ختم۔ اب تو صرف ایک ہی صورت ممکن ہے مطلقہ کسی اور مرد سے نکاح کرے۔ پھر قسمت سے وہ مرد مر جائے یا طلاق دے دے اور اس وقت یہ عورت تم سے پھر نکاح کرنے پر راضی ہو تو بے شک اب تمہارے لئے اس سے نکاح حلال ہوگا۔

الف تو یہ لکھتا ہے:-

"اور اگر بیوی پھر (یعنی تین طلاقوں کے بعد۔ تجلی) اپنے سابق شوہر سے ملنے کی خواہش مند ہو تو اس کو اپنے نئے شوہر سے طلاق لینی اور عدت پوری کرنی ضروری ہے۔ دیکھا جائے تو یہ سزا شوہر کے لئے کچھ بھی نہیں مگر ایسی معصوم عورت کے لئے جو کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ کسی اجنبی سے ہمبستری کے لئے تیار ہونا کس طرح ممکن ہے۔ وہ شاید موت کو اس قسم کی شادی پر ترجیح دے گی (ص ۲۶)"

یہ عبارت منہ سے بول رہی ہے کہ حلالے کی اسلامی نوعیت کے بارے میں الف کی معلومات ان ناخواندہ مسلمانوں

سے زیادہ نہیں ہیں جنھوں نے بس یوں ہی سن رکھا ہے کہ حلالہ بھی ایک چیز ہے۔ اسی لئے اس نے اس طریقۂ شرعی کی ایسی بدنما تصویر کھینچی ہے جو بھی ناواقف اس کی عبارت پڑھے گا وہ یہی تاثر لے گا کہ اسلام نے حلالہ کے نام سے بے حیائی اور بدکاری کا ایک کھیل تماشا بنایا ہے۔ العیاذ باللہ۔

صحیح صورتِ حال یہ ہے می لارڈ کہ مرد کا تین طلاق دینا اسے کلی طور پر اس حق سے محروم کر دیتا ہے کہ پھر وہ اس عورت سے نکاح کر سکے۔ یہ محرومی ہی اللہ کے نزدیک اس کی کافی سزا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ کہ یہ مطلقہ اب کسی اور مرد سے نکاح کرے اور یہ نکاح اس غرض سے نہ ہو کہ وہ طلاق لے کر پھر پہلے شوہر سے تعلق جوڑے بلکہ غرض وہی ہو جو ہر نکاح کی ہوتی ہے یعنی مرتےدم تک نباہ۔ اس دوسرے مرد کے لئے بھی اسلام کا یہی حکم ہے اور وہ نکاح واقعی نکاح کی نیت سے کرے یہ نیت نہ ہو کہ ہمبستری کے بعد طلاق دے دے گا۔ ایسی نیت سے نکاح کرنا اسلام کے نزدیک فی الحقیقت نکاح ہے ہی نہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کے سلسلے میں حضورؐ نے فرمایا ہے حلالہ کرنے والے پر بھی لعنت، کروانے والے پر بھی لعنت۔ گویا جو شوہر تین طلاق دینے کے بعد اس نئے مطلقہ کا نکاح کہیں اور کراتا ہے کہ اس سے طلاق دلوا کر پھر اسے اپنی بیوی بنالے وہ ملعون ہے اور جو شخص اس کی اسکیم میں معاون بن کر اس عورت سے نکاح کرتا ہے وہ بھی ملعون ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو مکروہ تصویر الف نے الفاظ میں بنائی ہے وہ خود اسلام کے نزدیک ملعون ہے اور اسے اسلام کی اصطلاح "حلالہ" کی تشریح و توضیح میں پیش کرنا اسلام کو متہم اور رسوا کرنا ہے

بیوی کی خواہش سے کچھ نہیں ہوتا جب تک مرد کی بھی خواہش نہ ہو۔ مسئلے کی صحیح شکل یہ ہے کہ مطلقہ نے جس دوسرے مرد سے شادی کی ہے وہ اتفاق سے اگر مر گیا یا اس نے کسی وجہ سے طلاق دے دی (پہلے سے طے شدہ اسکیم کے مطابق نہیں بلکہ کسی اور بنا پر) اور پھر یہ عورت اور پہلا شوہر دونوں یہ خواہش کریں کہ ہم پھر سے میاں بیوی بن جائیں۔ تب اجازت ہے کہ وہ باہم نکاح کر لیں۔ فرمایا جائے کہ اس شکل میں ایک معصوم عورت کے لئے کسی اجنبی سے ہم بستری کا سوال کہاں پیدا ہوا۔ در اصل از راہ جہالت جو غلط طریقہ حلالہ کے نام سے اختیار کیا جاتا ہے وہ خود اسلام کے نزدیک بھی ناپاک اور ملعون ہے۔ یہاں تک کہ حضرت عمر فاروقؓ اپنے دورِ خلافت میں فرماتے تھے کہ میرے سامنے اگر حلالہ کرنے والا یا کرانے والا لایا گیا تو میں اسے سنگسار کر دوں گا (اعلام الموقعین)

اس منقولہ بالا عبارت میں خواہ مخواہ یہ بھی فرض کر لیا گیا ہے کہ جس عورت کو تین طلاقیں مل گئیں اس کے لئے بس دو ہی راہیں باقی ہیں۔ یا تو وہ اسکیم کے تحت کسی مردِ وقتی نکاح کر کے طلاق لے اور پھر شوہر اول سے جڑ جائے یا زندگی بھر بیوگی کی مصیبت اٹھائے۔ تیسری راہ کو جو معقول بھی ہے اور کثیر الوقوع بھی الف نے نظر انداز کر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ مطلقہ کہیں اور نکاح کر کے بقیہ زندگی وہیں منکوحہ کی حیثیت سے گذارے۔ آپ جانتے ہیں می لارڈ کہ سماج میں ہر کنبے اور خاندان کے لوگ ایک دوسرے کی خصلتوں اور مزاجوں سے اچھی خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔ ایک شوہر اگر بیوی کو ایک یا تین طلاقیں دیتا ہے تو شوہر اور بیوی دونوں ہی زبانوں سے وجہ نزاع بھی ضرور سننے میں آتی ہے۔ ان کے بیانات سے اور مذکورہ واقفیت سے یہ پتہ چل ہی جاتا ہے کہ قصور زیادہ مرد کا تھا یا عورت کا۔ اگر واقعہ یوں ہو کہ مرد کا بدخصلت اور شقی القلب اور غلط کار ہونا ایک امر معروف ہو اور عورت بھلی ہو تو اس عورت کو دوسرا شوہر اکثر و بیشتر مل جاتا ہے وہ لازماً بیوہ نہیں بیٹھی رہتی۔ ایسے لوگ مسلمانوں میں ہمیشہ رہے ہیں اور آج بھی ہیں جو مظلوم مطلقہ عورتوں سے بخوشی نکاح

اور می لارڈ یہ جو کہا گیا کہ اگر بیوی پھر سے ملنے کی خواہشمند ہو تو میں کہتا ہوں کہ یہ بھی الفاظ کا ناروا استعمال ہے

کر لیتے ہیں اور ان عورتوں کو پہلے کی نسبت زیادہ آرام و اطمینان میسر آتا ہے۔ لیکن اگر طلاق کا واقعہ اس لئے پیش آیا ہو کہ عورت ہی بد خصلت اور کج دماغ اور خیرہ سر ہو اور ملنے جلنے والے جانتے ہوں کہ شوہر نے اصلاح حال کی تمام کوششوں میں ناکام ہو کر ہی آخری قدم اٹھایا ہے تو پھر بے شک مطلقہ کو آسانی سے دوسرا شوہر نہیں ملتا اس کی بیوگی کو الف چاہے بربادی یا مظلومی یا تباہی جیسے کسی بھی لفظ سے تعبیر کرتا رہے لیکن انصاف بہر حال یہی ہے کہ ایسی عورت اپنی بری سیرت و خصلت کا زہر خود ہی پیتی رہے کسی اور مرد کی زندگی تلخ کرنے کا موقعہ اسے مہیا نہ ہو۔

حق رجوع کی بحث

الف آگے لکھتا ہے:-

"میری رائے میں ایسے مطلق العنان شوہر کی کوئی مناسب سزا دینی ضروری ہے اور ایسی طلاق کو جو غصہ یا کسی غلط فہمی یا نشے کی حالت میں دی جائے تو اس کو طلاق مطلقہ نہ سمجھا جائے اور شوہر پر تاوان ڈالنے کے بعد رجوع کا اختیار مل جانا چاہیئے۔" صلاتا

جہاں تک بیک وقت تین طلاق دینے کا تعلق ہے میں بھی اسے تسلیم کرتا ہوں کہ ایسا شخص مستوجب سزا ہو سکتا ہے لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے تین طلاقیں قرآنی طریقے کو نظر انداز کر کے دی ہیں نہ کہ تین طلاق دینا بجائے خود کوئی جرم ہے۔ ان دونوں شکلوں میں فرق یہ ہے می لارڈ! کہ پہلی شریعت کی تعظیم و تکریم پر مبنی ہے اور دوسری شریعت سے انحراف پہ۔ شریعت نے تین طلاق دینے کو جس حد تک جرم قرار دیا ہے وہ بس یہ ہے کہ مرد سے اب رجوع یا تجدید نکاح کا حق سلب کر لیا گیا۔ کیا اسے مزید کوئی سزا اس بنا پر دینی چاہیئے کہ اس نے اپنے ایک حق سے دست برداری کا قطعی اعلان کر دیا ہے؟

اور یہ بھی غور کیا جائے کہ الف بیک وقت میں طلاق دینے والے شوہر پر تاوان ڈالنے کے بعد رجوع کا اختیار دینا چاہتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں اختیار کی تقسیم یا تنسیخ کا منصب حلال و حرام کے معاملات میں انسانوں کو کب سے مل گیا؟ الف وضاحت کرے کہ بیک وقت تین طلاق دینے سے اس کے نزدیک ایک طلاق واقع ہوتی ہے یا تین؟ اگر ایک ہوتی ہے تو تاوان وہ کس قصور میں ڈال رہا ہے۔ کیا ایک طلاق دینا بھی اب جرم اور مستوجب جرمانہ ہو گیا۔ اگر یہی اس کی رائے ہے تو پھر تین کا تکلف کیوں اسے تو صاف صاف کہنا چاہیئے کہ ایک طلاق دینے والا بھی تاوان کا سزاوار ہے۔

مگر نہیں۔ وہ ایک طلاق پر تاوان کی رائے نہیں رکھتا پورے مقالہ میں اس نے کہیں بھی ایسا خیال ظاہر نہیں کیا ہے لہٰذا معلوم ہو گیا کہ تاوان کا خیال اسے اسی لئے پیدا ہوا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں اس کے نزدیک ایک طلاق سے مختلف نوعیت رکھتی ہیں۔ یہ نوعیت کیا ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ رجوع کا حق ختم ہو جائے ایک یا دو یا تین طلاقیں رشتۂ نکاح کو کاٹ ڈالنے میں قطعاً یکساں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک طلاق سے نکاح کچھ فیصد حصہ سلامت رہ جاتا ہو۔ بس فرق یہ ہے کہ ایک اور دو کے بعد اللہ نے رجوع کا حق دیا ہے اور تین کے بعد یہ حق سلب کر لیا ہے۔ الف ایک طلاق پر تاوان کی رائے نہیں رکھتا۔ تین پر رکھتا ہے تو گویا وہ خود اعتراف کر رہا ہے کہ حکم خداوندی کی رو سے تین طلاقوں نے حق رجوع ختم کر دیا — اب اس کے بعد بھی وہ اگر اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ چند پیسے جرمانہ عائد کر کے اس ختم شدہ حق کو زندہ کیا جا سکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نزدیک حرام و حلال قطعی چیزیں نہیں ہیں بلکہ ہم اپنی مصالح کی بنا پر کسی حرام کو حلال یا حلال

کو حرام قرار دینے کا قانون بنا دیں تو یہ عند اللہ بھی نافذ ہو جائے گا

اگر یہی ذہن اور انداز فکر معقول ہے می لارڈ! تو کیا رکاوٹ رہے گی اس بات کی کہ کل آلف یہ بھی مشورہ دینے لگے کہ بہن اور بھائی یا ماموں بھانجی یا چچا اور بھتیجی کے نکاح کو قانوناً جائز قرار دیا جائے۔ یہ امکان محض نکتہ سنجی نہیں می لارڈ ہمارے معاشرے میں ایسی بے شمار لڑکیاں پائی جاتی ہیں اور پائی جا رہی ہیں جنھیں موزوں شوہر میسر نہیں آ رہے ہیں اور ان کی عمریں ڈھل رہی ہیں۔ ان کے اپنے جوان بھائی اور چچا اور ماموں سب موجود ہیں۔ عورت کے آلف جیسے ہمدردوں کا خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان لڑکیوں سے ان کے بھائی یا چچا وغیرہ نکاح کر لیں تاکہ بے چاریاں کنوارپن کی مصیبت سے تو چھوٹیں۔ کیا مضائقہ ہے اس میں اگر طرز فکر یہی ہے کہ خدا کا حرام ہماری "دانشوری" کے تابع ہے۔ ہم مصلحت دیکھ کر اس کی حلت کا قانون گھڑ دیں۔ تو وہ حلال ہو جائے گا۔

خفا ہونے کی بات نہیں ہے می لارڈ! بھائی بہن یا خالہ بھانجے وغیرہ کی مناکحت "عقلاً" ہرگز کوئی قباحت نہیں رکھتی بلکہ وہ تو اور معقول نظر آتی ہے کیونکہ جو فکر نو اس خیال کا علمبردار ہے کہ شادی سے قبل لڑکا لڑکی کو ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیئے اور کورٹ شپ کے ذریعہ ایک دوسرے کے اوصاف و خصائل کا قریبی مطالعہ کر لینا چاہیئے اس کے لئے بچپن سے ایک ساتھ پلنے اور رہنے والے بھائی بہنوں کے مابین تو یہ واقفیت خوب خوب موجود رہے گی۔ کتنی معقول بات ہے کہ وہ آپس ہی میں شادیاں کر لیا کریں خصوصاً جب لڑکیوں کو مناسب شوہر میسر نہ ہو رہے ہوں تو یہ معقولیت اور بھی پرکشش ہو جاتی ہے۔

ہاں محترم جج! اگر مسلمان یہ مان لے کہ خدا کا حرام کردہ حرام کوئی اٹل چیز نہیں ہے بلکہ اسے قانون بنا کر حلال کیا جا سکتا ہے تو کسی بھی تجویز کو غیر متوقع نہیں کہہ سکتے۔ آج حال یہ ہے کہ جو لوگ بخت و اتفاق سے کوئی اونچا عہدہ پا گئے ہیں اور تھوڑی سی شہرت بھی انہیں حاصل ہو گئی ہے وہ فرعون بے سامان بنے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو عقل کل تصور کرتے ہیں۔ وہ اگر مسلمان بھی ہیں تو خدا اور رسول کے فرامین کی قدر اور عظمت ان کے دلوں میں کچھ نہیں اور یہ جانئے می لارڈ! وہ بھلا چکے ہیں کہ ان کی اصل نجس پانی کی ایک حقیر بوند ہے جس نے قدرتِ خداوندی سے پھل پھول کر انھیں آدمی بنا دیا ہے۔ قرآن بار بار اسی لئے یاد دلاتا ہے کہ اے انسان جامے سے باہر مت ہو۔ تجھے ہم نے ایک قطرۂ منی سے تخلیق کیا ہے اور بہت جلد تجھے ہماری بارگاہ میں غلاموں کی طرح حاضری دے کر اپنا حساب پیش کرنا ہو گا۔

بات چھوٹی سی ہے می لارڈ! کہ تین طلاق دینے والے پر تاوان عائد کر کے حق رجوع دیدیا جائے مگر نتائج کے اعتبار سے یہ ایک بم ہے جو تمام قوانین شریعت کے پرخچے اڑا سکتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ جو شوہر بیک وقت نہیں بلکہ ہدایت قرآنی کے مطابق ایک ایک ماہ کے فصل سے تین طلاقیں دیتا ہے اس کے سلسلے میں الف یہ کہتا ہے۔ اگر اس کے بعد حق رجوع دیا جا سکتا ہے تو پھر قرآن کوئی چیز ہی نہ ہوا۔ اور اگر نہیں دیا جا سکتا تو کیا اس کے نتیجے میں عورت اس تباہی سے دوچار نہ ہو گی جس کی منظر کشی بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کی صورت میں کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ عورت کے لئے دونوں شکلیں یکساں ہیں۔ تباہی جس چیز کا نام آلف نے رکھا ہے وہ عورت کا اس مرد کی زوجیت سے نکل جانا ہے یہ دونوں صورتوں میں پایا جا رہا ہے۔ پھر کیا یہ قانون بھی بننا چاہیئے کہ مرد تین طلاق دے ہی نہ سکے

ہاں می لارڈ! الف کا منشا یہی ہے۔ وہ شدومد سے اس کے حق میں ہے کہ کوئی بھی مرد حکومت سے اجازت لئے بغیر اپنے منصب شوہریت سے مستعفی نہ ہو سکے۔

بحالتِ نشہ طلاق

طلاق سکران یعنی نشے میں دی ہوئی طلاق کے وقوع اور عدم وقوع میں بے شک دو رائے کی گنجائش ہے اور آلف سے کسی بھی رائے کا حق سلب نہیں کیا جا سکتا لیکن مجھے افسوس ہے

می لارڈ! کہ نشے بازی کی مذمت میں کوئی حرف مجھے الف کے یہاں نہیں ملا۔ اس نے نشے بازی کے رواج کا عام ذکر اس انداز میں کیا ہے گویا وہ ایک معمولی شے ہے جسے اچھا مناسب نہیں۔ حالانکہ الف مسلمان ہے اور مسلمان کا اندازِ فکر یہ ہونا چاہیئے کہ جو برادران ملت اسلام سے سرکشی کرتے ہوئے نشے بازی کے عادی ہوں انھیں مجرم سمجھنے کے عوض اس رعایت کا مستحق قرار دیا جائے کہ نشے کی حالت میں وہ تین طلاقیں دے بیٹھیں تو اپنے حقِ رجوع سے محروم نہ ہوں اور یہ اطمینان بھی کر بیوی کے جسم پر متصرف ہو جائیں۔ یہ تو کچھ ایسی ہی بات ہوئی کہ گویا جرم نشہ بازی انعام کا مستحق ٹھیرا۔

عملاً اس کا ثمرہ یہ ہو سکتا ہے می لارڈ! کہ بحالتِ ہوش دحواس دی ہوئی نہ جانے کتنی طلاقیں نشے سے جوڑ دی جائیں گی اور مرد وزن زندگی بھر زنا میں مبتلا رہیں گے میں طلاقِ سکران میں ہر اجتہادی رائے کو لائق قبول تصور کرنے کے باوجود یہ چاہتا ہوں کہ مصلحین کرام مسلمانوں کی نشہ بازی کا بھی کم سے کم اتنا احساس تو کریں جتنا وہ خواتین کی مظلومیت کا کر رہے ہیں۔ نشہ بازی کی ہمت افزائی میری سمجھ میں نہیں آتی۔

اختتامی لکچر

میری تقریر لمبی ہو گئی می لارڈ اس لئے مزید جزئیات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے الف کے صرف اس "لکچر" پر اور کچھ عرض کرونگا جو اس نے مقالے پر دیا ہے وہ شب برات اور تعزیہ داری اور میلاد اور شادی بیاہ کی مسرفانہ رسموں اور تعلیم سے مسلمانوں کی غفلت اور اسی نوع کے دیگر امور پر جو وعظ دیتا ہے اس میں سو فیصدی اس کا ہمنوا ہوں۔ اِن خرافات کے خلاف احتجاج کرنا اور ان کی مضرتوں کو واضح کرنا تو خود میرا دیرینہ معمول رہا ہے مجھے یقین ہے کہ الف شعور کی حد تک مسلمانوں کا بہی خواہ اور فلاح و ترقی کا خواہاں ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ فلسفہ اور فاسد علم نے اس کے بنیادی فکر کو راہِ مستقیم سے ہٹا دیا ہے اور وہ یہ نہیں جانتا کہ جن تجویزوں کو وہ مفید سمجھ رہا ہے ان میں سے بعض کتنی مضرتیں اپنے اندر رکھتی ہیں۔ یہ مضرت تنہا ہر نقصان سے بڑھکر ہے کہ قانونِ شریعت سے انحراف کرنا پڑے۔

بہرحال وہ اس مقالے کے اختتام پر علماء سے گذارش کرتا ہے کہ آپ اپنا جمود و تعطل ختم کریں۔ دنیا ہر آن تغیر پذیر ہے خوابِ غفلت سے آپ نہ چونکے تو دین و ملت کو مزید نقصانات اٹھانے پڑیں گے وغیرہ۔

طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں اس لکچر نما گذارش کو من و عن نقل کر کے آپ کو دکھلاتا کہ اس کا پرداز کتنا سطحی اور کم و بیش کتنا بچکانہ ہے۔ حد ہے کہ اس میں بھی الف نے قرآن مجید سے بغیر تفصیلی حوالے کے چند ار دو فقرے نقل کئے جن کے بارے میں اس کا دعویٰ ہے کہ یہ ایک آیت قرآنی کا ترجمہ ہے حالانکہ می لارڈ! وہ ہرگز کسی ایک آیت کا ترجمہ نہیں بلکہ دو ایسی آیتوں کو اس نے گڈمڈ کر دیا جو ایک دوسرے سے بہت دور واقع ہیں علاوہ ازیں ان آیات کا روئے سخن ان کافروں کی طرف ہے جو باوجود سب کچھ دیکھنے کے خدا پر ایمان نہیں لاتے۔ گویا موجودہ دور کے ترقی یافتہ کفار تو خصوصیت سے ان کا ہدف ہیں لیکن الف نے ان کا رخ مسلمانوں کی طرف کر دیا ہے اور یہ باور کرانا چاہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کی حالت پر افسوس کر رہا ہے جو اپنی کوتاہیوں سے دنیا کی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔

بہر حال علمی و فنی اغلاط سے قطع نظر مجھے یہ عرض کرنا ہے می لارڈ کہ آخر اس طرح کے سرمن اور لکچر کا تعلق زیرِ بحث موضوع سے کیا ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ علماء میں بہت سی خامیاں ہیں وہ بہت سی ذمہ داریوں سے غافل ہیں۔ ان میں دین و ملت کے لئے پسینہ بہانے اور مرنے کھپنے کا جذبہ سرد پڑا ہوا ہے۔ وہ اصلاح معاشرہ پر شایانِ شان توجہ نہیں دے رہے ہیں اور ان کا

باہمی افتراق وانتشار بھی یقیناً قابلِ مذمت ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ بیداری اور حرکت و جنبش دینے کے لئے سب سے پہلے شریعت ہی میں تبدیلی اور ترمیم پر تُل جائیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی شخص اپنی فعالیت اور مستعدی کا ثبوت دینے کے لئے اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کا مظاہرہ کرے یا بجائے پیروں پر چلنے کے سر کے بل چلنے کا تماشا دکھائے۔ نہ معلوم خدا جانے کس اندازِ فکر کے نتیجے میں یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ مسلم پرسنل لا میں من مانی تبدیلیاں کرکے اس کے زوال و انحطاط کا کوئی مداوا ہو سکے گا جس میں ملتِ مسلمہ گرفتار ہے۔ یہ ایسا ہی خیال ہے جیسے لارڈ جیسے کوئی یوں سوچے کہ سمندر میں آیا ہوا طوفان ملاح کے سر کے بل کھڑے ہونے سے رُک جائے گا۔

افسوس الف ایک زیرک اور سنجیدہ اور تجربہ کار انسان ہوکر ایسی باتیں کر رہا ہے جو کسی بھی ذمہ دار شخصیت کو زیب نہیں دیتیں۔ میں جناب سے آخری بار التماس کرتا ہوں کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس پر بے لاگ تدبر فرمائیں۔ اگر میرے دلائل و براہین میں کہیں غلطی ہے تو اپنے تحریری فیصلے میں اس کی نشاندہی فرمادیں۔ میں آپ کا فیصلہ بخوشی اپنے تجلی ہی میں شائع کردوں گا اور آپ دیکھیں گے کہ مجھے اپنی کسی بھی غلطی کے اعتراف میں ادنےٰ تامل نہ ہوگا بشرطیکہ اسے مضبوط دلائل سے واضح کردیا جائے۔

لیکن اگر آپ نے کوئی تحریری فیصلہ نہ دیا تو میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گا کہ میری معروضات کی صحت سے آپ نے اتفاق کرلیا ہے۔

از قلم مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

تجلی کا سب سے پہلا اداریہ

تجلی کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سرورق پر "مذہبی" کا لفظ دیکھ کر بہتیرے نوّے فی صدی بھائی ورق گردانی کی زحمت گوارہ کئے بغیر ہی اسے ایک طرف ڈال دیں گے۔ ان کی طنز آلود نگاہیں زبانِ حال سے تحقیر آمیز انداز میں کہیں گی "دقیانوسی، فضول، رجعت پسندانہ!"

پانچ فیصدی ایسے ہوں گے جو محض عنوانات پر نگاہ ڈالنا کافی سمجھیں گے۔ ان کا اندازِ نظر کچھ ایسا ہوگا گویا صرف ورق گردانی ہی چھپے چھپائے ورق ریزیوں کی مناسب قیمت ہے۔ پانچ فی صدی مشکل سے ایسے ہوں گے جو پورے مضامین کا مطالعہ فرما سکیں گے۔ ان پانچ فیصدی سے ہی ہم گزارش کریں گے کہ اگر ان کے نزدیک ہماری یہ پیشکش کسی درجہ میں دینی خدمت کہلانے کی مستحق ہے۔ اگر اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے تو جس حد تک بھی ہو سکے اسے دوسروں تک پہنچانے اور اس کے نفع کو عام کرنے کی زحمت وہ گوارہ فرمائیں۔ اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے باعث یہ کہتے ہوئے تو ہمیں جھجک محسوس ہوتی ہے کہ "ادارہ تجلی" کے

ذریعہ ہم تبلیغ و دعوت کا کوئی وسیع سلسلہ پھیلائیں گے کیونکہ تبلیغ ایک اہم ترین ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونا ہم جیسے ہیچ مدانوں اور سیاہ کاروں کے لئے آسان نہیں، لیکن اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ ہمارے پیش نظر ایک بھولی ہوئی کہانی کی یاد دلاتا ہے — وہ کہانی جس نے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے فاران کے تپتے ہوئے ذرّوں کی گود میں جنم لیا تھا۔ وہ کہانی جس نے ایک سادہ فطرت نبی کے ہونٹوں سے قرآنی نغمے بن کر بے شعوروں کو شعور اور ناامیدوں کو امید عطا کیا تھا۔ وہ کہانی آگے ہی آگے بڑھتی گئی، پھیلتی گئی، چھاتی گئی — اس کہانی کو ترتیب دینے والے ہمارے ہی باپ دادا تھے۔ ہماری ہی طرح گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان تھے، ہماری ہی طرح ان کے سینوں میں ہمارا خواہشات سے بھرا ہوا دل بھی تھا، ان کے سروں میں خیر و کلفت اور افلاس و امارت کی تمیز کرنے والے دماغ بھی تھے، ان کے سامنے ان کی انفرادی الجھنیں اور اجتماعی مسائل بھی تھے۔ لیکن ہماری طرح انھوں نے دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ کر آخرت کو بیچ نہیں دیا تھا، ان کی باوقار گردنیں نفس کی چوکھٹ پر جھک نہیں گئی تھیں۔ انھوں نے اعتقادات کو محض کھلونا نہیں بنا لیا تھا وہ خدا اور رسول کی جس غلامی کا دعویٰ کرتے تھے وہ صرف زبانی نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے ایک ایک موئے تن سے، ایک ایک لفظ سے، ایک ایک عمل سے اس کا ثبوت بھی دیا تھا، انکی غلامی نے قیصر و کسریٰ کی آقائی پر ٹھوکریں ماری تھیں، ان کی غربت نے مغرور امارت کی گردنیں خم کی تھیں۔ وہ جدھر بھی گئے کامیابیاں ان کے ہمرکاب گئیں۔ وہ جہاں سے بھی گذرے انسانیت کے لازوال موتی بکھیرتے ہوئے گذرے۔ شام و روم کی طاقتوں میں انھوں نے اپنی اٹل سچائیوں کی شمعیں جلائیں۔ ایران و فارس کی محرابوں پر انھوں نے اپنے غیر فانی اصولوں کی مشعلیں روشن کیں۔ عدل و انصاف کے پھریرے لہراتے ہوئے وہ آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ آگے ہی آگے۔ شرابِ یقین سے سرشار، بیخوف، مطمئن، ان کے بازوؤں نے ٹوٹی ہوئی تلواروں سے توپوں کے سینے چیر دیئے۔ ان کے پھٹے ہوئے لباسوں نے دیبا و حریر کے جھلملاتے ہوئے ملبوسات پر حقارت کے شعلے الٹ دیئے۔ ان کے گرجتے ہوئے نعروں نے اونچے اونچے محلوں کی بنیادیں ہلا دیں۔ رستموں کے دل ہلا دیئے۔ قارونوں کے خزانے خاک کر دیئے۔ خون اگلتے ہوئے میدانوں میں جب زخموں سے چور چور ہو کر وہ فرشِ خاک پر گرے تو ان کی پاک زبانوں پر اللہ ہی کا نام اور رسولؐ ہی کا کلمہ تھا اور باطل کے فلک بوس ایوانوں میں جب وہ فاتح بن کر داخل ہوئے تب بھی ان کے ہونٹوں پر خالقِ برتر کی حمد و ثنا اور نبی پاک کی محبت کے نغمے ہی رقص کناں تھے۔ کونے کونے میں انھوں نے خدا کی بڑائی کے گیت گائے۔ ذرّے ذرّے کو ان کی پیشانیوں نے سجدوں کی تابانیاں عطا کیں۔ زندگی کے تقاضے ان کے غلام تھے۔ حالات کی الجھنیں ان کی باندیاں تھیں۔ یقین محکم ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ خوفِ الٰہی اور رقت سے ان کی خلوتیں معمور تھیں اور جلوت میں وہ ایک مجسمۂ عدل و شجاعت تھے۔ پیکرِ حلم و مروت تھے، رحیم و کریم تھے، عابد و زاہد تھے۔ انھوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا سیکھا تھا۔ انھوں نے زندگی کے تجربوں سے نتیجہ ملا کر آخرت کا شعور حاصل کیا تھا۔

لیکن آہ! آج ہم ہیں کہ زندگی کی وسعتِ خشک میں دیوانوں کی طرح ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ دل ویران، روحیں مردہ، ضمیر گھائل، دماغ مفلوج۔ نفس کے آستانے پر ہماری حیاتِ مجروح کبھی کے گھٹنے ٹیک چکی ہے۔ فکر و نظر کی بلندیوں سے ہم کبھی کے تاریک ترین پستیوں میں گر چکے ہیں۔ اسلام کے مدعی ہو کر ہم اپنے معاشرتی اور اقتصادی مسئلوں اور الجھنوں کا حل ملحدانہ نظریوں اور مادی فلسفوں میں ڈھونڈتے ہیں۔ اسبابِ ظاہری پر ہمارا تکیہ ہے۔ توہم اور ضعف و بزدلی ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔ نہ ہمارے سینوں میں خلوص و محبت کے اس بحرِ بے کنار کا کوئی قطرہ ہے جس نے غارِ ثور میں صدیق اکبرؓ کے سفینۂ زندگی کی آزمائش کی تھی، نہ ہمارے دلوں میں اس عدیم المثال پامردی و بسالت کی کوئی رمق ہے جس کی گھن گرج نعرۂ فاروقی بنکر باطل کے ایوان کبر و نخوت پر لرز رہی تھی۔ نہ ہم عثمانؓ کے اس صبر و یقین کا ذرا سا بھی پرتو رکھتے ہیں۔ جو انتہائی روح فرسا حالات میں راہِ تسلیم و رضا سے ایک انچ نہ ہٹ سکا تھا۔ نہ ہم علیؓ کے اس جذبۂ ایثار کے حصہ دار ہیں۔ جس نے رسول پاکؐ کے بستر پر علیؓ کو بے تکلف کافروں کی تیغ ہائے برّاں کے آگے رکھ دیا تھا۔ کچھ ہے تو بے دلی، بے حسی، بے عملی، ناامیدی اور بس!

کاش ہمیں احساس ہو۔ کاش ہم اپنے کردار پر توجہ دے سکیں۔ ... کاش!!

(ماخوذ از تجلی۔ نومبر ۱۹۵۳ء)

مولانا عامر عثمانیؒ

ایک ذہین ترین

اور

لاجواب محقق کی

حیثیت سے

مولانا عامر عثمانی نے اپنی جد و جہد کے ۲۷ سالوں میں حق اور حق پرستی کی طرفداری میں اتنا کچھ لکھا ہے کہ اس کا احصار اور اس کا احاطہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

انھوں نے تجلی کی مختصر زندگی میں بے شمار ایسے خاص نمبر نکالے ہیں جو علمی نچوڑ اور تحقیقات سے لبریز ہیں اور جن کا ہر لفظ مولانا کی ذکاوت، ان کے تفکر کی گہرائی، ان کے وسعت مطالعہ اور ان کی جہد و لگن کی شہادت دیتا ہے۔

"خلافت و ملوکیت نمبر" اور "طلاق نمبر" تو ان کی زندگی کی دو ایسی وقیع اور اہم کوششیں ہیں کہ ہند و پاک کا کوئی مذہبی رسالہ اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتا۔ ایسے ضخیم و طویل اور علم و تحقیق سے بھرے ہوئے "نمبر" دس صاحب قلم اور باصلاحیت قسم کے علماء بھی شاید مرتب نہ کرسکیں۔

خلافت و ملوکیت نمبر نکال کر انھوں نے ان غلط الزامات کی قلعی کھول کر رکھدی تھی جو یار لوگوں نے مولانا مودودی کے بارے میں پھیلا رکھے تھے اور جو سفید جھوٹ اور کالے فریب پر مبنی تھے۔ اور طلاق نمبر نکال کر انھوں نے دیوبند کے اس مسلک کی آبرو رکھ لی تھی جس کا سلسلہ امام ابو حنیفہؒ سے جا کر مل جاتا ہے۔ جماعت اسلامی کے افراد اور دیوبندی مسلک کے حاملین اگر احسان فراموش نہیں ہیں تو وہ مولانا عامر عثمانیؒ کی مذکورہ کوششوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکیں گے۔

علاوہ ازیں تجلی کے ۲۷ سالہ فائل میں اور بھی ایسے بے شمار تحقیقی مضامین موجود و محفوظ ہیں جن کی ابتداء انتہا مولانا کے بے مثال محقق ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ "سایۂ رسول" کی بحث کا جب فتنہ اٹھایا گیا تو چشم فلک نے دیکھا کہ بڑے بڑے زیرک اور دانشمند قسم کے آدمی اس فتنہ کے لپیٹ میں آگئے۔

اس نازک وقت میں مولانا عامر عثمانیؒ کے علم و قلم نے ایک انگڑائی لی اور دیکھتے ہی دیکھتے سایۂ رسول کی تحقیق وجود میں آگئی۔ اور اس تحقیق کے وجود میں آتے ہی سایۂ رسولؐ کے فتنہ نے دم توڑا اور فتنہ کی لپیٹ میں آجانے والے لوگوں پر دوا اور دو چار کی طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہماری طرح ایک انسان ہی تھے اور ہماری ہی طرح ان کا سایہ بھی ہوا کرتا تھا۔

اسے لطیفہ کہئے یا بدنصیبی کہ بعض دیوبندی حضرات بھی سایۂ رسولؐ کے بارے میں بریلویوں کے ہمنوا تھے۔ وہ بھی اسی ذہن سے سوچ رہے تھے جس ذہن سے بریلوی لوگ سوچا کرتے ہیں یعنی اس غلط قسم کی خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ آنحضورؐ کا سایہ ندارد تھا۔

مولانا عامر عثمانی کے علم و تحقیق نے تجلی کی پشت پر سوار ہو کر اپنا تنور اٹھا ندنی لٹائی اور فتنہ پرور اور سادہ لوح قسم کے مسلمانوں کے دل و دماغ کی تاریکیاں چھٹنے پر مجبور ہوگئیں۔

ہماری دعا ہے کہ حق تعالیٰ مولانا عامر عثمانی اور دیگر تمام محققین کی قبروں کو نور سے بھر دے جنھوں نے اپنے دن کا آرام و سکون اور راتوں کی نیندیں قربان کرکے تحقیقات کے دفتر مرتب کئے۔ امت مسلمہ قیامت تک ان تحقیقات سے مستفید ہوتی رہے گی۔

اب لیجئے سایۂ رسول کی وہ بحث ملاحظہ فرمائیے جو مولانا عثمانیؒ کو ایک ذہین ترین محقق ثابت کرتی ہے۔

٭ ٭ ٭



اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک — نہ زندگی نہ حرارت نہ معرفت نہ نگاہ

یاد ہوگا ہے! فروری و مارچ ۵۹ء کے مشترکہ شمارے میں ہم نے دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی صاحب کے ایک فتوے پر نقد کیا تھا جس کا تعلق سرورِ کائنات خاتم الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداہ امی وابی کے سائے سے تھا۔ خود ستائی نہیں، بلکہ تحدیثِ نعمت ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ ہمارے نقد نے بفضلہ تعالیٰ ایک خلافِ واقعہ عقیدے کی بیخ کنی اس مضبوطی کے ساتھ کی تھی کہ کسی غیر جانبدار اور انصاف پسند قاری کے لئے ریب و شک کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی اور کتنے ہی وہ لوگ جو معصومانہ لاعلمی کے باعث اس عقیدے کے دامِ فریب میں گرفتار تھے اپنے خیال سے دستبردار ہوگئے تھے۔ ہم ہند و پاک کے جرائد میں برابر دیکھتے رہے کہ کہیں ہمارے نقد پر کوئی کلام کیا جاتا ہے یا نہیں۔ بے شک کام کیا گیا اور کافی کیا گیا اور کرنا بھی چاہئے تھا۔ کوئی کیسا ہی بوگس اور کتنا ہی عقل سوز عقیدہ و خیال ایک مرتبہ شہرت پا جائے تو اللہ کی اس وسیع سرزمین میں کچھ نہ کچھ لوگ ضرور اس پر فریفتہ ہوکر رہتے ہیں اور پھر چاہے کتنے ہی شدومد سے اس کی تردید کی جاتی رہے یہ اس سے کان نہیں دھرتے۔ خصوصاً جب اس عقیدہ و خیال کا داخلی رشتہ جذبات کے تاروں سے جاملا ہو تو اس کا استیصال جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔ یہی سائے کی بحث میں ہوا۔ نقد کے سلسلے میں ہمارے دلائل اگرچہ فیصلہ کن اور تسلی بخش تھے، لیکن جذباتی لگاوٹوں کے آگے بیچارے دلائل کو کون پوچھتا ہے۔ اپنے پیارے پیغمبرؐ کو بشریت کی سطح سے اونچا لے جاکر الوہی صفات سے متصف کرنے اور ان کی توصیف و منقبت میں زمین و آسمان ایک کر دینے میں جذباتِ عقیدت کے لئے جو آسودگی اور لذت ہے وہ علم و عقل کی سپاٹ ترغیبات میں کہاں۔ حقائق کا کھرا پن کام و دہن کو جذبات و خواہشات کا وہ ریشمی گداز کیونکر دے سکتا ہے جو اوہام و تخیلات کی لگاوٹیں دیا کرتی ہیں۔ عقیدت کی بیتابیوں کے ہاتھ تو بمشکل ایک روایت آئی تھی جس سے اپنے محبوب پیغمبرؐ کے جسدِ مبارک کو "بے سایہ" قرار دیکر نصرانیوں کے "ابن اللہ" سے آنکھ لڑانا ممکن ہوگیا تھا اور انھیں عالم الغیب، حاضر و ناظر اور فوق البشر قرار دینے کے دعاوی کیلئے ایک مضبوط تائیدی شہادت کا منہ دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ اب عامر عثمانی یا اور کوئی گستاخ اس نعمت غیر مترقبہ کو علم و استدلال کے ذریعہ چھین لینا چاہے تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے استسقا کے مریض سے

سرد و شیریں پانی کا گلاس چھیننے کی کوشش کی جائے۔ مریض کو اگر اپنے مرض کا علم و احساس ہو تب تو ممکن بھی ہے کہ سمجھانے بجھانے سے صبر کی سل سینے پر رکھ لے، لیکن جو مریض اپنے کو ہر طرح صحت مند گمان کر رہا ہو وہ کیسے ناصح کی فہمائش کو وزن دے سکتا ہے۔ وہ تو علم و منطق کی ہر اپیل ٹھکرا کر غٹ غٹ گلاس خالی کر جائے گا حد ہے خدا کی مملکت میں خدا ہی کے وجود سے انکار کرنے والے بھی نہ صرف موجود ہیں بلکہ دندنا رہے ہیں۔ تب بیچارے زودعی عقائد میں اگر کچھ باطل و فاسد مزعومات و مفروضات نے جڑیں پکڑ لی ہوں تو کیا تعجب۔ علمی و عقلی دلائل اگر الحاد کی تقدیر نہیں بدل سکتے تو جزوی اختلافات میں ان کی بے بسی و ناکامی پر حیرت کیوں ہو۔ مانا کہ ہم نے صریح و محکم دلائل پیش کر دئیے تھے، مگر ان کے رد میں متعدد مضامین مختلف جرائد میں آئے کسی نے غصہ دکھایا، کسی نے تالی بجائی، کسی نے منہ چڑایا کسی نے ناصح مشفق کا پارٹ ادا کیا۔ ہم نے ٹھنڈے دل سے تلاش کرتے رہے کہ ان تبرکات میں کہیں کوئی سنجیدہ اور عالمانہ تحفہ مل جائے تو اسے سینے سے لگائیں، اس پر غور کریں اور جو کچھ تاثر ہو اسے تجلی کے صفحات میں پھیلا دیں۔ لیکن حاصلِ تلاش کچھ نہ نکلا۔ ایک بھی اللہ کے بندے نے رد و جرح میں وہ متین و دقیع راہ اختیار نہیں کی جس پر توجہ دینے کو طبیعت چاہتی۔ نہ سلیقے سے ہمارے دلائل کا رد کیا نہ ڈھنگ سے اپنے شواہد پیش فرمائے۔ بس ادھوری اور تیسرے درجے کی باتیں جن میں طنطنہ زیادہ اور وقار کم تھا۔ جن میں اندر سے باہر تک غصے اور کم فہمی کی لالہ کاری تھی۔ ایسی چیزیں تعاقب کے لائق نہیں ہوا کرتیں، بلکہ ان کا صحیح مصرف یہ ہوتا ہے کہ پڑھ کر ان کے لکھنے والوں کے حق میں دعائے خیر کی جائے اور اپنے کام میں لگ جایا جائے۔

لیکن اے خوشا آرزو ایں ہمت، دنوں بعد آخرکار ایک لائق تعاقب چیز سامنے آ ہی گئی ہے جو اپنے معیار نگارش کے لحاظ سے نہ سہی مگر مطالب کے اعتبار سے اس لائق ہے کہ اس پر گفتگو کی جائے۔ ہمارا پچھلا نقد صرف ایک فتوے کے دائرے تک محدود تھا۔ اس بار انشاء اللہ اس پار عوب کھل کر گفتگو کریں گے اور مبحث کے ہر پہلو کا جائزہ پوری طرح لیں گے۔ کیونکہ ملتان (پاکستان) کے ایک ماہنامے نے مستقل "ظل نمبر" نکالا ہے جس میں مدیر مسئول جناب سعید احمد کاظمی کی طرف سے پونے بیالیس صفحات میں اس خیال کی توثیق و تصویب کی گئی ہے کہ رسول اللہ کا سایہ نہیں تھا اور فاضل مدیر نے اپنی دانست میں تجلی کے تمام مثبت و منفی دلائل کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا ہے انھوں نے اپنی شاندار بحث کے دوران میں متعدد بار نہایت فخر و ادعا کے ساتھ اس طرح کی باتیں کہی ہیں کہ اب ہمارا دعویٰ سورج کی طرح روشن ہو گیا۔ اب ہمارے موقف کی صحت میں شمہ برابر شک نہیں رہا۔ اب منکرین ظل کی بے نوری و بے سوادی صاف ظاہر ہو گئی۔ وغیر ذلک۔ ان خوش فہمیوں پر ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں اور التماس کرتے ہیں کہ ان کے زمودات پر جو کچھ ہم عرض کرنے چلے ہیں اسے بھی وہ شگفتہ مزاج اور کھلے دل سے ملاحظہ فرمانے کی زحمت اٹھائیں۔ انھوں نے چونکہ منکرین ظل کے سارے ہی مثبت و منفی دلائل جمع فرمائے ہیں، اس لئے اس بار کی گفتگو شاید اس مبحث پر فیصلہ کن بھی ہو جائے اور آئے دن کی چھیڑ چھاڑ سے فراغت مل جائے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اگر جناب کاظمی صاحب کے ذہن و مزاج کا کچھ تعارف انھی کی تحریر سے ہو جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ ہمیں پہلے بھی یقین تھا اور اب بھی یقین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ ہونے کی بے اساس بات صرف ایسے ذہنوں کو ہضم ہو سکتی ہے جو یا تو طبعاً وہم پرست، مبالغہ کیش اور عجائب پسند ہوں، یا پھر جذباتی مغلوبیت نے ایک حادثے اور اتفاق کے طور پر ان کے قدرتی سسٹم پر کوئی ایسا ہی برا اثر ڈال دیا ہو جیسا بخار آدمی کے نظام کام و دہن پر ڈالا کرتا ہے۔

بجا کہ اسلاف میں بعض ایسے بزرگ بھی سایہ نہ ہونے کی بے اصل بات کے فریب میں آ گئے ہیں جن کے علم و فضل پر انگلی مشکل ہی سے اٹھائی جا سکتی ہے۔ جن کے ذہنوں کو فاسد کا سد کہنا بے جا جسارت ہوگی اور جن کی عام قدر و منزلت شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن بے شک ہے وہ انبیاء نہیں تھے معصوم بھی نہیں تھے، تابعی بھی نہیں تھے، بلکہ ہمارے ہی جیسے

امتی تھے جو زہد و عبادت کے ذریعہ امام و قطب اور شیخ و مرشد تو بن سکتے ہیں، لیکن خطا و نسیان سے بالاتر نہیں ہو سکتے جنکی عظمت کے آگے معتدل حد تک تو لازماً سرِ عقیدت خم کرنا ضروری ہوا کرتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ازراہِ بشریت اگر ان سے کوئی علمی و فکری کوتاہی ہو جائے تو اس کوتاہی کو سر آنکھوں پر رکھنا اور اس کی تردید میں زبان نہ کھولنا بھی لازم قرار دیا جائے۔ ان کے بارے میں تفصیلی معروضات ہم بحث کے اس حصہ میں پیش کریں گے جہاں اقوالِ سلف کی گفتگو چھڑے گی۔

فی الوقت آپ کاظمی صاحب کے ذہن و مزاج کا جزوی اندازہ لگائیں۔ وہ شروع ہی میں رقمطراز ہیں :۔

"تقریباً ایک مہینہ ہو گیا کہ مختلف اور متعدد مقامات سے احباب کے پیغامات آ رہے ہیں ماہنامہ تجلی دیوبند اور تنظیم اہلِ حدیث لاہور وغیرہ رسائل میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمِ اقدس کا سایہ ثابت کرنے کے لئے زوردار مضامین شائع کئے گئے ہیں اور اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ "نفی الفئ عمن نورہ انار کل شیٔ" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے پر تحریر فرمایا ہے اس پر اچھی طرح پھبتیاں کسی گئی ہیں اور اس کا خوب مذاق اڑایا گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ صحیح حدیثوں سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا سایہ ثابت کیا گیا ہے۔ جنھیں پڑھ کر عامۃ المسلمین نہایت مضطرب اور متعجب ہیں۔ اس لئے ان حدیثوں کے جوابات اور اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ مبارکہ کی تائید و توضیح نہایت ضروری ہے تاکہ مسلک اہلِ سنت بے غبار ہو جائے اور کسی قسم کا خلجان باقی نہ رہے"۔

ان متعدد سطور میں ذرا ان فقروں پر چشم توجہ ڈالئے جنپر ہم نے خط کھینچ دیا ہے۔ ان فقروں کے مفہوم کی نسبت اگرچہ "احباب" کی طرف کی گئی ہے، لیکن الفاظ احباب کے نہیں بلکہ خود کاظمی صاحب کے ہیں لہٰذا ان کے ذریعہ خود کاظمی کی ذہنی کیفیت کا سراغ لگا لینا بے جا نہ ہو گا۔ ہماری اس حرکت کو آپ شاید "مہندی کی چندی" یا "بال کی کھال" سے تعبیر کریں۔ لیکن نفسیات کے کسی طالب علم سے پوچھئے کہ کبھی کبھی تجزیہ و تحلیل کی خراد پر چڑھے ہوئے ایک ہی فقرے یا ایک ہی ادا کے پردے میں آدمی کا باطن کس طرح منہ سے بولتا ہے۔

سایہ نہ ہونے کے فتوے پر نقد فروری و مارچ ۵۹ء کے تجلی میں شائع ہوا تھا۔ گویا ایک سال سے بھی زیادہ گذرا۔ اسکے بعد اگر کبھی تجلی میں اس موضوع کا ذکر آیا ہے تو محض ضمناً اور سرسری اب سوا سال بعد اپریل و مئی ۶۰ء میں کاظمی صاحب کا یہ ظاہر کرنا کہ احباب نے بس تقریباً ایک ہی مہینہ سے توجہ دلائی ہے، اس قدر عجیب ہے کہ قیاس و درایت کا کلیجہ منہ کو آتا ہے اس اظہار سے شاید یہ تأثر دینا مقصود ہے کہ سایہ نہ ہونے کے بارے میں تجلی یا کسی اور نے جو دلائل سامنے رکھے ہیں ان کی کمزوری واضح کرنے میں ہمیں کسی فکر و تلاش کی احتیاج نہیں ہوئی بلکہ ہم تو اطلاع ملتے ہی انھیں ادھیڑ کے جھٹکے دے رہے ہیں اور اپنے عقیدۂ و مسلک کے اثبات میں بے شمار دلائل قاطعہ کا انبار چشم زدن میں آگے رکھ رہے ہیں۔ یہ تأثر ہے شاندار۔ معلوم نہیں فقہ اسے گناہ ثواب کے کس خانے میں رکھے گی۔ ہم تو اتنا ہی جانتے کہ اس مقام پر صاحب موصوف کی فکری دیانت اور علمی خلوص زلف جاناں کی طرح پیچ و خم کھا گئے ہیں۔

دوسرے خط کشیدہ فقرے پر غور کرنے سے ذہن کا ایک اور دریچہ کھلتا ہے۔ اخباری زبان میں تو اس طرح کی خبریں غیر معمولی نہیں کہی جا سکتیں کہ فلاں شہر میں ایک آدمی نے دوسرے کا سر پھاڑ دیا جس سے سارے شہر میں غم و غصے کی لہریں دوڑ گئیں لیکن جب سنجیدہ علمی و نظری مباحث میں بھی کوئی بزرگوار یہی زبان اختیار کریں تو ان کے مذاق و مزاج اور متانت و ثقاہت کے بارے میں ایک مجموعی اندازہ قائم کرنے کے لئے کسی جاسوس کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ "اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلویؒ" کو اپنا مقتدیٰ ماننے والوں کی تعداد ہند و پاک میں آٹے میں نمک کی برابر ہو گی۔ یا چلئے آٹے میں بھوسی کی برابر کہہ لیجئے اور رسول اللہ کا سایہ نہ ہونے کا عقیدہ اگرچہ عوام میں

بسبب جہالت عامہ کے کافی شہرت پاگیا ہے لیکن اس کی حیثیت ایک سنی سنائی بات سے زیادہ نہیں اور جن عوام نے تجلی کا متعلقہ نقد پڑھ لیا ہے ان میں سے چند ہی ایسے نکلیں گے جنھیں اضطراب لاحق ہوگیا ہو ورنہ تقریباً سبھی نے قرار و سکون کی کیفیت محسوس کی ہے اور بالکل مطمئن ہوگئے ہیں کہ زیر بحث عقیدہ واقعی بے بنیاد ہے جس کے لئے عقل و نقل میں کوئی معتبر دلیل موجود نہیں۔

اس کے باوجود ایک محدود ترین گروہ عوام کے اضطراب کو عامۃ المسلمین کا اضطراب تعبیر ظاہر کرنا کیا غم و غصّے کی اُن لہروں سے کچھ مختلف ہے جو اخبار والے ذرا ذرا سی بات میں دوڑایا کرتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے دیگ کا بس ایک چاول دیکھ کر پوری دیگ کے بارے میں فیصلہ کرنے والے ماہر نفسیات رہے ہوں گے۔ افتتاحی سطور کے مذکورہ نمونے میں قارئین اگر غلو پسندی اور سخن سازی کی بو باس نہ سونگھ سکیں تو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ علم النفس کے کچھ اسباق ضرور پڑھیں۔

تیسرا خط کشیدہ فقرہ بھی خاصا دلچسپ ہے چشم بد دور قبوری شریعت اور دین مردہ پرستی کے شہسواروں کا یہ عام طرز عمل ہے کہ وہ خود کو ڈنکے کی چوٹ خالص "اہل سنت" کہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی ساری آئیڈیالوجی اور فکر و بصیرت کی پوری کائنات سنتِ رسول کی بجائے اوہام و وساوس کے جس محور پر گھومتی ہے اس میں اور سنتِ رسول میں تقریباً وہی نسبت ہے جو ندی کے دو کناروں میں ہوتی ہے کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ اس کے برخلاف یہ کرم فرما امتِ مسلمہ کے اس سوادِ اعظم کو وہابی، مودودی، دیوبندی، بدعقیدہ اور نہ جانے کیا کیا نام دیتے ہیں جو ان کے طبعزاد عقائد کی تائید نہیں کرتا اور قرآن و سنت ہی کو مدار و معیار قرار دیتا ہے۔ یہ مزید ار طرزِ عمل ظاہر ہے ایسے ہی اہلِ کمال کا ہوسکتا ہے جنھوں نے تعصب کو دلیل، تخیل کو دلیل، تنگ بندی کو اجتہاد اور ہاتھ کی صفائی کو تفقہ فی الدین کا ہم معنی سمجھ لیا ہو۔ دیکھ لیجئے کاظمی صاحب نے کس برجستگی سے "مسلک اہل سنت" کے الفاظ نقل کر دیئے ہیں۔

الفاظ مفت کی دولت ہیں کیوں انھیں لٹانے میں کنجوسی کی جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ حقیقی دنیا کر وہ شعر کی زبان میں نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں "اہل سنت" ہوگا اور قرآن و سنت کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی بھی مرحلے میں ذہن و بصیرت کی باگ ڈور جذبات اور ذاتی میلانات و مرغوبات کے ہاتھوں میں نہیں دے گا وہ قیامت تک ایسی بے سر و پا اور فتنہ انگیز حرکت نہیں کریگا کہ جس پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشریت کے اثبات میں اللہ جل شانہٗ متعدد صریح و محکم آیات نازل فرما رہے ہیں اور جس کی بشریت عین مشاہدہ اور تمام عالم کے نزدیک حقیقت ثابتہ ہے اسے حدودِ بشریت سے باہر لاکر مادی و طبعی اوصاف و لوازم سے بالاتر ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ وہ سایہ نہ ہونے کی بات سنکر جھومے گا نہیں کہ میرے نبی کی شان بڑھ رہی ہے بلکہ خطرے کی آہٹ پاکر چونک پڑے گا کہ یہ تو قصرِ نبوّت میں وہی چور دروازہ کھولا جا رہا ہے جس کی راہ سے مسیح ابن مریمؑ اللہ کے بیٹے بنائے گئے اور محمد رسول اللہؐ کو عالم الغیب و ماورائے بشریت قرار دیا گیا۔ نعوذ باللہ۔

ہزاروں ہزار علماء و ائمہ میں شاید گنے چنے ایسے نکلیں جنھوں نے اپنے خاص احوال یا جذباتی مغلوبیت یا اپنی افتاد طبع یا کسی ہنگامی ترغیبِ ذہنی کے تحت رسول اللہؐ کا سایہ نہ ہونے کو واقعہ گمان کر لیا ہو۔ باقی جملہ اکابرین کے عقیدہ و مسلک کی فہرست اس عقیدے سے یکسر خالی ہے۔ پھر بھی کسی شخص کا اس افواہ کو "مسلک اہل سنت" قرار دینا اسکے سوا کیا معنی رکھتا ہے کہ یا تو وہ چند کے سوا سبھی علمائے سلف و خلف کو سنت کی راہ سے ہٹا ہوا سمجھتا ہے یا پھر اپنے مسلک کو منوانے کے لئے ایک شاندار تاریخی شعبدہ دکھلا رہا ہے۔ یا پھر ایسی عینک لگائے ہوئے ہے جو گز دو گز سے آگے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یا پھر اس اصطلاح کے اسنے ایسے پر اسرار معنی متعین کر لئے ہیں کہ اس کے اپنے گروہِ مختصر کے سوا کسی کو بھی ان کی ہوا نہ لگے۔

کچھ بھی ہو ہمارے نزدیک کاظمی صاحب کی مذکورۃ الصدر عبارت سمجھداروں کے لئے بیر ومیٹر سے کم نہیں۔ یہ لفظ برا لگے تو مقیاس کہہ لیجئے۔ لیکن جو قارئین اس طرح کی باریک باتوں کو پسند نہ فرما رہے ہوں وہ گھبرائیں نہیں کہ یہ تمہیدی حروف تو محض ان لوگوں کے لئے ہیں جو باریک بینی سے مزا لیتے ہیں ورنہ ان کو تسلیم کرانے پر ہم کو اصرار نہیں ہے اور آگے ہم کاظمی صاحب کی ہر مثبت و منفی دلیل کے ایک ایک پہلو کا جائزہ عام فہم انداز میں لیں گے اور اللہ کی ذات سے امید رکھتے ہیں کہ ہمارا یہ جائزہ انشاء اللہ ثم انشاء اللہ اس موضوع پر حرف آخر ہوگا۔ ہاں اُن بہادروں کی زبان بندی کرنا کسی کے بس میں نہیں جنھوں نے طے ہی کر لیا ہو کہ اپنی کہے جاؤ دوسروں کی مت سنو، یا سنو تو اس کان سُنو اس کان اڑا دو اور سیر بھر سونے کے مقابلہ میں دو سیر پیتل ترازو کے پلڑے میں رکھ کر چیخا کرو کہ دیکھو صاحبو! ہمارا پلہ بھاری رہا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اس بحث میں ہمیں بریلویوں سے ہی نہیں بعض دیوبندی علماء سے بھی عہدہ برآ ہونا ہے۔ اسی لئے کافی سر کھپانے کا ارادہ کیا ہے۔ دوسرے گروہوں کی طرح ہم دیوبندیوں کا گروہ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ بدعت نوازی اور کج فکری بس دوسروں ہی کا حصہ ہے۔ دیوبندی مکتبۂ فکر کے علماء واتقیا وہ جو چاہے کریں، جو چاہے سوچیں سو فیصدی حق ہوگا۔ مزید لطف یہ ہے کہ "اہل سنت والجماعت" کا جو بورڈ اہل بدعت نے اپنے یہاں ٹانگ رکھا ہے وہی ہم نے بھی ٹانگ لیا ہے اور ہم دونوں ہی مدعی ہیں کہ بورڈ کے اصلی مالک ہم ہیں، دوسرا تو جھوٹا اور غاصب ہے۔ کوئی شک نہیں کہ ایک زمانہ تھا جب یہ اصطلاح اپنی مناسب وضعی حدود میں استعمال ہوتی تھی اور اس کے استعمال کا فائدہ ظاہر و باہر تھا۔ لیکن زمانہ کے ہاتھوں جہاں اور بے شمار الفاظ و اصطلاحات کی مٹی پلید ہوئی وہیں اس کا بھی خانہ خراب ہوا۔ اب تو اس کی مثال اس گھی کی سی ہے جو اصلی کے نام سے بازار میں بکتا ہے۔ عموماً تو پچیس سے لیکر اسّی فیصدی تک نقلی ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی گھی والا صد فیصد اصلی لے آئے تو اس پر وثوق و اطمینان کا عوام کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ ایسے حالات میں اس اصطلاح کو بطور استدلال لانا عامیوں کو مرعوب کرنے تو کرے خواص اور اہل دانش اسے اہمیت نہیں دیں گے۔ ہاں شیعیت کے بالمقابل بولی جائے تب اس کا فائدہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

تمہید بہت ہولی۔ اب اصل بحث پر آیئے۔ منکرین ظل (حضورؐ کے سائے سے انکار کرنے والوں) کے وہ تمام دلائل جو کاظمی صاحب نے جمع فرمائے ہیں چار خانوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں:-

(۱) قرآن (۲) حدیث (۳) عقل و درایت (۴) اقوال سلف

ہم چاہتے ہیں کہ ان پر علی الترتیب گفتگو ہو تاکہ بات آئینہ ہو جائے۔ ویسے کاظمی صاحب نے چونکہ نظم و ترتیب کا التزام نہیں کیا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے بحث کے کسی مرحلہ میں ایک سے زیادہ نوع کے دلائل پر ایک ساتھ گفتگو ہو جائے تو اسے مجبوری سمجھئے گا۔ ہمیں یہ بھی احساس ہے کہ نقد کا جو اسلوب ہم نے اختیار کیا ہے وہ کافی طوالت طلب ہے، لیکن متعدد وجوہ سے طوالت ہی ضروری معلوم ہوئی۔ ایک تو وہی مذکورہ وجہ کہ گفتگو صرف بریلویوں ہی سے نہیں، بعض علمائے دیوبند سے بھی ہے۔ مسئلہ کے ہر گوشہ کو اتنا منقح اور مصفّیٰ کر دینا ضروری ہے کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی نظر آجائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کاظمی صاحب نے ۴۸ صفحات میں حوالوں اور عربی عبارتوں اور بزرگوں کے ناموں کا اتنا بہت سا ڈھیر جمع کر دیا ہے کہ عوام بیچارے سہم کے رہ گئے ہوں گے۔ اس سہم کو دور کرنے کے لئے ہم بھی اس ڈھیر کو کریدنے اور قوی تر مواد کا انبار لگانے کا جھمیلا لے بیٹھے ہیں ورنہ جہاں تک پڑھے لکھے اور ہوشمندوں کا تعلق ہے ان کے لئے ہمارا وہ پہلا ہی نقد جس کا ہم شروع میں ذکر کر آئے ہیں ایسا فیصلہ کن تھا کہ کسی کی این و آں اب ان پر قیامت تک اثر نہیں کر سکتی۔ لہٰذا قارئین طول کے لئے معاف کریں۔ ہم کوشش کریں گے کہ یہ طول بے مزا نہ ہو۔

سب سے پہلے "محلِّ نزاع" کو کاظمی ہی صاحب کے الفاظ میں دیکھ لیجئے:-

"اہل سنت (؟) کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے

حبیب حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بشری
جسم اقدس کو ایسا لطیف و تلطیف اور پاکیزہ و مطہر
کر دیا تھا کہ اس میں کسی قسم کی عنصری اور مادی
کثافت باقی نہ رہی تھی۔ اس لئے چاند، سورج،
چراغ وغیرہ کی روشنی میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم
تشریف فرما ہوتے تھے تو جسم اقدس اس روشنی کے
درمیان حائل نہ ہوتا تھا اور دیگر اجسام کثیفہ کی طرح حضور
علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے جسم پاک کا کوئی تاریک
سایہ نہ پڑتا تھا۔"

الفاظ جوں کے توں نقل کئے گئے ہیں۔ بعض الفاظ پر صرف خط ہم نے کھینچا ہے۔ اس سے تفہیم میں آسانی رہے گی۔ سلیم الطبع اور عدل پسند حضرات کے لئے تو اس نام نہاد نہاد مسلک کی لغویت کسی لمبی گفتگو کی محتاج نہیں۔ ان سالکین سے کوئی پوچھے بول و براز، منی، تھوک وغیرہ عنصری اور مادی کثافتیں ہیں یا نورانی لطافتیں؟ کیا اب یوں بھی کہیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حوائج ضروریہ سے مبرا تھے؟ ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ:-

"کسی قسم کی عنصری اور مادی کثافت باقی نہیں رہی تھی"۔

قاعدہ ہے کہ اذا ثبت الشئ ثبت بجمیع لوازمہ (جب کوئی چیز ثابت ہوتی ہے تو اپنے تمام لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے) اس قاعدے کو خود کاظمی صاحب نے بھی ص۱۹ پر بیان فرمایا ہے اور معصومیت دیکھئے کہ اپنی تائید میں بیان فرمایا ہے کہتے ہیں کہ جب حضور کا نور ہونا ثابت ہو گیا تو لازمی طور پر سایہ نہ ہونا بھی ثابت ہو گیا، کیونکہ سایہ نہ ہونا لوازم نور ہے۔

حیرت ہے نور کا صرف یہی ایک لازمہ انھیں یاد رہ گیا کہ اس کا سایہ نہیں ہوتا باقی تمام لوازمات دماغ کے کسی خفیہ گوشے میں جا چھپے۔ اگر رسول اللہ کو سائنسی اور طبعی معنوں ہی میں "نور" ثابت کرنے کا سودا سر میں سمایا ہے تو یہ لوازمات بھی پیش نظر رہنے چاہئیں تھے کہ نور حقیقی پاخانہ پیشاب نہیں کرتا۔ کھانا نہیں کھاتا شادی کرنے اور باپ بننے سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ نہ وہ چیز (اپنے محل وقوع) کو بھرتا ہے نہ اس پر تیر تلوار اثر کرتے ہیں۔

وغیر ذلک۔ آخر بجمیع لوازمہ کے بعد سارے لوازم لیس سایہ نہ ہونے ہی میں کیسے سمٹ آئے!۔

ہم سمجھتے ہیں اتنی ہی بات مذکورہ مسلک کا اہمال ظاہر کرنے کے لئے کافی وافی ہے۔ لیکن ہم نے تو ایک ایک دلیل کو توڑنے کا تہیہ کیا ہے۔ اس لئے آئیے تفصیل میں چلیں۔ کاظمی صاحب فرماتے ہیں:

" سایہ نہ ہونے کی اصل دلیل ہمارے نزدیک وہ آیات
قرآنیہ مرقومہ بالا ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو
نور فرمایا گیا ہے۔ نیز وہ احادیث مذکورۃ الصدر ہیں
جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہم کامل نورانیت
ثابت کر چکے ہیں اور سایہ نہ ہونے کی روایات ان
آیات و احادیث کے مضمون کو مؤید ہیں ایسی صورت
میں ان کا ضعف کسی حال میں بھی ہمارے لئے مضر
نہیں" ص۳۶

کسی عاقل پر پوشیدہ نہیں کہ کسی دعوے کی اصل دلیل جس درجے کی ہو اسی درجے میں وہ دعویٰ لائق رد و قبول ہوا کرتا ہے اور تائیدی شہادتوں کی قدر و قیمت بھی اصل دلیل ہی کے وزن و قوت پر منحصر ہے۔ پھر یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ جس درجہ کا دعویٰ ہوگا اسی درجہ کی دلیل بھی درکار ہوگی۔ آپ معمولی سا دعویٰ کریں تو معمولی دلیل بھی چل سکتی ہے۔ لیکن بہت بڑا دعویٰ کرنے کی صورت میں بہت مضبوط دلیل دینی ہوگی۔ آپ کہتے ہیں فلاں شخص پر میرا ایک روپیہ قرض ہے۔ اس قول کو بہت معمولی سی دلیل پر بھی قبول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ کہیں کہ زید پر میرے بیس ہزار روپے قرض ہیں تو اس کے لئے معمولی شواہد و دلائل کافی نہ ہوں گے، بلکہ آپ کو صریح و محکم طور پر ثبوت لانا ہوگا اور ذرا سی بھی شک کی گنجائش نکل آئی تو اس کا فائدہ مدعا علیہ کو پہنچے گا اور آپ کا دعویٰ منہ پر مار دیا جائے گا۔

منکرین ظل کا حال یہ ہے کہ دعویٰ تو کرتے ہیں ایک انتہائی غیر معمولی اور مہتم بالشان، وہ منوانا چاہتے ہیں کہ تمام مادی کائنات کے ایک ازلی و ابدی قاعدے اور ایک اٹل حقیقت کے برخلاف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم سائے سے مبرا تھا۔ یہ جتنا عظیم الشان دعویٰ ہے محتاج بیان نہیں، لیکن ان کے دلائل د

شواہد کا حال یہ ہے کہ انھیں شاعری اور تک بندی کہنا بھی مشکل ہی ہے، جیسا کہ ابھی ہم ثابت کریںگے ان کی اصل دلیلوں میں اتنی بھی جان نہیں جتنی چیونٹی میں ہوتی ہے اور ان سے کہیں زیادہ وزنی استدلال تو ان نصرانیوں کا ہے جو قرآن کی آیت إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ کو مسیح علیہ السلام کی ابنیت و الوہیت کے ثبوت میں لاتے ہیں، اس میں مغالطہ دہی کے لئے کم سے کم منطقی تُک تو ہے، لیکن منکرین ظل کے یہاں سرے سے تُک ہی نہیں بلکہ ایک جذباتی ترنگ کو انھوں نے برہان و حجّت تصوّر کر لیا ہے۔

لیجئے ان کی اصل دلیلوں کو دیکھئے۔ مذکورہ عبارت میں انھوں نے "جو آیات قرآنیہ مرقومہ بالا" کے الفاظ لکھے ہیں تو ان سے ان کا مقصود دو آیتیں ہیں جو انھوں نے ذکر کی ہیں۔ ایک قد جاء کم من اللہ نوراً اور دوسری وہ جس کے صرف دو لفظ سراجاً منیراً بلا حوالہ لکھ دیئے گئے ہیں، پوری آیت نہیں لکھی۔ علی الترتیب دونوں کا حال درج ذیل ہے:-

قرآن

پڑھے لکھے ہی نہیں، جاہل اور عامی بھی جانتے ہیں کہ دنیا کے ہر ملک اور ہر زبان میں استعارے، کنائے، تشبیہیں اور مثالیں وغیرہ اس قدر عام ہیں جیسے ہوا اور پانی۔ قرآن ہو، حدیث ہو، عربی ہو، اردو ہو، ادب ہو، فلسفہ ہو، روزمرہ ہو، تحقیق ہو، خطبہ ہو، وعظ ہو۔ ہر جگہ قدم قدم پر مجازی طرز کلام اور کنایاتی اسلوب سے لازماً واسطہ پڑے گا۔ یہ کنائے اور مجازی پیرائے بنی نوع انسانی میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ عام طور پر انھیں جاہل اور کم عقل بھی بلا تکلف سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ استعارے کو حقیقی معنی میں لے کر وہ بات کا بتنگڑ بناتے پھریں۔ مگر بعض ذہنی مریضوں کی دو ایک مثالیں ہم آپ کے سامنے رکھتے ہیں۔ ذرا بتلائیے تو انھیں آپ عقلاء کے کس طبقے میں شمار کریں گے۔

پہلی مثال

زید، بکرے کے تیز بھاگنے کی تعریف کر رہا تھا زید کے شیخ نے کہا — "واقعی بکرا برق رفتار ہے"۔

اس پر زید نے بعض لوگوں سے برق کی طبعی رفتار دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ ایک لاکھ اسی ہزار میل فی سکنڈ۔ اب تو وہ دعویٰ کرتا پھرتا ہے کہ بکرا ایک لاکھ اسی ہزار میل فی سکنڈ دوڑ سکتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ خرافات مت بکو۔ زید چیختا ہے تو کیا ہمارے شیخ جھوٹ بولتے ہیں؟ جواب ملتا ہے کہ نہیں بھائی شیخ جھوٹ نہیں بولتے تمہارا دماغ خراب ہوا ہے۔ زید ہرگز نہیں مانتا اور پوری طرح مطمئن ہے کہ بکرا اور برق کی طبعی رفتار ایک ہی ہے!۔

دوسری مثال

طلحہ، نعمان کے بیدھے پن کا ذکر کر رہا تھا۔ کہنے لگا — "وہ بیچارا تو گائے ہے گائے"۔

یہ فقرے اختر نے بھی سنے۔ وہ جانتا تھا کہ نعمان جھوٹ ہرگز نہیں بولتا۔ پس اس وقت سے اسے یہ یقین ہو گیا کہ نعمان دودھ بھی ضرور دیتا ہوگا۔ اب وہ تحقیق کر رہا ہے کہ دودھ کا یومیہ اوسط کیا ہے؟۔

اس طرح کی دسیوں مثالیں آپ چٹکی بجاتے سوچ سکتے ہیں تفنّن نہیں حقیقت ہے کہ آیاتِ قرآنیہ سے منکرین ظل کا استدلال کم و بیش اسی نوعیت کا ہے۔ ذرا سوچئے جب تحریر و تقریر میں ہم کسی ایک چیز کو دوسری چیز کا نام دیتے ہیں تو کیا آپ کے فرشتے بھی گمان کر سکتے ہیں کہ اس دوسری شے کی تمام تر حقیقت طبعی پہلی شے میں فرض کی جا رہی ہے۔ مثلاً ہم نے موٹے آدمی کے بارے میں کہا کہ "ہاتھی ہے ہاتھی" تو کیا آپ بھول کے بھی اس کا یہ مطلب لے سکیں گے کہ اس شخص کو بہمہ وجوہ ہاتھی کہا جا رہا ہے۔ ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص "آگ ہے آگ" تو کیا آپ تصوّر کریں گے کہ اس شخص کی پیٹھ پر ہنڈیا پکائی جا سکتی ہے؟۔

دیکھ لیجئے ہم نے مانند یا مثل کا لفظ نہیں بولا، بلکہ صاف ہاتھی یا آگ کہہ دیا لیکن آپ ہماری کسی تشریح کے بغیر بلا تامّل ہی سمجھ گئے کہ غیر معمولی مشابہے کی طرف اشارہ ہے اور آگے

مراد مزاج کی تیزی ہے۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ نور و ظلمت کے الفاظ کا ہے۔ دنیا کے تمام صنفات کھنگال جائیے یہی ملیگا کہ ان دونوں کو بطور استعارہ بولنا شائع ذائع رہا ہے۔ معنوی حسن، رشد و ہدایت، ایمان، علم، خیر و برکت، اخلاق، نیکی وغیرہ کو نور سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے برعکس اوصاف اشیاء کو ظلمت سے۔ حسین محبوب کو "حسن" کہنا تو معلوم و معروف ہے ہی۔ کسی اخلاقی راہنما اور صالح ترین آدمی کو "نور" کہہ دیا جائے تو کسی کو بھی اس استعارے کا مطلب سمجھنے میں غلط فہمی نہیں ہوگی۔ لیکن قیامت آگئی ہے کہ بعض اسلاف و اخلاف اپنی فکری چوک اور ذہنی ریودگی کو حق بجانب ثابت کرنے کیلئے ان ظاہر و باہر حقائق کو منہ چڑھا رہے ہیں اور آیاتِ الٰہیہ سے کھیل کرنے میں ذرا خوف محسوس نہیں کرتے۔

نور و ظلمت اور حسن وغیرہ کو بطور استعارہ استعمال کرنے کی ہزار مثالیں ہم عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب سے لا سکتے ہیں لیکن اس طول و عمل کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ خود قرآن ہی کی امثلہ کافی و وافی ہیں۔ لیجئے ملاحظہ کیجئے :۔

جن دو آیات کو منکرینِ ظل مستدل قرار دیتے ہیں ان میں کی ایک یہ ہے :۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللهِ نُورٌ	(اے لوگو) تحقیق آیا تمہارے پاس
وَكِتَابٌ مُبِينٌ (سورۂ مائدہ ع ۳)	اللہ کی طرف سے نور اور کتاب روشن

وہ کہتے ہیں کہ نور سے مراد رسول اللہ ہیں اور نور کا سایہ نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا حضورؐ کا بھی سایہ نہیں ہو سکتا۔ کیسی بچکانہ اور بے مغز بات۔ اول تو یہی طے نہیں کہ "نور" اس آیت میں ذاتِ رسولؐ کو کہا گیا ہے۔ ابھی آپ دیکھیں گے کہ اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے دوسرے یہ مان بھی لیا جائے کہ ذاتِ رسول ہی کے لئے آیا ہے تو دو اور دو چار کی طرح صاف بات ہے کہ اسی طرح بطور استعارہ آیا ہے جس طرح دنیا بھر میں لفظ نور ہمیشہ سے بولا جاتا رہا ہے۔ دنیا بھر کو چھوڑیئے خود قرآن میں دیکھ لیجیے کہ اس لفظ کو کتنی بہت ساری مرتبہ اللہ نے بطور کنایہ و استعارہ استعمال فرمایا ہے۔ پھر آخر کیا قرینہ، کیا دلیل، کیا جواز ہے کہ دنیا بھر کے مفسرین کو بے بہرہ قرار دیکر نور کے وہ طبعی اور سائنسی معنی لے لئے جائیں جو کسی دلیل سے بھی نہیں لئے جا سکتے

تو ہم قرآن کھول کر دکھلاتے ہیں کہ اللہ نے لفظ "نور" کو اس کے طبعی و سائنسی مفہوم میں نہیں بلکہ معلوم و معروف تشبیہ و کنائے کے مفہوم میں کیسے کیسے ارشاد فرمایا ہے۔

سورۂ بقرہ کا دوسرا رکوع دیکھو :۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي	ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے
اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ	آگ جلائی پھر جب اس آگ نے ان کے
مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللهُ	ماحول کو روشن کر دیا تو زائل کر دی
بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ	اللہ نے ان کی روشنی اور چھوڑ دیا انھیں
فِي ظُلُمَاتٍ لَا	اندھیرے میں دریں حالت کہ کچھ نہیں
يُبْصِرُونَ۔	دیکھ پاتے۔

کیا کہتے ہو۔ کیا یہاں لفظ نور تمثیلاً نہیں آیا ہے؟

آگے چلو۔ سورۂ بقرہ ۳۴ واں رکوع (پارہ ۳)

اللهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا	اللہ مددگار ہے ان لوگوں کا جو
يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ	ایمان لائے۔ نکالتا ہے ان کو
إِلَى النُّورِ ۝ وَالَّذِينَ	تاریکی سے روشنی کی طرف۔ اور
كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ	جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مددگار
يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ	ہیں شیاطین نکالتے ہیں انھیں
إِلَى الظُّلُمَاتِ۔	روشنی سے اندھیرے کی طرف۔

کیا یہاں استعارے کے سوا بھی کوئی مفہوم ہے؟ کیا ایمان کو بھی ایسا ہی نور کہوگے کہ چلتا پھرتا، کھاتا پیتا نظر آئے گا سایہ نہ دے گا

اور آگے سورۂ مائدہ رکوع ۷ (پارہ لا یحب اللہ ۶)

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا	اور ہم نے نازل کی توراۃ کہ اسمیں
هُدًى وَنُورٌ۔	ہدایت ہے اور روشنی۔

کیا یہ توراۃ کا نور ویسا ہی نور حسی ہے جیسا تم اپنی آیت مستدلہ میں منوانا چاہتے ہو؟

علیٰ ہذا۔ ایک آیت چھوڑ کر :۔

وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ	اور ہم نے عیسیٰ کو انجیل دی کہ اسمیں
هُدًى وَنُورٌ۔	ہدایت اور روشنی ہے۔

یہاں بھی وہی بات ہے۔ سورۂ انعام (پارہ ولو اننا) رکوع ۱۵ کھولو۔

فَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ	بھلا وہ شخص مردہ تھا پھر اسے

وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا	ہم نے زندہ کردیا اور دی اسے
یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ	روشنی کہ لئے پھرتا ہے اسے لوگوں
كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی	میں کیا اس شخص جیسا ہو سکتا ہو
الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ	جو اندھیروں میں اس طرح
مِّنْهَا ۔	گرفتار ہے کہ ان سے نکل ہی نہیں
	سکتا۔

* * *

کیا یہاں اس نور حسی کا سراغ ملتا ہے جس کا سایہ تو نہو مگر مجسم مع حوائج بشریہ نظر آئے ؟

سورۂ اعراف رکوع ۱۹ میں تو صاف ہی آگیا کہ تعلیم حق، ترغیب ایمان اور درس بندگی کی گفتگو میں " نور " کا مفہوم اللہ پاک کیا لیتے ہیں۔ نبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام بلند کے بارے میں ارشاد ہے :-

سورۂ اعراف رکوع ۱۹ (قال الملأ ۹)

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ	پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور
وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ	اسکی رفاقت کی اور اسے امداد
وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ	دی اور تابع ہوئے اس روشنی کے
اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ	جو اس کے ساتھ نازل ہوئی ہے
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔	تو وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

دیکھ لو یہ نہیں کہا کہ محمدؐ بذاتِ خود سچ مچ کے نور ہیں بلکہ وضاحت کر دی کہ نور ان کے علاوہ کوئی شئے ہے جو ان کے ساتھ نازل کی گئی ہو وہ دین حق اور اسلام وایمان کے سوا کیا ہو سکتی ہے ؟ کیا اسکے بعد بھی یہ بات صاف نہیں ہو جاتی کہ قد جاءکم من اللہ نور میں " نور " کا لفظ دین حق اور صراط مستقیم ہی کے لئے اسی طرح بطور استعارہ ارشاد ہوا ہے جس کی مثالیں پیش کرتے آ رہے ہیں اگر بعض مفسرین کی رائے مانکر " نور " سے مراد ذاتِ رسولؐ ہی لے لی جائے تب بھی یہ مہمل اور بے سروپا نکتہ نکالا جا سکتا ہے کہ ادب عالیہ کی فصاحت وبلاغت کے بجائے اللہ تعالیٰ علم الابدان اور طبعیات کا نکتہ بیان کرنے بیٹھے ہیں۔ ہم آگے دکھائیں گے کہ جن مفسرین نے ذات رسولؐ مراد لی ہے ان میں سے بھی کسی نے یہ لغو بیانی نہیں کی ہے کہ اس استعارے نے حضورؐ کو خواص بشری اور قوانین طبعیہ کے دائرے سے نکال کر لغوی معنوں میں سچ مچ کا نور بنا دیا۔ سورۂ توبہ پارہ ۱۰ واعلموا۔ رکوع ۵ ملاحظہ کریں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ	قرار دے لیا یہودونصاریٰ نے
وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا	اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِیْحَ	اللہ کو چھوڑ کر۔ اور مسیح ابن مریم
ابْنَ مَرْیَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا	کو بھی۔ اور ان کو اس کے سوا کسی
اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا	بات کا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ خدائے
وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا	واحد کی پرستش کرو۔ کوئی الٰہ نہیں
هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ	ہے سوائے اس کے وہ پاک ہے
یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا	ان کے شریک بتلانے سے چاہتے
نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ	ہیں کہ بجھا دیں روشنی اللہ کی اپنے
وَیَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ	منھوں سے اور اللہ نے طے
نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝	کرلیا ہے کہ وہ اپنی روشنی کو پورا
هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ	کئے بغیر نہ رہےگا چاہے کافروں
بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ	کو ناگوار گزرے اسی نے بھیجا
لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ	اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے
كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ	ساتھ تاکہ اسے غلبہ دے دوسرے تمام
الْمُشْرِكُوْنَ ۝	دینوں پر اگرچہ مشرکین برا مانیں

یہاں دو بار لفظ نور استعمال ہوا لیکن وہی استعارے کی زبان میں۔ اللہ تعالیٰ تو حقیقۃً نور ہیں لیکن پھر بھی یہاں حقیقی معنیٰ نہیں لئے جا سکتے۔ کیونکہ اللہ کا نور تو ہمیشہ سے کامل و تمام ہے اس کے لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ اسے تمام و کامل کرکے رہےگا۔ قطعی بات ہے کہ " نور " دین حق کو کہا گیا ہے۔ تب آخر آیت مستدلہ میں کیوں " نور " کا مفہوم دین حق نہیں لیا جا سکتا جیسا کہ بے شمار مفسرین نے لیا ہے۔ سورۂ ابراہیم رکوع اول — (پارہ ۱۳) میں بھی یہی انداز تعبیر ہے۔

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ	یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے تیری طرف
اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ	اتارا ہے تاکہ تو نکالے لوگوں کو
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ	اندھیروں سے روشنی کی طرف
بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ	ان کے رب کے حکم سے اس زبردست
الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ اللّٰهِ الَّذِیْ	خوبیوں والے اللہ کی راہ کیطرف
لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ	کہ اسی کا ہے آسمانوں اور زمین

وَمَا فِي الْاَرْضِ۔	میں سب کچھ۔

پھر دو آیات بعد :-

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى	اور بھیجا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں
بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ	کے ساتھ یہ حکم دیکر کہ اپنی قوم کو
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔	اندھیرے سے روشنی کی طرف لا۔

پھر سورۂ طلاق رکوع ۲ (پارہ ۱۸) میں بھی یہی ہے۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ	بے شک اللہ نے نازل کی تمہیر کتاب
ذِكْرًا رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا	رسول ہے جو پڑھ کر سناتا ہے تمہیں
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ	اللہ کی وہ آیات جو کھول کر بیان
لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	کرنیوالی ہیں تاکہ نکالے اُن
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیکوکار
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ	ہوئے اندھیروں سے روشنی کیطرف

نور سے دین حق اور صراط مستقیم مراد لینے کی مثالیں اور چاہو تو اور لو۔ سورۂ احزاب رکوع ۶ (پارہ ۲۲)

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ	وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور
وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ	اسکے فرشتے تاکہ نکالے تمہیں
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔	اندھیروں سے روشنی کی طرف۔

پھر سورۂ زمر رکوع ۳ (پارہ ۲۳)

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ	جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام
صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ	کے لئے کھول دیا وہ اپنے رب کیجانب
عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔	سے روشنی پر ہے۔

کیا اب بھی یہ ثابت ہونے میں کسر رہ گئی کہ "نور" سے بطور استعارہ دین حق اور صراط مستقیم اور ایمان و اسلام وغیرہ مراد لینا قرآن کا معمول ہے نہ یہ کہ "نور" کو طبعی و سائنسی مفہوم میں استعمال کرے۔ "سائنسی" ہم طنزاً نہیں کہتے بلکہ منشأ یہ ہے کہ سائنس چونکہ اشیاء کی مادی حقیقت و حیثیت سے سروکار رکھتی ہے، اس لئے اس کی زبان میں تو ہر اسم کو اس کے مادی و طبعی مفہوم میں لینا درست ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک سائنس داں کہے کہ فضائے بسیط میں بے شمار چاند ہیں تو اس کا مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ اس کی دانست میں ایسے ہی بے شمار اجسام جیسا یہ ہمارا چاند ہے فضائے بسیط میں پائے جاتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ چمکدار ذرّوں کو وہ بطور استعارہ چاند کہہ رہا ہے۔ اس کے برخلاف جب دب کی زبان میں کوئی کہے گا کہ —

"فلاں شخص آیا تو رات کے اندھیرے سمٹ گئے چاندنی بکھر گئی"

تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جائے گا کہ وہ شخص اپنے خواص و صفات میں واقعی آسمان کے چاند کا مماثل ہے اور اس کی آمد واقعی ویسی ہی چاندنی بکھیر دیتی ہے جیسی چاند سے بکھرتی ہے اور چاند کے طبعی لوازم اس میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ لیا جائے گا کہ کہنے والا اس شخص کے حسن و جمال اور اپنے والہانہ تعلق کو استعارے کی زبان میں بیان کر رہا ہے۔ یہی معاملہ اس آیت کا بھی ہے جسے منکرین قال نے دلیل بنانے کی سعی کی ہے۔ یہاں بھی نور سے ذات رسولؐ مراد لینے کی صورت میں صرف اور صرف یہی مفہوم ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کی ذات والا صفات سے دنیا میں ایمان، سچائی، نیکی اور دین حق کا جو معنوی اُجالا پھیلا اسی کی تعبیر کے لئے یہ لفظ "نور" فرمادیا گیا ہے" سائنسی انداز میں نہیں فرمایا گیا۔

سورۂ شوریٰ رکوع ۵ (پارہ ۲۵) میں دیکھو :-

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ	اور اسی طرح ہم نے تیری طرف
رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ	اپنے حکم سے ایک فرشتہ بھیجا۔ تو
تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا	نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے
الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ	اور ایمان کیا۔ ولیکن ہم نے رکھا
نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ	ہے یہ نور کہ راستہ سمجھا دیتے ہیں
مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا۔	اس سے اپنے بندوں سے جسے
+ + +	چاہے۔

یہاں بھی نور اسی حقیقت کو کہا گیا جو حسّی نہیں بلکہ معنوی ہے یعنی ایمان اور کتاب الٰہی کی تعلیمات مقدسہ۔ یہ دونوں چیزیں جوہری اعتبار سے ایک ہی ہیں، اسی لئے جعلناہ میں واحد کی ضمیر لائی گئی۔ نہ یہ کہ کسی حسّی و طبعی نور کا ذکر کیا گیا ہو۔

سورۂ حدید رکوع اول (پارہ ۲۷) دیکھو :-

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى	وہی ہے جس نے نازل کیں اپنے
عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ	بندے پر واضح آیات تاکہ نکالے
لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ	تمہیں اندھیروں سے
اِلَى النُّوْرِ۔	روشنی کی طرف۔

وہی تمثیل واشارہ کی زبان۔ مزید دوسرے رکوع میں :-

یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ	جس دن تو دیکھے گا مومن مردوں
وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰی نُوْرُهُمْ	کو اس حال میں کہ دوڑتی ہوئی
بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ	چل رہی ہے ان کے آگے اور
بُشْرٰکُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ	دائیں بائیں روشنی۔ خوش خبری
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ	تم کو آج کے دن باغوں کی کہ
خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ذٰلِکَ	ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں سدا
هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔	رہو ان میں۔ یہی تو ہے عظیم کامیابی

یہاں بھی "نور" کو استعارہ ہی ماننا پڑے گا۔ اسی سورۃ میں آگے۔ رکوع ۲ میں :-

یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ	جس دن کہیں گے منافق مرد وزن
وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ	مومنوں سے کہ ہمارا انتظار کرو ہم
اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا	بھی تمہارے نور سے روشنی لینگے
نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِکُمْ	کہا جائے گا کہ لوٹ جاؤ پیچھے
قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَکُمْ	پھر ڈھونڈھو نور روشنی۔
فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا۔	

چند آیات کے بعد :-

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ	اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر
وَرُسُلِهٖ اُولٰٓئِکَ هُمُ	اور اس کے رسول پر وہی ہیں
الصِّدِّیْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ	سچے ایمان والے اور اللہ کے
عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ	حضور لوگوں کے اعمال پر گواہی
اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ	دینے والے۔ ان کیلئے ہے ان کا
	ثواب اور ان کی روشنی۔

\+ + +

سورۂ صف رکوع ۱ (پارہ ۲۸) میں :-

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ	اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو
الْکَذِبَ وَهُوَ یُدْعٰٓی اِلَی الْاِسْلَامِ	اللہ پر بہتان باندھے حالانکہ
وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ	اسے اسلام کی طرف بلایا گیا ہے
الظّٰلِمِیْنَ یُرِیْدُوْنَ	اور اللہ ظالموں کی قوم کو ہدایت
لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ	نہیں دیتا۔ چاہتے ہیں کہ بجھا دیں
وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ	اس کے نور کو اپنے منھوں سے
کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ۔	اور اللہ تو اپنی روشنی کو مکمل کرنے

والا ہے چاہے کافر برا مانیں۔

\+ + +

سورۂ تغابن رکوع ۱ (پارہ ۲۸) میں :-

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے
وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا۔	رسولؐ پر اور اس نور پر جو ہم نے
	اتارا (قرآن)

* * *

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی ذات کے لئے بھی لفظ "نور" استعمال فرماتے ہیں تو تمثیل وتشبیہ ہی کے اسلوب میں، نہ کہ طبعیات کے نقطۂ نظر سے۔ ملاحظہ ہو سورۂ نور رکوع ۵ (پارہ ۱۸)

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ	اللہ آسمانوں کی اور زمین کی روشنی
وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ	ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے
کَمِشْکٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ	جیسے ایک طاق ہو کہ اس میں چراغ
اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ	رکھا ہو۔ چراغ ایک شیشے کے اندر
اَلزُّجَاجَةُ کَاَنَّهَا	ہو اور شیشہ ایک دمکتے ہوئے تارے
کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ	کی مانند ہو۔ تیل جلتا ہو اس میں
مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَکَةٍ	زیتون کے اس مبارک درخت
زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ	کا جو نہ مشرق کی طرف ہو نہ مغرب
وَّلَا غَرْبِیَّةٍ یَّکَادُ	کی طرف۔ قریب ہو کہ روشن
زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ	ہو اٹھے اس کا تیل حالانکہ آگ نے
تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ	اسے چھوا تک نہ ہو روشنی پر۔ اللہ
عَلٰی نُوْرٍ یَهْدِی اللّٰهُ	جسے چاہے اپنی روشنی کی طرف
لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ	ہدایت یاب کر دیتا ہے اور اللہ
وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ	بیان کرتا ہے مثالیں لوگوں
لِلنَّاسِ	کے لئے

جس کے قلب میں شمہ برابر جذبۂ عدل، دماغ میں تھوڑی سی عقلِ سلیم اور ذوق ومذاق میں صحت وسلامتی ہو وہ غور کرے کہ "نور" سے مراد چاہے دین حق کی روشنی ہو یا رسول اللہ کی ذاتِ پاک بہر صورت مفہوم ومنشا کیا اس کے سوا بھی کچھ ہو سکتا ہے کہ جاہلیت کی غلط کاریوں اور گمراہیوں کے مقابلہ میں دینِ مبین کی طلعت تابش اور آخری پیغمبر کی تعلیمات کا حسن وجمال اور رسولِ خاتم کے لائے ہوئے اسلام کی روشنی، شانِ ہدایت کو نمایاں کیا جاتا ہے ادنیٰ سا قرینہ بھی ایسا نہیں ہے کہ اس کے سہارے جناب پیغمبر

علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسدِ مبارک کا سایہ نہ ہونے کا تخیل اخذ کیا جائے۔ اگر "نور" سے مراد حضور ہی ہوں تب بھی متصل قبل کے الفاظ ہی صاف بتا رہے ہیں کہ یہ استعارہ کیا مفہوم رکھتا ہے۔ ظلمت ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے۔ یہ اہل کتاب کی ذہنی و قلبی ظلمت ہی تو تھی کہ وہ اللہ کی کتاب میں وارد شدہ بہت سی باتوں کو بسبب نفسانیت چھپائے رکھتے تھے۔ آپ آیات میں دیکھ چکے ہیں کہ شرک و کفر اور طغیان و معصیت کو اللہ تعالیٰ ظلمت سے تعبیر فرماتے رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ جس معنوی ظلمت کا متصل قبل الفاظ میں ذکر ہے اسے دور کرنے والی شے نورِ معنوی ہی ہو سکتی ہے نہ کہ نورِ حسی۔ سورج کا حسی نور کتنا ہی تابناک سہی لیکن ذہن و قلب کی معنوی ظلمتوں کو وہ رائی برابر دور نہیں کر سکتا۔ اہل کتاب کی سیاہ کاریوں کا ازالہ جس نور سے ہو سکتا ہے وہ نورِ معنوی ہونا چاہئے نہ کہ حسی۔ رسول اللہؐ کو اگر نور کہیں تو نورِ معنوی ہی مراد دینا لازم ہوگا۔

ایک اور نکتہ قابل لحاظ ہے جو ہمارے موقف کے لئے قرآن کی داخلی شہادت سمجھا جا سکتا ہے۔ دیکھیئے نور اور کتاب مبین کے فوراً بعد یھدی بہ اللہ کہا گیا۔ اگر نور اور کتاب مبین فی الحقیقت دو الگ وجود ہوتے تو ضمیر واحد نہ لائی جاتی بلکہ بھما کہا جاتا۔ واحد کی ضمیر نے ثابت کر دیا کہ نور اور کتاب معنوی اعتبار سے ایک ہی منطوق کے دو عنوان ہیں اور مقصود بیان ایک ہی شئے ہے۔ اب منکرین ظل سوچیں کہ "نور" سے محمدؐ مراد لینے کے بعد ان کے وجودِ ظاہری اور جسمِ مرئی کو حاصلِ مراد قرار دے کیا جائے (جیسا کہ سایہ نہ ہونے کا شوشہ نکالنے سے ظاہر ہے) تو یہی بات ہے کہ جسمانی اعتبار سے تو رسول اللہ اور کتاب مبین دو الگ الگ وجود ہیں۔ ان کے لئے تثنیہ کی ضمیر آنی چاہئے تھی لیکن نہیں آئی معلوم ہوا کہ لفظاً جدا جدا ہوتے ہوئے بھی معناً ایک ہی شئے کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ شئے سوائے دینِ حق کے کیا ہو سکتی ہے، جس کی تعبیر خود قرآن ہی بار بار نور اور قرآن مبین اور کتاب اور برہان وغیرہ سے کرتا آ رہا ہے اور خود اس آیت میں بھی ظلمت و نور کا وہی تمثیلی اور تعبیری انداز بیان موجود ہے۔

آج سے پہلے بھی اگر کچھ لوگوں نے اس آیت سے سایہ نہ ہونے کا لطیفہ اخذ کیا ہے تو دیکھنا چاہئے کہ یہ لوگ فنِ تفسیر میں کیا مقام رکھتے ہیں۔ آخر کسے نہیں معلوم کہ کسی شخص کا زاہد و شیخ ہونا یا بعض علوم میں متبحر ہونا یہ لازم نہیں کرتا کہ اسے ہر علم و فن میں امام اور حجت مان لیا جائے۔ سائنس کے مسئلہ پر ماہرین سائنس ہی کو بولنے کا حق ہے۔ ادب یا جغرافیے یا ریاضی کا بڑے سے بڑا پروفیسر اپنے ہی علوم پر لائق استناد ہو سکتا ہے نہ کہ جملہ علوم پر۔ تفسیر قرآن ایک مستقل عظیم الشان علم و فن ہے۔ جس شخص کو دعویٰ ہو کہ فلاں آیت سے یہ مفہوم نکلتا ہے اسے چاہئے کہ استناد میں مفسرین ہی کا قول لائے نہ کہ ان لوگوں کا جو حدیث یا فقہ یا ادب میں تو تبحر رکھتے ہوں لیکن فنِ تفسیر میں اپنی پیش رفت کا ثبوت نہ پیش کر سکے ہوں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بزعم خود آیاتِ قرآنیہ کو اپنی اصل دلیل سمجھنے والے منکرین ظل اپنے دعوے کے ثبوت میں کسی ایک بھی ایسے مفسر کو شہادت میں پیش نہیں کرتے جو امت میں بطور مفسر معروف و مقبول ہو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان آیات سے جو کچھ وہ اخذ کر رہے ہیں وہ ان کی اپنی اُپج ہے کوئی بھی مفسر ان کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ آیئے ہم دکھلائیں مفسرین کیا کہہ رہے ہیں۔ اس سے منکرین ظل کی اس سیاست کا بھی توڑ ہو جائے گا کہ وہ بزرگوں اور کتابوں کے بہت سے نام جمع کر کے عوام کو مرعوب کرتے ہیں۔

پہلے ہم ان تفسیروں کا ذکر کرتے ہیں جن میں "نور" سے ذاتِ رسولؐ مراد نہیں لی گئی۔ جلد اور صفحے کا حوالہ اس لئے لاحاصل ہوگا کہ سورۂ مائدہ رکوع ۳ تو متعین ہے۔ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔

تفسیر روح المعانی

اسی قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ کی تفسیر صاحب روح البیان فرماتے ہیں:۔

المراد بالنور والکتاب	نور اور کتاب سے مراد قرآن ہے کیونکہ
هو القرآن لما فيه	اس کی آیات شرک و ریب کی
من كشف الظلمات الشرك	تاریکیاں دور کرتی ہیں اور گمراہیوں

والشك ودیانة ماخفی — ان تعلیمات حقہ کو جلی کرتی ہیں
علی الناس من الحق . — جو ان سے پوشیدہ تھیں۔

تفسیر کشاف زمخشری کی عبارت لسانی کیا کہنے۔ نور اور کتاب مبین کے تحت فرماتے ہیں:-

یریدن القرآن بکشفه — (نور اور کتاب مبین سے) قرآن مراد
ظلمات الشرك والشك — ہے کیونکہ وہ شرک تذبذب کی
ولابانته ماکان — تاریکی دور کرتا ہے اور ان حقائق
خافیا عن الناس — کو ظاہر کرتا ہے جو لوگوں سے مخفی
من الحق او لانه — تھے۔ یا اس لئے کہ اس کا اعجاز
ظاهر الاعجاز . — بالکل ظاہر ہے۔

تفسیر الجواہر یہ خصوصیت سے ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ شیخ طنطاوی کی یہ تفسیر قرآن کے عجائب و بدائع اور غرائب لطیفہ کا خاص طور سے تذکرہ کرتی ہے لیکن اس عجوبے پر اس کی بھی نظر نہیں گئی کہ نور سے مراد رسول اللہؐ ہیں اور اس مراد کا لازمی فائدہ یہ ہے کہ آپؐ کا سایہ نہیں ہونا چاہئے اس کی بجائے وہ مختصر طور پر کہتی ہے:-

وقد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین هو القرآن

گویا شیخ طنطاوی کے نزدیک نور اور کتاب مبین ایک ہی مفہوم و معنی کے دو عنوان ہیں اور مراد سوائے قرآن کے کچھ نہیں پھر آگے وہ مزید تصریح کرتے ہیں:-

(الظلمات) الکفر (والنور) الاسلام جیسے پہلے بھی ہوئی

تفسیر بیضاوی یہ وہی متداول تفسیر ہے جس کا اصلی نام انوار التنزیل واسرار التاویل ہے۔ نور اور کتاب مبین کی تفسیر یوں ہے:-

یعنی القرآن فانه الکاشف — یعنی نور اور کتاب مبین سے مراد
ظلمات الشك — قرآن ہے کیونکہ وہ شک اور گمراہی
والضلال والکتاب الواضح — کی تاریکیاں مٹاتا ہے اور ایسی کتاب
الاعجاز وقیل یرید — ہے جس کا اعجاز واضح ہے اور کہا گیا
بالنور محمدا ﷺ — ہے کہ "نور" سے محمدؐ مراد ہیں۔

ظاہر ہے کہ بیضاوی "نور" سے مراد قرآن ہی لیتے ہیں اور "محمدؐ" مراد لینا مرجوح خیال کرتے ہیں۔

تفسیر فتح البیان ارشاد ہوتا ہے:-

جملة مستانفة مشتملة — (لقد جاءکم من اللہ نور و
علی بیان ان محمدا — کتاب مبین) جملہ مستانفہ ہے
صلی اللہ علیه وسلم — جو اس بیان پر مشتمل ہے کہ حضورؐ کی
قد تضمنت بعثته فوائد — بعثت ان فوائد کے علاوہ بھی اور
غیر ما تقدم من مجرد البیان — منافع رکھتی ہے جن کا تذکرہ
قال الزجاج النور محمد — سابق میں لفظاً ہوا۔ زجاج
صلی اللہ علیه وسلم وقیل — نے کہا کہ "النور" سے محمدؐ مراد
الاسلام والکتاب — ہیں۔ اور کہا گیا کہ "النور" سے
المبین القرآن . — اسلام مراد ہے۔ اور کتاب مبین
سے مراد قرآن ہے۔

* * *

تفسیر فتح القدیر اس میں بعینہ وہی بات کہی گئی جو فتح البیان سے نقل ہوئی۔

ترجمان القرآن مولانا آزادؒ آیت کی تفسیر یوں کرتے ہیں:- "اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی آچکی اور ایسی کتاب آچکی جو (اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے۔"

بیان القرآن مولانا اشرف علیؒ ترجمہ فرماتے ہیں:- "تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی اور ایک کتاب واضح۔"

اس کے بعد تفسیر میں تفصیلاً یہی کہا ہے اور حاشیے میں نحوی استدلال کے ساتھ ثابت فرمایا ہے کہ نور کی تفسیر اگر ذات رسولؐ سے کی جائے تو وہ حسن بیان حاصل نہیں ہوتا جو "کتاب" سے کرنے میں ہوتا ہے۔"

مولانا محمود الحسن (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ و مولانا مودودی اپنے ترجموں میں نور کا ترجمہ "روشنی" کرتے ہیں اور کوئی اشارہ ایسا نہیں کرتے جس سے معلوم ہو کہ روشنی سے مراد ذات رسولؐ ہے

اب آئیے ان مفسرین کو دیکھیں جنہوں نے "نور" سے ذات محمدؐ مراد لی ہے یا متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ بیشتر مراد لینے کے انہوں نے وہی کہا ہے جو ہم کہتے آرہے ہیں۔ یعنی حضورؐ کو نور کہنے کا

منشار نورحسی کا اثبات نہیں، بلکہ اس معنوی نور کی طرف اشارہ ہے جو دین حق اور ایمان و ہدایت کے جمالِ معنوی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تفسیر روح المعانی

صاحب روح المعانی دونوں قول نقل کرتے ہیں کہ نور سے مراد حضورؐ ہیں یا قرآن۔ پھر اول الذکر صورت میں ان کے نزدیک مفہوم کیا بنتا ہے اسے ان کی مندرجہ ذیل عبارت میں دیکھئے:

ولا یبعد عندی ان یراد	اور میرے نزدیک بعید نہیں ہے کہ
بالنور والکتاب المبین	نور اور کتاب مبین دونوں ہی سے
النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔	نبیؐ مراد لئے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے ان ایرادات کو صاف کیا ہے جو اس مراد لینے پر نحوی اعتبار سے واقع ہو سکتے تھے۔ اب سوچ لیجئے کہ جب "کتاب" سے بھی وہ حضور ہی کی ذات مقدسہ مراد لے رہے ہیں تو اس استعارے کا تعلق مادی وطبعی جسموں سے کہاں ممکن ہے جسمانی اعتبار سے تو ظاہر ہے کہ حضورؐ ایک انسان تھے ذی روح اور صاحب عزم اور "کتاب" ایک دوسری جنس کی شے ہے۔ روح بشری اور عزم وشعور سے خالی۔ تب ان دونوں کے درمیان جو چیز مشترک ہے وہی استعارے کا محمل بن سکتی ہے۔ وہ سوائے ہدایت و ایمان کی معنوی روشنی کے سوا کیا ہے؟

تفسیر الدر المنثور

یہی بات صاحب درمنثور نے کہی ہے الفاظ تک جوں کے توں ہیں۔

تفسیر خازن

فرمایا گیا:-

قد جاءکم من اللہ نور	نور یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم آپ کا
یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم	نام نور اس لئے رکھا گیا کہ آپ
انما سماہ نوراً لانہ	کے ذریعہ ہدایت پھیلی ہے جیسے
یھتدی بہ کما یھتدی	کہ تاریکی میں روشنی سے انسان
بالنور فے الظلام وقیل	ہدایت پاتا ہے اور کہا گیا کہ نور
ہو النور الاسلام۔	سے مراد اسلام ہے۔

صاحب خازن نے بے شک نور سے مراد ذات رسولؐ لی لیکن ساتھ ہی استعارے کی بنا بھی ظاہر کردی کہ نور ہدایت مراد ہے۔

یہ نہیں کہ آپ نور حسی کے چکر میں پڑیں اور جسم کے سائے کا مسئلہ چھیڑیں۔

تفسیر معالم التنزیل

یہ بھی وہی بات فرماتے ہیں جو صاحب خازن نے فرمائی۔ بس فرق طول و اختصار کا ہے۔

تفسیر ابن کثیر

اسی نور والی آیت پر ارشاد ہوا:-

یخبر تعالیٰ عن نفسہ	اللہ تعالیٰ اپنے نفس کریمہ کے بارے
الکریمۃ انہ قد ارسل	میں خبر دیتا ہے کہ اس نے رسول اللہؐ
رسولہ محمداً صلی اللہ	کو تمام اہل زمین کی طرف۔ خواہ
علیہ وسلم بالھدیٰ	وہ عربی ہوں یا عجمی اَن پڑھ لکھے
ودین الحق الی جمیع اھل	ہوں یا صاحب علم۔ ہدایت اور
الارض عربھم وعجمھم	دین حق کے ساتھ بھیجا اور جو چیزیں دے
امیھم وکاتبھم وانہ	نبیرت اسے بھیجا روشن دلیلوں کے
بعثہ بالبینات والفرق	ساتھ اور حق و باطل میں امتیاز
بین الحق والباطل۔	کے ساتھ۔

کون نہیں جانتا کہ حافظ ابن کثیرؒ آیات کی تفسیر میں احادیث پیش کرنے کے دلدادہ ہیں اور بعض دفعہ تو ایسی روایات تک لے آتے ہیں جن کے بارے میں بعض محققین کو خیال گذرتا ہے کہ یہ اس محل کے لئے موزوں نہیں تھیں، لیکن ان روایات کی انھیں بھی نہیں سوجھی جو منکرین ظل اس آیت سے استشہاد کرتے ہوئے بطور تائید لاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان تائیدوں کا جوراس حد تک بے سر و پا ہے کہ روایات کے خوگر مفسرین بھی اس پیوند کاری کا تصور نہیں کر سکے۔ دیر ان کے وہم وخیال میں آیا کہ نور تو بے سایہ ہوتا ہے لہٰذا حضور بھی سایہ ہوئے۔

تفسیر الکبیر

امام رازی کی نکتہ آفرینیاں سب کو معلوم ہیں مگر یہ کا نکتہ ان کی ذہانت پر بھی نازل نہیں ہو سکا۔ وہ مذکورہ آیت کے ذیل میں کہتے ہیں وفیہ اقوال پھر تین قول بیان کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ نور سے مراد اسلام ہے اور کتاب سے مراد قرآن۔ دوسرا یہ کہ نور اور کتاب دونوں ہی سے قرآن مراد ہے۔ ...

وتسمية محمد والاسلام والقرآن بالنور ظاهرة لان النور الظاهر هو الذی یتقوی به البصر علی ادراك الاشیاء الظاهرة والنور الباطن ایضًا هو الذی تتقوی به البصیرة علی ادراك الحقائق والمعقولات.	محمد اور اسلام اور قرآن کو نور کے نام سے تعبیر کرنا ظاہر المراد ہے اس لئے کہ نور ظاہر جس طرح ظاہری اشیاء کے ادراک کے لئے بینائی کو قوت و اہلیت دیتا ہے اسی طرح نور باطن بھی حقائق و معقولات کے ادراک کے لئے بصیرت کو قوت و اہلیت عطا کرتا ہے

کیا کوئی گنجائش ہے کہ نور ظاہری و طبعی مراد لے کر سایہ صاف کرنے کا کرشمہ دکھایا جائے۔

تفسیر ابن جریر

طبری کے بارے میں بھی اہل علم جانتے ہیں کہ روایات لانے میں آگے آگے ہیں لیکن جو حال ابن کثیر کا ہے وہی ان کا بھی ہے۔ فرماتے ہیں :-

یعنی بالنور محمد صلی اللہ علیہ وسلم الذی انار اللہ به الحق وظهر به الاسلام ومحق به الشرك فهو نور لمن استنار به.	نور سے محمدؐ مراد لئے گئے ہیں۔ وہ محمدؐ کہ اللہ نے ان کے ذریعے حق واضح کیا اور اسلام کو غلبہ دیا۔ اور شرک کو مٹایا۔ پس وہ نور ہیں ہر اس شخص کیلئے جو روشنی حاصل کرنا چاہے۔

کیا ابن جریر کا تصور بھی گیا اس طرف کہ نور سے محمدؐ مراد لینے کی صورت میں سایہ نہ ہونے کا استنباط ہو سکتا ہے۔ وہ تو صاف کہہ رہے ہیں کہ حضورؐ صرف انھی کے لئے نور ہیں جو ان سے نور حاصل کرنا چاہے۔ ظاہر ہے اہل ایمان کی طرف اشارہ ہے اور اہل کفر و شرک کے لئے وہ نور نہیں ہیں کیونکہ وہ بصیرت کے اعتبار سے اندھے ہیں تو انھیں نور کہاں نظر آئے گا۔ اب سوچ لیجئے کہ نور حسی و ظاہری کا کیا تک ہو سکتا ہے۔ حسی نور تو مومن کافر سب کو چشم سر سے نظر آتا ہے اور سبھی نور شمس و قمر سے یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کسی اللہ کے بندے نے [illegible] آیت [illegible] آنحضورؐ کے بے سایہ ہونے کا پتا [illegible] استشہاد میں لاؤ جو اس کی مؤید بن سکیں۔

الجواہر الحسان

ثعالبی نے اگرچہ سورۂ نساء کی آیت اُنزلنا الیکم نورًا مبینًا میں نور سے حضورؐ کی طرف اشارہ مان لیا۔ حالانکہ ادب اور محل کے اعتبار سے یہ دور کی بات ہے لیکن "نور" کی تشریح وہ بھی بایں الفاظ کرتے ہیں :-

اور نور مبین سے مراد قرآن ہے کیونکہ اس میں ہر شئی کا بیان ہے۔

تفسیر جلالین

صاحب جلالین نے بے شک "نور" کی تفسیر هو النبیؐ ہی سے کی، لیکن یہ نہیں کہا کہ مراد جسمِ نبی ہے۔ جلالین کے مشہور و مقبول حاشیے الجمل میں اس اختصار کی تفصیل دیکھئے :-

(قد جاءکم من اللہ نور) جملة مستانفة مسوقة لبيان ان فائدة مجئ الرسول لیست منحصرة فیما ذکر من بیان ما کانوا یخفونه بل له منافع لا تحصیٰ.	یہ جملۂ مستانفہ ہے جو یہ واضح کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ رسولؐ کی آمد کا فائدہ ماقبل میں بیان شدہ صرف اسی ایک فائدے تک محدود نہیں کہ وہ اہل کتاب کی مخفی کردہ کثیر باتوں کو منکشف کرتا ہے بلکہ اسکے منافع اتنے ہیں جنکا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

اب اگر کوئی نادان یہ کہے کہ ان غیر محدود فوائد میں سایہ نہ ہونا بھی شامل ہو سکتا ہے تو اسے کسی مدرسے میں "فائدے" اور "خاصّے" کے فرق پر چند سبق پڑھنے چاہئیں۔ اوصاف و خواص فائدہ اور نفع نہیں کہلاتے۔

تفسیر المنار

یہ تفسیر نئی تفاسیر میں جس قدر رفیع ہے اہل علم جانتے ہیں۔ لیجئے اسے بھی دیکھئے۔ اس میں تینوں ہی قول بیان ہوئے ہیں کہ نور سے مراد یا نبیؐ ہوں یا اسلام یا قرآن۔ لیکن :-

ووجه تسمية كل من هذه الثلاثة نورًا هو انها للبصيرة كالنور للبصر.	ان میں سے ہر ایک کو نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بصیرت کے لئے ایسی ہی چیز ہے جیسے بینائی کیلئے نور (روشنی)

انھیں بھی رسولِ کریم کے سایہ نہ ہونے کا استنباط فرماتے۔

تفسیر مظہری

بعد کی تفسیروں میں اس کا بھی مقام بلند ہے۔

(قد جاءکم من اللہ نور) یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم او الاسلام (وکتاب مبین) للاحکام بین الاعجاز وھو القرآن وجاز ان یکون العطف تفسیریا والرسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم والقرآن نوران لکونھما کاشفین لظلمات الکفر۔

نور یعنی محمد اور اسلام — اور کتاب مبین (متعدی ماننے کی صورت میں) احکام واضح کرنے والی یا (لازم ماننے کی شکل میں) ظاہر الاعجاز۔ اور وہ قرآن ہے۔ اور جائز ہے یہ بات کہ (نور اور کتاب مبین کے درمیان) عطف تفسیری مانا جائے۔ کیونکہ دونو ہی کفر کی سیاہیاں دور کرتے ہیں۔

کسی بھی اللہ کے بندے کو عقل نہیں آ رہی کہ نور سے نورِ حسی مراد لے کر سایہ غائب کر دے۔ وہی معنوی نور، وہی دینِ حق حالانکہ اگر واقعی حضورؐ کا سایہ نہ ہونا ان مفسرین کے خیال میں ذرا بھی ماننے کے قابل ہوتا تو نہایت ذوق و شوق سے اس آیت کے ذیل میں ضرور اس کا ذکر کیا کرتے۔

مدارک التنزیل

اسے تفسیرِ نسفی بھی کہتے ہیں۔ اسکے سلسلہ میں لطیفہ یہ ہے کہ کاظمی صاحب نے ص۲۷ پر حضرت عثمان سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ کا سایہ نہیں تھا اور حوالہ دیا ہے تفسیر مدارک جلد ۲ مطبوعہ مصر کا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے مدارک التنزیل ہی علمی حلقوں میں وہ معروف تفسیر ہے جبکا مصداق لفظ "مدارک" کو سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس تفسیر کی جلد اول ہی میں سورۂ مائدہ ختم ہو گئی ہے۔ سائز چونکہ بڑا نہیں اور چونکہ چھاپہ بھی وہی باریک مصری ٹائپ کا ہے لہذا یہ بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ کاظمی صاحب کے سامنے کوئی دوسرا ایڈیشن ہوگا جس میں یہ جلد اول کی بات ڈیڑھ سو صفحات آگے چلی گئی ہوگی۔ اس تفسیر کے تو اجزا ہی چار ہیں اور پہلا جز سورۂ مائدہ کو شامل ہے جلد ۲ ص۱۰۲ پر ان کی نقل کردہ روایات نہیں ملیں۔ اگرچہ یہ ہماری چوک ہو تب بھی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ صاحب مدارک نے یہ روایت اس سورۂ مائدہ والی آیت کے ذیل میں قطعی نقل نہیں کی جسے منکرین ظل مستدل بتا رہے ہیں اور جس کی بحث چل رہی ہے۔ مدارک میں نور کے دونوں ہی مصداق یعنی محمدؐ اور قرآن مانے گئے ہیں۔ لیکن محمدؐ ماننے کی صورت میں وہی تشریح پیش کی ہے جو دیگر مفسرین کرتے آ رہے ہیں:۔

(والنور محمد) علیہ السلام لانہ یھتدی بہ کما سمی سراجا منیرا۔

حضورؐ کو نور اس لئے کہا گیا کہ ان سے ہدایت حاصل ہوتی ہے جیسا کہ ان کا نام سراج منیر رکھا گیا۔

تو واضح ہوا کہ صاحب مدارک بھی نورِ حسی مراد نہیں لیتے۔

تنویر المقیاس

یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کا نام ہے۔ بے شک حضرت موصوف نے نور کی تفسیر (رسول یعنی محمد) کی ہے لیکن خیال کرنے کی بات ہے کہ اگر واقعی حضورؐ کا جسد مبارک بے سایہ ہوتا اس عجیب وغریب اور فرید وحید خصوصیت کا ذکر کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر مناسب موقعہ کونسا ہو سکتا تھا۔ وہ لازماً اس محل میں اس کا ذکر کرتے لیکن نہیں کیا تو ثابت ہوا کہ یہ خصوصیت بعد کی طبعزاد ہے۔ انھیں تصور بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ بھی وقت آنے والا ہے جب کچھ لوگ استعارے کو طبعی و سائنسی حقیقت پر محمول کر کے آیت قرآنی کا کھلونا بنانے لگیں گے۔ وہ جانتے تھے کہ نور کی تفسیر میں "رسول" لکھ دینا صریح المعنی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ منبعِ رشد وہدایت کو نور سے اور منبعِ کفر وطغیان کو ظلمت سے تعبیر کر لیا جاتا ہے۔

تفسیر المراغی

احمد مصطفےٰ مراغی کی یہ تفسیر رفیع المرتبہ سمجھی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

(قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین) النور ھو النبی صلی اللہ علیہ وسلم وسمی بذلک لانہ للبصیرۃ کالنور للبصر کما انہ لولا النور ما ادرک البصر شیئا من المبصرات کذلک لولا ما جاء بہ النبی من القرآن والاسلام

نور نبی صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور آپ کا نام نور اسلئے رکھا گیا کہ آپ بصیرت کیلئے ایسے ہی ہیں جیسے نور بینائی کے لئے۔ جب کبھی بھی نور نہیں ہوگا آدمی کی بینائی لائق نظارہ اشیاء کا دیدار نہ کر سکے گی ایسے ہی اگر نبیؐ قرآن اور اسلام وغیرہ نہ لاتے تو اہل کتاب اور غیر اہل کتاب میں کا کوئی صاحب بصیرت

لما ادرک ذا البصیرۃ من — دین حق کی حقیقت کا ادراک
اھل الکتاب ولا من — نہ کر سکتا۔
غیرھم حقیقۃ الدین الحق

متعدد تفاسیر اور بھی ہیں جنہیں حوالہ میں پیش کیا جا سکتا ہے لیکن فی الوقت اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا منکرین ظل نے جس آیت کو مستدل بنایا تھا اس کے بارے میں جملہ مفسرین کیا کہتے ہیں اور منکرین کا استدلال کتنا پا در ہوا ہے۔ اب انکی مستدل دوسری آیت (سراجا منیرا والی) پر گفتگو سے قبل ایک آیت ہم اور دیں جسے بعض لوگوں نے مستدل بنانے کی کوشش کی ہے

سورۂ نساء رکوع ۲۴ میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ — اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب
بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا — کی طرف سے برہان آیا ہے اور ہم نے
إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا۔ — نازل کیا ہے تم پر نورِ مبین۔

اس میں نورِ مبین سے مراد تقریباً سبھی مفسرین قرآن اور دینِ حق لیتے ہیں اور برھان سے بعض لوگوں نے رسول اللہؐ کی ذاتِ گرامی مراد لی ہے۔ ہر آئینہ منکرین ظل کے لئے اس میں کوئی دلیل نہیں، نورِ مبین قطعی طور پر قرآن کو کہا گیا ہے۔ یہ منکرین خوب جانتے ہیں کہ اس آیت سے استدلال دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ چنانچہ کاظمی صاحب نے تو اسے پیش ہی نہیں کیا ہے اور جو بعض لوگ پیش کرتے ہیں وہ بھی بھاگتے دوڑتے کہ سننے والا اگر مان لے تو کیا کہنے اور اعتراض کرے تو جلدی سے بات پلٹ دیں۔

اب سراجاً منیرا والی آیت ملاحظہ فرمائیے۔ سورۂ احزاب رکوع ۶ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے تاکہ نکالے تمہیں اندھیروں سے اجالے میں اور ہے وہ ایمان والوں پر مہربان۔ جس دن وہ اللہ سے ملیں گے تو وہاں ان کی سلام ہوگی (یعنی اللہ ان پر سلام بھیجے گا۔ فرشتے بھی سلام کرتے ہوئے آئیں گے اور وہ باہم بھی ایک دوسرے کے لئے سلامتی کے خواہاں ہوں گے) اور تیار رکھا ہے ان کیلئے عزت کا اجر۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

سورۂ احزاب رکوع ۶۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ — اے نبی ہم نے تجھے بھیجا شہادت
شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا — دینے والا اور خوشخبری سنانے
وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا — والا اور ڈرانے والا اور بلانے والا
إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا — اللہ کی طرف اس کے حکم سے
مُّنِيرًا۔ — اور چمکتا ہوا چراغ۔

غور کیجئے ان آیات کے سیاق و سباق اور زبانِ ادب کے قرائن اور لغت و اصطلاح کے تقاضوں کی روشنی میں کیا کوئی غیر جانب دار ذہن تصور بھی کر سکتا ہے کہ سراجِ منیر کے استعارے سے حضورؐ کے جسدِ مبارک کا بے سایہ ہونا مترشح ہوا؟ کیا اس کے سوا بھی کوئی مفہوم خیال میں آسکتا ہے کہ حضورؐ کو سراجِ منیر کہا گیا تو اس چراغ کی روشنی اور چمک سے مراد وہی دینِ حق اور ایمان و اسلام کی معنوی روشنی اور چمک ہے جس کی تعبیر قرآن نے جگہ جگہ نور سے کی ہے اور ماقبل کی آیات میں بھی یہ تعبیر موجود ہے لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (تاکہ نکالے تمہیں اندھیروں سے اجالے میں) یہ اندھیرے اور اجالے آخر کیا ہیں؟ کیا اندھیروں سے یہ مطلب ہے کہ رسول اللہ کی بعثت سے قبل سورج نہیں نکلتا تھا۔ یا نکلتا تھا تو روشنی نہیں دیتا تھا اور تمام عالم پر سیاہ رات طاری رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ دیوانے کے سوا ایسا کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اندھیروں سے کفر و شرک اور جہل و طغیان کی معنوی تاریکیاں مراد ہیں اور نور سے لازمی طور پر ایمان و اسلام کا معنوی اجالا مقصود ہے۔ تب اگلی آیت میں حضورؐ کو سراجِ منیر کہنے سے کیا لازمی طور پر یہی معنوی روشنی مفہوم نہ ہوگی! حضورؐ ظاہر ہے بشر تھے سچ مچ کے چراغ نہیں تھے۔ بطورِ استعارہ ہی انہیں چراغ کہا گیا۔ لہٰذا جو روشنی اس چراغ سے خارج ہو رہی ہے وہ بھی اس روشنی جیسی حسی و ظاہری نہیں ہو سکتی جو سچ مچ کے چراغ سے نکلا کرتی ہے۔

لیکن منکرینِ ظل عقل و ہوش کے ابتدائی تقاضے تک کو نظر انداز کر کے یہ ہانک لگاتے ہیں کہ سراجِ منیر کہا گیا تو حضورؐ نور ثابت ہوگئے اور نور بسیط ہوتا ہے اس کا سایہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا

آپ کا بھی سایہ نہیں تھا۔ یہ عقل کل اگر ادب و انشاء کے اسالیبِ بلیغہ کا دماغ نہیں رکھتے تو کم سے کم اتنا ہی سوچ لیں کہ خود چراغ سراپا نور نہیں ہوتا، بلکہ وہ تو ایک ٹھوس مادی جسم ہوتا ہے جو اگر دھوپ میں رکھدیا جائے تو اس کا سایہ بھی لازماً پڑے گا۔ ہاں جلائے جانے پر اس کی روشنی بے شک بسیط اور لطیف ہو سکتی ہے۔ تو اللہ کا حضورؐ کو چراغ کہنا خود اس بات کا شاہد ہے کہ آپ نورِ بسیط نہ تھے بلکہ چراغ کی طرح ایک مادّی جسم رکھنے والے تھے جس میں طول و عرض اور عمق سب کچھ ہوتا ہے اور جو روشنی کی راہ میں حائل ہو کر سایہ بھی ضرور دیتا ہے۔ صفتِ تنوّر اگر دھاندلی سے نورِ حسّی پر ہی محمول کر لی جائے تب بھی خود چراغ کا مبدّل بہ نور ہو جانا کون ہوش مند گمان کر سکتا ہے۔

قرآن میں "سراج" کا لفظ تین جگہ اور آیا ہے۔ سورۂ فرقان۔ نوح اور نبأ میں تینوں ہی جگہ اس کا مصداق صریح طور پر "سورج" ہے۔ اس لحاظ سے اگر یہ خیال کر لیا جائے کہ رسول اللہؐ کو سورج سے تشبیہ دی گئی ہے تب بھی یہ لغویات کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حضورؐ کے لئے سورج کے تمام لوازمات ثابت ہو گئے۔ وجہِ تشبیہ صفتِ غالبہ ہوا کرتی ہے۔ سورج کی صفتِ غالبہ روشنی پھیلانا ہے۔ اسی صفت کے لحاظ سے حضورؐ کو سراجِ منیر کہہ دیا گیا۔ اب اگر کوئی آدمی منکرینِ ظل کی طرح یہ دعویٰ کرنے لگے کہ حضورؐ حسّی و طبعی مفہوم میں سورج بن گئے تو اسے آپ دیوانہ ہی قرار دیں گے۔ نیز آپ یہ بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کی روشنی سورج کی روشنی جیسی ظاہری و حسّی نہیں۔ نہ ایسا ہوا ہے کہ حضورؐ کی حیات میں کبھی رات ہی نہ ہوئی ہو۔ دس بیس ہزار کے رقبے میں تو کجا، دو چار میل میں بھی بلکہ خود دولت کدۂ رسولؐ میں بھی اسی طرح ہر دن کے بعد کالی رات آتی تھی جیسی آج آتی ہے اور سب لوگ اپنے کام کاج کے لئے اسی طرح بیچ بیچ کے چراغ جلانے پر مجبور ہوتے تھے جس طرح آج ہیں۔ گویا جسمِ حضورؐ سے وہ حسّی روشنی نہیں نکلتی تھی جو سورج کی طرح تو کجا چاند بلکہ قمقمے اور مشعل اور چراغ کی طرح ظاہری اندھیرے کو دور کرتی ہے۔ تو روشنی پھیلانے میں سورج کے مشابہ قرار دینا اس کے سوا کیا معنی رکھ سکتا ہے کہ روشنی سے مراد دینِ حق اور ہدایت اور علمِ صحیحہ کی معنوی روشنی ہے جس سے کفر و شرک کی تاریکیاں دور ہوتی ہیں۔

اور اگر سورج سے نہیں بلکہ اسی چراغ سے تشبیہ مانی جائے جو گھروں میں جلتا ہے تب بھی حضورؐ کے جسم مبارک کا ٹھوس اور مادّی ہونا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ ہر شخص چراغ کی مادیت سے واقف ہے۔ اگر نورِ حضورؐ کو نورِ حسّی ہی فرض کر لیا جائے تب بھی چراغ تو بجائے خود ٹھوس اور مادی ہی رہے گا چاہے اس کی لَو سے کتنی ہی روشنی نکلے۔ زیرِ بحث آیت میں تشبیہ چراغ سے دی گئی ہے نہ کہ روشنی سے۔ منیر تو چراغ کی صفت ہے نہ کہ خود مشبہ کی۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جو ان بدیہی اُمور کو پسِ پشت ڈال کر الفاظِ قرآنی کو اپنی خواہشات اور رسائے کے ہاتھوں کھلونا بناتے ہیں۔

الحمدللہ منکرینِ ظل کی "اصلی دلیل" کا بے بنیاد اور قطعاً ہوائی ہونا اظہر من الشمس ہوا۔ اب انصاف فرمائیے کہ جب دلیل ہی ہوائی بلکہ لاشئ ہو تو شواہد و مؤیدات کیا کام دیں گے۔ دوا مریض کو اچھا کر سکتی ہے مگر مُردے کو نہیں جلا سکتی۔ اصولاً تو منکرین کا دعویٰ اس حد تک باطل ہوا کہ اب شواہد پر گفتگو کی حاجت ہی نہیں رہ جاتی۔ لیکن ہم دکھلانا چاہتے ہیں کہ ان کے شواہد بھی ایسے ہی ہیں جیسی یہ اصل دلیل تھی اور بنیاد ہی نہیں، ان کی پوری تعمیر ہی خیالی قلعہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ وما التوفیق الا باللہ۔

حدیث ارشادِ رسولؐ پر دل و جان فدا۔ کس مومن میں مجال ہے کہ اللہ کے سچے رسولؐ کوئی خبر یا حکم دیں اور وہ انکار کی جرأت کرے۔ ہزار بار اس سرکشی سے اللہ کی پناہ۔ لیکن حُبِّ نبی اور اطاعتِ رسولؐ کا یہی جذبہ تو ہے جو مجبور کرتا ہے کہ اپنے پیارے نبی کے فرمودات اور غیرِ نبی کے اقوال میں فرق کیا جائے اور جانچ پرکھ میں شدت برتی جائے کوئی کھیل نہیں ہے کہ زید عمر و بکر دعویٰ کریں کہ حضورؐ نے یوں فرمایا تھا اور ہم احمقوں کی طرح آمنّا و صدّقنا پکار اٹھیں۔ ہم کیسے گوارا کریں گے کہ بعد کا کوئی گستاخ ایک قول گھڑے اور ہمیں جھانسہ دے کہ یہ تمہارے

نبی کا قول ہے۔ عقیدت کی رو میں عقل کو چھٹی دیدینا اور رطب و یابس کے فرق سے بے بہرہ ہو جانا نادان کی دوستی ہے جسے دانا کی دشمنی سے بدتر کہا گیا ہے۔ عقیدت حماقت کا نام نہیں حُبِّ رسول کند ذہنی کو نہیں کہتے۔ جن لوگوں نے عقیدت و محبت کے نام پر رسول اللہؐ کو ان کے حقیقی مرتبۂ و مقام سے بڑھایا اس نے حضورؐ ہی کی نافرمانی کی اور اللہ کو ناراض کیا حضورؐ ہی تو ارشاد فرماتے ہیں کہ لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسی ابن مریم (مجھے بڑھاؤ چڑھاؤ مت جس طرح نصرانیوں نے عیسٰی ابن مریم کو بڑھایا چڑھایا) پھر بھی اگر کوئی یہی گمان کرتا ہے کہ حضورؐ کی شان میں بے دلیل فضائل گھڑنے اور غیر ثابت فضائل و اوصاف بیان کرنے کا نام حُبِّ رسولؐ ہے تو اسے اپنا گمان مبارک۔ ہم ایسی جاہلانہ محبت و عقیدت کو اللہ کی ناراضگی اور حضورؐ کی خفگی کا موجب سمجھتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد یہ بھی خوب ذہن نشین رکھئے کہ اختلاف یہ ہے۔ ہم نے یہ کبھی نہیں کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر قسم کے نور حسّی و ظاہری سے بالکل خالی تھے۔ آپ کے چہرے پر جس حسن و جمال اور طلعت و تابش کا تذکرہ محدثین کرتے ہیں اس سے انکار کی کسے اور کیوں مجال؟ یہ بھی ہم مانتے ہیں کہ بعض مرتبہ بعض حضرات نے آپ کے کسی عضو یا چند اعضاء سے ایک ایسی روشنی خارج ہوتے ہوئے دیکھی جو ان کے خیال میں حسّی اور مرئی تھی۔ یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ باطنی علوم و معارف اور اعلیٰ درجہ کی نبوتِ منوّرہ کے نتیجے میں کبھی آپ کے جسدِ مطہر سے غیر معمولی نور و طلعت کا مشاہدہ کیا گیا ہو۔

گفتگو اس نکتہ میں ہے کہ منکرینِ ظل کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کا پورا جسم مبارک طبعی و حقیقی معنوں میں نورِ مستقل تھا جس میں سے سورج کی شعاعیں اس طرح گذر جاتی تھیں کہ سایہ نہیں پڑتا تھا۔

اب ان منکرین کی عقل کا عالم دیکھیے کہ اپنے دعوے کی شہادت میں کس طرح کی روایتیں پیش کرتے ہیں۔ پہلی روایت پیش کی گئی کہ حضرت حسنؓ کے دریافت کرنے پر ان کے ماموں نے رسول اللہؐ کا جو حلیہ مبارکہ بیان کیا اس میں فرمایا کہ رسول اللہ عظیم و معظم تھے۔ آپ کا چہرۂ انور ایسا چمکتا تھا جیسے چودھویں کا چاند۔

کیا چاند کی اس تشبیہ سے سچ مچ کا چاند مراد لینا ویسی ہی کور دماغی نہیں جیسی ہم دو مثالوں میں واضح کر آئے ہیں۔ پھر چلو مان لو۔ لیکن یہ روایت تو حضورؐ کے روئے مبارک کا حسن و جمال ظاہر کر رہی ہے نہ کہ پورے بدن کا۔ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ پورا بدن نورِ طبعی تھا۔ یہ روایت صرف چہرے کو خصوصیت دیکر واضح کرتی ہے کہ باقی جسم کا یہ حال نہیں تھا۔ اگر یہی ہوتا تو وہ سارے جسم کو چودھویں کے چاند سے تشبیہ دیتے۔ دوسری حدیث پیش فرماتے ہیں کہ حضرت جابرؓ نے کہا کہ ایک مرتبہ چاندنی رات میں، میں نے رسول اللہؐ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ پر سرخ رنگ کا (دھاری دار) حُلّہ تھا، میں حضورؐ کو کبھی دیکھتا اور چاند کو کبھی، تو حضورؐ میرے نزدیک چاند سے زیادہ حسین تھے۔

خدا رحم کرے ان دانشوروں پر۔ دنیا کے شاید ہر ادب میں محبوب کے حسن و جمال کو چاند سے تشبیہ دی گئی ہے۔ حضرت جابرؓ کو کیا معلوم تھا کہ ان کی تشبیہ و تمثیل کو آنے والے دَوْر کے بعض افلاطون کیا معنی دیں گے۔ رسول اللہؐ کی محبوبیت کے صادقین۔ ان کے روئے مبارک کی تابانی و طلعت کو اگر ان کے شیدائی چاند سے تشبیہ دیں تو غلط فہمی کا کیا موقعہ۔ مگر کسی کا دماغ ہی الٹ جائے تو اس کا کیا علاج۔

ایک اور مزیداری ہے کہ روایت میں عندی آیا ہے یعنی حضرت جابرؓ نے کہا کہ حضورؐ میرے نزدیک چاند سے زیادہ حسین تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حضرت جابرؓ صرف اپنا تأثر و احساس بیان کر رہے ہیں۔ سائے کے دشمنوں کو یہ بات ناپسند آئی تو علامہ شیخ ابراہیم بیجوری کی ایک تشریح لائے جو انھوں نے اس حدیث کے ذیل میں کی ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ ایک اور روایت میں "فی عینی" آیا ہے۔ یعنی "میری نگاہ میں"۔ ہم پوچھتے ہیں اس سے کیا فرق پڑا "میرے نزدیک" اور "میری نگاہ میں" تو ایک ہی مفہوم کے لئے بولا جاتا ہے۔ مگر نہیں۔ حضرت بیجوریؒ نے بلا دلیل یہ شوشہ نکالا کہ حضورؐ ہر دیکھنے والے کے نزدیک فی الواقع چاند سے زیادہ حسین تھے۔

ذرا اندازہ کیجیے۔ اہل نظر و بشرک کو بھی اس تأثر میں شامل کر لیا گیا

جو خالص ایمان کا ثمرہ تھا۔ ظالمو اگر یہی حقیقت ہوتی تو تمام ہی لوگ اہل ایمان کی طرح مومن نہ ہو گئے ہوتے۔

اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ حدیث میں حسن کا ذکر ہے روشنی کا نہیں۔ جو شخص حسن اور روشنی میں بھی فرق نہ کر سکے۔ اس کے ذوق و وجدان پر فاتحہ کے سوا کیا پڑھا جا سکتا ہے۔

علامہ بیجوری نے آگے فرمایا کہ :-

"اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاند سے زیادہ حسین اس لئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی چاند کی روشنی بلکہ سورج کی روشنی پر غالب رہتی تھی۔ کیونکہ سیدنا ابن مبارک اور علامہ ابن جوزی محدث کی روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سورج کے سامنے کبھی کھڑے نہیں ہوتے، مگر حضور کی روشنی سورج کی روشنی پر غالب ہو جاتی تھی۔ اسی طرح چراغ کے سامنے بھی حضور کبھی کھڑے نہیں ہوتے مگر چراغ کی روشنی پر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی غالب رہتی تھی"۔

اب بتائیے عیسائیوں کو آپ برا کیوں کہتے ہیں۔ اگر وہ فرط عقیدت میں عیسیٰ ؑ کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ یا ان ہندوؤں کا کیا قصور ہے جو دیومالا پر ایمان رکھتے ہیں۔ حضور کا حسین و جمیل ہونا برحق لیکن اس حسن کے بیان میں اتنا مبالغہ کہ نوامیس فطرت، آیات الٰہیہ یعنی چاند سورج بھی گرد ہو جائیں اور پھر اس مبالغہ کو بیان حقیقت منوانے کی کوشش اگر مجذوبیت و مغلوبیت نہیں تو اور کیا ہے۔ حاملین حدیث کی اسی طرح کی حرکتیں تو ہیں جنھوں نے لوگوں میں انکار حدیث پر اصرار اور تشدد پیدا کیا۔ حدیث کی حمایت اور ترجمانی اگر ایسی بے دانشی اور مجذوبیت کے ساتھ نہ کی جاتی تو ردِ عمل اتنا سخت نہ ہوتا اور بہت سے لوگ انکار کی اس انتہا پر نہ پہنچتے جس پر انھیں عاشقان حدیث کی کم فہمیوں نے پہنچا دیا ہے۔

الغرض پڑتا تھا کہ اگر حضور کا سورج اور چاند سے زیادہ روشن ہونا ظاہری و طبعی معنی میں درست ہے تو پھر یہ بھی لازماً ہونا چاہئے تھا کہ پر رعب نہ سہی، مدینہ یا مکہ سہی، یہ گلی سہی تو وہ رستے اور مکان سہی جن میں حضور موجود رہتے تھے۔ اسی طرح روشن رہا کرتے جس طرح دن میں رہتے ہیں۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ حضور کی راہ میں بھی رات کے وقت اندھیرا ہی ہوتا تھا اور حضور کے دولتکدہ میں بھی تاریکی دور کرنے کے لئے چراغ جلائے جاتے تھے۔ اس طرح کی روایتوں میں سے صرف ایک روایت کاظمی صاحب نے نقل فرمائی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ حضور ایک بار میرے حجرے میں نماز پڑھنے تھے اور چراغ نہ ہونے کے باعث اندھیرا تھا تو جب آپ سجدے میں جاتے تو میرے پاؤں کو اپنے مبارک ہاتھ سے دبا دیتے اور میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی تو حضورؐ سجدہ فرماتے۔

اس کا جواب دانشمند یہ دیتے ہیں کہ اس قسم کی روایات سے نور مبارک کی نفی نہیں ہوتی، بلکہ ظہور کی نفی ہوتی ہے اور نفی ظہور نفی وجود کو مستلزم نہیں۔ پھر انھوں نے علم کی مثال دی ہے کہ جب عالم پر نیند یا عدم التفات وغیرہ کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ظہور علم نہیں ہوتا۔ مگر فی الحقیقت وہ علم اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔

چلئے مان لیا۔ لیکن اس طرح تو آپ خود ہی تسلیم کر رہے ہیں کہ حضورؐ خود مجسم نور نہ تھے۔ بلکہ یہ نور آپ کے اندر تھا جو کبھی ظہور کرتا تھا اور کبھی چھپا رہتا تھا۔ علم اور عالم دو الگ چیزیں ہیں، روشنی اور چراغ دو جداگانہ وجود ہیں۔ آپ جس نور کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ موجود تھا مگر مائل ظہور نہیں تھا، اسے تو ہم بھی مانتے ہیں لیکن آپ کا تو دعویٰ ہے کہ حضور خود ظاہری معنوں میں ہی سراپا نور تھے۔ لہٰذا یہ کیا بات ہوئی کہ نور کبھی ظاہر ہوا کبھی نہیں ہوا۔ اور "کبھی" تو آپ کہتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ کبھی بھی ظاہر نہیں ہوا۔ یعنی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تاریک رات میں حضورؐ کے بدن سے سورج جیسی ضیاء نکل کر تمام ماحول کو اسی طرح روشن کر گئی ہو جیسے سورج کرتا ہے تو جواب مذکورہ کا کیا وزن رہا۔ اور دیکھئے :-

آپ کہتے ہیں کہ نور محمدؐ کی مثال علم جیسی ہے تو علم تو نور معنوی ہے نہ کہ حسی۔ پھر علم کا اظہار اور اخفاء عالم کی اپنی مرضی پر ہوتا ہے۔ کیا حضورؐ کا وہ نور بھی جس کے حسی اور مشاہد ہونے کا آپ کو دعویٰ ہے ایسا ہی تھا کہ جب حضورؐ چاہیں اسے ظاہر کریں جب نہ چاہیں نہ ظاہر کریں

اللہ کے بندو اس نور کو ظاہر کرنے کا اس سے بہتر وقت کونسا ہو سکتا تھا کہ اندھیرے کی وجہ سے حضورؐ کو خالی مقام پر سجدہ کرنے میں دقت پیش آرہی تھی اور اسی لئے آپؐ حضرت عائشہؓ کے پاؤں دبانے کا وہ عمل فرماتے جا رہے تھے جو ظاہر ہے کہ زائد از صلوٰۃ تھا۔ مجبوری درپیش نہ ہوتی تو آپؐ ہرگز ایسا نہ کرتے۔ کیوں نہ اس وقت آپؐ نے اس نورِ حسّی کو ظاہر کیا جو رات کو دن میں بدل دیتا اور حضورؐ کی نماز چا ندرنے میں ہو جاتی۔

ہر شخص پر ظاہر ہے کہ جو فی الاصل نور ہے وہ تو ہر وقت اور ہر حال میں نور ہی رہے گا۔ سورج جب تک سامنے ہے اسکی روشنی ضرور آئے گی۔ رسول اللہؐ اگر اسی طبعی مفہوم میں روشنی اور نور ہوتے جس مفہوم میں منکرین ظل سمجھانا چاہتے ہیں اور جس مفہوم کو حدیث کے شارح علامہ بیجوری نے ایک محلِ نظر روایت سے مؤکد کیا ہے تو پھر یہی ہوا کرتا کہ جہاں آپ ہوں وہاں رات تھوڑی ہی رہے۔ اندھیرا نہ ہو اجالا ہی نظر آئے۔ ایسا نہیں ہوا اور کبھی نہیں ہوا۔ تو ثابت ہوا کہ حضورؐ کا تمام جسدِ مبارک طبعی و حسّی معنوں میں نور نہیں تھا۔ بلکہ اسی طرح گوشت پوست کا مجموعہ تھا جیسا اللہ نے اسے بنایا تھا اور جیسا بشر کا ہوا کرتا ہے۔ اِلّا یہ کہ شقِ صدر کے ذریعہ اندرونی آلائشیں نکال لی گئی تھیں اور اس تزکیہ و تصفیہ کے اثرات آپ کے اعمال و اخلاق میں نمایاں ہوا کرتے تھے نہ کہ ظاہری جسم میں۔ ظاہری جسم تو کھانے پینے، جماع کرنے، تھکنے اور زخمی ہونے کے سبھی لوازمات کا مورد تھا۔

تماشا دیکھئے کہ ایک طرف تو علامہ بیجوری کی تحریر سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ حضورؐ کا نورِ حسّی ہمیشہ ہمیشہ چراغ اور سورج کی روشنی پر غالب رہا کرتا تھا اور دوسری طرف جواب دینے بیٹھے تو فرما رہے ہیں روایات سے ظہور کی نفی واضح ہوتی ہے وجود کی نہیں اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ کچھ اوقات میں حسّی طور پر غیر روشن ہونے کو آپ بھی تسلیم کر رہے ہیں۔ پھر یہ ہمیشہ ہمیشہ کی بات چہ معنی دارد؟

دراصل معنی وغیرہ کچھ نہیں مقصود بات کی پچ ہے۔ جب جو جواب ذہن میں آیا داغ دیا۔ بلا سے وہ دعوے کے چوکٹے میں فٹ بیٹھے یا نہ بیٹھے۔

رہا علامہ بیجوری کا ابن المبارک اور ابن جوزی کے حوالوں سے یہ کہنا کہ حضورؐ کا سایہ نہیں تھا تو بے شک یہ دونوں حضرات فضل و مرتبت کے مالک تھے اور ان کی عظمت پر ہمارا سرِ عقیدت خم ہے۔ لیکن ان کی نبوّت یا صحابیت ہم نہیں مانیں گے۔ ان کا کوئی فرمودہ اگر عقل و نقل کے خلاف ہو تو اسے تسلیم کرنے کے ہم پابند نہیں۔ جو روایت ان دونوں حضرات کے واسطے سے بیان کی جاتی ہے اس کی پوری سند لائیے۔ ایک ایک راوی کو ہم دیکھیں گے کہ فنِّ رجال میں اس کا کیا حال ہے اور معروف و معتبر ائمۂ رجال اسے معتبر قرار دیتے ہیں یا غیر معتبر۔ بلا راویوں کی تفصیل بتائے ایک روایت داغ دینا اور دعوے کرنا کہ یہ حدیث ہے جہاں یا اندھے مقلدین کو مرعوب کرے تو کرے ہم اسے کوئی وقعت نہیں دے سکتے۔ لاکھوں روایتیں گھڑی گئی ہیں اور ان کی بے شمار چھان پھٹک کے باوجود اسلاف میں متعدد ایسے محدثین ہو گذرے ہیں جنھوں نے غلط سلط روایات کو درست سمجھ کر قبول کر لیا۔ کون عالم نہیں جانتا کہ حدیث کی موجود کتابوں میں اکثریت ان کتابوں کی ہے جن میں بعض موضوع روایات کا پایا جانا طے شدہ معاملہ ہے۔ تو جسے دعویٰ ہے کہ ابن المبارک اور ابن جوزی نے رسول اللہ کا سایہ نہ ہونے کی روایت کی ہے وہ پورا سلسلۂ سند بیان کرے۔ یا پھر ثابت کرے کہ یہ دونوں حضرات معصوم عن الخطاء تھے اور ان کا فرمودہ وحیِ آسمانی ہے۔

تیسری روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ حضورؐ کا چہرہ تلوار کی مانند نہیں تھا، بلکہ چاند کی طرح تھا۔

چوتھی یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بتایا کہ حضورؐ جب کلام فرماتے تھے تو آپ کے دانتوں کی درمیانی جھریوں سے نور کی مانند کوئی چمکدار چیز نکلتی ہوئی دیکھی جاتی تھی۔

اس روایت میں "کالنّور" کا لفظ ہے۔ ظاہر ہے کاف تشبیہ کے لئے آتا ہے مگر ترجمہ فرمایا گیا کہ "نور یا نور کی مانند" پھر علامہ بیجوری کا یہ نکتہ سامنے لایا گیا کہ "کالنّور" میں کاف زائدہ ہونا بھی ممکن ہے کہ تفخیم کے لئے بڑھا دیا گیا ہو۔ اس خود ساختہ احتمال پر ہم قواعدِ نحویہ کے لحاظ سے گفتگو کر سکتے تھے

لیکن اس کی ضرورت یوں نہیں کہ کاف کو زائد مان کر بھی ہمارے موقف میں کوئی کمزوری نہیں آتی۔ یہ روایت تو خوب وضاحت سے بتارہی ہے کہ حضورؐ سراپا نورِ حسّی نہیں تھے، بلکہ آپ کے اندر کوئی شے تھی جو گاہے گاہے بعض اعضائے جسم سے نور کی شکل میں خارج ہو جاتی تھی۔ کاظمی صاحب کاف زائدہ کا شوشہ نکال کر بہت خوش ہوئے ہیں کہ "نورِ حسّی تھا" لیکن، بھول گئے کہ دعویٰ تو تمام و کمال جسم کے نورِ حسّی ہونے کا کر رکھا ہے اور یہاں اس نورِ حسّی کا اثبات ہو رہا ہے جو ہر وقت نہیں صرف بولتے وقت اور تمام بدن سے نہیں صرف دانتوں کی ریخوں سے خارج ہو رہا ہے۔

پانچویں روایت یہ کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ خوش اور مسرور میرے پاس آئے تو آپ کی پیشانی کے خطوط چمک رہے تھے۔ یہ روایت بخاری کی ہے اس لئے بلا تامل مانی جاسکتی ہے۔ ماننے میں کوئی دقت بھی نہیں ہے۔ مگر عقل والوں سے عرض ہے کہ ذرا منکرینِ ظل کے دعوے کو دیکھئے اور پھر یہ دلیلیں ملاحظہ کیجئے۔ کوئی جوڑ، کوئی منطقی ربط ان میں کہیں نام کو بھی پایا جاتا ہے؟ محاورہ تو اردو میں بھی مستعمل ہے کہ فلاں شخص کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ تو کیا اس طرح کے واضح محاوروں تک کا مطلب منکرینِ ظل نہیں سمجھتے۔ واہ رے دانشورو۔

ذرا دیکھئے تو شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں کیا فرماتے ہیں:-

حديث عائشة قصة القائف وسياتي شرحه في كتاب الفرائض انشاء الله تعالى والغرض منه هنا قولها تبرق اسارير وجهه والاسارير جمع اسرار وهي جمع سرر وهي الخطوط التي تكون في الجبهه (فتح الباري جلد ۶ ص ۴۴۶ باب صفۃ النبی)

یہ حدیث عائشہ قصہ قائف میں ہے اور اس کی شرح انشاء اللہ عنقریب کتاب الفرائض میں آرہی ہے اور غرض یہاں قولِ عائشہ سے یہ ہے کہ حضورؐ کے خطوطِ پیشانی چمک رہے تھے اور اساریر جمع ہے اسرار کی اور اسرار جمع ہے سرر کی سرر پیشانی کے خطوط کو کہتے ہیں۔

پھر باب القائف کھولئے جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہاں حدیث کے اس ٹکڑے کے بارے میں صرف اتنا ملے گا:-

(تبرق اسارير وجهه) تقدم شرحه في صفة النبي صلى الله عليه وسلم.

(تبرق اسارير وجهه) کی شرح باب صفۃ النبیؐ میں گذر چکی۔

بس۔ بخاری کے اس سب سے بڑے شارح اور فنِ حدیث کے شہسوار کو خواب میں بھی گمان نہیں گذرا کہ اس صاف و سادہ پارۂ حدیث سے رسول اللہؐ کے بے سایہ ہونے پر بھی شہادت لائی جاسکتی ہے۔

چھٹی روایت بھی بخاری ہی کی پیش کی گئی ہے۔ یہ کہ:-

"کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ جب میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام عرض کیا تو چہرۂ انور فرحت و سرور سے چمک رہا تھا اور حضورؐ خوش ہوتے تھے تو چہرۂ انور ایسا چمکنے لگتا تھا گویا کہ وہ چاند کا ٹکڑا ہے۔"

کیا دنیا کا کوئی غبی سے غبی آدمی بھی پاگل ہوئے بغیر اس پارۂ حدیث کو رسول اللہؐ کے بے سایہ ہونے کی گواہی میں لاسکتا ہے؟ صاف لفظ كَاَنَّهٗ موجود ہے جس کا ترجمہ خود ناقل نے بھی "گویا کہ" کیا ہے مگر نعرہ وہی مجذوبانہ کہ اس سے حضورؐ کا سراپا نورِ طبعی و حسّی ہونا ثابت ہو گیا۔

اور سنئے اس کے تحت میں کیسا الیکشنی انداز کا مغالطہ عوام کو دینا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"فتح الباری وغیرہ شروح اٹھا کر دیکھئے تمام شراحِ کرام ان احادیث سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی حسّی نور کو ثابت مان رہے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ایسی چمکتی ہوئی روشن حدیثوں کے ہوتے ہوئے کوئی ایسا شخص جس کے دل میں نورِ ایمان کی ادنیٰ جھلک بھی موجود ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جسمانیتِ مقدسہ کیلئے نورِ حسّی کا انکار نہیں کرسکتا اور ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اس نورانیت کا مقتضیٰ سایہ نہ ہونا ہے اسی لئے محدثین کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ہونے کو حضورؐ کے سایہ نہ ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔"

اس گل افشانی سے الیکشنی مقرروں کی یاوہ گوئی کو مات کر دیا تمام شراح حدیث کو تو بعد میں دیکھئے گا پہلے اسی فتح الباری کو دیکھئے جس کا نام لکھ کر جناب نے یہ تأثر دینا چاہا ہے کہ محدثین بھی حضورؐ کی نورانیت کے بارے میں اسی عقیدے کے حامل ہیں جس کے آپ ہیں۔ یعنی حضورؐ سراپا نور حسّی تھے اور ان کا سایہ نہیں تھا۔

بخاری کی پہلی حدیث کی شرح تو آپ ابھی صاحب فتح الباری کے قلم سے ملاحظہ فرما چکے۔ اب اس دوسری کی بھی ملاحظہ فرمائیے۔

فتح الباری جلد۶ ص۴۴۸ میں حافظ ابن حجر اسی مذکورہ (نمبر۲) کی شرح میں لکھتے ہیں:-

حدیث کعب بن مالك وهو طرف من قصة توبته وسياق بطوله في المغازي مستوفي شرحه انشاء الله تعالى.

یہ حدیث کعب بن مالک انکی توبہ کے قصہ کا ایک ٹکڑا ہے اور عنقریب کتاب المغازی میں یہ قصہ اپنے پورے طول کے ساتھ آئے گا تو انشاء اللہ اس کی پوری شرح کی جائے گی۔

یہاں تو اتنے پر بات ختم ہوگئی۔ اب کتاب المغازی بھی دیکھئے۔ مذکورہ حدیث میں قطعۃ قمر کے جو الفاظ آتے ہیں اس کے تحت حافظ لکھتے ہیں:-

(حتى كانه قطعة قمر) في رواية اسحق بن راشد في التفسير حتى كانه قطعة من القمر ويسئل عن السر في التقييد بالقطعة مع كثرة ما ورد في كلام البلغاء من تشبيه الوجه بالقمر بغير تقييد وقد تقدم في صفة النبي ﷺ تشبيههم له بالشمس طالعة وغير ذلك وكان كعب بن مالك قائل هذا من شعراء الصحابة وحاله في ذلك مشهور فلابد من التقييد بذالك من حكمة وما قيل في ذلك من الاحتراز من السواد الذي في القمر ليس بقوى لان المراد تشبيهه بما في القمر من الضياء والاستنارة وهو في تمامه لا يكون فيها اقل مما في القطعة المجردة وقد ذكرة في صفة النبي ﷺ بذلك توجيهات ومنها انه للاشارة الى موضع الاستنارة وهو الجبين وفيه يظهر السرور كما قالت عائشة مسرورا تبرق اسارير وجهه فكان التشبيه وقع على بعض الوجه فناسب ان يشبه ببعض القمر.

اور تفسیر میں اسحاق بن راشد کی روایت کے الفاظ یہ ہیں حتی کان قطعۃ من القمر۔ اور سوال اٹھا ہے کہ چاند کا ٹکڑا کیوں کہا گیا جب کہ بلغاء کے کلام میں چہرے کو پورے چاند سے تشبیہ دینا کثرت سے پایا جاتا ہے اور باب صفۃ النبیؐ میں بھی گذر چکا ہے کہ بلغاء حضورؐ کو روشن سورج سے تشبیہ دیتے ہیں وغیرذلک۔ اور اس تشبیہ کے دینے والے کعب بن مالک تھے جو صحابہؓ کی صف شعراء میں شامل تھے اور ان کی شعرگوئی مشہور ہے تو لا زماً اس تقیید میں (یعنی بجائے چاند کہنے کے چاند کا ٹکڑا کہنے میں) کوئی حکمت ہوگی۔ رہی یہ تاویل کہ پورے چاند میں تو سیاہ دھبہ بھی ہے۔ لہذا یہ سیاہی بھی شامل تشبیہ ہو جاتی اس لئے ٹکڑا کہہ کر اسے خارج کر دیا تو یہ قوی نہیں ہے اس لئے کہ تشبیہ تو اس روشنی اور چمک سے دی جا رہی ہے جو پورے چاند میں ہے اور پورے چاند کی روشنی (سیاہ دھبے کے باوجود) اس روشنی سے کم نہیں ہوتی جو اس کے کسی ٹکڑے میں ہو سکتی ہے۔ اور ذکر کی جا چکی ہیں باب صفۃ النبیؐ میں اس طرح کی توجیہات اور انہیں میں سے ایک توجیہ یہ ہے کہ اصل (پورے بدن کو نہیں بلکہ) ایک خاص حصۂ بدن کو یعنی پیشانی کو کہ اس میں خوشی کی چمک دمک ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا (مسرورا تبرق اسارير وجهه) تشبیہ دینی مقصود ہے لہٰذا زیادہ مناسب یہی معلوم ہوا کہ پورے چاند سے نہیں بلکہ اسکے ایک حصّے سے تشبیہ دی جائے

٭ ٭ ٭

یہ فتح الباری کی ساری شرح (اس حدیث منقولہ سے متعلق) پیش خدمت ہے۔ اسے غور سے پڑھئے اور کاظمی صاحب کی وہ الیکشنی عبارت پڑھئے جو ابھی نقل ہوئی۔ کیا اس سے بڑھ کر افتراء، ڈھٹائی اور جرأت کچھ ہو سکتی ہے کہ جس عقیدہ وخیال کا وہم وگمان تک ابن حجر کو نہ گذرا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ صراحت کے ساتھ فصاحت وبلاغت اور تشبیہ کا تذکرہ فرما رہے ہوں۔ اسی کی نسبت گول الفاظ میں انکی طرف

کردی جائے۔ زیادہ غور کی ضرورت نہیں۔ معمولی مطالعے ہی سے منکشف ہو جاتا ہے کہ حافظ ابن حجر کے نزدیک بھی حضورؐ کے لئے چاند اور سورج کے الفاظ تشبیہ و استعارہ ہی ہیں جیسا کہ سب لوگ جانتے اور سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ان حدیثوں کی تشریح میں نورِ حسی کا ذکر تک نہیں کیا ہے جنھیں نقل کرنے کے بعد دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ "فتح الباری وغیرہ شروحِ بخاری" میں "حقیقی حسی نور" ثابت مانا گیا ہے۔ حالانکہ اگر کسی موقعہ پر ان شرحوں میں نورِ حقیقی حسی کا تذکرہ آ بھی جاتا تو کچھ بھی فائدہ نہ تھا۔ جزئی طور پر کبھی نورِ حسی کا اخراج رسول اللہؐ کے کسی حصۂ جسم سے محلِ نزاع نہیں ہے۔ محلِ نزاع تو وہ ہے جسے ہم کاظمی صاحب کے اور اپنے الفاظ میں دوبار پیش کر چکے ہیں۔

حافظ ابن حجر کی مذکورہ شرح سے ایک اور نکتہ سامنے آیا۔ دیکھئے وہ اس تاویل کو غیر قوی کہہ رہے ہیں کہ چاند کا ٹکڑا اس لئے کہا گیا کہ چاند میں جو داغ ہے اس سے حضورؐ غیر ملوث رہیں۔ اس کی بجائے وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کو جب چاند سے تشبیہ دی جاتی ہے تو وجہِ شبہ صرف روشنی ہوتی ہے نہ کہ چاند کے دیگر خواص و اوصاف۔ لہٰذا یہ وہم کرنا درست نہیں کہ پورے چاند سے تشبیہ دینا حضورؐ کو نعوذ باللہ "داغ دار" بنا دے گا۔ اور چونکہ روشنی ہی تک تشبیہ محدود ہے۔ لہٰذا یہ لازماً ماننا پڑے گا کہ چاند کا کوئی بھی ٹکڑا روشنی میں پورے چاند سے زیادہ بڑھ کر نہیں ہو سکتا کم ہی روشن ہوگا۔

اب کہاں ہیں منکرینِ ظل۔ وہ تو کہتے تھے کہ حضورؐ کو نور کہنے سے نور کی طرح بے سایہ ہو جانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ تب تو چاند کہنے سے "داغدار" ہونا بھی لازمی ہو جائے گا (نعوذ باللہ) حالانکہ جن صاحبِ فتح الباری کے لئے انھوں نے سفید جھوٹ بولا تھا کہ وہ بھی ہماری ہی طرح نورِ حسی حقیقی کے قائل ہیں وہ تو تشبیہ میں تنہا وجہِ شبہ (روشنی) کے سوا اس نمایاں وصف کو بھی شامل نہیں مانتے جو چاند میں روشنی کے ساتھ ہی ہمیشہ نظر آیا ہے یعنی کالا داغ!

نور کا مقتضیٰ بے سایہ ہونا ہے تو روشن سورج کا مقتضیٰ بھی آس پاس کی چیزوں کو جلا کے بھسم کر دینا ہے اور کروڑوں میل کے فاصلے پر زمین کی ہریالی کو جھلس دینا، تالابوں کو چوس ڈالنا اور مخلوقِ خدا کو گرمی سے پریشان کر دینا ہے تو کیا ابن حجر کی توضیح کے مطابق حضورؐ کو "شمس طالعۃ" سے تشبیہ دینے کا مطلب یہ لیا جائیگا کہ نعوذ باللہ حضورؐ میں بھی یہ مقتضیات پائے جاتے تھے؟

اللہ تعالیٰ دماغوں پر رحم کرے۔ جب ان کا توازن بگڑتا ہے تو زمین آسمان ایک نظر آنے لگتے ہیں۔

رہے اور محدثین کرام تو خدا کے لئے کسی ایک مقبول و معروف "محدث" کا نام تو لیجئے جس نے حضورؐ کے نور ہونے کو بے سایہ ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ خواہ مخواہ ان بے چاروں پر اتہام کیوں لگاتے ہو ہاں اگر تمہارے یہاں حافظ سیوطی اور علامہ بیجوری بھی "محدث" کہلاتے ہیں تو ایں را علاجے نیست! مگر آئیے امام قسطلانی کی اس مواہب اللدنیہ کو بھی دیکھیں جس میں انھوں نے نہ جانے کن احوال میں سایہ نہ ہونے کی بات نقل کر دی ہے اور اس کے شارح زرقانی نے اس کی تائید میں ابن المبارک اور ابن جوزی کی بے سند روایت ٹانک دی ہے۔ یہ مواہب اللدنیہ کی کتاب الشمائل کا ماجرا ہے ذرا دیکھئے اس کے آغاز ہی میں وہ کیا فرما گئے ہیں۔ بریکٹ میں صاحبِ مواہب کی عبارت ہے اور باقی زرقانی کی۔

وھٰذہ التشبیھات الواردۃ فی حقہ علیہ السلام انما ھی علیٰ سبیل التقریب والتمثیل۔	اور یہ تشبیہات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وارد ہوئی ہیں یہ تقریب و تمثیل کے طور پر وارد ہوئی ہیں۔

(زرقانی شرح مواہب اللدنیہ جزء رابع ص۸۳)

پھر کچھ آگے:-

ان التشبیہ بالشمس انما یراد بہ غالب (الاشراق) دون الضرر والاحراق (وبالقمر انما یراد بہ الملاحۃ) دون غیرھما۔	حضورؐ کو سورج سے تشبیہ دینے میں اس کی صفت غالبہ یعنی روشن کرنے کی صفت کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے نہ کہ نقصان پہنچانے اور جلا ڈالنے کے اوصاف کو اور چاند سے تشبیہ دینے میں ملاحت ملحوظ ہے نہ کہ ملاحت کے سوا اور کچھ!

(ایضاً ص۸۳)

دیکھ لیا آپ نے! قسطلانی اور زرقانی میں سے کوئی بھی اس مفحکہ خیز وہم میں مبتلا نہیں کہ جن چیزوں سے حضورؐ کو تشبیہ دی جائے ان کے تمام ہی لوازم مشبّہ یعنی حضورؐ میں مان لینے چاہئیں بلکہ وہ متعین کر کے بتا رہے ہیں کہ صرف صفت غالبۂ ظاہرہ میں تشبیہ مقصود ہے اور زرقانی اسے دون غیرهما کہہ کر مؤیَّد کر رہے ہے۔ اس طرح آغاز باب ہی میں جب انھوں نے تشبیہ و تمثیل کے بارے میں اپنا زاویۂ نظر واضح کر دیا تو کیا گنجائش رہ جاتی ہے اس بات کی کہ کسی روایت کے استعارے کو بجائے تشبیہ و تمثیل کے حقیقی و طبعی معنی پر محمول کرنے کی سعیِ ناشکور کی جائے۔ کسی شخص کے اس کہنے سے کہ حضورؐ نے اپنی دعا میں واجعلنی نورًا کہا تھا۔ لہٰذا اللہ میاں نے انھیں نور مجسم بنا دیا کہ جس کا سایہ نہیں ہوتا۔ قسطلانی اگر متأثر ہو گئے ہیں اور اپنے ظاہر فرمودہ زاویۂ نظر کو بھول کر نور کو اس کے طبعی و حقیقی معنی پر محمول کرنا جائز سمجھ لیا ہے تو یقین کر لینا چاہئے کہ اس وقت ان پر عقیدت رسول کا غلبہ ہو گیا تھا اور اس غلبے نے علم و فراست کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔ ان پر اللہ کی رحمت ہو۔ بے شک ان کی نیت فاسد نہیں ہوگی۔ مگر ظاہر ہے کہ کسی بزرگ کے غلبۂ حال کو علم و فن میں دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ خود زرقانی یا بیجوری نے ان کی ہمنوائی کر دی تو اس کی بھی وجہ وہی غلبۂ عقیدت ہے اس غلبہ کو بشارت دینے کے لئے ایک روایت بھی سامنے آ گئی تو وہی ہوا جو جذباتی مغلوبیت کے عالم میں ہوا کرتا ہے۔ انھوں نے سوچا یہ تو بڑا شاندار وصف ہوا کہ ہمارے پیارے نبیؐ کا سایہ نہیں تھا! اسے ماننے میں کیا مضائقہ ہے!!

تاہم اس روایت کی بقیہ بحث ہم آگے کریں گے۔ فی الحال اس حدیث کعب کے بارے میں ایک بات سن جائیے جسے "چھٹی روایت" کے نام سے کاظمی صاحب نے بیان اور ہم نے نقل کیا ہے۔ روایت کا یہ ٹکڑا تو انھوں نے بخاری جلد اول سے لے لیا۔ لیکن یہی روایت مکمل طور پر جلد ثانی کتاب المغازی میں صفحہ ۶۳۴ پر حدیث کعب بن مالک کے عنوان سے آئی ہے جو بخاری کے تقریباً پورے تین صفحات پر حاوی ہے۔ پوری بحث نہیں صرف اس حصے پر توجہ دلانی ہے۔ جب حضرت کعب اس ادھیڑبن میں تھے کہ حضورؐ اب تبوک سے واپس تشریف لائیں گے تو میں اپنی عدم شرکت کا کیا عذر پیش کروں گا۔ اسی عالم میں انھوں نے خبر سنی کہ حضورؐ واپس آ رہے ہیں اور مدینے کے بالکل قریب آ چکے ہیں تو اس واقعہ کو انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

فلما قیل ان رسول اللہ	پس جب خبر ملی کہ حضورؐ مدینے سے
صلی اللہ علیہ وسلم	اس قدر قریب آ چکے ہیں کہ ان کا سایہ
قد اظل قادمًا	ارض مدینہ پر پڑ سکتا ہے تو مجھ پر
زاح عنی الباطل	سے غلط سلط بہانے بازی کا
وعرفت انی لن اخرج	خیال کافور ہو گیا اور میں نے یقین
منہ ابدًا بشیٔ	کر لیا کہ حیلے بہانے مجھے میری اس پوزیشن
فیه کذبٌ.	پوزیشن سے ہرگز عہدہ برآ نہ کر سکیں گے

ہم خوب جانتے ہیں کہ اظلّ قادمًا ایک اصطلاحی فقرہ ہے جس کے معنی فی الحقیقت یہ نہیں ہوتے کہ سچ مچ آنے والی شے کا سایہ پڑ رہا ہے، بلکہ یہ بہت قریب آ جانے کے معنی میں بولا جاتا ہے لیکن جب منکرین ظل نے یہ انداز مجاز رکھا ہے کہ تشبیہ و استعارے کو حقیقی و طبعی معنی پر محمول کر کے سایہ غائب کئے دے رہے ہیں تو کیوں نہ ہمیں بھی اجازت ہو کہ تمثیل کو حقیقی معنی میں لے لیں۔ شروح بخاری اور کتب لغات و ادب میں دیکھ لیجئے۔ اتنی کنج کاوی برداشت نہ ہو تو یہیں بخاری میں حاشیہ ۱۴ ملاحظہ فرما لیجئے۔ اظلّ قادمًا کے تحت محشی لکھتے ہیں :-

ای دنا قدومه کأن	یعنی وہ اتنے قریب تشریف لے آئے
ظله وقع علیه۔	کہ گویا ان کا سایہ پڑنے لگا۔

تو اس طرح خود صحابی رسولؐ کی زبانی معلوم ہو گیا کہ حضورؐ کا سایہ پڑتا تھا۔

سمجھدار لوگ کہیں گے کہ یہ تو عامر عجیب مسخرہ پن کر رہا ہے کہیں اصطلاحوں کا بھی یوں آپریشن ہوتا ہے۔ تو جناب عالی یہ اس شعبدہ گری کا جواب ہے کہ منکرین ظل "نور" کے استعارے سے سایہ غائب کرنے کا کام لیتے ہیں۔ موازنہ کر لیجئے کہ ان کے وطیرے میں زیادہ تمسخر ہے یا ہمارے؟ "نور" میں تو لفظاً سائے کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ حضرت کعب کے فرمودے میں سایہ کم سے کم لفظاً تو موجود ہے ہی۔ یہ الگ بات ہے کہ جن معنوں میں واقعۃً

سایۂ مبارک کی طرح گم ہو گئے تھے، لہٰذا ہم ان کے موقع پر لائیں گے یہاں تو محض تشبیہ کے طور پر سایہ کی نفی سے کام لیا ہے۔

چلئے اصطلاح کو اصطلاح ہی کے مفہوم میں مان لیتے ہیں لیکن اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں کہ ہر اصطلاح کے استعمال کا ایک محل ہوتا ہے اور مفہوم و منشاء کے علاوہ اس کے پس منظر میں کچھ معلوم و معین تصورات بھی ہوتے ہیں۔ ان تصورات کی رعایت کے بغیر اس اصطلاح کو استعمال کرنا اناڑیوں کے سوا کسی کا کام نہیں ہو سکتا۔ مثلاً "چھکے چھوٹ جانا" ایک معروف اصطلاح ہے جس کا معلوم مفہوم یہ ہے کہ آدمی بُری طرح پریشان اور بے حواس ہو جائے اب جنگِ احد کے واقعہ کو لیجئے، اس میں کفار کے غیر متوقع حملے سے مجاہدین دفعتاً سراسیمہ اور مضطرب ہو گئے تھے یہاں تک کہ جیتی جتائی بازی الٹ گئی تھی، مفہوم کے اعتبار سے یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ان کے چھکے چھوٹ گئے تھے، لیکن کیا کوئی مسلمان ادیب اور مومن قاری اسے پسند کر سکتا ہے کہ مجاہدین کی سراسیمگی و اضطراب کو اس اصطلاح میں بیان کیا جائے؟ غالباً بلکہ یقیناً نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اپنے ظاہری مفہوم سے ہٹ کر اس کے پس منظر میں ذم کا ایک خفی سا تصور موجود ہے۔

یا مثلاً "ٹس سے مس نہ ہونا" ایک معروف اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنی بات پر جمے رہنا، اپنے موقف سے نہ ہٹنا۔ اب کیا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اس استقامت کے لئے جو آپ نے کفار کی تہدید و ترغیب اور تحریص کے مقابلہ میں دکھلائی ہمارے لئے یوں کہنا درست ہو گا کہ:-

"کفار و مشرکین نے بہت ڈرایا دھمکایا، لالچ دیئے سارے جتن کئے۔ لیکن اللہ کے آخری پیغمبر ٹس سے مس نہ ہوئے"۔

ظاہر ہے کہ ایسا کہنے والے کا آپ منہ نوچنا چاہیں گے۔ کیوں؟ —— اس لئے کہ ان اصطلاحی الفاظ میں ان کے مصداقِ ظاہری کے علاوہ ایک لطیف پہلو بے ادبی اور تخفیف کا بھی مُتصوّر ہے۔

ایسی ہی کتنی مثالیں آپ ذرا سے غور سے مستحضر فرما سکتے ہیں تو مانا کہ اظلّ قادمًا ایک اصطلاح ہے جس کے مصداق و مفہوم میں شیخ کا سایہ پڑنا نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ حاشیۂ بخاری سے آپ کو معلوم ہوا ہے کہ یہ بولی جاتی ہے اس اصطلاح کے پس منظر میں سائے کا تصور موجود ہے۔ لہٰذا حضرت کعب جیسا ادب شناس صحابی کبھی اس اصطلاح کا استعمال حضورؐ کے بارے میں نہ کرتا اگر واقعی آپ کا سایہ نہ پڑتا ہوتا۔ وہ منفرد و یکتا خصوصیت جو کائنات کے تمام اجسام مادیہ میں اور تمام انبیاء و رسل میں تنہا خاتم الانبیاء کے لئے تسلیم کرائی جا رہی ہے اگر واقعی ہوتی تو قیاس کے بالکل خلاف تھا کہ حضرت کعبؓ حضورؐ کی تشریف آوری کے لئے تمام پیرائے چھوڑ کر ٹھیک وہی پیرایہ استعمال کرتے جو اپنے پس منظر میں اس خصوصیت کی تردید کا پہلو رکھتا ہے اور جسے فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے نعوذ باللہ طنزِ ملیح بھی کہہ سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ صحابہ کے تو وہم و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایک زمانہ آئے گا جب رسولؐ کے امتی جسدِ رسولؐ سے اس کا سایہ چھیننے کا کرشمہ دکھلائیں گے اور ہمارا اظلّ قادمًا کہنا جرم بن جائے گا!

شاید یہاں کوئی کہے کہ اردو کی دونوں بیان شدہ مثالوں میں تو معنوی مذمت شامل تھی اس لئے ان سے پرہیز ضروری ہوا۔ اظلّ قادمًا میں مذمت کا کوئی پہلو نہیں، نہ اس کے ذہنی پس منظر میں شمہ برابر توہین پائی جاتی ہے۔ بس لفظ "ظلّ" آ گیا ہے جس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

تو ہم کہیں گے اول اس میں لازمًا مذمت کا پہلو شامل ہو جائے گا۔ اگر واقعہ یہ ہو کہ حضورؐ بے سایہ رہے ہوں۔ کیا یہ ذم میں شامل نہیں ہے کہ حضورؐ کے لئے وہ محاورہ بولا جائے جس کی بناوٹ میں "سایہ ہونا" شامل ہو حالانکہ حضورؐ کا سایہ نہ پڑتا ہو۔ دوسرے لیجئے ہم ایسی بھی مثال دیتے ہیں جو یہ راہِ فرار بھی مسدود کر دے گی۔ کون نہیں جانتا منطق کی اصطلاح میں تمام انسانوں کو "حیوانِ ناطق" کہا جاتا ہے۔ منطق کا کوئی طالب علم کبھی نہیں کہے گا کہ یہ اصطلاح بنی نوعِ انسان کی توہین و تذلیل کے لئے بنائی گئی ہے یا اس کے پس منظر میں ذم اور تحقیر کا پہلو شامل ہے۔ لیکن ذیل کا فقرہ دیکھئے:-

"رسول اللہؐ ایک بے مثال، برتر اور عظیم الشان انسان تھے"۔

اسے قبول ہو جانے کے باوجود حضورؐ کے لئے "حیوان" کے لفظ کا

استعمال [illegible] کیا [illegible] گستاخ
اس [illegible] انسان کی [illegible] حیوان ناطق [illegible] ہے ؟ نعوذ باللہ۔
ایسا کرنے والے کو آپ انگلیاں توڑ دینا چاہیں گے — کیوں ؟
" حیوان ناطق " کی اصطلاح تو تحقیر و مذمت کے لئے نہیں بنی تھی —
اسے تو آپ منطق کے اسباق میں تمام ہی نوع انسانی کے لئے
بلا تکلف سینکڑوں بار بول چکے ہیں۔ حالانکہ اس وقت بھی آپ کے علم
میں تھا کہ رسول بھی نوع انسانی ہی کے ایک فرد تھے۔ یہ اس بات
کا کھلا ثبوت ہے کہ اس اصطلاح میں آپ نے توہین و مذمت کا
کوئی پہلو ملحوظ نہیں پایا۔ لیکن پھر بھی مذکورہ شخص پر آپ کا غصہ
آخر اس کے سوا کیا بنیاد رکھتا ہے کہ اس نے رسول اللہ کے لئے ایک
ایسی اصطلاح استعمال کی جس میں " حیوان " کا لفظ آتا ہے۔

تو کیا صحابی رسول حضرت کعب آپ سے بھی کم احساس اور
آپ سے بھی کم مزاج شناس رسالت تھے کہ وہ جانتے تھے کہ حضور
" صاحب ظل " نہیں ہیں اور پھر بھی ایسی اصطلاح حضور کے
حق میں استعمال فرما رہے تھے جو وضع ہی ظل کی بنیاد پر ہوئی ہے
اور جس کے الفاظ اعجاز رسول کی نفی کرنے والے ہیں بشرطیکہ یہ اعجاز
ثابت ہو !

ایک اور نکتہ یہاں واضح ہوا۔ جس طرح مذکورہ بالا فقرے
میں انسان کی جگہ " حیوان ناطق " رکھ دینا اس لئے غلط ہے کہ یہ منطق
کی اصطلاح ہے اور فقرہ منطق کا نہیں۔ ادب و انشاء کی زبان میں بولا
جا رہا ہے۔ اسی طرح یہ بھی غلط ہوگا کہ قرآن تو اعلیٰ درجے کی بلیغ
انشاء میں خالص ادبی اسلوب کے ساتھ حضورؐ کو " نور " کہے اور ہم
اس میں علم الابدان اور طبعیات کی ٹانگ اڑا کے نور ظاہری مراد لینے
لگیں۔ قرآن، منطق یا طبعیات کی کتاب نہیں ہے۔ یہ ادب و اخلاق
کی کتاب ہے اور اپنی شان ادبیت ہی سے اس درجہ نامو ہے کہ فاتوا
بسورۃ من مثلہ کا چیلنج دیتی ہے۔ اللہ نے کئی جگہ واضح فرمایا کہ
قرآن ہم نے تمہاری ہی زبان میں نازل کیا۔ مثلاً سورۂ شعراء میں
فرمایا گیا ہے :-

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ	اور یہ قرآن اتارا ہوا ہے پروردگار
الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ	عالم کا۔ لیکر اترا ہے اسے معتبر فرشتہ
الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ	تیرے قلب پر تا کہ تو ہو لوگوں کو

[illegible] عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ [illegible]

قرآن کے [illegible]
زبان [illegible]
لب و لہجہ اس کا اسلوب [illegible]
تشبیہیں، تمثیلیں، اصطلاحیں [illegible]
جو لسان عرب میں معروف و مسلم [illegible]
اور جس میں سائنس یا [illegible]
استعمال [illegible] ہے۔ [illegible]
اس عربی مبین کے [illegible]
راستے ہٹا کر [illegible]
سر پکڑ کے [illegible]

تو یہ چودہ [illegible]
پیش فرمایا ہے۔ اس کے [illegible]
روایت نقل کرتے ہیں کہ :-

" حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہنستے تھے تو [illegible]
دیواروں پر چمکتا تھا۔ [illegible]
نے روایت کیا۔ [illegible] کے یہ بیان
فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]
ایسا چمکتا [illegible]
دیواروں پر پڑتی [illegible] "

آمنا و صدقنا۔ لیکن عقل کے [illegible] روایت [illegible]
ہے کہ نور حسی کا یہ ظہور ہنسنے کے وقت ہوا کرتا تھا، [illegible]
چلتے پھرتے نور حقیقی تھے !۔

اس کے بعد خصائص کبریٰ سے نقل کیا ہے کہ :-

" حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں میں کپڑا سی رہی
تھی ہاتھ سے سوئی گر پڑی۔ چراغ گل ہونے کی وجہ
سے اندھیرا تھا۔ اس لئے تلاش کرنے کے باوجود نہ ملی
اتنے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے آئے
حضور کے چہرۂ انور سے ایسا نور نکلا کہ سوئی ظاہر ہو گئی "

اول تو ان روایات صحیحہ کے مقابلہ میں جو کتب صحاح میں آئی ہیں، جنھیں کاظمی صاحب بھی صحیح تسلیم کر کے "عدم ظہور" اور "عدم وجود" کی منطق جھاڑ چکے ہیں اور جن کا مفاد یہ ہے کہ حضورؐ کے ہوتے بھی رات کو چراغ جلا کرتے تھے۔ نہ جلتے تو اندھیرا ہوتا تھا۔ اس روایت کا کیا وزن ہو سکتا ہے، اہلِ عقل غور فرمالیں دوسرے اسے صحیح بھی مان لیں، تو اس سے منکرین کے دعوے کو کیا نسبت ہے۔ اس سے تو صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی بطور معجزہ حضورؐ کے کسی حصۂ جسم سے روشنی خارج ہو جایا کرتی تھی ہمیں اس سے تعرض نہیں۔ احمق بھی جانتے ہیں کہ اگر کسی قمقمے یا چراغ وغیرہ سے کبھی کبھی روشنی خارج ہوتی تو خود وہ قمقمہ یا چراغ مجسم روشنی نہیں بن جایا کرتا، بلکہ وہ تو اس روشنی سے الگ مستقل بالذات ایک وجود ہے جو اپنی حقیقت اور بناوٹ میں مادّی اجزاء کا رہینِ منت ہے۔

اس کے بعد کسی "ابن سبع" کا ایک قول پیش کیا گیا ہے جو منکرین کے طرفدار ہونے کے سبب علامہ اور محدث سبھی کچھ بن گئے ہیں۔ اس سے ہم "فرمودات سلف" کے مبحث میں تعرض کریں گے۔ فی الحال تو ان مذکورہ روایات سے متصل بعد کاظمی صاحب کے اس ناز آفریں ارشاد کو دیکھئے :-

"یہ حدیثیں کتب احادیث وسیر میں اتنی کثرت سے موجود ہیں کہ ان کا احصار ممکن نہیں۔ ان کے بعد بھی اگر کوئی شخص حضورؐ کو نورِ حقیقی نہیں مانتا تو سمجھ لیجئے کہ وہ نورِ ایمان سے بالکل خالی ہے"۔

خدا بچائے۔ اگر جنت کا ٹھیکہ ان "اہل سنت" کو مل گیا ہوتا تو دس بیس ہزار کے سوا شاید ہی کسی کو جنت کی ہوا بھی نصیب ہو سکتی۔ "ایمان" تو ان کے یہاں ایسی گیند ہے جسے یہ اپنے من گھڑت عقائد اور فاسد انداز فکر کے بلّوں سے جب جس طرف چاہے اڑا کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ سب حدیثیں آپ نے دیکھیں جن کے بل پر منکرین اپنا ہوائی قلعہ تعمیر کئے ہوئے ہیں۔ کیا ایک بھی حدیث اس میں ایسی نظر آئی جو ان کے مفروضہ دعوے کو جھوٹ موٹ ہی قوت دے رہی ہو۔ کیا ان میں کی ہر ایک ہی صراحت کے ساتھ ان کے دعوے کی تکذیب اور قطعاً جداگانہ مطالب کی تصریح نہیں کر رہی۔ پھر اگر ایسی حدیثیں کتب احادیث وسیر میں بیشمار ہوں تو ان سے ان کے دعوے کی تکذیب ہی میں استحکام پیدا ہوگا نہ کہ تائید و اثبات میں رہا "نورِ ایمان" کا معاملہ تو ہزار ہزار شکر ہے خدائے واحد کا جس نے ہمیں بے بنیاد اور وہم پرستانہ عقائد والے ایمان سے خالی ہی رکھا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہر مسلمان کو اسی طرح محفوظ رکھے!

اب سنئے لطیفہ در لطیفہ۔ کاظمی صاحب کو خیال آیا کہ باوجود ہماری لفاظی کے یہ شبہ ضرور قارئین کے دلوں میں کھٹکے گا کہ ان روایات میں استنارہ اور نور وغیرہ کے الفاظ بطور استعارہ وارد ہوئے ہیں اور چاند وغیرہ سے تشبیہ اسی طرح تشبیہ ہے جس طرح زبان و ادب میں رائج و شائع ہے۔ اس خیال کے آتے ہی "ایک شبہ اور اس کا ازالہ" کے تحت جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ سنئے اور سر دھنئے کہتے ہیں :-

"جواباً عرض کروں گا کہ بدعقیدگی اور گمراہی کی اصل بنیاد یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عامۃ الناس کے زمرہ میں شمار کر لیا جائے۔ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال کی نفی کرنے کے لئے حضورؐ کا قیاس اپنی ذات پر کر لینا اہل سنت کے نزدیک بد ترین جہالت ہے"۔

کاظمی صاحب کا قصور نہیں دور نبوّت کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ نکٹے ناک والوں پر ہنسیں اور لباس والے ننگوں سے شرمائیں۔ عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کے لئے بعض مفروضہ مراتب دل و دماغ میں راسخ کر لئے۔ اب ان کی تردید کیجئے تو یہی سمجھتے ہیں کہ گستاخ کمالِ مسیح کی نفی کر رہے ہیں۔ اسی طرح بقلم خود قسم کے اہل سنت نے بھی اپنی کارگہ وہم و خیال میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ بے بنیاد مراتب و فضائل گھڑتے ہیں جن کی زد اللہ تعالیٰ کی توحید و یکتائی پر پڑتی ہے اور جو علم و عقل کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اب ان کی تردید کیجئے تو عیسائیوں ہی کی طرح ان میں بھی خیال گذرتا ہے کہ تردید کرنے والے بے ایمان ہیں۔ حالانکہ ان معصوموں کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت آپ حضرات کے ذہنی تعیش اور دیوانہ شاعرانہ کاریوں کے لئے نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس کے لئے ہوئی تھی کہ اللہ کو پہچانئے اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جئے۔ آپ نے محکمات و بینات کو

پس پشت ڈال کر شاعروں اور افسانہ نگاروں والی خیالی اڑانوں کو اپنا دین بنا لیا اور شاید ہمسایوں کی ریس میں دیومالائی طرزِ فکر کو دانتوں سے پکڑ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے پیغمبر کو تو آپ نے عالم الغیب اور ما فوق البشر، حاضر و ناظر وغیرہ بنا کر اللہ کی شان میں گستاخی کی اور عمل صحیحہ کے خانے میں صفر ہی صفر بڑھاتے چلے گئے۔

دنیا میں کون ہوشمند کہہ سکتا ہے کہ زبان و ادب کے مسلمہ قواعد اور اسلوبِ کلام کے طے شدہ پیرائے کسی ایک شخص کے بارے میں اپنے معروف معانی و مطالب سے عاری ہو جاتے ہیں پورے قرآن سے کئی سو مثالیں اس بات کی مل سکتی ہیں کہ کوئی بھی مجازی اندازِ بیان چاہے وہ استعارہ و تشبیہ پر مشتمل ہو یا اصطلاحی فقروں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی اسی مفہوم میں مستعمل ہوا ہے جس مفہوم میں دوسروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ لیکن تفصیلات میں جائے بغیر ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ حضورؐ سے خطاب فرماتے ہیں :-

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ — اور اپنے بازو جھکا ان مومنین کے لئے جو تیری اتباع کریں۔

(سورۂ شعراء - رکوع ۱۱)

سب کو معلوم ہے کہ "اخفاضِ جناح" عربی کی اصطلاح ہے جس کے معنی شفقت و نرمی کرنے کے آتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو مومنین کے حق میں رافت و شفقت کا حکم دیا۔ اب بعید نہیں کہ کسی دن "اہلِ سنت" کو سوجھ جائے تو وہ دعویٰ کر بیٹھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم میں دو ایسے بازو بھی تھے جیسے پرندوں کے ہوتے ہیں! اس صورت میں ان کی یہی دلیل کام آئیگی جو ابھی نقل ہوئی۔ یعنی "اخفاضِ جناح" کی اصطلاح تو عام انسانوں کے لئے ہے۔ معاذ اللہ حضورؐ عوام کے زمرے میں تو نہیں تھے کہ ان کے لئے بھی اصطلاح کے وہی معنی لئے جائیں جو عوام کے لئے لئے جاتے ہیں۔ حضورؐ کو معراج ہوئی تھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان میں قوتِ پرواز تھی۔ اللہ نے ایک اور جگہ بھی حضورؐ کے بازوؤں کا ذکر فرمایا ہے :-

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (سورۂ نحل رکوع ۶) — اور اپنے بازو مومنین کے لئے جھکا دیجئے۔

"جناح" لغت میں بھی پرندوں کے بازوؤں کے لئے آتا ہے اور خود قرآن میں اسی معنوں میں استعمال ہوا ہے :-

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ — اور نہیں ہے کوئی چلنے والا
وَلَا طَائِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ — زمین میں اور نہ کوئی پرندہ کہ اڑتا
اِلَّا اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ۔ — ہے اپنے دو بازوؤں سے مگر یہ کہ
(سورۂ انعام رکوع ۴) — امت تمہاری ہی طرح ہے۔

تو اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا اس کا کہ حضورؐ کے جسم میں اڑنے والے بازو بھی تھے۔

پھر ایسی بے جوڑ تائید کی روایتیں بھی مل ہی جائیں گی جیسی سایہ نہ ہونے کے لئے ڈھونڈی گئی ہیں۔ رہے عقلی دلائل تو جس دنیا میں خدا کے نہ ہونے تک پر عقلی دلائل موجود ہیں، اور ہر ناپاکی کے لئے یورپ کی کارگہ فکر نہایت خوش رنگ و مقدس دلائل ڈھال رہی ہے، اور دور کیوں جائیے اپنے ہی ملک میں ادیانِ شرک کے پاس بے شمار دلائل عقلیہ ایسے ہیں جن سے دیومالا کا پورا محل بنایا جا سکتا ہے تو حضورؐ کے لئے پرواز والے بازوؤں کا دعویٰ کیوں محرومِ دلیل رہے گا۔

آپ موازنہ کر لیجئے...... بے سایہ ہونے کے لئے جس طرح کے دلائل منکرین نے پیش فرمائے ہیں ان سے تو مضبوط ہی استدلال بازو ثابت کرنے کے لئے حاضر کیا گیا۔ ہم قسمیہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ماضی میں کسی من چلے کو یہ سوجھ گئی ہوتی اور اس نے بازوؤں کا دعویٰ داغ دیا ہوتا تو آج سیکڑوں ہی اشخاص آپ کو ایسے نظر آتے جو اسے بھی "اہلِ سنت" کا عقیدہ کہہ کر اسے نہ ماننے والوں کے ایمان کا مرثیہ پڑھتے۔ دنیا میں احمقوں اور نفس و خواہش کے غلاموں کی نہ پہلے کمی رہی ہے اور نہ اب ہے۔ ہمل سے ہمل ادعا لیکر اٹھئے کچھ لوگ اسے ازراہِ حماقت اور کچھ ازراہِ خواہش پرستی ضرور قبول کر لیں گے۔ آخر کس کے سامنے نہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی جیسے بزرگوار دعوۂ نبوت کرتے ہیں اور رسول اللہ کی خاتمیت پر ایمان رکھنے والی امت ہی سے انھیں بے شمار پیرو اور امتی مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیا چیز ناممکن ہے؟

اور آگے فقرہ دیکھئے۔ کاظمی صاحب فرماتے ہیں:۔

"معمولی سمجھ والا انسان بھی اتنی بات سمجھ سکتا ہے کہ اگر صرف رأیت اسدًا کہا جائے تو لفظ اسد میں شجاعت سے استعارہ ہو سکے گا۔ لیکن جب کوئی رأیت اسدًا یفترس کہے تو پھر "اسد" سے حیوان مفترس ہی مراد ہوگا اور اسے بہادر آدمی کے لئے استعارہ قرار دینا درست نہ ہوگا۔"

معلوم نہیں مفکر جیالی اس طرح کی بچکانہ باتیں معصومیت سے کرتے ہیں یا عوام کو قصداً مغالطہ دیتے ہیں۔ بہر حال ہمیں تو چونکہ معمولی علم و عقل کے لوگوں کو بھی سمجھانا ہے اس لئے بچکانہ مثالوں کا بھی تجزیہ کرتے رہیں گے۔

اگر منطق کا سبق پڑھایا جا رہا ہو تب تو بے شک "حیوان ناطق" سے مراد ابن آدم ہی ہوگا اور "حیوان مفترس" درندوں ہی کو کہیں گے۔ لیکن جب گفتگو ادب و انشاء اور خطابت و وعظ کے کلاس میں ہو رہی ہو تو یہ امتیاز کرنے کے لئے کہ بولنے والے نے اسد (شیر) بطور استعارہ بولا ہے یا صحیح معنی کے شیر کا ذکر کر رہا ہے اس سے کوئی سہارا نہیں ملتا کہ اس نے "شیر" کے لئے کوئی توضیحی صفت استعمال کی ہے یا نہیں بلکہ موقع، محل اور سیاق و سباق ہی خود بتا دیتا ہے کہ مقصود کیا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنے کسی ہوائی سفر یا شکار کا واقعہ سناتے ہوئے کہتا ہے:۔

"میں گھنی جھاڑیوں سے گذر رہا تھا کہ اچانک شیر پر نظر پڑی، وہ چشمے پر جھکا ہوا پانی پی رہا تھا۔"

ان فقروں میں "شیر" کے لئے قائل نے کوئی توضیحی صفت بیان نہیں کی، لیکن موضوع گفتگو اپنے آپ بتا رہا ہے کہ "شیر" اس نے بطور تشبیہ و استعارہ نہیں بولا، بلکہ واقعتہً "شیر" ہی مراد ہے۔

اس کے برخلاف ایک شخص کسی طاقتور اور جری آشام آدمی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"ظالم شیر ہے شیر۔ دشمن کو بے دریغ چیر پھاڑ دیتا ہے، ایسا خوفناک حملہ کرتا ہے کہ حریف بھیڑ بکری نظر آتے ہیں۔"

ان فقروں میں قائل نے "شیر" کے ساتھ وہی "مفترس" یعنی "چیر پھاڑ دینے" کی توضیحی صفت کا بھی اضافہ کر دیا، لیکن کیا کوئی احمق سے احمق آدمی بھی تصور کر سکتا ہے کہ "شیر" یہاں بطور استعارہ نہیں بلکہ اصلی معنوں میں بولا گیا ہے اور شیر کے چند اوصاف و خصائص شخص مذکور کے لئے ثابت ہو گئے ہیں۔ کیا شخص مذکور کے لئے آپ چاروں ہاتھ پیروں پر چلنا، جانوروں کا لہو پینا اور شیر کی طرح بالوں دار ہونا بھی تسلیم کریں گے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیوں؟ اسی لئے تو کہ آپ جانتے ہیں جب مخلوقات کی کسی ایک نوع پر کسی دوسری نوع کا اطلاق کرتے ہیں تو منشا اس دوسری نوع کے وصف معروف سے پہلی نوع کو تشبیہ دینا ہوتا ہے اور یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ دوسری نوع کے تمام ہی اوصاف و خواص پہلی نوع میں ثابت ہو جائیں تو اسی تشریح کی روشنی میں آیت قرآنی قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ کو دیکھئے۔ اگر مان ہی لیا جائے کہ "نور" رسول اللہ کو کہا گیا ہے تو کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ اور روشنی مخلوقات کی جداگانہ نوعیں ہیں۔ روشنی یا نور کی جو بھی تعریف آپ کریں وہ بہر حال انسان کی تعریف نہیں ہوگی۔ یہاں تو "نور" کے لئے ایسی کوئی توضیحی صفت بھی مذکور نہیں ہے جیسی کاظمی صاحب اسد کے ساتھ بیان کر رہے ہیں، لیکن اگر ہوتی بھی تو کیا فرق پڑ سکتا تھا عقل و نقل کی گواہی اور قرآن کی صراحت کے بعد بھی اگر بعض لوگ رسول اللہ کو بشر ماننے سے جان چراتے ہیں تو چلئے یہاں ہم اس سے بحث نہیں کریں گے۔ وہ بشر کو چھوڑ کر جس بھی مخلوق میں آپ کو شامل کریں یہ تو بہر حال تسلیم کریں گے وہ اسی طرح ایک بنت حوا کے پیٹ اور ایک ابن آدم کے صلب سے پیدا ہوئے جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے۔ پھر ویسے ہی ہاتھ پاؤں، ناک منہ وغیرہ ان کے تھے جیسے ابن آدم کے ہوتے ہیں، کھانے پینے، سونے جاگنے کاروبار کرنے وغیرہ کے جملہ خواص انسانیہ انھیں بھی لاحق رہے اور ان کی ہیئت، ان کا ہیولیٰ، ان کا جسد پاک اسی طرح چشم سر سے نظر آتا تھا جس طرح دوسری مادی و مرئی اشیاء نظر آتی ہیں۔

پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ "نور" ابن آدم اور حیوان ناطق کو نہیں کہتے، بلکہ وہ مخلوقات الہیہ کی ایک جداگانہ نوع ہے۔ اس میں گہرائی اور دبازت نہیں ہوتی صرف بسط اور طول و عرض ہوتا ہے

یہ انسان کی طرح ذی شعور بصیر نہیں بلکہ ذوی الارواح کے تمام خواص صفات سے یکسر خالی ہے۔ اس کا وجود آنکھوں کو دیکھنے کی استعداد دیتا ہے اور یہ نہ ہو تو آدمی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔

اب اگر رسول اللہؐ کو اللہ تعالیٰ "نور" فرما دیں تو یہ ایک نوع پر دوسری نوع کے اطلاق کے سوا کیا ہوگا؟ اس صورت میں کون تصور کر سکتا ہے کہ "نور" کے جملہ خواص طبعی بھی نوع اول یعنی ذاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ثابت ہو جائیں گے۔ جس طرح زید کے لئے اسد بول دینے سے چاہے اس کے ساتھ کچھ صفات بھی شامل کر دی جائیں۔ کوئی شخص اس مہمل تصور میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ زید کو بہمہ وجوہ شیر بنا دیا گیا ہے۔ بلکہ یہی سمجھے گا کہ شیر کے وصف غالب شجاعت، دلیری اور توانائی میں مشابہت دکھائی جا رہی ہے۔ اسی طرح رسول اللہؐ کے بارے میں بھی یہی سمجھے گا کہ انھیں "نور" کے خاصۂ معلومہ و غالبہ یعنی استنارہ و ایضاح اور ازالۂ خفا اور انکشاف و انشراح سے تشبیہ دی جا رہی ہے۔ نہ یہ کہ دیگر خواصِ نور سے۔ ایسا سمجھنا فطری اور لازمی ہے۔ عقل، مشاہدہ، علم سب گواہی دیتے ہیں کہ رسول اللہؐ تا دم وصال اسی طرح حوائجِ انسانیہ کے مورد رہے جس طرح ابنائے آدم رہا کرتے ہیں۔ آپؐ کا جسم مبارک اسی طرح چشم سر سے نظر آتا رہا اور اس کا طبعی و انسانی ہیولیٰ اسی طرح قائم رہا جس طرح انسانوں کا رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ حاضرینِ خدمت کی نگاہیں جسمِ اطہر سے بلا تامل گذر کر ان اشیاء کو دیکھ لیتی ہوں جو آپ کی اوٹ میں آئی ہوئی ہیں حالانکہ نورِ طبعی کبھی حائلِ نگاہ نہیں ہوتا بلکہ وہ تو ہر شئے کو اور زیادہ واضح کرتا ہے۔

یہ تو آیتِ قرآنی کا معاملہ تھا۔ اب ان احادیث کو لیجئے جن کے بارے میں کاظمی صاحب نے فرمایا ہے:۔

"ہماری پیش کردہ احادیث میں بھی ایسے الفاظ موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے معترض کا استعارہ صحیح نہیں ہوتا۔ دیکھئے:۔

(۱) دندانہائے مبارک کے درمیان سے نور نکلتا ہوا دیکھا جاتا۔

(یعنی اقدس کے نور کا شمع مبارک پر غالب ہوتا ہوا معلوم ہونا۔

(۳) پیشانیِ اقدس کے خطوط کی چمک کا مشاہدہ۔

(۴) نورِ اقدس سے دیواروں کا روشن ہو جانا ایسے امور ہیں جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نورانیت اور نور کے حقیقی اور جسمانی ہونے کو اس وضاحت کے ساتھ متعین کر رہے ہیں جس کے بعد معترض کے استعارے کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا"

حیرت ہوتی ہے کہ دلائل پیش کرتے ہوئے منکرینِ ظل یاد نہیں رکھتے کہ ہمارا دعویٰ کیا تھا۔ دعویٰ تو وہ پورے جسدِ اطہر کے بارے میں نورِ حسی و طبعی ہونے کا فرماتے ہیں، مگر دلیلیں لاتے ہیں بالکل بے جوڑ۔ جتنی روایتیں وہ بیان فرما چکے ہیں ان کا حال آپ نے دیکھ لیا۔ ان کی جو تشریح اس اقتباس میں چار نمبر دیکر انھوں نے کی ہے اسے بھی دیکھ لیجئے۔ دانتوں کی ریخوں سے نکلنے والا نور یا تاک کا نور یا انبساط کے وقت پیشانی کے خطوط کی چمک یا وہ نور جس کی چمک کبھی دیوار پر دیکھی گئی اگر استعارۃً نہیں بلکہ حقیقی طور پر ہی نور ہو تو اس سے پورے جسدِ اطہر کا مستقل طور پر ایسا نورِ حقیقی ہونا جو کہ ثابت ہو سکتا ہے کہ اس کا سایہ ہی نہ پڑتا ہو۔ جتنی روایات انھوں نے بیان کیں اگر ان میں واقعی یہ ذکر آیا ہوتا کہ حضورؐ سراپا نور تھے تب تو یہ فرض کر کے کوئی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا کہ نور سے مراد حسی و حقیقی نور ہے، استعارہ نہیں، لیکن روایات خود ہی بتا رہی ہیں کہ ان میں سراپا نور کا ذکر نہیں بلکہ ایک انسان کا تذکرہ ہے جس کے بعض اعضائے جسم سے خاص اوقات میں اخراجِ نور کا مشاہدہ کیا گیا یہ سائنسی معنوں میں سراپا نور ہوتا تو اس کی توصیف میں ان باتوں کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ نہ اس طرح پر اس کی توصیف کی جا سکتی تھی کہ فلاں حصۂ جسم سے نور نکلا۔

قارئین ملاحظہ فرما چکے کہ جن احادیث کو منکرینِ ظل اپنے دعوے کی شہادت میں پیش کرتے ہیں وہ ادنیٰ سا بھی تعلق سایہ ہونے نہ ہونے کے سوال سے نہیں رکھتیں، بلکہ سایہ کی بحث میں انھیں لایا ہی جائے تو الٹا ان سے سائے کا اثبات اور منکرینِ ظل کی تردید نکلتی ہے۔ اب لیجئے اس واحد روایت پر

گفتگو کرتے ہیں جو واقعی سائے ہی سے متعلق ہے اور پورے ذخیرۂ حدیث میں وہی تنہا روایت ہے جس کا سہارا لینا منکرینِ ظل کے لئے ممکن ہے (ابن عباسؓ سے منسوب روایت کا سو وقت تک ہم حدیث ماننے کے لئے تیار نہیں جب تک اس کی سند نہ بیان کی جائے۔ یہی وہ روایت ہے جس کا حوالہ حضرت صدر مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند نے اپنے فتوے میں دیا تھا اور ہم نے فروری و مارچ ۵۹ء کے تجلی میں اس کی پوست کندہ حقیقت کھول کر رکھ دی تھی۔ اب کاظمی صاحب بھی اسے بڑے طمطراق سے لائے ہیں تو ایک بار پھر ہم اپنا نقد منصف مزاج حضرات کے سامنے رکھے دیتے ہیں:۔

روایت یہ ہے:۔

اخرج الحکیم الترمذی عن ذکوان ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن یری لہ ظل فی شمس ولا قمر قال بن سبع من خصائصہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ظلہ کان لا یقع علی الارض وانہ کان نورا فکان اذا مشی فی الشمس او القمر لا ینظر لہ ظل قال بعضھم ویشھد لہ حدیث قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی دعائہ واجعلنی نوراً	حکیم ترمذی نے حضرت ذکوان سے اخراج[1] کیا کہ سورج اور چاند کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ دیکھا جاتا تھا ابن سبع (محدث) نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص سے یہ بات ہے کہ حضور کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا اور یہ کہ حضور علیہ السلام نور تھے اس لئے جب حضورؐ سورج یا چاند کی روشنی میں چلتے تو حضور کا سایہ نظر نہ آتا تھا۔ بعض علماء (محدثین) نے فرمایا کہ حضورؐ کا سایہ نہ ہونے کی شہادت حضورؐ کی یہ حدیث بھی دیتی ہے جس میں حضورؐ کی یہ دعا وارد ہے کہ واجعلنی نوراً۔ یا اللہ!

[1] یہ کاظمی صاحب کا ترجمہ ہے۔ اہل علم اندازہ فرمائیں "تخریج" کی بجائے "اخراج" کا استعمال کس بہرہ وری کا پتہ دیتا ہے۔ ع

(خصائص کبریٰ ج ۱ ص ۶۸) مجھے نور کر دے!

بجائے اس کے کہ ہم نئے سرے سے نقد کریں پچھلا ہی نقد قدرے ضروری تصرف کے ساتھ دہرائے دیتے ہیں۔ تصرف بایں معنیٰ کہ پہلے خطاب مفتی دارالعلوم سے تھا، اب کاظمی صاحب سے ہے۔

سیوطیؒ کی خصائص کبریٰ سے نقل کی ہوئی ان کی مذکورہ عبارت تین اجزاء پر مشتمل ہے:۔

(۱) حکیم ترمذی کی بیان کردہ روایت (۲) کسی ابن سبع کا قول اور (۳) کچھ نامعلوم لوگوں کا ایک اور حدیث سے استشہاد۔ ہر ایک کو بالترتیب الگ الگ لیتے ہیں اور ترجمہ بھی ساتھ دیتے ہیں۔

(۱) اخرج الحکیم الترمذی عن ذکوان ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن یری لہ ظل فی شمس ولا قمر۔	حکیم ترمذی نے ذکوان سے تخریج کی ہے کہ حضورؐ کا سایہ نہیں دیکھا جاتا تھا دھوپ میں نہ چاندنی میں۔

سب سے پہلے یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ حکیم ترمذی وہ نہیں ہیں جو "صحیح ترمذی شریف" کے جامع ہیں، بلکہ وہ ترمذی ہیں جن کا نام محمد بن علی تھا اور جو "نوادر الاصول" جیسی غیر معتبر کتاب کے جامع ہیں۔ پہلے تو اس کتاب ہی کی حیثیت دیکھ لیجئے جس میں ان صاحب نے یہ روایت بیان فرمائی ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے بستان المحدثین میں فرمایا ہے:۔

"اس کے (نوادر الاصول) مصنف حکیم ترمذی ان ابوعیسیٰ ترمذی کے علاوہ ہیں جن کی کتاب صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے نوادر الاصول میں اکثر حدیثیں غیر معتبر ہیں۔ اکثر جاہلوں کو چونکہ معلوم نہیں اس وجہ سے حکیم ترمذی کو وہی ترمذی خیال کر کے ان کی واہیات کو ابوعیسیٰ ترمذی کی طرف منسوب کر کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ترمذی میں اس طرح ہے"۔ نیز:۔

"جاننا چاہئے کہ ان کی تصانیف میں غیر معتبر اور گھڑی ہوئی حدیثیں بہت مندرج ہیں اور اس حادثہ کی وجہ انھوں نے خود ہی بیان کی ہے کہ میں نے اس تصنیف میں قطعاً فکر و تدبر سے کام نہیں لیا نہ میری

غرض یہ ہے کہ کوئی ان مؤلفات کو میری طرف منسوب کرے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جب کوئی کام کاج مجھ پر آ پڑتا اور میرا دل گھبرا جاتا تھا تو طبیعت بہلانے کے لئے تصنیف کا شغل کر لیتا تھا اور جو جی میں آیا لکھ ڈالتا تھا" (ترجمہ از فارسی)

مشہور صوفی طریقت استاد قشیریؒ نے بھی رسالۂ "قشیریہ" میں حکیم ترمذی صاحب کا یہ فردہ نقل کیا ہے:۔

ما صنفت حرفاً عن	میں نے کوئی حرف بھی سنجیدہ فکر
تدبیر ولا ینسب	سے نہیں لکھا اور میری تصنیف
الیّ شئ منه ولکن	میں سے کسی بھی چیز کی نسبت میری
کان اذا اشتد	طرف نہ کی جائے۔ دراصل جب
علیّ وقتی انسلی	خالی وقت مجھ سے کاٹے نہ کٹتا
به ؛	تو شغل تصنیف سے دل بہلا لیتا
	تھا"۔

٭ ٭ ٭

کمال ہے جس تصنیف کا حال یہ ہو اور اس کا مصنف صاف لفظوں میں اس کے ساقط الاعتبار ہونے کا اعلان یا اعلان کر رہا ہو اسی کی ایک روایت پر بعض اہل علم اعتقاد کی عمارت اٹھالیں۔

نازکی سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

خیر یہ تو اس کتاب کا حال تھا جس سے حافظ سیوطیؒ نے روایت اخذ کی ہے۔ اب خود روایت کا حال دیکھئے: اس کی سند یہ ہے عبد الرحمن بن قیس الزعفرانی عن عبد الملك بن عبد الله ابن الولید عن ذکوان عن رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

سب سے پہلے ہی راوی عبد الرحمن[عه] بن قیس کو صاحب المیزان کی تصریح کے مطابق ابن المهدیؒ اور ابو ذرعہؒ نے جھوٹا بتایا ہے۔ امام بخاریؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی روایتیں لینے کے قابل نہیں ہیں۔ امام احمدؒ کا ارشاد ہے کہ وہ لاشئ کے درجہ میں ناقابل التفات ہے۔ حاکمؒ نے اگرچہ اس کی ایک[له] منکر روایت کی تصحیح کر دی ہے۔ لیکن اہل علم حاکم کی تصحیح بعض مرتبہ کس قدر نادرست ہوتی ہے اور پھر انھوں ہی نے ایک جگہ اس کی روایتوں کو ساقط الاعتبار کہا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی ابن مہدی کی تکذیب اور امام احمد کی تضعیف کی توثیق کی ہے اور ان کے قول میں "متروک الحدیث" کے الفاظ بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ امام نسائیؒ نے بھی اسے متروک الحدیث کہا ہے۔ صالح بن محمدؒ نے فرمایا کہ وہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ اور ابن عدیؒ نے فرمایا کہ اس نے کم و بیش جتنی روایتیں کی ہیں کوئی بھی ثقہ آدمی ان کی پیروی نہیں کرتا۔ ابو نعیم اصفہانی نے فرمایا کہ وہ لاشئ کے درجے میں[عه] ہے۔ عذر یہ ہے کہ خود اُن علامہ سیوطیؒ نے جو الخصائص الکبریٰ میں اس کی روایت کو مستدل بنا رہے ہیں۔ اسی روایت کے تحت کتاب مناهل الصفا فی تخریج احادیث الشفا میں تحریر فرمایا ہے کہ اس کی سند میں عبد الرحمن بن قیس راوی ہے جو گھڑنت کرنے والا بہت جھوٹا آدمی ہے[سه] (ص۳)

کشف الاحوال فی نقد الرجال میں ہے:۔

عبد الرحمن بن قیس ابو معاویۃ الزعفرانی البصری	عبد الرحمن بن قیس یکا دروغ باف ہے اس نے خلفاء کی تعریف میں
کذاب یضع سمع سفیان الثوری فی مناقب الخلفاء (ص۳۷)	روایتیں گھڑ کے سفیان الثوری کی طرف منسوب کر دی ہیں۔

یہ ہے راوی اول کا حال۔ راوی ثانی عبد الملك بن عبد الله بن ولید خدا جانے کون ہے۔ اس کا کوئی حال کتب رجال میں نہیں ملتا۔ فرمائیے کیا اس کے بعد بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟

کون نہیں جانتا کہ حدیث مرفوع تک میں اگر کوئی ایک بھی راوی ساقط الاعتبار ٹھیر جائے تو روایت بے کار ہو جاتی ہے۔ زیر بحث روایت تو خود ہی مرسل ہے اور مرسل بھی کسی صحابی کی نہیں

عه پورا نام یوں ہے عبد الرحمن بن قیس الضبی ابو معاویۃ الزعفرانی الواسطی له جس کا راوی ضعیف ہو اور کسی قوی راوی کی روایت کے خلاف روایت بیان کر رہا ہو سه محدثین نے جس کی روایتیں چھوڑ دی ہوں عه تہذیب التہذیب جلد ۶ صفحہ ۲۵۸ مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف سه علامہ عبد الحی ابن العماد نے شذرات الذهب میں اس کا ذکر تک گوارا نہیں کیا جب کہ آٹھ مجلدات میں انھوں نے ایکہزار برس کے رجال کو جمع کیا ہے ۱۲

تابعی کی۔ ذکوان صحابی ہرگز نہیں ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ جس مرسل کے راویوں میں سب ثقہ ہوں۔ ایک بھی متروک و مجروح نہ ہو اسے بھی احتجاج کے قابل نہ ماننے والوں میں بڑے بڑے علماء مثلاً: امام شافعیؒ، سعید بن المسیبؒ، ابن سیرینؒ اور زہریؒ وغیرہم شامل ہیں۔

علامہ امیر عبدالقادر الجزائریؒ فرماتے ہیں :۔

والحدیث المرسل ضعیف	اور حدیث مرسل ضعیف ہوتی ہے
لایحتج به عند جمهور	جمہور محدثین، بہت سے فقہاء اور
المحدثین وکثیر من	ارباب اصول و نظر کے نزدیک
الفقهاء واصحاب الاصول	اس سے دلیل نہیں پکڑی جا سکتی۔
والنظر (فتح الملہم)	

ترمذی پر جرجانی کا اور فتح الباری پر خود ابن حجر کا مقدمہ دیکھئے مرسل کے قابل احتجاج ہونے نہ ہونیکا اختلاف مل جائے گا۔

امام اعظمؒ اور بعض علماء احتجاج کو جائز سمجھتے ہیں مگر متعدد سخت قیود کے ساتھ۔ مثلاً عقل و درایت کے خلاف نہ ہو، دوسری روایت سے اسے قوت حاصل ہو جائے اور کسی اپنے سے قوی روایت کے خلاف نہ ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ شرط لگاتے ہیں جیسے امام ابن ہمامؒ حنفی نے تحریر الاصول میں بیان کیا ہے کہ اس روایت کا مرسل[1] معتبر شخص ہو، عادل ہو، مسلمانوں کو اس کی ثقاہت میں کلام نہ ہو۔ ان لوگوں میں سے نہ ہو جو ہر سنی سنائی بات نقل کرنے کے مشتاق ہوتے ہیں، راوی کے سچ جھوٹ کی تمیز کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ اس میں جرح و تعدیل کی اہلیت ہو وہ محذوف راوی کے بارے میں اس کے ہمعصر مشاہیر کی منتخب آراء سے واقف ہو، تب کہیں جاکر اس کی مرسل روایت کو قبول کرنے کی ہمت کی جا سکتی ہے۔ آخری شرط بہت اہم ہے کیونکہ جیسا کہ ابن حزمؒ نے فرمایا ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں منافقین و مرتدین بھی تھے جو آپ کی زندگی ہی میں جھوٹ گھڑ لیتے تھے تو بعد میں کیوں کسر چھوڑتے۔ کیا معلوم کہ جس محذوف راوی کو مرسل نے صحابی سمجھا ہو وہ مشاہیر صحابہ کے نزدیک منافق و مرتد رہا ہو۔

پھر کوئی صاحب علم اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ اہل فن حدیث مرسل کو خبر مردود ہی کے ذیل میں بیان کرتے ہیں نہ کہ خبر مقبول کے

تاہم یہاں ان بحثوں کی ضرورت ہی نہیں۔ عبدالرحمٰن زعفرانی جیسے مجروح و متروک اور عبدالملک جیسے مجہول راویوں کے شریک سند ہونے کے بعد دنیا کے کسی بھی بالغ نظر امام و محدث سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سند سے آئی ہوئی روایت کو ذرہ برابر وقعت دے گا اور جب یہ روایت فہم و درایت کے بھی خلاف ہو اور احادیث قویہ کے بھی خلاف ہو تو کیا امکان رہ جاتا ہے کہ اس سے دلیل پکڑی جائے۔

اب حافظ سیوطیؒ کا دوسرا جز لیجئے :۔

(۲) قال ابن سبع من	ابن سبع نے کہا کہ حضورؐ کی خصوصیات
خصائص ظله كان	میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی
لا یقطع علی الارض	کہ آپ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا
وانه کان نوراً فکان	تھا اور وہ نور تھے پس جب دھوپ
اذا مشى فى الشمس	یا چاندنی میں چلتے تو سایہ دیکھنے
او القمر لا ینظر له الظل	میں نہیں آتا۔

کاظمی صاحب نے ترجمہ میں ابن سبع کے آگے بریکٹ میں "محدث" کا لفظ بڑھا دیا ہے تاکہ عوام رعب کھا جائیں۔ لیکن ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ ذرا ان ابن سبع صاحب کا تعارف تو کرائیے بے دلیل اور خلاف درایت بات تو کسی بڑے سے بڑے محدث کی نہیں مانی جاتی حتیٰ کہ بخاری اور مسلم کو بھی اپنی روایات کا اعتبار و قبول پوری سندیں بیان کرنے کے بعد ہی ملا ہے۔ لیکن آپ کسی ابن سبع کی بے دلیل بات منوانے پر تلے ہیں جبکہ علمائے امت میں ان صاحب کی کوئی بھی مسلم حیثیت نہیں۔ محدث سیکڑوں گذرے ہیں۔ ان میں ثقہ بھی تھے اور غیر ثقہ بھی۔ محتاط بھی تھے اور غیر محتاط بھی۔ خدا کے لئے بڑے علمائے سلف میں سے دو چار ہی عالموں کے وہ فرمودات پیش فرمائیے جن سے پتا چلے کہ یہ ابن سبع کون تھے، کیا تھے اور انھیں کس پلے کا محدث کہا

[1] وہ آخری شخص جو صحابی کا ذکر کئے بغیر حضورؐ کا قول یا حال نقل کر رہا ہے ۱۲

ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ امجد بتہ اللہ ہر علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الرد علے البکری میں ابن سبع وغیرہ کا ذکر کرکے فرمایا ہے

وامثال ھؤلاء ممن فی کتابہ من الکذب مالا یحصیہ الا اللہ فہم لا یعرفون الصحیح من السقیم۔

(یہ ان مصنفین میں سے ہیں جن کی کتابوں میں اتنا جھوٹ بھرا ہے کہ اس کا شمار وزن نہیں اللہ ہی کر سکتا ہے۔ یہ لوگ صحیح و ناقص روایات کے مابین فرق کرنے کی تمیز نہیں رکھتے۔)

* * *

ابن تیمیہؒ کا یہ زمودہ دیوبندی مکتبۂ فکر میں تو قابلِ اعتنا ہو سکتا ہے لیکن کاظمی صاحب کے حلقے میں اسے شاید ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے۔ چلئے ڈال دیجئے۔ مگر یہ تو واضح فرما دیجئے کہ فلاں فلاں تاریخی و تحقیقی شہادت سے ابن سبع ایک ایسے بزرگ ثابت ہوتے ہیں جن کے ہر بے دلیل دعوے کو بھی حجت بنا لینا امت پر لازم ہے۔ بے دلیل اس لئے کہ ابن سبع نے کوئی قابلِ توجہ روایت یا عقلی ثبوت تو فراہم کیا نہیں بس دعویٰ داغ دیا۔ غالباً وہ بھی حکیم ترمذی ہی کی مذکورہ روایت سے متأثر ہو گئے ہوں۔

ابن سبع کی عصمت و قطعیت کا ثبوت دیئے بغیر عبارت کا یہ جزوِ ثانی بھی لاحاصل ہوا۔ اب تیسرا جز لیجئے:-

(۳) قال بعضہم وتشہد لہ حدیث قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی دعائہ واجعلنی نورا۔

(بعض لوگوں نے کہا کہ سایہ نہ ہونے کی شہادت رسول اللہؐ کی ایک دعا کے اس فقرے میں موجود ہے واجعلنی نورا (اے اللہ مجھے نور بنا دے)

\+ + +

یہ استشہاد اگرچہ ایسا ہے کہ اس کو استشہاد کہنا یا تو علم و منطق کے ساتھ مذاق ہے یا پھر پرلے سرے کا کھلا پن۔ اسی لئے اس کا رد کرتے ہوئے کوفت ہوتی ہے۔ تاہم تکمیلِ نقد کے لئے اس بوالفضولی کو بھی گوارا ہی کرنا ہوگا۔

پہلی جس دعا کا ذکر ہے وہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اور کئی کتبِ حدیث میں ملتی ہے۔ حضورؐ جب نماز کے لئے مسجد چلتے تو اسے پڑھا کرتے تھے۔ پہلی بات تو یہ قابلِ توجہ ہے کہ بخاری و مسلم، ابن ماجہ اور ابو داؤد میں جو متن وارد ہے اس میں یہ واجعلنی نورا کے الفاظ ہیں ہی نہیں۔ بس نسائی اور مستدرک میں ملتے ہیں۔ درانحالیکہ حدیث سبھی کتابوں میں حضرت ابن عباسؓ ہی سے منقول ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دعا میں لفظ "نور" کو بار بار جس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے وہ بجائے خود یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ سایہ نہ ہونے کی دلیل بنانے کے لئے لفظ نور کو جس سائنسی مفہوم میں لینے کی عجیب و غریب اُپج بعض حضرات کو سوجھی ہے قطعاً نامعقول ہے۔ تا طہین کہنا یہ ہے کہ چونکہ حضورؐ نے اللہ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ مجھے نور بنا دے اس لئے آپ کی دعا تو لازماً مقبول ہوتی ہی اور اس کے نتیجے میں آپ نور بنتے ہی۔ لہٰذا سایہ کیسے پڑتا کہ سایہ تو کثیف اشیاء کا پڑتا ہے اور نور بسیط و غیر مرئی ہوتا ہے!

ملاحظہ فرمائیے کیسی لاجواب منطق ہے۔ چلئے ہم اس منطق کو ایک منٹ کے لئے تسلیم ہی کئے لیتے ہیں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضورؐ کا جسدِ مبارک صحابۂ کرامؓ اور امہات المومنین کے چھونے میں کیسے آتا تھا۔ ایسا ہونا چاہئے تھا کہ صحابی نے مصافحہ کرنے حضورؐ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لینا چاہا تو بس اپنے ہی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں مل کر رہ گئیں۔ حضورؐ کا ہاتھ بسبب نورِ بسیط ہونے کے گرفت میں نہ آیا۔ ایسا کیوں ہوتا تھا کہ حضورؐ اسی طرح زخمی ہو جاتے تھے جس طرح دوسرے اجسام تیغ و سناں سے زخمی ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ دعا کی قبولیت اور مجسم نور بن جانا واقعۂ جراحت کے بعد ہوا ہے تو چلئے کتنا ہی عجب ہوا ہو، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وصالِ مبارک کے بعد بھی جسمِ اطہر کی تکفین و تدفین اور غسل وغیرہ اسی طرح ہوا ہے جس طرح دوسرے اجسام کا ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ آبِ غسل بہا کر ہاتھ پھیرا گیا ہو تو بس ہوا میں جھول کے رہ گیا ہو اور کفن پہنانے لگے ہوں تو کوئی مادی شے مکفون نہ ہو سکی ہو۔

ہم سمجھتے ہیں حد درجہ مغلوبیت اور جذباتی گم گشتگی کے عالم ہی میں بعض اسلاف واجعلنی نورا سے سایہ نہ ہونے پر استدلال کر گئے ہیں ورنہ ہوش و حواس کی حالت میں تو کسی سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس لطیفہ نما استدلال کی بے حقیقتی اور مضحکہ خیزی سے بے خبر رہے۔ لفظ "نور" قرآن میں کم سے کم تیس چالیس بار استعمال ہوا ہی ہے۔ اُن مقامات کے سوا جہاں

اللہ جل شانہ نے خود اپنی ذات واجب الوجود کا ذکر فرمایا ہو کسی بھی مقام پر وہ مفہوم لینا ممکن نہیں ہے جو مذکورہ قائلین لینے پر مصر ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ زیر تذکرہ دعا امت کے بھی ملقین کی گھٹی اور بڑے بڑے اولیاء اللہ اسے پڑھتے رہے، لیکن شاید کسی کی بھی قبول نہیں ہوئی ورنہ "نور" بن جاتے اور سایہ غائب ہو جاتا۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تو بس اتنی ہی منفعت اس کی بتاتے ہیں کہ میں نے جس شخص کو اس دعا کی پابندی کرتے دیکھا اسے برکت اور نورانیت میں گھرا ہوا پایا۔

(عوارف المعارف)

اگر کاظمی صاحب اور ان کے ہم مشرب ضد پر نہ آئیں تو یہ جاننا اور ماننا دشوار نہیں ہے کہ قرآن و حدیث میں نور بالعموم ایک ایسی کیفیت کے لئے بولا جاتا ہے جو خیر و برکت سے معمور ہو، جس سے اللہ کے احکام و مرضیات کی معرفت حاصل ہو جو نفس کو معصیت، کینہ و حسد و بغض اور اسی طرح کی دیگر صفات رذیلہ سے متوحش کر دے اور نور ہی کا مختصر لیکن جامع نام "ایمان" بھی ہے جیسا کہ آیات قرآنیہ میں آپ دیکھ چکے۔ اتنی جب وہ جعلنی نوراً والی دعا مانگیں گے تو مقصود اسی ایمان کامل کی طلب اور اسی کیفیت سعید کی تمنا ہوگی۔ اور رسول اللہ جب یہ دعا فرماتے ہوں گے تو آپ کا منشا ہرگز ہرگز اس کے سوا کچھ نہ ہوتا ہوگا کہ اے اللہ! آپ نے مجھے اپنا پیغامبر اور آخری نبی اور دین حق کا مبلغ بنا کر بھیجا ہے تو اس منشا کو کامل طور پر پورا فرما اور مجھے ایسا نور بنا دے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔

جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس دعا کے ذریعہ حضورؐ نے اللہ تعالیٰ سے یہ استدعا کی کہ اے اللہ! مجھے سچ مچ کا نور بنا دے یعنی حقیقی و سائنسی معنوں میں ——— وہ فی الحقیقت حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے مرتکب ہیں اور اپنی کم فہمی کو سرکارؐ کی ذہانت و متانت کے لئے داغ بنا دینا چاہتے ہیں۔

ذرا غور تو کیجئے جو اللہ کا بندہ نور ایمان پھیلانے کے لئے مبعوث ہوا اور جو شب و روز اسلام کی اشاعت میں تن من دھن سے لگا ہو، جسے ہمہ وقت یہی لگن ہو کہ اپنے اللہ کا پیغام لوگوں کے قلوب میں اتار دے۔ اس کی مراد "نور" سے اس کے سوا کیا ہوگی کہ انسانوں کی بڑی سے بڑی تعداد میری تبلیغ و تعلیم سے صراط مستقیم پر آئے اور ایمان کی روشنی سے مستفیض ہو۔ اس کے حاشیۂ خیال میں کبھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ وہ اللہ سے اپنے آپ کو ایسی مخلوق بنا دینے کی التجا کرے جس کی جنس ہی الگ ہے۔ جس کا کوئی تعلق ہی بشریت سے نہیں، جو صرف سر کی آنکھوں کے لئے مفید ہو سکتی ہے دل کی آنکھوں کے لئے نہیں اللہ کے بنائے ہوئے چاند سورج سامنے موجود ہوں تو کون ہوشمند ہوگا جو اللہ سے یہ دعا مانگے کہ مجھے دھوپ یا چاندنی بنا دے۔ توبہ، ہزار بار توبہ۔ ٹھیک کہا تھا کہنے والے نے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے یہ نادان دوستوں کی غلو آمیز عقیدت مندیاں فتنہ نہیں تو اور کیا ہیں کہ سرکار دو عالم کی طرف ایک ایسی آرزو اور طلب کو منسوب کر رہے ہیں جو نعوذ باللہ من ذلک ذہنی صحت اور توازن دماغی ہی کی نفی کرتی ہے۔ اللہ کے رسولؐ خوب جانتے تھے کہ میرے جسم کا سایہ پڑنے نہ پڑنے کا کوئی تعلق میرے مقصد بعثت سے نہیں۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ اللہ نے جس مخلوق کے لئے جو اوصاف و خواص متعین فرما دیئے ہیں وہ اٹل ہیں۔ آبی مخلوق پانی کے اندر رہ کر ہوا کے جی سکتی ہے، مگر انسان باوجود اپنی اشرفیت کے بغیر ہوا کے نہیں جی سکتا۔ دھوپ اور چاندنی اور چراغوں کی روشنی بسیط ہوتی ہے لیکن بشر جس مخلوق کا نام ہے وہ بہر حال میں ٹھوس ہی رہے گی۔ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کا رسولؐ اللہ کی غیر متبدل سنت کے منافی دعا مانگے۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ از روئے قرآن بشر کی عظمت کا مدار تقویٰ اور اطاعت الٰہی پر ہے نہ کہ جسمانی حسن و قبح پر۔ چاند سورج کی روشنی اگر بسیط ہے اور بشر بیچارہ غیر بسیط ہے تو روشنی اس بسط کی وجہ سے اس سے اشرف و مقدس نہیں ہو سکتی۔ فرشتوں اور جنوں کو دیکھئے وہ تو غیر مرئی اور لطیف تر ہیں لیکن ان پر بھی شرف بشر ہی کو حاصل ہے حالانکہ یہ جسمانی ترکیب کے اعتبار سے نسبتاً کثیف بھی ہے اور متعدد حوائج کا محتاج بھی۔ تب حضورؐ کیوں نور حقیقی بنائے جانے کی دعا مانگتے۔ ان کا منشا لامحالہ اور قطعاً وہی نور معنوی ہوگا جس سے انسانی شرف بڑھتا ہے اور جس کو نور ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔ کسی بچے کا ذہن تو یہ ہو سکتا

غرض یہ ہے کہ کوئی ان مؤلفات کو میری طرف منسوب کرے۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جب کوئی کام کاج نہ ہونے کی بنا پر میرا دل گھبراتا تھا تو طبیعت بہلانے کے لئے تصنیف کا شغل کر لیتا تھا اور جو جی میں آیا لکھ ڈالتا تھا" (ترجمہ از فارسی)

مشہور صوفی طریقت استاد قشیریؒ نے بھی رسالۂ "قشیریہ" میں حکیم ترمذی صاحب کا یہ فرمودہ نقل کیا ہے:۔

ما صنفت حرفاً عن تدبیر ولا ینسب	میں نے کوئی حرف بھی سنجیدہ فکر سے نہیں لکھا اور میری تصنیف
الیّ شیٔ منه ولکن	میں سے کسی بھی چیز کی نسبت میری
کان اذا اشتد	طرف نہ کی جائے۔ دراصل جب
علیّ وقتی اتسلی	خالی وقت مجھ سے کاٹے نہ کٹتا
به ÷	تو شغل تصنیف سے دل بہلا لیتا تھا۔"

÷ ÷ ÷ ÷

کمال ہے جس تصنیف کا حال یہ ہو اور اس کا مصنف صاف لفظوں میں اس کے ساقط الاعتبار ہونے کا اعلان یا ملان کر رہا ہو اسی کی ایک روایت پر بعض اہل علم اعتقاد کی عمارت اٹھالیں۔

نا طقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

خیر یہ تو اس کتاب کا حال تھا جس سے حافظ سیوطیؒ نے روایت اخذ کی ہے۔ اب خود روایت کا حال دیکھئے۔ اس کی سند یہ ہے عبد الرحمن بن قیس الزعفرانی عن عبد الملک بن عبد اللہ ابن الولید عن ذکوان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

سب سے پہلے ہی راوی عبد الرحمن[عہ] بن قیس کو صاحب المیزان کی تصریح کے مطابق ابن المہدیؒ اور ابو ذرعہؒ نے جھوٹا بتایا ہے۔ امام بخاریؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی روایتیں لینے کے قابل نہیں ہیں۔ امام احمدؒ کا ارشاد ہے کہ نہ لاشئی کے درجہ میں ناقابل التفات ہے۔ حاکمؒ نے اگرچہ اس کی ایک منکر[عہ] روایت کی تصحیح کر دی ہے۔ لیکن اہل علم حاکم کی تصحیح بعض مرتبہ کس قدر نادرست ہوتی ہے اور پھر انھوں ہی نے ایک جگہ اس کی روایتوں کو ساقط الاعتبار کہا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی ابن مہدی کی تکذیب اور امام احمدؒ کی تضعیف کی توثیق کی ہے اور ان کے قول میں "متروک الحدیث" کے الفاظ بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ امام نسائیؒ نے بھی اسے متروک الحدیث کہا ہے۔ صالح بن محمدؒ نے فرمایا کہ وہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ اور ابن عدیؒ نے فرمایا کہ اس نے کم وبیش جتنی روایتیں کی ہیں کوئی بھی ثقہ آدمی ان کی پیروی نہیں کرتا۔ ابو نعیم اصفہانی نے فرمایا کہ وہ لاشئی کے درجے میں ہے[عہ]۔ حد یہ ہے کہ خود ان علامہ سیوطیؒ نے جو الخصائص الکبریٰ میں اس کی روایت کو مستدل بنائے ہیں۔ اسی روایت کے تحت کتاب مناھل الصفا فی تخریج احادیث الشفا میں تحریر فرمایا ہے کہ اس کی سند میں عبد الرحمن بن قیس راوی ہے جو گھڑنت کرنے والا بہت جھوٹا آدمی ہے[سو] (صٹ)

کشف الاحوال فی نقد الرجال میں ہے:۔

عبد الرحمن بن قیس ابو معاویۃ الزعفرانی البصری	عبد الرحمن بن قیس یکا دروغ باف ہے اس نے خلفاء کی توصیف میں
کذاب یضع سمع سفیان الثوری فی مناقب الخلفاء (صفحہ)	روایتیں گھڑ کے سفیان الثوری کی طرف منسوب کر دی ہیں۔

یہ ہے راوی اول کا حال۔ راوی ثانی عبد الملک بن عبد اللہ بن ولید خدا جانے کون ہے۔ اس کا کوئی حال کتب رجال میں نہیں ملتا۔ فرمائیے کیا اس کے بعد بھی کچھ کہنے کی ضرورت ہے؟

کون نہیں جانتا کہ حدیث مرفوع تک میں اگر کوئی ایک بھی راوی ساقط الاعتبار ٹھیر جائے تو روایت بے کار ہو جاتی ہے۔ زیر بحث روایت تو خود ہی مرسل ہے اور مرسل بھی کسی صحابی کی نہیں

عہ پورا نام یوں ہے عبد الرحمن بن قیس الضبی ابو معاویۃ الزعفرانی الواسطی سلہ جس کا راوی ضعیف ہو اور کسی قوی راوی کی روایت کے خلاف روایت بیان کر رہا ہو ۔ سلہ محدثین نے جس کی روایتیں بالکل چھوڑ دی ہوں عہ تہذیب التہذیب جلد ۶ صفحہ ۲۵۸ مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف سے علامہ عبد الحی ابن العماد نے شذرات الذھب میں اس کا ذکر تک گوارا نہیں کیا جب کہ آٹھ جلدات میں انھوں نے ایک ہزار برس کے رجال کو جمع کیا ہے ۱۲

تابعی کی۔ ذکوان صحابی ہرگز نہیں ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ جس مرسل کے راویوں میں سب ثقہ ہوں۔ ایک بھی متروک و مجروح نہ ہو اسے بھی احتجاج کے قابل نہ ماننے والوں میں بڑے بڑے علماء مثلاً: امام شافعیؒ، سعید بن المسیبؒ، ابن سیرینؒ اور زہری وغیرہم شامل ہیں۔

علامہ امیر عبدالقادر الجزائریؒ فرماتے ہیں :۔

والحدیث المرسل ضعیف	اور حدیث مرسل ضعیف ہوتی ہے
لایحتج بہ عند جمہور	جمہور محدثین، بہت سے فقہاء اور
المحدثین وکثیر من	ارباب اصول و نظر کے نزدیک
الفقہاء واصحاب الاصول	اس سے دلیل نہیں پکڑی جا سکتی۔
والنظر (فتح الملہم)	

ترمذی پر جرجانی کا اور فتح الباری پر خود ابن حجر کا مقدمہ دیکھئے مرسل کے قابل احتجاج ہونے نہ ہونیکا اختلاف مل جائے گا۔

امام اعظمؒ اور بعض علماء احتجاج کو جائز سمجھتے ہیں مگر متعدد سخت قیود کے ساتھ۔ مثلاً عقل و درایت کے خلاف نہ ہو، دوسری روایت سے اسے قوت حاصل ہو جائے اور کسی اپنے سے قوی روایت کے خلاف نہ ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ شرط لگاتے ہیں جسے امام ابن ہمامؒ حنفی نے تحریر الاصول میں بیان کیا ہے کہ اس روایت کا مرسل[1] معتبر شخص ہو، عادل ہو، مسلمانوں کو اس کی ثقاہت میں کلام نہ ہو۔ ان لوگوں میں سے نہ ہو جو ہر سنی سنائی بات نقل کرنے کے مشتاق ہوتے ہیں، راوی کے سچ جھوٹ کی تمیز کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو۔ اس میں جرح و تعدیل کی اہلیت ہو وہ محذوف راوی کے بارے میں اس کے ہمعصر مشاہیر کی منتخب آراء سے واقف ہو، تب کہیں جا کر اس کی مرسل روایت کو قبول کرنے کی ہمت کی جا سکتی ہے۔ آخری شرط بہت اہم ہے کیونکہ جیسا کہ ابن حزمؒ نے فرمایا ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں منافقین و مرتدین بھی تھے جو آپ کی زندگی ہی میں جھوٹ گھڑ لیتے تھے تو بعد میں کیوں کسر چھوڑتے۔ کیا معلوم کہ جس محذوف راوی کو مرسل نے صحابی سمجھا ہو وہ مشاہیر صحابہ کے نزدیک منافق و مرتد رہو۔

پھر کوئی صاحب علم اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ اہل فن حدیث مرسل کو خبر مردود ہی کے ذیل میں بیان کرتے ہیں نہ کہ خبر مقبول کے

تاہم یہاں ان بحثوں کی ضرورت ہی نہیں۔ عبدالرحمٰن زعفرانی جیسے مجروح و متروک اور عبدالملک جیسے مجہول راویوں کے شریک سند ہونے کے بعد دنیا کے کسی بھی بالغ نظر امام و محدث سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سند سے آئی ہوئی روایت کو ذرہ برابر وقعت دے گا اور جب یہ روایت فہم و درایت کے بھی خلاف ہو اور احادیث قویہ کے بھی خلاف ہو تو کیا امکان رہ جاتا ہے کہ اس سے دلیل پکڑی جائے۔

اب حافظ سیوطیؒ کا دوسرا جز لیجئے :۔

(۲) قال ابن سبع من	ابن سبع نے کہا کہ حضورؐ کی خصوصیات
خصائصہ صلی اللہ علیہ وسلم ان	میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی
ظلہ کان لا یقع علی الارض	کہ آپ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا
وانہ کان نورًا فکان	تھا اور وہ نور تھے پس جب دھوپ
اذا مشی فی الشمس	یا چاندنی میں چلتے تو سایہ دیکھنے
او القمر لا ینظر لہ ظل ۔	میں نہیں آتا۔

کاظمی صاحب نے ترجمہ میں ابن سبع کے آگے بریکٹ میں "محدث" کا لفظ بڑھا دیا ہے تاکہ عوام رعب کھا جائیں۔ لیکن ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ ذرا ان ابن سبع صاحب کا تعارف تو کرائیے۔ بے دلیل اور خلاف درایت بات تو کسی بڑے سے بڑے محدث کی نہیں مانی جاتی حتیٰ کہ بخاری اور مسلم کو بھی اپنی روایات کا اعتبار و قبول پوری سندیں بیان کرنے کے بعد ہی ملا ہے۔ لیکن آپ کسی ابن سبع کی بے دلیل بات منوانے پر تلے ہیں جبکہ علمائے امت میں ان صاحب کی کوئی بھی مسلم حیثیت نہیں۔ محدث سیکڑوں گذرے ہیں۔ ان میں ثقہ بھی تھے اور غیر ثقہ بھی۔ محتاط بھی تھے اور غیر محتاط بھی۔ خدا کے لئے بڑے علمائے سلف میں سے دو چار ہی عالموں کے وہ فرمودات پیش فرمائیے جن سے پتا چلے کہ یہ ابن سبع کون تھے، کیا تھے اور انہیں کس پایہ کا محدث کہا

---

[1] وہ آخری شخص جو صحابی کا ذکر کئے بغیر حضورؐ کا قول یا حال نقل کر رہا ہے ۱۲

ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ اعجوبۃ الدہر علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الرد علی البکری میں ابن سبع وغیرہ کا ذکر کر کے فرمایا ہے

وامثال ھؤلاء ممن	یہ ان مصنفین میں سے ہیں جن کی
فی کتابہ من الکذب	کتابوں میں اتنا جھوٹ ملا ہوا ہے
مالا یحصیہ الا اللہ	کہ اس کا شمار و وزن بس اللہ ہی
فہم لا یعرفون	کر سکتا ہے۔ یہ لوگ صحیح و ناقص
الصحیح من السقیم۔	روایات کے مابین فرق کرنے کی
	تمیز نہیں رکھتے۔

* * *

ابن تیمیہ کا یہ فرمودہ دیوبندی مکتبۂ فکر میں تو قابلِ اعتنا ہو سکتا ہے لیکن کاظمی صاحب کے حلقے میں اسے شاید ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے۔ چلئے ڈال دیجئے۔ مگر یہ تو واضح فرما دیجئے کہ فلاں فلاں تاریخی و تحقیقی شہادت سے ابن سبع ایک ایسے بزرگ ثابت ہوتے ہیں جن کے ہر بے دلیل دعوے کو بھی حجت بنا لینا امت پر لازم ہے۔ بے دلیل اس لئے کہ ابن سبع نے کوئی قابلِ توجہ روایت یا عقلی ثبوت تو فراہم کیا نہیں بس دعویٰ داغ دیا۔ غالباً وہ بھی حکیم ترمذی ہی کی مذکورہ روایت سے متأثر ہو گئے ہوں۔

ابن سبع کی عصمت و قطعیت کا ثبوت دیئے بغیر عبارت کا یہ جزوِ ثانی بھی لاحاصل ہوا۔ اب تیسرا جز لیجئے :-

(۳) قال بعضہم ویشہد	بعض لوگوں نے کہا کہ سایہ نہ ہونے کی
لہ حدیث قولہ صلی اللہ	شہادت رسول اللہ کی ایک دعا
علیہ وسلم فی دعائہ	کے اس فقرے میں موجود ہے
واجعلنی نوراً۔	واجعلنی نوراً (اے اللہ
	مجھے نور بنا دے)

\+ \+ \+

یہ استشہاد اگرچہ ایسا ہے کہ اس کو استشہاد کہنا یا تو علم و منطق کے ساتھ مذاق ہے یا پھر پرلے سرے کا بھولا پن۔ اسی لئے اس کا رد کرتے ہوئے کوفت ہوتی ہے۔ تاہم تکمیلِ نقد کے لئے اس بوالفضولی کو بھی گوارا ہی کرنا ہوگا۔

یہ جس دعا کا ذکر ہے وہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے اور کئی کتبِ حدیث میں ملتی ہے۔ حضورؐ جب نماز کے لئے مسجد چلتے تو اسے پڑھا کرتے۔ پہلی بات تو یہ قابلِ توجہ ہے کہ بخاری، مسلم، ابن ماجہ اور ابو داؤد میں جو متن وارد ہے اس میں یہ واجعلنی نوراً والے الفاظ ہیں ہی نہیں۔ بس نسائی اور مستدرک میں ملتے ہیں۔ درانحالیکہ حدیث سبھی کتابوں میں حضرت ابن عباسؓ ہی سے منقول ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس دعا میں لفظ "نور" کو بار بار جس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے وہ بجائے خود یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ سایہ نہ ہونے کی دلیل بنانے کے لئے لفظ نور کو جس سائنسی مفہوم میں لینے کی عجیب و غریب اُپج بعض حضرات کے یہاں ملتی ہے وہ قطعاً تاریک ہے تاہلین کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ حضورؐ نے اللہ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ مجھے نور بنا دے اس لئے آپ کی دعا تو لازماً مقبول ہوتی ہی اور اس کے نتیجے میں آپ نور بنتے ہی۔ لہٰذا سایہ کیسے پڑتا کہ سایہ تو کثیف اشیاء کا پڑتا ہے اور نور بسیط و غیر مرئی ہوتا ہے!

ملاحظہ فرمائیے کیسی لاجواب منطق ہے۔ چلئے ہم اس منطق کو ایک منٹ کے لئے تسلیم ہی کئے لیتے ہیں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضورؐ کا جسدِ مبارک صحابۂ کرامؓ اور امہات المومنین کے چھونے میں کیسے آتا تھا۔ ایسا ہونا چاہئے تھا کہ صحابی نے مصافحہ کے لئے حضورؐ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لینا چاہا تو بس اپنے ہی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں مل کر رہ گئیں۔ حضورؐ کا ہاتھ بسبب نور بسیط ہونے کے گرفت میں نہ آیا۔ ایسا کیوں ہوتا تھا کہ حضورؐ اسی طرح زخمی ہو جاتے تھے جس طرح دوسرے اجسام تیغ و سناں سے زخمی ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ دعا کی قبولیت اور مجسم نور بن جانا واقعۂ جراحت کے بعد ہوا ہے تو چلئے کتنا ہی عجب ہوا ہو، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وصالِ مبارک کے بعد بھی جسمِ اطہر کی تکفین و تدفین اور غسل وغیرہ اسی طرح ہوا ہے جس طرح دوسرے اجسام کا ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ ماءِ غسل بہا کر ہاتھ پھیرا گیا ہو تو بس ہوا ہی میں جھول کے رہ گیا ہو اور کفن پہنانے لگے ہوں تو کوئی مادی شئے مکفون نہ ہو سکی ہو۔

ہم سمجھتے ہیں حد درجہ مغلوبیت اور جذباتی گم گشتگی کے عالم ہی میں بعض اسلاف واجعلنی نوراً سے سایہ نہ ہونے پر استدلال کر گئے ہیں ورنہ ہوش و حواس کی حالت میں تو کسی سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس لطیفہ نما استدلال کی بے حیثیتی اور مضحکہ خیزی سے بے خبر رہے۔ لفظ "نور" قرآن میں کم سے کم تینتیس چالیس بار استعمال ہوا ہی ہے، اُن مقامات کے سوا جہاں

اللہ جل شانہ نے خود اپنی ذات واجب الوجود کا ذکر فرمایا ہو کسی بھی مقام پر وہ مفہوم لینا ممکن نہیں ہے جو مذکورہ قائلین لینے پر مصر ہیں۔

مزے کی بات یہ ہے کہ زیر تذکرہ دعا امت کے بھی ملیون کی ممیٔ اور بڑے بڑے اولیاء اللہ سدا پڑھتے رہے، لیکن شاید کسی کی بھی قبول نہیں ہوئی ورنہ "نور" بن جاتے اور سایہ غائب ہو جاتا۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تو بس اتنی ہی منفعت اس کی بتاتے ہیں کہ میں نے جس شخص کو اس دعا کی پابندی کرتے دیکھا اسے برکت اور نورانیت میں گھرا ہوا پایا۔

(عوارف المعارف)

اگر کاظمی صاحب اور ان کے ہم مشرب ضد پر نہ آئیں تو یہ جاننا اور ماننا دشوار نہیں ہے کہ قرآن و حدیث میں نور بالعموم ایک ایسی کیفیت کے لئے بولا جاتا ہے جو خیر و برکت سے معمور ہو، جس سے اللہ کے احکام و مرضیات کی معرفت حاصل ہو، جو نفس کو معصیت، کینہ و حسد و جمود اور اسی طرح کی دیگر صفات رذیلہ سے متوحش کرے اور نور ہی کا مختصر لیکن جامع نام "ایمان" بھی ہے جیسا کہ آیات قرآنیہ میں آپ دیکھ چکے۔ امتی جب "واجعلنی نورا" والی دعا مانگیں گے تو مقصود اسی ایمان کامل کی طلب اور اسی کیفیت سعید کی تمنا ہوگی۔ اور رسول اللہ جب یہ دعا فرماتے ہوں گے تو آپ کا منشاء ہرگز ہرگز اس کے سوا کچھ نہ ہوتا ہوگا کہ اے اللہ! آپ نے مجھے اپنا پیغامبر اور آخری نبی اور دین حق کا مبلغ بنا کر بھیجا ہے تو اس منشاء کو کامل طور پر پورا فرما اور مجھے ایسا نور بنا دے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔

جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس دعا کے ذریعہ حضورؐ نے اللہ تعالیٰ سے یہ استدعا کی کہ اے اللہ! مجھے سچ مچ کا نور بنا دے یعنی حقیقی و سائنسی معنوں میں ——— وہ فی الحقیقت حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے مرتکب ہیں اور اپنی کم فہمی کو سرکارؐ کی ذہانت و متانت کے لئے داغ بنا دینا چاہتے ہیں۔

ذرا غور تو کیجئے جو اللہ کا بندہ نور ایمان پھیلانے کے لئے مبعوث ہوا ہو، جو شب و روز اسلام کی اشاعت میں تن، من، دھن سے لگا ہو، جسے ہمہ وقت یہی لگن ہو کہ اپنے اللہ کا پیغام لوگوں کے قلوب میں اتار دے۔ اس کی مراد "نور" سے اس کے سوا کیا ہوگی کہ انسانوں کی بڑی سے بڑی تعداد میری تبلیغ و تعلیم سے صراط مستقیم پر آئے اور ایمان کی روشنی سے مستفیض ہو۔ اس کے حاشیۂ خیال میں کبھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ وہ اللہ سے اپنے آپ کو ایسی مخلوق بنا دینے کی التجا کرے جس کی جنس ہی الگ ہے۔ جس کا کوئی تعلق ہی بشریت سے نہیں، جو صرف سر کی آنکھوں کے لئے مفید ہو سکتی ہے دل کی آنکھوں کے لئے نہیں اللہ کے بنائے ہوئے چاند سورج سامنے موجود ہوں تو کون ہوشمند ہوگا جو اللہ سے یہ دعا مانگے کہ مجھے دھوپ یا چاندنی بنا دے۔ توبہ، ہزار بار توبہ۔ ٹھیک کہا تھا کہنے والے نے کہ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے، یہ نادان دوستوں کی غلو آمیز عقیدت مندیاں فتنہ نہیں تو اور کیا ہیں کہ سرکار دو عالم کی طرف ایک ایسی آرزو اور طلب کو منسوب کر رہے ہیں جو نعوذ باللہ من ذلک ذہنی صحت اور توازن دماغی ہی کی نفی کرتی ہے۔ اللہ کے رسولؐ خوب جانتے تھے کہ میرے جسم کا سایہ پڑنے نہ پڑنے کا کوئی تعلق میرے مقصد بعثت سے نہیں۔ انھیں اچھی طرح علم تھا کہ اللہ نے جس مخلوق کے لئے جو اوصاف و خواص معین فرما دیئے ہیں وہ اٹل ہیں۔ آبی مخلوق پانی کے اندر رہا ہوا کے جی سکتی ہے، مگر انسان با وجود اپنی اشرفیت کے بغیر ہوا کے نہیں جی سکتا۔ دھوپ اور چاندنی اور چراغوں کی روشنی بسیط ہوتی ہے لیکن بشر جس مخلوق کا نام ہے وہ بہر حال میں ٹھوس ہی رہے گی۔ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کا رسولؐ اللہ کی غیر متبدل سنت کے منافی دعا مانگے۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ از روئے قرآن بشر کی عظمت کا مدار تقویٰ اور اطاعت الٰہی پر ہے نہ کہ جسمانی حسن و قبح پر۔ چاند سورج کی روشنی اگر بسیط ہے اور بشر بیچارہ غیر بسیط ہے تو روشنی اس بسط کی وجہ سے اس سے اشرف و مقدس نہیں ہو سکتی۔ فرشتوں اور جنوں کو دیکھئے وہ تو غیر مرئی اور لطیف تر ہیں لیکن ان پر بھی شرف بشر ہی کو حاصل ہے حالانکہ یہ جسمانی ترکیب کے اعتبار سے نسبتاً کثیف بھی ہے اور متعدد حوائج کا محتاج بھی۔ تب حضورؐ کیوں نور حقیقی بنائے جانے کی دعا مانگتے۔ ان کا منشاء لازماً اور قطعاً وہی نور معنوی ہوگا جس سے انسانی شرف بڑھتا ہے اور جس کو نور ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔ کسی بچے کا ذہن تو یہ ہو سکتا

کاش میں چندا ماموں ہوتا۔ کاش میں ہوا ہوتا کہ آسمان کی پہنائیوں میں اڑا پھرتا۔ کاش میں ننھا سا ستارہ ہوتا وغیرہ۔ لیکن ایک صحتمند اور سنجیدہ ذہن سے اس طرح کی دعاؤں کی توقع کون کر سکتا ہے بڑی نارواجرأت ہے یہ کہنا کہ سرکارِ دوعالم ﷺ نے اللہ سے اپنے آپ کو سائنسی و طبعی معنوں میں نور بنا دینے کی طلب کی۔

کاظمی صاحب نے آگے متعدد کالموں میں زرقانی اور قاضی عیاض اور شہاب الدین رحمہم اللہ کی جو عبارات پیش کی ہیں، ان سب کا مدار اسی مذکورہ روایت اور ابن سبع کے قول پر ہے۔ لہٰذا علم و استدلال کی بارگاہ میں ان کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی یہ لوگ اگر کچھ صدیاں پہلے پیدا ہوئے ہیں اور علماء کی صف میں شمار ہوتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ فکر و نظر کی غلطی سے بالاتر ہو گئے۔

اب رہا زرقانی کا شرح مواہب میں یا بعض اور علماء کا اپنے مصنفات میں یہ کہنا کہ ابن المبارک اور ابن جوزی نے بھی ابن عباس سے سایہ نہ ہونے کی روایت کی ہے تو ضروری ہے کہ اس روایت کی پوری سند سامنے لائی جائے تاکہ علم و فن کی روشنی میں جانچ پرکھ کی جائے۔ محققین جب تابعین تک کے مرسلات کو بلاحجت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تو بعد کے کسی شخص یا اشخاص کا یہ مرتبہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ صحابی سے ایک روایت نقل کریں، اور ہم یہ جانے بغیر کہ صحابی سے ان تک یہ روایت کن ذرائع سے پہنچی، آمنا و صدقنا کہہ اٹھیں۔

زرقانی یا شہاب الدین وغیرہ کی عبارتوں میں جو فقرے دلائل عقلیہ سے تعلق رکھتے ہیں انھیں ہم نے یہاں قصداً نظرانداز کر دیا ہے کہ ان کی بحث مباحثِ عقلی کے ذیل میں ہوگی۔ فی الحال تو ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "حدیث" و "قرآن" کی حد تک یہ تھا وہ کل سرمایہ منکرین ظل کا جسے وہ اپنے دعوے کی اصل دلیل قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد کاظمی صاحب نے فرمایا:-

> "اس میں شک نہیں کہ حدیث ذکوان ضعیف ہے لیکن ایسی نہیں کہ بالکل ساقط الاعتبار ہو جائے کہ اسے موضوع کہا جائے"۔

خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ذرا بتایا جائے کہ حدیث موضوع کی تعریف کیا ہے؟ ایک ایسی روایت جس میں ایک راوی ہی کا نام حذف ہوا در پھر جن صاحب سے اس روایت کا تحفہ ملا ہے ان کے اوصاف ناقدین رجال نے وہ بیان کئے ہوں جو ہم پیچھے پیش کر آئے۔ اگر یہ روایت بھی ساقط الاعتبار نہیں ہے تو پھر وہ آٹھ دس لاکھ روایتیں بھی قابل اعتبار ہونی چاہئیں جن میں سے محض چند ہزار چھانٹ کر باقی کو محدثین و ناقدین نے ردی کر دیا ہے" چہ جائیکہ" بہت خوب رہا ہم کہتے "موضوع" تو درکنار اگر روایت کی تردید کے لئے اس سے بڑھکر بھی کوئی لفظ ہوتا تو یہ روایت اس لائق تھی کہ اس کے لئے وہ بولا جاتا۔

آپ نے ساقط الاعتبار نہ ہونے کی دلیل دی ہے:-

> "اس لئے اگر یہ حدیث بالکل ساقط الاعتبار یا موضوع ہوتی تو وہ جلیل القدر ائمہ حدیث جن کی عبارات ہم اپنے بیان میں نہایت بسط و تفصیل سے نقل کر آئے ہیں ہرگز اس روایت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کی تائید میں پیش نہ کرتے"۔

بے علم عوام کو تو آپ اس طرح کی دلیلوں سے دم بخود کر سکتے ہیں لیکن اہل علم کے یہاں ایسی سطحی باتوں کا کوئی وزن نہیں کتب متداولہ میں ان بحثوں کو اٹھا کر دیکھئے جن میں کسی روایت کے مرتبہ و مقام اور حقیقت و حیثیت پر گفتگو ہو رہی ہے۔ یہی ملیگا کہ ہر عالم فنی و اصولی دلائل پیش کر رہا ہے۔ راویوں پر جرح و تعدیل ہو رہی ہے۔ متن پر کلام ہے وغیرہ۔ یہ نہیں ملے گا کہ ایک فریق تو فنی دلائل پیش کر رہا ہو اور دوسرے فریق نے ان دلائل سے صرف نظر کر کے یہ رٹ لگانی شروع کر دی ہو کہ فلاں فلاں چند اشخاص نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ لہٰذا ہم اس کی عدم صحت کو نہیں مانتے اور راوی چاہے کیسے ہی ہوں ہم تو اسے ضرور قبول کریں گے

پھر زرقانی اور ابن سبع اور رزین اور شہاب الدین اور قاضی عیاض اور ہجوری جیسے حضرات آپ کی دانست میں "ائمہ حدیث" ہوں تو ہوں لیکن محتاط اہل علم انھیں یہ خطاب نہیں دیتے اور

اور اگر دیں بھی تو کیا آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ معدودے چند کتب حدیث کو چھوڑ کر باقی تمام کتب حدیث میں سچی اور جھوٹی معتبر اور غیر معتبر، کھری اور کھوٹی سب قسم کی روایات پائی جاتی ہیں۔ یہ مستدرک یہ معاجم ثلاثہ، یہ مسند عبدالرزاق، یہ مصنف ابن ابی شیبہ یہ صحیح اسماعیلی، یہ مسند فردوس دیلمی، یہ مسند بزار، یہ سنن ابی مسلم ان میں سے کون ہے جس میں ضعیف، منکر اور موضوع روایات نہیں ملتیں۔ تو کیا زرقانی وغیرہم ان سب سے بالاتر اور معصوم ہو گئے کہ ان کی ضخیم کتابوں میں کسی موضوع و مکذوب روایت کا پایا جانا امر محال ٹھیرا۔ آپ کہتے ہیں:-

> "جن احادیث ضعیفہ سے اہل علم نے استدلال کیا یا انھیں کسی مسئلہ کی تائید میں پیش کیا انھیں علی الاطلاق ساقط الاعتبار قرار دینا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا، کیونکہ ایسی صورت میں وہ تمام محدثین اور علمائے اعلام مورد طعن قرار پائیں گے جنھوں نے ان احادیث کو کسی مسئلہ شرعیہ کی دلیل یا اس کا مؤید قرار دیا ہے"۔

امت کے ہزاروں ہزار علماء میں سے معدودے چند علماء کا مورد طعن بن جانا تو آپ کو پسند نہیں، لیکن یہ بھی سوچا کہ زیر بحث روایت پر اعتبار کر لینے سے امام بخاری، امام احمد، ابن مہدی، ابو زرعہ، حاکم، ابن حجر، صالح بن محمد، ابو نعیم، ابن عدی رحمہم اللہ جیسے معظم حضرات مورد طعن بن جاتے ہیں کہ یہ سب تو اس روایت کے پیش کنندہ عبدالرحمٰن بن قیس کو جھوٹا اور ناقابل اعتماد بلکہ ناقابل تذکرہ تک فرما رہے ہیں، اور آپ خم ٹھونک کے کہتے ہیں کہ کہے جاؤ ہم تمہاری نہیں سنیں گے اور اس شخص کو معتبر مانیں گے!

اہل علم جانتے ہیں کہ علم حدیث کی فنّی بنیاد "اسماء رجال" پر ہے اور رجال کی معرفت جن حضرات کے ذریعہ ہوتی ہے انھی کو مورد طعن بنا دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ علم حدیث کا پورا قصر گرا دیا جائے۔ زرقانی اور سیوطی اور بیجوری جیسے ہزار متاخرین بھی کسی روایت کے سلسلہ میں خطا وار ٹھیر جائیں تو اس سے کوئی بڑا فساد ظہور میں نہیں آتا۔ لیکن "کتب رجال" ہی سے اعتماد اٹھ جائے اور ائمۂ متقدمین ہی غیر معتمد قرار دیے جائیں تو علم حدیث کی جڑ بنیاد تک باقی نہیں رہ سکتی۔

کیسی افسوسناک بے عقلی ہے کہ بعد کے چند علماء کو تو احبار و رہبان کا درجہ دیا جائے اور ان ناقدین و ائمہ کو نظر انداز کر دیا جائے جن کے دم سے قصر حدیث کے دیوار و در قائم ہیں۔

اور سنئے اہل بدعت کے علماء کم علم عوام کو عموماً ایک سطحی نعرے سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہی کاظمی صاحب نے بھی بلند فرمایا ہے۔ کہتے ہیں:-

> علاوہ ازیں ابواب فضائل و مناقب میں ضعاف کا معتبر ہونا ایک حقیقت ثابتہ ہے جس کا انکار محض تعصب اعتساف ہے!"

افسوس بے علموں کے ہاتھوں علم کی مٹی پلید ہوئی اور بے عقلوں نے علم حاصل کر کے اس کا وقار مجروح کیا۔ کاظمی صاحب کے مذکورہ فقرے غلط ہی نہیں غلط در غلط ہیں جن پر ہم قدرے تفصیل سے اس لئے کلام کرتے ہیں کہ یہی استدلال اکثر لوگ بدعات و خرافات کے جواب میں پیش کرتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سایہ نہ ہونے کی دلیل میں متعدد حدیثیں ہیں ہی نہیں، بس یہ ایک حدیث ذکوان ہے جسے موضوع سے کم کچھ نہیں کہا جا سکتا لہٰذا "ضعاف" کی بات کرنا ہی بے محل ہے باقی جتنی روایتیں کاظمی صاحب نے بیان کیں ان کا حال ناظرین دیکھ ہی چکے کہ ان میں سے ایک میں بھی سایہ نہ ہونے کا ذکر نہیں، بلکہ وہ الٹا یہ ثابت کرتی ہیں کہ حضورؐ سچ مچ نور نہیں تھے، انسان تھے ٹھوس اور ذی جسم۔ تب اس اصول کا ذکر چہ معنی دارد کہ فضائل و مناقب میں ضعاف معتبر ہوتی ہیں۔

دوسرے فضائل کے ساتھ مناقب کا لفظ بڑھانا بھی یا تو جہل ہے یا فریب دہی۔ ضعیف روایات کا فضائل اعمال میں مقبول ہونا بے شک ایک اصول ہے۔ لیکن مناقب میں معتبر ہونا ہرگز کوئی اصول نہیں "مناقب" تو افراد و اشخاص کے اوصاف حمیدہ کو کہتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ مناقب میں بھی ضعیف روایات مقبول ہیں۔ اصول حدیث سے متعلق کتابیں اٹھا کر دیکھئے امام نووی، حافظ سخاوی، ابن الہمام ابوالحسن قطان، علامہ جزائری وغیرہم یہی لکھتے ملیں گے کہ فضائل

اعمال یا مذ سبق آموز قصص اور ترغیب و ترہیب میں بعض علمائے کم قوی روایتوں کو مقبول مانا ہے۔ فضائل اشخاص و افراد کا ذکر کوئی بھی نہیں کرتا۔

تیسرے جس چیز کو کاظمی صاحب دھڑلے سے "حقیقتِ ثابتہ" کہہ رہے ہیں وہ ہرگز ہرگز متفق علیہ بلکہ کوتاہ نظری یا کم علمی نے انھیں ایسا گمان کرا دیا ہے۔ کتنے ہی علمائے اصول اور محققین حدیث ضعیف کو کسی بھی شعبے میں لائق قبول نہیں مانتے "توجیہ النظر" اٹھا کر دیکھئے، ص ۲۱۹ پر علامہ الجزائری کا ارشاد ہے:-

وذهب قوم الى	اور ایک جماعت اس کی قائل
عدم جواز الاخذ	ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل و
بالحدیث الضعیف	اعتماد کسی صورت میں بھی درست
فی ای نوع کان .	نہیں چاہے وہ فضائل کی ہو
	یا قصص کی۔

* * *

اسی توجیہ النظر میں ابن عساکر پر ابی شامہ کی تنقید موجود ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ ضعیف و کمزور روایات کو فضائل اعمال میں قبول کرنا بھی بلند پایہ محدثین اور ائمۂ اصول کی نگاہ میں خطا ہے۔

امام الائمہ بخاریؒ، راس المحدثین مسلمؒ، علامہ ابن حزم یحییٰ بن معین اور ابوبکر ابن العربی رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ ضعیف روایات سے کسی بھی معاملہ میں حجت پکڑنا اور انھیں لائق قبول سمجھنا غلط ہے۔ تو معلوم ہوا کہ مذکورہ اصول تمام علماء کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے۔

چوتھے حدیث ضعیف کو مقبول قرار دینے والے بھی علی الاطلاق ایسا نہیں کہتے، بلکہ بعض شرائط لازم کرتے ہیں جن میں کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ حدیث احکام و عقائد سے متعلق نہ ہو ناظرین دیکھ ہی رہے ہیں کہ منکرین ظل سایہ نہ ہونے کو ایک عقیدے کے طور پر ثابت کرتے ہیں اور اپنے مخالفوں کو نورِ ایمان سے خالی اور بدعقیدہ وغیرہ کہتے ہیں، تو ثابت ہوا کہ حدیث ضعیف کے قبول کی بنیادی شرط ہی غائب ہے۔ ویسے بھی ظاہر ہے کہ سایہ ہونا نہ ہونا اعمال سے متعلق کوئی چیز نہیں۔ نہ اس میں زہد و تقویٰ کا کوئی درس ہے۔ لہٰذا ضعیف روایت کے قبول کا اصول اس میں کیونکر چلے گا۔

ایک اور شرط اہل علم یہ بتاتے ہیں جسے ابن حجرؒ کے الفاظ میں سنئے کہ:-

ان یکون الضعیف	وہ حدیث ضعیف تو ہو مگر بہت
غیر شدید الضعف	زیادہ ضعیف نہ ہو۔ پس جس
فیخرج من انفرد	روایت میں کوئی ایسا راوی ہو
من الکذابین	کہ اسے جھوٹا شمار کیا گیا ہو وہ
والمتهمین بالکذب	قبول کے دائرہ سے نکل جائے گی۔

اس شرط کا حال بھی ناظرین دیکھ چکے کہ زیر بحث روایت میں کس انداز کے راوی ہیں۔ موضوع نہ مانئے تب بھی شدید ضعف تو کھلا ہوا ہے۔

اس صورت حال میں کیا قیمت رہ جاتی ہے۔ اس استدلال کی جو "علاوہ ازیں" کہہ کر پیش کیا گیا ہے اور جسے ابھی ہم نے نقل کیا ہے۔

احساس کاظمی صاحب کو بھی ہے کہ لے دے کے ایک ہی تو حدیث ذکوان تھی جو ہمارے لئے سہارا بنی ہوئی تھی۔ اس کی سند علم و فن کی کسوٹی پر تانبا ثابت ہو گئی۔ اس تانبے کو سونا دکھلانے کے لئے وہ کیمیاگروں کے سے نوع بہ نوع نسخے استعمال کرتے ہیں مثلاً:-

> "چونکہ اس حدیث کو بھی علماء محدثین نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کی دلیل یا اس کا مؤید قرار دیا ہے اس لئے اس میں ایسی قوت پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے اسے بالکلیہ ساقط الاعتبار کہنا درست نہیں۔"

کسی معروف و مستند محدث کا نام تو کاظمی صاحب پیش نہیں کر سکے ہیں ہاں ان کا یہ نظریہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جس نے بھی اس روایت سے ان کے عقیدے کے مطابق استدلال کر لیا وہی محدث بن گیا۔ کسی روایت سے امت کے معدودے چند افراد کا دلیل پکڑنا اگر اس روایت کی قوت میں اضافہ کر سکتا ہے تو پھر بے شمار موضوع روایات کے لئے بھی اہل باطل کو پارس کی

پتھری ہاتھ آجاتی ہے۔ جن موضوعات پر بعض مذہبی گروہوں کے فکر و نظر کی عمارت قائم ہے ان سے تو استدلال کرنے والے گروہ کے بے شمار علما رمل جائیں گے اور مجموعی طور پر یہ گروہ چونکہ امت مسلمہ ہی میں شامل ہیں اس لئے اس سے بھی انکار نہ کیا جاسکے گا کہ یہ استدلال بے شمار مسلمان علماء نے کیا ہے۔ پھر تو اہلِ تشیع کی جملہ بنیادی روایات بھی قوی اور قابل قبول ٹھیریں گی!

چیست یاران طریقت بعد ازاں تدبیر ما

یا مثلاً وہ کہتے ہیں :-

" علاوہ ازیں یہ حدیث صرف ذکوان سے نہیں بلکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے جیسا کہ زرقانی علی المواہب میں ہے"۔

یہ زرقانی کا حوالہ تو کئی بار دیکھ لیا مگر منکرین ظِل آخر یہ کیوں نہیں بتلاتے کہ ابن المبارک اور ابن الجوزی تک یہ روایت پہنچی کن لوگوں سے۔ یہ عجوبہ ہے کہ بار بار حضرت ابن عباسؓ کا نام لے کر رعب ڈالا جاتا ہے۔ حالانکہ اکثر جھوٹی اور من گھڑت روایات کے ساتھ بھی یار لوگ کسی نہ کسی صحابی ہی کا نام جوڑ دیتے ہیں۔ زرقانی پیغمبر نہیں تھے کہ وہ جو کچھ کہیں بے سند مان لیا جائے۔ بخاری و مسلم تک کا اعتبار ان کی سندوں سے قائم ہے۔ ابن عباسؓ کی طرف منسوب شدہ روایت کی جب تک پوری سند بیان نہ ہوگی کوئی بھی اہمیت اسے نہ دی جاسکے گی۔ ہم خوب سمجھتے ہیں کہ اس روایت کی کوئی مضبوط اور قابل اعتماد سند بیان کرنا کسی کے بس میں ہے ہی نہیں۔

یا مثلاً وہ فرماتے ہیں :-

" ہاں بعض رواۃ کی جہت سے اس کا ضعف مسلّم ہے، لیکن یاد رہے کہ اس حدیث کی صرف ایک روایت نہیں، بلکہ ایک سے زائد روایتوں سے یہ حدیث مروی ہے جیسا کہ زرقانی کی منقولہ عبارت سے ثابت ہوتا ہے"۔

پھر وہی زرقانی۔ اللہ کے بندو زرقانی نے اگر ایک سے زائد سندیں بیان کی ہیں تو انھیں سامنے لاؤ نا۔ جو ایک سند ہمیں مل سکی تھی اس کا جغرافیہ تو ہر شخص نے دیکھ ہی لیا۔ اب مزید کوئی سند ہے تو وہ بھی پیش ہو۔ ہم دیکھیں گے کہ علم و فن کے اعتبار سے اس کا کیا حال ہے۔ یہ کیا طریقہ ہے کہ زبانی جمع خرچ کئے جاتے ہو اور مسلمات فن سے آنکھیں چار نہیں کرتے۔

اس مقام پر کاظمی صاحب نے مولانا شبلی پر بھی چھینٹے اڑائے ہیں۔ اس سے تو ہم "ارشاداتِ سلف" کے ذیل میں تعرض کرینگے البتہ مولانا مودودی کی ایک تحریر سے جو انھوں نے سہارا پکڑا ہے اس کا جواب عرض کر دیں۔

ہوا یوں تھا کہ استاد ناصر الدین نے پردے کی بحث میں مولانا مودودی پر ایک مرسل اور ضعیف روایت سے دلیل پکڑنے کا اعتراض کیا تھا۔ اس کا جواب مولانا مودودی نے دیا تو وہی بعض ان لوگوں کے لئے تنکے کا سہارا بن گیا جو سچے اور جھوٹے موتیوں میں فرق نہیں کرسکتے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مولانا مودودی اور استاد ناصر الدین کے درمیان ایک ضعیف روایت کی بحث تھی۔ نہ کہ موضوع کی ـــ موضوع روایتیں اگر سو بھی ایک مضمون کی مل جائیں تو وہ مضمون ردی ہی رہے گا۔ حدیث ذکوان اپنے آخری راوی کی خستہ حالی و رسوائی کے باعث موضوع سے کم کسی خطاب کی مستحق نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مرسل روایت کے قبول میں اختلاف ہے جیسا کہ ہم عرض کر آئے۔ اب اگر بعض مرسل روایتوں میں وہ شرائط پائی جائیں جن کے پائے جانے پر بعض علماء کے نزدیک وہ لائق قبول ہو جاتی ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ اگر یہ علماء انھیں قبول کرلیں لیکن ذکوان والی مرسل تو ان شرائط سے خالی ہے جیسا کہ واضح کیا جاچکا۔ پس ان علماء کے نزدیک بھی اس سے حجت پکڑنا جائز نہ ہوگا جو مرسل سے احتجاج کے قائل ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ پردے کا مسئلہ فقہ سے تعلق رکھتا ہے، لہٰذا اس میں فقہاء کا فیصلہ یقیناً اہمیت رکھے گا ـــ تب مولانا مودودی کا یہ فرمانا بجا ہے کہ :-

" فقہاء کی تلقی بالقبولِ احادیث کے ضعف میں نہیں، بلکہ اس کی قوت میں اضافہ کرتی ہے"۔

"تلقی بالقبول" اس ارشاد میں خاص اہمیت کے الفاظ ہیں ان کا استعمال اسی وقت ہوتا ہے جب متعلقہ حلقے میں اسے قبول عام

کاش میں چندا ماموں ہوتا۔ کاش میں ہوا ہوتا کہ آسمان کی پہنائیوں میں اڑا پھرتا۔ کاش میں ننھا سا ستارہ ہوتا وغیرہ۔ لیکن ایک صحتمند اور سنجیدہ ذہن سے اس طرح کی دعاؤں کی توقع کون کرسکتا ہے بڑی نارواجرأت ہے یہ کہنا کہ سرکارِ دوعالم ؐ نے اللہ سے اپنے آپ کو سائنسی و طبعی معنوں میں نور بنا دینے کی طلب کی۔

کاظمی صاحب نے آگے متعدد کالموں میں زرقانی اور قاضی عیاض اور شہاب الدین رحمہم اللہ کی جو عبارات پیش کی ہیں، ان سب کا مدار اسی مذکورہ روایت اور ابن سبع کے قول پر ہے۔ لہٰذا علم و استدلال کی بارگاہ میں ان کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی یہ لوگ اگر کچھ صدیاں پہلے پیدا ہوئے ہیں اور علماء کی صف میں شمار ہوتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ فکر و نظر کی غلطی سے بالاتر ہو گئے۔

اب رہا زرقانی کا شرح مواہب میں یا بعض اور علماء کا اپنے مصنفات میں یہ کہنا کہ ابن المبارک اور ابن جوزی نے بھی ابن عباس سے سایہ نہ ہونے کی روایت کی ہے تو ضروری ہے کہ اس روایت کی پوری سند سامنے لائی جائے تاکہ علم و فن کی روشنی میں جانچ پرکھ کی جائے۔ محققین جب تابعین تک کے مرسلات کو بلا حجت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تو بعد کے کسی شخص یا اشخاص کا یہ مرتبہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ صحابی سے ایک روایت نقل کریں اور ہم یہ جانے بغیر کہ صحابی سے ان تک یہ روایت کن ذرائع سے پہنچی، آمنا و صدقنا کہہ اٹھیں۔

زرقانی یا شہاب الدین وغیرہ کی عبارتوں میں جو فقرے دلائل عقلیہ سے تعلق رکھتے ہیں انھیں ہم نے یہاں قصداً نظر انداز کر دیا ہے کہ ان کی بحث مباحثِ عقلی کے ذیل میں ہوگی۔ فی الحال تو ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "حدیث" و "قرآن" کی حد تک یہ تھا وہ کل سرمایہ منکرین ظل کا جسے وہ اپنے دعوے کی اصل دلیل قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد کاظمی صاحب نے فرمایا :-

"اس میں شک نہیں کہ حدیث ذکوان ضعیف ہے
لیکن ایسی نہیں کہ بالکل ساقط الاعتبار ہو جائے
کہ اسے موضوع کہا جائے۔"

خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ذرا بتایا جائے کہ حدیث موضوع کی تعریف کیا ہے؟ ایک ایسی روایت جس میں ایک راوی ہی کا نام حذف ہوا اور پھر جن صاحب سے اس روایت کا تحفہ ملا ہے ان کے اوصاف ناقدین رجال نے وہ بیان کئے ہوں جو ہم پیچھے پیش کر آئے۔ اگر یہ روایت بھی ساقط الاعتبار نہیں ہے تو پھر وہ آٹھ دس لاکھ روایتیں بھی قابل اعتبار ہونی چاہئیں جن میں سے محض چند ہزار چھانٹ کر باقی کو محدثین و ناقدین نے ردی کر دیا ہے "چہ جائیکہ" بہت خوب رہا۔ ہم کہتے "موضوع" تو درکنار اگر روایت کی تردید کے لئے اس سے بڑھکر بھی کوئی لفظ ہوتا تو یہ روایت اس لائق تھی کہ اس کے لئے وہ بولا جاتا۔

آپ نے ساقط الاعتبار نہ ہونے کی دلیل دی ہے :-

"اس لئے اگر یہ حدیث بالکل ساقط الاعتبار یا
موضوع ہوتی تو وہ جلیل القدر ائمہ حدیث جن کی
عبارات ہم اپنے بیان میں نہایت بسط و تفصیل
سے نقل کر آئے ہیں ہرگز اس روایت کو حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کی تائید
میں پیش نہ کرتے"۔

بے علم عوام کو تو آپ اس طرح کی دلیلوں سے دم بخود کرسکتے ہیں لیکن اہل علم کے یہاں ایسی سطحی باتوں کا کوئی وزن نہیں کتب متداولہ میں ان بحثوں کو اٹھا کر دیکھئے جن میں کسی روایت کے مرتبہ و مقام اور حقیقت و حیثیت پر گفتگو ہو رہی ہے۔ یہی ملیگا کہ ہر عالم فنی و اصولی دلائل پیش کر رہا ہے۔ راویوں پر جرح و تعدیل ہو رہی ہے۔ متن پر کلام ہے وغیرہ۔ یہ نہیں ملے گا کہ ایک فریق تو فنی دلائل پیش کر رہا ہو اور دوسرے فریق نے ان دلائل سے صرف نظر کر کے یہ رٹ لگانی شروع کر دی ہو کہ فلاں فلاں چند اشخاص نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ لہٰذا ہم اس کی عدم صحت کو نہیں مانتے اور راوی چاہے کیسے ہی ہوں ہم تو اسے ضرور قبول کریں گے

پھر زرقانی اور ابن سبع اور رزین اور شہاب الدین و قاضی عیاض اور بیجوری جیسے حضرات آپ کی دانست میں "ائمہ حدیث" ہوں تو ہوں لیکن محتاط اہل علم انھیں یہ خطاب نہیں دیتے اور

اور اگر دیں بھی تو کیا آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ معدودے چند کتب حدیث کو چھوڑ کر باقی تمام کتب حدیث میں سچی اور جھوٹی معتبر اور غیر معتبر، کھری اور کھوٹی ہر قسم کی روایات پائی جاتی ہیں۔ یہ مستدرک، یہ معاجم ثلاثہ، یہ مسند عبدالرزاق، یہ مصنف ابن ابی شیبہ، یہ صحیح اسماعیلی، یہ مسند فردوس دیلمی، یہ مسند بزار، یہ سنن ابی مسلم ان میں سے کون ہے جس میں ضعیف، منکر اور موضوع روایات نہیں ملتیں۔ تو کیا زرقانی وغیرہم ان سب سے بالاتر اور معصوم ہو گئے کہ ان کی ضخیم کتابوں میں کسی موضوع و منکر روایت کا پایا جانا امر محال ٹھیرا۔ آپ کہتے ہیں :۔

> "جن احادیث ضعیفہ سے اہل علم نے استدلال کیا یا انھیں کسی مسئلہ کی تائید میں پیش کیا انھیں علی الاطلاق ساقط الاعتبار قرار دینا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا، کیونکہ ایسی صورت میں وہ تمام محدثین اور علمائے اعلام مورد طعن قرار پائیں گے جنھوں نے ان احادیث کو کسی مسئلہ شرعیہ کی دلیل یا اس کا مؤید قرار دیا ہے"۔

امت کے ہزاروں ہزار علماء میں سے معدودے چند علماء کا مورد طعن بن جانا تو آپ کو پسند نہیں، لیکن یہ بھی سوچا کہ زیر بحث روایت پر اعتبار کر لینے سے امام بخاری، امام احمد، ابن مہدی، ابو زرعہ، حاکم، ابن حجر، صالح بن محمد، ابو نعیم، ابن عدی رحمہم اللہ جیسے معظم حضرات مورد طعن بن جاتے ہیں کہ یہ سب تو اس روایت کے پیش کنندہ عبدالرحمن بن قیس کو جھوٹا اور ناقابل اعتماد بلکہ ناقابل تذکرہ تک قرار دے رہے ہیں، اور آپ خم ٹھونک کے کہتے ہیں کہ کہے جاؤ ہم تمہاری نہیں سنیں گے اور اس شخص کو معتبر مانیں گے!

اہل علم جانتے ہیں کہ علم حدیث کی فنی بنیاد "اسماء رجال" پر ہے اور رجال کی معرفت جن حضرات کے ذریعہ ہوتی ہے انھی کو مورد طعن بنا دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ علم حدیث کا پورا قصر گرا دیا جائے۔ زرقانی اور سیوطی اور بجیری جیسے ہزار متاخرین بھی کسی روایت کے سلسلہ میں خطا وار ٹھیر جائیں تو اس سے کوئی بڑا فساد ظہور میں نہیں آتا۔ لیکن "کتب رجال" ہی سے اعتماد اٹھ جائے اور ائمہ متقدمین ہی غیر معتمد قرار دیئے جائیں تو علم حدیث کی جڑ بنیاد تک باقی نہیں رہ سکتی۔

کیسی افسوسناک بے عقلی ہے کہ بعد کے چند علماء کو تو احبار و رہبان کا درجہ دیا جائے اور ان ناقدین و ائمہ کو نظر انداز کر دیا جائے جن کے دم سے قصر حدیث کے دیوار و در قائم ہیں۔

اور سنئے اہل بدعت کے علماء کم علم عوام کو عموماً ایک سطحی نعرے سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہی کاظمی صاحب نے بھی بلند فرمایا ہے۔ کہتے ہیں :۔

> "علاوہ ازیں ابواب فضائل و مناقب میں ضعاف کا معتبر ہونا ایک حقیقت ثابتہ ہے جس کا انکار محض تعصب و اعتساف ہے!"

افسوس بے علموں کے ہاتھوں علم کی مٹی پلید ہوئی اور بے عقلوں نے علم حاصل کر کے اس کا وقار مجروح کیا۔ کاظمی صاحب کے مذکورہ فقرے غلط ہی نہیں غلط در غلط ہیں جن پر ہم قدرے تفصیل سے اس لئے کلام کرتے ہیں کہ یہی استدلال اکثر لوگ بدعات و خرافات کے جواب میں پیش کرتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سایہ نہ ہونے کی دلیل میں متعدد حدیثیں ہیں ہی نہیں، بس یہ ایک حدیث ذکوان ہے جسے "موضوع" سے کم کچھ نہیں کہا جا سکتا لہٰذا "ضعاف" کی بات کرنا ہی بے محل ہے۔ باقی جتنی روایتیں کاظمی صاحب نے بیان کیں ان کا حال ناظرین دیکھ ہی چکے کہ ان میں سے ایک میں بھی سایہ نہ ہونے کا ذکر نہیں، بلکہ وہ الٹا یہ ثابت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ نور نہیں تھے، انسان تھے ٹھوس اور ذی جسم۔ تب اس اصول کا ذکر چہ معنی دارد کہ فضائل و مناقب میں ضعاف معتبر ہوتی ہیں۔

دوسرے فضائل کے ساتھ مناقب کا لفظ بڑھانا بھی یا تو جہل ہے یا فریب دہی۔ ضعیف روایات کا فضائل اعمال میں مقبول ہونا بے شک ایک اصول ہے۔ لیکن مناقب میں معتبر ہونا ہرگز کوئی اصول نہیں۔ "مناقب" تو افراد و اشخاص کے اوصاف حمیدہ کو کہتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ مناقب میں بھی ضعیف روایات مقبول ہیں۔ اصول حدیث سے متعلق کتابیں اٹھا کر دیکھئے امام نووی، حافظ سخاوی، ابن الہمام، ابو الحسن قطان، علامہ جزائری وغیرہم یہی کہتے ملیں گے کہ فضائل

اعمال یا درسِ عبرت آموز قصص اور ترغیب و ترہیب میں بعض علمائے کم قوی روایتوں کو مقبول مانا ہے۔ فضائلِ اشخاص وافراد کا ذکر کوئی بھی نہیں کرتا۔

تیسرے جس چیز کو کاظمی صاحب دھڑتے سے "حقیقتِ ثابتہ" کہہ رہے ہیں وہ ہرگز ہرگز متفق علیہ بلکہ کوتاہ نظری یا کم علمی نے انھیں ایسا گمان کرادیا ہے۔ کتنے ہی علمائے اصول اور محققین حدیثِ ضعیف کو کسی بھی شعبے میں لائق قبول نہیں مانتے "توجیہ النظر" اٹھاکر دیکھئے، ص ۲۱۹ پر علامہ الجزائری کا ارشاد ہے:۔

وذهب قوم الى	اور ایک جماعت اس کی قائل
عدم جواز الاخذ	ہے کہ حدیثِ ضعیف پر عمل و
بالحديث الضعيف	اعتماد کسی صورت میں بھی درست
فى اى نوع كان۔	نہیں چاہے وہ فضائل کی ہو
	یا قصص کی۔

٭ ٭ ٭

اسی توجیہ النظر میں ابن عساکر پہ ابی شامہ کی تنقید موجود ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ ضعیف و کمزور روایات کو فضائلِ اعمال میں قبول کرنا بھی بلند پایہ محدثین اور ائمۂ اصول کی نگاہ میں خطا ہے۔

امام الائمہ بخاریؒ، راس المحدثین مسلمؒ۔ علامہ ابن حزم یحییٰ بن معین اور ابوبکر ابن العربی رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ ضعیف روایات سے کسی بھی معاملہ میں حجت پکڑنا اور انھیں لائق قبول سمجھنا غلط ہے۔ تو معلوم ہوا کہ مذکورہ اصول تمام علماء کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے۔

جو تھے حدیثِ ضعیف کو مقبول قرار دینے والے بھی علی الاطلاق ایسا نہیں کہتے، بلکہ بعض شرائط لازم کرتے ہیں جن میں کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ حدیث احکام وعقائد سے متعلق نہ ہو ناظرین دیکھ ہی رہے ہیں کہ منکرینِ ظل سایہ نہ ہونے کو ایک عقیدے کے طور پر ثابت کرتے ہیں اور اپنے مخالفوں کو نورِ ایمان سے خالی اور بدعقیدہ وغیرہ کہتے ہیں تو ثابت ہوا کہ حدیثِ ضعیف کے قبول کی بنیادی شرط ہی غائب ہے۔ ویسے بھی ظاہر ہے کہ سایہ ہونا نہ ہونا اعمال سے متعلق کوئی چیز نہیں۔ نہ اس میں زہد و تقویٰ کا کوئی درس ہے۔ لہٰذا ضعیف روایت کے قبول کا اصول اس میں کیونکر چلے گا۔

ایک اور شرط اہلِ علم یہ بتلاتے ہیں جسے ابن حجرؒ کے الفاظ میں سنئے کہ:۔

ان يكون الضعيف	وہ حدیثِ ضعیف تو ہو مگر بہت
غير شديد الضعف	زیادہ ضعیف نہ ہو۔ پس جس
فيخرج من انفرد	روایت میں کوئی ایسا راوی ہو
من الكذابين	کہ اسے جھوٹا شمار کیا گیا ہو وہ
والمتهمين بالكذب	قبول کے دائرہ سے نکل جائے گی۔

اس شرط کا حال بھی ناظرین دیکھ چکے کہ زیرِ بحث روایت میں کس انداز کے راوی ہیں۔ موضوع نہ مانئے تب بھی شدید ضعف تو کھلا ہوا ہے۔

اس صورتِ حال میں کیا قیمت رہ جاتی ہے۔ اس استدلال کی جو "علاوہ ازیں" کہہ کر پیش کیا گیا ہے اور جسے ابھی ہم نے نقل کیا ہے۔

احساس کاظمی صاحب کو بھی ہے کہ لے دیکے ایک ہی تو حدیث ذکوان تھی جو ہمارے لئے سہارہ بنی ہوئی تھی۔ اس کی سند علم وفن کی کسوٹی پر تانبا ثابت ہوگئی۔ اس تانبے کو سونا دکھلانے کے لئے وہ کیمیا گروں کے سے نوع بہ نوع نسخے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

"چونکہ اس حدیث کو بھی علمار محدثین نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ ہونے کی دلیل یا اس کا مؤید قرار دیا ہے اس لئے اس میں ایسی قوت پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے اسے بالکلیہ ساقط الاعتبار کہنا درست نہیں۔

کسی معروف و مستند محدث کا نام تو کاظمی صاحب پیش نہیں کرسکے ہیں ہاں ان کا یہ نظریہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جس نے بھی اس روایت سے ان کے عقیدے کے مطابق استدلال کرلیا وہی محدث بن گیا۔ کسی روایت سے امت کے معدودے چند افراد کا دلیل پکڑنا اگر اس روایت کی قوت میں اضافہ کرسکتا ہے تو پھر بے شمار موضوع روایات کے لئے بھی اہلِ باطل کو یارین کی

پھری پاتھ آجاتی ہے۔ جن موضوعات پر بعض مذہبی گروہوں کے فکر و نظر کی عمارت قائم ہے ان سے تو استدلال کرنے والے گروہ کے بے شمار علماء مل جائیں گے اور مجموعی طور پر یہ گروہ چونکہ امت مسلمہ ہی میں شامل ہیں اس لئے اُن سے بھی انکار نہ کیا جاسکے گا کہ یہ استدلال بے شمار مسلمان علماء نے کیا ہے۔ پھر تو اہل تشیع کی جملہ بنیادی روایات بھی قوی اور قابل قبول ٹھیریں گی!

چیست یاران طریقت بعد از اں تدبیر ما

یا مثلاً وہ کہتے ہیں :-

" علاوہ ازیں یہ حدیث صرف ذکوان سے نہیں بلکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے جیسا کہ زرقانی علی المواہب میں ہے"۔

یہ زرقانی کا حوالہ تو کئی بار دیکھ لیا مگر منکرین ظِل آخر یہ کیوں نہیں بتلاتے کہ ابن المبارک اور ابن الجوزی تک یہ روایت پہنچی کن لوگوں سے۔ یہ عجوبہ ہے کہ بار بار حضرت ابن عباس رضؓ کا نام لے کر رعب ڈالا جاتا ہے۔ حالانکہ اکثر جھوٹی اور من گھڑت روایات کے ساتھ بھی یار لوگ کسی نہ کسی صحابی ہی کا نام جوڑ دیتے ہیں۔ زرقانی پیغمبر نہیں تھے کہ ان کا کہا کہیں بے سند مان لیا جائے۔ بخاری و مسلم تک کا اعتبار ان کی سندوں سے قائم ہے۔ ابن عباسؓ کی طرف منسوب شدہ روایت کی جب تک پوری سند بیان نہ ہوگی کوئی بھی اہمیت اسے نہ دی جاسکے گی۔ ہم عجوبہ سمجھتے ہیں کہ اس روایت کی کوئی مضبوط اور قابل اعتماد سند بیان کرنا کسی کے بس میں ہے ہی نہیں۔

یا مثلاً وہ فرماتے ہیں :-

" ہاں بعض رواۃ کی جہت سے اس کا ضعف مسلّم ہے، لیکن یاد رہے کہ اس حدیث کی صرف ایک روایت نہیں، بلکہ ایک سے زائد روایتوں سے یہ حدیث مروی ہے جیسا کہ زرقانی کی منقولہ عبارت سے ثابت ہوتا ہے"۔

پھر وہی زرقانی۔ اللہ کے بندو زرقانی نے اگر ایک سے زائد سندیں بیان کی ہیں تو انھیں سامنے لاؤ نا۔ جو ایک سند ہمیں مل سکی تھی اس کا جغرافیہ تو ہر شخص نے دیکھ ہی لیا۔ اب مزید کوئی سند ہے تو وہ بھی پیش ہو۔ ہم دیکھیں گے کہ علم و فن کے اعتبار سے اس کا کیا حال ہے۔ یہ کیا طریقہ ہے کہ زبانی جمع خرچ کئے جاتے ہو اور مسلمات فن سے آنکھیں چار نہیں کرتے۔

اس مقام پر کاظمی صاحب نے مولانا شبلی پر بھی چھینٹے اڑائے ہیں۔ اس سے تو ہم "ارشاداتِ سلف" کے ذیل میں تعرض کریں گے البتہ مولانا مودودی کی ایک تحریر سے جو انھوں نے سہارا پکڑا ہے اس کا جواب عرض کر دیں۔

ہوا یوں تھا کہ استاد ناصر الدین نے پردے کی بحث میں مولانا مودودی پر ایک مرسل اور ضعیف روایت سے دلیل پکڑنے کا اعتراض کیا تھا۔ اس کا جواب مولانا مودودی نے دیا تو وہی بعض ان لوگوں کے لئے تنکے کا سہارا بن گیا جو سچے اور جھوٹے موتیوں میں فرق نہیں کر سکتے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مولانا مودودی اور استاد ناصر الدین کے درمیان ایک ضعیف روایت کی بحث تھی۔ نہ کہ موضوع کی ۔ موضوع روایتیں اگر سو بھی ایک مضمون کی مل جائیں تو وہ مضمون ردی ہی رہے گا۔ حدیث ذکوان اپنے آخری راوی کی خستہ حالی و رسوائی کے باعث موضوع سے کم کسی خطاب کی مستحق نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مرسل روایت کے قبول میں اختلاف ہے جیسا کہ ہم عرض کر آئے۔ اب اگر بعض مرسل روایتوں میں وہ شرائط پائی جائیں جن کے پائے جانے پر بعض علماء کے نزدیک وہ لائق قبول ہو جاتی ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ اگر یہ علماء انھیں قبول کرلیں لیکن ذکوان والی مرسل تو ان شرائط سے خالی ہے جیسا کہ واضح کیا جاچکا۔ پس ان علماء کے نزدیک بھی اس سے حجت پکڑنا جائز نہ ہوگا جو مرسل سے احتجاج کے قائل ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ پردے کا مسئلہ فقہ سے تعلق رکھتا ہے، لہٰذا اس میں فقہاء کا فیصلہ یقیناً اہمیت رکھے گا۔ تب مولانا مودودی کا یہ فرمانا بجا ہے کہ :-

" فقہاء کی تلقی بالقبول احادیث کے ضعف میں نہیں، بلکہ اس کی قوت میں اضافہ کرتی ہے"۔

" تلقی بالقبول" اس ارشاد میں خاص اہمیت کے الفاظ ہیں ان کا استعمال اسی وقت ہوتا ہے جب متعلقہ حلقے میں اسے قبول عام

حاصل ہو۔ بے شک جس نقطۂ نظر کو مولانا مودودی نے حدیث مرسل کے استشہاد پر پیش کیا ہے اسے فقہاء کی غالب ترین اکثریت کا قبول حاصل ہے۔ لیکن سایہ ہونے نہ ہونے کا مسئلہ فقہ کا مسئلہ نہیں عقائد کا مسئلہ ہے۔ اس میں علمائے اصول عقائد کی آراء سند ہو سکتی ہیں۔ کاظمی صاحب نے عقائد کی کسی ایک کتاب کا نام بھی نہیں لیا نہ کسی امام کو شہادت میں لائے، چہ جائیکہ ائمہ عقائد کے حلقے میں اس عقیدے میں "تلقی بالقبول" ثابت کرتے۔ وہ نام لیتے ہیں تو ان لوگوں کا جو مجموعی حیثیت سے چاہے کتنے ہی مشہور عالم ہوں لیکن معروف معنوں میں نہ محدث ہیں نہ امام العقائد۔

چوتھی بات یہ ہے کہ تحفظ عصمت اور پردے کے بارے میں اسلام کا جو مزاج اور رجحان صریح و محکم نصوص سے ثابت ہے مولانا مودودی کی مستدل روایت اسی مزاج و رجحان سے ہم آہنگ اور اسی کو تقویت دینے والی ہے۔ لہٰذا با وجود ضعیف ہونے کے لازماً جھوٹی نہیں قرار دی جا سکتی۔ اس کے برخلاف، رسول اللہ کی بشریت اور عبدیت کے بارے میں قرآن و حدیث کی محکم نصوص جس مزاج و رجحان کی تربیت کرتی ہیں سایہ نہ ہونے کی روایت تو اس کی ضد ہے۔ اس سے تو اس غلو کو شہ ملتی ہے جس سے اللہ اور رسول ؐ نے بتاکید منع فرمایا ہے ان کھلے ہوئے فرقوں کے باوجود کاظمی صاحب کا مولانا مودودی کی تحریر سے دلیل پکڑنا "قیاس مع الفارق" نہیں تو اور کیا ہے؟۔

رہا مولانا مودودی کا یہ فرمانا کہ:-

"ابن جریر اور قتادہ نہ تو قرآن سے اس قدر ناواقف ہیں کہ ایک چیز اس کے خلاف ہو مگر انھیں اس کا احساس نہ ہو اور نہ وہ ایسے جری ہیں کہ جان بوجھ کر ایک مخالف قرآن بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیں"۔

تو اگرچہ اس طرز استدلال کو ہم مولانا مودودی کے علمی مزاج سے ہم آہنگ نہیں پاتے بلکہ ان کی اکثر تحریریں اس طرز کو غیر معتبر باور کراتی ہیں۔ تاہم اسے محکم ہی مان لیا جائے تو منکرین قتل کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مولانا مودودی اور استاذ ناصر الدین کے مابین زیر بحث مسئلہ قانون شریعت کا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ قانون جذباتی لگاوٹوں سے بلند ہوتا ہے۔ قانون کے دائرے میں شخصی عقیدت مندیوں کا سوال نہیں پیدا ہوتا اس لئے یہ خطرہ موجود نہیں ہے کہ ابن جریر اور قتادہ جیسے لوگ جذبات کی رَو میں بہہ گئے ہوں گے۔ لیکن سایہ نہ ہونے کا بنیادی تعلق ذاتِ رسول ؐ کی عقیدت سے ہے۔ انبیاء کی عقیدت میں امتی کہاں تک گئے اس کی نظیر نصاریٰ کی تثلیث میں موجود ہے۔ اہل بدعت کے ان واہی عقائد میں بھی موجود ہے جن کا محل حضور ؐ کی بشریت سے انکار اور عالم الغیب ہونے کے اثبات وغیرہ کے مسائل سے بنتا ہے۔ بڑے بڑے علماء غلوئے عقیدت کے دھارے میں بہہ گئے ہیں۔ سایہ نہ ہونے کے اگر بعض علماء نے قرآن و حدیث کی تعلیمات و تصریحات کے خلاف نہیں سمجھا تو اسے عقیدت ہی کا غلو کہا جائے گا جب تک کہ علمی و فنی سطح پر اس کا معقول ہونا ثابت نہ کر دیا جائے ۱۲۔

بازگفت

"سایۂ رسول" کی بحث میں یہ تیسری قسط کتابت ہو چکی تھی کہ اس سلسلہ میں اپنی ناچیز ہستی کے متعلق دیوبند کے ایک فاضل بزرگ کا شہ پارہ نظر سے گذرا جو نہ صرف مولانا ہیں بلکہ پی۔ اے بھی ہیں۔ ہمیں اس کا تو ملال نہیں کہ اس شہ پارے میں ہم پر کچھ اس طرح تبرّا بازی کی گئی ہے کہ اس کی مثال تیسرے درجہ کے بازاری حلقوں کے سوا کہیں مشکل ہی سے ملیگی۔ لیکن اس کا افسوس ضرور ہے کہ فضلائے دیوبند کے حسن تقریر و تحریر کے بارے میں جو بدگمانیاں علمی حلقوں میں پیدا ہو چکی ہیں انھیں اس شہ پارے سے بہت کچھ تقویت نصیب ہوتی ہے اور اس کا بھی صدمہ ہے کہ یہ شہ پارہ ایک ایسے جریدے میں اشاعت پذیر ہوا ہے جو اگرچہ علمی و دینی حلقوں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن اسے استاذ محترم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے عالی قدر صاحبزادے مولانا الحاج سید اسعد صاحب دامت برکاتہم کی نگرانی و سرپرستی کا شرف حاصل ہے۔ ہم اپنے محترم

استاد زادے سے دست بستہ عرض کریں گے کہ وہ اس شہ پارئے پر اپنے عظیم المرتبہ باپ جیسی خلوص کیشی کے ساتھ نگاہ نقد ڈالیں اور غور فرمائیں کہ اس طرح کی مبتذل، طفلانہ اور ذاتی کینۂ وعناد سے لبریز تحریر ان کی اپنی اونچی شخصیت کے لئے بھی اور جملہ منتسبین دارالعلوم کے لئے بھی کس قدر رسوائی کا باعث ہو سکتی ہے۔ گفتگو یہ ہے کہ رسول اللہؐ کا سایہ تھا یا نہیں تھا۔ عاجز کی رائے یہ ہے کہ سایہ تھا اور سایہ نہ ہونے کا عقیدہ علمی وعقلی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ اپنی رائے کے اثبات میں عاجز فروری ومارچ ۵۹ء میں بھی دلائل پیش کر چکا ہے اور اب بھی قسط وار پیش کر رہا ہے۔ اگر کسی کو اس سے اختلاف ہے تو اسے لازم ہے کہ دلائل کو دلائل سے کاٹے اور علمی زبان میں سنجیدہ گفتگو کرے، یہ کیا چھچھلا پن ہے کہ ایک صاحب اٹھتے ہیں اور فضیلتوں کی ڈگریاں پیش فرماتے ہوئے انتہائی عامیانہ اور بیہودہ گفتگو شروع فرما دیتے ہیں۔ بغض وحسد اپنی جگہ درست، لیکن ہر علم وفن کے کچھ آداب ہیں، انسانیت وشرافت کے کچھ تقاضے ہیں۔ دیانت ومتانت کچھ حدود رکھتی ہیں۔ ہر طرح کے آداب وحدود کو بالائے طاق رکھ کر نہایت گھٹیا اور مضحکہ خیز انداز میں دل کا غبار نکالنے بیٹھ جانا اور نفس کی آلائشوں کو ان مقدس صفحات پر دھونے کی جسارت کرنا جن کی نگرانی ایک محترم شخصیت کے ذمہ ہو، بڑی ہی رسواکن بات ہے۔ ہمارا خیال ہی نہیں یقین ہے کہ اگر اس جریدہ کو واقعی کوئی سنجیدہ حلقۂ قارئین میسر ہوگا تو اس پر گل افشانیاں پہاڑ بن کر ٹوٹی ہوں گی اور اس کی بردباری ہاتھ ملتی رہ گئی ہو گی کہ یا الٰہی! اتنے ثقہ پرچہ میں ایسی پوچ تحریر!

طعن ولعن، سب وشتم اور افترا پردازیوں پر مشتمل مضامین ہمارے لئے کوئی نئے نہیں، تجلی کی خداداد مقبولیت، اس کے مشتملات کی مقبولیت اور اس کے معنوی حسن وجمال کی کشش سے کبیدۂ خاطر رہنے والوں کی تعداد بہت ہے، اور ایسے اخبارات ورسائل بھی کافی ہیں جو علم واستدلال کی بازی ہار کر بدزبانی اور تبرّا بازی پر اتر آتے ہیں۔ لیکن ان کی صف میں اس جریدے کو شامل نہیں ہونا چاہئے تھا جس کے وجود کے ساتھ استاذ معظم مولانا مدنی کے خانوادے کی تقدیس کو نسبت خصوصی حاصل ہے۔ ہمارے لئے نہ پہلے ممکن رہا ہے نہ اب ہے کہ اس طرح کی بوالفضولیوں پر توجہ دیں۔ لیکن مذکورہ شہ پارہ پر تھوڑا سا وقت برباد کرنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس کا تعلق ایک فاضل دارالعلوم کے قلم اور ایک عالی مرتبت صاحبزادے کی نگرانی میں نکلنے والے جریدے سے ہے۔ کسی بھی فاضل دارالعلوم کے علم وفضل کی رسوائی خود ہماری رسوائی ہے کہ ہم بھی تقدیر الٰہی سے فضلائے دارالعلوم ہی کے زمرے میں شامل ہیں۔ ہم اپنے محترم استاد زادے کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ وہ فاضل مضمون نگار کو تھوڑا سا درس انسانیت دیں اور تنبیہ فرمائیں کہ اے صہبائے عناد کے متوالے علم وشرافت کی کچھ تو آبرو رکھئے، وقار ومتانت کی اونچی سطح سے نہ سہی مدل وشرافت اور ادب ونگارش کی معمولی سطح سے تو کلام فرمائیے۔ ملا ابن العرب مکی کی تقلید میں طنز ومزاح ہی کا شوق پورا کرنا ہے تو اس کے لئے بھی سلیقہ درکار ہے۔ طنز ومزاح کا فن بہت اونچا ہے، بشرطیکہ کلمکار اس کے مزاج، اس کی حدود اور اس کی تکنیک کو سمجھتا ہو اور اسے برتنے کا بھی سلیقہ رکھتا ہو۔ لیکن یہی فن دنیا کا بدترین فن ہے اگر ایک اناڑی پھکڑپن کے ساتھ اس میدان میں ٹٹو دوڑانے لگے جہاں ومبتذلین جیسا تبرّا ہی مقصود ہو تو "سایۂ رسول" جیسے علمی مبحث کی آڑ لینی ضروری نہیں، کوئی بھی "جواب آں غزل" قسم کا عنوان قائم کر کے شیعہ لٹریچر سے استفادہ کرنا چاہئے عزیز حسن بقائی کی تحریریں بھی اس سلسلہ میں کافی معاون ہو سکتی ہیں۔ بعض بدعتی جریدے بھی خاصا مواد دے سکتے ہیں یہ کیا کہ "سایۂ رسول کی تحقیق" کا بھاری بھرکم عنوان دیا جاتا ہے اور گفتگو کی جاتی ہے ایسے سوقیانہ انداز سے کہ متانت وشرافت سر پیٹ لیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ بسم اللہ ہی اس طرح فرماتے ہیں:۔

"اس کا تو علم تھا کہ جناب ماہر صاحب ایسے باکمال شاعر عثمانی (؟) ہیں کہ بسا اوقات مشاعرے میں کسی ایک شعر پر بھی داد نہیں ملتی اور پانی سے

گھونٹ پی پی کر شعر پڑھا کرتے ہیں"

اس سے قطع نظر کہ داد ملنے نہ ملنے کی حقیقت کیا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ جس شخص کو علمی متانت اور صحافتی بردباری چھو کر بھی نہ گئی ہو کیا اس سے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ "سایۂ رسولؐ" کی بحث اس لایعنی انداز میں شروع کرے گا۔ پھر آگے دو صفحے تک اسی طرح کی غیر متعلق شیریں بیانیوں کا سلسلہ جاری رکھا گیا ہے۔ مثلاً:-

"عامر صاحب شاہنامۂ اسلام کے مؤلف بھی ہیں
جس میں حفیظ صاحب کے قدم بہ قدم چل کر بھی
ہوئی ترکیبیں اور بھدے الفاظ پیش کر دیئے
ہیں"۔

سمجھے آپ! یہ سایۂ رسول کی تحقیق ہے۔

"اصول تجارت سے بھی خوب واقف ہیں جو
اشتہار سرمہ در نجف سے ظاہر ہے۔ جس کے
سامنے در عدن کی آب و تاب ماند ہے
جو شخص اس کو استعمال کر لیتا ہے اس کے دل
کی آنکھیں تک کھل جاتی ہیں۔ پھر وہ روشنی
میں بھی اپنے حریفوں کو اعمیٰ ہی سمجھنے لگتا ہے"

ایمان سے کہئے اس میں اور ہذیان میں کوئی فرق کیا جا سکتا ہے؟ "درنجف" اول تو عامر عثمانی کا نہیں دار الفیض رحمانی کا ہے، پھر بات کیا بنی؟ یہی نا کہ بغض و عناد کے بخار میں مبتلا ایک شخص بر ملا ہذیان پر اترا ہوا ہے، حالانکہ اس بیچارے کو طنز کرنے اور گالی دینے کا بھی سلیقہ نہیں۔

آگے:-

"عامر عثمانی رمضان شریف کے روزے کبھی نہیں
رکھا کرتے ہیں۔ یہ انکشاف ان کے ایک عزیز نے
کیا جو رمضان شریف میں دن میں ان کو کھاتے
دیکھنے کا عینی شاہد ہے" اور بھی عجیب و غریب
انکشافات ہیں جو آئندہ کے لئے محفوظ ہیں"۔

اچھا ہوتا اگر یہ اور انکشافات بھی ہاتھوں ہاتھ واشگاف کر دئیے جاتے تاکہ دل کا کچھ اور غبار نکل جاتا۔

آگے:-

"شاید مے نوشی تو نہ فرماتے ہوں گے مگر ایسا اندازہ
ہوتا ہے کہ شوق مے نوشی خوب ہے"۔

وعلیٰ ہذا القیاس۔ اہل نظر انصاف فرمائیں کہ کیا کینہ پروری اور ذاتی عناد کی اس سے واضح مثال بھی کوئی ہو سکتی ہے تحقیق ہو رہی ہے سایۂ رسولؐ کی اور باتیں ہو رہی ہیں یہ نور علیٰ نور۔

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

ہمیں اپنی شاعری یا شاہنامے کی علمی وادبی حیثیت پر کچھ نہیں کہنا۔ ہزاروں ہیں جنھوں نے مشاعروں میں ہمارے شعر سنے اور رسائل میں پڑھے ہیں، ہزاروں ہیں جنھوں نے شاہنامے کا مطالعہ کیا ہے اس پر موقر رسائل میں تبصرے بھی ہوئے ہیں۔ ہمیں قطعاً اصرار نہیں کہ اپنی سخن سنجی کا قصیدہ گائیں لیکن ہاں دوسرے الزامات جو محترم بزرگ نے لگائے ہیں ان پر ضرور کچھ نہ کچھ کہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی گفتگو کے لئے تجلی کے صفحات موزوں نہیں۔ اس کا موزوں مقام تو عدالت ہی ہے، رب العزت کی آخری عدالت پر تو شاید ہمارے عنایت فرما کو یقین نہیں ہے اس لئے پہل ہم دنیا ہی کی عدالت سے کریں گے۔ وہ دنیا جسے ہمارے دوست نے سب کچھ سمجھ لیا ہے وہاں انھیں موقع ہوگا کہ "بس سے اترتے وقت نوٹو" کی پھبتیاں کا مطلب اور ہماری مستقل روزہ خوری اور شوق مے نوشی وغیرہ کا ثبوت فراہم کر کے اپنی کامیابی کے ڈنکے بجائیں۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اتہام و افتراء کو صحیح ثابت کر دینے کا اعجاز ہمارے کرم فرما میں کس حد تک ہے۔ لیکن اگر یہ اعجاز وہ نہ دکھلا سکے تو پھر ہم انھیں یہ دکھانے کی زحمت اٹھائیں گے کہ قانون کی ایک دفعہ "ازالۂ حیثیت عرفی" بھی ہے اور کسی با عزت شہری کی عزت و شہرت کو کینہ و حسد کے پائے چوبیں سے رگڑ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا انھوں نے سمجھ رکھا ہے۔

یہاں تک تو ان کی تمہید کے بارے میں عرض کیا گیا، آگے چھ صفحات میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ عامر عثمانی نے فروری و مارچ ۵۹ء کے تجلی میں جان بوجھ کر از راہ فریب مفتی شفیع صاحب کے فتوے اور رسالے کو مفتی

عزیزالرحمٰن کی طرف منسوب کردیا۔ اس سلسلے میں کوئی سخت سے سخت لفظ ایسا نہیں ہے جو انھوں نے ہمارے حق میں استعمال نہ کیا ہو۔ افترا، اتہام طرازی، تلبیس، بجدی، کذب و دغا وغیرہ ذلک اللہ تعالیٰ انھیں اس کی پوری پوری جزا دے۔ انھوں نے ہمارا جُرم ثابت کرنے میں تاحق چھ صفحات برباد کئے اور آخر میں یہ بھی اپیل کی کہ :۔

"خدارا لوگوں کو اس تلبیس میں مبتلا نہ فرمائیں
اور حق کی پابندی کے سلسلہ میں اعلان فرمادیں
کہ مجھ سے غلطی ہوگئی"۔

اس طرح کی اپیل اگرچہ ان لوگوں کو زیب نہیں دیتی جنھوں نے کبھی اس بلند کرداری کا مظاہرہ نہیں کیا جنھیں ہمیشہ اپنی بات کی پچ رہی ہے خواہ کتنے ہی مضبوط استدلال سے ان کی غلطی واضح کی گئی اور جو ہمیشہ ضد، کبر اور جمود کی راہ پر چلتے رہے۔ پھر اس شخص سے اپیل کی جارہی ہے جس نے اپنی بارہ سالہ صحافتی زندگی میں ایک دو بار نہیں دسیوں بار واضح الفاظ میں اپنے کسی نہ کسی سہو و قصور کو اعتراف و تصحیح کے ساتھ چھاپا ہے جس کا جی چاہے تجلی کا فائل دیکھ لے

لیکن یہ اپیل کی ہی گئی ہے تو جواباً عرض ہے کہ اے ناصحِ مشفق آنکھیں کھول کر دیکھئے۔ اب سے ایک سال تین ماہ قبل ہی مئی ۵۹ء کے تجلی میں اداریئے کے تحت "ایک غلطی کی تصحیح" کا جلی عنوان دیکر ذیل کا شذرہ سپرد قلم کیا گیا ہے۔ لفظ بلفظ نقل ملاحظہ ہو۔

ایک غلطی کی تصحیح

فروری و مارچ ۵۹ء کے مشترکہ شمارے میں "تجلی کی ڈاک" کے تحت حضورؐ کے سائے کی بحث کرتے ہوئے ہم نے مولانا مفتی عزیزالرحمٰنؒ کی طرف ایک فتوے کی نسبت کی تھی، اشاعت کے بعد معلوم ہوا کہ یہ فتویٰ ان کا نہیں تھا بلکہ دارالعلوم کے سابق مفتی مولانا محمد شفیع صاحب کا تھا۔ ہماری غلط فہمی کا باعث یہ چیز ہی کہ فتاویٰ دارالعلوم میں ان دونوں حضرات کے فتاویٰ کو دو الگ عنوانوں سے چھاپا گیا ہے عزیزالفتاویٰ اور امداد المفتیین۔ یہ فتویٰ امداد المفتیین کے تحت تھا۔ لیکن ہم نے سہواً اسے عزیزالفتاویٰ کے تحت سمجھ لیا۔ اب جس کا جی چاہے ہمارے اس سہو کو دانستہ "سہواً" مان لے اور جس کا جی چاہے بددیانتی اور خیانت وغیرہ سے تعبیر کرلے۔ ہمارا ضمیر بہرحال مطمئن ہے کہ ہم نے ارادۃً یہ فعل نہیں کیا ہے۔ اور یہ بھی اطمینان ہے کہ اس سہو سے نفس بحث پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ مولانا مفتی شفیع صاحب بھی بہت برسوں تک دارالعلوم دیوبند کے مفتی رہے ہیں۔ بہت بڑے عالم ہیں۔ مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص خلفاء میں سے ہیں اور آج بھی انھیں پاکستان میں مفتی اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ ویسے اس تعارف سے مقصود اپنے خیال و رائے کی تقویت نہیں ہے کہ مسائل میں اصل حیثیت دلائل کی ہے نہ کہ شخصیات کی۔ بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ اکابرین دیوبند کا متفقہ طور پر یہ عقیدہ ہرگز نہیں رہا ہے کہ حضورؐ کا سایہ نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے مولانا مفتی عزیزالرحمٰنؒ صاحب سایہ نہ ہونے کے قائل ہوں۔ مگر تنہا ان کی ذات پر "اکابرین دیوبند" کا اطلاق نہیں ہوتا۔"

آپ نے دیکھا جو خطا ہم سے نادانستہ ہوگئی تھی، اس کا اعلانِ اعتراف ہم نے ایک ماہ بعد ہی برملا کرلیا تھا اور اس صورت میں کرلیا تھا جب کہ کسی اخبار و رسالہ نے ہمارے قصور کی گرفت نہیں کی تھی، صرف ایک شخص نے خط کے ذریعہ ہمیں متنبہ کیا اور ہم نے تحقیق کے بعد اس کی تنبیہ کو درست پایا تو بلا تامل تصحیح شائع کردی۔ چونکہ اسی فتوے میں جسے ہم نے غلطی سے مفتی عزیزالرحمٰن کا سمجھ لیا یہ فقرہ بھی تھا کہ :۔

"احقر کے رسالہ میں تفصیل دیکھ لی جائے"۔

اس لئے اس رسالہ (تامیل القبول) کو بھی قدرتاً ہم نے مفتی عزیزالرحمٰنؒ ہی کا سمجھ لیا اور اس کے فرمودات کی نسبت ان کی طرف کی۔ لیکن جب متنبہ ہونے پر ہم نے اعلان کردیا کہ یہ فتویٰ مفتی شفیع صاحب کا ہے تو یہ بات بھی آپ سے آپ صاف ہوگئی کہ رسالہ "تامیل القبول" بھی مفتی شفیع صاحب ہی کا ہے۔ اب اس سے بڑھ کر بوالفضول اور کس کو کون ہوگا

جو تیرہ مہینے بعد ہم سے "اعتراف حق" کی اپیلیں کرتا ہے اور ناموں کے غلط انتساب کی جو بات چند سطروں میں لکھی جا سکتی تھی اس کے لئے چھ صفحات سیاہ کر گزرا ہے ۔ محض اس لئے کہ اس کا مقصود علمی و تحقیقی گفتگو نہیں بلکہ ذاتی عناد و حسد کا بخار نکالنا ہے ۔ اور اسی لئے وہ دو مستقل صفحے اس بے سر و پا تمہید پر صرف کرتا ہے جس کے نمونے ہم نے نقل کئے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے استاذ زادے کی سرپرستی میں نکلنے والے جریدے کے اسٹاف میں کس دنیا کے لوگ شامل ہیں جنھیں اتنا بھی شعور نہیں کہ شریفوں اور رذیلوں کے طرز گفتگو میں فرق ہوتا ہے ۔ جو یہ بھی نہیں جانتے کہ چھچھورپن اور با وقار طنز میں کتنا فاصلہ ہے۔ جن کو اتنا بھی ہوش نہیں کہ عامر عثمانی کی تضحیک و تذلیل میں لکھا جانے والا مضمون خود لکھنے والوں کی صلاحیتوں کا کتنا برا نمونہ دنیا کے سامنے رکھ رہا ہے ۔ جن کے نزدیک پرائمری اور میٹرک کا معیار یکساں ہے ۔ جنھیں ذرا احساس نہیں کہ جس مضمون کو وہ طمطراق کے ساتھ شائع کر رہے ہیں اسے کوئی بھی صاحب ذوق ایکائی لئے بغیر ختم نہ کر سکے گا جو ادب و انشاء کے وقار اور تہذیب و شائستگی کی پاکیزگی کا شمہ برابر پاس نہیں کرتے ۔

خدا گواہ ہے کہ آج یہ ہم نے بہت درد کے ساتھ لکھا ہے ۔ درد اس بات کا نہیں کہ کسی چھچھورے نے انتہائی طفلانہ انداز میں ہم پر عناد و حسد کے ترکش خالی کئے ہیں ایسے ترکش تو بریلی ، بمبئی ، ملتان اور نہ جانے کہاں کہاں سے خالی کئے ہی جاتے رہتے ہیں ۔ ہوائی تیروں سے چٹان کا سینہ چھلنی نہیں ہوا کرتا اور خاک اڑانے سے چاند کی روشنی ظلمت میں تبدیل نہیں کی جا سکتی ۔ کبر و غرور سے ہزار بار پناہ ۔ تجلی کی بے پناہ مقبولیت کا محل ریت کی بنیاد پر نہیں کھڑا ۔ اس کی دیواریں اندھی عقیدت مندوں کی بے مغز قصیدہ خوانیوں پر نہیں اٹھیں ۔ وہ خدائے بخشندہ کی عطا فرمودہ فولادی توانائی کے سہارے سرافراز ہے ۔ کون ہے جو اسے زمیں بوس کر سکے ۔ یہ تو اسی دن زمیں بوس ہو گا جب خدا تعالیٰ عز جل شانہ

کی نگاہ کرم اس سے پھر جائے گی ۔

بر و ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

ہاں درد اس بات کا ہے کہ شیریں کلامی کا ایسا معطر شاہکار اس محترم ہستی سے منسوب پرچے میں چھپا ہے جس کے لئے ہمارے سینے میں نہایت عقیدت مندانہ جذبات ہیں جس کے عظیم المرتبہ باپ کی جوتیوں کے طفیل ہمیں علم حدیث کی دولت حاصل ہوئی ہے اور جس کی شخصیت اس سے بلند ہے کہ ہرزہ سراؤں کی سرپرستی فرمائے ۔ یقین نہیں آتا کہ یہ مضمون ہمارے استاذ زادے کی نگاہ سے گزر کر اشاعت پذیر ہوا ہو گا ۔ اگر جریدۂ مذکور کا انتساب ان کی طرف نہ ہوتا تو زیر تذکرہ مضمون کی حیثیت ہماری نگاہ میں پر کاہ کی برابر بھی نہ ہوتی ۔ ہم مڑ کر بھی نہ دیکھتے کہ ردّہ کس پر پڑا ہے ۔

خیر سے اس مضمون پر باقی آئندہ بھی لکھا گیا ہے ۔ طرز گفتار اگر اتنا گھناؤنا نہ ہوتا تو یقین کیجئے ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی کہ "سایۂ رسول" کے علمی مسئلہ پر ایک فاضل دار العلوم بھی کچھ لکھنے چلے ہیں ۔ ہم ان لوگوں میں نہیں جو اپنے خیال و رائے کو وحی کا درجہ دیتے ہوں ۔ نہ ہمارے نزدیک علمی اختلاف ذاتی عداوت کا نام ہے ۔ نہ ہمیں اس میں شمہ برابر حجاب ہے کہ جس رائے کو ہم درست سمجھ رہے ہوں اسکی قوی دلائل سے تردید ہو جائے تو سر تسلیم خم کر دیں ۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ نا شائستہ ، ان گھڑ اور لاطائل تحریریں پڑھ سکنے کے لئے ہمارے پاس نہ وقت ہے نہ دماغ ، ہمارے لئے سخت مشکل ہے کہ فاضل مضمون نگار کی اگلی قسطیں بھی دیکھ سکیں ۔ ہم علم و ادب کو بچوں کا کھیل نہیں اہل نظر کا فن سمجھتے ہیں گھسیارے اور قلم کار کے ہاتھوں کی جنبش میں فرق ہونا چاہئے ۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر واقعی صاحب موصوف کو ہم پر اتنا غصہ ہے کہ ہماری بوٹیاں نوچے بغیر وہ سایۂ رسول کی تحقیق نہیں فرما سکتے تو ایسا کریں کہ چند اوراق الگ سے وقف کر دیں جس میں جی بھر کے ہماری تذلیل و اہانت فرمائیں ، اس کے بعد سایۂ رسول پر

شرافت ومتانت کے کسی گوارا معیار کے ساتھ گفتگو فرمائیں۔ اس صورت میں ہم نفس مضمون سے فیض اٹھا سکیں گے۔ پھر اس کا بھی خیال رہنا چاہئے کہ اس مبحث پر ہم مسلسل لکھ رہے ہیں جس کی یہ تیسری قسط آپ کے سامنے ہے اور مزید قسطیں انشاء اللہ آگے آئیں گی، جتنے مثبت ومنفی دلائل ہم دیتے جا رہے ہیں ان کا رد اور پھر اپنے دعوے کا اثبات آپ کے ذمہ ہے۔ اسی صورت میں مسئلہ کی تنقیح ہو سکتی ہے اور دیکھا جا سکتا ہے کہ بات آپ کی وزنی ہے یا ہماری لیکن اگر آپ ہماری معروضات کو ملحوظ رکھے بغیر اپنی ہی ڈفلی بجاتے رہے اور مرغے کی ایک ٹانگ کی طرح وہی پٹے چھٹے دلائل پیش فرماتے رہے جن کی بے حیثیتی ہم واضح کر چکے ہیں تو سوائے صبر وسکوت کے ہمارے لئے کوئی چارہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس مسخرے سے عہدہ برآ ہونا کسی متین آدمی کے بس کا نہیں ہے جو اپنی ہی ہانکے جائے اور دوسروں کے لئے گونگا، بہرا بن جائے۔

اب تک کی گفتگو سے پوری طرح واضح ہوگیا کہ سلائے کے منکرین قرآن وحدیث سے نہایت غلط قسم کا استدلال کرتے ہیں اور نہ قرآن وحدیث میں نہ عقل وقیاس میں ان کے دعوے کی کوئی معقول دلیل ہے، گو کہ ابھی تک ہم نے مخالف دلائل پر ہی نقد کیا ہے اور اپنے مثبت دلائل کو بعد کے لئے اٹھا رکھا ہے۔ لیکن یہی اثبات مدعا کے لئے اتنا کافی شافی رہا کہ بے شمار خطوط ہمارے پاس اس مضمون کے آرہے ہیں کہ مسئلہ اطمینان بخش طور پر منقح ہوا اور خدا کا شکر ہے کہ جس غلط عقیدے کو ہم بچپن سے ایک امر فیصل سمجھتے آرہے تھے اس سے رجوع کا موقعہ ملا۔

دوستو! ابھی مت گھبراؤ، ابھی تو بہت کچھ باقی ہے ہم اس بار کسی بھی مثبت ومنفی گوشے کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ سچائی کے تن نازک کی ایک ایک سوئی نکالیں گے راہِ صداقت سے گریز کا ایک ایک ناکہ گھیریں گے۔

کاظمی صاحب نے انکارِ ظل کے لئے جتنے دلائل دنیا جہان سے جمع کئے تھے ان سب کی قلعی کھل چکی۔ اب یہ بھی سنئے کہ سلائے کے ثبوت میں جو چند حاشئیے پیش کی جاتی ہیں ان کو تاویل وتحریف کی سان پر چڑھانے کا کھیل انھوں نے کس عجیب انداز سے کھیلا ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ان کی نکتہ آفرینیوں میں ذرا بھی ذہنی تنوع یا ور نور فراست کی جھلک نظر آتی تو ہم داد دینے میں بخیل نہیں تھے۔ ہم ذہانت وذکاوت کے دلدادہ ہیں چاہے وہ کہیں بھی ہو۔ دشمن کا قلم بھی ہم چوم سکتے ہیں، اگر ہماری دھجیاں بکھیرنے میں اس نے خوش مذاقی اور سلیقے کا مظاہرہ کیا ہو۔

مگر اسے اپنی کم نصیبی نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ عموماً ایسے ہی حریف ہمیں ملتے ہیں جن کی کم نگاہی اور نارسائی سے طبیعت گھٹ کے رہ جاتی ہے۔ نہ لہجے میں رس نہ الفاظ میں شادابی نہ معانی دل کش، نہ زبان منجھی ہوئی۔ بات کریں تو معلوم ہو کہ لٹھ مارا، دلیل دیں تو خیال گزرے کہ سوتے سوتے بول رہے ہیں۔ یا اللہ۔ یہ تو علمی بحثیں ہیں۔ انھیں ان عدالتی جھگڑوں کی حیثیت کیوں دیتے ہو جن میں بازی جیتنے کے لئے پوچ دلائل اور بے سروپا مغو اہد سے کبھی احتراز نہیں کیا جاتا اور خوش مذاقی، بصیرت، شرافت اور انصاف کے ابتدائی تصور تک کو طاق میں رکھ دیا جاتا ہے۔ بات کرو بعد میں پہلے تول لو۔ ایسا نہ ہو کہ دنیا ہنسے اور اہل علم کا رہا سہا وقار بھی ہوا ہو جائے۔

قصہ یہ تھا کہ ایک حدیث آئی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مع بعض بیویوں کے سفر میں تھے۔ زوجۂ محترم حضرت صفیہ کا اونٹ بیمار پڑ گیا تو حضورؐ نے حضرت زینب سے کہا کہ تم اپنا فاضل اونٹ صفیہ کو دیدو۔ حضرت زینب کے پاس ایک اونٹ زائد تھا۔ حضرت زینب نے بجائے تعمیل کے جواب دیا کہ میں تو اس یہودیہ کو نہ دوں گی (حضرت صفیہ یہودی کے خاندان سے تھیں اور بعد اسلام لانے کے حضورؐ کی زوجیت میں آئی تھیں) آنحضورؐ کو اس افسوسناک جواب پر بڑا رنج ہوا اور حضرت زینب سے بول چال ختم کر دی۔ سفر سے واپسی ہوگئی۔ حضورؐ کی ناراضگی ترکِ تعلق کی صورت میں تقریباً ڈھائی مہینے قائم رہی۔ حضرت

زینب کو قدرتاً گمان گذرا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے راضی نہیں ہوں گے۔ یہ گمان یاس انگیز تھا۔ مگر اسی عالمِ یاس میں ایک دن حضرت زینب کیا دیکھتی ہیں کہ ان کے دروازے کے قریب اندر کے رُخ پر ایک انسانی سایہ نمودار ہوا اور پھر معاً معلوم ہوا کہ یہ سایہ تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ آپ دارِ زینب میں تشریف لے ہی آئے۔

یہ تھی حدیث جس کا ایک ٹکڑا ہم نے فروری و مارچ ۷۱ء کے نقد میں نقل کیا تھا۔ پوری روایت قصداً اس لئے نہیں نقل کی کہ اس بحث کا کوئی تعلق نہ تھا۔ بے ضرورت ایسے ناخوشگوار واقعہ کو نقل کرنا اچھا نہیں معلوم ہوا جو ہماری دو محترم ماؤں سے متعلق ہو۔ بجا ہے کہ حضرت زینب کا جواب نامناسب تھا اسی لئے اللہ کے رسولؐ خفا بھی ہوئے، مگر کیا ضروری ہے کہ بیٹے بھی ماں کی خطا کا بے ضرورت تذکرہ کریں۔

خیر تو یہ حدیث مجمع الزوائد میں بھی آئی ہے۔ اور مسند امام احمد میں بھی راوی اول حضرت عائشہ ہیں۔ جو ٹکڑا ہم نے نقل کیا تھا اسے بھی ایک بار پڑھ لیجئے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ حضرت زینبؓ کا مقولہ نقل فرماتی ہیں:۔

فبینما انا یوماً بنصف النہار	پس ایک دن دوپہر کے وقت
اذا انا بظل رسول اللہ	دفعتاً رسول اللہ تشریف لے آئے
صلے اللہ علیہ وسلم مقبل	اور میں نے پہلے ان کا سایہ ہی دیکھا

اب کاظمی صاحب جس نوع کی جرح و قدح فرماتے ہیں دیکھنے کے لائق ہے۔

آپ نے پہلے تو دو صفحے کچھ سوالغات و تفاسیر کے بل پر یہ ثابت فرمانے میں برباد کئے کہ "ظل" کے معنی سایہ ہی نہیں ہیں بلکہ جسم و شخص کو بھی "ظل" کہتے ہیں اور بطور استعارہ و تمثیل بھی یہ استعمال ہوتا ہے۔ پھر ایک صفحہ اس میں کھپایا کہ "ظل" اور "فیئ" کے معنی میں فرق ہے۔ پھر دو صفحے اس گفتگو کی نذر کئے کہ زینب چونکہ دوپہر کا واقعہ بیان کر رہی ہیں۔ اس لئے سایہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ زمانہ گرمی کا تھا اور گرمی کے دوپہر میں سایہ نہیں پڑا کرتا۔

اسے کہتے ہیں بات کا بتنگڑ۔ حدیث میں آئی ہوئی حقیقت صریحہ کو مسخ و محرّف کرنے کے لئے یہ دو سو ادکار طول بیانی اور لاحاصل تگ و دو موٹی عقل والوں کو تو شاید مرعوب کر جائے کہ فاضل فنکار نے بہت سے لغتوں اور تفسیروں کے حوالے دیدئیے ہیں لیکن متوسط عقل والے اس پر ہنس دیں گے اور ذہین لوگ تو سر ہی پیٹ لیں گے۔

تجزیہ سے قبل ہم یہ بتا دیں کہ یہ حدیث اگر مجمع الزوائد اور مسند امام احمد میں "نصف النہار" کی تخصیص کے ساتھ آئی ہے تو اسی مسند امام احمد میں بغیر اس کے بھی مروی ہے اور اس کے الفاظ تو اور بھی قطعیت سے سایۂ رسول کا اثبات کر رہے ہیں۔ مسند امام احمد کی جلد چھ کا صفحہ ۱۳۲، اور صفحہ ۳۳۸ کھولئے "حدیث صفیہ" میں آپ کو یہی مذکورہ قصہ خاصے بسط کے ساتھ ملے گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکِ تعلق کو تقریباً ڈھائی ماہ گذر گئے اور حضرت زینب مایوس ہو گئیں تو ایک دن اچانک حضور نے قدم رنجہ فرمایا، مگر کس طرح:۔

فلما کان شہر ربیع الاول	ربیع الاول کا مہینہ تھا جب
دخل علیہا فرأت ظلہ	رسول اللہ حضرت زینب کے گھر
فقالت ان ھذا لرجل	تشریف لائے۔ زینب کو پہلا آپ کا
وما یدخل علی النبی صلے	سایہ نظر آیا تو آپ ہی آپ کہنے
اللہ علیہ وسلم فمن ھذا	لگیں کہ سایہ تو یہ کسی مرد ہی کا ہو
فدخل النبی صلے اللہ علیہ	مگر رسول اللہ تو میرے پاس آتے
وسلم فلما رأت قالت	ہی نہیں پھر یہ کون شخص ہو سکتا
یارسول اللہ ما ادری	ہے۔ اسی کشمکش میں تھیں
ما اصنع حین دخلت۔	کہ رسول اللہ بنفسِ نفیس اندر پہنچ
× × × × ×	گئے۔ آپ کو دیکھ کر موصوفہ فرطِ
× × × × × ×	مسرت میں کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ
× × × × × ×	نہ جانے آپ نے تشریف آوری
× × × × × ×	سے نوازا نہیں سمجھ میں آتا کہ
× × × × × × ×	میں اس عنایت کے شکر میں کیا کروں

یہ شعر تو شاید یہاں مناسب نہ رہے
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

حدیث میں جو الفاظ ایک مایوس و دل گرفتہ خاتون سے غیر متوقع مسرت کے موقعہ پر منسوب ہوئے ہیں وہ بزورِ داخلی شہادت ہیں، روایت کے درست ہونے کی۔ واقعی اس طرح کے مواقع پر انسان حواس باختہ سا ہو جاتا ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

خیر کہنا یہ ہے کہ لفظ "ظل" کے ہزار معنی بھی لغت میں درج ہوں اور محاورۂ عرب میں یہ چاہے ایک لاکھ مفاہیم میں استعمال ہوتا ہو لیکن کیا کوئی بھی شخص جسے عقل و انصاف چھو کے گیا ہو یہ شوشہ نکال سکتا ہے کہ یہاں "ظل" کا مطلب اس معلوم سائے کے سوا کچھ ہے جسے لغات اور اصطلاحات عرب کا دفتر چھانے بغیر ہی ہر شخص اچھی طرح سمجھتا ہے۔ سایہ دیکھ کر جو خیال برقی سرعت کے ساتھ حضرت زینب کے قلب میں پیدا ہوا اس کا کوئی مطلب بن ہی نہیں سکتا اگر ظلِ رسول سے مراد رسول اور جسم رسول لے لیا جائے۔ کیا اندھیر ہے کہ روزمرہ کی زبان میں بے تکلف بولے ہوئے ایک معلوم المراد لفظ کا لغت و تفسیر کی مار سے مثلہ کیا جائے اور ذرا بھی نہ سوچا جائے کہ یہ کھلے طور پر احمقانہ فعل ہے۔ روزمرہ کی گفتگو میں سیاق و سباق سے جو معنی کسی لفظ کے واضح ہو رہے ہوں انھیں اس دلیل سے کوئی بھی باہوش رد نہیں کیا کرتا کہ کوئی اور معنی بھی اس کے لغت میں آتے ہیں۔ پھر ظل اور فئی کی بحث چھیڑنا تو اور بھی ستم ظریفی ہے، حضرت زینب اور ان کا واقعہ بیان کرنے والی خاتون صرف و نحو اور کلام و منطق کی زبان میں بات نہیں کر رہی تھیں کہ آپ لغات و تفاسیر کے بنڈل اٹھا کے دوڑ پڑیں۔ یہ روزمرہ کی عام فہم اور معلوم المراد زبان میں گفتگو ہو رہی تھی۔ کون نہیں جانتا کہ جب ایک شخص کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے یوں کہہ رہا ہو:-

"فلاں آدمی کو آخر کار یقین آ ہی گیا"

تو اس وقت یہ بحث نہیں اٹھائی جائے گی کہ "یقین" کا لفظ تو قرآن میں موت کے لئے بھی آیا ہے لہٰذا کیا عجب ہے کہ فلاں آدمی کی موت کی اطلاع دی جا رہی ہو۔ ایسے آدمی کو پاگل کہیں گے۔ حالانکہ "یقین" کا "موت" کے معنی میں بولا جانا غلط نہیں ہے۔ اسی طرح مذکورہ روایت میں جو شخص ظل کو سائے کی بجائے جسم اور شخص کے معنی میں لینے لگے وہ مسخرہ ہی کہلائے گا حالانکہ "ظل" کو جسم اور شخص کے مفہوم میں اور بطور استعارہ و تمثیل بولا جانا غلط نہیں ہے۔

قرآن میں لفظ "اجل" عموماً موت ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے مگر جب سیاق اور محلِ استعمال بدلا تو:-

إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ

جب تم قرض لین دین کا معاملہ کرو اجلِ مسمیٰ تک کے لئے تو لکھ لیا کرو۔

مگر کسی کو بھی دھوکا نہیں ہوا کہ یہاں اجل سے مراد موت ہے اور صرف انھی قرضوں کو لکھنے کی ہدایت کی جا رہی ہے جو موت پر ممتد ہوں۔

یہی تمام زبانوں کے جملہ الفاظ کا معاملہ ہے کہ کوئی لفظ چاہے کتنے ہی معنی اور سیاق و سباق اور محل استعمال جس ایک معنی کو متعین کر دیں۔ وہی مراد لئے جائیں گے۔

"ظل اللہ" کہا جائے تو آپ سے آپ طے ہو جاتا ہے کہ سچ مچ کا سایہ مراد نہیں استعارہ ملحوظ ہے۔ اسی طرح آپ جب کہیں گے کہ "زید بیماری کے ہاتھوں اپنے وجود کا محض سایہ رہ گیا ہے" تو کسی احمق کو یہ دھوکہ نہیں ہوگا کہ بیماری کے بھی انسانوں جیسے ہاتھ ہوتے ہیں اور زید سچ مچ سایہ بن گیا ہے لیکن اگر کہا جائے کہ "زید جب گھر آیا تو پہلے میں نے اس کا سایہ دیکھا اور سوچنے لگا کہ زید تو میرے گھر آتا نہیں پھر یہ کون آ رہا ہے" تو ذرہ برابر گنجائش اس میں شک کی نہ رہے گی کہ نہ یہاں مجاز پیش نظر ہے نہ کنایہ نہ تمثیل نہ استعارہ بلکہ معروف معنی میں سایہ ہی مراد ہے۔ اب آپ لغت کی کتابیں اور تفسیروں کے مجلدات بغل میں دبا کے چیخیں کہ بھائیو سایہ تو جسم کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور بطور مجاز و استعارہ بھی بولتے ہیں تو لوگ آپ کو حواس باختہ کہیں گے۔ ایک لفظ ظل کی کیا خصوصیت۔ ہر لفظ حقیقی و مجازی معانی میں استعمال ہوتا رہتا ہے اور استعارہ و تمثیل وغیرہ کے وقت اس کا منشا بدل جاتا ہے لیکن روزمرہ کی گفتگو کو کلام و منطق کے معیاروں سے پرکھنا عقل دشمنی کے سوا کچھ نہیں۔

کاظمی صاحب بھی اور دیگر حضرات بھی سوچیں کہ روایت مذکورہ میں کیا گنجائش ہے اس کھینچ تان کی کہ ظل اور فئی وغیرہ کے

الفاظ پر داد تحقیق دی جائے اور ایک صریح و سادہ حقیقت کو تاویل و تحریف کی چھری سے ذبح کر دیا جائے۔

اچھا اس روایت کو چھوڑیئے اور وہی روایت لیجئے جس میں "نصف النہار" کا ذکر آیا ہے اور اس کو زینہ بنا کر کاظمی صاحب ماورائی بلندیوں تک چڑھ گئے ہیں پہلے آپ نے دو تاریخی کتابوں کے حوالوں سے یہ واضح فرمایا کہ مذکورہ واقعہ جس ربیع الاول میں پیش آیا ہے وہ جون ۶۳۲ء میں واقع ہوا تھا۔ پھر یہ کبریٰ منکشف فرمایا کہ جون میں گرمی ہوتی ہے، اور گرمی کے دوپہر میں سایہ نہیں پڑا کرتا۔ لہٰذا حدِّ اوسط آپ سے آپ یہ نکلا ہے کہ زینب جس "ظل" کا تذکرہ فرما رہی ہیں وہ سایہ نہیں تھا بلکہ جسم رسولؐ تھا۔

موسم گرما کے دوپہر میں سایہ نہ ہونے کے لئے کاظمی صاحب نے عوام مخزاہ المنجد، مصباح اللغات، اقرب الموارد اور کرمانی وغیرہ کا بارِ گراں اٹھایا۔ یہ تو ایک تجرباتی مسئلہ تھا۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کے وہ دو شعر پیش کئے جا سکتے تھے جو ہم نے بچپن میں پڑھے تھے اور شاید انھوں نے بھی پڑھے ہوں۔

مئی کا آ کے پہنچا ہے مہینہ   بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ
بجے بارہ تو سورج سر پہ آیا   ہوا زیر قدم پوشیدہ سایہ

بس فرق مئی اور جون کا ہے تو کہا جا سکتا تھا کہ اتنے سے فرق سے کچھ نہیں ہوتا۔

ہم موصوف کی کنج کاوی کی داد دینے کے بعد عرض کریں گے کہ اول تو یہ ضروری نہیں ہے کہ جون میں ہند و پاک گرم رہتے ہیں تو حجاز بھی ایسا ہی گرم رہتا ہو۔ مختلف ممالک میں گرما و سرما کے اوقات مختلف ہیں۔ دوئم یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جن مہینوں میں آج ہندوستان یا حجاز میں جتنی گرمی پڑتی ہے ہزار بارہ سو برس پہلے بھی یہی تناسب رہا ہو۔ تجربہ و مشاہدہ گواہ ہے کہ موسموں اور مہینوں کے تناسب میں امتدادِ زمانہ سے فرق آتا رہتا ہے۔

سوئم یہ کہ مئی ہو یا جون کسی بھی گرم مہینے میں ایسا ہرگز نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا کہ تمام دوپہر سایہ نہ پڑا کرے۔ قلیل ہی سا وقت ہوتا ہے جب سورج عین سر پر آ جاتا ہے اور سایہ ڈالنے والے سائے معدوم ہو جاتے ہیں۔ باقی دوپہر میں سائے حسبِ فرق مراتب ضرور پڑتے ہیں۔ اپنے ہند و پاک ہی میں دیکھ لیجئے۔ شاید گرمی کے دنوں میں تقریباً دس ہی بجے سے دوپہر شروع ہو جاتا ہے اور کم و بیش تین بجے تک رہتا ہے کیا پانچ گھنٹوں کی اس پوری مدت میں سایہ نہیں پڑتا؟ —— جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے۔ قلیل سا وقت چھوڑ کر سایہ پڑے گا اور ضرور پڑے گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے:-

"زید ٹھیک دوپہر میں میرے پاس آیا"۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ زید ٹھیک اس وقت آیا جب سورج نصف النہار پر تھا اور سائے معدوم ہو گئے تھے۔ اگر زبان اور عرف عام کے اعتبار سے یہی مطلب ہو تب تو کاظمی صاحب کا استدلال دو قدم چل سکتا ہے، لیکن ہر شخص جانتا ہے یہ مطلب تو قائل کے فرشتوں تک کے تصور میں نہیں ہوتا نہ کوئی سننے والا یہ سمجھتا ہے، تب کیا بات بنی؟

آج گھڑیاں موجود ہیں اس لئے اسمٰعیل میرٹھی شوق سے کہہ سکتے ہیں۔

بجے بارہ تو سورج سر پہ آیا

مگر حضرت زینب کے پاس تو گھڑی نہیں تھی کہ دوپہر (نصف النہار) کے الفاظ انھوں نے ٹھیک بارہ بجے بولے ہوں نہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نصف النہار سے مراد دوپہر نہیں تھی بلکہ عین وہ وقت تھا جب دن آدھا گذر چکا ہے۔ آخر حضرت زینب کے پاس کونسا آلہ تھا جس کے ذریعہ انھوں نے ناپ لیا ہو تا کہ اب دن ٹھیک ٹھیک نصف ہوا۔ کھلی بات ہے کہ انھوں نے (نصف النہار) کے الفاظ اسی روزمرہ کے محاورے میں بولے تھے جس میں ہم دوپہر کے الفاظ بولتے ہیں۔ انھیں ظل اور فیئ کی فنی بحثوں کا تصور تک نہ تھا، وہ وہم بھی نہ کر سکتی تھیں کہ حضورؐ کا سایہ دیکھنے کی روداد کے ساتھ اگر میں نے نصف النہار کے الفاظ کہہ دیئے تو صدیوں بعد میرے

قولِ سادہ کو لغت، منطق اور علم کلام کی مار دی جائے گی۔ انھیں کیا خبر تھی کہ سایۂ رسولؐ کے ساتھ نصف النہار کا نام لینا جرم ہے جس کی معافی بغیر اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ یا تو انھیں معاذ اللہ جھوٹا قرار دیا جائے یا تاویلات باردہ کے ذریعہ بات پلٹی جائے۔ بات پلٹنا ہی تو ہے کہ ام المومنین کہہ رہی ہیں میں نے رسول اللہ کا سایہ دیکھا اور پھر حضورؐ بہ نفس نفیس سامنے آگئے۔ مگر سعادت مند بیٹے مارے قابلیت کے ٹوک رہے ہیں کہ نہیں نہیں آپ نے سایہ نہیں دیکھا تھا۔ ماہ جون کی دوپہر میں سایہ کہاں۔

اے دانش ورو! پہلے تو لو پھر بولو۔ یہ مشورہ پیچھے بھی دیا جا چکا ہے مگر اس قابل ہے کہ بار بار دیا جائے۔

ظلّی وظلّکم

زوری ومارچ ۶۸ء کی تنقید میں ہم نے ایک حدیث کے بارے میں ذکر کیا تھا کہ حضورؐ نے ـــــ کہ ظلّی وظلّکم (میرا سایہ اور تمہارے سائے) کے الفاظ فرمائے ہیں۔ حوالہ حافظ ابن قیم کی حادی الارواح کا دیا تھا۔ کاظمی صاحب کہتے ہیں کہ یہاں بھی شخص اور جسم مراد ہیں۔ سائے نہیں۔ ہم تسلیم کرینگے کہ یہاں ان کا دعویٰ اتنا پوشح نہیں ہے جتنا گذشتہ روایت میں تھا۔ جس نوع کی یہ حدیث ہے اس کے اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ ظل کے معنی سایہ نہ ہوں۔

لیکن غور یہ کرنا چاہئے کہ اللہ کے رسول اگر سایہ نہ ہونے کی زیدہ وحیا خصوصیت کے حامل ہوتے تو اپنے اور صحابہ کے اجسام کے لئے ایسے الفاظ کیوں بولتے جن میں اس خصوصیت کی نفی اور تردید کا کھلا اشتباہ موجود ہے۔ پھر بھول ہی گئے تھے تو صحابہ کو قدرتاً چونک جانا چاہئے تھا۔ وہ حیرت سے کہتے۔ "یا رسول اللہ آپ کا ظل کہاں!"

ایسے کسی سوال کا پتہ روایت سے نہیں چلتا تو معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول بھی اس طرح صاحبِ ظل تھے جس طرح دنیا کا ہر شخص ہوتا ہے اور اسی لئے ظلّی کے لفظ پر کسی کے چونکنے کی نوبت نہیں آئی۔

آگے کاظمی صاحب نے عنوان جمایا ہے۔

"مخالفین کی بے بصری پر حیرت"

اور پھر تقریباً ڈیڑھ صفحہ اصل مبحث سے دور ہٹ کر اپنی وسعتِ مطالعہ کے مظاہرے میں صرف کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں وسعتِ مطالعہ سے ہمیں انکار نہیں۔ دنیا میں جب تک کتابوں کا وجود ہے ہر شخص ورق پلٹ کے عبارتیں نقل کر سکتا ہے۔ ہم خوشی سے تسلیم کرتے ہیں کہ انھوں نے کتابوں کی الٹ پلٹ میں کافی مشقت برداشت کی ہے، مگر یہ مشقت کیا عقل و فراست کے تقاضے بھی پورے کرتی ہے؟ یہی ہے وہ سوال ہے جس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔

زیرِ تذکرہ حدیث کا لب لباب یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ نے نماز فجر پڑھانے کے متصل بعد بیداری ہی میں جنت اور دوزخ دیکھی تھیں۔ اسی رویت کے سلسلہ میں آپ نے واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا رءیت ظلّی وظلّکم (میں نے اپنا اور تمہارا سایہ دیکھا)

ہم مانے لیتے ہیں کہ ظل سے یہاں جسم مراد ہے سایہ نہیں۔ لیکن ہر شخص پر آشکارا ہے کہ نہ تو جنت و دوزخ کی دنیا ایسی ہے کہ اس میں ہماری موجودہ دنیا کے طبعی و سائنسی قوانین چلتے ہوں، نہ رسول اللہ کی یہ رویت ایسی تھی کہ اسے مادی دنیا کے علم و سائنس کی ترازو میں تولا جاسکے۔

لیکن کاظمی صاحب اپنے بے پناہ علم کلام کے جوش میں للکارتے ہیں کہ اے ناظرین اگر اس حدیث سے حضورؐ کا سایہ ثابت ہوا تو یا مسجد نبوی میں ہوگا یا دوزخ میں یا جنت میں۔ اس کے بعد وہی قاعدے اور اصول پیش فرما کے جو ہماری دنیائے ظاہر میں کارفرما ہیں ثابت کرتے ہیں کہ ان جگہوں میں سے کسی جگہ سایہ ہونا ممکن نہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ ظل سے مراد جسم تھا سایہ نہیں۔ بتلایئے اس مظاہرۂ علم و فن کو عقل دشمنی نہیں کہیں تو اور کیا کہیں۔

اور سنئے کہا گیا ہے۔

"دنیا والوں کے عرف میں سایہ اسے کہتے ہیں جو

سورج کی گرمی اور تکلیف سے بچائے"۔

اس سے قطع نظر کہ رسول اللہ کا سایہ ہونے نہ ہونے سے اس ارشاد کو کچھ بھی تعلق نہیں، عرف عام کی تعبیر بھی کاظمی صاحب نے غیر دانشمندانہ کی ہے۔ سورج کی گرمی ہمیشہ تکلیف ہی نہیں پہنچاتی۔ موسم سرما میں یہ راحت بخش بھی ہوتی ہے۔ وہی سایہ جو گرمیوں میں آرام دہ ہوتا ہے سردیوں میں تکلیف دہ بن جاتا ہے۔ سائے کا جو لفظ عرف عام میں "پناہ" کے لئے مستعمل ہے اس کا تعلق سورج اور اس کی تابش سے بالکل نہیں ہے۔ مثلاً سایۂ عاطفت، سایۂ شفقت وغیرہ لیکن جس سائے کا تعلق سورج کی تابش سے ہے وہ نہ مستقلاً آرام دہ نہ دائماً اذیت بخش۔ موسم اور ضرورت کے اعتبار سے اس کی حیثیتیں بدلتی رہتی ہیں۔

وسعت مطالعہ کا لوہا منوانے کے لئے یہ تذکرہ بھی فرمایا گیا کہ جنت میں سورج نہیں ہوگا۔ چلئے تسلیم اگر واقعی قرآن وحدیث میں "شمس" جیسے الفاظ تکلیف دہ گرمی کی بجائے نفس سورج ہی کے لئے آئے ہیں تو کون کافر ہے جو انکار کرے۔ لیکن بعض گزشتہ علماء کی پیروی کرتے ہوئے کاظمی صاحب نے یہاں بھی دور از کار منطق کا در کھولا اور گل افشانی کی کہ جنت چونکہ خالص آرام و راحت کا معدن ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے وہاں سورج جیسی گرم اور تکلیف دہ چیز نہیں رکھی۔ یہ ان کے الفاظ نہیں مفہوم ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ سورج کی صرف مضرت ہی آپ نے دیکھی۔ وہ لامتناہی منافع نہیں دیکھے جنہیں بچہ بچہ جانتا ہے۔ نشو ونما، حرارت، زندگی، جولانی، سبھی کچھ تو سورج کا طفیل ہے۔ موسم گرما کی تپش آپ نے ملحوظ رکھی مگر یہ نہیں سوچا کہ سردی کے ٹھٹھرے ہوئے ایام میں یہی تپش نعمت غیر مترقبہ بن جاتی ہے۔ بالکل مہمل بات ہے کہ جنت کو سورج سے اس کی اذیت دہ گرمی کی وجہ سے پاک رکھا گیا۔ کہنا یوں چاہیے کہ بدیع السمٰوات والارض نے جنت کی بناوٹ دنیائے ظاہر کے میکنزم سے جدا رکھی ہے اور جو لامتناہی منافع دنیائے ظاہر کو سورج کے ذریعہ بخشے گئے ہیں ان کے لئے جنت میں کوئی اور ذریعہ تخلیق فرمایا ہے۔ وہ قادر وتوانا ہے۔ مختلف نوع کے ہزار عالم پیدا کرسکتا ہے۔ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ وہ چاہے تو سورج کے بغیر ہی اجالا پھیلا دے چاہے تو سورج کے ہوتے ہوئے بھی کسی کو روشنی کی رمق تک نصیب نہ ہو۔ جو لوگ مادی دنیا کے طبعی قوانین اور اصول وقواعد کو جوں کا توں اٹھا کر جنت، دوزخ اور کائنات آخرت پر نافذ کرنا چاہتے ہیں وہ فعل عبث کے مرتکب ہیں۔

الحمد للہ کہ قرآن وحدیث سے متعلق منکرین ظل کے جملہ دلائل کا جائزہ تمام ہوا۔ اب خدا نے چاہا تو اقوال سلف اور براہین عقلیہ کی بات چلے گی۔ وما التوفیق الا باللہ علیہ توکلت والیہ منیب۔

شامِ عامرؒ منائیے

تجلی کے تمام قارئین کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ وہ ۱۵ر جولائی کو اپنے اپنے ملاقوں میں "جشن عامر" کے عنوان سے جلسے اورمشاعرے منعقد کریں اور ان جلسوں اور مشاعروں میں مولانا عامرعثمانی کی شخصیت اور ان کی مذہبی خدمات پر روشنی ڈالیں۔

ہر علاقے کے چند افراد مل کر بھی یہ جشن منعقد کرسکتے ہیں۔ جن علاقوں میں کسی خاص مصلحت یا کسی خاص مجبوری کی بناپر کھلے عام جشن عامر منانا ممکن نہو ان علاقوں میں پرائیویٹ قسم کی مجلسیں بھی جشن عامر کے عنوان سے منعقد کی جاسکتی ہیں۔

تاریخ (۱۵ر جولائی) اس لئے متعین کردی گئی ہے تاکہ جشن ملک بھر میں ایک ہی تاریخ میں منایا جاسکے۔

جشنِ عامر کی جدو جہد کرنے والے حضرات کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ اپنے نام اپنے مکمل پتے تھوڑے سے تعارف کے ساتھ اور جشن کی پوری کارروائی ہمارے پاس لکھکر بھیجدیں ہم جشن کی کارروائی ہم جشن کی ذمہ داریاں نبھانے والے حضرات کے نام تعارف اور پتوں کے ساتھ "عامرعثمانی نمبر" کی دوسری قسط میں شائع کریں گے۔

جو مجلسیں کسی مصلحت و مجبوری کی وجہ سے گھروں اور پرائیویٹ نشست گاہوں میں منعقد کی جائیں ان کی رپورٹ بھی ہمیں مل جانی چاہئے۔

اس اعلان کے منظر عام پر آنے سے پہلے اگر کسی علاقے میں "جشن عامر" یا "شام عامر" کے عنوان سے کوئی پروگرام تشکیل و تکمیل کے مرحلہ سے گذر چکا ہو تو اس پروگرام کے منتظمین کے لئے بھی ضروری ہوگا کہ پروگرام کی جملہ تفصیل لکھ کر ہمیں ارسال کردیں ہم اسے بھی نمبر کی دوسری قسط میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔

جشنِ عامر منانے والے حضرات یکم جولائی کو اپنے ارادوں سے آگاہ کریں تاکہ ان کی خدمت میں چند مخصوص قسم کے اشتہارات روانہ کئے جاسکیں۔ ان اشتہاروں کا جلسہ گاہ اور مشاعرہ گاہ میں ہونا ضروری ہے۔

المعلن ——— حق احمد صدیقی

ذرا ایک نظر ادھر بھی

ہم نے گذشتہ کئی شماروں میں تجلی کے اقتصادی حالات کے بارے میں کچھ روشنی ڈالی تھی اور قارئین پر یہ واضح کر دیا تھا کہ ادارہ تجلی مولانا عامر عثمانی رح کی وفات کے بعد قسم قسم کی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم نے قارئین سے اپیل کی تھی کہ وہ تجلی کو بھرپور تعاون دیں اور اس چراغ کو گمنامی کے اندھیروں کا شکار نہ ہونے دیں جو ایک مدت سے دلوں کی کائنات میں اجالے پھیلانے کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری آواز صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوئی۔ قارئین نے ہماری درخواست پر کچھ خریدار بھی مہیا کئے اور پانچ پانچ سال کے چندے روانہ کئے۔ بعض حضرات نے دس دس سال کے چندے ارسال کئے۔ بعض حضرات نے تجلی کے پرانے فائل خرید کر ہمارا ہاتھ بٹایا۔

ہم تمام قارئین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یہ دعا کرتے ہیں کہ خدا ہمارے محسنین کو دونوں جہان میں سرخرو کرے اور دونوں جہان میں اپنی رحمتوں سے نوازے اور اب قارئین سے یہ التماس ہے کہ وہ تجلی کے لئے کچھ مستقل اشتہارات مہیا کریں۔ اندازہ یہ ہوا ہے کہ جب تک مستقل آمدنی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوگی بات نہیں بنے گی اور الجھنیں صحیح معنوں میں دم نہیں توڑیں گی۔ اگر قارئین کی جد وجہد سے چند اشتہارات مہیا ہو گئے تو تجلی کو غیر معمولی تقویت حاصل ہو جائے گی اور وہ سوالیہ نشانات دم توڑ دیں گے جو ماہ بہ ماہ متعلقین تجلی کے ذہنوں میں خلفشار پیدا کرتے رہتے ہیں۔

اطلاعاً یہ چند باتیں تحریر ہیں جنھیں آپ نوٹ کر لیجئے۔

(۱) تجلی مذہبی پرچوں میں سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہوتا ہے ——— (۲) تجلی تقریباً دنیا کی تمام لائبریریوں میں بھیجا جاتا ہے ——— (۳) تجلی کے ایک صفحہ کی اجرت (۱۰۰) متعین ہے، $\frac{1}{2}$ صفحے کی (۵۰) اور $\frac{1}{4}$ کی (۲۵) روپے۔ کم از کم ایک سال تک چھپنے والے اشتہاروں کو خاص رعایت دی جاتی ہے ——— (۴) تجلی تصویروں کے اشتہارات کبھی نہیں چھاپے گا خواہ اس کو بھاری معاوضہ دینے کی پیش کش کی جائے ——— (۵) گندی دواؤں کے اشتہارات بھی تجلی نے کبھی نہیں چھاپے اور آئندہ بھی کبھی نہیں چھاپے گا ——— (۶) کسی ایسی کتاب کا اشتہار بھی نہیں چھاپے گا جو اس کی پالیسی کے خلاف ہو ——— ان ضروری باتوں کو ذہن کے کسی گوشہ میں نوٹ کرنے کے بعد قارئین کچھ بھاگ دوڑ کریں اور تجلی کے لئے کچھ اشتہارات مہیا کر کے شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ غیرت ہمیں عزیز ہے لیکن آج ہم نے قارئین کے سامنے اپنی غیرت کا خون کر دیا ہے۔ خدا کرے یہ خون رنگ لائے ——— عنایتوں کا طالب: حسن احمد صدیقی

چند اہم کتابیں

اسلام کیا ہے؟
از مولانا محمد منظور نعمانی۔ نہایت آسان زبان میں۔ اور بے حد دل نشیں و پُر اثر انداز میں اسلامی تعلیمات کا جامع اور مکمل خلاصہ صفحات ۲۵۶ ۔ قیمت مجلد ۴/۵۰

دین و شریعت
از۔ مولانا محمد منظور نعمانی۔ اس کتاب میں توحید آخرت، رسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان، ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں قیمت مجلد مع گرد پوش ۵/

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟
از مولانا منظور نعمانی۔ یہ کتاب اسم با مسمیٰ۔ قرآنی دعوت اور اس کی اہم تعلیمات کا ایک جامع مرقع ہے، جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور روح پرور تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے قیمت مجلد مع گرد پوش ۷/- انگریزی ایڈیشن ۱۵/-

تذکرہ مجدد الف ثانی
تلخیص و ترجمہ۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی۔ امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی سوانح حیات۔ سائز ۲۲×۱۸ قیمت مجلد مع گرد پوش ۱۲/-

تجلیات ربانی حصہ اول
تلخیص و ترجمہ، مولانا نسیم احمد فریدی امروہی پورے اسلامی ادب میں حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان مکاتیب میں احسان و تصوف، تعمیر باطن، حق و باطل میں امتیاز، جہاد فی سبیل اللہ اور اقامت دین کی ترویج شریعت کی ترغیب اور امت مسلمہ کی عام رہنمائی کا وہ سامان موجود ہے جس کی صدائے بازگشت نے گذشتہ تین چار صدیوں میں امت مصطفویہ کے حق میں ابر کاروان کا کام انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی مولانا موصوف نے حاشیہ پر مکتوب الیہم کے حالات بھی کسی قدر تفصیل سے بیان کیے ہیں جس نے اس کتاب کی اہمیت اور عظمت کو دوبالا کر دیا ہے معیاری کتابت طباعت دیدہ زیب۔ گرد پوش سے مزین۔ قیمت مجلد ۱۲/۵۰

مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ
حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ اور خلیفہ حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کے مکتوبات کا ذخیرہ جو حضرت خواجہ کے ارشاد و ہدایت کا پورے کام کا آئینہ دار ہے۔ آپ کے گرانقدر مکتوبات کو اردو زبان میں مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے تلخیص کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ قیمت مجلد ۷/

وصایا شیخ شہاب الدین سہروردی
حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے وصایا جو اپنے اندر بڑی کشش اور دلآویزی رکھتے ہیں اب تک مخطوطہ کی شکل میں عربی زبان میں تھے۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے ان کا انتخاب کر کے اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ قیمت صرف ۱/۲۵

تذکرہ حضرت صوفی عبد الربّ
حضرت سید محمد عبد الرب علیہ الرحمہ کے حالات زندگی اُن کے اللہ پر ایمان کامل اور آپ کی بامقصد اور اصلاحی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز اس تذکرہ میں ان کی چند منتخب اصلاحی نظمیں بھی شامل کی گئیں ہیں۔ خوبصورت ٹائیٹل سے مزین۔ قیمت صرف ۲/

انسانیت زندہ ہے
از: مولانا محمد منظور نعمانی۔ یہ کتابچہ مولانا موصوف کے چار مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پُر اثر واقعہ بیان کیا ہے۔ جذبۂ انسانیت و اتحاد کی افزائش کے لئے بیحد مفید کتاب ہے۔ قیمت ۶۰ پیسے۔

فیصلہ کن مناظرہ
اکابر علماء دیوبند پر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا تحقیقی جواب۔ مولانا منظور نعمانی کے قلم سے۔ کتاب کے مقدمہ میں بریلوی کے اس تکفیری فتنہ کی حقیقت اور اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اہل حق کو اس سے کیسے نمٹنا چاہیئے۔ قیمت ۲/۵۰

مکتبہ تجلی دیوبند۔ یو۔پی

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندینِ اہلِ بدعت کے الزامات

از: مولانا منظور نعمانی۔ حضرت شاہ شہیدؒ جیسی مقدس ہستی پر جس نے اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے خون کا کفن پہنا۔ معاندینِ اہلِ بدعت نے خوف خدا سے بے نیاز ہو کر جو کردہ الزامات لگائے ہیں ان کا تشفی بخش اور مدلل جواب۔ قیمت صرف ۲/۵۰

بریلوی فتنہ کا نیا روپ

از: مولانا محمد عارف سنبھلی۔ (استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ارشد القادری صاحب کی تصنیف "زلزلہ" کا تنقیدی جائزہ اور تحقیقی جواب۔ ہر بحث قابلِ دید، بصیرت افروز اور باطل سوز ہے بالخصوص "علم غیب" اور کائنات میں تصوف کے عقیدہ کی جو تنقیح کی گئی ہے وہ عوام اور اہلِ علم سب کے لئے اس کتاب کا خاص تحفہ ہے۔ آخر میں بریلوی فتنہ کی تاریخ و تعارف پر ایک مفصل مضمون ہے شروع میں مولانا محمد منظور نعمانی کا ایک مکتوب گرامی ہے۔ جو اس کتاب کا پیشس لفظ ہے۔ قیمت چھ روپے ۶/-

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟ اور مسئلہ نزول مسیح و حیاتِ مسیح

یہ کتاب مولانا محمد منظور نعمانی کے قادیانیت پر چار اہم مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان تمام مضامین میں قرآن و حدیث اور عقل کی روشنی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل عام فہم پیرائے میں لکھا گیا ہے، رد قادیانیت پر ایک مدلل کتاب ہے۔ قیمت مجلد مع گرد پوش قیمت ۳/-

معارف الحدیث

تالیف: مولانا محمد منظور نعمانی۔ احادیث نبوی کا ایک جامع انتخاب اردو ترجمہ اور تشریح کے ساتھ۔ جلد اوّل۔ میں ایمان و آخرت، قیامت، حشر، صراط، میزان، حساب، جنت اور دوزخ سے متعلق حدیثیں۔ مع ترجمہ و تشریح۔ قیمت ۱۰/۵۰۔ جلد دوم میں۔ تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق کے ابواب کی حدیثیں۔ مع ترجمہ و تشریح قیمت ۱۱/- جلد سوم میں۔ طہارت اور نماز کے ابواب کی حدیثیں۔ مع ترجمہ و تشریح قیمت ۱۲/۵ جلد چہارم میں۔ زکوٰۃ، روزہ رمضان اور حج کے ابواب کی حدیثیں۔ مع ترجمہ و تشریح قیمت ۱۰/- جلد پنجم۔ حمد و تسبیح، ذکر اللہ، دعا، توبہ و استغفار اور درود پاک سے متعلق حدیثیں مع ترجمہ و تشریح قیمت ۱۲/- جلد ششم میں: معاشرت اور معاملات کے ابواب کی حدیثیں مع ترجمہ و تشریح بیان کی گئی ہیں۔ قیمت ۱۳/۵۰

(مجلد کیلئے ہر مجلد جلد کی قیمت علیحدہ لگائی جاتی ہے)

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ تبلیغی تحریک کے بانی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی مکمل سوانح حیات۔ مولانا کی شخصیت ان کے اخلاق و عادات، ان کے امتیازی اوصاف، ان کے خاص افکار و نظریات، اُن کی دینی دعوت کا پس منظر، اس کا ارتقا اور اس کے اصول و طریق کار کو سمجھنے کے لئے یہ واحد کتاب ہے قیمت۔ ۴/۵۰

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ: مولانا منظور نعمانی۔ جن لوگوں نے حضرت کو نہیں پایا وہ اُن کے ملفوظات کے مطالعہ سے آپ کو پوری طرح جان اور سمجھ سکتے ہیں۔ دین کی حقیقت سمجھنے اور اس کے لئے دل میں سوز و تڑپ پیدا کرنے میں یہ کتاب بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہے۔ قیمت ۳/۵۰

صحبتے با اہلِ دل

مرتبہ: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ حکیم نکتہ داں عارف باللہ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی (عرف پیر نھے میاں) کی عرفانی و اصلاحی مجالس کا مرقع اور ان ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ جن میں عصرِ حاضر کے ذوق اور مزاج کے مطابق زندگیوں کی اصلاح کا پیغام، ایمان و یقین و کیفیتِ احسانی پیدا کرنے کا وافر سامان اور مکاتیب و تمثیلات کے پیرائے میں تصوفِ اسلامی کا عطر آگیا ہے۔ قیمت مجلد مع گرد پوش ۸/-

تصوف کیا ہے؟

مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا محمد اویس ندوی۔ کی مشترکہ تصنیف۔

یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود انصاف، تحقیق اور مباحث کے سلجھاؤ کے لحاظ سے اپنے موضوع میں بہت ممتاز سمجھی گئی ہے۔ بہترین کتابت و طباعت۔ گلیز کاغذ۔ قیمت مجلد مع گرد پوش ۵/-

مکتبہ تجلی۔ دیوبند

موجودہ صدی کے

دو بڑے

(۱) اعلیٰ حضرت حضور پُرنور احمد رضا خانصاحب بریلوی

(۲) والا حضرت حضور پُرنور گنبد قضا خانصاحب رکھیلوی

رحمۃ اللہ علیہ و علیہ

سجدے تک

ملا ابن العرب مکی

زوبی نے اپنی بہن نادرہ کا خط میری طرف بڑھا دیا "لو پڑھو"

میں نے ہاتھ بڑھائے بغیر کہا — "میں نامحرموں کی تحریریں نہیں پڑھا کرتا۔ ضروری ہو تو خود ہی خلاصہ بتا دو"

"قصائی کہیں کے۔ کیا میرے چہرے پر تمہیں اس وقت غم کے آثار نظر نہیں آتے"

"کیسے نظر آئیں گے۔ میری نظر موٹی ہو گئی ہے۔ آخر تمہاری سہیلیوں کے خطوط سے مجھے زاہد شب زندہ دار کا کیا تعلق"

نادرہ میری صرف دوست نہیں ہے رشتے کی بہن بھی لگتی ہے۔ بیچاری بڑی پریشانی میں ہے۔ لکھا ہے کہ میری مدد کرو"

"ضرور کرو۔ تم ماشاء اللہ سیٹھانی ہو اور دولت کا ایک نام قاضی الحاجات بھی ہے"

"لعنت ہے تم پر یہ پیسے کا معاملہ نہیں ہے۔ تم ہی مدد کر سکو گے۔ بہت اچھی لڑکی ہے نادرہ۔ تم سے تو زیادہ ہی قابل ہوگی"

"قابلیت برداشت کر سکتا ہوں لیکن بورییت برداشت

نہیں کرسکتا۔ قابل لڑکیاں اکثر وریت کی پوٹ ثابت ہوتی ہیں۔"

"تمہیں تو میں بھی بورلگتی ہوں حالانکہ مجھ میں قابلیت کچھ بھی نہیں۔"

"اب شاید تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہاری شان میں قصیدہ شروع کردوں ——— اے محترمہ مجھے فوراً سے پیشتر گھر لوٹنا ہے۔ وہ مسز چچا میرے لئے عذابِ جان بن گئی ہیں۔ حافظ چچا لوٹ بھی آئے مگر وہ ان کے ساتھ جانے پر کسی طرح آمادہ نہیں۔"

"کیوں نہیں؟"

"میری سیاہ بختی۔ فرماتی ہیں نہ جانے کہاں کہاں سے کیا کیا کر کے لوٹے ہیں۔ حفظوا۔ مجھے تو ان کی پاکدامنی پر اعتبار نہیں رہا۔ ارے تم کیا سنو گی یہ داستانِ امیر حمزہ سے چار آتشہ ہے۔ وضاحت کرو نادرہ پر کیا آفت آئی؟"

"اس کی منگنی خطرے میں پڑگئی ہے۔ اس کے ہونے والے سسر خواجہ فرہاد علی ہیں اور اس کے ڈیڈی سرفراز حسین میں کچھ کشیدگی پیدا ہوگئی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ خواجہ فرہاد علی جارج پنجم تو نہیں ہیں کہ انھیں سسر بنانا فرض وواجب ہی ہو۔ اور کسی کے صاحبزادے سے رشتہ لگ جائے گا۔"

"تم محبت کے معاملات نہیں سمجھ سکتے۔ نادرہ اور ناشاد ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔"

"بس تو ہمیں انتظار کرنا چاہیئے کہ وہ کب ایک دوسرے کو لے بھاگتے ہیں۔"

"گندے کہیں کے۔ دونوں شرفاء کے خاندان سے ہیں۔ اب تو تمہیں ہی دونوں خاندانوں میں صلح کرانی ہوگی۔"

"میں تو داروغہ ہوں نا زمانے بھر کا۔ تم جانتی ہی ہو میں تعویذ گنڈے نہیں کرتا۔ عملیات سے بھی سروکار نہیں رکھتا۔ پھر سوائے اس کے کیا کرسکتا ہوں کہ جب بھی توفیق ملے دعا کردوں۔"

"سمجھو نہ بوجھو کہے چلے جاتے ہو۔"

"تو سمجھا دو نا بابا۔"

"اختلاف کچھ اس طرح کا ہے کہ تم اس کا حل ضرور نکال لوگے کچھ پیری مریدی کا جھگڑا ہے۔ نادرہ نے پچھلی ملاقات پر بتایا تو تھا میری سمجھ میں تفصیل نہیں آئی۔"

"میں بھی تو تم سے زیادہ سمجھدار نہیں ہوں۔ پیری مریدی کے اسرار و رموز تو سقراط و بقراط بھی نہیں سمجھ سکتے۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ گھر کہہ کے آؤ۔ دو بجے اپنی گاڑی سے چلیں گے۔ تمہارے انکل سیٹھ یہی پروگرام طے کر گئے ہیں۔"

"ان کا تو بھیجا پھر گیا ہے۔ وہ آخر خود کیوں یہ ڈیوٹی انجام نہیں دیتے خواجہ فرہاد اور سرفراز حسین دونوں ہی سے ان کے تعلقات ہیں۔ کرادیں مصالحت۔"

"وہ کوشش کرچکے ہیں۔ کامیابی نہیں ہوئی۔ انھیں کا تو یہ خیال ہے کہ تم کامیاب ہوجاؤ گے۔"

"میں چراغ الہ الدین ہوں نا۔ اے بیبی! تم آگا پیچھا بھی تو کچھ سوچا کرو۔"

"اب محترمہ سے بے بی ہوگئی ——— خدا تمہیں غارت نہ کرے جاؤ جلدی کہہ آؤ۔ کھانا ساتھ ہی کھالیں گے۔ یا چلو گھر کھاتے آنا۔ مگر دو بجے تک ضرور لوٹ آنا۔"

"نہ لوٹا پھر؟"

میں تمہارا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتی مگر اپنی مٹی خراب کرسکتی ہوں اتنا روؤں گی اتنا روؤں گی۔"

"کہ ساری دنیا آنسوؤں میں بہہ جائے گی۔" میں نے جملہ پورا کردیا "لوٹ کر لو رونے سے تندرستی بڑھتی ہے۔ نیند کھل کر آتی ہے مجھے تو آج بہت کام ہیں۔ اور یہ بھی سوچو۔ نہ ہوئی جلدی مصالحت ہم رکھیلی ہیں کب تک دھونی رمائیں گے۔ میرے پاس مرنے تک کو وقت نہیں۔"

"مجھے یقین ہے تم دو تین روز میں صلح کرادو گے۔ اللہ قسم ذرا دیکھنا نادرہ کتنی اچھی ہے۔ وقت بڑا اچھا گذرے گا۔"

"تم بھی بہت اچھی ہو۔ میں کس کس کی اچھائیاں شمار کرتا پھروں۔ فرض کرو اس کے والد صاحب قبلہ میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کر بیٹھے تو پھر؟"

"نہیں وہ بہت روشن خیال آدمی ہیں۔ تمہاری طرح تاریک خیال نہیں۔"

"اس کے باوجود وہ پیری مریدی کے مسائل سے اس درجہ

شغف رکھتے ہیں"

"یہی تو تجھ تمہیں سمجھنا ہے۔ انکار نہیں کرسکتے۔ تم جب تک گھر سے نہیں لوٹو گے مجھ پر کھانا پینا حرام۔ چاہے مر ہی کیوں نہ جاؤں"

"خدا تمہاری بخشش کرے اور مجھے بھی زندہ اٹھالے ——— زوجی میری محترم میں تو تہیہ کرچکا ہوں کہ اب مہذب دنیا سے قطع تعلق کرکے یا تو بن باس لے لوں گا یا تصوف کی وادی میں گم ہوجاؤں گا۔ یہ تم اور قضیہ نکال بیٹھی ہو۔ نادرہ بھی باپ ہی کی طرح روشن خیال ثابت ہوئی تو کیا ہوگا"

"تمہارا سر ہوگا۔ بس چلے ہی جاؤ۔ گیارہ بج رہے ہیں کھانا میرے ساتھ کھانا ہے تو رتا کر جاؤ نہیں تو کھا کر آؤ۔ دو بجے ہر حال میں ہمیں چل دینا ہے کیونکہ دن چھپنے سے پہلے رکھیلی پہنچ جانا چاہیئے"

"یا رب المشرقین والمغربین ——— وہ مسز ہجاما تو اتنے عرصے میں اپنی جڑیں اور مضبوط کرے گی۔ کچھ عجب نہیں کہ ہم تو اُدھر رکھیلی میں بین بجاتے رہیں اور حافظ بجاما دم دبا کر سرحد پار اتر جائیں پھر تو وہ عمر دس اللیل زندگی بھر میرے گلے میں ڈھول بن کر لٹکی رہے گی"

"خدا کرے لٹکی رہے۔ تم اوروں کی جان جلاتے ہو کوئی تمہاری بھی تو جلائے۔ میں ہی بے حیا ہوں کہ تمہاری الٹی سیدھی سہہ لیتی ہوں اور کوئی ہوتی تو جوتی بھی نہ مارتی۔ اللہ اب جا بھی چکو"

"میرے مونڈھوں میں آج درد ہے گاڑی نہ چلا سکوں گا"

"کونسے مگدر گھمائے ہیں۔ چلو ڈرائیور تو نہیں مر گیا اور میں بھی کچھ نہ کچھ چلا ہی لیتی ہوں"

تم شاید عورت ہو۔ عورت جس دن مجھے ڈرائیو کرے گی داڑھی منڈوا کر خودکشی کرلوں گا"

"بس خدا کے لئے ختم کرو۔ جاؤ جلدی جاؤ مجھے راستے کے لئے بھی کچھ تیار کرانا ہے"

"کیا واقعی چلنا پڑے گا؟"

"نہ چل کر دیکھو۔ میری لاش ہی پاؤ گے"

"اتنا پیار ہے نادرہ سے"

"تمہاری طرح پتھر نہیں ہوں ——— اٹھ بھی جاؤ اب"

"بڑی مصیبت ہے۔ بیوی سے کیا بہانہ کروں گا"

"تم اور یہ کہہ رہے ہو۔ میرا خیال ہے تم سے بڑا بہانہ باز دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ میں اندھی نہیں ہوں خوب دیکھ رہی ہوں تمہیں"

"میری زوجہ ڈارلنگ مجھ مجھے خوب دیکھ رہی ہے"

"ارے کیا کرسی نے پکڑ لیا ہے ——— اٹھو لیس"

"اچھا جھانسی کی رانی۔ خالہ کی ہٹلر بھتیجی کی چنگیز۔ سلام علیکم"

"وعلیکم۔ وعلیکم۔ بھاگو"

اجازت کا مرحلہ کچھ آسان نہیں تھا، ایک آدھ دن کی بات ہوتی تو عادت کے مطابق یوں ہی بے کہے غائب ہوجاتا لیکن رکھیلی میں کتنے دن لگیں گے یہ کسے معلوم تھا۔ مسز ہجاما یوں بھی زوجہ کو خاصا بدمزاج بنا چکی تھی۔

"سلطان آباد میں سیرت النبیؐ کا جلسہ ہے" میں نے نظریں ملائے بغیر بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"اور آپ کو دعوت ملی ہوگی"

"ظاہر ہے دور دور تک میری شہرت کا طوطی بول رہا ہے"

اس نے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور اپنی سلائی میں مشغول ہوگئی۔ مسز ہجاما غسلخانہ میں تھیں۔ یہ بھی غنیمت ہی تھا ورنہ اب مجھ سوختہ قسمت کا یہ عالم ہوگیا تھا کہ جہاں ان کا ردِ مبین سامنے پڑا میری ایڑی سے بجلا اٹھکر کھوپڑی میں چڑھ آیا۔

"آپ نے توجہ نہیں فرمائی زوجہ ڈارلنگ"

"جہاں جانا چاہتے ہیں جایئے۔ میری توجہ کے نتیجے میں آپ کو دو چار جھوٹ اور تصنیف کرنے پڑیں گے"

"خادم سے کیا قصور ہوا ہے جانِ حیات بلکہ جانِ عالم"

"ایک آغا حشر والی نوٹنکی اور کھول لیجئے۔ خدارا میری طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہے"

"چشم بد دور۔ نصیب اعداء اتنی بھی بے رخی کیا کہ مسکرا بھی نہ سکو۔ یہ مسز ہجاما صاحبہ کی ایک ٹکیہ سے کم میں تو کیا غسل کرتی ہوگی"

"زندگی بھر واسطہ رہنا ہے۔ خود ہی دیکھ لیجئے گا۔ وہ اب صاف کہہ رہی ہیں کہ میں تو اپنے حافی جی کو طلاق دے دوں گی"

"اینٹ مار و مردود کی کھوپڑے پر" میں نے دانت پیس کر
گرآواز دبا کر کہا۔ پھر آگے کو جھک کر سرگوشی کی "ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے۔ آج رات جب سوجائے تو قینچی سے زلف دراز صاف کردو۔ لنڈھوری بنادو اخبیث النساء کو"

"تاکہ اگلی رات وہ آپ کی داڑھی اور میرے بالوں سے بھی یہی سلوک کرے"

"مار ڈالوں گا گلا گھونٹ کے"

"چلئے بس تخت پر بیٹھئے۔ میں کھانا لاتی ہوں"

جی میں تو آیا کہ کہدوں مولانا بدرالدین یا صوفی اسمٰعیل کے یہاں دعوت ہے مگر پھر سوچا کہ ہتھے سے اکھڑ جائے چلو کھا ہی لو ہو سکتا ہے اتنی دیر میں اس کا موڈ ٹھیک ہی ہو جائے۔ عام حالات میں ہم ساتھ ہی کھاتے تھے لیکن مسز بجاما نے تو حالات کو خاص سے بھی خاص بنا کر رکھ دیا تھا۔ زوجہ ان ہی کے ساتھ کھاتی تھی۔

"تو میں ہو آؤں" میں نے کھانا کھانے کے دوران بڑے پیار سے اجازت چاہی۔

"کیا یہ جلسہ زوجی کی صدارت میں ہونے جا رہا ہے؟" اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اور آنکھوں سے شوخی جھانکی۔ لہجے میں طنز کی تلخی نہیں تھی۔ وہ مارا۔

"اب تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس کی ایک رشتہ دار سہیلی ہے نادرہ بیچاری کی منگنی چھوٹی جا رہی ہے۔ مجھے دونوں خاندانوں میں مصالحت کرانی ہے"

"کیوں نہیں۔ امریکہ اور چین میں بھی تو آپ ہی نے مصالحت کرائی تھی"

"کیا کروں مائی سوئٹ ڈارلنگ۔ عادت سے مجبور ہوں۔ نیکی کر کنوئیں میں ڈال۔ سوچو تو کہانی نمبر لکھنا ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے سفر وسیلہ ظفر۔ ممکن ہے اس سفر سے کر دماغ کی برف پگھل جائے ورنہ بالکل جمود طاری ہے"

"مجھے اب آپ کے لکھنے لکھانے سے کوئی مطلب نہیں۔ بھونکتے بھونکتے عاجز آگئی"

"اس سے تو میں ممنون رہوں گا۔ بس تمہارا اشیرواد چاہیئے زیادہ سے زیادہ تین چار دن میں لوٹ آؤں گا"

"تو آخر حافظ بیجاما اس عذاب کو لیکر کب جائیں گے"

"یہ میاں بیوی میری سمجھ سے باہر ہیں۔ دیکھی جائے گی لوٹ کر"

"یہ کہہ کر میں نے اس کی کلائی تھام کر پنجہ شریف اپنے سر مبارک پر رکھ لیا" دیکھو مائی سوئٹ اسے کہتے ہیں اشیرواد یعنی دست شفقت۔ اب مسکرا کر اجازت دیدو۔ تم تو اللہ نے چاہا بے حساب جنت میں جاؤ گی۔ شوہر خوش خدا خوش"

"ہٹئے بھی" اس نے جھنجھلا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "بچوں کو مات کرتے ہیں"

"ہائے ربا۔ یہ ہم کیا دیکھیں" دفعتاً مسز بجاما کی کلکاری سنائی دی۔ وہ غسلخانے سے نکل کر ادھر ہی چلی آرہی تھیں۔

"کیا دیکھیں" میں بھنایا۔

"سر دا یہ ہاتھ تو اماں ابا دھر دے راہن۔ یوں تو نکاح بھی ٹوٹ جایئو"

"دیکھو پیاری بوا۔ اگر تم نے زیادہ قابلیت بگھاری تو میں تم سے سوہارس پاور کا عشق شروع کردوں گا۔ میرا عشق بڑا بے ڈھب ہوتا ہے۔ دورے کی حالت میں مجھے بالکل پروا نہیں ہوتی کہ کس کا سر پھوٹ گیا اور کس کی ٹانگ ٹوٹ گئی"

ہر آئینہ چوں توں کر کے ایک دونوالہ اور گلے سے اتارا پھر بھاگ ہی نکلا۔

رکھیلی بڑا تاریخی شہر ہے اسے پہلے ریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ جس زمانے میں محمد بن قاسم سندھ پر حملہ آور ہوا تھا یہ ریاست بریلی کے شمال مشرق میں ایک سو تین میل کے فاصلہ پر واقع تھی۔ اب یہ بریلی کے جنوب مغرب میں تین سوا ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ خزائن الاسرار کے مصنف جناب خواجہ احمد دیا سمر قندی پیر دامن علی کی سند سے اس تغیر احوال کی وجہ لکھتے ہیں کہ رکھیلی کے نواب کی ایک جوان لڑکی تھی گلبدن۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ فنون جنگ میں طاق تھی۔ حسن میں شہرہ آفاق تھی۔ ایک دن خدا کا کرنا یوں ہوا کہ سولہ سنگار کئے گھوڑے پر چلی جا رہی تھی۔ ادھر سے شاہ درویش علی سہروردی کا گذر ہوا۔

آنکھ لڑی دل دے بیٹھے۔ یہ اپنے وقت کے ولی کامل تھے۔ خواجہ ریحان الدین کے مریدین میں انھیں خاص مقام حاصل تھا۔ گلبدن تو صبر و قرار لوٹ کر یہ جا وہ جا۔ یہ سینہ دبائے زار و نزار گھر پہنچے۔ تین دن تڑپتے رہے۔ آخر چین نہ آیا تو رخت سفر باندھا۔ ان کے پیر خواجہ ریحان الدین ان دنوں ڈھولا پہاڑ کی ترائی میں مصروفِ عبادت تھے۔ توشہ ساتھ لے گدھے پر سوار آٹھ دن میں وہاں پہنچے۔ روشن ضمیر پیر نے چھوٹتے ہی کہا ـــــ بس میاں ایک ہی تیر میں یہ حال!

وہ قدموں میں گر کر خوب روئے گھگھی بندھ گئی۔ بارے سدھ بدھ آئی تو عرض کیا کہ اب تو جو ہو سو ہو۔ آپ ہی کا آسرا ہے۔ دل جگر سب بھنے جا رہے ہیں۔ پیر نے پوچھا نکاح چاہتے ہو یا لونڈی بنا کر رکھوگے؟ وہ بولے جیسے حضور کی مرضی۔ خواجہ نے جبھی ایک مرید کو رکھیلی روانہ کیا کہ گلبدن کے باپ کو بلا کر لائے۔ مرید باپ کو کیا لاتا وہ خود گلبدن کے تیر نظر کا شکار ہو کر وہیں ڈیوڑھی کا دربان بن گیا۔ خواجہ نے دوسرا بھیجا۔ اسے نواب نے نوکروں سے پٹوایا اور زنداں میں ٹھونس دیا۔ تیسرا بھیجا وہ بھی گلبدن کو دیکھتے ہی ہوش کھو بیٹھا۔ اب خواجہ ریحان الدین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا فرط غضب میں یا علی کا نعرہ مارا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ نواب صاحب ایک گھوڑے کی پیٹھ پر رسیوں سے بندھے چلے آ رہے ہیں۔ گھوڑا ٹھیک خواجہ کے قدموں میں آ کر رکا اور ہنہنانے کے بعد فصیح عربی میں بولا کہ حضور کا مجرم حاضر خدمت ہے۔

خزائن الاسرار کے مصنف نے اس موقع پر چار چشم دید راویوں کے نام لکھے ہیں۔ بقیہ نام تحقیق میں نہ آ سکے۔ بہر حال خواجہ نے نواب کو حکم دیا کہ اپنی لڑکی کو شاہ درویش علی کی زوجیت میں دیدے۔ نواب نے بہانہ سازی کی کہ گلبدن گھر چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ اب نہیں لوٹے گی۔ بڑی ضدی ہے۔ خواجہ ہنسے اور فرمایا کہ میاں نواب۔ ہم پر سات سمندروں کی تہیں آشکارا ہیں۔ تمہاری لڑکی اس وقت بھی تمہارے ہی محل میں ہے۔ کہو تو ابھی بلوا لیں۔ نواب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بڑی مشکل سے عرض کیا کہ گلبدن کی شادی پڑوسی ریاست کے ولیعہد سے کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ نہ کی تو وہ بزور شمشیر رکھیلی پر قبضہ کر لے گا۔ سرحدی پوزیشن بڑی نازک ہے۔ ان کے پاس سرحد کی حفاظت کے لئے کافی سپاہ نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ خواجہ نے فرمایا کہ اس کا علاج ہم کئے دیتے ہیں۔ رکھیلی اگر تمہاری دشمن ریاست سے کافی فاصلہ پر ہٹ جائے تو قضیہ ختم ہو جائے۔ لو ابھی لو۔ یہ کہہ کر خواجہ رضی اللہ عنہ نے یا غوث کا نعرہ مارا اور کیا دیکھتے ہیں کہ رکھیلی اپنے مضافات سمیت پھرکی کی طرح گھومتا ہوا فضا میں اڑا چلا جا رہا ہے پھر ہیلی کوپٹر کی طرح اس مقام پر اتر گیا جہاں آج واقع ہے۔

ہیلی کوپٹر کی تمثیل میں دے رہا ہوں خزائن الاسرار میں یہ الفاظ نہیں آئے۔ البتہ مورخین اس پر متفق ہیں کہ رکھیلی آنِ واحد میں اپنے مقام سے اکھڑ کر فضا میں بلند ہوا تھا اور لٹو یا پھرکی یا چاک کی طرح گھومتا ہوا بہت دور چل کر اتر گیا تھا۔

گلبدن بے شک نواب کے محل میں پائی گئی۔ نواب اسی دن سے خواجہ کا غلام بے دام ہو گیا۔ شاہ درویش کو دلی مراد حاصل ہوئی۔ یہیں سے رکھیلی کا وہ مشہور خاندان چلا ہے جس میں زمرد بیگم اور یاقوت بانو اور شتری خاتون جیسی قمریاں گلزارِ طریقت میں پیدا ہوئیں۔ مشہور قطب العالم حضرت خدا بخش فیض گنجور بھی اسی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔

خلاصہ یہ کہ رکھیلی زمانۂ قدیم سے مشائخ اور فقراء کی بستی ہے۔ انگریز کے زمانے میں یہ ضلع غوث آباد سے منسلک تھا۔ اب نئے انتظام کے تحت اسے ضلع شک نارائن سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے مزید حالات بہار ولایت اور بستان المشائخ اور گنجینۃ المعارف اور خزینۃ الاسرار وغیرہ کتب معتبرہ میں ملتے ہیں۔ فردوس العارفین میں یہاں تک لکھا ہے کہ یہاں کے زنخے تک منازلِ سلوک طے کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔

جواہر العرفان میں یہاں کی ایک زنِ بازاری کا حال درج ہے کہ اس کے پسینے سے خوشبو پھوٹتی تھی۔ اگربتیوں کے تاجر فی بوند ایک اشرفی کے حساب سے خرید کر لے جاتے۔ فقط ایک بوند سے سولہ ہزار نو سو بچانوے اگربتیوں کا جوہر تیار کر لیتے۔ ان بتیوں کا شہرہ ولایت تک پہنچا۔ کشف المکنون کے مصنف نے کئی فرنگیوں کے تعریفی بیانات نقل کئے ہیں

تفریش اور زدبی رسیلی پہنچ ہی گئے۔ نادرہ کے والد سرفراز حسین ایم۔اے پاس تھے۔ جوانی کے دور کی تصویریں اب بھی ان کے گھر سجی ہوئی ہیں۔ کوٹ پتلون ٹائی۔ کلین شیو۔ دفعتاً کسی درویش کی نگاہ ایسی پڑی کہ کایا پلٹ گئی۔ اب ان کے داڑھی بھی تھی اور لباس بھی بدل گیا تھا۔ مکان جدیدیت اور قدامت دونوں کا عجیب مرکز تھا۔ مکان کیا حویلی کہئے۔ نادرہ بور ثابت نہیں ہوئی۔ کافی دلکش خد و خال کی کشیدہ قامت لڑکی تھی۔ میٹرک تک پڑھا تھا۔ شعر و ادب کا بھی ذوق تھا۔ پردہ ان کے یہاں کوئی نہیں کرتا تھا۔

جزئیات کا ذکر تو طوالت چاہتا ہے۔ قصہ کوتاہ یوں سمجھئے کہ میں نے نادرہ کے والد سرافراز حسین سے بھی معاملات کو سمجھا اور خواجہ فرہاد علی سے بھی متعدد ملاقاتیں کیں۔ ان کا لڑکا آجکل کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اختلاف کی نوعیت عجیب نکلی۔

خواجہ فرہاد علی کا خیال یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خانصاحب بریلوی سے بڑا شیخ طریقت اس صدی میں پیدا نہیں ہوا۔ وہی اس صدی کے مجدد ہیں۔ وہ علم ظاہری و باطنی دونوں میں یکتا تھے۔ ان کی ہمسری کم سے کم اس صدی میں کوئی نہیں کرسکتا۔ مگر سرفراز حسین کی رائے یہ تھی کہ والا حضرۃ گنبد قضا خانصاحب رکھیلوی رضی اللہ عنہ اگرچہ اعلیٰ حضرت بریلوی کے مرید تھے مگر ترقی کرکے ان سے بھی اونچے پہنچ گئے اور موجودہ صدی کے مجدد ان کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔

خواجہ فرہاد کو سب سے پہلا اختلاف تو یہی تھا کہ حضرت رکھیلوی اعلیٰ حضرت کے مرید تھے ہی نہیں۔ وہ جس وقت پیدا ہوئے اعلیٰ حضرت دنیا سے چل بسے۔ سرفراز حسین جواب یہ دیتے تھے کہ حضرت رکھیلوی نے حالتِ خواب میں اعلیٰ حضرت سے بیعت کی تھی۔ اس پر ان کے دور کے سات مشائخ عینی شاہد ہیں۔ ان ساتوں مشائخ کو ٹھیک اسی وقت وہی خواب آیا تھا جس وقت حضرت رکھیلوی خواب دیکھ رہے تھے۔

خیال و رائے کا یہ اختلاف مختلف مراحل سے گذرتا ہوا یہاں تک پہنچا کہ دونوں حضرات نے اپنے ممدوحین کے ملفوظات اور کرامتیں ایک دوسرے کے مقابلہ پر رکھیں اور کوشش کی کہ اس کا ممدوح دوسرے کے ممدوح سے برتر ثابت ہو جائے۔ مگر اختلاف کے خلیج بجائے کم ہونے کے وسیع ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ناشاد و نادرہ کا وہ رشتہ بھی معرضِ خطر میں پڑ گیا جو دس سال سے لگا ہوا تھا۔

میری انتہائی کوشش پر دونوں بزرگ ایک ایسی مجلس پر آمادہ ہو ہی گئے جس میں وہ اپنے اپنے دلائل پیش کرکے مجھ سے ایماندارانہ فیصلہ طلب کریں گے۔ میں نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ علوم طریقت میں میری نظر بہت گہری ہے۔ یہ یقین انہیں کبھی نہ آتا کہ اگر میں ان پر یہ نہ کھولتا کہ میں بو قلندر رحمۃ اللہ علیہ کا خلیفہ مجاز ہوں۔ بارہ برس عمل کی برجیاں ختم خواجگان کا اہتمام کر چکا ہوں اور درگاہ کھڑے بڑے کے شہرۂ آفاق عرس میری ہی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ ان حقائق نے انھیں خوش گمانی پر مجبور کیا اور نوچندی جمعرات کی شب میں وہ مجلس جم ہی گئی۔ دونوں بزرگ اپنے اپنے ساتھ کئی کئی حامیوں کو بھی لائے تھے۔

کارروائی شروع ہوئی۔ میں نے خواجہ فرہاد علی سے گذارش کی کہ ابتدا آپ فرمائیں۔ انھوں نے ملفوظات اعلیٰ حضرت بریلوی کا حصہ سوم نکال کر اس کے صفحہ ۲۵ پر یہ ملفوظ پڑھا۔

"سیدی عبدالوہاب اکابر اولیاء کرام میں سے ہیں سیدی احمد بدوی کے مزار پر بڑا میلہ ہوتا تھا اس مجمع میں چلے آتے تھے کہ کسی تاجر کی کنیز پر نظر پڑی فوراً نگاہ پھیرلی۔ خیر نگاہ تو آپ نے پھیرلی مگر وہ آپ کو پسند آئی۔ جب مزار شریف پر حاضر ہوئے تو ارشاد فرمایا وہ کنیز کیا تمہیں پسند ہے؟ عرض کی ہاں اپنے شیخ سے چھپانا نہ چاہیئے۔ ارشاد فرمایا اچھا وہ کنیز ہم نے تم کو ہبہ کی۔ اب آپ سکوت میں ہیں کہ وہ کنیز تو تاجر کی ہے اور حضور ہبہ فرماتے ہیں۔ معاً وہ تاجر حاضر ہوا اور اس نے وہ کنیز مزار اقدس کی نذر کی۔ خادم کو ارشاد ہوا اس نے آپ کی نذر کردی ارشاد فرمایا عبدالوہاب اب دیر کا ہے کی ہے فلاں حجرے میں لے جاؤ اور اپنی حاجت پوری کرو۔"

اب خواجہ فرہاد نے تحسین طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے پوچھا — اس روایت سے اعلیٰ حضرت بریلوی کی برتری پر کیا استدلال کرتے ہیں؟"

"ہمارا دعویٰ ہے کہ کسی اور شیخ وقت کو اس ایمان افروز واقعہ

کاکشف نہیں ہوا تنہا اعلیٰ حضرت بریلوی اس صدی میں اس سے پردہ اٹھا گئے ہیں۔ اس طرح کے کراماتی واقعات صدی کے مجدد ہی پر منکشف ہو سکتے ہیں غیر مجدد پر نہیں ۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے سرفراز حسین کی طرف دیکھا۔ وہ جواب کے لئے تیار ہی بیٹھے تھے۔ ملفوظات والاحضرت رکھیلوی کے ملفوظات کی جلد چہارم اٹھائی اور اوراق کھولتے ہوئے بولے

"والاحضرت رکھیلوی نے بھی ایسے ہی ایک کشف کا اندراج کیا ہے سنئے ۔" یہ کہہ کر انھوں نے صفحہ ۲۳ سے ذیل کی سطریں باآواز بلند پڑھیں۔

"سلطان الاولیار شاہ زمانی ایک دن شاہِ وقت کے محلات کی طرف سے گذر رہے تھے کہ اچانک نظر بام کی طرف گئی اور وہاں شاہ کی نئی زوجہ پر نظر پڑی زوجہ ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک تھی۔ نیت ڈانواڈول ہوگئی۔ اپنے شیخ کے مزارِ مبارک پر پہنچکر مراقبہ کیا۔ شیخ نے ٹوکا کہ آج تمہاری توجہ کہیں اور پا رہا ہوں۔ عرض کی کہ آپ پر سب روشن ہے۔ وہ اللہ کی بندی حسین ہی اسقدر تھی کہ قلب کے آئینے میں منقش ہو کر رہ گئی۔ خیال اس کی طرف سے ہٹتا ہی نہیں۔ فرمایا یوں نہیں۔ وہ شاہ کو بہت مرغوب ہے۔ تم اسے حاصل بھی کر لو تو خرچ نہیں اٹھا سکو گے۔ عرض کی بجا فرمایا میں فقیر وہ ملکہ اب جیسا حکم ہو۔ فرمایا جاؤ اس کی بہن اس سے بھی خوبصورت ہے۔ وہ تمہیں خواجہ مرجان کے مزار پر اکیلی ملے گی۔ نکاح کر لینا۔ ایک مہینہ کے بعد طلاق دے سکتے ہو۔ عرض کی۔ دل میں تو ملکہ بس گئی ہے اور کو کیا کروں گا۔ فرمایا ـــ اسے بھی ملکہ ہی کے ہم شکل پاؤ گے۔ شاہ زمانی تین دن کی منزل کر کے خواجہ مرجان کے مزار پر پہنچے۔ وہاں ملکہ کی بہن ٹھیک ملکہ کی شکل میں ملگئی۔ نکاح کیلئے کہا تو اس نے ہیرے سینڈل نکالکر سر پر جڑ دیا۔ شاہ بولے اور مارلو۔ بندہ تو حضرت شیخ کے حکم پر آیا ہے۔ وہ دوسرا سینڈل رسید کرتے ہوئے بولی یہ تمہارے شیخ کا حصہ ہے۔ فرمایا یہ بھی وصول پایا۔ اب نکاح ہو جائے۔ وہ تیسرے وار پر تیار تھی کہ یکایک قدموں میں گر گئی، شاہ زمانی نے صاف دیکھا حضرت شیخ سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ فوراً ملکہ کی بہن کو اٹھا کر سینے سے لگایا۔ خطا معاف کی۔ گواہ اس وقت کوئی تھا نہیں۔ سوچ میں پڑ گئے کہ بلا گواہ نکاح کیونکر ہو۔ اسی وقت حضرت شیخ کے پاس ایک اور صاحب کھڑے نظر آئے۔ غور سے دیکھا تو پہچان لیا خواجہ مرجان ہیں۔ حضرت شیخ نے فرمایا سو دو گواہ بھی ہوگئے۔ سو دینار سرخ پر نکاح کر لو دیناروں کی تھیلی بھی شیخ نے آگے بڑھائی۔ بس ایک مہینہ کی شرط پر نکاح ہوگیا۔ مہینے بعد طلاق ہوئی تو عورت نے ایک شامی تاجر سے نکاح کر لیا ان کے ارتباط سے سو د سالوں میں بارہ بچے پیدا ہوئے جو سب اپنے اپنے وقت کے قطب بنے۔ یہ ظاہراً اسی شامی کی اولاد کہلاتے ہیں لیکن حقیقۃً یہ شاہ زمانی کی ذریات صالحہ میں سے تھے۔ شاہ صاحب کی قوی روحانیت کے تحت ایک ہی ماہ میں یہ سب بچے ان کے صُلب سے منتقل ہو کر عورت مذکور کے بطن میں جم ٹھکر گئے تھے۔ سال بسال رحم مادر میں منتقل ہوتے گئے ۔"

سرفراز حسین نے سلسلۂ خواندگی منقطع کر کے فاتحانہ انداز میں پہلے خواجہ فرہاد کی طرف پھر میری طرف دیکھا اور کہنے لگے۔

"اندازہ کیا جائے۔ والاحضرۃ رکھیلوی رضی اللہ عنہ کی نگاہِ کشف نے کہاں سے کہاں تک دیکھ لیا کسی اولیار کے صُلب سے ایک ہی مہینے میں بارہ بچے منتقل ہو جائیں یہ اسرار غیبی میں سے ہے سوائے مجدد وقت کے کسی کی مجال ہے جو ایسے اسرار تک رسائی کر سکے ۔"

میری کھوپڑی میں بلبلے اٹھ رہے تھے جیسے سڑے ہوئے پانی میں ہلکا ہلکا کھدبدا پڑ رہا ہو۔ بجائے اسکے کہ دونوں بزرگوں کے

استدلالات کا وزن میزان عقل میں تولتا خیال ان کے روحانی اور جنسی گوشوں کی طرف بھٹک گیا۔

مجھے خاموش پا کر چہ میگوئیاں بلند ہوئیں۔ میں نے لاحول پڑھ کر سر کو جھٹکا دیا۔ واہی خیالات دور جا پڑے۔

"محترم بزرگو! یہ دونوں ملفوظات عالیہ سر دست فکر و غور کے طالب ہیں۔ آپ ایک ایک نمونہ اور پیش فرمائیں۔"

خواجہ فرہاد نے ملفوظات کی دوسری جلد اٹھائی پھر ورق الٹ کر صفحہ ۲۶۴ سے اعلیٰ حضرت بریلوی کا یہ ملفوظ تلاوت کیا۔

"سیدی احمد سلجاسی کی دو بیویاں تھیں ان کے مرشد سید عبد العزیز دباغ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رات تم نے ایک بیوی کے جاگتے دوسری بیوی سے ہم بستری کی۔ یہ نہیں چاہئے تھا۔ فرمایا حضور وہ اس وقت سوتی تھی۔ فرمایا سوتی نہ تھی سوتے میں جان ڈال لی تھی۔ عرض کیا حضور کو کس طرح علم ہوا فرمایا جہاں وہ سو رہی تھی کوئی اور پلنگ وہاں پر تھا عرض کیا ہاں ایک پلنگ خالی تھا فرمایا اسی پر میں تھا۔"

اب پھر داد طلب نظروں سے خواجہ فرہاد نے میری جانب دیکھا "آپ اسکے جواب میں کیا لاتے ہیں۔" میں نے سرفراز حسین سے پوچھا۔ انہوں نے ملفوظات دالاحضرت دہلوی کی پہلی جلد اٹھائی اور اوراق پلٹ کر صفحہ ۱۰۳ کھولا۔ وہاں سے ذیل کا ملفوظ عطا کیا

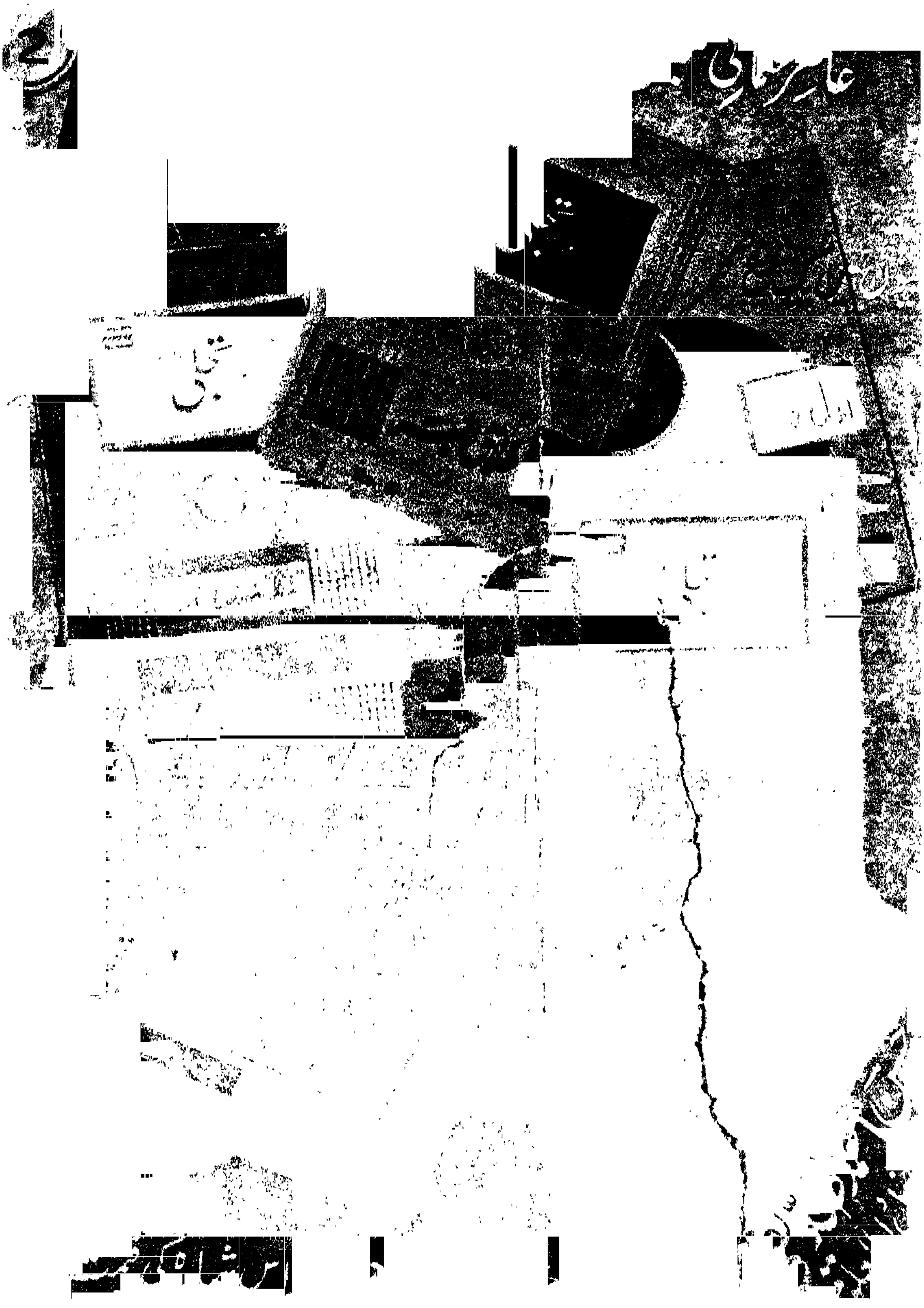
"سیدی زمزم بغدادی کی چار بیویاں تھیں۔ ان کے مرشد شیخ نذر اللہ شفاف رضی اللہ عنہ نے فرمایا رات تم چار بیویوں سے ملے مگر تمہارا خیال کسی پانچویں میں الجھا ہوا تھا۔ عرض کیا۔ حق فرماتے ہیں۔ کل شام کمہاروں کی بستی سے گذر رہا تھا کہ ایک لڑکی نظر آئی۔ دل مائل ہو گیا۔ رات بھر اس کا تصور پریشان کرتا رہا۔ فرمایا بڑی سے چھوٹی کو طلاق دیدو۔ کمہار زادی سے نکاح کر لو عرض کمہار زادی کا عقد ایک کمہار زادے سے ہونے والا ہے فرمایا پھر کیا چاہتے ہو۔ عرض کیا دل سے مجبور ہوں۔ فرمایا لو کمہار زادہ مر گیا۔ ابھی ہم اس کی نماز جنازہ پڑھنے جائیں گے لڑکی کے باپ کو اپنا پیغام دو۔ اب اسے نکاح میں عذر نہ ہوگا۔ سید صاحب نے اگلے روز نکاح کیا لڑکی بے شک حور شمائل تھی مگر رات میں کھلا کہ منہ سے بڑی سخت بدبو آتی ہے۔ سید صاحب پہلے ہی بھبکا رے میں بیہوش ہونے سے بچے۔ اب ارادہ کیا طلاق دے کر نکل جائیں اسی وقت مرشد کی آواز آئی خبردار! کیا دیکھتے ہیں کمرے کے گوشے میں وہ سفید براق لباس زیب تن کئے کھڑے ہیں ہاتھ بڑھا کر انہوں نے سید صاحب کو ایک پڑیا دی جس میں سفوف تھا۔ فرمایا اس سے بدبو ہمیشہ کے لئے دور ہو جائیگی۔ لڑکی مارے ڈر کے بیہوش ہو گئی تھی۔ عرض کیا کیسے کھلاؤں فرمایا ناک میں چڑھا دو۔ لڑکی ہوش میں آئی تو بدبو کے بجائے اس کے منہ سے خوشبو مثل عطر شمامۃ العنبر فوارے کی طرح چھوٹ رہی تھی۔ سید صاحب کو اتنی چھینکیں آئیں اتنی چھینکیں آئیں کہ گردے تلی میں گھس گئے پھیپھڑے حلق میں چڑھ گئے بھیجا ناک سے بہہ گیا چند لحظ میں دم باہر۔ لاش ٹھنڈا۔ عروسہ دھاڑ مار کر روئی۔ مرشد نے فرمایا غم مت کر۔ ابھی ہم اسکو زندہ مثل جوان رعنا کئے دیتے ہیں۔۔۔۔"

ملفوظ پورا ہونے سے پہلے ہی میں نے کھنکار کر عرض کیا۔

"گستاخی معاف اس طرح کے ملفوظات سے دیگر اولیاء اللہ کے بلند مقامات تو منکشف ہوتے ہیں مگر خود صاحب ملفوظ کے درجات کا پتہ چلانا ازبس دشوار ہے۔ کیا آپ بزرگوں کے پاس اعلیٰ حضرت اور دالاحضرت کی اپنی اپنی کرامات وغیرہ کا کچھ ذخیرہ بھی ہے؟"

"ہے کیوں نہیں۔" دونوں فریقوں نے فخر سے نتھنے پھلا کر کہا پھر خواجہ فرہاد نے ملفوظات کی جلد ہاتھ سے رکھ ایک چھپا ہوا اشتہار نکالا جس میں اعلیٰ حضرت بریلوی کے مریدوں نے بعد مردن ان کی کچھ کرامتیں نمبر شمار دیکر چھاپی تھیں ——— باقی

رجسٹرڈ نمبر ایم ایچ این ایل-۱۳۰-این پی-۱۷۲-۹۶ء


شبلی

توجہ طلب

ہم نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ دارالعلوم دیوبند اینٹ اور پتھروں کا نام نہیں بلکہ یہ اس مقدس روایت کا نام ہے جو ماضی بعید سے سلسلہ بہ سلسلہ اور سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے اگر ہمارے اکابرین کا یہ فرمان مبنی بر حقیقت ہے تو پھر ہم ببانگ دہل یہ کہیں گے کہ موجودہ زمانہ میں وہ ایک خاص روایت جس کو بنیاد بنا کر دارالعلوم کی تاسیس کی گئی تھی صرف حضرت قبلہ مہتمم صاحب کے اندر مقید ہے۔ وہ بزرگی، وہ انکساری و تقدس جو مولانا قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی شکلوں میں ڈھل کر دنیا کے سامنے آیا تھا۔ اس کا پرتو قبلہ مہتمم صاحب کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ حضرت قبلہ مہتمم صاحب کا وجود مسعود دارالعلوم دیوبند کے لیے بالکل وہی حیثیت رکھتا ہے جو جسم کے لیے روح کی حیثیت ہوتی ہے۔ کسی انسان کی روح نکل جانے سے اس کے جسم پر فنا آئے یا نہ آئے لیکن اس کی حقیقت فنا کے گھاٹ اتر ہی جاتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کو کھینچ تان کر آئندہ بھی باقی رکھا جا سکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے بعض بڑی شخصیتوں کے مجسمے مسالے لگا کر محفوظ کر لیے جاتے ہیں لیکن ان کو محفوظ کرنے کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ دیکھنے والی آنکھیں اس بات کا کچھ نہ کچھ اندازہ کر لیں کہ یہ شخصیت دور رفتہ میں بڑی اہم اور پرکشش رہی ہوگی۔

ہم بقا کی دعا کریں یا نہ کریں لیکن دارالعلوم دیوبند کا جسم ہمیشہ باقی ہی رہے گا اور اس کے باقی رہنے کا اتنا فائدہ ضرور ہی ہوگا کہ دیکھنے والے یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ کتنے عظیم ہوں گے وہ لوگ جنہوں نے اتنی بڑی یونیورسٹی قائم کی۔ اور کتنا فائدہ پہونچا ہوگا دنیا کو اس یونیورسٹی سے جو لتنے بڑے جسم کے ساتھ آج بھی موجود ہے جبکہ وہ بنیادیں کھوکھلی پڑ چکی ہیں جن میں گارے اور روڑوں کی جگہ خون قاسمی اور جذبۂ مدنی زیب زیں تھا۔

لیکن قبلہ مہتمم صاحب کے بعد وہ دوسرے تمام فائدے تو تقریباً مفقود ہو چکے ہوں گے جنکو حاصل کرنے کی خاطر بزرگانِ دین نے دارالعلوم کی بنیادوں میں اپنا لہو کھپایا تھا۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ قبلہ مہتمم صاحب دارالعلوم کا وقار ہیں، اس کی روح رواں ہیں لیکن اس کے باوجود بھی قبلہ موصوف پر الزامات لگانے — انھیں ان کے مقام سے گراتے اور انھیں ناقابل احترام باور کرانے کا ایک ذلیل سلسلہ دارالعلوم کے بعض گوشوں میں کل کی طرح آج بھی جاری ہے۔ کتنے خطرناک ہوتے ہیں وہ مکین جو اپنی بعض ناروا حرکات کی وجہ سے اپنے ہی مکان کو بدنام کرنے اور اس کی بنیادیں کمزور کرنے کی خدمت انجام دینے میں مصروف ہوں۔

کتنی ہی بار قبلہ مہتمم صاحب پر تہمتیں لگائی گئیں، انکی عظمت پر خاک اڑانے کی کوشش کی گئی، ان کے وقار کو مجروح کرنے کے لیے ہر اوچھا ہتھیار استعمال کیا گیا لیکن ہوا کچھ بھی نہیں اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے کہ جو عزت اور بڑائی خدا کی عطا کردہ ہو اس کی حفاظت بھی خدا ہی کرتا ہے وہی محافظ ہے ان عظمتوں کا جو عظمتیں اس کے خزانۂ خاص سے ملتی ہیں۔ اور پھر تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ آسمان پر تھوکنے والے اپنے ہی چہروں پہ ذلتوں کی سیاہی ملنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور آسمان کی رفعت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے۔ اور وہ ہمیشہ بلند و برتر ہی رہتا ہے۔

رجب کے آخری ہفتہ میں مجلس شوریٰ کے کچھ نئے فیصلے سامنے آئے ان فیصلوں کو بھی بعض کج فکروں نے قبلہ مہتمم صاحب کے دماغ کی اپج سمجھ کر دیوار پر دے مارنے کی دھمکی دی — لیکن ہر عقلمند آدمی جانتا ہے کہ کسی گھر کے بڑے اور نظام چلانے والے لوگوں کا کسی ایک فیصلہ پر متفق ہو جانا ہی بس سب کچھ ہے۔ ان کے کسی نتیجہ پر پہنچنے اور کسی فیصلے پر متفق ہو جانے کے بعد اسی گھر کے چند بچوں کا واویلا مچانا اور اعتراض و بغاوت کے جھنڈے بلند کرنا قابل التفات بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ بچوں کی دھمکیوں سے سراسیمہ ہو کر ان فیصلوں کو مسترد کرنے کی سوچی جائے جو قرین فہم اور قرین انصاف ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

روشِ دہر کا ہر نقش پکاریگا مجھے
یہ نہ سمجھو کہ مجھی تک مرا افسانہ ہے

ماہنامہ تجلّی کا
عامر عثمانی نمبر

اس شمارہ کی قیمت	سالانہ چندہ	فی شمارہ
۶ روپے	۲۴ روپے	پونے تین روپے

(محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند)

کیا اور کہاں

(بقیہ ان کی ۲۷ سالہ عرق ریزیاں) از صفحہ ۲۹۸

مندرجہ ذیل کتابوں پر تبصرہ کیا

(الف) اسلام اور جدید معاشی نظریات، اسلامی دعوت اور خواتین، آسان عربی، امریکہ کے مسلمان، اعتراف، انکشاف، آپ تقریر کیسے کریں؟، اندیشوں کے گرفتار، اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ، اسلامی مکتب، اسلامی قانون میں مرتد کی سزا، اخلاقی کہانیاں، اقبال کی کہانی، اساس دین کی تعبیر، اسلام کے معاشی نظریے، امن کس طرح قائم ہو سکتا ہے، اشتراکیت، فریب اور اسلام، اسلامی کیلنڈر، اسلامی نظام معیشت، اہم ہدایتیں، اسلام کا نظام مسجد، آئینۂ تاریخ، اساس عزم: مولانا الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت، انوار حدیث، اشتراکی چین اور مذہب، انمیس خواتین، اسلام کی شکشا، مسئلہ انتخاب، اردو انسائیکلوپیڈیا، اذکار سہیل، اصول فارسی، ایصال ثواب، امام ابن ماجہ اور علم حدیث، امین ، بستان المحدثین، اسباب بغاوت ہند، اسلام کے سائے میں، ماہنامہ اسلامی دنیا (دیوبند) اسلام ایک عظیم جدوجہد، امام ابن تیمیہؒ اسلامی بیت المال، الادب المفرد، اسلامی پیغام کے اولین علمبردار، اسلام اور اجتماعیت، مسئلۂ اجتہاد پر تحقیقی نظر، اقلیت و اکثریت کے مسائل قرآن و حدیث کی روشنی میں، انوار الباری، اسلامی قانون کی تدوین، اصول تفسیر، ازبیلہ میں اسلام، اجماع اور باب اجتہاد، آیات بینات، آدھی کتاب، اوتار اور عقیدۂ رسالت، الادب المفرد، اسلامی پیغام کے اولین علمبردار، احیاء الاسلام، اہتمام جہاد، اوریانٹلسی بہتا رہا، انوار الاسلام کی خصوصی اشاعت، ادیچلادوکا نیں، انتقاد صحیح، اشک تبسم، ایک ہندوستانی صحابی، اہل بیت رسولؐ، انسان اور کائنات، اسلام حق کی برکات، اسلام، سوشلزم اور اسلامی سوشلزم، آداب زندگی، ماہنامہ اسوہ کراچی، ارکان اربعہ، اذان سحر۔

(ب) بچوں کا گھر، البشریٰ، بھارت کی نئی تعمیر اور ہم، بہارستان وفا کے ۱۲۵ پھول، بھارت میں اسلامی نظام کی دعوت اور اس کی کامیابی کے امکانات، بچوں کے ترانے، برقی نامہ، ماہنامہ بتول (لاہور) بخاری مترجم، پندرہ روزہ برادری (لکھنؤ) بزرگان پانی پت، بائبل سے قرآن تک، بادۂ عرفاں، بریلوی فتنہ کا نیا روپ؟ بات کیسے کی جائے؟ بیٹے سے خطاب۔

(پ) روزنامہ پاسبان (بنگلور) پانداں والی خالہ، پاسبان حمت، پرویز کے بارے میں علماء کا متفق فیصلہ پکار، پتھر کے دیوتا، پہلا پتھر۔

(ت) تاریخ دیوبند، تفریر المنطق، تذکرۂ سلف دق، ماہنامہ تذکرہ کراچی، تمرین النحو، تسہیل التنزیل، تازیانے، تبلیغی دورے، ترجمہ مختصر شعب الایمان، تین کتابیں، تفسیر بیان القرآن، تندرستی کی کنجی، ماہنامہ تشریح (حیدرآباد) تحریک مجاہدین کا انقلابی پہلو، تعمیر علی گڑھ، تصویر التبلیغ تاریخ محمودیت، تلبیس ابلیس، تواریخ عجیب، تحفہ تفسیر بیان القرآن، تاریخ دعوت و عزیمت، تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ، تحریک کی خصوصی اشاعت، تحقیق مزید، تجدید جنوں، تجارتی سود، تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے، تقریب القرآن تفسیر ماجدی، ترجمان السنہ، ترجمان الحق، تعلیمات نبوی، تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں، ترجمان (دہلی) کا مسلم پرسنل لا نمبر۔

(ث) ثواب۔

(ج) ہفتہ وار جمہور (بنگلور) جاپان، آسان لغت القرآن، اخبار جوہر (رامپور) جنت قرآن و عقل کی روشنی میں، جمعیۃ العلماء پر ایک تاریخی تبصرہ۔

(چ) چراغ راہ (کراچی) کا سوشلزم نمبر، چند سورتوں کی تفسیر، چراغ راہ (کراچی) کا خاص نمبر، چالیس عتیں جو کھٹ کے اندر، چار علمی مقالات، چاند کا سلام، چاند کی تسخیر اور سائنس کی ترقیات، چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں

(ح) الحسنات کا حدیث نمبر، حدیث اور قرآن ماہنامہ الحرم (میرٹھ) حقیقت عیسائیت، حیات سرورکائنات

(نوٹ) تجلی کی ڈاک کے کچھ عنوانات کتابت ہونے سے رہ گئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تجلی کا ابتدائی زندگی میں تجلی کی ڈاک کے تحت جو سوالات شائع کیے جاتے تھے ان پر نمبر لگایا جاتا تھا انکا ہم نے ذکر نہیں کیا انکی تعداد ایک ہزار سے کچھ اوپر ہے۔ بڑے بڑے مراسلوں کا بھی ہم نے تذکرہ نہیں کیا جو کہ اب تجلی کی ڈاک سے الگ چھپتے رہے ہیں

ج کے بعد، الحسنات رامپور کا دعوت نمبر، حیات سرور کائنات، الحرم میرٹھ کا مدنی نمبر، حیات وحید الزماں — حقیقت کی تلاش، حرم کا امام اہل سنت نمبر، حکایات جنوں، حدیث دوست، حدیث اقبال، ماہنامہ حجاب رامپور، حدیث دفاع، الحرف الآخر۔

(خ) خدیجۃ الکبریٰ، خدائی دعدہ، خصائل نبوی، خطبات یا رہنمائے دارین، خصائل مسلمین، خاتون مشرق (کراچی کا رسول نمبر)، خوشحالی کی تلاش، خلائی دوڑ۔

(د) ماہنامہ دعوت الحق (کراچی) دین کی باتیں، دارالعلوم ایک نظر میں، دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیات، دعوۃ الفطر، داستان ادب، دکنی ہندی اور اردو، ماہنامہ دانش (رامپور) دیوان حافظ، دیوان صبر، ماہنامہ دوام، دارالعلوم اور دارالحرب دین فطرت کا چیلنج۔

(ذ) ماہنامہ ذکریٰ (رامپور)

(ر) رہنمائے فطرت، رموز خطابت، روحانی نشرگاہ رہبر عالم، رحمۃ اللعالمین، رکعات تراویح، روح تصوف، رسالہ حیات نو (بنارس) رہبر کامل، روح القرآن، رکعات تراویح رہبر حجاج، الرسالۃ المستطرفہ، رشید ابن رشید، رد بدعت رضوان کا ماں نمبر، رگ سنگ کا سیرت نمبر ۲؎ ۱۹۷۳ء رگ سنگ کا سیرت نمبر ۳؎ ۱۹۷۴ء، رویت ہلال کا مسئلہ، رامپور میں یوم رضا۔

(ز) الزبیرؓ، زجاجۃ المصابیح، الزمراء، زاد الطالبین زمزمہ، زبدۃ المناسک، زاد راحلہ، زلزلہ۔

(س) ماہنامہ ساحل (کشن گنج)، سنت رسولؐ، سہل تجوید، ماہنامہ سوداگر (کراچی) کا خاص نمبر، سب کے رسولؐ، سفر حجاز، سالنامہ اردو ڈائجسٹ، سرچشمۂ قرآن، سیرت عثمان ذوالنورین، سیاسی نظریے، سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ، سوانح حضرت عبدالقادر رائے پوری، سیکولرزم جمہوریت اور اسلام، سیہ بر سفید سفینۂ زرگل۔

(ش) ماہنامہ شاعر بمبئی، شرح مأۃ عامل، شعلۂ خیال، شعر و حکمت، شاہراہ ترقی، شہادت ذی النورین رضؓ، شیطان جاگ اٹھا، شبستان کا غالب نمبر، شمس الخطبات، شعر و شعور، شیخ الہندؒ، شعور حیات۔

(ص) صحیفہ اہل حدیث کا حدیث نمبر، صحیح لغت القرآن صحیفہ ہمام ابن منبہ، صدیق اکبرؓ، ماہنامہ صبح نو پٹنہ، صراط مستقیم، صحائف معارف، صحرا میں اذان، صبح فاراں۔

(ع) عالمی امن، علی گڑھ تاریخ و سیاست کی روشنی میں، عیسائی مشنری سے ملاقات، علماء اور اسلام، علماء دیوبند اور اردو ادب، العقیدۃ النبیہ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، عیسائی مشنری سے ملاقات، عقائد وہابیہ اور علمائے دیوبند، علامہ اقبال اور تصوف، عبداللہ ابن مسعودؓ اور ان کی فقہ، عقائد اسلام یعنی ایمان نامہ، عالم عرب کا المیہ۔

(ف) الفاروق کا سیرت نمبر، فتاویٰ رحیمیہ، فضائل درود ابراہیمی، فریب تمدن، فیض الرحمٰن، فلسفۂ ملکیت، فیصلہ کن مناظرہ، فتنۂ انکار حدیث کا پس منظر، فلسفۂ نماز، مولانا فراہی کی پانچ کتابیں، فقہ الحدیث، فضائل رمضان، فتاویٰ دارالعلوم، فتاویٰ ستاریہ، فیوض الحرمین، فسادات کا علاج، فن تعلیم و تربیت، فوائد جامعہ، فخر کونین، فاتح مصر، فلسفۂ دعا،

(ق) قانون وراثت، قوموں کا عروج و زوال — قاموس القرآن، قادیانی مذہب کا مقدمہ، قوم کا عروج و زوال اخبار قومی زبان (کراچی) القاموس الجدید، قول طیب، قاضی بدر الدولہ، قرآن کا تعارف، قافلۂ سخت جان، قرآن پاک اور آسمانی پروازیں، قرابادین ہمدرد، قرآنی تعلیمات قرآن پر ظلم، قانون شریعت کے مصادر۔

(ک) کاروان حجاز، کتاب التوحید، کلمات اکابر کتاب الطہارۃ، کتاب الرسالۃ، کینسر وارڈ، کم و کیف۔

(گ) گلبانگ حرم، گلدستہ، گلنور۔

(ل) لغات القرآن، لمحات، ماہنامہ لالہ زار (لکھنؤ)، لہو رنگ، لاہور کا جو ذکر کیا۔

(م) مسلم ممالک میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش، مفہوم القرآن، میری آپ بیتی، ماہنامہ منادی

(نئی دہلی) کا خواجہ نمبر، مروجہ بدعات، حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی، مطالب قرآن، مقبول ربانی کی مقبول نماز، المفتاح، مودودی شعرپارے، مسلمانوں کا مقصد حیات، مدرسہ ابتدائی کی کہانی، ملا قائم، مخزن الولایت، ماہنامہ فون، ثمار، ماہنامہ مریخ پٹنہ، سیدنا معاویہؓ، مسلم پرسنل لا اور اسلام کا عائلی نظام، مذہب اور سائنس، میں گواہی دیتا ہوں، مکتوبات علیؓ، مکتوبات علمیہ، مسلم پرسنل لا میں ترمیم، مقالات امینی، محفوظات، مسلمانان ہند کا لائحہ عمل، المنطق، مدنی تیسیر القرآن، ماہنامہ معیار (لکھنؤ) منتخب نظمیں، معارف الحدیث، سراپائے رسول، مکاتیب سلیمان، مشکوٰۃ الصلوٰۃ، معلم الانشاء، ماہنامہ میزان حیدرآباد، ماؤزی تنگ کے دیس میں، مسلمانوں کا برتاؤ غیر مسلموں کے ساتھ، مہکتی کلیاں، معراج سخن، معلم نماز، سہ روزہ منہاج لاہور،

(ن) دوماہی نئی نسلیں (لکھنؤ) پندرہ روزہ نجات حیدرآباد، نماز کے فضائل، نئے کردار، نور الدرایہ من عین الہدایہ نقوش راہ، نیا طبقہ، نورانی جہیز، نفس مناظرہ، نئے مشاہدات اور محنت، شق القمر، نغمۂ شعور، نشر کا حسن، نشاط منزل، نقوش اقبال، نجات کے بعد، نہایۃ التحقیق۔

(و) وحدۃ الوجود والشہود، وہ جنھیں کوئی نہیں جانتا۔

(ھ) ہادیٔ اعظم، ہماری کتاب، ماہنامہ ہماری دنیا، (لاہور) ہندوستانی سوشلزم، پندرہ روزہ ہمدرد، ہمارا دین حق، ہمدرد عطار، ہندوستان کی منزل، سوشلزم یا اسلام ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ، ہدایت القرآن، ہمارے عائلی مسائل، ہندوستان اب عربوں کی نگاہ میں — ہفت رنگ، ہیرے کا جگر۔

(ی) یاد کی خوشبو۔

کچھ اور مختلف کتابیں

تذکرۃ الاولیاء، آزادی کی طرف، سالنامہ بتول، لغات القرآن، متاع کلیم، حیات اقبال، ہماری شہنشاہی مومنات، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ذہنی تربیت، روزنامہ تسنیم کا قرآن نمبر، ہفت روزہ المنبر لائل پور، انوار مصابیح، تفسیر ابن کثیر، جمال کربلا، نور المصابیح، زجاجۃ المصابیح، فتاویٰ نبوی، غذائی علاج، حیات مجدد، امثال آصف الحکیم، سورۂ کوثر، سورۂ اخلاص، تلاش راہ حق، تاریخ قرآن، امامت عظمیٰ، چہل حدیث، سلوک، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تقویۃ الایمان، شہادت امام حسین، کتاب الاخلاق، احکام سلطانیہ، خلافت معاویہ ویزید۔

۲۷ سالہ مدت صحافت میں مندرجہ ذیل خصوصی مضامین لکھے

وہ چین جس کے تم گن گاتے ہو۔
تقلید کا مسئلہ
آواز دو انصاف کو انصاف کہاں ہے۔
دعا بعد الصلوٰۃ۔
بسم اللہ کی علمی وفقہی حیثیت۔
تقتلک الفئۃ الباغیہ۔
قرض کی زکوٰۃ
شذرے۔
شرفاء کی زبان۔
ایک کہانی ایک حقیقت
یہ علم ودانش کے نقیب۔
مولانا اصلاحی کیا فرماتے ہیں۔
مولانا دریابادی کیا فرماتے ہیں۔
جماعت اسلامی اور دارالعلوم دیوبند۔
کوثر نیازی اور جماعت اسلامی
فتنے کی کہانی۔
حقائق جنھیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔
پرویزیات۔

حضرت عثمان غنی رضؓ
جوڑے کی لعنت۔
ابوالاعلیٰ نام پر اعتراض۔
جماعت اسلامی اور صوفی نذیر احمد کشمیری۔
امارت و صحابیت۔
اگرچہ پیر ہیں آدم جواں ہیں لات و منات۔
اسلام پر ایک تازہ حملہ۔
عورت کی امارت۔
قیام میلاد
سایۂ رسول
نقد و احتساب
گاندھی اور جماعت اسلامی۔
مدیر معارف اور جماعت اسلامی۔
خود رو یا خود رو
حضرت مہتمم صاحب کے کچھ ارشادات۔
کچھ نظریۂ ارتقاء کے بارے میں۔
جواب تبصرہ پر ایک نظر۔
شطرنج کی بحث۔
دعا میں وسیلہ۔
تفہیم القرآن پر چند اعتراضات۔
مسلم پرسنل لاء
اجتہاد و بدعت۔
عیدگاہ میں عورتوں کی نماز کا مسئلہ۔
مسند امام اعظمؒ
انبیاء صحابہ بنیادی عقائد کی روشنی میں۔
تمام علماء کی خصوصی توجہ کے لیے۔
جماعت اسلامی کا کل ہند اجتماع۔
بحث و نظر۔ کیا سرکاری سود جائز ہے۔
رضاعت کا مسئلہ۔
معترضین کیا فرماتے ہیں۔
تین طلاقوں کے بارے میں رسول اللہؐ اور صحابہؓ کے نمونے۔

قادیانیت کے جیب و گریباں وغیرہ۔

علمی اور قلمی جد و جہد کے ۲۷ سالوں میں مختلف احادیث کی تشریح مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کی

سلام۔
مصافحہ و معانقہ۔
نسل و نسب کا گھمنڈ۔
قوم پرستی۔
صلہ رحمی۔
والدین کا مرتبہ۔
تین پسندیدہ اور تین ناپسندیدہ کام۔
ہمسائے کے حقوق۔
حسن اخلاق
باہمی محبت و اخوت
اپنے بھائیوں کی مدد کرو۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں۔
رحم و رحمت۔
برائیوں کو مٹاؤ اور بھلائیوں کو پھیلاؤ وغیرہ۔

علاوہ ازیں تفہیم البخاری اور شرح مسلم عنوانات کے تحت

بعض ایسی احادیث کی توضیح کی جن کا متن اپنی نوعیت اور درد و وسعت کے اعتبار سے انتہائی مشکل تھا۔ ان خدمات کے علاوہ بھی ان کی بعض قلمی خدمات ایسی ہیں جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یقین ہے کہ مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ان عرق ریزیوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے انھوں نے امت مسلمہ کو بہت کچھ دیا ہے۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔

(آمین)

⁂ ⁂ ⁂

مولانا عامر عثمانیؒ کی موت جادو سے واقع ہوئی؟

ایک حیرت انگیز مضمون ـــــ اگلے شمارے میں
توجّہ طلب عنوان کے تحت ملاحظہ فرمائیے

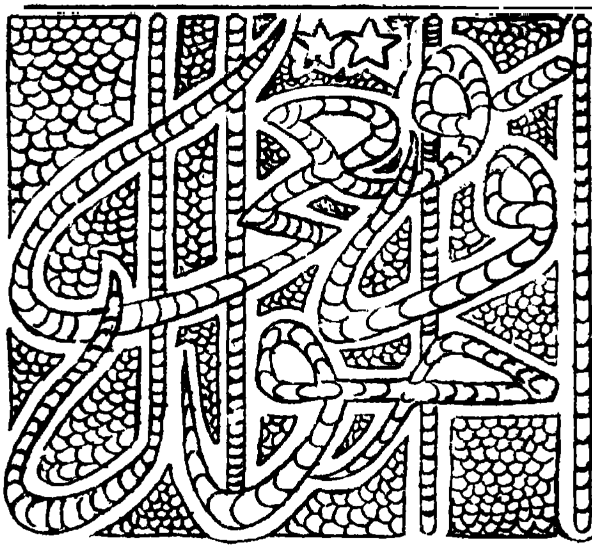
سرا

مضمون میں کوئی بات ایسی بیان نہیں کی جائے گی ـــ جو
ناقابلِ یقین ہو

اور

جسے خلافِ حقیقت کہا جا سکے

ہماری گذارش ہے عامر عثمانی نمبر کی تیسری اور آخری قسط ضرور پڑھیے گا



حسن احمد صدیقی

ماہانہ پرچوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ پیش آنے والے حالات پر فوری تبصرہ کرسکیں۔ پھر تجلی جیسے ماہنامے جو روز مرہ کی پریشانیوں اور ناگہانی افتادوں کی وجہ سے تاخیر در تاخیر سے شائع ہونے کے عادی ہو چکے ہوں ان کے لیے قطعاً یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ پیش آنے والی حقیقتوں پر فوری تبصرہ کرکے بروقت اور برمحل بات کہنے کی سعادت سے بہرہ ور ہو سکیں۔

ایسے ماہناموں میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بے محل بھی ہوتا ہے اور بعد از وقت بھی۔ اور بعد از وقت منظر عام پر آنے والی باتیں نہ مفید ہوتی ہیں نہ متاثر کن اس لیے عقل و فہم کا تقاضا تو یہی ہوتا ہے کہ وقت نکل جانے کے بعد کسی موضوع پر خامہ فرسائی کرنے سے احتراز کیا جائے۔

تاہم زندگی میں بعض واقعات اور بعض حادثات ایسے بھی پیش آجاتے ہیں جن پر خامہ فرسائی کیے بغیر نہ دل کی بھڑاس نکلتی ہے اور نہ ہی روح کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

کسی موضوع خاص پر بعد از وقت الفاظ پاشی کرنا کوئی معقول طرز عمل نہ سہی لیکن اتنا غیر مناسب بھی نہیں ہے کہ اسے غلطی یا حماقت سے تعبیر کیا جاسکے۔

جون کا مہینہ صحافت کو ایک نئے غم سے آشنا کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس مہینہ کی بارہ تاریخ کو ایک ایسا قلم کار دنیائے دنی سے اٹھ گیا تھا جسے دنیائے صحافت کا بے تاج بادشاہ کہنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو۔ تحریر و صحافت کے اس بادشاہ کا شہرہ کتب خانوں، لائبریریوں اور انجمنوں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ ہوٹلوں اور گلی کوچوں میں بھی اس کے چرچے تھے، مکانوں اور کمروں میں بھی اس کی دھوم تھی، مسجدوں اور خانقاہوں میں بھی اس کا ذکر تھا — اس کی خوبیاں اور اس کی صلاحیتیں ہر جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ ہر جگہ اس کی اچھائیوں اور دلچسپ رنگینیوں کا تذکرہ ہوتا تھا — اس کو جو عزت، شہرت اور عظمت حاصل ہوئی وہ غیر محدود تھی — ہمہ گیر تھی۔ لامتناہی تھی — آپ نے ٹھیک ہی پہچانا۔ ہمارا اشارہ الجمعیۃ کے سابق ایڈیٹر جناب عثمان فارقلیط صاحب کی طرف ہے۔ جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے دل لرزتا ہے۔

ان کی عظمت اور بڑائی کے پیش نظر ان کی تعزیت بروقت کرنی چاہئے تھی۔ لیکن جس وقت ان کا انتقال ہوا عامر عثمانی نمبر کی پہلی قسط کی تمام کاپیاں پریس پہنچا دی گئی تھیں اس لیے بروقت تعزیتی سطور لکھنے کی نوبت نہ آسکی اور اب محض فرض ادا کرنے کے لیے یہ تعزیتی سطور قلم بند کی جارہی ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اب اس کی ضرورت محسوس

نہیں ہوتی۔ اب تو ان کے پس ماندگان کو بھی صبر آچلا ہوگا۔ اور اس صحافت کے آنسو بھی خشک ہو چکے ہوں گے جو انکی جدائی میں تڑپ رہی تھی اور جس کو ان کے قلم نے ایک نیا رنگ اور ایک نئی تازگی اور شگفتگی بخشی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے انتقال سے مجھے وہی صدمہ ہوا جو مولانا عامر عثمانی کی وفات سے ہوا تھا۔ مولانا عامر عثمانی کی وفات پر میری آنکھوں نے آنسوؤں کی ندیاں اس لیے نہیں بہائی تھیں کہ وہ میرے پھوپھی زاد بھائی اور میری اہلیہ کے والد تھے۔ بلکہ ان کی وفات پر رونے اور آہیں بھرنے کی واحد ترین وجہ یہ تھی کہ دنیا سے امت مسلمہ کا ایک خیر خواہ اور دانش مند مہرا اٹھ گیا تھا ایک ایسا چراغ گل ہوگیا تھا جس کی زندگی کا اول و آخر مقصد اسلام اور ارباب اسلام کی حمایت وطرفداری کے ماسوا کچھ تھا ہی نہیں۔

عثمان فارقلیط بھی کچھ ایسے ہی انسان تھے۔ وہ بھی امت مسلمہ کے نباض تھے، مخلص رہنما تھے۔ صحیح معنوں میں ہم سب کے چارہ گر تھے۔

لہٰذا ان کے انتقال پر ہمارے دل ودماغ کی کیفیت بالکل وہی ہوئی جو مولانا عامر عثمانی کی وفات کی اطلاع سنکر ہوئی تھی۔

ہم کچھ دن فرط غم میں روئے بھی۔ ہم نے کچھ دن تک شدت افسوس میں آہیں بھی بھری ہیں۔ اور پھر کچھ دنوں بعد ہمیں صبر بھی آگیا یہ سوچ کر کہ ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

عثمان فارقلیط صاحب نے تقریباً ۵۵ برس تک قلم کے ذریعہ امت مسلمہ کی جو قیادت ورہنمائی کی ہے اسے زندگی کے کسی موڑ پر بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی سوجھ بوجھ اور دور اندیشی پر امت مسلمہ کو بھرپور اعتماد تھا۔ شاید اسی لیے انکی تحریریں آخری حد تک مقبول ہوئیں اور امت مسلمہ اپنی موجودہ بے حسی کے باوجود وقتاً فوقتاً ان کی تحریروں کو سراہتی رہی، اور شاید یہ عثمان فارقلیط صاحب کی خوش بختی ہے کہ انھیں ان کا صحیح مقام زندگی ہی میں حاصل ہوگیا تھا۔ جب کہ قائدوں اور رہنماؤں کو ہزار قسم کی جاروجہد کرنے کے بعد بھی زندگی میں وہ وقعت نصیب نہیں ہوتی جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق ہوتے ہیں۔

مردہ پرست دنیا نے عثمان فارقلیط کو زندگی ہی میں انکھیں ان کا صحیح مقام دیکر کم از کم یہ تو ثابت کر ہی دیا تھا کہ عثمان فارقلیط کا مقام ان تمام صحافیوں سے بالاتر ہے جن کی علمی صلاحیتوں اور ذاتی خوبیوں کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو پاتا جب تک ان کا جسم خاک کا ڈھیر نہ ہو جائے۔

عثمان فارقلیط ہماری یادداشت کے مطابق ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اس حساب سے ان کی عمر ۸۲ سال کی تھی۔

ہمارا یہ جملہ پڑھنے کے بعد ان لوگوں کو تھوڑا سا تردد ہوگا جنھوں نے ۱۳ر جون ۷۶ء کے الجمعیۃ کا ایڈیٹوریل پڑھا ہے یہ عثمان فارقلیط صاحب کی وفات پر ملال پر اظہار غم کرنے کے لیے قلم بند کیا گیا تھا۔ اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے:۔

"مولانا موصوف کی ولادت ۱۹۰۰ء میں دلی میں ہوئی"

اگر مدیر الجمعیۃ کے اس انکشاف کو مبنی بر حقیقت مان لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ عثمان فارقلیط صاحب کی وفات ۷۵ سال کی عمر میں واقع ہوئی۔ حالانکہ ان کے اعضاء جسمانی بزبان خویش یہ اعلان کر رہے تھے کہ وہ عمر طبعی سے کچھ آگے ہی جاچکے ہیں۔

ہمیں یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ چند سال پہلے انھوں نے کسی رسالہ کے ایڈیٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوا تھا۔

مجھے اپنی یادداشت پر اگرچہ بھروسہ تھا لیکن پھر بھی میں نے تحقیق کی۔ عثمان فارقلیط صاحب مرحوم کے دولت کدہ پہنچا اور وہاں جاکر میں نے ان کے صاحبزادے سے ان کی عمر کے بارے میں پوچھ تاچھ کی کہ آیا وہ کس سن اور صدی میں پیدا ہوئے تھے اور بوقت اجل ان کی صحیح عمر کیا تھی۔ صاحبزادے صاحب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس لیے مجھے ناکام ونامراد لوٹنا پڑا۔

پھر میں نے طبقۂ اہل حدیث کے ایک معتبر عالم سے

یہ دریافت کیا کہ محترم عثمان صاحب کی عمر کے بارے میں اگر آپ کو کچھ تحقیق ہو تو واضح فرمائیں کہ کب پیدا ہوئے تھے اور ۱۳ر جون ۱۹۷۶ء کو ان کی زندگی نے کونسی منزل میں قدم رکھا تھا۔

ان صاحب نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: کہ سن پیدائش کے بارے میں تو مجھے ادنیٰ درجہ کی تحقیق بھی نہیں البتہ اندازہ یہ ہے کہ ان کی عمر اسّی سال سے اوپر ہی تھی۔

یہ اندازہ ظاہر کرنے کے بعد انھوں نے مجھے بتایا کہ عثمان صاحب حلیم کھانے کی غرض سے اکثر ایک دوکان پر تشریف لے جاتے تھے اور صاحب دوکان سے ان کا بڑا گہرا ربط تھا۔ ان سے ملو وہ ان کی عمر کے بارے میں صحیح نشاندہی کریں گے۔

میں وہاں بھی پہنچا۔ انھوں نے فرمایا اندازاً نوے سال کی عمر ہوگی اور صحیح تحقیق کرنی ہو تو آؤ میرے ساتھ۔ میں ان کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے ایک اور دوکان پر لے گئے اور بولے یہ عثمان صاحب کے پچاس سالہ دوست ہیں ان سے دریافت کیجئے۔ ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ خود ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور عثمان صاحب کی عمر ان سے آٹھ دس سال زیادہ تھی۔ گویا کہ وہی لگ بھگ چوراسی سال کی

چلیے اب پھر الجمعیۃ کی طرف آیئے۔ ۱۳ر ہی جون کے ایڈیشن میں صفحہ ۲ پر اداریہ کے عین پہلو میں عزیز الرحمٰن نامی ایک صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے: بہ عنوان عثمان فارقلیط صاحب مضمون نے بایں الفاظ مضمون کی ابتدا کی ہے:-

"۱۹۲۹ء میں بلی ماران میں مدراس بوٹ ہاؤس کے اوپر ایک کمرہ تھا۔ اس کمرہ کے باہر گیلری میں ایک بورڈ آویزاں تھا، جس پر لکھا تھا:-

"دفتر سہ روزہ الجمعیۃ اخبار"

۱۹۲۹ء کو ذہن نشین رکھ کر اب صاحب مضمون کی یہ سطریں پڑھیے۔

ایک صاحب جو نحیف جسم کے تھے اور پستہ قد۔ عینک لگائے ہوئے تھے۔ انھوں نے بڑی آہستگی سے جواب دیا" میرا ہی نام محمد عثمان فارقلیط ہے چھوٹی سی سیاہ داڑھی عمر ۳۵ اور چالیس کے درمیان"۔

اب حساب لگا لیجیے کہ جس شخص کی عمر ۱۹۲۹ء میں پینتیس اور چالیس کے درمیان میں ہوگی اس کی پیدائش کس سن میں واقع ہوئی ہوگی اور ۱۹۷۶ء میں اس نے عمر کی کس منزل میں قدم رکھا ہوگا۔

حساب لگاتے ہوئے اگر کوفت ہو تو پھر الجمعیۃ کے مذکورہ ایڈیشن میں صفحہ ۲ پر عزیز الرحمٰن صاحب کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں انھیں اپنے دامن نظر میں سمیٹ لیجیے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان کی ساری زندگی فقیری میں گذری اب جبکہ ان کی زندگی کے ۸۵ برس گزر چکے ہیں"

بس معاملہ صاف ہو گیا اور یہ بات واضح ہو گئی کہ عثمان فارقلیط صاحب ہماری یادداشت کے مطابق ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے تھے اور بوقت وفات ان کی عمر ۷۶ سال نہیں بلکہ ۸۴ سال کے لگ بھگ تھی۔ الجمعیۃ کا اداریہ قلمبند کرنے والے کی لاعلمی پر حیرت کرنی چاہئے کہ اسے اس شخص کے سن پیدائش کا بھی صحیح علم نہیں تھا جو الجمعیۃ کے دورِ ثانی میں بھی تقریباً ۲۵ سال تک الجمعیۃ سے وابستہ رہا، اور جس کی تحریروں کی بدولت کسی زمانہ میں الجمعیۃ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہوا تھا۔

اور اسے غیر ذمہ داری کے ماسوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ایڈیٹوریل کی ناک کے نیچے جو مضمون شائع ہوا ہے اسے پڑھنے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کی گئی۔ حالانکہ یہ مضمون بھی اسی شخص کی تعریف و تعارف پر مشتمل تھا جس کی وفات سے متاثر ہو کر مدیر الجمعیۃ کو قلم اٹھانے کی سوجھی تھی۔

ہمارا قلم کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ گذارش تو یہ کرنا تھی کہ عثمان فارقلیط ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے تھے اور انتقال ۱۳ر جون ۱۹۷۶ء کی صبح کو ساڑھے چار بجے ہوا۔ ان کی زندگی کے اکثر ایام امت مسلمہ کے مسائل حل کرنے اور معاشرے کی نوک پلک درست کرنے میں گذرے۔ انھوں نے ہر موضوع پر لکھا ہر انداز میں لکھا ہر طبقہ کے لیے لکھا، بوڑھے، جوان، بچے، سبھی ان کی تحریروں کے شیدائی تھے اور سبھی کو ان کے خیالات سے

فائدہ پہنچا۔

ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ الجمعیۃ کے دفتر میں بیٹھ کر بھی سچ بولا کرتے تھے، جبکہ الجمعیت کے دفتر میں بیٹھ کر سچ بولنا انتہائی مشکل اور صبر آزما کام تھا۔

ان کی عمر عزیز کے بیشتر لمحات امت مسلمہ کی خدمت میں صرف ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۲ء کے اواخر میں انھوں نے پادریوں سے کئی مناظرے کیے اور مختلف علاقوں میں جاکر ان مسلمانوں کی پشت پناہی کی جو عیسائی مشنریوں سے خائف اور سراسیمہ تھے۔

اس زمانہ میں آپ کا رشتہ اس الجمعیۃ سے قائم ہوا جس کو ایڈیٹ کرنے کا شرف مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے حصہ میں بھی آچکا تھا۔ زندگی کی کچھ اور بہاریں گزار کر آپ نے اپنی جادو جہد میں کچھ اور اضافہ کیا۔ منزل حق کی طرف آپ کے قدم کچھ اور تیزی کے ساتھ اٹھے۔

ان دنوں ان کے قلم نے دوسرے اخباروں پر بس اپنے احسانات کی بارشیں برسائیں، انھیں اپنے زریں نظریات سے نوازا۔ ان کی جاندار اور شاندار تحریریں فاران، مدینہ اور زمزم تینوں میں بھی جلوہ گر ہونے لگیں۔

کچھ ہی عرصہ کے بعد الجمعیۃ بند ہوگیا اور ۱۹۴۸ء میں اس اخبار کو جب مولانا حفظ الرحمٰن نے دوسری زندگی عطا کی تو مولانا عثمان فارقلیط صاحب پھر الجمعیۃ سے وابستہ ہوگئے اور ۱۹۷۳ء تک وابستہ رہے۔

مارچ ۱۹۶۳ء میں انھوں نے اچانک اور ڈرامائی طور پر الجمعیۃ سے چھٹکارا پالیا، کیوں — ؟ آخر اس کی وجہ کیا تھی۔ ؟

وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ الجمعیۃ کی بدلتی ہوئی پالیسیوں سے انھیں اتفاق نہ ہو۔ آخر کو مولانا حفظ الرحمٰن کے انتقال کے بعد اس کی صورت وسیرت میں، جو نمایاں تغیر واقع ہوگیا ہے وہ بالکل عیاں بیاں ہے۔

وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جمعیۃ العلماء کے موجودہ صدر محترم کی حالیہ روش انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی ہو

آخر اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ صدر محترم نے جو راہیں اختیار کی ہیں وہ انتہائی گندی اور مذموم ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان رہبروں پر پڑے، نادان دوستوں کے تکمیل دینے کا نتیجہ ہو۔

وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انھیں ارکان جمعیت کے اختیار کردہ طور طریقوں سے اکتاہٹ اور گھن آنے لگا ہو۔ آخر کون نہیں جانتا کہ جمعیۃ العلماء کے موجودہ کرتا دھرتا کن برائیوں کے شکار ہیں اور اپنے نظریاتی مخالفین کے لیے وہ کیسے کیسے اوچھے ہتھیار استعمال کرتے رہتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وجہ کچھ بھی نہ ہو۔ بس یوں ہی یا ضعف و ناتوانی کی وجہ سے انھوں نے جمعیت سے نجات حاصل کی ہو۔

بہرکیف چھٹکارا پانے کی کوئی وجہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ الجمعیۃ سے عثمان فارقلیط جیسے باصلاحیت اور حق گو آدمی کا الگ ہوجانا اس بات کی علامت و دلیل تھی کہ جمعیۃ العلماء کے سر پر بدنصیبی کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ الجمعیۃ باقی ہے اور شاید آئندہ بھی باقی ہی رہے گا لیکن اسے کبھی بھی عثمان فارقلیط جیسا باہنر ایڈیٹر نصیب نہیں ہوسکتا۔

قلم انھوں نے پھر بھی نہیں توڑا۔ اس کے بعد انھوں نے ہفت روزہ نئی دنیا سے وابستگی اختیار کرلی۔ اور یہ وابستگی زندگی کے آخری ایام تک باقی رہی۔

عثمان فارقلیط کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے — ان خدمات کے پیش نظر اگر انھیں میدان حشر میں کسی مقام علیا پر فائز کردیا جائے تو تحیّر کی کوئی وجہ نہیں۔ یقین ہے کہ ان کی بخشش کا فیصلہ کردیا ہوگا۔ اس یقین کے باوجود اپنا فرض ادا کرنے کے لیے ہم ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار فارقلیط صاحب کی خدمات کو قبول فرما اور ان کی ان بشری غلطیوں کو نظرانداز فرما جو خواہی نخواہی انسان سے سرزد ہو ہی جاتی ہیں۔

ایک اور سانحہ

جون کی ۲۴ تاریخ کو مولانا عامر عثمانی رح کے برادر کلاں مولانا زبیر افضل عثمانی بھی مرحوم ہوگئے۔ یہ وہ ہی تھے جنھوں نے کئی سال تک مولانا عامر عثمانی کے ساتھ تجلی کی بنیادوں میں اپنا لہو ٹپکایا تھا۔ تجلی کی ابتدائی زندگی پر ان کے بھی کافی احسانات

ہیں۔

ماضی کی کچھ باتیں جاننے کا ذوق پیدا ہوا تو خاندان کے لوگوں نے بتایا کہ زبیر افضل اور عامر عثمانی کا تعلق شہر بھر میں مشہور تھا۔ ہر وقت کا ساتھ، ہر وقت کی معیت، ہر وقت ایک دوسرے کے قریب رہنے کا جذبہ۔

گھر سے دارالعلوم تک اور دارالعلوم سے علمی وادبی انجمنوں تک ان کی دوستی کی دھوم تھی۔

یہ بچے جب سند فراغت لے کر دارالعلوم سے باہر آئے تو انھیں محسوس ہوا کہ انسانی ماحول نفرت وعداوت کی باد سموم کا شکار ہے۔

یہ صورت حال دیکھ کر ان دو "دوستوں" کو تشویش ہوئی لیکن یہ ابھی اس کا کوئی حل بھی سوچنے نہ پائے تھے کہ نفرتیں اور زیادہ بڑھنے اور پھیلنے لگیں۔ ملک کے سیاسی حالات پر انتشار و کشاکش کا کہرا چھاتا چلا گیا۔ فضاؤں میں زہر زہر گھل چکا تھا۔ ہر طرف جنگ کے شعلے بکھرے ہوئے تھے۔ بغاوت کا محاذ بھی نفرت کی گالیوں اور تعصب کی گولیوں سے گونج رہا تھا۔

ان تشویشناک حالات میں بعض علماء، ماحول میں پھیلے ہوئے بغض و عناد کے دھوئیں کو ہٹا کر امن و امان کی چاندنی پھیلانے کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ ان علماء میں مولانا شبیر احمد عثمانی رو بھی شامل تھے۔ ان کی آواز بھی امت مسلمہ کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔ جگہ جگہ ان کی تقریروں کا پروگرام سیٹ کیا جاتا تھا۔ شہر در شہر ان کے خیالات کا اجالا پھیلا ہوا تھا۔

ان کی تقریر سے پہلے ہر اسٹیج سے دو آوازیں بلند ہوا کرتی تھیں۔ یہ آوازیں دو نوعمر شاعروں کی آوازیں تھیں۔ ان شاعروں کی آواز و کلام میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ جس جلسہ گاہ اور جس انجمن میں ان کی آواز بکھرتی وہاں سکوت اور سناٹے چھا جاتے تھے۔ سامعین بار بار اس بات کی فرمائش کرتے کہ ان شاعروں کو پھر سامنے لایا جائے۔ یہ عزت اور یہ مقبولیت صرف خدا کی دین تھی۔

یہ دونوں شاعر وہی دو بھائی تھے جنھوں نے پھر آگے چل کر امت مسلمہ کی رہنمائی کرنے کے لیے تجلی جاری کیا تھا۔

کئی سال تک عامر عثمانی قلم و کاغذ میں کھوئے رہے اور زبیر افضل عثمانی وقت اور موسم کی ستم نوازیوں سے بے نیاز ہو کر تجلی کے خریدار بنانے کی جد و جہد کرتے رہے۔

اور اس طرح بھی ان دونوں کا ساتھ برقرار رہا۔ لیکن پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ بچھڑ گئے۔ زبیر افضل پاکستان چلے گئے۔ انھوں نے پاکستان جاتے وقت عامر عثمانی سے اصرار کیا کہ تم بھی ساتھ چلو ہندوستان میں تمہارا مستقبل محفوظ نہیں ہے۔

عامر عثمانی نے درد و کرب میں ڈوبی ہوئی آواز میں فرمایا:
تمہاری جدائی ناقابل برداشت سہی لیکن میں پاکستان نہیں جاؤں گا۔ مجھے ہندوستان ہی میں رہنا ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو میری زیادہ ضرورت ہے۔

ایک بار انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مجھے وہ زندگی زیادہ پسند ہے جو خطرات میں گھری ہوئی ہو۔ بہرحال وہ پاکستان نہیں گئے اور اس طرح یہ ایک دوسرے کے دیوانے اور یہ دو بھائی بچھڑ گئے۔ کچھ دن کے بعد عامر عثمانی صاحب نے تجلی کے ٹائٹل سے با دل ناخواستہ زبیر افضل عثمانی کا نام ہٹا دیا گویا کہ ان دونوں کے جسموں کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے ناموں کے درمیان بھی جدائی واقع ہو گئی۔

لیکن ان کے دلوں کے درمیان کوئی بعد نہیں تھا، کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ دونوں میں آخیر عمر تک خط و کتابت رہی۔ بذریعہ خطوط ہی یہ دونوں ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک رہے وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کو مشورے دیتے رہے، ایک دوسرے کی رہنمائی کرتے رہے۔

قارئین کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ زبیر افضل عثمانی عامر عثمانی کی والدہ کے بطن سے پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کی ماں دوسری تھیں جو انتقال کر گئی تھیں۔ باپ ایک سہی لیکن ماؤں کا فرق بھی کوئی معمولی فرق نہیں ہوتا۔ بعض مکانات میں یہی فرق عداوت وکشاکشی کی اصل وجہ ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ جداگانہ تھا۔ شاید اس کی وجہ وہ تربیت تھی جو فی زمانہ مفقود ہے۔ اس حقیقت کو مولانا عامر عثمانی کے الفاظ میں

سنیے :-

"وہ میری والدہ کو ہمیشہ "زبیر کی ماں" ہی کہا کرتے تھے، حالانکہ بھائی زبیر ہی ہم تمام بہن بھائیوں میں تنہا ایسے ہیں جو میری ماں کے بطن سے نہیں ہیں لیکن والد کے اس طرز خطاب نے اس قدرتی فرق کا احساس مٹانے میں ہمیشہ تریاق کا کام کیا۔ اور واقعتہً ہم لوگوں کے قلوب سے یہ فرق محو ہی رہا۔

(تجلی نومبر ۱۹۷۶ء)

بھائی زبیر بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی کمی ہم اہل خاندان بہت دنوں تک محسوس کریں گے۔ خدا سے استدعا ہے کہ وہ ان کی غلطیوں کو معاف کرے اور انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے۔ آمین۔

کچھ اپنی باتیں

عامر عثمانی نمبر کی پہلی قسط ایک مہینہ لیٹ ہو کر قارئین کی خدمت میں پہنچی۔ لیٹ ہونے کی وجہ کچھ ایسی ہی ہے کہ اسے ظاہر کرنا شاید مصلحت کے خلاف ہو۔ اس لیے ہم فی الحال یہ نہیں بتائیں گے کہ عامر عثمانی نمبر کی پہلی قسط کو منظر عام پر لانے میں دیر کیوں لگی۔

لفظ فی الحال کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ کر دے کہ ہم فی المستقبل اس سلسلہ میں کوئی انوکھا انکشاف کرنے والے ہیں۔ نہیں ایسا کوئی خیال ہمارے دل میں نہیں، فی الحال کا لفظ تو بس یوں ہی قلم سے خارج ہو گیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض رازوں سے چونکہ آج پردہ ہٹانا مناسب نہیں اس لیے انھیں مصلحت کے دبیز حجابوں میں پڑا رہنے دیجیے۔ آنے والی کل جب مصلحتیں دم توڑ دیں گی تو شاید انھیں واشگاف کرنے کی توفیق ہمیں نصیب ہو جائے۔

یہ بات باعث مسرت ہے کہ:-
عامر عثمانی نمبر کی پہلی قسط توقع سے زیادہ مقبول ہوئی تعریفی خطوں کا ایک انبار ہمارے سامنے رکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل تعریف کے مستحق مولانا مرحوم ہی ہیں، اس لیے کہ نمبر کی پہلی قسط میں جتنے بھی مضامین شائع کیے گئے ہیں وہ مرحوم ہی کے ہیں۔ اس لیے تعریف و تحسین کے تحفے ان ہی کی خدمت میں پیش ہونے چاہئیں اور وہ اس طرح کہ انھیں زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب کیا جائے لیکن چونکہ مضامین کا انتخاب، مضامین کی ترتیب ہماری محنت، کاوش، جدوجہد اور فکر و فہم کا نتیجہ تھی اس لیے تعریف و توصیف کا کچھ نہ کچھ حصہ ہمارے دامن میں بھی سمٹ آیا ہے۔

دوسری قسط میں مولانا کے جو مضامین پیش کیے جا رہے ہیں یقین ہے کہ انھیں بھی خراج تحسین سے نوازا جائے گا۔ اسلیے کہ یہ مضامین وقت کی ایک اہم ضرورت ہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں جس قسم کے فتنے پھیلے ہوئے ہیں ان کے پیش نظر ہم نے ایک مضمون شریک اشاعت کیا ہے (بعنوان اسلامی قانون پر تین اعتراض) ہمیں یقین ہے کہ یہ مضمون عامۃ المسلمین کے لیے انتہائی مؤثر اور مفید ثابت ہوگا۔

نمبر کی پہلی قسط کی ضخامت کو دیکھ کر قارئین نے اس بات کا اندازہ تو لگا لیا ہوگا کہ ہمارا مقصد صرف تجارت کرنا نہیں بلکہ اس مشن کو باقی رکھنا ہے جسے مولانا عامر عثمانی اپنے وجود سے زیادہ چاہتے تھے۔

بعض قارئین نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ نے نمبر کی قیمت کم رکھی ہے۔ صفحات کے اعتبار سے قیمت سات روپے ہونی چاہیے تھی۔ قارئین کی بات بڑی حد تک ٹھیک ہے لیکن آخری حد تک ٹھیک نہیں۔ وہ اس لیے کہ ضخامت کے اعتبار سے نمبر کی پہلی قسط تین سو گنے صفحات پر مشتمل تھی اور عام شمارہ کی قیمت چونکہ بھی تین روپے کر دی گئی ہے لہذا نمبر کی یہ قسط کم از کم سوا آٹھ روپے میں فروخت کرنی چاہیے تھی۔

کم از کم کا لفظ استعمال کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ نمبر کی پہلی قسط کی قیمت دس روپے نہیں تو نو روپے تو ہونی ہی چاہیے تھی۔

نمبر کے ٹائٹل میں، آفسیٹ کی پلیٹوں میں اور مولانا

مرحوم کے خط کا عکس چھپوانے میں جو پیسہ خرچ ہوا ہے ظاہر ہے کہ وہ بھی اخراجات نمبر میں شامل ہیں اور کسی چیز کی قیمت متعین کرتے وقت ایک تاجر اور ایک کاریگر اپنے اخراجات کو پیش نظر رکھنے کے علاوہ اپنی محنت اور اپنی مساعی کو بھی پیش نظر رکھنے پر مجبور ہوتا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ کمائے گا کیا۔ اور اس کی محنت کا بدل کیا ہوگا۔؟

لیکن ہم نے تاجرانہ نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اس کی دو وجہیں پیش نظر تھیں۔ ایک تو ہم کافی عرصہ پہلے قیمت کا اعلان کر چکے تھے کہ نمبر کی پہلی قسط چھ روپے کی ہوگی۔ ہم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ نمبر کی پہلی قسمت کی قیمت چھ ہی روپے رکھیں گے خواہ اس میں ہمیں تھوڑا سا نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ ایک وجہ قارئین کی جیبوں پر کرم کرنے کا جذبہ تھا۔ گھاس پر رحم کھا کر ایک آدھ وقت کا فاقہ کر لینا کسی بھی گھوڑے کو پاجی قرار نہیں دے سکتا لیکن مستقل طور پر گھاس پر رحم کھانے والے گھوڑے احمق اعظم نہیں تو پھر کیا کہلائیں گے۔

زیر ترتیب قسط کی قیمت تو چھ ہی روپے ہے لیکن صفحات میں کچھ کمی کر دی گئی ہے تاکہ اس قسط میں پہلی قسط کے نقصان کا ازالہ ہو سکے۔

پہلے تو خیال یہ تھا کہ نمبر دو ہی قسطوں میں مکمل کر دیا جائے لیکن مواد اتنا اکٹھا ہو گیا ہے کہ دو قسطوں میں اسے سمیٹ لینا ممکن نہیں۔ اور زیر ترتیب قسط میں سارے مضامین ٹھونس دینے کا مطلب یہ ہے کہ قیمت میں اضافہ کر دیا جائے جو کسی اعتبار سے غلط ہوگا۔ لہٰذا قارئین نمبر کی ایک اور قسط ملاحظہ فرمانے پر مجبور ہوں گے۔ نمبر کی تیسری قسط بھی پہلی دو قسطوں کی طرح انشاء اللہ دلچسپ ثابت ہوگی۔ ملا ابن العرب مکی کا تعارف بھی خود ان ہی کے قلم سے آخری قسط میں پیش کیا جائے گا۔

توجہ طلب عنوان کے تحت ایک ایسا مضمون شریک اشاعت کرنے کا ارادہ ہے جسے قارئین دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے ۔ مولانا عامر عثمانی کا انٹرویو بھی اگلے ہی شمارے میں جلوہ گر ہوگا۔

نمبر کی تیسری قسط بہت جلد پیش کر دی جائے گی تاکہ اشاعت کا یہ بگڑا ہوا نظام درست ہو جائے۔ اور آئندہ پرچہ وقت پر شائع ہوتا رہے۔

بعض مصلحتوں کے پیش نظر یہ سوچا گیا تھا کہ مولانا عامر عثمانیؒ کی تالیف "شرک و بدعت کے چور دروازے" کو عامر عثمانی نمبر کے بعد پیش کیا جائے گا، اسی لیے اس کی اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہے، ورنہ کتاب مدت ہوئی کتابت کے مرحلہ سے گزر چکی ہے۔ اب توقع یہ ہے کہ اکتوبر کے اوائل میں اس کتاب کو ہدیۂ ناظرین کر دیا جائے گا۔ اس کے فوراً ہی بعد تجلی کی ڈاک کو مرتب کرنے کا ارادہ ہے۔ قارئین یہ بتائیں کہ تجلی کی ڈاک کو کس عنوان سے شائع کیا جائے یعنی عنوان "تجلی کی ڈاک" ہی رکھیں یا بدل دیں۔

تجلی کی ڈاک کے علاوہ مولانا عامر عثمانی کا مجموعۂ کلام بھی چھاپنے کا خیال تھا لیکن بعض حضرات نے یہ مشورہ دیا ہے کہ مولانا کے کیے ہوئے تبصروں کو بھی ایک مجموعہ کی شکل دی جائے کم از کم اہم کتابوں پر کیے تبصروں کی ایک جلد تو مرتب ہونی چاہیے۔ اس مشورے کے بعد اب ہم تذبذب میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ پہلے کونسی چیز چھاپی جائے۔ آیا مجموعۂ کلام یا تبصرے۔ اب یہ مسئلہ بھی قارئین ہی کو حل کرنا ہے کہ فی الوقت ترجیح کسے دی جائے۔ اکثر قارئین کی جو رائے ہوگی اسی پر عمل کیا جائے گا۔

عامر عثمانی نمبر میں بھی کتابت و تصحیح کی کافی غلطیاں باقی رہ گئی تھیں، ہمیں شرم لگی ہے کہ ہم ابھی تک تصحیح پر پورا قابو نہیں پا سکے۔ امید کہ آئندہ کتابت و تصحیح کی اتنی غلطیاں نظر نہیں آئیں گی۔ جن حضرات نے کتابت، تصحیح اور طباعت کی غلطیوں کی نشان دہی کر کے ہماری توجہ اس طرف کرائی ہے ہم ان کا تہے دل سے شکریہ ادا کرنے کے بعد یہ گذارش کر رہے ہیں کہ آئندہ بھی وہ ہمیں غلطیوں پر متنبہ کرتے رہیں۔۔

صـ۴۲ پر ایک بھاری غلطی باقی رہ گئی ہے۔ پہلا کالم دیکھیے۔ ایک جملہ غلط ہے۔ صحیح جملہ یہ ہے:

"کہ انسانوں سے بھری دنیا میں معاملات کے اچھے لوگ بس اتنے ہی ہیں کہ انھیں انگلیوں پر شمار کر لیا جائے۔"

[illegible] پڑھ بھی لیا ہوگا۔ بعض خدا ترس قارئین نے [illegible] چاہیے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ مبنی برحقیقت [illegible] تمام قارئین سے گذارش ہے کہ ۱۶ صفحات پر مشتمل [illegible] جائے گا اس کے مبنی بر کذب ہونے کا کیا سوال [illegible] تقسیم نہیں ہوتا۔ کھلے عام پڑھا جاتا ہے [illegible] یوں کی زینت بنتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی [illegible] جاتا ہے۔ ایسے رسالہ میں من گھڑت باتیں شائع کیسے ہو سکتی ہے؟ اپنے خدا ترس قارئین سے [illegible] کیا کہیں کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے ہم [illegible] ذمہ دار ہیں اور خدا سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اگر ہم نے [illegible] چھاپی ہو، من گھڑت باتیں قارئین کے کانوں میں [illegible] وہ ہمیں اپنے دربار میں سخت سے سخت سزا

[illegible] ہم نے ایک استاد نے ایک کتاب کے ختم [illegible] تقریر کرتے ہوئے یہ تاکید کی ہے کہ طلبا ان [illegible] باتوں میں نہ آئیں جو اساتذہ کے بارے میں لوگ اڑاتے [illegible] بات کی تاکید بھی کی ہے کہ طلبا کے لیے ضروری [illegible] اپنے اساتذہ کی تعظیم کریں۔

[illegible] سے کورے طلبا تو استاد موصوف کی تقریر [illegible] کے ایمان لے آئیں گے عمل کی انھیں توفیق ہو یا نہ ہو [illegible] اور ذی فہم طلبا کے اذہان میں یہ سوال کلبلائیگا [illegible] کی تعظیم پر اتنا زور کیوں دے رہے جبکہ قابل [illegible] یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی کہ ان کا احترام [illegible] اتنا زور دینے کی وجہ کیا ہے؟

[illegible] تعظیم بے شک ضروری ہے لیکن اسی استاد کی [illegible] استادوں اور اپنے بڑوں کا احترام کیا ہو [illegible] دوسروں پر کیچڑ اچھالتا ہو، دن رات [illegible] اساتذہ کا مذاق اڑاتا ہو، اس کا مستحق نہیں ہو سکتا [illegible] کا ادب کیا جائے۔ اور اس کے سامنے گردنیں جھکائی

ایک ضروری اطلاع

"شرک و بدعت کے چور دروازے" کی قیمت میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ دراصل پہلے متوسط کاغذ پر چھاپنے کا ارادہ تھا۔ پھر یہ خیال ہوا کہ اچھے کاغذ پر چھاپا جائے۔ اسی لیے تھوڑی قیمت کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب قیمت ساڑھے چار روپے ہو گئی ہے لیکن پروگرام یہ بنا لیا گیا ہے کہ جو لوگ ۳۰ ستمبر تک پیشگی قیمت روانہ کر دیں گے انھیں چار ہی روپے میں دی جائے گی۔

شائقین حضرات چھ روپے روانہ کریں۔ دو روپے رجسٹری فیس اور چار روپے قیمت۔

مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ کافی عرصہ سے علیل ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ ان کی صحت کے لیے دعا فرمائیں۔

اور نشاۃ اسلام کا آتش نفس داعی ابوالکلام بلا رہا ہے، جیسا ایسا خیال ہوا جیسے ابن تیمیہ، مجدد الف ثانیؒ، سید احمد شہیدؒ اور نہ جانے کون کون ہمیں دلاسا دے رہا ہے، ہمت بندھا رہا ہے نہیں ہم تو یہ سمجھے کہ ہمارا عمر ابن العزیز مل گیا ہے، اور عمر ابن عبد العزیز کی یاد کے ساتھ صدیق اکبر، فاروق اعظم، خالد ابن ولید، سلطان صلاح الدین اور نہ جانے کس کس کی یاد نے ہمیں لوریاں دیں، نکھار دیا، ہمت دی ہم عقیدت وخود سپردگی کے نشے میں یہاں تک سوچنے لگے کہ ایک طرف ابوالکلام ہو اور دوسری طرف ہماری اولاد ہمارے والدین، ہماری متاع دنیا ہو —— پھر کوئی یوں کہے کہ دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو تو ہم کیا کریں گے؟ روح پکار اٹھی کہ ہم ابوالکلام کے قدموں میں گر کر کہدیں گے کہ اسے ہم نہیں دے سکتے یہ ہماری زندگی ہے، ہماری کائنات ہے، ہمارا سب کچھ ہے، یہ نہ رہا تو پوری امت کی امنگیں دم توڑ دیں گی، یہ نہ رہا تو دین حق کا ابھرتا ہوا سورج واپس لوٹ جائے گا۔ یہ نہ رہا تو تحریک اقامت دین کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوا ہے کہ ایک وادیٔ غیر ذی ذرع میں اللہ کے ایک برگزیدہ بندے نے دین حق کی دعوت دی تھی اور کتنے ہی انسانوں نے اس داعی کی خاطر اپنے عیال، اپنے والدین اپنے گھر بار اپنی ہر متاع کو بخوبی چھوڑ دیا تھا باپ نے بیٹے کے خلاف تلوار اٹھائی تھی، بیٹے نے باپ پر تیر چلایا تھا۔ بیوی نے شوہر سے رشتہ توڑ لیا تھا۔ وہی دعوت آج نئے الفاظ نئے اسلوب کا جامہ پہن کر ابوالکلام کی زبان وقلم پر آگئی ہے —— کیوں نہ اپنے پیارے ماضی کا سبق دہرایا جائے اور کیوں نہ ایک بار حق کے آستانہ پر سب کچھ بھینٹ کر دیا جائے۔

لیکن ...... واحسرتا ..... واویلا ..... وا دریغا .....

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ

جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

کون جانے کیا ہوا۔ کیسے ہوا۔ کیوں ہوا۔ ڈھونڈنے والے اپنے ابن تیمیہ، اپنے مجدد الف ثانی اپنے عمر ابن عبد العزیز کو ڈھونڈتے ہی رہ گئے اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ قوم کی بے حسی، گمراہی، ہٹ دھرمی بے مروتی کا شاکی اور تاہلی سے بد دل ہو کر گوشہ و عزلت میں جا چھپا۔ تھک گیا، مایوس ہو گیا۔

لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں —— خود اس نے ۱۹۴۰ء میں کہا تھا کہ اب میں سرتاپا مجروح ہوں میری کمر ٹوٹ چکی ہے، میرے پاؤں کٹ گئے ہیں، پہلے بھی اس نے کہا تھا کہ ——

میری پوری سوانح عمری نصف افسانہ امید

اور نصف ماتم یاس ہے۔

جس نظام حق اور خلافت الٰہیہ کی طرف وہ سالہا سال تک دعوت دیتا رہا تھا اس کے باب میں پے در پے ناکامی سے پیدا ہونے والی مکمل یاس ہی نے اس کے قلم سے یہ فقرے نکلوائے تھے کہ .....

"میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ میں اس عہد

اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالہ کر دیا گیا۔

اسے شکایت رہی کہ ——

"افسوس کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا

کوئی سامان نہ کرے گا"۔

مایوسی پر اعتراض کر دینا آسان ہے یہ کہنے میں کیا خرچ ہوتا ہے کہ داعی حق سرور کونین صلے اللہ علیہ وسلم سے لے کر سید احمد شہید تک جتنے بھی داعی گذرے ہیں انھیں ان کی قوم نے طنز و تعریض تذلیل و تمسخر اور مخالفت وایذا رسانی کے وہ تمام ہی تحفے دیئے جن کی ابوالکلام کو اپنی قوم سے شکایت ہے لیکن نہ جانے یہ کس مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ ان میں سے ایک بھی مایوس ہو کر گوشۂ عافیت میں نہیں جا بیٹھا تاریخ کے ورق الٹتے الٹتے تھک جاؤ گے مگر ایسا کوئی انسان ڈھونڈھ نہ لا سکو گے جس نے زندگی کا بڑا حصہ نظام حق کے قیام ونصب کی مسلسل دعوت میں گذرا ہو لیکن جب انقلاب زمانہ نے اس کے آگے منصب اقتدار پیش کر دیا ہو تو اس کی دعوت کا آوازہ ایک نہ ٹوٹنے والی خموشی نہ پگھلنے والی برف میں تبدیل ہو جائے اس کی یاس کا گہرا بادل خورشید عزم وامید کی ایک کرن بھی منزل حیات تک پہنچانے کی اجازت نہ دے۔ حق یہ ہے کہ مایوسی تو بشریت کے اجزاء میں سے ہے۔ اب ضروری تو نہیں کہ انبیاء کی طرح ہر آدمی بھی عزم وہمت سے مایوسی کے پہاڑ کاٹنے کی سکت رکھتا ہو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا آزاد دنیا سے فاتح گئے یا مفتوح، غالب گئے یا مغلوب، اگر وہ منزل جس کی نشان دہی دعوت الہلال والبلاغ

کے ہزاروں صفحات میں پھیلی ہوئی ہے، یہی تھی جس پر پہنچکر انھوں نے مسلمانوں کو ان کے پیروی کی ہے تو کیا شک ہے کہ وہ فاتح و غالب گئے ہیں اگر یہ وہ منزل نہیں تھی تو دل پر پتھر رکھ کر ماننا پڑے گا کہ انھیں اپنے کاز میں فتح و کامرانی نصیب نہیں ہوئی۔

مولانا کی ممتاز ترین صلاحیتیں قوم و وطن اور حکمران طبقہ کی جن عظیم خدمات سے نوازگئیں وہ تو اہلِ خیر پر ظاہر ہی ہے۔ خود مسلمانوں کو بھی کچھ کم ڈھارس نہیں تھی اور ان کے بوجھل سکوت سے دل دکھی محسوس کرنے کے باوجود اس حسنِ ظن سے خود کو تقویت دیتے رہتے تھے کہ یہ سکوت بھی ہمارے لئے مفید ہی ہوگا۔ جب ہی تو جاتے بڑے داعی و ہادی نے اسے اختیار فرمایا۔ حکمرانوں کی صفِ اوّل میں مولانا کا مجرد موجود ہونا ہی ایک مستقل سہارا تھا اور کیا شک ہے کہ اپنے وطن پرورانہ اصول و مسلک کے دائرہ میں رہ کر انھوں نے امتِ مسلمہ کی بقا اور تحفظ کے لئے بہت کچھ اقدامات بھی کئے ہوں گے بعض اقدامات کا عوام کو علم ہے اور بعض ایسے بھی ہوں گے جو تخم کی طرح زیرِ زمین رہ کر اپنے برگ و بار اور ثمرات زمین کے اوپر پھیلائے گئے ہوں۔ آڑے وقت میں مولانا سے مدد طلب کرنے کا بہت بڑا سہارا تھا، اقامتِ دین اور نظامِ حق کی نصیب دشمنیدکے وہ خواب تو دور گئے جو انہوں نے مدتوں تک دکھلائے تھے۔ اب تو روٹی، کپڑا، امن، ملازمت اور اسی سطح کے دیگر مسائل ہی اتنی کثرت و شدت سے امتِ مسلمہ کو در پیش تھے کہ ان کے سلجھاؤ اور حل کی خاطر مولانا آزاد جیسے بزرگ کا سایہ سر پر رہنا از بسکہ ضروری تھا۔ اور جب وہ لحد میں جا سوئے امتِ مسلمہ کا رونا، تڑپنا، بین کرنا، بال نوچنا فطری ہے بجب سے برگل ہے اندھیرے بڑھ رہے ہیں، مشعلیں گل ہوتی جا رہی ہیں۔ راستہ گم ہو گیا ہے۔ منزل نظروں ہی سے نہیں حیطۂ خیال سے اوجھل ہے معلوم نہیں کہاں جانا ہے، کیوں جانا ہے اور معلوم ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کتے، بلی، مچھر جیتے ہیں مر جاتے ہیں، انھیں بھی رزق ملتا ہے۔ ہم بھی آخری دم تک جئیں گے اور رزق لیں گے۔ منزل خود زندگی ہے، اچھا کھانا، اچھا پہننا اس سے بڑھ کر منزل کیا ہو سکتی ہے۔ خدا کرے اب کوئی ابوالکلام پیدا نہ ہو اور پیدا تو ابوالہول نہ نکلے۔ ہمیں روٹی کپڑا چاہیئے، جینے کی اجازت چاہیئے۔ ہمیں مذہب، اخلاق کی پٹی مت پڑھاؤ۔ یہ محمود منہ کی چیزیں ہیں۔ انھیں وہیں رہنے دو، ہم آرٹ، کلچر، ثقافت اور ترقی کے طالب ہیں۔ ہم ناچ دیکھیں گے، گانا سنیں گے۔ ہم ......

مگر استغفراللہ۔ کیا ہذیان شروع ہو گیا، کہنا یہ تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات ایک بہت بڑا، بہت ہی بڑا قومی سانحہ ہے جس پر فلک جتنا بھی روئے کم ہے۔ جنازے میں ہم بھی شریک تھے۔ واقعی سچے عوامی لیڈر کی موت اس کا نام ہے سیلاب آدم تھا جو اپنے محبوب کی میت سے اظہارِ عقیدت کے لئے امڈ آیا تھا۔ حدِ نظر تک آدمی ہی آدمی، چہرے ملول، آنکھیں پرنم، آوازیں لرزاں۔ دفن کے بعد بھی ہم کئی دن تک دلی رہے اور روزانہ مزار کی طرف جانا ہوا کوئی وقت زائرین سے خالی نہ پایا۔ اللہ تعالیٰ صاحبِ مزار کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

(تجلی اپریل ۵۸ء)

مولانا احمد سعید صاحب کی وفات پر جو کچھ لکھا تھا وہ یہ ہے:-

سحبان الہند مولانا احمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر اخبارات و رسائل میں جتنا کچھ حقِ تعزیت ادا کیا جا چکا ہے اس کے بعد ہمارا کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہی ہے لیکن بے حسی ہوگی اگر دو لفظ بھی اپنے دل کے تاثر کے اظہار میں سپردِ قلم نہ کریں۔

مدح و ذم اور محبت و نفرت اور غم و راحت کے ابواب تنہائی میں ہمارا جو مشرب ہے وہ قارئین سے پوشیدہ نہیں۔ یہ کہنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ سحبان الہند علیہ الرحمۃ کی موت پر آسمان اور زمین دونوں رو رہے ہیں، نہ ہی یہ ماننا ہمارے بس میں ہے کہ ان کی وفات صفِ اول کے آخری لیڈر کی وفات ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حد تک ہمارا خیال ہے کہ مولانا آزاد علیہ الرحمۃ صفِ اول کے آخری فرد تھے۔ اور اب یہ دوسری صف کا بچا کھچا سرمایہ ہے جو امتِ مسلمہ کے تن بھر دستا پر زخموں کا اضافہ کرتے ہوئے فضائے عدم میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ چاند اور سورج تو کبھی کے غروب ہو چکے چند کم تاب ستارے رہ گئے ہیں جن کی مدھم روشنی میں امتِ مسلمہ

اپنا سفرحیات جاری رکھے ہوئے ہے اور احوال و حوادث کی تاریک شب میں یہ کتاب ستارے بھی نعمت سے کم نہیں ہیں۔ ایک بھی ستارا اگر فرشتۂ اجل کی دھمک سے ٹوٹ جاتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دل ٹوٹ گیا، جیسے شب تاریک کی سیاہی اور بڑھ گئی۔ جیسے لرزہ براندام ایوان حیات کی ایک دیوار اور گر گئی۔

مولانا احمد سعید علیہ الرحمۃ بہت بڑے آدمی تھے اُن کا حُسن تقریر مثالی ہے، ان کا علم تبحر کسی اختلاف کا مورد نہیں ان کا حُسن اخلاق ہر اُس شخص کی زبان قلم پر مرقم ہے جسے اُن سے شرف صحبت حاصل رہا ہے ان کی شگفتہ مزاجی، اُن کی زندہ دلی، اُن کا حُسن بیان ان کی رعنائی تحریر یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو مدت تک یاد رہیں گی، ان کی وفات ایک ایسے آدمی کی وفات ہے جس پر ملت مسلمہ کو یکساں طور پر رنجیدہ ہونا چاہیئے، بلکہ حق یہ ہے کہ ان کی وفات پورے ہندوستان کے لئے ایک غم انگیز سانحہ ہے، وہ مسلمانوں کیلئے تمام اقوام ہند کے لیڈر تھے، وہ ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے حامی متحدہ قومیت کے علمبردار ملکی سیاست کے پہلو رو اور اس جمعیۃ العلماء کے آخری صدر تھے جس کی ہندوستان گیر سیکولر سیاست کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

تارے ٹوٹ رہے ہیں ظلمت کی تہیں اور دبیز اور ہوتی جا رہی ہیں۔ کون جانے زوال و مغلوبیت کی گھاٹیوں میں بھٹکنے والی امتِ مسلمہ کب کن غاروں میں گر جائے گی ۔۔۔ یا پھر کب ظلمت کا سینہ چیر کر کوئی چاند، کوئی سورج، کوئی جہاں تاب ستارا طلوع ہوگا ۔۔۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

ہم مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے لئے دعائے مغفرت اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کرتے ہیں۔ پس ماندگان سے ہماری مراد صرف لواحقین و اعزہ ہی نہیں۔ ایسے عوامی رہنما کی نسبت سے تو سارے ہی اعزا و قوم پس ماندگان کے دائرے میں آتے ہیں۔ اور سبھی کے سینے میں صدمہ کی وہ چوٹ ہے جو کہ لگا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ (جنوری ۱۹۵۹ء)

جگر مراد آبادی کی وفات پر ان کے قلم سے حرکت کی تو مندرجہ ذیل تاثرات کاغذ پر بکھر گئے۔

آج یہ خبر پرانی ہو چکی ہے کہ اردو ادب کا سب سے بڑا غزل گو شاعر جگر مراد آبادی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گیا لیکن جن لوگوں کو اللہ نے مذاق سلیم اور احساس و وجدان کی لطافتوں سے نوازا ہے ان کے لئے مرگ جگر کا غم دلسوز آئندہ بھی بہت زمانہ تک تازہ رہے گا ۔۔۔ کیا انسان تھا سراپا نغمہ و آہنگ، مجسم سوز و گداز، جب عشق مجازی کا افسانہ کہنے پر آیا تو رنگینی، رعنائی حُسن و شباب رنگ و ریشم اور نور و ظلمت کی قوس قزح بکھیرتا چلا گیا۔ اور جب عشق حقیقی کے نکات و رموز بیان کرنے پر آیا تو شوخی گفتار نے حُسن لم یزل کی [illegible] لبندیوں پر سجود نیاز کے چراغ جلا دیئے۔ وہ چراغ جن کی مقدس روشنی میں روحیں سفر کرتی ہیں۔

میں کم و بیش چھ مرتبہ ان سے ملا ہوں، دو مرتبہ پاکستان میں اور چار مرتبہ یہاں دو ملاقاتوں کو چھوڑ کر باقی ملاقاتیں کافی طویل رہیں۔ تجلی کے صفحات اگر متحمل ہو سکتے تو ان ملاقاتوں کے تاثرات و کوائف بیسیوں صفحات پر پھیل سکتے تھے پھر ان کی شاعری سے جو گہرا لگاؤ میرے مذاق شاعری کو رہا ہے اس کے تعلق سے تو دل بے تاب سا ہوا جاتا ہے کہ اس عظیم شاعر کے ذکر جمیل میں دفتر کا دفتر لکھتا چلا جاؤں وہ اس کے طرز بیان کی وجد انگیزی وہ اس کے مذاق جمال کی لطافت وہ اس کی سرشاری و سرمستی وہ اس کا رچاؤ گداز اور آہنگ وہ سوز و ساز میں ڈوبی ہوئی محاکات، وہ صحت مند رنگینی وہ وجد انگیز والہیت۔

مگر نہیں میں دل کی بے تابیوں کا گلا گھونٹ کر صرف فریضہ تعزیت ادا کروں گا کیونکہ غزل کا وہ سرفراز شہنشاہ صرف شاعر کی حیثیت میں خراج تعزیت کا مستحق نہیں بلکہ اپنی انسانی اور اخلاقی حیثیت سے بھی ہر اہل نظر سے خراج اشک لینے کا مستحق ہے مروت، فیاضی، سیر چشمی، غیرت، شرافت، دوستی، احساس اور وفاداری کا پیکر عناد و نفرت سے بیزاری خلوص و محبت کا [illegible]

اخوت و مروّت کے ہر سانچے کے لئے پگھلا ہوا موم مگر کدورت و خوشامد کے کسی بھی پیمانے کے لئے جامد پتھر جو ٹوٹ سکتا ہے گل نہیں سکتا۔ میں نے پہلی بار انھیں جامعہ کے ایک مشاعرے میں غزل پڑھتے دیکھا تھا نشے میں بدمست خود سے بے خبر خوب یاد ہے کہ دو تین شعر پڑھنے کے بعد جب وہ اس شعر پر پہنچے

میں اور ترے ظلم مسلسل کی شکایت
میرا ہی تو عالم ہے تیری یاد کا عالم

تو بار بار اسی کو دہراتے رہے اور پھر عجیب دل گرفتہ آواز میں یہ شعر پڑھا:۔

اب دل کے دھڑکنے کی بھی آتی نہیں آواز
کیا جانئے کیا ہے دلِ برباد کا عالم

اسے ختم کرتے اور پھر شروع کر دیتے پڑھتے ہی گئے یہاں تک کہ مقطع پڑھے بغیر اسی پر غزل تمام کر دی ــــ بیشک انہوں نے بہت دنوں شراب پی ہے اور ایسی پی ہے کہ قدح نوشوں کے چھکے چھڑا دیئے ہیں، لیکن اللہ کی بے شمار رحمتیں ہوں ان پر تو انہوں نے فسق جلی کو وہ کافرانہ رنگ دیا جو آجکل کے خدا بیزار شرابی شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے، نہ اخلاقی گراوٹوں کی اس ناپاک وادی میں ٹھوکریں کھائیں جو ام الخبائث کے ماروں کی عمومی سیرگاہ ہے جو فطرت سعیدہ لے کر آئے تھے۔ اسے شراب نے میلا تو کیا مگر مسخ نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ مدت ہوئی انہوں نے میخواری سے توبہ کر لی تھی اور یہ توبہ ان کے خوگر بادہ اعصاب کے لئے عذاب مستقل بن جانے کے باوجود ٹوٹی نہیں۔ فالحمد اللہ علیٰ ذلک۔

اہل اللہ سے کیسی عقیدت اور دینی اقدار سے کیا اُنس تھا اس شخص کو یہ ان تمام لوگوں کو معلوم ہے جنھیں ان کی قربت ملی ہے میں نے تو ان میں ایک عجیب طرح کی شاعرانہ معصومیت پائی جواب سے تقریباً ڈھائی سال پہلے کی آخری ملاقات میں بھی ویسی ہی شاداب و پاکیزہ تھی جیسے طفل معصوم کے ہونٹوں کا پاکیزہ تبسم، حالانکہ اس وقت ان کا پورا ہیولیٰ طبنا آواز سے بڑھاپے کی داستان سنا رہا تھا۔

ان کی موت اس شاعر کی موت ہے جس کی لاش پر شاعری کا ایک دور ایک منفرد اسٹائل ایک اچھوتا طرز و اسلوب ایک بے صدا موسیقی، شدت جذبات شائستگی خودداری، بیکراں جمالی پیرو گی نہ جانے کیا کیا نوحہ خواں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

(تجلی ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۸ء)

اپنے والد حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی پُر الم وفات پر انہوں نے ایک طویل تحریر سپرد کاغذ کی تھی۔ اس تحریر کا ایک حصّہ یہ بھی تھا:۔

ان کا انتقال اتوار کے دن ۷/ جولائی ۱۹۶۳ء کو ہوا ہے۔ دو دن پیشتر میں نے حیات کے آخری جمعہ کو جو اثر انگیز نظارہ دیکھنے میں آیا اس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

شب ان پر کافی سخت گذری تھی، بہت سے مریدین تقریباً بارہ بجے شب رخصت ہوئے تھے وہ بھی خود موصوف ہی کے حکم پر ورنہ کتنوں ہی کی خواہش تھی کہ رات یہیں گذاریں۔ صبح ہم اہل خانہ موصوف کے گرد جمع تھے، وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد غافل ہو جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ غفلت ٹوٹی تو والدہ نے مزاج پرسی کی انہوں نے کچھ جواب دیا مگر سمجھ میں نہیں آیا۔ منہ کے چھالوں کی وجہ سے وہ بمشکل ہی آواز نکال پاتے تھے۔ والدہ نے پھر پوچھا تو اب کے ان کا جواب سمجھ میں آگیا۔

"اللہ کا شکر ہے"

اس کے بعد انہوں نے والدہ سے کچھ باتیں کیں، ہم بھائی بہنوں نے کوشش کی کہ قریب ہو کر ہم بھی کچھ سُن لیں، لیکن انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا، کچھ دیر بعد والدہ ہی سے معلوم ہوا کہ وہ کچھ کٹے کٹے الفاظ میں کافی تعب کے ساتھ جو فرما سکے تھے اس کا لب لباب یہ ہے:

"میں ایک عالی شان مکان میں گیا تھا، راہ میں کافی دشواریاں پیش آئیں لیکن کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گیا"

یہ خواب تھا یا خیال؟ ــــ اس میں عالم باطن کی کوئی حقیقت پنہاں تھی یا ذہن و شعور ہی کرشمہ کاری کر رہے تھے؟ ان سوالوں کا جواب کون دے ہیں ان کی اولاد کی حیثیت سے نہیں

بلکہ اس مشاہدہ کی حیثیت سے جس نے طویل مدت تک ان کے اُسوۂ کردار کو بہت قریب سے دیکھا ہے یہ قیاس کرتا ہوں کہ اس سرگذشت کے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی حقیقت پوشیدہ رہی ہوگی چاہے اس کی حیثیت ایمائی وتمثیلی ہی ہو لیکن اس قیاس پر اصرار کی میرے پاس کوئی دلیل نہیں۔ اس لئے ظن وتخمین کے درجہ میں ہی سمجھنا چاہیئے۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے والدہ سے کہا:۔

اُن سب سے کہو میرے پاس سے ہٹیں ان کا اشارہ ہم اہل وعیال کی طرف تھا کیوں؟ آپ اکیلے چھوڑ جائیں گے یہ والدہ کا ارشاد تھا۔ مرحوم نے جواب دیا مگر والدہ نہ سمجھ سکیں ان کے مُنہ سے کان قریب کرکے والدہ نے پھر جواب لینا چاہا جس پر انھوں نے پھر مُنہ ہی مُنہ میں کچھ کہا والدہ نے بعد میں بتایا وہ اس طرح کے الفاظ کہہ رہے تھے میں اب جانے کہاں ہوں —— میں اب اس دنیا میں نہیں ہوں ——

والدہ کے سوا ہم سب وہاں سے ہٹ گئے۔ لیکن اس تنہائی کو جلد ہی آگے پیچھے آنے والے مریدوں نے ختم کردیا۔ مرحوم پلنگ پر تھے باقی لوگ متصلاً فرش پر بیٹھے تھے اس وقت مرحوم غافل نہیں تھے۔ یکایک مجلس میں کچھ ایسی کیفیت پیدا ہوگئی جیسے کوئی شخص سفر میں جانے سے قبل عزیز واقربا سے الوداعی ملاقات کررہا ہو۔ مرحوم باری باری ہر شخص کو قریب بلاتے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے، کسی کا سر اپنے سینے پر رکھ لیتے، کسی کی گردن میں اپنا کانپتا ہوا لاغر ہاتھ اس طرح حائل کرتے جیسے فرطِ محبت میں گلے لگانا چاہتے ہوں۔

ساتھ ساتھ چند کلمات کہتے۔ یہ منظر اس درجہ سوز وگداز کا حامل تھا کہ بعضوں کی تو چیخیں نکل گئیں۔ آنسوؤں سے تو کوئی آنکھ خالی نہیں تھی۔ اس موقعہ پر میں نے بعض ایسے شیردلوں کو بھی بچوں کی طرح روتے دیکھا ہے جن کی متانت اور استقامت ان کے حلقۂ تعارف میں ضرب المثل سمجھی جاتی ہے۔

توقع کی جارہی تھی کہ رخصت وودا ع کے اس ہنگامے میں وہ اپنے لواحقین، اپنے گھربار کے متعلق کچھ وصیتیں فرمائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا انھوں نے جو کچھ کہا اس کی نوعیت دلداری اور شکرگذاری کی تھی۔ مثلاً زید کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ حاضرین سے فرماتے:۔

"یہ بہت خوبیوں کا آدمی ہے"

اسی طرح بکر کے بارے میں ارشاد ہوتا:۔

یہ میرا بھائی ہے، اس نے مجھ پر بہت احسانات کئے ہیں

اسی طرح عمرو کے بارے میں گویا ہوتے:۔

"یہ عجیب آدمی ہے ایسے شریف لوگ اس گھرانہ میں کم ہوتے ہیں۔

غرض چھوٹے چھوٹے فقروں میں وہ صرف یہ واضح فرماتے چلے جارہے تھے کہ میں کسی بھی مرید یا دوست یا عزیز کے حسنِ سلوک کو بھولا نہیں ہوں جو میرے ساتھ برتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مرض الموت میں سب سے زیادہ جو جذبہ ان پر طاری نظر آیا وہ تشکر کا تھا۔

میری والدہ کی انتھک خدمت کا تشکر بھی بار بار ان کی زبان پر آتا تھا جیسے بارِ احسان سے دبے جارہے ہوں ۔۔ ایک بار فرمایا۔

بیٹے دیکھ رہے ہو اپنی ماں کو، ایسی مثال تم نے کہیں دیکھی ہے۔

ایک بار بعض مریدین کی موجودگی میں فرمایا:۔

اللہ نے مجھے عجیب بیوی عطا کی ہے گردن کٹا دے گی مگر شریعت سے بال برابر ہٹنا گوارہ نہیں کرے گی۔

ایک بار فرمایا۔ جسے بے حساب جنتی دیکھنا ہو وہ زبیر کی ماں کو دیکھے۔

والدہ کی تحسین وتعریف کے لئے اگرچہ اُن کے وہ اوصاف ہی بہت کافی ہیں جو احسن الخالقین نے ان کی سرشت میں ودیعت کئے ہیں۔ انتھک جذبۂ خدمت، حیرتناک صبر وتحمل، بے جھجک ایثار، رحم ورافت، عجز وادب اور دوسروں کو خود پر فوقیت دینے کی عادت، لیکن سب سے بڑھکر ان کی جس خصوصیت نے مغفور کو ان کا مدح خواں بنایا تھا وہ ہے دین وشریعت سے ان کا والہانہ عشق۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہماری ماؤں میں

عبادت اور شریعت سے ایسی گہری لگن رکھنے والی مائیں فی زمانہ خال خال کے درجہ میں ہیں۔

حاصل یہ کہ والدہ محترمہ کی دین داری ہی اُن کا وہ سب سے بڑا وصف تھا جس نے اباجی رحمۃ اللہ علیہ کو ہمیشہ ان کا بہت زیادہ گرویدہ رکھا اور اپنے آخری دنوں میں اسی وصف کو دوسرے تمام اوصاف حسنہ پر غالب رکھتے ہوئے وہ ان کی توصیف فرمایا کرتے تھے۔ لم یشکر العبد لم یشکر اللہ۔ اگر کوئی پاکیزہ صداقت ہے تو پھر ماننا چاہیئے کہ آخری ایام میں مغفور کا بڑھا ہوا جذبہ سپاس گذاری سعادت و برکت کی کھلی علامت تھی۔

رحلت کے سلسلہ میں اب کچھ زیادہ کہنا باقی نہیں تو اِدھر کے دن ۱۷ر جولائی ۱۹۸۲ء کی شام کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا الحمد للہ کا شکر ہے کہ محبین واعزہ کی کثرت تعداد کے باوجود ماتم و عزا میں کوئی غیر شرعی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔

غالب نے خوب ہی کہا ہے۔

سب کہاں لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

لیکن قبر میں لاشہ اتارتے وقت اس شعر سے کہیں زیادہ پُراثر سبق آموز اور دل و روح پر چھا جانے والی قرآن کی وہ آیت ہے جو اگرچہ بہت سادہ ہے لیکن ایسا ساحرانہ دروبست اور ایسی گیرائی اپنے اندر لئے ہوئے ہے کہ قلم میں صلاحیت نہیں جو اس کے سوز و اثر کو بیان کر سکے۔

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا	اسی زمین (مٹی) سے ہم نے تمہیں
نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا	پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیا اور
نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى	اسی سے پھر ایک بار تمہیں نکالا
	جائے گا

٭ ٭ ٭

مولانا حفظ الرحمٰن نے جب داعی اجل کو لبیک کہا تو مولانا ماہر عثمانی کے دل و دماغ پر کیا گذری چھا گئی اور پھر جب اداسی رقت آمیز لفظوں کی صورت میں ڈھل کر تجلی کے صفحات پر بکھری تو حسا قارئین کو ایسا محسوس ہوا جیسے گلاب کے پتوں پر

شبنم کے قطرے بکھر رہے ہیں اور دنیا کو اپنی محرومیوں سے متعارف کرا رہے ہیں۔

کچھ لوگ مرتے ہیں تو ایک آنکھ بھی ان پر رونے والی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ مرتے ہیں تو احباب و اقربا کا ایک محدود حلقہ ان پر آنسو بہا لیتا ہے —— لیکن کچھ لوگ مرتے ہیں تو اِدھر سے اُدھر تک فضا میں اندوہ ملال کا غبار بکھرتا چلا جاتا ہے اور کوئی نہیں گن سکتا کہ کتنی آنکھیں اشکوں سے بہا گئی —— صرف اشکوں ہی کی بات نہیں ان کی موت پر روحیں تڑپ اٹھتی ہیں، دماغ بوجھل سے ہو جاتے ہیں اور احساس کے ماتھے پر چمکتی ہوئی چنگاریاں پسینہ بن کر پھیل جاتی ہیں۔

کیا شک ہے کہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن قدس اللہ سرہٗ العزیز ایسی بلند مرتبہ اور ذی شان ہستیوں میں سے تھے جن کی موت نے ہر اس شخص پر غم کا پہاڑ توڑ دیا ہے جسے مرحوم و مغفور کے اوصاف عالیہ اور محاسن و محامد کا ادراک ہے جس کے سینہ میں دل مر نہیں چکا ہے اور جو اپنے ملک و ملت کے مخصوص حالات و مسائل کا شعور رکھتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن طاب اللہ سراہٗ کا وجود نامساعد حالات کی ماری ہوئی اُمت مسلمہ کے لئے آج کس قدر اہم تھا۔

کوئی بُرا مانے یا حیرت کرے ہم بلا خوف تردید عرض کریں گے کہ مولانا آزاد علیہ الرحمۃ کی موت کا حادثہ اگرچہ بہت بڑا تھا لیکن اثرات و نتائج کے اعتبار سے مجاہد ملت کی موت امت مسلمہ کے لئے زیادہ کاری زخم ہے۔ مولانا آزاد اپنے اچھے اور برے بلکہ ، دو بھاری اعمال کا سرمایہ سنبھالے دوسری دنیا میں جا چکے ان کے لئے سوائے حسن ظن، سوائے عقیدت سوائے دعائے مغفرت کے ہمارے پاس اب کچھ نہیں ہے ان کے علم و فہم، ان کی ذکاوت و جودت، ان کی تحریر و تقریر ان کی امتیازی آن بان سے صرف نظر تو بھلا کون سوا کر سکتا ہے لیکن یہ صداقت بہرحال اپنی جگہ ناقابل تردید ہے کہ ان کی رنگا رنگ صلاحیتوں کا پورا شباب، ان کی ساری توانائیاں جنگ آزادی کی نذر ہوئی تھیں۔ اور جب آزادی کا سورج ہم پر طلوع ہوا تو وہ اپنی بیش بہا صلاحیتوں کا دامن سمیٹ کر اعزاز و منصب

ان بلندیوں پر جا بیٹھے تھے جو اگرچہ بجا طور پر فاتح سورماؤں کا حصہ ہوا کرتی ہیں۔ لیکن تاریخ کی چند منفرد اور خال خال مثالوں کے سوا وہاں تک عوام کے دل کی دھڑکنیں اور جمہور کے احساسات کی آہٹیں کبھی نہیں پہنچا کرتیں۔

لیکن مولانا حفظ الرحمٰن نور اللہ مرقدہ توان مجاہدوں میں تھے جنھوں نے عین میدانِ جنگ میں جان دی ہے۔ یہ محض استعارہ نہیں ایک سامنے کی حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد بھی تعصب، تنگ نظری، فرعونیت اور ظلم کی طاقتوں کے ہاتھوں ہمارا وطن امتِ مسلمہ کے لئے ایک جنگ گاہ، ایک کارزار بنا ہوا ہے جہاں مسلمان مسلسل مدافعت، فریاد و احتجاج اور کرب و اضطراب کا مجسمہ بن کر رہ گئے ہیں اور ایک جارحانہ ذہن بے تکان ہر جبر و جور کے ترکش خالی کر رہا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن علیہ الرحمہ ظلم و طغیان کی ان طاقتوں سے نبرد آزمائی کرنے والوں کی صفِ اول کے مجاہد تھے، وہ جسمانی اعتبار سے نحیف لیکن جرأت و ہمت کے لحاظ سے بڑے شجاع تھے، شیر دل تھے، جیالے اور نڈر تھے۔ ان کی زندگی کے تقریباً چالیس سال اس جنگ جو سورما کی طرح گذرے ہیں جو اپنا کفن سر سے باندھے حریف کے آگے مستقل ڈٹا ہوا ہو، انھوں نے دُہری ابتلائیں جھیلی ہیں۔ چومکھی جنگ لڑی ہے۔ ایک طرف انھیں اپنی ہی ملت کے ان افراد سے دست و گریبان ہونا پڑا جو ان کی دانست میں غلط نظر و فکر کے علمبردار تھے لیگی عقائد کے حاملوں سے وہ بڑی بے جگری کے ساتھ نبرد آزما رہے ہیں اور دوسری طرف امتِ مسلمہ کو باطل اور جارحانہ عزائم کے بے تحاشہ برسنے والے تیروں سے بچانے کی انتھک جد و جہد انہوں نے اس وقت تک جاری رکھی جب تک تقدیرِ الٰہی نے انھیں بستر کا ہو رہنے پر مجبور نہیں کر دیا۔ اللہ اللہ۔ کیسے انتھک۔ بے باک۔ سیماب وش۔ سرگرم اور جفاکوش تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ — ایک شعلہ، جوالا — ایک موجِ رواں — ایک جہدِ مجسم — ایک نہ سرد ہونے والی لگن — ایک ایسا پیکرِ امید جس نے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا اور

مسلمانوں کو للکارا کر ناداناؤ! ہمت کرو، خوف زدہ مت ہو۔ یہ ملک تمہارا ہے، یہ زمین و آسمان تمہارے ہیں۔ متحد ہو کر ظلم کی طاقتوں کا مقابلہ کرو اور ثابت کر دو کہ وطن کی محبت میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

ہم اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتے کہ جمعیۃ العلماء کے سیاسی فکر سے ہمیں کامل اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ ہمارے پاس اختلاف کے متعدد دلائل تھے اور ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اس اعتراف سے بھی ہمیں کوئی روک نہیں سکتا کہ مولانا حفظ الرحمٰن خداداد صلاحیتوں اور قابلِ رشک محاسن و محامد کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے۔ ان کے اخلاص اور دردمندی میں بھی دو رائیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی حیات قوم و ملت کے لئے بڑی قیمتی تھی وہ مضبوط سہارا تھے اور جبکہ وہ اپنے اعمال کا دامن سمیٹ کر اپنے رب سے جا ملے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک یاس انگیز سعادت ہے، ایک کربناک لمحہ ہے۔ ایک حادثۂ عظیم ہے۔ موت کا فرشتہ اگر اللہ جل شانہ کا تابع فرمان نہ ہوتا تو ہم غم میں یہ کہنے سے بھی نہ چوکتے کہ مجاہدِ ملت کی روح قبض کرنے میں جلد بازی کی ہے، موصوف اگرچہ جواں سال نہیں تھے کہ ہم غالب کی زبان میں کہہ سکیں۔

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

لیکن اتنے عمر رسیدہ بھی نہیں تھے کہ دس بیس سال اور جیئے جانا عجوبہ کہلاتا۔

مگر ہمارے منہ میں خاک — کوئی بڑے سے بڑا حادثہ اور عظیم سے عظیم ابتلاء بھی خالق حکیم و دانا کی مصلحتوں سے خالی نہیں ہوا کرتا۔ ہر قیامت جو ہم پر ٹوٹتی ہے اس کا حق ہے کہ ٹوٹے کیونکہ جو کچھ جس وقت ہوتا ہے وہ اسی لائق ہے کہ اسی وقت ہو تقدیرِ الٰہی میں جہاں انحراف نہیں وہیں خطا بھی نہیں۔ تعالی اللہ عن ذٰلک۔

حاصلِ تعزیت یہ ہے کہ جس وقت ہمیں شیر دل اور مخلص مجاہدوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی اس وقت مولانا حفظ جیسے سخت کوش، بلند حوصلہ اور انتھک بزرگ کا اٹھ جانا ایک ایسے ستون کا گر جانا ہے۔ جو ملتِ مسلمہ کے عزم و ہمت کی گرتی ہوئی

دیواروں کا سہارا بنا ہوا تھا جس نے ۱۸۵۷ء کی قیامتِ صغریٰ میں آگ اور خون کے سیلِ تند سے گذرتے ہوئے بے شمار انسانوں کو پیامِ حیات دیا تھا۔ اور اس کے بعد مسلسل اب تک وہ ہر محاذ پر اپنی تمام صلاحیتوں کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ملک و ملت ہی کی خدمت اور عدل و صداقت ہی کے گیسو سوارنے پر کھپا رہا تھا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہماری قوم ایک طویل عرصے سے مردہ پرست ہے! وہ زندوں کو بہت کم شمار میں لاتی ہے مگر جب وہ مر جاتے ہیں تو ان کی عقیدت و محبت کا پرچم ساتویں آسمان تک پہنچا دیتی ہے آپ دیکھتے ہی ہیں کہ جب کوئی بزرگ دارِ فانی سے تشریف لے جاتے ہیں تو کتنے ہی دنوں تک ماتم سرائی کا وہ غلغلہ بلند رہتا ہے کہ گویا سینے پھٹ جائیں گے اور دل و جگر اشک بن کر بہہ جائیں گے جا اور بیجا صحیح اور غلط ہر طرح کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے جاتے ہیں۔ نظم و نثر کی ساری استعدادیں ختم کر دی جاتی ہیں۔ لیکن مرنے والے کی زندگی میں ان قصیدہ سراؤں نے کس حد تک عقیدت و انقیاد کا ثبوت دیا عملاً اس کے کاز کو کتنی تقویت پہنچائی یہ سوال دردناک ہی دردناک ہے۔ خود مولانا حفظ الرحمٰن کو بھی زندگی میں یہی محسوس رہا کہ جس محاذ پر انھیں زبانی جمع خرچ کی نہیں عملی تعاون کی ضرورت تھی۔ وہاں صحیح معنوں میں انھیں تعاون نہ مل سکا۔

جو لوگ مولانائے مرحوم کی محبت کے دعویدار ہیں انھیں ماتم و شیون اور قصیدہ سرائی سے جلد فراغت حاصل کر لینی چاہیئے۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ کا صدہا سالہ ماتم کسی مرض کا علاج نہیں بن سکا تو اور کسی کی طویل عزاداری کیا ثمرہ دے گی محبت کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ جس جہدِ مسلسل کو مرحوم نے اپنایا تھا آپ بھی اسی کو حرزِ جان بنایئے۔ آپ اگر نظریاتی پہلو سے ان سے کچھ اختلاف بھی رکھتے ہیں تو جدّ و جہد، سرگرمی، تہوّر، تن دہی اور ایثار و اخلاص میں تو بہر حال ان کی تقلید امر لازم ہے اگر انیس، دبیر، کی طرح مرثیے ہی پڑھتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ مرحوم کی روح آپ کی طرف سے کبھی مطمئن نہ ہوگی۔ اللہ تعالےٰ انھیں اپنے فضل و رحمت سے نوازے اور ہمیں آپ کو خدمتِ ملک و ملت کی توفیق دے۔ مولانائے مرحوم کے پس ماندگان سے ہم تہہ دل کے ساتھ اپنی غم گساری اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں نیز جمعیۃ علماء کے ارباب و حل و عقد سے ملتمس ہیں کہ مایوس و دلگرفتہ نہ ہو جائیں۔ انسان مرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جد و جہد کا میدان بہر حال جوں کا توں ہے۔ مایوسی اور باہمی جنگ کے اقتدار سے دامن بچا کر مولانائے مرحوم کے کاز کو تکمیل تک پہنچانا ہی چاہیئے اور اگر طبعِ نازک پر گراں نہ ہو تو یہ گذارش بھی ہم ادب کے ساتھ کریں گے کہ نظری اور عملی اعتبار سے بعض خامیاں جمعیۃ العلماء میں پائی جاتی ہیں ان پر بھی بے نفسی اور دیانت کے ساتھ توجہ کرنی چاہیئے۔ خود تنقیدی ترقی کا زینہ ہے۔ اگر ارباب حل و عقد خلوص کی سطح پر آ کر غور کریں گے تو انھیں پہلے ہی مرحلے میں اس کی ضرورت محسوس ہوگی کہ بندھے ٹکے خطوطِ عمل میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ یہ محض اشارہ ہے۔ تفصیل پر غور کرنا اربابِ جمعیۃ کا کام ہے۔

آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی موت پر ان کے قلم کے تاثرات یہ تھے :-

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

ابھی ابھی ریڈیو نے یہ المناک خبر سنائی ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو دفعتاً چل بسے انا للہ وانا الیہ راجعون کیسی عبرت کی جا ہے۔ ابھی دو تین ہی دن ہوئے کہ آنجہانی نے کم و بیش یہ الفاظ فرمائے تھے۔

"میں ابھی جا نہیں رہا ہوں، ابھی تو کافی دنوں زندہ رہوں گا۔"

بھلا کون تصور کر سکتا تھا کہ فرشتۂ اجل اس خوش فہمی کے عین پہلو ہی میں کھڑا بس گھڑیاں گن رہا ہے، ہائے یہ انسانی بے بسی اور لاچاری کی عبرتناک داستان جو ازل سے آج تک ایک ہی انداز میں دُہرائی جا رہی ہے۔

کم سے بات جو پنڈت نہرو کی موت پر کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آج ہندوستان کی تاریخ کا ایک خاص دور ختم ہو گیا —— ایسا دور جو ان کی قد آور شخصیت کے آغوش میں آخری

سنبھالے رہا تھا۔ وہ ماضی اور حال کے درمیان ایک حلقہ تھے جس سے زنجیر کا تسلسل قائم تھا، اب یہ حلقہ ٹوٹ گیا۔ اب ایک نئی کہانی شروع ہو رہی ہے۔

ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو ہندوستان کی اس عظیم شخصیت کو اپنی امیدوں کا ملجا و ماویٰ سمجھتے رہے ہوں لیکن ان لوگوں میں ضرور ہیں جنھیں ان کے بعض اوصاف سے محبت تھی۔ اس کے باوجود یہ کیسی مجبوری ہے کہ آج ہم ان کے لئے دعائے مغفرت نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے رب سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے بطل جلیل پر اپنی رحمتوں کا سایہ ڈالنا۔ اُف یہ لاچاری۔

بڑے لوگوں کی موت ہمیشہ ہی ہنگامہ خیز اور دور رس ہوتی ہے۔ لیکن شیخ عبداللہ کی رہائی اور مسئلہ کشمیر کی نشاۃ ثانیہ نے آج ہندوستانی سیاست کی فضا میں جن نزاکتوں اور پیچیدگیوں کو جنم دیدیا ہے ان کے عالم خروش میں پنڈت نہرو کا اُٹھ جانا خاص طور پر ایک ایسا غیر معمولی سانحہ ہے جس نے خیالات اور قیاس و تمنا کے سارے سانچے توڑ پھوڑ کر رکھ دیئے ہیں۔ ہند و پاک کے درمیان مفاہمت اور بہتر تعلقات کی آرزوؤں پر بھی اس سانحے نے کہرے اور غبار کی ایک نئی پرت کا اضافہ کیا ہے اور چینی جارحیت کے رخ پر بھی دھوئیں کا رنگ کچھ زیادہ ہی گہرا نظر آ رہا ہے۔ بہرحال انسان مجبور ہے کہ جو کچھ پڑے اسے سہے اور زندگی کے سفر میں نئی مشعلیں جلاتا ہوا آگے بڑھتا جائے انجام ہر چیز کا ایک ہی ہے:

فالموت
اللہ بس باقی ہوس

(جون ۶۴ء)

علامہ ابراہیم جب دنیائے فانی سے رخصت ہوئے تو مولانا عامر عثمانی کے دل و دماغ کی کیفیت خدا ہی جانے کیا رہی ہوگی — ذیل میں دی ہوئی تحریر کو ان کے دل و دماغ کی کیفیت کا عکس تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد اس کا اندازہ ہو ہی جاتا ہے کہ علامہ کی

وفات مرحوم عامر صاحب کے لئے ایک نئے غم کا پیغام تھی ——

آہ استاد محترم

مرنا جینا تو روز ہی کا معمول ہے لیکن جن ہستیوں کی موت کا صدمہ اور نقصان فقط ایک دو گھرانوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ پوری ملت اور قوم کے لئے سرمایۂ غم بنتا ہے، ان کا تذکرہ تو بہرحال عام زبانوں اور قلموں پر آنا ہی چاہیئے۔ ابھی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ نے ملت کو داغ مفارقت دیا تھا کہ علامہ محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ بھی داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس بھی تھے اور تعلیمات کے ناظم بھی۔ منطق اور علم کلام میں نہایت ارفع حیثیت رکھنے کے علاوہ علم الحدیث میں بھی آپ کا مقام بلند تھا۔ راقم الحروف کو آپ کی شاگردی کا فخر بھی حاصل ہے۔ مسلم شریف آپ ہی سے پڑھی ہے لیکن عاجز کی شاگردانہ حیثیت سے زیادہ ان کے پیش نظر ہمیشہ وہ حیثیت رہی جو ناچیز کو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا بھتیجا ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کو آپ اپنا گہرا دوست کہا کرتے تھے اور اسی تعلق سے راقم الحروف کے ساتھ آپ کا برتاؤ استاد سے زیادہ ایک شفیق چچا کا سا تھا۔ بعد عصر کبھی کبھی ان کی مجلس میں بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوتی تو ان کی شفقت و محبت کا احساس شدید تر ہو جاتا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں رات میں گیا ہوں طبیعت کچھ ناساز ہے چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ میں احتراماً فرش پر بیٹھ گیا تو میرا بازو پکڑ کر پلنگ پر بٹھایا اور میں نے اگر یہ کوشش کی کہ پاؤں دبا دوں تو کسی قیمت پر اس کی اجازت نہ دی۔ یہ دراصل اپنے مرحوم دوست علامہ شبیر احمدؒ کی منزلت اور ان سے میرے قرابتی تعلق کا لحاظ تھا، ورنہ شاگرد سے بڑھ کر کون استاد کی خدمت کے لئے مناسب ہوگا۔

تجلی بہت شوق سے دیکھتے تھے۔ کئی بار شکوہ کیا کہ آپ کا رسالہ آیا تھا۔ سرہانے رکھا کوئی اٹھا کر لے گیا — میں نے عرض کیا کہ آئندہ دو پرچے بھیجا کروں گا۔ فرمانے لگے کہ اصل میں

گھستہ سبھی افراد انتظار میں رہتے ہیں کہ اگر میری عدم موجودگی میں آئے تو پتہ ہی نہیں دیتے۔ پہلے خود پڑھ لیں تب ہی دیں۔ اور اگر میری موجودگی ہی میں آئے تو پھر بھی تاک لگائے رکھتے ہیں۔

افسوس وقت کی قلت اور سفرِ حج کی تیاری تفصیل میں مانع ہے، ورنہ لکھنے کو تو بہت کچھ تھا۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ آئندہ کبھی تفصیل بھی ہدیۂ خدمت کی جائے گی۔ فی الحال تو بس یہ کہنے پر اکتفا مناسب ہوگا کہ علامہ رحمۃ اللہ علیہ ایک خاص دور کی آخری یادگار تھے وہ دور جس کے علمی اور عملی معیاروں کی بلندی کا تصور آج کے دورِ انحطاط میں بہت مشکل ہے۔ جگہ تو کبھی بھی کسی کی پُر نہیں ہوتی، لیکن حضرت مرحوم کے سلسلے میں فقط محاورۃً نہیں حقیقتاً بھی کہنا درست ہوگا کہ جائے استاد خالی است۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور آخرت کی بے بہا نعمتوں سے نوازے۔

(جنوری و فروری ۶۹ء)

ڈاکٹر ذاکر حسین بھی ایک بڑے آدمی تھے، بھلا انکی وفات پر مولانا عامر عثمانی کا قلم سستی اور تساہل کا اظہار کیوں کرتا — وہ بر وقت متحرک ہوا اور مندرجہ ذیل باتیں ابدی طور پر محفوظ ہونے کے لیے تجلی کے صفحات پر بکھر گئیں۔

آہ صدرِ جمہوریہ!

میں اس وقت دہلی ہی تھا جب یہ المناک خبر نشر ہوئی کہ صدرِ جمہوریۂ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین یک بیک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

یہ واقعہ ہے کہ کوئی بہت بڑا صدمہ اس حادثے سے راقم الحروف کے قلب پر نہیں پہنچا۔ موت ایک حقیقت منتظرہ ہے جس سے مفر نہیں۔ مرحوم و مغفور عمرِ طبعی کو پہنچ چکے تھے۔ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں عناصرِ جسمانی کا شیرازہ بکھرنا ہی تھا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک ایسے آدمی کو جو نہ ان کا رشتہ دار ہو نہ نمک خوار ان کی موت پر دنیا اندھیرا معلوم ہو اور سینہ دفورِ غم سے پھٹنے لگے۔ صدمہ ہونا کوئی ایسی بات نہیں کہ قلوب کے لئے اس سے محبت کے چشمے پھوٹیں۔ وہ صدر تھے لہٰذا ظاہری احترام، ان کا ہم سارے ہی اہلِ وطن کا سیاسی و تہذیبی فرض تھا! احترام محبت کو نہیں کہتے اور محبت وا حد چیز ہے جو غم و مسرت اور ملال و نشاط کے پیمانے تراشتی ہے لہٰذا جھوٹ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ صدرِ جمہوریۂ ہند کے انتقال نے ہماری آنکھوں سے اشکوں کے دریا رواں کر دیئے۔

مگر یہ بھی درست نہیں کہ ہمیں رنج ہوا ہی نہیں۔ ہوا اور اچھا خاصا ہوا۔ بڑا صدمہ نہ سہی مگر ہلکا ضرور دل کو پہنچا ہے۔ اس اعتراف کی ضرورت یہاں اس لئے پیش آئی کہ ہو سکتا ہے مرحوم پر ہماری بعض نظریاتی تنقیدوں کے نتیجے میں کچھ لوگ یہ سمجھیں کہ ان کی موت ہمارے لئے خوشی کا باعث ہوئی ہوگی۔ استغفر اللہ ثم استغفر اللہ

ہمیں کبھی کسی سے نفرت اور عداوت نہیں ہوتی۔ ہمارا ہدف تو صرف باطل نظریات اور مریض عقائد ہیں۔ نہ کہ ذوات و اشخاص۔ صدر مرحوم کو اللہ جنت میں جگہ دے ہمیں ان کا جو طرزِ عمل اسلامی تقاضوں کے خلاف محسوس ہوا اس پر بلا تکلف اظہارِ خیال کر دیا۔ ہم نے سنا تھا کہ صدر اور وزیرِ اعظم کے بارے میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ دیر سویر خود ان تک بھی خلاصے کی شکل میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہم نے سوچا اگر ہماری معروضات ان تک پہنچتی رہیں تو ممکن ہے کہ وہ ہماری بے بضاعتی اور بے نوائی کے باوجود ان معروضات پر اس لئے توجہ دیں کہ ان کا تعلق سیاست و حکمرانی کے مسائل سے نہیں بلکہ ایک ایسی دنیا کے مسائل سے ہے جہاں نہ ان کی صدارت کوئی قیمت رکھتی ہے نہ ہماری کم حیثیتی حقارت سے دیکھی جا سکتی ہے۔ وہاں ہم دونوں ایک ہی سطح پر ہیں — کمزور اور لاچار بندے۔ وہاں ہمیں یکساں طور پر حساب دینا ہے اور جو کچھ دنیا میں کر کے آئے ہیں اس کا بھگتان کرنا ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے انہوں نے ایک معمولی شہری کی معروضات کو نگاہِ توجہ سے دیکھ لیا تو عین ممکن ہے کہ آخرت کی خاطر ان افعال و اعمال کی کوئی تلافی کرنے کی کوشش کریں جن پر دنیا میں چاہے

مدح و ستائش کے ڈونگرے ہی برس گئے ہوں، مگر آخرت میں ان کی پذیرائی ممکن نہیں ہو سکتی۔ تلافی نہ سہی تو کم سے کم اپنے رب کے آگے استغفار ہی کر لیں۔ کوئی مسلمان ـــــ اگر واقعی مسلمان ہے تو ہزار ملکوں کا بادشاہ ہو کر بھی اس احساس سے خالی نہیں ہو سکتا کہ اپنی لغزشوں پر اللہ کے حضور گڑگڑانا اور معافی مانگنا اس کا فرض اوّلین ہے۔ صدر مرحوم نے دنیا میں بہت کچھ کمایا تھا۔ عزت، دولت، آرام اور جاہ و منصب۔ ہم چاہتے تھے کہ آخرت میں بھی وہ آرام ہی سے رہیں۔ اسی لئے ان سے منسوب بعض افعال و اعمال کی خبریں پڑھکر ہمارے قلب میں بے چینی ہوئی اور عین خیر خواہی کے جذبے سے نقد و نظر کی جسارت کر بیٹھے۔

آپ کے سامنے ہے کہ وہ جہاں سے جا چکے ہیں وہاں نہ صدارت ہے نہ وزارت، نہ جاہ و حشم ہے نہ فوج و فرا۔ وہاں تو ہر طرح کی کینچلی اور لباس و خلعت سے بے نیاز ننگی روحیں ہیں جنھیں اصل شہنشاہ ـــــ مالک الملک کو اپنا اعمال نامہ پیش کرنا ہے ہم قلب و روح کی گہرائیوں کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ اے خدائے رؤف و رحیم؛ ان کے گناہوں سے درگذر فرما اور ان کی نیکیوں کو قبول کر کے جنت کا دروازہ ان پر کھولدے۔ خبر نہیں روایت کہاں تک درست ہے ـــــ یقین ہمیں نہیں آیا اس لئے راوی کا نام نہیں لکھتے ـــــ ہیں بہر حال وہ ایسے ہی آدمی جو وزیر اعظم اور جناب صدر سے وقتاً فوقتاً ملاقاتیں کرتے رہے ہیں۔ فرمانے لگے کہ اپنے سے متعلق تمہاری تنقیدیں ان کی نظروں سے گذر چکی تھیں۔ یہ پچھلا اپریل والا آغاز سخن بھی دیکھ چکے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آدمی مخلص ہے اور سچ کہتا ہے مگر لہجہ تند اور انداز سخت ہے!

ہم نے راوی صاحب کی بات کو ابتداءً مذاق سمجھا مگر وہ قسم کھانے لگے۔ آدمی بڑی جرأت والے ہیں۔ قسم بھی جھوٹی کھالیں تو کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ـــــ لیکن ایک مسلمان کی حیثیت میں ہیں تو بہر حال یہی حسن ظن رکھنا پڑے گا کہ قسم کھائی ہے تو بات بھی سچی ہی ہوگی، اگر سچی ہو اور خدا کرے سچی ہو تو ہمیں بے حد خوشی ہوگی کیونکہ یہ بات مرحوم صدر کے مومن ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ ایمان سلامت نہ ہوتا تو ان باتوں کو وہ سچا کیسے مان لیتے جن کی صداقت ایمان کی عینک کے بغیر نظر ہی نہیں آسکتی

اور ان کی سلامتیٔ ایمان کا اندازہ ہمیں بعض اور باتوں سے بھی ہوا۔ انتقال کی خبر جس وقت گرم ہوئی اس سے کچھ دیر بعد ہم ندوۃ المصنفین میں تھے۔ برادرِ محترم حضرت مفتی عتیق الرحمان کے پاس بہت سے لوگ آئے اور مرحوم کا ذکرِ خیر چھڑ گیا۔ اس ذکر کے ذیل میں ان کے بہت سے اوصاف و محامد ہمارے کانوں میں پڑے اور خدا کی قسم ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ اندرونی حالات سے ناواقفیت کے باعث جو بدگمانی ہمیں ان سے تھی وہ اس حسنِ ظن میں بدل گئی کہ سیاسی مصالح کی بنا پر وہ صدر بننے کے بعد جس اسوۂ کردار کو بھی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہوں۔ یہ بہر حال ایک ظاہری چیز تھی۔ باطناً وہ مومن ہی تھے اور ظاہر میں بھی ان کی ذاتی اور نجی زندگی اسلام کے حسین پرتو سے خالی نہ تھی۔ طاب اللہ ثراہٗ و نور اللہ مرقدہٗ۔

ان کی قوم پرستانہ صلاحیتوں، ملکی خدمتوں، سیاسی پیش رفتوں اور دماغی کارناموں کی مدح و ثنا پر تو اب تک نہ جانے کتنے مضمون، مقالے، اداریئے اور بیان منظرِ عام پر آچکے ہونگے ہم اس سلسلے میں کیا کہیں اور کیونکر کریں۔ کیونکر کا سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاری اور تاریخ نویسی ہمیں آتی ہی نہیں۔ ہم اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو فقط یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا مسلمان مرنا ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ سب سے بڑی خوش بختی ہے، سب سے بڑا اعزاز ہے۔ یہی اب ان کے کام بھی آئیگا ورنہ مردے غریب کو اس سے کیا کہ دس لاکھ آدمیوں کا جلوس اسے کسی بیس لاکھ روپے کے مقبرے میں گاڑ آئے یا چار پھٹے کپڑوں والے اس کی چارپائی اٹھا کر کسی ویرانے میں سپردِ خاک کر آئیں۔ ماتم کے شور سے آسمان کا کلیجہ شق کر دو، تب کیا اور ملک بھر میں کوئی ایک آنسو نہ بہائے تب کیا۔ جانے والا وہاں جا چکا جہاں صرف ایمان و عمل کام آتا ہے اور کچھ نہیں۔

ویسے اگر خود ملک کو ان کی رحلت سے واقعۃً کوئی نقصان پہنچا ہو تو یہ رنج ہی کی بات ہے۔ ملک کا نقصان تمام اہلِ ملک کا نقصان۔ ہم بھی ملک سے باہر تھوڑی ہیں لیکن سیاست کی بڑی بڑی اور پیچیدہ باتوں کا علم و شعور چونکہ ہمیں نہیں اس لئے بوثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ ملک کو فلاں نقصان پہنچا ہے

خدا کرے نہ پہنچا ہو۔ پہنچ گیا تو مجھے صدمہ دو آتشہ ہوا۔ اللہ اس ملک کو ان کا نعم البدل دے۔

رسماً ہمیں مرحوم کے پس ماندگان سے بھی دلی ہمدردی ہے یہ پتہ نہیں انھوں نے عزیز و اقربا میں کیسے کیسے چھوڑا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہم سارے ہی اہل ملک ان کے پس ماندگان ہیں کیونکہ وہ راشٹرپتی تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے۔ ہمارے نزدیک مرحوم کی حقیقی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ دعائے مغفرت کی جائے۔ رہے پس ماندگان تو انھیں صبر آج نہیں تو کل آ ہی جائے گا۔ کیسی عبرت کدہ ہے یہ دنیا۔ کل تک جو اہل خانہ کروڑوں کے محل میں رہتے تھے اب وہ اس سے نکال دیئے جائیں گے کیونکہ ان کا سربراہ دنیا سے چلا گیا۔ کتنی آیات ہیں جو اس وقت یاد آئی جارہی ہیں صدق اللہ مولانا العظیم۔

مولانا اعزاز علی صاحب کے انتقال پر
انھوں نے اس انداز میں تعزیت کا فرض ادا کیا۔

اہلِ علم کے لئے ایک صدمۂ جانکاہ

ہم بہت رنج و افسوس کے ساتھ ناظرین کو یہ خبر سنانے پر مجبور ہیں کہ ۸ مارچ ۵۵ء کو مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے ایک بہت ہی فاضل و پرہیزگار بزرگ اور راقم الحروف کے استاد حضرت علامہ شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب مدظلہ دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کی ذاتِ گرامی کی بہترین خصوصیات سے یوں تو دارالعلوم اور دیوبند کا بچہ بچہ واقف ہے لیکن میرے لئے ان کی موت نہ صرف اس لئے خصوصی طور پر المناک ہے کہ وہ میرے استاد تھے بلکہ اس لئے بھی مجھے ان کی موت پر سخت صدمہ ہوا کہ دارالعلوم کی اس فضا میں جہاں آج مطبخ سے لیکر اہتمام تک پارٹی پالیٹکس کا دور دورہ اور من و تو کی رسہ کشی ہے، وہ ایک ایسی معظم و برتر ہستی تھے جسے اپنے فرائض کی ادائیگی، کے سوا کسی سیاست بازی اور دھڑے بندی سے سروکار نہ تھا وہ ایک طرف شب زندہ دار عابد تھے تو دوسری طرف تعلیم و تعلم کے زندہ پیکر ہر آلھد الا گواہ ہے کہ ان کے اوقات کا کثیر ترین حصہ پڑھانے اور صرف پڑھانے میں صرف ہوتا تھا۔ اعلیٰ علمی قابلیت کے ساتھ انھیں انتہائی پابندی وقت اور ایک ایک لمحہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا مخلصانہ شوق اس حد تک تھا کہ بعض احمق اسے جنون سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ ایک دینی استاد کو ایسا ہی سرگرم، پابند فرائض، ذمہ دار اور انہماک ہونا چاہیئے جیسے کہ وہ تھے۔ سبق پڑھانے کے علاوہ خاکسار کو معلوم ہے کہ ان فرائض کی ادائیگی میں انہوں نے ہمیشہ اعلیٰ انتظامی اور عادلانہ طرز و اسلوب کا ثبوت دیا۔

ادب و انشا میں ان کی افضلیت اتنی مسلم ہے کہ عرصہ سے "شیخ الادب" کا خطاب ان کے نام کا جزء تھا بلکہ خود نام پر غالب آگیا تھا۔ لیکن میں کہوں گا کہ علم الحدیث میں ان کی دسترس کچھ کم نہ تھی اور یہ سنی سنائی نہیں بلکہ جس زمانہ میں احقر نے آپ سے ابوداؤد پڑھی ہے اس زمانہ کی یاد دل سے کبھی نہیں جاسکتی، احقر پر وہ خصوصیت سے عتاب فرماتے تھے، کیونکہ احقر غیر حاضری کا مریض تھا اور ناغہ کے بعد جاتا تو فرماتے۔

"مولی صاحب! شرم نہیں آتی آپ کو! شرم نہیں آتی آپ کو!"

پورا جملہ وہ دو تین بار دہراتے۔ اگر مجھے پہلے شرم نہ بھی آئی ہوتی تو اس وقت ضرور آجاتی، سر جھکا کے بیٹھ جاتا، سیکڑوں طلبا کے مجمع میں ابوداؤد و احادیث پر آپ کی جامع اور تشفی بخش تقریر اگرچہ ابتداءً غیر حاضری کے باعث میرے لئے ذرا جھولدار ہوتی، لیکن جلد ہی آپ کے لبیط انداز بیان اور علمی انکشاف و تجزیہ سے جھول مٹ جاتے اور مجھے محسوس ہوتا کہ شاید میں نے کوئی سبق نہیں چھوڑا ہے۔ یہی احساس مجھے پھر آٹھویں دسویں ناغہ پر ابھارتا اور دل کو تسلی دیتا کہ استاد کی تقریر ایک ہی دن میں اس نقصان کی تلافی کردیگی۔ ایک مشفق استاد ہمیشہ شاگردوں کی لغزش اور قصور پر دلی صدمہ محسوس کرتے ہوئے سرزنش اور تادیب پر مجبور ہوتا ہے چنانچہ کئی بار کی شفقانہ فہمائش کے بعد بھی جب انھوں نے میرے مرض کو زائل ہوتا نہ پایا تو ایک دن فرمانے لگے۔

"مولی صاحب، آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے آپ بیکار تشریف لاتے ہیں"۔ میں جواب دیتا مجرم تھا اور اقراری بشکل عرض کیا۔

"اب آپ معاف فرمادیں"۔

فرمایا "معاف تو کب سے کر رہا ہوں۔ یا تو اب پڑھنے کے لئے

پڑھے ورنہ میں آپ کا نام کاٹ دوں گا۔

اس سرزنش میں وہ یقیناً حق بجانب تھے، یاد ہے کہ شاید نام تو انھوں نے نہیں کاٹا کیونکہ سالانہ امتحان میں کوئی گڑبڑ پیش نہیں آئی لیکن اتنا ضرور کیا کہ جب حاضری کے وقت میرا نام پکارتے تو ان کے انداز آواز سے معلوم ہوتا کہ گویا پہلے ہی معلوم ہے کہ یہ غیر حاضر ہوگا۔ چنانچہ وہ انتظار جو پہلے کبھی میرا نام پکار کر "حاضر جناب" سننے کے لئے کیا کرتے تھے اور خموشی کی صورت میں دوبارہ پکارا کرتے تھے ترک کر دیا گیا۔ اور بے شک کرنا چاہیئے تھا۔

یہ گذری کہانی اگرچہ بے محل یاد آئی۔ مگر اس کی یاد میرے لئے ان کی ذات گرامی کے تصور سے ہمیشہ منسلک رہی ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مدت تک میں بظاہر منقطع رہا، لیکن شاید یہ دلی تعلق کی کارفرمائی تھی کہ انتقال سے کچھ ہی روز پہلے وہ احقر کا نکاح پڑھانے تشریف لائے اور ان کی خلاف توقع آمد سے دل کو یقین ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ انکی ذات بابرکات کے واسطے سے مجھکو سعادت و برکت عطا فرمانا چاہتے ہیں۔

نکاح کے بعد آپ نے مجھ سے فرمایا۔ اب اجازت دیجئے!

استاذ مکرم کا یہ استیذان اس ناکارہ شاگرد کے لئے کس درجہ ندامت آفریں تھا اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ احقر ان کی مشایعت میں کھڑا ہونے لگا تو ہاتھ سے تھامتے ہوئے کہا کہ نہیں آپ بیٹھے رہیں میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا مجھ ناکارہ گستاخ کی خاطر آپ کی یہاں تک تشریف آوری اور اپنے قیمتی وقت کا صرف میرے لئے حد درجہ ممنونیت کا باعث ہے کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔

ارشاد فرمایا۔ مولی صاحب! آپ کیا فرما رہے ہیں، میں تو آپ لوگوں کا خادم ہوں!

اللہ اکبر کتنے فراخ دل تھے ممدوح! آج کل کے رسمی اخلاق میں اس طرح کے جوابات کچھ قابل لحاظ نہیں ہوا کرتے لیکن حضرت کے الفاظ یقیناً اسلئے قابل لحاظ تھے کہ ان کے انداز و اسلوب میں نہ تو رسمی سطحیت تھی نہ وہ "غرور و عجز" جو آجکل کے اکثر علماء و صوفیاء کا اوڑھنا بچھونا بنکے رہ گیا ہے۔ ان میں خلوص اور بے ساختگی تھی، صداقت و دیانت تھی، میرے پاس سوائے خموشی اور شرمساری کے ان کی اس وسیع القلبی اور نیک دلی کا کیا جواب تھا، وہ چلے گئے کسے معلوم تھا کہ آج ان کے سراپا کا دیدار میرے لئے آخری دیدار ہے، خدا ان کو جنات نعیم عطا فرمائے۔

واقعہ یہ ہے وہ ان باقیات الصالحات میں سے تھے جن کی صفات حسنہ کے پرتو سے ماحول کی بہت سی تاریکیاں دھل جاتی ہیں، بہت سی گمراہیاں دبی رہتی ہیں، ان کی رحلت نے جو خلا دارالعلوم —— بلکہ ملت اسلامیہ میں پیدا کیا ہے اس کے پُر ہونے کی بظاہر کوئی امید نہیں اور یوں تو ؎

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے محفل کی

ناظرین ان کے لئے دعائے مغفرت اور پس ماندگان کے لئے دعائے عافیت و صبر فرمائیں۔

(اپریل ۶۳ء)

تبلیغی جماعت کے امیر مولانا یوسفؒ کے انتقال پُرملال پر ان کے تاثرات یہ تھے:-

سانحۂ ارتحال

آج ہی یہ المناک اطلاع ملی ہے کہ تبلیغی جماعت کے محترم امیر حضرت مولانا محمد یوسف صاحب حرکت قلب بند ہونے کے باعث دفعتاً اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ سانحہ تبلیغی جماعت کیلئے جس درجہ غم آفریں ہوگا وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن وہ تمام مسلمان بھی اس غم میں شریک ہیں جنھیں مرحوم و مغفور کے مقام و منصب کا کچھ بھی علم تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا دنیا سے رخصت ہو جانا امت مسلمہ کا ایک بڑا نقصان ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے وہ اس کاز اور مشن کے لئے بہت ہی موزوں انسان تھے جسے "جماعت تبلیغی" کے عنوان سے آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اس مشن کے بعض پہلوؤں سے ہم سب کو اتفاق نہ ہی لیکن یہ حقیقت سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ مرحوم نے اس مشن کی خدمت میں سعی و جہد کا حق ادا کر دیا تھا۔ آدمی وہی قابل تعریف ہے جو اپنے مقصد کی راہ میں تیز گامی سے چلے اور اپنی ساری توانائیاں منزل تک پہنچنے کی جدوجہد میں کھپا دے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو آخرت کی بہترین نعمتوں سے نوازے اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

(اپریل ۶۵ء)

(۲) **شکر گذاری** ان کی ایک خاص صفت تھی، ناسپاسی اور ناشکری کا مظاہرہ انھوں نے کبھی نہیں کیا —
ذرا یہ مضمون پڑھئے۔ جو ان کی مذکورہ صفت کا آئینہ دار ہے —

تنقید نمبر

شکر ہے کہ تنقید نمبر غیر معمولی طور پر پسند کیا گیا۔ یہ توقع تو ہمیں ضرور تھی کہ اس نمبر کا مواد قارئین کے لئے مایوس کن ثابت نہیں ہوگا مگر یہ امید نہیں تھی کہ بہت زیادہ پسندیدگی اور مقبولیت اس کے حصے میں آسکے گی، اللہ تعالیٰ جب کسی پر فضل کرنا چاہتا ہے تو پھر اس کی ہر کوشش کو خیر و برکت کی متاعِ بے بہا سے نواز دیتا ہے۔

ہمیں خودستائی اور تعلّی سے نفرت ہے، لیکن یہ کفرانِ نعمت ہوگا کہ آدمی تحدیثِ نعمت بھی نہ کرے۔ گاہے گاہے یہی تحدیثِ نعمت کا جذبہ ہم سے کچھ کہلوا دیتا ہے۔ آج بھی یہی چند الفاظ کہنے پر مجبور کر رہا ہے۔

نمبر خاصے انتظار کے بعد شائقین تک پہنچا، مگر شائقین ہی کا کہنا ہے کہ انتظار کی تمام کلفت کو اس کے مطالعے نے دھو دیا۔ الحمد للہ آخر اسے اللہ رحیم و کریم کے بے پایاں فضل اور احسان کے سوا کیا کہیں کہ ایک ہم جیسے نااہل، ناتواں، کم علم اور خطا کار بندے نے "تجلی" نام رکھ کر ماہوار چند ورق چھاپنے شروع کئے تو قادرِ مطلق نے ان چند بے مصرف اوراق کو ہزاروں انسانوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیا۔ ہم بیمار تھے اس نے شفا بخشی۔ ہم بے علم تھے اس نے علم عطا کیا۔ ہم بے وسیلہ تھے اس نے وسائل کا دروازہ کھول دیا۔ کن لفظوں میں شکرِ نعمت ادا کریں، بدن کا رُواں رُواں سراپا تسبیح بن جائے، تب بھی رحیم و کریم آقا کے ان احسانات کا حقِ تشکر ادا نہیں ہو سکتا جن سے اس کی نگاہِ کرم نے ایک نافرجام و کم سواد بندے کو نوازا ہے۔

داد و تحسین پر کس کا نفس نہیں پھولتا۔ مگر خدائے ارحم الراحمین کا کتنا بڑا فضل ہے کہ بے شمار داد و تحسین اور توصیف و تبریک کے ہجوم میں بھی ایک پل کے لئے ہمارے دل و دماغ میں یہ وسوسہ تک نہیں گذرتا کہ کامیابی اور مقبولیت کا کوئی حقیقی تعلق ہماری ذاتی صلاحیتوں سے بھی ہے۔ استغفر اللہ۔ ہماری حقیقت ہی کیا ہے ایک قطرۂ آب جسے قدرت کی بے مثال صنعت نے نشوونما عطا فرما کر انسان کا نام دیا اور اس انسان کی ہر صلاحیت ایک بے قیمت کنکر سے زیادہ کچھ نہیں جب تک کہ مشیتِ ایزدی ہی اسے قیمت عطا نہ فرمائے، وہ اور لوگ ہوں گے جنھیں کامرانی و مقبولیت کا نشہ فخر و استکبار کی فضاؤں میں لے اڑتا ہے، یہاں تو ہر آن یہی استعجاب اور تحیّر ہے کہ خدا کی قدرت دیکھئے۔ وہ کس طرح ایک ذلیل و حقیر مشتِ خاک کی بے ڈھنگی کوششوں کو ہزاروں ہزار اہلِ ایمان میں اعلیٰ درجہ کی قدر و قیمت ادا کر دیتا ہے اور اس کے بے انداز خزانوں سے کس دریادلی کے ساتھ عامر عثمانی جیسے نالائق، ناسپاس، کم توفیق، بے عمل، اور نحیف و زار بندے کو دین کا تفقہ اور نقد و نظر کی استعداد عطا کی جاتی ہے خوب کہا ہے ڈاکٹر اقبال رحمہ اللہ نے

تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

لوگ ہمیں مولانا کہتے اور لکھتے ہیں اور ہم اس لفظ کی معنوی عظمت کا احساس کر کے شرم سے پانی ہو جاتے ہیں۔ ہم اور مولانا یہ ایسا ہی ہے جیسے دھوپ میں چمکتے ہوئے ذرّے کو سورج کہہ دیا جائے۔ اطمینان یہ ہے کہ سادہ لوح عقیدت مندوں کی اس "غلط بخشی" میں ہماری اپنی خواہش اور مرضی کا کوئی دخل نہیں۔ خدا اگر پوچھے گا کہ تم ذلیل و خوار مولانا کیسے بن بیٹھے تھے تو ہم بہ اطمینان کہہ سکیں گے کہ یہ آپ کہنے والوں سے پوچھئے۔ ہم نے تو کبھی یہ خواہش نہیں کی کہ لوگ ہمیں ہماری حیثیت سے بڑھ کر القاب و آداب عطا فرمائیں۔

القصہ ذکر تنقید نمبر کی مقبولیتِ عام کا تھا۔ ارادہ یہ ہے کہ چند ماہ بعد پھر ایک خاص نمبر شائع کریں جو زیادہ ضخیم ہو — انتظار کاغذ کے نئے کوٹے کا ہے جو انشاء اللہ جون، جولائی تک مل سکے گا۔ بعید نہیں کہ اگست و ستمبر تک قارئین کی خدمت میں ایک ایسا ہی خاص نمبر حاضر کر دیا جائے جس کا ایک ایک صفحہ ان کے ذوقِ مطالعہ کے لئے خوانِ یغما ثابت ہو واللہ المستعان۔ (۱۱ اپریل ۱۹۶۵ء)

شکرگذاری کا ایک انداز یہ بھی ہے۔

قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ

یہ آدمی ۔ناشکرا اور خیرہ سر آدمی جو زمین کے سینے پر اس طرح دندناتا ہے گویا اس کا توانا جسم اس کے دل و دماغ، اس کی بے مثال صلاحیتیں، اور اس کی روح خود اسی کی کمال تخلیق کا شاہکار ہوں، گویا زندگی اور ... اس کی بے کراں نعمتوں کا کوئی حساب اسے کہیں نہ دینا ہو ـــــ آخر اس کی حقیقت کیا ہے۔ ایک نکتہ، ایک حباب، ایک ذرۂ بے مقدار۔ خالق کائنات کی قدرت و اختیار کے مقابلہ میں اس کی ضعف و بے اختیاری کا تناسب بیان کرنے کے لئے نہ ریاضی کے پاس کوئی فارمولا ہے نہ لغت کے پاس کوئی لفظ۔ کچھ نہ ہونا اور سب کچھ ہونا ان دو متقابل نقروں میں جو نسبت ہے، ٹھیک ایسی ہی نسبت آدمی اور اللہ کے مابین ہے۔ پھر بھی یہ آدمی کتنا احسان فراموش، کیسا خود سر، مغرور، کس درجہ غافل و مدہوش ہے، ظلم و جہول ۔کفور و کنود۔

برتر ہے وہ ذات جس نے عُسر کے ساتھ یُسر، صحت کے ساتھ مرض اور راحت کے ساتھ مشقت پیدا فرما کر غافل و متساہل انسان کے لئے خواب غفلت سے چونکنے، اپنی حقیقت کو سمجھنے اور اپنے کفران و طغیان پر متنبہ ہونے کا زریں موقع بہم پہنچایا۔ راقم الحروف پہلے تو اپنی آئے دن کی بیماریوں اور دشواریوں پر ملول ہوا کرتا تھا، لیکن اب جتنا سوچتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں دیکھتا کہ بیماریوں اور دشواریوں میں خیر خواہی کا پہلو غالب ہے کتنا بصیرت افروز ہوتا ہے وہ منظر کہ ابھی ہم بہت کچھ کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں، اسکیمیں سوچ رہے ہیں، مگن ہیں کہ یہ کریں گے وہ کریں گے، اور ابھی بخار ہمیں آدبوچتا ہے۔ ابھی داڑھ یا کان میں درد شروع ہوجاتا ہے، ابھی آنکھیں دکھنے آجاتی ہیں، ابھی کوئی زہرگداز خبر ہمارے ہوش حواس معطل کر کے رکھ دیتی ہے

بس پھر سارے منصوبے خاک ہیں۔ سارے عزائم دھرے رہ گئے۔ قلم ہاتھ میں ہے مگر انگلیاں جنبش کرنے سے انکار کر رہی ہیں، دماغ سنسنا رہا ہے، توانائیاں ہتھیار ڈال رہی ہیں۔ کہاں ہے ہمارا تبحّر، ہمارا گھمنڈ، ہمارا طنطنہ۔ لاریب کہ یہی وہ لمحات ہیں جب اللہ اپنے بندے کو موقع بہم پہنچاتا ہے کہ وہ اپنی بے حیثیتی کو سمجھے، اپنے کفران و سرکشی کا احساس کرے، اپنے رب کی طرف متوجہ ہو اور سوچے کہ اسی طرح ایک دن اس کے بے حقیقت جسم کو خاک کے سپرد ہو جانا ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ۔

اس موقع سے جس نے فائدہ اٹھایا وہی صاحب بصیرت ہے، وہی دانشور ہے، وہی خوش نصیب ہے۔ صدقے اس رحیم و کریم کے جس نے مرض دے کر صحت کی، مصیبت دے کر آرام و راحت دی اور مجبوریاں دے کر قوت و اختیار کی قدر و قیمت کا صحیح انداز بخشا۔

عاجز تو نہیں کہہ سکتا کہ سعادت مندبندوں کی طرح اس نے بھی عُسر و یُسر کی سبق آموزیوں سے کماحقہ فائدہ اٹھایا ہے، لیکن یہ ضرور عرض کرسکتا ہے کہ انسان کو خودسری اور غفلت سے چونکانے کے لئے حوادث و آلام اور امراض و آفات سے بڑھ کر کوئی تریاق نہیں۔ پلنگ پر ایڑیاں رگڑتے ہوئے یا حوادث و آفات کی گھاٹیوں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے سوچو تم کیا ہو، تم میں کیا دھرا ہے جس پر گردن اکڑا کر چلتے ہو۔ یٰٓاَیُّہَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ـ خدا کو بھول کر خود کو بھلا دینے والو کیا بھول گئے۔ تمہیں منی کے ایک قطرے سے پیدا کیا گیا۔ فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ۔

تمہیں ہو کیا گیا ہے کہ اس خالق و مالک کی ناشکری کرتے ہو، جس نے تمہیں وجود بخشا، پھر وہ اس وجود چھین لینے کے بعد تمہیں دوبارہ وجود بخشے گا اور پوچھے گا کہ کیا کر کے آئے

ہو۔ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ کُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ

ھیھات۔ آیات الٰہیہ کی تلاوت کرنے والے بہت ہیں مگر وہ لوگ کہاں گئے جن کے سینے آیات الٰہیہ کو سُن کر سوز و گداز سے بھر جاتے تھے۔ جن کی عقلِ سلیم نے آیاتِ ربانی کے عطا فرمودہ پیغامات کو اپنے ایک ایک موئے تن میں اس طرح سمو یا تھا کہ وہ خود بھی چلتی پھرتی آیتیں بن گئے تھے۔

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

تجلی کا مدیر بیمار رہتا ہے۔ تجلی اپنے وقت پر شائع نہیں ہو پاتا۔ مشتاق قارئین کو کوفت رہتی ہے۔ کاروباری اعتبار سے ادارہ تجلی کو زیاں پہنچتا ہے۔ یہ سب بظاہر بہت اہم ہے مگر حقیقت میں کچھ بھی اہم نہیں۔ اہم یہ ہے کہ ہم نے ٹھوکروں سے، آفات و حوادث سے، امراض و عوارض سے سبق لینا چھوڑ دیا حالانکہ کارگہِ عالم حوادث و آلام اور امراض و عوارض کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ آدمی جاگے۔ عبرت پکڑے، اپنے انجام کی طرف متوجہ ہو۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ وَّ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی۔ (النسا) کہدو اے پیغمبر دنیا کی پونجی تو بہت قلیل ہے اور آخرۃ ہی بہتر ہے اس کے لئے جو اللہ سے ڈرے۔ یٰقَوْمِ اِنَّمَا ھٰذِہِ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَۃَ ھِیَ دَارُ الْقَرَارِ۔ (المؤمن)

اے قوم! یہ دنیا کی زندگی متاع ہے اسے تو بس تھوڑا سا برت لینا ہے ہمیشہ رہنے کی جگہ تو آخرت ہی ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ مصیبت اور تکلیف میں آدمی خدا کو یاد بھی کرتا ہے تو یہ یاد عموماً دیرپا نہیں ہوتی۔ اِدھر مصیبت کے بادل چھٹے اُدھر اس کی خدا فراموشیاں انگڑائی لے کر بیدار ہوگئیں، پھر ظلم یہ کہ مصیبت ختم کر دینے کا کریڈٹ دعا مثلاً کے بجائے ان اسباب و وسائل کو دیتا ہے جو بظاہر دفع مصیبت کا سبب بنے ہیں اور ان افراد و اشخاص کو جن کے واسطے سے یہ اسباب و وسائل میسر آئے ہیں، تشکر و نیازمندی کا وہ سرمایہ پیش کر دیتا ہے جس کا حقدار سوائے اللہ کے اور کوئی بھی نہیں۔ اس عامۃ الورود صورتِ حال کو اللہ نے کیسے پیارے انداز میں بیان فرمایا ہے:۔

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّہٗ مُنِیْبًا اِلَیْہِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَہٗ نِعْمَۃً مِّنْہُ نَسِیَ مَا کَانَ یَدْعُوْا اِلَیْہِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰہِ اَنْدَادًا لِّیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ قُلْ تَمَتَّعْ بِکُفْرِکَ قَلِیْلًا اِنَّکَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ (الزمر)

اور جب آپہنچی انسان پر سختی تو پکارنے لگا اپنے رب کو بڑی توجہ کیساتھ پھر جب اسکے رب نے اپنی طرف سے نعمت عطا فرمادی تو بھول گیا اس چیز کو جسکے لئے پہلے اپنے رب کو پکار رہا تھا اور لگا اللہ کی برابر ٹھیرانے اور وں کو تاکہ اسکی راہ سے بھٹکائے کہدو اے محمد! اٹھالے تھوڑا سا فائدہ اپنے کفران نعمت سے بلاشبہ تو دوزخیوں میں سے ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

دیکھ لیجیے یہ منکرین خدا یا مشرکین کفار کا ذکر نہیں، ان لوگوں کا ذکر ہے جو خدا کو نہ صرف مانتے ہیں بلکہ کلفت و مصیبت کی گھڑیوں میں دیوی دیوتاؤں کے عوض اسی کو رجوع اور قلب تضرع کے ساتھ پکارتے ہیں، اسی سے دعا کرتے ہیں۔ اسی کو دافع البلیات اور شافی جانتے ہیں۔ انھیں اللہ نے مصیبت میں ڈال کر موقع دیا کہ غفلت سے چونکیں، بدعملی اور خدا فراموشی سے باز آئیں، لیکن ان کا رویہ عموماً یہ ہے کہ مصیبت پڑنے پر خدا کو پکارا اور جب مصیبت دور کر دی گئی تو بجائے اس کے کہ اللہ کی شکرگذاری کرتے ان کی زبانوں پر اور ذہنوں میں اس طرح کی باتیں ہوتی ہیں کہ فلاں ڈاکٹر بہت اچھا ہے، فلاں دوا بڑی اکسیر ہے فلاں بزرگ کا تعویذ نہایت تیر بہدف ہے، فلاں پیر غوث دستگیر ہیں فلاں مزار پر جو دعا کرلو مقبول ہوتی ہے۔ وغیر ذلک۔ یہ باتیں نہ صرف ان کی اپنی گمراہی کا ثبوت ہیں بلکہ ان کے ذریعہ وہ دوسروں کو خدا کی راہ سے بھٹکا رہے ہیں، بیشک ڈاکٹر اچھے اور بُرے بھی ہوتے ہیں، دوائیں زود اثر بھی ہوتی ہیں اور بے اثر بھی۔ اولیاء اللہ کسی کے لئے دعا کریں تو مقبول ہونا کچھ مستبعد نہیں، تعویذ میں کچھ نہ کچھ اثر ہے لیکن ایک تو یہ ہے کہ اسباب و وسائل کو ثانوی درجہ میں اہمیت دیتے ہوئے اصل معطی و بخشندہ خدا ہی کو سمجھنا اور

[illegible] کا فرق ہے۔ ایک محمود ہے اور دوسری مردود۔ ایک بجا ہے اور دوسری کلیتہً باطل۔ یہ ٹھیک ہے کہ زبان سے ہم صاف صاف نہیں کہتے کہ فلاں شخص یا فلاں ذریعہ اللہ کے سوا [illegible] ہے۔ نہ یہ کہتے ہیں کہ مرض اور مصیبت دور کرنے میں اللہ کا کوئی ہاتھ نہیں لیکن یہ سکوت بجائے خود کفران احد یہ حسی میں داخل ہے اللہ کا یہ مطالبہ نہیں کہ مجھے بھی کارساز مانو، وہ مطالبہ کرتا ہے کہ مجھے ہی کارساز مانو۔ ان دونوں باتوں میں بونِ بعید ہے۔ ایک اسلام ہے تو دوسری کفر۔ ایک شکران نعمت ہے تو دوسری کفرانِ نعمت۔ پھر سکوت نہ بھی کیا جائے بلکہ اللہ ہی کو کارساز ماننے کا اعلان و اظہار ہی کر دیا جائے۔ تب بھی ذہن و اعتقاد کی کیفیات کا صحیح فیصلہ زبان سے نہیں عمل سے ہوا کرتا ہے۔ ہمارا عمل اگر احسانِ الٰہی کے احساس اور اسی کے امتنان و تشکر کا مظہر نہیں تو یہی ہمارے کفران اور غلط اندیشی کا سب سے بڑا برہان ہے۔ ہم خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کے لئے بھی گمراہی کا وسیلہ بنے۔ ہمیں ڈرنا چاہیئے کہ اتنک من اصحٰب النار کا آتشیں دائرہ کہیں ہمیں بھی تو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گیا۔

بات پھیل گئی۔ تذکیر صرف اس نکتہ کی مقصود تھی کہ بیماری اور مشقت اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر وہ نفس امارہ کی وسیلہ کاری کے لئے تازیانۂ عبرت بن کر ذہن انسانی کو اطاعت و بندگی کی طرف منعطف کر دے اور آرام و راحت کی [illegible] غفلت دبے حسی کی جو گرد ذہن و قلب پر تہہ بر تہہ جمالی چلی آ رہی ہے اسے دھو ڈالے۔

لیکن یہی بیماری اور مشقت عذاب و سزا بھی ہے اگر انسان اس سے کوئی سبق نہ لے یا سبق لے تو محض وقتی۔ پھر اللہ اس پر رحم [illegible] و راحت کی نعمتیں نازل کر دے تو وہ بھول ہی جائے کہ کس [illegible] مصیبت سے نکالا اور کس چشم کرم کے اشارے سے [illegible] دوام کا استیصال ہوا۔ ایسے بدنصیب

[illegible] والی آیت میں بیان [illegible]

عبادت کے سلسلہ میں اللہ نے سورۂ بقرہ [illegible]

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ — پس اس کی [illegible]
عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ — جس پر مٹی [illegible]
وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا — پھر اس پر [illegible]
لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ — کر چھوڑا ان کا [illegible]
مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا — نہیں لگتا ایسے لوگوں [illegible]
يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ — اس چیز کا [illegible]
— اللہ نہیں ہدایت [illegible]

✽ ✽ ✽

عاجز کی جس وقتی بیماری کے باعث مارچ [illegible] بیس دن موخر ہوا اس کے سلسلے میں عیادت [illegible] اور دعائیں کرنے والے دوستوں کو فرداً فرداً شکریہ ممکن نہیں ہوا اس لئے آج میں من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ کے تحت ان سب حضرات کی [illegible] تشکر پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ زیر نظر مطالعہ کرنے کے بعد وہ یہ الزام نہ دے سکیں گے [illegible] یک ماہی خلا کی تلافی کرنے میں اپنی حقیر استطاعت [illegible] محنت نہیں کی ہے۔ وللہ الحمد

(۲۸۰ کا بقیہ)

کا ادنیٰ سا انتظار بھی اپنے اندر سکون و طمانیت کا عجیب [illegible] چنانچہ تجلی کے سلسلہ میں بارہا ہمیں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ [illegible] راقم الحروف کیلئے ظاہری اعتبارات سے جس قدر یا [illegible] گذرے اگر ان میں رحمتِ خداوندی سے نور [illegible] ہاتھ پیر چھوڑ دینا یقینی تھا۔ صدقے اس ارحم الرا[حمین] [illegible] ہم جیسے رو سیاہوں کو اپنی رحمت پر تکیہ کر [illegible] اسی کی عنایت و رحمت کا احسان ہے کہ تجلی کا [illegible] ہو جانے کے باوجود ناغہ نہیں ہوا اور یہ تاخیر [illegible] اگلے شمارے سے باقی نہ رہے گی

[illegible] اپریل

غلطیوں کا اعتراف

برملا اپنی غلطیوں کا اعتراف کرلینا ان کی ایک صفت تھی جو فی زمانہ دوسرے لوگوں میں نظر نہیں آتی۔ ہٹ دھرمی کی راہ انھوں نے کبھی نہیں اختیار کی۔ تجلی کے بیسیوں اوراق میں انھوں نے علی الاعلان اپنی غلطیوں کا اعتراف کرکے بارہا اپنی عظمت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ آپ مئی ۶۵ء کا تجلی اٹھاکر دیکھیے صفحہ ۲۰ پر یہ عبارت نظر آئے گی۔

ایک غلطی کی اصلاح

نومبر ۶۴ء کے تجلی میں "غسل انزال" کے عنوان سے ایک سوال تھا جس کا ہم نے مختصر سا جواب دیا تھا۔ پھر اسی جواب کے متعلق ایک صاحب نے اعتراض کی شکل میں اپنا سوال پیش کیا جس کا جواب ہم نے اپریل ۶۵ء کے تجلی میں دیا۔

اب جناب تاج الدین اشعر نے اسی موضوع پر ایک خاصا مفصل استفسار ارسال کیا ہے جو فی الحقیقت استفسار نہیں ہے بلکہ ہمارے دیے ہوئے جواب کی گرفت ہے۔

ہمیں اگر اس گرفت کو غلط ثابت کرکے اپنے جواب کی تصویب و توثیق کرنی ہوتی تو بلاشبہ ہم یہ پوری تحریر نقل کرکے گفتگو کرتے۔ لیکن اس گراں قدر تحریر کی روشنی میں ہم نے محسوس کیا ہے کہ قصور ہم سے ہی سرزد ہوا ہے اور صحیح تر زاویۂ نظر وہی ہے جسے اشعر صاحب نے پیش فرمایا ہے۔ جب ہم پر اپنا قصور واضح ہو جائے تو بات کی پچ اور کج بحثی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اشعر صاحب کو اور ان کے تمام دوستوں کو جو کبھی کبھی ہماری لغزشوں کی نشاندہی فرماتے رہتے ہیں، جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس واضح اعتراف خطا کے بعد ہم تصریح کرتے ہیں کہ خطا کی نوعیت کیا ہے۔

صحیح مسلم کی کتاب الحیض میں ایک حدیث آئی ہے:۔

حضرت ابوسعید خدریؓ بیان فرماتے ہیں۔

خرجت مع رسول الله صلی الله علیہ وسلم یوم الاثنین الی قباء حتی رسول الله صلی الله علیہ وسلم علی باب عتبان فصرخ بہ فخرج یجر ازارہ فقال رسول الله صلی الله علیہ وسلم اعجلنا الرجل فقال عتبان یا رسول الله رأیت الرجل یعجل عن امرأتہ ولم یمن ماذا علیہ قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم انما الماء من الماء۔

پیر کا دن تھا میں رسول اللہ کے ساتھ مسجد قبا کی طرف جا رہا تھا، جب ہم بنو سالم کے محلے میں پہنچے تو حضور عتبان کے دروازے پر رک گئے اور انھیں آواز دی عتبان فوراً ہی باہر نکلے مگر حال یہ تھا کہ وہ اپنے کمربند کو گھسیٹ رہے تھے حضورؐ نے اس وقت زیر لب فرمایا کہ ہم نے اس شخص کو جلدی میں ڈال دیا عتبان بولے کہ اے اللہ کے رسول اگر ایک شخص اپنی بیوی سے صحبت کر رہا ہو مگر کسی وجہ سے قبل انزال ہی الگ ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے کیا وہ غسل کرے یا نہیں؟ حضورؐ نے جواب دیا کہ پانی (غسل)، پانی (ماءِ منی) سے واجب ہوتا ہے۔

اس حدیث کی شرح میں امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امت اس بات پر اجماع کر چکی ہے کہ جماع سے غسل واجب ہو جاتا ہے چاہے انزال نہ ہوا ہو اور صحابہؓ کی ایک جماعت یہ خیال رکھتی تھی کہ بغیر انزال کے غسل واجب نہیں ہوتا۔ پھر ان میں سے بعض نے اپنے خیال سے رجوع کرلیا۔

اس شرح سے ظاہر ہوا کہ اگرچہ بعض صحابہ نے اپنے خیال سے رجوع کرلیا تھا مگر کچھ صحابہؓ پھر بھی ایسے رہ گئے تھے جنھوں نے یہی خیال قائم رکھا کہ انزال نہ ہو تو غسل واجب نہ ہوگا۔

حافظ ابن حجرؒ نے وضاحت کی ہے کہ اس مسئلہ میں نہ صرف تابعین کے درمیان خاصا مشہور اختلاف رہا، بلکہ تابعین کے بعد بھی اختلاف کا وجود ملتا ہے مگر بعد میں جمہور امت اس بات پر متفق ہو گئے کہ وجوب غسل کے لیے انزال شرط نہیں صرف جماع کافی ہے۔

ان دونوں جلیل القدر شارحین کے فرمودات سے اگرچہ یہ حکم فقہی مؤکد ہوتا ہے کہ غسل کے وجوب میں انزال شرط نہیں لیکن یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ حکم صحابہ وتابعین کے مابین متفق علیہ نہیں رہا ہے علاوہ ازیں مسلم ہی میں ابوسعید خدریؓ سے ایک اور روایت موجود ہے جس کے الفاظ زیادہ واضح ہیں۔ کسی انصاری کے جواب میں حضور فرماتے ہیں۔

إِذَا أُعْجِلْتَ أَوْ أُقْحِطْتَ — جب تو (کسی وجہ سے) جلدی کرے
فَلَا غُسْلَ عَلَيْكَ — اور انزال کے بغیر ہی الگ ہوجائے
وَعَلَيْكَ الْوُضُوءُ۔ — تو پھر غسل لازم نہیں ہے، ہاں وضو لازم ہوگا۔

نیز امام احمد سے ایک روایت رافع ابن خدیج کی بھی اسی مفہوم و منشاء کی منقول ہے گویا اس امر واقعہ میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ابتداءً حضور نے وجوب غسل کو انزال کے ساتھ مشروط فرمایا تھا، انزال نہ ہو تو نفس مجامعت سے غسل واجب نہ ہوتا تھا۔ اسے امام نوویؒ حافظ ابن حجرؒ اور دیگر ائمہ وفقہاء نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مزید یہ کہ مسلم کا عنوانِ باب اسے واضح کرتا ہے۔

(ان الجماع کان فی اوّل الاسلام
لا یوجب الغسل الا ان ینزل المنی)

ہاں اس کے بعد حضورؐ نے بالیقین ایسا قول صادر فرمایا کہ انزال کی قید ختم ہوگئی اور نفس جماع ہی پر غسل ضروری ٹھیر گیا۔ اس تبدیلیٔ حکم کو بعض علماء نے "نسخ" سے تعبیر کیا ہے

نسخ قرآن وحدیث دونوں میں بلاشبہ موجود ہے لیکن جن علماء نے ناسخ ومنسوخ کی بحث میں منطقی زاویۂ نظر سے غور کیا ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ نہ تو وجوہ نسخ سب جگہ یکساں ہیں نہ منسوخ شدہ حکم کی طبعی نوعیت ہر جگہ ایک ہے۔ یہ بحث خاصی دقیق اور مشکل ہے اس لیے یہاں اس سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم صرف اتنا بتا دینا چاہتے ہیں کہ وجوب غسل سے متعلق احادیث اور ان کی شرح پر نظر کرتے ہوئے ہمارے ذہن میں یہ خیال قائم ہوا تھا کہ ابتداءً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجوب غسل کو انزال پر منحصر رکھنا ثابت کرتا ہے کہ وجوب کی اصولی جوہری اور طبعی بنیاد انزال ہی پر ہے اور بعد میں جو انزال کی قید اڑا کر نفس جماع پر وجوب کا فیصلہ کر دیا گیا ہے وہ حکمت خارجیہ کے درجہ میں ہے جس طرح مثلاً کتب فقہ میں یہ جزئیہ بیان کیا گیا ہے کہ نابالغہ پر واجب نہیں ہوگا مگر تخلّقاً اور اعتیاداً اسے بھی غسل کا حکم دیا جائے گا۔

یا مثلاً: قبر کو سامنے رکھ کر نماز سے منع کیا گیا حالانکہ اس میں بجائے خود (بحد ذاتہ) کوئی قباحت نہیں تھی لیکن اشتباہ شرک کے باعث سد باب کے ذریعہ کے طور پر یہ ممانعت کی گئی۔

ایسی مثالیں بے شمار ہیں جن میں ایک شے واجب تو کر دی گئی ہے لیکن اس کا وجوب بجائے خود مقصود نہیں ہے بلکہ بطور وسیلۂ مقصود شارع کے پیش نظر ہے۔ ہم نے یہی گمان کیا کہ نفس جماع پر وجوب غسل کا حکم اسی نوع کی ایک چیز ہے۔ اسی لیے نومبر والے جواب میں یہ کہنے کی نوبت آئی کہ:

"ان حدیثوں میں بنیاداً کوئی تعارض نہیں"

نیز یہ کہ

"صحیح تر یہ ہے کہ غسل تو انزال سے واجب ہوتا ہے لیکن صرف دخول پر بھی غسل کرنا چاہیے تاکہ طہارت و نظافت کا احساس ترو تازہ رہے۔
واللہ اعلم بالصواب"

اب شعر صاحب کے تفصیلی تنبیہ کی روشنی میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ اپنے دقیق خیال کو بیان کرنے میں ہم نے الفاظ کا انتخاب درست نہیں کیا اور یہ بھی ہماری غلطی ہی تھی کہ جس لطیف غامض خیال کا اظہار کرنے کے لیے کافی احتیاط اور تفصیل کی ضرورت تھی اسے ہم نے احتیاطی اور ایسے اختصار کے ساتھ بیان کر دیا کہ صورت مسئلہ مسخ ہو کر رہ گئی۔

گو کہ نومبر ۶۴ء اور اپریل ۶۵ء دونوں ہی میں زور ہم نے اسی پر دیا ہے کہ فقہی اعتبار سے بات وہی مانی جائے گی جسے

فقہائے کرام فیصل کر دیں گے لیکن پھر بھی ہمارا قصور قصور ہی رہتا ہے جس پر ہمیں ندامت ہے (مئی ۶۵ء)

نومبر کا شمارہ اٹھاکر ورق گردانی کیجیے۔ صفحہ ۶ پر تحریر دکھائی دے گی۔

ہماری خطائیں

انسان نسیان و خطا کا پتلا ہے، بھول چوک تو اسکی گھٹی میں پڑی ہے شاید اسی لیے قرآن میں یہ دعا تلقین کی گئی ہے رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا۔ بڑے بڑے عقلا اور فضلا سہو و غفلت کا شکار ہوتے رہتے ہیں تو ہم جیسے بے بضاعت کس شمار و قطار میں ہیں مگر یہ اللہ کا شکر ہے کہ ناظرین تجلی میں ایک بڑا حلقہ اہل علم کا بھی ہے جو ہماری تحریروں پر گہری نظر رکھتا ہے اور جہاں کوئی خامی نظر آئی ہمیں از راہِ اخلاص متنبہ کر دیتا ہے غلطیوں پر ٹوک دینے والے احباب اللہ کی نعمت ہیں۔ ہم تمام ایسے لوگوں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے پہلے یا اب ہمیں ٹوکنے کی زحمت گوارہ فرمائی ہے۔ اسوقت ہم نے اپنی تین غلطیاں عام ناظرین کے سامنے لاتے ہیں جن سے بعض ناظرین ہی نے مطلع فرمایا ہے۔

پہلی یہ کہ اگست ۶۴ء کے تجلی میں ص ۱۳ کالم ۱ سطر ۲۵ میں یوں لکھا گیا۔

"انھیں اپنے امین و صادق چچا کی دیانت و صداقت پر یقین تھا"۔

انھیں کا مرجع ابوطالب ہیں، ظاہر ہے وہ تو حضورؐ کے چچا تھے نہ کہ بھتیجے لکھنا "بھتیجے" چاہیے تھا لکھا گیا چچا۔ اس کا باعث جہل نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ چند ہی سطر پہلے تو ہم خود ہی لکھ چکے ہیں کہ ابوطالب حضورؐ کے چچا تھے۔ اب اسے ذہنی قلابازی کے سوا کیا کہیں۔

دوسری یہ کہ فروری ۶۴ء کے پرچہ میں ہم نے عنوان دیا "ارواح و اجنہ کی باتیں"

ایک کرم فرما نے آگاہ کیا کہ اجنہ تو جنین کی جمع ہے "جن" کی نہیں۔ واقعی بات درست ہے، ہم تو پہلے بھی اجنہ ہی لکھتے رہے ہیں حالانکہ جن کی جمع جنات (بکسر جیم) ہونی چاہیے۔ جنت کی جمع جَنّات (بفتح جیم) گو کہ مادہ جن اور جنین کا ایک ہی ہے۔ باب ایک ہی ہے۔ تاویل ممکن ہو سکتی ہے مگر ہم ایں و آں کے بغیر اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہیں۔

تیسری یہ کہ ستمبر ۶۴ء کے شمارے میں صفحہ ۱۴۱ پر ہم نے ایک سوال کے جواب میں کہا ہے کہ فجر و عصر کے بعد امام کا مقتدیوں کی طرف منھ کر کے بیٹھنا پسندیدہ نہیں۔ یہ ہم سے قصور ہوا ہے۔ متعدد قارئین کی رہنمائی سے پتہ چلا کہ حدیث صحیح اس کے جواز میں موجود ہے۔ گو ناجائز ہم نے کبھی نہیں کہا تھا لیکن ہمارے آقاؐ نے اگر ایک عمل کیا ہے اور آپ کے کسی قول و عمل نے اسے منسوخ بھی نہیں کیا تو اسے ناپسندیدہ قرار دینا بھی کیسے درست ہو سکتا ہے۔ پھر متنبہ ہو جانے کے بعد کتب فقہ میں ہم نے دیکھا تو وہاں بھی مقتدیوں کی سمت منھ کر کے بیٹھنے کو دائیں بائیں رخ کر کے بیٹھنے کی طرح جائز تسلیم کیا گیا ہے لہٰذا ہمیں یہ اعتراف کرتے ہیں ادنیٰ تامل نہیں کہ اپنے جہل پر ہم شرمندہ ہیں، ہمارے قلم سے شاید اس ذہنی پس منظر میں لغزش ہو گئی ہے کہ بچپن سے آج تک اپنے بزرگوں اور استادوں کو دائیں بائیں بیٹھتے دیکھا۔ مقتدیوں کی طرف چہرہ کر کے بیٹھتے نہیں دیکھا۔ اس مشاہدہ نے تقلیدی ذہن کو اس خیال پر جما دیا کہ یہ تیسری شکل ناپسندیدہ ہی ہوگی ورنہ زیر عمل کیوں نہ آتی۔ بات چونکہ کسی اہم مسئلہ کی نہیں تھی اس لیے یہ بھی خیال آیا کہ کتاب ہی اٹھاکر دیکھ لیں وجہ کچھ بھی رہی ہو قصور بہرحال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ درگذر فرمائے اور رہنمائی دینے والوں کو اجر دے۔

(نومبر ۶۴ء)

نومبر ۶۶ء کے شمارے صفحہ ۶ ملاحظہ فرمائیے

تصحیحات

انسان سہو و نسیان کا پتلا ہے پھر ہم جیسے فرومایہ انسان تو جتنی غلطیاں بھی کر جائیں تھوڑی ہیں فی الحال دو فروگذاشتوں کی طرف بعض احباب نے توجہ دلائی ہے۔ ضروری ہے کہ

ان کی تلافی کردی جائے۔ اول یہ کہ رسالے کے نمبر جلد و نمبر شمار میں دو بار کتابت کی غلطی ہوچکی ہے جس سے اس کی عمر ایک سال ایک مہینہ بڑھ گئی اسے حذف کرکے اس بار صحیح نمبر دیے گئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ جون ۷۶ء کے تجلی میں صفحہ ۲۰ پر "مولانا عبدالشکور" کے ساتھ "جناب اور صاحب" چھوٹ گیا ہے یہ سہو کاتب کا نہیں ہمارا ہوگا اس سے موصوف کے ادب میں جو کمی واقع ہوئی اس پر ہم شرمندہ ہیں۔ حاشا کہ ترک تحقیر کی نیت سے نہیں تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ہماری عقیدت و محبت محتاج بیان نہیں مگر ہماری تحریروں میں جگہ جگہ "مولانا مودودی مل جائے گا" اس سے ثابت ہوا کہ روانی تحریر میں ہم واقعی تعظیم سے چوک جاتے ہیں ورنہ ارادہ تحقیر کا ہرگز نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔ جن حضرات کو ہماری اس چوک سے کبھی تکلیف پہنچی ہے ان سے ہم دست بستہ معافی چاہتے ہیں۔

نومبر ۷۴ء کا شمارہ دیکھیں گے تو پہلے ہی صفحہ پر ان الفاظ کا مشاہدہ ہوگا۔

ہماری ایک بھول

تجلی طلاق نمبر میں صفحہ ۱۳۶ پر ہم نے مولانا شمس پیرزادہ پر اعتراض کیا تھا کہ رفاعۃ القرظی والی روایت مسلم شریف میں موجود ہی نہیں ہے جب کہ ہم نے حوالہ مسلم ہی کا دیا ہے۔ چند روز ہوئے مولانا موصوف کا مراسلہ ہمیں ڈاک سے موصول ہوا جس میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ اعتراض درست نہیں یہ روایت مسلم میں موجود ہے البتہ چوک ان سے یہ ہوئی ہے کہ حوالہ "مسلم کتاب الطلاق" کا دے گئے ہیں حالانکہ یہ روایت کتاب النکاح میں آئی ہے۔

ہم ان کا پورا مراسلہ ہی شائع کر دیتے لیکن پرچہ مرتب ہوچکا بس یہی صفحہ زیر تکمیل ہے لہٰذا بات اگلے ماہ پر اٹھا رکھنے کے بجائے ہم نے اپنے الفاظ میں یہیں ان کے مراسلہ کا خلاصہ بیان کر دیا، کون جانے اگلے ماہ تک ہم زندہ بھی رہیں یا نہ رہیں۔ اپنے کسی قصور سے آگاہ ہوجانے کے بعد ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ جلد از جلد اس کا اعلان کر دیا جائے۔ مولانا موصوف کو جو تکلیف اس قصور سے پہنچی ہے اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ لیکن یہ بہرحال ظاہر ہے کہ قصور کا باعث ان کا غلط حوالہ دینا ہے۔ ویسے نفس بحث پر اس قصور کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس روایت پر ہم نے ہر پہلو سے بحث کی ہے جو ہماری دانست میں کافی شافی ہے۔ مراسلہ میں یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ جو معارضہ تجلی نے موصوف کے مقالہ پر کیا ہے اسکے جواب میں ایک کتاب شائع کی جارہی ہے۔ اس اطلاع سے خوشی ہوئی۔ ہم بڑے شوق سے اس کتاب کے منتظر رہیں گے۔

(نومبر ۷۴ء)

فروری کے شمارے میں صفحہ ۳ پر یہ اعلان دیکھا جا سکتا ہے۔

تصحیح الاغلاط

(۱) دسمبر ۷۴ء کے شمارے میں تجلی کی ڈاک کے تحت صفحہ ۳۵ پر ہم نے جناب فضا ابن فیضی کے ایک شعر کو یایں طور نشانۂ اعتراض بنایا تھا کہ "یاد در آتا" خلاف محاورہ ہے۔ اشاعت کے بعد نہ جانے کتنے قارئین نے خطوط کے ذریعہ تنبیہ فرمائی کہ تمہارا اعتراض غلط ہے۔ ثبوت میں غالب کا معروف مصرعہ لکھا یاد در آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جاتا۔ لطف یہ ہے کہ یہ شعر خود ہماری یادداشت کے کسی گوشہ میں ایک عرصہ سے استراحت فرما تھا۔ پہلی ہی تنبیہ پر آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور ہمیں اپنی حالت پر تعجب ہوا کہ کس عالم میں ہم نے فضا صاحب پر اعتراض جڑ دیا خدا ان بزرگوں کی مغفرت فرمائے جنھوں نے درج شعر لکھا تھا۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

ہمیں خوشی ہے کہ قارئین تجلی میں بہت لوگ ایسے ہیں جو بروقت ہمیں ہماری غلطیوں پر ٹوک سکتے ہیں اور ہمیں افسوس ہے کہ بعض اوقات ہم سے فاحش غلطیاں ہو جاتی ہیں اللہ ہمیں ہدایت دے۔ امید ہے فضا صاحب اس قصور کے لیے معاف

فرمائیں گے۔

(۲) ایک کرم فرما کے خط سے پتا چلا کہ دسمبر کے شمارے میں صفحہ ۶۸ پر عبارت یوں چھپی ہے:

"تم ہر طرح کی کامرانیوں سے دوچار ہو سکتے ہو"۔

کرم فرما کی گرفت درست تھی کہ "دوچار" کا لفظ یہاں بے محل ہے "ہمکنار" ہونا چاہیے۔ ہم نے اپنے مسودے میں دیکھا وہاں "ہمکنار" ہی تھا۔ گویا چوک ہم سے نہیں ہوئی، کاتب صاحب نے کمال فن دکھایا ہے یہ بات ہم سخت معیوب سمجھتے ہیں کہ اپنی غلطی کاتب اور مصحح کے سر مڑھ دیں، مگر یہاں قصور ان ہی صاحبان کا نکلا، ہمارے قلم نے "ہمکنار" ہی لکھا تھا۔ یقین کرنا یا نہ کرنا قارئین کے اختیار میں ہے

(فروری ۷۵ء)

ان کا ایک مرتب کردہ آخری شمارہ اٹھا کر دیکھیے جو ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا تھا۔ اس میں پہلے ہی صفحہ پر اس انداز میں اپنی لغزشوں کا اعتراف موجود ہے:

تصحیح اغلاط

(۱) پچھلے شمارے میں صفحہ ۶۷ پر طاہر تلہری کے شعر میں یا دل کی جگہ دل چھپ گیا (غم کھائے دل صحیح ہے)

(۲) تجلی فروری ۷۵ء صفحہ ۵۱ کالم ۱ پر ابو طالب پر رضی اللہ عنہ کی علامت رضؓ چھپ گئی ہے، وہ غلط ہے ابو طالب اسلام نہیں لائے تھے۔ لہٰذا رضی اللہ عنہ [illegible] لکھا جائے گا۔

(۳) ایک دینار ہندوستانی اوزان کے اعتبار سے چار ماشہ چار رتی کا ہوتا ہے نجی ڈاک سے دیے ہوئے جوابات میں اگر ہم نے کسی کو اس سے مختلف وزن لکھ دیا ہے تو اسے حسابی غلطی تصور کیا جائے۔ اگر مثلاً دس دینار مہر کی رقم میں شامل ہیں تو ان کا سونا ۳ تولہ ۹ ماشہ بنے گا (گویا پونے چار تولہ) اور اسی کی رائج الوقت قیمت یا پھر اتنا ہی سونا ادا کرنا ہوگا۔ بعض کتب فقہ میں دینار کا وزن کچھ اور لکھا ہوا ہے وہ درست نہیں۔ اس پر ان شاء اللہ ہم جلد ایک مضمون لکھنے والے ہیں تاکہ سونے چاندی کے نصاب زکوٰۃ کے تعین میں جو غلطی ہمارے بعض متاخرین علماء سے ہوگئی ہے اس کی اصلاح ہو۔

(۴) جناب شمیم کرہانی کی "صبح فاراں" کے تبصرے میں لفظ "قتال" پر کچھ بحث کی گئی تھی۔ پھر یہ بحث دسمبر ۷۴ء کے تجلی میں بھی تازہ ہوئی۔ اس کے سلسلہ میں مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) کے ایک ذی علم مہربان نے ہمیں ہمارے علمی قصور پر متنبہ کیا تھا۔ اس پر جواباً ہم نے انھیں خط لکھا۔ مگر اس کا جواب ہمیں نہ مل سکا۔ بہرحال بطور ماحصل ہمیں اعتراف ہے کہ قتال بطور مبالغہ عربی میں مستعمل ہے جس کے نظائر فاضل موصوف نے پیش کیے ہیں۔ اپنے افلاس علمی اور قلت مطالعہ کا اقرار ہمیں پہلے بھی تھا، آج بھی ہے۔ اللہ ہمیں معاف فرمائے اور ان تمام اہل علم کو جزائے خیر دے جو ازراہِ کرم رہنمائی کی زحمت اٹھاتے ہیں۔

(۴) اور ان کی یہ تحریر ہر حال میں امید سے وابستگی اور عاجزی وانکساری کی آئینہ دار ہے۔

اللہ جل شانہ نے بار بار اپنے رحیم وکریم ہونے کا تذکرہ فرما کر لاتقنطوا کا حکم صادر کیا اور واضح ترین مثالیں دے کر سمجھایا کہ اے نادانو! مادی اسباب اور ظاہری وسائل کو ہی سب کچھ سمجھ کر ہماری رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ اسباب و وسائل ہمارے ادنیٰ اشارے سے بدلتے ہیں اور جن لوگوں کو عقل ہے وہ بد سے بدتر حالات میں بھی ہماری رحمت و نوازش سے بدگمان نہیں ہوتے۔

اس تعلیم اور نصیحت کے پیچھے کتنا پائدار فلسفۂ حیات اور سکون و اطمینان کی کتنی لازوال دولت ہے۔ اس کی پوری حقیقت تو وہی خوش قسمت جان سکتے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کا مطیع بنالیا اور اس کے ہر حکم پر گردنیں جھکا دیں لیکن ہم جیسے روسیاہ و بدبخت بھی جن کی زندگی سراپا معصیت ہے، جن کے قلوب حبِ دنیا کی گندگی سے آلودہ اور جن کے دماغ اسبابِ عقل کے غلام ہیں اتنا ضرور محسوس کرتے ہیں کہ رحمتِ خداوندی کا معمولی سا سہارا اور غیبی کارسازی

کیا اُن کی یہ تحریر بھلائی جا سکتی ہے

مسلمانوں کی عملی زندگی دینی مشاغل اور مظاہر سے کتنی ہی خالی کیوں نہ ہو جائے مگر جب تک ان کے معاشرے میں اسلام کے عائلی قوانین کی کارفرمائی ہے، کوئی بھی دوسری تہذیب و ثقافت ان کے قومی وجود اور ملی تشخص کو اپنے اندر ضم نہیں کر سکتی۔ ان عائلی قوانین کا اصطلاحی نام خواہ پرسنل لا رکھ لیا جائے یا کچھ اور بہرحال یہ اسلامی معاشرے کے قلعے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی لئے ہر وہ قوم جو اسلام سے عناد رکھتی ہے اس فکر میں رہتی ہے کہ جس طرح بھی ہو اس قلعہ کی دیواروں میں شگاف ڈال دیئے جائیں۔ قرآن کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنا، اس میں ردّ و بدل کر دینا تو کسی کے بس کی بات نہ تھی، لہٰذا اسلام کو فنا کے گھاٹ اتارنے کی آرزو رکھنے والوں نے ہدف ان عائلی قوانین کو بنایا جن کے بارے میں وہ جانتے تھے کہ یہ جب تک کارفرما ہیں مسلمان قوم کسی بھی دوسری قوم میں گم اور تحلیل نہیں ہو سکتی

مسلمانوں کی شامتِ اعمال سے اسلام کے دشمنوں کو اس رُخ پر کامیابی بھی اچھی خاصی ہوئی۔ بعض مُسلم ممالک میں انھوں نے وہاں کے کج فہم اور بدبخت حکمرانوں کے ذریعہ ان قوانین کا چہرہ مسخ کرا ہی دیا۔ اور شدہ شدہ انھیں پاکستان جیسے ملک میں بھی ــــ جو بنا ہی تھا اسلام کے نام پر، ایوب خاں جیسے غلط کوش بادشاہ سلامت دستیاب ہو گئے جن کے ذریعے انھوں نے مکمل طور پر نہ سہی جزوی طور پر تو ان قوانین کو اپنا نشانہ بنا ہی لیا۔ اور اب ہمارے ملک میں دستور کی ایک دفعہ کو آڑ بنا کر مسلسل یہ تگ و دو ہو رہی ہے کہ جس طرح بھی ہو اسلامی پرسنل کے ایوانِ معلّٰی میں شگاف ڈال دیا جائے اور مذہبی آزادی کے بلند بانگ دعووں کے باوصف مسلمانوں کے ان عائلی قوانین پر دست درازی کی جائے جن کا سرچشمہ ان کے خدا کی کتاب اور ان کے پیغمبرؐ کی احادیث ہیں۔

زیادہ شکایت ہمیں غیر مسلم برادرانِ وطن سے نہیں۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اگر سمجھ بھی سکیں تو بہرحال انھیں اسلامی نقطۂ نظر سے دلچسپی ہی کیا ہو سکتی ہے۔ وہ اگر معصومیت اور نیک نیتی سے اسلامی پرسنل لا کا حلیہ بگاڑنا چاہتے ہیں تب بھی ان کی جہالت ان کے لئے کافی عذر ہے اور اگر ان کی نیت نیک نہیں اور عناد و تعصب کے جذبات ان کے عزائم میں کارفرما ہیں تب بھی اسے خلافِ توقع اور بعید از قیاس نہیں کہیں گے کیونکہ باطل کو حق سے اور کفر و شرک کو ایمان و توحید سے کب عداوت نہیں رہی ہے جو آج اس پر حیرت یا شکایت کی جائے لیکن شکایت بہت زیادہ ان خوش فکروں سے ہے جو دعویٰ تو اسلام کا کرتے ہیں مگر اسلامی پرسنل لا کے خلاف انکے سینوں میں عناد اور عداوت کی بھٹی چل رہی ہے کہ وقتاً فوقتاً اسکی لپٹیں انکے حلقۂ ذہن سے اس طرح نکلنے لگتی ہیں جیسے روایتی دیو کے مُنہ سے شعلوں کی بھبکاریں۔ وہ ذرا نہیں سمجھتے کہ اسلامی پرسنل لا کے خلاف زبان درازی کرنا اسی شاخ کو کاٹنے کے مرادف ہے جس پر وہ بسیرا کئے ہوئے ہیں۔ وہ مغرب کی درسگاہوں سے کچھ باتیں رٹ آئے ہیں اور کمال بیدانشی کے ساتھ انھیں وقتاً فوقتاً دہراتے رہتے ہیں وہ فریب خوردہ ہیں مگر خود کو دانشور اور حقیقت پسند تصور کر کے جہل مرکب کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اسلام کی حقیقت کا انھیں شعور نہیں مگر زبان اس طرح کھولتے ہیں جیسے سارے کا سارا اسلام انکے صندوق شکم میں بند ہو۔

مولانا عامر عثمانی رح

اعتراف

کس لیے تذکرۂ عظمتِ ماضی کیجیے
انجمن والوں کو اس ذکر کی فرصت ہی نہیں
خونِ گرمانے کی امید ہے امیدِ عبث
جذبِ غیرت ہی نہیں جوشِ حمیت ہی نہیں
رجز و نعرۂ تکبیر و درا سب بے کار
مضمحل روحوں میں احساس کی قوت ہی نہیں

جن سے اسلاف کی عظمت کا تصور آئے
ایسے افسانوں پہ پردہ ہی پڑا رہنے دو
ظلمتیں حال کی کچھ اور نمایاں ہوں گی
طاق ماضی کے چراغوں کو بجھا رہنے دو
پیٹ بھرنے کے لئے بھیک تو مل جائے گی
گردنوں کو درِ باطل پہ جھکا رہنے دو

نام اسلام تھا جس جنسِ گرانمایہ کا
اب وہی جنس ہے نایاب مسلمانوں میں
شمع کے حسنِ فروزاں پہ ہے بحث و تنقید
عاقبت بینی کی خو آ گئی پروانوں میں
ڈالنے والے ستاروں کے نشیمن پہ کمند
سو گئے یاس کے تاریک شبستانوں میں

بھول جاؤ کہ خدا کیا ہے محمدؐ کیا ہے
غور کرنے کے لئے ٹھوس مسائل ہیں بہت
یہ جو اوہام ہیں اک مذہبِ پارینہ کے
جنگِ سرمایہ و افلاس میں حائل ہیں بہت
مرحلہ سخت ہے انسان کی رزاقی کا
خنجرِ فقر سے سینے ابھی گھائل ہیں بہت

مشعلیں راہ نمائی کے لئے گیا ہوں گی
قافلے والوں کی آنکھوں میں بصارت کب ہے
تودۂ برف کو پگھلا نہ سکیں گے مہتاب
انکی ٹھٹھری ہوئی کرنوں میں حرارت کب ہے
پوچھنے والو ہمہ گیر تباہی کا مآل
اس سے بہتر ہے یہ پوچھو کہ قیامت کب ہے

انھوں نے پڑھکر سنائی جو یہ تھی۔

"ایک مرتبہ بعد نصف شب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اعلیٰ حضرت قبلہ دروازہ کھول کر باہر تشریف فرما ہوئے اور تھوڑی دیر میں پھر اندر تشریف لے گئے صاحبزادی نے پوچھا کون تھا منہ سے نکل گیا کہ مدینہ طیبہ کے راستہ میں ایک قافلہ جارہا تھا اس میں سے ایک شخص کو شرعی مسئلہ کی ضرورت پڑ گئی وہ دریافت کرنے آیا تھا پوچھکر چلا گیا۔"

جملہ حاضرین کی زبانوں پر سبحان اللہ، ماشاء اللہ وغیرہ کے الفاظ آئے دونوں فریق اعلیٰ حضرت بریلوی کی ولایت و عظمت پر ہم آہنگ متفق تھے نزاع صرف اتنا سا تھا کہ زیادہ عظیم اور زیادہ مرتبہ والا اعلیٰ حضرت کو مانیں یا والا حضرت کو۔

" واقعی بڑی سبق آموز کرامت ہے" میں نے کہا " اس سے اعلیٰ حضرت کے زبردست صاحب کرامت ہونے کا پتا تو خیر چلتا ہی ہے یہ بھی ثابت ہوتا ہے علوم ظاہری میں طاق تھے۔ اکرم شہرۂ آفاق تھے امراض خبیثہ کے تریاق تھے۔ رمز شناس وصل و فراق تھے۔ قائمہ علیٰ تو محترم قبلہ سرفراز حسین صاحب۔ اسکے مقابلہ پر آپ کیا لاتے ہیں؟"

سرفراز حسین نے ملفوظات والا حضرت کی جلد ایک طرف رکھی بنڈل سے ایک پمفلٹ نکالا اور کھنکھال سے ورق الٹ کر کے بسم اللہ الرحمان الرحیم کہا۔ پھر کھنکارتے ہوئے سامنے والوں پر نظر ڈالی اور آخرکار میری طرف دیکھ کر فرمایا " ملاحظہ کیا جائے۔ کرامت نمبر ایک۔"

اسکے بعد ان کی نظریں پمفلٹ پر جم گئیں اور زبان حرکت میں آئی۔

"ایکمرتبہ والا حضرت رکھیلوی تہجد کیلئے اٹھے اور زوجہ سے وضو کا پانی لانے کیلئے کہا۔ زوجہ باورچی خانہ سے پانی لائی تو دیکھا حضرت کمرہ سے غائب ہیں۔ حیران ہوئی کہ کہاں گئے۔ دروازے سے جاتے تو ضرور نظر پڑتے۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ چند منٹ بعد کیا دیکھتی ہے حضرت کمرے ہی میں اپنے پلنگ پر بیٹھے ہیں بالوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ کپڑے بھی بھیگے ہیں۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ — فرمایا نیک بخت لمبی داستان ہے خیر سن تو تاکہ سمندر سے۔ غوث اعظم شاہ جیلانی نے یاد فرمایا تھا۔ پہنچا تو وہاں اکابر علمائے سلف جمع تھے ابوحنیفہ، عبداللہ ابن مبارک، علامہ قسطلانی، حافظ ابن حجر، امام رازی، امام زیلعی وغیرہ وغیرہ۔ فنا فی البقا والبقائی الفنا کا دقیق مسئلہ زیر گفتگو تھا یہ سب اکابر شاہ جیلانی سے گتھی سلجھوانے آئے تھے گتھی حضرت نے سلجھادی مگر ایک گرہ کسی طرح نہ کھلی تب آپ نے حاضر باش فرشتوں میں سے ایک کو حکم دیا کہ جاؤ رکھیلی سے قطب بلی لادیا، گنبد قضا خاں کو لیکر آؤ۔ وہی اس گرہ کو کھول سکتے ہیں۔ جس وقت تم پانی لینے باورچی خانے میں گئیں فرشتہ کمرہ میں داخل ہوا اور مجھیں شل طفلک شیرخوار بازو میں سمیٹ کر وہاں لے گیا گرہ سخت تھی مگر ہمارے ناخن تدبیر سے کھل گئی۔ سب نے آفریں کہی پھر حضرت جیلانی کے سوا ہم سب مجلس سے باہر آئے۔ شیطان لعین چین یا روس سے بارہ درجن سپاہیوں کو ساتھ لاکر دروازے پر جا کھڑا تھا۔ ہم سب کو گھیرے میں لے لیا۔ میں نے بڑھکر وار کئے۔ ایک درجن فنا کے گھاٹ اترے۔ دوسرے حضرات نے بھی استقامت دکھائی۔ رضا بالقضا، گرفتار ہوئے سو کوس لے جاکر مردودوں نے ہم گرفتاران بلا کو بحرالکاہل میں دھکا دیدیا۔ ساتھیوں میں سے کم ہی تیرنا جانتے تھے۔ جو جانتے تھے وہ فرط خوف میں جی چھوڑ بیٹھے تھے۔ ہم نے ہمت بندھائی اور سب کو اپنی پیٹھ پر چڑھایا۔ القصہ سمندر پار کر کے ایک ایک کو اسکے گھر پہنچایا پھر اپنے گھر لوٹے ہیں۔"

زوجہ حیران و پریشان تھی۔ عرض کیا بس دو ہی منٹ تو گذرے ہیں۔ اتنی سی دیر میں آپ۔ بات کاٹ کر فرمایا کیا بھول گئیں حبیب خدا رسول اللہ پلک کی پل میں سات آسمانوں کی سیر کر آئے تھے۔ ہم ان کے غلام وقت کو ربڑ کی طرح پھیلا اور سکیڑ لیتے ہیں — تم نہیں سمجھوگی۔ جاؤ ایک چائے پیالی بنالاؤ بہت

تھکن ہو گئی ہے ــــ"

اب پھر سبحان اللہ، ماشاء اللہ کی صدائیں بلند ہوئیں ہر شریک محفل پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی البتہ خواجہ فرہاد کا چہرہ کچھ کشیدہ سا نظر آرہا تھا۔ دفعتاً وہ بولے۔

یہ روایت کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہے۔ حضرت رکھیلوی کی زوجہ کے علاوہ اسے کسی نے بیان نہیں کیا۔"

محفل میں سناٹا چھا گیا سب کی نگاہیں سرفراز حسین کی طرف اٹھ گئیں۔

"شب کی خلوت میں زوجہ کے علاوہ اور کوئی راوی کہاں سے آتا۔" سرفراز حسین بولے "پھر زوجہ بھی کیسی سرتاج الاولیا حضرت سمیع اللہ کی بھانجی۔ قطب وقت خواجہ سبحان اللہ کی بھتیجی۔"

"رضی اللہ عنہ۔ رضی اللہ عنہ۔ ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں۔ سرفراز حسین نے مزید کہا۔ ان کا خطاب خواجہ فرہاد سے تھا۔

"آپ نے اعلیٰ حضرت بریلوی والی روایت کے راوی کا نام ظاہر نہیں کیا۔"

"ایسی ہی جاہلانہ باتوں پر ہمیں غصہ آتا ہے۔" خواجہ فرہاد جھلا کر بولے "کیا آپ کو اتنی بھی خبر نہیں کہ اعلیٰ حضرت کی کرامتیں ان کی مریدان خاص نے جمع کی ہیں ان میں کا ہر فرد چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ سوائے وہابیوں نجدیوں کے ان کی صداقت بیانی میں کوئی شک کر سکتا ہے۔"

"جوش نہیں محترم قبلہ۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر نیازمندانہ لہجے میں کہا "کرامتیں برحق ہیں اسلئے وہ راویوں کی محتاج نہیں ہوا کرتیں۔ راویوں کا کیا ہے آج مرے کل کو دوسرا دن کرامتیں لافانی ہیں اور ابدی ہوتی ہیں۔ ذرا دماغ ٹھنڈا رکھئے۔ ایک ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی لیا جائے تو اور بہتر ہے۔"

اسی چکر میں ہوا دو گھڑے خالی ہو گئے۔

"ایک نمونہ اور بھی" میں نے التماس کیا خواجہ فرہاد نے اشتہار میں سے کرامت نمبر ۷ پڑھی جو یہ تھی۔

"ایک عورت عالم خواب میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئی وہاں اس نے مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو نہ پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضور اقدس بریلی شریف مولوی احمد رضا خانصاحب کی مہمانی میں تین روز کیلئے تشریف لے گئے ہیں جب سرکار واپس ہوئے تو اس نے مدعا عرض کیا ارشاد فرمایا کہ بریلی جاکر احمد رضا کے مزار پر عرض حاجت کر آنکھ کھلی تو بیداری میں بریلی شریف حاضری دی اور منزل مقصود کو پہنچی۔"

کئی حاضرین انگوٹھے چوس چوس کر آنکھوں کو لگا رہے تھے۔ خواجہ نے ملفوظہ ختم کیا تو ماشاء اللہ اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوئیں "کھڑے ہو جاؤ" میں دفعتاً جھٹکے دار آواز میں بولا "دوستو سات سات بار درود ہو جائے۔ تعظیم ضروری ہے۔"

اور میں نے کھڑے ہو کر درود شروع کر دیا۔ محفل نور سے بھر گئی

"ہاں ــــ اب آنجناب نمونہ پیش فرمائیں۔" درود ختم ہونے پر میں نے سرفراز حسین سے کہا۔ انھوں نے ایک پمفلٹ سے کرامت نمبر ۱۱ پیش کی جو یہ تھی۔

"پیر تحفہ شاہ کی نواسی عذرانہ بیگم نے عین حج کی شب میں خواب دیکھا کہ وہ حج کو گئی ہے۔ طواف کرتے ہوئے فرشتے کی صدا اسکے کانوں میں پڑی کہ پگلی! یہاں آج کیا دھرا ہے۔ رکھیلی شریف جا۔ پیا کا جلوہ والا حضرت رکھیلوی کے مزار شریف پر ملے گا عذرانہ اسے ابلیس کی آواز سمجھی۔ بعد فراغت مدینے روضۃ النبی پر حاضری ہوئی تو غیب سے ندا آئی کہ پگلی! جہاں خدا وہاں اسکا حبیب۔ یہاں کیا لینے آئی ہے عرض کیا کہ اے غیبی فرشتے۔ میں رکھیلی کس طرح جاؤں ابھی تو جہاز چھوٹنے میں ایک مہینہ باقی ہے۔ جواب ملا یہ عالم خواب ہے جب گھر لوٹے تو والا حضرت کے مزار پر جانا مراد کو پہنچے گی۔ آنکھ کھلی تو عجیب عالم حیرت طاری تھا۔ جی چاہا کہ اس حقیقت سب حاجیوں پر آشکارا کر دے۔ چیخ چیخ کر کہے کہ پگلو! آجکل خدا اور رسول دونوں رکھیلی پہنچے ہوئے ہیں۔ یہاں کیا خالی پتھروں سے سر مار رہے ہو۔ لیکن غیبی آواز آئی کہ خبردار! اسرار باطن آشکارا نہ کرنا ورنہ مثل منصور حلاج سولی پائے گی ورنہ بندوق سے ماری جائے گی تب اس نے

ہونٹوں کو قفل خاموشی لگایا۔ حقیقت کا راز چھپایا۔ زخم دل پر ضبط کا پھایا لگایا۔ بمشکل دل بے قرار کو قرار آیا۔ گھر لوٹی تو حضرت رکھیلوی کے مزار پر حاضری دی حکم ہوا سات طواف کر۔ طواف کئے تو ندا آئی مانگ کیا مانگتی ہے عرض کیا واری جاؤں لونڈی کو چاند سا بچہ چاہیئے جواب ملا جا دیا۔ سورج سا مانگتی تو سورج سا دیتے اور کچھ مانگ بولی میرے شوہر کی آنکھیں بھینگی ہیں وہ ٹھیک ہو جائیں۔ جواب ملا۔ ٹھیک ہو گئیں اور مانگ۔ بولی ان کی ناک بھدی ہے کھڑی ہو جائے۔ جواب ملا چل یہ بھی ہوا اور مانگ غرض سات طواف کے بدلے سات مانگیں پوری ہوئیں مگر گھر لوٹی تو شوہر کے دھوکے میں دیور سے دل لگایا جس کی ناک کھڑی تھی اور آنکھیں حسین تھیں۔ از بسکہ رات آئی۔ مخلوق خدا اپنے اپنے کمروں میں جا سوئی۔ دیور بھی کنڈی چڑھانے جا رہا تھا دالاحضرت نے منھ پر ایک چانٹا رسید کیا۔ آنکھیں بھینگی ہو گئیں ناک پچک گئی۔ اسی وقت ندا آئی باہر نکل اصلی شوہر کو بھیج۔ غفران بیگم از بسکہ چشم حیرت وا کئے سب کچھ دیکھتی رہی۔ اصلی شوہر آیا دل کی کلی کھلی طبیعت سے طبیعت ملی۔ ارمانوں کی شمع جلی۔ ہجر کی رات ڈھلی۔ دل کی ہوا چلی۔"

قسم قرآن کی کمال ہے۔ ایک شریک محفل نے نعرہ مارا" یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے بھائی صاحب۔" دوسرے قلندر بولے" ہماری زوجہ تو جانے کس کس مزار پر دامن پھیلا آئی ایک چڑیا کا بچہ بھی نہیں جنا۔"

"جن دیجئے جن دیگئے" میں نے ہاتھ ملا کر تسلی دی۔ میرا مقصد تھا کہ ذرا خاموش ہو جاؤ۔ لیکن ایک اور صاحب بڑبڑانے لگے" ہم نے تو اپنا آپریشن بھی کرا لیا مگر بچے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔

تو بھائی آپریشن کرنے والے ڈاکٹر سے شکایت کی ہوتی۔

کی تھی جناب۔ عجیب سا جواب دے کر لوٹا دیا تیجرے سے۔ ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔"

"کیا جواب ہے؟"

آنکھیں نکال کر کہنے لگا کہ میں نے آپ ہی کا تو آپریشن کیا ہے سارے شہر کا تو نہیں کیا۔"

آپ کیا بولے؟"

"ہم کیا بولتے۔ ہم کوئی ٹھیکہ دار ہیں سارے شہر کے۔"

"کم سے کم وضاحت تو طلب کی ہوتی مردود سے۔"

"کہنے لگا کہ ہم فیس لئے بغیر کوئی بات نہیں کریں گے۔ دس روپے فیس غضب خدا کا۔"

گفتگو غلط رخ پر چلی گئی تھی۔ میں نے رخ درست کیا۔

"بہرحال یہ تو کرامتیں ہو گئیں۔ دونوں بزرگوں کے کچھ ذاتی ملفوظات بھی ہو جائیں تو خیر و برکت میں اضافہ ہو۔"

خواجہ فربادرنے اعلیٰ حضرت بریلوی کے ملفوظات کا حصہ اول اٹھایا اور صفحہ ۱۱۶ سے یہ ملفوظ سنایا۔

"بغیر غوث کے زمین و آسمان قائم نہیں رہ سکتے۔"

"ٹھیریئے حضرت" میں نے ٹوکا۔" غوث کا موضوع نہ چھیڑیئے کسی اور موضوع کو لیجئے۔"

"چلو اور سہی۔" انھوں نے جلد چہارم اٹھائی مگر سرفراز حسین بیٹھے سے کھڑے ہو گئے۔

یہ نہیں ہو سکتا۔ غوث کے موضوع پر مقابلہ کا ایک ملفوظ میں بھی سناؤں گا۔"

چلئے آپ بھی سنا لیجئے۔" میں نے کہا۔

انھوں نے والا حضرت رکھیلوی کے ملفوظات کی کوئی جلد اٹھائی اور جلدی جلدی ورق الٹ کر ذیل کا ملفوظ ڈھونڈا۔

"غوث کے دم سے سورج اور چاند حرکت کرتے ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں۔ موت اور حیات ان کے قبضے میں ہوتی ہے۔ مجھ پر کھولا گیا ہے کہ تو اپنے دور کا غوث بھی ہے اور مجدد بھی میری ایک چھینک گیا پر آسمان ٹکا ہے اور دوسری چھینک گیا پر زمین گھوم رہی ہے ہزار ہزار سلامتی ہو مجھ پر۔"

خواجہ کو یہ ملفوظ بڑا گراں گذرا۔ پیچ و تاب کھا کر بولے" سمجھ میں نہیں آیا والا حضرت رکھیلوی کے ملفوظات میں کسی جاہل نے

نے اضافے کر دیئے ہیں ان سے تو ایک کی چھنگلیا بھی ہی نہیں پیدائشی ہی نکلے تھے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے" سرفراز حسین ترش مزاجی سے بولے "غوث اور مجدد ہو کر کیا وہ اپنی ایک چھنگلیا بھی نہ اگا سکے ہوں گے۔ کیا آپ کرامات الاولیاء سے انکار کرتے ہیں" ان کا خطاب خواجہ سے تھا۔

"نہ خیر۔ ہم وہابی، گلابی، تبلیغی، مودودی تھوڑی ہیں کرامت برحق۔ اولیاء برحق۔ مگر غوث و مجدد تو اعلیٰ حضرت بریلوی تھے۔ والا حضرت کیسے ثابت ہو سکتے ہیں۔ یا چلو انہیں قطب مان لو۔"

"ارے واہ کیوں مان لیں" سرفراز حسین ہاتھ ہلا کر بولے "قطب تو وہ پیدائشی ہی تھے۔ ترقی درجات کے بعد غوث اور مجدد کیوں نہیں بنے۔ اپنے ایک خواب شریف میں وہ خود بیان کرتے ہیں پہلے اعلیٰ حضرت بریلوی ہمارے پیر تھے پھر ہم ان کے پیر بن گئے ہمارا قدم سارے عالم کی گردن پر ہے۔"

یہ ٹھیک ہے۔ لیکن علوم ظاہرہ اور علوم باطنہ میں جتنے گہرے اعلیٰ حضرت تھے اتنی گہرائی اور وسعت والا حضرت کے علم میں نہیں تھی۔ پھر آپ ایک عالم کی بات کر رہے ہیں تمام اولیاء ربانی کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تمام عالموں کے دھڑ اعلیٰ حضرت کے قدموں کے نیچے ہیں۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ بیسویں صدی کے غوث و مجدد صرف اعلیٰ حضرت ہی ہیں۔

تم جھک کر رہے ہو۔ اسرار ولایت کے صفحہ ۵۰ پر چوتھی سطر میں لکھا ہوا ہے کہ ایک رات کو صوفی نوبہار نے تین سو تیرہ خواب دیکھے اور خواب میں یہی دیکھا کہ تمام فرشتے اور جنت کی تمام حوریں والا حضرت کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنے پر کمربستہ ہیں اور وہ اسی بناء پر کہ ساتویں آسمان کے موجودین نے انہیں بخوشی اور برضا و رغبت بیسویں صدی کا سب سے بڑا غوث تسلیم کر لیا ہے۔

سب سے بڑا ۔۔۔ میں نے ذرا حیرت سے کہا۔

جی ہاں۔ سب سے بڑا ۔۔۔ سرفراز حسین سینہ پھلا کر بولے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ غوث کئی قسم کے ہوتے ہیں، چھوٹے اور بڑے۔ اور سب سے بڑے میں نے انہیں کی ذو معنی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وھذا لکل فیہ ۔۔۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک غوث اصغر ہوتا ہے ایک غوث متوسط ہوتا ہے، ایک غوث اکبر ہوتا ہے، ایک غوث اعظم۔

ذرا ٹھہریئے ۔۔۔ میں نے زبان کے ساتھ ساتھ اشارے سے بھی روکا۔ اب مسئلہ حل ہو گیا۔ ہم اعلیٰ حضرت اور والا حضرت دونوں ہی کو اس صدی کا غوث تسلیم کر لیتے ہیں۔

انیس بیس کے فرق سے۔

اعلیٰ حضرت کو بیس میں رکھئے گا" خواجہ فرہاد کھٹ سے بولے۔"

جی نہیں ۔۔۔ سرفراز نے کھڑے ہو کر کہا، والا حضرت کو بیس میں رکھا جائے بلکہ اکیس میں۔

ایک صورت اور بھی ہے ۔۔۔ ہم دونوں کو بالکل ایک ہی ڈگری دیئے دیتے ہیں۔ یعنی دونوں ہی حضرتین غوث اعظم تھے۔ بلکہ اعظم الاعاظمین۔ ختم کیجئے اس طنا طنی کو۔

یہ نہیں ہو سکتا ۔۔۔ خواجہ فرہاد نے اپنی دومین کی گرمن ہلاتے ہوئے کہا۔ اور یہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ شیخ ذو الجلال کی تصنیف مبارک "ولایت کے اصول و مبادی" کے کسی نہ کسی صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے کہ ایک صدی میں ایک ہی درجہ کے دو غوثوں کا پایا جانا امر محال ہے اور اگر سوئے اتفاق سے ایسا ہو جائے کہ ایک صدی میں ایک ہی سطح کے دو غوث جنم لے لیں تو پھر ..... تو پھر .....

تو پھر کیا ۔۔۔ میں نے اپنے مترجم کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔

تو پھر دنیا بھر میں طاعون کا پھیل جانا اور قیامت کا خود چل کر آ جانا یقینی اور لازمی ہے۔

اس طرح قضیہ نہیں نمٹ سکتا ۔۔۔ میرے لہجہ میں گرانی تھی "اگر قضیہ کو نمٹانا مقصود ہو تو دونوں میں سے ایک کو جھکنا ہی پڑے گا ۔۔۔ ورنہ پھر اس غوث کے چکر کو ختم کیجئے۔

وہ دونوں خاموش ہو گئے تو میں نے خواجہ فرہاد سے مخاطب ہو کر کہا۔ لاؤ کوئی دوسرا ملفوظ پیش کرو۔

خواجہ فرہاد نے احکام شریعت نامی ایک کتاب کی ورق گردانی

جلد نکالی اور پھر اس کا صفحہ پچاس کھولتے ہوئے بولے۔ دیکھئے علماً کی قدر پیدا کرنے کے لئے ان کا یہ ملفوظ کس قدر موثر ہے۔

"عالموں کے قدموں پر بوسہ دینا سنت ہے۔"

سبحان اللہ۔ میرے منہ سے بیساختہ نکلا۔

عالم دین کے موضوع پر والا حضرت کا ملفوظ اس سے زیادہ موثر اور پائیدار ہے۔

سنئیے —

سرفراز حسین نے ایک کتابچہ نکال کر کچھ صفحے الٹ پلٹ کئے دیکھئے کتنی جاندار چیز ہے فرماتے ہیں:۔

"عالم دین کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھنا ستر کروڑ کبیرہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔"

عالم دین سے کون لوگ مراد ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔"

عالم دین سے عالم دین مراد ہیں" خواجہ فرہاد بولے۔"

یعنی وہ لوگ جنھوں نے دین کا علم حاصل کر رکھا ہو۔ سرفراز حسین نے وضاحت کی

دارالعلوم دیوبند کے فارغین پر عالم دین کا اطلاق ہو گا کہ نہیں؟

بالکل نہیں ہو سکتا —— اس لئے کہ دیوبند کے فارغین تو وہابی ہوتے ہیں اور وہابیوں کے بارے میں تمام صحابۂ کرام اور تبع تابعین کا ارشادِ گرامی یہ ہے کہ ان کے ایمانوں میں عشبہ پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کے عقائد گل اور سڑ جاتے ہیں اور جن لوگوں کے ایمانوں میں سڑیند پیدا ہو جائے انھیں عالم دین نہیں کہا جا سکتا خواہ انہوں نے ایک کروڑ کتابیں گھول کر پی لی ہوں۔ وہابیوں اور نجدیوں کے بارے میں اعلیٰ حضرت بریلوی صاحب کا ایک ملفوظ ہے اگر اجازت ہو تو پیش کروں

چلو کرو — میں نے چہکتی دار آواز میں کہا۔

انھوں نے ایک دیمک زدہ سی کتاب نکالی — اور پانچ منٹ اس کی ورق گردانی کرنے کے بعد بولے۔ سنئیے فرماتے ہیں۔

"وہابیوں کے سینے لطائفِ ایمانی سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ان مردودوں کے سلام کا جواب دینا بھی خلافِ اولیٰ ہے۔"

وہابیوں کے بارے میں والا حضرت کا ایک مقولہ میں بھی پیش کرنے والا تھا..... سرفراز حسین نے اجازت طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔

ہاں، ہاں ضرور کیجئے۔

انھوں نے ایک ضخیم کتاب نکالی، پھر بولے دیکھئے پہلے ہی صفحہ کی پہلی ہی سطر پر فرمایا گیا ہے:۔

"وہابیوں اور دیوبندیوں کے قلوب پر کفر و ضلالت کی دھند چھائی رہتی ہے لہٰذا جہاں تک ہو سکے ان کے سائے سے بھی بچو۔"

استغفر اللہ —— ناچیز تو ہر وقت دیوبندیوں میں گھسا رہتا ہے —" میں نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔"

پہلی فرصت میں ان سے ترک تعلق کیجئے۔ پھر کسی شیخ کامل کے ہاتھوں پر تجدید ایمان کر کے اہل سنت والجماعت میں شامل ہو جائیے بیڑا پار ہو جائے گا ورنہ بیڑا غرق ہے یہاں —" خواجہ فرہاد کا لہجہ مشفقانہ تھا۔"

اس سلسلہ میں آپ کی رائے کیا ہے؟ میں نے سرفراز حسین کو مخاطب کیا۔

میری ناچیز رائے تو یہ ہے کہ والا حضرت گنبد قضا خاں کے مزار پر کم از کم پچاس روپے قیمت کی ایک چادر چڑھائیے اور اکیسو ایک اگربتی جلا کر کم از کم تین گھنٹے اور زیادہ سے زیادہ تین دن وہاں مراقبہ کیجئے۔ انشاء اللہ ایسا کرنے سے خدا تمہاری پچھلی خطاؤں کو معاف کر دے گا اور تم بالکل ایسے ہو جاؤ گے جیسے آج ہی تمہاری ماں نے تمہیں جنا ہے۔

جزاک اللہ —— اچھا یہ بتائیے کہ مودودیوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے —— ان کے ساتھ میل جول رکھنا تو فسق و فجور میں داخل نہیں۔ جس طرح دیوبندیوں کے ساتھ میل جول رکھنا فسق جلی اور کفر خفی ہے۔

حضرت — مودودیت سے زیادہ خطرناک بیماری دنیا میں آج تک پیدا نہیں ہو سکی — یہ تو وہ مرض ہے جو ایمان اور عقیدے کو ہلاک کر کے ہی دم لیتا ہے — دیوبندیت کا تو کچھ نہ کچھ علاج ہمارے پاس ہے بھی لیکن اس مودودیت کا تو کوئی علاج ہمارے پاس نہیں — یہ مرض تو جسے بھی لاحق ہوا اس کے ایمان کا ستیاناس ہو کر رہا۔

العیاذ باللہ — میری اہلیہ تو ایک مدت سے

مودودیت کا شکار ہے۔

حشر بُرا ہوگا ــــ اگر توبہ کی توفیق نصیب نہ ہوئی، خواجہ فرہاد نے پُر وثوق لہجہ میں کہا۔

دعا فرمایئے خداوندِ قدوس اسے توبہ کی توفیق عطا کرے بظاہر اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ مودودیت سے باز آجائے گی

دو رات ہمارے پاس چھوڑ دو ــــ امام ضامن رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خاص الخاص وظیفہ ہماری بیاض میں موجود ہے۔ وہ رات کو ایک بجے پڑھا جاتا ہے، ایک ٹانگ پر کھڑے ہوکر۔ اس وظیفہ نے اچھے اچھوں کے ایمان درست کر دیئے ہیں، تمہاری زوجہ کو تو ہستی کیا ہے۔

وہ وظیفہ مجھے سکھا دیجئے میں خود نمٹ لوں گا۔

کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وظیفہ خواں کے اندر حسن اوصافِ حمیدہ کا ہونا ضروری ہے وہ ابھی تمہارے اندر پیدا نہیں ہوسکے ویسے تمہاری پیشانی یہ بتا رہی ہے آجکل تمہاری روح آسمانِ ولایت پر بہت تیزی کے ساتھ اُڑ رہی ہے۔

ان اوصاف کا تھوڑا سا ناک نقشہ بیان کر دیجئے تاکہ میں انھیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کروں۔ مجھے تو یہ غلط فہمی تھی کہ فی الوقت مجھ سے بڑا ولی اللہ کوئی روئے زمین پر نہیں ہے۔

اگر چالیس دن لگاتار تم ہماری صحبت میں رہ لو تو پھر تمہاری غلط فہمی حقیقت میں بدل سکتی ہے۔

خیر یہ تو بعد کی بات ہے فی الحال تو یہ قضیہ نمٹایا جائے کہ اعلیٰ حضرت کا مقام بلند ہے یا دالا حضرت کا ــــ

فرمایئے اب کیا چیز پیش کی جائے ــــ سرفراز حسین نے کافی دیر کے بعد چونچ کھولی۔

آپ دونوں ہی حضرات نے بڑے قیمتی اور گرانقدر ملفوظات پیش کئے ہیں لیکن ان پیشکردہ ملفوظات سے یہ ثابت نہیں ہو پایا کہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خانصاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ عظیم ہے یا حضرت گنبد قضا خاں صاحب نور اللہ مرقدہ کو زیادہ عظمت حاصل ہے اس لئے ناچیز کی رائے یہ ہے کہ آپ دونوں حضرات ملفوظات کے کچھ ایسے نمونے پیش کریں جن کو پڑھکر عوام الناس نے اپنی بگڑی حالت سدھار لی ہو۔ اور اپنی بے حسی اور بے عملی سے باز آگئے ہوں۔

خواجہ فرہاد کے چہرے پر لاتعداد سلوٹیں پھیل گئیں۔ وہ یکلخت کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے ــــ سرفراز حسین کا دماغ بھی شاید سوچ و فکر کی سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ دونوں بزرگوں کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے سگریٹ جلائی ــــ خواجہ فرہاد کی خاموشی نے دم توڑ دیا وہ بھڑکتے کے انداز میں بولے

لاحول ولاقوۃ ــــ ملا بھائی! صوفیاء کی موجودگی میں مکروہ تحریمی کا ارتکاب کرتے ہو۔

اس مکروہ تحریمی کا ارتکاب تو میں منکر نکیر کے سامنے بھی کر کے رہوں گا۔

حیرت ہے کہ بارہ برس تک قل کی بُرجی میں رہنے کے بعد بھی تمہارے نفسِ امارہ کی موت واقع نہیں ہوئی۔

اماں یہ نفسِ امارہ تو وراثت میں ملا ہے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ میرے والد اٹھارہ سال تک قُل کی برجی میں معتکف رہے۔ دن میں نفلیں پڑھتے تھے رات کو روزے رکھتے تھے اور ہر پیر جمعرات کو ختم خواجگان کا اہتمام کراتے تھے، لیکن اٹھارہ سال کے بعد جب وہ قل کی بُرجی سے باہر نکلے تو یہ مکروہ تحریمی ان کے ہونٹوں سے چپکا ہوا تھا ــــ میں نے سگریٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

ماشاء اللہ ــــ بڑا ہی پائیدار نفس رکھتے ہو۔

محترم یہ ہماری قصیدہ خوانی تو بعد میں بھی ہوسکتی ہے فی الحال آپ کوئی ملفوظ پیش کیجئے ــــ تاکہ معاملہ رفع دفع ہو۔" یہ کہہ کر میں نے سگریٹ کے دو کش مارے۔" خواجہ فرہاد نے مجھے گھور کر دیکھا ــــ پھر بولے:

ملفوظ پیش کرنے سے پہلے ایک واقعہ سنانا ضروری سمجھتا ہوں ورنہ بات واضح نہیں ہو سکے گی۔

قصبہ رحیم پور کا نام نامی تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ بڑا تاریخی قصبہ ہے۔ ایک زمانہ میں اولیاء اور شہدا کا مرکز رہ چکا ہے۔ پہلے شاہ ولایت علی کا مزار بھی وہیں واقع تھا۔ ساری دنیا میں مشہور تھا کہ اولاد دینے اور مقدموں میں کامیابی عطا کرنے میں شاہ ولایت علی انتہائی سخی اور فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے ان کا مزار پاک بندگانِ خدا سے کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ روزانہ لاکھوں کی تعداد میں عورتیں اور مرد اپنی حاجات پوری کرنے کے لئے مزار مبارک

پر تشریف لاتے تھے۔ مزارِ مبارک کی چہار دیواری صرف دس گز لمبی اور دس گز چوڑی تھی۔ لیکن شاہ ولایت رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت تھی کہ اتنی مختصر سی جگہ میں کئی کئی لاکھ آدمی کھپ جاتے تھے اور کسی کو کوئی زحمت نہیں ہوتی تھی۔

۵۷ء کے بعد قصبہ رحیم پور اجڑ کر رہ گیا۔۔۔ اہل سنّت والجماعت کے اکثر افراد پاکستان چلے گئے۔ ہزاروں مکانات خالی ہو گئے اور ایک مدت تک خالی پڑے رہے۔ پھر ان میں خانہ بدوش وہابی آگھسے، جنھوں نے گمراہی اور بد عقیدگی پھیلانے کی خدمت انجام دینی شروع کی۔ کافی لوگ ان کے پھندے میں پھنس گئے۔ جعفر علی نام کے ایک کٹر اہلِ سنت والجماعت بھی ان لوگوں میں جا پھنسے اور قطعی طور پر مرتد ہو گئے۔

پہلے ان کا عالم یہ تھا کہ ہر ہر سنت پر عمل کرنے کی کوشش کرتے۔ ہر خیر و خوبی کو انھوں نے زندگی کا جز بنالیا تھا۔ قبروں پر چادریں چڑھانا، مزارات کے طواف کرنا۔ شبرات کے مہینے میں حلوہ بنا کر تقسیم کرانا۔ زنانِ عاشقانِ اولیاء کی دلجوئی کرنا چھوٹے بڑے مزارات پر عرس کا اہتمام کرنا، فاتحہ خوانی، طاق بھرائی وغیرہ یہ تمام کام وہ انتہائی استقلال کے ساتھ انجام دیا کرتے تھے ۔۔۔ لیکن پھر ان میں بگاڑ آیا۔ ایک دم گمراہی کی راہ اختیار کر بیٹھے۔ قبروں پر چادریں چڑھانا چھوڑ دیں قیام و سلام کو بدعت سمجھنے لگے۔ اہل سنت والجماعت کے ناموس پر کیچڑ ڈھیلے اچھالنے لگے۔ حلوے کی تقسیم بند کردی گئی۔ زنانِ عاشقانِ اولیاء کو بازاری عورتوں کا خطاب دے کر جرمِ عظیم کا ارتکاب کیا اور اولیاء اللہ کی ناراضگی مول لی۔ عرس مقدس کی توہین کرنے سے نہیں چوکے۔ محرم کے فرائض کو بدعت تصور کرنے لگے۔ غرضیکہ بالکل مرتد ہو گئے اور نماز، روزے، زکوٰۃ جیسی معمولی چیزوں میں اٹک کر رہ گئے۔ اور یہ سب کچھ ان وہابیوں کی تقریروں کے اثرات تھے جو رحیم پور میں آگھسے تھے ۔۔۔

ان ہی دنوں رحیم پور میں گل گلے شاہ کا نزول ہوا جو اپنے وقت کے شیخ کامل تھے۔ اور رحیم پور میں خدا کے فرستادہ تھے۔ انھوں نے خود قرآن کی قسم کھا کر یہ بتایا تھا کہ ایک رات نوچندی جمعرات کو میں اعلیٰ حضرت کے ملفوظات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک آسمان پر ایک تجلی نظر آئی پھر یہ تجلی میرے گھر کے صحن میں سمٹ گئی اب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے گھر کی ایک ایک اینٹ نور کی بنی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں بیہوش ہو گیا۔ اور چند لمحوں تک میں بے ہوش رہا۔ ہوش آنے پر میں نے دیکھا کہ دو نورانی پیکر میرے سامنے کھڑے ہیں۔ انہوں نے ادب و احترام کے ساتھ مجھے سلام کیا پھر بولے۔ خدا کی طرف سے تمہیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ رحیم پور کے اندر بھری ہوئی غلاظت کو اپنی تدبیر کی جھاڑو سے صاف کردو اور بھٹکے ہوئے انسانوں کو سیدھے راستہ پر لانے کی پوری پوری کوشش کرو۔ مردود وہابیوں اور مودودیوں نے رحیم پور کے باشندوں کی روحوں میں سوراخ کردیئے ہیں۔ جاؤ اپنے علم و فہم کے سوئی۔۔۔ دھاگے سے ان سوراخوں کو رفو کرو ورنہ ان کا ایمان چھن چھن کر زمین پر گرے گا اور ان کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ گل گلے شاہ حکم پاتے ہی رحیم پور پہنچے اور انہوں نے جد و جہد شروع کی۔

ایک دن انہوں نے جعفر علی کو بلایا۔ اسے اپنی جھوٹی کھچڑی کھلائی۔ اس کے منہ میں اپنا مقدس لعاب ڈالا۔ اس کا شیطان بھگانے کے لئے اس کے کانوں میں "لاحول ولا قوۃ" کا وظیفہ انڈیلا۔ پھر شفقت آمیز لہجہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا لو حضور پرنور فیض گنجور، صاحب غلمان و حور اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس لازوال ملفوظ کی تلاوت کرو۔

جعفر علی کا دل پگھل چکا تھا۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والی شیطنت مدھم پڑ گئی تھی۔ اس نے اعلیٰ حضرت کے ملفوظ کی تلاوت شروع کی۔

" دسواں چہلم، فاتحہ خوانی، طاق بھرائی، بزرگوں کی نذر و نیاز خدا سے تعلق بڑھانے کے بہترین ذرائع ہیں۔ جو لوگ ان اعمالِ حسنہ سے جان چرائیں وہ وہابی ہیں اور وہابیوں کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد گرامی ہے "ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار" ایک دو ورق الٹنے کے بعد انہوں نے یہ ملفوظ پڑھنا شروع کیا۔

مزارات مقدسہ کا طواف کرنا، قبروں پر پھول

[illegible] لائے کفت اور اہلِ سنت کی ضیافت کرنا
[illegible] مبارک افعال ہیں۔ ان افعال کا رکن
[illegible] نے دو منٹ پہلے ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم
کی شفاعت نصیب ہو جاتی ہے —
[illegible] — یہ دونوں ملفوظ پڑھنے کے بعد کایا
[illegible] اور جعفر علی کا مردہ ایمان پھر سانس لینے لگا — اور
ایک دوزخی آدمی جنتی بن گیا۔
[illegible] نے جواب طلب نظروں سے سرفراز حسین کو دیکھا — وہ
بولے۔ میں صرف ایک ملفوظ پیش کروں گا — زیادہ
[illegible] کرنے سے پہلے میں خواجہ فریاد کی تقلید کرتے
[illegible] واقعہ سنا دوں۔
[illegible] گھر میں مجیدہ اور زرینہ نام کی دو نیک فطرت لڑکیاں
[illegible] پھرا کرتی تھیں۔ صورت اور سیرت میں ان کا کوئی
[illegible] تھا بعض صوفیائے کرام انھیں جنت کی حوریں کہہ کر
[illegible] بڑی ہی بے مثال ہستیاں تھیں۔ [illegible]
[illegible] ان گنت خوبیاں [illegible]
[illegible] سے انھیں خاص تعلق تھا۔ بزرگانِ دین کے
[illegible] ان کے نسب نامے ان کے گھر پہنچے اور ان کے
[illegible] انھیں ازبر یاد تھی — ان کے رقص و سماع
[illegible] شہر، گاؤں در گاؤں اور گھر در گھر پھیلا ہوا تھا
[illegible] سے ان کی ملاقات کسی وہابی سے ہوئی اس
[illegible] انھیں بہکا کر گمراہی کے راستوں پر ڈال دیا اور
[illegible] بات ناروی کر [illegible] ہے —
[illegible] انھوں نے رقص و سرود کی محفلوں میں جانا ترک
[illegible] وہابیوں کی طرح نماز روزہ میں الجھ کر رہ گئیں۔
[illegible] لوگوں نے یہ نازک صورت حال شہید اکبر خطیب [illegible]
[illegible] صوفی قمر القمر پانی پتی کے صاحبزادے اور لائق
[illegible] صوفی نور الزمان کے سامنے بیان کی — وہ سن کر
[illegible] اور انھوں نے اسی وقت مجیدہ اور زرینہ کے
[illegible] جا کر ان کے سروں پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے فرمایا

کی ضرورت نہیں تم نہیں جانتیں کہ یہ وہابی کس قدر بے ادب اور
ایمان لیوا قوم ہوتی ہے۔ خدا ہر مومن و مومنہ کو ان کی چالوں سے
محفوظ رکھے۔ انھوں نے تمہارے دلوں میں تصوف اور اعمالِ حج
کی طرف سے بدظنی کا جو درخت اگا دیا ہے، اسے آج ہی نیست و
نابود کر دو۔ ورنہ خطرہ یہ ہے کہ تمہارے ایمان سلب ہو جائیں
اور مرتے وقت کلمہ نصیب نہ ہو۔ تصوف اور اولیاء سے
بدظنی رکھنے والے اسے دوزخ کے آخری طبقہ کے مکین بنائے جاتے
ہیں۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا۔
یہ مختصر سا وعظ بیان کرنے کے بعد صوفی نور الزمان نے الماری
سے ایک کتاب نکالی اور چند صفحے الٹ پلٹ کرنے کے بعد انھوں نے
کہا۔ لو وضو کر کے اعلیٰ حضرت کا یہ ملفوظ پڑھو جو ضلالت و گمراہی سے
نجات عطا کرنے میں تریاقِ اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔
مجیدہ اور زرینہ نے کھٹا کھٹ وضو کیا پھر باواز بلند انھوں
نے اعلیٰ حضرت کے اس مقدس ملفوظ کی تلاوت شروع کی۔ فرمایا گیا تھا:
صوفیائے کرام اور زنانِ عاشقانِ اولیاء کی توہین کرنے
والے اور انھیں برا سمجھنے والے عورت اور مرد خواہ جوان ہوں یا بالغ
خواہ پڑھے لکھے ہوں یا جاہل خواہ صحت مند ہوں یا بیمار خواہ پہلوان ہوں
یا لاغر اوندھے منہ دوزخ میں پھینکے جائیں گے اور ستر ہزار سال تک
آتشِ دوزخ کی سزائیں بھگتنے کے بعد انھیں عدالتِ خداوندی
میں پیش کیا جائے گا — اس عدالت میں دنیا کی ہر چیز ان کے
خلاف گواہی دے گی حد یہ ہے کہ وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے
لہٰذا انھیں پھر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا لیکن پھر ایک دن صوفیہ
کرام ان کی شفاعت کریں گے اور دوزخ سے نکال کر جنت میں
جگہ دلائیں گے لیکن ایک مدت تک دوزخ میں رہنے کی وجہ سے ان کے
چہرے جھلس جائیں گے — وہ دونوں یہ سن کر لرز گئیں، ان کی آنکھوں سے
ندامت کے آنسو جاری ہو گئے انھوں نے اسی وقت دل کی گہرائی سے توبہ کی
اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صوفی نور الزمان سے بیعت ہو گئیں — یہ کہہ کر سرفراز
حسین نے زبان بند کر لی پھر کتاب بند کرتے ہوئے بولے — [illegible]
ہے کہ مجیدہ بانی، زرینہ بانی کا جب انتقال ہوا [illegible]
انھی لوگوں نے غسل کر [illegible] [illegible] دیا۔

مرتب:- حسن احمد صدیقی

مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی عرق ریزیاں

اشاروں ـــــــ کی ـــــــ زبان میں

انھوں نے ۲۷ سال کی مدت صحافت میں مندرجہ ذیل خاص نمبر نکالے

خاص نمبر فروری و مارچ سنہ ۵۸ء	خلافت و ملوکیت نمبر (مکمل تین حصوں میں) ستمبر، اکتوبر، نومبر و دسمبر سنہ ۷۱ء
خلافت نمبر ـــ اکتوبر و نومبر سنہ ۵۹ء	مسلم پرسنل لاء نمبر ـــ مارچ و اپریل سنہ ۷۲ء
خاص نمبر ـــ مارچ و اپریل سنہ ۶۳ء	ڈاک نمبر ـــ دسمبر سنہ ۷۲ء
ڈاک نمبر ـــ نومبر و دسمبر سنہ ۶۳ء	ڈاک نمبر ـــ جنوری و فروری سنہ ۷۳ء
تنقید نمبر ـــ فروری و مارچ سنہ ۶۵ء	تنقید نمبر ـــ مارچ و اپریل سنہ ۷۳ء
حاصل مطالعہ نمبر ـ جولائی و اگست سنہ ۶۶ء	ایمان نمبر ـــ جولائی و اگست سنہ ۷۳ء
خاص نمبر ـــ اگست و ستمبر سنہ ۶۹ء	نظریۂ ارتقاء نمبر ـــ اکتوبر و نومبر سنہ ۷۳ء
خاص اشاعت ـــ جولائی سنہ ۷۰ء	ڈاک نمبر ـــ جنوری فروری سنہ ۷۴ء
مخصوص شمارہ ـــ ستمبر و اکتوبر سنہ ۷۰ء	نقد و نظر نمبر ـــ مارچ و اپریل سنہ ۷۴ء
سالنامہ ـــ جنوری، فروری و مارچ سنہ ۷۱ء	طلاق نمبر ـــ مئی، جون، جولائی سنہ ۷۳ء

ان عنوانات کے تحت تجلّی کی ڈاک کے جوابات دیئے گئے

(الف) انعامی بانڈ۔ امتیازی الفاظ، ایک آیت اسلام اور غلامی، اسلامی تعزیرات، اقتداءِ امام، ایصالِ ثواب، الوائدۃ والوٗدۃ فی النار، آثارِ مبارک، اسپرٹ کا کاروبار، ایک آیت پر شبہ، ایصال ثواب، اسلامی سربراہوں کے بارے میں ایک الجھن، احرام، امام بخاری، اسلامی خلافت آسمان، استمداد و توسل، آزادی، ایک رباعی، الحاق کشمیر انشورنس، امیر معاویہؓ، ایک کیمپ میں نماز جمعہ، اسلام اور تفریحات، اہل حدیث اور فقہ، اسلامی اخلاق، اف یہ بے لگام مبلغ، اسلام کے نادان دوست، ایک ہندو بھائی فرماتے ہیں، ادائیگی حق، اسلامی امیر، استاد کے لیے شاگردوں کے گھٹے، آدابِ رزق، انجمن صدیقِ دیندار، ایک لیکچرار صاحب ابوالاعلیٰ اور لفظ مولانا، آمین بالجہر، آذان کا جواب، اعترافِ اسلام ضروری ہے، ازواج رسول اللہؐ، ایصال ثواب، ایصال ثواب کی بحث، آنکھوں کا عطیہ، آنکھیں چرانا، امامت اور رسالت، اعمالِ کفر، انیس کا ایک شعر، اسلام اور فتنہ، ادائیگی قرض، ایصال ثواب، ایک نامناسب القاب ایک روایت، انگلستان میں رویت ہلال کا مسئلہ، اسلامی شادی، ایک حدیث، انگریزی دوائیں، اولادِ مشرکین کا مسئلہ، امام کے گلے میں مائک، انگریزی دوائیں، استعانت بالاولیاء، امین احسن اصلاحی پر اعتراض، امامت، اجرت علی الاطاعت۔

ایصال ثواب، امامت، ایصال ثواب، ابلیس کی گرفتاری آسیب، ایک مکتوب، ایک ادبی بحث، ایک حدیث، ایک بدعت، امام ابوحنیفہؒ اور مولانا مودودی، ایک عبارت، ایکسیڈنٹ اور شہادت، اسکول کا مسئلہ، اقوامِ سابق ایک سطحی اعتراض، ایک معمائی شعر، ان میں اور پاگلوں میں کیا فرق ہے، آسیب اور اسلام، اجہل واعظ، الفتنۃ اللسیری، امانتداری، ایک آیت کا مفہوم، اسلامی کلمے، اخبارات میں قرآنی آیتیں، اجتہاد و تقلید، السلام علیک ایہا النبی، امام سے قرأت میں چوک، ایک آیت کی بحث، الفاظ کے استعمال کا مسئلہ، اسلامی نظام اور حجرِ اسود، اسلام اور عیسائیت، اخبار میں آیات و احادیث، ایک نام کی تحقیق، اہل سنت والجماعت کون ہیں، احباب کے تقاضے اور خواہشات، اقرار کا مطلب اہل حدیث اور اہل قرآن، ابن عبدالوہاب نجدی، اسلامی شریعت و معاشرہ وغیرہ، ایک ثقہ عالم کی خوش فہمیاں، الجمعیۃ میں تردد کا اشتہار، اخبار نشر اور جماعت اسلامی امامت، الصلوٰۃ خیر من النوم، انگریزی زبان، ابتدائی دینی مدارس میں مارپیٹ، اضطرار و اکراہ، ایک مراسلہ، اطاعت اور غیر حق، اسلامی حکومت اور محرمات، ایک عربی جملہ اولیاء کو پکارنا، الکوحل کا مسئلہ، الفاظ کا غلط استعمال، ایک حدیث، ایک روایت ایک دعویٰ، ایصال ثواب وغیرہ،

اولیا و شہداء، ایک حدیث کی تشریح، اسرار قبوری کا ایک عام معاملہ، اجتماعی قرآن خوانی، اذان یا ورد، اردو میں نماز، ایک شعر، اعوذ بسم اللہ، انگریزی بال، العوذ جس، امامت کا ایک حق، آیت کی تاکید، اسقاط حمل کا قانون، امیر معاویہؓ، ایمان اولیاء سے طلب مدد، ادارہ اہل سنت والجماعت، اعمال نامے لکھنے والوں کی مصلحت، امامت کی عمر، اہل حدیث دوستوں کی کرم فرمائیاں، امام الدین عالمگیری اور مدیر تجلی، امام ابو حنیفہؒ کی شان میں غلو سے احتیاط، اظہر، ایک حیرت ناک صورت حال، ایمان اور دخول جنت، اجرت کے معاملے ایک مسئلہ، اصلاح اجرت، ایصال ثواب کے لیے تلاوتِ قرآن، ایصال ثواب، اعلان نکاح اور دف، استمداد بغیر اللہ، استمداد من الاولیاء، امامت، اندھے کی لاٹھی، امتحان امام، اخبار کی غلطی، استعانت بالقبور، امامت کا ایک عجیب فتویٰ، ایک حدیث، ایک فرسودہ وصیت ایک پیچیدہ مسئلہ۔

(ب) بیعت، بے عنوان، بدعات و توہمات بری ذہنیت، بدعت، بدعات محرم، بے راہ روی، بدعات بریلوی مذہب، بیمہ زندگی، بدعتیں، بے تقلیدی، بیع سلم بدعتی کے پیچھے نماز، بچہ کا نام متعلق، بدگہر مولوی، بے تقلیدی کا رجحان، بدعت و شرک، بیچاری بھیڑیں، بدعت کی تعریف بینکوں کی ملازمت، بیچاری جماعت اسلامی، حضرت بلالؓ اور اذان، بیع سلم، باندیاں، بدعت کے لمبے سائے، بے بنیاد طریقے، بے دلیل باتیں، بعض اہل حدیث، بصورت پرمیت، بیمہ زندگی، بشرٹ اور پتلون، بھنگ کا مسئلہ بدعت، قبوری تصوف، بنگلور کا مسلم پرسنل لا کنونشن، بدعقل یا بے عقل امام، بعد نماز مصافحہ، برسات کے پانی کی چھینٹیں، برے پڑوسی کا حق، بہشتی زیور، بیچارے کشمیری مسلمان، بیوی کی وراثت، بینک کے سود کا مسئلہ، بلیک کا مسئلہ، بدعات و توہمات، بدعتی یا فاسق کے پیچھے نماز، بیچارے مولانا مودودی، بغیر بسم اللہ کی کتابیں، بینک کے سود کا مسئلہ، بیت المال، بہت کم بہروں کا مسئلہ، بیع سلم، بیلا بورڈ بابی، بالوں والا سر، [illegible] استعمال، بھوربھال کی حقیقت، بہشتی زیور کا مسئلہ، بدعات، بدعت کی اقسام، بالغ کا نکاح، [illegible] بمبئی کا ذبح، بیوی کی وراثت، باؤنڈری کا مسئلہ، بھانجی بطور بیوی، باندی سے تمتع یا نکاح، بیکار کی باتیں، بزم قادریہ، بدعت، بیع فاسد، بشارت، بیوی کا زیور، برسات کے پانی کی چھینٹیں، [illegible] مصافحہ۔

(پ) پیٹ میں بچہ، نماز ادا کرتا ہے، پیر علم جاہ اور بدعات، پیری مریدی، پیغمبر دل کی [illegible] پیغمبروں پر جادو کا اثر، پردے کے حدود، پیراسرار اقوال، پرائیویٹ فنڈ پر زکوٰۃ، پان سگریٹ، [illegible] پردے کا مسئلہ، پیری مریدی، پیر کی وراثت، [illegible] پیغمبر کی بیٹی، پیدائشی متقی و سعید، پاگل شوہر۔

(ت) تفہیم القرآن پر تنقید، [illegible] تعویذ، تحریر، تلاوت، [illegible] تعظیم والا حت بالکفر، تراویح، تصوف، تعویذ، تحریر، [illegible] الٰہی پر ایک شبہ، تفہیم القرآن اور ایک حدیث، تضاد بیانی، تفہیم القرآن کا ایک حاشیہ، تبلیغی جماعت کے بارے میں تعویذ، تارک جماعت، تعداد رکعات، تعزیہ، تصویر کا دستور قرآن، تارکِ صلوٰۃ کا حکم، تصوف، تین طلاق، تحیۃ المسجد، تراویح میں سجدہ کا ایک مسئلہ، تین طلاق، تقدیر، تراویح کی اجرت، ترجیع، تحریف قرآن سے تفسیر القرآن، تھوڑی سی شراب کا مسئلہ، تفہیم القرآن پر ایک اعتراض، تفسیر بالرائے، [illegible] تہمت تراشیاں، تبلیغی جماعت کی [illegible]۔ تفہیم القرآن سے متعلق ایک سوال، تفسیر البیان اور تصویر، تفہیم القرآن کی ایک عبارت، توہین صحابہ یا [illegible] تجارت کے نفع کا تناسب، تارک صلوٰۃ کی نماز جنازہ تصویر کا مسئلہ، تعویذ گنڈوں کا جواز، [illegible] تصویر، تشبہ بالکفار، تین طلاق، تعویذ، [illegible]

کی چند عبرتیں، تقلید کی بحث، تفسیر، تشبہ، تفریح، تقلید کی بحث، یمین مختلف سوال، تعاون علی المعصیت، تفاخر بجول، تاریخی سوال، تقابل، تفہیم القرآن، تجاوز عن المی، تشبہ بالکفار، تقلید واجتہاد، تصوف کے عجائبات، یمین مبارک دور، تفسیر بلا متن، تراویح اور مسلک اہل حدیث، تبلیغی جماعت، تلک کی رسم، یمین طلاقیں، تصویر کا مسئلہ، ٹخنوں سے نیچے پائجامہ کا مسئلہ، تراویح پڑھانے کی اجرت، تجلی جلا یا کب، تبلیغی بقراط، تفریح کیجیے، تحریف قرآن کا عقیدہ، تھوڑی سی شراب کا مسئلہ، تو آخر ہو کیا؟، ترقی، اہل سنت والجماعت کون ہیں، تفہیم القرآن کی ایک عبارت، ترک نماز، تماثیل، تمباکو نوشی، ٹیوشن کی آمدنی، تحریک شہید، تفسیر بلا متن، تعزیر کا حاصل، تمین مبارک در تفصیلاً لکل شیٔ کا مطلب، تعزیہ داری، ٹخنوں سے نیچے پائجامہ کا مسئلہ، تراویح اور مسلک اہل حدیث، ترانے کا احترام، تفہیم القرآن سے متعلق ایک سوال، تبلیغی جماعت کا طریق کار، تصویر اور گڑیا، تالیف قلب اور رشوت، ترتیب قرآن، تبلیغی نصاب، تبلیغی جماعت کے سات چلے

(ٹ) ٹونکا ٹوٹکا، ٹیلیفون پر نکاح، ٹیپ کا مصرعہ۔

(ث) ثواب کے لیے گناہ۔

(ج) جمعہ اور عیدین کے خطبے، جماعت اسلامی پر اعتراضات کا نمونہ، جاسوسی کرنے والے کتے، جماعت اسلامی اور سیاست، جنت میں دودھ اور شہد کی نہریں، جنت میں حوریں، جن اور فرشتے، جیلٹ کبھی نہیں بدلتی ـــــــ، جماعت اسلامی اور جماعت تبلیغی، جماعت اسلامی اور علمائے کرام، جماعت اسلامی اور جماعت سازی، جن کا ذبیحہ، جماعت اسلامی کی شرکت، جماعت تبلیغی جماعت اسلامی کا رد، جماعت اسلامی اور جماعت تبلیغی، جمہوریت کی تقریب، جن، جائز وحرام مشروبات، جائز رسم، جماعت تبلیغی، جاہل کی امامت، جماعت احمدیہ، جماعت اسلامی دیوبندی مسلک، جوا اور کاشتکار، جہالت، جماعت ثانیہ، جمعہ کی سنتیں، جمع تفریق، جمعیۃ علماء اور جماعت اسلامی، جہیز اور مہر، جمع بین الصلوٰتین، جماعت کے لیے کس وقت کھڑے ہوں، جلوۂ تہذیب، جماعت اسلامی اور الیکشن، جماعت اسلامی اور اسوۂ نبوی، جمعیۃ العلماء اور جماعت اسلامی، جماعت اسلامی مردودوں کی جماعت ہے، جماعت اسلامی کس سلوک کی مستحق ہے، جہالت کا کرشمہ، جماعت اسلامی کا نام، جماعت اسلامی وجماعت تبلیغی، جماعت اسلامی کے نقائص، جماعت اسلامی اور عامر عثمانی، جوتے پہن کر نماز کا مسئلہ، جنگ بدر سے متعلق، جاسوسی، جمال ناصر کے دکیل جھینگا مچھلی، جمعہ میں شرکاء کی تعداد کا مسئلہ، جہیز کی باطل رسم، جنت کا محل وقوع اور نظریۂ ارتقاء، جہل مرکب، جنات جوڑے کی لعنت، جواز زنا، جاہل اور غبی مفتی۔

(چ) چھری کانٹے سے کھانا، چوری کی لعنت، چند مسائل، چاند کا سفر اور اسلام، چند ماہ بعد ولادت کا مسئلہ، چاند کا سفر اور اسلام، چاندی سونے کا نصاب، چاند کی اطلاع، چند فقہی مسائل، چار بیں عید کیسے منائیں، چور کے ہاتھ کاٹنا، چمڑے اور ہڈی کا ٹھیکہ، چند نصیحتیں، چار شادیاں، چونکہ نہیں تو گمراہی کہہ لیجیے، چار شادیاں، چاند کے مسافر، چرم قربانی۔

(ح) حضور کا سایہ اور دنیٰ فتدلّٰی، حرام کی کمائی، حرمت حلت، حیات قبر، حکومت اور تبلیغ حق، حالات کی مجبوریاں، حروف کی شکلیں، حب جاہ، حقوق، حادثہ، حقوق الوالدین، حماقتیں، حضورؐ کے والدین، حق طلاق، حیات النبیؐ، حادثہ کربلا، حدیث بیعت، حلال وحرام کا معیار، حدیث، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان، حق پارٹی، حرام کاری، حقوق سے دست برداری، حفظ قرآن، حدیث کی بے ادبی، حضورؐ کا سایہ، حضورؐ کے تعلق سے، حکم ماں کا مانیں یا باپ کا؟، حب الوطن من الایمان، حقانی صاحب کی شریعت یا جہالت، حضورؐ اپنی قبر میں، حضورؐ کا رعب، حج میں تجارت، حمل کی مدت، حیات بعد الموت، حضورؐ کے نام پر انگوٹھے چومنا، حیرت ناک، محراب کا مفہوم، حضورؐ کا علم غیب، حسین بن منصور،

حدیث افتراقِ امت، حوض کا مسئلہ، حیات النبیؐ، حلال وحرام، حسینؓ، حضورؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، حلقۂ ذکر، حضورؐ کا سایہ، حدیث کا تعارض، حقوق کا معاملہ، حدیث کی کس مپرسی، حدیث کا جواب، حافظ کا ناظرہ پڑھنا درست ہے، حکومت کے قوانین، حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حج بدل، حلالہ کا مسئلہ، حالات کی گتھیاں، حضورؐ کا ادب، حیات خضر، حضرت آدمؑ اور نور محمدؐ۔

(خ) خطیب اور امام جمعہ کا مختلف ہونا، خدا کا وجود، خرافات، خاتمہ زمینداری، خلع، ختنوں کا مسئلہ، خط، ختنہ بہ جدید آلات، خبط، خلافت اور جماعت، خاندانی منصوبہ بندی، خواب میں زیارت نبویؐ، خواہ مخواہ، خطیب اور امام کا ایک ہونا ضروری نہیں، خاندانی منصوبہ بندی، حضورؐ کا پیشاب، حج کا ایک مسئلہ، خطبۂ عید کے بعد دعا کا مسئلہ، خطرناک باتیں، خطبہ میں حضرت معاویہؓ کا نام، خدمت دین، خطبۂ جمعہ میں خلفاء کے نام، خلیفہ بلا فصل، حضرت خارجہؓ، حضرت خضرؑ، خطائے اجتہادی، خطبات جمعہ، خدا کے سوا کسی سے غائبانہ مدد مانگنا، خون نفاس، خیالی پرواز یں، خاتم النبیین، خدا کی اطاعت اور والدین کی نافرمانی، خان عبدالغفار، خودکشی کا مسئلہ، ختم قرآن، خیانت و سرقہ، خدا کا آسمان دنیا پر نزول، خواجہ اجمیری کا مزار، خانقاہی تعلیمات، خرد کا نام جنوں۔

(د) دجال اور اس کی بھیکی اولاد، درس عبرت، دخولِ جنت وغیرہ، دارالحرب وغیرہ کا مسئلہ، درود تاج، دعا کے وقت چہرے کا رخ، دیوبندی اور اہل حدیث سب کافر، دودھ شریک بھائی بہن، دعا بعد نماز اور بنارسی ٹوپی، دارالاسلام، درود اور مولانا مودودی، درود کا مفہوم، ڈاکٹری اور پاکی، دفن کا طریقہ، داڑھی کا مسئلہ، داڑھی کی بحث، ڈاکخانہ کے فارموں کی خرید و فروخت، دو اعتراض، دماغ، دعا بعد الصلوٰۃ داڑھی، دعوے، داڑھی کی حد، دین و سیاست کا مقام، دارالحرب کا مسئلہ، دکانوں کی پگڑی، دوکان کے بورڈ، دعا کا مسئلہ، داڑھی سے متعلق، دعا بعد الاقامت، در حالت نماز تصویر، داڑھی مونڈنا، دارالحرب کا قضیہ، دعائے گنج العرش، ڈراموں کی تمثیل، داڑھی کی مقدار، داڑھی کی کمی بیشی، دیوانگی، داڑھی کی بحث، دودھ شریک بہن بھائی، دہریت، دادا کی وراثت، دیوبندیت اور بریلویت، دہریت اور اسلام، دین پسند بیویوں کا مسئلہ، درگاہ پر حاضری، دوسری شادی کے لیے زوجۂ اول کی اجازت، دین کے مسائل، دھوکہ کی شادی، دعائیں وسیلہ، دماغی خلل، دل دکھانا اور بول چال چھوڑنا، دارالکفر اور دارالاسلام، دستور جماعت اسلامی، دوسرے دو جماعتیں، درود وسلام۔

(ذ) ذبیحے کا مسئلہ، ذکر و شغل اور تبلیغی نصاب وغیرہ، ذبیحہ، ذو معنی یا ذو معنین، ذرا آپ دیکھیے، ذبح۔

(ر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، رضاعت کی بحث، روزے کی نیت، رجب کی ۲۷، رمضان کا ایک مسئلہ، رکعات تراویح کا قضیہ، روزہ اور انجکشن، رشتۂ زوجیت، رویت ہلال، ریل گاڑی میں نماز، ریڈیو وغیرہ رمضان میں شیطان کی گرفتاری، رضاعت، رسول اور نبی کا فرق، رہن کا ایک معاملہ، روح اور جسم، رسول اللہؐ کی بیویاں، روایات کی دنیا، رویت ہلال اور سائنس کی مزید بحث، ریڈیو اور رویت ہلال، رہن سے استفادہ، رشوت، رشوت کا مسئلہ، روحوں سے دل بستگی، رسموں کی بیڑیاں، رکعات تراویح، رسول اللہؐ کی دو حیثیتیں، رسول اللہ کی صاحبزادیاں، روایات کا کھیل، رمضان کی رسمیں، ربیب وطن، روزے کی نیت، رہن۔

(ز) زکوٰۃ، زن و شوہر، زمین سے زمین بدلنا، زکوٰۃ کا مسئلہ، زکوٰۃ اور صدقۂ فطر، زچہ کی موت، زندگی کا بیمہ اور اس کی زکوٰۃ، زر داد یا دوار، زکوٰۃ کا ایک مسئلہ، زکوٰۃ سے متعلق، زکوٰۃ اور چرم قربانی، زکوٰۃ، زکوٰۃ کے بارے میں، زکوٰۃ غیر مسلمین کو دینا جائز نہیں، زنا کا مسئلہ، زوال کے وقت نکاح، زندوں کے لیے مردوں کے اعضاء کا استعمال، زکوٰۃ کے مسائل، زوجہ کا دودھ، زیارت قبور، زینت۔

(س) سعودی عرب میں اسلامی قانون، سائنس اور قرآن، سوتیلی سالی سے نکاح، سماع موتی، سرکاری سود، سیرت النبی کے جلسے، سجدہ کا طریقہ، سنن، سلام فی دوران الطعام، سجدۂ تلاوت، سائنس اور قرآن، سعودی عرب میں اسلامی قانون، سنگ اسود اور بت پرستی، سول میرج، سُنی شیعہ تصادم، سجدۂ ابلیس، سودی پیسہ، سہرا، سنگ اسود کا بوسہ، سوشلسٹ ذہن، سیرت النبی کا مضمون، سود، سجدہ کا طریقہ، سود، سود خنزیر، سعد ابن وقاص، سنت طبعی، سود، سنتِ نکاح، بیکاری کا شرعی حل، جنگل کی چوری، سود، سود کا مسئلہ، سائنس، سائیکل پر نماز، سورۂ ممتحنہ مدنی ہے، سجدۂ تعظیمی، ساس سے زنا، ساڑی سے نماز، سوال کچھ جواب کچھ، سایۂ رسول، سزائے زنا، سود اور دار الحرب، سرسوتی پوجا کی مٹھائی، سنتوں کا قصر، سلسلۂ نسب، سوتیلی ماں کی بہن سے نکاح، سرکاری اسکیم سے استفادہ، سینما اور مولانا مودودی، سید زادیوں کا نکاح، سمت، سنتوں کے بعد کی دعا، سینما کی دوکانیں، سورتوں کا تعین، سودی قرض، سودی نظام، سرجری سے چہرے کی مرمت، سادات کو زکوٰۃ، سیدنا زین العابدین، سرکار رسالت کے والدین، سنی علماء کی زیب خوردگی، سنگ اسود کا بوسہ، سود، سہو.

(ش) شاہ اسمٰعیل شہید کی ایک عبارت، شب برات، شرکا جمعہ کی تعداد، شب قدر کا ایک مسئلہ، شعر و سخن، شوہر مفقود الخبر کا مسئلہ، شرکیات، شکایت، شاعری یا خرافات، شرکیات سے جلسے، شرک، شفاعت رسول، شرک و ضلالت، شخصیت پرستی، شرک فی الصفات، شاہ ولی اللہ اور بزرگان دین پر عظیم بہتان، شرک و بدعت، شب قدر، شطرنج و گنجفہ و تاش وغیرہ، شاہ صاحب کے دو شعروں پر اعتراض، شادی و بیاہ، شرک کی گھن گرج، شہزادوں کی باتیں، شب برات، شیطان اور رمضان، شراب کے چھینٹے اور بدن کے کھانا، شرک اور شرک، شر انگیزیاں، شرک، شیعہ حضرات کی روایتیں، شوہر مفقود الخبر، شرارت، شیریں کلامی، شرائط امامت، شیعوں کا ایمان، شیعوں سے تعلقات، شریعت یا جہالت، شب قدر کا مسئلہ، شرح صدر کی اصلاح، شراب کا کاروبار، شیطانی مذہب، شرک و بدعت، شرک و زندقہ کی بہاریں، شریعت محمدی، شراب کی ایک قسم بیئر، شرک و زندقہ، شرک مبین، شراب ملی ہوئی دوائیں، شیطان کے حربے، شرک و بدعت، شگون، شوہر کا ظلم اور اس کا علاج، شادی بیاہ میں ریکارڈنگ، شاکھا بینک کا سود، شب قدر، شب برات، شریعت اور توہمات، شادی بیاہ اور مشینوں کا ربط.

(ص) صفر کا آخری چہارشنبہ، صرف تبلیغی اسلام، صلاحیتوں کا بیچنا، صدر جمہوریہ ہند، صوفی نذیر احمد کشمیری اور مولانا مودودی، صلہ رحمی.

(ض) ضبط تولید، ضبط تولید اور مفتی عصر، ضبط تولید.

(ط) طعام کفار، طلاق بائن و رجعی، طلاق و نکاح، طویلے کی بلا بندر کے سر، طلاق معدود، طلاق کا مسئلہ، طلاق وغیرہ، مولانا قاری طیب صاحب کی تقریر، طرفہ تماشہ، مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند کے ارشادات، طوفان جہالت، طلاق کیوں، طلاق کی قسمیں.

(ظ) ظن و یقین، ظہور مہدی، ظلم اور انصاف.

(ع) علم غیب، عورت کی آواز، عشرہ، عالم برزخ کی باتیں، عمل نیک کا غلط وقت، عالم بالا کی باتیں، عورتوں کا تبلیغی سفر، علماء اور جماعت اسلامی، عشر کا مسئلہ، عورتوں کی مسجد، عورتوں کی ملازمت اور تعلیم وغیرہ، عریانی، علم رسول، عالم برزخ کی باتیں، عرس، عقیقہ، عبث باتیں، علی —— عبد الرسول جیسے نام، علی مولائے کائنات، عشر کا مسئلہ، عقیقے کے مسائل، علی کے لیے سورج کا پلٹ آنا، عرطلائے بزرگان، عائشہ اور نابالغ، عیسیٰ کی پیدائش، عورتیں اور مصاحب، عید کے دن مصافحہ، عقل اور نیت، عناد لوجہ اللہ، عمارت بلا بنیاد، عقیقہ، عورتوں کا ختنہ، عمرہ کی فتوحات، عورتوں کی آواز کا مسئلہ، عائشہ، عورتوں کی تبلیغ، عناد و تعصب، عدت کے بغیر نکاح ثانی، علماء یا حمقاء، عمر

اور وعا و وسیلہ، عبادت اور نیت، عیسیٰ بشر تھے یا فرشتے، عشر و خراج، عنوان طلب، عالم مثال، عالمگیری ایک عبارت، عصمت کی قیمت مہر، عیسیٰ بن مریم یا محمد سعید بن عبداللہ۔

(غ) غوث، غلط فہمی، غیر اسلامی رسوم، غلط طریقے غلط عقائد، غیر معتبر حدیث، غائبانہ نماز جنازہ، غیر ضروری سوالات، غلط استدلال، غلط ترجمہ، غسل جنین، غیر مسلم کی ارتھی میں شرکت غیر ضروری، غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ، غضب کا ظلم، غلط روایات، غسل جنابت، غیر مقلدین اور فقہ حنفی، غلطی اسے مضامین مت پوچھ، غیر مقلدین کے پیچھے حنفی کی نماز، غالباً درا قبال، غیر ضروری دماغ سوزی، غیر مسلم کی نماز جنازہ، غیر مسلمین سے تعلقات کی حدیں، غیر ذمہ دار محقق، غیر معیاری امام، غلوئے عقیدت، غلو پسندی، غلاف کعبہ، غلہ کی زکوٰۃ، غلو فی العقیدت غلط زاویے۔ ص

(ق) قیمت کا فرق، قبرستان، قیام میلاد، قبر اور میت وغیرہ، قسم کا کفارہ، قرآن میں سہو، قادیانیوں کی نماز جنازہ قربانی، قصر، قادیانیت، قبروں پر پھول چڑھانا، قومی بینک اور بیمہ کمپنیاں، قادیانی منطق، قرأت میں ترتیب، قرآن اور پیغمبر، قوالی، قصاص حسینؓ، قصاص عثمانؓ، قبر رسولؐ کی افضلیت قبروں پر فاتحہ، قومی جھنڈے کی سلامی، قبر پر قرآن خوانی، قربانی کی فرضیت، قضائے عمری اور مبارک راتیں، قبریں اور دعوت، قدرت خداوندی، قرآن میں اضافے کی بحث، قرآن کے مخاطب، قرآن اور قوم یہود، قادیانیت کا مسخرہ پن قبروں کی سمت نماز، قرآن اور فقہی مسائل، قادیانی اور امت مسلمہ، قرآن میں چوری کی سزا، قربانی، قلب بیدار، قرآن کی چند آیات۔

(ک) کفار کی ملازمت اور پیشہ وکالت، کفریات کمیونسٹ شوہر کی مسلمان بیویاں، کشمیری بھائی، کشمیر کے جلوے کمیونسٹوں کے خیالات، کفر کا مسئلہ، کمیونزم، کیا بیل عربی بولا تھا، کارساز کا ایک غلط طریق، کار شیطان جاری، کفار و مشرکین کے اعمال کی حیثیت، کفر و شرک، کرایہ در کرایہ، کراہتوں کی کہانیاں، کھیل تماشے، کبھی کھلی قمیص، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا، کیا کھڑے ہو کر پیشاب کرنا، کرامت کرامات الاولیاء، کفر و انکار، کپڑوں پر تصویر، کفر کا مسئلہ، کتب اور خاندان، کوڑھی کا غسل میت، کوڑھی کی امامت، کذب اور نبوت، کتابیہ عورت سے نکاح، کمیونزم کے ہتھکنڈے۔

(گ) گانا بجانا، گانے بجانے کی آمدنی، گھار بتھنا، گھٹیا سوالات، گڑے مردے، گمراہ کن پروپیگنڈہ، گلے کا ذبیحہ، گانا بجانا اور ولیمہ وغیرہ، گمراہی کے مقدس راستے، گوشہ گیری اور اسلام۔

(ل) لغویات، لعان، لباس، لیلۃ القدر، لائبریری، لائف ممبری، لیبیا میں قانون اسلامی، لغویت، لایعنی، لفظی تحقیق لفظی بحث، لاٹری، لاحاصل، لڑکیوں کی تعلیم، لفظ زنا شوئی، سالی اور بہنوئی، لفظ مولانا کی بحث، لڑکی کی مرضی کے بغیر نکاح۔

(م) مسجد سے متعلق، مصلی، مصافحہ بعد نماز، مسجد میں ذکر و شغل اور تبلیغی نصاب، مشتبہ بنیادیں، مہر کی قسم کا مسئلہ میلاد کا قیام، مولانا آزاد کا ایک ترجمہ، مولانا آزاد کا دوسرا ترجمہ مسئلہ تقلید، متفرق مسائل، متعدد مساجد میں نماز جمعہ و عیدین مسئلہ تقدیر، مہر کی بحث، مرہونہ مکان سے انتفاع، مروجہ محفل میلاد کی روایتیں، مشورہ طلب، مسلمان اور الیکشن، موت اور زندگی، ابن عبدالوہاب نجدی، مسلمانوں کی مشکلات کا حل، مغرب اور عشاء کا فصل، مولانا مودودی اور جماعت اسلامی، منصور حلاج، مکائد شیطانی، مسائل تصوف، مسجدیں، مکتوبات اور کتبات، نکاح ثانی، مالیخولیا، محبت اور عشق، مہر کا مسئلہ مسافت، مہر کی ادائیگی، معجزہ اور کرامت، محمد کی قسم، مباہلہ کا ایک مسئلہ، مجبوری میں رشوت دینا، محبت اور شادی، مولانا مودودی اور اعلان تاشقند، مال تجارت کی زکوٰۃ، مسجد کی تولیت، مختلف، متعہ، محرمات، مختلف مسائل، مشتبہات، میت کی زود شکلی، مباہات، مولانا مودودی کی داڑھی، مذہبی اجارہ داری، مسجد، مختلف، موت، موئے مبارک، مصافحہ مولانا علی، ملا علی قاری وغیرہ، مسجد کا دروازہ، مختلف، مخدوم محی الدین کی نماز جنازہ، مہر اور عدت کی شرعی حیثیت، مختلف مسائل، مسجد کی بیع، مرزائیوں کا مسئلہ، معجزہ اور سحر کا فرق۔

[illegible] ، قرآن کی تفاسیر اور علماء کرام، رحمۃ الرحمٰن، [illegible]

اختلافات، [illegible]، نفاق، [illegible]، نفسیاتی جنتہ، فلم، [illegible]، فلسفۂ مذہب، فقہی جزئیات، فاسد، [illegible]، فقیر و مسکین کی اصلاحیں، فاتحہ

مسجد کی زیبائش، مشرک خاندان، مسائل وراثت، متولی مرنے کے بعد کی رسمیں، مختلف سکوں کی خرید و فروخت، مردوں کی مخلوط نماز، مراسم جہالت، مزاروں کے دھندے، مسئلہ امام اعظم، مسلمان حرام خوروں کی نماز جنازہ کا مسئلہ، ماں کا حکم مانیں یا باپ کا، معاویہؓ کا نام، محراب، مولا علی کا پہاڑ، مال حرام، مقامات مقدسہ کے فلم، موئے مبارک، مسجد کا روپیہ، مسجد کے معاملات، معصیت اور فسق، مہربانیاں، مذاہب اربعہ، مزاروں کی دنیا، موسیقی کی شرعی حیثیت، مصر کے علماء کی کانفرنس، موسم سرما کی باتیں، مختلف مسائل، مباشرت بحالت حیض، مذہبی سمت گراہ چت، مہر، مختلف مسالک کا معاملہ، مذاق اور سنجیدگی میں فرق کرو، مساجد کے مسائل، مظلوم عورتیں، مردوں کے سننے کی بحث، موضوع روایات، مردہ بچہ مذہب کی ضرورت، مسلمان مشرک، مباح دعوتیں، مسواک اور برش، مولانا مودودی پر ایک اعتراض، متفرقات، مردوں کا سننا، مسائل فقہ، مولانا مودودی، مسائل مختلفہ، مروجہ اوراد وظائف، مظلوم کی دعا، مولانا مودودی کی تحریروں پر اعتراض، مقلدین و غیر مقلدین۔

(ن) ناقابل فہم، نماز جنازہ، نقد اور ادھار کی قیمتوں کا فرق، نئے مجتہد، نالائق مدیر تجلی، نشہ آور چیزوں کا استعمال، نیلام بر نکاح و طلاق کا مسئلہ، نزاکتوں کی انتہا، نفس اور شیطان نماز جنازہ، نماز میں سمت نگاہ کا مسئلہ، نفسانیت کے جلوے، نماز میں قیام کا مسئلہ، نفسانیت کے مظاہرے، نقد اور ادھار کے بھاؤ میں فرق، نیرنگ زمانہ، نماز عید اور عورت، نماز جمعہ کی بحث، ناسمجھوں کی باتیں، نماز میں ترتیب قرأت، نستیزہ گاہِ جہاں، نماز عید کا ایک عجیب مسئلہ، نظر، نفل نماز، نماز جنازہ نسلی امتیاز، نکاح کے لیے لڑکی کا دیدار، نحوست و سعادت نادان دوست، نماز کے مسائل، نصاب زکوٰۃ، نفع یا سود، نماز سے متعلق، نو ایجاد دعاؤں کا مسئلہ، نئے درود، نس بندی یا زیب کاری، نظریہ ارتقاء، نماز میں غیر عربی قرآن، نماز عید کی تکبیریں، نماز پڑھاتے ہیں مگر داڑھی ندارد، نیکی اور گناہ نزول قرآن اور تفسیر صدیق، نرالے مفتی، نذر۔

(و) ولدیت نابالغہ، ولد الزنا، وہی مولانا مودودی، وساوس، وحدت الوجود اور وحدت الشہود، واہی باتیں، وہی شیطانی مشن، وقت کی بربادی، وہی شریعت قیوری، وہی گھسی پٹی باتیں، وصیت اور وراثت، وراثت اور عقل، وضو وہی مردہ پرستی، والدین کے حقوق، وہی پرانا راگ، وما کان محمد ابا احد من رجالکم، وہی ذہنی بگاڑ، وراثت کا مسئلہ، وضاحت طلب، وہی دیرینہ بیماری، ولی قطب غوث۔

(ہ) ہر کہ آمد، ہندوؤں کا جھوٹا، ہاتھ پیر چومنا، ہلتے دنیا ہماری ایک عبارت پر اعتراض، ہم اور مولوی اسعد، ہلدی کا مسئلہ ہذیانات، ہندی زبان کا مسئلہ، ہیر پھیر کی باتیں۔

(ی) یہ نکتے اور عجمی عالم، یہ بھی سننا پڑا، یا عبد القادر شیئاً للہ، یہ بیچارے ذہنی مریض، یوم معاویہ، یہ ملت خرافات میں کھو گئی، یہ نام نہاد دیوبندی، یا رسول اللہ کا نعرہ، یہ تقلید کے مخالفین، یقولون ما لا یفعلون، یزید کی مجبوری۔

کچھ متفرق عنوان جو شروع میں آنے سے رہ گئے تھے۔

(الف) انما انت مذکر، سورۂ اخلاص، اختراعات۔

این چہ؟، اجنبیہ عورت کو دیکھنا، امام سے قرأت میں چوک، اہلحدیث اور اہل قرآن، اونچی دوکان پھیکے پکوان، ایک کا خون دوسرے کے جسم میں ڈالنا، ایجاد و بدعت، الزام تراشیاں — الشہاب الثاقب، اہل بدعت کا شرک، حضرت اویس قرنیؓ، ادارہ اہل سنت والجماعت، مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی، ابن عبد الوہاب نجدی، مولانا احمد رضا خاں صاحب کا ایک ترجمہ احتکار، اخبار دعوت اور فرقہ قادیانیہ، اعوذ باللہ، انگریزی بال آپس کی باتیں، امامت کی عمر، اجنبیہ عورت کو دیکھنا، امام کے اوصاف، مولانا آزاد کی تفسیر، اصول پسندی یا شخصیت پرستی انبیاء کی حیات قبر، ابتدائی دینی مکاتب، انگریزی زبان، اسلامی قوانین پر تین اعتراض، ایک عربی جملہ، اطاعت اور غرض اضطرار و استکراہ، اسلامی حکومت اور محرمات، اولیاء و شہداء و محمدؐ، خدا سے برتر ہیں، امام کو لقمہ دینا، آدھا کلمہ، اخبار دعوت میں عرس کا اشتہار، امامت اور قرض، ارباب تقدیر اور جماعت اسلامی۔

اسلامی شریعت انکے علم و فہم پر ناز کرتی ہوگی

یہ مضمون موجودہ دور میں انمول کہلانے کا مستحق ہے

اسے کئی بار پڑھیئے

اسلامی قوانین پر تین اعتراض

از:- محمد علی کاظمی ایڈوکیٹ (جالنہ)

قانون

نظامِ قانون و نظامِ عدلیہ کے تعلق سے بنیادی نظریہ یہ ہے کہ وہ انسان کی ضروریات اور معاشرتی تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ قانون انسان کے لئے بنایا جاتا ہے نہ کہ انسان قانون کے لئے۔ اس لئے کہ انسانی تہذیب اور انسانی معاشرہ مسلسل تغیر پذیر و مائل بہ ارتقاء ہے وہ قانون یا وہ نظامِ عدلیہ جو آج سے چند صدیوں پہلے بنایا گیا ہو موجودہ معاشرہ اور اس کے تقاضوں اور ضروریات کو یقیناً پورا کر ہی نہیں سکتا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اتنا لچکدار ہو کہ وہ انسانی تہذیب اور افراد کی ضرورت کے تقاضوں کو پورا کرے ورنہ ایسا قانون اور ایسا نظامِ عدلیہ غیر مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

(۱) اسی طرح اسلامی شرع و فقہ میں تعزیری قانون بھی موجودہ حالات کے تحت قابلِ تنقید ہے۔ مثلاً چوری کی شرعی سزا قطع ید ہے۔ چوری جیسے معمولی جرم پر جو یقیناً قابلِ اصلاح بھی ہوتا ہے، اتنی سنگین سزا انصاف کے تقاضوں اور انسانی ہمدردی کے نقطۂ نظر سے بھی غلط محسوس ہوتی ہے۔

چوری ایک ایسا جرم ہے جو بعض حالات میں کسی شخص سے اُس وقت سرزد ہوتا ہے جب کہ بجائے چور کو قابلِ سزا سمجھنے کے حالات اور معاشرے کو ان کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے۔ قطع ید جیسی سنگین سزا دینے کے بعد مذکورہ بالا باتوں پر غور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مذکورہ بالا باتوں پر غور کرنے کے بعد یہ سزا غیر منطقی و غیر انسانی نظر آتی ہے۔

موجودہ دور میں روئے زمین پر کم و بیش ۹۰ کروڑ مسلمان بستے ہیں اور بے شمار آزاد اور خود مختار اسلامی اسٹیٹس بھی موجود ہیں لیکن کسی بھی اسلامی مملکت میں اسلامی شرع و فقہ کے مطابق اسلامی قانون نافذ نہیں ہے کیا یہ سمجھا جائے کہ روئے زمین پر کوئی مسلمان نہیں بستا یا کسی اسلامی مملکت کا وجود ہی نہیں ہے؟ اُردن۔ مصر یا دیگر عرب ممالک جو مسلمانوں اور اسلام کے نام پر اسرائیل سے مسلسل جنگ کر سکتے ہیں تو وہ آزاد اور خود مختار ہونے کے باوجود اسلامی مملکت میں اسلامی شرع و فقہ کے مطابق قوانین کیوں نافذ نہیں کر سکتے؟ وہ کونسی وجوہات ہیں جو ان کو ایسا کرنے سے باز رکھتی ہیں؟ کیا اس وجہ سے دنیائے اسلام، اسلامی شریعت و فقہ کو اپنانے سے تو نہیں کتراتی کہ وہ جدید تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے؟

وراثت

(۲) مسلمانوں کا قانونِ وراثت کیا مبنی بر انصاف ہے؟ اگر واقعتاً ہے تو دادا کی جائداد میں پوتے یا پوتوں کے محروم الورث ہوجانے کے قانون کو کہاں تک مبنی بر حق و انصاف سمجھا جائے گا؟

جب کہ ہندوں کے قانونِ وراثت میں ایک پوتا اپنے باپ کی وفات کے بعد دادا کی جائداد میں (قانونِ نمائندگی کے تحت دادا کے ترکے میں حصہ پاتا ہے۔

طلاق

(۳) انحطاط پذیر ہندوستانی مسلم معاشرے میں جہاں اخلاقی قدروں اور اخلاقی کردار کا فقدان ہے اسلامی شریعت کا قانونِ طلاق کہاں تک مسلمانوں کے

ازدواجی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور زن وشوہر کے باہمی تعلقات کو خوشگوار، مضبوط اور مثالی بنانے میں ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے جب کہ ایک مسلمان شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینے میں اتنا ہی آزاد ہے جتنا زمانۂ جاہلیت کے دور میں کوئی شخص ایک عورت سے جنسی تعلقات قائم کر کے منقطع کرنے میں آزاد تھا۔

اسلامی شریعت کی رو سے ایک شخص محض لفظ طلاق کو تین مرتبہ دوہرا نے پر اپنی منکوحہ بیوی سے چھٹکارا پاسکتا ہے۔ اُس کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کے فعل سے روکنے کے لئے سوائے اخلاقی نصیحتوں کے کوئی قانونی بندش اسلامی قانون میں موجود نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں عام طور پر یہ طریقہ کار مروّج ہے کہ جب کوئی مُسلمان شوہر اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو بزرگانِ خاندان یا بزرگانِ محلہ یا چند ٹھیکیدارانِ مذہب اُس کے اس فعل کی مذمّت کرتے ہوئے اُسے اپنی طلاق شدہ بیوی کو دوبارہ اپنا لینے کی تلقین ونصیحت کرتے ہیں۔ آیا ایسا طریقہ کار کسی منظم اور جدید معاشرے میں کس حد تک قابلِ عمل قرار دیا جاسکتا ہے؟

اس کے علی الرغم موجودہ زمانے میں روئے زمین پر ازدواجی تعلقات کے متعلق کوئی بھی ایسا قانون نہیں ہے جو ایک عورت کو کلیۃً طور پر مرد کے رحم وکرم پر چھوڑ دے۔ تمام تہذیب یافتہ ممالک میں شوہر بیوی کو طلاق دینے سے پہلے اُن تمام قانونی مراحل کو طے کرتا ہے جو وہاں کے قانونِ رائج الوقت کے تحت ضروری ہیں۔ شوہر بیوی کو طلاق دینے سے پہلے طلاق وجوہات کورٹ آف لا کو بتلاتا ہے تب ہی وہ طلاق ہوتی ہے جب کورٹ آف لا مطمئن ہوتا ہے مثلاً

کے تحت ایک ہندو اپنی بیوی کو طلاق دینے سے پہلے اُس قانون کی دفعات کو پورا کرتا ہے۔ کورٹ آف لا کو مطمئن کرنے کے بعد اس کو اجازت ہے کہ وہ طلاق دیدے یہی وجہ ہے کہ ہندو معاشرے میں شرحِ طلاق نسبتاً مسلم معاشرے کے نہ ہونے کے برابر ہے۔

جواب

یہ سوالات جن میں سے ہر ایک اسلام کے خلاف ایک فردِ جرم کی حیثیت رکھتا ہے، تجلّی کے ایک قاری محمد عثمان صاحب نے اس اصرار کے ساتھ ارسال فرمائے ہیں کہ ان کے جوابات تجلّی میں ضرور دیئے جائیں۔ انکا کہنا ہے کہ یہ سوالات ان کے بہت ہی بے تکلف اور دیرینہ دوست جناب محمد علی کاظمی ایڈوکیٹ کے اپنے تحریر کردہ ہیں اور کاظمی صاحب دوستوں کی مجلس میں بڑی شد ومد سے اس خیال کا اظہار فرماتے رہتے ہیں کہ اسلامی شریعت اور اسلامی فقہ سراسر ناکام ہوچکی ہے لہٰذا اس میں تبدیلیاں کی جائیں۔ کاظمی صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی تعلیم حاصل کی ہے اور بہار انٹر الیونیورسٹی سے بھی ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری لی ہے۔ گویا فاضل در فاضل۔ اب وہ جالنہ کورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں اور دوستوں کی محفلوں میں اپنے ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار واعلان ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

ان سوالات پر کچھ عرض کرنے سے پہلے ہمیں یہ تحقیق ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے محترم کاظمی صاحب آیا مُسلمان ہیں یا غیر مُسلم؟

آپ کہیں گے کہ جس شخص کا نام ہی محمد علی ہے اسکے غیر مُسلم ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہم کہیں گے کہ نام سے کچھ نہیں ہوتا۔ سُرخ رنگ کا پانی بوتل میں بھر کر آپ اس پر مار اللحم کا لیبل لگادیں تو یہ لیبل اسے مار اللحم نہیں بنادے گا۔ اسلام کوئی نسلی مذہب نہیں کہ ہر حال میں چپکا ہی رہے۔ وہ تو اس بنیادی عقیدے کا نام ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم

خدا کے آخری رسول ﷺ اس اساسی عقیدے سے ذہنی انحراف آدمی کو بیک قلم دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے خواہ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے آپ کو مسلمان کہتا رہے۔ سوالات میں جو ذہن کارفرما ہے وہ تو ہانکے پکارے کہہ رہا ہے کہ مجھے کوئی دلچسپی ایمان و اسلام سے نہیں ہے۔ اگر بات فقہی جزئیات کی ہوتی تو خیال کیا جا سکتا تھا کہ کاظمی صاحب صرف فقہار سے خفا ہیں مگر یہاں تو بات براہِ راست ان قوانین کی ہے جنھیں خود باری تعالےٰ نے بندوں کیلئے حرفِ آخر قرار دیا ہے اور انھیں پوری صراحت کیساتھ قرآن میں نازل فرمایا ہے۔ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً ۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؎ کسی فقیہ یا مجتہد کا قول نہیں، اللہ کا ارشاد ہے جو شخص اللہ کے صریح و محکم قانون کو پوری بے تکلفی سے غیر منطقی و غیر انسانی اور غیر عادلانہ کہہ رہا ہو ظاہر ہے کہ یا تو وہ خدا کو مانتا ہی نہیں یا پھر ایسے خدا کو مانتا ہے جو منطق سے کورا، انسانیت سے بے خبر اور عدل سے عاری ہے۔ قانون وراثت یا طلاق کے کسی خاص فقہی جزئیے پر کاظمی صاحب معترض ہوتے تو تاویل کی جا سکتی تھی کہ وہ اللہ سے نہیں بلکہ علمار و فقہار سے اختلاف کر رہے ہیں لیکن وہ تو صریح طور پر ان آیاتِ الٰہیہ کو ناکارہ غیر منصفانہ اور فاسد ٹھیرا رہے ہیں جنھیں خود اللہ نے اہلِ ایمان کے لئے قانون کا درجہ عطا فرمایا ہے۔ وراثت اور طلاق دونوں ہی کے احکام شرح و بسط کے ساتھ قرآن میں موجود ہیں لہٰذا کاظمی صاحب کے معترضانہ فرمودات کا ہدف براہِ راست خدا ہی بنتا ہے۔ پھر بھی کیا کوئی صاحبِ عقل یہ مان سکتا ہے کہ فقط اس لئے کاظمی صاحب مومن و مسلم ہیں کہ انکا اسمِ گرامی محمد علی ہے۔

مغرب زدوں کی عام عادت کے مطابق شاید کاظمی صاحب بھی یہاں فوراً یہ طعنہ دیں کہ مولوی لوگ جھٹ کفر کا فتویٰ ہی داغ دیتے ہیں اور علمی جواب ان سے بن نہیں پاتا۔

اس طعنے کے سلسلے میں ہم صفائی سے عرض کر دیں کہ ہمارا مقصود انھیں کافر قرار دینا نہیں بلکہ نفس بحث کو معقولیت کی راہ پر چلانے کے لئے ان کی پوزیشن متعین کرنی مقصود ہے۔ کھلی بات ہے کہ سائل اگر بنیادی اصول و عقائد میں ہم سے متفق ہو تب تو یہ بات معقول ہو سکتی ہے کہ اس سے فروعات و جزئیات میں گفتگو کی جا سکے لیکن اگر وہ اساسی اصول و عقائد ہی میں ہم سے اختلاف رکھتا ہو تو فروعات میں بحث کیا معنی۔ ایک غیر مسلم سے ہماری گفتگو اساسات پر ہوگی۔ توحید و رسالت پر ہوگی قرآن کے کلام الٰہی ہونے نہ ہونے پر ہوگی نہ کہ پرسنل لا کی کسی فرع یا تعزیری قوانین کی کسی دفعہ یا فقہ کے کسی جزئیے پر۔ چوری کی سزا یا پوتے کی وراثت یا طریقۂ طلاق میں سے کوئی بھی مسئلہ اساسیات میں شامل نہیں۔ پھر بھلا ان پر کسی ایسے بزرگوار سے بحث کیا اور کیوں ہو سکتی ہے جو سرے سے قرآن ہی کی صداقت و حقانیت پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور رسول ﷺ کی تعلیمات و ہدایات سے انھیں کوئی سروکار نہ ہو۔ محترم کاظمی صاحب اگر اپنے ترقی پسندانہ خیالات کے سلسلہ میں واقعی سنجیدہ ہیں تو انھیں سب سے پہلے خود اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں کا جائزہ لے کر یہ طے کر لینا چاہئے کہ قرآن جس کتاب کا نام ہے وہ حقیقۃً کلامِ الٰہی ہے بھی یا نہیں اور محمد ﷺ جس ہستی کو کہتے ہیں وہ سچ مچ خدا کی آخری اور برحق پیغامبر تھی بھی یا یہ سب یوں ہی باتیں ہیں۔

اگر اس جائزے کے نتیجے میں وہ دیانتداری کے ساتھ محسوس کریں کہ قرآن و سنت پر غیر مشروط ایمان رکھنا انکے بس سے باہر ہے تب تو انھیں اسلامی شریعت

؎ چور چاہے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ جزا ہے انکی کمائی کی سزا ہے اللہ کی طرف سے عبرتناک۔ (المائدہ، ۳۸)

کے بعض اجزار وعناصر کے خلاف زبان کھولنے کے بجائے سیدھے لفظوں میں یہ کہہ دینا چاہیئے کہ خدا اور رسولؐ سب ڈھکوسلے ہیں۔ عدل، انسانیت، اخلاق سب کا سرچشمہ صرف ہماری عقل اور ہماری صوابدید ہے۔ آیات و احادیث کو کوئی فیصلہ کن مقام حاصل نہیں ہے۔

اور اگر وہ یہ محسوس کریں کہ خدا اور رسولؐ سے انحراف ان کے لئے ممکن نہیں تو پھر انھیں اپنی موجودہ روش چھوڑ کر وہ روش اختیار کرنی چاہیئے جو اہل فہم کے شایان شان ہو۔ اہل فہم کا طریقہ یہ ہے کہ جبتک وہ کسی مسئلہ میں تحقیق کا حق ادا نہ کرلیں۔ اس پر زبانِ تنقید دراز نہیں کرتے۔ محترم کاظمی صاحب نے یونیورسیٹیوں کا کورس تو پڑھا لیکن ان کی باتوں سے صاف مترشح ہے کہ اسلامی علوم کی تحصیل میں انھوں نے اپنی عمر عزیز کی قیمتی ساعتیں صرف نہیں کیں۔ انھیں سمجھنا چاہیئے کہ اسلامی شریعت کوئی گری پڑی چیز نہیں ہے۔ وہ ایک مبسوط منضبط اور ذیل در ذیل علم ہے۔ ایک ہمہ جہتی مجموعۂ قانون ہے۔ ایک مکمل دستور ہے۔ اس کے کسی جزیئے پر زبانِ اعتراض دراز کرنے سے پہلے انھیں کم سے کم اتنا تو کرنا تھا کہ عمر کا جتنا حصہ مغربی درسگاہوں کی نذر کیا ہے اس سے آدھا یا تہائی کچھ علوم اسلامیہ کی تحصیل پر صرف کرتے۔ وہ زبان سیکھتے جس میں یہ شریعت نازل ہوئی ہے۔ اُن اساتذہ کے حلقۂ تلمذ میں بیٹھتے جو علوم شرعیہ کی واقفیت میں معروف ہیں۔ ان مآخذ کا مطالعہ فرماتے جن میں قوانین شرعیہ کی سیر حاصل بحثیں محفوظ ہیں اس کے بعد بھی اگر انھیں کچھ الجھنیں باقی رہتیں تو انھیں اُچھالنے اور نشر کرنے میں اُس پر خود غلط آدمی جیسا طرز اختیار نہ کرتے جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ میں عقل کل ہوں۔ میں جس بات کو غلط سمجھوں وہ لامحالہ غلط ہوگی اور میرے علم و فہم اگر کسی مسئلے میں خدا اور رسولؐ کے فیصلوں سے متفق نہیں ہیں تو مجھے حق ہے کہ انھیں غلط، غیر منصفانہ اور غیر منطقی کہہ کر رد کردوں

ظاہر ہے کہ جو شخص قرآن کو کتاب الٰہی مانے گا وہ محض اس وجہ سے خدا کے قوانین کی تحقیر و تنقیص نہیں کرسکتا کہ بعض قوانین اس کی دوتولہ عقل قبول نہیں کررہی ہے۔

یہاں جی چاہتا ہے کہ چند آیات قرآنی پر بھی کاظمی صاحب کو توجہ دلا دیں۔ ان کے اعتراضات کی بنیاد عقل و تحقیق پر نہیں وساوس پر ہے اور وساوس کا علاج دلیل و منطق سے نہیں تذکیر ہی سے ممکن ہوسکتا ہے۔ واللہ والی التوفیق۔

سورۂ نسار کے بیسویں رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ ۔	اے ایمان والو ایمان لاؤ اللہ پر اور اسکے رسولؐ پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر اُتاری ہے۔

دیکھ لیجئے خطاب کفار سے نہیں مومنین ہی سے ہے مگر پھر یہ کہا جارہا ہے کہ ایمان لاؤ۔ یہ ٹھیک ایسا ہی ہے جیسا ہم نے عرض کیا کہ نام اور قومیت کے لحاظ سے بیشک ہمارے کاظمی صاحب مومن ہی سہی لیکن جس طرز فکر اور ذہنیت کا صدور ان سے ہورہا ہے وہ ایمان کے منافی ہے لہٰذا ان کے اعتراضات پر گفتگو کرنے سے پہلے یہی عرض کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ظاہری دعوۂ ایمان کے ساتھ دلی ایمان پر بھی توجہ دیں۔ یا پھر صاف صاف کہدیں کہ میں ان معنوں میں مومن نہیں ہوں کہ خدا کی کتاب کے ہر ہر جز اور ہر ہر آیت پر بلا یقین کرلوں۔

اس آیت کی تفسیر میں تمام ہی مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ بات قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس آیت میں جن مومنین سے خطاب کیا ہے وہ وہ ہیں جو ظاہراً تو اہل ایمان کے دائرے میں آگئے لیکن ذہنی طور پر وہ کتاب اللہ کی ہر ہر آیت پر یقین

نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ حقیقتہً مومن نہیں ہیں کیونکہ بعض آیات پر یقین رکھنے اور بعض کے بارے میں تذبذب اور شک کا شکار ہونے والوں کی حیثیت ان کافروں جیسی ہے جو تمام آیاتِ الٰہی کے منکر ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے اسی قرآن میں ان لوگوں کو کافر قرار دیا ہے جو بعض آیات پر ایمان رکھتے اور بعض سے انحراف کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ نے منافقین کا نام دیا ہے اور بعض منافقین کے لئے سخت ترین عذاب کی وعیدیں کتابِ الٰہی میں بکثرت موجود ہیں۔

سورۂ آلِ عمران کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

> اے رسول! اللہ نے تجھ پر جو کتاب (قرآن) اُتاری ہے اس میں دو طرح کی آیات ہیں محکمات اور متشابہات۔ محکمات وہ ہیں جن کے معانی واضح ہیں اور وہ اصل ہیں کتاب کی متشابہات وہ ہیں جنکے معانی واضح نہیں پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو متشابہات کے پیچھے سرگرداں رہتے ہیں تاکہ فتنے پیدا کریں اور ان متشابہات کو اپنی طرف سے کوئی معنی پہنائیں۔ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ "اٰمنا بہٖ کلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا" (ان پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں)"

اندازہ کیجئے کہ قرآن کی جن آیات کے معانی صریح و واضح نہیں ان تک میں ادنیٰ درجے کا ریب و شک ایمان کے منافی ہے اور اہلِ ایمان وہی ہیں جو ان پر بھی بلا تامل یقین رکھتے ہوں۔ پھر بھلا ان لوگوں کے ایمان کا اعتبار کہاں ہوگا جو قرآن کی آیاتِ محکمات پر بھی شک کا اظہار کریں اور یہ شک کھلے اعتراض اور تحقیر کی شکل اختیار کرلے۔ چوری کی سزا جن آیات میں ہے وہ تو ہر لحاظ سے محکمات میں شامل ہیں صریح۔ واضح۔ بے غبار۔ پھر بھی کوئی دعویٰ ایمان کرنے والا آدمی چوری کی پاداش میں ہاتھ کاٹ دینے کی سزا کو ظالمانہ، سنگین اور خلاف انسانیت قرار دے تو کس منطق کی رو سے یہ مانا جاسکتا ہے کہ وہ کتاب الٰہی پر ایمان رکھتا ہے۔

یہاں کاظمی صاحب کی طرف سے یہ عذر پیش کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے "موجودہ حالات کی قید کے ساتھ یہ سب کہا ہے لہٰذا یہ بدگمانی ان کے بارے میں درست نہیں کہ وہ قرآن میں نازل شدہ سزائے سرقہ کو اصولاً اور مطلقاً خلافِ عدل قرار دیتے ہیں۔

ہم یہ عذر مان لیتے اور اگر ان کی اپنی تقریر میں اسکی گنجائش ہوتی۔ لیکن ان کی تقریر تو اس سے سرتاسر منحرف ہے۔ وہ ایک سطر میں "موجودہ حالات" کے الفاظ لکھ کر دوسری ہی سطر میں بطور اصول یہ فرمادیتے ہیں کہ:۔

> "چوری جیسی معمولی جرم پر جو یقیناً قابلِ اصلاح بھی ہوتا ہے اتنی سنگین سزا انصاف کے تقاضوں اور انسانی ہمدردی کے نقطۂ نظر سے بھی غلط محسوس ہوتی ہے۔

اس واضح ارشاد نے اس تاویل کی گنجائش بھی نہیں چھوڑی کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا پر ان کے واشگاف اعتراض اور تردید و مذمت کو کسی مخصوص زمانے اور مخصوص حالات سے مشروط سمجھ لیا جائے۔ وہ ہر حال میں چوری کو ایک ایسا معمولی جرم سمجھتے ہیں جس کی پاداش میں ہاتھ کاٹ دینا خلاف عدل اور خلافِ انسانیت ہے۔ لہٰذا کوئی بھی دور، کوئی بھی ملک ہو اور کچھ بھی حالات ہوں ان کے استدلال کی رو سے چوری کی وہ سزا جو اللہ تعالیٰ نے صریح لفظوں میں معین فرمائی ہے ظالمانہ اور انسانیت کش قرار پائی۔ ایک اور پہلو پر بھی نظر ڈالئے۔ کاظمی صاحب

اگر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہی کو سرے سے ظالمانہ سمجھتے اور براہِ راست انھیں خدا ہی سے اختلاف نہ ہوتا تو آج ہند و پاک میں کہاں چوروں کے ہاتھ کاٹے جا رہے ہیں کہ اس پر احتجاج کرتے ہوئے وہ مخصوص حالات کی دہائی دے رہے ہیں یہ احتجاج کہ ہاتھ کاٹنے کا قانونِ خدا وندی فلاں قسم کے حالات میں ہے آجکے حالات میں نہیں ہے اُس وقت کوئی منطقی جواز رکھ سکتا تھا کہ آج کے حالات میں بھی چوروں کے ہاتھ دھڑا دھڑ کاٹے جارہے ہوتے لیکن جب اس سزا کا اجرا آس پاس کہیں بھی نہیں ہو رہا اور اسلامی قوانین کو حیطۂ اقتدار سے بے دخل کیا جاچکا ہے تو مسئلے کی حیثیت فقط نظری اور اعتقادی رہ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں تنقید کا جھنڈا وہی شخص بلند کرسکتا ہے جو نظری اور اعتقادی حیثیت ہی سے قرآن کے اس محکم قانون کو غلط اور خلاف عدل تصور کرتا ہو کہ چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جائیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ کاظمی صاحب کے پیش نظر نہ اصلاحِ معاشرہ ہے نہ دفعیۂ ظلم نہ کوئی اور مثبت مقصد۔ اصلاح اس برائی کی کیجاتی ہے جو پائی جا رہی ہو۔ دفعیہ اس ظلم کا ہوتا ہے جو ڈھایا جا رہا ہو۔ ہاتھ جب کاٹے ہی نہیں جا رہے ہیں تو سوائے اس کے کاظمی صاحب کا کیا مقصد ہوسکتا ہے کہ یونیورسٹی میں تجدد اور کج فکری کے جو انجکشن ان کے قلب و دماغ میں انجیکٹ کئے گئے ہیں ان کے تحت وہ اسلام کے بنیادی معتقدات کو ریب و تذبذب کے تیروں سے چھلنی کریں اور قرآن کے حرف حرف پر جو قطعی یقین ایمان و اسلام کی شرطِ اولین ہے اسے کمزور کردیں۔ ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر یہ کام کر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے انھیں شعور ہی نہ ہو اور فی الحقیقت وہ یہ سمجھ رہے ہوں کہ میں اس طرح اسلام کی خدمت انجام دے رہا ہوں لیکن ان کے سمجھنے نہ سمجھنے پر حقائق کا مدار نہیں۔ شراب کو ہم پانی سمجھ لیں تو وہ پانی نہیں بن جاتا گمراہی کو ہم ہدایت تصور کرلیں تو اس میں سے نور کی کرنیں نہیں پھوٹیں گی۔ جو روش انھوں نے اختیار کی ہے وہ بہرحال ایک ایسے بگڑے ہوئے دماغ اور دھواں دھواں قلب کی ترجمان ہے جسے جہالت آمیز تعلیم اور ناقص معلومات نے دگا ڈکر رکھدیا ہے۔

آیئے اب ذرا منطقی رخ سے بھی ان کے اعتراضات کا تھوڑا سا جائزہ لے لیں۔

"قانون" کا عنوان دے کر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ژولیدہ فکری کا شاہکار ہے۔ خدا جانے انھیں کس نے بتا دیا کہ اسلامی قوانین میں لچک ناپید ہے وہ تکلیف کر کے صرف ایک دو وہ کتابیں دیکھ لیں جنمیں اسلامی قوانین کی بحثیں محفوظ ہیں۔ انھیں نظر آئے گا کہ ایسے تمام قوانین جن میں لچک نہ ہونا تغیر پذیر انسانی معاشرے کے لئے نقصان دہ ہوسکتا ہے اس درجہ لچک اپنے اندر رکھتے ہیں کہ اسلامی قانون کے ہر ماہر کو ان میں اپنے اپنے فکر و فہم کے مطابق ایک الگ رائے قائم کرنے کا موقع مل گیا اور جزئی اختلافِ خیال نے اسلامی قانون کے گلزار کو ٹھیک اس باغ کی شکل دیدی جس میں رنگ رنگ کے پھول کھلتے اور نوع نوع کے پودے اُگتے ہیں۔ لچک اگر موجود نہ ہوتی تو فقہ کے مختلف اسکولوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لچک ہی ہے جس نے فقہاء اسلام کو مخلصانہ اختلافِ رائے کے مواقع بہم پہنچائے اور اسلامی فقہ ایک ایسا تالاب بن کر نہیں رہ گئی جہاں پانی ٹھیر کر گندہ ہو گیا ہو۔

البتہ جہاں تک اصول و مبانی اور اساسیات کا تعلق ہے تو ان میں لچک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ دنیا کے ہر آئین میں بعض دستوری بنیادیں اور بعض اصول و کلیات ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ناقابلِ تغیر ہوں۔ قطعی او مسلّم ہوں کیا کاظمی صاحب دنیا کے

کسی بھی قابلِ ذکر آئین کا نام بتا سکتے ہیں جو ناقابلِ تغیر اصول وکلیات اور بے لچک اساسیات سے خالی ہو وہ تو ماشاء اللہ ایڈوکیٹ ہیں جب تک رہے اگر وہ بھی یہ نہ جانیں کہ دنیا کا کوئی بھی آئین اپنے پیروں پر کھڑا ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کے ستون بعض غیر متبدل تصوّرات وافکار اور بعض بے لچک مبادیات کی زمین میں نہ اُتار دیئے گئے ہوں، آج دنیا میں جو مہذب قومیں کہلاتی ہیں اُن کے قوانین کا مطالعہ کر لیا جائے۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ملے گا جو چند قطعی، ناقابلِ تغیر اور اٹل دستوری اصول وتصورات سے خالی ہو۔ البتہ یہ ضرور آپ دیکھیں گے کہ بنیادی فکر اور مرکزی تصوّرِ حیات کے تفاوت بلکہ تناقض کی وجہ سے بہتیری وہ قدریں جو اسلام کے یہاں اٹل ہوں گی وہ دوسرے غیر اسلامی قوانین میں قابلِ تغیر مان لی گئی ہوں گی۔ اور بہتیرے وہ تصوّرات جنہیں اسلام مذموم قرار دیتا ہے ان قوانین میں محمود و مرغوب تسلیم کر لئے گئے ہوں گے۔

معاشرے کے تقاضوں اور زمانے کی ضروریات کے سلسلے میں ایک متعین مثال سے نفسِ حقیقت کو سمجھئے۔ زنا ایک ایسا فعل ہے جسے اسلام کسی حالت میں جواز کا درجہ نہیں دے سکتا۔ عفت وعصمت اس کی نگاہ میں ایک ایسی قیمتی چیز ہے جس کا تحفظ ہر قیمت پر اسے مطلوب ہے اور جن اصول و ہدایت پر عفت وعصمت کا تحفظ منحصر ہے ان کے سلسلے میں وہ کسی لچک اور مفاہمت کا روادار نہیں۔ اس کے مقابلے میں مادی تصورِ حیات پر مبنی کوئی بھی نظام اس اخلاقی قدر اپنے اساسی تصوّرات اور بنیادی مقاصد میں شامل نہیں کرتا۔ اسی لئے جو معاشرہ آج کے مختلف نظاموں نے پیدا کیا ہے اس میں یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ عفت وعصمت کا وہ درجہ باقی رہ جائے جو اسلام کے یہاں ہے۔ زندگی کے اکثر شعبوں میں مرد و زن کی مخلوط معاشرت اور حظِ نفس کو حاصلِ زندگی قرار دینے والے فلسفوں، فارمولوں اور تہذیبی نسخوں کی بہتات نے زنا کو موجودہ معاشرے کا ایک ایسا تقاضا بنا دیا ہے جسے مادہ پرست ذہن "ضروریات" کی فہرست میں شمار کرنے لگا ہے۔ اب اگر کوئی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ اصلاح کے نام پر اسلامی قوانین میں ایسی لچک پیدا کی جائے جو اس نوع کے معاشرتی تقاضے اور اس قبیل کی زمانی ضروریات کو پورا کرنے میں ممد و معاون ہو تب تو انہیں صاف طور پر کہنا چاہیئے کہ وہ فی الحقیقت اصلاح کے نہیں بلکہ اسلام کی موت کے خواہاں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کا ٹائٹل جوں کا توں رکھتے ہوئے عقائد وتصوّرات وہ اپنالئے جائیں جو مکمل طور پر تہذیبِ حاضر اور تمدنِ موجود سے ہم آہنگ ہوں۔ جن میں خدا اور رسولؐ کی حاکمیت کے بجائے مادّہ پرستانہ تعقل اور نفس پرورانہ تفلسف کی حاکمیت ہو۔

کاظمی صاحب نے تمثیلاً چوری کی سزا کو پیش کیا ہے۔ پہلا سوال تو ان سے یہی کیا جانا چاہیئے کہ کسی جرم کے معمولی یا غیر معمولی ہونے کا معیار آپ کے نزدیک کیا ہے سائنس نے حرارت، برودت، دباؤ اور پھیلاؤ وغیرہ کی پیمائش کے آلے تو بے شک ایجاد کر لئے ہیں مگر کیا ایسا بھی کوئی آلہ وجود میں آگیا ہے جو یہ بتا سکے کہ فلاں جرم کا اخلاقی درجہ کیا ہے اور فلاں گناہ کو کتنی ڈگری کا گناہ تصور کیا جانا چاہیئے۔ چوری کو کاظمی صاحب نے معمولی جرم کہہ دیا۔ ظاہر ہے کہ زنا کو بھی معمولی جرم کہنے پر کوئی کسی کی زبان نہیں پکڑ سکتا۔ آج جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں وہاں زیادہ "مہذب" لوگ تو زنا کو سرے سے جرم ہی نہیں سمجھتے اور جو لوگ اتنے مہذب نہیں ہیں وہ بھی اتنا بڑا جرم نہیں سمجھتے کہ سو کوڑوں سے کھال اُدھیڑ دی جائے۔ تو کیا اگلے مرحلے میں کاظمی صاحب کو اس دعوے سے کوئی روک سکے گا کہ زنا ایک معمولی جرم ہے۔ آخر اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ سو کوڑے نے خدا کی پناہ کتنا ظالم اور وحشی ہے وہ اسلام جو زنا جیسے معمولی جرم کی سزا سو کوڑے اور بعض حالتوں میں سنگساری تجویز کرتا ہے۔

[illegible] ... [illegible] ... ہے
[illegible] ... کی تمام ... [illegible]
[illegible] ... سکتا ہے جس کی ... [illegible]
[illegible] ... ہے اگر قرآن چوری کو ... [illegible]
[illegible] ... اس کے مرتکب کا ہاتھ کاٹ دیا جائے
[illegible] ... اس کی کوئی منزل ہے جس ... [illegible]
[illegible] ... دعویٰ کر سکے کہ چوری ایک ... [illegible]
ہے [illegible] ... میں ہاتھ کاٹ دینا عمل نہیں ظلم ہے
[illegible] ... میں کاظمی صاحب بتائیں تو کر کونسی ... [illegible]
[illegible] ... فیصلہ ... [illegible] ... ہیں کہ جرم سرقہ کا وزن کم
[illegible] ... بہت ہی زیادہ ... زبان ہلا دیجئے
[illegible] ... ہوتا ... کے لئے دلیل چاہیئے ... [illegible]
[illegible]

[illegible] ... استدلال ہے کہ چور کو قابل سزا سمجھنے کے
لئے ... معاشرے کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا
اس استدلال کی رو سے تو کم و بیش سارے ہی جرائم
ناقابل ... معاشرے کے سر تھوپا جا سکتا
[illegible] ... بہرحال معاشرتی
[illegible] ... پھر ہاتھ کاٹنے ہی کا ... [illegible]
[illegible] ... کی قیدی جاتی ہے اسے
[illegible] ... قرار دیئے ... [illegible]
[illegible] ... معاشرتی حالات
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ... معاشرے کو ... [illegible]
[illegible] ... جائے کہ آپ ... [illegible]

[illegible] ... تو کاش کاظمی صاحب نے اسلام
[illegible] ... مطالعہ کیا ہوتا تب انھیں معلوم ہوتا کہ
کے قانون میں بھی لچک موجود ہے پیغمبر
ہر چوری کا ہاتھ کٹوانے کا موجب ہوگی قرآن
نازل ہوا تھا اسی نے دوسرے اسلامی قانون
چوری کے قانون کو بھی اس ... تشریح ... [illegible]
نہیں رکھا ہے جس سے لچک کا نقشہ سامنے
آپ نے فرمایا کہ اتنے مال کی چوری پر ہاتھ
جائے گا جو ایک ڈھال کی قیمت سے کم ... [illegible]
ہے کہ ڈھال کی قیمت ... [illegible]
کو اس کا موقع ملا کہ اس لچک سے فائدہ اٹھا
اپنی صوابدید کے مطابق مال کی حد مقرر کریں جس
کم پر ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔
آپ نے فرمایا کہ پھلوں اور ترکاریوں
میں ہاتھ نہیں کٹے گا۔ نہ کھانے کی چوری میں
گا۔ حتی کہ کسی بھی ایسی چیز کی چوری پر حضور
مبارک میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا جسے معمولی
کہا جا سکے۔ پرندوں کی چوری کا یہی مسئلہ
ہوگی۔ حالانکہ جنگل میں چرنے ہوئے جانوروں کا
پر بھی اس کا نفاذ نہ ہوگا۔
[illegible] ... لچک ... [illegible]
[illegible] ... سے ... [illegible]
[illegible]
[illegible]

تفصیل کتبِ فقہ میں اور عملی نظیریں تاریخ اسلام میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

کاظمی صاحب اگر یہ کہتے کہ غیر اسلامی نظام کے تسلط نے جو حال معاشرے کا بنا دیا ہے اس میں چوری کی سزا پر ہاتھ کاٹنا قرین انصاف نہیں معلوم ہوتا تو یہ ایک متین بات ہوتی جس پر اسلام دشمنی اور خدا بیزاری کا طعن نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہم خود کہاں اس کے قائل ہیں کہ اسلامی قوانین اور اسلامی اخلاق کے ذریعہ معاشرے کو اصلاح و تطہیر کے سانچے میں ڈھالے بغیر وہ سزائیں نافذ کردینی چاہئیں جو اسلام نے چوری اور زنا اور شراب نوشی وغیرہ پر رکھی ہیں۔

لیکن کاظمی صاحب نے جو کچھ جس انداز میں کہا ہے وہ متانت و معقولیت سے اس لئے دور ہے کہ جذبۂ اصلاح کے بجائے وہ جذبۂ انحراف و بغاوت پر مبنی نظر آتا ہے اس خدا سے بغاوت جس نے چوری کو ایک سنگین جرم قرار دے کر اس کی سزا قطعِ ید مقرر کی ہے۔

سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے ان تمام اخلاقی جرائم کی سزائیں جن سے وہ معاشرے کو پاک رکھنا چاہتا ہے دو وجہ سے سنگین رکھی ہیں۔ ایک تو اس لئے کہ سنگین سزائیں جرائم کے معرضِ ظہور میں آنے کو روکتی ہیں اور دوسرے اس لئے کہ وہ اپنے اصلاحی قوانین کے ذریعے ایسے حالات ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس میں ان جرائم کے لئے کوئی منطقی وجہِ جواز باقی نہ رہے۔ اسکے بعد بھی اگر لوگ جرم سے باز نہیں آتے تو وہ وہی ہو سکتے ہیں جو طبعاً شریر اور بدگہر ہوں۔ ایسے لوگوں کے لئے سنگین سزائیں اس لئے ضروری ہیں کہ ان میں اصلاح کو قبول کرنے کا داعیہ ہی نہیں ہے اور ضرورت کے تحت نہیں بلکہ اپنی مجرمانہ سرشت کے تحت وہ جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ دوسروں کو بھی جرائم کی راہ پر لگانے کا ذریعہ بن جائیں گے اگر سختی سے

ان کی سرزنش نہ کی گئی۔

سعودی عرب میں اگرچہ مکمل اسلامی نظام نہیں، لیکن اسلامی حدود و تعزیرات بہرحال نافذ ہیں لہٰذا کاظمی صاحب جیسے حضرات کو ایک نگاہِ عبرت ڈال لینی چاہیئے کہ وہاں چوری اور زنا وغیرہ کا کیا اوسط ہے۔ اسلامی سزاؤں کو بھیانک کر کے دکھانے والوں کا اندازِ بیان ایسا ہوتا ہے جیسے ان سزاؤں کے نتیجے میں معاشرہ لنجوں اور لنگڑوں سے بھر جاتا ہو مگر جب واقعاتی مشاہدہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جہاں جہاں یہ سزائیں کارفرما گئی ہیں وہاں وہاں وہ جرائم ہی تقریباً ناپید ہوگئے ہیں جن پر ہاتھ کاٹنے یا کوڑے برسانے کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ ایک ایسا قانون جس کی نظر میں بنیادی اہمیت اخلاقی پاکیزگی کو حاصل ہو اور جو دنیا کے چند روزہ تعیش پر حیاتِ اخروی کی فلاح کو ترجیح دیتا ہو لازماً یہ چاہے گا کہ جرائم کا مکمل سدِ باب ہو۔ نہ یہ کہ جرائم اور سزاؤں کے انبار لگتے چلے جائیں۔ سزا کا معیار اگر ہلکا ہو تو قدرتاً مجرموں کی ہمت بڑھے گی، بیشمار لوگ ہر جگہ ایسے دیکھے جاسکتے ہیں جو چند ہزار روپے کی خاطر چند ماہ جیل میں رہ آنے کو نفع کا سودا تصور کرتے ہیں لیکن ایسے لوگ خال خال ہی مل سکتے ہیں جو چند ہزار کی خاطر ہاتھ کٹ جانے کا خطرہ مول لینے پر آمادہ ہوں۔

چوری کی شرعی سزا کو مثلاً پیش کرنے کے بعد اسلامی قانون کے متعلق جو کتنی سطری تقریر کاظمی صاحب نے فرمائی ہے وہ ایک طرف پراگندہ ذہنی کی مظہر ہے۔ دوسری طرف منطق سے یکسر عاری اور تیسری طرف اُن کے اُس جذبۂ بغاوت کی مظہر جو اسلامی قانون کو ہر حال میں ناقص و ناکارہ منوانے پر تلا ہوا ہے۔

ہم کاظمی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ اگر بے شمار مُسلمان نماز کی فرضیت پر ایمان رکھنے کے باوجود
ہوگی کہ نماز
ہی میں کوئی نقص و عیب ہے؟ اگر نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ

نہیں تو پھر مسلمان حکمرانوں کا اپنے ملکوں میں اسلامی آئین و دستور کو نافذ نہ کرنا اور بھانت بھانت کے غیر اسلامی قوانین کو سینے سے لگائے رکھنا اس بات کی دلیل کیسے بن گیا کہ اسلامی شریعت ہی ناکارہ و کاسد ہے، ایک بہترین نسخہ طاق میں رکھا رہے اور بیمار حضرات اسے استعمال کرنے کے بجائے دوسرے نسخوں کو آزماتے رہیں تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہاں تک عقل و منطق سے مطابقت رکھے گا کہ یہ نسخہ ہی ناموزوں اور بے اثر ہے بہت بھولا ہوگا وہ مسلمان جو یہ نہ سمجھ سکے کہ مسلمان حکومتوں کے سربراہ کیوں اسلامی آئین کو نافذ کرنا نہیں چاہتے۔ آج دنیا پر مادّہ پرستانہ فکر کا غلبہ ہے۔ کمیونسٹ ممالک ہی نہیں وہ ممالک بھی جنھیں مذہب اور روحانیت کو طلاق مغلظہ نہیں دے چکے مادّیت کے سیلاب میں نفس پرستی، لذّت اندوزی، تعیش اور تکمیل شہوات کی ایسی جولانگاہ بن چکے ہیں کہ چشم فلک نے کبھی کہیں بھی ایسا منظر نہ دیکھا ہوگا اور ان کے تصوّرِ حیات نے مسلم ممالک سمیت تمام ہی دنیا میں جیسا کچھ نفوذ کیا ہے وہ کسی آنکھ والے سے پوشیدہ نہیں لہٰذا مسلم حکمرانوں کیلئے کیسے ممکن ہے کہ وہ اُس نظامِ اسلامی کی طرف پیش قدمی کر سکیں جو قدم قدم پر نفس پرستی، تعیش اور شہوات و اہوا پر پابندیاں عائد کرتا ہے اور اگر کچھ اللہ کے بندے توفیقِ الٰہی سے اس کی جرأت کریں بھی تو وہ مادّہ پرست اور اخلاق دشمن حکومتیں کیونکر اسے برداشت کر سکتی ہیں جنھوں نے اپنے بے پناہ مادی وسائل اور نت نئے فلسفوں کے ذریعے انھیں اپنا دست نگر بنا رکھا ہے اور ان کی مملکتیں ان کے مفادات و اغراض کی جولانگاہیں ہیں اخوان المسلمون جیسی کوئی جماعت کہیں اٹھتی ہے تو روس اور امریکہ، فرانس اور برطانیہ ــــ جو ایک دوسرے سے مختلف ہونے ہوئے بھی مادّہ پرستی کے موقف پر یکسر متفق ہیں ــ مل کر اسے کچلنے کے درپے ہو جاتے ہیں اور خود مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ ایسی ہر تحریک کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے جو اسلامی نظام کا داعیہ لے کر اٹھی ہو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان اسلام ہی کے نام پر بنایا گیا ہے لیکن وہاں کا اقتدار جن ہاتھوں میں منتقل ہوا انھوں نے آج تک اس کے سوا کچھ نہیں کیا ہے کہ اسلامی قدروں کو دبانے اور غیر اسلامی تہذیب و ثقافت کو اُبھارنے میں سارا زور صَرف کرتے رہیں اسلامی آئین موجودہ زمانے کی جائز ضروریات اور حقیقی مقتضیات کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں اس کا پتہ تو اس وقت چلتا جب عملی دنیا میں اسے کارفرمائی اور نفاذ کا موقع بھی دیا جاتا۔ یہ کتنی احمقانہ بات ہے کہ نسخے کو آزمانے کی زحمت تو اٹھاؤ نہیں اور خواہ مخواہ شور مچاتے رہو کہ وہ نسخہ تو بے کار ہے اور بے اثر ہے وغیر ذلک۔

اب دوسرے سوال کو لیجئے جس کا عنوان "وراثت" ہے جو لوگ تھوڑا سا بھی مطالعہ رکھتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ پوتے کی وراثت کا شوشہ کوئی نیا شوشہ نہیں جیسے پہلی بار کاظمی صاحب ہی نے چھوڑا ہو۔ یہ تو ان معروف چٹکلوں میں ہے جن کے ذریعے مادیت کے فنکار اسلامی قوانین کو مجروح اور قرآن کو مشکوک بنانے کی مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں۔ کاظمی صاحب کے کانوں تک انھی حضرات سے یہ بات پہنچی اور ہر اُس فریب خوردہ کی طرح جس نے اسلام کا علم مغربی درس گاہوں سے حاصل کیا ہے کاظمی صاحب بھی اس شوشے پر ریجھ گئے۔ حالانکہ ذرا بھی عقلِ سلیم سے کام لیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ ایک سفسطہ، ایک شعبدہ ہے اور کچھ بھی نہیں۔

خدا جانے کاظمی صاحب کے یہاں انصاف اور ظلم کا معیار کیا ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے تو ان کا یہ ایمان ہونا چاہیئے تھا کہ خدا اور اس کا رسول جس فیصلے کو منصفانہ کہدیں وہ منصفانہ ہے اور جسے ظالمانہ قرار دیں وہ ظالمانہ لیکن اس معروف اسلامی اندازِ فکر سے

ہٹ کر اگر وہ اس دھاندلی پر اتر آتے ہیں کہ جسے وہ خود انصاف کہدیں وہی انصاف ہے اور جسے وہ ظلم ٹھیرا دیں وہ لازماً ظلم ہے تو ایک پوتے ہی کی وراثت کی بات کیا۔ وہ تو بڑی آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ لڑکی کو لڑکے سے آدھا ورثہ دینا ظلم ہے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر مرنے والے کا ایک بیٹا دولت مند ہو اور دوسرا غریب تو دونوں کو برابر کا ورثہ دینا انصاف کے خلاف ہے۔ وہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بیٹے اگر امیر ہیں اور بیٹی غریب تو سارا ہی ترکہ بیٹی کو دینا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ظلم اور انصاف کی تشخیص میں اگر کسی اتھارٹی اور سند کو تسلیم نہ کیا جائے تو دنیا کا کوئی قانونِ وراثت بھی ایسا نہیں ہو سکتا جسے ظالمانہ کہنے سے زید عمر بکر کو روکا جا سکے۔

کاظمی صاحب ایک وکیل ہیں۔ انھیں کم سے کم اتنا تو معلوم ہونا ہی چاہیئے کہ ہر قانون کی بنیاد کسی نہ کسی اصول پر ہوا کرتی ہے۔ کیا انھوں نے کبھی یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارہ فرمائی کہ اسلام کا قانونِ وراثت کس اصول پر مبنی ہے۔ سامنے کی بات ہے کہ اسلام کا قانونِ وراثت قرابت کے اصول پر استوار ہے رحم و رعایت ... اور صدقہ و خیرات کے تصور پر نہیں۔ اسی لئے ترکہ کی تقسیم خونی رشتوں کی بنیاد پر ہوتی ہے نہ کہ اس بنیاد پر کہ ورثہ میں کون کتنا ضرورت مند ہے۔ اکیلے اسلام ہی کی بات نہیں۔ دنیا کے ہر مہذب قانون میں وراثت کا مبنیٰ قرابت ہی ہے نہ کہ پس ماندگان کی ضرورت و احتیاج فرق اتنا ہے کہ دوسرے تمام قانونوں میں یہ تناسب خود انسان مقرر کرتا ہے کہ کس رشتہ دار کو کتنا دینا چاہئے اور اسلام میں تناسب اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا ہے اب یہ بات خود کاظمی صاحب سوچیں کہ انسان کی تشخیص زیادہ صحیح ہو سکتی ہے یا اللہ تعالیٰ کی

اسلامی قانونِ وراثت کے چند بنیادی کلیات ہیں۔ ایک یہ کہ کسی بھی شخص کا مال اس کی زندگی میں مالِ وراثت نہیں بن سکتا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ہندوؤں کے قانونِ وراثت میں یہ کلیہ مسلّم نہیں۔

دوسرا یہ کہ وراثت صرف زندوں کو پہنچے گی مُردوں کو نہیں۔ اسی کلیے کے تحت وہ پوتے دادا سے ملنے والی میراث سے محروم ہو جاتے ہیں جن کا باپ اپنے باپ کی زندگی ہی میں انتقال کر گیا۔

کاظمی صاحب نے ہندوؤں کے قانونِ وراثت کا حوالہ دیتے ہوئے "قانونِ نمائندگی" کی بات بطور دلیل کہی ہے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر وہ واقعی مسلمان ہیں تو بجائے ہندو قانون کا حوالہ دینے کے قرآن یا حدیث یا صحابہؓ و تابعین کے تعامل یا ائمہ و مجتہدین کے اقوال میں سے "قانونِ نمائندگی" کے لئے کوئی ادنیٰ سی دلیل نکال کر دکھائیں۔ علاوہ ازیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "قانونِ نمائندگی" اگر کوئی چیز ہے تو یہ ساری محبت و شفقت صرف پوتوں کے لئے کیوں وقف ہو کر رہ گئی ہے دوسرے تمام رشتہ داروں میں بھی اس نمائندگی کی کارفرمائی ہونی چاہیئے۔ مثلاً مرحوم بیٹے کی بیوی، مرحوم بھائی کی اولاد، مرحوم بیوی کے والدین یہ تمام اقربا اسی طرح قانون نمائندگی سے مستفید ہونے چاہئیں جس طرح پوتوں کو فیض پہنچایا جا رہا ہے۔ نواسوں اور نواسیوں نے کیا قصور کیا ہے کہ انھیں وہ حصہ نہ ملے جو اُن کی مرحوم ماں کو ملنا تھا۔ مرنے والے کی ساس نے کیا قصور کیا ہے کہ اسے وہ حصہ نہ ملے جو اس کی مرحوم بیٹی کو اس لئے ملتا کہ وہ مرنے والے کی بیوی تھی۔

عجیب تماشہ ہے کہ صرف پوتوں کے حق میں نمائندگی کا قانون پیش فرمایا جاتا ہے مگر دوسرے تمام رشتہ داروں کے سلسلے میں اس قانون کی بساط لپیٹ کر رکھدی جاتی ہے۔ یہ صریح ناانصافی اور جانبداری ہے جو کاظمی صاحب جیسے حضرات کے نزدیک عین عادلانہ ہے۔

ہو۔ لیکن اسلام کا قانون اگر اپنے اصولوں کے تحت کسی جانبداری اور بے قاعدگی کا روادار نہیں تو اسے ناانصافی کا نام دے دیا جاتا ہے —— جہاں تک رحم و رافت کا تعلق ہے قانون وراثت اس کا محل نہیں۔ اگر رحم و رافت کے تحت آپ پوتوں کو وارث بنائیں گے

۱ اور چشم بد دور بعض مسلمان ملکوں میں نہ صرف ایسا کہا بھی گیا ہے بلکہ بیٹا بیٹی کا حصہ عملاً برابر کر دیا گیا ہے۔

تو پھر رحم و رافت کا تقاضہ یہ بھی ہوگا کہ جو شخص مثلاً تین بیٹے چھوڑ کر مرا ہے اور ان تینوں میں دو خوب دولتمند ہیں اور تیسرا بالکل غریب یا اپاہج تو مرنے والے کی دولت میں ان تینوں کو برابر حصہ نہ دیں بلکہ یا تو سارا کا سارا اس غریب ہی کو دیدیں یا پھر حساب کتاب لیکر بیٹھ جائیں اور تینوں میں امارت و غربت کا جو تناسب ہو اسی حساب سے ترکہ تقسیم کریں۔ اسی طرح اگر بیٹی ہو تو مثلاً کہ بیٹی شوہر یافتہ ہی گئی ہو اور بیٹا محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتا ہو تو آپ یہ فیصلہ دیں کہ سارا مال متروکہ بیٹے کو دیدیا جائے بیٹی کو کچھ دینے کی کیا ضرورت

اور بات یہیں تک نہیں رہتی پھر تو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ برابر والے گھر میں جو بیچارہ غریب ہمسایہ رہتا ہے اسے کیوں مرنے والے دولتمند کی وراثت میں شامل کیا جائے پڑوسی کا حق تو بہت ہے۔ حضورؐ کے صریح لفظوں میں قسم کھا کر فرمایا ہے وہ شخص مومن نہیں ہو سکتا جو خود پیٹ بھر کر کھالے اور اس کا پڑوسی بھوکا سو جائے۔ اتنی زبردست اہمیت جس کے ساتھ سلوک کرنے کو دی گئی ہو وہ تو بدرجۂ اولیٰ اس کا مستحق ہو جاتا ہے کہ پوتوں کی ہمدردی کا راگ الاپنے والے کرم فرما اسے بھی وراثت میں شریک ٹھہرائیں۔

حق یہ ہے کہ پوتوں کو وارث بنانے کے پیچھے خواہ جذبۂ رحم کارفرما ہو یا قانون نمائندگی، دونوں ہی صورتوں میں قانون وراثت کے بخیئے اس طرح ادھڑ جاتے ہیں کہ سوائے انتشار اختلاف اور پراگندگی کے کچھ باقی نہیں رہ جاتا

عقل دشمنی کی بات اور ہے ورنہ جو لوگ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ کسی بھی قانون کی تمام دفعات اور تمام شقوں کو لازماً ان بنیادی تصورات اور اساسی اصولوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے جن پر یہ قانون استوار ہوا ہے انھیں اس نکتے کے ادراک میں کوئی دشواری پیش نہیں آئیگی کہ قانون نمایندگی یا رحم و رافت کے تحت پوتوں کو دادے کا وارث بنانا ایک ایسا غیر منطقی، غیر اصولی اور نامعقول اقدام ہے جو قانون وراثت کے بنیادی کلیات سے متصادم ہے اور اسکی مثال ایسی ہے جیسے سیب کے درخت کی ایک ٹہنی پر آپ امرود باندھ دیں۔ امرود سیب کے درخت پر نہیں اگا کرتا۔ اسی طرح قانون وراثت کے بنیادی اصولوں میں کسی مرحومے کی نمائندگی کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

سوال ایک اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ پوتے اگر واقعی اس پوزیشن میں ہیں کہ انھیں مالی مدد ملنی چاہیئے تو آخر دادے کو کس نے روکا ہے کہ وہ انکے لئے کچھ وصیت کرے۔ اسلامی قانون وراثت میں ایک تہائی مال کی حد تک وصیت واجب نہیں مستحب ہے۔ دادا اگر دیکھ رہا ہے کہ اسکے مرحوم بیٹے کی اولاد غریب ہے، محتاج امداد ہے تو یہ حق ہے کہ اپنے مال میں ان کیلئے وصیت کر جائے۔ اس سے زیادہ ان پوتوں کیلئے شفیق کون ہوگا جن لوگوں کو پوتوں کی ہمدردی بے چین کئے ہی رہتی ہے وہ قانون وراثت میں بے اصولی پیدا کرنے کی مذموم کوشش کے بجائے یہ سیدھا اور صاف راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے کہ دادوں کو اسلام کا قانون وصیت یاد دلائیں اور ترغیب دیں کہ ہر دادا اپنے ان غریب پوتوں کیلئے تہائی مال کی وصیت کر کے مرے جن کے باپ مر چکے ہیں۔ یہ طریقہ پوتوں کے حق میں نسبتاً زیادہ بہتر ثابت ہوگا کیونکہ پوتوں کو اگر زبردستی ورثاء کی فہرست میں شامل کر دیا گیا تو اکثر و بیشتر حالتوں میں انکا حصہ مورث کے کل مال کے ایک تہائی سے کم ہی نکلیگا لیکن دادا اگر چاہے تو وصیت کے ذریعہ انھیں ایک تہائی کا مالک بنا سکتا ہے۔

تیسرا سوال جس کا عنوان "طلاق" ہے وہ بھی بے مغز ہی ہے پہلے دونوں سوالوں جیسا۔ نہیں مسلم معاشرے میں اخلاقی قدروں کے انحطاط کی بات اپنی جگہ درست لیکن اس انحطاط کو اس بات کی دلیل بنانا کہ طلاق کا حق مرد کے ہاتھ سے چھین کر عدالت کے سپرد کر دیا جائے "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" والی بات ہے۔ آخر کیا مناسبت ہے دلیل اور دعوے میں ہم نہیں سمجھ سکتے کہ علمی استدلال کی تکنیک اور کلام و منطق کے درس سے اس درجہ بے نیاز رہنے والے کاظمی صاحب اپنے موکلین کے مقدمے کیسے لڑتے ہونگے ۔۔۔۔۔ کاش وہ آنکھیں کھول کر دیکھتے کہ جن ممالک میں مرد و زن کی مساوات کے سرتا سر جاہلانہ اور خلاف فطرت نعرے کے تحت مرد و زن کو طلاق کے معاملے میں یکساں حق دیکر یہ معاملہ کورٹ آف لا کے سپرد کر دیا گیا ہے وہاں نکاح و طلاق کا حال ابتر ہے اور اخلاقی گندگی پورے عروج پر اچھل رہی ہے۔ امریکہ و انگلینڈ وغیرہ کے گوشوارے تو آئے دن چھپتے ہی رہتے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ نکاح کا اوسط سال میں چالیس فی صد اور طلاق کا ساٹھ فیصد۔ پھر کیسی کیسی فریب کاریاں اور کس کس نوع کی فحاشیاں طالبان طلاق کورٹ آف لا کو مطمئن کرنے کیلئے کرتے ہیں اس کا حال معلوم کیجئے تو طبیعت سلیم کو استفراغ ہو جائے۔ ایک کیٹ سلیا سے زیادہ کون اس بات کو جانیگا کہ کسی سچی بات کو عدالتی سطح پر ثابت کرنا اکثر و بیشتر کتنا دشوار ہوا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں طلاق کا اختیار عدالتوں کو منتقل کر دیا کر دیا گیا ہے وہاں سو میں دس مقدمے بھی ایسے نہیں ہوتے جنھیں طلاق طلب کرنے والا مرد یا عورت سیدھے اور سچے طریقہ پر صرف وہی وجہ بیان کر دینے پر اکتفا کرے جو حقیقۃً طلاق چاہنے کا موجب ہے بلکہ عموماً جھوٹی وجوہ گھڑی جاتی ہیں اور افترا پردازی، بہتان تراشی اور مکر و دجل کے کسی بھی بدتر حربے کے استعمال سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ اسلام کے پاکیزہ طریقۂ طلاق سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کورٹ والے طریقۂ طلاق کو پسند کرنا ایسا ہی ہے جیسے روایتی کھیر قورمے بریانی اور گوشت وغیرہ پاک کھانوں پر ناک بھوں چڑھانے کے بعد اس وقت خوشی سے جھوم اٹھے جب اسکے سامنے مینگنیاں ملے ہوئے چنے ڈال دیئے جاتے ہیں یہاں بے اختیار قرآن کا بیان کردہ وہ واقعہ یاد آتا ہے جب حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ۔ (اے کیا تم اعلیٰ درجہ کی چیز کے بجائے ایک گھٹیا چیز لینا چاہتے ہو)

بے دانشی کی حد ہے کہ اوسط طلاق کے سلسلہ میں کاظمی صاحب مسلم معاشرہ کا مقابلہ ہندو سماج سے کر رہے ہیں اور کسی نا سمجھ بچے کی طرح ہندو معاشرے میں طلاق کی شرح کم ہونے کا سبب ابھی سن ۵٦ میں بنے ہوئے اس ہندو میرج ایکٹ کو قرار دے رہے ہیں جس نے ایک ہندو شوہر کو یہ حق دیدیا ہے کہ عدالت کے ذریعہ اپنی بیوی کو طلاق دے سکے۔

والے تو ہیں نکری: — شاید اسکول کے بچے بھی جانتے ہیں کہ طلاق کا سسٹم ہندو (۳۱۲) کی ہیات جنھیں طلاق کیلئے وکیلوں اور عدالتوں کے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں اس بات

معاشرے کی مذہبی روایات اور عائلی تصورات میں پایا ہی نہیں جاتا۔ وہاں تو شادی ہوگئی تو بس زندگی بھر کیلئے ہوگئی۔ کاظمی صاحب کے استدلال کا کوئی مفہوم اسوقت تو سمجھ میں آسکتا تھا جب صورتحال یہ ہوتی کہ مذکورہ ہندو میرج ایکٹ سے قبل ہندو سماج میں طلاقوں کی بھرمار ہوتی اور اس قانون نے آکر اس بھرمار کو کم کردیا ہوتا لیکن حقیقی صورتحال یہ ہے کہ اس قانون سے قبل ہندو سماج میں طلاق کا تصور تھا ہی نہیں۔ پھیرے تب بیاہ تو جنم بھر کا ساتھ ہے یہی تصور ہندو سماج کے عائلی دائروں میں ایک مذہبی عقیدے اور روایتی قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہندوؤں کے ماہرین قانون نے جب یہ دیکھا کہ یہ تو بڑی نامعقول بات ہے کہ کسی بھی حالت میں کسی کو طلاق کا حق حاصل ہی نہ ہو تو انھوں نے قانون بنایا تاکہ جو لوگ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیں اٹھالیں قانون مذہبی تصورات و عقائد پر قاضی نہیں ہوا کرتا لہٰذا اس قانون سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد زیادہ نہ ہوسکی صرف معدودے چند ایسے لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا جو آج کی اصطلاح میں زیادہ مہذب تھے اور سماجی دباؤ کو نظرانداز کرنے کی جرأت رکھتے تھے۔ ظاہر ہے ایسے لوگ معاشرے میں کم ہی ہوتے ہیں لہٰذا ہندو سماج میں طلاقوں کی شرح نہ ہونے کے برابر ہی رہی اب اگر کوئی صاحب علم و فہم کی اس معلوم صورتحال کے باوجود یہ منطق چھانٹے کہ ہندو معاشرے میں طلاقوں کی شرح کم ہونے کے باعث سن چھپن کا ہندو میرج ایکٹ ہے تو اسکے سوا کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ اس شخص کے نزدیک علم کے معنی ہیں لغوگوئی اور فہم کا مطلب ہے خودرستی۔ جو قانون ایک نایاب چیز کو معرض ظہور میں لانے کا موجب بنا اسے کاظمی صاحب اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے وہ بہ افراط پائی جانیوالی طلاقوں میں کمی کا موجب بنا ہو۔

ناطقہ سربگریباں ہے، اسے کیا کہیے — سامنے کی بات ہے کہ مقابلہ کرنا چاہیئے کہ ان ممالک سے جہاں طلاق کیلئے کوئی مذہبی تصور مانع نہیں اور حق طلاق تفویض کردیا گیا ہے عدالتوں کو ان ممالک میں طلاقوں کی جو شرح ہے اسکے مقابلہ میں مسلم معاشرے کی شرح طلاق نہ ہونے کے برابر ہے۔ اپنے ہندوستان ہی کا سروے کرکے دیکھئے۔ نکاح کے مقابلہ میں طلاق کا اوسط ایک فیصدی بھی نہیں حالانکہ مہذب ممالک میں طلاقوں کی بھرمار ایک افسانوی حیثیت حاصل کرچکی ہے۔ شادی شدہ سو مردوں میں سے کم سے کم دس مرد ایسے ضرور ملیں گے جو کئی کئی بیویوں کو طلاق دے بھی چکے ہیں اور کئی کئی بیویوں سے طلاق لے بھی چکے ہیں۔ پھر ننانوے جو باقی رہے ان میں سے بھی کم از کم بیس ایسے ہونگے جنھوں نے زیادہ نہیں تو ایک بار ضرور طلاق کھانے اور طلاق کھلانے کا ذائقہ چکھ رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طلاق کی کثرت اور قلت کا کوئی تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ طلاق کا طریقہ کیا ہے۔ اگر اس بات سے ہوتا تو دنیا میں ہر قوم سے زیادہ شرح طلاق مسلمانوں میں پائی جاتی کیونکہ انکے پرسنل لا میں نہ عدالت کی احتیاج ہے نہ کسی اور کھٹ راگ کی۔ مرد کامل طور پر آزاد ہے کہ جب چاہے زبان کو حرکت میں لاکر طلاق دے ڈالے۔ پھر بھی اس قوم میں طلاقوں کی قلت اور دیگر اقوام میں طلاقوں

کی واضح دلیل ہے کہ طلاقوں کی کثرت و قلت کا منطقی تعلق معاشرے کی اخلاقی حالت اور افراد کے ذہنی رخ سے ہے نہ کہ طریقۂ طلاق سے۔ جس معاشرے میں مرد و زن کے تعلقات صرف مادی اور حسی قدروں پر مبنی ہونگے وہاں طلاق کی بہتات ہوگی خواہ طریقۂ طلاق آسان ہو یا مشکل اور جہاں معنوی و روحانی قدریں بھی کچھ اہمیت رکھتی ہوں اور جانی پہچانی جاتی ہونگی وہاں طلاق نسبتاً کم ہوگی۔

مسلمانوں کا پرسنل لا دنیا کے ہر پرسنل لا پر نمایاں فوقیت رکھتا ہے، اس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، ہم خود بھی یہاں تھوڑا سا تقابلی جائزہ پیش کرتے لیکن محترم کاظمی صاحب کا مبلغ قابلیت اور سخن فہمی کی جس سطح سے گفتگو کررہے ہیں اس سطح پر شعور اور تحقیقی مواد کی حیثیت ایسی ہی ہوگی جیسے بھینس کے آگے بین بجایئے۔ ہم آج کی گفتگو کو دو باتوں اور ایک نصیحت پر ختم کردینا چاہتے ہیں۔

باری تعالٰے نے فرمایا:-

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ	اور جو لوگ منکر ہوئے وہ منھ کے بل گرے اور کھو دیئے (اللہ نے)
اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ	انکے عمال یہ اسلئے کہ انھیں وہ پسند نہ آیا جو اللہ نے
كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (محمد ۹)	نازل کیا۔

چوری کی پاداش میں ہاتھ کاٹنا، پوتوں کا ورثا، کی فہرست میں شامل نہ ہونا، طلاق کا کامل اختیار شوہر کو ہونا اور اس سلسلے میں عدالت کی دخل اندازی کا خارج از بحث ہونا۔ یہ تمام امور صریح و محکم قوانین کی حیثیت سے اللہ کے نازل فرمودہ ہیں اور اللہ کے آخری رسولﷺ نے انھیں اسلامی معاشرے میں جاری و ساری کرکے بھی دکھلادیا ہے۔ اسکے باوجود اگر کوئی شخص شد و مد کے ساتھ ان قوانین کو ناپسندیدہ، ظالمانہ اور انسانیت دشمن قرار دیتا ہے تو اسے آنکھیں کھول کر دیکھ لینا چاہیئے کہ خود اللہ تعالٰی اس کی اس باغیانہ جسارت کو کفر سے تعبیر کررہا ہے نہ یہ کہ کوئی مولوی کفر کا فتویٰ لگا رہا ہو۔ اسی سورۃ میں چند آیات کے بعد اللہ تعالٰے کہتا ہے:-

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ	کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے کیا انکے دلوں
عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا	پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔

ایمان کا مسکن و مستقر انسان کا قلب ہی ہے دماغی اعتبار سے وہ کتنا ہی تیز طرار ہو لیکن اگر اسکے دل پر تالا پڑگیا ہے تو فکر و فہم کی ساری صلاحیتیں کفر ہی کی تزئین اور آرائش میں صرف ہونگی۔ یہ ہم نہیں کہتے قرآن کہتا ہے اور قرآن پر جس شخص کو ایمان کا دعویٰ ہو اسے دل کا دروازہ کھولکر قرآن میں تدبر کرنا چاہیے — اس تذکیر کے بعد ہماری نصیحت بھی محترم کاظمی صاحب سن لیں کہ آدمی کو اپنے علم و فہم کی بساط سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہیئے۔ جو مسائل اونچے درجے کا تدبر، اعلٰے درجہ کا سوجھ بوجھ، کافی علم و تحقیق، جاگتا ہوا دل اور سلامتی کی راہ پہ چلنے والا دماغ چاہتے ہوں ان سے عہدہ برآ ہونے کیلئے محض ڈگریاں اور سندیں کافی نہیں۔ دانشمند وہ ہے جو ہمیشہ حد ادب کا لحاظ رکھے اور اپنی استعداد سے باہر کی باتوں میں نہ الجھے خصوصاً مسلمان کو تو لازماً یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں بہت قلیل عرصے رہنے کے بعد ہمیں حساب کتاب بھی دینا ہے جو کچھ زبان یا قلم یا ہاتھ پیروں سے یہاں کرتے رہے ہیں وہ سب آخرت کی میزان احتساب میں تلنا ہے ایسا نہ ہو کہ آج ہم

جہل مرکب کی رو میں خدا اور رسولﷺ کی اہانت کرکے اپنے آپ کو تیس مار خاں سمجھ لیں اور کل اسکی پاداش میں دردناک اور طویل عذاب ہمارے گلے پڑے۔ والعیاذ باللہ من شرور انفسنا

مولانا عامر عثمانی

ایک بیباک مبصر کی حیثیت سے

— مولانا کتابوں پر تبصرہ انتہائی دیانتداری اور ذمہ داری کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

— تبصرہ کرنے سے پہلے پوری کتاب کا مطالعہ کرنا ان کا خاص معمول تھا۔

— تعلق اور قرابت داری کی وجہ سے انہوں نے کسی کتاب اور صاحب کی جھوٹی تعریف کبھی نہیں کی۔

— وہ عامیانہ اور شریفانہ تبصروں کے قائل نہیں تھے۔

— ان کے کئے ہوئے تبصرے جاندار اور شاندار ہوا کرتے تھے اور ملک بھر میں ان کی ایک اہمیت تھی۔

— تبصرہ کا کالم ہر ایک رسالہ میں موجود ہوتا ہے، لیکن تجلی کے کالم کو ایک امتیازی شان حاصل تھی، بلکہ یوں سمجھئے کہ تجلی کے کھرے کھوٹے کی حیثیت ہائی کورٹ جیسی تھی۔ اس عدالت میں جس کتاب کو ناقص قرار دیدیا جاتا تھا وہ کتاب عموماً خراج تحسین حاصل نہیں کر پاتی تھی، اور جس کتاب کی تعریف کر دی جاتی وہ بالعموم بازار میں نایاب اور نایاب نہیں تو کمیاب ضرور رہ جاتی تھی۔

— ارشد القادری صاحب کی زلزلہ جلوہ گر ہوئی تو مولانا نے اس پر تبصرہ کیا۔ تبصرہ مجموعی طور پر صاحب کتاب کے حق میں تھا۔ بس پھر کیا تھا، کتاب کے کئی ایڈیشن ہوا ہو گئے کچھ ہی عرصہ کے بعد زلزلہ کے رد میں عبدالجلیل نامی ایک طالب علم کی انکشاف نمودار ہوئی۔ مولانا نے اس کتاب کو ناقص باور کرایا۔ جانتے ہیں پھر کیا ہوا؟ انکشاف کا ڈھیر آج تک ناشر اور مصنف کو منہ چڑا رہا ہے۔

— بہر حال —— تبصرہ کرتے وقت وہ دیانتداری کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کا قلم سچ بات کہنے میں بڑا بے باک اور جری تھا —— کوئی تعلق، کوئی رشتہ انہیں دیانتداری اور صدق بیانی سے نہیں روک سکتا تھا —— وہ کتابوں پر بیباکانہ اور جرأت مندانہ اظہار خیال کیا کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے تبصرے تلخ ہونے کے باوجود مقبولیت عامہ کی دولت سے بہرہ ور تھے۔

— بطور تبرک چند پرانے تبصرے پیش کئے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے

عامر عثمانی نمبر کی پہلی قسط میں از راہ غلطی دو کاپیوں پر ایک ہی نمبر (صفحہ ۳۱۸/۲۵۱) پڑ گئے تھے۔ وہ دونوں چھپ چکی تھیں اس لئے نمبر میں تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجبوراً ایک کاپی کو روکنا پڑا۔ جدید صفحہ سے جو کاپی شروع ہو رہی ہے ذکر اس کا ہے اس پر نمبر غلط ہیں۔ صحیح نمبر یہ ہیں:

۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲ —

ترجمان السنۃ (جلد چہارم)

تالیف:- مولانا محمد بدر عالم صاحب۔
شائع کردہ:- ندوۃ المصنفین۔ جامع مسجد دہلی
صفحات ۱۴۸ سائز متوسط۔ کتابت معیاری۔ طباعت نیم معیاری۔ قیمت مجلد ۔ سولہ روپے

مولانا بدر عالم صاحب ایک اونچے درجے کے عالم اور صاحب کردار ذوتقویٰ بزرگ تھے۔ کہتے ہوئے دل دکھتا ہے کہ ابھی تھوڑا ہی زمانہ گذرا جب ان کی مغتنم ہستی اپنی فیض رسانی کے ساتھ ہماری دنیا میں موجود تھی۔ مدینے میں مستقل رہائش اختیار کر لینے کے باوجود ہم دور افتادوں کو برابر ان کی گرانمایہ تحریروں سے فیض پہنچتا رہا اور ان کی رفیع الشان تالیف ترجمان السنۃ کی ہر نئی جلد نے اہلِ ذوق کو علم وتفقہ کا قیمتی سرمایہ عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ بڑے متبع سنت اور ماحی بدعت تھے۔ ترجمان السنۃ جلد اول کا مقدمہ جو بجائے خود ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے ان کی ژرف نگاہی کا شاہکار ہے جس میں انھوں نے انکار حدیث کے فتنے کا بھرپور تعاقب کیا ہے

یہ جلد چہارم چار عنوانات پر مشتمل ہے ۔ معجزات، کرامات۔ امام مہدی۔ دجال اکبر۔ پہلی تینوں جلدوں کی طرح اس کا بھی طرز یہ ہے کہ اوپر متن حدیث۔ اس کے نیچے قدرے جلی قلم سے ترجمہ۔ اس کے نیچے مفید حواشی۔ حواشی کا کیا کہنا اپنے جلیل القدر استاد علامہ انور شاہ کاشمیری کے وسیع علم ومطالعہ کی جھلکیاں وہ ان حواشی میں چھوڑ گئے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ فکری اور ثقافتی اعتبار سے قدامت کے دلدادہ ہونے کے باوجود ان کے اندازِ تحریر میں وہ فرسودگی نہیں ہے جو نئے ذہنوں کو بدمزا کر دے بلکہ بڑی طراری، بانکپن اور روانی ہے۔ تازگی اور رعنائی ہے۔

حق تبصرہ ادا نہ ہوگا اگر اس جلد چہارم کے مقدمے کا خصوصی ذکر نہ کیا جائے۔ یہ مقدمہ ۱۴۳ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا تعلق کتاب کے تمام ابواب سے نہیں بلکہ صرف باب اوّل سے ہے۔ یعنی معجزات سے۔ اصل اس مقدمے میں مؤلف نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کا نام لئے بغیر سیرۃ النبی کے اُس حصے پر نقد کیا ہے جس کا تعلق معجزات سے ہے۔ ظاہر ہے ہم جیسا بے بضاعت اس کا اہل نہیں ہوسکتا کہ اپنے ان دو بزرگوں کی بحث میں جج بن کر بیٹھے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ علامہ اور شیخ ہیں۔ طاب اللہ سراہما۔

لیکن فرض تبصرہ کی ادائیگی کے تحت واجبی باتیں کہے بغیر چارہ بھی نہیں مؤلف کے اس مفصل اور مدلل نقد ونظر سے معجزہ جیسے مہتم بالشان موضوع کے سارے ہی جلی وخفی گوشے خوب ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اب یہ ہر قاری کا اپنا اپنا مذاق ومعیار اور اندازِ نظر ہے کہ کہاں کہاں وہ کس رائے کو قوی یا کمزور تصور کرتا ہے۔ ہمارا خیالِ ناقص یہ ہے کہ موقف بنیادی طور پر مؤلف ہی کا مضبوط ہے۔ سید سلیمان ندویؒ نے معجزات کے سلسلے میں تاویل وتوجیہ اور تجزیہ وتحلیل کی جو خوبصورت اور متنوع کوشش سیرۃ النبی میں کی ہے اس کے سطحی حسن میں کلام نہیں۔ اس کا انشائی ہیولیٰ بھی بڑا پُرکشش ہے اس کے پیچھے حسن نیت اور جذبۂ خدمت بھی بلاریب موجود ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ کہیں کہیں صائب ترین نقطۂ نظر سے کچھ ہٹی ہوئی ہے۔ اس کے مضمرات اور منطقی نتائج بعض اعتبار سے مغالطہ انگیزی کے امکانات سے لبریز ہیں اور ہو سکتا ہے کہ بہت سے ذہنوں میں اس نے معجزے کی ایک ایسی حقیقت ابھار دی ہو جو حقیقت کم اور واہمہ زیادہ ہے۔ مولانا بدر عالم صاحب نے جس فکر کو زورِ استدلال اور قوت برہان کے ساتھ پیش کیا ہے ناچیز تبصرہ نگار کے خیال میں وہی فکر معجزات کے باب میں واحد صحیح فکر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ موصوف کا جوشِ نقد جب اس فکر کو اس کے بنیادی نقطے سے آگے لیکر چلا تو اس کی رفتار میں کہیں کہیں تھرتھراہٹ اور ناہمواری آتی چلی گئی۔

دوسرے یہ کہ مؤلف کا لب و لہجہ ضرورت سے زیادہ پُرخروش ہے۔ وہ [illegible] کے جوش اور ابطالِ باطل کے جذبے میں کہیں کہیں ایک جوانِ اسم مبارز نظر آنے لگتے ہیں۔ اگرچہ ان جیسی شخصیت کو مولانا ندویؒ جیسی شخصیت پر برابر کی چوٹ اور تنقید کرنے کا یقیناً استحقاق تھا۔ توہین یا تحقیر کا الزام ان پر نہیں لگایا جا سکتا لیکن ہم جیسے لوگ ـــــ جو مولانا ندویؒ سے بھی گہری عقیدت رکھتے ہیں یہ بہرحال حسرت کریں گے کہ کاش مؤلف کسی اور لہجے میں اپنی بات کہتے۔ بات بجائے خود سچی تلی ہے۔ نقد کا غالب حصہ علمی اعتبار سے گرانمایہ ہے۔ نقطۂ نظر قوی اور واضح ہے لیکن شاید اپنے موقف کی صحت کے کامل یقین نے مؤلف کی آواز کو ذرا تند اور آہنگ کو کرخت کردار بنا دیا ہے۔

یہاں خود کوئی ہماری تند گفتاریوں کا حوالہ نہ دے ناچیز تبصرہ نگار تو ایک چھوٹا آدمی ہے۔ بوڑھا بھی نہیں ہے۔ وہ نرمی، تحمل اور شیریں گفتاری کی حد میں چھلانگ جانے کے مرض میں گرفتار ہو تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ بڑا مسئلہ یہ ان جیسے اونچے حضرات کے تعلق سے بنتا ہے جن کی علمی ثقاہت سے لوگ بڑے تحمل اور ٹھیراؤ کی امید رکھتے ہیں۔

یہ جلد مؤلف نے اپنی طویل بیماری کے زمانہ میں تالیف کی ہے۔ مسودے کی ترتیب و تدوین کا کام دوسروں سے کرایا۔ اس کے اثرات جگہ جگہ موجود ہیں۔ بعض جگہ تشریح ادھوری۔ کہیں تعبیر و توضیح میں اغلاق و ابہام۔ کہیں عنوان کا تعلق مضمون سے محلِ نظر۔

• بعض معجزات کی چھانٹ کر کے وہی
روایات نقل کرنا . . . ." ص۶۸

" کرکے فصاحت سے گر گیا۔ صرف "کر"۔ یا صرف "کے" کافی ہوتا۔

" ان دقائق کو وہ شخص کیسے ادراک کر سکتا ہے
جو مؤرخین کی صف میں سے نکل کر محدثین کی
جماعت میں گھسنے کی کوشش کرتا ہو" ص۷۶

" دقائق کو" تو صریح کتابت کا سہو ہے "کا" ہونا چاہیے لیکن یہ فقرہ اور اس سے متصل چند اور فقرے اپنے اسلوب اور الفاظ کے لحاظ سے شاید علمی شانِ گفتار سے نیچے اتر آئے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ اتنے سخت ریمارک کے مستحق ہوں اسے ہمارا وجدان قبول نہیں کرتا۔

صفحہ ۸۴ پر اکبر الٰہ آبادی کے شعر میں پہلا مصرعہ شاید سہو کتابت سے ناموزوں نقل ہوا ہے۔

صفحہ ۸۵ پر "اسنادوں" نظر آیا ـــــ پتہ نہیں اس طرح جمع الجمع بنانا درست بھی ہے یا نہیں مثلاً خیالاتوں اور مشاغلوں اور تفریحاتوں کہنا تو جائز نہیں معلوم ہوتا۔

• لیکن جس میں کہ حیات و شعور پہلے کبھی نہ پیدا ہوئی تھی [illegible] مشعور کرتے ہے۔ حیات و شعور رکھنے والوں کے اعتبار سے نہ ہونے [illegible]

ص۱۶۸ پر حدیث نمبر ۱۳۵ کا ترجمہ اہلِ علم کے لئے لائقِ غور ہے۔

" عبدالرحمٰن بن معاذ تیمی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقامِ منیٰ میں ہم کو خطبہ دیا تو ہمارے کان کھل گئے۔ دوسری روایت ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ہمارے کان کھول دیئے یہاں تک کہ ہم اپنے اپنے گھروں میں رہتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو سُن لیا کرتے تھے۔"

ہمارے ناقص خیال میں راوی کا مطلب یہاں صرف ایک وقتی صورتِ حال کا ذکر کرنا تھا۔ یعنی منیٰ میں جب حضورؐ نے خطبہ دیا تو تمام حاضرین نے اسے پوری طرح سُنا حالانکہ بعض لوگ اتنے فاصلے پر تھے کہ عام اعتبار سے حضورؐ کی آواز صاف صاف ان کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیئے تھی۔ نحن فی منازلنا کا ترجمہ جہاں "ہم اپنے اپنے گھروں میں" ہو سکتا ہے وہیں یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے جو جہاں تھا وہیں اس نے حضورؐ کا خطبہ سُن لیا۔ فرق دونوں ترجموں کا یہ ہے کہ پہلا ترجمہ تو ایک معجزۂ مستقل اور اعجازِ مستمر کی خبر دیتا ہے یعنی اس خطبہ کے بعد ہمیشہ ایسا ہوتا رہا کہ حضورؐ جہاں بھی بات کرتے

میں تمام صحابہ اپنے اپنے گھروں میں اسے سُن رہے تھے۔ یہ بات تو نہ صرف یہ کہ معتمد علیہ روایات سے ثابت نہیں بلکہ بہتیری روایات اس کی صاف تردید کرنے والی موجود ہیں اور معجزات کا بیان کرنے والے معروف و معتمد علمائے اس معجزے کی توثیق نہیں کی ہے۔

دوسرا ترجمہ یہ بتاتا ہے کہ صرف اس خطبۂ منیٰ کے موقع پر یہ معجزہ پیش آیا کہ وادیٔ منیٰ میں جتنے بھی صحابی اس وقت موجود تھے وہ چاہے قریب رہے ہوں یا دور ان سب نے اس خطبے کو صاف صاف سُن لیا۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ معجزے کی حقیقت اور تعریف کی بحث میں مؤلف ہی کا نقطۂ نظر صائب ہے مگر بعض روایات ہم اس کتاب میں ایسی بھی پاتے ہیں جو علمی و فنی قوت اپنی پشت پر نہیں رکھتیں۔ واللہ اعلم بالصواب

مؤلف کے مقدمۂ کتاب سے قبل مؤلف کے صاحب زادے آفتاب احمد صاحب نے اپنے رفیع المرتبہ والد کے کچھ حالات بھی بیان کئے ہیں اس میں مؤلف کے بعض اشعار بھی ہیں۔ سبحان اللہ۔ دوسرے علوم کے ساتھ فن شعر میں بھی وہ پختہ گو نظر آرہے ہیں۔ نور اللہ مرقدہٗ۔

ویسے صاحب زادے کی حیثیت سے آفتاب صاحب اپنا انداز تحریر کچھ بدل لیتے تو بہتر ہوتا۔ ایک بیٹا جب باپ کی شان میں انتہائی ارادت مندانہ اسلوب اختیار کرتا ہے تو چاہے واقعتہً وہ مبالغہ نہ کر رہا ہو مگر ثقہ طبیعتوں کو یہ بات جچتی نہیں۔ گو ہمارا خیال ہے کہ ان سے مبالغہ بھی سرزد ہو ہی گیا ہے۔ مثلاً "کرامات بروقت ولادت" کا عنوان دے کر بتایا گیا:-

"حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی سعادت قبولیت کے آثار ولادت سے قبل ہی ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے ولادت کے وقت لیڈی ڈاکٹر انگریز موجود تھی لیکن ولادت میں تاخیر ہو رہی تھی۔ اس نے بہت سعی کی لیکن ناکام رہی۔ آخر کار اس نے کہا کہ اب تو آپریشن کرنا ہوگا جس میں بچے کا مر جانا ممکن ہے۔ آخر کار دادا صاحب مرحوم کو اجازت دینی پڑی اور اس نے آپریشن کی تیاری شروع کر دی۔ صرف اتنے وقفے کے لئے ایک مسلمان سعید دائی آ بیٹھی۔ بس کیا تھا فوراً ولادت ہو گئی۔ گویا اللہ تعالےٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ انگریز کے ہاتھ میں ایسا جسم مبارک جو اتنی صفات کا مالک ہونے والا تھا دے دیا جائے۔ چنانچہ ان کا ایک مسلمان عورت کے ذریعے اس دنیا میں آنا مقدر ہوا۔" (ص۱۷)

ایسی ہی بچکانہ اور سادہ لوحانہ عقیدت مندیوں نے کرامتوں کے سلسلے میں اہل عقل و فہم میں بڑا غلط ردِ عمل پیدا کیا ہے۔ کرامت یقیناً برحق ہے لیکن کرامت سازی بالکل برحق نہیں۔ دوسرے پیغمبروں کو تو کیا کہیے خود سرورِ کائنات ﷺ کی پیدائش ایک کافرہ دایہ کے ہاتھوں ہوئی اور پھر نہ جانے کتنے کافروں اور مشرکوں نے آپ کے جسد مبارک کو آغوش میں لے کر کھلایا۔ اگر آپؐ کے ایک غلام کی پیدائش انگریز دایہ کے ہاتھوں ہو جاتی اور اس کافرہ کے ہاتھ اس بندۂ خدا کو چھو لیتے تو اس سے ان اوصاف جمیلہ پر کیا داغ آسکتا تھا جنہیں اس بچے کے مستقبل میں مقدر کر دیا گیا تھا۔ متذکرہ واقعہ میں تو کوئی کرامت نہیں اس طرح کے امور کو کرامت کا عنوان دینا مریض ذہنوں کا کام ہو سکتا ہے اور ایسی ہی غلو آمیزیاں حقیقی کرامات کو بدنام کرنے کا موجب بنتی ہیں۔

تبصرے کا لب لباب یہ ہے کہ چند جزئیات کو چھوڑ کر نہایت بلند پایہ مفید اور ایمان افزا کتاب ہے۔ اللہ تعالےٰ مؤلف کو بہشت کی بہترین نعمتوں سے نوازے۔

نورانی جہیز

• صفحات ۹۶ • لکھائی چھپائی غنیمت۔ کاغذ سفید • شائع کردہ:۔ ایجنسی تاج کمپنی، مسجد اسٹریٹ۔ بمبئی ۳ • قیمت ایک روپیہ • مرتب کردہ:۔ مولٰنا محی الدین منیری۔

مولانا محی الدین منیری کا نام نامی قارئین پچھلے تجلی کے آغاز سخن میں دیکھ چکے ہیں۔ چند سال قبل ان کی دختر سعیدہ زینب النساء سلمہا کا عقد ہوا تھا۔ اس موقع پر ایک نصیحت نامہ تو مولانا مناظر احسن گیلانی نور اللہ مرقدہ نے ازراہ شفقت سپرد قلم فرمایا تھا اور ایک نصیحت نامہ "نورانی تعلیمات" کے عنوان سے مولانا المحاج سید عبدالرب صوفی۔ ایم۔ اے۔ نے تسوید کیا تھا۔ یہ دونوں اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک خطبۂ نکاح اس کتاب کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ چند منظومات بھی زیب صفحات ہیں یہ بڑی مبارک بات ہے کہ شادی کے موقع پر لایعنی سہرابازیوں کے بجائے اس طرح کی مفید چیزیں سامنے آئیں۔ نورانی جہیز" نام کا یہ مجموعہ سامان بچیوں کے لئے ایک انمول تحفہ ہے۔ بے شمار روپیہ شادی کی غیرضروری رسموں میں صرف کرنے والے اگر محض ایک روپیہ خرچ کر کے اس کتاب کو بھی جہیز کا جزو بنالیں تو یہ فلاح دارین کا موجب ہوگا۔

مولانا دریابادی نے اپنی بیٹی کے نکاح پر جس انداز میں عربی خطبۂ نکاح کی ترجمانی فرمائی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ دل کا نور لفظوں میں سمٹ آیا ہے۔ جذبے کا صدق سطر سطر سے نمایاں ہے۔ انشاء تو ان کی لونڈی ہے۔ تحریر میں تقریر کا لطف موجود ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی بھی معمولی آدمی نہ تھے۔ صاحب علم و تقویٰ۔ وسیع المطالعہ۔ اور صوفی عبدالرب صاحب بھی اپنی تحریر کے آئینے میں باخدا بزرگ نظر آتے ہیں۔ اللہم زد فزد۔

آیئے چند لفظ تنقید کے بھی سہی: "دو لفظ" کے تحت مولانا دریابادی کی درج ذیل عبارت اگر اغلاط کتابت کا شکار نہیں تو لغزش خامہ پر محمول کی جائیگی۔

"قابل تہنیت ہیں وہ باپ جو اس طبی محبت کے نسخے میں اجزاء عقل و دین کی بھی آزمائش پوری مقدار میں رکھیں۔" (ص ۳)

"آزمائش" کا محل یہاں سمجھ میں نہیں آیا، غالباً "آلائش" لکھا گیا ہوگا۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنے پیش لفظ میں بڑے وثوق کے ساتھ فرمایا:۔

اسلام کی تیرہ سو سال سے زائد تاریخ کے ہر دور میں مسلمان عورتوں کی بڑی تعداد زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے برابر کام کرتی رہی ہے اور علم و فن کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہا جس میں مسلمان عورت نے اپنی خدمات سے حسن و جمال نہ بخشا ہو۔ زہد و تصوف کی طرف نظر اٹھاؤ تو عابدات زاہدات کی قطاریں عفت و عصمت کی چادر میں نظر آتی ہیں۔ دینی علوم میں جاؤ تو مسند درس و تدریس پر محدثات و فقیہات قال اللہ و قال الرسول کا نغمہ سنا رہی ہیں۔ جہاد و غزوات کی مولائیوں کی طرف دیکھو تو دل و جگر رکھنے والی مجاہدات و غازیات اعلائے کلمۃ اللہ کی راہ میں بڑھ بڑھ کر قربانیاں پیش کرنے میں سرگرم کار ہیں۔ صنعت و حرفت کے کارخانوں میں پہنچو تو افتراعات و ایجادات کے ہر شعبے میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی اپنے ذہن و عمل سے کام لے رہی ہیں۔" (ص ۶)

ہماری کم علمی سراغ نہیں لگا سکی کہ وہ تاریخ اسلام کس کتب خانہ میں پائی جاتی ہے جو مسلمان عورت کی اس

شان بان کی نشان دہی کر سکے۔ تھوڑے سے مبالغے کا جواز تو خیر مدح میں چل جاتا ہے لیکن "اعامبالغہ" جسے بد کا کبوتر" قرار پائے شعر کے قالب میں چل سکتا ہے نثر کے میدان میں نہیں۔ ہمارے علم کے حد تک مسلمان عورت کی یہ توصیف واقعات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی مستثنیات سے بحث نہیں۔ عمومی سطح پر مسلمان عورت اگر اب زیادہ کچھ نہیں رہی کہ وہ بس عورت ہے۔ عورت تھی عورت رہے گی۔ مردوں کے برابر کام کرنا عورت کے لئے نہ زیبا ہے نہ ممکن۔ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے بقول وہ تو کانچ کا آبگینہ ہے۔ مخمل کے غلافوں میں سنبھال کر رکھیئے تو بیش بہا۔ علم و فن یا حرب و ضرب یا تجارت و صنعت کی چٹانوں سے ٹکرایئے تو معاشرہ گیاڑی کی دوکان بن جائے گا۔ عورت کو غیر ضروری اور غیر طبعی خواب دکھا کر اسے پاگل نہ بنایئے۔ وہ ایک نازک مشین ہے جو محدود دائروں میں محدود قسم کے کام کرنے کے لئے تیار ہوئی ہے۔ اسے خواہ مخواہ جھنڈے پر چڑھانا مستم ظریفی ہے مدح نہیں۔

مولانا عبد الرب صوفی کی حمد نعت بہت عمدہ ہے لیکن کہیں کہیں نظرِ ثانی کی محتاج۔

عرش سے افضل ہے رتبے میں تمہارے مرقد کی خاک

صاحب مرقد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارے ماں باپ قربان۔ ان کے مرقد کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ تو بن سکتی ہے مگر عرش سے بھی افضل ہو یہ قابل غور ہے۔ متقدمین میں سے جن اکابر نے ایسا خیال ظاہر فرمایا ہے ان کے دلائل علمی سے زیادہ جذباتی ہیں۔ عرش تو خدا کا پایۂ تخت ہے کیا کوئی شے اس سے بھی مقدس و مطہر ہو سکتی ہے۔

اور تو ارشاد فرماتا ہے اے عفت مآب

حضور معصوم بے شک تھے اور لفظی اعتبار سے "عصمت مآب" بھی معصومیت کا مفہوم رکھتا ہے لیکن اصطلاح میں "عصمت مآب" کسے کہتے ہیں یہ محتاج تشریح نہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ اصطلاح عورتوں ہی کو زیب دیتی ہے۔ حضور اگرچہ اصطلاحی مصداق میں بھی "عصمت مآب" تھے لیکن یہ مصداق ان تک محدود نہیں۔ ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ بھی "عصمت مآب" ہی تھے۔ آج بھی بے شمار عصمت مآب ہیں۔ رہی معصومیت تو اصطلاحاً جس معصومیت کا اثبات انبیاء کے لئے ہوتا ہے وہ "عصمت مآب" جیسے الفاظ سے تعبیر نہیں کی جا سکتی۔

نا اور محبت خدا ہے شافع محشر ہے تو
میرے مولا! انبیائے پاک کا سرور ہے تو

نعت کی بحث میں چاہیئے تو مولا کا لفظ حضور کے لئے غلط نہیں مگر اردو بول چال میں "مولا" خدا کے لئے مخصوص ہے۔ آپ نے سنا ہوگا۔

مرے مولا بلا لو مدینے مجھے

یہ شعر!۔

ہر نبی نائب ہے تیرا تو نبی مستقل
ہے نبوت تیری ذاتی ہر نبوت ایک ظل

خارج کر دینے کا تھا۔ جس نے کہا غلط کہا کہ صرف حضور کی نبوت مستقل ہے اور باقی تمام انبیاء کی غیر مستقل۔ فرق مراتب تو مسلم مگر یہ فرق نفس نبوت میں نہیں ہے۔ مثال ایسی سمجھیئے گورنری ایک عہدہ ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ ایک گورنر دوسرے گورنر کے مقابلے میں زیادہ صلاحیتوں اور خوبیوں سے متصف ہو۔ لیکن یہ اوصاف اس کے ذاتی ہوں گے نہ کہ منصبی۔ منصبی اعتبار سے ہر گورنر من وعن یکساں درجے میں ہوگا کسی کم صلاحیت کے گورنر کو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس زیادہ صلاحیت والے گورنر کا نائب تھا جو بعد میں گورنری پر آیا۔ ہر گورنر براہ راست اقتدار اعلیٰ کا نمائندہ، ترجمان، نائب اور کارندہ ہے۔ بس اسی طرح تمام انبیاء و رسل براہ راست اللہ تعالیٰ کے نمائندے اور کارندے تھے نہ کہ کسی نبی اور رسول کے نائب۔ ایسے فلسفے بے حد خطرناک ہیں جو انبیاء علیہم السلام

کی معروف اور سادہ حیثیات کو ماورائی نکات و رموز کی بھول بھلیاں میں داخل کر کے غبار آلود اور پیچیدہ بنا دیتے ہیں جو روایتیں ایسی فلاسفی کو ملک پہنچاتی ہیں وہ سب کی سب سنداً ضعیف اور باعتبار متن ذو معنی ہیں۔ انھیں باوجود ضعف کے قبول ہی کرنا ہو تو متشابہات کے خانے میں رکھ دیجئے۔ ہر نبی کی نبوت کا استقلال قرآن کی آیات محکمات سے ثابت ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم کھینچ تان کر کے اسے غیر مستقل بنائیں اور اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بلا ضرورت ایسے اوصاف ثابت کریں جن کے بغیر ہی آپ افضل المخلوقات اور خیر البشر ہیں۔

بخش وہ نور بصیرت جس سے تو آئے نظر

یہ مصرعہ تنوار د ہوگیا ہے۔ یاد نہیں کس شاعر کا ہے مگر ہے کسی اور ہی کا۔

"جب تک ماں باپ سو من مٹی کے نیچے دفن نہیں ہو جاتے ان کا جلا یا ختم نہیں ہوتا"

جلایا رنج و غم کو نہیں کہتے۔ اس کا مفہوم ہے جلن، حسد، رقابت۔

- میں کسی بچی کی رخصتی کے وقت بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتا حالانکہ عقلاً رقت انگیزی کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی" (ص ۳۹)

"رقت انگیزی" کا نہیں رقت پذیری کا محل تھا۔

کتابت کی غلطیاں کتاب میں بہت ہیں۔ بعض تو بڑی دلچسپ ہیں۔ مثلاً:-

"صاف کر کے ہیضہ کم از کم ان کے حوالے کر ہی دیجئے"

کاتب صاحب نے "مبیضہ" کو ہیضہ بنا دیا ہے۔

اے مرے جستجو دو بر حق اے الہ العالمین

یہاں کاتب نے "مسجود" کی شان میں گستاخی کی ہے مگر بچارا کاتب تو غیر مکلف ہوتا ہے۔ عذاب گیا مصلح کے سر۔

ایک ایسی کتاب میں جو جوان لڑکیوں کے لئے ہو کتابت کی غلطیاں حتی الوسع نہ ہونی چاہئیں ورنہ وہ بیچاری اس کی تصحیح نہ کر سکیں گی۔

کتاب کے خاتمے پر بہشتی زیور کی مشہور نظم شامل کر کے کتاب کی افادیت بڑھا دی گئی ہے۔ ہم دلی مسرت سے اس کتاب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

نغمۂ شعور

● مجموعۂ کلام جناب عبدالمتین نیاز ● ناشر:- مرکز ادب (بدھواڑہ) بھوپال ● صفحات ۱۱۶ ● لکھائی چھپائی گوارہ۔ ● قیمت دو روپے ۷۵ پیسے۔

بہت سی غزلوں، چند نظموں اور چند قطعات کا یہ مجموعہ متوسط درجے کی شاعری کا لائق قدر نمونہ ہے۔ شاعر نہ تو بہت زیادہ روایت پرست اور قدامت پسند ہیں نہ عالی قسم کی جدت طراز۔ ان کے یہاں قدیم و جدید کی خوشگوار آمیزش ہے۔ لہجہ مہذب، آہنگ خوشگوار، بیان میں روانی۔ زبان میں لوچ۔ پختگی اگرچہ ابھی پوری طرح نہیں آئی لیکن آثار کہہ رہے ہیں کہ مشق سخن جاری رہی تو شاعر ایک امتیازی مقام پالیں گے۔

چند اچھے شعر نمونتہً ملاحظہ ہوں:-

سینے سے لگا لے گی کوئی موج طلاطم
یہ سوچ کے امید کے ساحل پہ کھڑا ہوں

تپتے ہوئے صحراؤں سے اٹھتے ہیں بگولے
اس سمت بھی آؤ کبھی گلشن کی بہارو

ہم مقتل حیات میں ہیں سر بکف مگر
اہل ہوس کو اپنے دل و جاں کی فکر ہے

کتنے بے نور ہیں یہ ہنگامے
میں بھرے شہر میں بھی ہوں تنہا

یہ دور مرے خوابوں کی تعبیر نہیں ہے
مجھ کو مرے خوابوں نے کہاں چھوڑ دیا ہے

جو زمین پر مہ و انجم ہیں نہیں ان پہ نظر
آسماں پر یہ کسے ڈھونڈ رہی ہے دنیا

دستو صبح طرب کی خاطر شرط ہے شام الم تک آؤ
صفحات میں زیادہ گنجائش نہیں ورنہ اور بہت سے اچھے شعر اس مجموعے میں موجود ہیں

البتہ ضرورت تھی کہ انتخاب کا معیار ذرا اور سخت ہوتا۔ بہتیرے ایسے اشعار بھی شاملِ اشاعت ہو گئے ہیں جو نظرِ ثانی کے محتاج تھے۔

رُخ پہ کسی کے رنگ حیا دیکھتے چلو
نظارہ جمالِ خدا دیکھتے چلو

یہ صرف مشاعرے میں پڑھنے کا شعر ہے چھپنے کا نہیں۔ محبوب کے مجموعی حسن و جمال کے نظارے سے جمالِ خدا کی طرف تصور کا ابھر جانا ایک قابلِ فہم بات ہے لیکن صرف وہ حالت جب محبوب کا چہرہ حیا سے سُرخ ہو رہا ہو جمالِ خدا سے کوئی وجدانی یا تخیلی یا منطقی رابطہ نہیں رکھتی۔

انساں کی پلکوں پہ لرزتے ہوئے تارو
تم خاک میں مل کر رُخ گیتی کو سنوارو

الفاظ اور ان کا دروبست بظاہر خوبصورت ہے لیکن واقعاتی مفہوم کچھ نہیں۔ سنوار نا زلفوں کے لئے موزوں لفظ ہے۔ "رُخ کو سنوار نا" روزمرہ کے خلاف ہے رُخ تو سجایا جاتا ہے۔ پھر آخر آنسوؤں کے خاک میں مل جانے سے رخِ گیتی کا سنوار کیسے ہو گا۔

اب کوئی نہیں آئے گا غم خانۂ دل میں
سو جاؤ شبِ ہجر کے بے خواب ستارو

غم خانۂ دل کا یہاں کیا موقعہ تھا۔ ہجر کی شب تو کہتے ہی اس رات کو ہیں جب عاشق محبوب کی یاد میں جاگ رہا ہو۔ یاد کا مطلب ہے کسی کا غم خانۂ دل میں موجود ہونا۔۔۔ پھر پہلے مصرعے کا کیا جواز رہا۔

سُرخی خونِ جگر لے کے حنا جاگی ہے
آج اس شوخ کے چہرے پہ حیا جاگی ہے

حنا چہرے پر تو کوئی کبھی نہیں لگاتا۔ حیا اور حنا کے رنگ کی مشابہت مسلّم لیکن محل تشبیہہ موزوں نہیں۔

رقصاں مری پلکوں پہ نہ ہوتے اگر آنسو
راتوں کو ستارے بھی نمودار نہ ہوتے

ایک دعویٰ ہے مگر محروم دلیل۔ ایسے اشعار مشاعرے میں تو خوب چلتے ہیں مگر کاغذ پر ان کی قیمت کیسے مشخص کیجائے۔

فن کو نہ بناتے کبھی جزوِ غمِ انساں
حسّاس جو اس دور کے فنکار نہ ہوتے

شاعر نے محسوس نہیں کیا کہ پہلے مصرعے میں الفاظ اُلٹ گئے ہیں۔ موقعہ یہ کہنا کا تھا کہ غمِ انسان کو جزوِ فن نہ بناتے۔ اگر آج کے فنکار حساس نہ ہوتے "یہ بھلا کیا بات ہوئی کہ فن کو جزوِ غمِ انساں نہ بناتے"۔ ویسے یہ ہم اپنے عزیز شاعر کو بتا دیں کہ "غمِ انساں" میں گھلنے والے آج کے فنکار زیادہ تر نعرہ باز اور سخن ساز ہیں۔ حقیقی غمِ انساں کے بجائے انھیں "سیاسی غمِ انساں" زیادہ ہے اور جہاں کہیں "انسان" کی تکمیل ان کے ہاتھوں میں آگئی ہے وہاں انھوں نے انسان کو اس سے بدتر حالت میں پہنچا دیا ہے جس پر وہ نوحہ بہار رہے تھے۔

ساقیا میکدہ گیری کا چلن عام تو ہو

"میکدہ گیری" اچھی اختراع نہیں۔ اس سے ذہن یکلخت "اٹھائی گیرے" جیسے الفاظ کی طرف جست کرتا ہے۔
ص۵۵ پر دو شعروں میں صرعۂ شتر گربہ پایا گیا۔

آپ تجدید ملاقات کی باتیں نہ کرو
اور
آپ اب مجھ سے عنایات کی باتیں نہ کرو

" آپ" کا نہیں " تم" کا محل تھا۔ یا پھر ردیف " کرو" نہیں " کریں" ہوتی۔

حصۂ نظم نسبتاً کمزور ہے۔ " آزاد نظمیں" تو آزاد ٹھہریں پابند بھی ابتدائی مشق و تمرین کے خدو خال رکھتی ہیں۔

آج بھی سر میں ہے سودائے محبت کی لگن

" سودائے محبت کی لگن" لیلۃ القدر کی رات جیسی بات ہے۔ سودا لگن ہی کا ایک غلو آمیز روپ ہے۔ ان میں باہم اضافت درست نہیں ہے

اٹھو سارے جہاں کے انسانو حق اور امن کے ثنا خوانو

لفظ " حق" کو مشدد پڑھیئے تب وزن درست ہوتا ہے حالانکہ تشدید کا یہاں کیا سوال۔ ویت نام، نہرو کا خواب، جشن جمہوریت، ارتقا، ان عنوانات کے تحت لکھی ہوئی نظمیں کتنی قابل ہوتیں اگر شاعر عمر کے پچاس سال گذرنے کے بعد انھیں کہتے۔ فکر و شعور کی پختگی کے بغیر ایسی نظموں میں وقتی رجحانات، پروپگنڈے اور سیاست کی سطحی نمود کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے۔

بحیثیت مجموعی " نغمۂ شعور" میں محاسن کا پہلو غالب ہے اور اہل ذوق اسے دلچسپی سے پڑھ سکتے ہیں

> تبصرہ کے لئے کتابیں ارسال کرتے وقت یہ بات پیش نظر رکھئے کہ تجلی کسی رشتہ اور تعلق کی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر آپ اپنی تصانیف کی " جھوٹی تعریف" سننے کے عادی ہوں تو تبصرہ کے لئے کسی اور رسالہ سے رجوع کیجئے۔
>
> ——— حسن احمد صدیقی
>
> ❁ ❁ ❁ ❁

مولانا عامر عثمانی

تحریر و قلم کے غازی

مولانا عامر عثمانیؒ کی بیباکی مسلّم ہے۔ انکے مخالفین بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مولانا عامر عثمانی جو کہنا چاہتے ہیں کہہ گزرتے ہیں۔ خوف اور جھجک کبھی ان کے قلم کو چھو کر بھی نہیں گذرے۔

ان کا ذہن کسی بھی دور میں مصلحت کا غلام نہیں رہا۔ وہ کبھی کسی سے مرعوب بھی نہیں ہوئے۔ وہ ہر ظالم اور صاحبِ طاقت آدمی سے زور بدو ٹکراتے تھے۔ لاگ لپیٹ سے انھیں خداواسطے کا بیر تھا۔ بے ضرورت اور بزدلانہ تاویل سے وہ ہمیشہ محترز رہے۔ حق بات کہنا، برملا کہنا، بے جھجک کہنا ان کا طرّۂ امتیاز تھا

ملک میں جب کوئی ہندو مسلم فساد ہوا، جب کبھی مسلمانوں کے جان و مال کو لوٹا اور کھسوٹا گیا، مولانا عامر عثمانی کسی بہادر جرنیل کی طرح بے دھڑک میدان میں کود پڑے۔ اور کھلے الفاظ اور سخت لب و لہجہ میں جبر و انانیت اور سفاکی و بربریت کی مذمت کی۔

بے لاگ باتیں کرنا ان کی عادتِ ثانیہ تھی ـــــ اور بے لاگ باتیں کرنے کی وجہ سے انھیں کئی بار سزا بھی ہوئی۔ وہ جیل بھی گئے لیکن حکومت وقت کی طرف سے ملنے والی کوئی سزا اور کوئی سختی ان کے جذبوں میں اضمحلال پیدا نہیں کر سکی۔ ان کا قلم دو دھاری تلوار تھا اور وہ دو دھاری تلوار ہی رہا۔

ان کی اس جرأت مندی اور بے باکی کی وجہ سے اپنے اور پرائے انھیں تحریر و قلم کا غازی سمجھتے رہے اور آج بھی وہ ایک بڑی دنیا میں تحریر و قلم کے غازی کے نام سے مشہور ہیں۔

ماہ فروری کے پہلے عشرے میں جبل پور اور اس کے مضافات میں ظلم و سفاکی کا جو ہولناک کھیل کھیلا گیا ہے اور پولیس ہی کے زیر سایہ فرقہ پرست بھیڑیوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر جو قیامت صغریٰ ٹوٹی ہے۔ اس کی تفصیلات سے اخبار بیں طبقہ واقف ہو چکا ہے اور جو لوگ اخبار نہیں پڑھتے انھیں بھی دوسروں کی زبانی اطلاعات مل چکی ہیں۔ اس کے متعلق ہمارے پاس کہنے کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کوئی ایسی اسکیم نہیں جو اُن مسلمانوں کے کام آسکے جو ظلم و بربریت کی آگ سے زندہ تو بچ نکلے ہیں مگر بے سر و سامانی کے کانٹوں پر کرب و الم کے دن کاٹ رہے ہیں۔ نہ ہمارے پاس کوئی ایسا منصوبہ ہے جو ان مسلمانوں کے کام آسکے جن تک ابھی فساد کے شعلے نہیں پہونچے۔ لیکن معلوم نہیں کب ان پر بھی کینہ و عداوت کے ترکش خالی کئے جانے لگیں۔ صرف دل کے درد اور حزن کا احساس ہے جو ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ جبل پور کا ذکر کر کے چند آنسو بہا لیں —— وہ جبل پور جسے "شمشان بھومی" بنا دیا گیا جہاں تھوڑے سے وقت میں وہ مظالم توڑے گئے کہ انسانیت شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اندازہ کہتا ہے کہ اس ملک میں اقلیت آزاری کا سلسلہ کبھی نہیں رکے گا۔ ۴۷ء سے ۵۰ء تک تو عمل اور ردِّ عمل کی منطق بھی آڑ بن سکتی تھی۔ لیکن اس کے بعد جتنے بھی فسادات پے در پے ہوتے ہیں ان میں تو صرف یک طرفہ عمل ہی کی منطق کارفرما رہی ہے۔ کانگریس کے کاغذی اصول اور دستور پر کچھ بھروسہ تھا۔ وہ بھی مسلسل آزمائش کے بعد ہاتھی کے دانت ثابت ہوئے۔ دوسرے درجے میں بعض ایسے رہنماؤں کی ذات مرجع امید تھی۔ جن کو تعصب اور فرقہ وارانہ ذہنیت سے بالاتر سمجھا گیا ہے اور جن کے ہاتھوں میں زمام اقتدار بھی ہے۔ لیکن عملاً وہ بھی مسلمانوں کو تحفظ نہ دے سکے۔ وجہ کچھ بھی ہو معلوم ایسا ہی ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر جا ہے کچھ ہی گذر جائے ان کے قلوب میں انصاف کی تڑپ اور ہمدردی و عمل کی امنگ ہی پیدا نہیں ہوتی۔ وزیر اعظم پنڈت نہرو علمی اعتبار سے ہندوستان کی سب سے بڑی شخصیت ہیں انھیں نہ صرف یہ کہ تعصبات اور فرقہ وارانہ ذہنیت سے بلند سمجھا جاتا ہے بلکہ بعض اکثریتی جماعتیں تو ان پر اکثر مسلم نوازی کا الزام بھی لگاتی رہتی ہیں۔ لیکن ان سے بھی مسلمانوں کو سوائے خوشنما لفظوں اور لاحاصل دلاسوں کے اور کچھ نہ ملا۔ آسام میں فساد ہو گا تو وہ ہوا کے بازؤں پر اڑتے چلے جائیں گے۔ شاید اس لئے کہ وہاں خود اکثریت گتھم گتھا ہے۔ لیکن مسلمانوں پر ہلاکت و بربادی کی بارش کرنے والے فسادات چاہے روز روز ہوتے رہیں وہ کبھی تشریف نہیں لے جائیں گے۔ ایک دو نہیں دسیوں فسادات دورِ آزادی میں ہوئے ہیں لیکن کیا مجال کہ وزیر اعظم پنڈت نہرو کہیں ایک بھی جگہ قدم رنجہ فرما سکے ہوں۔ بہت احسان کیا تو چند فقرے فرقہ پرستی کے خلاف کہہ دیئے لیکن مظلوموں نے عدالتی تحقیقات اور حقیقی عدل کی مانگ کی تو آنکھیں پھیر لیں۔ اب تازہ ہی فساد کو دیکھئے۔ کوئی معمولی بات ہے کہ صرف ساگر میں سو سے زیادہ مکانات خاک سیاہ کر دیئے گئے۔ پورے کے پورے خاندان آگ میں جھونک دیئے گئے۔ خود وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش ڈاکٹر کاٹجو کے اعتراف کے مطابق جبل پور کو "شمشان بھومی" بنا دیا گیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ پنڈت نہرو اسے بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اس فسادِ عظیم میں وہاں کے مقامی حکام کی کوتاہیاں بھی دخیل ہیں مزید یہ کہ اس مرتبہ انگریزی پریس بھی فرقہ پرستی کے خلاف اظہار نفرت کرتے ہوئے انصاف کا مطالبہ کر رہا ہے۔ لیکن ان سطور کے لکھنے تک نہ تو پنڈت جی فساد زدہ علاقوں میں قدم رنجہ فرمانے کی تکلیف اٹھا سکے نہ ہی ایسی کوئی بات کہی ہے جس سے توقع کی جا سکے کہ قتل و غارت کے اس ہولناک ڈرامے کی انصاف دلانے والی سطح پر تحقیقات کی جائے گی۔ بس اتنا ہی کہا ہے کہ جو کچھ ہوا

مجھے اس پر دکھ ہے اور یہ بھی فرمایا کہ:-

"ان فسادات سے معلوم ہوا کہ قوم کی ذہنی صحت اچھی نہیں ہے۔"

گویا گذشتہ تیرہ سالوں سے آئے دن جو مسلمانوں کے خون سے ہولی اور جان و مال سے پھاگ کھیلا جارہا ہے ان سے تو یہ اندازہ کیا ہی نہ جا سکتا تھا کہ قوم کی ذہنی حالت بگڑی ہوئی ہے اب جبل پور ہی کے حشر خیز فسادات نے اچانک یہ اندازہ کرنے کا موقعہ دیا ہے کہ قوم کی ذہنی صحت خراب ہے۔ زہے نصیب اب بھی اندازہ ہوا تو بہت ہوا۔ لیکن اس کا حاصل ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے عالی مرتبہ وزیر اعظم کے نزدیک جبلپور اور اس کے آس پاس کے مسلمانوں کی بربادی و ہلاکت کوئی انسانی مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ خالص سائنسی و فنی مسئلہ ہے جس کے سلسلے میں چارہ جوئی و عدل گستری کے ٹھوس اقدامات کے عوض علم و فن کے فلک ہفتم سے یہ سر دسا نکتہ ہی عطا فرما دینا کافی ہو کہ قوم کی ذہنی صحت خراب ہے کوئی بتاؤ اس عطائے خسروی کو حالیہ آفات اور آئندہ خطرات میں گھرے ہوئے مسلمان کن کن زخموں کا مرہم بنائیں۔

وزیر اعظم کے بعد۔ اور دستوری اعتبار سے ان سے بھی پہلے عالی جناب صدر جمہوریہ ہند کی ذات گرامی بھی مظلوموں کے لئے تکیہ گاہ تھی۔ لیکن مسلمان کو جان و مال کے تحفظ کی نعمت ان کے سرچشمہ فیض سے بھی حاصل نہ ہوئی ابھی جبکہ جبل پور کے حشر کو برپا ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہ ہوئے تھے۔ جناب موصوف نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں بجٹ سیشن پر ایڈریس دیا ہے۔ اس میں بہت کچھ ہے۔ حالات عالم پر تبصرہ بھی ہے۔ کانگو لاؤس اور قبرص کا بھی ذکر خیر ہے۔ کانگو میں لوممبا کو ان کے دو ساتھیوں سمیت مار ڈالا گیا۔ اس کی اہمیت کے اظہار کے ساتھ ساتھ سخت تشویش بھی ظاہر فرمائی گئی ہے۔ لیکن کوئی لفظ جبلپور کے لئے نہیں ہے جبل پور جہاں دو تین نہیں۔ بلکہ پچاسوں انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور یہ سب مرنے والے محترم صدر کی رعایا ہی تھے بلکہ وہ دستور اگر کوئی قیمت رکھتا ہے جس کی نگہبانی محترم صدر فرما رہے ہیں تو یہ سب مقتول و مظلوم ان کی اولاد کے درجے میں تھے۔ مگر ان کی لاشوں کو اپنے معزز صدر اور دیش پتا کے دو آنسوؤں سے بھی مشرف ہونے کی سعادت نصیب نہیں ہوسکی اس کی تو کیا امید رکھئے کہ صدر محترم بین الاقوامی بلندیوں سے اتر کر کوئی عملی اقدام بھی کشتگان تغافل کی اشک شوئی کے لئے کر سکیں گے۔

یہ تو ان دو معزز ہستیوں کا ذکر ہوا جن کے ہاتھ میں پورے ملک کی باگ ڈور ہے۔ جن کے چشم و ابرو کے اشارے پر ایک ایک ظالم و سفاک کی روح فنا ہوسکتی ہے جو کرنے پر آئیں تو اس ایڈمنسٹریشن کا مزاج درست کر سکتے ہیں جس کی کوتاہیاں فتنۂ و شر کو طرح دینے کی ذمہ دار ہیں۔

اب بعض ان ہستیوں کو دیکھئے جو ضابطے میں کسی عہدۂ منصب کی مالک نہ سہی لیکن سیاسی و سماجی دونوں سطحوں پر ان کا طوطی بولتا ہے وہ اگر کوشش کریں تو کوئی بھی مسئلہ خاطر خواہ اہمیت حاصل کر سکتا ہے لیکن ان کا بھی حال یہ ہے کہ اور سب معاملات میں تو بلا کی ترکتازیاں دکھائیں گے لیکن مسلمانوں کے تحفظ اور حقوق کا معاملہ آئے تو منہ میں قفل اور پیروں میں بیڑیاں ڈالکر بیٹھ جائیں گے۔

مثال کے طور پر اچاریہ ونوبا بھاوے کو دیکھئے بڑے مہاتما بڑے دردمند بڑے انسانیت دوست۔ لیکن ان کی مہاتمائیت آسام ہی کے فساد پر ماہئ بے آب ہوتی ہے ان کی ناک کے نیچے مسلمانوں پر ظلم و قہر کا کیسا ہی طوفان گذر جائے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ان کے مقدس کانوں پر جوں رینگی ہے۔ ڈاکوؤں کی اصلاح کے لئے سرگشتہ و بے تاب۔ چھوت چھات کی لعنت ختم کرنے

کے لئے مجسم سوز وگداز اور فحش پوسٹروں کے غم میں سراپا عمل وحرکت، مگر مسلمانوں کی مظلومانہ چیخیں اور فریادیں ان کے کانوں سے ٹکرا کر مایوس لوٹ آتی ہیں ان کی روحانیت ذرا ان کے پہلو میں چٹکی نہیں لیتی کہ خدمتِ عدل وانسانیت کا ایک میدان یہ بھی ہے۔

دوسری طرف ذرا فرقہ پرستوں کے رنگ ڈھنگ دیکھئے روزنامہ "دعوت" میں جبلپور کے ہنگامے پر ہندو مہاسبھا کی رپورٹ نقل کیگئی ہے اس رپورٹ پر جو نوٹ "دعوت" والوں نے دیا ہے۔ وہ تو مستقل ایک مقالۂ عبرت کا طالب ہے لیکن نوٹ سے اس وقت بحث نہیں۔ بتانا یہ ہے کہ ہندو مہاسبھا کے وفد نے اپنی رپورٹ میں وہی الٹی گنگا بہائی ہے جس کے فرقہ پرست سدا کے عادی ہیں اس کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہی ہندوؤں پر چڑھائی کی انھی کی فرقہ پرستی فساد کا واحد سبب ہے انہیں کا یہ حوصلہ ہے کہ باقاعدہ منصوبہ بنا کر اسلحہ جمع کئے پھر اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ ڈرے سہمے ہندوؤں پر حملہ آور ہوگئے حد یہ ہے کہ بقول ہندو مہاسبھا۔

"کیونکہ کئی بار ملک کے مختلف حصّوں میں مسلمانوں کو اقلیت میں ہونے کی وجہ سے مالی امداد دی جاتی رہی ہے۔ اسی لالچ کے پیشِ نظر جبل پور میں مسلمانوں نے اپنے گھروں کو آگ لگائی۔"

فرمایئے چوری اور سینہ زوری کی اس سے بڑی مثال کہیں آپ کی نظروں سے گذری ہے۔؟ دن دہاڑے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اور ڈنکے کی چوٹ پر ایسا سفید جھوٹ بولنے کا شاہکار کبھی دیکھنے میں آیا ہے؟

اس رپورٹ پر تبصرہ کرنے کی بجائے ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہندو مہاسبھا یا کسی اور فرقہ پرست جماعت سے ہمیں کوئی گلہ نہیں۔ فرقہ پرستی کی جبلت جو کچھ ہے وہ اسی کا مظاہرہ کرے گی۔ درندے خوں آشامی کی جبلت نہیں چھوڑ سکتے بچھو کاٹے گا، بر کاٹے گا افسوس یہ ہے کہ کانگریسی حکومت اور اس کی پولیس مسلمانوں کو ان خونخوار درندوں سے دل کھول کر نمٹ لینے کا غیر جانبدارانہ موقع نہیں دیتی اس کی ذمہ داری تھی کہ بھارت کے ہر شہری کا تحفّظ کرے اسے غنڈوں کی دستبرد سے بچائے لیکن آئے دن ہونے والے فسادات شاہدِ عدل ہیں کہ وہ اس ذمّہ داری کو پورا نہیں کرسکی ایسی صورت میں اسے کہدینا چاہیئے تھا کہ مسلمانوں کی حفاظت ہمارے بس میں نہیں ہے وہ کر سکیں تو خود اپنی حفاظت کرلیں یہ کہکر وہ ایک کونے میں جا بیٹھتی تب دیکھ لیا جاتا کہ تعداد میں کم اور وسائل میں بے بضاعت ہونے کے باوجود کیا مسلمان غنڈوں اور فرقہ پرستوں سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ اور محفوظ نہ رکھ سکیں تو مردانہ وار جان پر کھیلنا بھی جانتے ہیں اور یہ حرفِ شکایت کبھی انکی زبان پر نہیں آیگا کہ امن وقانون کے ذمہ داروں نے ہماری مدد نہیں کی کونے میں بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔

لیکن تلخ تر شکوہ یہ ہے کہ بار بار ہونے والے فسادوں میں مقامی حکّام اور پولیس کا رویّہ بھی مسلمانوں کے حق میں اکثر بلائے جان ثابت ہوتا ہے۔ وہی مرتے ہیں برباد بھی ہوتے ہیں اور پھر پولیس کے کانٹے دار جال کے حلقے بھی انہی کے تن مجروح پر تنگ ہوتے ہیں اس کے بعد کس سے فریاد کی جائے اور کہاں سے وہ طمانیت لائی جائے جو جمہوریت کے ہر شہری کا واجبی حق ہے۔

جہاں کہیں مقامی حکام اور پولیس والے فرض شناس ہو نکلے مسلمان بن آئی نہیں مارے جاسکتے اس کی ایک قریبی مثال سہارنپور کا وہ ہنگامہ ہے جو رام لیلا کے جلوس کے موقعہ پر برپا ہوا تھا۔ ٹھیک وہی تکنیک استعمال کی گئی تھی جو فرقہ پرستوں کا طرۂ امتیاز ہے

جب جلوس جامع مسجد کے سامنے پہونچا تو شور مچا دیا گیا کہ "بھگوان رام" کی سواری پر جامع مسجد سے ڈھیلے پھینکے گئے ہیں حکام اس ادچھے ہتھیار پر فوراً ہی اپنی گرفت مضبوط نہ کر لیتے تو مسلمانوں پر قیامت توڑنے کے پورے سامان کر ہی لئے گئے تھے لیکن فرقہ پرستوں کو ناکامی ہوئی اور حکام کی فرض شناسی کے طفیل ایک لیش پال نامی شخص کو عدالت نے تین ماہ قید سخت کی سزا بھی دی۔

حاصل اس خامہ فرسائی کا یہ بتانا ہے کہ ہم بھارتی مسلمانوں کے لئے بہت ہی نازک وقت آ پہونچا ہے ہر فساد پر یہ توقع باندھکر دل کو تسلّی دے لیتے تھے کہ شاید اب یہ سلسلہ ختم ہو جائے مگر واقعات بتا رہے ہیں کہ یہ سلسلہ لا متناہی ہے اور اس مقدس دستور کے ہوتے سے مسلمانوں کو پورے سیاسی و سماجی حقوق تو درکنار جان و مال کا تحفظ ملنا بھی مشکل ہے جس کے زیر سایہ کبھی کسی کو مظلومیت کی موت نہیں مرنا چاہئیے تھا۔

پھر کیا کیا جائے۔؟

یہی وہ سوال ہے جو بھارت کی امّت مسلمہ کے لئے فوری طور پر سب سے اہم ہے ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو گاہے گاہے اس سوال کی اہمیت کا احساس ہوتا رہتا ہے اور اپنی صواب دید کی حد تک وہ جواب بھی دینے کی کوشش کرتی ہیں مگر جب طوفان گذر جاتا ہے تو اسے طاق نسیاں میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس بے بنیاد خوش فہمی سے ٹیک لگا لی جاتی ہے کہ جو ہونا تھا ہوا۔ اب آگے کو خیر سلّا ہے حالانکہ حالات گواہ ہیں کہ یہ خوش فہمی کسی مرض کا مداوا ثابت نہیں ہوئی اور خطرات و آفات جوں کے توں موجود ہیں ضروری ہے کہ تمام مسلم جماعتوں کے ارباب حل و عقد صرف اسی ایک مسئلہ پر سر جوڑ کر کچھ سوچیں اور دیگر تمام باہمی اختلافات کو ایک طرف رکھکر اسی پہیلی کو بوجھیں کہ آئے دن کی آفات کا مداوا کیا ہو۔ کیونکر ہو۔ (۱۹۶۱ تجلی، فروری و مارچ ۱۹۶۱ء)

شامتِ اعمال

ابھی احمد آباد کے فسادات پر کچھ بھی مدّت نہیں گزری کہ درندگی و بربریت کا یہ کھیل ملک کے دوسرے حصوں میں بھی شروع ہو گیا ہے۔ بہار اور مہاراشٹر کی نہ جانے کتنی بستیاں اس کی لپیٹ میں ہیں۔ گھر جل رہے ہیں آبروئیں لٹ رہی ہیں قتل و غارت کے جنون نے لہو کو پانی سے زیادہ ارزاں کر دیا ہے۔

کس سے کہیئے اور کیا کہیئے۔ اخبارات پڑھتے ہیں کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دل و جگر کے ٹکڑے اڑتے ہیں دعائیں فریادیں بنکر لبوں پر کانپتی ہیں۔ خدا ظالم تو نہیں۔ پھر اس کے سوا کیا کہا جائے کہ جو کچھ نظر آرہا ہے وہ بباطن ہماری اپنی ہی کرنی کا پھل اور اپنے ہی اعمال کی شامت ہے اللہ یہ الفاظ صریح کہہ چکا۔ وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ۔

(تمہیں جو بھی مصیبت پہونچے وہ تو نتیجہ ہے خود تمہارے کرتوتوں کا اور (شکر کیجو) کہ بہت سی خطائیں تو اللہ معاف ہی کر دیتا ہے۔)

جو کچھ ملّت اسلامیہ پر گذر رہی ہے۔ اس کی ظاہری ذمّہ داری خواہ جن سنگھ پر ڈالئے یا راشٹریہ سیوک سنگھ پر۔ شریک جرم پولیس کو قرار دیجئے یا پوری انتظامیہ کو۔ طعنے حکومت کو دیجئے یا کانگریس کو۔ فریاد بلند آواز سے کیجئے یا گھٹے ہوئے حلق سے۔ ہر حال میں یہ سب اُس مشیت ایزدی کی ڈور سے بندھا ہوا ہے جسکا نام تو ہم سب لیتے ہیں مگر ہمارا عقیدہ اس پر سے متزلزل ہو چکا ہے۔ اگر عقیدہ مستحکم ہوتا تو ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں سب سے پہلے اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیئے تھا کہ خدا کی اطاعت اور نافرمانی کا میزانیہ ہمارے یہاں کیا ہے ہماری زندگی کے شب و روز کس حال میں گذر رہے ہیں۔

(تجلّی فروری و مارچ ۱۹۶۱ء)

یہ ضروری نہیں کہ جن غریبوں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں جو بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں خود انھی کے اعمال کا بدلہ انھیں مل رہا ہو فرقہ پرست غنڈوں کے ہاتھوں تو بے شمار معصومین بھی تباہ و برباد ہوتے ہیں اور بہتیرے وہ صلحاء بھی جن کی فرد عمل میں خطائیں کم اور نیکیاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔

لیکن اجتماعی سطح پر جو عذاب اللہ تعالے نازل فرماتا ہے اسکا قانون اور ہی ہے اس قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی قوم میں غلبہ نافرمانی اور سرکشی کا ہو جائے تو جو عذاب اس کی پاداش میں نازل ہوتا ہے وہ نکوکاروں اور معصوموں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ۔ (الانعام)

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے ہم ایسی کتنی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو اپنے زمانوں میں مقتدر رہ چکی ہیں انھیں ہم نے زمین پر وہ اقتدار بخشا تھا جس سے تم بہرہ یاب نہیں۔ ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے قدموں میں نہریں بہا دیں (مگر جب انھوں نے انتہائی ناشکر گذاری کا ثبوت دیا تو) آخر کار ان کے گناہوں کی پاداش میں ہم نے انھیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۔

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس بستی میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں تب عذاب کا فیصلہ اسی بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

یہ مطلب نہیں کہ یہ خوشحال حضرات اللہ کا حکم پا کر فسق و فجور کی راہ اختیار کرتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے جس کو اللہ تعالے خود فرماتا ہے ان اللہ لا یامر بالفحشاء (اللہ گناہ و بے حیائی کا حکم ہرگز نہیں دیتا) مطلب یہ ہے کہ بستی کے غالب حال کے لحاظ سے اللہ کی مشیت تکوینی جب یہ ضروری سمجھتی ہے کہ اس بستی پر عذاب بھیجا جائے تو پھر ہوتا یہ ہے کہ اللہ کے تکوینی (نہ کہ تشریعی) حکم کے تحت وہاں کے آسودہ حال لوگ بداعمالیوں پر اتر آتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ بستی عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ عذاب الہی عوام کی بداعمالیوں کی بنا پر نازل نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی بستی کے خواص، دولت مند ممتاز اور با اثر افراد کے بگاڑ پر نازل ہوتا ہے تو عوام بھی اس سے نہیں بچ پاتے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے بدکاروں کی شامت اعمال نکوکاروں کو بھی لے کر ڈوبتی ہے۔

ہمارے ملک میں آزادی کے بعد جو نوع بہ نوع مصائب ملت مسلمہ پر نازل ہوئے ہیں اور جس طرح یہاں تسلسل کے ساتھ مسلمانوں کے جان و مال اور حرمت و عزت سے خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے یہ اگر عذاب الٰہی ہی کی ایک شکل ہے تو پھر اس میں شبہ کی گنجائش نہ ہونی چاہیے کہ یہ ہمارے خواص کے فسق کا ثمرہ ہے۔ وہ خواص جس میں خوشحال بھی شامل ہیں اور لیڈر قسم کے اصحاب بھی۔ دانشور بھی شریک ہیں اور منصب دار بھی۔

ملت مسلمہ کے خواص کا جائزہ لے کر دیکھئے تو آپ علیہ ایسے افراد کا پتہ پائیں گے جنہیں ذاتی مفاد کے سوا قوم و ملت

تو کبھی اپنے پڑوسی تک کی پرواہ نہیں۔ جنکا مذہب پیسہ مقصد حیات دنیا کی نعمتیں اور خیالات کا محور اپنی ذات اور اہل وعیال کے سوا کچھ نہیں۔

پھر اس سے بھی بڑھکر المیہ یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والی جمعیۃ علمائے ہند کا کردار فسق وفجور کی ان پستیوں تک جا پہونچا ہے کہ اس کے وبال میں ہندوستان کی پوری ملت مسلمہ بھی عذاب آلہی کی زد میں آجائے تو کوئی تعجب نہیں علماء سے بڑھکر خواص کون ہوگا پھر "جمعیۃ علماء" کے صدر اور ناظم عمومی تو یقیناً بھی اشرفین ہی کی صف کے لوگ ہیں۔ کھاتے پیتے۔ مالدار وال والے یہ "دوہرے خواص" دین ملت کے حق میں جو فاسقانہ طرز عمل اختیار کئے ہوئے ہیں وہ اتنا تباہ کن ہے کہ تنہا اسی کی پاداش میں اللہ کے عذاب کو بارگاہ مشیت سے پروانۂ جواز مل سکتا ہے۔

چونکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ جمعیۃ علماء بہتیرے ایسے کام بھی کررہی ہے جو نیکی اور خدمت کے دائرے میں آتے ہیں ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے ناظم وصدر صاحبان شکل وصورت کے اعتبار سے متشرع اور پیشے کے اعتبار سے خادم دین وملت ہیں مگران حضرات کے زیر قیادت جس فسق وفجور اور کفر وزندقہ کو نشوونما مل رہا ہے وہ ایسا ہی ہولناک ہے کہ اس کی آمیزش کے بعد کسی بھی عمل نیک اور خدمت دین وملت کی حیثیت ایسے جام سے زیادہ نہیں رہ جاتی جس کے شیریں مشروب میں زہر ہلاہل کی آمیزش کردی گئی ہو۔

مال زکوٰۃ کو صحیح مصارف میں صرف کرنے کے بجائے خود پروری پر خرچ کرنا اور فسادزدوں کی مدد کے نام پر یا انگریزی اخبار کے بہانے حاصل کی ہوئی دولت کو اللّے تللّے اڑانا تو خیر ایسے امور ہیں جنکے لئے ثبوت وشہادت کی بحث بھی اٹھ سکتی ہے لیکن کیا اس ننگی سیاہ کاری کے لئے بھی کسی ثبوت وشہادت کی ضرورت ہے کہ اس نام نہاد جمعیۃ علماء کا سرکاری آرگن "الجمعیۃ" سود اور جوئے کے اشتہار چھاپتا ہے کھلم کھلا اثم وعدوان کو تعاون دے کر قرآن کی تضحیک کرتا ہے دہریت اور الحاد کی تعریف اور ائمۂ کفر وضلال کی تحسین اس کے کالموں میں آئے دن دیکھی جا سکتی ہے کسی بھی دوسری مسلم جماعت کے لئے اگر اس بدنصیب کے منہ سے کلمۂ خیر نکلا ہو تو ہمیں دکھا دیجئے اپنے سوا کسی بھی مسلم جماعت کی خدمت کا اعتراف اس خود پرست نے کیا ہو تو ہمیں بھی مطلع فرمائیے۔ کیا مجال ہے کہ اپنی شان میں قصیدے پڑھنے کے سوا کبھول کر بھی یہ کبھی کسی کے کار خیر کا ذکر کرتا ہو متفقہ آفات اور مسائل پر مشترکہ غور وفکر کے لئے مسلمانوں کا کوئی متحدہ پلیٹ فارم بنانا چاہو تو سب سے پہلی مخالفانہ آواز جس کے حلق سے نکلے گی وہ "جمعیۃ علماء ہند" کی ہوگی۔ مر مار کے کچھ مسلمان اگر یکجا ہو گئے تو انھیں حکومت کی نظر میں فرقہ پرست ثابت کرنا جمعیۃ علماء کا سب سے پہلا فریضہ قرار پائے گا۔ جماعت اسلامی سے۔ جو آج کی دنیا میں قرآن وسنت والے اسلام کی اجتماعی سطح پر نمائندگی کرنے والی جماعت ہے۔ اسے بے اندازہ بیر ہے بغض اور عداوت ہے اس کے لئے بدخواہی اور تبرا کے علاوہ الجمعیۃ میں آپ کبھی کچھ نہ پائیں گے۔ خدا کا خوف، حساب آخرت کا تصور اور دوسروں سے انصاف کرنے کا جذبہ اس نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے تو بتائیے کیا قومی سطح کی یہ بدکرداری اور فسق مبین اس بات کے لئے کم ہے تو اللہ کا عذاب حرکت میں آئے اور وہ قوم جھنجھوڑ ڈالی جائے جو ایسے بدکرداروں کو برداشت کئے ہوئے ہے۔ (تجلی جون سنہ ۱۹۶۰ء)

مولانا عامر عثمانی احباب و آفاق کی نگاہوں میں

اس عنوان کے تحت جو مضامین ہمیں موصول ہوئے ہیں ان کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ پہلے ان سب مضامین کو شائع کرنے کا ارادہ تھا لیکن پھر بعد میں یہ خیال ہوا کہ ان میں سے خاص خاص مضامین شائع کر دیئے جائیں۔ لیکن صفحات کی تنگ دامانی خاص خاص مضامین کو بھی شائع کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ لہٰذا اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ خاص خاص لوگوں کی طرف سے موصول شدہ مضامین کے کچھ جملے ہدیۂ ناظرین کر کے موضوع کا کما حقہٗ نہیں بلکہ برائے نام حق ادا کر دیا جائے

اس عنوان کے تحت جو تحریریں پیش کی جا رہی ہیں انھیں پیش کرنے کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ناظرین پر یہ بات واضح ہو جائے کہ مولانا عامر عثمانی صرف ایک اچھے عالم اور صرف ایک اچھے قلمکار ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ ایک اچھے انسان بھی تھے

ایک

اچھے دوست بھی تھے۔ ایک اچھے

شوہر

بھی تھے۔ ایک اچھے

باپ

بھی تھے اور ایک اچھے

بیٹے

بھی تھے

محمد فاروق عثمانی

میری اور عامر بھائی کی رفاقت بہت پرانی ہے — سب سے پہلے ہم دونوں
نے شرکت میں بساطخانے کی دکان کھولی۔ اسکے بعد پرچون کی دکان میں دونوں شریک رہے۔
پھر ہم نے مکتبہ تجلی میں مل کر کام کیا۔ اس طرح سے ہماری کاروباری رفاقت تقریباً تیس سالوں پر محیط ہے۔
تیس سال کے طویل تجربات نے میرے دل و دماغ کو جو تاثر بخشا ہے وہ یہ ہے کہ اس دور خود غرضی میں ان
جیسا نیک دل مخلص، دیانتدار اور دوسروں پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنے والا انسان جلدی سے دیکھنے میں
نہیں آ سکتا۔ میرے دل میں ان کی قدر پہلے بھی تھی لیکن اب — اس قدر عقیدت میں کہیں زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے
دنیا سے چلے جانے کے بعد مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ عامر بھائی کا اٹھ جانا ہمارے سارے خاندان کے لیے کم نصیبی کا پیش خیمہ ہے۔
وہ چلے گئے۔ وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔ انہیں بھلا ہی دینا مناسب ہے لیکن جب انکی
ہزاروں خوبیاں ہر وقت میرے پردۂ ذہن پر چھائی رہتی ہوں تو میں انہیں کیسے فراموش کر دوں؟
انہوں نے وقتاً فوقتاً مجھ پر جو احسانات کئے ہیں ان کا احساس ... کا تقاضا ہے ... [illegible]

ایک ماں کا یقین

ان کی والدہ کو ان سے برابر گہرا تعلق تھا۔ یوں تو ہر ماں کو اپنی اولاد سے تعلق ہوتا ہی ہے لیکن ان کی والدہ کو جو انسیت اور وابستگی تھی اسکی مثالیں دنیا میں کم ہی نظر آتی ہیں۔ وہ اکثر فرماتی ہیں: کہ عامر مجھے اپنی اولاد میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اسنے زندگی بھر میرا بے حد خیال رکھا ہے۔ میں اس سے خوش ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میرا پروردگار بھی اس سے خوش ہی ہو گا

احمد بن سعید صدیقی [illegible]

مسلسل کئی سال تک ان کے قریب رہنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مولانا عامر عثمانی سیرت و کردار کے ایک ایسے روشن چراغ تھے جسکی روشنی میں دھیلا دو سر بیں بیا سفر حیات طے کرتی ہیں۔ وہ دنیا سے کوچ کر گئے لیکن انکی پھیلائی ہوئی روشنی لفظوں کی شکل میں آج تک موجود ہے اور یہ روشنی کبھی فنا نہیں ہو سکتی

حسن احمد صدیقی

میرے نزدیک مولانا عامر عثمانی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے غریب پروری کو اپنی زندگی کا خصوصی مقصد بنا لیا تھا۔ رشتہ داروں اور اعزہ کے علاوہ دوسرے متعلقین بندوں کو خفیہ طریقے سے مدد کرنا ان کے خصوصی حصہ میں داخل تھا۔ یتیموں بیواؤں اور نادار لوگوں کی دستگیری کرنے کو وہ اپنا انسانی فرض سمجھتے تھے اور زندگی کے آخری سانس تک وہ اس فرض سے غافل نہیں رہے۔ خود غرضی اور مفاد پرستی کے اس دور میں مسکینوں اور لاچاروں کی از خود مدد کرنا اور چھپ چھپا کر مدد کرنا ایک ایسا وصف جمیل ہے جسے فی زمانہ عنقا نہیں تو نادر ضرور کہا جا سکتا ہے

منشی محمد حنیف بمبئی

میں نے بڑے بڑے علماء سے ملاقات کی ہے لیکن مجھے اتنی خوبیاں کسی دوسرے عالم میں نظر نہیں آئیں جتنی مولانا عامر عثمانی
کی ذات میں مجتمع تھیں۔ وہ میرے ہی اصرار پر بمبئی تشریف لائے تھے اور میرے ہی مکان میں ان کا قیام
تھا۔ اپنے آخری خط کی پیشانی پر انہوں نے جو پتہ تحریر کیا ہے وہ میرا ہی پتہ ہے۔ یہ تو میری خوش بختی ہے کہ انہوں نے میری دعوت قبول
کی اور میرے مکان میں قیام کر کے انہوں نے مجھے ایک ایسی سعادت بخش ڈالی جس سعادت کے سیکڑوں لوگ متمنی تھے۔
میں تجلی کا پرانا خریدار ہوں اور مولانا عامر عثمانی سے میرا پرانا تعلق ہے لیکن انہیں دیکھنے کا اتفاق پہلی بار اس وقت ہوا جب مرحوم ٹھکل
سے واپس ہو رہے تھے۔ اس وقت بھی ان کا قیام میرے ہی مکان پر رہا۔ اور انھیں قریب اور بہت قریب سے دیکھنے کے بعد مجھے یہ اندازہ
ہوا کہ عامر عثمانی صرف ایک اچھے ایڈیٹر نہیں، صرف ایک بے نظیر نقاد نہیں بلکہ ایک دلچسپ انسان بھی ہیں۔ ایک ایسے دوست بھی
ہیں جس کی رفاقت دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوا کرتی ہے۔ اب وہ چلے گئے ہیں اور ان کی وفات نے مجھے ایک ایسا غم بخش ڈالا
ہے جس سے میری روح پہلے آشنا نہیں تھی۔ ان کی وفات سے مجھے جو صدمہ ہوا ہے اس کا اندازہ شاید
کوئی دوسرا نہ کر سکے۔

میں نے ان کے ساتھ زندگی کی بیس منزلیں طے کی ہیں ۔۔ بیس سال تک ہر وقت ساتھ رہنے کے بعد میرے اور ان کے درمیان موت اور زندگی کی ایک اونچی فصیل حائل ہو گئی اور جدائی کی یہ فصیل اس وقت تک زمین بوس نہیں ہو سکتی جب تک میں خود قید حیات سے نجات نہ پالوں۔

زندگی کا سفر بذات خود کوئی کشش اپنے اندر نہیں رکھتا۔ راہیں کتنی ہی خوبصورت اور دیدہ زیب کیوں نہ ہوں منزلیں کتنی ہی پرکشش اور دلفریب کیوں نہ ہوں، مسافر ہر قدم اکتاہٹ اور تکان ہی محسوس کرتا ہے۔ البتہ اگر کوئی خوش اخلاق اور خوب سیرت ہمسفر ساتھ ہو تو پھر سفر کی حقیقت سراپا ایک خوبصورت افسانے میں ڈھل جاتی ہے۔ اچھے ہمسفر کی موجودگی میں کانٹے، پھول اور دھوپ چھاؤں محسوس ہوتی ہے اور سفر خود بخود راحتوں اور لطافتوں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ راستے خود بخود گھٹ جاتے ہیں۔ تکلیفیں سمٹ کر ہوا ہو جاتی ہیں۔ اور ہر ہر قدم پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قسمت کے ستارے راہوں میں چاندنی پھیلانے کی ڈیوٹی انجام دے رہے ہوں۔ اور یہی سفر سراپا مصیبت اور سقر بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر کوئی اچھا ساتھی، کوئی اچھا رفیق سفر ساتھ نہ ہو۔



۱۹۵۵ء کی ایک شام کو اپنے گھر اور اپنے محلّہ کی گلیوں کو خیرآباد کہہ کر میں مرحوم کے مکان میں منتقل ہو گئی تھی ۔۔ ازدواجی زندگی کی راہیں میرے لئے اجنبی تھیں۔ میں کچھ سراسیمہ تھی ۔۔ کشمکش، تذبذب اور چند مہمل قسم کے وساوس نے میرے دل و دماغ کی وادیوں میں طوفان برپا کر رکھا تھا۔ میری رگ رگ میں سوچ و فکر کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ میری زمین دماغ میں ان گنت سوالیہ نشان ابھرے ہوئے تھے۔ اس وقت میری عمر اٹھارہ سال تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر کسی بھی اعتبار سے پختہ نہیں کہلائی جاسکتی۔ ناتجربہ کاری تو تھی ہی مسلّم۔ اپنے گھر کی چہار دیواری سے باہر قدم نکالنے اور کسی دوسرے گھرانے میں جھانکنے کی نہ کبھی توفیق ہوئی تھی اور نہ کبھی موقع ملا تھا۔

پھر اچانک ایک بڑے گھرانے میں منتقل ہو جانا دل و دماغ میں جتنی بھی گھبراہٹ اور کیفیتیں پیدا کرتا کم سے کم ہی تھا۔ میری شادی جس زمانہ میں ہوئی وہ زمانہ دقیانوسی زمانہ تھا۔ تہذیب کا سورج نصف النہار پر نہیں تھا۔ مغربیت اور بیحیائی اتنی عام نہیں تھی جتنی آج ہے۔ اس زمانہ میں لڑکیاں اور لڑکے اپنے ماں باپ کے فیصلوں پر مکمل اعتماد کیا کرتے تھے ۔۔ ماں باپ، نے جس نسبت طے کر دی ہنسی خوشی اس رشتہ کو منظور کر لیا۔ اس دور مسعود میں معاشرہ کی خشک زمین پر عشق و محبت کی فصلیں نہ لہراتی تھیں اور ماں باپ کے فیصلوں پر خط تنسیخ پھیر دینے کی کوئی اور وجہ بھی نہیں۔

میں اپنے ماں باپ کے فیصلے پر قطعی مطمئن تھی۔ فکر اور سراسیمگی کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ ایک چھوٹے سے گھروندے سے بڑے گھرانے میں منتقل ہونے کے بعد میں وہاں کی ذمہ داریاں کس طرح نبھا سکوں گی۔

لیکن مجھے اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا شوہر ہر ہر قدم پر میری اتنی دلجوئی کریگا کہ فکرات کے اندھیرے اطمینان کی روشنیوں میں تبدیل ہو جائیں گے اور جس دماغ میں سوالوں کی دھند بکھری ہوئی ہے اس میں سکون کی چاندنی پھیلتی چلی جائے گی انہوں نے مجھے اتنی محبت کی جتنی خیالوں اور خوابوں میں کی جاسکتی ہے مجھے ان کے دامن سے وہ سب کچھ ملا جو ایک بیوی کو

منا چاہیے۔ پھر بیس سال کی طویل مدت پلک جھپکتے ہی گذر گئی ـــ ایک اچھے ہمسفر کی موجودگی میں شاید راستے سمٹ جاتے ہیں۔ گھنٹے منٹوں میں بدل جاتے ہیں۔ اور منزلیں وقت سے پہلے ہی قدموں کی خاک بن جاتی ہیں۔

ان کی محبت اور خلوص کی زیادتی نے غم کو غم نہیں کہنے دیا۔ میں نے ان کے ساتھ رہ کر ہر خوشی پائی۔ ہر راحت مجھے ملی۔ ہر ضرورت میری پوری ہوئی ـــ وہ میرے تمام تقاضے پورے کرتے رہے، زندگی کا سفر جاری رہا۔

اور پھر بیس سال تک میرے ساتھ چلنے کے بعد انھوں نے زندگی سے دامن چھڑا لیا۔ اور مجھے زندگی کی راہوں میں اکیلا بھٹکنے کے لئے چھوڑ گئے۔ چلے گئے کہاں؟ وہاں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

میرا اپنا گھر ہے۔ کاروبار ہے، بچے ہیں سبھی کچھ ہے لیکن زندگی کی راہیں بڑی سونی اور وحشتناک محسوس ہوتی ہیں ـــ اب دنیا میں دل نہیں لگتا ـــ ان کی یادوں کے چراغ اور صبر وضبط کی قندیلیں اگر میرے دل میں روشن نہ ہوتیں تو اس دل کی دھڑکنیں مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب جاتیں۔ میں مرحوم کی بے شمار خوبیوں کے پیش نظر یہ دعا کرنے پر مجبور ہوں کہ خدا دنیا کی ہر لڑکی کو ان جیسا شوہر عطا کرے ـــ تاکہ زندگی کی کٹھنائیاں اتنی تکلیف دہ محسوس نہ ہوں جتنی حقیقت میں وہ ہوتی ہیں۔

زینت ناہید عثمانی

علمی حیثیت سے میرے ابّی کا مقام کیا ہے، اس کا مجھے صحیح اندازہ نہیں۔ البتہ تجلّی کے مطالعے نے مجھ پر یہ بات ضرور واضح کردی ہے کہ ان کی تحریروں میں جو روانی، سلاست اور رچاؤ پایا جاتا ہے۔ کسی صاحب قلم کی تحریر میں اس کا عشر عشیر بھی موجود نہیں ہے اگر یہ مبالغہ ہے تو پھر یوں کہہ لیجئے کہ ان کی تحریروں میں جو کشش اور جاذبیت پائی جاتی ہے اس کا سلسلہ ان قلم کاروں سے جا کر مل جاتا ہے۔ جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کی تعداد ایک وقت میں چند سے زیادہ نہیں ہوتی ـــ بہرحال یہ میرا ایک اندازہ ہے ضروری نہیں کہ میرا اندازہ صحیح ہو۔ میں ان کی بے شمار تحریروں کو دلیل بنا کر انھیں وقت کا بے نظیر ناصر باور کرا سکتی ہوں لیکن اس وقت یہ میرا موضوع نہیں۔ اس وقت میرا موضوع یہ ہے کہ وہ (عامر عثمانی) باپ کے روپ میں کیا تھے ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے ہمیں کسی بات پر نہیں جھڑکا، کبھی کسی نقصان پر آگ بگولہ نہیں ہوئے ـــ کبھی ایسی نظروں سے نہیں دیکھا کہ ہم سہم کر رہ جائیں۔ وہ ہمارے لئے سراپا شفقت تھے ـــ ہم نے ان کے دامن میں نرمی کے پھولوں کے سوا کچھ اور نہیں پایا۔

وہ سراپا محبت تھے، مکمل خلوص تھے ـــ ان کی زندگی اس خوشبو کی مانند تھی جو دل ودماغ کو فرحت وتازگی بخشنے کے لئے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اور جب سے وہ چلے گئے گھر کی در ودیواریں ان کو صدائیں دیتی ہیں اور گھر کا بچہ بچہ ان کی یاد میں آنسو بہاتا ہے ـــ میں بھی انھیں یاد کر کے رو پڑتی ہوں لیکن جب مجھے اس بات کا خیال آتا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انسان آتے ہیں ان سب کو اسی طرح اللہ کی طرف لوٹ جانا ہے تو پھر کسی نہ کسی حد تک صبر قرار آ ہی جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صبر نام کی کوئی چیز دنیا میں موجود نہ ہوتی تو میں زندگی بھر روتی ہی رہتی ـــ اور ان کی خوبیوں اور شفقتوں کا تصور ہمیشہ مجھے تڑپنے پر مجبور کرتا رہتا۔

میں دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کرتی ہوں کہ خدا میرے ابّی کی مغفرت فرمائے اور میرے بھائیوں کو ان کے نقش قدم پر چلائے تاکہ وہ کسی دور میں ایک اچھے شوہر اور ایک اچھے باپ بن کر معاشرے کو وہ سب کچھ دے سکیں جس کے بغیر امن وعافیت کا قیام ممکن نہیں ہے۔ ان کے چلے جانے سے ہمارے گھر میں جو سناٹا بکھر کر رہ گیا ہے۔ اس کے وجود میں شاید ہی کبھی تخفیف ہو سکے ـــ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ میرے ابّی اللہ کی ایک خاص نعمت تھے اور چونکہ ہم لوگوں نے صحیح معنوں میں اس نعمت کی قدر نہیں کی لہٰذا خدا نے ہم سے یہ نعمت چھین لی ـــ یہ ہماری ناقدری کی سزا ہے۔ خدا ہمیں معاف کرے۔ اور آئندہ ہمیں ناقدری کے جرم عظیم سے محفوظ رکھے۔

مفتی کفیل الرحمن نشاط عثمانی

اس احساس سے ہی کلیجہ کٹا جاتا ہے کہ ہمارے مشفق و مہربان چچا اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔ چچا کی وفات اہل خاندان کے لئے ایک غیر معمولی حادثہ اور ایک ایسا عظیم نقصان ہے جس کی تلافی کی بظاہر کوئی صورت نہیں

وہ تاریخ کے ایک اچھے معمار اور اسلام کے ایک ایسے مجاہد تھے کہ جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ حق گوئی کے لئے وقف ہو کر رہ گیا تھا، بلکہ سارے ولولے ان کے نذر کردیئے۔ تھے۔ ایک ایسے خطرناک وقت میں جبکہ اظہارِ حق کسی جرم عظیم سے کم نہیں تھا وہ سچائی کا پرچم بلند کئے رہے۔ باطل کے طوفانوں اور اندھیروں کا مقابلہ استقلال و پامردی سے کرتے رہے۔ ان کے کمزور و ضعیف جسم میں جہد و عمل کی ایسی چنگاریاں موجود تھیں جن سے جدوجہد کا جذبہ ابھرتا ہے۔ باطل کے ایک طوفانی دور کے بعد دوسرا طوفانی دور آیا۔ پھر تیسرا دور آیا۔ دور بدلتے رہے، باطل بھی اپنے رنگ بدلتا رہا۔ وہ مختلف روپ میں حق سے ٹکراتا رہا لیکن وہ (مولانا عامر عثمانی) باطل سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ وہ ہر خطرہ سے بے پروا جہد و عمل کا چراغ لئے ہوئے دشوار گذار راستے سے گذرتے رہے۔ مرحوم نے احقاق حق اور ابطالِ باطل کی ایسی روشن مثال قائم کی ہے جسے صدیوں تک نہیں بھلایا جا سکتا۔

مرحوم ملی خدمت کے جذبہ سے سرشار تھے۔ جس قدر اور جہاں تک ہو سکتا تھا وہ ہر ایک کی مشکلات دور کرنے کی سعی کرتے تھے، کسی کے جان سے کام آتے تھے اور کسی کے مال سے ۔ کسی کی لفظوں سے مدد کیا کرتے تھے، کسی کی ہاتھ سے، غرضیکہ وہ دامے، درمے سخنے مخلوق کی خدمت میں لگے رہے۔ آج ہم اپنے خاندان کے عظیم و قابل فخر شخصیت کی وفات پر سوگوار دردوں کے ساتھ انکی بیمثال زندگی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور انکی اس بے باکی کو سلام نیاز کرتے ہیں جو اسلامی تعلیمات نے انھیں عطا کی تھی۔ مرحوم پر قیادت کا ایک دور ختم ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس زنجیرِ زر کی آخری کڑی کی قبر پر ہمیشہ ہمیشہ بارش رحمت برساتا رہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

علی اکبر عثمانی

عزیزی حسن احمد صدیقی نے مجھ سے برادرِ مکرم مولانا عامر عثمانی کے بارے میں میرے احساسات و جذبات کے اظہار کیلئے کہا کہ مولانا عامر عثمانی کی حیثیت تمہاری نظر میں کیا تھی، اختصار کے ساتھ تحریر کردہ جو زیادہ سے زیادہ ایک کالم میں آسکے۔

اس عظیم شخصیت کی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر مختصر روشنی ڈالنے کیلئے بھی کئی صفحے اور کافی وقت درکار ہے، چالیس سال کی وہ رفاقت جسمیں کبھی کوئی خلا واقع نہیں ہوا۔ شب روز ایک شفیق باپ کی حیثیت سے جس کا سایہ میری زندگی کے ہر سرد گرم حالات میں میری رہنمائی اور سرپرستی کرتا رہا، ناز برداریاں اٹھاتا رہا، میری لغزشوں اور کوتاہیوں کو بچپن اور ناسمجھی پر محمول کر کے ہمیشہ نظر انداز کرتا رہا، میرے کسی بھی ذاتی کام میں کبھی حکم کے انداز میں اپنے بڑے ہونے کا رعب نہیں جمایا، بلکہ کسی مناسب اور خوشگوار وقت میں ایک رفیق کی حیثیت سے اپنی جامع اور مفصل رائے کا اظہار کردیا۔ اظہار رائے کے بعد انتہائی انکساری اور شیریں کلامی کے ساتھ فرماتے کہ ہماری رائے یہ ہے تم اس پر اطمینان اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کرلینا۔

قدم قدم پر انکا تعاون، ہمدردی اور پیار میری زندگی کا سرمایہ بنا رہا۔ والد محترم مرحوم و مغفور کی کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دیا۔ برادر مکرم مولانا عامر عثمانی کے انتقال پر مجھے اپنی یتیمی کا احساس ہوا۔ اس لئے کہ مجھے والد صاحب سے جدا ہوئے کم و بیش اکیس برس ہو چکے تھے۔ اس طویل مدت میں میرے بہترین مشفق و عزیز و محترم بھائی مولانا عامر عثمانی نے باپ کے وہ تمام فرائض بحسن و خوبی انجام دیئے جس کی توقع اولاد اپنے باپ سے فطری طور پر رکھتی ہے۔ مولانا کی بیس سالہ رفاقت کو ایک کالم میں بیان کردینا دریا کو کوزے میں سمیٹ دینے کے مصداق ہے۔ کہاں مولانا عامر عثمانی جیسا ذہین مفکر، ایک ادیب ایک شاعر، ایک مفتی، ایک طنز و مزاح کا پیکر، ایک ایسا نقاد جسکو صدیوں تک دنیا فراموش نہیں کرسکے گی اور کہاں ایک کالم۔

اس کالم کی احساس گرفت نے قلم اور انگلیوں کو شل ہی کردیا۔ قلم کی ایک گردش اور انگلیوں کو ایک جنبش بھی دینے کی سکت نہیں رہ گئی۔ بہرحال اس قید و بند کے باوجود میں حسن احمد صدیقی کا مشکور ہوں کہ انھوں نے میرے جذبات کا احترام کرتے ہوئے مجھے لکھنے کا موقع عنایت کیا

یہ چند نامکمل سی سطور میرے جذبات کی صحیح تصویر تو شاید پیش نہ کرسکیں لیکن انکی ایک ہلکی سی عکاسی ضرور ہو جاتی ہے۔

★

"پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں" والی مثال میرے برادر مکرم مولانا عامر عثمانی مرحوم میں من وعن صادق آتی ہے۔ میں آپ کے سامنے اس مثال کی روشنی میں اپنے پیارے بھائی اور محترم استاد کے متعلق گفتگو کروں گی ——— وہ واقعات جو ہم لوگ اپنے بزرگوں اور اپنی والدہ محترمہ ماں سے سنتے چلے آئے ہیں وہ بھی ان میں تحریر کئے جائیں گے ——— یہ اس وقت کی بات ہے جب میرے والدِ بزرگوار حضرت مولانا مطلوب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سلطنتِ برطانیہ کے دورِ حکومت میں انجینیر تھے اور ہمارے گھر میں نوکروں، ملازموں، سیدانیوں کی پرورش ہوتی تھی انھیں میں سے ایک سیدہ نانی صاحبہ تھیں یہ عامر بھائی کی پرورش پر مامور تھیں اور دل وجان سے ان کی نگہداشت کررہی تھیں اور ان کی ایک ایک بات اور حرکت پر حیرت اور تعجب سے چونک چونک جاتی تھیں، وہ کہتی تھیں کہ میں نے بہت سے بچے پالے ہیں لیکن یہ عجیب وغریب بچہ پہلا ہی ہے جو بجائے کھیل کھلونوں، کھانے پینے کی چیزوں کے کتابوں اور قلم کا شوقین ہے۔ قارئین شاید آپ یقین نہ کریں لیکن یہ ایک زندہ اور ٹھوس حقیقت ہے کہ ڈھائی سال کی عمر میں عامر بھائی نے سیدہ سے ایک تھیلے والی سلوائی اور اس میں اباجی کا ایک بیکار قلم لے کر رکھا اور ادھر ادھر سے کاغذ جمع کر کے تھیلی میں رکھے اور سیدہ صاحبہ سے ٹوٹی پھوٹی زبان میں یہ کہا کہ "ہم لکھا کریں گے۔"

اندازہ کیجئے یہ اس عمر کی بات ہے جب کوئی ہوش اور کوئی عقل کی بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ ایک بچے کی نفسیات اور اس کے ذہن کے دھارے کا رُخ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے، جوں جوں عمر بڑھتی گئی یہ ذوق وشوق فزوں سے فزوں تر ہوتا گیا سیدہ صاحبہ کے ساتھ ہر وقت پڑھائی اور تعلیمی کھیل کھیلنے پر مصر ہوتے، کبھی تختی پوتی جاتی، کبھی کاغذوں پر مشق کی جاتی اور بتدریج یہ دو ڈھائی سال کا بچہ جب دس سال کا ہوا تو اسی دس سالہ بچے نے اپنی آپا کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا، جو قطعی ناخواندہ تھی۔ یہ ایک ایسی انہونی سی بات تھی جو اس وقت میرے والد کے ہمعصروں میں بڑے تعجب اور حیرانگی سے ذکر ہوتا تھا ہر شخص یہی کہتا کہ یہ بچہ زندہ رہا تو بڑے ہو کر والدین کا نام روشن کرے گا ——— اس طرح یہ بچہ چھوٹے چھوٹے تعلیمی مراحل اتنی تیزی سے طے کرتا گیا کہ حیرت ہونے لگی۔

عائشہ عثمانی

قرآن پاک کے سلسلے میں یہ قصہ ہوا میلنہ منی عثمانی (علامہ شبیر احمد عثمانی کی صاحبزادی) جب قرآن شریف پڑھ رہی تھیں تو عامر بھائی سے تیرہ سیپارے آگے تھیں۔ ایک دن آپا منی نے عامر بھائی کو چڑانے کے انداز میں یہ کہہ دیا کہ دیکھو عامر میں تم سے آگے ہوں اور تم کتنے پیچھے ہو یہ سننا تھا کہ ان سے بڑے عزم کے ساتھ بولے آپا دیکھنا یہ ہے کہ قرآن شریف پہلے کون ختم کرتا ہے۔ بس اس دن سے لگن کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا، تو یہ عالم ہوا کہ حافظ صاحب جو سبق دیکر جاتے ان سے ایک اور دو سیپارے روزانہ ان کو آگے بڑھکر سناتے، جس پر حافظ صاحب محوِ حیرت تھے کہ یہ بچہ کہیں پہلے ہی سے تو پڑھ کر نہیں آیا۔ غرض کہ آپا منی سے پہلے قرآن شریف ختم کر کے اُن سے بڑے ناز سے بولے دیکھا آپا آپ نے ہم نے ہرا دیا نہ آپ کو۔ یاد رہے آپا منی انتہائی قابل مدبر شاعرہ ادیبہ اور سیاسی فکر رکھنے والی عورت ہیں۔ عامر بھائی کی گہری دوستی تھی ان سے ہمیشہ ادبی موضوعات پر ان کی بحث وتکرار رہا کرتی تھی۔ عامر بھائی سے میری آپا منی اور پھوپی زاد بہن سیدہ نگار کی گہری دوستی رہی تھی ہمیشہ ایک ساتھ کھیلنے ایک ساتھ ہر پروگرام بنتا اور ہمیشہ ادب، صحافت، سیاست کی باتیں اور بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ آپا منی بہت اچھی شاعرہ ہیں انہوں نے جب سب سے پہلے کچھ شعر کہے تو عامر بھائی کو دکھائے اور کہا کہ دیکھو میں شاعرہ ہوگئی اور تم دونوں یعنی میں اور عامر بھائی یہ کام نہیں کر سکے۔ عامر بھائی نے یہ سنکر جواب دیا کہ میں بھی شاعری کر سکتا ہوں لیکن آپا منی لہا کہ نہیں یہ مشکل کام ہے۔ پھر آپا منی نے خود ہی شاعری پر ان کو اکسایا تو زبیر بھائی حیدرآباد دکن سے دیوبند آئے تھے عامر بھائی نے انکی آمد کی خوشی میں ایک ——— طویل نظم کہی جس پر آپا منی اور دیگر خاندان کے اہل علم بزرگ حیران تھے کہ پہلی نظم اور اس قدر ترتیب وترتیل اور وزن کے ساتھ ایسی نظم اس عمر میں اللہ تعالیٰ اس کی صلاحیتوں کو اور نمایاں کرے۔ پھر تو شاعری کی ایسی دھن سوار ہوئی کہ اس وقت کے مشہور شعراء کی ہر غزل ہر نظم شعر کہنے لگے اور مجھے اور آپا منی کو بھی مصرعہ دیا کرتے۔ اس طرح یہ ذوقِ شعری اتنا بڑھا کہ ہمارا گھر مشاعرہ گاہ میں تبدیل ہو گیا۔ ہر دوسرے تیسرے دن مشاعرہ ہو رہا ہے۔ میں، آپا منی اور سیدہ نگار صاحبہ اس کا انتظام

کرتے پھر رہے ہیں علی بھائی صدر بنتے اور سیدہ آپا کو اناؤنسر بناتے، سامعین میں محلے کے لڑکوں اور خاندان کی لڑکیوں کو جمع کرلیتے۔ اس طرح یہ ادبی ذوق جنون کی حد تک پہونچا، پھر تو یہ کیفیت ہوگئی کہ ادھر مصرعہ ملا اور پوری غزل تیار، کیونکہ تعلیم جاری تھی۔ ابا جی اس ہر روز کے شاعرے بازی سے تنگ آگئے تھے اور ہم سب کو ڈانٹتے تھے لیکن پھر یہ کام دن میں اور وہ بھی دوپہر کو اس وقت سرانجام دیا جاتا جب سب دوپہر کو سو جاتے۔ غرض اس طرح بچپن کا رنگین زمانہ گذرا، پھر تو عامر بھائی ہم دونوں کے استاد ہوگئے۔ ہماری شاعری اصلاح کرتے اور ادبی مشورے دیتے، آپا منی کیونکہ بہت اچھا اور ٹھوس کہتی تھیں اس لئے ان کی غزل میں زیادہ اصلاح نہیں ہوتی تھی۔ میرے تو یکسر مصرعے کے مصرعے تبدیل کردیا کرتے اور مشورہ بھی دیا کرتے۔ پھر ایک قلمی پرچہ "ساتھی" نام کا نکالا جس میں ادارت عامر بھائی آپا منی اور میری رہی، اس میں زیادہ کام عامر بھائی کا رہتا کیونکہ یہی اس کو سجاتے، نکھارتے اور جب پورا لکھا جاتا تو خود ہی سب کو مطالعہ کیلئے دیتے اور واپس لیتے

عامر بھائی میں انتہا پسندی حد سے زیادہ تھی، کسی کام کو اس وقت تک نہ چھوڑتے جب تک وہ انتہا کو نہ پہنچ جاتا، آپ کو حیرت ہوگی کہ جب کشیدہ کاری کا ذوق پیدا ہوا تو دہلی اور بمبئی سے کشیدہ کاری کا سامان لاتے اور گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر مجھے مشورہ دیتے وہ ڈیزائن اتارتے، میں کاڑھتی وہ رنگ بتاتے ذرا سا غلط ٹانکا لگتا تو پورا اُدھڑوا دیتے، یہ ذوق تو مرتے دم تک ختم نہیں ہوا تھا میری موجودہ چادر جو نسیم فاطمہ جو بہترین کڑھائی کرتی ہیں ان سے کڑھواتے اور مشورہ دیتے رہتے، مناظر پرستی اور حسِ لطیف اتنی تھی کہ ہم بعض مرتبہ اکتا بھی جاتے تھے، کوئی خوبصورت سینری یا خوبصورت پھول یا اچھا شعر کہیں دیکھتے تو اس پر بغیر گفتگو کئے نہ رہتے تھے۔

شروع ہی سے جو فکر سخن پائی تھی اس نے تجلی جیسے رسالہ کا اجرا کرایا اور علمی دنیا میں اپنا لوہا منوالیا۔ عامر بھائی نے زندگی میں سب سے پہلا شعر یہ کہا تھا ؎ کوئی راہ چشم سے سینے میں اترا جائے ہے۔

ان کے بارے میں بہت کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے — بس بس: حاصلِ جذبات یہ سمجھئے کہ میرے بھیا ایک ایسے پھول کی مانند تھے جو کئی قسم کی خوشبوئیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہو — پروردگار انھیں وہاں کی نعمتیں عطا کرے ——

مولانا
عامر عثمانی
اور
اربابِ ادب

اربابِ قلم کے صرف یہی مضامین
ہم تک نہیں پہونچے بلکہ ان کے علاوہ بھی کچھ اور
مضامین ہمیں ایسے موصول ہوئے ہیں جنہیں معیاری اور قابلِ
اشاعت سمجھنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں۔

لیکن

صفحات کی قلت کی وجہ سے ہم ان سے زیادہ مضامین چھاپنے
کی پوزیشن میں نہیں ہیں ——

جن

اربابِ قلم کے مضامین کو جگہ نصیب نہ ہوسکی۔
ان سے ہم معذرت
چاہتے ہیں۔

جناب
ابو محمد امام الدین رام نگری

نہ بھلائے جانے والے چھبیس ۲۶ سال کے رفیق

مولانا عامر عثمانی رحؒ کی یادیں

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

یہ شعر غالب مرحوم نے اپنے ایک نوجوان عزیز عارف کی وفات پر لکھا تھا جو مولانا عامر عثمانیؒ کی وفات اور مجھ پر راست آتا ہے۔ ۵۰ سال کی عمر ہو چکی ہے، تمام قویٰ جواب دے چکے ہیں۔ زندگی کے آخری ایام سے گذر رہا ہوں میں نے کبھی اس کا تصور بھی نہ کیا تھا کہ مولانا عامرؒ مجھ سے پہلے چلے جائیں گے۔ مولانا پر پہلی بار دل کا دورہ پڑا میں ۴ اپریل کے روزنامہ قومی پرچہ میں اس کی خبر دیکھی جس میں بتایا گیا تھا کہ وہ صحت یاب ہو رہے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مطالعہ کرنے اور لکھنے میں کتنی جانکاہی اور جگر کاوی کرتے ہیں۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ یہ مہلک مرض اعادہ بھی کرتا ہے۔ میں خود اس کے حملوں کا ہدف رہ چکا ہوں اس لئے میں نے مولانا کو لکھا کہ دین و ملت کو آپ کی بڑی ضرورت ہے اپنی زندگی کی حفاظت کیجئے پڑھنے لکھنے کی محنت کم کر دیجئے آپ کو میرا مرثیہ بھی لکھنا ہے۔ کیا خبر تھی کہ قضا و قدر کے منصوبات کیا کہ مجھی کو ان کا مرثیہ لکھنا پڑیگا۔

اس دار فانی میں جو بھی آتا ہے جانے ہی کے لئے آتا ہے لیکن انھیں آنے جانے والوں میں ایسی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے پیچھے ایسے نقوش چھوڑ جاتی ہیں جو مدتوں ان کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ مولانا عامر عثمانی رحؒ بھی ایک ایسی ہی شخصیت تھے جماعت اسلامی ہند کی تحریک دعوت کی حمایت و وکالت اور اس پر ہونے والے حملوں کی مدافعت میں ان کے قلمی کارنامے بالخصوص ناقابل فراموش ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا عثمانیؒ کو اتنی خصوصیتیں عطا فرمائی تھیں کہ وہ بجائے خود اہل علم کی ایک جماعت کی حیثیت رکھتے تھے۔ حدیث، فقہ، تحقیق و تنقید، شعر و ادب، طنز و مزاح غرض ہر میدان علم و فن میں ان کا اشہب طبع اور رہوار قلم جولانیاں دکھاتا تھا۔ ان کے پاس الفاظ کا وافر ذخیرہ تھا اور اپنا شگفتہ اور دلآویز اسلوب نگارش، فتویٰ نگاری جیسے خشک فن کو بھی ان کی جدت طبع نے باغ و بہار بنا دیا تھا۔ ان کی نگارشات کا جائزہ لیا جائے تو کتنے ہی الفاظ، جملے اور فقرے ایسے ملیں گے جن کے وہ خود موجد تھے۔ غالباً وہ جب قلم اٹھاتے تھے تو بے ساختہ لکھتے چلے جاتے تھے۔ ان کی تحریروں میں تکلف اور آورد کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس سے وہ اتنا لکھ ڈالتے کہ تجلی کے بیشتر صفحات ان ہی کی تحریروں سے پر ہوتے تھے۔ تجلی کا یہ ۲۶ واں سال ہے۔ میری اور مولانا عامر عثمانیؒ کی رفاقت کی بھی اتنی ہی مدت ہے۔ تجلی کی حد تک مولانا کے

فضل وکمال سے ہندوستان وپاکستان ہی کے نہیں دوسرے ممالک کے اردو خواں بھی واقف ہیں لیکن ؎

ہے شمع بزم رونق بزم کی یہ سب سمجھتے ہیں
مگر جلتی ہے کیونکر شمع سوزاں کون سمجھے گا

مولانا مطالعہ کرنے اور سمجھنے میں جو دماغ سوزی اور جانکاہی کیا کرتے تھے اس سے متعلق مولانا کے گھر والوں کے سوا شاید ہی کسی کے پاس وہ معلومات ہوں جو میرے پاس ہیں۔ ادھر چند سال سے معمول سا ہوگیا تھا کہ جب تازہ تجلی آتا تو میں مولانا کی نگارشات کے متعلق اپنے احساسات و تاثرات لکھ بھیجا کرتا تھا اور مولانا خود بھی میرے احساسات و تأثرات جاننے کے منتظر رہا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا اپنے نجی حالات بھی لکھتے رہتے تھے۔ ان معلومات کا منظر عام پر لانا مجھے اپنا ایک فریضہ سا محسوس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ان کا تذکرہ لکھنا چاہے گا تو اس کے لئے یہ معلومات بڑے اہم ثابت ہوں گے جو ان کے خطوط سے پیش کر رہا ہوں۔

۱۱؍ دسمبر ۷۳ء کا خط۔

محترمی۔ سلام مسنون۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں "نظریہ ارتقاء نمبر" مل گیا ہوگا۔ آپ تو ان مخلصین میں ہیں جو مطالعہ کے بعد بطور خود اپنے تأثرات سے آگاہ فرمایا کرتے ہیں۔ لیکن اس بار رسید سے محروم ہوں حالانکہ موضوع کی خصوصیت کے باعث اس بار خود منتظر ہوں کہ اہل الرائے کے تأثر کا پتہ چلے۔ آپ بلاشبہ اہل الرائے کی صفِ اوّل میں ہیں۔ ابتک جن قابلِ ذکر حضرات نے خط سے نوازا ہے ان کی رائے میں تو یہ ناچیز کامیاب رہا ہے۔ مسئلہ پوری طرح منقح ہوگیا ہے لیکن آنجناب بھی اسی رائے پر پہنچے ہوں اس کا پتہ نہیں امید ہے خط سے نوازیں گے۔ تفسیر ماجدی کا تبصرہ بھی پڑھ ہی رہے ہوں گے۔ کیا واقعی حق تبصرہ ادا ہوا ہے؟ تجلی کے تمام مستقل عنوانات کو ان کے معیار پر قائم رکھنا کتنا دشوار ہے اس کا اندازہ آپ سے بہتر کون کر سکتا ہے۔ اگر اس میں مجھے ناکامی نہیں ہو رہی ہے تو یہ بھی بہت بڑی بات ہے آپ جیسے اہل نظر کی تصویب و تحسین حوصلہ بڑھاتی ہے۔ منتظر ہوں کہ جواب جلد ملے گا۔ فقط والسلام۔

آپ کا مخلص عامر عثمانی

مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے اسے مولانا کا کرم ہی سمجھئے اور ان کی بلند اخلاقی کہ وہ اپنے رفیق کو اس طرح نوازتے تھے۔

تفسیر ماجدی کا تبصرہ، تبصرے کے لٹریچر میں اپنی مثال آپ ہے کھنگال ڈالئے تبصرہ کا پورا لٹریچر، ایک تبصرہ ایسا نہ ملیگا سیکڑوں صفحات کی پوری تفسیر کو مولانا نے لفظ بلفظ پڑھا ہوگا جب تبصرہ لکھا ہوگا۔ ترجمے سے بھی اختلاف کیا ہے۔ مفہوم و مدعا اور تفسیر سے بھی اختلاف کیا ہے اور وجوہِ اختلاف میں مستند ترجموں اور تفسیروں کے حوالے دیئے ہیں، کون اندازہ کر سکتا ہے اس مغز پاشی اور جانکاہی کا؟ اور کون حق پسند کہہ سکتا ہے کہ مولانا نے تبصرہ کا حق ادا نہیں کیا۔

۲۵؍ اگست ۷۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"ایمان نمبر" مل گیا ہوگا۔۔۔۔۔ نہ ملا ہو تو مطلع کیجئے، پھر بھجواؤں۔ مل گیا ہوگا تو غالباً پڑھ بھی چکے ہوں گے۔ خدا جانے کیسا رہا۔ آپ کا تأثر معلوم کرنا چاہوں گا۔

جو کام آپ کر رہے ہیں اس کا اجر بھی اللہ ہی دے گا۔ افرادِ ملت تو عموماً جامد اور بےحس ہیں" آخر میں اس تشکر یہ کا جواب ہے جو غیر مسلموں میں اشاعت اسلام کی تحریک ہے جو اس سلسلہ میں مجھے مسلمانوں خصوصاً اصحاب استطاعت سے ہے جو آئے دن کے فسادات میں لٹتے ہیں، تباہ ہوتے ہیں اور مرتے ہیں لیکن غیر مسلموں کو اسلام کے محاسن و برکات سے آگاہ کر کے ان کے دلوں کو تعصب سے پاک کرنے کی فکر نہیں کرتے۔

نہ جانے کس دشمن کا مولانا پر قائم کردہ فوجداری کا مقدمہ ڈھائی سال سے چل رہا تھا۔

۱۹؍ ستمبر ۷۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

وکلاء نے کافی مایوس کن باتیں کہیں، مجبوراً خود وکیل بننا پڑا۔ یہ پورا مہینہ اسی نئے "فن" میں گزر رہا ہے۔ اللہ نے وہ فضل فرمایا کہ بازی الٹ گئی اور ۱۵ ستمبر کو مدعی خاسر و نامراد ہوا۔

بڑی دلچسپ روداد ہے، شاید مقدمہ نمبر نکالوں۔

جمع شدہ ڈاک سے آپ خود اندازہ فرمالیں کتنا وقت طلب کام ہے۔ اوسطاً پندرہ خط روز مسائل سے متعلق آتے ہیں۔ تین دن سے اسی انبار کو ہلکا کر رہا ہوں۔ نظم آپ کو پسند آئی محنت وصول ہوگئی۔ اچھی بری مجھے کچھ معلوم نہیں۔ کبھی اور چھاپ دی۔

اللہ اب تک تو میرے وقت میں بہت برکت عطا فرماتا رہا ہے۔ تفسیر ماجدی کی تازہ قسط دیکھئے گا۔ کچھ دنوں بعد میں خود پچھلے شمارے دیکھ کر سوچا کرتا ہوں کہ یہ سب کام کیسے ہوگیا۔ اللہ جس پر مہربان ہو اس کے لئے خیر و برکت کی کیا کمی ایک عاصی اور خاطی پر یہ نوازش اللہ اللہ۔ عامر عثمانی۔

میں اکثر مولانا کو لکھا کرتا تھا کہ آپ اتنے کام کیسے کرلیا کرتے ہیں۔ آخری سطروں میں اسی کا جواب ہے۔

۱۴ر دسمبر ۷۳ء کا خط بغور ملاحظہ کیجئے۔ کتنے اہم معلومات کا حامل ہے۔

برادرم سلام مسنون۔ والا نامہ ملا۔ شکرگزار ہوں آپ میرے لئے اتنا وقت نکال ہی لیتے ہیں۔ اس کی بھی داد دیتا ہوں کہ سخت مباحث کو چیٹ پٹ پڑھ ڈالتے ہیں۔ ناچیز کی تعریف میں جو اسالیب آپ اختیار فرماتے ہیں وہ بجائے خود انفرادی شان رکھتے ہیں۔ درد ہو تو ایسا ہو۔ آپ کو صاحب الرائے اور سخن فہم نہ سمجھتا تو یہی گمان کرتا کہ مذاق فرما رہے ہیں۔ بصورت موجودہ اس بدگمانی کی بھی جرأت نہیں کرسکتا۔ پھر اس کے سوا اور کیا کہوں کہ اللہ کا فضل خاص ہے۔ چند ہڈیوں کے مجموعہ میں اس نے جو چاہا رکھ دیا۔ بارہا تو وہ شاید الہام فرماتا ہے۔ آنکھیں بند کرکے سوچا کہ فلاں بات کہاں دیکھی جائے۔ اکثر کوئی خیال ذہن میں آوارد ہوا۔ اور اب جو اس خیال کا تتبع کرتا ہوں تو منزل مقصود مل جاتی ہے۔ بعض مرتبہ تو یہاں تک ہوا اور ہوتا ہے کہ مثلاً کوئی حدیث بخاری میں ہے، ڈھونڈھنی ہے۔ ہزار سے زائد صفحات کی دو جلدیں ہیں۔ بسم اللہ کرکے ایک جلد کھولی اور حیرت میں رہ گیا کہ بلا ارادہ جہاں سے کھلی تھی وہیں وہ مطلوبہ حدیث موجود۔ کبھی کچھ وقت الٹ پلٹ میں لگ گیا اور حدیث مل گئی۔ حالانکہ بخاری اس معاملہ میں منفرد ہے کہ عنوان حدیث سے اس کے ابواب کا تعین نہیں ہوسکتا۔ خدا مدد کرے تو ایک ہی حدیث کی تلاش پسینے لاسکتی ہے۔

بہرحال خدا کی خصوصی عنایات پر جی رہا ہوں۔ سر سے پاتک گنہگار مگر الطاف خسروانہ کا سزاوار۔ آپ تفسیر ماجدی کا تبصرہ بھی ضرور پڑھیں، یہ بھی محنت کے پسینے سے خالی نہ ملے گی۔ خود آپ کی رائے بھی جاننا چاہوں گا کہ میں انصاف کرسکا ہوں یا نہیں؟۔

سیرت طیبہ کے بالکل ابتدائی چند حصے الٹ پلٹ کر دیکھئے مجھے نہیں معلوم اس میں بھی وہ سب ہوگا جس کا آپ نے تذکرہ فرمایا ہے۔ رائے عالی صائب ہے میں تو بارہا تجلی میں لکھ چکا ہوں کہ عربی کتب خصوصاً احادیث و سیرت کی کتب کے اردو ترجمے عامۃ المسلمین کے لئے نفع سے زیادہ مضرت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ سیرت طیبہ کا ترجمہ مہتمم صاحب کے وہ صاحبزادے کر رہے ہیں جو اصطلاحاً مولوی بھی نہیں ہیں بلکہ محض زبان تک انہوں نے عربی سیکھی ہے اور انگریزی تعلیم یافتہ ہیں ان سے روشن فکری کی توقع تھی لیکن شاید وہ بھی اپنے ناموں کے دھارے میں بہہ گئے۔

آپ شاید یقین نہ کریں سرکار کا محکمہ اطلاعات و نشریات نہ جانے کب سے کچھ مضامین اور کتابیں لکھوانا چاہتا ہے میں نے جس قدر انکار لکھا ان کا اصرار بڑھا۔ ناول سائز کے سو صفحے کے ایک ہزار تک دینے کو آمادہ ہیں۔ موضوعات بھی میری دسترس سے باہر نہیں۔ سو صفحے کا حجم لے کر بیٹھوں تو دس دن میں یا زیادہ سے زیادہ پندرہ دن میں لکھ ڈالوں۔ لیکن تجلی کی ایڈیٹری، ڈاک نویسی اور الا بلا اس طرح دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے کہ آجتک ایک حرف لکھ کر نہیں دیا۔ حالانکہ آپ خود اندازہ فرمالیں کہ یہ سلسلہ میرے لئے مالی اعتبار سے کس قدر نفع بخش ہوسکتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مجھ سے میرے نظریات و افکار کے خلاف کسی تحریر کا مطالبہ نہیں گویا کام بھی مزاج کے مطابق۔ لیکن وہاں میری نالائقی لکھ بھیجا تھا کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی — مولوی

اشفاق حسین قاسمی مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند وغیرہ یہ کام مجھ سے کہیں بہتر طور پر کر سکیں گے اور معاوضہ بھی شاید کم لیں. لیکن محکمہ مذکور کو شاید کسی حکیم نے نسخے میں میرا ہی نام لکھ دیا ہے. اصرار چل رہا ہے. دراصل نائب ڈاکٹر مسلمان ہیں اور تجلی کہیں سے پڑھتے ہیں.....

فقط والسلام

آپ کا مخلص عامر عثمانی

خط کی ابتدار میں مولانا نے میری دادکے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ میں نے لکھا تھا کہ آپ اس کثرت سے ہر طرح کے تحقیقی مسائل، مباحث، تنقیدیں تبصرے، کتابوں کے حوالے کے ساتھ پوری تفصیل و مباحث سے کیسے لکھ لیتے ہیں. آپ انسانی صورت میں کوئی جن ہیں یا عہد رسالت یا عہد صحابہ کا کوئی جن عالم ہے جس کا تعاون آپ کو حاصل ہے.

محکمہ اطلاعات ونشریات جو مولانا کے پیچھے پڑا تھا اس کا مقصد میرے نزدیک مولانا پر دام تزویر ڈالنا تھا مولانا نے محکمہ کو جن بزرگوں کا نام لکھا تھا وہ حکومت کے لئے کچھ مضر نہیں ہیں. مولانا کا قلم "آغاز سخن" میں حکومت پر اس فنکارانہ انداز میں چرکے لگاتا تھا کہ حکومت تڑپ تڑپ جائے. لیکن مولانا کو گرفت میں نہ لے سکے. محکمہ نے اس سے بچنے کے لئے مولانا کے قلم کا سودا کرنا چاہا ہوگا لیکن مولانا کا جواب تھا

برو ایں دام بر مرغے دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

مولانا کے انہماک و مشغولیت اور ان کی زندگی کا یہ نقشہ دیکھئے. ۲۲ر نومبر ۱۹۷۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:-

کرم گستر. سلام مسنون.

اب تک تو ایسا نہیں ہوا کہ آپ کا عنایت نامہ آیا ہو اور میں نے جواب نہ دیا ہو. لیکن "بائیکاٹ" کا لفظ تو یہ بتاتا ہے کہ شکایت طول کھینچ گئی ہے. اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے مرسلہ کچھ خطوط ڈاک میں گم ہو گئے مجھ تک نہیں پہونچ سکے. یا پھر میرے جوابات آپ تک نہیں پہنچ سکے.

میری "زیارت" اچھا ہوا آپ نے نہیں کی. زیارت کرنے والے عموماً مایوس ہوتے ہیں. قلم انھیں یقین دلاتا ہے کہ کسی پہلوان قسم کے سجیلے نوجوان سے ملاقات ہوگی مگر مٹھی بھر ہڈیوں کا مجموعہ دیکھ کر وہ بجھ جاتے ہیں، ہائیں یہ ہے ایڈیٹر تجلی، عمر تو اتنی زیادہ نہیں لیکن لاتعداد ہی مغز پاشیوں نے بڑے میاں بنا دیا ہے. غذا ڈیڑھ روٹی. زیادہ قلم چلانا ہو تو وہ بھی غائب. غذا کی حد تک فقر اختیاری میں مبتلا ہوں عادت اب قبر میں جا کر ہی رہے گی.

اللہ جنت کی روحانی غذاؤں سے ضیافت فرمائے قبر میں غذا کا کیا سوال؟

اتنے تعلقات کے باوجود کبھی مولانا سے ملاقات نہ ہو سکی. قارئین یہ نہ سمجھیں کہ میں مولانا کی تحسین و ستائش ہی کرتا رہا اور وہ مجھے قدر دانیوں سے نوازتے ہی رہے جماعت اسلامی کے ۱۹۵۵ء کے کل ہند اجتماع دہلی میں مجھے شرکت کی سعادت حاصل ہوئی تھی. مولانا نے بھی اپنا مکتبہ لگایا تھا. اس زمانے میں محمود احمد عباسی کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کی بنا پر مولانا سے میرا سخت اختلاف ہو گیا تھا. مولانا اس کی حمایت کر رہے تھے اور میں اس کی تردید کر رہا تھا. لوگوں نے مولانا سے میری ملاقات کرانی چاہی تو میں نے انکار کر دیا. ان کا مکتبہ بھی گیٹ سے دور پنڈال کے کنارے تھا. برسرِ راہ بھی سامنا نہ ہوا. لیکن جماعت اسلامی کے تعلق نے بلا کسی واسطے کے ہم کو پھر ایک کر دیا. مولانا کی یہ حق پسندی بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انھوں نے خلافت معاویہ و یزید سے متعلق اپنے نقطۂ نظر سے بالاعلان رجوع فرما لیا. میلاد و قیام کے سلسلہ میں سخت اختلاف واقع ہو گیا تھا، خاصی جنگ رہی.

اس بار انتہائی ضعف و نقاہت کے باعث اجتماع دہلی میں شریک نہ ہو سکا. جب معلوم ہوا کہ مولانا نے اجتماع میں شرکت کی تھی تو میں نے لکھا تھا کہ اجتماع میں شریک ہوا ہوتا تو آپ کی زیارت ہو جاتی. حقیقت ہے کہ مولانا کی

زیارت کی حسرت ہی رہ گئی۔ تاثرات دریافت فرماتے ہی رہتے تھے۔

۲۸ اپریل ۱۹۷۳ء کے خط میں ہے۔

ذوالمناقب ۔ سلام و رحمت

عنایت نامہ ملا . . . . ۔ آپ کے اشعار غضب کے ہیں زیرِ طبع شمارے میں عزیزی اشعر کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ آرہا ہے۔ یہ شمارہ کئی اعتبار سے اہم ہے۔ ملاحظہ فرماکر تاثرات سے آگاہ کیجئے گا۔ سورۂ ممتحنہ انشاء اللہ تجلی کی ڈاک میں لکھوں گا۔

شمس نوید کے تبصرے پر آپ کا تأثر برحق ہے۔ کیا کروں اسی وجہ سے تو سارا پرچہ خود لکھتا ہوں۔ انگریزی کتابوں کی مجبوری ہے ورنہ ایسے تبصرے مجھے بھی پسند نہیں جنھیں پڑھ کر درد سر پیدا ہو۔

یاد نہیں سورۂ ممتحنہ کے بارے میں کیا دریافت کیا تھا تجلی میں جواب نہیں آیا۔

۵ دسمبر ۱۹۷۳ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

بندہ پرور ۔ رحمکم اللہ۔

آپ کا خط پڑھا تو حرف حرف لیا۔ مگر شاید یہ آپ بھی نہ چاہیں گے کہ میں اتنا ہی لمبا جواب لکھوں۔ آپ جس پیرائے میں داد دیتے ہیں وہ بجائے خود قابلِ داد ہے۔ یہاں اکثر لوگوں کو تعجب ہے کہ عامر لکھتا کب ہے۔ وہ مجھے بعد عصر اور بعد عشاء بلا ناغہ گشت کرتے دیکھتے ہیں۔ دوپہر کو سونے کا بھی عادی پاتے ہیں۔ مجلس احباب سے بھی گریزاں نہیں دیکھتے پھر آخر اتنا کب لکھا جاتا ہے۔ یہ سوال کبھی کبھی تو مجھے بھی جواب طلب ہوجاتا ہے۔ عادت یہ ہے کہ صبح اذان فجر سے بھی کچھ قبل اٹھتا ہوں اور نماز و ناشتہ کا وقت منہا کرکے گیارہ بجے تک لکھتا ہوں۔ اسی میں ضروری مطالعہ کا وقت بھی شامل ہے بس اسی وقت میں اللہ نے برکت دے رکھی ہے کہ مجھے خود بھی کبھی کبھی اچنبھا سا ہوتا ہے۔ بوالفضولی مزاج میں اتنی ہے کہ تجلی میں جو آپ ڈیزائن وغیرہ دیکھتے ہیں وہ بھی بناڈالتا ہوں

یہ سب کام اور ڈاک کے نجی جوابات تقریباً پانچ فتوے روز کا اوسط ہے۔ شعر بھی کہہ لیتا ہوں۔ خدا کا خاص انعام ہے کہ کمر اور سر نہیں دکھتے۔ خواہ دس گھنٹے مسلسل بیٹھا لکھتا پڑھتا رہوں۔ رفتارِ مطالعہ یہ ہے کہ ناول سائز کے سو صفحے ۴۵ منٹ میں ختم ہوجاتے ہیں۔ عربی کا مطول صفحہ پہلے دس منٹ لیتا تھا اب چھ منٹ لیتے ہیں۔ ضخیم سے ضخیم کتاب کھولتا ہوں تو عموماً وہیں سے کھل جاتی ہے جہاں میرے کام کی چیز ہے۔ یہ سب خصوصی فضلِ خداوندی نہیں تو کیا ہے مجھے اس لئے یہ امید بندھ گئی ہے کہ اللہ کے یہاں تجلی کی کوئی نہ کوئی مدت ضرور مقبول ہوئی ہے ورنہ سچ جانئے زمانۂ تعلیم تو بس کھیل کود میں گذرا تھا۔ آج وہ اساتذہ جو کل تک حقارت سے دیکھتے تھے بیٹھے سے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ راہ میں ملیں تو معانقے تک سے گریز نہیں کرتے۔ میں حاضر مجلس ہوں تو کوئی ایسا موضوع نہیں چھیڑتے جس میں میرے اختلافی نقطۂ نظر کا انھیں علم ہے سنتے میری زیادہ ہیں اپنی بہت کم کہتے ہیں۔ میں عربی جاننے کی طرح نہیں جانتا۔ ز زبول نہیں سکتا۔ اس میں مضمون نہیں لکھ سکتا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ بعض مجلسوں میں بعض کتابوں کی ادق ترین عبارتوں کا مفہوم اللہ نے مجھ پر اس طرح القا کر دیا ہے کہ اربابِ فضل اور مدعیانِ علم مبہوت رہ گئے ہیں۔ یہ تحدیثِ نعمت ہے۔ خود ستائی عجیب پندار؛ تعلّی۔ ان جذبوں کا ان میں مطلق شائبہ نہیں ہے۔ ایک قطعہ سنئے :۔

نظر کی جوت بجھ گئی شعورِ دید مٹ گیا
وہاں ہوں میں جہاں کہیں زمین آسماں نہیں
ہجومِ بیخودی بتا یہ ہجر ہے کہ وصل ہے
وہ اتنے پاس آگئے کہ بیچ بھی درمیاں نہیں

ضروری نہیں کہ آپ کو پسند آئے۔ مگر رات کو ایک خاص کیفیت نے کہلوایا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وحدۃ الوجود مسئلہ ایسی ہی کسی کیفیت کے بطن سے نکلا ہو۔

آپ بھی کیا کہیں گے کہ آج عامر پر کیا دورہ پڑگیا، کیا بکواس جاری کردی۔ بس محترم موڈ کی بات ہے۔ آپ کو دور نہیں نظروں کے سامنے پاتا ہوں " آپ کا دعا گو عامر عثمانی

کیوں قارئین! کیا ایسے رفیق و مشفق کی جدائی کا غم مجھے نہ ہوگا
اور میں اسے بھلا سکوں گا؟

ظاہر ہے کہ قطعہ ایک عالم کیف میں کہا گیا ہے۔ اس پر منطقی گفتگو کیا کی جا سکتی ہے۔ میں نے چوتھے مصرعے کے متعلق مولانا کو لکھا کہ کوئی انسان یا کوئی شئے دو چیزوں کے درمیان ہوتی ہے۔ "وہ" اور "میں" دو ہی ہیں اور "وہ" کے پاس آنے سے "میں" باقی نہیں رہا تو درمیان کہاں باقی رہا۔ وہ ہی وہ باقی رہ گیا۔ مولانا نے اس کا جواب نہیں دیا۔ تجلی میں بھی یہ قطعہ شائع ہوا۔ یہ میں ہی نہیں مولانا کا کلام پڑھنے والا ہر سخن فہم تسلیم کرے گا کہ وہ جیسے محقق اور نقاد تھے ویسے ہی بلند پایہ ادیب اور شاعر بھی تھے اور غالباً نثر کی طرح بے ساختہ شعر بھی لکھتے تھے۔ قطعہ بہر کیف کیف آور ہے۔ روحِ انسانی کا اللہ تعالیٰ کا جو خصوصی تعلق ہے اس کے اثر سے انسان پر کبھی کبھی ایسی کیفیت طاری ہوجایا کرتی ہے۔

۱۴ر دسمبر ۷۳ء کا ایک خط اوپر نقل ہوا ہے اسی کے آخر میں ازراہ فکاہت لکھا ہے:۔

"ملاّ سے آپ شاید ناراض ہیں۔ ہے بھی اسی قابل۔ کبھی اس نالائق کو بھی کوئی نیک مشورہ دیجئے۔ میں تو اس سے کلام نہیں کرنا چاہتا"۔

مطلب ہے "مسجد سے میخانے تک" کے متعلق میری ناچیز رائے معلوم کرنا۔ میں نے سوال ہی کے اسلوب میں جواب لکھدیا۔ جی ہاں، میں ملاّ سے ناراض ہوں، وہ زبردستی اپنے کو پڑھواتا اور میرا وقت برباد کرتا ہے"۔

۲۶ مارچ ۷۴ء کا خط۔

محترم بھائی۔ سلام مسنون!

والا نامہ ملا۔ تین روز سے صاحب فراش ہوں۔ بخار وغیرہ زیر ترتیب پرچہ۔ پھر "نقد و نظر نمبر" منعقد و معرکے ہیں ایک معرکہ مسئلہ طلاق بھی ہے۔ "زندگی" کے طلاق نمبر پر ابھی تنقید تو نہیں کی صرف کچھ مثالیں مقالات میں سے اس کی دی ہیں کہ مقالہ نگار حضرات بے لوث اور بے لاگ تحقیق حق کے بجائے فقط رجحان و میلان اور پہلے سے قائم کردہ رائے کی وکالت میں لگے ہوئے ہیں۔ اس مثال بازی ہی میں تجلی کے تقریباً بیس صفحے سیاہ ہوجائیں گے۔ تنقید بعد میں آئے گی....

مجھے اور ملاّ کو آپ نے قطعی طور پر ایک ہی بنا دیا۔ یہ تو رجماً بالغیب والا مضمون ہے۔ میں اس نالائق سے عاجز ہوں۔ قارئین بھی عاجز ہوتے تو مکان سے باہر کرتا۔ آپ جیسا ثقہ آدمی ایک ہی نشست میں اسے پورا پڑھ ڈالے تو بتلایئے کیسے نکالوں۔ بہرحال اس گدھے کی وجہ سے ہزاروں ایسے جدید تعلیم یافتہ قاری تجلی سے لپٹے ہوئے ہیں جو عام حالات میں مولویوں کے پرچوں کو ہاتھ نہیں لگاتے....

آپ کا مخلص عامر عثمانی۔

میں نے تعجب سے لکھا تھا کہ جو دماغ تفسیر ماجدی کی تنقید لکھتا ہے اور ایسے ہی دوسرے اوراق و مباحث اور فتوے وہ دماغ مسجد سے میخانے تک میں کیسے ڈھل جاتا ہے اور قضا و کردار کو اس کامیابی کے ساتھ ادا کرتا کہ ایک کا دوسرے پر ہلکے سے ہلکا عکس نظر نہ آئے اور وہ بھی دو چار تحریروں اور دس بیس صفحوں میں نہیں برسوں تک کے لکھے ہوئے سیکڑوں صفحات میں، یہ معمولی کمال نہیں ہے اور کبھی کبھی یہ بھی لکھا کرتا تھا کہ تجلی جیسے ممتاز اور بلند مرتبہ دینی رسالے میں "مسجد سے میخانے تک" زیب نہیں دیتا یہ خط انھیں باتوں کا جواب ہے۔ میری طرح کتنے لوگ مسجد سے میخانے تک کے بارے میں سوچتے ہوں گے۔ اس خط سے ایک بڑا مسئلہ صاف ہوگیا۔ پھر یہ بھی نہیں کہ مسجد سے میخانے تک محض تفریحی ہوتا تھا۔ نہایت مؤثر اصلاحی اور اخلاقی بھی ہوتا تھا۔ مصنوعی پیروں اور صوفیوں، ان کی زیب کاریوں اور بد اخلاقیوں، عرسوں، قوالیوں، نذر و نیاز، درگاہوں، منتوں، نذر و نیاز وغیرہ کی مولانا جس اسلوب و انداز میں قلعی کھولا کرتے اور دھجیاں اڑایا کرتے وہ سنجیدہ اصلاحی مضامین سے کہیں زیادہ مؤثر ہوتا تھا اس طرح جماعت اسلامی کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والوں اور غلط فہمی و بدگمانی میں مبتلا طبقے پر بھی مزاح مزاح میں ہی بھرپور ضرب لگاتے تھے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تأمل

نہیں کہ اس صف میں بھی مولانا عامر عثمانی رہ منفرد تھے۔

مسئلہ طلاق کی بحث و تنقید مولانا عامر عثمانی رہ کی آخری کامیاب جنگ تھی۔ ایک تنہا مولانا عامر عثمانیؒ تھے اور دوسری جانب علماء کا ایک گروہ تھا۔ میں نے حیرت و استعجاب سے دیکھا کہ جو حضرات حنفی مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور جن کو میں حنفی مذہب کا محقق، حامی و مؤید اور وکیل سمجھتا تھا وہ بھی بقول عثمانی بے لوث اور بے لاگ تحقیق کے بجائے فقط اپنے ذاتی رجحان و میلان اور پہلے سے قائم کردہ رائے کے دھارے میں بہتے نظر آئے بعض حضرات نے تو مولانا کے جواب میں خاموش رہ کر ہی اپنی بھرم رکھی گویا مولانا نے ناقابل التفات بکواس کی ہے اور جن حضرات نے جواب دیا ان کے جواب کا بھی وہی انجام ہوا جو ان کے مقالے کا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں میری آنکھوں نے یہ عبرتناک اور حیرت انگیز منظر بھی دیکھا کہ ایک موقر ماہنامے کے مدیر شہیر نے بذریعہ ڈاک مولانا عثمانی رہ کو اپنا جواب بھیجا تھا اور اس کے نصف کا مولانا نے تجلی میں رد شائع کر دیا تھا اس کے بعد جب وہ ماہنامہ آیا تو مدیر ممدوح کا مضمون اس میں موجود ہے۔ تجلی کی بعد کی اشاعت میں مولانا عثمانی نے باقی مضمون کا بھی رد شائع کر دیا۔ اس سے عجیب تماشا اور بھی دیکھنے میں آیا۔ میں بالکل سمجھ نہ سکا کہ یہ علمی حق پسندی کی کون سی قسم ہے۔

مسئلہ طلاق کے متعلق جہاں تک میرے احساس و تأثر کا سوال ہے مردوں کے ہاتھ طلاق کا مطلق اختیار عورتوں کے خلاف بے پناہ ہتھیار ہے۔ طلاق کے شرعی احکام سے غافل اور بے پرواہ مرد جوش میں آکر پھٹا پھٹ تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں اور جب گرہستی برباد ہونے لگتی ہے تو چاہتے ہیں کہ کسی طرح پھر مطلقہ کو رکھ لیں۔ اور پھر رکھ بھی لیتے ہیں۔ مطلقہ کا مصنوعی نکاح و طلاق بھی اسے دوبارہ رکھ لینے کا ایک حیلہ ہے۔

طلاق کے تین اور ایک ہی کا مسئلہ نہیں ہے اور مسائل بھی ہیں۔ سسرال میں عورتوں کی بدسلوکی ہوتی رہتی ہے عورتیں بولتی ہیں تو اور ستائی جاتی ہیں۔ میکے والے بھی اس اندیشے سے نہیں بولتے کہ شوہر میاں نے اپنے جابرانہ اختیار کا استعمال کر ڈالا تو کیا ہوگا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر بیوی کو ستاتا ہے بیوی طلاق چاہتی بھی ہے تو طلاق بھی نہیں دیتا۔ ہر جگہ ایسا نظام بھی نہیں ہے جہاں عورتیں یا ان کے ورثاء استغاثہ پیش کریں۔ بعض بیوی کو میکے میں چھوڑ دیتے ہیں۔ نہ لے جاتے ہیں نہ طلاق دیتے ہیں۔ یہ سب پرسنل لا سے متعلق مسائل ہیں۔ پرسنل لا کی تبدیلی کے خلاف ہنگامہ آرائی کافی نہیں ہے۔ علماء کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہئے اور ان سب کا حل نکالنا چاہئے۔

میرا مقصد جناب مولانا عامر عثمانی علیہ الرحمۃ کی بھی زندگی کے اہم ترین مخفی گوشوں کو منظر عام پر لانا تھا میں نے انھیں پیش کر دیا ہے۔

سلسلۂ کلام میں ازدواجی مسائل سے متعلق چند کلمات زبان قلم پر آگئے۔ تازہ ڈاک سے برادر عزیز عمر فاروق عثمانی کا مطبوعہ خط آیا ہے۔ محترمہ بیگم صاحبہ نے عزاداروں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ یہ دیکھ کر سینے میں ایک ہوک اٹھی اور آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

فاروق میاں نے تجلی کے جاری رکھنے کی خبر دی ہے اللہ تعالیٰ بیگم صاحبہ اور فاروق میاں کا حامی و ناصر ہو اور مولانا کی یادگار تجلی کامیابی سے جاری رہے۔ میں تجلی کے قارئین سے استدعا کروں گا کہ وہ تجلی سے پورا تعاون کریں۔

تجلی کے ۱۴ خاص نمبر

پچھلے کئی شماروں میں ہم نے کچھ خاص نمبروں کا اشتہار دیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اشتہار کارگر ثابت ہوا، اچھی خاصی تعداد میں ہمیں آرڈر موصول ہوئے۔ پروگرام یہ بنایا گیا ہے کہ تجلی کے دو فائل رکھنے کے بعد تمام عام و خاص شمارے فروخت کر دیے جائیں۔
ایک بار ہم پھر ناظرین سے یہ گزارش کریں گے کہ ہنوز یہ نمبر دستیاب ہو سکتے ہیں لیکن عین ممکن ہے کہ کل یہ نمبر عنقا اور نایاب ہو جائیں اور آپ کی پرائیویٹ الماری تجلی کے اُن اہم نمبروں سے محروم رہ جائے جو اپنی مثال آپ ہیں۔

خلافت و ملوکیت نمبر (تین حصوں میں)	قیمت:- پانچ روپے پچاس پیسے ۵/۵۰
سالنامہ سن ۷۱ء	قیمت:- چھ روپے ۶/
طلاق نمبر	قیمت:- پانچ روپے ۵/
نظریۂ ارتقا نمبر	قیمت:- دو روپے پچاس پیسے ۲/۵۰
ایمان نمبر	قیمت:- تین روپے ۳/
تنقید نمبر	قیمت:- دو روپے پچاس پیسے ۲/۵۰
نقد و نظر نمبر	قیمت:- چار روپے ۴/
خاص نمبر سن ۶۹ء	قیمت:- چار روپے پچیس پیسے ۴/۲۵
خاص نمبر سن ۶۳ء	قیمت:- ایک روپیہ پچاس پیسے ۱/۵۰
مسلم پرسنل لا نمبر	قیمت:- دو روپے ۲/۰
ڈاک نمبر سن ۶۳ء	قیمت:- ایک روپیہ پچیس پیسے ۱/۲۵
ڈاک نمبر سن ۷۲ء	قیمت دو روپے ۲/۰
ڈاک نمبر سن ۷۳ء	قیمت:- دو روپے ۲/۰
ڈاک نمبر سن ۷۴ء	قیمت:- تین روپے ۳/۰

یہ تمام نمبر ایک ساتھ منگانے میں آپ کو فائدہ رہے گا، اس لئے کہ ایک ساتھ منگانے کی صورت میں آپ کو صرف ۲۸ روپے ادا کرنے ہوں گے جبکہ ان کی مجموعی قیمت ۴۴ روپے ۵۰ پیسے ہوتی ہے۔ ڈاک خرچ آپ کے ذمہ رہے گا۔

منیجر:- مکتبہ تجلی دیوبند (یوپی)

عرفان خلیلی

مولانا عامر عثمانی ایک نظر میں

مولانا عامر عثمانی رحمتہ اللہ علیہ آج ہم میں نہیں ہیں۔ کل تک وہ ہماری محفلوں کو باغ و بہار بنائے ہوئے تھے۔ ہماری نجی صحبتیں ان کے دم سے قہقہہ زار بنی ہوئی تھیں اور آج ——

افسوس —— صد افسوس —— وہ ہم سے دور —— بہت دور چلے گئے ہیں۔ جہاں سے اب وہ کبھی واپس نہ آئیں گے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

ادبی ذوق رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا صرف عالم ہی نہ تھے۔ بلکہ بیک وقت وہ ایک بلند پایہ ادیب ایک قادر الکلام شاعر اور کامیاب طنز نگار بھی تھے۔ جس مسئلہ پر قلم اٹھاتے اس کا پورا پورا حق ادا کر دیتے گتھیاں سلجھانا اور مسائل کی تحقیق کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میدانِ ادب کے وہ مایہ ناز سپاہی تھے اسی مناسبت سے وہ اپنے فاؤنٹین پین کو اپنا "ہتھیار" کہا کرتے تھے۔ بہرحال اس مقالہ میں ان کی ادبی خدمات کے بارے میں کچھ لکھنا میرے مدِ نظر نہیں ہے کیونکہ اس پر لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور انشاء اللہ بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا۔ میں آپکی زندگی کے اس پہلو کو سامنے لانا چاہتا ہوں جو آج تک ہماری نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ ان کی سیرت کا یہی پہلو میرے نزدیک زیادہ اہم ہے۔ اور ہمارے لئے ایک اچھا نمونہ بھی ہے۔

مولانا ایک کثیر الاشاعت ماہنامہ کے مالک اور ایڈیٹر تھے۔ وہ ایک بڑا مکتبہ بھی چلا رہے تھے۔ جن سے تقریباً دو ڈھائی ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہو جاتی تھی۔ لیکن یہ وافر آمدنی ان کی سادہ زندگی اور میانہ روی پر کبھی اثر انداز نہ ہو سکی نہ بینک بیلنس میں اضافہ ہوا، نہ جائدادیں خریدی گئیں اور نہ کوٹھیاں ہی تعمیر ہوئیں۔ جس آبائی مکان میں وہ شروع سے رہتے چلے آئے تھے آخر دم تک اسی میں رہتے رہے اور جس نہج پر زندگی بسر ہو رہی تھی آخر دم تک وہی معیارِ زندگی قائم رہا۔

پھر آخر یہ آمدنی کہاں جاتی تھی —— ؟ یہ سوال ضرور غور طلب ہے اور خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ یہی سوال میری اس تحریر کا محرک بنا ہے۔ ہم آپ سب جانتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ دل کھول کر دے تو پھر اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر فراخ دلی کے ساتھ خرچ کرنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ شرعاً اس کی اجازت بھی ہے لیکن جس طرح کسی کی زیادتی پر بدلہ لینے کی اجازت ہونے کے باوجود معاف کر دینے میں جو روحانی خوشی، معاشرتی یگانگت اور اُخروی درجات کی بلندی حاصل ہوتی ہے، وہ بدلہ لینے سے کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح میانہ روی کے ساتھ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ذات پر خرچ کرنے کے بعد باقی رقم میں سے ضرورتمندوں اور غیر مستطیع حضرات کا حق نکال دینے میں جو قلبی سکون، دائمی مسرت اور آخرت کی فلاح حاصل ہوتی ہے، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مولانا احادیث کی روشنی میں اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کا مال صرف وہی ہے جسے وہ اپنی

زندگی میں خرچ کرلیں۔ آنکھیں بند ہونے کے بعد پس انداز کی ہوئی رقم ان کی نہیں کہلائے گی۔ اسی لئے آپ بینک بیلنس کے بھی قائل نہ تھے اور نہ خرچ کا کوئی حساب کتاب ہی رکھتے تھے۔

اس سلسلے میں چند واقعات نیچے درج کئے جارہے ہیں جن سے بخوبی اندازہ ہوجائیگا کہ مولانا اپنی بچی ہوئی رقم سے کتنی نفع بخش تجارت کررہے تھے۔ جس سے ہم لوگ اب تک بے خبر تھے۔

ایک دفعہ حساب کی جانچ پڑتال کے لئے انکم ٹیکس انسپکٹر آیا۔ مولانا نے بڑی آؤ بھگت سے اسے بٹھایا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے پہلا سوال یہ کیا:۔

"مولانا صاحب! اس کاروبار سے کتنی آمدنی ہوجاتی ہے؟"

"میری ضرورت سے بہت زیادہ" مولانا بے ساختہ جواب دیا۔

اس نے جب آمد و خرچ کا کھاتہ طلب کیا۔ تو مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"میں خرچ کا حساب کتاب نہیں رکھتا۔ رقمیں آتی رہتی ہیں اور میں خرچ کرتا رہتا ہوں"

"اگر میں اندازہ سے انکم ٹیکس لگادوں تب تو آپ کو کھاتہ پیش کرنا ہی ہوگا" انسپکٹر نے یہ سمجھتے ہوئے کہ مولانا کھاتہ دکھانا نہیں چاہتے۔ یہ سوال کردیا۔

مولانا نے عادت کے مطابق ایک قہقہہ لگایا اور فرمانے لگے:۔

"جتنا آپ کا دل چاہے ٹیکس لگادیں۔ پھر بھی میں کوئی حساب کتاب پیش نہ کرسکوں گا"

"آخر ایسا کیوں؟" انسپکٹر نے زچ ہوتے ہوئے آخری سوال کیا

"...! جب میرا رب مجھے بے حساب دیتا ہے۔"

مولانا کی آنکھوں میں ... ... آگئی۔

"... گن گن کر یا گھر بیٹھ کر خرچ کرنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا"

یہ تھی شانِ عبودیت!

مہینے کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔ مولانا دفتر میں بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں محلے کا بنیا سلام کرتا ہوا کمرہ میں داخل ہوا

مولانا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بولے "آؤ بھئی لالہ بیٹھو!"

لالہ جی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

"کیا پچھلے مہینے کا حساب لے آئے؟" مولانا نے دریافت کیا۔

"جی ہاں — آٹھ سو روپے کا بل ہے" لالہ نے مولانا کے سامنے بل رکھتے ہوئے جواب دیا۔

مولانا نے ایک اچٹتی سی نظر بل پر ڈالی اور رقم نکال کر لالہ جی کے حوالے کردی۔

کیا یہ مولانا کے گھر کے مصارف تھے؟ نہیں — ایسا نہیں ہے۔ انتقال کے بعد پتہ چلا کہ چند گھرانوں کی کفالت کی ذمہ داری مولانا نے اپنے سر لے رکھی تھی اور لالہ کو ہدایت تھی کہ ان گھرانوں میں جتنی بھی جنس کی ضرورت ہو دیدیا کریں۔ اور اس کی رقم مولانا کے حساب میں چڑھادیا کریں۔

اب ذرا غور فرمائیے کہ مولانا کی غیر موجودگی سے ان گھرانوں پر کیا بیت رہی ہوگی۔

اسی طرح —

ایک دن ٹہلتے ہوئے مولانا اپنے خاندانی معالج کے مطب میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب قرضداروں کے بل بنا رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد مولانا نے بے تکلفانہ انداز میں دریافت کیا۔

"امیں، یار کیا کر رہے ہو؟"

"بل بنا رہا ہوں" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

"بقایا بہت ہوگیا ہے۔ لوگ اس طرف توجہ نہیں کرتے"

"کیا کروگے بل بنا کے" مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ ساری رقم ڈوب جانے دوں؟" ڈاکٹر صاحب نے مولانا کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کل بقایا کا ٹوٹل کردو" مولانا کے لہجہ میں سنجیدگی آگئی تھی۔

"کون دیدیگا اتنی رقم" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"ارے بھئی ٹوٹل تو کردو"

مولانا کے اصرار پر ڈاکٹر صاحب نے ٹوٹل کردیا۔ کئی سو رقم

نکلی۔ مولانا نے جیب سے سو سو کے نوٹ نکالے اور ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو۔ حساب بے باق کردو۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ آہستہ آہستہ وصول ہو ہی جائے گی۔" ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ کھینچتے ہوئے جواب دیا۔

"اگر دو بیچارے دینے کی پوزیشن میں ہوتے تو ادھار کیوں کرتے پھر کتنے دن کیوں گذرتے۔" مولانا کے لہجہ میں دکھ اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات نمایاں تھے۔

آپ کی خوشی۔" ڈاکٹر صاحب نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔

لیکن دیکھئے۔" مولانا صاحب ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہوئے:۔

"اس کا ذکر کسی کے سامنے نہ آئے۔"

دیکھا آپ نے! یوں خرچ ہوتی تھی وہ رقم۔

لڑکی کی شادی سے فارغ ہونے کے بعد ایک روز مولانا اپنے داماد سے مخاطب ہوئے۔

"دیکھو بھئی! اس بات کا اپنے دل میں کوئی خیال نہ کرنا کہ میں نے شادی بہت سادے انداز میں کی ہے۔ اور جہیز بھی جتنا میں اپنی حیثیت کے مطابق دے سکتا تھا، اس سے کم ہی دیا ہے۔"

ان کے داماد سعادت مندانہ سر جھکائے بیٹھے سنتے رہے۔

"میں اس سے بہت زیادہ جہیز دے سکتا تھا۔"

مولانا نے پھر سمجھانا شروع کیا۔

"لیکن میرے گرد و پیش بہت سے ایسے رشتہ دار ہیں جو تنگی و ترشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ جب جہیز کی بھرمار اور ٹھاٹ باٹ دیکھتے تو ان کے دلوں کو اذیت پہنچتی کہ کاش وہ بھی اس حال میں ہوتے کہ اپنی لڑکیوں کو اتنا جہیز دے سکتے۔"

مولانا سانس لینے کے لئے رکے اور پھر کہنا شروع کیا۔

"اور پھر یہ دور کچھ ابھی نہیں ہے کہ ایک طرف تو میں جہیز کی لعنت کے خلاف صفحات کے صفحات

سیاہ کرتا رہوں اور خود اپنا عمل اس کے خلاف ہو۔"

ماہنامہ تجلی کی کتابت جو کاتب صاحب کرتے تھے اتفاق سے وہ علیل ہوگئے۔ اور علالت نے اتنا طول کھینچا کہ وہ چلنے پھرنے اور کام کرنے کے بھی قابل نہ رہے۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر مولانا بہت متاثر ہوئے اور جتنے روپے ماہانہ وہ تجلی کی کتابت سے کمایا کرتے تھے۔ اسی کے بقدر مولانا نے ان کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ جس سے ان کی گذر بسر ہوتی رہی۔

اپنی علالت سے قبل ایک دفعہ مولانا کاتب صاحب کو ان کا وظیفہ دینے کے لئے ان کے مکان پر تشریف لے گئے کاتب صاحب نے وہ رقم لیتے ہوئے مولانا سے کہا:۔

"مولانا صاحب! یہ رقم لیتے ہوئے مجھے اب تکلف معلوم ہوتا ہے۔ اسے بند فرما دیجئے۔"

"آخر اس میں تکلف کا کیا سوال؟" مولانا نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"جب میں کتابت نہیں کر رہا ہوں تو اس رقم کی کیا ضرورت۔" کاتب صاحب نے مایوسانہ انداز میں جواب دیا۔

"واہ بھئی واہ! یہ خوب کہی۔" مولانا نے مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"جب تک آپ کام کرنے کے لائق رہے ہم آپ سے کام لیتے رہے۔ اور اب جب آپ کام کرنے کے قابل نہ رہے تو ہم آپ کو نظر انداز کر دیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"یہ ایک دو دن کی بات نہیں ہے۔ آخر کب تک آپ یہ بار اٹھاتے رہیں گے۔" کاتب صاحب نے درد بھرے انداز میں سوال کیا۔

"جب تک میرا رب مجھے دیتا رہے گا، میں آپ کا حق آپ کو پہنچاتا رہوں گا۔" مولانا کی آنکھوں میں چمک تھی۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عیدین کے موقع پر مولانا ان کے متعلقین کے کپڑے بھی بنوا دیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ آخری دم تک جاری رہا۔ اور شاید کسی کو اس کی خبر نہ ہو سکی۔

مولانا پر جب دل کا دورہ پڑا تب اندازہ ہوا کہ عیادت کرنے والوں میں رشتہ داروں کے علاوہ زیادہ تعداد ان مفلوک الحال اور معذور انسانوں کی تھی جن میں سے بعض لاٹھی ٹیکتے ہوئے اور بعض دوسروں کا سہارا لئے ہوئے آئے تھے۔ اور مولانا کو زندگی و موت کی درمیانی حالت میں دیکھ کر تڑپ اٹھے تھے۔ ان کے دلوں کی کیفیت کا صحیح اندازہ ان کی نمناک آنکھوں، دلدوز آہوں اور گڑگڑا گڑگڑا کر مانگی جانے والی دعاؤں سے کیا جاسکتا ہے۔ دنیا میں نہ جانے کتنے مرتے رہتے ہیں، خود ان کے رشتہ دار بھی تو اس دنیا سے رخصت ہوئے ہوں گے۔

پھر آخر مولانا کے ساتھ یہ خصوصیت کیوں تھی۔

مولانا کی جدائی کا تصور انھیں کیوں اتنا بے تاب کئے ہوئے تھا۔ کوئی تو خاص بات تھی جس نے انھیں اتنا بے چین کیا تھا کاش یہ راز ہماری سمجھ میں آجائے اور اسے ہم اپنا لائحۂ عمل بنالیں۔

مولانا کی زندگی کی یہی وہ چند جھلکیاں تھیں جو میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ کاش ہم ان سے کچھ حاصل کرسکیں۔

آخر میں مولانا کے اس قطعہ پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں جسے وہ اپنے آخری ایام میں پڑھ پڑھ کر زار و قطار رویا کرتے تھے۔

نہ زہد و تقویٰ نے یاوری کی، نہ [illegible] کام آیا
حساب کے دن یہ سب عبادت حساب کی مزبوں [illegible]
ہمارے دامن میں وہ تو کچھ کر تھے ندامت کے چند آنسو
کسی نے ان کو قبول کرکے، ہماری فردِ عمل جلادی

اثر:- لالہ صحرائی

شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا

سالوں پہلے کی بات ہے، ایک محب گرامی کے ہاں اردو کا ایک اجنبی رسالہ دیکھنے کا اتفاق ہوا سادہ بلکہ سپاٹ سرورق جس پر ایک بھاری بھرکم روشن دیا۔ دیئے کی بے ڈھنگی دھوئیں کی مانند بل کھاتی ہوئی داہنی جانب ایک بڑے رنگین دائرے میں جلی قلم سے رسالہ کا نام لکھا تھا۔ نام کے نیچے بطور وضاحت تحریر تھا: "تاریکیوں میں ایک چراغ"۔ میں نے جماہی لے کر سرورق الٹا، تو پہلے صفحہ پر کئی آڑے ترچھے چوکھٹے نظر آئے جن کی وضع قطع کو بڑے اہتمام کے ساتھ آرٹ اور اقلیدس دونوں تقاضوں سے پاک رکھا گیا تھا۔ کسی چوکھٹے میں فہرست مضامین کسی میں رسالے کے بدل اشتراک کا گوشوارہ، کسی میں خریداروں کے نام ہدایات، کسی میں رسالہ کا نام، کسی میں مقام اشاعت اور کسی میں ایڈیٹر کا نام درج تھا ——— رسالہ کا نام تھا ماہنامہ "تجلی" مقام اشاعت بھارت کا مشہور مذہبی شہر دیوبند اور ایڈیٹر کا نام عامر عثمانی ——— مجھے ایک اور جماہی آئی اور میں نے خیال کیا کہ کوئی بے تکا سا مذہبی رسالہ ہے۔ میرے میزبان درون خانہ تھے اور میں کمرے میں تنہا۔ لہٰذا وقت گذاری کے لئے رسالہ کا اگلا ورق الٹ دیا۔ اب میرے سامنے جو صفحہ کھلا، وہ اداریئے کا صفحہ تھا جس کا عنوان تھا "آغازِ سخن"۔ یہ سوچ کر کہ دیکھیں مولوی صاحب کیا فرماتے ہیں میں نے سرسری نگاہ سے مضمون پڑھنا شروع کر دیا۔ مشکل سے تین چار سطریں ہی پڑھی ہوں گی کہ نیم وا آنکھیں آپ سے آپ کھل گئیں اور میں قدرے غور سے مطالعہ پر مجبور ہو گیا۔ چند لمحوں بعد میری جماہیاں رک گئیں میں خود بخود سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اداریئے کی تحریر میں مجھے ایک سواد مولوی کے بجائے ایک شاداب ذہن کا منجھا ہوا ادیب بولتا نظر آیا۔ الفاظ کے دلآویز دروبست، فقروں کی چست اور دلکش بندش اور لہجے کی بے ساختگی کے باعث میں مضمون میں جذب ہو گیا۔ پھر تحریر کے ظاہری حسن کے پس پردہ لکھنے والے کے خلوص اور صدق وصفا کی جو سچ دھج نظر آئی، اس نے میرا دل پوری طرح موہ لیا، اداریہ خاصا طویل تھا، لیکن میں نے سارے کا سارا ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالا۔ اداریہ ختم ہوا، تو میں نے پلٹ کر ایڈیٹر کا نام دوبارہ سرورق پر دیکھا۔ "کون ہیں یہ عامر عثمانی"؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا، ذہن پر بہتیرا زور ڈالا، لیکن مطلق یاد نہ آیا کہ علمی و ادبی دنیا میں یہ نام کبھی پہلے سنا ہو۔ اتنی مرصع ادبی تحریر کسی مذہبی مدرسے کے مولوی کے حصے میں تو نہیں آسکتی۔ یا للعجب! آخر اس پردہ میں کون بول رہا ہے؟

فہرست مضامین پر نگاہ دوڑائی، تو ایڈیٹر کے قلم سے ایک اور مضمون وہاں درج پایا، عنوان تھا "تجلی کی ڈاک" ——— تیزی کے ساتھ اوراق پلٹ کر یہ مضمون نکالا۔ کچھ فقہی قسم کے سوالات قارئین کی طرف سے اور ان کے جوابات ایڈیٹر کے قلم سے نظر آئے نفسِ مضمون جی کو نہ لگا۔ تاہم طبیعت کو تھوڑا سا آمادہ کر کے مطالعہ شروع کیا۔ تو یہاں بھی فوراً ہی "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست" والا مضمون پیدا ہو گیا۔ اکثر سوالات کی نوعیت عام سی تھی لیکن جوابات میں فتووں کی ثقیل زبان اور خشک لہجے کی پرچھائیں تک نہ تھی۔ قارئین کے سوالات کا انداز جدا جدا تھا۔ ان میں خالص تلاش حق کا جذبہ بھی جھلکتا تھا اور معصومانہ لاعلمی اور نادانی بھی اور طنز و تعریض بھی، البتہ ہر سوال کا جواب یکساں دلکش انداز میں حوالۂ قرطاس کیا گیا تھا۔ اس انداز میں عالمانہ تحکم کے بجائے استاد کی سی شفقت، احساس برتری کے بجائے جذبۂ خیر خواہی اور کوئی حکم سنانے یا جاری کرنے کے بجائے دلائل کے بے پناہ زور سے حکمت عیاں کرنے کی کوشش کارفرما نظر آتی تھی۔ پھر جوابات میں محض الفاظ کے طوطا مینا نہیں اڑائے گئے تھے، بلکہ ان میں خالص اور بے میل علم بھی پیش کیا گیا تھا۔ ادب و انشاء کے

زرتار رہا ہے اس میں — بعض سوالات میں مخفی طنز و تعریض کے ساتھ ایڈیٹر کا قلم جس محبت بھرے انداز میں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے گزر جاتا تھا، وہاں اندازِ بیان کی لطافت اور ملاحت سے تحریر کے جوہر اور بھی کھل جاتے۔

اس مضمون کو بھی میں نے آن کی آن میں ختم کر ڈالا۔

اتنے میں میرے میزبان تشریف لے آئے۔ مجھے مطالعہ میں مصروف دیکھ کر انھوں نے فوراً سوال کیا: "کہئے! رسالہ پسند آیا؟"

"بڑا عمدہ ہے۔ کون ہیں یہ عامر عثمانی صاحب؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"مولانا شبیر احمد عثمانی کے بھتیجے ہیں۔ سچے مردِ حق" انہوں نے پُر زور لہجے میں جواب دیا۔ "دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں۔ لیکن گروہ بندی کا تعصب چھو تک نہیں گیا۔ نہایت کشادہ دل رکھتے ہیں۔"

"دل کی مانند مجھے تو ان کا علم بھی فراخ نظر آتا ہے۔" میں نے بے اختیار کہا: "تحریر میں بلا کی تاثیر ہے۔ بڑے ہی مخلص آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" میرے میزبان بولے اور پھر انہوں نے ذرا تفصیل سے عامر صاحب کا تعارف کرایا۔ آخر میں پرچے کو اٹھا کر بولے: "آپ نے ان کا کونسا مضمون پڑھا ہے؟"

"ابھی صرف دو ہی مضمون دیکھے ہیں "آغازِ سخن" اور "تجلی کی ڈاک"" میں نے عرض کیا۔

"لیجئے یہ مضمون پڑھئے۔" رسالے کے آخری اوراق کھول کر انہوں نے ایک صفحہ میرے سامنے رکھا اور پھر ایک عنوان پر انگلی دھر کر بولے: "یہ مضمون بھی عامر صاحب کے قلم سے ہے۔"

مضمون کا عنوان تھا "مسجد سے میخانے تک" اور مضمون نگار کا نام ملا ابن العرب مکی درج تھا۔

"ملا ابن العرب مکی کے قلمی نام سے عامر عثمانی صاحب اپنے رسالے میں ایک مستقل مزاحیہ مضمون لکھا کرتے ہیں۔" انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

رسالہ ان کے ہاتھ سے لے کر میں نے مضمون کا مطالعہ شروع کیا، تو ذہن میں جیسے ایک نیا چمن کھل گیا، مزاح ادب و انشاء کی مشکل ترین صنف ہے۔ یہ گوہر ایک دانہ آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ سلاست، فصاحت اور بلاغت کے جواہر سے مرصع انداز بیان، بجلی اور سبک و لطیف زبان اور وسیع معلومات مزاح نویسی کے ویسے ہی لوازم ہیں، جیسے زندگی کے لئے پانی اور ہوا — یہ لوازم اگر میسر نہ ہوں تو مزاح نویس خود ہی قارئین کے لئے مضحکہ کا سامان بن کر رہ جاتا ہے۔ "مسجد سے میخانے تک" کے ایک صفحے پڑھنے کے بعد قائل ہو گیا کہ عامر صاحب اس میدان کے بھی دھنی ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اردو زبان کا ایک قادر الکلام مزاح نویس ایک سپاٹ سے مذہبی رسالے کے صفحات میں عام نظروں سے اوجھل اس مشکل صنفِ ادب میں اضافے کی خدمت انجام دے رہا ہے

اس طرح عامر صاحب نے گویا مجھے پہلی نظر میں شکار کر لیا، اسی وجہ سے سالہا سال گذر جانے کے بعد اپنے گھائل ہونے کی ذرا ذرا سی بات مجھے خوب یاد ہے کہ رسالہ کا مطالعہ ختم کرنے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا کہ وہیں بیٹھے بیٹھے ایک مختصر سا خط عامر صاحب کے نام لکھا کہ وہ اپنا ماہنامہ "تجلی" میرے نام جاری فرما دیں۔

"تجلی" میرے نام جاری ہوا، گویا ایک نشہ کی لت پڑ گئی، ہر ماہ دنوں پہلے میں "تجلی" کا انتظار شروع کر دیتا۔ جس روز پرچہ ملتا۔ طبیعت کو قرار سا آجاتا۔ اکثر ایک دو نشستوں ہی میں سارا پڑھ ڈالتا اور یہ "آغازِ سخن" "تجلی کی ڈاک" اور "مسجد سے میخانے تک" مستقل مضامین کے علاوہ عامر صاحب کا جو مضمون بھی شائع ہوتا لطف لے لے کر پڑھتا، جیسے کسی لقمۂ تر کو آدمی مزے لے لے کر نوش جان کرتا ہے۔ اسی دوران گاہ بگاہ عامر صاحب سے مراسلت کا شرف بھی حاصل ہوتا رہا۔ ان کے مضامین کی مانند ان کے خطوط بھی مجھے رعنائیِ خیال، حسنِ تحریر اور خلوص و للّٰہیت کا مرقع نظر آئے۔

یہ خلوص و للّٰہیت ہی ان کی تمام تحریروں کا اصل جوہر تھا، اللہ ہی کی خاطر مخالفت اور اس محبت اور مخالفت دونوں میں اوجِ کمال۔ اس کا دوسرا نام عامر عثمانی تھا۔ ان کی تحریروں میں علم کی گہرائی بھی ہوتی اور دلائل کی گیرائی بھی، اور پھر اس پر مستزاد لس لس کرتے خلوص کا نکھار جس کے باعث ہر گام اثر و تاثیر کے چشمے ابلتے نظر آتے۔ عقائد و نظریات کے معاملہ میں وہ اپنا رشتہ ہر وقت براہِ راست کتاب اللہ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم استوار رکھتے اور ایک لمحہ کے لئے بھی کسی بڑے سے بڑے نابغۂ روزگار کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس معاملہ میں انھوں نے

اپنی مادرِ علمی دیوبند کے اکابر اور اپنے اساتذۂ کرام سے بھی اللہ کی خاطر اظہارِ اختلاف سے گریز نہ کیا۔ مولانا مودودی سے انھیں بے حد عقیدت تھی، لیکن جب مولانا کی مشہور کتاب "خلافت و ملوکیت" شائع ہوئی اور انھیں مولانا کا نقطۂ نظر ابتداءً صحیح نظر نہ آیا، تو انہوں نے تجلی کے صفحات پر مبنی کھیت اختلاف کا اظہار کیا اور ذرہ برابر چشم پوشی سے کام نہ لیا پھر بعد ازاں جب وہ مولانا مودودی کے دلائل سے قائل ہو گئے، تو بلا توقف اپنی رائے کی غلطی کا اعتراف کر لیا اور اس موضوع پر مولانا کے نقطۂ نظر کی تائید میں "تجلی" کے دو ضخیم خاص نمبر اپنے قلم سے لکھ کر نکال ڈالے حق پرستی کی خاطر نفئ ذات کی یہ ادائے دلبرانہ قلبِ مومن کے سوا کہاں مل سکتی ہے!

یہ بھی ان کی ادائے حق پسندی ہی تھی کہ وہ کسی بات کو دلیل سے مانتے اور دوسروں کو بھی اپنی بات دلیل ہی سے منواتے۔ فراستِ مومنانہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے پناہ قوتِ استدلال بھی بخشی تھی، اس قوت کے جوہر اُن کے تنقیدی مضامین میں خوب کھلتے۔ صداقت کے حق میں ایک سے ایک کاٹ دار دلیل لا کر وہ اپنے گمراہ حریف کو چاروں طرف سے اس طرح سے نرغے میں لے لیتے کہ اس کے لئے کوئی جائے امان باقی نہ رہتی۔ پھر زیرِ بحث مسئلہ کی جزئیات تک وہ اس خوبی سے کنگھال ڈالتے کہ جہل کی ساری کثافت دُھل جاتی اور حقیقت کا چہرہ بالکل نکھر کر سامنے آ جاتا۔

ایک ہی قلم سے بیک وقت سنجیدہ علمی مضامین اور شگفتہ مزاح پاروں کا ترشح بھی شاید قسامِ ازل نے عامر صاحب ہی کے حصہ میں کیا تھا۔ ان کے سنجیدہ مضامین پڑھتے وقت اگر ذہن میں علم و آگاہی کے قمقمے روشن ہو جاتے ہیں تو ان کے مزاح پاروں کے مطالعہ سے دماغ میں کیف آگیں شگوفے پھوٹتے چلے جاتے ہیں، دینِ فطرت کی صداقتوں کو نہایت لطیف مزاح کے پیرائے میں آشکار کرنے میں عامر صاحب کا "مسجد سے میخانے تک" کا سلسلہ اپنی مثال آپ ہے۔ مزاح نویسی کے دشوار فن میں طنز کی آمیزش اس کی دشواری میں دو چند اضافہ کر دیتی ہے۔ لیکن عامر صاحب نے جس کامیابی کے ساتھ اس آمیزش کو نبھایا اور برتا ہے، وہ ان کی قادر الکلامی کا ایک دلکش روپ ہے۔ یہ ان کا کمالِ فن ہے کہ ان کے قلم سے ٹپکے ہوئے تیرو نشتر، مزاح کے لطیف پیراہن پر موتی بن کر جڑ جاتے ہیں اور اس کی لطافت و زیبائش میں کچھ اور اضافہ کر دیتے ہیں۔ اُن کے طنز آمیز مزاحیہ مضامین پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی گدگدیاں کرتے ہوئے ہلکی ہلکی چٹکیاں بھی لے رہا ہے۔

ان کے رسالے کے زیادہ تر صفحات ان کے اپنے قلم کے رہینِ منت ہوتے تھے، لیکن بسیار نویسی کے باوجود اسلوبِ تحریر کا حسن کبھی ماند نہ پڑا۔ ماہ و سال کی گردش نے بہت گرد اڑائی زمانے نے آنکھیں پھیریں۔ لیکن عامر صاحب کے قلم کے "حسنِ طبیعت" اور "سوزِ دروں" میں ذرا فرق نہ آیا۔ آٹھ دس سال کی بندش کے بعد جب گذشتہ دنوں بھارت اور پاکستان کے درمیان ڈاک کی آمد رفت دوبارہ شروع ہوئی، تو میں نے عامر صاحب کی خدمت میں خیریت طلبی کے لئے خط لکھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے محبت اور خلوص سے مہکتا ہوا گرامی نامہ تحریر فرمایا، نیز "تجلی" کے تین تازہ شمارے بھی روانہ کئے اور میں نے دیکھا کہ ایک طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود نہ تو "تجلی" نے اپنی وضع بدلی ہے، نہ عامر صاحب نے قلم نے اپنی مومنانہ اور حق پرستانہ خو بو تبدیل کی ہے۔

"تجلی" کا وہی سپاٹ سرورق وہی پرانا دیا، وہی اس کی دھواں نما لو ——— وہی فہرست مضامین وغیرہ کے ٹیڑھے بینگے جو کھٹے ——— اور اس کے ساتھ ہی عامر صاحب کے قلم کی وہی گہرائی و گیرائی، وہی خلوص و للہیت، وہی زورِ استدلال وہی "اعجازِ سخن" وہی "تجلی کی ڈاک" "مسجد سے میخانے تک" ——— وہی قہقہے، وہی شگوفے! یہ سب کچھ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اس خوشی کے عالم میں یکے بعد دیگرے میں نے دو تین خطوط عامر صاحب کی خدمت میں لکھے۔ انہوں نے ہر خط کا جواب عطا فرمایا اور اس جواب نے قلب و روح کو شاد کام کر دیا، لیکن مجھے معلوم نہ تھا اس شادکامی کی جگہ جلد ہی قلب و روح میں ایک گھاؤ پیدا ہو جائے گا۔ ان کا آخری خط ملنے کے دوسرے ہی روز مجھے یہ سناونی ملی کہ وہ ایکا ایکی اپنے گراں بہا اعمال کا رختِ سفر باندھ کر اس سرائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ آہ! وہ حق کی خاطر تن تنہا زمانے بھر سے بھڑ جانے والا مردِ مجاہد، وہ استقامت کا پہاڑ، وہ خلوص کا دمکتا ہوا ہیرا، وہ حق پرستی کا بے میل و بے مثل آئینہ ——— ہم سب اس سے محروم ہو گئے۔ عامر صاحب "تجلی" کے ذریعہ عشق کے ذریعہ لو دیا کیا ان کی جوت جگایا کرتے تھے آہ! وہ شعلۂ عشق اب سیاہ پوش ہے

عامر عثمانی کی وفات

ایک المیہ

جناب سلیم الواجدی

۱۲ ر اپریل ۱۹۷۵ء کو مولانا عامر عثمانی پونہ میں وفات پاگئے وہ جس حالت میں یہاں سے رخصت ہوئے تھے، اس کے پیش نظر یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ وہ جان کی سلامتی کے ساتھ واپس آسکیں گے صرف پندرہ دن پہلے وہ دل کے زبردست دورہ میں مبتلا ہوئے تھے۔ انہی دنوں انھیں بمبئی اور پونہ وغیرہ کے ایشیائی مشاعرے میں شرکت کی دعوت ملی۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اس مشاعرے میں شریک ہوں۔ یار دوستوں نے سمجھایا، عزیزوں نے منت سماجت کی، اپنوں، غیروں نے سر پٹکا، ڈاکٹروں نے منع کیا مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ مجبور ہوکر دوستوں اور عزیزوں نے اللہ کے حوالے کیا۔

راستے بھر اطمینان سے رہے، قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہے، بمبئی اترے تو چاق وچوبند تھے۔ وہاں کا مشاعرہ پڑھا، گھر والوں کو اپنی خیریت کا تار ارسال کیا۔ مشاعرہ کے بعد اپنی اہلیہ کو ایک طویل خط لکھا، وہ اپنی صحت اور مشاعرہ کی تکان کے باعث پونہ کے مشاعرے میں شرکت کا ارادہ ملتوی کرچکے تھے۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ منتظمین کے اصرار پر بالآخر پونہ چلے گئے، وہاں مشاعرہ پڑھا۔ مائک سے علیحدہ ہی ہوئے تھے کہ دل کا دورہ پڑا۔ اسپتال تک بھاگ دوڑ کی گئی مگر وقت موعود آچکا تھا۔ عامر عثمانی اپنے حقیقی رب سے جاملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

وہ دیوبند کی ادبی اور علمی محفلوں کی جان اور روح رواں تھے۔ یہاں کی رونقیں ان ہی کی ذات سے وابستہ تھیں، وہ اوجھل ہوگئے تو محفلیں اجڑ گئیں، ہنگامے خاموش ہوگئے وہ آواز ڈوب گئی جو یہاں ابھرتی تھی، اور کشمیر سے لے کر راس کماری تک ہر حلقے میں، ہر جگہ اور ہر شہر میں سنی جاتی تھی۔ ہزاروں لوگ اس آواز کے بے چینی کے ساتھ منتظر رہتے۔ سیکڑوں دلوں کو چھوکر گذرتی اور ان گنت دماغوں کو جھنجھوڑ کر آگے بڑھ جاتی۔

میری زندگی کے بیس برس انہی گلیوں میں بھاگتے دوڑتے گذرے ہیں، جن گلیوں میں عامر مرحوم کے باون برس گذرے میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو دیوبند میں شعر وادب کا مذاق اپنے عروج پر تھا۔ آئے دن شعری نشستیں ہوتیں، ان چھوٹے چھوٹے مشاعروں میں علامہ انور صابری مولانا عبدالواحد آباد مرحوم، محزون بیانی، اور نشا طاجانی کے علاوہ عامر صاحب کے بھی نغمے گونجا کرتے تھے۔ میں نے عامر صاحب کو انہی محفلوں میں سنا۔ اس زمانہ میں مجھے ان کے کلام میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی، ایک ایسے بچے کو جس کی تمام تر دلچسپی آواز کے زیروبم، اور ترنم کی آہٹوں تک محدود ہو۔ عامر صاحب کے کلام کو کیسے پسند کرسکتا تھا، جس میں شعریت بھی تھی، عالمانہ رنگ بھی، متانت وبردباری بھی۔ زبان وادب کی قوت بھی۔ اس زمانہ میں میرے نزدیک عامر صاحب کا شمار ان شعراء میں تھا جو بور کرتے ہیں۔ اس لئے یار دوستوں کی محفلوں میں جب انھیں بلانے کی بات چھڑتی تو میں منہ بنایا کرتا۔ مگر بڑا ہوا اور ادھر ادھر کا مطالعہ کیا تو عامر صاحب کی شخصیت ہی کچھ ایسی محسوس ہوئی جس کے شعر سمجھنے اور سننے کے قابل تھے۔ بڑے شوق سے ان کے اشعار سننے

لگا۔ خاص طور پر ان کی نظمیں، اور قطعات بہت پسند آتے، تجلی میں ان کا کلام شائع ہوتا تو بڑے شوق سے اسے پڑھتا۔

اسی زمانہ میں تجلی بھی پڑھنا شروع کیا، میں نے جس ماحول میں تعلیم پائی، وہاں تجلی جیسے "گستاخ" اور "دریدہ دہن" پرچوں کی کھپت نہ تھی بچوں کو اور نوعمر لڑکوں کو اس کے مطالعے سے منع کیا جاتا۔ یہ والدِ محترم کا کرم ہے کہ انہوں نے مجھ پر اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں کی — "تجلی سے دلچسپی کا آغاز اس کے مستقل کالم "مسجد سے میخانے تک" کی وجہ سے ہوا مگر جلد ہی آغازِ سخن، تجلی کی ڈاک، کھرے کھوٹے وغیرہ عنوانوں پر نظر پڑنے لگی۔ اسی زمانے میں مسلم شریف کی شرح بھی لکھ رہے تھے، اسے بھی پڑھا

وہ ایک عالم بھی تھے، مفتی بھی، ناقد بھی، ادیب بھی، شاعر بھی، طنز و مزاح نگار بھی، اور صحافی بھی۔ ہر پہلو سے اور ہر حیثیت سے وہ مکمل و ممتاز تھے، منفرد اسلوب رکھتے، شگفتہ نثر لکھتے تھے۔ لکھنے پر خوب قادر تھے۔ رواں دواں لکھتے رہتے۔ گھنٹوں تک لکھتے رہتے دنیا و ما فیہا سے بے خبر، بے نیاز، مگر تھکتے نہ تھے، علمی مسائل پر بچے تلے انداز میں گفتگو کرتے، تجزیہ و تحلیل میں ان کا خاص رنگ تھا، ایک ایک پہلو روشن! اور واضح کرتے۔ فقہی مسائل پر بھی اتنے سہل اور دلچسپ انداز سے لکھتے کہ ایک عامی بھی سمجھ لیتا، بے لاگ تنقید کرتے، کھرے کھوٹے میں امتیاز کرتے۔ صحیح کو غلط سے اور غلط کو صحیح سے الگ کر کے پیش کرنے کا ڈھنگ انھیں خوب آتا تھا، زبان و ادب کی باریکیوں پر عبور تھا۔ کتابوں پر ہی کیا موقوف ہے، وہ ہر مسئلے میں یہی موقف رکھتے تھے۔ ملّی مسائل پر، ملکی معاملات پر علمی نظریات پر تنقید کرنے کا یہی رنگ تھا۔ لوگ ان کی گرفت سے گھبراتے تھے، اسی وجہ سے وہ بدنام بھی بہت ہوئے اور دنیائے علم میں خاص طور پر بازاری قلم کار کہے گئے، مگر غور سے دیکھتے تو ان کی تحریر میں شوخی اور ظرافت تو بہت تھی مگر بھونڈا پن نہ تھا بہت تیز، تند اور تلخ لکھتے، مگر سطر سطر میں خلوص کی چاشنی بھی موجود ہوتی، اور حق پسندی اور اس سے بڑھ کر حق کے اظہار کا جذبہ بھی۔ اگر کوئی بات ان کے قلم سے غلط نکل جاتی تو یہ عادت بالکل نہ تھی کہ اس پر مصر رہیں ان گنت موقعوں پر انھوں نے رجوع کیا ہے۔ ابھی آخری شمارہ میں انھوں نے اپنی ایک غلطی کا اعتراف کیا ہے۔

وہ ایک ممتاز ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین طنز و مزاح نگار بھی تھے۔ بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں ناول بھی لکھے ہیں، "ادبی انداز میں" میں انھوں نے برسوں تک جو کچھ لکھا وہ اسی ریاضت اور مشق کا نتیجہ تھا، عام ملکی اور ملّی مسائل پر اُن کے جو مضامین "آغازِ سخن" کے عنوان سے چوتھائی صدی تک تجلی میں چھپتے رہے وہ ان کی صحافتی ژرف نگاہی، بصیرت اور دقت نظری پر دلالت کرتے ہیں۔ اُن کے مرنے سے ایک ایسا ادیب شاعر، ناقد، مزاح نگار اور صحافی بھی مر گیا ہے جس کی تحریروں میں سادگی تھی، بے تکلفی تھی اور جس کی تحریروں میں غم کا اجالا بھی ہوتا تھا، قہقہوں کا شور بھی، آہوں کی آہٹ بھی اور آنسوؤں کی کسک بھی، شوخی اور دلفریبی بھی۔

انھوں نے دیوبند کا نام روشن کیا، وہ یہاں کے ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے، دیوبند کو ان کا سا شخص مشکل سے ملے گا" انہوں نے یہاں کے مشہور علمی مرکز اور دینی درسگاہ "دار العلوم" میں تعلیم پائی۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں بہت کم پڑھا۔ بعد میں مطالعے سے استعداد پختہ کی، لکھنے کا شوق خاندان سے وراثت میں ملا اور زندگی کے آخری لمحوں تک اسے گلے سے لگائے رکھا۔

دیوبند مکتبِ فکر کے ساتھ ان کا اختلاف تھا۔ وہ اگرچہ جماعتِ اسلامی سے باقاعدہ وابستہ نہ تھے، مگر اس جماعت کی حمایت تائید، اور دفاع ان کی زندگی کا مشغلہ تھی۔ مگر دیوبند سے اس فکری اختلاف کے باوجود یہاں کے بڑے بھوڑوں سے ان کو لگاؤ تھا۔ اسی مسلک کے عاشق تھے اور زندگی بھر ان کا دفاع کرتے رہے، بریلویوں سے لڑتے رہے۔ ہزاروں صفحات ان کی تردید میں لکھ ڈالے غیر مقلدوں کے ساتھ دست و گریباں رہے اور سیکڑوں مسائل میں ان کے ساتھ کھل کر بحث کی۔ ابھی طلاقِ ثلٰثہ کے مسئلہ پر انہوں نے بڑے عالمانہ انداز میں لکھا تھا۔ اور ایک ضخیم نمبر نکال کر اپنی علمی بصیرت اور فقہی آگہی کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ مقابلے پر جماعتِ اسلامی کے افراد تھے، دیوبند کے علماء بھی تھے، اور غیر مقلد حضرات بھی، مگر انہوں نے کسی کی پرواہ نہ کی، نکما ڈٹ کر لکھا، دن رات ایک کر کے لکھا، ایک ایک بات کے

لئے حوالے ہمیشہ کرکے

علمی محاذ پر اس دفاع کے علاوہ بھی وہ اپنی نجی زندگی میں یہاں کے بزرگوں سے ملتے جلتے رہتے۔ دارالعلوم کے اساتذہ، طلباء اور دوسرے منتسبین اور متعلقین سے اُن کے بہت ہی مخلصانہ روابط تھے۔

اب آخر عمر میں انھوں نے قادیانیت کے خلاف لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اس باطل فرقے کے خلاف انھوں نے پہلے بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر اب پاکستان میں اس کی جو درگت بنی ہے، اس سے بوکھلا کر ان کا رُخ ہندوستان کی طرف ہوگیا ہے۔ عامر صاحب کا عزم تھا کہ وہ اس فرقے کو یہاں چین کی سانس نہ لینے دیں گے۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط کے دانشوروں کی بکواس کا انتہائی وقیع اور سنجیدہ جواب لکھا خود فارقلیط صاحب نے بھی اعتراف کیا، اور مولانا محمد منظور نعمانی نے بھی سراہا، قادیانی لٹریچر کا مطالعہ کر رہے تھے اور ایک ایک کرکے تمام کتابوں کا جواب لکھنے میں مشغول تھے کہ موت نے آلیا۔ دیوبند میں وہ ابھی جب بیمار پڑے تھے تو بیہوشی کے عالم میں بھی ان کی زبان پر یہی ایمان افروز جملہ تھا۔ ” قادیانیوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دونگا “۔

اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنے ”تجلی“ کا چراغ انتہائی تاریکیوں ہی میں نہیں سخت آندھیوں میں بھی جلائے رکھا۔ خلافت وملوکیت نمبر کی تیاری میں مشغول تھے تو صرف دو ڈھائی گھنٹے آرام کیا کرتے تھے، ایک لگن تھی، ایک جذبہ تھا کام کرنے کا۔ اتنی محنت اور زبردست قوت مطالعہ کی مثالیں نادر ہیں۔

وہ غریبوں کے ہمدرد بھی تھے اور خلیق اور شفیق انسان بھی۔ قصبے کے انتہائی مفلوک الحال اور میلے کچیلے لوگوں کے گلے میں باہیں ڈال کر بے تکلف چل پھر لیتے تھے۔ نجی زندگی میں انتہائی سادہ اور بے ضرر انسان کسی کو تکلیف نہیں دی، کسی کو ضرر نہیں پہونچایا، کسی کا دل نہیں دکھایا ——— اور ——— مرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بہت سے گھروں کی کفالت کرتے تھے ——— بہت سے لوگوں کو قرض دیا واپس لینا تو درکنار مانگا تک نہیں۔

آخر میں سب لوگوں کے قرض معاف کر دیئے۔ اپنی ابنی پائی پائی چکا دی اور ہدایت کر دی کہ جو بھی قرض کا دعویٰ کرے، بجرح کے

بقیہ اداکیجیے۔

بیماری سے چند روز پہلے ان کے گھر گیا۔ دیر تک گفتگو رہی وہاں دارالعلوم کے ساتھ ان کے لگاؤ اور تعلق کا بھی اندازہ ہوا۔ دیر تک بیٹھا رہا۔ اگر پتہ ہوتا کہ یہ صحبت اب کبھی نصیب نہ ہوگی تو کچھ دیر اور بیٹھ جاتا اور اتنا بیٹھتا کہ عامر صاحب خود ہی اکتا کر کہدیتے کہ ——— ” اچھا بھائی، اب جاؤ ——— اچھا بھائی، اب جاؤ۔ پھر آنا “ ——— اب صرف یادیں رہ گئیں۔

اللہ انھیں آخرت کی نعمتوں سے نوازے۔

بقیہ :- آج کیا چل بسا ......

جائیں اور مجموعۂ کلام شائع کر کے محفوظ کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ خود بھی فائدہ اٹھا سکیں اور آئندہ نسلوں کو بھی منتقل کیا جا سکے کیونکہ ایسے کار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

خدا تعالیٰ مرحوم کے مدارج بلند کرے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

کیا ہی بہتر ہو اگر مرحوم کی لوحِ تربت پر انھیں کا قطعہ کندہ کر دیا جائے جو انہوں نے مرنے سے ایک گھنٹہ قبل پونا کے مشاعرے میں سنایا تھا۔ اس میں عبرت وموعظت اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ حیات وکائنات کے چہرہ سے پردہ بھی اٹھایا گیا ہے۔

دھرا کیا ہے کراہوں کے سوا دنیا کے دامن میں
میں کیوں روؤں، مجھے کیا غم اگر تارِ نفس ٹوٹا
مری میت پہ عامر نوحہ گر ہیں جسم کے قیدی
مگر میں مسکراتا ہوں کہ مدت میں قفس ٹوٹا

مسائلِ اذان

جناب پروفیسر محمد حیات غوری
صدر شعبہ اردو انجمن کالج بھٹکل

آج کیا چل ہی بسا بزمِ جہاں سے عامر

مولانا عامر عثمانی مرحوم سے وابستہ چند یادیں

مولانا عامر عثمانی ہندوستانی علماء کی صف اول کے لوگوں میں شامل تھے مرحوم نے عالمی اسٹیج پر اپنا مقام ہی پیدا نہیں کر لیا تھا بلکہ اپنی انفرادیت بھی منوالی تھی، انہوں نے شرمندۂ ساحل رہنے کے بجائے اچھل کر بیکراں ہونا پسند کیا اور تجلی کے ذریعہ سیاسی حدود کو توڑ کر علمی آفاقیت پر چھا گئے۔

مرحوم سے میری غائبانہ شناسائی تو اس وقت سے ہے جبکہ میں اپنی تعلیمی زندگی کے مراحل طے کر رہا تھا اور چھٹے یا ساتویں درجہ میں زیر تعلیم تھا۔ اس وقت سے مجھے تجلی کے صفحات میں ذہنی الجھنوں کا علاج "تجلی کی ڈاک" میں ملتا رہتا تھا۔ میں اسے سب سے پہلے غور سے پڑھتا۔ اس کے بعد جس عنوان کو ہاتھ لگاتا وہ ملا ابن العرب کی مزاح نگاری تھی جو "مسجد سے میخانے تک" کے عنوان کے تحت مستقل شائع ہوتی رہتی ہے۔ اس کالم میں طنز کے تیر مزاح کی چاشنی لپیٹ کر بڑے تعمیری و اصلاحی انداز سے ذہنوں کو متاثر کر رہا ہے۔ میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو صرف "ملا" کی رشحات قلم کی وجہ سے تجلی کے شائق بنے ہوئے ہیں۔ میرے اس ذوق کی تربیت میں جہاں میرے بہت سے مربیوں کے نام آتے ہیں اُن میں میرے ہائی اسکول کے استاد ماسٹر محمد ادریس صاحب کا نام سرِ فہرست ہے جنہوں نے اپنی بے غرض اور پُرخلوص محبت سے میرے ذہن میں دینی کتب و رسائل کے مطالعہ کرنے کی ضرورت کا احساس بیدار کیا۔ موصوف ہی نے تجلی کے پرچے مجھے دینے اور مطالعہ کا ذوق بیدار کر کے مولانائے مرحوم سے متعارف کرایا اور گرویدہ بنا دیا جو آج تک باقی اور قائم ہے۔

اس کے بعد جب علم اور تجربہ کی اگلی منزلوں میں قدم رکھا تو موصوف کی علمی بصیرت اور بے لاگ تبصروں نے اپنا گرویدہ بنا لیا، خاص طور سے مولانا کے اصولی اور علمی مباحث جن میں انھیں کسی شخصیت سے مرعوب اور متاثر ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ حق گوئی و بے باکی کے معاملے میں مرحوم نے اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔ لوگ اکثر کہا کرتے تھے کہ "اگر کسی معاملہ میں بے لاگ اور صحیح رائے معلوم کرنا ہو تو تجلی کو لکھو۔" اور اکثر معاملہ میں تجلی کی آراء حکم بن جاتیں۔ اصولی اور علمی مباحث میں مولانا کو کسی کے سامنے جھکتے کبھی نہیں دیکھا بلکہ اگر کہیں علمی بددیانتی یا ہٹ دھرمی نظر آتی تو مولانا کو شمشیر برہنہ ہی پایا۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے اقبالؔ نے کہا تھا ؎

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

تجلی کے صفحات شاہد ہیں کہ اللہ کے اس شیر کو روباہی کردار میں نہیں دیکھا گیا، جس کا اعتراف مولانا کے دوست و ہمنوا ہی نہیں بلکہ ان کے مخالفین اور دشمنوں تک نے کیا ہے مخالفین کے ایک گروہ نے تجلی کے آفس تک میں آگ تو لگا دی لیکن کوئی شخص یہ الزام نہیں لگا سکا کہ مولانا نے کہیں بھی جانبداری کا رویّہ اپنایا ہے۔

تجلی کے مسلسل مطالعہ سے مولانا سے خاص قسم کی عقیدت اور محبت کا پیدا ہو جانا لازمی امر تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ تجلی ایک کے بعد دوسرا خاص نمبر شائع کرنے کا اعلان کر رہا تھا۔ میں بھوپال میں تھا چند احباب جن میں میرے دوست جناب عنایت علی اور نثار علی صاحبان بھی شامل تھے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ تجلی کا ذکر نکل آیا۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ بھئی! آپ تجلی سے اس کام سے خوش ہیں اور جب میں ایسے اعلان سنتا ہوں تو مجھے خطرہ کی گھنٹی سنائی دینے لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مولانا کو نوٹس موصول ہو گیا ہے کہ اپنا کام جلد تمام کر دو تاکہ تمہارا بلاوا بھیجا جا سکے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید مولانا اپنے کام کی تکمیل کر رہے ہیں تاکہ جلد فارغ ہو کر دنیا کے سفر کے مکمل ہونے کا اعلان کر دیں۔ بعد کے حالات نے بتایا کہ شائد مولانا اسی تکمیل میں لگے ہوئے تھے۔

مولانا کے حلئے کے بارے میں ذہن میں ایک خاص قسم کا ہیولا بن گیا تھا۔ اور تصور کے پردہ پر ایک مولویانہ وضع قطع نے لے لی تھی کہ مولانا عامر عثمانی موٹے تازے، سرخ و سفید چہرہ کے مالک ہوں گے اور چہرہ پر ایک لمبی برف کی طرح سفید داڑھی ہو گی وغیرہ وغیرہ ابھی تک چونکہ مولانا کو چشم سر سے دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے ذہن میں ایک تصوراتی نقشہ مرتسم ہو گیا کہ مولانا کو ایسا ہونا چاہیئے لیکن اسی کے ساتھ یہ خواہش بھی کروٹیں لینے لگی تھی کہ کم از کم ایک بار مولانا سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہو جائے تو کیا ہی اچھا ہو، لیکن بظاہر اس کے امکانات دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔

غالباً ستمبر ۱۹۷۵ء میں بزم اردو انجمن کالج بھٹکل نے ۲ر جنوری ۱۹۷۶ء کو ایک آل انڈیا مشاعرہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اس مشاعرہ کا انتظام کرنے اور شعراء کو مدعو کرنے کی ذمہ داری ڈاکٹر سید انور علی صاحب (پرنسپل) کی نگرانی میں میرے ذمے آئی، چنانچہ شعراء کی تلاش ہوئی اور مشاعرہ کو کامیاب بنانے کے لئے بہتر سے بہتر اور اصلاحی ذہن و فکر رکھنے والے شعراء کا انتخاب عمل میں آیا اور انھیں دعوت نامے جاری کر دیئے گئے اتفاق سے اسی سال نومبر ۷۵ء میں مجھے اور ڈاکٹر صاحب کو ایک اجتماع کے سلسلے میں دہلی جانا پڑا۔ اس اجتماع کے اختتام پر ایک شعری نشست کا بھی اہتمام تھا۔ اس مشاعرہ میں جناب نسیم صاحب اناؤنسنگ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مشاعرہ جاری تھا کہ یکایک نسیم صاحب کی آواز کانوں سے ٹکرائی کہ اب مولانا عامر عثمانی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ اس آواز پر میں نہ صرف ہمہ تن گوش ہو گیا، بلکہ ہمہ تن چشم بھی۔ کیونکہ یہ مولانا کو بچشم سر دیکھنے کا سب سے پہلا اتفاق تھا، مولانا کے بارے میں میری ذہنی تصویر ایک دم ابھر آئی، لیکن جب اسٹیج پر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ بار بار آنکھیں مل کر دیکھتا رہا کہ کیا ایسے دبلے پتلے آدمی کو مولانا عامر عثمانی کہتے ہیں جس کی کل کائنات ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے جس پر بغیر گوشت کی کھال چڑھا دی گئی ہے۔ ماننے کو جی نہیں چاہ رہا تھا کہ یہی شخص جس کی جولانئ طبع اور علمی و فکری صلاحیتوں کا مظہر ماہنامہ تجلی ہے، انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ لاؤڈ سپیکر نے رباعی کے اشعار کی ترسیل کے فرائض انجام دینا شروع کر دیئے۔ آواز میں کڑک وقار اور مردانگی سب کچھ تھا۔ صرف آواز ہی میں نہیں بلکہ کلام میں بھی مقصدیت، ادبیت اور ایک صالح اور تعمیری ذہن کے سارے ہی عناصر موجود تھے۔ تجلی کے صفحات میں مولانا کے کلام کو تو اکثر دیکھنے کا موقع ملا تھا لیکن خود مولانا کو سننے کا یہ پہلا موقع تھا۔ خدا تعالےٰ کے نظام عدل کا قائل ہونا ہی پڑا۔ اگر جسم پر گوشت کی کمی رکھی گئی تھی تو اس کمی کو ذہنی و فکری صلاحیتوں سے پوری کر کے اپنی صفت عدل کا تقاضا پورا کر دیا تھا۔

دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مشاعرہ کا تذکرہ آیا۔ میں نے مولانا کے کلام اور خاص طور سے پڑھنے کے انداز کی تعریف کی تو کہنے لگے چلئے مولانا کو بھی اپنے مشاعرہ میں مدعو کر لیتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ مولانا اس

بہ تیار ہو جائیں گے، چنانچہ جواب دیا کہ مولانا اتنے معروف آدمی ہیں کہ صرف مشاعرہ کے لئے اتنا طویل سفر کر سکیں گے مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ویسے اگر مولانا قبول کرلیں تو اس سے بڑھکر مسرت کی بات اور کیا ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے جانے کیا جادو کیا کہ مولانا تیار ہو گئے، اور یہ خوش خبری مجھے بھی سنادی۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، میری دیرینہ آرزو بر آنے والی تھی اور مولانا سے زیادہ سے زیادہ قربت کے امکانات روشن نظر آرہے تھے۔ چنانچہ ۱۵ نومبر ۱۹۶۸ء کو بھٹکل سے مولانا کو آل انڈیا مشاعرہ کا باقاعدہ دعوت نامہ ڈاکٹر صاحب کے سفارشی خط کے ساتھ ارسال کردیا گیا۔ بزم نے تمام شعراء کو سیکنڈ کلاس ریل کا کرایہ دینے کی پیشکش کی تھی۔ اس کا جواب مولانا کے شگفتہ و پُرمزاح قلم نے جس طرح دیا، آپ بھی سنئے۔

"یہ لطیفہ ہے کہ آپ کی بزم اب تک "سیکنڈ کلاس" عنوان قائم کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ بندہ جس ہندوستان میں رہتا ہے وہاں کی ریلوں میں تو اب اس عنوان کی کوئی چیز رہی نہیں۔ دو ہی درجے ہیں تھرڈ، یا فرسٹ۔ ظاہر ہے میرے نصیب میں تھرڈ ہی آئے گا۔ شکوہ وہ کرے جسے تقدیر پر یقین نہ ہو۔ لکھنے والا جو کچھ لکھ چکا وہ اٹل ہے۔ آپ کا یا کسی کا اس میں کیا قصور۔

بہرحال بشرطِ زندگی سر کے بل حاضر ہو رہا ہوں" (ماخوذ از مکتوب مورخہ ۱۲ دسمبر ۶۸ء)

اگر یہ خط مولانا کے ذاتی پیڈ پر نہ آیا ہوتا تو یقیناً یہی تسلیم کیا جاتا کہ مولانا نے بذاتِ خود جواب دینا گوارہ نہیں کیا بلکہ ملا ابن العرب مکی سے کہہ کر لکھوا دیا ہے۔ زبان کی شوخی تو یہی دلالت کرتی ہے مگر پیڈ کے ساتھ مولانا کے دستخط بھی ہیں اس لئے اس بات کو تسلیم کرنے کے سارے امکانات موجود ہیں کہ یہ زبان بھی مولانا کی اپنی ہی ہے۔ علمی مباحث کی بات الگ ہے۔

حسبِ وعدہ مولانا، حفیظ میرٹھی، شمسی مینائی اور ناظم ناگپوری کے ہمراہ ۳۰ دسمبر ۶۸ء کو بھٹکل تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر ملاقات ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں مولانا نے اپنی شخصیت کی سادگی اور زبان کی لطافت و شیرینی سے متاثر کرلیا۔ مولانا سے گفتگو کرتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ ہم کسی ایسی شخصیت سے گفتگو کر رہے ہیں جو عالمی شہرت کی حامل ہے۔ گفتگو کی لطافت اور اپنائیت سے محسوس ہوتا تھا کہ مولانا سے پہلی ملاقات نہیں ہے۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اسی دن ڈاکٹر صاحب کے مکان پر سب لوگ بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے تھے کہ تھوڑی ہی دیر میں اس نشست نے "منی مشاعرہ" (MINI MUSHIRA) کی شکل اختیار کرلی۔ مشاعرہ شروع ہوگیا اور شعراء نے اپنا اپنا کلام سنایا مولانا بھی کسی سے پیچھے رہنے والے کب تھے چنانچہ موصوف نے بھی کئی غزلیں سنا ڈالیں۔

اسی دن دورانِ گفتگو میں نے مولانا سے عرض کیا کہ "مولانا ہم نے سیکنڈ کلاس ریل کرایہ کی پیشکش اس لئے کی تھی کہ اب تھرڈ کلاس کو حکومت نے ختم کردیا ہے۔ کہنے لگے بھئی نام بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس طرح حقیقت نہیں بدلتی ہے تو وہ تھرڈ ہی کلاس خواہ اسے فرسٹ کہئے یا سیکنڈ۔ جس طرح گدھے کو گھوڑا کہنے سے وہ گھوڑا نہیں بن سکتا۔ اسی طرح تھرڈ تو تھرڈ ہی رہے گا۔ نام اس کا کچھ بھی رکھ لیجئے۔

شام کے وقت میں اور مولانا قیام گاہ کی طرف جا رہے تھے راستے میں میں نے کہا مولانا تجلی کافی عرصہ سے کہانی نمبر کا اعلان کر رہا ہے۔ لیکن نمبر ابھی تک نہیں نکل سکا۔ آخر کیا رکاوٹ درپیش ہے مسکرا کر کہنے لگے "بھئی یہ کمبخت ملا بہت بدمعاش ہوگیا ہے ہاتھ ہی نہیں آتا۔ بڑی مشکل سے پکڑ کر کچھ کام کراتا ہوں اور پھر چھوٹ کر بھاگ جاتا ہے۔ اس مرتبہ اسے پکڑ کر کمرہ میں بند کردوں گا اور جب تک کہانی نمبر مکمل نہیں ہوجاتا باہر نہیں نکلنے دوں گا" لیکن کسی کو معلوم تھا کہ ملا مکی کو قید کرنے والا خود ہی اپنی قیدِ حیات سے آزاد ہو جائیگا حضرت علیؓ نے کس قدر صحیح فرمایا ہے عَرَفْتُ بِاللّٰہِ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ (میں نے خدا کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا) میں نے کہا مولانا ہم نے سنا ہے کہ ملا مکی تو آپ ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس میں کہاں تک مولانا اس سوال کو بڑی صفائی سے ٹال گئے اور کہانی نمبر کی یقین دہانی کرکے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

موصوف بڑے زاہد اور عبادت گذار ہی نہیں بلکہ شب زندہ دار

بھی تھے، اسی لئے احتیاطاً ہمیشہ ایک عدد تھرماس اور ایک ماچس اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جب ہمیں اس کا علم ہوا کہ مولنا رات کو جلدی بیدار ہوتے اور چائے و سگریٹ سے تازہ دم ہو کر اپنے مشاغلِ نیم شبی میں مصروف ہونے کے عادی ہیں تو ہم نے مرحوم کے لئے مخصوص اہتمام کی کوشش کی تاکہ ان کے مشاغل میں دشواری نہ ہو کیونکہ وہ کسی حال میں اپنے ان مشاغل سے غفلت پسند نہیں کرتے تھے

مرحوم کو تجلی سے عشق تھا۔ ایک سے زیادہ بار اس جملے کو دہراتے رہے کہ تجلی میری تجارت نہیں بلکہ مقصدِ حیات ہے اور آخری دم تک اسی کی خدمت کرتے رہنا تصور کرتا ہوں۔ ایک بار ڈاکٹر صاحب رشید کوثر فاروقی، قوی ٹونکی، بزمی ٹونکی اور راقم بیٹھے ہوئے مولانا سے ملاقات کر رہے تھے۔ دورانِ گفتگو تجلی کی علمی تنقید کے معیار و مزاج کی بات چل نکلی۔ مولانا سے کہا گیا کہ آپ کی پُر وقار سنجیدہ اور عالمانہ تنقید میں جب شخصیات پر بات چل نکلتی ہے تو اس کا علمی وقار مجروح ہوتا نظر آتا ہے۔ لوگوں کو اس معاملے میں ایسی شکایت ہے کہ علمی اور اصولی بحث کو اپنے حدود میں ہی رہنا چاہیئے ورنہ اس کا علمی وقار اور تاثر دونوں مجروح ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس براہِ راست تنقید پر یا تو خفا ہو جاتا۔ یا پھر بہانے تراشنے لگتا۔ ورنہ تاویلوں کا سہارا تو لے ہی لیتا مگر مولانا نے ان اوچھے ہتھیاروں میں سے کسی کو استعمال نہیں کیا بلکہ کہنے لگے کہ بھئی پہلی بات تو یہ ہے کہ جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ عصبیت اور تنگ نظری کی وجہ سے حقائق سے پہلوتہی کرتے ہیں اور کٹ حجتی پر اتر آتے ہیں تو مجھے غصہ آجاتا ہے اور اس قسم کی باتیں تجلی میں چھپ جاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ میں تنہا آدمی ہوں اور پورا تجلی مجھی کو تیار کرنا پڑتا ہے اس لئے اپنی تحریر پر کبھی نظرِ ثانی کی نوبت ہی نہیں آتی۔ بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ کاتب کو اپنے پاس ہی بٹھا لیتا ہوں۔ صفحہ پورا بھی نہیں ہو پاتا کہ کاتب کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے اور کتابت ہو کر چھپائی کے مراحل طے ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ بعد میں جب نظر پڑتی ہے تو خود مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال آئندہ اور احتیاط برتوں گا۔ تجلی ہی کے سلسلے میں میں نے ایک بار مولانا سے کہا کہ مولانا آپ نے اپنا کوئی جانشین بھی تیار کر لیا ہے یا نہیں ورنہ آپ کے بعد تجلی بھی مرحوم ہو جائے۔ بہت ہی رنجیدہ لہجے میں کہنے لگے کہ بھئی میں خود بھی بہت دنوں سے کسی معقول آدمی کی تلاش میں ہوں جو تجلی کا بار سنبھالنے کی صلاحیتوں کا مالک ہو لیکن ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی غرض کے لئے میں نے تجلی کے کچھ صفحات شمس نوید عثمانی صاحب کو دے رکھے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ خود بہت مصروف آدمی ہیں۔ اسی ذمہ داری کو نہیں سنبھال پا رہے ہیں تجلی کو کیسے سنبھال سکیں گے۔ بہرحال میں تلاش میں ہوں۔

ایک بار ادبی تنقید کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ مولانا سے کہا گیا کہ آپ یا تو اس میدان میں قلم نہ اٹھایا کریں، یا اگر اٹھائیں تو پوری تحقیق کے بعد ایسا کریں۔ اس میں بعض وقت ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو کم سے کم آپ کے قلم سے اچھی معلوم نہیں ہوتیں۔ ڈاکٹر انور علی (بیسل) نے مولانا کی توجہ تجلی کی ایک ادبی تنقید کی طرف مبذول کراتے ہوئے فرمایا کہ اس میں آپ نے "باور آنا" کو محاورہ تسلیم نہیں کیا ہے۔ مولانا کہنے لگے "ہاں یہ محاورہ کب ہے"۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے غالب کے شعر ؎

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

کو سند میں پیش کیا تو موصوف چونک پڑے اور بڑی صفائی سے غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہنے لگے کہ بھئی کمال ہے اس شعر کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ ہم لوگوں نے کہا مولانا غلطیاں تو سب سے ہو جاتی ہیں مگر آپ کے قلم سے ایسی باتیں دیکھنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ آپ ادبی مسائل کو ہاتھ نہ لگائیں تو اچھا ہے خود آپ کا اپنا میدان ہی کیا کم ہے۔

چونکہ مشاعرہ ۲ جنوری کو ہونے والا تھا اس لئے یکم جنوری کی شام کو شعراء کو سمندر کے کنارے واقع لائٹ ہاؤس کی سیر کرانے لے جانے کا پروگرام بنایا گیا۔ ایک ٹیکسی کرلی گئی اور تمام شعراء کو لیکر لائٹ ہاؤس کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس وقت مولانا کے علاوہ جناب حفیظ میرٹھی، شمسی مینائی، ناظم نانگپوری اور مولانا منصور علی ندوی ہمارے ساتھ تھے۔ کار جس سڑک پر دوڑ رہی تھی وہ ایک پہاڑی وادی کے سہارے ناگن کی طرح بل کھاتی چل رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف ایک پہاڑی سلسلہ سمندر تک چلا گیا تھا تو دوسری طرف وادی میں ناریل کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا

تھا گویا کہ پہاڑ کی بلندی سے شکست کھانے کو تیار نہیں ہیں اور جھوم جھوم کر اس کی سختی اور بے حسی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ انھیں درختوں کے درمیان سے ایک صاف و شفاف ندی بھی جھومتی اور اٹھکیلیاں کرتی ہوئی سمندر کی بے کرانی میں ملکر بے کراں بننے کے لئے آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ گویا کہ سمندر کی آغوش میں سما کر زندگی کی سب سے بڑی مسرت حاصل کرنا چاہتی ہے۔

ایسے پُر بہار ماحول میں چند شاعر جمع ہو جائیں تو بھلا وہ خاموش کیسے رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ کار کے اندر ہی موبائل مشاعرہ شروع ہو گیا۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ قدرتی مناظر کسی پردۂ فلم کی طرح مسلسل بدل رہے تھے، کار میں مزاحیہ شاعر ناظم ناگپوری غزل سرائی شروع کر چکے تھے۔ ماحول کی جادوگری غزل کا مزاج اور ترنم کی چاشنی نے مل کر عجیب لطف پیدا کر دیا تھا۔ پھر کار کی چلنے کی آواز اور ہوا کی سرسراہٹ پلے بیک میوزک بنے ہوئے تھے سارے ہی ہم سفیر بڑی فیاضی سے داد دے رہے تھے کہ یکایک گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تب معلوم ہوا کہ ہم لائٹ ہاؤس پہنچ گئے ہیں۔ ڈرائیور نے اتر کر کار کا دروازہ کھولا اور سب لوگ کار سے اتر پڑے ہمارے ایک طرف ایک پہاڑ کھڑا تھا جس کی بلندی پر لائٹ ہاؤس کا منار کھڑا سمندری ٹریفک کی رہنمائی کر رہا تھا تو دوسری جانب بڑے انداز دلربائی کے ساتھ سمندر سے ہم آغوش ہو رہی تھی۔ ندی کا بہاؤ برائے نام ہی تھا گویا کہ طویل مسافت طے کرنے کی وجہ سے اتنی چور ہو گئی ہے کہ مزید چلنے کی سکت اس میں باقی نہیں رہی۔ یہ ملاپ بھی عجیب سحر انگیز تھا۔ ایک طرف سمندر اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ آگے بڑھ کر استقبال کر رہا تھا تو دوسری طرف ندی نے بڑی معصومیت کے ساتھ اس کی گود میں جانے کے لئے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے تھے کیونکہ ندی کی منزل آ چکی تھی اور اس کا مقصدِ حیات حاصل ہو رہا تھا۔

کار سے اتر کر ہم لوگ پہاڑ پر بنی سڑک کے ذریعہ لائٹ ہاؤس جانے کے لئے روانہ ہو گئے۔ اس سحر انگیز منظر سے مولانا سب سے زیادہ متاثر معلوم ہو رہے تھے۔ دو تین بار مرحوم نے فرمایا کاش کہ میں اپنا کیمرہ لے آتا اور ان مناظر کے فوٹو لے لیتا۔ یہ بار بار دیکھنے کو کہاں ملیں گے۔ میں نے کہا مولانا آپ نے فرمایا ہوتا تو کیمرہ کا انتظام بھی ہو جاتا۔ کہنے لگے "یہ کس کو معلوم تھا کہ یہاں ایسے مناظر بھی ہیں۔" تھوڑی دیر میں کہنے لگے "ہم لوگ شمالی ہند میں بیٹھ کر ان مناظر کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ مناظر تو غزل کی جان ہیں۔ شائد اسی لئے اردو غزل کی ابتدا جنوبی ہند سے ہوئی ہے۔" اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی یہاں تک کہ ہم لائٹ ہاؤس کے پاس پہنچ گئے۔ یہ پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا ایک منارہ ہے جس کے اوپری سرے پر ایک بہت بڑی سرچ لائٹ لگی ہوئی ہے جو اپنی کیلی پر مسلسل گھوم کر دور سمندر سے گذرنے والے جہازوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ مینارہ کے اندر جانے کے لئے انچارج انجینیر سے گفتگو کی۔ مینارہ کا دروازہ کھلے رہنے کا وقت ختم ہونے کے باوجود انجینیر نے دروازہ کھول کر ایک ایک کو اوپر لے جا کر دکھایا۔ اتنا اونچا پہاڑ چڑھنے کے بعد بھی مولانا مینارہ کی پتلی لوہے کی سیڑھی پر چڑھ گئے اور اوپر جا کر سب دیکھ بھال کر آئے۔ اسی مینارہ کے پاس ایک دوسرا مینارہ ہے جس میں سمندر کی سمت اوپر سے نیچے کئی لاؤڈ اسپیکر کے ہارن لگے ہوئے ہیں۔ انجینیر نے بتایا کہ جب سمندر کے ساحل میں طوفان ہوتا ہے تو ان ہارنوں سے مخصوص قسم کی آواز پیدا کر کے سمندر سے گذرنے والے جہاز کے کپتان کو اطلاع دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنا وہ اپنا جہاز اور گہرے سمندر میں لے جا کر طوفان سے محفوظ کر لے۔ اسی پہاڑ پر سمندر کی سمت ایک مستطیل (RECTANG ULAR) سفید روشنی لگی ہوئی ہے جس میں کئی رنگین دھاریاں بنی ہیں۔ انجینیر نے بتایا کہ اس کی روشنی سمندر کے اندر تقریباً ۱۲ میل دور سطح آب پر ابھری ہوئی چٹانوں پر پڑتی ہے تاکہ کوئی جہاز غفلت میں اس سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائے۔ مولانا بھی ان ساری چیزوں کو بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ پہاڑ کے اوپر ہی سے جب دائیں بائیں دیکھا تو حد نگاہ تک ناریل کے باغات پھیلے ہوئے نظر آئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا کہ یہ درخت سمندر کے محافظ چوکیدار ہیں جو لمبے تنوں کی سنگین لئے ہوئے لائن بنا کر حکم کے منتظر کھڑے ہیں۔ یہ سب دیکھنے کے بعد ہم سمندر کی طرف اترنے کے لئے مڑے ہی تھے کہ دیکھتے ہیں کہ مولانا تقریباً بھاگنے کی رفتار سے سمندر کی طرف اترتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے پکار کر کہا "مولانا خدا کے لئے اپنے اوپر رحم کیجئے اور سنبھل کر چلئے اگر پیر پھسل گیا تو آپ

سمندر میں نظر آئیں گے۔" مگر مولانا کہاں سننے والے تھے۔ میں نے پھر کہا: "اگر آپ اپنے اوپر رحم نہیں کرتے تو ہم پر رحم کیجئے۔ ایسا نہ ہو ہمارا مشاعرہ، بزم مشاعرہ کے بجائے جلسۂ تعزیت بن جائے۔" اس پر بھی مولانا نے کان نہیں دھرا۔ تب میں نے پھر کہا: "مولانا کم از کم تجلی کے لئے زندہ رہیئے ہمیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔" مگر وہ اسی رفتار سے چلتے رہے یہاں تک کہ ایک سطح چٹان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اس بوڑھے جسم اور مٹھی بھر گوشت سے محروم ہڈیوں کے اندر اتنا جوان دل اب بھی دھڑک رہا ہے اگر بڑھاپا اسی کو کہتے ہیں تو اس کی تمنا کرنا چاہیئے۔ وقت چونکہ تنگ ہو رہا تھا اس لئے عصر کی نماز پڑھنے کا ارادہ کر کے شیریں پانی کے چشمے پر ہم لوگ وضو کرنے بیٹھ گئے۔ دیکھتے کیا ہیں مولٰنا سمندر کے پانی کے قریب کائی جمی ہوئی چٹان پر ایک جگہ بیٹھ گئے جہاں سمندر کی موجیں آب رسانی کا کام کر رہی تھیں، سمندر میں اس وقت تموج زوروں پر تھا۔ ایک بدمست موج نے چٹان سے سر ٹکرایا اور اس کے اوپر اس طور سے چڑھتی چلی آئی کہ مولٰنا گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے کپڑے تو بھیگ گئے لیکن بات یہیں تک رہی ورنہ خطرہ کی گھنٹی تو سنائی دینے لگی تھی۔ جب وضو کر کے واپس لوٹے تو میں نے کہا مولانا کھاری پانی کے بجائے شیریں پانی ہی سے وضو کر لیتے تو بہتر تھا۔ بلاوجہ خطرہ کو دعوت دینے سے کیا فائدہ؟ کہنے لگے بھئی یہاں آکر بھی شیریں پانی سے وضو کرنا پڑی تو محرومی کی بات ہے۔ شیریں پانی سے تو ہمیشہ وضو کرتے ہی ہیں۔

واپسی پر منصور صاحب نے مولانا سے بیت المال کے اجتماعی قیام کے بارے میں پوچھا مولانا نے فرمایا کہ شریعت کا منشا تو اسی سے پورا ہوتا ہے اور اجتماعی بیت المال کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے مگر اس کے لئے قابل اعتماد اور دیانتدار افراد کا ہونا لازمی ہے، اگر یہ کہیں میسر ہوں تو کیا کہنا۔ کئی جگہ لوگوں نے اس کا انتظام کیا ہے اور اس کے مفید اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔ دیوبند کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں مرحوم نے کہا کہ اب دیوبند پہلے والا نہیں رہا۔ اس میں کافی تبدیلی آچکی ہے، اپنے تحقیقی کام اور حوالوں کے لئے وہیں کے دار المطالعہ سے استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ لوگ تجلی کے مؤقف کو پہلے سے زیادہ بہتر طور پر سمجھنے لگے ہیں۔

۲ر جنوری ۷۵ء کو مشاعرہ تھا۔ پنڈال میں سارے شعراء آچکے تھے اور سامعین مولانا کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے چین نظر آرہے تھے۔ مولانا تھوڑی دیر بعد تشریف لائے جب اناؤنسر نے مولانا کے نام کا اعلان کیا۔ وہ مائک کے پاس پہنچ گئے۔ طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے معذرت کرتے ہوئے چند قطعات اور ایک غزل سنانے کی اجازت چاہی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ لیکن شروع کرنے کے بعد غالباً بھول ہی گئے کہ معذرت بھی کر چکے ہیں۔ کئی قطعات، رباعیات اور غزلیات سناڈالیں اور غیر معمولی طور پر داد وصول کی۔ ٹیپ ریکارڈر کے ایک پورے کیسٹ میں مولانا چھائے ہوئے ہیں جسے اب بھی کبھی کبھی سن کر یاد تازہ کر لیتے ہیں۔ پڑھتے وقت مولانا کا ایک فوٹو بھی لے لیا گیا۔ اس پر مولانا نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ مشاعرہ صبح پانچ بجے تک جاری رہا، اور مرحوم بھی اسٹیج پر موجود رہے مشاعرہ ختم ہونے کے بعد ہی سارے شعراء کے ساتھ قیام گاہ کی طرف گئے۔ دوسرے دن بزم اردو نے مہمان شعراء کے ساتھ گروپ فوٹو لینے کا پروگرام رکھا تھا مگر مولانا نے اس میں شرکت کرنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ کہنے لگے آپ نے رات میں جو فوٹو لیا تھا وہی کافی ہے۔ خود سے فوٹو کھچوانا مناسب نہیں۔

اسی دن مقامی حضرات کی نشست میں مولانا کو سوالات کے جوابات دینا تھے۔ بھٹکل میں جتنی مساجد ہیں سب میں شوافع ائمہ مقرر ہیں ایک صاحب نے مولانا سے سوال کیا کہ کیا شافعی امام کے پیچھے حنفی مقتدی کی نماز ہو جاتی ہے۔ مولانا نے اس کا جواب نفی میں دیا اور وجہ یہ بیان کی کہ چونکہ شافعی امام سورہ فاتحہ کے بعد کچھ دیر وقفہ کر کے قرأت کرتا ہے۔ جو سکتہ کی تعریف میں آجاتا ہے اور سکتہ سے حنفی مسلک میں نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ جب موصوف سے کہا گیا کہ مولانا علی میاں اور مولانا ابو اللیث صاحبان تو نماز پڑھنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے مولانا کہنے لگے کہ میں مطمئن نہیں ہوں اور چونکہ اس قسم کا کوئی سوال ابھی تک میرے سامنے آیا بھی نہیں ہے اس لئے اس کی تحقیق کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ آپ ایک سوال

تجلی کو لکھ دیجئے میں تحقیق کر کے اس کا جواب چھاپ دوں گا اس سے اندازہ ہوا کہ موصوف فقہی مسلک میں شدت پر عامل تھے اور مکمل تحقیق کے بغیر فقہی معاملے میں بھی رائے دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ واقعہ دراصل ان کے احساس ذمہ داری اور علمی بلندی نیز طالبعلمانہ مزاج کا مظہر ہے۔

۴ر جنوری کو شعراء کی واپسی کا پروگرام تھا۔ مگر بھٹکل کے ایک باذوق نوجوان اور انجمن کے سرگرم رکن جناب عبدالغنی صاحب محتشم نے شعراء کے اعزاز میں ایک ظہرانہ کا اہتمام کر کے مہمانوں کو روکنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہو گئے۔ ظہرانہ کے لئے اپنے گھر کے بجائے سمندر کے کنارے بنے ہوئے ایک اہتمام کیا گیا۔ تقریباً ۲ بجے سب لوگ وہاں پہنچے۔ یہاں پھر ایک مِنی مشاعرہ وجود میں آگیا مگر گلے کی خرابی کی وجہ سے موصوف کچھ نہیں سنا سکے۔ اس موقع پر مولانا اور حاضرین میں سے ایک صاحب میں کچھ ناپسندیدہ گفتگو ہو گئی جس کو مولانا نے بڑے ضبط اور عالی ظرفی سے نظر انداز کر دیا جو اُن کی شان بزرگی پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور بڑی شرافت نفسی کے ساتھ اعلےٰ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے مولانا سے معذرت کر لی جس سے حاضرین کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں طرف سے جس اعلیٰ اخلاقی و کرداری معیار کا مظاہرہ ہوا ہے وہ قابلِ مسرت ہی نہیں قابلِ تقلید بھی ہے اگر امتِ مسلمہ کے افراد اسی طرح عالی ظرفی کے ساتھ دوسروں کی غلطیوں کو نظر انداز کرنے لگیں دوسری طرف سے بھی غلطی کا احساس ہوتے ہی اس پر شرمساری کے ساتھ معذرت طلبی کا رویّہ اپنایا جانے لگے تو ہمارے بہت سے مسائل پیدا ہی نہ ہوں۔ کاش کہ لوگ اس طرح سوچنے کی عادت ڈالیں اور اس پر عمل کرنے لگیں۔ جناب غنی صاحب نے دعوت میں جس سلیقہ مندی اور مہمان نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ اس اعتراف تو خود مولانا تجلی کے صفحات میں کر چکے ہیں۔ کھانوں میں شمالی ہند کے مذاق کو جس طرح ملحوظ رکھا گیا تھا۔ وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ کاش کہ بھٹکل کے کچھ اور نوجوان اس دلچسپی کا مظاہرہ کرتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد اس دن شام کو سارے شعراء گوا ہوتے ہوئے اپنے مستقر کو روانہ ہو گئے۔

ہم سمجھ رہے تھے کہ مولانا دیوبند پہنچ چکے ہونگے لیکن مولانا کے بمبئی کے لکھے ہوئے خط نے بتایا کہ :۔

"آج رات تک ہم یہیں دھرے ہوئے ہیں۔ مسلسل تین مشاعرے ہو چکے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے گلا بیٹھ گیا ہے اور کھاتے کھاتے معدوں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں ...... آپ کی پُر خلوص محبت ضیافت، دوستداری اور بے تکلفی کے نقوش تا دیر دماغ پر مرتسم رہیں گے۔ بلکہ شاید زندگی بھر دھندلے نہ ہوں ..... ایڈیٹر تجلی کی مٹی پلید ہو گئی مگر مجرم کوئی اور نہیں ہے خود یہی نالائق ہے جو خواہ مخواہ شاعر بن بیٹھا ہے۔ بقول شخصے ۔۔ اس شاعری میں عزتِ سادات بھی گئی۔ گھر والے یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ شاعر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خط لکھ کر ڈالے جا رہا ہوں۔ خدا کرے پہنچ رہے ہوں۔ نہ پہنچے تو گھر والے آپ ہی پر "قتل عمد" کا کیس دائر کر دیں گے۔"

(ماخوذ از مکتوب مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۷۵ء بنام ڈاکٹر صاحب)

پھر اس کے بعد موصوف نے دیوبند پہنچکر تفصیلی خط تحریر کیا۔ جس میں دیوبند پہنچنے کی رسید کے ساتھ تحریر تھا۔

"آپ نے مجھ جیسے "گمنام" شاعر کو اتنی دور دعوت دی یہی بڑا کرم تھا۔ پھر جس خلوص و مودت سے مہمان نوازی کی وہ مستزاد۔ جزوی طور پر مجھے یا کسی کو اگر کوئی معمولی تکلیف پہنچی ہو تو اس کا تعلق آپ کے قصد و ارادے سے نہیں۔ آپ کی مہمان نوازی، توجہ، قدر افزائی شبہ سے بالاتر ہے اور میں آپ کے حُسنِ اخلاق سے بہت متاثر ہوا ہوں۔"

(مکتوب مورخہ ۲۳ر جنوری ۱۹۷۵ء بنام ڈاکٹر صاحب)

مرحوم نے اس کے بعد پھر دیوبند سے ایک خط میں تحریر کیا۔

"جن حالات اور ماحول میں آپ ہیں اس میں سنبھل سنبھل کر چلنا ہی دانشمندی ہے۔ کام کرنے والوں اور دور اندیشوں کو گالیاں کھانا ہی پڑتی ہیں

روڑے کہاں نہیں اٹکائے جاتے۔ مگر آپ اللہ کے بھروسہ پر عزم و ہمت کے ساتھ ڈٹے رہیئے۔ اور دین و ملت کی بھلائی کے لئے جو بھی بن آئے کر گذرئیے۔

بے تکلفانہ ایک بات پوچھنے کو جی چاہتا ہے جشن کے لئے ناچیز کو مدعو کرنے میں اصلاً آپ اور طلبا کالج کے انتظامیہ کے کچھ افراد شریک تھے۔ ایڈیٹر تجلی کی حیثیت کو الگ رکھئے جس میں وہ مدعو کیا گیا تھا اسی کے رخ سے یہ نالائق داعیانِ کرام کی توقعات پوری کر سکا یا نہیں کر سکا؟ ظاہری واہ واہ کی بات الگ ہے میں قلوب و اذہان کے حقیقی تاثرات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ جواب بھی اتنا ہی صاف ہونا چاہیے جتنی صفائی خادم اپنی بکواس میں برتتا ہے۔

اہلیہ محترمہ کو بہت بہت سلام۔ میرے گھر میں بھی انہیں اور آپ کو سلام پیش کرتی ہیں۔ جشن کل دوسرے کرہ میں واقع نہ ہوتا تو عجب نہ تھا کہ نصف بہتر بغیر دعوت ہی کے آپ کی اہلیہ سے ملنے دوڑی چلی جاتیں۔ میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ بالکل گھر کا سا آرام ملا۔ بچوں کو بہت بہت پیار" کوئی سی بچی بہت یاد آتی ہے، مگر نام نہیں لوں گا ورنہ" دوسرے" بُرا مان جائیں گے۔"

(ماخوذ از مکتوب مورخہ ۶ر فروری ۷۶ء بنام ڈاکٹر حسنا)

ان اقتباسات سے بھی ملائی کے قلم کی بازگشت ڈنکے کی چوٹ سنائی دیتی ہے مگر "انداز زباں بندی" کا احترام کرتے ہوئے کچھ نہیں کہا جاتا۔

میں نے اس مضمون کی تیاری میں انھیں واقعات اور گفتگو کا تذکرہ کیا ہے جو خود میرے سامنے ہوئی ہیں تاکہ مولانا کی سیرت اور جس زندگی میں خلوص، محبت، شفقت۔ اپنائیت، حلم، بردباری حوصلہ افزائی اور درگذر جیسی تمام اعلیٰ اخلاقی و انسانی صفات موجود تھیں، تو دوسری طرف دین، اصولی اور علمی مباحث میں شدت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی اور انھیں دونوں صفات کا حسین امتزاج مومن کا مطلوبہ کردار ہے۔ بقول علامہ اقبال ے

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

موصوف کی یہی صفات ممیزہ ہیں جن کی وجہ سے وہ یاد آتے رہیں گے اور انہیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ حال ہی میں مدرسہ سہارنپور کے شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا مدظلہ کی ایک کتاب "فتنۂ مودودیت" نظر سے گذری۔ کتاب کے مباحث اور طرزِ لہجہ علمی سنجیدگی اور عالمانہ وقار سے عاری نظر آیا۔ اس میں دیئے گئے اقتباسات کا اصل عبارتوں سے موازنہ کر کے دیکھنے پر افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی۔ مصنف نے کتاب ترتیب دیتے وقت جس بے دردی سے قینچی کا استعمال کیا ہے علمی دنیا اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جوں توں کتاب آگے بڑھتی گئی۔ مرحوم کی یاد بھی اسی شدت سے آتی چلی گئی۔ اور اقبال کا شعر ذہنی افق پر ابھر آیا ے

خزاں میں بھی کب آ سکتا تھا میں صیاد کی زد میں
مری غماز تھی شاخِ نشیمن کی کم اوراقی

بقول ڈاکٹر انور علی، ایسی صورت میں یہی کہا جا سکتا ہے ے

خوشی ہے بزمِ خرد میں کہ آج دیوانے
صلیب و دار سے مقتل سے ہمکنار ہوئے

اس لئے کہ ے

حقیقتوں کے سمجھنے کی کب انھیں فرصت
بنا کے شیش محل صاحبِ نگار ہوئے

جی چاہا، کاش کہ مرحوم بقیدِ حیات ہوتے تو کتاب کے تبصرہ کا حق ادا کر دیتے۔ اس لئے کہ ایسی کتابوں پر علمی محاکمہ کرنے کے لئے وسعتِ مطالعہ کے ساتھ جس تعمق نظر اور جرأت کی ضرورت ہے وہ مرحوم میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ جغرافیہ بتانے میں تو مرحوم کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ ایسے معاملات جب بھی سامنے آئیں گے۔ مرحوم یاد آتے رہیں گے۔

مولانا اگرچہ ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کے علمی کارنامے بہرحال ہمارے پاس موجود ہیں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مضامین کے انتخاب مرتب کئے جائیں۔ فتاویٰ علیحدہ چھاپے جائیں۔ تجلی کے خاص نمبروں کو کتابی شکل دی جائے۔ مکتوبات جمع کئے

بقیہ بر ص

ایک صاحب قلم تھا نہ رہا

اطہر ریحان - شعبہ طب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کسی کو کیا معلوم تھا کہ پونا میں ہونے والا ایشیائی مشاعرہ مولانا کے لئے پیغام اجل ساتھ لایا ہے اور کسے خبر تھی کہ اس چہل پہل کی محفل اور بزم کیف و طرب میں یکایک صف ماتم بچھ جائے گی آپ اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باوجود پونا تشریف لے گئے، جبکہ اس سے چند روز قبل آپ پر قلبی دورہ پڑچکا تھا۔ جس کی وجہ سے بیحد کمزور ہو گئے تھے۔ نقاہت کا یہ عالم تھا کہ آپ خود کچھ لکھ بھی نہیں سکتے تھے خطوط وغیرہ املا کراتے تھے، آپ نے اپنے ایک مکتوب میں اپنے قلبی عارضہ کا بڑے ظریفانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے "موت آئی لیکن میں نے اپنے دلائل سے اسے زیر کردیا کہ مجھے مشاعرہ میں شرکت کرنی ہے۔ وہ واپس چلی گئی۔ دیکھئے خدا سے مشورہ کرنے کے بعد وہ کب واپس آتی ہے۔ بہرحال آپ اعزہ و اقربا کے اصرار کے باوجود مشاعرہ میں شرکت کے لئے ایک طویل سفر طے کیا مشاعرہ کے اسٹیج سے ابھی دو شعر پیش کر سکے تھے کہ فرشتۂ اجل نے روک دیا اور پھر کوئی دلیل و حجت کے بغیر تیسرے شعر کی اجازت نہ دی قلب کی حرکت بند ہو گئی اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی "انا للہ و انا الیہ راجعون" ۔ زندگی کی ناپائیداری اور موت کی بے رحمی کو کیا کہا جائے۔ ایک شخص جس نے عمر عزیز کے پورے ایام دیوبند کی مقدس سرزمین میں گذارے ہوں، تعلیم بھی وہیں پائی ہو حتیٰ کہ کاروبار کے لئے بھی وطن عزیز کو نہ چھوڑا ہو اس کے اعزہ و اقربا، احباب و معتقدین آخری دیدار کو بھی ترس گئے۔

شاہ فیصل کے سانحۂ ارتحال سے دل تڑپ کر رہ گیا تھا ابھی دل کی کسک مٹی بھی نہ تھی کہ موصوف کی وفات کی خبر دل و دماغ پر بجلی بن کر گری اور ایک آزردہ دل دوبارہ چھل گیا اور مجھے بھی اپنے اس ناتواں اور بے وفا دل پر کچھ زیادہ اعتماد نہ رہا کہ کب بیٹھ جائے بس راہی عدم کے لئے بار بار یہی کلمات زبان سے نکل کر فضا میں منتشر ہو رہے ہیں۔ ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

عامر صاحب مرحوم دور حاضر کے مایہ ناز انشا پرداز بلند پایہ شاعر ہی نہیں بلکہ متبحر عالم اور ماہر اسلامیات بھی تھے اور تعصب و تنگ نظری سے بالاتر شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ایک ہمہ جہت انسان تھے بیک وقت ادیب، نقاد، شاعر اور ایسے بے مثال وسیع النظر عالم تھے کہ جس کی نگاہ علم حدیث و تفسیر فقہ و عقائد کے ساتھ عصری علوم پر بھی گہری تھی۔ کسی قوم یا ملک میں اس طرح کے افراد شاذ و نادر ہی ملتے ہیں جن کو دینیات سے بے حد دلچسپی کے ساتھ ادب کی رنگینیوں سے بھی شغف ہو جہاں آپ فقہ و حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے، قرآن و عقائد میں آپ کی پختگی مسلم ہے تو وہیں شعر و شاعری، تنقید و تعریض طنز و مزاح کا عمدہ ذوق آپ کو موہبت تھا۔ اور آنے والی نسل

۱۔ عدم معلومات کی بنا پر لکھا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ مرحوم نے اپنی نظم "خواب جو بکھر گئے" پوری پڑھی اور ہسپتال میں جاکر آپ کا انتقال ہوا۔ (ایڈیٹر)

اس فن میں آپ کی مہارت اور دسترس کو تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکے گی جبکہ تعصب اور ضد کا بادل چھٹ گیا اور مطلع صاف ہو چکا ہوگا۔

عامر صاحب مرحوم اس دور میں ہمارے لئے خدا کی ایک نعمت تھے جو اب ہم سے چھن چکی ہے۔ موصوف کے قلم اور استدلال میں وہ قوت اور گرج تھی کہ قادیانیت کے شیطان بھی لرزتے تھے اور جب کبھی قادیانیت نے سر اٹھانے کی کوشش کی آپ نے اس کے جیب کے بخیلی چاک کر ڈالے اور اس کی لغویت و بے بنیاد حقلیت کا زوردار رد کر کے اسلام کو ایک عظیم فتنے سے بچایا۔ بدعت کی ریشہ دوانیوں اور اس کے جزو کل تجزیہ کر کے عوام از اس پر اس کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا اور منصب توحید و رسالت کی ناقدری نہ ہونے دی۔ اور تادم حیات عشق رسول کے پردے میں ہونے والی خرافات اور اسلام دشمن نظریات کی بیخ کنی کرتے رہے۔

اس موقع پر اگر آپ کی تحقیق اور وسعت نظر کا ذکر نہ کیا جائے تو آپ کے ساتھ سخت ناانصافی ہوگی۔ مرحوم میں جہاں یہ خوبی تھی کہ بغیر تحقیق و مطالعہ اور مضبوط بنیاد کے کسی موضوع پر قلم نہیں اٹھاتے تھے۔ وہیں اپنی کوئی غلطی ثابت ہو جانے کے بعد اس کے اعتراف سے قطعاً گریز نہ کرتے تھے۔ اور فوراً رجوع فرما لیتے تھے۔ جو بذات خود ایک کمال اور بلند ظرفی کی علامت ہے۔ آپ ایک وسیع النظر فاضل دیوبند تھے۔ آپ کی نظر ظاہر سے زیادہ باطن پر رہتی تھی۔ موصوف صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے ۱۹۷۵ء میں اتر پردیش راجدھانی لکھنؤ میں ہونے والی آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس میں دوران جلسہ عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا تو تمام ناظرین حیرت زدہ رہ گئے کہ عامر صاحب اسٹیج سے اتر کر ایک کنارے پر نماز میں مشغول ہو گئے جو پختہ ایمان کی علامت ہے۔

عامر صاحب ایک باعزم، حوصلہ مند اور دھن کے پکے انسان تھے، جس بات کو حق سمجھ کر ڈٹ جاتے پھر کوئی شے انھیں متزلزل نہیں کر سکتی تھی اور انہیں کوئی دلائل سے شکست نہیں دے سکتا تھا۔ جو موصوف کے راسخ الایمانی کا بھی ثبوت ہے۔ بہتیرے علماء نے بعض دینی مسائل پر اور دیگر اہل قلم حضرات نے دوسرے علمی و ادبی مسائل میں آپ کو زیر کرنا چاہا لیکن کبھی بھی کسی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور آپ نے کبھی بھی کسی کے زور قلم سے مرعوب ہو کر شکست تسلیم نہیں کی۔

مرحوم بیباک، صاف گو، حقیقت پرست، انشاء پرداز تھے۔ آپ کا طرز تحریر انتہائی دلکش، اسلوب بیان انتہائی پیارا افہام و تفہیم کا مدلل انداز۔ یہی وجہ تھی کہ تجلی ہر دائرہ میں لیا جاتا تھا۔ رسالہ کی ہمہ جہتی اور مقبولیت آپ کی وسیع النظری کا بین ثبوت ہے۔ مقبولیت کی ایک بڑی وجہ آپ کے قلم کی روانی برجستگی، سہل نگاری اور صاف گوئی بھی تھی۔ آپ کے مقالے اپنے موضوع پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ادبی دنیا کے لئے بھی کم قیمتی سرمایہ نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ تجلی کا ہر شمارہ ادب اور دینیات پر مستقل ایک کتاب ہے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا

مولانا مرحوم صرف ادیب ہی نہ تھے بلکہ اردو ادب میں ایک طرز ظرافت کے موجد اور گیسوئے اردو سنوارنے والوں میں تھے۔ آپ کے اشعار، تنقیدات، اور طنز و مزاح اردو ادب کے لئے ایک گرانقدر سرمایہ ہیں۔ آئندہ مورخ اردو ادب سے اس حصہ کو کبھی بھی الگ نہ کر سکے گا۔

عامر صاحب مرحوم کی براہ راست کئی زبانوں سے استفادہ پر ملکہ تھا۔ عربی، فارسی کے استاد تھے، ہندی انگریزی سے بخوبی واقف تھے اور زبان اردو تو آپ کی مادری زبان تھی۔ جو آپ کی وفات پر تاتم کناں ہے

موصوف تحریک اسلامی کے نظریات سے ہم آہنگ تھے جو صحیح فکر کا ثبوت ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کے ہاتھوں فروخت نہیں ہوتے تھے۔ وہ غیر جانبدار شخص تھے۔ حق کا ساتھ دینے اور باطل سے دلی نفرت رکھتے تھے۔ دیوبند سے فارغ تھے لیکن نظریات کی لڑائی برابر قائم رہی۔ جہاں انھوں نے اپنے مضامین و خیالات میں جمعیۃ العلماء پر اعتراضات کئے ہیں۔ وہیں موقع پڑنے پر دعوت، جماعت اسلامی کو بھی نہیں چھوڑا ہے اور انھوں نے جمعیۃ العلماء یا دارالعلوم کے کسی فرد پر تنقید اور اس کی کوتاہیوں سے آگاہ کیا ہے تو بعض مسائل میں اپنے قریبی دوستوں مولانا حامد علی صاحب، سید عروج احمد قادری صاحب، محمد مسلم صاحب اور شمس پیرزادہ

صاحب جیسے اساطین جماعت سے بھی اختلاف اور تنقید تجلی کے صفحات میں موجود ہے۔

آپ کی شخصیت متنوع اوصاف کی حامل تھی۔ ہر محفل، مجلس میں عامر صاحب کی قدر کی جاتی تھی۔ آپ نیک طینت متواضع اور ملنسار انسان تھے۔ ان کی مختلف النوع خدمات ہیں میرے نزدیک سب سے بڑی خدمت بدعت اور تعصب و تنگ نظری کے خلاف جنگ ہے۔ دنیا ہمیشہ مدیر تجلی کو یاد رکھے گی۔ اور ان کا نام ہمیشہ عقیدت واحترام کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔ کیونکہ علمی وادبی احترام کے آگے سارے اعزاز ہیچ ہیں۔ آپ تاریخ کے صفحات سے آسودہ خواب ہو سکتے ہیں لیکن میرے دل ودماغ سے کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ مرحوم کو علماء اور اہل دین سے ایک نسبت تھی۔ مذہبی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت پر یقین رکھتے تھے اور اس کے رواج کے لئے کوشش بھی کیا کرتے تھے۔

آہ حسین احمد مدنیؒ کا ترتیب کردہ دنیا سے اٹھ گیا مولانا اعزاز علیؒ کا شاگرد رشید دنیا سونی کر کے چلا گیا۔ اس دور کا فقیہ، محدث، عالم دین اور ایک صحافی اٹھ گیا۔ رونق مشاعرہ، بلبل گلزار ادب اور اسلامیات کا ماہر کوچ کر گیا۔ آہ! اب کون قادیانیت کے جیب و گریباں چاک کرے گا۔ بدعت کے خلاف جنگ کون لڑے گا "یا عبد القادر شیئاً للہ" جیسے فرسودہ خیالات کی وضاحت اور اس کی تردید کون کرے گا۔ کھرے کھوٹے، تجلی کی ڈاک کی داد تحقیق کون دے گا۔ اب "آغاز سخن" اور "احوال واقعی" دیکھنے کو آنکھیں ترس کر رہ جائیں گی۔ آہ تجلی کا سہاگ لٹ گیا۔ اب شاید ہندوستان میں اس کے بعد کوئی دوسرا باوقار، مدلل اسلام پسند ادبی رسالہ رسالہ نہ نکل سکے گا۔ آپ کی وفات نے ہند و پاک بلکہ پوری دنیائے اسلام کے لوگوں کو کبیدہ خاطر کیا ہے۔ آپ کی وفات سے تمام حلقوں میں ایک ایسا خلا سا پیدا ہو گیا جس کے پر ہونے کی کوئی امید بظاہر نظر نہیں آ رہی ہے۔ لیکن پھر بھی شمس نوید عثمانی کے خلوص اور حسن احمد صدیقی صاحب کی محنتوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اور خلا کچھ پر ہوتا سا نظر آنے لگا ہے۔

میں نے مقطع بھی ختم کر رہا ہوں اور میرا دل کانپ رہا ہے

اور اب مسافر عدم کے لئے مغفرت کی دعا میں مصروف ہے ایسے نادرہ روزگار، صاحب کمال صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں مگر ان کے کارنامے انشاء اللہ دنیا میں حیات جاوید پائیں گے

سالہا زمزمہ پرداز جہاں خواہد بود
ایں نواہا کہ دریں گنبد گرداں زدہ است

مخزن المعلومات

لائبریری میں جاکر پچاس کتابیں ٹٹولنے سے

بہتر یہ ہے کہ

▲ آپ گھر بیٹھے صرف ایک ہی کتاب کا مطالعہ کر کے معلومات عامہ کی دولت اپنے دامن میں سمیٹ لیں

▲ مخزن المعلومات کے صفحات میں آپ کو وہ سب کچھ ملے گا جو کسی لائبریری کی پچاس کتابیں الٹ پلٹ کرنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

▲ مکتبہ تجلی شکیل احمد عاصم بریلوی (ایم اے، ایم کام، بی ٹی) کی عرق ریزی کو مجتمع کر کے انتہائی اعتماد کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں مبصرین کی ایک ہی رائے ہوگی

"دلچسپ، مکمل، ہمہ گیر"

اس کتاب میں ہند اور بیرون ہند کے جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، اقتصادی، صنعتی، سائنسی، اور تعلیمی حقائق پر معلوماتی روشنی ڈالی گئی ہے اور بڑی تعداد میں قابل ذکر شخصیتوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

کم و بیش چار سو صفحات پر مشتمل۔ رسالہ سائز قیمت ۲۰/-

ناشر:- مکتبہ تجلی۔ دیوبند۔ (یوپی)

مولانا عامر عثمانی

ایک ہمہ گیر شخصیت

محمد اعجاز امروہی متعلم دارالعلوم دیوبند

اس دنیائے ناپائیدار میں بہار و خزاں کا دور دورہ ایک بدیہی امر ہے، کسی کلی شگفتگی پر فرطِ انبساط سے قہقہے لگانا یا رنگ برنگ، نوع بنوع گلوں کے پژمردگی پر اشکبار ہونا، کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کے پرستاروں کے لئے کوئی تعجب انگیز، تحیر آمیز بات نہیں ہے۔ ہاں وارثانِ انبیاء جب اس دارِ فنا سے دارِ بقا کے دبیز پردوں میں روپوش ہوجاتے ہیں، یا یوں کہہ لیجئے کہ جب ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی ہے تو اس جاں گسل، اندوہ آمیز حادثہ پر جس قدر بھی اشک افشانی کی جائے کم ہے۔ یہی قابلِ تعظیم و تکریم ہستیاں ہیں جن کی مساعی جمیلہ سے دنیا کا نظام چل رہا ہے، جب اس لائق عظمت و منزلت ہستیوں سے خطۂ ارضی خالی ہوجائے گا اور دنیا کے کسی بھی گوشہ اور جگہ میں ایسی ہستیوں کا وجود نہ ہوگا تو حکومتیں اور سلطنتیں تاخت و تاراج ہوجائیں گی، بادشاہت اور جمہوریت دم توڑ دے گی نظامِ عالم درہم برہم ہوجائیگا، چنانچہ محسنِ انسانیت، سرورِ کون و مکاں محمد ابن عبد اللہ ہاشمی صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔ موت العالم موت العالم۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ایسی ہستیوں کے لئے دعا و استغفار میں مصروف رہتی ہیں۔ ان کی موت سے افلاک ہل جاتے ہیں، زمین کانپ جاتی ہے۔

چنانچہ نقادِ اعظم حضرت مولانا عامر عثمانی صاحبؒ بھی انھیں ہستیوں میں سے تھے جن کا وجود ان کے پرستاروں کے لئے باعثِ رحمت اور صد سرمایۂ صد افتخار رہتا۔ آپ کی وفات ایک عظیم انسان ہی کی وفات نہیں بلکہ ایک فقید المثال ادارہ کی وفات ہے اور آپ کی وفات عالمِ صحافت اور دنیائے تنقید ہی کا ماتم نہیں بلکہ مسلمانوں کا ماتم ہے، اسلام کا ماتم ہے علم کا ماتم ہے عمل کا ماتم ہے۔ وقت کروٹیں بدلتا رہے گا۔ کائنات گردش کرتی رہے گی۔ سورج معمول کے مطابق نکلے گا۔ اور ڈوب جائیگا۔ آسمان ہر شام شفق کی گلگوں قبا پہنے گا۔ تاروں کی انجمن منعقد ہوگی۔ چاند اپنے طلوع و غروب کے ضابطے پورے کریگا، غرض مظاہرِ فطرت ازل سے ابد تک اسی طرح قدم اٹھائے آگے بڑھیں گے.... مگر آسمان صحافت کا جو آفتاب غروب ہوچکا ہے، اور جو ادب کی کائنات اجڑ چکی ہے اور جو تحقیق کا ستارہ ٹوٹ چکا ہے۔ وہ آفتابِ صحافت پھر طلوع نہیں ہوگا، اور کائناتِ ادب ہمیشہ ویران رہے گی اور اس تحقیق کے ستارہ کا دوبارہ ابھرنا ممکن نہیں اور وہ چاند آئندہ کبھی تنقید کے دریچوں سے نہیں جھانکے گا، مولانا عامر عثمانیؒ کی وفات پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے، لیکن دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ ہر ذی روح کو موت کا

ذائقہ چکھنا ہے اور رب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ جس نے یہاں بھیجا ہے۔ زندگی اور موت اسی کے قبضہ میں ہے جس نے یہ سلسلہ جاری کیا ہے۔ بالآخر صبر ہی سے کام لینا ہے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام مرحمت فرمائے آمین

مولانا عامر عثمانی رح ایک جید عالم تھے سیاست کے رموز و اسرار سے بھی انھیں واقفیت تھی وہ بلند پایہ مورخ و محقق اور بے نظیر مفکر و فلسفی تھے تو صاحب طرز، انشاء پرداز اور مایہ ناز ادیب اور سخن داں اور سخن سنج بھی، مولانا کی شخصیت ہر میدان میں ممتاز نظر آتی تھی، لیکن مولانا کی جو خصوصیت ہر جگہ نمایاں تھی وہ ان کا تنقیدی شعور تھا...... اسی تنقیدی شعور نے ان کی شخصیت کا تعارف مذہبی، سیاسی اور علمی، ادبی حلقوں میں صحیح طور پر کرایا، اگر قدرت نے ان کو تنقید کا زبردست ملکہ عطا نہ کیا ہوتا تو شاید ان کی شخصیت وقت کے دھندلکوں میں اتنی واضح، اتنی صاف اور اتنی روشن نہ دکھائی دیتی۔ انھیں جو بلند اور منفرد مقام حاصل ہوا شاید حاصل نہ ہوتا، ان کے سیاسی اور مذہبی مضامین ہوں یا ادبی نگارشات ان میں تنقیدی شعور کی پرچھائیاں صاف طور پر دکھائی دیتی ہیں، مولانا نے تجلی کے ذریعہ تھوڑی ہی مدت میں علمی، ادبی، سیاسی مذہبی حلقوں میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ تجلی کے لفظ لفظ نے ایوانوں میں گرمی، اور طبقوں میں امنگ پیدا کر دی اور اس کے جملے جملے میں بجلی کی کڑک، بادل کی گرج، آندھیوں کی سنسناہٹ، سیلاب کی روانی، وہ سب کچھ تقاضوں کی وقت کی ضرورت تھی۔ تجلی کے مضامین اس وجہ سے مقبول ہوئے کہ وہ عام رنگ سے بالکل ہٹ کر لکھے گئے تھے۔ اور خیالات و نظریات میں بھی نیا پن تھا اور ان میں ماحول پر کڑی تنقیدیں اور بھرپور وار تھا۔ اور مولانا عامر صاحب کی ادبی نگارشات میں دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی۔ سبزہ کی مہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی کی تپش، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یہ ساری چیزیں ایک حسین امتزاج کے ساتھ ملیں گی جس کے ثبوت کے لئے تجلی کے صفحات ہی کافی ہیں۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کا دفاع طاقت سے کرو طاقت میسر نہ ہو تو زبان سے مقابلہ کرو اور اگر یہ بھی کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو ظلم کو دل ہی میں برا سمجھو۔ یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔ تو مولانا عامر عثمانی صاحب کے پاس طاقت نہ تھی مگر زبان اللہ تعالیٰ نے مرحمت فرمائی تھی اور اس زبان کو نوکِ قلم میں بدلنے کی صلاحیت بھی عطا فرمائی تھی لہٰذا قلم کو حتی الوسع اپنے پیارے نبی ﷺ کے ارشاد کے مطابق استعمال کرتے رہے۔ مولانا عامر عثمانی صاحب عنفوانِ شباب ہی سے مسلسل اور غیر منقطع طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نام کو بلند کرتے رہے ہیں، اور دین دشمن خیالات و افکار کی بیخ کنی ان کا شعار رہا ہے۔ اپنی ساری زندگی انہوں نے اسلام کی خدمت میں صرف کر دی، کلمۃ اللہ کی عظمت و حرمت کی خاطر وہ ہر طرح کی آزمائشوں سے سینہ سپر رہے ہیں، اپنوں اور بیگانوں کی مخالفت، الزام تراشی اور بہتان طرازی کا نشانہ بنتے رہے، کبھی مولانا کو مایوسی ہوئی اور نہ ان پر سستی و کاہلی کا دورہ پڑا، ایک ایسے آدمی کی طرح جو آخرت کو اپنی منزل بنائے ہوئے تقدیر الٰہی پر راضی اور ہر حال میں صابر و شاکر چلا جا رہا ہو، مولانا عامر عثمانی دعوتِ حق کے سنگلاخ پر گامزن تھے۔ کانٹے چبھتے رہے۔ کنکر زخمی کرتے رہے، ٹھوکریں لگتی رہیں، خون ٹپکتا رہا مگر اس مردِ مجاہد کو کسی قسم کا فکر دامنگیر نہ ہوا، بلکہ اپنی دھن میں مست اپنے ناقابل شکست عزم کی چادر میں لپٹے رہے اور آگے بڑھتے گئے کبھی آہستہ آہستہ، کبھی تیز گامی کے ساتھ اور کبھی گرتے سنبھلتے۔

دنیا کی کم ذوقی اور ناقدری نے بیسیوں اہل کمال کے رخ نمود پر گمنامی کے تہ بر تہ پردے ڈال دیئے ہمارا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مولانا عامر عثمانی صاحب کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا... نہیں بلکہ آپ کا نام ابھی زندہ ہے اور غالباً جب تک دنیا میں علمی کمال، تدریجی حقائق اور ادبی لطافت کا سکہ جاری رہے گا تو آپ کے نام کی گونج بھی سنائی دیتی رہے گی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ممدوح کی قدر دانی جیسی ہونی چاہیے تھی نہ ہوئی اور آپ کا نام ایک مخصوص حلقہ میں محدود ہو کر رہ گیا۔ مبارک ہے آپ کی زندگی جس کی خوشبو سے دنیا معطر ہے، جس کا زمانہ قیام دنیا کے لئے باعث خیر و برکت ہے جس کی خاک کا ہر ذرہ گوہر آبدار کی طرح چمک رہا ہے۔ خلوص و صداقت کے شیریں چشمے ان کے لگائے ہوئے پودوں کو سرسبز و شاداب کر رہے ہیں۔ مولانا ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر زندہ ہیں کاغذ کے ٹکڑوں پر جسے تجلی کہتے ہیں، خیالات امڈ رہے ہیں جذبات بیتابیاں مگر صفحات کا دامن تنگ ہے۔ اسلئے قلم روک لیا گیا ہے۔ ۴

۴ دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار ◆ گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

جناب شمس نوید عثمانی

پھر ملیں گے!

۱۹۵۶ء میں میری شادی میری چچا زاد بہن خدیجہ سے ہوئی تھی اور خدیجہ میرے مرحوم "بھائی صاحب" مولانا عامر عثمانیؒ کی حقیقی بہن ہیں۔ اس شادی کے بعد بھائی صاحب ہم دونوں کو ہر سال تعطیلات بسر کرنے کے لئے دیوبند بلایا کرتے تھے۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ دیوبند سے واپسی کے وقت انھوں نے کبھی یہ الفاظ ادا کئے ہوں جو مرض وفات کے موقع پر ہماری واپسی کے وقت اس سال ان کے ہونٹوں پر اس حال میں سنے گئے کہ آنکھوں میں آنسو تھے اور اپنے چہرے سے میرے چہرے کو رخساروں کو رخساروں سے لگائے ہوئے انتہائی یقین و شوق سے انشاء اللہ کے بغیر فرمایا "پھر ملیں گے!"

ظاہر ہے اس دنیا میں ایک ملاقات کے بعد کسی دوسری ملاقات کا ایسا یقینی امکان کہاں؟ ہاں لیکن ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس کے بعد کوئی رات نہیں! جس دن "جامع الناس" اللہ تعالیٰ تمام نوع انسانی کو میدانِ محشر میں سمیٹ لانے والا ہے ۔۔۔ وہاں سارے انسانوں کا ایک بار یکجا ہونا ایسا یقینی امر ہے کہ اس میں "انشاء اللہ" کہنے کی بھی ضرورت نہیں اس لئے اللہ یہ فیصلہ کر چکا، پہلے ہی چاہ چکا ہے کہ وہ انسانیت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو قیامت کے دن مجتمع کرکے رہے گا۔ تو کیا جب بھائی صاحب مرحوم مجھ سے یہ کہہ رہے تھے کہ "پھر ملیں گے!" تو اس وقت ان کی زبان پر خدا کی تقدیر بول رہی تھی؟ خدا کرے ایسا ہی ہو! ۔۔۔ اور مجھ جیسا سیاہ کار بندہ ان جیسے جاں نثار بندے سے وہاں ملاقات کرکے جہاں ان کے متعلق رحمت و مغفرت کے حسین ترین سلسلے کا حسن ظن پیدا کرتے والے ہزاروں آثار ہم کو اس دنیا میں دکھائے گئے۔ اُف! کیسا سنسنی خیز اور شکر انگیز ہے یہ تصور! ۔۔۔ حسن کے "یکطرفہ" کی "امکانی حقیقت کا تصور: اور پھر مغفرت و رحمت کے جاں نواز سلسلے میں ایک انتہائی گنہگار اور ایک انتہائی جاں نثار اور خدا کار بندے کی ملاقات کا تصور! ۔۔۔ وہاں جو مل گیا پھر کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوگا ۔۔۔ جہاں آخری ہار جیت کا وہ منظر سامنے آ رہا ہوگا کہ جو جیتا وہ ہمیشہ جیت گیا اور جو ہار اوہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہار گیا ۔۔۔۔۔۔ جہاں خیر و شر کی قسمت کا آخری فیصلہ ہوگا تو ساری انسانیت دو قانونوں میں بٹ جائے گی ۔۔۔ ایک وہ قافلہ جس کے سالارِ کارواں حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہوں گے اور دوسرا وہ جس کا رہبر انسانیت کا بدترین رہزن ابلیس ہوگا۔ سوچتا ہوں کیا اے میرے رب! تو اس دن مجھے ایک ایسے بندے سے ملا دینے کا معجزہ رحمت دکھانے والا ہے جس نے پچیس سال تک تیری کتاب اور تیرے آخری رسولؐ کی سنت پر زندگی کے شب و روز قربان کئے تھے؟ جس نے تیرے حق کا کلمہ بلند کرنے کے لئے اس دنیا کے ذلیل بندوں کی گالیاں کھائی تھیں؟ ۔۔۔ جس نے حق گوئی کی قربان گاہ پر اپنی عزت و آبرو کو اس طرح داؤں پر لگایا تھا کہ رمضان المبارک میں روزے کی حالت میں بھی اُسے تیری راہ میں ہتھکڑیاں پہنے دیکھا تھا اور اس وقت آہنی سلاخوں کے پیچھے بھی وہ اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے گھر کی خوشیوں کے درمیان کوئی مسکرا سکتا ہے ۔۔۔ جسے تیرے رسولؐ اور ان کی سنتوں سے ایسا گہرا عشق تھا کہ اس سے ٹکرانے والی کوئی شے بھی ایسی نہ تھی جسے وہ "خاموش تماشائی" کی طرح دیکھتا رہے اور اس سے خود ٹکرا نہ جائے ۔۔۔ خواہ وہ شے اس کی کتنی ہی قریبی اور عزیز دنیا سے متعلق کیوں نہ ہو، خواہ وہ شے طاقت اور استحکام کے لحاظ سے آہن و فولاد کا پہاڑ کیوں نہ ہو، لیکن اس کی کوئی جذباتی نسبت اور اس کی مادی قوت اس بندۂ حق کو نہ حق گوئی اور جاں نثاری کے خلاف نرم کر سکی ۔۔۔ نہ سراسیمہ کر سکی ۔۔۔ جس کی

جس کی کیفیت اس معاملہ میں یہ تھی کہ وہ مصلحت اور جان بچانے کو اس راہ میں اپنی سب سے بری موت سمجھتا تھا اور جس کی آرزو تھی کہ وہ بدعت کے خلاف زبان وقلم کی تلوار چلاتے ہوئے جانِ جاں آفریں کے حوالے کرے ——— اور ——— جس کی یہ آرزو ایک عجیب "معجزے" کی شکل میں پوری ہوتی ہوئی بھی ہمیں نظر آئی ہے۔

اس "معجزۂ رحمت وقدرت" کی تفصیل یہ ہے کہ خود مرحوم نے اپنے مرضِ وفات اور زندگی کے آخری نہایت قیمتی ایام میں مجھے بتایا کہ جب گذشتہ قریبی عرصہ میں وہ کچھ مشاعروں کی دعوت پر جنوبی ہند گئے تھے تو بمبئی میں انھوں نے کمیونزم کے خلاف اپنی تازہ ترین، طویل نظم پڑھی، اور بستر علالت پر بیٹھ کر انھوں نے مجھے وہ نظم اپنی زبان سے سنائی بھی۔ کیسی عجیب تھی وہ نظم! اور اس کو پڑھنے کا انداز کیسا عہد آفریں سوز و درد کا تھا! ——— نظم تو ایسی تھی کہ شاید دشمن حق وصداقت کے سوا کوئی آدمی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایسا لفظی دروبست اور ایسا تدریجی انداز تھا اپنے فکر ونظر کو سامنے رکھنے کا کہ دھیرے دھیرے جیسے قلب ودماغ کی ساری گرہوں کو کھولتا جارہا ہو۔ ——— اور پڑھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی بوڑھا سپہ سالار اپنے لشکر کو کسی خوفناک ترین معرکے کے نشیب وفراز کی طرف گہرے فیصلہ کن اشارات کر رہا ہو ——— مرحوم نے بتایا کہ اس نظم کا اثر میری توقعات کے خلاف نہایت کامیاب ہوا ——— مرحوم کو اندیشہ تھا کہ موضوع کی خشکی شاعروں کے مزاج سے میل نہ کھا سکے گی مگر ہوا یہ کہ "از دل خیزد بر دل ریزد" کی تصویر کھینچ کر رہ گئی۔ اس کے بعد جہاں ایک طرف متاثرین کے تاثرات کی حسین آوازیں آئیں وہاں حق دشمنی کہنے والوں کی ایک آواز یہ بھی آئی کہ "ہونے والے ایشیائی مشاعرہ میں انھیں کوئی پوچھے گا!!..." نہ جانے کس نے کیا کیا ہوگا کہ اس پر اس نظم کے خالق کے خلاف نہیں بلکہ خود خالقِ حقیقی کے خلاف کسی بدنصیب نے اس طرح نفرت وحقارت کا زہر اگلا ——— مرحوم نے بتایا کہ اس جملہ سے مجھے حق دشمنی کی عفونت اُبلتی محسوس ہوئی ——— جیسے کہنے والا مجھے نہیں بلکہ اس حق کو حقیر ظاہر کر رہا ہے جس کو حالیہ نظم نے طاغوتی ذہنوں پر بم کی طرح مارا تھا ——— لہٰذا مرحوم کا کہنا تھا کہ میں نے خدا سے عجیب کیفیت میں بندگی کے ناز اور ضد بھرے انداز میں دعا کی کہ "خدایا! اس مشاعرے میں تو آپ کو بلوانا ہوگا!" اس کے بعد مرحوم دیوبند واپس چلے آئے، ایشیائی مشاعرے کا اعلان ہوا اور اس کے اشتہار میں عامر عثمانی کا نام نہیں تھا۔ بمبئی کے کسی دوست نے انھیں "پس پردہ" کا یہ راز بتایا کہ مشاعرے کے ذمہ داروں کے سامنے آپ کا نام پیش ہوا تھا مگر کچھ ایسے لوگوں نے جو بمبئی میں آپ کے سامنے فرطِ عقیدت میں جوتے چاٹنے کو نظر آتے تھے انھوں نے ہی اس کی مخالفت کی" مرحوم نے انھیں کہہ دیا کہ "میں شاعر نہیں اصلاً مدیر تجلی ہوں۔ اس لئے اگر بلایا جاتا تو تعجب ہوتا، نہ بلائیں تو کیا حیرت؟" لیکن اس کے بعد پھر اسی دعا پر اعتماد کی یہ باطنی آواز قلم سے نکل گئی "لیکن یاد رکھنا! انھیں بلانا ہوگا!" اور ——— واقعی ایسا ہی ہوا۔ نہ جانے کیسے دوسرا اشتہار شائع ہوا اور اس میں عامر عثمانی صاحب کا نام موجود تھا اور دعوت نامے یکے بعد دیگرے غالباً تین بار موصول ہوئے۔ خدا کی رحمت وقدرت کے اس معجزے کا دوسرا رخ بھی سامنے آیا۔ دیوبند میں مرحوم کو جو پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا تمام معالجوں کے نزدیک وہ اسی رات گویا مرچکے تھے، زندگی کی کوئی علامت اور جانبر ہونے کا کوئی ظاہری امکان ان لوگوں کی علمی وفنی نظر میں باقی نہ رہا تھا ——— نبضیں، بلڈ پریشر، دھڑکنیں سب ڈوب جانے کا جیسے فیصلہ کر چکی تھیں اور بہترین ڈاکٹر نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ آخری دوا کا انجکشن دیکر بے اختیار یہ کہہ دیا کہ "بظاہر ان میں کچھ نہیں رہا" لیکن وہ دعا! غالباً وہ کام کر رہی تھی۔ اور جس قادر مطلق سے یہ دعا کی گئی تھی وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اپنے اس بندے کی یہ "ضد" پوری کرکے رہے گا خواہ اسے مرنے والے کو اتنی دیر کے لئے ایک نئی زندگی کیوں نہ دینا پڑے۔ بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے ایک مُردے کو جلا دیا گیا ——— وہ گھنٹوں اور دنوں میں زندگی اور صحت وافاقہ کی سمت میں طوفانی رفتار سے اڑتا ہوا نظر آیا اور چند دن کے بعد اس کی قوتِ ارادی کے لائق اس کے اس جسم کو آلۂ کار بنا دیا جسے بظاہر ہارٹ اٹیک کی شکل میں سکرات موت نے نچوڑ کر

رکھ دیا تھا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس مشاعرے کے اسٹیج پر جا پہونچے اور اپنی آواز سے باطل کے قلعوں میں آخری زلزلہ کی دھمک دوڑا نے کی "ضد" اور "دھن" پوری کرلی —— اور پھر پھر اسی طرح سنیچر کی ایک رات غالباً پندرہ دن کے بعد آئی اور پونا میں وہی مرض اس بار "درد" کے بجائے ڈوبتی ہوئی کیفیت "SINKING - CONDITION" کے ساتھ عود کر آیا اور وہاں پر موجود رامپور کے ایک قیمتی شاعروادیب ڈاکٹر عنوکار کے بقول ایسی تیزی سے وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے جیسے اچانک پتنگ کٹ کر نکل جائے اور ڈور ہاتھوں میں رہ جائے —— انا للہ وانا الیہ راجعون (یارب! ان حادثوں سے یہ حقیقت ہم پر کھل گئی کہ، ہم سب تیری چیز ہیں اور تجھ سے آملیں گے ")

اس واقعہ میں ایمان وعمل کے مجاہدوں کے لئے بعض بڑے ہی قیمتی اشارے محسوس ہوتے ہیں مثلاً ایک تاثر یہ پیدا ہوا کہ چونکہ مرحوم کی زندگی کا۔ ایک مخصوص رنگ بن چکا تھا کہ وہ دھن کے پکے تھے اس قدر پکے کہ جس بات کو کرنے کا وہ فیصلہ کرلیں پھر مخلوق کا کوئی خوف اور نقصان کا کوئی اندیشہ انھیں اس راہ سے ہٹانے والا نہ تھا۔ اس دھن کے ساتھ ساتھ ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ حق کو سننے اور دل سے جان لینے کی صلاحیت پوری طرح بیدار رہتی تھی اور اپنی "غلطی" کو برحق منوانے یا ماننے کی خو چھپانا حماقت سے انھیں قلبی بیر تھا۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ ہوا کہ ہم اپنی زندگی میں جو اچھی روش اختیار کرلینے کا فیصلہ کرلیتے ہیں اللہ تعالےٰ کی مدد ہمیں اس روش پر قائم رکھتی ہے جبکہ ہماری طاقت جواب دے گئی ہو۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دھن کے پکے انسان کی .... یہ "آخری دھن" بھی خدا نے اپنی قدرت ورحمت کے غیر معمولی ہاتھ سے پوری ہی کرکے دکھادی جس کے پورے ہونے کی کوئی ظاہری صورت اس آدمی کے اندر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی ہستی میں بندہ نواز کیسی رعنائیوں پرسے بھی حجاب اٹھتا ہے! اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کاش اس ہستی کا دیدار ہم بھی کرسکیں!!

اور — میں سوچتا ہوں کہ کیا ایسے جلیل القدر خادم دین سے مجھ جیسا "پسماندۂ پسماندگان" آخرت کی کسی اعلیٰ محفل خلد میں مل سکے گا؟ اور کیا " پھر ملیں گے" کے یہ الفاظ میرے مالک نے اس خادم دین کے مقدس ہونٹوں سے سنوا کر ایک ٹوٹتے ہوئے دل کو رحمت وبندہ نوازی آخری درجہ کی تسلی دی ہے؟ اے کاش! یہ تصور محض خوش اندیشی اور تمنا کیشی کی سرحدوں میں محض ایک "تصور" ہی نہ رہے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے اس پشیمانِ زندگی بندے سے ایسا کوئی کام بھی لے لے جس کے بعد یہ "تصور" حقیقت کا ٹھوس روپ دھارن کرکے۔ آمین یارب العالمین

میرے تعلقات کی دنیا کے کتنے ہی انسان اس دنیا سے میرے سامنے کوچ کرگئے لیکن نہ جانے کیوں بھائی صاحب مرحوم کی رحلت نے جس طرح یہ شوق سا لگا دیا ہے کہ برزخ کا پردہ سرکا کر میں بھی اس دوسری دنیا میں داخل ہو کر اپنے بھائی صاحب کے دوش بدوش چل پھر سکوں جس طرح دیوبند میں قیام کے دوران اکثر وبیشتر ہم دونوں ساتھ ساتھ نظر آتے تھے، ایسا شوق آخرت کسی دوسری موت سے کبھی پیدا نہ ہوا تھا۔ جس طرح ہمیں حدیث رسول میں خدا کے مقرب بندوں کی ایک علامت یہ بتائی گئی ہے کہ ان کو دیکھ کر خدا یاد آجائے، کچھ ایسی ہی کیفیت مجھے بھائی صاحب کی زندگی کے بعد ان کی "موت" میں محسوس ہورہی ہے کہ بے اختیار آخرت کی کشش دل کی دھڑکنوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہورہی ہے۔ خدا کرے یہ ان کی مغفرت ومقبولیت کی کوئی علامت ہو! اور خدا کرے میں آخرت کی اس پرکشش دعوت کو اس طرح قبول کرسکوں کہ اب میری بقیہ زندگی کا ہر لمحہ لمحہ اس عظیم ترین دور افتادہ ترین سفر ...... کی تیاریوں کے علاوہ اور کسی دوسری چیز پر صرف نہ ہونے پائے۔ میری آرزو ہے کہ میں نے زندگی کے گذشتہ آٹھ نو سال جس "موضوع" پر صرف کئے ہیں خدا اس کی میرے ہاتھ سے تکمیل کرادے اور اپنے رحمت بھرے دونوں ہاتھوں سے قبول بھی فرمالے وہ موضوع اور وہ مشن یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے "رحمۃ للعالمین" ہونے کے کچھ پہلو کی خدمت کرسکوں —— غیر مسلم دنیا کے سامنے حضور پر کچھ ایسی کتابیں اس دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑ جاؤں جن کے مطالعہ میں ایک غیر مسلم یہودی، عیسائی، ہندو وغیرہ نیز ایک "کمیونسٹ ملحد" کے لئے دلچسپی کی کشش کا پہلو موجود

ہو، جیسا کہ ایک مومن کے لئے ہوتا ہے : اللہ تعالیٰ نے میری اس آرزو کو راہ دکھائی ہے اور انگریزی اور ہندی میں اس طرح کے لٹریچر کا ایک خاکہ میرے جستجو کے ہاتھوں میں عنایت فرما دیا ہے۔ اور اب محض میرے گناہ حائل ہیں جو اس خاکے میں رنگ بھرنے کی منزل کو مجھ سے دور کئے ہوئے ہیں۔ میں ہاتھ پھیلا رہا ہوں خدا کے سامنے کہ وہ مجھے معاف فرما دے اور گھسٹ رہا ہوں اس سمت میں کہ یہ منزل موت سے پہلے میرے قدموں تک کھنچ کر آجائے ——— اور آپ سب سے التجا ہے کہ اپنی اشک آلود دعاؤں سے میری مدد فرمائیں۔ میں خاص طور پر یہ درخواست ان سب بھائی بہنوں سے کرتا ہوں جنھوں نے میرے یا عزیزم کے نام بھائی صاحب کی تعزیت ناموں میں مجھ سے "تجلی" میں تعاون کی بات کہی ہے۔ ان سب تعزیت کرنے والوں کی خدمت میں ان سطور کے ذریعہ ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں یقین دلاتا ہوں کہ اپنی بساط بھر میں ان کی اس آرزو کو پورا کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں کہ غیر مسلم بھائیوں کے لئے میں جو کام کرنا چاہتا ہوں خدا اس کی تعمیل کرا دے اور میری قوتِ ایمانی و جسمانی اور وقت میں برکت عطا فرمائے اور مغفرت کی نعمات سے محروم نہ فرمائے آمین۔

یعقوب سروش۔ ایم اے بی ایڈ

موت بڑے طمطراق سے آئی

مولانا عامر عثمانی صاحب مرحوم جیسے ذی علم اور اہل قلم کے بارے میں مجھ جیسا ناچیز بھلا کیا لکھ سکتا ہے ؟ لیکن "تجلی" سے میرے تقریباً بیس سالہ تعلق نے جذبات میں مدوجزر پیدا کر دیا ہے۔ اسی لئے ذیل کے چند سطور بہ انداز خراج عقیدت پیش کر رہا ہوں ـــــ مضمون کا عنوان مولانا مرحوم کے اس خطبے لیا گیا ہے جو انھوں نے اداریہ "دعوت" کو اپنی وفات سے ایک ہفتہ قبل لکھا تھا !!۔

۱۹۷۵ء کے بہار کے مہینوں میں اسلام کے تین فرزند ہم سے چھن گئے ـــــ

سرزمین دکن کے ایک مایہ ناز سپوت تحریک اسلامی ہند کے ایک پُرجوش رہنما، میدانِ خطابت کے ایک شہسوار، اور حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم و حساس ایک مونس غمخوار مولانا نکیفی صاحب نے فروری میں آنکھیں موندلیں ـــــ

پھر مارچ کے مہینے میں پاسبانِ حرم، شاہ فیصل نے جامِ شہادت نوش کیا ـــــ جن کا دل اسلام کی سربلندی کے لئے دھڑکتا تھا ـــــ جن کے خزانے اسلامیانِ عالم کے لئے ہمیشہ کھلے رہے۔ جو ایک عظیم عرب قائد ہی نہیں، ایک عظیم مرد مسلمان تھے۔ جو بیسویں صدی کے مادی دور میں اللہ کی ایک نشانی بن کر ابھر آئے تھے اور جنھوں نے اپنی فراستِ ایمانی کے ذریعہ بڑے بڑے عالمی سیاست کاروں کی بساط الٹ کر رکھدی تھی ـــــ !!

ابھی دل کے زخم ہرے تھے، ابھی آنکھیں اشکبار تھیں، اور ابھی صدمے تازہ تھے کہ ایک اور موت بڑے طمطراق سے آئی ـــــ اُس کے پاس آتی ہوئی تاریکیوں میں ایک چراغ جلایا کرتا تھا ـــــ جو باطل کے ہر محاذ پر ڈٹ کر کھڑا ہو جاتا تھا ـــــ جس کے قلمی جہاد نے ابن تیمیہؒ کی یاد تازہ کر دی تھی ـــــ اور ہم نے بڑی حسرت سے، بہت دکھ سے سنا کہ ہمارا محبوب عامر عثمانی ابدی نیند سو گیا ہے ـــــ زبانیں گنگ تھیں اور آنکھیں کھلی کی کھلی ـــــ اظہار رنج و غم کے لئے نہ ہی الفاظ ملتے تھے اور نہ ہی صبر و ضبط کا یارا باقی رہا ـــــ محفلِ احباب ہو یا بزم اہلِ علم، بازار ہوں یا مساجد، ہوٹلیں ہوں یا چوراہے، ہر شخص کی زبان پر "تجلی" اور عامر عثمانی ہی کا چرچا تھا۔

ہاں وہی مولانا عامر عثمانی صاحب جنھوں نے ربع صدی قبل تجلی کا چراغ جلایا تھا ـــــ بدعات و محدثات کی آندھیوں میں بھی یہ چراغ جلتا رہا ـــــ شرک و کفر کی ظلمتوں کو پاش پاش کرتا رہا ـــــ کتنے ہی بھولے بھٹکے راہِ راست پر آگئے ـــــ کتنے ہی مجاوروں مذہب کی فسوں کاری ختم ہو کر رہ گئی ـــــ پھر اس چراغ کو بجھانے کے لئے کتنے ہی "احبار و رہبان" نے صف آرائی کی ـــــ الزام تراشی، بہتان طرازی اور یاوہ گوئی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا ـــــ لیکن مولانائے محترم نے اپنا قلم نہیں رکھا ـــــ تشنگان علم اور طالبانِ حق سیراب ہوتے رہے ـــــ وہ فقیہ بن کر لوگوں کے استفسارات کا مدلل جواب دیتے، محدث بن کر درس حدیث پیش کرتے، محقق بن کر ادق سے ادق مسائل بھی سہل کرکے صفحے کے صفحے نکال ڈالتے ـــــ وہ ایک عظیم حق گو عالم دین

بہترین انشاء پرداز، اور بے لاگ تنقید نگار تھے ـــــــ اور جب وہ ملا ابن العرب مکی بن کر مسجد سے میخانے کی طرف چل پڑتے تو ان کا قلم بلغ دبہار کا سماں باندھ دیتا، طنز و مزاح اتنا شگفتہ اور اتنا دلچسپ ہوتا کہ ہنسی کا ضبط کرنا محال ہو جاتا اور ساتھ ہی عبرت کے درس بھی مل جاتے ـــــــ برجستہ مکالموں منظر نگاری اور اعلیٰ افسانوی ٹکنک سے اپنی تحریر کی جادوگری کو اتنی اثر انگیز بنا لیتے کہ پرائے اور مخالفین بھی چھپ چھپ کر مسجد سے میخانے تک کی سیر کر جاتے۔

اپنے اپنے بھانت کے کرداروں کے ذریعہ وہ معاشرے پر بھرپور وار کر جاتے ـــــــ ان کا زندۂ جاوید کردار خود ملا مکی "کا ہے۔ جو سر روجر ڈی کورلی (SIR ROGER COVERLY) کی طرح مجبور امداد نظر آتا ہے ـــ ملا مکی نے ایڈیٹر تجلی کو اپنا "سالا" بنا کر دنیا جہاں کی ساری سنجیدگی اس میں بھر دی تھی۔ ملا مکی کی بیوی ملا مکی کی ہمشیرہ تھی جو ملا سے ہمیشہ بچی "دہابن" ہونے کے سنتے رہنے کی عادی ہو گئی ـــــــ !!

ہم منتظر تھے کہ ملا مکی، تجلی کے کہانی نمبر میں طنز و مزاح کی آخری سرحدوں کو چھو لے گا، سوسائٹی کے ناسوروں کو برہنہ کر دے گا ـــــــ لیکن ملا کی قلم کی موت نے توڑ کر رکھ دیا ـــ !!

پھر بھی عامر عثمانی "شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو انداز اور تیور بدل جاتے ہیں ـــــــ ایک ایک شعر مرصع، ایک ایک لفظ نگینہ ـــــــ ایک دفعہ میں نے اُن کے کلام پر اپنے تاثرات انھیں لکھ بھیجے تھے تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ

"ناچیز کی غزلوں پر آپ نے جن تاثرات کا
اظہار کیا ہے وہ شاید آپ کے حسن ظن اور محبت
کا ثمرہ، ورنہ میں کیا اور میری غزل کیا ـــــــ
سارے اوقات فرصت تو نثر نگاری میں کٹتے ہیں۔
اور وہ بھی خشک موضوعات پر ـــــــ کبھی کبھی
فطری آرٹ پسندی کا دبا ہوا جذبہ کسی خارجی محرک
سے جاگ اٹھتا ہے تو کچھ شعر موزوں کر لیتا ہوں
ـــ تجلی کے بہت سے قارئین، تجلی میں میری غزل
کو پسندیدگی کا تمغہ عطا کرتے رہتے ہیں تو ان کی
خاطر بھی کبھی چھاپ دیتا ہوں بس ـــــــ
"کچھ شاعری ذریعۂ شہرت نہیں مجھے"
(تاریخ نوشت ۳۱ اگست ۱۹۷۵ء)

آج مولانا عامر عثمانی ہم میں نہیں ہیں ـــ وہ اپنے پروردگار کے پاس چلے گئے ہیں ـــــــ تجلی کے ذریعہ انھوں نے اسلام کی جو خدمت انجام دی ہے ـــــــ دلوں میں ایمان کی جو شمع جلائی ہے ـــــــ اور گم گشتگان راہ کی جو رہنمائی کی ہے، اُن سب کا صلہ پانے کے لئے اپنے رب کے حضور پہونچ گئے ہیں!

خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کے مدارج کو بلند کرے اور ہم سبھوں کو صراط مستقیم پر چلنا آسان کر دے۔ آمین

جناب حامد سراجی

ایک کو موت آگئی عالم پریشاں ہوگیا

مدیر تجلی کا انتقال ہوگیا، ایک بیباک صحافی اٹھ گیا۔ عامر عثمانی کو موت آگئی۔ ایک کہنہ مشق شاعر اپنے مالک حقیقی سے جا ملا غرض کتنی باتیں لوگوں کی زبان پر ہیں۔ لیکن میں سوچتا ہوں کیا مدیر تجلی ہم سے جدا ہو سکتے ہیں؟ کیا وہ اپنے شیدائیوں کو سوگوار چھوڑ کر جا سکتے ہیں؟ اور اگر چلے بھی جائیں تو کیا ہم انھیں بھول سکتے ہیں؟ کیا ان کی یاد ذہن سے نکالی جا سکتی ہے؟ کیا ان کے کارناموں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں: ایسا کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ مولانائے محترم کے کارنامے ان کے بارے میں چیخ چیخ کر اعلان کر رہے ہیں۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دنیا دار فانی ہے۔ یہاں لوگ روز مرتے ہیں۔ متعلقین کو روتا ہوا چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھ دنوں تک یادوں کی بارات سامنے رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ نقش دھندلا پڑ جاتا ہے اور لوگ ایک حد تک مرنے والے کو فراموش کر دیتے ہیں۔ لیکن جب تک اردو زبان ہے جب تک لوگ شعر و شاعری سے حظ اندوز ہوتے رہیں گے جس وقت مزاحیہ مضامین میں لوگ دلچسپی لیتے رہیں گے۔ فقہی مسائل کی ضرورت جب تک پڑے گی۔ مدیر تجلی کی تصویر لوگوں کی نگاہوں کے سامنے پھرتی رہے گی۔

محترم مدیر تجلی ایک حق گو عالم۔ صاحب طرز انشا پرداز۔ بے باک صحافی، ایک کہنہ مشق شاعر تھے، نکتہ سنجی اور ظرافت تو ان میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی، ان کی بیباکی اور جرأت حق گوئی کے بڑے بڑے لوگ قائل تھے۔ موصوف زندگی بھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ الخ پر عمل پیرا رہے اور جا بجا علمائے دین اور "صاحب جبہ و دستار" کے دجل و فریب اور مکر و ریا کی پردہ دری کرتے رہے چنانچہ شیوخ و اکابر اور "خداوندان مکاتب" پر آپ کی تنقید کو پڑھتے ہوئے لوگ فرط حیرت سے انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں اور یہ کہنے پر مجبور رہیں کہ یہ مرد مومن بلا خوف حق کی اشاعت کے لئے زندگی گذار رہا ہے۔

آئین جوانمردی حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مولانا مرحوم اپنے مسلک کے بہت پابند تھے اور جس بات کو حق سمجھتے اس کی شدت سے تائید کرتے چاہے مخالفت کا طوفان ہی کیوں نہ کھڑا ہو جائے۔

بذلہ سنجی، ظرافت اور قلم کی شوخی کا یہ عالم کہ خشک سے خشک مضامین کو پر لطف انداز بیان کے ذریعے قاری کے ذہن کو اپنی طرف کھینچ لیتے اور لوگ پڑھنے کے لئے بیقرار ہو جائے۔

آپ جب "ملا ابن العرب مکی" کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو یہ بات حاشیۂ خیال سے نکل جاتی ہے کہ یہ خالص دینی مسائل پر داد تحقیق دینے والے مدیر تجلی مولانا عامر عثمانی فاضل دیوبند ہیں۔

"مسجد سے میخانے تک" کے لئے جب آپ کا قلم اٹھتا ہے تو کتنے دلگرفتہ اور مغموم نظر آتے ہیں اور کتنوں کے ہونٹوں پہ تبسم دکھائی دیتا ہے۔

مُلّا اپنے قلم کا تیر و نشتر کا نشانہ ارباب وجد و حال قبروں کے مجاور "بندگان در دولت" ضمیر فروش لیڈران اور ریاکار عالمانِ دین کو بناتا ہے اور "سرمست پیروں فقیروں کی دنیا" میں تو اس نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔

"مسجد سے میخانے تک" میں ملّا کی تصویر نظر آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک "دادا" قسم کا انسان ہے۔ اخلاق کے نام سے ناواقف ہے اور جھوٹ اس کی محبوب اور پسندیدہ شے ہے۔ اگرچہ مجھے ملاقات کا شرف حاصل نہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے آپ اجنبیوں سے اس طرح ملتے تھے جیسے برسوں سے بچھڑا بھائی دوسرے بھائی سے ملتا ہے۔

"فن" کے کلام پر بے لاگ تبصرہ پڑھتے ہوئے عامر صاحبؒ کی ذہانت و فطانت اور فہم و فراست کا لوہا ماننا پڑتا ہے اور قاری یہ کہے ہوئے نہیں رہ سکتا کہ واقعی اس فن میں بھی مولانا کو دسترس حاصل ہے اور تنقیدی شعور حد سے بڑھا ہے۔

مولانا مرحوم کی شاعری کے سلسلے میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا جا سکتا ہے کہ اپنی طرز کے منفرد شاعر تھے، آج جبکہ شاعری میں بے راہ روی عام ہو چکی ہے کاش مولانا جیسی مصلحانہ شان لئے کچھ شخصیتیں اٹھیں اور معاشرہ کے زخم پر مرہم رکھ کر ان کے درد کا درماں کر سکیں۔

جوشؔ نے شاعر کی جو تعریف کی ہے وہ مولانا پہ کتنی اچھی طرح صادق آتی ہے۔

جس کے دفتر میں ہو اس کے عہد کی ہر کیفیات
موسم و ماحول و راہ و رسم آئینِ حیات

"تجلی کی ڈاک" میں پُر لطف، دلچسپ اور شرعی سوالوں کے جوابات اپنی مثال آپ تھے۔ مولانا موصوف باریک سے باریک مسئلے اور پیچیدہ تر سوالات بہت ہی خوبی اور آسانی سے حل کر کے ذہن میں بٹھلا دیتے تھے۔ افہام و تفہیم کا ملکہ حاصل تھا اندازِ تحقیق نہایت ہی دلکش اور نرالا تھا۔

اب جبکہ مولانا مرحوم اپنے مالک حقیقی سے جا ملے ہیں۔ ادبی و علمی دنیا میں ایک وسیع النظر عالم ایک نڈر صحافی اور ایک صاحبِ طرز انشا پرداز سے محروم ہو چکی ہے میں ایک آواز سن رہا ہوں۔

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق

ہم بارگاہِ الٰہی میں موصوف کی مغفرت کے لئے دستِ بدعا ہیں۔ خدا انھیں اجر کثیر اور جزا رجزیل سے نوازے

متاعِ جاں نثادی جس نے ایثار و اخوت پر
الٰہی رحمتوں کے پھول برسیں اسکی تربت پر

جناب شبیر احمد آرہی
بھیونڈی

مَوتُ العَالِمِ مَوتُ العَالَم

حضرت مولانا عامر عثمانی کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے انھیں جب دیکھا تو مسرور و خوش باش دیکھا۔ ان کے الفاظ زندگی کے ترجمان ہی نہیں تھے۔ زندگی کی حقیقی روح پھونکنے والے بھی تھے۔ مذہبی صحافت کے آسمان پر وہ آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے دمکتے رہے "تجلی" کے ذریعہ وہ ملک کے کونے کونے ہی میں نہیں بیرونِ ملک میں بھی علم و فضل، تحقیق و جستجو، شریعت و حقیقت کی روشنی پھیلاتے رہے، اُن کی زندگی کی آخری کاوش "تجلی کا طلاق نمبر" ہے جسے انہوں نے اپنی زندگی ہی میں بڑی آن بان سے شائع کیا۔ اختلاف کی گنجائش کہاں نہیں نکلتی "طلاق نمبر" کے دلائل اور حوالہ جات کو بھی معرضِ بحث میں لایا گیا، طویل اور مسلسل مضامین لکھے گئے، مولانا مرحوم کی مسلکی ذہنیت کی تضحیک کی گئی لیکن ان سب کی حیثیت منہ چڑانے سے زیادہ نہ بن سکی، ان کی آئینہ کی طرح صاف شفاف تحریر، شگفتہ، شستہ و رفتہ اندازِ بیان، بیشمار ٹھوس دلائل اور ناقابلِ انکار حوالہ جات کے مقابلے میں "ترجمان" دہلی کی ژولیدہ بیانی، جھنجھلک طرزِ نگارش، درجۂ ثقاہت سے گرے ہوئے اشارے اور مسلک اہلِ حدیث کی تنگ دامانی کے مظاہرے ہمارے نزدیک قابلِ اعتنا نہیں۔ اگر ہم نے صحیح سمجھا ہے تو کچھ عرصہ سے مذکورہ بالا پرچہ اپنے اندازِ فکر و نظر کو دوسروں پر تھوپنے کی جارحانہ مشق جاری رکھے ہوئے ہے۔

مولانا عامر عثمانی سے مری ملاقات کو ایک خوشگوار حادثہ کہنا مناسب ہوگا۔ محترم ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کی دعوت پر میں ان کے طلب کردہ آل انڈیا مسلم یوتھ کنونشن میں شرکت کے لئے دہلی گیا ہوا تھا کنونشن کے انعقاد کا سارا اہتمام خاصے بڑے پیمانے پر "ہندیان" میں کیا گیا تھا۔ مدعوئین کے متعلق مجھے تفصیلی معلومات نہیں تھی۔ اور یہ بات تو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی تھی کہ مولانا عامر عثمانی سے اس موقع پر نیاز حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوگی۔ مولانا حسبِ ذوق ایک ٹیبل پر بکھرے ہوئے کتابوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ میرے ایک دوست نے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا "مولانا عامر صاحب [illegible] وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں متعارف ہونے کے لئے بے چین ہوگیا۔ لیکن مولانا کے انہماک کو دیکھ کر مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور انتظار کرتا رہا۔ چند منٹ بعد مولانا مڑے اور میں نے بڑھ کر انھیں سلام کیا۔ انھوں نے کوئی خاص توجہ نہیں کی اور آگے بڑھ گئے۔ بہرحال میں نے اسے اتفاق سمجھا اور دوسرے بہتر موقع کا انتظار کرتا رہا۔ مولانا کو بغور دیکھنے کے بعد ان کی عظمت کے بارے میں مجھے مطلق حیرت نہیں ہوئی۔ انہوں نے ظاہر کو سجا کر اپنی ذات کو وجیہ بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کی حقیقی وجاہت ان کے نقد و نظر میں پائی جاتی تھی جسے صرف اہلِ علم کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں اور وہی اُس کے حقیقی قدردان ہوسکتے ہیں۔

مولانا سے پھر مدتوں ملاقات نہ ہوسکی۔ البتہ تجلی نظروں سے گذرتا رہا اور اسے پڑھ پڑھ کر مرحوم کے حیرت انگیز مطالعہ اور غیر معمولی علم و تفقہ کا دل سے قائل ہوتا رہا میں نے ان کا سا عالی ظرف کم دیکھا۔ اپنے کسی بھی مخاطب کو تسلیم کرنا ان کے لئے مقابلتاً اتنا ہی آسان تھا [illegible] کے لئے مشکل تھا

مخالفین میں کتنے ایسے ہوں گے جن میں یہ جرأت ہوگی کہ وہ اپنی غلطی کو اپنے ہی قلم سے بارہا تسلیم کریں، میں ان کی تعداد ظاہر کرکے کسی کی توہین کرنا نہیں چاہتا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ مخالفین کے تحریروں کو دیکھ کر اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے کہ ہر غلطی کے لئے ناقابلِ تسلیم "جواز" ڈھونڈ نکالنا اپنی غلطی کو تسلیم نہ کرنے کے لئے ہزار جتن کرنا اور تسلیم کرلینے کو اپنے مقام و مرتبہ کی توہین سمجھنا ہماری زندگی کا وطیرہ بن چکا ہے، لیکن مولانا کی روش بالکل مختلف تھی۔ وہ نہ صرف اپنی غلطی کو کھلے دل کے ساتھ تسلیم کرتے تھے بلکہ اپنے آپ کو اسی زد و قلم کا نشانہ بن کر اس قدر سرزنش و ملامت کرتے تھے کہ پڑھنے والے کو بھی ناگوار گذرتا تھا۔ "تجلی" کے صفحات میں اس کی بکثرت مثالیں آپ کی نظروں سے بھی گذر چکی ہوں گی۔

قارئین تجلی کے علم میں یہ بات ہوگی کہ ۶۳ء کے اوائل میں رضا خانی مولویوں نے بھیمڑی میں محمد بالس حقانی کی بدعت شکن اور ایمان افروز تقریروں کے خلاف ایک طوفان کھڑا کردیا تھا، اگرچہ مولانا حقانی کسی مسلک یا کسی مذہبی گروہ کے خلاف لب کشائی نہیں کرتے بلکہ ان خرابیوں کے خلاف جو مسلمانوں میں مذہبی رنگ لیکر در آئی ہیں، نہایت دلچسپ پُر مزاح اور قرآن و حدیث سے دلائل کی روشنی میں بولتے ہیں۔ پھر بھی رضا خانی بدعتیوں کے خلاف ان کی تقریریں ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہیں کیونکہ ان بدمذہبوں کی پیر پرستی، قبر پرستی، آثار پرستی، صندل، چادر اور گاگر کی فریب کارانہ حکمتیں جن کا مقصد شکم پروری، تن آسانی، اور عیش پرستی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ناکامی کے خطرے سے دوچار ہو جاتی ہیں۔ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ مجھے پہلی بار دیوبند جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے دل میں بڑی خواہش تھی کہ میں مولانا سے ملوں اور بہت سے مسائل پر اُن سے تبادلہ خیال کروں، گو وقت کی تنگی مانع رہی اور دوسری طرف یہ احساس ہر وقت پریشان کرتا رہا کہ جن مشکوک اور ناقابلِ اعتبار خدمیت سے مجھے واسطہ پڑا ہے۔ وہ میری غیر موجودگی میں خاطرے کے تعلق سے نہ جانے کیا گل کھلائے، میں مولانا سے ملے بغیر واپس آگیا۔ لیکن پھر جلد ہی مولانا سے خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہوگیا۔

مولانا عامر عثمانی مرحوم و مغفور کو جماعتِ اسلامی سے جو لگاؤ تھا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ۶۳ء کے اواخر میں جماعت مذکور کا ایک عظیم الشان اجلاس دہلی کے گاندھی درشن میدان میں منعقد ہوا دنیا کے مختلف مسلم ممالک سے نمایاں ہستیاں شریک اجلاس ہوئیں۔ تجلی کا کتابگھر بھی اجلاس کی زینت تھا اور مولانا عامر بھی تشریف لائے تھے آخری شب کی ادبی نشست میں مولانا نے نہایت عمدہ کلام پیش فرمایا۔ حاضرین نے بہت پسند کیا لیکن مشاعرے کے اناؤنسر کا رویہ غالباً ناقابلِ فہم ہی رہا کیونکہ انھوں نے مولانا کو دوبارہ زحمتِ کلام نہیں دی۔

میرے لڑکے اُسامہ کو مولانا سے بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے خود ہی مولانا کو تلاش کرکے اپنے ایک دوست کے ہمراہ اُن سے ملاقات کرلی۔ میرے نام اپنے خط میں مولانا اُسامہ کا ذکر فرماتے ہیں۔ جہاں مجھے اس بات پر فخر ہے کہ مولانا عامر عثمانی اپنی زندگی کے آخری ایام میں مجھے برابر خط لکھتے رہے، وہاں اس پر بے حد مسرور رہوں کہ وہ میرے نوجوان لڑکے اُسامہ سے بہت محبت کرتے تھے اور اسے دعائیں دیا کرتے تھے۔ جماعتِ اسلامی کے اجلاس کے بعد مولانا سے ہماری ملاقات دیوبند میں اُن کے دولت خانہ پر ہوئی مولانا نے مجھے اور اسامہ کو بڑے تکلف سے چائے پلائی۔ اس دوران میں مختلف معاملات و مسائل سے تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہا۔ اُسامہ دوزانو سر جھکائے خاموشی سے ہماری گفتگو سنتا رہا۔ مولانا سے رخصت ہوکر جیسے ہی ہم زینہ اتر کر تنگ سڑک پر آگئے۔ اُسامہ خود بخود مولانا کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنے لگا۔ وہ مولانا مرحوم کی صاف گوئی اور سادگی اور خوش اخلاقی سے بہت متاثر تھا۔

مشاعروں سے مولانا دور رہتے تھے۔ وہ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ تصورات و خیالات کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان بھی منفرد تھے۔ عام مشاعروں میں شرکت سے اجتناب کی وجہ سے کل ہند مشاعرہ منعقد کرنے والے اُن سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ لیکن جو لوگ ذاتی تعلق کی بنا پر انھیں کرتے تھے۔ مولانا ان کو مایوس نہ کرتے تھے۔ کون جانتا تھا کہ جن مشاعروں میں شرکت سے وہ اس قدر محترز انہی میں سے ایک اُن کی موت کا بہانہ بن جائیگا۔

اپنے ایک مداح کے مسلسل اصرار پر مولانا کار وار کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئے۔ حفیظ میرٹھی مولانا کے ہمراہ تھے اختتام پر مولانا کو بعض مجبوریوں کی وجہ سے بذریعہ جہاز گوا جانا پڑا اور وہاں سے وہ بمبئی تشریف لائے اور جماعتِ اسلامی کے دفتر میں مقیم ہوئے۔ مجھے مولانا کے اس طویل اور تھکا دینے والے سفر کا کوئی علم نہ تھا۔ غالباً

مولانا سے تعلق خاطر کی وجہ سے ایک دن میں جماعت اسلامی کے دفتر پہنچا۔ وہاں یہ معلوم کر کے میں حیران رہ گیا اور مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ مولانا دفتر میں قیام فرما ہیں۔ ملاقات ہوئی اور پھر خوب خوب باتیں ہوئیں۔ دوسرے دن مہاراشٹر کالج میں ایک مخصوص شعری نشست ہوئی جس میں حفیظ میرٹھی کے علاوہ محسن انصاری اور راقم الحروف نے بھی غزلیں پیش کیں۔ مولانا عامر صاحب ترنم ریز شاعر نہیں تھے لیکن تحت اللفظ میں اُن کے پڑھنے کا انداز بہت متاثر اور پُر جوش ہوتا تھا سچ پوچھئے تو وہ اس انداز میں بھی منفرد تھے۔ انہوں نے متعدد قطعات اور غزلیں سنائیں اور خوب داد حاصل کی۔ مولانا کو ایشیائی مشاعرہ میں مدعو کرنے کا خیال اُسی وقت بعض لوگوں کے ذہن میں ابھرا تھا جس کی ایک حلقہ سے سخت مخالفت ہوئی۔ بالآخر انہیں مدعو کیا گیا۔ ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ یہی دعوت مولانا کی موت کا پیش خیمہ بنی۔

کاروار سے واپسی پر مولانا چند روز بمبئی میں ٹھہرے۔ میرے اور اُسامہ کے اصرار کے باوجود بھیمڑی تشریف نہ لا سکے۔ لیکن وعدہ فرمایا کہ ایشیائی مشاعرہ کے موقع پر ضرور تشریف لے چلیں گے۔ دیوبند پہنچنے پر مولانا نے مجھے جو خط لکھا اس میں اس کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے

ہم سب کو خوشی تھی کہ مولانا ۱۱ر مارچ ۱۹۷۵ء کے ایشیائی مشاعرہ میں شرکت کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ یکایک بالکل خلافِ توقع ایک دن شیخ عبدالستار سیکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ نے مجھے یہ افسوسناک اطلاع دی کہ مولانا عامر عثمانی تشریف نہیں لا رہے ہیں۔ میں نے گھبراہٹ اور بے چینی کے عالم میں وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ ان پر دل کا دورہ پڑا۔ کیا کیا پروگرام بنائے تھے، کن کن مقامات کا دورہ کرنا تھا کیسی کیسی شخصیتوں سے ملاقاتیں کرنی تھیں۔ ایک کس قدر بے بس اور مجبور بنا دیا اب ایک دوسری فکر لاحق ہو گئی۔ مولانا کس حال میں ہیں۔

۱۱ر مارچ ۱۹۷۵ء کی صبح کو بمبئی پہنچا مختلف کاموں سے فارغ ہو کر مشاعرہ گاہ میں کوئی ۸ ½ بجے آیا تو معلوم ہوا کہ مولانا عامر عثمانی بھی تشریف لائے ہیں۔ اور کہیں مقیم ہیں۔ سخت حیرت ہوئی۔ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ ابھی دو ہفتے پہلے مرض کا اسقدر شدید حملہ ہوا تھا کہ گھنٹوں بیہوش پڑے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے کیسے اجازت دی ہو گی۔ خویش واقارب اتنے طویل اور تکلیف دہ سفر کے لئے کیونکر آمادہ ہوئے ہونگے کوئی معقولیت سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ اطلاع دینے والا یہ نہ بتا سکا کہ مولانا کا قیام کہاں ہے اور نہ بانیان مشاعرہ بتا سکے کیونکہ مولانا کی آمد کی کوئی اطلاع انھیں بھی نہ ملی تھی۔ مجبوراً مشاعرہ گاہ ہی میں مولانا کا انتظار کرتا رہا۔

کوئی گیارہ بجے ہوں گے کہ مولانا چند احباب اور خدمت گذار کے ساتھ تشریف لائے۔ میں شہ نشین کے قریب بیٹھا مولانا کا منتظر تھا مصافحہ کیا تو مجھے تپ کا احساس ہوا۔ مولانا نڈھال سے ہو رہے تھے میں اپنے جذبات کو نہ روک سکا اور مقام و ماحول کو نظر انداز کر کے بڑی بے چارگی سے کہا۔ مولانا آپ کو بخار ہو رہا ہے۔ آپ ایسی حالت میں یہاں کیوں آئے۔

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں"۔ تقریباً مولانا کے یہی الفاظ تھے۔ میں بالکل بے بس ہو گیا اور مولانا کو سہارا دے کر شہ نشین (ڈائس) پر پہنچا دیا۔ کچھ حاسدوں نے مشاعرے کو ناکام بنانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ مولانا غزل پڑھ کر رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن صبح قصداً میں کسی قدر تاخیر سے الحاج محمد حنیف صاحب کے دولت خانے واقع مورلینڈ روڈ پہنچا تاکہ مولانا ناشتے سے فارغ ہو لیں۔ نو بج رہے تھے لیکن جیسے میں کمرے میں پہنچا پایا گیا کہ مولانا کے ناشتے میں مکھن، نرگسی، ہریسہ، گھی میں تلے ہوئے انڈے، دودھ پر اسٹیو پیش کئے گئے ہیں، ظاہر ہے کہ ان میں سے بیشتر چیزیں اختلاج قلب کے مریض کے لئے حد درجہ مضر ہیں۔ میں نے پریشان ہو کر مولانا سے اس بدپرہیزی پر سخت احتجاج کیا۔ جواب میں مولانا مسکرا کر بولے" ارے بھئی راتی صاحب آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ میں نے کھایا ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ یہی دو چار لقمے"۔

"لیکن یہ چیزیں تو آپ کو بالکل نہیں کھانی چاہئیں۔ کیا ڈاکٹر نے آپ کو پرہیز کرنے کے لئے نہیں کہا؟ میں اُن کے جواب سے قطعی مطمئن نہ تھا۔

"اچھا بیٹھئے تو سہی۔ ڈاکٹر نے پرہیز کرنے کے لئے کوئی خاص ہدایت تو نہیں دی"

میں بیٹھ گیا اور میرے ساتھ مولوی محمد مستقیم صاحب بھی بیٹھ گئے اب میں نے مولانا پر سوالات کی بوچھار کر دی، جن کے وہ برابر جواب

دیتے رہے میں ان کی باتیں سُن سُن کر حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔ آج جب میں ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پر غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنے وقت موعود سے باخبر تھے چنانچہ جب میں ان سے محض مشاعرے کی خاطر حالتِ مرض میں اتنا طویل سفر اختیار کرنے پر غیر معمولی تشویش کا اظہار کیا تو فرمانے لگے "ارے بھائی راہی صاحب، میں نے سوچا، مشاعرے میں شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اسے پورا ہی کیا جائے۔ مرنا ہی ہے تو اس کے لئے دیوبندی کیا ضروری ہے، کوئی جگہ بھی تو ہو سکتی ہے، بمبئی ہی سہی" مولانا سے بے تکلف ہونے کے باوجود مجھ پر ان الفاظ کا اچھا اثر نہ پڑا اور میں نے اُن کو ایسی باتیں کرنے سے روکا۔

الحاج محمد حنیف صاحب نہایت شریف اور پرانی وضع قطع کے مہمان نواز بزرگ ہیں۔ انھوں نے دوپہر کے کھانے پر ہمیں بھی مدعو کر لیا اس روز بھی دسترخوان بہت متنوع تھا لیکن میرے احتجاج کا اثر بہت نمایاں تھا۔ پرہیزی غذا کا خاص اہتمام کیا گیا۔ مولانا نے کچھ بھی نہیں کھایا۔

میری رائے تھی کہ مولانا کو مشاعرے میں شرکت کے لئے پونا نا سک نہیں جانا چاہیئے۔ اور یہیں ایک دو دن آرام کرنے کے بعد بھیمڑی کے لئے روانہ ہونا چاہیئے۔ مولانا مستقیم صاحب کا بھی یہی مشورہ تھا۔ مولانا کے ارکو چلتے رہے۔ بالآخر انھوں نے پونا جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم دونوں پونا جانے سے معذور تھے۔ مولانا بضد تھے کہ میں اُن کے ہمراہ جاؤں یا پھر مولانا مستقیم جائیں لیکن مولانا مستقیم بھی کسی وجہ سے مجبور تھے۔ ہم نے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو مولانا کے ہمراہ کر دیا۔

میں زندگی بھر اُن الفاظ کو نہیں بھول سکتا جو پونا کو روانہ ہوتے وقت مولانا مرحوم کی زبان سے ادا ہوئے تھے مولانا نے مجھ سے پوچھا "اب کے بچھڑے پھر کب ملاقات ہوگی؟"

مولانا پونا کے بعد ۱۳ مارچ کو ناسک کے مشاعرے میں شرکت کا ارادہ رکھتے تھے۔ چنانچہ میں نے اُن سے کہا کہ میں ۱۴ مارچ کی صبح بمبئی پہنچ جاؤں گا اور ان سے الحاج محمد حنیف صاحب کے دولت خانے لوں گا۔ ایک دن آرام کرنے کے بعد ۱۵ مارچ کو بھیمڑی کے لئے روانہ ہوں گے۔ اس دوران میں بھیمڑی کا پروگرام ترتیب دے دوں گا۔ لیکن میرے جواب میں مولانا نے فرمایا "دیکھئے آپ سے اس دن ملاقات ہوتی بھی ہے یا نہیں" مجھے مولانا نے اس غیر متوقع جواب سے بڑا دکھ ہوا۔ مولانا کے الفاظ دوسری طرف اشارہ کر رہے تھے۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا جو بات میری سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ مولانا کو اس دن میرے بمبئی آنے کا یقین نہیں تھا۔ قدرتی طور پر مجھے صدمہ ہوا اور میں ہر طرح ان کو اپنے صادق القول اور مخلص ہونے کا یقین دلاتا رہا۔ مولانا عجیب انداز سے مسکراتے رہے۔ بالآخر موٹر مولانا کو اپنے ہمراہیوں سمیت لیکر روانہ ہوگئی۔

پونا کے اس یادگار مشاعرہ میں مولانا نے انتہائی جوش اور جذبہ کے عالم میں آواز کے پورے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اشعار پڑھے۔ تجلی کی تحریر کا جادو جس طرح پڑھنے والے پر چھا جاتا ہے۔ اسی طرح مولانا عامر کے اشعار کا جادو ساری محفلِ مشاعرہ پر چھایا ہوا تھا۔ خاتمۂ کلام پر مولانا کسی قدر ہٹ آئے۔ لیکن اب تاب بینش بھی باقی نہ تھی۔ وہیں لیٹ گئے۔ جس شیر کی آمد سے زمانہ کانپ رہا تھا خاموش ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نصیر قاضی، ڈاکٹر شیخ، ڈاکٹر نائک اور متعدد دوسرے ڈاکٹروں نے ہسپتال میں داخل کر کے ہزار جتن کئے مگر مولانا محبوب حقیقی کے حکم پر لبیک کہہ چکے تھے۔

میں بدنصیب ان سب باتوں سے بے خبر ۱۳ مارچ کی صبح اپنی مصروفیت سے نپٹ رہا تھا۔ کچھ نہ تھا کہ گذشتہ رات کا اندھیرا ایک آفتابِ تجلی کو نگل گیا۔ یکایک اخبار کی ایک خبر پر نظریں جم گئیں۔ اور پھر جیسے آنکھیں پتھرا گئیں۔ افسوس کہ مولانا کو پونا سے لا کر بمبئی کے ناریل باڑی قبرستان میں دفن کیا گیا مگر نہ مجھے نہ دیگر متعلقین اور احباب کو کسی قسم کی اطلاع دی گئی۔ اخبار کے ذریعہ جو اطلاع ملی وہ بھی نامکمل تھی۔ اسامہ کو مولانا کی وفات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے مجھ سے صرف اتنا پوچھا کیا یہ خبر صحیح ہو سکتی ہے؟

دوسرے دن صبح میں اُسامہ کو ہمراہ لیکر بمبئی کے ناریل باڑی قبرستان میں پہنچا کئی لوگوں سے دریافت کیا پتہ نہ چل سکا۔ آخر ایک صاحب نے جن کی وضع قطع عجیب و غریب تھی۔ عجیب و غریب انداز میں نشان دہی کی۔ "وہ جو تیسرا کھمبا ہے، اُس کے پاس والی قبر ہے۔ اس پر پھول ابھی نہیں ہیں"

چند لمحوں میں ہم مولانا کی قبر کے ڈھیر پر تھے۔ اُسامہ رو پڑا۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے۔ دعائے مغفرت کی۔ قبرستان کی چہار دیواری سے باہر نکلے تو بمبئی بہت سوگوار محسوس ہو رہا تھا۔

جناب حبیب الرحمٰن ہاشمی

اے اللہ!

اِس سراپا تجلّی کی قبرکو گوشۂ تجلّی بنا دے

مولانا عامر عثمانی سے میری ملاقات جو کچھ بھی تھی، تجلّی کے ذریعہ تھی، زمانہ طالبعلمی میں میں " تجلّی کا سالانہ خریدار تھا ـــ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ نے اُن سے یہ رابطہ منقطع کردیا ــــــ اس کے بعد کبھی کبھار کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی راستے سے آیا ہوا ان کا جریدہ دیکھنے کو مل جاتا، تو آنکھیں دل سے پہلے اور دل آنکھوں سے پہلے اسے چومنے کے لئے بے تاب ہو جاتا، ان کا اداریہ " آغاز سخن " اختتام سخن بھی ہوتا، فاضل دیوبند تھے لیکن نرے مولوی نہ تھے ۔ ان کی تحریر میں جمود نہیں تحرک ہوتا، لکھتے تو بس دل و دماغ پر سکہ جماتے چلے جاتے، اگرچہ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا کہ فرط جذبات میں، بات زیادہ طول کھینچ گئی، تاہم ہمیشہ ایسا نہ ہوتا، ان کے ہاں عقل کی دلیل بھی ہوتی اور نقل کی بھی، روایت کے بادشاہ بھی تھے اور درایت کے بھی ــــ تفہیم الحدیث کے زیر عنوان کسی حدیث کی تشریح کرتے تو کمال کر دکھاتے، ایسا معلوم ہوتا جیسے قرن اول میں بس رہے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت یافتہ افراد سے سُن سن کر لکھتے جا رہے ہیں ۔

ملا ابن العرب مکی کے نام سے طنزیہ اور مزاحیہ کالم "مسجد سے میخانے تک" لکھتے رہے، اس کے اسلوب کی دھوم تو ایسی مچی کہ کسی دوسرے مولوی کے حصہ میں کہاں سے آئی ہوگی ۔ شاعر بھی قادر الکلام تھے، مزاحیہ اور سنجیدہ شاعری دونوں مملکتوں میں ان کی فرمانروائی تھی ۔

اب کہ بھارت کے ساتھ مواصلاتی رابطوں کا آغاز ہے کئی بار ان سے ملنے کو جی چاہا اور بے اختیار دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ بھارت جاؤں اور اُن سے بھی ملوں لیکن ان کے سفر نے میری یہ آرزوئے سفر تو سلب ہی کر لی ہے ۔

۹ اپریل کو بمبئی کے ایشیائی مشاعرے میں شریک ہونے تھے ــــ اس سے پہلے دل کا دورہ ایسا سخت پڑا کہ ہر گھڑی خطرہ تھا۔ صبح گیا یا شام گیا ــــ دعوت دہلی کے ایڈیٹر کے نام بستر سے ہی لکھا اور موت سے صرف چار روز پیشتر:

" موت بڑے طمطراق سے آئی تھی، لیکن میں نے وہیں سے اسے پسپا کر دیا، میری دلیل یہ تھی کہ ۹ تاریخ کو ایشیائی مشاعرے میں مدعو ہوں اور مجھے وہاں شرکت کرنی ہے، وہ بیچاری لوٹ گئی، اب دیکھئے اللہ میاں سے کیا مشورہ کر کے آئے، بظاہر خطرے سے نکل گیا ہوں لیکن ضعف پورے شباب پر ہے ۔

عامر عثمانی تا حال زندہ "

مشاعرے میں شرکت کے لئے پہنچے، اس کے بعد بعض احباب پونا لے گئے، ۱۱ اپریل کو وہاں مشاعرے میں سٹیج پر بیٹھے تھے کہ موت مشورہ کر کے واپس آ گئی، اور اب اس کی دلیل ہی باقی رہی تھی ــــ سو وہ ساری عمر بڑے بڑوں کو دلیل سے پسپا کرتے

تھے' چاروں شانے چت گراتے تھے موت کی اس دلیل کے سامنے ــــ کہ مشاعرہ میں شرکت تو ہو چکی ــــ بہرحال اس کے ساتھ ہی طے ــــ رہے تمام اللہ کا میت دیوبند بھی نہ لائی جاسکی' بمبئی ہی میں دفن کر دیئے گئے۔

مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ دیوبند کے ایک استاد ایک دور افتادہ مقام پر جاکر ملازم ہو گئے' وہیں انتقال ہوا چندروز کے بعد کسی دوست کو خواب میں نظر آئے' دیکھا کہ جنت میں ٹہل رہے ہیں' انہوں نے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟

جواب دیا: پردیس میں موت ہوئی قادر مطلق کو یہی ادا پسند آگئی سو نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

عامر عثمانی کی پونا میں موت کی خبر سنکر یہ واقعہ یاد آگیا ــــ اُن کی بھی یہ ادا خالقِ کائنات کو یقیناً پسند آئی ہوگی' اور یہ کیا اُن کی تو ساری ادائیں ہی ایسی تھیں کہ اپنے رب کے حضور باریاب ہوئی ہوں گی' ان کی تڑپ' ان کا دلولہ' ان کا انداز' ان کے تیور ان کی جولانی' ان کا غضب' سب کچھ اللہ ہی کے لئے تو تھا' وہ جس راستے کو اللہ کا راستہ سمجھ لیتے اس پر بڑی شان سے چلتے' کوئی انھیں روک نہ سکتا' اُن کے نتائج فکر سے اختلاف ممکن ہے' لیکن کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ان کی دیانتدارانہ اور عالمانہ جستجو سے انکار ممکن نہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی مرحوم اُن کے استاد تھے لیکن جب ان کی سادہ لوحی کی آڑ میں جماعت اسلامی کے خلاف یُدھ رچایا گیا تو عین دیوبند میں بیٹھ کر' ایک نکتہ رس فقیہ اور ایک عالم بیباک اور ایک شاگرد باادب کی طرح جواب عرض کرتے رہے ــــ اعتراض کی رسوائی اور پسپائی ہر اہل نظر کو صاف نظر آرہی تھی' عامر عثمانی نے جماعت اسلامی کی جنگ ــ جو صداقتوں کی جنگ تھی' اور اس لحاظ سے ان کی اپنی ہی جنگ ــــ اس طرح لڑی کہ اپنے بیگانے عش عش کر اٹھے' اس زمانہ میں ان کا ایک فقرہ تو کسی طور بھولتا ہی نہیں ــــ زیر بحث معاملہ یہ تھا کہ کیا صحابۂ کرام رض معیار حق ہیں یا نہیں ــــ کہا جا رہا تھا کہ صحابۂ کرام کو معیار حق نہ ماننا ان کی توہین کے مترادف ہے ــــ عامر عثمانی کے قلم نے ایک ہی فقرہ میں بحث کا خاتمہ کر دیا۔

" سونا خواہ کتنا ہی خالص کیوں نہ ہو کسوٹی نہیں بن سکتا۔"

شہادت حسین کے موضوع پر مولانا مودودی کے ایک مضمون سے اختلاف ہوا تو کھل کر اظہار کیا۔ اور مولانا سے ساری محبت اور عقیدت کے باوجود ان کے نقطۂ نظر کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے' بھارتی حکومت کے عزائم اور مسلمان دشمن ریتوں کے خلاف بھی ہمیشہ پیش پیش رہے۔ متحدہ قومیت کے بُت پر بت کدے میں بیٹھ کر ضرب پر ضرب لگاتے رہے' مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کو ختم کرنے کے اقدامات کے خلاف ان کی آواز بہت بلند تھی' ملّا ابن العرب مکّی کی زبانی چند باتیں سنئے۔

" خدا کانگریس کو عمر خضر عطا فرمائے' جہاں اسکے اور بے شمار فوائد تھے' وہیں ایک نیا فائدہ سامنے آیا' جو سب سے اہم ہے۔ غور سے سنئے:۔ کانپور کا تازہ واقعہ ہے' مشہور اور معمر کانگریسی کارکن شری منظر علی سوختہ الٰہ آبادی انتقال فرما گئے تو ان کی تدفین سوختہ آشرم میں ہوئی' تدفین میں شرکت کرنے والوں میں شری لال بہادر شاستری' جناب حافظ محمد ابراہیم وزیر فنانس یوپی اور شری مظفر حسین ڈپٹی منسٹر جیل خانہ یوپی وغیرہ بھی تھے' جنازے پر قرآنی سورتوں کی تلاوت کے علاوہ رام دھن رگھوپتی راجہ رام' گائی جاتی رہی۔

کیا سمجھے آپ؟ فائدہ اس کا یہ ہے کہ آدھے گناہ تو مرحوم کے قرآن کی تلاوت سے دھل گئے اور آدھے جو رہ گئے تھے انھیں "رام دھن" نے صاف کر دیا۔ مرحوم رحمۃ اللہ علیہ رن تھرو جنت میں پہنچے اور اب ہمارے وہ علماء کرام جنھیں کشف و مراقبہ کے ذریعہ سوختہ رحمۃ اللہ علیہ کا بک ٹُو جنت میں پہنچ جانا صاف نظر آگیا' ایک کمیٹی بنانے والے ہیں' جو یہ طے کرے گی کہ متحدہ قومیت اور مشترکہ کلچر کی نشوونما کے لئے علمائے حق کو کون کون اقدامات کرنے چاہیں۔ میرے دیوبند شریف میں ایک اونچے مولوی صاحب ہیں جو دو ہی باتوں کو

حاصل زندگی بنائے ہوئے ہیں نمبر ایک جماعت اسلامی کو برباد کرنا نمبر ۲ کانگریس کی بھرپور مدد کرنا نمبر ایک کے لئے تو انہوں نے یہ تازہ فتویٰ ترتیب دیا ہے کہ جس شخص نے جماعت اسلامی کی طرفداری کی، اس کی اور اس کے باپ کی بیوی پر طلاق مغلظ واقع ہو گئی، پچھلی تمام نمازیں فاسد ہوئیں، ساری اداشدہ زکوٰۃ باطل ٹھہری، چاہیئے کہ تجدید نکاح کرے اور نمازیں ادا کرے اور پچھلی کل زکوٰۃ کانگریس گورنمنٹ کی بجو تی پھٹ والی مدوں میں نقد دے ورنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں بھیجا جائیگا۔

نمبر ۲ کے لئے وہ یہ تجویز لئے پھر رہے ہیں کہ متحدہ قومیت کی خاطر مسلمانوں کے مردے دفن کرنے کی رسم چھوڑ دینی چاہیئے۔ یا کم سے کم اتنا ہو کہ مُردے کے بیچ سے دو کر دیئے جائیں، ایک حصّہ دفن ہو ایک حصّہ جلایا جائے، نیز قرآن کے ساتھ ہر مدرسے میں گیتا کا بھی درس ہونا چاہیئے اور آخران کے معبد یا تو رام دھن گائی جائے، یا گھنٹیاں بجائی جائیں تاکہ ہمارے وطنی بھائیوں کو ہماری تعلیمات اور عبادات غیر ملکی اور اجنبی محسوس نہ ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

" گویہ غریب ملّا عرض کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ہمارے زندہ بزرگوں نے جو راستہ اختیار فرمایا ہے انشاء اللہ وہ مشترکہ کلچر اور متحدہ قومیت کے لیے ایسے نظافر در منظر دس بیس سال بعد سامنے لائیگا کہ جس طرح بہت سے مسلمان ممالک بعض اساتذہ کوٹ پتلون پہنے، داڑھی مونڈے، میز کرسی پر بیٹھے، منہ میں سگریٹ سلگائے، قرآن و حدیث کا درس دیتے نظر آتے ہیں، اس طرح یہاں بھی بعض علماء دھوتی پہنے، گوبر کا پوتا کئے اس پر پلتھی مار کر بیٹھے قرآن وحدیث کا درس دیتے نظر آئیں گے اور ہر آیت اور حدیث کے ذیل میں وید اور گیتا سے انمول جواہر ڈھونڈ کر پیش فرمایا کریں گے۔

ایک اور خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۶ رفروری ۷۵ء: بفضلہ تعالیٰ متحدہ قومیت کا فی پھل پھول رہی ہے، ابھی کچھ روز ہوئے، سورت میں جمعیۃ علماء کا سالانہ اجلاس زور شور سے منعقد ہوا صدر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہ تھے، رسم افتتاح چیف منسٹر مرارجی ڈیسائی نے اپنی تقریر کے ذریعہ ادا کی۔

جمعیۃ کے ذمہ دار پورے زور شور سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری جماعت سیاسی نہیں، دینی ہے اگر یہ دعویٰ نہ ہوتا تو خیر یہ کہہ سکتے تھے کہ شری مرارجی سے اجلاس کا افتتاح کرانا سیاسی و ملکی مصالح پر مبنی تھا، لیکن دینی ہونے کے ساتھ یہ بات بالکل ایسے ہی ہے، جیسے مسجد کا سنگ بنیاد پنڈت جواہر لال نہرو سے رکھوایا جائے اور جیسے کیا آپ دیکھیے گا، سوشلسٹ سماج ذرا پر پُرزے نکال لے اور پُرانے خیال کے جو علماء باقی رہ گئے ہیں اللہ کو پیارے ہولیں تب مسجد اور مدرسے کی رسم افتتاح شریمان اور مہاشے ہی فرمایا کریں گے۔ آج بھی اتنا تو بفضلِ رَبّی ہو چکا ہے کہ بعض درگاہوں کے عرسوں کے اونچے درجے کے شریمانوں سے متبرک اور مطہر کرایا جاتا ہے "۔

یہ تو ان کی طنزیہ نثر نگاری کا رنگ تھا، رہے سنجیدہ مضامین تو، ان کا ذکر ایک فقرے میں کہاں ہو سکیگا؟ مختصر یہ کہ وہ سراپا تجلی تھے اور اے اللہ! ان کی قبر کو بھی گوشۂ تجلی بنا دے۔

(ماخوذ از افکار لاہور)

خط وکتابت

کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

عامر عثمانی

جو ایک عالم دین بھی اور غزل گو بھی تھے

جناب اقبال حامد

جب کسی کو عظمت دیتا ہے تو وہ عظمتِ خداوندی محدود نہیں ہوتی بلکہ ایک سے زیادہ مقامات پر محیط ہوتی ہے لیکن یہ دنیا کی فطرت ہے کہ پھر عظمت انسانوں کی ایک ہی صفت کو عام کیا جاتا رہا ہے اور دوسری صفات کم و بیش معدوم ہو جاتی ہیں مثلاً بوعلی سینا اور معلم ثانی ابونصر فارابی۔ موسیقی اور ستاروں کے بڑے عالم اور ماہر تھے لیکن دنیا نے ایک کو فن طب اور دوسرے کو فقہ اور حدیث و فلسفہ میں تشہیر دی۔ عمر خیام اپنے عہد کا بہت بڑا سائنسداں تھا لیکن اس کے تمام اوصاف ختم کر کے صرف خمریہ شاعری اس کی فضیلت کا سبب قرار دیا گیا۔ اور اس نوع کی مثالیں ہر عہد میں بے شمار ملتی ہیں۔

حال ہی میں برصغیر کی ایک مقتدر شخصیت جناب عامر عثمانی اس دنیائے فانی سے سفر کر گئے تھے، اب تک ان پر پاکستان اور بھارت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مرحوم کے دینی تشخص اور عالم دین کی وسعت دینیات سے متعلق تحریروں اور دلائل و براہین پر دسترس سے متعلق ہے، حالانکہ جناب عامر عثمانی ایک نڈر صحافی اور بلند مرتبہ شاعر بھی تھے عجیب ستم ظریفی ہے کہ یہ مدیر تجلی دیوبند کی حیثیت سے زندہ رہے اور ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے اس طرح مرے کہ مشاعرے میں شرکت کے لئے موت سے مہلت طلبی اور مشاعرے کے بعد مزید مشاعرے میں جانے سے موت کی جاں طلبی غیر فانی واقعات بن کر رہ گئے جن پر نیک انسان اور خدا کے تعلق پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن بحیثیت شاعر کے بارگاہِ باری تعالیٰ سے عامر عثمانی کے لئے خصوصی مہلت واقعات کا وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے ان کی شاعری پر سب سے پہلے توجہ دینا ضروری ہے۔

جناب عامر عثمانی کا جب پیغام اجل آیا تو وہ پونا کے ایشیا مشاعرے میں جو غزل پڑھ رہے تھے اس کے ایک دو شعر دستیاب ہو سکے ہیں جو یہ ہیں۔

قدم قدم کتنے زخم کھا کر وفا ہوئی کتنی کامیاب لیکن
وفا بایا صلہ جو ہم نے وہ بیوفاؤں کے کام آیا

ہمارے پاس اب دھرا ہی کیا ہے نہ رخت جادہ نہ زاد منزل
جو رہزنوں سے بچا لیا تھا وہ رہنماؤں کے کام آیا۔

عامر عثمانی اعلیٰ درجہ کے غزل گو تھے اور ان غزلوں کے ہر شعر میں نہ صرف معنی آفرینی بلکہ جذبات و تخیل کی بے پناہ رنگینی اس قدر آفرینی کے ساتھ ہوتی ہے کہ قاری شاعر کے ساتھ ایک خمار آگیں فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ اہم شاعری میں بھی مالک حقیقی اور سردار انبیاء کو نہ بھول سکے شاید

مولانا عامر عثمانی

ایک لاجواب ناقد

کئی سال ہوئے مقامی روزنامہ "آبشار" میں ایک مقالہ بعنوان "اقبال فراق کی نظر میں" مدیر کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا کہ فراق اردو کے نامور شاعر ہی نہیں نقاد بھی ہیں اور ان کا یہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اس مقالہ میں فراق نے اقبال سے زیادہ اسلام کو تنقید کا اصل ہدف بنایا تھا اور جگہ جگہ اقبال کے فلسفۂ خودی پر تنقید کرتے ہوئے فلسفۂ اسلامیہ میں بھی زبردستی کے نقائص نکالنے کی کوشش کی تھی۔ پورے مقالے میں اقبال کم اور اسلام زیادہ موضوع بحث بنا رہا۔ یقیناً فراق نے اپنا یہ مقالہ ہوش و حواس کے عالم میں سپرد قلم نہیں کیا ہوگا۔ کیونکہ خیال کی بے ربطی اور اصول تنقید سے بے راہ روی مقالے سے صاف طور پر نمایاں ہو رہی تھی ویسے بھی ایک ذمہ دار ناقد کو اپنے [illegible] خامہ کو آمادۂ جنبش کرنے سے پہلے بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں اس کی تنقید حصار اصول تنقید کو توڑ کر تنقیص کے حدود میں تو داخل نہیں ہو رہی ہے۔

مقالہ جب میری نظر سے گذرا تو دل پر ایک چوٹ سی لگی کہ فراق جیسا شاعر جو بیک وقت آل انڈیا سطح کا شاعر ہی نہیں بلکہ حکومت کا ایوارڈ یافتہ پدم بھوشن بھی ہے اتنا تنگ نظر اور عصبیت کا شکار کیسے ہو گیا اور اس کی غیرت نے اس سے اس قسم کی پوچ تنقیدی مقالہ کیسے سپرد قلم کروا لیا۔ میں نے اپنے استادوں سے سن رکھا تھا کہ [illegible] کسی زمانے میں تنقید بھی لکھا کرتے تھے" مگر جب اس کا نمونہ نظر سے گذرا تو جانئے کہ ان سیاسی نظریئے کے حامل شاعر، ادیب سے یک گونہ سی ہونے لگی اور خیال ہوا کہ :-

کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اس کے کچھ ہی دنوں بعد ماہنامہ "تجلی" کا ایک شمارہ نظر سے گذرا اداریئے میں "فراق گورکھپوری اور اقبال" کے عنوان سے مولانا (مرحوم) نے ایک ایک لفظ کی تنقیص و تنقید کا مدلل اور بھرپور جواب دیا تھا۔ اور فراق کے ایک ایک اٹھائے سوال کا اس پیرائے دیا تھا کہ فراق خود اپنی غلطی پر بعد میں نادم ہوا ہوگا۔ ویسے تو [illegible] کو تجلی کے واسطے سے بہت پہلے سے جانتا تھا اور خصوصی طور پر تفہیم الحدیث کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتا تھا مگر اداریہ پڑھنے کے بعد یکبارگی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مولانا اردو ادب ناقد پہلے ہیں یا اسلامی ادب کے عالم۔ کیونکہ فراق کے ایک سوال کا انھوں نے جس مدلل طریقے سے جواب دیا تھا وہ ایک بین ناقد اور زبان و فن کا عالم ہی دے سکتا تھا۔ ویسے تو قادر الکلام شاعر تھے اور زبان پر بھرپور دسترس حاصل تھی مگر پہلے یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک مذہبی عالم اس قدر [illegible]

ہیں کی ادبی نظر اتنی عمیق ہوگی کہ الفاظ کی قدر و قیمت
ین متعین کرے گا بلکہ اس کو مخصوص جگہ پر استعمال کرنے کا خوب
فن بھی جانے گا۔ کیونکہ جب نیاز فتحپوری ناقد ہونے
کے وجود ہی سے انکار کرنے لگے تھے۔ یہ مولانا کی جادوگری
بلکہ حکمت تھی۔

میری نظر سے ان کے، کتابوں پر کئے گئے تبصرے بھی
ہے۔ ان میں مذہبی کتابیں تھیں اور شعری و تنقیدی بھی۔ مگر مجال ہے کہ
نے تبصرے میں کہیں بھی یہ ثابت ہونے دیا ہو کہ میں ناقد نہیں عالم
یا عالم نہیں ناقد ہوں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ تبصرہ کرتے وقت
کسی شاعر کا کوئی شعر مہمل نظر آیا (حالانکہ وہ مہمل نہیں تھا)، اس پر
تنقید کرتے ہوئے گذر گئے مگر جب اس پر نشان دہی کی گئی تو انہوں
نے غلطی کا شدت سے احساس کیا۔ اور اس کے لئے انہوں نے
تبصرہ کتاب کے طالب تبصرہ سے معذرت بھی چاہ لی۔ یہ ان کی
بی تھی کیونکہ نقاد اکثر ہٹ دھرم ہوتے ہیں اور وہ اپنی ہی بات
مستند سمجھتے ہیں حالانکہ یہ طریقہ اصولِ تنقید کے سراسر منافی ہے۔

ہمارے بہت سارے فیشن زدہ نقاد شعروں کو مہمل قرار
دینے میں قطعی سوجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے ہیں اور تعمیری جذبے کو
پشت ڈال کر تخریبی جذبے کو پروان چڑھاتے ہیں۔ مگر مولانا
نے تنقید کو اپنی زندگی کی طرح اصولی طور پر برتا اور کبھی بھی اپنے
علم کسی پر لادنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے ہمیشہ
تنقید برائے تنقیص نہیں بلکہ تنقید برائے ادب سمجھا اور عیوب
دوسری کی طرف نشان دہی کر کے ہر ممکن اس کی اصلاح
کی کوشش کی جو ایک ذمہ دار ناقد کا حق ہوتا ہے۔

تجلی کا ڈاک نمبر ہو یا نقد و نظر نمبر یا کوئی بھی دوسرا
اس کی ایک انفرادی حیثیت ہے جو مولانا کی بھرپور
صلاحیت کا مظہر ہے۔ چاہے اس نقد و نظر کا تعلق
سے ہو یا مذہب سے۔

بقیہ:- بیہوشی کے عالم میں بھی اللہ اللہ ان کی زبان پر تھا

یہ خبر ملی کہ پونا میں عامر صاحب کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ
راجعون۔

عزیزی حسن میاں! مجھے تو ان کے انتقال کے بعد بڑی فکر
رسالہ تجلی کی ہے۔ تجلی عامر صاحب کی یادگار رہے (اور جہاں تک
میری معلومات ہیں)، ان کے متعلقین کے لئے واحد ذریعۂ معاش بھی۔
تجلی کے سلسلے میں آپ نے اپنے فرض کو بڑی حد تک پہچانا ہے۔ مجھے
کسی نے بتایا تھا کہ آپ باہر کہیں درس و تدریس کے منصب پر فائز
تھے مگر گھر کے حالات کے تقاضہ کو محسوس کر کے تجلی کو تھام کر بیٹھ گئے
اور اپنی ساری محنت اسی کے لئے صرف کردی۔ اب تجلی کے عام
حلقہ کا فرض ہے کہ دل کھول کر تجلی کو تعاون دیں۔ عام خریدار کم از کم
دو سال کا چندہ پیشگی تجلی کو بھیجکر اس کے مستقبل کو کسی حد تک
مضبوط بنا سکتے ہیں۔ اور دوسرے حضرات بھی علمی تعاون سے گریز
نہ کریں۔ میں اسے بڑا افسوسناک واقعہ قرار دوں گا اگر تجلی کے
حلقے نے اس تنگی اور کشاکش کے وقت اس کی دیواروں اور چھت
کو مضبوط نہ کیا۔ اور یہ عمارت زمین پر آگرے جس کی بنیاد عامر
عثمانی صاحب نے رکھی تھی۔

جناب شمیم طارق

جواب چاہیئے مجھے

جواب ڈھونڈتا ہوں میں

یہ مضمون حضرت مولانا عامر عثمانی صاحب کے انتقال کے پندرہ منٹ بعد اسی اسٹیج پر لکھا گیا جہاں حضرت مولانا نے آخری بار اپنے زبان میں اپنا کلام پڑھکر سنایا تھا۔

ابھی تو وہ گلاس بھی یہیں رکھا ہوا ہے جس میں حضرت مولانا نے پانی پیا تھا۔ ابھی وہ آواز بھی گوش سماعت میں رس گھول رہی ہے جو چند ساعتوں قبل فضاء میں گونج رہی تھی۔

ابھی تو ان کے سانس کی خوشبو بھی ختم نہیں ہوئی۔ کیسے یقین کرلوں کہ مولانا عامر عثمانی صاحب انتقال کر گئے۔ چند لمحوں قبل وہ میرے ہی ساتھ ایشیائی مشاعرہ نہرو میموریل ہال پونہ کے اسٹیج پر تشریف فرما تھے ... مگر آہ، موت کی تاویل نہیں، موت کتنی ہی اچانک اور ناگہانی کیوں نہ ہو؟ موت پھر موت ہے .... مگر کس قدر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ موت برحق ہے، موت یقینی ہے۔ موت کا کوئی وقت متعین نہیں۔ موت سے کسی حال میں مفر نہیں۔ موت کبھی بھی اور کہیں بھی آسکتی ہے۔ مگر موت ہی پر ہم سب سے زیادہ حیرت واستعجاب کا اظہار کرتے ہیں۔

اگر موت کی کوئی تاویل ہوسکتی تو شاید میں مولانا عامر عثمانیؒ کی موت کا یقیناً انکار کر دیتا مگر یہ سب کچھ اتنا اچانک اور ملا کہ عقل اس خبر کو تسلیم ہی نہیں کرتی تھی۔

حضرت مولانا میرے متصل ہی تکیہ سے ٹیک لگائے ہے اسٹیج پر نیم دراز تھے۔ اور جب اناؤنسر دینڈت گلزار دہ نے آپ کو آواز دی تو آپ مائیک پر تشریف لائے۔ آپ کے لئے کرسی رکھی گئی اور آپ نے بیٹھکر کلام سنانے کے سبب چاہی اور دو تین قطعات جس میں ایک یہ تھا۔

دھرا کیا ہے کراہوں کے سوا دنیا کے دامن میں
میں کیوں روؤں مجھے کیا غم اگر ٹوٹا نفس ٹوٹا
میری میت پہ عامرؔ نوحہ گر ہیں جسم کے قیدی
مگر میں مسکراتا ہوں کہ مدت میں قفس ٹوٹا

اور ایک طویل نظم جس کا شعری مصرعہ تھا

جواب چاہیئے مجھے جواب ڈھونڈتا ہوں میں

سنائی تھی۔

سامنے ہی ملک کے نائب وزیر داخلہ جناب محسن صاحب ہندوستانی فضائیہ کے سربراہ اور پونہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تشریف فرما تھے۔ سامعین ہمہ تن گوش تھے۔ مولانا کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اقبال کے اس مصرعہ کی تصدیق کر رہا تھا۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے ہی آپ نے پانی طلب کیا اور یہ میری خوش نصیبی تھی کہ یہ سعادت میں نے حاصل کی۔ آپ نے مجھ سے پانی کا گلاس لیا، تھوڑا تھوڑا کر کے پیا، نظم مکمل کی اور نیچے اتر آئے۔

ابھی آپ اپنی جگہ آکر بیٹھے ہی تھے کہ دورہ پڑا لوگوں نے لٹا دیا۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب جھنجانہ والا تشریف لائے اور ہسپتال لے جانے کا مشورہ دیا مگر ہسپتال پہنچنے سے قبل ہی راستے میں تارِ نفس ٹوٹ چکا تھا۔ اور آپ ابدی اور پُر سکون نیند سو چکے تھے۔

کسے خبر تھی کہ مولانا کی نظم کا یہ آخری مصرعہ

جواب چاہیئے مجھے جواب ڈھونڈتا ہوں میں

ان کی زندگی کا آخری جملہ بن جائے گا۔

کسے خبر تھی کہ بدعت و گمراہی میں زلزلہ پیدا کرنے والا اپنی زندگی کی آخری سانس تک باطل پرستوں سے جواب طلب کرے گا۔

کسے خبر تھی کہ بدعت و شرک کی تمام مشکلوں سے ہر وقت نباہ کرنے والا اپنی موت سے پیشتر ہی اپنی موت سے آگاہ ہو جائیگا۔ کسے خبر تھی کہ یک جنبش قلم سے سب کے سوالوں کے جواب دینے والا ابھی زندگی کی آخری ساعتوں میں بھی دنیا کے سامنے ایک سوال چھوڑ جائے گا۔

دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کی صورت و سیرت میں کلی یکسانیت ہو لہٰذا مولانا مرحوم سے مجھے یا کسی کو اختلاف تھا تو کچھ تعجب نہیں۔ اختلاف رائے صحتمند فکر اور مضبوط قوتِ فیصلہ کی علامت ہے۔ میں حضرت مولانا کی عزت اسی لئے کیا کرتا تھا کہ وہ اظہار رائے کے وقت مصلحت یا مرعوبیت کا ارتکاب نہیں کرتے تھے، انہوں نے جو کہا ببانگ دہل کہا ڈنکے کی چوٹ کہا۔ غیروں کو بھی للکارا اور اپنوں کو بھی ٹوکا [illegible]

ناراض تھے۔ حالانکہ یہ ناراضگی کی بات نہ تھی۔ صاف گو شخص منافق اور مضر نہیں ہوتا ضرر تو صرف منافقوں اور خوشامدیوں سے پہنچتا ہے

کسی شخصیت یا فکر و نظریہ کو پسند کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہوتی ہے کہ انسان اسے اپنے فکر و خیال کے قریب پاتا ہے۔ میں بھی مولانا عامر عثمانی مرحوم کو اس لئے پسند کرتا ہوں کہ ان کی تحریروں میں "مگر" اور "اگر" میں حقیقت کو چھپانے کی کوشش نہیں ہوتی تھی۔ ان کی تحریروں سے مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ غلطیاں صرف چھوٹوں، غریبوں اور طالب علموں ہی سے نہیں اُن سے بھی ہوتی ہیں جو خود کو داعی مطلق، مفسر و مجتہد اور مفکر وقت سمجھتے ہیں۔

اللہ اللہ کس قدر صاف گو بلکہ حق گو تھے۔ مولانا عامر عثمانیؒ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ ایشیائی مشاعرہ کے اول روز صابو صدیق پالی ٹکنک میں آپ نے کس قدر متاثر کن انداز میں فرمایا تھا کہ ملک کے نامور ادیب و شاعر علی سردار جعفری صاحب جب دیوبند آئے تھے تو میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ میں بمبئی اگر آیا تو یہ قطعات ضرور سناؤں گا۔ اگر میں یہ قطعات سنائے بغیر مر جاتا تو منافق کی موت ہوتی۔ اب جبکہ میں نے یہ قطعات آپ کو سنا دیئے ہیں تو مر بھی جاؤں تو مجھے افسوس نہیں ہو گا۔

یہ الفاظ مولانا نے کچھ اس انداز سے ادا کئے تھے کہ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ خود مولانا کو اپنے چل چلاؤ کا پتہ چل چکا تھا۔

بمبئی کے مشاعرہ میں تو کچھ غلط لوگوں کی طرف سے ہلڑ بازی بھی ہوئی تھی مگر پونا والوں نے مولانا کو بہت سکون کے ساتھ سنا تھا۔ شاید اہلِ پونہ بھی لاشعوری طور پر ان کی رخصت کی خبر پا چکے تھے۔ مولانا بہت دیر تک اپنا کلام سناتے رہے اور اہلِ پونہ ہمہ تن گوش بنے رہے اور جب آپ کرسی سے نیچے اترے تو ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا عامر عثمانی سے محبت و عقیدت کا تقاضہ یہ ہے کہ تجلی کی روشنی تیز کی جائے اور یہ آپ کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے

جناب
محمد عبدالکریم مدراسی

مولانا عامر عثمانی
شرک و بدعت کی ظلمتوں
ٹمٹمانے والا ایک چراغ

مولانا عامر عثمانی (مرحوم)، مدیر (تجلی) ہمارے والد محترم جناب وزیر کمال (مرحوم)، کے رفیقوں میں سے تھے۔ والدِ محترم کو مولانا مرحوم کی ملاقات کا شرف بھی حاصل تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب مولانا مرحوم "مدراس" تشریف لائے تھے۔ دیوبند سے فراغت کے بعد مولانا نے ایک ماہنامہ (تجلی) کا اجرا کیا جو آگے چل کر لوگوں کے تاریکیوں میں "روشنی کا چراغ" ثابت ہوا۔ جب مولانا کے انتقال کی خبر ہمیں ملی تو ایسا لگا جیسے روشنی کا ایک بلند مینار گر پڑا۔ مولانا عامر عثمانی (مرحوم)، راہِ حق کا ساتھ دینے والوں کی حمایت کرتے تھے۔ اور خاص طور پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے زبردست حامی و مددگار تھے۔ مولانا نے جس شمع (تجلی) کو ۱۹۴۹ء میں روشن کیا اور اس کی حفاظت کرتے ہوئے اور اس میں اپنا لہو جلاتے ہوئے اسے ایک بلند مقام پر لا کھڑا کر دیا۔ . . . . .

ضروری ہے کہ اس شمع کی حفاظت کی جائے اور اس کی روشنی کو قائم رکھنے کی حتی الامکان سعی کی جائے۔ ایک زمانہ دراز سے مسلمان اسلامی اصولوں پر عمل کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ اللہ کی کتاب پر ایمان تو ضرور ہے لیکن اس کے احکامات سے سرتابی دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ خاصکر اس فتنہ پرور دور میں جبکہ الحاد، خدا بیزاری، بے دینی۔ فحش خواہشات، بے حیائی و عریانی اور مشرکانہ تعلیم نے مسلمانوں کے اخلاق کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے، ایسے نازک اور پُرفتن دور میں دینی کتابوں کو منظر عام پر لانا، دینی رسالوں کی ہمت افزائی کرنا لوگوں کو خدا کے بتائے ہوئے صحیح راستے پر چلنے کی دعوت دینا وہ راستہ ہے کہ جس راستہ پر خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے چل کر خدا کی رضا و خوشنودی حاصل کی، جھوٹے عقیدے، بدعت پرستی گمراہی وغیرہ وغیرہ کے خلاف قلمی جہاد لوگوں کے غلط خیالوں کی اصلاح کرنا ملتِ اسلامیہ کا ایک بہت بڑا فریضہ ہے۔ اسی فریضہ کو ادا کرنا ادارۂ تجلی اپنا نصب العین سمجھتا ہے اور خدا کرے تا دیر ... سمجھتا رہے۔ اچھی کتابیں اچھے رسالے ہی وہ پاکیزہ ذریعے ہیں جن سے اخلاق کی اصلاح ہوتی ہے، خیالات میں پاکیزگی موجود رہتی ہے، اور احساسات میں زندگی اور بیداری

پیدا ہوتی ہے۔ پاکیزہ معیاری اوصافِ اول کے اچھے اور دینی رسالوں میں ایک رسالہ ماہنامہ تجلی بھی ہے جس کا دوران گنت مسلم گھرانوں میں بکھرا ہوا ملے گا۔ جس شمع کو مولانا عامر عثمانی (مرحوم) نے ۱۹۴۹ء میں روشن کرکے اب تک قائم رکھا۔ ہمیں امید ہے کہ جناب حسن احمد صدیقی صاحب اور ادارہ تجلی کے جملہ منتظمین مل جل کر اس شمع کو ہمیشہ روشن رکھنے کی کوشش کریں گے اور انشاء اللہ یہ شمع روشن رہے گی، تابندہ رہے گی جگمگاتی رہے گی
اس سلسلہ میں ہماری نیک خواہشات، پُرخلوص تعاون اور دلی دعائیں تجلی کے ہمراہ ہیں۔ خدائے تعالیٰ مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ مرحمت فرمائے اور ان کے جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق کے ساتھ اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ ہمیشہ تجلی کو چلانے کی جدوجہد میں سرگرداں رہیں۔ آمین — مولانا مرحوم کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ ان کے پروردگار انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے گا، اور ان کی برائیوں کو بھی نیکیوں میں بدل دے گا۔ قرآن کی آیت ذہن میں کلبلا رہی ہے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝

(بیشک جو لوگ ایمان لائے، نیک عمل کئے ان کے لئے (آخرت میں) ایسا ثواب ہے جو (کبھی موقوف ہونے والا نہیں)

عامر عثمانی نمبر کے بعد
تجلی کے
انتخاب نمبر کا منظرِ عام پر آنا متوقع ہے
اور
اس کے بعد کہانی نمبر
کی توقع کی جاسکتی ہے

بے ہوشی کے عالم میں بھی
اللہ اللہ ان کی زبان پر تھا

مولانا سید ازہر شاہ قیصر (مدیر دارالعلوم دیوبند)

مولانا عامر عثمانی مرحوم کی زندگی مختلف گوشوں میں بٹی ہوئی تھی اور جہاں تک میری معلومات ہیں ان کا آخری عرصۂ حیات تو کئی گوشوں میں اس طرح پھیل گیا تھا کہ کسی مختصر مضمون میں اسے سمیٹ لینا مشکل ہی ہے۔ میری اپنی عادت یہ رہی ہے کہ جن اصحاب کے متعلق ذاتی تأثر کی بنا پر کوئی مضمون لکھا تو اس میں اس کی کوشش کی ہے کہ اپنے تجربات و معاملات کی روشنی میں سہولت ہو، افسوس ہے کہ کئی ہفتہ سے میری طبیعت بھی خراب ہے اور بہت سے کاموں کا ہجوم اس طرح ہے کہ مجھے ذہن و فکر کی یکسوئی میسر نہیں۔ "تجلی" کا یہ قرض میرے ذمہ ہے۔ انشاء اللہ کسی وقت اسے ادا کروں گا۔

میں عرصہ سے بڑی یکسوئی اور کم آمیزی کی زندگی گذارتا ہوں۔ لیکن بچپن میں عامر صاحبؒ اور ہم اکٹھے کھیلے ہیں۔ وہ مجھ سے عمر میں کچھ چھوٹے تھے۔ مگر اس زمانہ میں شعر و ادب، خورد و نوش اور کھیل کود کا کوئی موقع ایسا نہ تھا جس میں ہم دونوں اکٹھے نہ ہوتے ہوں آگے چل کر میری اور ان کی زندگی کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔ بہرحال کچھ دو موقعے مجھے نہیں بھولتے۔ پچھلے سال عید الفطر پر ایک مقامی عید پارٹی میں عامر صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملے اور جب میں اس پارٹی سے کھول کر باتیں کیں۔ اس کا شکوہ کیا کہ میں ان سے نہیں ملتا اور تقاضا کیا کہ میں ان کے ساتھ گھر چلوں۔ اور کچھ دیر مجلس جمے۔ میں صحت کی خرابی کی وجہ نے عامر صاحب کے ساتھ گھر جانے سے معذرت کی۔

دوسرا موقع وہ تھا جب عامر صاحبؒ کو پہلی دفعہ ہارٹ اٹیک ہوا۔ ہم ایک صاف ستھری شعری نشست میں شریک تھے جو کمیونسٹ شاعر علی سردار جعفری کی آمد پر ترتیب دی گئی تھی عامر صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ بڑی بے تکلفی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے اور جب کوئی خام کار شاعر اپنی غزل پڑھتا تھا تو وہ ادھر سے توجہ ہٹا کر سرگوشی کے انداز میں اپنے یا جگرؔ و فانیؔ کے اشعار سنانے لگتے تھے عامر صاحب اپنی غزل پڑھ کر میرے ہی پاس آ بیٹھے۔ غزل پڑھ کر لوٹے تو ان کے چہرہ پر معمولی سی گھبراہٹ تھی۔ مجھ سے انہوں نے کہا کہ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ عامر صاحب کو ہارٹ اٹیک کا مرحلہ درپیش ہے۔ میں نے کہا کہ آپ سامنے کے کمرہ میں چلے جایئے اور لیٹ جایئے۔ تھوڑے سے آرام سے آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی۔ مگر تھوڑی سی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ عامر صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اور وہ فلاں ڈاکٹر کے یہاں ہیں۔ چنانچہ رات کو ۱۲ بجے کے بعد۔ میں، محترم مولانا حامد الانصاری غازی۔ علی سردار جعفری اور دوسرے کئی اصحاب ان کی مزاج پرسی کے لئے ڈاکٹر کے یہاں گئے۔ عامر صاحب اس وقت دل کے شدید دورہ سے دوچار تھے، ان کے بہت سے عزیز وہاں موجود تھے۔ عامر صاحب کو بڑی بے چینی اور غفلت تھی مگر اس حال میں بھی اللہ اللہ ان کی زبان پر جاری تھا۔ ہم سب واپسی پر ان کا ذکر کرتے رہے کہ دیکھئے یہ ایمان اور توفیق خداوندی ہے کہ اس عالم درد و کرب میں شافیٔ مطلق اور ربِّ حقیقی کا نام ان کی زبان پر ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ اس واقعہ کے شاید ایک ماہ بعد ایک اکیلے یہ

بر جناب
قمر عثمانی
(فاضل دیوبند)

مولانا عامر عثمانی

ایک قلم کار
ایک صاحب طرز فن کار

عامر صاحب کی وفات ادبی اور صحافتی دنیا کے لئے ایک حادثے سے کم نہیں عالم مسافرت نے ان کی اچانک موت نے اس واقعہ کو اور بھی حسرت ناک بنا دیا ہے۔ عوامی مزاج کچھ ایسا ہے کہ انسان جب تک زندہ رہے اس کی خوبیاں، اس کے کمالات نگاہوں میں نہیں آتے اور وفات کے بعد ایک ایک بات یاد آتی ہے۔ عامر صاحب نے علمی اور صحافتی دنیا کو کیا کچھ دیا یہ فیصلہ مستقبل کا مورخ کرے گا۔ البتہ تجلی کی پچیس چھبیس سالہ زندگی میں عامر صاحب کے شادابِ قلم نے علم و فضل ادب و انشاء، تنقید و تبصرہ طنز و مزاح کے گلزار میں جیسے سدا بہار پھول کھلائے، گلزار ادب کو حیات بخش بہاروں سے آشنا کیا۔ صحافتی دنیا کو ایک خوشگوار امتیاز بخشا اس کا اندازہ تجلی کے بڑھتے ہوئے روز افزوں حلقۂ ناظرین سے ہو سکتا ہے۔ تجلی ایک مذہبی پرچہ ہے اور مذہبی پرچوں کی جو حالت ہند و پاک میں ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ مگر تجلی کے رنگا رنگ موضوعات اور ان موضوعات کے پیکر میں عامر صاحب کے باغ و بہار قلم نے تجلی کی محبوبیت کو ایک اعلیٰ معیار بخشا تھا خشک سے خشک موضوع پر عامر صاحب کا قلم جب رواں دواں ہوتا تو اس میں بھی ادب و انشاء کی رعنائیاں انگڑائیاں لیتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ تجلی کی ڈاک جس کے تحت فتاویٰ کے جوابات دیئے جاتے تھے اس کی شاہد ہے کہ ہر بات کو اس کی ضروری تفصیل کے ساتھ پھیلا کر بیان کرنا عامر صاحب کا خاص مزاج تھا اس کی بنا پر ان کو جو غیر معمولی کاوش کرنی پڑتی محنت اور عرق ریزی کے جن مراحل سے گذرنا پڑتا اس کا اندازہ تجلی پڑھنے والوں کو ضرور ہوگا۔ آئے دن تجلی کے خاص نمبر مختلف موضوعات پر نکلتے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ بسا اوقات پورا کا پورا پرچہ ہی عامر صاحب کی ہی نگارشات پر مشتمل ہوتا۔ پھر یہ بھی نہیں کہ رطب و یابس جو کچھ بھی بن پڑا پرچے کا پیٹ بھر کر چھاپ دیا۔ بلکہ قوت و استدلال اور فکر و بصیرت کی دلکشی کے ساتھ ایک ایک صفحہ عامر صاحب کی فکر و نظر کی چھلنی میں چھن کر زیب قرطاس ہوتا تھا۔ اور ظاہر باطن کے حمیدہ کمالات سے مزین ہو کر جب یہ چیز سامنے آتی تو ذہن و ضمیر اور فکر و فن جھوم جھوم جاتے۔ اس کی مثال میں ہم تجلی کے طلاق نمبر کا ذکر کریں گے۔ طلاق ثلاثہ کا موضوع بہرحال ایک خشک موضوع ہے مگر عامر صاحب نے اس پر بھی ایک ضخیم نمبر مرتب کیا اور اس کی ترتیب و تسوید میں تحقیق و تدقیق محنت مطالعہ کے کیا کیا ہفت خواں طے کئے اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ تو اہل علم ہی کر سکتے ہیں۔ مگر سرسری نظر رکھنے والے

بھی اتنا تو سوچ ہی سکتے ہیں کہ عربی کی بڑی بڑی ضخیم مجلدات کی ورق گردانی کے بغیر اس میدان میں دو قدم بھی نہیں چلا جا سکتا پانچ چھ نمبر سال میں پیش کرنا تجلی کا عام معمول تھا اور اس میں عامر صاحب از اول تا آخر تمام رعنائیوں اور شادابیوں کے ساتھ داد قلم دیتے تھے

عامر صاحب کے قلم میں قدرت نے جو بانکپن رکھا تھا اس نے تجلی کو تعارف و شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیا تھا۔ پھر اس پر عامر صاحب جس طرح بار بار بارگاہ ایزدی میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہوئے اس کو محض فضل ربی گردانتے تھے (جیسا کہ حقیقت یہی ہے کہ آدمی کا ہر کمال، اس کی ہر خوبی بلاشبہ اللہ جل شانہ کا پرتو کرم ہے اور کچھ نہیں) یہ چیز عامر صاحب صفائے باطن کی دلیل اور درست انداز فکر کی علامت ہے عامر صاحب کے قلم میں تنقید کی تندی اور تلخی بھی اکثر ہوتی تھی جس سے قدرتی طور پر بعض اصحاب کو ان سے شکوہ ہوتا تھا لیکن عامر صاحب کو اپنی اس کمزوری کا واضح احساس اور برملا اعتراف تھا جس کا اظہار وہ بار بار تجلی کے صفحات پر کرتے رہتے تھے۔ بایں ہمہ یہ بات مسلم ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے برہان و دلیل کی قوت کے ساتھ لکھتے تھے یہ تو بالکل ممکن ہے کہ ان کے دلائل کمزور یا ناقابل اعتبار ٹھہرائے جا سکیں لیکن یہ بہر حال کوئی نہیں کہہ سکتا وہ گفتگو کرتے ہوئے ہوا میں تیر چلاتے تھے۔ تجلی کے صفحات اس کے گواہ ہیں اس کے باوجود اگر کوئی شخص عامر صاحب کی اس کمزوری کو ان کی تمام تر صلاحیتوں کے لئے ناسخ سمجھے تو یہ بہر حال اس کی اپنی ذاتی رائے ہوگی جس کو اعتبار کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔

تجلی بظاہر ایک پرچہ تھا لاکھوں پرچوں کی بھیڑ میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے مگر رب العزت نے عامر صاحب کے قلم کے ذریعہ جس طرح ایک حلقۂ فکر بنایا، جس طرح ذہن و فکر اس سے متاثر ہوئے جس طرح قدر دانوں نے تجلی کو سر آنکھوں پر لیا اور یہ بھی کہہ دو تو شاید بجا نہ ہو کہ جس طرح تجلی نے ایک نسل کو متاثر کیا یہ مقبولیت عنقا تو نہیں مگر نادر الوقوع ضرور ہے اور بے تامل اس موقع پر کہا جا سکتا ہے کہ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

عامر صاحب اکثر کہا کرتے تھے اور غالباً کبھی لکھا بھی ہے کہ تجلی محض ایک ایسا پرچہ ہی نہیں کہ جوں توں چھاپ کر اس کو خریداروں کو بھیج دیا جائے اور رواجی اور رسمی طور پر جب جس کا چندہ ختم ہوا تو چندہ

کی اپیل کر دی جائے۔ تجارتی انداز میں توسیع و اشاعت کی کوشش کر کے وصولیابی کی جدوجہد کی جائے وہ کہتے تھے کہ تجلی تو ان سب چیزوں سے بلند میری زندگی کا مشن اور میرے ولولوں اور امنگوں کا ترجمان ہے اور ان شاء اللہ میری زندگی کی آخری سانس تک یہ چراغ گل نہیں ہوگا۔ حق تعالیٰ نے ان کی یہ آرزو پوری فرمائی۔ تجلی نہ صرف ان کی زندگی تک نکلا بلکہ ایک اشاعت تو ان ہی کے قلم سے مرتب شدہ ان کی وفات کے بعد بھی ناظرین تجلی تک پہنچی۔ اب آئندہ کیا ہوگا اس کو کوئی نہیں جانتا عامر صاحب کے متعلقین عزائم تو یہی رکھتے ہیں کہ تجلی کو تا بحد امکان بند نہیں ہونے دیا جائے گا۔ حق تعالیٰ ان کی مدد فرمائیں۔

(ملیح نے)

عامر صاحب ایک پختہ گو قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے بھی مقام امتیاز رکھتے تھے ان کی شعری تخلیقات تجلی کے صفحات پر جلوہ گر ہوتی رہتی تھیں جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کے اشعار میں شاعرانہ محسن کے ساتھ انفرادیت کا رنگ چھایا رہتا تھا۔ غزل، نظم، قطعات وغیرہ جملہ اصناف سخن پر انھیں قدرت تامہ حاصل تھی ارباب فکر و بصیرت ان کی تخلیقات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ غزل میں ان کی نے جگر کی روایات سے ہم رنگ نظر آتی تھی۔ سرشاری اور بے خودی کی سی ہو بہو وہ کیفیت تو چاہے نہ ہو لیکن ان کی نوائے غزل میں جگر کی نے بہر حال سنائی دیتی تھی ایک زمانہ میں مشاعروں اور نشستوں میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ بعد کو تحت اللفظ پڑھنے لگے ان کے مخصوص فکر اور نظریات کی چھاپ ان کے کلام میں واضح طور پر تھی ۱۹۴۷ء کے بعد آشفتہ حالی اور حالات کی قیامت خیزی کے نتیجہ میں برصغیر کا شعری ادب بہت متاثر ہوا ہے اور شاید کوئی قابل ذکر شاعر ہوگا جس نے وقت کی اس رفتار کو پیکر شعر میں نمایاں نہ کیا ہو اور ایسا ہونا قدرتی بھی ہے کیونکہ شاعر بھی اسی کلج اسی ماحول کا پیداوار ہوتا ہے جس کے اندر اس کا ذوق اس کا وجدان، اس کا شعور جنم لیتا اور پرورش پاتا ہے۔ عامر صاحب کے اشعار میں بھی حالات کی تلخی کا عنصر بہت نمایاں ہوتا تھا۔ عامر صاحب چونکہ صاحب فن شاعر تھے اس لئے وہ الفاظ کو ان کی تمام تر نزاکتوں کے ساتھ برتنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ ان کے یہاں فکر و فن بھی ملتا تھا

اور شعور و شعریت بھی، احساس کی نزاکت اور ندرت بھی ان کے یہاں ہوتی تھی اور تغزل و ترنم کی کھنک بھی۔ مجھے بہت مرتبہ عامر صاحب کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے مجھے بصیرت کے ساتھ یہ اندازہ ہے کہ عوام الناس کے بس کی عامر صاحب کی شاعری نہ ہوتی تھی۔ اس لئے عوامی شاعر نہ عامر صاحب کبھی ہوئے اور نہ کبھی ہو سکتے تھے، لیکن خواص اور صاحبان فکر و نظر کے لئے ان کا کلام تبرک اور سوغات سے کم نہ ہوتا تھا۔ عرصہ گذرا دیوبند میں ایک مرتبہ بہت معیاری مشاعرہ ہوا جو واقعی آل انڈیا تھا اس میں جگر صاحب تشریف لائے تھے اور بھی بہت سے خوش فکر شعراء موجود تھے۔ عامر صاحب کی غزل ایک صاحب نے پڑھی جو خوش آواز تھے۔ عامر صاحب علالت کی بنا پر خود نہیں پڑھ رہے تھے۔ مجھے آج تک وہ سماں یاد ہے کہ جگر صاحب عامر صاحب کی غزل پر جھوم جھوم کر داد دے رہے تھے اور اگر میں یہ کہوں کہ عامر صاحب کی مرصع غزل اس مشاعرے میں سب سے کامیاب غزل تھی تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ان سطور پر پہنچ کر قدرتی طور پر مجھے عامر صاحب کے چند اشعار تازہ ہو گئے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ناظرین کو وہ یاد ہی ہوں اور ایسے بھی بہت ہوں گے جن کے لئے وہ اشعار نئے ہی ہوں۔ اس لئے ان کو یہاں ذکر کر دیا جائے تو ذوق کی تازگی اور وجدان کی بالیدگی کا سبب بھی ہو گی اور عامر صاحب کی خوش فکری اور برجستہ گوئی کی ایک مثال بھی۔ ؎

مری رات منتظر ہے کسی اور صبح نو کی
یہ سحر تجھے مبارک جو ہے ظلمتوں کی ماری

یہ قدم قدم بلائیں یہ سواد کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

وہی پھول چاک داماں وہی رنگ اہل گلشن
ابھی صرف یہ ہوا ہے کہ بدل گئے شکاری

یہ بساط عشق عامر ہے عجیب طرح کی بازی
کبھی جیت کر نہ جیتی کبھی ہار کر نہ ہاری

قفس کے لے سادہ دل اسیر و قفس کا در توڑنا تو ممکن
مگر چمن تک بھی جا سکو گے یہ پوچھ لو بال و پر سے پہلے

در حوادث پہ سر جھکانا مری خودی کو نہیں گوارا
میں آشیاں خود ہی پھونک لوں گا نزول برق و شرر سے پہلے

کمال علم و ہنر نے عامر بتا دیا رات کو سویرا
گناہ اتنا حسین کب تھا کمال علم و ہنر سے پہلے

جو ایک سجدہ امانت تھا پائے جاناں کا
ہوس اسے بھی در غیر پر گذار آئی

ہزار تو رسم و راہ چھوڑے ہزار میں ضبط شوق کر لوں
مگر دلوں کا یہ ربط باہم نہ تیرے بس میں نہ میرے بس میں

ابھی تو پچھلی بہاروں کے زخم تازہ ہیں — کوئی بچاؤ کہ پھر باغ میں بہار آئی
گذر گئی جو گذرنی تھی کچھ بھی یاد نہیں — یہ یاد ہے کہ تری یاد بار بار آئی

بہار مرے چمن میں گئی تو تھی عامر
خزاں کا رنگ اڑا تھا اسے نکھار آئی

جو دے رہی ہے ہمیں جام بے طلب دنیا — طلب کریں تو یہی زہر بھی پلا نہ سکے
مری نظر میں وہی سر ہے سر جسے عامر — زمانہ کاٹ تو ڈالے مگر جھکا نہ سکے

وہ نگاہ یاد آئی مجھے تھامنا چلا میں — یہ پڑے ہیں جام و مینا یہ صراحی یادوں کی

اب یہ دنیا شوق سے مجھ پر پتھر پھینکے تیر چلائے
میں تو خود ہی گوشہ نشیں ہوں پھرتا ہے اک سایا تنہا
ہنگاموں کی اس دنیا میں تنہائی نایاب ہے لیکن
جب بھی کوئی وقت پڑا ہے ہم نے خود کو پایا تنہا

اتو وہ جو بھی سزا دے وہ روا ہے یارو — میں نے صیاد کو صیاد کہا ہے یارو
اُف یہ نیرنگیٔ تقدیر بھی کیا ہے یارو — آ کے ساحل پہ کوئی ڈوب رہا ہے یارو
ایک مدت سے مجھے آپ ہے اپنی ہی تلاش — کوئی بتلاؤ کہیں میرا پتہ ہے یارو
آئینہ بھی مری صورت کا شناسا نہ رہا — وقت نے مجھ سے مجھے چھین لیا ہے یارو
شوق سے قتل ہوئے دھار پہ گردن رکھ دی — اہل دل کا یہی معیار وفا ہے یارو

آج کیا چل ہی بسا بزم جہاں سے عامرؔ
کم سوادوں میں یہ کیوں جشن بپا ہے یارو

یہ خوش نصیبی نہیں تو کیا ہے کہ اپنی مٹی لگی ٹھکانے
کہ وہ سرِ جو تھا بار دوش عامرؔ کسی کے قدموں پہ وار آئے

نہ زہد و تقویٰ نے یاوری کی نہ کام کوئی کمال آیا
حساب کے دن یہ سب تجارت حباب کی ضربتوں نے ڈھادی
ہمارے دامن میں وہ تو کہئے کہ تھے ندامت کے چند آنسو
کسی نے ان کو قبول کرکے ہماری فرد عمل جلادی

وہیں پھول ہنس رہے ہیں وہیں رو رہے ہیں مالی
وہیں جام چل رہے ہیں وہیں جھولیاں ہیں خالی
یہ خطا بتاؤں کس کی یہ نصیب کی ہیں باتیں
کہیں صبح بھی اندھیری کہیں شام بھی اُجیالی

نمونے کے طور پر یہ چند اشعار محض عامرؔ صاحب کی طبع رسا اور ماہرانہ صلاحیتوں کی شہادت کے طور پر نقل کر دیئے ہیں۔ میری نظر میں عامرؔ صاحب کی شاعری میں تخیل کی بلندی اور واقعیت پسندی اور حسن اور جذبے کی صداقت اور رعنائی اسلوب، تغزل کی رنگینی اور قدرت کلام یہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عامر صاحب کی شاعرانہ حیثیت پر ایک مستقل اور مفصل مقالے کی ضرورت ہے۔ زیر نظر مقالے میں تو اتنی ہی گفتگو کا موقع تھا۔ یہاں قلم کو روکنا ہی پڑا ہے تاکہ کچھ اور باتیں جو ضروری محسوس ہو رہی ہیں وہ سامنے آجائیں ورنہ عامرؔ صاحب کے یہاں خوبصورت اور قیمتی اشعار کا اتنا وافر ذخیرہ ہے کہ نقل کیجئے تو دفتر ہو جائے۔

ذاتی حیثیت سے عامرؔ صاحب ایک سادہ منش اور بے تکلف آدمی تھے۔ بناوٹ، تکلف، تصنع غالباً انھیں سونگھ کر بھی نہیں گئے تھے۔ ان کی سادہ مزاجی اور بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ چھوٹا آدمی ہو کوئی یا بڑا آدمی وہ ہر ایک سے اس طرح ملتے اس طرح گفتگو کرتے جیسے اجنبیت اور غیریت کی کوئی دیوار درمیان میں حائل نہیں بلکہ بعض اوقات کسی نہ جاننے والے آدمی کو ان کی طبعی سادہ مزاجی بچھورپن کا تاثر دیتی تھی کہ کسی بھی چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے ملتے ہوئے جب وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہکلا ہکلا کر باتیں کرتے تو محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی عامر عثمانی ہے۔ قلم کی دھاک ہند و پاک کی حدوں سے آگے بڑھ کر یورپ اور افریقہ اور عرب کی فضاؤں کو چھو رہی ہے۔ تجلی کے بڑھتے ہوئے حلقۂ اشاعت کے طفیل ہزاروں لاکھوں لوگ عامرؔ عثمانی کو احترام و عقیدت کی ایسی نظر سے دیکھتے جس کو اعتراف کمال سے تعبیر کیا جاسکتا ہے بعض باہر سے آنے والوں کو تو عامرؔ صاحب سے مل کر بعض اوقات مایوسی کا سامنا ہوتا۔ وہ سوچتے کہ جس عامرؔ کو تجلی کے آئینے میں دیکھا تھا یہ شخص تو اس بلند و بالا تخیل سے یکسر مختلف ہے۔ وضع قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، معمولات، معاشرت کوئی بھی تو چیز ایسی نہیں جو عامر صاحب کی فن اور فضیلت کے ہم قدر کہی جاسکے۔ عامر صاحب کو طبع کی ہوئی اور خول چڑھی ہوئی بے مایا تصنع اور شخصیت سازی سے نفرت تھی اس کا اظہار ان کی تحریروں سے بھی ہوتا تھا۔ دیوبند والوں کے لئے تو ان کی یہ ادائے سادہ کوئی عجوبہ نہیں تھی۔ عامرؔ صاحب کو روزانہ ٹہلنے اور سوڈا پینے کی عادت تھی۔ مغرب کا بعد ہوا اور عامر صاحب رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بازار چلے سوڈے والے کی دوکان پر پہنچکر۔ بیٹھنے کی جگہ نہ ہوئی تو کھڑے کھڑے سوڈا پیا اور ٹہلنے نکل گئے۔

دیوبند میں کوئی ادبی نشست ہوتی کوئی مقامی مشاعرہ ہوتا، عامر صاحب اس میں بے تکلف پہنچتے اور آخر تک شریک رہتے۔ یہ چیزیں ان کی سادگی اور تکلفات سے بے نیاز ہونے کی دلیل ہیں۔ ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کی خفیہ اعانت اور پاس پڑوس میں رہنے والے غریب غربا، مفلوک الحال لوگوں کی پوشیدہ مالی امداد کرنا عامرؔ صاحب کی ایک ایسی ممتاز خصوصیت ہے کہ اس کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے۔

اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ (تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ پس اللہ کے نزدیک بہت زیادہ پسندیدہ وہ شخص ہے جو اس کی

جو اس کی مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہو)

آج کے نفسا نفسی کے دور میں یہ بات اتنی عنقا ہے کہ اچھے اچھوں کو اس معیار سے ناپئے تو فرد تر نظر آئیں گے عامر صاحب کی مفلس نوازی اور غریب پروری کے چند در چند ایسے واقعات میرے علم میں آئے ہیں جن کو سُن کر مجھے یقین ہوا کہ انشاء اللہ حق تعالیٰ ان کے ساتھ ضرور رحم و کرم کا معاملہ فرمائیں گے وہ جس طرح دنیا میں خلق خدا کی مدد کرتے تھے وہ ان کے لئے ضرور کفارۂ سیئات بنیگی حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے

اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْکُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ	تم زمین والوں پر رحم کرو آسمان والا تم پر رحم کرے گا

کوئی غریب بوڑھی عورت جو کہیں عامر صاحب کے پاس پڑوس ہی میں رہتی تھی معلوم ہوا کہ مہینے کے پہلے ہفتہ کو عامر صاحب خود در وانہ پر جاکر ایک مقررہ رقم اس کو دیتے تھے۔ ۱۲ر اپریل کو عامر صاحب کی وفات ہوگئی اور اس وقت تک اس بڑھیا کو رقم نہ پہنچی تو ایک دو روز انتظار کے بعد ان کے گھر پہنچی۔ عامر صاحب کو دریافت کیا۔ جب اس کو بتایا گیا وہ تو چند روز پہلے خدا کو پیارے ہوگئے ہیں۔ تو اس وقت اس پر کیا گذری ہوگی اس کا اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں۔ از رہ اختصار میں نے ایک ہی واقعہ نقل کیا ہے سب کو ذکر کیا جائے تو داستان بن جائے مگر اسی ایک واقعہ سے عامر صاحب کی جو تصویر سامنے آئی ہے اس کو دیکھنے والے بہر حال عامر صاحب کی اس ممتاز خوبی کا اعتراف ضرور کریں گے۔

شاعر تو وہ فطری تھے اس میں تو ہمیشہ انہوں نے نُدرتِ خیالی کے جوہر دکھلائے جس کا مختصر سا تذکرہ اوپر کی سطور میں ہوچکا ہے۔ تنقید و تبصرہ کی راہ میں انہوں نے اُس راہ کو اپنایا اور دشوار طلب اور بڑی کد و کاوش کی طالب تھی۔ پوری کتاب کو نہایت ذمہ داری کے ساتھ دیکھ کر حتی الامکان اس کے ایک ایک گوشے پر گفتگو کرنا اور کھرے کھوٹے کو الگ الگ کردینا ان کا معمول تھا اس میں جو دردسری انھیں کرنی پڑتی جو قیمتی وقت انھیں اسمیں لگانا پڑتا اس کو وہ اپنا فرضِ منصبی سمجھ کر ادا کرتے محنت اور جاں سوزی کے ساتھ مطالعہ کرنے کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک کتاب پر تفصیلی محاکمہ کرنے کے لئے انہوں نے چھ ماہ اس طرح گذارے کہ تقریباً اٹھارہ گھنٹے مسلسل مطالعہ کرتے۔ دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں پہنچ جاتے اور عربی کی ضخیم مجلدات کھول کھول کر اس طرح گم ہوجاتے کہ پتہ ہی نہ رہتا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے کیا نہیں۔ کتب بینی میں یہ انہماک اپنے مقصد سے لگن مطالعہ کا اتنا شوق، مسلسل پڑھتے رہنے کی یہ دُھن بالآخر جب اُن کی دلآویز تحریروں کے روپ میں سامنے آئی تو دنیا کو اُن کے وسعت مطالعہ کی داد دینی پڑی۔ شواہد تقدس کتاب پر تنقید کے دوران جب انہوں نے ایک مرتبہ تفصیلی جائزے کے ساتھ ان کتابوں کی فہرست دی جو ان کی ماخذ رہی تھیں تو ان تمام ضخیم عربی کتب کی تعداد ۱۷ تھی۔ اور اُن میں تقریباً اکثر وہ معیاری کتابیں تھیں جن کے نام بھی آج کے فضلاء کو شاید معلوم نہ ہوں۔ آدمی کا کام پیارا ہوتا ہے۔ نام پیارا نہیں ہوتا۔ عامر صاحب نے بے پناہ محنت کرکے اپنے لیے جو مقام پیدا کیا وہ بہت لوگوں کے لئے سبق آموز ہونا چاہئے انہوں نے کام سے نام پیدا کیا۔ سستی شہرت حاصل کرنے کی راہ بھی وہ بسہولت اپنا سکتے تھے۔ ان کو ایسے گُر معلوم اور ایسے وسائل مہیا تھے۔ مگر انہوں نے اپنے لئے جو راہ منتخب کی وہ جان گسل اور خاصی حوصلہ آزما تھی۔ آج وہ دنیا میں نہیں لیکن ان کا کیا ہوا کام، ان کے علمی اور ادبی تبرکات اتنی وافر مقدار میں موجود ہیں کہ بہت دنوں تک اُن کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ مشق اور تمرین، محنت اور استقامت سے انہوں نے قبولیت عامہ کا جو شرف حاصل کیا اب آخری چند برسوں سے اس کا ظہور ہونے لگا تھا ان کی تحریروں کے شیدائی دور دور سے انھیں دعوت دیتے تھے اور بڑے اشتیاق سے انھیں بلاتے تھے۔ ان کے لئے غائبانہ عقیدت رکھتے تھے چنانچہ ان کا آخری سفر بھی اسی قسم کی پُرشوق دعوت پر ہوا اور بالآخر جان لیوا بنا۔

مارچ ۷۵ء کو دارالعلوم کے مہمان خانے میں ایک ادبی نشست میں وہ شریک ہوئے۔ وہیں انھیں خطرناک قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا۔ ایسا کہ نبضیں چھوٹ گئیں۔ ڈاکٹر تک مایوسی کا اظہار کرنے لگے۔ دیکھنے والے سہم گئے کہ دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے۔ صبح تک یہی کیفیت رہی۔ ۸، ۹ بجے تک افاقہ ہونا شروع ہوا تا آنکہ رفتہ رفتہ طبیعت بحال ہوتی گئی۔ تاہم کمزوری اور

نقاہت ہونی ہی تھی وہ رہی آنے جانے والوں عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا اور یہ توقع ہو چلی کہ خطرے سے باہر ہو کر اب عامر صاحب کی صحت بتدریج بحال ہو جائے گی۔ اسی دوران بمبئی میں ہونے والے مشاعرے کی تاریخیں آگئیں۔ انھوں نے اس میں شرکت کے لئے پختہ ارادے کا اظہار کیا۔ تمام چھوٹے بڑے احباب اور متعلقین نے ان کی طبیعت کی نزاکت کے پیش نظر ان کو منع کیا مگر وہ اپنے فیصلہ پر قائم، باوجود تمام تر نقاہت کے بمبئی پہنچے۔ مشاعرہ پڑھا وہاں طبیعت بالکل ٹھیک رہی۔ اپنی عافیت کا خط اپنے گھر لکھا۔ وہاں سے سنا ہے کچھ احباب ان کو پونا مشاعرہ میں... لے گئے جہاں کے لئے وہ مدعو پہلے سے تھے مگر شرکت کا ارادہ نہیں تھا۔ وہاں کے لوگوں نے اصرار کیا تو جانا پڑا۔ مشاعرہ میں شرکت کی کلام پڑھا، پڑھتے ہی طبیعت نڈھال ہو گئی۔ خطرناک ہارٹ اٹیک ہوا اور اسٹیج پر ہی سے نیم مردہ حالت میں ان کو فرسٹ ایڈ وغیرہ کے لئے اسپتال لے جایا گیا۔ انسانی کوشش کی حد تک معالجہ وغیرہ میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ مگر وقت موعود آچکا تھا۔ اس لئے ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ حیات و موت کی اس جنگ میں ہم ہار گئے ہیں۔ ان کے جسد خاکی کو دیوبند لانے کی بھی پوری سعی کی گئی۔ مگر کامیابی نہیں ہو سکی۔ بالآخر بمبئی میں تدفین کی گئی صاف ظاہر ہے کہ ایسی کمزوری کی حالت میں بمبئی جانے کا اصرار اور لوگوں کے روکنے کے باوجود نہ ماننا سوائے اس کے اور کیا معنی رکھتا ہے کہ بمبئی کی زمین ان کو کھینچ رہی تھی۔ ورنہ عام طور پر ایسی صورت میں آدمی اتنے طویل سفر کو شاید سوچ بھی نہ سکے خیال کیجئے کہاں دیوبند کہاں بمبئی۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ کس کو کہاں آسودۂ موت ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ	اور کوئی شخص واقف نہیں کہ وہ
أَرْضٍ تَمُوتُ	کس سرزمین میں وفات پائے گا

تجلی پڑھنے والے واقف ہیں کہ عامر صاحب نے اب آخر میں فتنۂ قادیانیت کا مثلہ کرنے کی ٹھانی تھی۔ ان کا ایک مفصل مضمون تجلی میں بھی آچکا تھا۔ جس کو جملہ اہل نظر نے وقعت کی نظر سے دیکھا تھا۔ یوں تو علماء امت نے بحمد اللہ اس فتنہ کو پورے طور پر فکری اور علمی محاذ پر شکست فاش دے کر زمین کی تہوں میں دفن کر دینے کا سامان مہیا کر دیا تھا۔ تاہم مرے ہوئے سانپ کی طرح یہ کبھی کبھی دھڑ دھڑی لیتا ہے تو پھر اس کی سرکوبی کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے عام مومنین کی طرح عامر صاحب کو بھی اس ملعون تحریک کی کمیت کا پورا احساس تھا اور وہ پورے طور پر اپنی طبیعت اور عادت کے مطابق اس کو ملیامیٹ کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ مگر وہ اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ اور یہ کام ان کی ذات کی حد تک ادھورا رہ گیا۔ ورنہ قادیانیت کے "جیب و گریباں" کے عنوان سے انہوں نے قادیانیت کا پوسٹ مارٹم مدلل طریقہ پر شروع کیا تھا۔ اور وہ اس موضوع پر ایک خاصہ کی چیز تھی۔

مولانا مودودی سے عامر صاحب کو عقیدت تھی اور جماعت اسلامی کی حمایت ان کے قلم و فکر کا بنیادی محور اس میدان اور محاذ پر انہوں نے برسہا برس کام کیا اور تحقیق و تدقیق کے بعد چونکہ یہ سمجھتے تھے کہ یہی جماعت عصر حاضر میں مسلمانوں کی علمی عملی، دینی اور فکری رہنمائی کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اس بات کو صحیح سمجھ کر انہوں نے اس کی حمایت شروع کی اور اس طرح کی کہ اچھے اچھوں کو پیچھے ہٹا دیا۔

بہرحال عامر صاحب کی وفات سے قدرتی طور پر ان کی ذات سے متعلق بہت سی جہات و صفات کا خاتمہ ہو گیا ہے تاہم ان کا کیا ہوا کام پچیس چھبیس سالہ دور پر محیط ان کی تحریروں کا مجموعہ پڑھنے والوں کو بہت دنوں تک ان کی یاد دلاتا رہے گا یہاں تک پہونچ کر میرے سامنے عامر صاحب کی ایک تحریر آگئی ہے۔ جو انہوں نے ۱۹۶۲ء میں مولانا حفظ الرحمٰن ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء ہند کی وفات پر تجلی میں بطور اداریہ لکھی تھی۔ اس کا اقتباس پیش کر کے خیال ہے کہ اس مقالے کو ختم کر دیا جائے۔

"کچھ لوگ مرتے ہیں تو ایک آنکھ بھی ان پر رونے والی نہیں ہوتی، کچھ لوگ مرتے ہیں کہ احباب و اقرباء کا ایک محدود حلقہ ان پر آنسو بہا لیتا ہے لیکن کچھ لوگ مرتے ہیں تو ادھر سے ادھر تک فضا میں اندوہ و ملال کا غبار بکھرتا چلا جاتا ہے،

اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کتنی آنکھیں اشکوں سے بہا گئیں، ان کی موت پر روحیں تڑپ اٹھتی ہیں۔ دماغ جاتے ہیں اور احساس کے ماتھے پر پھیلی ہوئی چنگاریاں پسینہ بن کر پھیل جاتی ہیں۔"

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"ان کی حیات قوم و ملت کے لئے بڑی قیمتی تھی۔ وہ مضبوط سہارا تھے اور آج جبکہ وہ اپنے اعمال کا دامن سمیٹ کر اپنے رب سے جا ملے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک یاس انگیز ساعت ہے، ایک کربناک لمحہ ہے، ایک حادثۂ اعظم ہے۔ موت کا فرشتہ اگر جل شانہ کا تابع فرمان نہ ہوتا تو ہم فرط غم میں یہ کہنے سے بھی نہ چوکتے کہ مجاہد ملت کی روح قبض کرنے میں اس نے جلد بازی کی ہے۔ موصوف اگرچہ جواں سال نہیں تھے کہ ہم غالب کی زبان میں یہ کہیں ؎

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

لیکن اتنے عمر رسیدہ بھی نہیں تھے کہ دس سال اور جئے جانا عجوبہ کہلاتا۔ مگر ہمارے منہ میں خاک کوئی بڑے سے بڑا حادثہ اور عظیم سے اعظم ابتلا بھی خالق حکیم و دانا کی مصلحتوں سے خالی نہیں ہوا کرتا۔ ہر قیامت جو ہم پر ٹوٹتی ہے اس کا حق ہے کہ ٹوٹے۔ کیونکہ جو کچھ جس وقت ہوتا ہے وہ اسی لائق ہے کہ اسی وقت ہو۔ تقدیر الٰہی میں جہاں انحراف نہیں وہیں خطا بھی نہیں۔ تعالیٰ اللہ عزّ و جلّ۔"

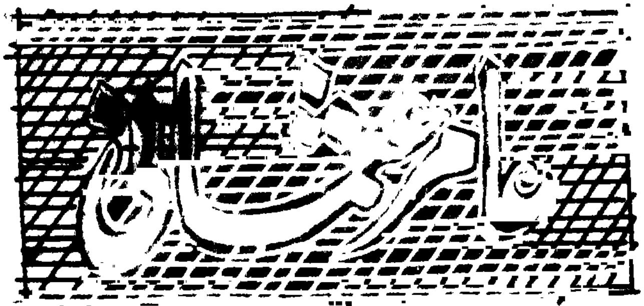
کون جانے کتنے ہزاروں لاکھوں لوگ جو عامر صاحب سے عقیدت اور تعلق خاطر رکھتے تھے، ان کے دلی احساسات بھی آج ان کی وفات پر یہی ہوں گے جو انھوں نے اوپر کی سطور میں مجاہد ملت کے لئے سپرد قلم کئے تھے۔ کیسی حیرتناک اور عجیب و غریب یہ بات ہے کہ آدمی دوسرے کیلئے جذبات تعزیت ظاہر کرتا ہوتا ہے اور بلا تاخیر وہ خود اس پوزیشن میں آجاتا ہے کہ دوسرے اس کے لئے تعزیت کرتے ہوتے ہیں۔ یہ ایک مسلسل چکر ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔ جس کی لپیٹ میں ہر ایک کو آنا ہے۔ فرق صرف اپنے اپنے نمبر کا ہے۔ بقول کسے ؎

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے۔

یہ تحریر قدرے طویل ہو گئی ہے لیکن اگر یہ اپنے موضوع کا حق ادا کر سکی تو سمجھئے لکھنے والے کی محنت ٹھکانے لگی۔ ان سطور کے ذریعہ عامر صاحب کی جو قلمی تصویر بنانی مقصود تھی کوشش یہی کی ہے کہ وہ اپنے خط و خال کے ساتھ مکمل ہی بن جائے اس میں کہاں تک کامیابی ہو سکی اس کو خدا ہی بہتر جانے و للہ عاقبۃ الامور۔

صرف یادِ غم بیکراں رہ گئی
مرنے والا گیا داستاں رہ گئی

از: علامہ انور صابری



مر کر بھی نہ مرنے والا انسان

خدا بخشے مولانا عامر عثمانی کو۔ عجب ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ مجھ سے عمر میں چھوٹے لیکن علم و فضل میں بہت بڑے تھے۔ بیک وقت شاعر خوش فکر بھی تھے۔ ادیب بالغ نگاہ بھی۔ بلند پایہ صحافی بھی۔ اور قابل قدر نقاد بھی۔ متحمل جماعتِ اسلامی بھی۔ زندگی سوز و گداز کا مجموعہ تھی۔ دردِ ملت نے ان کے دل و دماغ کو اور زیادہ مضطرب بنا رکھا تھا۔

تحریر کا انداز بیان مفکرِ لاثانی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے اندازِ بیان کے مشابہ، اور گفتگو کا لب و لہجہ مفسرِ اعظم علامہ شبیر احمد عثمانی کے لب و لہجہ کے مماثل ہوا کرتا تھا۔

مومن کے لئے جس جرأتِ ایمان کی ضرورت ہے وہ اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ خاندان کے اکثر و بیشتر افراد پاکستان چلے گئے تھے۔ مگر ان میں جذبۂ حُبّ وطن اس قدر طاری تھا کہ تا دمِ مرگ ہندوستان چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔

سیاسی اعتبار سے وہ نہ لیگی تھے، نہ کانگریسی۔ دونوں جماعتوں کے اچھے افراد سے محبت و تعلقات کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

رائے کے اختلاف میں بہت شدید تھے۔ دوستوں کو بھی نہیں بخشا کرتے تھے۔ وہ اربابِ توحید کی اس صف میں تھے جسے "دیوبندی" کہا جاتا ہے۔ میں طبعاً وجد و حال کا متوالا اور اعراس میں شرکت کا رسیا تھا۔ انہوں نے کئی مرتبہ تجلی میں میرے "بدعتی" ہونے پر سخت ترین طنز فرمایا۔ لیکن ملاقاتوں میں خلوص کی گرم جوشی، احساس کو تلخیوں سے آشنا نہیں ہونے دیتی تھی۔

موجودہ جمعیۃ العلماء کی سیاست اور طریقۂ کار سے متفق نہیں تھے۔ بلکہ اس کی پالیسیوں کے سخت ترین مخالف تھے۔

شاعرانہ نشستوں کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ بہ اصرار اپنے مکان پر نشستِ سخن میں لے جاتے تھے۔ بے جا داد سے پرہیز اور عمدہ شعر پر اظہارِ ستائش خیر و ہستی بن چکا تھا۔

نمازِ مغرب کے بعد ایک مخصوص دوکان پر سوڈا لینے جانا معمول میں داخل تھا۔ عزیزم بے چین دیوبندی کی دوکان راستے میں پڑتی تھی۔ دو چار منٹ وہاں ضرور بیٹھتے تھے۔ بے چین کی غزلوں سے متاثر نظر آتے تھے

تاریخی تجزیوں نے بنو امیہ کی حمایت اور ہر روح کی والہانہ عقیدت نے عشقِ آلِ رسول سے ہمکنار رکھا۔ یہ تضادِ ذہن کسی الجھن کا باعث نہ بن سکا۔ توازنِ خیال ہر قدم پر ہم رکاب رہا۔

حافظے میں لاکھوں کتابوں کے معانی و مطالب اور الفاظ و متن دونوں محفوظ تھے۔ بولنے اور لکھنے میں کوئی حوالہ غلط نہ ہوتا تھا

"ہر وقت ہنستے رہنا اور دوسروں کو ہنساتے رکھنا"
اُن کی سرشت حیات تھا۔ شدتِ غم کے ماحول میں بھی ناموافق حالات کی شکایت کبھی کرتے نہیں دیکھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی زندگی میں انہوں نے قسمت کی ستم ظریفیوں کا ذکر کیا ہو۔

علم و تحقیق کا جو قیمتی اثاثہ انھوں نے چھوڑا ہے۔ وہ انھیں مرنے کے باوجود کبھی نہ مرنے دیگا۔ وہ کل بھی زندہ تھے آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے سنہرے الفاظ سدا دوسروں کے لئے رشد و ہدایت کا ذریعہ بنتے رہیں گے

انہوں نے جو چراغ روشن کیا تھا وہ ابھی تک روشن ہے اس کی روشنی سے لاکھوں انسانوں نے فیض اٹھایا ہے۔ دنیا اس کی ایمان پرور روشنی سے فیض حاصل کرتی رہے — اور خدا اس غریب الوطنی کی حالت میں مرنے والے "حکمی شہید" کو اپنی رحمتوں سے نواز کر خلد بریں میں داخل فرمائے۔

(از صفحہ ۴۰۹)

مولانا عامر عثمانی دنیا کے بے تاج بادشاہ

معاملے میں لڑائی مول لی، گروہی تعصب اور مصلحت اندیشی کے ہر سائے سے گریزاں رہے اور وقت کے تقاضوں کو ٹھکرا کر حق کا ساتھ دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا۔

مختصر یہ ہے کہ وہ دنیائے تحریر کے بے تاج بادشاہ تھے اور آج ان کی وفات کے بعد تحریر کی دنیا میں جنگل کا سا سناٹا بکھرا ہوا ہے اور یہ دنیا اسی قسم کے دوسرے بادشاہ کا انتظار کر رہی ہے لیکن اس انتظار کا حاصل مایوسی کے سوا کیا ہو گا

جناب
محمد منیر خاں
(ادیب کامل علیگ)

مولانا عامر عثمانی

ایک بے باک صحافی اور ایک نڈر مبصر

حضرت مولانا عامر عثمانی صاحبؒ ہندوستان کے ان مانے ہوئے قلمکاروں میں سے تھے جن کی تحریروں میں زبانِ ادب کی رعنائی۔ نقد و نظر کا عمق۔ اور علم و تفقہ کی گہرائی پائی جاتی ہے اپنی انتھک بے پناہ صلاحیتوں کے سبب وہ شہرت و بلندی کے جس بلند مرتبہ پر پہونچ گئے ہیں اب ان کے تعارف کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ علمی دنیا کا شاید ہی کوئی فرد و بشر ایسا ہو جو موصوف کو جانتا نہ ہو۔ اور شاید ہی کوئی ایسی شخصیت ہو جو ان کے بے پناہ زورِ قلم کا لوہا نہ مان چکی ہو۔ مرحوم کے قلم میں نکھار، قوتِ بیان، سلیقۂ نقد اور اسلامی فکر ایسی چیزیں ہیں جو انھیں حیات و دوام کی منزلوں تک پہنچا گئیں۔ وہ بہت لکھتے تھے۔ اور بہت ہی اچھا لکھتے تھے، یوں تو لکھنے والوں کی کمی نہیں لیکن ایسے لکھنے والے کم ہیں جن کے حسنِ تحریر میں ان کے سوزِ جگر کا لہو ٹپکتا ہو۔ عامر صاحبؒ کا قلب، ملت کے درد، دین کی محبت، خدا کی خشیت اور مجاہدانہ عزیمت اور سوز و گداز سے منور و معمور تھا، بات میں زور، انشا میں تیکھاپن۔ استدلال میں تو غضب کی تاثیر تھی۔ یہی وہ اوصافِ عالیہ ہیں جو ان کی ہر تحریر میں گل کاریاں کرتے اور جولانیاں دکھاتے نظر آتے ہیں۔

اسلام کی حقانیت و صداقت کو اجاگر کرنے کے لئے زندگی بھر جو کبھی لڑائیاں لڑتے رہے اور ایسی لڑی کہ دریوباطل کے چھکے چھوٹ گئے، کیا حدیث، کیا فقہ، کیا منطق، کیا شعر و ادب، کیا کمیونزم، کیا اشتراکیت، کیا شعیت، کیا قادیانیت، کوئی بھی مورچہ ایسا نہیں تھا جہاں اس مردِ مومن نے اپنے قلم کے جوہر نہ دکھائے ہوں، جس محاذ پر ڈٹ گئے۔ بازی جیت کر رہے۔ یہ اکیلا شیر سارے ہی حریف پہلوانوں کو بیچ میدان سے للکارتا تھا اور جب بھی للکارا باطل افکار و نظریات کے بے شمار لاشے خاک و خون میں تڑپتے نظر آئے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ ان سے بغض و عناد رکھتے رہے ہیں اور انھیں بُرا سمجھتے رہے ہیں، ان کی علمی جلالت اور عالی مرتبت اور شانِ رفعت کا انکار کر کے انھیں علامہ مودودی کا پٹھو بتلاتے ہیں۔ یہ حاسدین تو زندگی بھر کوستے ہی رہے مرنے کے بعد بھی معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بغض و حسد کی اس سے بدترین مثال اور کیا ہو گی اور ان کے علمی کارناموں، فکری مجاہدوں اور گوناگوں خصوصیتوں سے صرفِ نظر کر کے انھیں مولانا مودودی صاحب کا پٹھو یا زبردست حامی بتایا جائے۔ حالانکہ حقائق و واقعات بالکل اس کے برعکس ہیں، کیا جبرئیل کے لفظ اقرأ اور سرورِ کائنات کے ما انا بقاری کے بارے میں مولانا مودودی صاحب سے انہوں نے اختلاف نہیں کیا۔ کیا علامہ مودودی کے مضمون "امام حسین و یزید" پر اُن سے اختلاف اس پر شاہد نہیں کہ وہ اپنی فہم و دانست کے مطابق

ہمیشہ حق کی حمایت میں سرگرم عمل رہے۔

لیکن انسانی نطرت کا خاصہ ہے کہ جب اسے اپنے عزائم منصوبوں میں ناکامی کا سامنا ہوتا ہے تو مزاج میں جھنجھلاہٹ و غصہ سوار ہوجاتا ہے۔ اس کی مثال اس چمگادڑ کی سی ہو جاتی ہے جس کی آنکھیں سورج کی تابناک روشنی سے خیرہ ہوجاتی ہیں حالانکہ یہ سورج کی روشنی کا قصور نہیں ہے بلکہ خود اس کی بینائی کا قصور ہوتا ہے۔ یہی قصور ترجمان کے ایڈیٹر اور مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ مولانا عبدالمجید صاحب سے بھی ہوگیا ہے۔ انھوں نے مولانا عامر کو مولانا مودودی کا پٹھو اور وکیل گردانا ہے۔ اندھوں اور احمقوں کے سوا کون ہوگا جو ان کی عظمت و حمیت سے انکار کرے

بریں عقل و دانش ببایدگریست

مولانا کی بالغ نظری وسعت مطالعہ، علم و فضل کا پوچھنا ہی کیا، بات کو خوب کھول کھول کر بیان کرنا ان کا دائمی معمول رہا ہے۔ جذبات میں ڈوب کر ان کی لکھی ہوئی ہر تحریر دل و دماغ میں اتر جانے کی قوی صلاحیت رکھتی ہے ان کے تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اصلاح تربیت کے لحاظ سے خالصۃً فکر جدید اور تہذیب حاضر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی سلیس، شگفتہ زبان، وزنی استدلال انشا رواں و پُر وقار، مطالب پاکیزہ و ایمان افروز۔

مولانا عامر عثمانی صاحب کو شعر و ادب میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ صحت مند، پاکیزہ خیالات کو شعر کا مرصع لباس پہنانے میں ان کا فن بڑا چست، اور بہت پرکار اور بے حد سلیقہ مند تھا۔ وہ اشعار کے دریائے رواں تھے جس کی ہر موج اپنے دامن میں گوہر چھپائے رہتی ہے۔ سرور کائنات کی توصیف میں ان کا یہ شعر کتنا جاندار اور انداز تخاطب کتنا دلکش اور پُر تاثیر و دلآویز ہے۔

تم نے انساں کو نور بصیرت دیا، ذوق عبرت دیا، حسن سیرت دیا
تم جو آئے تو دنیا کے دن پھر گئے، تم سے پہلے یہاں کا عجب رنگ تھا
کتنے بے جان معبود کتنے صنم آدم کی کارگاہوں میں ڈھالے گئے
عقل کس درجہ بیمار و مفلوج تھی، فکر کا دائرہ کس قدر تنگ تھا

قطعات میں غضب کی روانی اور بلا کی تاثیر ہوتی ہے جس میں وسعت و گہرائی سوزش بیان سب کچھ ہے۔ جو زندگی کو نیا جوش اور نیا ولولہ عطا کرتے ہیں

صحرا صحرا غم کے بگولے بستی بستی درد کی آگ
جینے کا ماحول نہیں ہے لیکن پھر بھی ..... جیتے ہیں
ساغر ساغر زہر گھلا ہے قطرہ قطرہ قاتل ہے
یہ سب کچھ معلوم ہے لیکن پیاس لگی ہے پیتے ہیں

مولانا اسلام پسند شعراء میں صف اول کے شاعر ہیں ان کی پختہ کلامی و مہارت فن مسلم اسلامی تصورات و نظریات سے والہانہ وابستگی و تعلق باطل افکار و خیالات سے ان کی شدید بیزاری ان کے فن کا وہ سرمایہ ہے جس پر بجا طور پر فخر و ناز کیا جا سکتا ہے۔ شعر و ادب میں استادانہ حیثیت اور گہری مہارت رکھتے ہوئے

وہ ایک بے لاگ صحافی کی حیثیت سے ہر محاذ پر ڈٹے رہے اور ایک مخلص رہنما کی حیثیت سے ملت اسلامیہ کی رہنمائی کے فرائض انجام دیتے رہے جس کو حق سمجھا اس کا اعلان برملا کیا۔ نتیجہ میں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں ۵۳ گھنٹے جیل کی اذیت ناک داستان ہنس ہنس کر سناتے رہے اور قارئین تجلی کو بھی ہنساتے رہے۔ شاید مصائب میں الجھ کر مسکرانا ان کی فطرت بن گئی تھی۔

مجھ ناچیز سے مرحوم کے گہرے تعلقات تھے۔ ہم ان کے ایک دو خطوط ذیل میں درج کر رہے ہیں جو ان کے خلوص، انسانیت و دوستی انکساری و فروتنی کی منھ بولتی تصویر ہیں۔

(۱) آپ کا مضمون دیکھ چکا ہوں پورے مطالب اس وقت مستحضر نہیں ہیں، اس لیے کچھ نہیں لکھ سکتا۔ تاہم تاثر اچھا ہی رہا تھا۔ علمی مسائل میں اگر باہم اختلاف بھی ہو تو اس سے ذاتی تعلق کو متاثر نہیں ہونا چاہیے، یہ انانیت و نفسانیت کا کرشمہ ہے کہ ہم اپنے سے اختلاف رکھنے والوں سے ذاتی عداوت و کدورت بھی رکھتے ہیں۔ بحمداللہ فدوی اس آفت سے بڑا ہے۔ علی ہذا۔ آپ کے بارے میں بھی یہی حسن ظن رکھتا ہے۔"

(۲) ذہن میں پاکیزگی و ستھرائی، خیالات میں صالحیت کا مظاہرہ ان کے ایک اور خط سے بھی ہوتا ہے جس سے نہ صرف ذہن میں محبت کے جذبات بیدار ہوجاتے ہیں بلکہ دل میں طہارت و حرارت پیدا ہوجاتی ہے اور اس لطیف احساس سے روح کے تار تک جھنجھنا اٹھتے ہیں۔

" میرے بارے میں آپ کا جذبہ توصیف غالباً مبالغہ کی سرحدوں کو چھو رہا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ ایک بے بضاعت اور معمولی انسان کے لئے کس چیز نے اس درجہ حسن ظن کو ابھارا ہے یا تو آپ کی غیر معمولی کریم النفسی ہے یا معصومانہ غلط فہمی، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جس شخص کو آپ اتنی تحسین سے نواز رہے ہیں وہ علمی میدان میں آپ سے بہت پیچھے ہے۔ اس سے زیادہ کوئی امتیاز اُسے آپ پر حاصل نہیں کہ اس کا قلم نسبتے کچھ زیادہ مشاق ہے خیر اللہ پاک آپ کو جزائے خیر عطا کرے، اور مجھے واقعتہً اس حسن ظن کا مستحق ٹھہرائے۔ دعائے خیر میں فراموش نہ کیجئے گا۔"

بہرحال اب جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تو ہمارا سب سے بڑا فرض ہے کہ ہم ان کے لئے دعائے مغفرت کریں اور ان کی روح کو سکون پہنچائیں۔ اس وقت وہ اس عالم میں نہیں ہیں۔ جہاں ان کو ہمارے پُرخلوص دعا و ایصال ثواب کی شدید حاجت ہے، ان کی مغفرت و رفع درجات کے لئے خدا کے حضور میں دعا کریں۔

الٰہی تو انکی روح اقدس کو نور کی چادر میں رکھنا
تیرے کرم پہ انھیں بھروسہ تھا تیرے دامن میں آگئے وہ

تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب تمیمی نجدی

آپ جانتے ہی ہیں کہ بدعتی حضرات اپنے سوا تمام مسلمانوں کو "وہابی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دراصل محمد بن عبدالوہابؒ کے نام نامی کی طرف نسبت ہے اور اس نسبت کو گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ سچائی کے متلاشی ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ فرما کر حقیقت سے آگاہ ہوں کہ محمد بن عبدالوہابؒ کس قدر سنت کے شیدائی، بدعت کے دشمن اور دین وملت کے خیر خواہ تھے۔ انگریزوں نے انھیں بدنام کیا اور بدعتی لوگوں نے اس بدنامی میں چار چاند لگائے۔ اس کتاب کے مصنف "قطر" کے محکمۂ شرعیہ کے قاضی احمد بن حجر ہیں۔ اردو ترجمہ مصفی الرحمٰن الاعظمی نے کیا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ فاضل مترجم نے بیش قیمت نوٹ بھی حواشی پر بڑھائے ہیں۔

قیمت ۔۔۔ ۴/۵۰

تاریخ دیوبند

دیوبند ایک قدیم بستی ہے۔ اس کی سرزمین نے انقلاب کی بے شمار کروٹیں دیکھی ہیں۔ اور اب دارالعلوم کی وجہ سے یہ بستی بین الاقوامی شہرت کی مالک بن گئی ہے۔ اس بستی کی دلچسپ اور محققانہ تاریخ جناب سید محبوب رضوی کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے۔ تاریخ نگاری میں مصنف موصوف کی بصیرت ایک امتیازی شہرت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپ کر ختم ہوگیا۔ اب دوسرا ایڈیشن فاضل مصنف کی نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے صفحات ۵۱۲ قیمت مجلد دس روپے ۱۰/-

تذکرۃ المصنفین اردو

یہ کتاب درس نظامیہ، درس عالیہ، نصاب ندوۃ العلماء، اور سرکاری نصاب کی کتابوں کے مصنفین کا جامع اور نہایت مستند تذکرہ ہے۔ جس کو مصنف کی عرق ریزی اور مساعی جمیلہ نے انسائیکلو پیڈیا بنا دیا ہے۔ مدارس عربیہ کے اساتذہ وطلباء کے لئے یکساں مفید ہے۔ ملک کے عظیم تبصرہ نگاروں نے اس کتاب کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ قیمت ۷/-

ورق ورق روشن

اخلاقی اسباق اور علم وحکمت کا ایسا خزانہ جو ہر دل و دماغ کو روشن کرے گا۔ اس کتاب میں مؤلف نے قرآن وحدیث تاریخ، آثار اور معیاری لٹریچر سے اللہ، رسول اور دنیا بھر کے دانشوروں، مصلحوں، اور عالموں کے بہت ہی مفید و نفیس ارشادات حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایمان یا انصاف یا اعتقاد یا انتقام کے بارے میں آپ کو لو دیکھنا چاہیں گے تو آپ کی فہرست میں یہ عنوان حل جائے گا۔ اسی طرح کسی بھی لفظ کو اس فہرست میں بآسانی ڈھونڈھا جاسکتا ہے۔

بہت شاندار اور لاجواب کتاب ہے قیمت مجلد تین روپے ۳/-
صفحات (۲۸۷)، متوسط سائز۔

مکتبہ تجلی دیوبند۔ (یو۔پی)

محمد یوسف ایم' اے

مولانا عامر عثمانی

دنیائے تحریر کے بے تاج بادشاہ

یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔

میں آٹھویں درجہ کا طالب علم تھا۔ ذہن بالغ نہ تھا مگر سمجھنے کی معمولی سی شدھ بدھ پیدا ہو گئی تھی۔ اسکول میں چند مولوی صاحبان کے متعلق سنا تھا کہ یہ "مودودی" ہیں۔ (ان اصحاب میں سے چند آج بھی بقید حیات ہیں) مودودی کا لفظ اگرچہ میری سمجھ سے بالاتر تھا مگر اتنا ضرور محسوس کرتا تھا کہ عام طور پر ان اصحاب کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ انہی اصحاب میں ایک مولوی صاحب بھی تھے یہ عربی کے ٹیچر تھے اور مولوی فاضل کی سند حاصل کر لی تھی۔ ان مولوی صاحب کا نام میں اب بھول گیا ہوں۔ یہ ہمارے درجہ کو عربی اردو پڑھاتے تھے

اقبال کا شعر پہلی بار مجھے ان ہی کی زبان سے کانوں میں پڑا تھا۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

ایک دن مولوی صاحب کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کتاب تھی۔ نہ معلوم کس وجہ سے مولوی صاحب نے وہ "کتاب" تھوڑی دیر کے لئے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ "کتاب" لیکر میں نے اس کا نام پڑھا۔ موٹے حرفوں میں لکھا تھا "تجلی دیوبند اس" کتاب" کو کھول کر میں اس وقت کیا سمجھا تھا۔ یہ اب مجھے یاد نہیں۔ مگر ایک بات ایسی تھی جس کو میں آج تک بھول نہیں سکا ہوں۔

اس چھوٹی سی کتاب میں ایک "سبق" کا نام تھا "مسجد سے میخانے تک"۔ اس مضمون میں کیا لکھا گیا تھا۔ یہ میں آج کیسے کہوں رب ہی جانے کہ کیا کچھ سمجھ سکا تھا یا نہ سمجھ سکا تھا مگر مضمون میں دو تین شعر ایسے تھے کہ جنھوں نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی۔ شعر یہ تھے ؎

در مختار میں یہ ہے وارد کل مودودی ملحد
اور شامی کی یہ عبارت ہے سارے مودودیوں پہ لعنت ہے
عامر ناہنجار زندیق کر دیا ہم سے عالموں کو ضیق
خارجی ہے بڑا گدھا ہے یہ

(دوسرا مصرعہ حافظے سے اتر گیا ہے)

اس وقت سے لے کر آج تک پھر یہ شمارہ میری نظر سے نہیں گذرا لہٰذا نہیں کہہ سکتا کہ مضمون کیا تھا۔ مگر میرے ذہن میں ایک دھندلی سی یاد باقی ہے۔ یہ شعر کسی ایسے ملا کی زبان سے کہلوائے گئے تھے جو مودودی دشمن تھا اور کسی مشاعرے میں یا کسی محفل میں اپنی تخلیقات پیش فرما رہا تھا۔

ملا مکی کی تخلیقات کو سمجھنا اس وقت میرے بڑی ناممکن

بات تھی۔ میں نے ان اشعار پر انگلی رکھ کر مولوی صاحب کو دکھا دیئے تھے، کیونکہ ذہن میں یہ بات ناچ رہی تھی کہ یہ صاحب بھی مولوی ہیں۔ مولوی صاحب نے "تجلی" کا یہ شمارہ میرے ہاتھ سے لے کر اپنے دوسرے ساتھیوں کو دکھا دیا تھا۔ اور کچھ دیر کے مودودیوں کی یہ پارٹی قہقہے لگاتی رہی۔

ماہنامہ تجلی سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ اس کے بعد کئی سال تک میں "تجلی" سے وابستہ نہ ہو سکا۔ کچھ تو اس لئے کہ ذہن اتنا پختہ نہ تھا جو تجلی کی عبارات کو سمجھ سکتا اور سمجھ اس لئے کہ اس دوران میں میرے فکر و نظر نے بہت سی قلابازیاں کھائیں۔ آج مجھے وہ صحیح تاریخ یاد نہیں جب میں نے "تجلی" کے ساتھ مستقل طور پر اپنا ذہنی رشتہ استوار کیا۔ شاید ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۳ء کے بعد کا کوئی ہی شمارہ ایسا ہوگا جو میری فائل میں موجود نہ ہو یا جسے میں نے پڑھ نہ لیا ہو۔ میں نے ہمیشہ ہی تجلی کا بڑی شدت سے انتظار کیا ہے اور حالات کیسے بھی رہے میں نے تجلی کو ضرور خرید لیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ ایسا مضبوط ذہنی رشتہ میں کسی دوسرے اردو رسالے کے ساتھ استوار نہ کر سکا۔ کتنے ہی رسالے دیکھے خریدے بھی اور پڑھے بھی مگر تجلی کی بات ہی دوسری تھی۔ یہ تو گویا اپنے دل کا ساتھی تھا جس کو کبھی بھلایا نہ جا سکتا تھا۔ جو جب بھی ملا ہے بڑے ہی پیار کے ساتھ ہم نے اسے گلے لگایا ہے۔

تجلی کے کتنے ہی شمارے ایسے ہیں جن میں صرف عامر صاحب کے قلم سے نکلی ہوئی تخلیقات زیب قرطاس ہیں۔ میں دوسروں کو تو نہیں کہہ سکتا مگر اپنے متعلق یہ کہنے میں مجھے کچھ بھی عار نہیں کہ مجھے تجلی میں صرف عامر صاحب کا لکھا ہوا پڑھنے کا مرض لاحق ہو گیا تھا یوں بھی تجلی کے عام شماروں میں زیادہ تر ایڈیٹر کی نگارشات کا حصہ غالب ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے تجلی اور عامر عثمانی میں ہم زیادہ فرق نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے سامنے دیوبند کا عامر عثمانی تجلی کی کتابی صورت میں کبھی ایک کبھی دو اور کبھی کبھار تین مہینوں کے بعد جلوہ گر ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ ہمارے دل میں عامر صاحب کی زیارت کا شوق کبھی اتنا زیادہ نہیں بھڑکا جو ہم کشمیر سے ہزاروں میل کی مسافت کو پھلانگ کر دیوبند اتر جاتے۔ انکی علالت کی خبریں تو ہر ماہ تجلی کے اوراق میں پڑھ ہی لیتے تھے۔ یہ بھی انہی سے پڑھ لیا تھا کہ تجلی کا پہلا شمارہ وہ بستر علالت پر لکھ کر منظر شہود لائے تھے، اور یہ بھی کہ مرض ایسا سخت تھا کہ اللہ کی کارسازی اور قدرت پر ان کا یقین آہنی نہ ہوتا تو ڈاکٹروں کی تشخیص کے بعد تجلی جیسے علمی ماہانہ کارنامے کی بازیافت تو دور کی چیز تھی انہیں اپنے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانا تھا۔ عامر صاحب کی موت ہمارے لئے بہت اچانک تھی۔ کئی دنوں تک یقین نہیں آیا کہ تجلی کا ایڈیٹر واقعی اس جہانِ فانی سے گذر گیا ہے۔

عامر صاحبؒ کے ساتھ اپنی مراسلت اور خط و کتابت کی تاریخ بھی بہت مختصر ہے۔ ایک تو رضاعت کے مسئلے پر ان کے ساتھ بالکل نجی قسم کی خط و کتابت ہوئی تھی اور دوسری مراسلت مثنوی مولانا روم کے ترجمے اور تفہیم سے متعلق تھی، اور یہ بھی صرف دو خطوط پر مشتمل ہے میں مولانا روم کی مثنوی کا ترجمہ اور تفہیم لکھنا چاہتا تھا اور شوق تھا کہ اسے تجلی کے صفحات پر بالاقساط شائع کراؤں پہلے نمونے کے طور پر چند متفرق اشعار کا ترجمہ مع تفہیم کے مولانا کی خدمت میں روانہ کر دیا تھا۔ مولانا نے جواب میں لکھا۔

محترمی! سلام مسنون

ملفوف ملا۔ طبیعت خوش ہوئی۔ آپ اسی طرح ابیات مع ترجمہ و شرح کے بھیجتے رہیں۔ تجلی کے صفحات حاضر ہیں۔ کوشش یہ کیجئے گا کہ ہر قسط میں ایسا کوئی شعر نہ آئے جس کے مفہوم کو سمجھنے کا مدار کسی اور شعر پر ہو۔ جو اس قسط میں درج نہ ہو۔ گویا ہر قسط قاری کے لئے شافی کافی ہونی چاہیئے۔ سالم

مثنوی مولانا روم کے طول و عرض کو دیکھتے ہوئے میری غرض نہیں تھی کہ اس کے پورے اشعار کا ترجمہ لکھوں۔ بلکہ میں چاہتا تھا کہ صرف چیدہ چیدہ ابیات کی تفہیم لکھوں۔ جو بذاتِ خود کوئی چھوٹا کام نہیں تھا۔ بہرحال مولانا کے حسب خواہش میں نے مثنوی کے پہلے ہی بیت یعنی

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

سے شرح کا آغاز کر دیا اور پہلے دس یا بارہ اشعار کی پہلی قسط ان کی خدمت میں روانہ کر دی۔ مولانا نے جواب میں لکھا:۔

محترمی۔ سلام مسنون!

"صحبتے با پیر روم"[؟] کی ابتدائی قسط موصول ہوگئی تھی مطالعہ کی نوبت اب آئی ہے۔ جناب کی محنت اور کاوش یقیناً قابلِ داد ہے لیکن باوجودِ غور وفکر کے قارئین تجلی کے لئے اس سلسلے میں افادیت اور دلچسپی کے پہلو اب تک مشخص نہیں کر سکا ہوں۔ یہ بجا ہے کہ مولانا روم کا مرکزی خیال بہت بلند، استعارات بڑے دوررس اور اندازِ بیان بڑا فنکارانہ ہے، لیکن ان کے ذخیرۂ سخن سے حقیقی افادیت کی منزل تک پہنچا دوں تو بڑا طولِ عمل ہے۔ دوسرے زمانہ کا موجودہ مزاج اس کا اہل نہیں معلوم ہوتا کہ ان تشریحات سے فائدہ اٹھا سکے اور ان میں دلچسپی لے سکے جو آپ نے اردو شکل میں پیش کی ہیں۔ عشقِ الٰہی کا اتنا بلند اور دقیق تصور اب کہاں قابلِ فہم ——— الخ"

اس کے بعد یہ کہانی ادھوری ہی رہی اور میں اپنی کم نصیبی سے مثنوی مولانا رومؒ کے چیدہ چیدہ اشعار کی تشریح بھی نہ لکھ سکا جس کا نقشہ میرے ذہن میں پہلے سے محفوظ تھا۔

میں تجلی اور ایڈیٹر تجلی کا بہت ہی ممنون و احسان ہوں کہ میں نے اردو زبان کو تجلی کے صفحات میں پڑھ کر ہی پختہ بنا لیا ہے۔ وہ تمام لوگ جنھیں اردوئے معلّٰی کے پڑھنے کا شوق ہے انھیں تجلی کے صفحات کو ضرور کنگھال لینا چاہیئے۔ مجھے مزاحیہ مضامین لکھنے کی تھوڑی بہت صلاحیت ہے۔ اس کے لئے بھی میں تجلی کے ملّا کی کا مرہونِ منت ہوں۔ قسم قسم کے ابیات کا ایک پورا لشکر جنھیں تجلی میں وقتاً فوقتاً پڑھا ہے، ذہن کے آئینہ خانے میں صف بستہ ہے۔ میں اس وقت اشعار کا یہ دفتر نقل کرنے کے موڈ میں نہیں مگر کچھ شعر نوکِ قلم پر جلوہ آرائی کے لئے بے تاب ہیں۔

یہ قدم قدم بلائیں، یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری — عامرؒ

مطربِ مزاج دانِ محبت نہیں جگر
نغمہ یہ اس نے چھیڑ دیا درمیاں سے کیا — جگر

دنیا سے تو ہزار طرح کی امید تھی
جب صرف غم ملا تو ہنسی آگئی مجھے — (نام یاد نہیں)

کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن کا ذکر خیر تجلی میں پڑھا اب انھیں عقیدت و احترام کے ساتھ ہمیشہ کے لیے سر آنکھوں پر جگہ دی ہے۔ یہ الفاظ لکھتے ہوئے مجھے آغا شورشؔ کاشمیری کی یاد آرہی ہے جن کا نام تجلی میں پڑھ کے دل پر نقش ہوگیا ہے۔ شورش کاشمیری کی اکثر نظمیں تجلی میں پڑھنے کو نصیب ہوئی تھیں۔ عامر صاحبؒ گئے اور ان کے پیچھے ہی پیچھے شورش کاشمیری بھی چلے گئے اور اب تجلی کا یہ غیر مستقل باب ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔ شورش کاشمیری سا عدیم المثال صحافی اور شعلہ نوا خطیب چشمِ فلک نے کم ہی دیکھا ہوگا۔

عامر صاحبؒ کی یادگاروں میں اوّل تو وہ اداریئے ہیں جنھیں آغازِ سخن کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ ان میں اکثر اداریوں کی حیثیت مستقل اور بنا رہبت پائدار ہے۔ جن لوگوں نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی موت پر ان کا اداریہ پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردوئے معلّٰی کا ایسا شاہکار اردو زبان کے بہت کم ادیبوں کو لکھنا نصیب ہوا ہے۔ اس کے بعد تجلی کی ڈاک کا نمبر آتا ہے۔ یہ ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو مولانا کی جانب سے نیاز مندوں کے استفسار کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی حیثیت بالکل منفرد ہوگی۔ کیونکہ یہ خالص فتاویٰ ہی نہیں بلکہ ہر ہر مسئلے پر تحقیق، تنقید، تدبر اور تفکر کے سلجھے ہوئے اور عام فہم جواب ہیں۔

یہی معاملہ حضرت مولانا کی شاعری کا بھی ہے اور ان کے نثر پاروں کا بھی، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے ان تنقیدی اور تحقیقی مضامین و مقالات کو بھی الگ سے یکجا کیا جانا چاہیئے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً مختلف مسائل و مباحث پر قلم بند کئے تھے، اور جو تجلی کی ڈاک سے الگ شائع ہوتے ہیں۔ تفہیم الحدیث کا کام تو اس کے علاوہ ہے اس عنوان کے تحت تجلی کے مختلف شماروں میں جتنا کچھ چھپا ہے اس کی مقدار اگرچہ معتد بہ نہیں مگر وقیع ضرور ہے۔

اس مختصر مضمون میں عامر صاحب کی ذاتِ گرامی پر مجھ جیسا بے بضاعت آدمی کتنا کچھ لکھ سکتا ہے۔ مگر مولانا مودودی کے ذکر خیر کے بغیر مجھے احساس ہے کہ یہ مختصر مقالہ بھی ادھورا ہی رہے گا۔

عامر صاحبؒ دیوبند کے فاضل تھے۔ ان کی زندگی کے شب و روز پر دیوبند کی چھاپ تھی۔ مگر اس کے باوجود مولانا مودودی، ان کی جماعت اور ان کے نظریے کے ایسے فدائی تھے کہ اکابر دیوبند سے بھی انتخاب کے

بقیہ بر صفحہ

مولانا عامر عثمانیؒ

بیسویں صدی کی ایک رفیع المرتبت شخصیت

از:- انور کمال کانوعی

ابھی مولانا شاہ معین الدین ندوی مرحوم کے غم میں بہائے ہوئے آنسو خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ امیر فیصل مرحوم کی جاں گداز موت کا صدمہ ملت کو سہنا پڑا۔ اس دلگداز غم سے ہوش و حواس بجا بھی نہ ہونے پائے تھے کہ مولانا عامر عثمانیؒ کی خبرِ مرگ ناگہانی بجلی بن کر گری اور خرمنِ صبر و سکون کو جلا کر خاکستر کر گئی۔ مولانا مرحوم جامع الکمالات اور جامع الصفات شخصیت کے مالک اور گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے۔ ان کے تبحر علمی، دقیقہ سنجی، دور بینی، نکتہ شناسی اور معاملہ فہمی کا زمانہ معترف ہے ان کے سحر انگیز قلم، دلنشیں طرزِ استدلال، زورِ بیان اور شیریں سخنی نے ملت کے قلوب و اذہان کو مسخر کر لیا تھا۔ تمام ہی دینی علوم سے انھیں فطری مناسبت، قلبی لگاؤ اور گہری واقفیت تھی۔ اس کے علاوہ وہ صاحبِ طرز، انشاء پرداز، مسلم الثبوت شاعر، بے مثل طنز و مزاح نگار، اعلیٰ پائے کے صحافی، فنِ تحقیق و تدقیق کے مردِ میداں، ژرف بیں، نقاد، شگفتہ قلم مبصر اور ماہرِ لسانیات تھے۔ فقہی و کلامی مباحث پر پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ ملکی و ملی مسائل سے پوری طرح باخبر تھے۔ وقت سلگتے ہوئے مسائل پر انھوں نے جس خوبی و بے جگری، دلسوزی، دردمندی، دیدہ ریزی و جگر کاری اور خود اعتمادی سے قلم اٹھایا ہے اور جس طرح حالات کا ہمہ گیر جائزہ لیا ہے اس نے ملک کے گوشے گوشے سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ مسئلے کے ہر پہلو پر ایسی روشنی ڈالتے اور حالات و واقعات کا ایسا تجزیہ فرماتے کہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی اور قاری کی تسلی و تشفی ہو جاتی۔ حق کی مدافعت اور شرک و بدعت کے خلاف محاذ آرائی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس لئے انھیں بڑی بڑی ہستیوں، محبوب شخصیتوں اور اپنے شفیق استادوں تک سے لڑائی مول لینی پڑی جہاں مرحوم نے دوسروں کی غلطیوں کی نشان دہی کی وہیں اپنی لغزشوں کا برملا اعتراف کیا اور ببانگ دہل ان سے رجوع فرمایا یہ وصف اس دور کے علماء، صلحاء میں تقریباً مفقود ہے۔ مولانا مرحوم کی وفات حسرت آیات سے جو خلا پیدا ہوا ہے۔ اس کا پر ہونا دشوار نظر آتا ہے۔ ایسی بے وقت موت اور پھر غربت کی موت نے ماحول کو اور زیادہ سوگوار بنا دیا ہے۔

ہمیں فخر ہے کہ ایسی نادرۂ روزگار ہستی ہماری سرزمین میں مدفون ہوئی۔

تھی نہ کچھ ایسی کشش شاید وطن کی خاک میں
وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

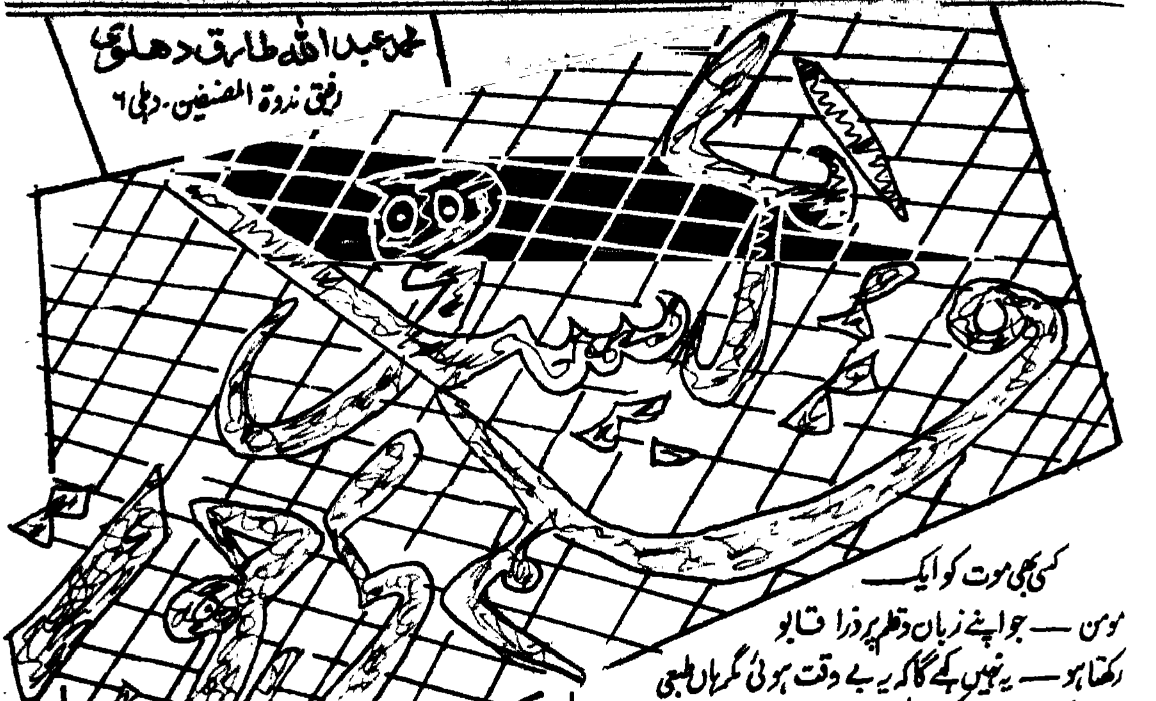
میں مولانا عامر عثمانی کے بارے میں صرف یہ کہدینے کو کافی سمجھتا ہوں کہ:۔

وہ صدی کے ایک رفیع المرتبت انسان کم ہی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انکی خدمات کو قبول فرما کر انھیں آخرت میں سرخرو کرے

این دعا از من
و از جملہ جہاں آمین باد

محمد عبد اللہ طارق دہلوی
رفیق ندوۃ المصنفین - دہلی ۶



کسی بھی موت کو ایک ــــ مومن ــــ جو اپنے زبان وقلم پر ذرا قابو رکھتا ہو ــــ یہ نہیں کہے گا کہ یہ بے وقت ہوئی مگر ہاں طبعی عمر پائے بغیر اس دنیا کو چھوڑ جانے والوں پر صدمہ زیادہ ہوا کرتا ہے مولانا عامر عثمانی مرحوم کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہ ہوئی تھی، ان سے بہت زیادہ عمر والے ان کے اقربا جن پر آنسو بہانے کا کام مولانا عامر عثمانی مرحوم کو کرنا تھا۔ خود انھیں کو مرحوم پر آنسو بہانے پڑے ہیں۔

ان پر کچھ لکھنے کے لئے جتنی گہری واقفیت اور کافی تعارف کی ضرورت ہے، مجھے ویسا تعارف ان سے نہ تھا۔ چند بار کی ندوۃ المصنفین کی ملاقاتیں ہیں۔ ہاں ان کی تحریرات دیکھنے کا خوب اتفاق ہوا ہے اور یہی دراصل ایک صاحب قلم سے واقف ہونے کا صحیح طریقہ بھی ہے، ایک صاحب قلم آپ خواہ کتنے ہی قریب ہوں، مگر اس کے ذہن اور طبعی رجحانات کا پورا پتہ صرف گفتگوؤں سے نہیں لگ سکتا۔ جس پر تقریر غالب ہو وہ تقریر میں کھلتا ہے اور جس کے ذہن کا بہاؤ ہاتھ کی انگلیوں اور قلم کی نوک کے راستے ہونے لگا ہو اس کی تمام جلوہ نمائیاں پھر اس قلم ہی کی راہ دیکھی جاسکتی ہیں اسی لئے ملاقاتیں کم ہونے کے باوجود میں نے ان پر چند سطریں لکھنے کا ارادہ کرلیا۔

ایک بار دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے (لائبریری) میں اپنے چھوٹے بھائی رضوان اختر کے ساتھ جانا ہوا، میں ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا، اچانک نظر جو اٹھی تو سامنے والے کمرے میں ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا ایک شخص بہت سادہ لباس میں نظر آیا۔ کپڑے بہت زیادہ میلے تو نہ تھے لیکن زیادہ اجلے نہ تھے، ڈاڑھی کے بال نصف کالے، نصف سفید، کتابوں پہ کتابیں نکالتا ہے کچھ دیر دیکھتا ہے، نوٹ لیتا ہے اور رکھ دیتا ہے، سیڑھی ذرا فاصلے سے رکھی ہے تو الماریوں پر ہی پاؤں رکھ کر الماری سے کتابیں اتار لیتا ہے۔ تپائی اور ڈیسک کے بجائے ہاتھ ہی میں اور میز کرسی کے بجائے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر کتاب دیکھ لیتا ہے، خود ہی کتاب اتارنا خود ہی رکھ دینا، نہ کسی چپراسی کو بلانا، نہ رجسٹر، نہ نمبر، نہ ادھر دیکھنا نہ ادھر کسی سے بات کرنا، یا اللہ! یہ کون شخص ہے؟ یہ عمر اور یہ انہماک؟ مدرسے کا طالب علم ہے تو بڑی عمر تک پڑھ رہا ہے۔ چہرے سے طالب علمانہ بے فکری، لاابالی پن تو کہیں نہیں جھلکتا۔ اور اگر یہ کوئی مدرس ہے تو شاگردوں اور نیازمندوں کی بھیڑ کہاں چھپ گئی کہ

کتابیں اتار اتار کر دیں، پھر مدرس کو یہاں آکر کیا زحمت گوارا کرنی پڑی تھی، کمرے ہی میں کسی سے کتابیں منگالی ہوتیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ اچھا آپ کو نہیں معلوم، یہ عامر عثمانی مدیر تجلی ہیں، ارے یہ ہیں عامر عثمانی؟ جبھی تو تجلی کے ایک ہی صفحے میں تفسیر رازی سے لے کر رسائل اخوان الصفا تک کے نام ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شخص بڑے بڑوں سے بھڑ جاتا ہے، ادھر جواب کے ختم پر آئندہ کے لئے دعوتِ مبارزت دیدیتا ہے۔ خوب خوب،

یہ انہماک مطالعہ، یہ سپردگی، یہ دیوانگی طلبہ میں کیا آج ہر ایک استاد میں بھی نہیں پائی جاتی۔ ان کے لب و لہجہ پر کوئی اعتراض کرے تو ضروری نہیں کہ وہ بالکل ہی بے جا بات کہتا ہو ان کی سخت گرفتوں پر کوئی برہم ہو تو ممکن ہے کہ اسے کسی حد تک حق بجانب مان لیا جائے۔ مگر یہ جن سفینوں سے اپنا سینہ اور سینے کی حرارت سے پھر قلمی سفینے تیار کرتے ہیں ان کو چیلنج کرنے کے لئے اس سے زیادہ تیاری کی ضرورت ہے۔ میرا ان کا یہ پہلا آمنا سامنا تھا۔

مجھے اس وقت نہ ان کی حمایت مقصود ہے اور نہ ان کی تمام آراء سے میرا متفق ہونا ہی ضروری ہے مگر دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے کیا صرف ہوائی قلعے تعمیر کرتے تھے؟ وہ جو سر کھپاتے تھے کیا وہ صرف لفاظی ہوتی تھی، وہ جتنے مطالعے کے بعد لکھتے تھے ایک انصاف پسند باوجود اختلاف رائے کے بھی اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قابلِ قدر چیز کی ہر حال میں قدر ہی کرنی چاہئے۔

سوالات کے جوابات میں وہ صرف اس پر اکتفا نہ کرتے تھے کہ سوال کے بس الفاظ کا جواب دیدیں۔ بلکہ وہ ان الفاظوں کے لاسلکی کے ذریعہ سائل کے ذہن و دماغ پر پہنچتے تھے اور پھر یہ دیکھتے تھے کہ یہ سوال پیدا کیوں ہوا، پھر وہ ان مبادی و مناشی کے بھی بخئے ادھیڑتے تھے، وہ کیڑے جس فاسد مادے سے پیدا ہوئے ہیں۔ سرے سے اس مادے ہی کو صاف کرنے کی کوشش کرتے تھے، وہ لفظوں کے بجائے مفہوم اور اس سے بھی بڑھ کر ذہنی پس منظر کی گھردیاں پکڑتے تھے اور انہیں درست کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک نفسیات کا طالب علم اگر غور سے ان کی تحریریں اور خاص طور پر سوالات کے جوابات پڑھے گا تو اسے صاف معلوم ہوگا کہ وہ اپنے مخاطب کی پہلی نفسیات پڑھتے ہیں، اور پھر جیسا موقع ہوتا ہے اس کے مطابق ہتھیاروں سے لیس ہوکر اس کے سامنے آتے ہیں۔ اگر وہ محسوس کریں کہ مخاطب اس وقت سمجھنے کے بجائے کٹ حجتی اور بحث پر آمادہ ہے۔ تلاشِ حق اس کے سامنے نہیں ہے تو وہ عموماً صرف صحیح بات کہدینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنی تحریر کے نشتروں سے اس کے ذہن کی کجی کی بھی اصلاح کرتے ہیں، اپنے مخاطب کی تمام کمزوریوں پر بھی ان کی پوری طرح نگاہ میں ہوتی ہے، اگر کمزوری کے باوجود میدان میں اتر کر ہیکڑی دکھاتا ہے تو وہ دوچار اچھی کچوکیاں لگا کر آئندہ اسے میدان میں نہ اترنے کا سبق بھی سکھادیتے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح دنیا کے عام مجرموں کو جسمانی سزا دی جاتی ہے، ذہنی بیماروں کو بھی بسا اوقات نوکیلے جملوں پھبتیوں اور لب و لہجہ کی درشتیوں کے ذریعہ سزا دینا تقاضائے مصلحت ہوتا ہے، یہ کام عامر عثمانی بڑے سلیقے سے کرتے تھے۔

ان کے تبصرے تجلی کی ایک خاص چیز ہوتے تھے۔ کتاب کو شروع سے اخیر تک بڑی توجہ اور گہرائی سے پڑھتے تھے۔ کھرے کھوٹے جو انہوں نے اپنے تبصرے کا عنوان قائم کیا تھا ٹھیک اسی کے مطابق صفائی سے تمام کھوٹ بیان کردیتے تھے، تبصرے کے ضمن میں خود بھی بار بار کتابوں سے مراجعت کرتے تھے تبصروں میں ان کے یہاں رو رعایت کم تھی۔ ان کی کسوٹی پر جو جیسا اترے ویسا کہنا، بسا اوقات تبصرہ اتنی محنت سے لکھتے تھے کہ کوئی کسی کتاب پر نظر ثانی بھی شاید اتنی محنت سے نہ کرتا ہو۔

ان کی تحریرات سے خاص طور پر دو چیزیں زیادہ زیرِ بحث رہتی تھیں۔ ایک بدعات و رسوم، دوسرے الحاد و تجدد کے زیرِ اثر پیدا ہونے والی کج رویاں۔ ان دونوں موضوعات پر وہ بزم سخن کے صدر نشین بھی رہے ہیں اور رزم کے آزمودہ کار سپاہی بھی، اور اس قدر بلا کے لکھنے والے تھے کہ تجلی میں اتنی ضخامت کے باوجود بہت کم مواد اور کسی کا ہوتا تھا۔ ورنہ تمام کا تمام پرچہ عامر عثمانی ہی کے رشحاتِ قلم سے پُر ہوتا تھا۔ بات بات میں

ظرافت اور شوخی ان کی خصوصیت تھی، یہی وجہ تھی کہ ایک ہی قلم کے اتنے سارے مضامین پڑھکر بھی اکتاہٹ بالکل نہ ہوتی تھی۔

ان کے لب ولہجہ کے شاکی بہت لوگ ہیں۔ اللہ خدا مرحوم کو بلند درجے عطا فرمائے شکوہ بالکل بے بنیاد بھی نہیں ہے مگر اس سلسلے میں دو باتیں ذہن میں آتی ہیں اول تو یہ کہ وہ جب کسی کے متعلق اپنے خیال میں یہ محسوس کرتے کہ یہ شخص قصداً فریب دہی اور مغالطہ دینے کی کوشش کر رہا ہے اور رکیک تاویلات سے باطل کو مضبوط بنانے پر آمادہ ہے اور حق بات پر کان نہیں دھرتا ہے تو وہ بغیر یہ دیکھے کہ مخاطب کون ہے اور کس حیثیت کا ہے۔ بس خبر لے ڈالتے تھے۔ دوسرے وہ کج فہم قسم کے لوگوں کی نفسیات کی رعایت میں ان کو تیز و تند جوابات دیتے دیتے شاید اسی بات کے عادی ہو گئے تھے کہ کبھی اپنے قلم کی باگ ذرا احتیاط سے سنبھالیں اور بڑی احتیاط اور اعتدال سے لکھیں، لیکن جب قلم خود اپنی چال چلے اور کوئی خاص اہتمام اسے روک تھام کرنے کا نہ ہو تو وہ پھر ویسی ہی چال چلے جیسی کی ضرورت کسی ہٹی مزاج اور اڑیل مخاطب کے لئے ہوتی ہے بہرحال خامیوں سے کون پاک ہے۔ ایک آدھ ایسی چیز سے قطع نظر ان کی خدمات اور اسلام و عقائد . . . . کی طرف ان کا دفاع ایسی چیز ہے جو اداروں کے کرنے کا کام تھا اور انہوں نے تنہا انجام دیا۔ جزاہ اللہ عنا وعن الاسلام

مبتدعین کے جواب میں اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحیح مرتبے و مقام سے ہٹ کر غیر محتاط الفاظ کہنے والوں کے رد میں انھوں نے بڑی بڑی تیز تحریریں سپرد قلم کی ہیں مگر ایسا ہرگز نہیں ہے کہ عشق رسول اور عقیدت اہل اللہ میں وہ کسی بڑے سے بڑے عاشق رسول اور عقیدت مند اولیاء سے کم ہوں۔ خود وہ اپنی تحریرات میں بار بار سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ "فداہ ابی وامی" اور ایک سے ایک بلند القاب سے آپ کا نام لینے میں اور جذبات عشق نبوی کا مختلف پیرایوں میں اظہار کرتے ہیں۔ اولیاء کرام کو بھی وہ ان کا پورا حق دیتے ہیں مگر حق سے زیادہ دینے کے مخالف ہیں ان کے قلم نے " ان کے قدموں کی خاک کو اپنی چشم عقیدت کا سُرمہ" کہا ہے وہ صرف اعتدال کے داعی ہیں۔ حد اعتدال سے بڑھی ہوئی عقیدت کی مخالفت نفس عقیدت کی مخالفت نہیں ہے۔

تصوف و سلوک کے سلسلے میں وہ اس چیز کے حامی تھے کہ "عجمی تصوف" کے بجائے شرعی "احسان" کو اپنایا جائے، اُن میں اور دیگر اہل علم میں مجھے جو فرق نظر آیا وہ یہی ہے کہ دیگر اہل علم و تصوف کی غیر مسنون چیزوں کو تاویل کر کے ذرا ادب کے ساتھ رد کرتے ہیں۔ مولانا عامر عثمانی مرحوم لگی لپٹی چھوڑ کر اور تاویلات کے جھنجھٹ سے منھ موڑ کر سیدھی صاف تنقید کر دیتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر جگہ قرآن و سنت کا دامن پکڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔

وہ ادبی، شعری، دینی، تحقیقی، حتیٰ کہ عقائد و کلام کے میدانوں میں بڑی کامیابی سے جادہ پیما رہے ہیں، انھوں نے متعدد علمی میدان اپنی جولانگاہ بنائے کہ عموماً کوئی ایک شخص اتنے میدانوں میں کامیاب نہیں ہوا کرتا مگر —— تحریریں گواہ ہیں کہ وہ بہت کامیاب رہے ہیں۔

ان کی شاعری ایک خاص چیز ہے جس پر کسی اچھے شاعر ہی کو کچھ لکھنا چاہیئے، توقع ہے کہ اس خاص نمبر میں اس پر بھی کوئی مضمون قارئین کی نظر سے گذرے گا۔ ان کا شاہنامہ اپنے مضمون، طرزِ ادا، سلاست و روانی اور بے ساختگی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ حفیظ جالندھری کے شاہنامے سے ملا یئے تو پیوند کا کپڑا اصلی کپڑے سے کچھ زیادہ مختلف نہ نکلے گا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(بقیہ عامر عثمانی۔ از صـــــ) جہاں قدم قدم پر بساط نور توڑ دو روشن پرانا تصیرا بھی ساتھ ساتھ۔ اسی تضاد کا شکار نوجوان نسل علی اقبال کو بالآخر ملیامیٹ کر دیا۔ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اس صدا کو تالیوں کی مکروہ شور میں دبا دیا گیا۔ جس کے بیے حساس طبیعت رکھنے والے دل اب مدتوں تڑپتے رہیں گے اور عامر صاحب اپنی تازہ غزل کے بمشکل تمام صرف دو شعر سنا سکے۔ کاش اس بدبختی کا مظاہرہ نہ ہوتا۔ پونا میں بھی جناب محسن مرکزی نائب وزیر داخلہ نے اس فعل کی سخت مذمت کی۔ ۱۴ر اپریل ۱۹۷۵ء کی صبح کا اخبار یہ ذہین ناک خبر لے کر آیا کہ یو۔پی کے ایک مقبول عام شاعر عامر عثمانی کا گذشتہ شب پونا کے ایک مشاعرے میں انتقال ہو گیا۔

جناب تابش پرتاب گڑھی

مولانا عامر عثمانی کی رحلت

دنیائے مذہب کا ایک عظیم نقصان

مقدور ہو تو اس خاک سے پوچھو کہ اے لئیم

اس عالمِ رنگ و بو میں نہ جانے کیسے کیسے لوگ آئے اور چلے گئے اور ہم اور آپ بھی چند روزہ عیش و عشرت کے لمحات گذار کر ایک روز اس جہان فانی سے کوچ کر جائیں گے۔ اسی طرح یہ رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ مگر یہ بھی ایک قابل تسلیم حقیقت ہے، کہ اس جہانِ آب و گل میں کچھ لوگ ایسے بھی آئے ہیں جن کے چلے جانے سے نہ صرف کسی ایک فرد و جماعت کو رنج و صدمہ ہوا بلکہ انسانی برادری کا کوئی بھی فرد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ملک کے عظیم بے باک صحافی۔ انصاف پسند و غیر جانبدار نقاد، بہترین صاحبِ طرز شاعر اور یہ ناز ادیب جناب مولانا عامر عثمانی مرحوم مدیر تجلی بھی انہیں آنے اور جانے والوں میں سے تھے۔ جن کی اچانک وفات پر نہ جانے کتنی آنکھوں نے آنسو بہائے۔ نہ جانے کتنے دلوں پر رنج و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ملک کے اردو ہندی اور انگریزی اخبارات و رسائل کی بھیانک چیخ و پکار سے علمی دنیا میں سناٹا چھا گیا۔ ہر طرف صف ماتم بچھ گئی اور وطن کا ہر ایک فرد اپنے اس علمی و ادبی سرمائے کے لٹ جانے پر گریہ کناں ہو گیا۔

جناب مولانا عامر صاحبؒ نے اردو ادب و صحافت کو ایک نیا رنگ و تحسین انداز عطا کیا تھا جو آنے والی نسل و قوم کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔ مولانا عامر صاحب ایک بامقصد صحافی

تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے

تھے۔ اور ادب برائے حیات کے قائل تھے۔ یعنی وہ ادب جو زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

مولانا مرحوم نے تقریباً ۲۶ سال تک ماہنامہ "تجلی" دیوبند کے ذریعہ علم و ادب اور مذہب و ملت اور تنقید و صحافت کی بے لوث و بے غرض خدمت انجام دی اور ہند و پاک کے علمی حلقوں کے لئے محتاجِ بیان نہیں۔

مولانا نے اپنی عمر میں کبھی بھی حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور نہ ہی کبھی کسی کتاب و مضمون پر تنقید و تبصرہ کرتے وقت خویش و بیگانے کا کوئی فرق باقی نہیں رکھا۔ اگر کہیں کوئی نقص مل گیا تو بڑے سے بڑے علامہ، شیخ وقت، محدث دوراں اور شاعر اعظم تک کو نہیں بخشا۔ اور اگر کبھی خود سے کوئی لغزش و بھول چوک ہو گئی تو معمولی سے معمولی کم علم و طفل مکتب کے بھی انتباہ پر سر تسلیم خم کر دیا اور فوراً معذرت چاہ لی۔ یہی وہ وصف ہے جس نے آپ کا نام صحافتی دنیا میں ہمیشہ ہمیش کے لئے روشن کر دیا ہے۔

میں یہاں نمونۃً مولانا کے کئے ہوئے دو تبصروں کا اقتباس پیش کروں گا تاکہ اس کی روشنی میں آپ مولانا کو صحیح معنوں میں دیکھ

سمجھ سکیں بلکہ حقیقۃً وہ تھے۔ اور خلاقِ کائنات نے جس عظیم مقصد کے لئے آپ کی تخلیق فرمائی تھی۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنے دلوں میں مولانا کی طرف سے کسی قسم کی غلط فہمی و بدگمانی کو جگہ دے لی ہے وہ اسے دور کردیں۔

پروفیسر عنایت اللہ اعظمی کے "تحفۂ رضاخانی" نامی کتابچے (دراصل یہ کتابچہ مولانا ارشاد احمد اور مولانا ارشد القادری کے درمیان ہونے والے ایک مناظرہ کی روداد ہے) پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"عقلمندی اور غیرت کا تقاضہ تو آجکل یہ سنا گیا ہے کہ اپنے گروہ، اپنے حلقے اور اپنے اساتذہ کی ہر حال میں تائید کرو خواہ ان کا موقف کسی مسئلہ میں کتنا ہی کمزور ہو اور حریف کو بلا تکلف مردود ٹھہراؤ چاہے وہ مظلوم ہی کیوں نہ ہو ہماری افتادِ طبع اس سے مختلف ہے ہم علمی و منطقی مسائل میں کسی ذاتی رشتے، دوستی اور وابستگی کی رعایت ملحوظ نہیں رکھ پاتے بلکہ کھری کھری بک دیتے ہیں جس پر ہمارا ضمیر صاد کرتا ہے۔ اور جسے ہم علم و عقل کے مطابق سمجھتے ہیں۔ شاید یہی کمزوری ہے جس کی وجہ سے ؂

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش

اور قیامت یہ ہے کہ اس روش سے توبہ کا ارادہ بھی نہیں رکھتے بلکہ تمنا کرتے ہیں کہ آخری دم تک نہ بدلے اور فرشتے جب ہمیں اللہ کے حضور کھینچ کرلے جائیں تو یوں کہیں کہ اے رب العزت! یہ ہے وہ نالائق جس نے نقد و نظر میں دوستی اور رشتہ داری کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اور اپنے ہوشگافیوں سے اپنے ہی ہم مسلک اور ہم حلقہ عزیزوں کے سینے چھلنی کئے ہیں مناظر جلیل مولانا ارشاد احمد صاحب ہمارے بزرگ بھی ہیں اور ہمارے دوست بھی اس کتابچے کا پیش لفظ لکھنے والے حضرت مفتی محمود گنگوہی بھی ہمارے مشفق بزرگوں میں ہیں اور ضرورت کے وقت ہم فقہی مسائل میں ان سے استفادہ بھی کرلیتے ہیں مؤلف عنایت اللہ صاحب سے بھی ہماری صاحب سلامت ہے مگر وائے ہماری نالائقی اس کتابچے کی حد تک ہم تینوں سے خوش نہیں اور دلی رنج کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ نہ چھپتا تو بہتر ہوتا (تجلی مئی ۷۲ء)

اور نومبر ۷۲ء کے شمارہ میں ملک کے معروف شاعر جناب شمیم کرہانی مرحوم کی ایک طویل نظم "صبح فاران" پر بے لاگ تبصرہ کرنے کے بعد رقم طراز ہیں۔

نقائص کی اتنی نشاندہی ہے تو ہمارے لئے باعثِ رسوائی، لوگ یوں کہتے ہیں کہ "ایڈیٹر تجلی" تبصرے کی آڑ میں لوگوں کی پگڑیاں اچھالتا ہے، ان کے حوصلے پست کرتا ہے خوردہ گیری اور نکتہ چینی کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس پر خدا کی پھٹکار۔ ہم دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ بندوں کی پھٹکار تو بجا مگر خدا کی پھٹکار والی بات شاید درست نہیں۔ خدا کا حکم ہے کہ علم کو مت چھپاؤ کتمانِ علم گناہ ہے۔ پھر اس نے یہ بھی جتلا یا کہ تعلیم و تعلم کا سب سے بڑا ذریعہ قلم عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ، تو آخر ہم کفِ قلم کیوں کریں اور اپنی بساط کے مطابق علم و تحقیق کی خدمت کیوں نہ کریں۔ بہتیرے دوستوں کو ہم نے تبصرے کر کرکے اپنا دشمن بنا لیا۔ مر جائیں گے تو یہ سب خوشی کا نعرہ لگائیں گے کہ خس کم جہاں پاک۔

میں یہ کہنے میں قطعی باک نہ محسوس کروں گا کہ جس انداز جس خلوص، دیانت داری سے مولانا نے خدمتِ صحافت انجام دی نیز جس غیر جانبدارانہ و انصاف پسندانہ طریقہ سے تنقید و تبصرہ کا فرض ادا کیا اس کی مثال موجودہ صدی میں نایاب ہے ؂

پیدا کہاں ایسے فرشتہ مزاج لوگ
افسوس کہ تمکو میری صحبت نہیں رہی

سال گذشتہ عید قرباں کے موقع پر ایک عزیز دوست کی مخلصانہ دعوت پر مجھے دیوبند حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی اسی ضمن میں مولانا مرحوم سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا نیز ان کے گھر پر ہونے والی ایک مقامی شعری و ادبی نشست میں شریک ہو کر مجھے اپنی کچھ غزلیں سنانے کا فخر میسر آیا۔ اس نشست میں محترم مولانا عامر عثمانی صاحب کے علاوہ جناب فاروق عثمانی عاصم اور جناب شمیم عثمانی نیز دیگر مقامی شعراء (جن کے اسمارِ گرامی ذہن سے نکل چکے) نے بھی اپنی تخلیقات سے سامعین کو محظوظ کیا۔ نظامت کے فرائض جناب

فاروق عاصم صاحب انجام دے رہے تھے غالباً مجھ سے کئی غزلوں کی فرمائش کی وجہ یہ تھی کہ میں بہرحال اجنبی اور مہمان تھا۔ مگر باوجود مقامی ہونے کے مولانا مرحوم سے درجنوں غزلیں اور قطعات سنے گئے۔

یوں تو کم وبیش دس سال سے "تجلی" کے دو مخصوص و مستقل عنوان "کھرے کھوٹے" اور "تجلی کی ڈاک" سے استفادہ کرتا رہا ہوں اور مولانا عامر عثمانی صاحب کو دور حاضر کا ایک بلند پایہ ادیب اور مایہ ناز اہل قلم وصحافی کی حیثیت سے جانتا اور پہچانتا رہا ہوں مگر اس ملاقات کے بعد مولانا سے میری عقیدت دیوانگی کی حد تک بڑھ گئی اور وقتاً فوقتاً ڈاک کے ذریعہ مولانا سے مشورہ سخن بھی لینے لگا

مگر وہ لمحہ کتنا دردناک والم ناک لمحہ تھا جب الجمعیۃ میں مولانا اخلاق حسین قاسمی کی طرف سے یہ اطلاع میری نظر سے گذری کہ مولانا عامر عثمانی نے ۱۲ر۱۳ر اپریل ۷۵ء کی درمیانی شب میں بمبئی کے ایک ایشیائی مشاعرہ میں شرکت کرنے کے بعد پونا کے ایک مشاعرہ میں اچانک دل کا دورہ پڑ جانے کے بعد داعی اجل کو لبیک کہدیا۔ اور ہمیشہ ہمیش کیلئے ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ بس اس وقت کا عالم نہ پوچھئے دل بیٹھ گیا سر چکرانے لگا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا

انا للہ وانا الیہ راجعون.

جناب مولانا عامر عثمانی صاحب ایڈیٹر تجلی دیوبند آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ دل رو رہا ہے، آنکھیں نم ہیں اور زبان پر دعائے مغفرت جاری ہے۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

بقیہ از صفحہ ۳۰۳

یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایسے اشعار کی کمی نہیں!۔

چاند، سورج، ستارے، زمیں، آسماں حشر تک پھول سکتے نہیں وہ سماں
جب اندھیروں کے پُرہول طوفان سے ایک تنہا دیا برسرِ جنگ تھا
پہلے پہلے تو ان سب کو آئی ہنسی پھر تحیّر ہوا دم بخود رہ گئے
دیکھتے دیکھتے شرق سے غرب تک نور ہی نور تھا رنگ ہی رنگ تھا

• • •

اِس طرف ایک شیشہ تھا نازک بدن اپنے ماتھے پہ گردیمی لئے
اُس طرف کتنے لشکر زرہ پوش تھے، ہر زرہ پوش کے ہاتھ میں سنگ تھا
پھر ہوا یہ کہ زرہوں کے ٹکڑے اڑے، سنگ شیشے سے ٹکرا کے شق ہوگئے
آب دِ گل کو تعجب تھا یہ کیا ہوا؟ برق حیران تھی آسماں دنگ تھا

• • •

پھول کھلتے گئے، دیپ جلتے گئے، سنگ وفولاد آہن پگھلتے گئے
ایک درویش کے ساز توحید میں، کیسی تاثیر تھی، کیسا آہنگ تھا
سننے والوں کی کایا پلٹ ہوگئی، دفعتاً کیا سے کیا بن گیا آدمی
اس پہ حق وملک رشک کرنے لگے، جو خود اپنے لئے باعثِ ننگ تھا

ان کے اکثر شعروں میں شبنم کی سی نزاکت اور جھرنوں کی سی روانی پائی جاتی ہے، ان کے تخئیل کی لطافت اور تحمّل کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی شاعری کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے مولانا عامر عثمانی مرحوم نے اپنے تخئیل اور نقطۂ فکر کے ذریعہ کافی شہرت وعظمت حاصل کی لیکن پھر بھی انھیں اتنی شہرت وعظمت حاصل نہ ہوسکی جتنی شہرت وعظمت کے وہ حقدار تھے۔ عالموں کی کمی نہیں۔ شعراء بھی نایید نہیں لیکن ایسے لوگ دنیا میں کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ جو بیک بہترین عالم بھی ہوں اور لاجواب شاعر بھی یہ دونوں خوبیاں جمع تھیں۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور تاریخ کو ان کے ساتھ انصاف کرنے کی توفیق عطا کرے۔

جناب انیس احمد کمبھی

عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

"فن کی دہلیز پہ فنکار نے دم توڑ دیا"

عامر عثمانی کی زندگی یوں تو آغاز سخن سے لے کر مسجد سے میخانے تک تجلی کے لاتعداد صفحات پر پوری آب و تاب کے ساتھ نکھری اور پھیلی ہوئی ہے، ایک حساس شاعر، ادیب، انشاء پرداز، جید عالم، ایک بحر ذخار اور میری یہ خواہش کہ مٹھیوں میں صحرا کو بھر لوں۔ ہندوستان کی اسلامی صحافی دنیا میں آج جو خلا پیدا ہو گیا ہے اب اس کا پر ہونا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح پاکستان سے مولانا ماہر القادری کو بلوا کر تجلی کی ادارت سونپ دینا۔

یوں تو برسوں سے تجلی پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن اس تحریر میں چھپے گوناگوں رازہائے فطرت کے عیاں کرنے والے کو دیکھ لینے کی سعادت پہلی بار جماعت اسلامی ہند کے اجتماع دہلی میں نصیب ہوئی۔ ان کے علم و فضل کے سامنے زبان تو کیا کھلی گنگ ہی رہی۔ میرے لیے تو وہ صرف ایک دیکھنے کی چیز تھی۔ اور جب تجلی کے بک اسٹال سے گزرا بڑی عقیدت سے دیکھا کیا۔ سنتا رہا۔ مکتبہ تجلی کے اسٹال پر جانا میرے لیے کسی کشور سے شاہ کے مزار پر زیارت سے کم نہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ ایک بارعب کی عقیدت مرنے کے بعد والی نہ تھی بلکہ ایک جوان تحریر ۵۲ سالہ بزرگ سے علم و فضل اور تقویٰ کی بنیاد پر محبت اور خلوص کی ایک کیفیت تھی جس کو بے جان صفحات پر آڑی ترچھی لکیروں کی مدد سے کھینچ کر لانا بس اس کا خامہ اور اسی بزرگ ہستی کا کمال تھا۔ کاش اس کمال کی قطرت میں ٹھیراؤ ہوتا جو آج ملت اسلامیہ کو داغ مفارقت دے گیا۔ ۱۹۷۵ء۔ اس سال جہاں کہیں

خبروں نے دلوں میں گہری خراشیں پیدا کی ہیں وہیں ہم سے یکے بعد دیگرے تین بڑے ہی نایاب گوہر بھی چھین لیے ہیں۔ عبدالرزاق لطیفی مرحوم، شاہ فیصل شہید اور اب عامر عثمانی۔ یہ وہ سنگہائے میل تھے جنھوں نے اپنی مقدور بھر دنیا کو اس شاہراہ پر گامزن کرنے کی گراں قدر کوشش کی تھی جس کی پختگی میں اپنی رگوں کا خون نچوڑ ڈالا تھا اور بوڑھا آسمان دیکھ رہا تھا کہ یہ شاہراہ صرف بامقصد زندگی کی طرف رواں دواں نہیں تھی بلکہ صحیح مقصد کی زندگی ایک صراط مستقیم تھی جس پر بڑی ہمت اور حوصلہ کے ساتھ یہ سپہ سالار رواں دواں تھے۔ جو اب ہمارے لیے اس شاہراہ پر وہ کانٹے چھوڑ گئے ہیں جو نہایت ہی کم آزار ہیں۔ ہم آبلہ پاؤں کا حال ان بزرگوں کو برابر ستا رہا تھا۔

اس قافلۂ سخت جاں کے اس دیوانہ کو بحیثیت ایک حساس دل شاعر کے سننے کا اتفاق (سعادت) پہلی بار اجتماع کے اختتام پر دہلی میں ہوا۔ بڑا پرسوز اور نہایت ہی کیف آگیں انداز۔ سیدھا سادا سا انداز، صاف ستھرا کلام، نہ کوئی منطقی تضاد۔ نہ کہیں زبان کی الجھن۔ ایک سکوت دریا تھا جو پوری آب و تاب کے ساتھ سامعین کے ذوق سلیم اور احساسات لطیف کو سیراب کر رہا تھا۔ دہلی سے واپسی کی یادیں آج بھی دل میں کل کی بات کی طرح تر و تازہ ہیں جب کبھی بھی تجلی پڑھنے کا اتفاق دارالمطالعہ جماعت اسلامی جلگاؤں یا حزب الاسلام کیرلا کے ذریعہ ہوتا رہا۔ عامر عثمانی آغاز سخن سے لے کر مسجد سے میخانے تک ایک پیکر عزم و حوصلہ اور وقار ہمالیہ کی طرح اپنی ہی تحریر کے پیچھے کھڑے ہوئے نظر آئے

اپنی ہی تحریر کی طرح جواں، پرعزیمت، ایک رائد۔ ایک ایسا نذیر عریاں جو قوم کو بروقت پکارتا رہا۔ لے نفل گزار و نفلیں بعد میں پڑھنا پہلے آگ بجھانے میں ہماری مدد کرو۔ وہ شخص فاطرا لعقل کہلائے گا جو یوں کہے گا کہ آگ بجھانے کا مسئلہ لوگوں نے بے وقت اٹھایا ہے، جس نے کم سواد مولویوں، مذہب کے نام پر اپنے کالے دماغ سادہ لوح مسلمانوں کے دماغوں میں آلسے تے چھپنے والے واعظوں سے قوم کو ہمیشہ متنبہ کیا۔ علم و منطق کی ایک درسگاہ، ایک ایسا سورج جس نے کھلی فضا کو صاف ذہنوں اور سچی تڑپ رکھنے والوں کو جن کے اندر حق کی پیاس ابھر آئی تھی ہمیشہ ان کو منطقی تضاد سے بچاتے ہوئے حقیقت سے روشناس کرایا۔

واقعاتی اور سائنسی ثبوت وجود باری پر بے شمار ہیں ہر ذرہ، ہر پتہ، ہر ذی روح، ہر نظر آنے والی چیز ایک بے نظیر صانع، خالق، پروردگار اور فاطر بدیع کی گواہی دے رہی ہے۔ لیکن بصیرت کا زاویہ بگڑ جائے تو پھر اسی طرح ہر گواہی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے جس طرح کیمرے کا فوکس غلط ہو جانے پر تصویروں کا کباڑا ہو جاتا ہے۔ آپ نے بگڑے ہوئے بصیرت کے زاویوں، مسموم ذہنیتوں، الفاظ و معنی کے تضاد سے مفلوج نظریات کو جنھوں نے فسق و الحاد کا ایک جال بن رکھا تھا۔ تدبیر و بصیرت، زہد و تقویٰ اور علم و فضل کی بنیاد پر پارہ پارہ کر دیا۔ ان نظریات کو دیوار پر سر مار دے مارا جن کی وجہ سے مسائل ہمیشہ الجھتے ہی رہے۔ اب ان لوگوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اس عامر کے سامنے اپنی بقا کی خاطر ہتھیار نہ ڈال دیں۔

اس دور میں جبکہ مذہب و سیاست کے درمیان ایک خلیج پیدا کر دی گئی ہے، مذہب کو پرائیویٹ زندگی تک محدود کر دیا گیا ہے، اس کی یہ جرأت نہیں رہی تھی کہ وہ عبادت گاہوں کے حصار کو توڑ کر آگے بڑھتا۔ عامر عثمانی بلاشبہ جس کے قلم کی سیاہی شہید کے خون سے زیادہ مقدس تھی ہمہ وقت اس جہاد عظیم میں لگا دیا۔ جان دینے کی بات ہوتی۔ دار پر کھنچنے کی نوبت آتی تو بلاشبہ بآسانی ان تقاضوں کو تقاضائے طبع پر قربان کر چکا ہوتا۔ لیکن یہاں تو استقامت درکار تھی — استقامت جو جان دینے سے بدرجہا پرخار اور حوصلہ شکن وادی ہے، وہاں بھی یہ برابر گو نجتا گاتا رہا۔ اس داعی حق کے تیور مقام دار و رسن ہو کہ عالم زنداں، کبھی بھی نہیں بدلے۔ اسلام نہ صرف ایک واضح سیاسی نظام رکھتا ہے بلکہ اس کا سیاسی نظام دنیا کے ہی نظام سے برتر اور اعلیٰ ہے، لیکن کسی بھی نظام کے پیچیدہ اور زلف در زلف گوشے کامل وضاحت کی روشنی میں اسی وقت آتے ہیں جب اسے عملی دنیا میں برتا جائے نظاموں کی مثال اپنی مجرد فکری و نظری حالت میں تخم جیسی ہے وہ لوگ احمق کہلائیں گے جو ایک تخم کو ہتھیلی پر رکھ کر اس کے اندر چھپے ہوئے پودے، پھول پتی اور برگ و بار کا اندازہ کر کے کچھ نقشے بنانے پر اکتفا کر بیٹھیں۔

آج — اور آج کافی بدل چکا تھا۔ آج مادہ پرستوں کی جنت "بمبئی" پرشکوہ عمارتوں کے درمیان گھرے ہوئے صابو صدیق پالی ٹکنک کے گراؤنڈ پر رنگ و نور کی بارش ہو رہی تھی ایشیائی مشاعرہ کا انعقاد (۱۱ اپریل ۷۵ء) مہمان خصوصی وزیر اعلیٰ مہاراشٹر ایس۔ بی چوان کی قیادت اور جناب رفیق زکریا کی صدارت۔ گراؤنڈ کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ دہلی کے بعد عامر عثمانی صاحب کو بمبئی میں سننے کی یہ سعادت دوسری مرتبہ میرے حصہ میں آئی تھی۔ اناؤنسر جناب ڈاکٹر کمال صاحب مدراسی نے آپ کے نام کا اعلان بڑے پرتکلف مگر شایان شان تعارف کے بعد کیا تھا۔ اس مشاعرہ سے قبل آپ پر دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ لیکن جناب علی سردار جعفری صاحب کے ساتھ وعدہ کر لیا تھا کہ اگر زندہ رہا تو انشاء اللہ بمبئی مشاعرہ میں ضرور شرکت کروں گا۔ اور پھر سامعین نے دیکھا کہ باوجود خرابی طبع کے کرسی پر بیٹھے تھے۔ بڑے دل سوز انداز میں اپنا کلام بالکل دل کو تھام کر سنا رہے تھے — TELE-CAST کی روشنی سے کیمرہ مینوں کی فلیش سے بیزار ہو کر دھیرے دھیرے، ضعیف آواز کے ساتھ سخن فہموں کو موت اور زیست کے فلسفہ سے آگاہ کر رہے تھے۔ ان دو قطعات میں دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز پر کھلا کون کان دھرتا البتہ بمبئی کی مادہ پرست اور مفاد پرست فضا۔ جہاں (باقی برص ۲۱۳)

مولانا عامر عثمانیؒ کا شعر و شعور

ایم، ایس وفا

مولانا عامر عثمانی رح کی شخصیت کسی
انجمن سے کم نہیں۔ ایک خدا پرست کا یقین کامل، ایک مردِ
مومن کا عزم، ایک رہبر کی مدبرانہ ذہانت، ایک ناقد کی ظرف
بینی، اور ایک شاعر کا حساس دل، یہ تمام تر عناصر ان کی ذات
میں کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے ہیں کہ بغیر کل جز کا مطالعہ دشوار
طلب امر ہوگا، لیکن جہاں تک میرے احاطۂ فکر کا تعلق ہے میں نے
مولانا کو بحیثیت شاعر بخوبی پڑھا ہے اور پسند بھی کیا ہے
ایسی کوئی بات نہیں کہ میں موصوف کی ناقدانہ بصارت اور عالمانہ
ذہانت سے یکسر بے بہرہ ہوں، لیکن صرف ان کی شاعری سے متاثر
ہونے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ یہی وہ میدان ہے، جہاں ایک
شاعر اخفائے راز کی لاکھ کوششوں کے باوجود دل کی بات کسی نہ
کسی نہج سے کہہ ڈالتا ہے، اس کے رجحانات اور فکری میلانات
کا عکس ہر طور اس کے شعروں میں نمایاں ہوتا ہے۔
اگر اقبال شاعر نہ ہوتے تو کبھی نثر میں "اللہ، اللہ" [illegible]
کی عادت ذکر تے اور اکبر ج کے منصب اعلیٰ پر فائز ہونے کے
بعد انگریزی تہذیب و آداب اور انگریزی حکومت کو اپنے طنز
[illegible] شاعر اپنے عکس افکار و خیالات کے
[illegible] ہوتا ہے لہٰذا مولانا مرحوم کے ذہن
[illegible] کے لئے ان کی شاعری پر ناقدانہ
[illegible]

مولانا کی شاعری کے تجزیہ [illegible]
ہیں دور و حالات اور ان کے مطالعۂ و موثرات خا[illegible]
میں رکھنا ہوگا، کیونکہ موصوف اردو کے ان شعراء میں سے
جو اپنے حالات اپنے پیش رووں کے فکر و نظر اور اپنے
اقدار سے متاثر ہوئے بغیر روایات کے پابند ہو کر رہ
میں غوطہ زن ہوئے بغیر اپنے عہد کی سطحی تحریکوں میں بہہ گئے
ذی ہوش، باعلم، دردرس اور صاحب فکر شاعر تھے۔ ان کے
مطالعۂ اسلامیات، تجزیۂ شریعت، اپنے عہد کے نام[illegible]
رہنماؤں کی قوم فروشی، غیروں کی ریاکاری، اردو شاعری
قدریں فنی باریکیوں کا احساس اور جدید شاعری کی [illegible]
ان سبھی محرکات کا مجموعی تاثر قبول کیا ہے۔
یہ کسی مخصوص یا منفرد رنگ کا طابع نہیں ہے کہیں اپنے
اور غیروں کی ستم انگیزیوں کا واویلا ہے تو کہیں "شاہنامہ"
بیانیہ تاریخی نظم ہے، کہیں عہد حاضر کی گھٹن ہے، تو کہیں [illegible]
کا پیغام ہے، کہیں اشعار کا انداز خالص روایتی ہے
جدت نگاری سے بھی استفادہ کیا ہے
ان کے یہاں اپنے ناخوشگوار حالات کا احساس [illegible]
ہے۔ یہ احساس انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اہمیت کا
موصوف کا دور سیاسی، اقتصادی، معاشرتی
مذہبی ہر لحاظ سے بالخصوص مسلمانوں کے لئے بحران [illegible]

خصوصاً ہندوستان میں اس بحران نے شدت اختیار کرلی
، جنھوں نے آزادیٔ ہند کی تحریک کو اپنی سعی و کاوش اور
سے جاری و ساری رکھا، حصول آزادی کے بعد انھیں
ہندی کی سازشیں رچی جانے لگیں جو حاکم تھے انھیں
کر جینا پڑا ، نئی سحر کی تمام امیدیں دم توڑ گئیں، ان ناموافق حالات
کا اثر مولانا کے ذہن پر ہوا، جس کا ردِ عمل مختلف اشعار کے علاوہ
کی مشہور نظم " خواب جو گم ہو گئے " سے بخوبی ظاہر ہے، اگرچہ یہ
علامت نگاری کا عمدہ نمونہ ہے لیکن کہیں بھی ابہام کا احساس
، خیالات واضح اور جامع ہیں ۔ چند بند دیکھئے ۔

جو منزلوں کے ساتھ تھے ، وہ منزلوں پہ چھوٹ گئے
جو رات میں لٹے نہ تھے ، وہ دوپہر میں لٹ گئے
مگن تھا میں کہ پیار کے بہت سے گیت گاؤں گا
زبان گنگ ہو گئی ، گلے میں گیت گھٹ گئے
کٹی ہوئی ہیں انگلیاں زبان ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

کھڑے ہوئے ہیں صف بہ صف بہت سے خواب سامنے
حقیقتیں بھی آ گئی ہیں بے حجاب سامنے
ورق ورق الٹ رہا ہوں میں کتاب وقت کا
ہو سے جو لکھی گئی ہے وہ کتاب سامنے
جو اس کتاب میں نہیں وہ باب ڈھونڈتا ہوں میں
جنھیں سحر نگل گئی وہ خواب ڈھونڈتا ہوں میں

یہ رات ، دوپہر ، خواب ، حقیقتیں ، اور کتاب وقت اور
میں نمک کی کان ، مٹھاس کی تلاش ، نیند کی شراب ، زرد زرد
، دھواں دھواں چاندنی ، بجھی بجھی طلعتیں ، داغ داغ کہکشاں
یں ، خندہ زن صداقتیں ، دورِ بے خودی ، خلوص کی زرد
ان نئی سحر کے خال و خط ، سمندِ وقت اور حریم ناز ــــ ایسی
میں جن کے سہارے کوئی بھی قاری نظم کی روح اور شاعر کے دماغ میں
یہ نظم کا مجموعی تاثر یاس انگیز ہے جو مولانا عامر مرحوم کی بلند
سے شایانِ شان نہیں ، شاعر کا یہ کہنا کہ ؎

جو مٹ سکے تو رنگ و دو سیل رنگ و نور کا
مری نظر کو چاہیے وہی چراغ دور کا

یا پھر یہ کہنا ؎

خوشا وہ دورِ بے خودی کہ جستجوئے یار تھی
جو درد میں سرور تھا تو بے کلی قرار تھی

اس کے منفیانہ ردِ عمل کی دلیل ہے ۔ حالانکہ مولانا کی عملی زندگی اور ان کے نثر پارے ایسے تاثر سے یکسر پاک ہیں پھر بھی خیالات سے ہٹ کر موصوف کی زبان دانی فنی باریکیوں اور تمثیل نگاری نے نظم کو ایک تابندہ اور پائندہ زندگی عطا کر دی ہے اور شاید اسی موضوع پر اس سے عمدہ تخلیق کا ملنا بھی ناممکن ہو ۔

مولانا کی شخصیت کا ایک اہم وصف ان کی بیباک گوئی ، بلند حوصلگی اور جراَتِ اظہار رہی ہے ۔ بیسویں صدی کے اس پُر آشوب دور میں ، جبکہ دلوں میں ایمان و ایقان کی روشنی دھندلا گئی ہے ، مادیت پر مذہبی و روحانی عقائد کی سالمیت کو بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے ، مولانا بزورِ قلم و قرطاس باطلوں سے برسرِ پیکار رہے ۔ اپنے نقد و تبصرہ سے جھوٹے دعووں کا چہرہ مسخ کیا ۔ خواہ وہ شعر ہو یا نثر ان کا نصب العین تبلیغ حق ہی رہا ۔ اپنی مشہور زمانہ نظم " گردش دوراں " میں عہدِ حاضر کی مادیت نوازی ، جہالت ، اوہام پرستی ، بے ضمیری اور اہلِ ایمان میں " سوزِ دل ، نورِ حقیقی ، ذوقِ عمل " کے فقدان کی طرف بڑے ہی موثر اور فنی انداز میں اشارہ کیا ہے ۔ نظم پڑھ کر جہاں مذہب کی طرف سے اپنی بے اعتنائیوں کا احساس ہوتا ہے ، وہاں ذہن ان کے عظیم الشان فن کی عظمت میں کھو جاتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں ؎

نور کے نام پہ بکتی ہے یہاں تاریکی
لوگ کہتے ہیں خزاں کو بھی یہاں فصلِ بہار
علم ہے خاک بسر زخم بہ دل آہ بہ لب
جہل نے سر پہ سجائی ہے کلاہ و دستار
جنس کردار کی نیلام میں چڑھ رہی ہے بولی
عصمتِ لوح و قلم بیچ رہے ہیں فنکار
بے ضمیری کے لئے عام ہے صہبائے نشاط
ہدفِ سنگِ ملامت ہے ضمیرِ بیدار
ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے
ہائے یہ گردشِ دوراں مجھے لائی ہے کہاں

انسان اس بے ضمیری کے سبب آج بے راہ روی کا شکار ہے منزل گم ہو گئی

ہے، وہ جس قدر نئی راہیں استوار کر رہا ہے، بھٹکتا جا رہا ہے شکست خوردہ ذہنیت منفیانہ ردِ عمل کے تحت لا مذہب اور اپنے ماحول سے مفرور ہوتی جا رہی ہے۔ فضاؤں میں گھٹن ہے، انسان خود کو تنہا محسوس کر رہا ہے۔ اس بکھرتے ہوئے ماحول کا جائزہ مولانا نے اپنے بیشتر اشعار میں لیا ہے۔

یار و تم نے بستی بستی انسانوں کی بھیڑ تو دیکھی
دیکھ سکو تو یہ بھی دیکھو ہر انساں ہے کتنا تنہا

ان چراغوں کی تھوڑی سی لو کاٹ دو ان چراغوں سے اٹھنے لگا ہے دھواں
غنچہ و گل کا دم گھٹ نہ جائے کہیں رچ گئی ہے فضا بڑھ گئی ہے گھٹن

مولانا عامر مرحوم کو انسان دوستی کا احترام بھی رہا ہے، انسان دوستی اسلام کے بنیادی تقاضوں میں شامل ہے، اسلام آغاز ہی سے اخوت و محبت اور اخلاق و ایثار کا پابند رہا ہے۔ اسی آفاقیت کا اظہار بھی مولاناؒ کی شاعری میں ہوا ہے ؎

چند مبہم لکیروں کو سجدے نہ کر چند خاکی حدوں کا پجاری نہ بن
آدمیت ہے اک موجۂ بیکراں، ساری دنیا ہے انسانیت کا وطن

لیکن ساتھ ہی شاعر کو گرتی ہوئی انسانی قدروں، عیاریوں، خود غرضیوں، اور مطلب پرستوں کا بھی بخوبی احساس ہے، وہ سسکتی ہوئی انسانیت کا ماتم بھی کرتا ہے ؎

کتنے شاہیں بسیرے کو ترسا کئے چھا گئے باغ پر کتنے زاغ و زغن
کتنے اہلِ وفا دار پر کھنچ گئے کتنے اہلِ ہوس بن گئے نو رتن

صرف شہرِ سیاست کا ماتم نہیں، ہر نگر ہر ڈگر ایک سا حال ہے
کتنی قبروں پہ چڑھتی رہیں چادریں کتنے لاشے پڑے رہ گئے بے کفن

مولانا عامرؒ کے کلام میں ہمیں بعض جگہ جذبۂ انا کی تپش بھی محسوس ہوتی ہے۔ انا کا احساس غالبؔ کے ساتھ اردو شاعری کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے، لیکن آج یہ احساس خود پرستی، یا خود فریبی کی حد تک ابہام کا شکار رہے، خود مولانا عامر عثمانیؒ کے مطابق "ایسی خود شناسی ہمارے نزدیک بھی نعمت ہے، جو عرفان ذات و خود آگہی سے عبارت ہو" ——— اور اس کا متوازن استفادہ مولاناؒ نے اپنی شاعری میں بخوبی کیا ہے، یہ دگر بات ہے کہ خودی کو جو اجتماعی حیثیت علامہ اقبالؔ نے دی، مولانا اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکے اور محض اپنی ذاتی کیفیت کا اظہار کر کے رہ گئے۔ ایک قطعہ دیکھئے اور جذبات کی شدت و خیال کی رفعت کو محسوس کیجئے ؎

نظر کی جوت بجھ گئی شعورِ دید مٹ گیا
وہاں ہوں میں جہاں کوئی زمین آسماں نہیں

بتا ہجومِ بیخودی یہ وصل ہے کہ ہجر ہے
وہ اتنے پاس آگئے کہ میں بھی درمیاں نہیں

جہاں اقبالؒ "خدا بندے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟" کی بات کہتے ہیں اسی کو عامر صاحبؒ نے انتہائی کمال پر پہنچا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ بزور خودی مخلوق اپنے خالق سے اسقدر قریب ہے کہ نقش دوئی ہی مٹ گیا ہے۔ من تو اور زمین و آسمان کا فرق ہی مفقود ہو گیا ہے۔

مولانا کے یہاں فکر و بصیرت کے ساتھ اردو شاعری کی روایتی قدروں مثلاً زبان دانی، جمالیاتی حُسن، جذبات عشقیہ، معاملہ بندی اور لطیف اشاروں کی جھلکیاں بھی خال خال نظر آتی ہیں، معاملہ بندی کا شعر ہے۔

دل نے کتنے شوق سے عامر یہ سودا منظور کیا ہے
ساری عمر وفا کی قیمت ان کا بس اک جلوہ تنہا

نازک خیالی دیکھئے۔

آئے تو ہیں ملنے لیکن شانِ تغافل کیا کہیئے
بھولے پن سے پوچھ رہے ہیں تم نے ہی بلوایا بھی

زبان دانی ملاحظہ ہو

اوّل اوّل بیخواروں نے جام و سبو سے کھیل کیا
آخر آخر جوشِ جنوں میں پھونک دیا میخانہ بھی

شعر میں اوّل اوّل اور آخر آخر کی تکرار قابلِ تعریف ہے۔ ایک قطعہ دیکھئے۔

عامر میری تشنہ لبی سے یوں بھی کھیل کیا ساقی نے
میرے ہی آگے صہبا کو پیمانے میں بھر بھر پھینکا
میں پھر بھی تا دیر ہی کوئی کر لیتا لیکن ظالم نے
پاس بُلا کر آس بندھا کر، دکھلا کر جتلا کر پھینکا

تخیل کی لطافت تو مسلم ہی ہے آخری مصرعہ میں بُلا کر بندھا کر دکھلا کر، جتلا کر، جیسے مسلسل قافیوں کے استعمال نے قطعہ کے حُسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں ——— اس طرح مولاناؒ نے روایت سے مستفید ہونے کی شعوری کوشش کی ہے لیکن پھر بھی جذبات میں وہ شدت پیدا نہیں ہوئی ہے جو روایتی مضامین کا خاصہ رہا ہے۔ بحیثیت مجموعی انکی شاعری حالات سے متاثر ہو کر جدید علامتوں اور روایتی اسلوب کا دلکش سنگم ہے۔ انکی نظمیں نسبتاً زیادہ قابلِ توجہ ہیں، کیونکہ یہاں ان کی جرأت اظہار اور صاف گوئی صاف نمایاں ہے جو اپنے اندر فطری جاذبیت رکھتی ہے • •

(ایم عالم بتیاوی)

آنسوؤں کے چراغ

وہ ایک عظیم فنکار تھا، مہان کلاکار تھا، گریٹ آرٹسٹ اور بڑا ادیب تھا۔ وہ اپنے رنگ برنگے تصورات سے ادب کے قوسِ قزح کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتا جارہا تھا۔ اُس کی فنکارانہ کاوش میں رنگوں کا دلآویز اور حسین امتزاج تھا، دلکش آمیزش تھی ——— صفحۂ قرطاس پر نثری و نظمی گھری ہوئی گھٹاؤں میں طنز و مزاح کے کرشمہ نواز شگفتہ پھول بکھیر دیتا اور لوگ دین و دنیا کی لطیف باتوں سے لطف اندوز ہوجاتے، اس کی دلفریب و دلنشیں باتوں سے محظوظ ہوکر اہلِ فکر و نظر جھوم اٹھتے ——— وہ حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں پر گہری نظر رکھنے والا تھا۔ وہ "خلافت و ملوکیت" کے دور کی تحریری تصویر میں شاندار رنگوں کی کہکشاں سمونے والا تھا ——— اور جب اس کی دلنشیں تحریر کی شوخ وشنگ دلہن مسکراتی تو اس کے عارضِ دلکش کے ہلکے گڑھے اس کے عمیق تخیل کی حسین وادی کی شہادت دیتے۔ اس کے موتی کی طرح چمکتے دانت، اس کی نیل جیسی گہری آنکھیں، غرضیکہ اس کا خوبصورت چہرہ اس کی تحریر کا حسین پیکر خاص خراش تراش سے ناظر و قاری کے اذہان میں اور پھلجھڑیاں چھوڑ جاتا اور دل میں لڈو پھوٹنے لگتے ——— اُس کی تحریر کی دلہن بے شمار تصویریں نمائش کے لئے پیش جاسکتی ہیں، اس کی ایک ایک تصویر شاہکار اور انعام واکرام کا مستحق ہے، اس کو نوبل اور اسٹالن پرائز نہ سہی، مگر نیاز فتحپوری، سلیمان ندوی، اور کلام آزاد پرائز تو ضرور ملنا چاہیئے تھا۔

وہ تحریر و قلم کا غازی تھا۔ مگر اس کی قدر نہ کی گئی۔ سرٹ دھرم لوگ اس کو اپنے سے بالاتر دیکھ کر، پست قد اور بونے ٹاٹے لوگ اس کو قطب مینار کی طرح قدآور اور اپنی بے چہرگی کے احساس کمتری کے شکار ہوکر اس اجاگر قوم و ملت کو تخریب کاروں کی فہرست میں داخل کرکے اپنی ناآسودہ ذہنیت کو تسکین دیتے رہے۔ مگر اس کی تحریر کا پیکر ناز و جمال سے بے داغ رہا ——— وہ قلمی جہاد کرتا رہا۔ زندگی کی آخری گھڑی تک وہ باطل کے خلاف حق کا پرچم بلند کرتا رہا، وہ تمام بغاوت کش اور بغاوت آموز اور بغاوت انگیز طاقتوں کے خلاف دل و دماغ کی ساری قوتوں کے ساتھ سعی و جد و جہد کرکے حق جہاد ادا کرتا رہا۔ وہ محجوب و مغضوب ہوتے ہوئے بھی دعوتِ حق دیتا رہا ——— مگر اس کی شایانِ شان قدر و منزلت نہ ہوئی اور وہ روٹھ کر اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کرگیا ؎

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

وہ اپنی زندگی کا سارا رنگ و روغن اپنی تحریری تصویریں بکھیر کر ابدی اور ازلی نیند سوگیا ——— وہ کوئی سامری نہیں تھا کہ اپنی پوجا کے لئے سونے کی گئو بنا جاتا۔ اشک، شعلہ و شبنم کا احساس تپتی ریت کی گرمی، اور پھر احساسات و محسوسات کی ساری رعنائیاں اور لطافتوں کا ناز و انداز ایک خاص رچاؤ کے ساتھ تجلی کے گلابی لب رخسار پر جلوہ گر ہے اُس نے سارے پھولوں کی سرخی اور کالی گھٹاؤں کی سیاہی اپنی خوشگوار حیات کی تازگی اور رس اور حسن سے تجلی کے پنکھڑیوں کو سنوارا ہے "تجلی" ہی اُس کی آرزوؤں کا تاج محل ہے ———

آج ہم اور آپ یہاں بیٹھ کر یادوں کی سیج پر عامری رنگینیوں کی داستان سجاکر "یومِ عامر" کے لئے اپنے اشکوں کے موتیوں سے بار پرو رہے ہیں۔

اس حسین "یومِ یادگار" کے موقع پر ہم میں سے ایک ایک فرد پر لازم تو یہ ہے "اہلِ تجلی" کے آنسوؤں کے جلتے دیپ بجھانے کے لئے تجلی کے سالانہ خریدار بن جائیں۔ مگر ہم تو آنسو بہا رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شاعر حق تو یہ ہے کہ ہم سا کہیں کیوں
حق ادا نہ ہوا

جناب ابوالخیر نشتر

راقم الحروف اپنے اب تک کے مطالعے سے جو تجلی کے اوراقِ پارینہ سے نصیب ہوئے ہیں یہی سمجھ سکا ہے کہ خالق کائنات نے اس جہان فانی کو اشرف المخلوقات کے لئے جائے امتحان قرار دیا ہے۔ انسان کی ضروریات زندگی کے تمام تراشیا، مہیّا کر رکھے ہیں، فلاح وکامرانی کے سبھی راستے ان پر منکشف کر دیئے ہیں جس پر گامزن ہوکر انسان نہایت تزک واحتشام کے ساتھ اپنی کامیابی وکامرانی کی منزل حاصل کر سکتا ہے، خود کو تباہی وہلاکت سے ہمکنار کر سکتا ہے، یہ نظام ہائے زندگی ازل سے قائم ہے اور لتبدیل قرآن ابد تک قائم ودائم رہے گا ۔

انھیں احکام الٰہی کی تکمیل جو کلام الٰہی میں درج ہیں عین اسلام کہا گیا ہے اور احادیث معتبر کے مطابق راہِ عمل استوار کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے ۔ یہی وہ پیغام صداقت ہے جسے مسلسل چھبیس سالوں تک "تجلی" کے صفحات پر اس عدیم النظر ہستی نے دیا جسے صرف ہم آپ ہی نہیں بلکہ ساری علمی دنیا 'مولانا عامر عثمانی' کے نام سے جانتی ہے جس کی خالص دینی تحریک نے نہ صرف انڈو پاک بلکہ ایشیا، افریقہ یورپ وغیرہ کے ممالک میں رہنے والے بیشمار انسانوں کے ذہن وقلوب کو اسلام کے ازلی نور سے معمور کیا، ان تمام راہِ صداقت کی نشان دہی فرمائی جس پر چل کر دنیا کے کروڑوں انسان کامیاب گذر گئے، اور جس پر گامزن ہوکر ہم آج بھی چاہیں تو مقام آدمیت اور معراجِ انسانیت حاصل کر سکتے ہیں۔ مولانا عامر عثمانی نے اپنے قلم کو ایک تاجر کی حیثیت سے کبھی استعمال نہیں کیا اور آپ نے اپنے ضمیر کی آواز کو ہوا کے رخ پر کبھی نہیں ڈالا۔ اور نہ وقتی نعروں کے حوالے کیا، اس کے برعکس آپ نے اسی راستے کو منتخب کیا، جن راستوں پر چل کر احکامِ خداوندی واتباع رسول کی تکمیل ہوتی ہے ـــ اُس کے لئے آزمائشوں اور مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، مصائب وآلام کا لامتناہی سلسلہ قائم کر دیا گیا، اور وہ تمام نظارے آنکھوں کے پردے پر نمودار ہو گئے، جو ایک داعی حق کے ساتھ دنیا پرستوں نے کیا ہے، یہ حقیقت ہے کہ مولانا نے اپنی قلم کی تلوار سے باطل عقائد اور فرسودہ نظریات کے خلاف جہاد کیا، علم وتحقیق کو ہدف بنا کر بے خوف وخطر میدان کارزار میں کود پڑے اور تادم حیات نبرد آزما رہے، ہمیشہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہا، حتیٰ کہ آخری سانس لینے تک انھیں احکام کی حمایت کی اور وہی پیغام وانصاف دیا، جس کی بدولت اس کائنات کا حسن وجمال قائم ہے اور اس کے خوشنما نظارے جلوہ گر ہیں ـــــ یہ الگ بات ہے کہ ذہنِ انسانی کی پستی انسان کو شرک وبدعت، گمرہی وضلالت کے تیز وتند بحر میں غوطہ زنی کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، انسان فسق وفجور میں مبتلا ہو کر باطل نظریات اور فرسودہ عقائد کا حامی بن کر اپنی گمرہی وضلالت کا بیّن ثبوت فراہم کر لیتا ہے، اپنی تباہی وہلاکت کی راہیں ہلاکت کی راہیں ہموار کر لیتا ہے اور اپنی ضروریات زندگی کی تمامتر امیدیں اپنے مالک حقیقی سے وابستہ کرنے کے بجائے اپنی تمامتر خواہشات کی تکمیل مزاروں سے حاصل کرنا عین ایمان تصور کرنے لگا ہے اور دامن امید پھیلائے دربدر کی خاک پیمائی کا عادی بن گیا ہے، اپنے سکونِ قلب اور تسکین جگر کے لئے وہ سب کچھ کر گذرتا ہے جو انسان اور خالقِ انسان کے مابین ایک پائیدار ومستحکم مگر تاریک دیوار بن جاتی ہے جس کے سائے میں یہ تاعمر بھٹکتا پھرتا ہے یہی انسان خالقِ جن وبشر کے آگے جبیں سائی کرنے کے بجائے

قبروں پر سجدہ ریز نظر آتا ہے، احکام الٰہی اس کے روبرو مسخر بن جاتے ہیں اور یہ خالق فرمانروائی سے اپنے آپ کو بے نیاز تصور کرنے لگتا ہے، بعض اوقات اپنی صورت وسیرت پر لادینیت کا نقاب لگاکر سرِراہ شریعت سے بغاوت پر نظر آتا ہے اور اپنے اخلاق اطوار سے یہ بانگ دُہل اعلان کرتا پھرتا ہے کہ "ہمارے سامنے احکام الٰہی کا کوئی پاس نہیں، شریعت محمدیؐ کی کوئی اہمیت نہیں" ——— جیسے یہ کسی اور مخلوق کے لئے رائج العمل ہے اور یہ اس سے الگ کوئی دوسرا قانون یا خود ساختہ نظام برپا کرنے چلا ہے ——— صد حیف! ایسے بہروپیوں کو ابدال، قطب اور غوث جیسے نادر القاب سے نوازنے والوں کی تعداد کم نہیں ہوتی جبکہ اس قسم کی کوئی ایک مثال بھی قرآن الکریم میں نظر نواز نہیں، اور احادیث معتبر بھی اس کی نشان دہی سے محروم ہیں ——— آج کی مُبارک و پُرنور شام جو "شام عثمانیؒ" کے نام سے منسوب ہے، میں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ جب انسانیت کی رہنمائی وقیادت کرنے والوں کا حال یہ ہو جائے تو پھر پوری انسانیت کا کیا ہوگا؟ ——— حالانکہ اسلام تو ایک نظریاتی مذہب ہے، عقائد اس کی واحد اساس و پونجی ہیں، یہ انسانی اعمال و افعال کو ثانوی درجہ دیتا ہے خود اور معاشرے کی تصویر میں عقائد ہی کی رنگینی دیکھنا چاہتا ہے اور اس کا واضح اعلان کرتا ہے کہ اگر انسان اسلام کے کسی ایک بھی بنیادی عقائد سے چشم پوشی کرے یا اس سے انحراف کی راہ نکالے، یا صاف لفظوں میں انکار کرے تو وہ دائرۂ اسلام میں نہیں بلکہ اسلام اسے اپنے حصار سے باہر پھینک دیتا ہے ——— یہ پاکیزہ خیال و اعلیٰ افکار اسی شخصیت بے مثال کی مرہونِ منّت ہے جس کی تحریک نے لاکھوں تعلیم یافتہ انسانوں کے اندر ذہنی انقلاب کی برقی لہر دوڑا دی اور شعور و عقل کو سانچۂ اسلام کے ڈھالنے میں نہ صرف ممد و معاون ہی ثابت ہوا بلکہ جہانِ دل کی رہنمائی فرما رہا ہے، قارئین تجلی اس صداقت سے تہی دامن نہیں ———

یہ زمانہ سائنسی و تکنیکی عروج کا زمانہ ہے جسے دنیا ترقی یافتہ زمانے سے تعبیر کرتی ہے۔ اور انسان کے خود ساختہ اقدام کو تعمیری اقدام کا نام دیتی ہے، جبکہ سچائی اس سے مختلف ہے۔ اگر آپ کو یقین نہیں تو آپ خود درِ انسانی پر دستک دیں اور آدمیت کو صدا لگائیں تو حقیقت سورج کی روشنی سے زیادہ روشن نظر آئے گی کہ وہی انسان جو مریخ و قمر کے سینے پر اپنی عظمت و بڑائی کا پرچم ابھارنے میں ہمہ اوقات مصروف ہے اور اس کے احاطوں کا طواف کرتا نظر آرہا ہے، یہی آج کا انسان عروج انسانیت اور مقامِ آدمیت کو اپنے خلائی پروازوں کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ مریخ و قمر کے عبور میں معراج انسانیت کو پوشیدہ تصور کرنے لگا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام تر علمی وعملی صلاحیتوں کو اس کے نذر کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ ——— جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسانیت بجائے عروج کے زوال پذیر ہوتی جارہی ہے، آدمیت مقامِ آدمیت سے بہت دور تاریک و بیابان جنگل کا رُخ اختیار کر چکی ہے۔ جہاں پہونچکر انسان انسان نہیں رہ جاتا بلکہ حیوانی اوصاف میں غرق ہو جاتا ہے اور اس کی درندگی و حیوانیت کے لاتعداد مناظر ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ——— لیکن یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے، کہ سرزمین کائنات پر ایسی بے نظیر و گرانمایہ ہستیاں وجود پذیر ہوئی ہیں، جنھوں نے تنِ تنہا فسق و فجور، شرک و بدعت اور گمرہیٔ ضلالت کے فلک بوس محل کو زمین کی تہوں میں روپوش کر دیا ہے، باطل عقائد اور فرسودہ نظریات کا قلعہ آہنی ہی کیوں نہ ہو، انہوں نے اپنی علمی وتحقیقی اسلحہ جات سے منہدم کیا ہے، یا اسے ضرب کاری لگائی ہے اور خود معراج انسانیت کے تقدس پر جلوہ افروز ہو کر اسلام کے شمع رشد و ہدایت سے قلب انسانی کو روشن اور مقام عروج پر جلوہ فگن کیا ہے، ایسے ہی عظیم المرتبت ہستیوں سے متاثر ہو کر علّامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

انھیں بے مثال ولازوال ہستیوں میں ایک ہستی "مولانا عامر عثمانیؒ" کی ہستی ہے، جنھوں نے اپنی عزّت و توقیر اپنا منصب و مرتبہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر قائم کیا جو بیک وقت ایک جیّد عالم و فاضل، بے خوف و بیباک صحافی، بے نظیر انشا پرداز، بے مثال محقق اعظم، باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ ان سب سے بڑھکر

ایک اعلیٰ انسان تھے جنھوں نے اپنے قلمی جہاد کے ذریعہ ایسی لازوال خدمات انجام دیں جن کے بدولت ایک جانب خالقِ کائنات کی انس و محبت و رضاعت کے ساتھ قربت نصیب ہوتی ہے تو دوسری جانب اس جہان فانی میں علم و دانش کا نور حاصل ہوتا ہے، روحوں اور دلوں کی تازگی نصیب ہوتی ہے اور .....

یہی وہ عزائم و جوانمردی کے انمٹ نقوش ہیں جن کی وجہ سے حضرت عامر عثمانی رح کے در سے آزمائشوں و مشکلات کے سیکڑوں طوفان ٹکرا کے واپس ہو گئے، مصائب و آلام کی تیز و تند آندھیاں ان کے پائے استقامت کو ہلکا ضرب پہنچانے میں نامراد ثابت ہوئیں اور طنز و تبرّکی بیشمار سنگ باریاں انھیں راہِ صداقت و انصاف سے ہٹانے میں ناکام و نامراد ثابت ہوئے مولانا کی اولوالعزمی و حق نوائی کو بیدار مغز مورّخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا ——

ایسی بے مثال و لازوال شخصیت کی یاد منانے پر اگر عقل و شعور کی طرف سے کوئی سوال کرے کہ" شام عامر عثمانی رح ہی کیوں ؟" تو اس کا جواب اس کے سوا کیا ہوگا کہ اسے یہ ہمدردانہ و مخلصانہ مشورہ دیا جائے کہ آپ علم و دانش کے جلوہ گاہوں کے بجائے اپنا مقام کسی عجائب خانہ میں تلاش کرلیں —— کیونکہ یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ کسی بھی عظیم المرتبت شخصیت کو ہر خاص و عام جانتا اور پہچانتا ہو۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ مولانا عامر عثمانی رح کی شخصیت اور اُن کے گرانما یہ فن سے ہر عاقل و بالغ واقف ہی ہو ——

بلکہ یہ روشن مثال تو صاحبِ فکر و فہم کے ذریعہ ہی معلوم ہوئی ہے کہ سمندر کنگھالنے والا ہی درِ آب دستیاب کرتا ہے ——

کیا ان تمام حقائق کی مختصر ہی سہی نشان دہی کرنے کے بعد بھی کسی طالب علم کو یہ حق حاصل ہے کہ یہ سوال کرے جو میرے اس مضمون کا عنوان ہے ؟ ۔

اگر اپنے آپ کو صاحبِ ذی فہم و علم و دانش کا واحد ترجمان تصور کرنے والا یہ کہے کہ —— شامِ عامر عثمانی ہی کیوں ؟ —— تو مجھے ببانگ دہل اعلان کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ اس قسم کے سوال کرنے والے دراصل جاہلوں کے فرق پر غاصبانہ حملہ کر رہے ہیں اور اپنے فہم و فراست کے زعم میں یہ تک فراموش کر بیٹھے ہیں کہ یہ حق تو ان کا ہے جنھیں ساری دنیا جاہل کہہ کے پکارتی ہے[12] ۔

[12] اور ان کی یاد میں ہزاروں شامیں منا کر بھی یہی کہونگا کہ" حق تو یہ ہے حق ادا نہ ہوا۔

عامر بھائی

ایس، ایچ شمسی، غازیپوری

ایک عالم ـــ ایک شاعر ـــ ایک مشفق ـــ

خدا مولانا عامر عثمانیؒ کو غریقِ رحمت کرے ـــ بڑی ہی خوبیوں کے مالک تھے ـــ بڑے خوش مزاج تھے ـــ میں نے اپنی زندگی میں اُن جیسا شفیق، محسن اور کرم فرما آدمی نہیں دیکھا۔

اس میں بھی دو رائے نہیں کہ علمی طور پر ان کا مقام ایک منفرد مقام تھا۔ ان کے قلم میں جتنی جبارت، اور روانی تھی اتنی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہندوستان کے کثیر مسلمانوں نے ہمیشہ ان کی تحریروں پر ناز کیا ہے۔ ان کی تحریروں کی شگفتگی اس جادو کی مانند تھی جو دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے ـ ان کی تحریروں کے پڑھنے والے شیدائی بن کر رہ جاتے پھر انھیں کسی اور کی تحریر میں لذت اور مٹھاس محسوس نہیں ہوتا تھا۔

وہ ایک زندہ دل انسان تھے مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کا جزو لاینفک تھی ـــ انھیں مغموم اور مایوس کبھی نہیں دیکھا گیا ـــ جب ملے ہنس کر ملے ـ پُرتپاک انداز میں ملے ـ خوش و خرم ملے۔

وہ ایک زود گو اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں بلا کی سلاست اور پختگی پائی جاتی تھی ـ دیوبند کی ادبی مجلسیں اور شعری نشستیں ان ہی کے دم سے پُر رونق تھیں۔ آج وہ نہیں رہے تو دیوبند میں ہونے والے مشاعرے پھیکے اور بے جان محسوس ہوتے ہیں اور ان میں جا کر وہ کیف حاصل نہیں ہوتا جو مرحوم کی موجودگی میں حاصل ہوتا تھا۔

وہ بڑے ہی مہربان اور منکسر المزاج تھے ـــ ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ہم ان کی مجلس اور صحبت میں جب بھی جاتے وہ انتہائی بے تکلفی کے ساتھ ہم سے مخاطب ہوتے۔

مگر یہ مولانا کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انھوں نے ہمیں اپنے سے چھوٹا کبھی نہیں سمجھا، اور کبھی اس بات کی تمنا نہیں کی کہ ان کا احترام کیا جائے، اور ان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھا جائے۔

آج وہ دنیا میں نہیں ہیں، لیکن ان کا علم، ان کی سوجھ بوجھ، ان کے مزاج کی شگفتگی، ان کی اعلیٰ ظرفی ہمیں یاد آتی ہے اور ہم ان کا مثیل اپنے ارد گرد تلاش کرنے کی ناکام کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

ضروری

پچھلے شمارہ میں ہم نے عامر عثمانی صاحب کی یاد میں یادِ عامر منانے کی اپیل کی تھی لیکن عامر عثمانی نمبر کی پہلی قسط غیر معمولی لیٹ ہو جانے کی وجہ سے سارا پروگرام غارت ہو کر رہ گیا جن مقامات پر یادِ عامر منائی گئی ہے یا آئندہ منائی جائے گی ان کی مختصر رپورٹ نمبر کی تیسری قسط میں چھاپ دی جائے گی۔

Regd. No. SHN/L-13/NP-17276



ماہنامہ تجلی دیوبند



خدا کی راہ میں خرچ کرنا
دراصل خرچ کرنا نہیں بلکہ جمع کرنا ہے

ایڈیٹر: عامر عثمانی

تاریکیوں میں ایک چراغ

2/50

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس دائرہ میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجیے اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے — یا منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی۔پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی۔پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہوگا۔ منی آرڈر بھیجکر آپ وی۔پی خرچ سے بچ جائیں گے

امریکہ انگلینڈ نائیجیریا کینیڈا فرانس انڈونیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک (دو پونڈ) بذریعہ ہوائی ڈاک (پانچ پونڈ)

بحرین افریقہ سعودی عرب قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک (دس شلنگ) ایک پونڈ بذریعہ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ

ماہنامہ تجلی دیوبند

ایڈیٹر
حسن احمد صدیقی
فاضل دارالعلوم دیوبند

کیا اور کہاں

سالانہ بائیس ۲۲ روپے
فی کاپی ڈھائی روپے

اٹھائیسویں ۲۸ سال
آٹھواں اور نواں شمارہ

For Mohamm:di Pıess Deoband

مستقل

دستک

نقادِ اعظم مولانا عامر عثمانی

دُنیا کی کم و بیش ہر چیز میں اچھائی اور برائی دونوں ہی پہلو لازماً ہوتے ہیں۔ سانپ، بچھو، درندے، ان میں بھی کچھ نہ کچھ منفعتیں ہیں اور ان کے زہر اور چربی بعض مفید کاموں میں استعمال ہوتے ہیں. [illegible] شراب اور جوئے جیسی چیزوں کے بارے میں [illegible] دیکھیے۔ [illegible] قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (ان سے کہہ دیجیے۔ جوئے اور شراب میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں لوگوں کے لیے) یعنی فائدوں کا بھی خدا نے انکار نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود فیصلہ ہوتا ہے۔ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا (اور ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شئے کو مردود اور مضرّت رساں قرار دیے جانے کا مدار اس پر نہیں کہ اس میں سرے سے کوئی منفعت ہی نہ ہو۔ بلکہ دیکھنا جُزوِ غالب کا ہوگا۔ غالب اگر مضرّت ہے تو مغلوب منفعت قابلِ رد ہوگی۔ اسی پر مذاہب کو قیاس کر لیجیے۔ ہزار بنیادی سچائیاں کسی مذہب میں ہوں لیکن شرک کا زہر [illegible] اس میں شامل کر لیا گیا ہے تو ان ہزار سچائیوں کی قیمت ختم ہوئی۔ یہ ایک [illegible] بن گیا جو نقصان ہی پہنچائے گا نفع نہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیا خدا کو [illegible] سچائیوں سے دشمنی تھی کہ اسلام کے سوا ہر دین کو مردود قرار دینے کا حتمی اعلان فرما دیتا۔ کیا کا ذو مشرک ان کے اپنے بندے نہیں [illegible] ہیں جو اللہ ان سے عداوت رکھتا۔ کیا عیسیٰ اور موسیٰ خود اسی کے رسول نہ تھے کہ ان کے نام سے جو دین منسوب ہیں انھیں وہ اسلام کے مقابلہ میں منسوخ قرار دیتا۔ کھلی بات ہے اسلام کے سوا ہر دین میں ایسے باطل عقائد کا زہر خود انسانوں نے گھول دیا کہ اب یہی زہر غلبہ حاصل کر چکا ہے اور کوئی نتیجہ سوائے ہلاکت کے ان دینوں سے ملنے والا نہیں۔

(اداریہ)

احوال واقعی

عامر عثمانی" نمبر کی پہلی قسط میں ایک نئے پرچے کے بارے میں مشورہ طلب کیا گیا تھا حسب عادت قارئین نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ یعنی کہ ہماری آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا ثابت نہیں ہوئی۔ اس بارے میں صرف ایک خط ایسا موصول ہوا جس میں رسالہ نہ نکالنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ صاحب خط نے ازراہ خلوص یہ تحریر فرمایا تھا کہ [illegible] پر نکل کر اس سے اچھی امیدیں وابستہ نہیں کی جا سکتیں اس لیے کہ موجودہ لوگوں کے اندر [illegible] کا ذوق برائے نام پایا جاتا ہے اور جو کچھ پایا جاتا ہے وہ بھی دینیت کے عام ہونے کی وجہ سے ابتذال کے ساتھ دن بدن گھٹ رہا ہے۔ صاحب خط نے اپنی دانست میں جو کچھ سمجھا اور کہا اس سے ہمیں اگرچہ اتفاق نہیں لیکن چونکہ صاحب خط کی رائے خلوص و ہمدردی پر مبنی معلوم ہوتی ہے لہٰذا ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ ہمارے حق میں بہتر سمجھا بے تکلف اور بے جھجک بیان کر دیا۔ لاگ لپیٹ اور تکلفات کے جھمیلوں میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

باقی تمام خطوط میں رسالہ نکالنے کا مشورہ دیا گیا ہے اور رسالہ نکالنے کا مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ بڑے ہمت افزا کلمات سے رسالے سے وابستگی کا اظہار کرنے کے وعدے بھی کیے گئے ہیں۔ ان خطوط کی تعداد توقع سے کم نہیں ہوگی ۔۔۔ تاہم ہم ادارہ تجلی خطوط ارسال کرنے والوں کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرنے کے بعد یہ گذارش ہے کہ نیا رسالہ ابھی چند ماہ تک منظر عام پر نہیں آسکتا۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں منجملہ ان میں سے ایک بنیادی وجہ ملک کے موجودہ حالات بھی ہیں۔ ان حالات میں کسی نئے رسالہ کی تشکیل زیادہ مصلحت معلوم نہیں ہوتی۔ جب تک حالات میں تغیر پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک کسی نئے رسالہ کی داغ بیل ڈالنا خلاف مصلحت ہی کہلائے گا۔ دوسری بنیادی وجہ تجلی کا بحران ہے جو باوجود ہزار کوشش اور جد و جہد کے ابھی تک کسی وقت ختم نہیں ہو رہا ہے۔

سلسلۂ اشاعت میں جو بے نظمی اور اختلال واقع ہو گیا ہے اسے ختم کرنے کے لیے یکسوئی اور توجہ کی ضرورت ہے جو ابھی تک شاید اس اختلال نہ ہونے سکتی ہو۔ دوسرے رسالہ کا اجرا ایسی یکسوئی اور توجہ کو زبردست ٹھیس پہنچے گی اور تجلی کی بے نظمی میں مزید اضافہ ہونے کے خدشات پیدا ہو جاتے ہیں لہٰذا دل و دماغ کا تقاضا یہ ہے کہ فی الحال تمام تر توجہ تجلی ہی پر مرکوز کی جائے اور جب تک تجلی کا بحران اور اختلاف دور نہیں ہو جاتا کسی نئے پرچے کا [illegible] ملتوی کیا جائے۔

ایڈیشن چھاپنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ رسالہ نکلے گا ضرور نکلے گا لیکن ذرا دیر سے اور ہمیں یقین ہے کہ اس رسالہ کا پہلا شمارہ دیکھتے ہی آپ بے ساختہ کہنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ دیر آید درست آید۔

عامر عثمانی نمبر کی پہلی اور دوسری قسط کو غیر معمولی طور پر سراہا گیا۔ خطوط اور خلوص ناموں کی ایک بڑی تعداد ہمیں ایسی موصول ہوئی جو صرف تحسین و تعریف پر مشتمل تھی۔ ان خطوط نے ہمارے حوصلوں میں زبردست استحکام پیدا کیا۔ اب ہم ایک نئی امنگ اور نئے جذبہ کے ساتھ کام کرنے پر مجبور ہیں۔

بعض حضرات نے عنوانات پر صفحات ضائع کرنے کو پسند نہیں کیا ہے۔ ان حضرات نے مخلصانہ تنقید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ موجودہ اقتصادی حالات میں کاغذ کا اس طرح ضائع کردینا خلاف احتیاط ہے۔

ان حضرات کی رائے غیر معقول تو نہیں مگر ہم اس پر کسی قسم کی گرفت کریں۔ ہاں یہ واضح کردیں کہ پورے صفحہ پر عنوان جمانے کی وجہ سے نمبر کے اندر جدت پیدا کرتی تھی، چنانچہ اس جدت کو کچھ لوگوں نے پسند بھی کیا ہے۔ لیکن اوسطاً نہ پسند کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ لہٰذا آئندہ ہم کوئی بھی نمبر ترتیب دیتے وقت صفحات ضائع کرنے سے گریز کریں گے اور ایسی جدت کا مظاہرہ نہیں کریں گے جو نقصان دہ ثابت ہو۔

نمبر کی دوسری قسط میں بائنڈنگ کرنے والے صاحب نے افسانہ [illegible] کی دو کاپیوں کو آگے پیچھے کردیا ہے جس کی وجہ سے رسالے کے اندر ایک بڑی خامی پیدا ہوگئی ہے۔ پہلی دو کاپیاں شمار میں نہیں تھیں۔ اس لئے ان پر نمبر ڈالنے کے بجائے الف سے ح تک حروف ڈال دیے گئے تھے۔ پہلی کاپی الف سے ح تک تھی اور دوسری ط سے ع تک۔ ابجد ہوز حطی کلمن سعفص کے مطابق بائنڈنگ کرنے والے صاحب نے فنکاری یہ دکھائی کہ جو کاپی بعد میں لگائی جانی چاہئے تھی اسے پہلے لگادیا جو پہلی [illegible] صفحات کی ترتیب مضحکہ خیز ہوکر رہ گئی۔ جب بائنڈنگ ترتیب ختم تھی [illegible] ایڈیٹر کی نظر تو تھا نہ رسالہ پڑھ رہی ٹکڑوں میں الجھی دبائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے متعلق

کرنے پر بعد میں بائنڈنگ ہونے والے پرچے کی اصلاح کرلی گئی تھی۔ لیکن یہ بعد میں بائنڈنگ ہونے والا پرچہ آٹے میں نمک کے برابر حیثیت رکھتا ہے۔

نمبر کی دوسری قسط میں اسی طرح کی ایک غلطی اور ہوگئی ہے صفحہ ۲۷۹ کے بعد ۲۸۰ کی بجائے ۲۸۲ ڈل گیا ہے اور اسے کتابت کی غلطی قرار دیے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے کہ اس کے بعد پھر نمبروں کی ترتیب بالکل صحیح ہے

قارئین نے یہ تو سمجھ ہی لیا ہوگا کہ نمبر کی دوسری قسط صفحہ ۲۵۹ سے شروع کی گئی ہے اور قارئین کو یہ بھی یاد ہوگا کہ نمبر کی پہلی قسط صفحہ ۲۵۸ پر ختم ہوئی تھی۔ ۲۵۸ کے بعد ۲۵۹ ہونا چاہئے تھا۔ بعض قارئین نے گمان کیا ہوگا کہ جس نمبر پر پہلی قسط ختم ہوئی ہے اسی نمبر سے دوسری قسط شروع کرنے کا مقصد یہ رہا ہوگا کہ نمبر جب مجلد ہوکر سامنے آئے تو ایک ہی محسوس ہو۔ قارئین کا گمان اپنے اندر بڑی خوبی رکھتا ہے اور قارئین کے گمان کے مطابق اگر نمبر کے تینوں قسطوں کی جلد بندی کرالی جائے تو نمبر بالکل ایک کتاب کی طرح محسوس ہوگا۔ لیکن یقین کیجئے کہ ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی کوئی ایسا نکتہ موجود نہیں تھا جو قارئین کے ذہنوں میں آگیا ہے بلکہ ہوا یہ تھا کہ پہلے عامر عثمانی نمبر ایک ہی قسط میں پیش کرنے کا ارادہ تھا اور اسی کے پیش نظر کتابت و طباعت جاری تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ نمبر کی ضخامت کافی بڑھ گئی تھی اور اسے ایک ہی قسط میں نکالنے کا مطلب یہ ہوتا کہ غیر معمولی ضخیم ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت کم سے کم ۱۸ روپے رکھی جائے ایک ہی مرتبہ میں ۱۸ روپے کی ادائیگی اکثر قارئین کے لیے ایک مسئلہ بن جاتی اور قارئین منہ پھیر کر پرے کو چل دیتے۔ لہٰذا بعض احباب و محسنین کے مشورے کے بموجب نمبر کو ہم نے تین حصوں میں تقسیم کردیا۔ لیکن بے ترتیبی کے ساتھ کاپیاں چھپ چکی تھیں انہیں پھاڑا تو نہیں جاسکتا تھا۔ انہیں کام میں لانے کی بس ایک ہی صورت تھی کہ ترتیب نمبر ایک ہی رکھی جائے اور تینوں قسطوں کی الگ الگ۔

تیسری قسط الگ ترتیب کے شمارے [illegible]

مطابق پہلے اسی کو منظر عام پر آنا چاہیے تھا لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسے روک کر ہم نے اکتوبر کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے متعدد ایجنٹوں نے ہمیں یہ مشورہ دیا تھا کہ نمبر کی تینوں قسطوں کا لگاتار آنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے اس لئے کہ تینوں قسطوں کی قیمت چھ چھ روپے ہے اور مہنگائی و بے روزگاری کے موجودہ دور میں ہر مہینہ چھ چھ روپے کی ادائیگی ایک طبقہ کے لئے مصیبت بنی ہوئی ہے۔ یہ طبقہ اپنے اقتصادی حالات کمزور ہونے کی وجہ سے رسالہ سے کترا رہا ہے اس کا نقصان ایجنٹوں کو بھی برداشت کرنا پڑ رہا ہے اور کسی نہ کسی صورت میں ادارہ تجلی کو بھی برداشت کرنا پڑے گا لہٰذا مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ تیسری قسط کو فی الحال کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کیا جائے۔

اب دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ دو چار عام شمارے پیش کرنے کے بعد تیسری قسط ہدیۂ ناظرین کر دی جائے دوسری صورت یہ ہے کہ ہر ماہ کی اشاعت میں کچھ نہ کچھ حصہ تیسری قسط کا جوڑتے رہیں۔ اور جب تک یہ سلسلہ جاری رہے رسالہ کی قیمت تین روپے کر دی جائے۔ قارئین کو جو صورت پسند ہو فوراً تحریر فرمائیں تاکہ نومبر کا تجلی مرتب کرتے وقت ہم اکثر قارئین کے رجحانات کو پیش نظر رکھیں۔

عامر عثمانی نمبر نے ہمارا کافی وقت لے لیا اس مدت میں تجلی کی ڈاک معطل ہی رہی نتیجہ یہ ہوا کہ تجلی میں چھپنے والے خطوط برابر آتے رہے اور جمع ہوتے رہے اور اس وقت ان کی تعداد دو سو سے کم نہیں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ انھیں رفتہ رفتہ ہی تجلی کی ڈاک میں جگہ نصیب ہو سکے گی۔

عامر عثمانی نمبر کی ذمہ داریوں سے نمٹنے کے بعد اب ہم تجلی کے مستقل مضامین پر زیادہ توجہ صرف کریں گے اور تجلی کو جاندار اور شاندار بنانے کے لئے ہر ممکن جد و جہد کرتے رہیں گے۔ خدا ہمیں جد و جہد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ پھر ہماری جد و جہد کو کامرانی سے بہرہ ور کرے۔

زیر ترتیب شمارے کے منظر عام پر آنے سے قبل ہی۔ شرک و بدعت کے موضوع پر رسائل ہدیۂ شائقین کر دی جائے گی۔ اور ان کے علاوہ کتابیں چھاپنے کا ارادہ ہے۔ جو ترتیب و تدوین کے مرحلوں سے گزر رہی ہیں۔ ان میں ایک تجلی کی ڈاک بھی ہے۔ انشاء اللہ سب سے پہلے تجلی کی ڈاک ہی منظر عام پر آئے گی اور اس کے فوراً بعد ہی مولانا مرحوم کی دو کتابیں اور منظر عام پر آجائیں گی جن کے نام ابھی تجویز نہیں کئے جا سکے ہیں۔

تجلی کی ڈاک کے ابھی آرڈر نہ دیں بلکہ نومبر کا شمارہ دیکھیں۔ اس شمارہ میں "عامر بورڈ" کے عنوان سے ایک مضمون جلوہ گر ہونے والا ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد ہی آپ اپنے آرڈروں سے نوازیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو اسکیمیں ہم نے بنائی ہیں ان سے تمام قارئین پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ قارئین کا فائدہ ہمارے نزدیک اپنے فائدہ سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔

● محصول ڈاک میں بے پناہ اضافہ ہو جانے کی وجہ سے تجلی کی قیمت میں اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن اکثر قارئین نے مہنگائی اور اپنی اقتصادی پریشانیوں کا حوالہ دیتے ہوئے قیمت میں کمی کرنے کی فرمائش کی ہے۔ قیمت میں اضافہ خواہ مخواہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ کئی ماہ کا نقصان اٹھانے کے بعد ہم قیمت بڑھانے پر مجبور ہوئے تھے۔ قیمت میں کمی کی فرمائش کو ہم رد نہیں کر سکتے۔ قارئین کی فرمائش سر آنکھوں پر لیکن قیمت میں کمی کرنے کی وجہ سے صفحات کو گھٹا دینا ناگزیر ہوگا تاکہ ہمارے حصہ میں آنے والا خسارہ غیر محدود نہ ہو۔

قارئین یہ یقین کرلیں کہ تجلی کی زندگی میں صرف دو۔ وجہوں سے عزیز ہے ایک اس بنا پر کہ مولانا عامر عثمانی کی یادگار ہے دوسرا اس بنا پر کہ یہ آج بھی ٹوٹی پھوٹی دین کی خدمت انجام دے رہا ہے اگر یہ دونوں مقصد ہمارے سامنے نہ ہوتے تو پھر تجلی کو بند کر دینے میں ہی عافیت تھا۔ بالخصوص موجودہ حالات میں کہ ہر قدم پر خطرات و خدشات سے بھیانک اندھیرے منہ پھاڑے کھڑے ہیں اور ہر طرف حق و صداقت کے ہر چراغ کو گل کرنے کی مہم جاری ہے۔

موجودہ شمارہ میں صفحات حسب سابق ہی ہیں آئندہ ان میں کمی کر دی جائے گی۔ اکثر قارئین کی اصرار کی وجہ سے عام شمارہ کی قیمت اور سالانہ چندہ گھٹایا جا رہا ہے۔ حق تعالیٰ ہماری مدد کرے اور راہ حق میں استقامت عطا فرمائے۔ خدا اگر استقامت عطا نہ کرے تو کسی بھی دشوار راستے پر دو قدم چلنا بھی ممکن نہیں۔

۲۷ رمضان المبارک

توجہ طلب

بمبئی میں منعقد ہونے والے مسلم پرسنل لا کنونشن میں اتحاد و اشتراک کی جو بے مثال فضا قائم ہوئی تھی اس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مسلمان فکری نوعیت کے ہزار اختلافات کے باوجود اساسی اور بنیادی امور میں بالکل اسی طرح متحد و متفق ہیں جس طرح متحد و متفق الگ الگ گھروں میں رہنے والے وہ دو بھائی ہوتے ہیں جن کے مابین حسد و تعصب، کینہ و تمرد اور خود غرضی و مفاد پرستی کی کچی اینٹوں سے بنی ہوئی کوئی دیوار حائل نہیں ہوتی۔

کنونشن کے انعقاد نے اس حقیقت ثانیہ کی توثیق بھی کر دی تھی کہ مسلم پرسنل لا کی قطعیت پر مسلمانوں میں سو فیصدی اتفاق ہے اور وہ اسے عمارت اسلام کا بنیادی پتھر سمجھتے ہیں۔

کنونشن کے چاروں کناروں پر گونجنے والی پاکیزہ صداؤں نے یہ واضح کر دیا تھا کہ مسلم پرسنل لا مسلمانوں کا سرمایۂ حیات ہے، ان کی شہ رگ ہے، ان کی روح رواں ہے، وہ اس کو اپنی جان و مال اور عزت و آبرو سے کہیں زیادہ محبوب تصور کرتے ہیں۔

کنونشن کے اردگرد بکھری ہوئی اتحاد و اخوت کی چمک نے کفر و نفاق کی آنکھوں کو خیرہ و بے نور کر دیا تھا۔ وہ اس اتحاد کو دیکھ کر تڑپ اٹھے تھے جو بڑی دور تک بقائے اسلام کا ضامن ہو۔

تیرہ سو سال کے طویل و محکم تجربات نے کفر و نفاق پر یہ بات کھول دی تھی کہ اسلام کے چراغ کو گل کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کو خانہ جنگی اور باہمی افتراق کے اندر مبتلا کر دیا جائے تاکہ خصومت و دشمنی کے اندھیرے اس درجہ غالب ہو جائیں کہ [illegible] اسلام کے بجھنے والی ضیا میں [illegible] کفر و نفاق جان سکے [illegible] کہ مسلمان [illegible]

عصبیت کا پیغام ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ کنونشن میں پیش آنے والے اتحاد و اشتراک کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ کر وہ تڑپ نہ اٹھتے۔ اتحاد کا مظاہرہ کرنے والے مسلمانوں سے فاش غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے نہ تو اپنے اتحاد پر حفاظت کا خول چڑھایا اور نہ ان چور دروازوں کو بند کرنے کی کوشش کی جہاں سے اختلاف و بغاوت کی مذموم ہواؤں کے داخل ہونے کا امکان تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اتحاد کمزور پڑ گیا جس نے دنیائے کفر و نفاق کو دہلا کر رکھ دیا تھا اور اس قسم کی چند در چند آوازیں اور بے تکی قسم کے شوشے ادھر ادھر سے ابھرنے لگے جو اعتراض و بغاوت کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور جو لایعنی و مہمل ہونے کے باوجود بھی بڑے معنی خیز ہوا کرتے ہیں۔

قادیانیت کا تیزی کے ساتھ پھلنا پھولنا بریلوی حضرات کا ایک نئی آن بان کے ساتھ دیوبندیوں کے خلاف صف آرائی کرنا بہت کچھ معنی رکھتا ہے۔ اتحاد و اشتراک کا غیر معمولی مظاہرہ کرنے کے بعد خاموش اور لاپرواہ ہو کر بیٹھ جانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے شیر کو للکارنے، اسے زخمی کرنے اور اس کے سامنے اپنی کھلی عداوت کا اظہار کرنے کے بعد آدمی گہری نیند سو جائے۔

اسلام کا بقا اگر مطلوب ہو تو یہ ضروری ہے کہ ہم غفلت کی پناہوں سے نکل کر اپنے افعال پر نظر ثانی کریں اور غور کریں کہ قادیانیت جیسی گمراہ جماعت کا دن بدن ترقی کرنا اور بریلوی حضرات کا ایک نئی تگن کے ساتھ علمائے دیوبند پر پھبتیاں کسنا سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ کیا یہ دونوں جماعتیں خواہ مخواہ ابھار رہی ہیں یا پردۂ زنگاری کے پیچھے کوئی معشوق ہے جو ان جماعتوں کی مافیہا پرورش کر رہا ہے تاکہ یہ جماعتیں آئندہ کسی بھی موقع پر ہمارے خلاف محاذ قائم کر سکیں اور اس طرح یہ ثابت ہو جائے کہ مسلمان کسی بھی معاملہ میں متحد نہیں ہو سکتے خواہ معاملہ جذبات کا ہو یا کلیات کا۔

اگر ہم نے اس سلسلہ میں غور و فکر نہیں کیا اور ان چور دروازوں پر احتیاط کے کواڑ نہیں چڑھائے جہاں سے اعتراض و بغاوت کی ہوائیں داخل ہونے کا سلسلہ برابر جاری ہے تو بہت جلد ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ ہم مسلمان [illegible] تر ہی رہ جائیں گے [illegible] نہیں پہنچ سکی [illegible] کی دنیا [illegible]

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى

دراصل تم لوگ ترجیح دیتے ہو دنیا کی زندگی کو حالانکہ آخرت زیادہ بہتر اور پائدار ہے

مولانا عامر عثمانیؒ

آغازِ سخن

یہ مضمون اگست ۱۹۷۱ء کے تجلی میں شائع ہو چکا ہے لیکن
گوناگوں افادیت کے پیشِ نظر اسے دوبارہ نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے

خط: دہلی ۱۲ رجولائی ۱۹۷۱ء . مجاہد نیازی ٹیا محل دہلی

مکرمی و محترمی - السلام علیکم

مؤرخہ ۸ رجولائی ۱۹۷۱ء کی رات کو آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اردو نشریات میں شمیم احمد شمیم صاحب کا انٹرویو نشر کیا گیا جو امید کے لحاظ سے بنگلہ دیش کے سلسلہ میں لیا گیا تھا

موصوف نے فرمایا کہ اسلامی نظام حکومت ناکام ہو چکا ہے . مذہب کے نام پر کوئی نظام کامیاب نہیں ہو سکا. اس لیے کوئی ملک مذہب کے نام پر قائم نہیں رہ سکتا. اس کے برخلاف ہندوستان میں ایک نظام کے تحت حکومت مستحکم ہے وغیرہ وغیرہ پھر آپ نے یہ پیشینگوئی بھی فرمائی کہ پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور بہتر ہے کہ جو کچھ بچ گیا ہے اس کو سنبھال لیا جائے . ان کی رائے میں بنگلہ دیش اب پاکستان کا جز نہیں ہے . بہتر ہے کہ سندھ پنجاب ، سرحد ، بلوچستان کو قائم رکھنے کے لیے ایک نظام وجود میں لایا جائے .

اس سے پیشتر مجھے موصوف کا ایک انٹرویو "شبستان" اردو ڈائجسٹ میں پڑھنے کا اتفاق ہوا . موصوف کو اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ بیرنگا فرماتے ہیں

کہ ملی جلی شادیوں (مختلف مذہب والوں کے درمیان) پر ان کو اعتراض نہیں !

جواب :-

جب کوئی بچہ اپنے ولی اور سرپرست سے محروم ہو جاتا ہے تو محلے بھر کے بچے اس کی جو چاہے درگت بناتے ہیں . جس طرح چاہے ستاتے ہیں تنگ کرتے ہیں .

کم و بیش یہی حال آج دنیا میں اسلام کا ہے . اسلام بجائے خود ایک قوت ہے ، مگر کوئی بھی قوت خلا میں قائم نہیں رہ سکتی جب تک اسے کوئی مناسب جسم میسر نہ ہو . یہ جسم عرصہ ہوا خلافت اسلامیہ کی شکل میں موجود تھا اور خلافت اسلامیہ نے پوری دنیا سے قوت اسلامیہ کا لوہا منوا کر چھوڑا مگر جب مشیت ایزدی بدلی تو یہی جسم کسی بلند و بالا عمارت کی طرح آہستہ آہستہ ٹوٹنا شروع ہوا . پہلے کچھ کنگورے گرے ، پھر ستونوں کی نوبت آئی . پھر دیواریں اور ڈاٹیں تدریجاً گرتی گئیں . یہاں تک کہ آج اسلام اپنی عملی اور خارجی حیثیت میں ایک کھنڈر کی مانند ہے جو اپنے ماضی کی شان و شوکت کا پتہ تو ضرور دے رہا ہے مگر اپنے حال کا مرثیہ اس کی مغموم اور ویران فضا میں اس طرح گونج رہا

کہ شاید بہرے بھی اس کی سماعت سے محروم نہ ہوں۔

ایسے حالات میں یہ بات تیاس کے عین مطابق ہے کہ اپنوں اور بیگانوں میں جس کا جی چاہے اسلام پر طنز کرے۔ اس کا مذاق اڑائے، اسے خوش فکریوں کا ہدف بنائے۔ کون ہے جو اس کی زبان پکڑے گا۔ کس میں طاقت ہے جو اسے اس بزدلانہ جسارت سے باز رکھے گا۔

اس تمہید کے بعد ہم شمیم صاحب کے ارشادات کا جواب دیتے ہیں:۔

انھوں نے فرمایا کہ اسلامی نظام حکومت ناکام ہو چکا ہے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ محض ایک دعویٰ ہے جو کسی دلیل شہادت کے بغیر کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ سب سے پہلے تو یہی تحقیق طلب ہے کہ اسلامی نظام حکومت سے صاحب دعویٰ پوری طرح واقف بھی ہیں یا نہیں۔ اگر وہ واقف نہیں تو دعوے کی پوری بنیاد سے محروم ہو جاتی ہے۔ اور اگر واقف ہیں تو انھیں بتانا چاہیے کہ اسلامی نظام حکومت کب کب، کہاں کہاں قائم ہوا۔ اور پھر کیا کیا ناکامیاں اس کے حصے میں آئیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ نظام اپنے تمام اصول فروع اور جملہ ضروری التزامات کے ساتھ سب سے پہلے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں قائم ہوا تھا۔ پھر اس کی زمام صحابہ رضؓ کے ہاتھ میں آئی اور یکے بعد دیگرے چار خلفاء نے اس کے تخت اقتدار کے پایوں کو اپنے کاندھوں پر سنبھالے رکھا۔ دنیا نام ہی تغیر کا ہے۔ ان چاروں خلفاء کے بعد اس نظام میں کچھ ایسی تبدیلیاں گھس آئیں جو نظام کی روح اور مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوگئی۔ پھر کچھ مدت گذرنے پر عمر بن عبدالعزیزؒ آئے جنھوں نے ان غیر موزوں تبدیلیوں کے نقوش مٹا کر تجدید و اصلاح کی جد و جہد کی اور تھوڑے عرصے کے لیے یہ نظام پھر اپنی اصلی شکل و حیثیت میں آگیا۔

لیکن عمر بن عبدالعزیزؒ کی موت کے بعد سے آج تک اس نظام کو اس کے اصلی روپ میں اس کی حقیقی اسپرٹ اور واقعی روح کے ساتھ قائم کرنے والا کوئی پیدا نہ ہو سکا مسلم حکومتوں کا تسلسل اگرچہ آج تک نہیں ٹوٹا ہے، چودہ سو سال پہلے کی فتوحات کے بہت سے برگ و بار اور ثمرات و منافع آج بھی امت مسلمہ کی جھولی میں موجود ہیں۔ مگر ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ زمین کے کسی ٹکڑے پر یہ نظام اپنی اس مکمل شکل میں قائم کر دیا گیا ہو جس میں یہ خیر القرون میں قائم کیا گیا تھا۔

اب ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ صاحب دعویٰ فی الحقیقت کہنا کیا چاہتے ہیں۔ کیا ان کا مطلب یہ ہے کہ خلفائے راشدین کا زمانہ بھی ناکامی ہی کا زمانہ تھا یا ان کی نظر میں بعد کے مسلم بادشاہوں کی ناکامیاں ہیں۔ یہ تصریح جب تک سامنے نہ آئے ان کا دعویٰ چیستاں کے سوا کچھ نہ قرار پائے گا۔

دوسرے نمبر پر یہ وضاحت بھی طلب کرنی ہوگی کہ ناکامی سے کیا مراد ہے۔ ناکامی ویسے تو ایک سادہ سا لفظ ہے جس کے معنی ہر خاص و عام جانتا ہے لیکن اس کا اطلاق ہر شخص کے اپنے نقطۂ نظر پر منحصر ہے۔ ایک شخص تو وہ ہو سکتا ہے جو راہِ خدا میں شہید ہوتے ہوئے فرط مسرت میں جھوم کر کہے کہ:

فزتُ برب الکعبہ (خدا کی قسم میں کامیاب ہو گیا) اور ایک شخص وہ ہو سکتا ہے جو موت کو سامنے دیکھ کر واویلا مچائے اور رو رو کر کہے ہائے میری بدبختی!

آج ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں اس کا معیار کامیابی و ناکامی تو اسلام کے معیار سے بالکل مختلف بلکہ کم و بیش متضاد ہے۔ آج وہ شخص کامیاب سمجھا جاتا ہے جس کے پاس دولت ہو، عہدہ ہو، شہرت ہو۔ چاہے کردار کے اعتبار سے کوئی ذرہ ایسا اس کے پاس نہ ہو جو آخرت میں کام آسکے۔ لیکن اسلام کی نظر میں وہ شخص کامیاب ہے جو کفر و طغیان اور فسق و معصیت سے حتی الوسع بچتا ہوا حالت ایمان میں دنیا سے رخصت ہو۔ چاہے اس کی دنیاوی زندگی فقر و فاقہ میں کٹی ہو، چاہے کوئی بھی ممتاز عہدہ اس کے حصے میں نہ آیا ہو۔ چاہے ذرا بھی شہرت اسے نصیب نہ ہوئی ہو۔

شمیم صاحب جس مقام سے بول رہے ہیں اور جس انداز کی بولی بول رہے ہیں اس سے تو یہی مترشح ہوتا ہے

کہ اسلام کا معیار ان کے پیش نظر نہیں بلکہ ٹھیک وہی معیار پیش نظر ہے جسے آج کی دنیا آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنائے ہوئے ہے۔

دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ مذہب کے نام پر کوئی نظام کامیاب نہیں رہ سکا۔ اس لیے کوئی ملک مذہب کے نام پر قائم نہیں رہ سکتا۔

اب گویا وہ نظام اسلامی ہی کو نہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر نفس مذہب کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ یہ دراصل لازمی نتیجہ ہے اس تعلیم و تربیت کا جو آجکل اسکولوں اور کالجوں میں دی جا رہی ہے۔ موصوف نے اسلام یا غیر اسلام کے بارے میں جو بھی کچھ معلومات حاصل کی ہیں، اسی راہ سے حاصل کی ہیں۔ اس کا ثمرہ اس کے علاوہ کیا نکلتا کہ مذہب کا ایک ناقص تصور ان کے ذہن میں بیٹھ جائے اور نسلی طور پر مسلمان ہونے کے باوجود ان کا ذہنی سانچہ کافرانہ انداز فکر اور ملحدانہ اسلوب تعقل سے تیار ہو۔

جہاں تک مذہب کے نام کا تعلق ہے اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ اسلام کے چودہ سو سالوں میں بے شمار مسلم حکومتیں اسلام ہی کے نام پر قائم رہی ہیں۔ انھوں نے خواہ اسلامی نظام کو مکمل طور پر نافذ نہ کیا ہو لیکن اسے مکمل طور پر مسترد بھی نہیں کیا اور نام کی حد تک تو انھیں اپنے مذہبی ہونے پر پورا پورا اصرار رہا ہے۔

موصوف کی ذہنی سطح اس وقت بالکل عریاں ہو کر سامنے آجاتی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ "اس کے برخلاف ہندوستان میں ایک نظام کے تحت حکومت مستحکم ہے"۔

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ان کے پیش نظر کسی سنجیدہ حقیقت کا اظہار نہیں بلکہ عامیانہ انداز میں اس سیکولرازم کی مدح ہے جس نے انھیں تھوڑے سے دنیاوی منافع عطا کر دیے ہیں۔ ہم سوال کرتے ہیں کہ پہلے سیکولرازم کی تعریف کیجیے۔ اس کے بعد کوئی دعویٰ یا دعویٰ ارشاد فرمائیے۔ بعض اور اصطلاحات کی طرح سیکولرازم کی اصطلاح بھی متعدد مفاہیم میں استعمال کی جا رہی ہے۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ موصوف کا اظہار خیال کون سے مفہوم پر مبنی ہے اس وقت تک کوئی مفہوم بھی ان کے ارشادات میں پیدا نہیں ہوتا۔

ہم کہتے ہیں کہ ایک غیر مسلم اکثریت کے ملک میں تو بیشک سیکولرازم کو نظام حکومت کے بنیادی تصور کی حیثیت سے قابل تعریف قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جن ملکوں میں اکثریت مسلم ہو انھیں مستحکم کیے بغیر سیکولرازم کی بے رکان مدح کرنا جہالت کے سوا کوئی اور بنیاد نہیں رکھتا۔

رہا استحکام ۔ ۔ ۔ تو خدا جانے اس لفظ کا کیا مطلب اور مصداق ہے موصوف کے نزدیک۔ اگر مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں بغاوت، انقلاب اور فوجی غداریوں کا چکر نہیں جب کہ عرب ممالک میں آئے دن یہ تماشے عام ہو گئے ہیں تو ہم سوال کریں گے کہ ان عرب ممالک میں اسلامی نظام ہے ہی کب جو آپ عدم استحکام کی ذمہ داری مذہب کے سر ڈال رہے ہیں۔ کیا عراق یا سوڈان یا مراکش یا مصر کسی بھی ملک میں آپ کو مدت دراز سے اسلامی نظام نظر آ رہا ہے ـــــ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر یہ کس قسم کی منطق ہے کہ ان ممالک کے عدم استحکام اور اضطرابات و انقلابات کو آپ اسلام کے کھاتے میں ڈالیں اور کم فہموں کے انداز میں بغلیں بجائیں کہ لیجیے مذہبی نظام ناکام ہو گیا۔

ایک مدت سے جو نظام تعلیم رائج ہے اس کا بنیادی ترین مقصد یہ ہے کہ بہت ہی فنکاری اور مہارت کے ساتھ طلباء کے ذہنوں سے مذہب کی بالادستی کا عقیدہ کھرچ کر مادہ پرستی کی برتری اور نفع بخشی کا تصور رچایا جائے۔ اس نظام تعلیم سے مستفید ہونے والے طلباء کا مذہب کا عموماً اور اسلام کا خصوصاً جو تعارف حاصل کرتے ہیں وہ اسی بنیادی مقصد کے گرد گھومتے ہیں کرتے ہیں اور ان کے کچے دل و دماغ احساس بھی نہیں کر پاتے کہ تریاق کے خوش رنگ مشروب کی شکل میں انھیں جو پلایا جا رہا ہے وہ ایک ایسا زہر ہے جو زندگی بھر کے لیے ان کی ذہنی سمت سفر کو بدل کر رکھ دے گا اور مذہب کے خلاف ایک گہرا تعصب ان کی رگ رگ میں سما جائے گا۔ ہم شمیم صاحب جیسے مسلمانوں کو

بڑی حد تک معذور تصور کرتے ہیں اور غصے یا خفگی کے بجائے انھیں رحم کا مستحق خیال کرتے ہیں کہ ان کا ذہنی سانچہ ہی بگاڑ دیا گیا ہے۔

جہاں تک اس پیش گوئی کا تعلق ہے کہ پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اسے چاپلوسی کے سوا کس زمرے میں رکھیں۔ آخر تا قیامت سالم رہنے کا پٹہ کونسا ملک آسمان سے لکھوا لایا ہے کہ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا پیشگوئی کا موضوع بن سکے۔ یہ دنیا اور اس کی ہر چیز فانی ہے۔ تغیر پذیر ہے۔ ہر دوسری شئے کی طرح ملکوں کے جغرافیے بھی بدلتے رہتے ہیں تلک الایام نداولہا بین الناس۔ کل تک لاہور اور کراچی ہندوستان کے ٹکڑے تھے۔ آج وہ ہندوستان سے جدا ہیں۔ عرصہ ہوا دہلی اور حیدرآباد اور راجستھان اور پنجاب الگ الگ مملکتیں تھیں۔ یہ جغرافیائی اور سیاسی تبدیلیاں لوازل سے ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ اگر مستقبل میں پاکستان بھی پارہ پارہ ہو جاتا ہے تو اس سے نہ اسلام پر حرف آتا ہے نہ مذہب پر۔ خدا جانے شمیم صاحب جیسے دانشور آنکھوں پر کونسی عینک چڑھا لیتے ہیں جو بعض سامنے کی چیزیں بھی نہیں دیکھ پاتے۔ کیا یہ بدیہی واقعہ کسی غور و دقیقہ بینی مطالعہ کا محتاج ہے کہ پاکستان میں شروع سے آج تک اسلامی نظام حکومت جیسی کوئی چیز وجود میں نہیں آئی۔ ٹھیک وہی نظام جو انگریز چھوڑ گیا تھا جزوی اور ضمنی تبدیلیوں کے ساتھ نافذ رہا۔ سیاسی بھونچال اور سیاسی انقلابات کتنے ہی آئے ہوں مگر پاکستانی اقتدار کے وہ بنیادی ستون اپنی جگہ جوں کے توں قائم رہے جنھیں بغیر اسلامی نظام حکومت کا ایوان تعمیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ ساری سیاسی قدریں اپنی جگہ مسلّم جو اسلامی اقدار سیاست کی دشمن تھیں۔ اسلام کا محض نام لیا گیا۔ وظیفہ رٹا گیا۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی پوری مشینری میں سے فقط وہ چند پرزے باطل نظام کی مشینری میں جوڑ لیے گئے جو خود حکمرانوں کے حق میں مفید تھے اور جن کی حیثیت اسلامی نظام کی مشینری سے جدا ہو کر اس پستول کی سی رہ گئی تھی جس کے بل پر ڈاکے بھی ڈالے جا سکتے ہیں۔ عصمتیں بھی لوٹی جا سکتی ہیں۔ ناحق خون ریزی بھی کی جا سکتی ہے۔

الفاظ بدل کر کہیے تو یوں کہیے کہ پاکستان نے آئینی سطح پر کلمہ تو پڑھ لیا مگر اس کلمہ کے مطالبات و مقتضیات کو طاق نسیاں میں رکھ دیا اور پورا نظام حکومت اپنے قالب اجزاء اور سمت رخ کے اعتبار سے کافرانہ ہی رہا۔ پھر بھلا موٹی عقل اور سطحی نظر رکھنے والوں کے علاوہ کون کہہ سکتا ہے کہ جن سیاسی اضطرابات سے پاکستان دوچار ہے وہ اسلامی نظام کی ناکامی کا ثبوت ہیں یا آئندہ اگر اس کے ٹکڑے ہو گئے تو اس کی ذمہ داری اسلامی نظام کے سر جائے گی۔

اگر چشم بصیرت ہو تو یہ دیکھنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ پاکستان اور دیگر مسلمان ملکوں کی حقیقی اور مفروضہ ناکامیوں کا مصدر و منبع اسلامی نظام سے فرار، اسلامی فکر سے غداری، اسلامی تعلیمات سے شرمناک دوری اور باطل افکار و تصورات کی بدبختانہ محبت و عقیدت ہے۔ اور اگر مستقبل میں یہ ملک مزید زلزلوں اور بھونچالوں کا شکار ہو یا اس کے ٹکڑے ہو جائیں تو اس کا مبنیٰ بھی اسی کی اسلام گریزی ہی قرار پائے گی نہ کہ اسلام دوستی۔

ہم اس کی کوئی بنیادی حیثیت نہیں سمجھتے کہ پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے یا اپنی موجودہ سالمیت کو برقرار رکھتا ہے۔ بنیادی اہمیت صرف اس بات کی ہے کہ کب وہاں ظالمانہ اقدار پر مبنی باطل نظام حکومت ختم کر کے منصفانہ اقدار پر مبنی اسلامی نظام حکومت لایا جاتا ہے اور کب وہاں کے مسلمان اُس فرض سے عہدہ برآ ہوتے ہیں جو قیام پاکستان کے پہلے دن سے ان پر عائد ہے۔ اسلامی نظام حکومت ایک ہزار مربع میل کے علاقے میں نافذ ہو جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ غیر اسلامی نظام حکومت ایک لاکھ مربع میل میں تخت اقتدار بچھائے۔

جہاں تک اس رائے کا تعلق ہے کہ بنگلہ دیش اب پاکستان کا جز نہیں، اسے ہم رائے کی بجائے خواہش کا نام دیں گے۔ خواہشات پر کوئی پابندی نہیں۔ لیکن کسی خواہش کو خارجی واقعہ بنا دینا محض خیال کی شعبدہ گری ہے۔ ٹھوس حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اگر مشرقی پاکستان کے وہ عوام جو مکمل خود مختاری کے خواہاں تھے الجزائر یا ویت نام والوں کی طرح جان بسپاری صلاحیت بھی رکھتے

اور سخت جانی کا ثبوت دیتے تو ممکن تھا "بنگلہ دیش" ذہنوں کے تہہ خانوں سے نکل کر اینٹ اور پتھر کی دنیا میں بھی نظر آجاتا۔ مگر یہ لوگ چار دن بھی کسی ممتاز شجاعت اور کسی نمایاں مقاومت کا مظاہرہ نہیں کرسکے۔ انھوں نے یحییٰ فوجوں کی سفاکی اور توپ و تفنگ کی گھن گرج سے ہار مان کر اتنی بڑی تعداد میں فرار کی راہ اختیار کی کہ آج ہمارا دیس ان کی گنتی کر کر کے تھکا جا رہا ہے۔ اب بھی اگر کوئی خوش فکرا یہ گمان کرتا ہے کہ بنگلہ دیش بن گیا تو خوش فکریوں پر روک لگانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ ہمارا خیال ہے رچاہے یہ کتنا ہی تلخ ہو) کہ بنگلہ دیش کا خواب فی الحال تعبیر سے ہمکنار ہوتا نظر نہیں آتا۔ مستقبل بعید کے بارے میں کوئی پیش گوئی تو حماقت ہے۔ اللہ جب چاہے کسی بھی ملک کو زیر و زبر کرسکتا ہے — لیکن مستقبل قریب میں بنگلہ دیش کا جنم موجودہ حالات کی روشنی میں خاصا دشوار نظر آرہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شبستان کے انٹرویو میں شمیم صاحب کے جس ارشاد گرامی کی نشاندہی کی گئی ہے وہ اگر امر واقعہ ہے اور نشاندہی کرنے والے کرم فرما نے مطلب سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے تو ہم سوائے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے اور کیا کہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ ملی جلی شادیوں سے شمیم صاحب کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے جو ذات پات اور پیشے وغیرہ کے تعلق سے اپنی ملت میں بہت سے اونچے نیچے طبقے بنالیے ہیں، ان کا آپس میں شادی بیاہ نہ کرنا افسوسناک ہے۔ اگر یہ مطلب ہو تو ہم موصوف کے ساتھ ہیں اور ایسی ہر اسکیم کو سراہتے ہیں۔ جو طبقاتی شدت کی اصلاح کرتے ہوئے با ہمی فاصلوں کو کم کرے اور اتنی فضا ہموار ہو وہ وقت آجائے کہ شادی بیاہ میں صرف کردار معیار بن جائے اور یہ فرق ختم ہوجائے کہ کون شیخ ہے اور کون سید۔

لیکن اگر ملی جلی شادیوں کا مطلب وہ ہے جیسے برعکس ہیں ظاہر کیا گیا ہے یعنی مسلمان غیر مسلموں میں شادی کریں تو صاف ظاہر ہے کہ ایسی بات صرف وہ مسلمان کہہ سکتا ہے جو قرآن و حدیث سے کورا ہو یا دنیا کی چمک دمک نے اس کی چشم بصیرت پھوڑ دی ہو۔

اللہ اور رسولؐ کی صریح ہدایات اور واضح تعلیمات مطلع کرتی ہیں کہ کسی بھی مسلمان عورت کا نکاح غیر مسلم مرد سے نہیں ہو سکتا۔ جب نکاح ہی نہیں ہو سکتا تو ان کے مابین جسمانی تعلق زنا کے سوا کیا رہ جائے گا اور زنا سے پیدا شدہ اولاد کو حرامی کے سوا کیا کہیں گے۔ اسلام میں حلال اولاد کے صرف دو ہی طریقے ہیں۔ مسلمان عورت کا مسلمان مرد سے نکاح یا شرعی کنیز سے اس کے مسلمان مالک کا جنسی تعلق۔ ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا طریقہ آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔ شمیم صاحب اگر اپنے مسلمان ہونے پر اظہار فخر نہ کرتے تو ہمیں ان کی رائے پر گرفت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ بہتیرے نام کے مسلمانوں کی آرا کفر و زندقہ کے بطن سے جنم لیتی ہیں۔ ہم سمجھتے ایک نے مسٹر چھاگلا پیدا ہوگئے مسٹر چھاگلا نے کبھی اپنے مسلمان ہونے پر فخر کا اظہار نہیں کیا لہٰذا شمیم صاحب جیسے علانیہ مسلمانوں کا اس قدر غلط رائے رکھنا اس حد تک قابل توجہ ضرور ہے کہ حق نصیحت ادا ہو جائے ہم انھیں مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ پاکستان اور بنگلہ دیش اور دیگر موضوعات سیاسیہ میں وہ جیسی چاہے گل افشانی کرتے رہیں، لیکن دین و مذہب کے موضوع پر احتیاط اور متانت کے ساتھ بولیں۔ ان کی بے احتیاطی سے ہمارا کچھ نہیں بگڑ سکتا لیکن اخوۃ اسلامی کے رشتے سے ہمارا دل یہ ضرور چاہتا ہے کہ دنیا کی طرح انھیں آخرت میں بھی آرام و راحت میسر آئے، اور ان کی فکر و عمل کفر و زندقہ کے دھبوں سے محفوظ رہے۔ زبانی طراریاں اور ذہنی اڑانیں اس حقیقت کبریٰ کو نہیں بدل سکتیں کہ نجات اُخروی صرف اسلام کے حلقہ بگوشوں کا حصہ ہے اور اسلام منحصر ہے قرآن و حدیث کی محکم تعلیمات میں۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

تجلیات ربّانی (حصہ اول)

تلخیص و ترجمہ: مولانا نسیم احمد فریدی امروہی

پورے اسلامی ادب میں حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان مکاتیب میں احسان و تصوف، تعمیر باطن، حق و باطل میں امتیاز، جہاد فی سبیل اللہ اور اقامت دین کی ترویج، شریعت کی ترغیب اور امت مسلمہ کی عام رہنمائی کا وہ سامان موجود ہے جس کی صدائے بازگشت نے گذشتہ تین چار صدیوں میں امت مصطفویہ کے حق میں امیر کارواں کا کام انجام دیا ہے۔ ساتھ ہی مولانا موصوف نے حاشیہ پر مکتوب الیہم کے حالات بھی کسی قدر تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ جس نے اس کی اہمیت اور عظمت کو دوبالا کر دیا ہے۔ معیاری کتابت و طباعت، دیدہ زیب گردپوش سے مزین مجلد ۱۳/۵۰

تذکرہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب تمیمی نجدی

آپ جانتے ہیں کہ بدعتی حضرات اپنے سوا تمام مسلمانوں کو "وہابی" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ دراصل محمد عبدالوہاب کے نام نامی کی طرف نسبت ہے اور اس نسبت کو گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر آپ سچائی کے متلاشی ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ حقیقت سے آگاہ کرے گا کہ محمد بن عبدالوہاب کس قدر سنت کے شیدائی، بدعت کے دشمن اور دین و ملت کے خیر خواہ تھے۔ انگریزوں نے انہیں بدنام کیا اور بدعتی لوگوں نے اس بدنامی میں چار چاند لگائے۔ اس کتاب کے مصنف "قطر" کے محکمہ شرعیہ کے قاضی احمد بن حجر ہیں اور ترجمہ صفی الرحمٰن الاعظمی نے کیا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ فاضل مترجم نے بیش قیمت نوٹ بھی حواشی پر بڑھائے ہیں۔

قیمت ـــ ۴/۵۰

تاریخ دیوبند

دیوبند ایک قدیم بستی ہے۔ اس کی سرزمین نے انقلابات کی بے شمار کروٹیں دیکھی ہیں۔ اور اب دارالعلوم کی وجہ سے یہ بستی بین الاقوامی شہرت کی مالک بن گئی ہے۔ اس بستی کی دلچسپ اور محققانہ تاریخ جناب سید محبوب رضوی کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے۔ تاریخ نگاری میں مصنف موصوف کی تصنیف ایک امتیازی شہرت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپ کر ختم ہو گیا۔ اب دوسرا ایڈیشن فاضل مصنف کی نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ صفحات ۵۱۲۔ قیمت مجلد دس روپے ۱۰/۰

تذکرۃ المصنّفین (اردو)

یہ کتاب درس نظامیہ، درس عالیہ، نصاب ندوۃ العلماء اور سرکاری نصاب کی کتابوں کے مصنفین کا جامع اور نہایت مستند تذکرہ ہے جسکو مصنف کی عرق ریزی اور مساعی جمیلہ نے انسائیکلوپیڈیا بنا دیا ہے۔ مدارس عربیہ کے اساتذہ و طلباء کے لیے یکساں مفید ہے ملک کے عظیم تبصرہ نگاروں نے اس کتاب کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ قیمت ۷/۰

ورق ورق روشن

اخلاقی اسباق اور علم و حکمت کا ایسا خزانہ جو ہر دل و دماغ کو روشن کریگا۔ اس کتاب میں مؤلف نے قرآن، حدیث، تاریخ، آثار اور معیاری لٹریچر سے اللہ رسولؐ اور دنیا بھر کے دانشوروں، مصلحوں اور عالموں کے بہت ہی مفید و نفیس ارشادات حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایمان یا انصاف یا اعتقاد یا انتقام کے بارے میں آپ مواد دیکھنا چاہیں گے تو الف کی فہرست میں یہ عنوان مل جائے گا۔ اسی طرح کسی بھی لفظ کو اس فہرست میں بآسانی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ صفحات (۴۸۷) قیمت مجلد ـ ۳۰/ـ

حسن احمد صدیقی

تفہیم الحدیث

حقوق والدین کے موضوع پر مولانا عامر عثمانی "تجلی" میں کافی سے زائد گفتگو کر چکے تھے۔ اس گفتگو کو عامر عثمانی نمبر کی پہلی قسط میں بھی دوبارہ شائع کر دیا گیا ہے۔ اب اس موضوع پر مزید خامہ فرسائی کرنا بے سود ہی ہوگا۔ لہٰذا آیئے اب اولاد کے حقوق پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

اتنی سی بات سے تو قارئین بھی واقف ہی ہوں گے کہ اسلام سے پہلے جو شریعتیں دنیا میں آئی تھیں ان میں اولاد کے حقوق ادا کرنے پر کوئی زور نہیں دیا گیا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اولاد کے حقوق ہی متعین نہیں کیے گئے تھے۔ لہٰذا حقوق کی ادائیگی پر شد و مد کے ساتھ اصرار کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کی امت کو تاکید اً یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اپنے والدین کے ساتھ بھلائی اور احترام کا سلوک کریں قرآن حکیم اور پچھلی آسمانی کتابوں میں اس کی نظیریں موجود ہیں لیکن ڈھونڈنے سے کہیں پچھلی شریعتوں میں کوئی ایسا جملہ نظر نہیں آتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ جس طرح اولاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے والدین کے متعینہ حقوق ادا کریں۔ اسی طرح والدین کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اپنی اولاد کے حقوق ادا کرنے کے پابند ہیں۔ لیکن اسلام چونکہ جامع و مانع ہونے کے ساتھ آخری مذہب بھی ہے لہٰذا اس نے اپنے ماننے والوں کو صرف والدین کے حقوق ادا کرنے کی تاکید نہیں کی بلکہ یہ بھی واضح کیا کہ جس طرح چھوٹوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے بڑوں کے حقوق پہچانیں اسی طرح بڑوں کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں کے حقوق سمجھنے کی کوشش کریں اور ان کے ساتھ نرمی و شفقت کا برتاؤ کریں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف چھوٹوں کو یہ تاکید کرنے پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ اپنے بڑوں کی تعظیم کریں بلکہ آپ نے یہ مختصر سی بات ارشاد فرمائی جو چند لفظوں پر مشتمل ہونے کے باوجود اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتی ہے اور جس میں خورد و کلاں کے حقوق سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ آپؐ کا ارشاد ہے :-

لیس منا من لم یرحم	وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو
صغیرنا و لم یوقر	ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے
کبیرنا۔ (ترمذی)	اور ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کرے

یہ مختصر سا جملہ اپنے اندر بڑی گہرائی رکھتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح چھوٹوں پر بعض ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں، اسی طرح بڑوں پر کچھ فرائض لاگو کیے گئے ہیں۔ جس طرح بڑے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کا احترام کیا جائے، ان کے ساتھ عزت و توقیر کے ساتھ پیش آیا جائے اسی طرح چھوٹے بھی اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے حقوق ادا کیے جائیں اور ان کے حقوق اس طرح ادا ہو سکتے ہیں کہ ان کے ساتھ نرمی و شفقت اور محبت و ہمدردی کا معاملہ کیا جائے۔ دیکھیے پیغمبر آخر الزماں نے صاف لفظوں میں یہ فرما دیا ہے کہ وہ شخص ہم میں سے ہو ہی نہیں سکتا جو چھوٹا ہو کر بڑوں کی عزت نہ کرے اور بڑا ہو کر چھوٹوں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ نہ کرے۔

بڑوں میں سب سے پہلے ماں باپ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی

حق کی جائے۔ اور بچوں میں سب سے پہلے اولاد اس بات کی حقدار ہے کہ ان کے ساتھ محبت و ہمدردی کا معاملہ اختیار کیا جائے۔ اولاد کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کرنا یا ان سے بے توجہی اور بے اعتنائی برتنا ان کے حقوق کی پامالی ہے اور اسکے بہت غلط نتائج سامنے آتے ہیں۔ بالعموم یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جو بچے والدین کی شفقت و محبت سے محروم ہوتے ہیں وہ بالعموم زندگی کی بے راہ روی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور یہ بچے کبھی کسی کو محبت نہیں دے پاتے اسلیے کہ محبت درافت سے یہ واقف ہی نہیں ہوتے۔ ماں باپ کا غیر عادلانہ اور غیر مشفقانہ سلوک ان کے دلوں میں یہ بات اتار دیتا ہے کہ انصاف اور شفقت کوئی چیز نہیں، محبت اور مہربانی کوئی چیز نہیں، اصل چیز خود غرضی ہے، مفاد پرستی ہے۔ چنانچہ جو کچھ نفرت و بے اعتنائی انھیں بچپن میں اپنے والدین سے ملتی ہے اسے یہ زندگی بھر معاشرہ میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ اور بالآخر جب ان کے اولاد پیدا ہوتی ہے تو وہ اسکے ساتھ وہی سلوک کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو سلوک انکے والدین نے ان کے ساتھ کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ والدین اپنی اولاد کے ساتھ نفرت آمیز برتاؤ کر کے صرف اپنے ہی بچوں کے دامن میں نفرت کے انگارے نہیں ڈالتے بلکہ اپنی آنے والی نسلوں میں نفرت و کشاکشی کا ایک تباہ کن سلسلہ قائم کر دیتے ہیں اور پھر یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ چلتا ہی رہتا ہے۔

اولاد کے جو حقوق متعین کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ محبت اور ترحم کا معاملہ کیا جائے اس سے بے التفاتی برتنا یا اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے وقت گریز و بخیلی کا مظاہرہ کرنا اسلامی تعلیم کے منافی ہے اور رسولِ خدا نے اس کی سخت مذمت فرمائی ہے۔

ایک صحابی تھے اقرع ابن حابسؓ۔ یہ ایک دفعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے: انھوں نے دیکھا کہ حضور اپنے نواسے حضرت حسنؓ کو پیار کر رہے ہیں۔ انھیں یہ بات بڑی نئی اور عجیب سی محسوس ہوئی۔ انھوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ کیا آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں۔

حضور نے استفہامی انداز میں انھیں دیکھا تو وہ بولے میرے دس بچے ہیں۔ مگر میں نے تو کبھی انھیں پیار نہیں کیا۔

آپؐ نے اقرعؓ کی طرف ذرا تیز نظروں سے دیکھا پھر فرمایا۔ اگر اللہ نے تمہارے دل سے رحم و شفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن دلوں میں ایمان ہو ان میں نرمی و شفقت ضرور ہوتی ہے اور جن دلوں میں نرمی و شفقت ہو وہ اپنی اولاد کے ساتھ اس کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اولاد کا ایک ضروری حق یہ بھی ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا جائے اور شروع ہی سے اس کو بری صحبتوں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ چھوٹی عمر میں جو بات بچے کے دل میں اتر جاتی ہے پھر زندگی بھر اسے دل سے نکالنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اگر بچہ چھوٹی عمر میں اپنے ماں باپ کو ہر وقت لڑتے جھگڑتے اور انھیں باہم دست و گریباں ہوتے دیکھے گا تو یہ بات ناممکنات میں سے ہے کہ وہ بڑا ہو کر جھگڑالو واقع نہ ہو۔ والدین کے ہر وقت کے تو تو میں میں بچے کے ذہن پر یہ اثر ڈالتی ہے کہ لڑائی ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے اور اس کے بغیر کوئی دن نہیں گذارا جا سکتا۔ بعض لوگ اپنی اولاد کو باقاعدہ بعض بری چیزوں کی تربیت دیتے ہیں اور یہ تربیت اکارت نہیں جاتی بلکہ اس کے مضر اور خاطر خواہ نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

ہم نے کسی کتاب میں ایک یہودی کا یہ واقعہ پڑھا تھا کہ ایک دن اس نے اپنے کمسن بچے کو ایک دیوار پر چڑھانے کے بعد کہا بیٹے نیچے کود جا۔

بچے نے کہا اگر میں نے آپ کے کہنے میں آکر ایسا کیا تو میری پسلی پسلی ایک ہو جائے گی۔

یہودی نے کہا میں تو دیوار کے نیچے موجود ہوں۔ تم کود و تو سہی میں تمہیں دبوچ لوں گا۔

بچے نے کہا۔ ابا جان اگر آپ ہٹ گئے تو پھر کیا ہوگا!

یہودی بولا۔ مجھ پر اعتماد کرو میں تمہارا باپ ہوں کیا میں تمہارا گرنا کیسے گوارہ کر لوں گا ——— (جاری)

مسلسل

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

آغازِ رسالت

بعثت سے قبل انبیاء کا ذہنی سفر

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اس کی نوعیت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی۔ ان کے پاس نزول وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعۂ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو چنانچہ حضورؐ سے فرمایا:-

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ	اے نبی تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب
وَلَا الْاِيْمَانُ (الشوریٰ ۵۲)	کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے
وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى	اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ناواقف
(الضحیٰ-۷)	راہ پایا، پھر تمہیں راستہ بتایا۔

عقلی معرفت سے الہامی ایمان تک

اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے علم و معرفت کے انہی عام ذرائع سے، جو دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہیں، ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے ہوتے تھے، وحی اگر جو کچھ کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر ان کا دل گواہی دیتا تھا اب انھیں کے متعلق وحی یقینی اور قطعی شہادت دیتی تھی کہ وہ حق ہیں، اور انھیں شہادتوں کا مشاہدہ انھیں کرا دیا جاتا تھا تاکہ وہ پورے وثوق سے دنیا کے سامنے ان کی گواہی دے سکیں۔ یہ مضمون سورۂ ھود میں بار بار بتکرار بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:-

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى	پھر کیا وہ شخص جو پہلے اپنے
بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ	رب کی طرف سے ایک دلیل
وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ	روشن پر تھا (یعنی عقلی و فطری
مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ	ہدایت پر) اس کے بعد اس کی
كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا	طرف سے ایک گواہ بھی اس
وَّرَحْمَةً	کے پاس آگیا (یعنی قرآن)
	اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب
	بھی رہنما اور رحمت کے طور پر
	موجود تھی (کیا وہ اس صداقت
(آیت-۱۷)	کے بارے میں شک کر سکتا ہے؟)

بینۃ من الرب

پھر اسی مضمون کو آیت ۶۳ میں حضرت صالح اور آیت ۸۸ میں حضرت شعیب دہراتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کے ذریعے حقیقت کا براہ راست علم پانے سے پہلے انبیاء علیہم السلام مشاہدے اور غور و فکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقہ پر استعمال کرکے (جسے ان آیات میں "بینۃ من الرب" سے تعبیر کیا گیا ہے) توحید اور معاد کی حقیقتوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اور ان کی یہ رسائی وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ انھیں علم وحی عطا کرتا تھا۔ اور یہ چیز کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتی تھی۔

یہ مشاہدۂ آثار اور غور و فکر عقل عام

(COMMON SENSE) کا استعمال ان قیاس آرائیوں اور ان ظن و تخمین (SPECULATION) سے بالکل ایک مختلف چیز ہے جس کا ارتکاب فلاسفہ کیا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر قرآن مجید ہر انسان کو خود آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بار بار اس سے کہتا ہے کہ آنکھیں کھول کر خدا کی قدرت کے آثار کو دیکھو اور ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرو۔ اس طرح آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے ایک غیر متعصب طالبِ حق حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۲۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ قبل نبوت کے جو حالات ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں ان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نبی ہونے سے پہلے ہی شرک سے پاک اور توحید کے قائل تھے۔ آپ نے ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی اپنی قوم کے مشرکانہ عقائد کو قبول نہیں کیا اس کی مشرکانہ عبادات میں حصہ نہیں لیا۔ بتوں اور بت پرستی سے ہمیشہ بیزار رہے اور بتوں پر جو قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں ان سے اجتناب فرماتے رہے۔ زمانۂ قبل نبوت میں آپ کا حال اپنی قوم کے ان حنفاء سے ملتا جلتا تھا جن کا ذکر ہم اس جلد کے دوسرے باب میں کر چکے ہیں۔ (اضافہ از مؤلف)

حضورؐ کا دورِ تحنث

محدثین نے آمدِ وحی کا قصہ اپنی اپنی سند کے ساتھ امام زہری سے اور انہوں نے عروہ بن زبیر سے اور انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء سچے (اور بعض روایات میں ہے اچھے) خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ ایسا ہوتا کہ جیسے کہ آپ دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔[۱] پھر آپ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی کئی شب و روز غارِ حراء میں رہ کر عبادت کرنے لگے[۲] (حضرت عائشہؓ نے تحنث کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زہری نے تعبّد سے کی ہے۔ یہ کسی طرح کی عبادت تھی جو آپ کرتے تھے۔ کیونکہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا) آپ کھانے پینے کا سامان گھر سے لیجا کر وہاں چند روز گزارتے، پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس پلٹتے اور وہ مزید چند روز کے لئے سامان آپ کے لئے مہیا کر دیتی تھیں۔ (تفہیم القرآن۔ ششم۔ دیباچہ سورۂ علق)

غارِ حراء میں خلوت گزینی کی وجہ

اس دور میں جس وجوہ سے آپ مکہ کی آبادی کو چھوڑ کر سنسان پہاڑیوں کے درمیان حراء کے غار میں خلوت گزیں ہوتے تھے اس کی وجوہ پر کچھ روشنی سورۂ الم نشرح کی اس آیت سے پڑتی ہے:

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ	اور ہم نے تم پر سے وہ بھاری
الَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ	بوجھ اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے
(آیات ۲-۳)	ڈال رہا تھا۔

اس آیت میں وِزْر کے معنی بھاری بوجھ کے ہیں اور اس سے مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا وہ بوجھ ہے جو اپنی قوم کی جہالت و جاہلیت کو دیکھ دیکھ کر آپ کی حساس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپ کے سامنے بت پوجے جا رہے تھے۔ شرک اور مشرکانہ اوہام و رسوم کا بازار گرم تھا

۱؎ بیہقی کی روایت ہے کہ یہ کیفیت نزولِ وحی سے چھ مہینے پہلے شروع ہو گئی تھی (اضافہ از مؤلف)

۲؎ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ کیفیت کے بعد آپ اور زیادہ خلوت پسند ہو گئے تھے۔ ورنہ آپ کی خلوت پسندی اس سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ آپ ہر سال ایک مہینہ حراء میں گزارتے۔ چند دن کا سامان خوراک ساتھ لے جاتے پھر گھر واپس آکر مزید چند روز کا سامان لیجاتے تھے۔ ابن اسحاق نے یہ بیان نہیں کیا کہ حضورؐ نے حراء میں جاکر قیام فرمانے کا یہ سلسلہ کب سے شروع فرمایا (اضافہ از مؤلف)

اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرت میں ظلم اور معاملات میں عدل عام تھا۔ زوروں کی زیادتیوں سے بے زور پس رہے تھے۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جارہی تھیں قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور بعض اوقات سو سو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی مضبوط جتھا نہ ہو۔ یہ حالت دیکھ کر آپ کڑھتے تھے مگر اس بگاڑ کو دور کرنے کی کوئی صورت آپ کو نظر نہ آتی تھی یہی فکر آپ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی جس کا بارِ گراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپ کے اوپر سے اتار دیا اور نبوت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپ کو معلوم ہوگیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ شاہ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا قفل کھولا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس رہنمائی نے آپ کے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپ پوری طرح مطمئن ہو گئے کہ اس ذریعہ سے آپ نہ صرف عرب بلکہ پوری نوعِ انسانی کو ان خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔

(تفہیم القرآن جلد ششم، الم نشرح، حاشیہ ۲)

سچے خواب جیسا کہ حدیث میں حضرت عائشہ رضؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی تھی (بخاری و مسلم)، یہ سلسلہ بعد میں بھی زمانۂ نبوت کے ہر دور میں جاری رہا ہے، چنانچہ احادیث میں آپ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے یا کسی بات پر مطلع کیا گیا ہے، اور قرآن مجید میں بھی آپ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے (الفتح آیت ۲۷) اس کے علاوہ متعدد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا فلاں بات میرے دل میں ڈالی

گئی ہے، یا مجھے یہ بتایا گیا ہے، یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اس سے منع کیا گیا ہے۔ احادیث قدسیہ زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔

(تفہیم القرآن جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۸۳)

ابتدائے وحی جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوگئی تو ایک روز ماہِ رمضان میں یکایک آپ پر غارِ حراء میں وحی نازل ہوئی اور فرشتے نے آکر آپ سے کہا پڑھو۔[1] بخاری میں کئی جگہ یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے نقل ہوا ہے۔ وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بیان کرتی ہیں کہ میں نے کہا "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے پھر کہا "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ — پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔

یہاں تک کہ مَا لَمْ یَعْلَمْ (جسے وہ نہ جانتا تھا) تک پہنچ گیا۔

---

[1] ابن اسحاق نے عبید بن عمر اللیثی سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا خواب میں جبریل نے آکر ایک ریشمی کپڑے میں لکھی ہوئی ایک تحریر مجھے دکھائی جس میں سورۂ علق کی ابتدائی آیات لکھی ہوئی تھیں اور مجھ سے کہا پڑھو۔ میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر انھوں نے مجھے اس طرح بھینچا کہ میں سمجھا کہ میری جان نکل جائے گی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھو۔ ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے کہتے ہیں کہ یہ گویا تمہید تھی اس معاملہ کی جو جاگنے کے بعد بیداری میں پیش آیا۔ جس کا ذکر حضرت عائشہؓ والی حدیث میں آیا ہے۔

(اضافہ از مؤلف)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہؓ کے پاس پہونچکر کہا "مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ" چنانچہ آپ کو اڑھا دیا گیا۔ جب آپ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے فرمایا "اے خدیجہ، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" پھر سارا قصہ آپ نے ان کو سنایا اور کہا "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے" انہوں نے کہا "ہرگز نہیں، آپ خوش ہو جائیے۔ خدا کی قسم! آپ کو اللہ تعالیٰ کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں) بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں"۔

حضرت خدیجہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاتی ہیں

پھر وہ حضورؐ کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے۔ عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے۔ بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہ نے ان سے کہا بھائی جان ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنیئے۔ (ابو نعیم کی روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے خود سارا قصہ ورقہ کو سنایا) ورقہ نے حضورؐ سے کہا بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ ورقہ نے کہا "یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ ہے) جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔ کاش میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے" ورقہ نے کہا، ہاں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں، اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پرزور مدد کروں گا" مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔

(تفہیم القرآن جلد ششم۔ دیباچہ سورۂ علق)

اس واقعہ سے کیا نتائج نکلتے ہیں

یہ قصہ خود اپنے منہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اس چیز کا طالب یا متوقع ہونا تو درکنار، آپ کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ آپ کے ساتھ پیش آنے گا۔ وحی کا نزول اور فرشتے کا اس طرح سامنے آنا آپ کے لئے اچانک ایک

---

[1] اس خوف کے بہت سے وجوہ علماء نے بیان کئے ہیں جن کی تعداد دس تک پہنچتی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ نبوت کے بار گراں کا تصور کر کے حضورؐ لرز جاتے تھے اور آپ کو بار بار خیال آتا تھا کہ میں اتنا بڑا بوجھ کیسے اٹھا سکوں گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ اپنے آپ کو کوئی بڑی ہستی نہ سمجھتے تھے اور کوئی ایسا ادعا آپ کے ذہن میں نہ تھا کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہی ہونا چاہئے اور کوئی زعم آپ کو نہ تھا کہ میں ہی یہ عظیم کام انجام دینے کی قوت رکھتا ہوں (اضافہ از مؤلف)

[2] ایک روایت میں الفاظ ہیں، اللہ تعالیٰ کبھی آپ رنج میں مبتلا نہ کرے گا۔ اضافہ از مؤلف)

[3] حضورؐ کو ان کا بھتیجا اس لئے کہا کہ ان کی تیسری پشت میں عبدالعزیٰ حضورؐ کی چوتھی پشت میں عبدمناف کا بھائی تھا۔ (اضافہ از مؤلف)

[4] حضرت عیسیٰ کے بجائے حضرت موسیٰ کا ذکر غالباً اس لئے کیا کہ حضرت عیسیٰ کے لئے تو نبوت کی بشارت پیدائش سے بھی پہلے دیدی گئی تھی، البتہ حضرت موسیٰ کو نبوت اسی طرح اچانک ملی جس طرح حضورؐ کو دی گئی (اضافہ از مؤلف)

حادثہ تھا جس کا پہلا تاثر آپ کے اوپر یہی ہونا تھا۔ ایک بے خبر انسان پر اتنے بڑے حادثہ کے پیش آنے سے فطری طور پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تو مکہ کے لوگوں نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کئے مگر ان میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اس قصے سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبوت سے پہلے آپ کی زندگی کیسی پاکیزہ تھی اور آپ کا کردار کتنا بلند تھا۔ حضرت خدیجہؓ کوئی کم سن خاتون نہ تھیں بلکہ اس واقعہ کے وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی اور پندرہ سال سے وہ حضورؐ کی شریک زندگی تھیں۔ بیوی سے شوہر کی کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے اس طویل ازدواجی زندگی میں آپ کو اتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ جب حضورؐ نے ان کو غار حرا میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو بلا تامل انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ فی الواقع اللہ کا فرشتہ ہی آپ کے پاس وحی لے کر آیا تھا۔ اسی طرح ورقہ بن نوفل بھی مکہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے۔ بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آرہے تھے اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے انھوں نے جب یہ واقعہ سنا تو اسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی بول اٹھے کہ یہ تو وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابل تعجب امر نہ تھا۔

(تفہیم القرآن جلد ششم، دیباچہ سورۂ علق)

صورتِ واقعہ کا تجزیہ

نزولِ وحی کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اچانک اس صورت حال سے سابقہ پیش آیا تھا۔ آپ کو اس سے پہلے کبھی یہ گمان بھی نہ گذرا تھا کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ نہ اس کی کوئی خواہش آپ کے دل کے کسی گوشہ میں موجود تھی، نہ اس کے لئے کوئی تیاری آپ پہلے سے کر رہے تھے اور نہ اس کے متوقع تھے کہ ایک فرشتہ اوپر سے پیغام لے کر آئیگا آپ خلوت میں بیٹھ بیٹھ کر مراقبہ اور عبادت ضرور کرتے تھے، لیکن نبی بنائے جانے کا کوئی تصور آپ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ اس حالت میں جب یکایک غار حرا کی اس تنہائی میں فرشتہ آیا تو آپ کے اوپر اس پہلے عظیم اور غیر معمولی تجربے سے وہی گھبراہٹ طاری ہوئی جو لامحالہ ایسے حالات میں ایک بشر پر طاری ہونی چاہئے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کیسا ہی عظیم الشان بشر ہو۔ یہ گھبراہٹ بسیط نہیں بلکہ مرکب نوعیت کی تھی طرح طرح کے سوالات حضورؐ کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے جنھوں نے طبع مبارک کو سخت خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیا واقعی میں نبی ہی بنایا گیا ہوں؟ کہیں مجھے سخت آزمائش میں تو نہیں ڈال دیا گیا ہے؟ یہ بار عظیم آخر میں کیسے اٹھاؤں گا؟ لوگوں سے کیسے کہوں کہ میں خدا کی طرف سے نبی مقرر ہوا ہوں! لوگ میری بات کیسے مان لیں گے؟ آج تک جس معاشرے میں عزت کے ساتھ رہا ہوں، اب لوگ میرا مذاق اڑائیں گے اور مجھے دیوانہ

لہ بے نظیر شخصیت کے مالک ہونے پر بھی وہ ذات عجب و خود پسندی سے اس درجہ خالی تھی کہ جب آپ نبوت کے منصب عظیم پر یکایک مامور کر دیئے گئے اس وقت بھی کافی دیر تک آپ کو یہ اطمینان نہ ہوتا تھا کہ دنیا کے کروڑوں انسانوں میں سے تنہا ایک میں ہی اس قابل ہوں کہ اس منصب کے لئے رب کائنات کی نگاہ انتخاب میرے اوپر پڑے (رسائل و مسائل، حصہ سوم ص ۲۳۳)

کہیں گے۔ اس جاہلیت کے ماحول سے آخر میں کیسے نکلوں گا
غرض اس طرح کے نہ معلوم کتنے سوالات ہوں گے جو آپ کو
پریشان کر رہے ہوں گے۔

پہلی وحی پر ردِّ عمل

اسی وجہ سے جب آپ گھر پہنچے تو کانپ رہے تھے جاتے ہی فرمایا کہ "مجھے اڑھا دو، مجھے اڑھا دو" گھر والوں نے آپ کو اڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا دل ٹھیرا تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سارا واقعہ سنایا اور فرمایا:۔

لَقَدْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ	مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے

انھوں نے آپ کو اطمینان دلایا کہ :۔

کلا واللہ ما یخزیك	ہرگز نہیں، خدا کی قسم! آپ
اللہ ابدًا۔ انك	کو اللہ کبھی رنج نہیں دے گا
لتصل الرحم	آپ تو رشتہ داروں کے
وتصدق الحدیث	کام آتے ہیں، سچ بولتے ہیں
وتحمل الکل	بیکسوں کی مدد کرتے ہیں
وتکسب المعدوم	نادار کی دستگیری کرتے ہیں
وتقری الضیف	مہمان کی تواضع کرتے ہیں
وتعین علی نوائب	اور تمام نیک کاموں میں
الحق۔	ہاتھ بٹاتے ہیں۔

پھر وہ ورقہ بن نوفل کے پاس آپ کو لے گئیں کیونکہ وہ اہل کتاب میں سے تھے اور انبیائے سابقین کے حالات سے باخبر تھے۔ انھوں نے حضورؐ سے کیفیت سن کر بلا تامل تصدیق کی کہ "یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر آیا تھا" اس لئے کہ وہ بچپن سے جوانی تک آپ کی انتہائی پاکیزہ سیرت سے خوب واقف تھے، اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہاں پہلے سے نبوّت کے دعوے کی کسی تیاری کا شائبہ تک نہیں پایا گیا ہے ان دونوں باتوں کو انھوں نے اس واقعہ سے ملایا کہ یکایک غیب سے ایک ہستی آکر ایسے شخص کو ان حالات میں وہ پیغام دیتی ہے جو تعلیمات انبیاء کے مطابق ہے تو یہ ضرور ہی نبوت ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۲۲۹ تا ۲۳۲)

اگر پہلے سے شوقِ نبوّت ہوتا

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کے فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہئے اور اس انتظار میں مراقبے کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے تو غارِ حرا والا معاملہ پیش آتے ہی آپ خوشی سے اچھل پڑتے اور بڑے دم... دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا اس پر ششدر رہ جاتے ہیں۔ کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں۔ ذرا دل ٹھہرتا ہے تو بیوی کو چپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غارِ حراء کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے، معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے، مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوت کے کسی امیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے؟

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے؟ اگر ان کے تجربے میں پہلے سے یہ بات آئی ہوئی ہوتی کہ میاں نبوّت کے امیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہؓ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی، چلو اب پیری کی دوکان چمکاؤ، میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں لیکن وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں اس کی بنا پر انھیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آ سکتا نہ خدا اس کو کسی بری آزمائش میں ڈال سکتا ہے اور اس نے جو کچھ دیکھا ہے

وہ سراسر حقیقت ہے۔ اور یہی معاملہ ورقہ بن نوفل کا بھی تھا۔ وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضورؐ کی اپنی برادری اور قریب کے رشتے سے برادر نسبتی تھے۔ پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبوّت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنع سے تمیز کر سکتے تھے۔ عمر میں کئی سال بڑے ہونے کی وجہ سے آپ کی پوری زندگی بچپن سے اس وقت تک ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے بھی آپ کی زبان سے حرا کی سرگزشت سنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتا تھا۔ کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادھا انسان بالکل خالی الذہن ہے، نبوت کی فکر میں رہنا تو درکنار، اس کے حصول کا تصور تک اس کے حاشیۂ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے، اور اچانک وہ پورے ہوش و حواس کی حالت میں علانیہ اس تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی چیز نے ان کو دو اور دو چار کی طرح بلا ادنیٰ تأمل اس نتیجے تک پہنچا دیا کہ یہاں کوئی فریب نفس یا شیطانی کرشمہ نہیں ہے بلکہ اس سچے انسان نے اپنے کسی ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے وہ دراصل حقیقت ہی کا مشاہدہ ہے۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے دلیل نبوّت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

(تفہیم القرآن جلد سوم، القصص حاشیہ ۱۰۹)

پہلی وحی کا مضمون

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی جو بھیجی گئی تھی وہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی جس میں صرف یہ فرمایا گیا تھا کہ:-

"پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہ تھا۔"

یہ نزولِ وحی کا پہلا تجربہ تھا جو اچانک حضورؐ کو پیش آیا تھا۔ اس پیغام میں آپ کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آپ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں۔ اور آگے کیا کچھ آپؐ کو کرنا ہے بلکہ ایک ابتدائی تعارف کرا کے آپ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ آپ کی طبیعت پر جو شدید بار اس پہلے تجربہ سے پڑا ہے اس کا اثر دور ہو جائے اور آپ ذہنی طور پر آئندہ وحی وصول کرنے اور نبوت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔[1]

(تفہیم القرآن جلد ششم۔ دیباچہ سورۂ مدثر)

یہ پہلی وحی جو حضور پر نازل ہوئی اس کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے:-

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ (العلق آیت ۱) — پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا

فرشتے نے جب حضورؐ سے کہا کہ پڑھو! تو حضورؐ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے یہ الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیے تھے اور انھیں پڑھنے کے لیے کہا تھا کیونکہ اگر فرشتے کی بات کا مطلب یہ ہوتا کہ جس طرح میں بولتا ہوں آپؐ اسی طرح پڑھتے جائیں تو حضور کو یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔[2]

[1] [illegible] سورۂ یونس کی آیت قل لو شاء اللہ ما تلوتہ علیکم نیز سورۂ شوریٰ کی آیت ما کنت تدری ما الکتٰب ولا الایمان [illegible] - مرتب۔

[2] [illegible] دیباچہ [illegible] وحی [illegible] شروع ہوا [illegible] کی ابتدائی سات آیتیں نازل کی گئیں اور ان میں پہلا [illegible] آپ کو حکم [illegible] اپنے [illegible] کے انجام [illegible] وہ چل رہی ہے اس سلسلہ میں تفصیل [illegible] سیرت [illegible] جبرئیل [illegible] حضورؐ کے سامنے پیش کی [illegible]

اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھو" یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھو، یا بالفاظ دیگر بسم اللہ کہو اور پڑھو۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وحی کے آنے سے پہلے ہی صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے۔ ..... اسی لیے یہ کہنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آپ کا رب کون ہے۔ بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنے رب کا نام لے کر پڑھو۔

"جس نے پیدا کیا" یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اس نے کس کو پیدا کیا۔ اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ اس رب کا نام لے کر پڑھو جو خالق ہے۔ جس نے ساری کائنات کو اور اس کی ہر چیز کو پیدا کیا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ — جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔
(آیت-۲)

کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس حقیر حالت سے اس کی تخلیق کی ابتدا کر کے اسے پورا انسان بنایا۔ عَلَقٌ، جمع ہے عَلَقَہ کی جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں۔ یہ وہ ابتدائی حالت ہے جو استقرار حمل کے بعد پہلے چند دنوں میں رونما ہوتی ہے، پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے بعد بتدریج اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ — پڑھو! اور تمہارا رب بڑا کریم
الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ — ہے جس نے قلم کے ذریعے
(آیات ۳-۴) — علم سکھایا۔

یعنی یہ اس کا انتہائی کرم ہے کہ اس حقیر ترین حالت سے ابتدا کر کے اس نے انسان کو صاحب علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے، اور صرف صاحب علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقی اور نسلاً بعد نسلٍ اس کے بقاء اور تحفظ کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی اور اسے نشو و نما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ — انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔
(آیت-۵)

یعنی انسان اصل میں بالکل بے علم تھا، اسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اللہ کے دینے سے حاصل ہوا۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے وہ اسی پر کھلتے چلے گئے۔ یہی بات ہے جو آیت الکرسی میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ:۔

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ" — اور لوگ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو وہ خود چاہے۔
(البقرہ - ۲۵۵)

جن چیزوں کو بھی انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے، درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ ہی نے جب چاہا ان کا علم اسے دیا بغیر اس کے کہ انسان یہ محسوس کرتا کہ یہ علم اللہ اسے دے رہا ہے۔

یہاں تک وہ آیات ہیں جو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رض کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ پہلا تجربہ اتنا سخت تھا کہ حضورؐ اس سے زیادہ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس وقت صرف یہ بتلانے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ رب جس کو آپ پہلے سے جانتے اور مانتے ہیں۔ آپ سے براہ راست مخاطب ہے۔ اس کی طرف سے آپ پر وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے اور آپ کو اس نے اپنا نبی بنا لیا ہے۔ اس کے ایک مدت بعد سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں آپ کو بتایا گیا کہ نبوت پر مامور ہونے کے بعد اب آپ کو کام کیا کرنا ہے۔ (تفہیم القرآن جلد ششم، العلق، حواشی ۱ تا ۲)

۱؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، [illegible]، آیت ۵ حواشی ۵ تا ۷، ۲؎ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد ششم، دیباچہ المدثر)

(جاری)

حسن احسن صدیقی

تجلی کی ڈاک

علم غیب

سوال :- از سید حسین صاحب۔ ورنگل

دو روز قبل شہر بھالکوٹ میں سیرت النبیؐ کا عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں زبردست ہنگامہ برپا ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مسلمان پروفیسر نے علم غیب پر تقریر کرتے ہوئے دوران تقریر میں فرمایا کہ:

"جو شخص یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب حاصل نہیں تھا وہ ابوجہل ہے۔"

اس کے بعد دوسرے مقرر ڈاکٹر حسام الدین صاحب نے تقریر کی اور انہوں نے اطاعت رسولؐ کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"اسلام کی تعلیمات بہت سیدھی سادی تعلیم ہے۔ کوئی ایسا فلسفہ نہیں جسے سمجھنے کے لیے منطقیں [illegible]"

اس بات کو چند شرپسندوں نے تنقید سمجھا اور ہنگامہ [illegible] بالآخر جلسہ برخواست کرنا پڑا۔ [illegible] یہ ہے کہ حضورؐ کو علم غیب حاصل تھا یا نہیں۔ امید ہے کہ جواب ضرور دیں گے۔

جواب :-

یہ مسلمانوں کی بدنصیبی ہے کہ وہ موجودہ دور میں [illegible] دوسرے کی پگڑی اچھالنے، ایک دوسرے کی گردن مارنے، ایک دوسرے کو ذلیل و رسوا کرنے کی فکر میں لگے ہوئے [illegible] جو طاقت کفر و الحاد اور شرک و نفاق اور دشمنان [illegible] شکست دینے کے لیے استعمال کی جانی چاہیے تھی وہ آپس [illegible] ایک دوسرے کو رسوا اور ذلیل و ناکارہ کرنے میں لگ [illegible] جلسہ گاہیں، خانقاہیں، مسجدیں، مدرسے [illegible] ہیں جہاں [illegible] [illegible]

بھی ہوتا ہے۔

ایک مدت سے علم غیب کا مسئلہ اختلاف اور کشاکشی کا باعث بنا ہوا ہے۔ ایک طبقہ کا خیال یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے۔ انھیں دنیا کی تمام حاضر و غائب چیزوں کا علم حاصل تھا۔ کائنات کی تمام کلیات و جزئیات ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا کرتی تھیں۔

دوسرے طبقہ کا خیال و عقیدہ بالکل اس کے برعکس ہے اس کی رائے یہ ہے کہ عالم الغیب صرف خدا کی ذات ہے اور اس ذات کے علاوہ کوئی ذات ایسی نہیں ہے جسے جملہ اشیاء کا علم حاصل ہو، اور کوئی وجود ایسا نہیں ہے جسے عالم الغیب سمجھنا مبنی بر واقعہ ہو۔

قرآن و احادیث پر گہری نظر ڈالنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ثانی الذکر طبقہ کا خیال و عقیدہ زیادہ مضبوط و مستحکم ہے۔ اگرچہ اول الذکر طبقہ کے پاس بھی کچھ دلائل و براہین موجود ہیں۔ لیکن یہ دلائل و براہین تار ہائے عنکبوت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

یہ کھوسٹے تنکوں کی مانند اتنے بے قدر و قیمت ہیں کہ کوئی باشعور آدمی ان پر نظر التفات بھی نہیں ڈال سکتا چہ جائیکہ انھیں حاصل علم سمجھ کر با آواز بلند اس بات کا دعویٰ کر بیٹھے کہ حضورؐ مغیبات سے اس طرح واقف تھے جس طرح خدا واقف ہے۔

یہ بات ہم دیوبندی بھی مانتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام مخلوقات اور تمام انبیاء و رسل سے کہیں زیادہ وسیع اور بے کراں تھا۔ بلکہ تمام مخلوقات کی حیثیت آنحضورؐ کے علم کے سامنے بالکل ایسی ہی تھی جیسے سمندر کے سامنے ایک قطرۂ بے مقدار۔ ہمارے نزدیک بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بہ اعتبار علم دنیا کے تمام جاننے والوں سے بلند و فائق ہیں۔ ہمارا بھی عقیدہ یہی ہے کہ جتنا علم آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے پیغمبر کو نصیب نہیں ہوا ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور خاص کچھ ایسی مغیبات کا علم بھی عطا کر دیا گیا تھا کہ دوسرے انسانوں کو جن کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

لیکن ہم بریلوی حضرات کی طرح یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام مغیبات پر حاوی تھا اور وہ بالکل اسی طرح عالم الغیب تھے جس طرح خدا عالم الغیب ہے۔ یہ سمجھئے کہ اختلاف دو چیزوں میں ہے۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام غیب کی باتوں کا علم حاصل تھا یا کچھ باتوں کا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض باتوں کا یہ علم غیب ذاتی تھا یا خدا کا عطا کردہ؟

بریلوی حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام غیب کی باتوں کا ادراک حاصل تھا۔ ساری کائنات اور کائنات کے پس منظر کی تمام چیزیں ہر وقت ان کے سامنے جلوہ گر رہا کرتی تھیں۔ ان ہی حضرات کا دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ حضورؐ کو جو علم حاصل تھا۔ وہ ان کا ذاتی تھا نہ کہ عطائی۔

ہم دیوبندیوں کی رائے اور عقیدہ یہ ہے کہ خدا کے ماسوا کوئی ہستی دنیا میں ایسی نہ آئی اور نہ آئے گی جو جملہ مغیبات کا علم رکھتی ہو اور یہ علم خود بخود اس کی ذات میں موجود ہو کسی کا بخشا ہوا نہ ہو۔

خاتم النبیین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض چیزوں کا علم غیب حاصل تھا اس کا منکر کوئی نہیں۔ اس پر سب متفق ہیں۔ سب کی مشترکہ رائے یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض ایسی باتیں کھول دی گئی تھیں جنھیں پیشانی پر لگی ہوئی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

لیکن بریلوی علماء کا دعویٰ یہ ہے کہ حضورؐ کو تمام کلیات و جزئیات کا علم حاصل تھا اور یہ علم خدا کا عطا کردہ بھی نہیں تھا بلکہ جس طرح خدا کی ذات خود بخود عالم الغیب ہے اسی طرح حضورؐ کی ذات بھی بذات خود علم غیب سے بہرہ ور تھی اور اس بارے میں خدا کا ان پر کوئی احسان نہیں تھا۔

بریلوی حضرات جوشِ عقیدت میں خدا کی توہین کرکے ایسے صریح جرم کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں کہ اگر خدا رحم و کرم سے کام نہ لے تو قیامت کے میدان میں ان حضرات کو زبردست خسارہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کسی رسول کو کسی بھی اعتبار سے

اتنا بڑھا دینا کہ وہ مقام خداوندی تک پہونچ جائے. خدا کی توہین نہیں تو پھر کیا ہے۔ عالم الغیب ہونا خدا کے لیے مختص ہے کسی دوسری ہستی کو عالم الغیب سمجھنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم اسے ایک اعتبار سے خدا کا ہمسر قرار دے رہے ہیں اور یہ حرکت شرک فی الصفات کے دائرے میں آتی ہے جو حساب کتاب کے دن یقیناً موجب عتاب ہوگی۔

قرآن کی ان گنت آیات ہمارے عقیدے کی تائید کرتی ہیں لیکن ہم بطور ثبوت صرف چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

سورۂ انعام میں یوں ارشاد فرمایا گیا:-

قُلْ لَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ　　اے محمد کہدیجیے کہ میں تم سے
خَزَائِنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ　　یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے
الْغَيْبَ۔　　خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں

اس آیت میں حق تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دو چیزوں کی نفی کرائی ہے۔ ایک تو یہ کہ میرے قبضہ میں دنیا کے خزانے نہیں ہیں اس لیے مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ میں جس چاہے انسان کی جھولی بھر دوں اور دوسرے یہ کہ مجھے غیب کی باتوں کا علم نہیں کہ میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہہ سکوں۔

کفار و مشرکین آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار معجزات طلب کیا کرتے تھے حضور صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے بھروسہ پر ان سے وعدہ فرما لیتے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا کہ انھیں اللہ کے عذاب سے ڈرا دیتے کہ دیکھو اگر تم نے سرکشی و سرتابی کی راہوں کو ترک نہیں کیا تو خدا کا عتاب تم پر نازل ہو جائے گا اور تم پچھلی سرکش قوموں کی طرح منٹوں سکنڈوں میں خاک کا پیوند بن جاؤ گے۔ اس وقت کفار و مشرکین کی طرف سے یہ سوال سر ابھارا کرتا تھا کہ وہ معجزات کب ظہور پذیر ہوں گے، یا وہ عذاب کب ہمارے سروں پر منڈلائے گا جس کی تم بشارت سنا رہے ہو۔ اسی طرح کے ایک موقعہ پر حق تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ بات کہلوائی:

قُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ　　تم کہدو کہ غیب کا علم تو اللہ کو ہے

فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ　　میں تمہارے ساتھ انتظار
مِنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ۔　　کرنے والوں میں ہوں۔

(یونس)

یعنی جس طرح تم لوگ خدا کی طرف سے نازل ہونے والی آیات کا انتظار کر رہے ہو اسی طرح میں بھی اس کی طرف سے آنے والی نشانیوں کا منتظر ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ نشانیاں کس دن اور کس وقت نازل ہوں گی۔ یہ نازل بھی ہوں گی کہ نہیں لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں بھی پوچھ تاچھ کرتے رہتے تھے کہ آیا کب آئے گی۔ اس بارے میں حق تعالیٰ نے حضور کو یہ بات کہدینے کی تلقین کی۔ قرآن ہی کے الفاظ میں سنیے:-

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ　　وہ آپ سے قیامت کے آنے
اَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا　　کی گھڑی معلوم کرتے ہیں کہدو
عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ۔　　کہ اس کا علم صرف میرے رب
(اعراف)　　کے پاس ہے۔

ان آیات سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عالم الغیب صرف خدا کی ذات ہے اور خدا کے علاوہ روئے زمین پر کوئی ہستی ایسی نہیں گذری جسے عالم الغیب کہنا اور سمجھنا مبنی بر صداقت ہو۔ اسی بات کو قرآن حکیم نے اپنے خاص انداز میں یوں بیان فرمایا ہے:-

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي　　اے محمد کہدو کہ زمین و آسمان
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ　　میں خدا کے سوا کوئی بھی ایسی
الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔　　ہستی نہیں کہ جسے غیب کی باتوں
(نمل)　　پر اطلاع ہو۔

اسی طرح اور بہت سی آیات پیش کی جا سکتی ہیں جن سے صاف طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام چیزوں کا علم غیب صرف اور صرف خدا ہی کو حاصل ہے۔ خدا کے ماسوا کوئی ذات کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جسے زمین و آسمان کی جملہ مغیبات کا علم ہو۔ رہی یہ بات کہ بعض انبیاء کو بعض غیب کی چیزوں کا علم حاصل تھا تو اسے دیوبندی حضرات بھی مانتے ہیں بلکہ شاید ہی کوئی ایسی جماعت ہو جو اس حقیقت کا انکار کرنے کی جسارت کر سکے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی بھی سلسلہ میں علم غیب کی دولت حاصل نہیں تھی۔ یا اسے

آنحضورؐ کو بعض چیزوں کے بارے میں وقت سے پہلے اطلاعات دیدی جاتی تھیں۔ کبھی وحی کے ذریعہ کبھی کشف کے ذریعہ کبھی کسی اور ذریعے سے۔ کبھی حضورؐ خود بھی اپنی پیغمبرانہ فراست سے بعض ہونے والے حقائق کا اندازہ لگا لیا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ دنیا کے مدبر و ذہین لوگ کچھ حالات و واقعات کا مشاہدہ کر کے مستقبل میں ہونے والی کتنی ہی باتوں کا ادراک کر لیا کرتے ہیں اسی ادراک کو دنیا پیش گوئی کا نام دیتی آئی ہے۔ جب ان پیش گوئیوں کو کبھی کسی نے علم غیب سے تعبیر کرنے کی جسارت نہیں کی تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدبرانہ پیش گوئیوں کو علم غیب سے موسوم کرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔

رہا یہ بات کہ حضورؐ کا علم غیب ذاتی تھا یا عطائی تو اس بارے میں ہمیشہ سے ہماری ایک ہی رائے ہے کہ حضورؐ کو جو کچھ علم غیب حاصل تھا وہ ذاتی نہیں تھا بلکہ خدا کا عطا کردہ تھا۔ اگر ذاتی ہوتا تو نبوت سے پہلے اس کے شواہدات ظہور میں آتے لیکن سیرت و تاریخ کا ایک معمولی سا طالب علم بھی اس حقیقت سے با خبر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جتنی غیب کی باتوں پر اطلاع بخشی ہے وہ نبوت کے بعد بخشی ہے نبوت سے پہلے کوئی واقعہ ایسا نظر نہیں آتا جس میں حضورؐ نے مستقبل میں پیش آنے والے کسی واقعہ کی نشاندہی کی ہو۔ اگر حضورؐ کا علم ذاتی ہوتا تو بچپن اور لڑکپن میں اس کے اثرات و مظاہر دیکھنے میں آتے: بچپن ہی سے ہی ایسے عجیب ظہور پذیر ہوتے رہتے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ محمد کوئی معمولی انسان نہیں بلکہ کوئی بڑی اور غیر معمولی ہستی ہے، کوئی عظیم المرتبت انسان ہے۔ لیکن بچپن میں کوئی مثال ایسی نظر نہیں آتی جس کا سہارا لے کر یہ ثابت کیا جاسکے کہ دیکھو یوم پیدائش ہی سے حضورؐ دنیا بھر کی تمام اشیاء سے واقف تھے کوئی حقیقت ان سے پوشیدہ نہیں تھی۔ نبوت کے بعد حضورؐ کے علم و ادراک کا ظاہر ہونا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ علم خدا نے عطا کیا ہے اگر ذاتی ہوتا تو یوم ولادت ہی سے آپ کی ذات میں موجود رہتا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اگر بچپن میں علم و ادراک کی دولت سے بہرہ ور ہوتے تو غار حرا میں جبرئیل کی آمد پر پریشان ہو جانے اور حضرت خدیجہؓ سے صورت حال بیان کرتے ہوئے غیر معمولی گھبراہٹ کا اظہار کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ جبرئیل کے آنے کا مقصد نہ سمجھنا خود یہ ثابت کرتا ہے کہ حضور خود اپنی ذات کے بارے میں بھی بے خبر تھے کہ میں کون ہوں اور مستقبل میں مجھے کتنا بڑا مرتبہ ملنے والا ہے۔ قرآن کی آیت سے بھی واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض مخصوص چیزوں کا علم غیب بعض انبیاء کو باری تعالیٰ خود حق تعالیٰ نے عطا کیا ہے یہ نہیں ہوا کہ کوئی نبی یا کوئی رسول دنیا کے ظاہر میں آتے ہی علم و واقفیت کے خزانے اپنے ساتھ لایا ہو اور شعور پاتے ہی اس نے علم کے دریا بہانے شروع کر دیے ہوں۔

قرآن کی یہ آیت ملاحظہ فرمائیے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ	اور یہ ضروری نہیں کہ اللہ تمہیں
عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ	غیب کی باتوں کی اطلاع
اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ	دے لیکن وہ اپنے پیغمبروں
رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۔	میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔

٭ ٭ ٭

آیت قرآنی کے الفاظ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند قدوس بعض مخصوص چیزوں کا علم خود اپنے بعض مخصوص انبیاء ہی کو عطا کیا کرتے تھے۔ تمام انبیاء کو علم غیب سے نوازنا کوئی ضروری نہیں تھا بلکہ اپنے پیغمبروں میں سے وہ جس کو اہل سمجھتے اس کو عمیق، مخفی اور پوشیدہ باتوں کا علم بخش دیا کرتے تھے۔ قرآن کی اور دوسری آیتوں سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمین و آسمان میں جتنی بھی ہستیاں ہیں یا موجود تھیں ان میں سے کسی بھی ہستی کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا علم ذاتی علم ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جسے جو کچھ علم حاصل ہے کم یا زیادہ وہ اللہ ہی کی دین ہے، اللہ ہی کی عطا ہے۔

ان آیات کے ہوتے ہوئے بھی کسی رسول کے بارے میں یہ خوش فہمی اور ہٹ دھرمی کہ یہ عالم الغیب ہے اور اس کا علم غیب علم خداوندی کی طرح ذاتی ہے کسی کا عطا کردہ نہیں انتہائی درجہ کی ضلالت اور گمراہی ہے جسے بدعت و شرک کا معکوس قرار دیے بغیر چارہ نہیں۔

ڈاکٹر حسام الدین صاحب نے اپنی تقریر میں جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ بالکل بجا اور درست ہے۔ اس بات کو

تنقید و فتنہ سمجھ کر ہنگامہ برپا کر دینا اس بات کی کھلی علامت ہے کہ ہنگامہ اور غل غپاڑا کرنے والی ٹیم سنجیدگی و متانت سے عاری ہونے کے ساتھ عقل سلیم سے بھی کلیۃً محروم تھی اور اس میں اتنی اہلیت ہی نہیں تھی کہ کسی سیدھی سادی بات کی گہرائی تک پہونچ سکے۔

چندے کا حج اور مجاور کی امامت

سوال [۱] :- از :- جناب نجیم الدین شحنہ۔ یادگیر

ہماری مقامی مسجد کے امام جو ایک عدد درگاہ کے مجاور بھی ہیں بڑی تگ و دو کے بعد مختلف مقامات سے چندہ جمع کر کے حج کر آئے ہیں۔ واپسی پر ان کا جلوس ریلوے اسٹیشن سے نکالا گیا اور اس کا اختتام درگاہ پر جا کر ہوا۔ ایک مدت سے ان کی امامت پر یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ مجاور کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ اب جب کہ وہ حج سے فارغ ہو کر آئے ہیں اب بھی وہ اپنے پیشۂ مجاوری پر قائم ہیں کیونکہ درگاہ سے انھیں اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اب مسجد کے مقتدی بھی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ان کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے اور امام اپنے فعل کا آپ ذمہ دار ہے دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مجاور کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ آپ سے ہم اور دیگر احباب اس بارے میں تجلّی کے ذریعہ واضح جواب چاہتے ہیں کیونکہ ایسی ہی صورت حال اطراف و اکناف کی چند مساجد میں بھی پائی جاتی ہے۔ دوسری دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا حج کے لیے چندہ کرنا درست ہے۔

جواب [۲] :-

حج صرف ان حضرات پر فرض ہے جو صاحب استطاعت ہوں۔ صاحب استطاعت سے مراد وہ مسلمان ہیں جن کے پاس سفر خرچ موجود ہونے کے ساتھ ساتھ اتنا پیسہ یا کوئی ایسا کاروبار موجود ہو جو ان کی غیر موجودگی میں ان کے بیوی بچوں اور ان کے ماتحت حضرات کی کفالت کر سکے۔ اتنی استطاعت اگر حاصل نہ ہو تو شریعت کی طرف سے حج کی فرضیت عائد نہیں ہوتی۔ لہٰذا قیامت کے دن بازپرس کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

جو شخص صاحب استطاعت نہ ہوتے ہوئے بھی حج کرنے کے غم میں گھلا جا رہا ہو یا جائز ناجائز طریقے سے پیسہ بٹور کر حج کی تیاری میں لگا ہوا ہو وہ خوشنودیٔ پروردگار کا متلاشی نہیں بلکہ محض سیر سپاٹے کے لیے حج کی تیاری میں منہمک ہے۔ اگر مقصود خدا کی رضا جوئی ہوتا تو پھر اس کے حکم سے سرمو سرتابی کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا قرآن حکیم میں جب صراحتاً یہ فرما دیا گیا ہے کہ حج ان ہی حضرات پر فرض ہے جو استطاعت و اہلیت کے حامل ہوں تو پھر بعض لوگوں کا ادھر ادھر سے پیسے اکٹھے کر کے حج کو جانا تفریح اور ہوا پرستی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

حاجیوں کا جلوس نکلنا رسم و رواج اور ریا کاری کے قبیل سے ہے۔ اس سے احتراز کرنا اس طرح ضروری ہے جس طرح دکھاوے کی دوسری عبادات سے محترز رہنے کی زبردست تاکید کی گئی ہے۔ جو اس سے احتراز نہ کریں انھیں مجبوراً ریاکاروں کی فہرست میں شمار کرنا ہی پڑے گا۔

درگاہ کے بارے میں آپ نے تفصیلات پیش نہیں کیں کہ آیا درگاہ پر کس نوعیت کی حرکات ہوتی ہیں۔ اگر صرف فاتحہ خوانی ہوتی ہے تو پھر اس درگاہ کے مجاور کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔

لیکن اگر درگاہ بدعت و شرک کا گہوارہ بنی ہوئی ہے آنے والے خوب سجدے لٹاتے ہیں۔ دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ چلّہ کشی ہوتی ہے، چراغاں کیا جاتا ہے اور یہ سب کچھ امام موصوف کی زیر نگرانی ہو رہا ہے تو پھر ایسے مجاور کے پیچھے نماز ادا کرنا کراہت سے خالی نہیں ہوگا۔

بعض حضرات کا یہ فرمانا کہ نماز ان کے پیچھے بہر حال ہو جاتی ہے، اس لیے کہ امام اپنے افعال کا ذمہ دار ہے انتہائی درجہ کی سادہ لوحی ہے۔ امام کا اگر فسق و فجور ظاہر نہ ہو تو اس کی اقتدا میں خراب ہونے والی نمازوں کا سارا وبال بلاشبہ اس کی

گردن پر رہے گا اور مقتدی حضرات سے کسی قسم کی باز پرس نہیں ہوگی لیکن اگر امام کا فسق وفجور ظاہر و باہر ہو تو پھر مقتدی یہ کہہ کر احتساب آخرت سے نہیں بچ سکیں گے ہم امام کی حرکتوں کے ذمہ دار نہیں جو سزا دینی ہو امام کو دو۔

کسی بھی مسجد کے امام کے بارے میں اگر یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ بدعات وخرافات کا شکار رہے تو اس کے پیچھے بے تکلف نماز ادا کرنے والے لوگ بے احتیاط کہلائیں گے اور اپنی بے احتیاطی کا خمیازہ انھیں بھگتنا پڑے گا۔

ہماری ایک حماقت

سوال :- از طالب حسین زیدی۔ رائچور۔

جنوری وفروری کا تجلی پیش نظر ہے۔ اس میں "حجاب" رامپور پر تبصرہ پڑھتے ہوئے ایک جگہ "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں" پر آپ کا اعتراض نظر سے گذرا تو خیال ہوا کہ اس معاملہ میں آپ کو توجہ دلاؤں۔ غالباً عجلت میں آپ نے مصرعہ میں "آپ" کے مفہوم پر غور نہیں فرمایا ورنہ معلوم ہو جاتا کہ یہاں "آپ" کے ساتھ "ہے" کا استعمال بالکل صحیح ہے یہاں "آپ" خود کے معنوں میں بولا گیا ہے۔ مثلاً "وہ شخص آپ ہی بھلے برے کا ذمہ دار ہے" یا میں آپ ہی یہ کام کروں گا" وغیرہ۔ ویسے آپ واقف ہی ہوں گے کہ یہ مصرعہ ناسخ کا ہے جس کو غالب نے اس طرح استعمال کیا ہے

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

آپ کو خود کے معنوں میں غالب نے ایک اور موقعہ پر اس طرح استعمال کیا ہے۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

جواب :-

یہ پورا شعر کبھی نہ کبھی ہماری نظروں سے گذرا تو ضرور ہوگا لیکن حافظہ کی گرفت میں نہیں تھا اس لیے حجاب کے خاص نمبر پر تبصرہ کرتے وقت ہم سے زبردست غلطی سرزد ہو گئی۔

مغالطہ کھا جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ سائل صاحب نے ایک ہی مصرعہ نقل کیا تھا اگر وہ پورا شعر نقل کر دیتے تو شاید اتنی بڑی غلطی سرزد ہونے نہ پاتی کہ جسے حماقت کے ماسوا کوئی دوسرا نام دینا روا نہیں ہوگا۔

بہرحال ہم کھلے الفاظ میں اپنی حماقت کا اعتراف کرتے ہیں اور سائل صاحب سے معافی کے خواستگار ہیں۔ جن حضرات نے ہمارے تبصرہ کو پڑھا ہے ان حضرات کی نگاہوں سے اگر ہماری یہ تحریر بھی گزر جائے تو ہمارے لیے باعث طمانیت ہوگا۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری غلط بیانی کی وجہ سے کسی کے ذہن میں کوئی غلط بات متمکن ہو کر رہ جائے۔

شکرانے کے کھانے میں ہندوؤں کی دعوت

سوال ۳ :- از وحید چودھری گل برگہ۔

میں اپنے کھیت میں باولی کھدوائی ہے۔ اب کھدائی کا کام قریب الختم ہے۔ اس دوران بہت سے لوگوں کا اصرار تھا کہ غریبوں کو کھانا کھلاؤں۔ ان کے کہنے پر میں نے غریبوں کو کھانا کھلایا جس میں ہندوؤں کو بھی شریک کیا تھا۔

دریافت طلب بات یہ ہے کہ شکرانے کے طور پر جو کھانا کھلایا جاتا ہے اس میں غیر مسلموں کو شریک کرنے میں کوئی حرج تو نہیں۔

الجواب ۳ :-

شکرانے کے طور پر جو کھانا کھلایا جاتا ہے اس میں ترجیح تو غریب مسلمانوں ہی کو دینی چاہئے لیکن غیر مسلموں کو مدعو کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

امانت میں خیانت کا ایک مسئلہ

سوال ۴ :- از :- غلام حسن۔ لون۔ کشمیر

الف اپنا کچھ سرمایہ ب کے پاس امانت رکھتا ہے، ب ا کی علمیت کے بغیر یہ رقم د کو تجارت کے لیے دیتا ہے اور (د) اس سے کچھ نفع کما لیتا ہے (ا) کے مانگنے پر (ب) ا کو اپنی رقم واپس کر دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ (ب) نے آ کی خیانت تو نہیں کی جب کہ مطالبہ کے وقت (ب) نے (الف) کو امانت میں رکھی ہوئی کل رقم واپس کر دی ہو۔

الجواب:۔

اگر امانت رکھواتے وقت (الف) نے (ب) کو اس بات کی اجازت دیدی تھی کہ تم میری رقم کو اپنی ضروریات اور اپنے کاروبار میں خرچ کر سکتے ہو۔ تو پھر (ب) کے لیے اس رقم کا استعمال منجملہ تقصیر نہیں لیکن اگر (الف) نے امانت رکھواتے وقت اس قسم کی اجازت نہیں دی تو پھر خیانت ہی کہلائے گی کہ (ب) الف کی رقم کو کسی کاروبار میں لگا دے۔

سوال یہ نہیں کہ ب مطالبہ کے وقت الف کی پائی پائی ادا کر دیتا ہے یا نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ ب نے الف کی اجازت کے بغیر اس کی رقم کو کسی بھی تجارت یا ضرورت میں لگانے کی جرأت کیسے کی۔ خیانت صرف اسی کو نہیں کہتے کہ امین رقم کا کچھ حصہ ہڑپ کرے اور مطالبہ کے وقت پوری رقم واپس نہ کرے بلکہ خیانت یہ بھی ہے کہ جو چیز رکھوائی جائے بعینہ وہ چیز نہ لوٹائی بلکہ اسی قیمت یا مالیت کی دوسری چیز دیکر پیچھا چھڑا لیا جائے۔ مثال کے طور پر الف نے ب کے پاس سَو کا بندھا ہوا نوٹ رکھوایا تھا اور اس نوٹ پر اس کے دستخط بھی موجود تھے۔ کچھ دن کے بعد الف اپنا رکھوایا ہوا نوٹ طلب کرتا ہے تو ب کے لیے ضروری ہے کہ وہ وہی سَو کا نوٹ واپس کرے جو الف نے بطور امانت و حفاظت اس کے پاس رکھوایا تھا۔ ایک ایک کے سو نوٹ دینا یا دوسرا سَو کا نوٹ دینا درست نہیں ہوگا۔

بعینہٖ اسی چیز کو لوٹانے کی تاکید اس لیے کی گئی تاکہ امانت کے سلسلہ میں لوگ نہایت درجہ کی احتیاط برتیں۔

یہ تاکید نہ کی جاتی تو عموماً لوگ امانت کو یہ سوچ کر اپنے ذاتی ضروریات میں خرچ کر لیا کرتے کہ مطالبہ کے وقت رقم مہیا کر کے لوٹا دیں گے اس وقت تو خرچ کر ہی ڈالو۔

نتیجۃً یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وقت آنے پر وہ رقم لوٹانے پر قادر نہ ہوں اور جس شخص نے امانت رکھوائی تھی اسے بروقت اپنی رقم حاصل نہ ہو سکے۔ بعینہٖ اور بجنسہٖ وہی واپس کر دینے کی شرط سے ایک سبق اور بھی ملتا ہے اور وہ یہ کہ قیمت اور مقدار قیمت کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی اہمیت کسی چیز کی ہوا کرتی ہے بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی دگنی قیمت دیکر بھی مالک کو خوش نہیں کیا جا سکتا مثال کے طور پر زید نے امانت میں رکھی ہوئی گھڑی دو سو روپے میں خریدی تھی اور عام مارکیٹ میں بھی اس کی قیمت دو سو روپے ہے۔ زید کچھ عرصہ کے بعد بکر سے اپنی گھڑی طلب کرتا ہے تو بکر گھڑی دینے کے بجائے دو سو روپے پکڑا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ گھڑی میں نے رکھ لی یا کسی کو فروخت کر دی تو کیا بکر کی یہ حرکت خیانت پر محمول نہیں کی جائے گی!

اور اگر اسے خیانت پر محمول کریں گے اور لازماً کریں گے تو پھر یہ کیسے درست ہو گا کہ پیسوں اور روپوں کے سلسلہ میں ان کی جنس اور ان کی نوع کو بدل دینا خیانت نہ کہلائے۔

ب کا یہ رویہ کہ وہ امانت میں رکھی ہوئی رقم کو د کے حوالہ کر دے اور بھی زیادہ قابل گرفت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ د کو اپنی تجارت میں زبردست خسارہ کا سامنا کرنا پڑے اور وہ وعدے کے مطابق رقم لوٹانے سے قاصر رہے اس صورت میں کیا الف کا سرمایہ اکارت نہیں جائے گا اور اس طرح اگر ب عندالطلب الف کا سرمایہ واپس نہ کر سکے تو کیا اسے کھلی خیانت کا نام نہیں دیں گے؟۔

تجارت میں نفع و نقصان دونوں ہی قسم کے پہلو ہوتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ د کو اپنی تجارت میں غیر معمولی فائدہ ہو۔ اس طرح بروقت وہ ب سے لی ہوئی رقم لوٹا دے اور امکان اس بات کا بھی۔ ۔ ۔ ہے کہ د کو اپنی تجارت میں زبردست قسم کا خسارہ برداشت کرنا پڑے اور اس وجہ سے وہ متعینہ تاریخ کو الف سے لیا ہوا روپیہ ادا نہ کر سکے۔ اگر د ہی بروقت نہیں لوٹا سکا تو پھر ب ہی بروقت الف کو رقم کس طرح لوٹا سکے گا۔ اور اس طرح ب خواہ مخواہ خیانت کا الزام اپنے

صورت میں جب کہ اس کا اپنا نفع و نقصان کچھ نہیں۔

امانت رکھوانے والا اگر اپنی مرضی سے اپنی رقم خرچ کرنے کی اجازت دے دے تو بات دوسری ہے ورنہ امانت میں رکھوائی گئی رقم کو کسی بھی ضرورت میں خرچ کرنا یا کسی دوسرے شخص کو بطور قرض دینا جائز نہیں۔

جو لوگ امانت میں رکھی ہوئی رقم کو صاحب امانت کی اجازت کے بغیر خرچ کر ڈالتے ہیں یا کسی کو قرض دیتے ہیں وہ ایک اعتبار سے خائن ہی کہلائیں گے اگرچہ انھوں نے عند الطلب اتنی رقم صاحب امانت کو دے بھی دی ہو جتنی کہ امانتاً رکھوائی گئی تھی۔

سوال :۔ (ایضاً)

ریح خارج ہونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اس صورت میں کیا استنجا کرنا بھی ضروری ہے۔

الجواب :۔

ریح خارج ہونے پر صرف وضو کرنا کافی ہے۔ استنجا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مدارس وغیرہ میں بینک کے سود کا استعمال

سوال :۔ از: مسکین حسین بلوچ۔ اسلام آباد

ہمارے علاقہ میں ایک امام صاحب ہیں۔ جو جامع مسجد میں لوگوں کو نماز پڑھاتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ بینکوں میں جو کسی کا روپیہ جمع ہے اور اس پر سود ملتا ہے۔ وہ سود کی رقم اپنی ذاتی ضروریات میں صرف نہیں کرنی چاہئے اس لیے کہ اس رقم کا استعمال شرعاً ناجائز ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امام صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ یہ سود کی رقم دینی درسگاہوں میں لگائی جا سکتی ہے اور امام صاحب نے یہ بھی کہا کہ یہ رسول صلعم کا ہی فرمان ہے حالانکہ قرآن و حدیث میں تو سود کو حرام ٹھیرایا گیا ہے۔ اور کسی جگہ سود کی رقم کو نیکی کے کاموں پر لگانے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ اب آپ ہی فرمائیے کیا اس امام کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اگر اس امام نے پیغمبر اسلام پر جھوٹ باندھا ہے تو اس امام کی سزا کیا ہوگی۔ یہاں کے عوام اس مسئلہ میں بڑے پریشان ہیں جبکہ امام صاحب بھی اپنی ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس ایک کتاب بھی ہے جو کشمیری علماؤں نے تصنیف کی ہے۔ اس کو بطور دلیل کے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں یہ لکھا گیا ہے کہ سود کا پیسہ دینی کاموں اور طالب علموں پر صرف کیا جا سکتا ہے۔ اب برائے کرم شرعی جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب :۔

یہ بات قطعی طور پر احتیاط و ذمہ داری کے منافی ہے کہ آدمی بغیر کسی تحقیق و تجسس کے جو چاہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دے۔ سبھی جانتے ہیں کہ حضورؐ کی طرف جھوٹی بات منسوب کر دینا بدترین قسم کی غیر ذمہ داری ہے اور اس غیر ذمہ داری سے مسلم معاشرے میں جو فتنے جنم لے رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

بینک کے سود کی رقم کے بارے میں امام موصوف کا یہ ارشاد فرمانا کہ حضورؐ نے اس کو دینی درسگاہوں میں لگانے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ انتہائی درجہ کی بے احتیاطی اور دروغ گوئی ہے۔ کیا حضورؐ کے زمانے میں بینکوں کا سسٹم قائم تھا۔ اگر قائم نہیں تھا اور واقعی قائم نہیں تھا تو پھر امام صاحب کو یہ بات کہنے کی جسارت کیسے ہو گئی کہ حضورؐ نے بینک سے ملی ہوئی رقم کو دینی درسگاہوں میں کھپانے کا اذن عام دے دیا ہے۔ کیا امام صاحب کے کانوں تک حضورؐ کا یہ فرمان نہیں پہونچ سکا ہے کہ جو شخص میری طرف کوئی غلط اور جھوٹی بات منسوب کرے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے؟

اگر حضورؐ کا یہ فرمان آج تک امام موصوف کے کانوں تک پہنچنے کا شرف حاصل نہیں کر سکا ہے تو پھر ان کی لاعلمی اور ناواقفیت پر حیرت کرنی چاہئے۔ اور یہی حیرت اس وقت کچھ طول در طول ہو جائے گی جب امام صاحب مشہور ترین احادیث سے ناواقف ہونے کے باوجود [illegible] نظر آئیں اور اس قسم کے فتوے صادر کریں جو عوام الناس کو الجھن اور خلش کے سوا کچھ دے [illegible]

(نور و ظلمت تجلی)

بریلوی علماء اور مسئلۂ توحید

از: مولانا محمد عارف ندوی
اُستاذ دار العلوم ندوۃ العلماء

اسّی پچاسی برس کی طویل مدت ہوئی پہلے کہ بریلوی علماء نے جماعت دیوبند کو کافر و زندیق ثابت کرنے کی مہم کا بڑے وسیع پیمانے پر اور بڑے زوروں کے ساتھ آغاز کیا تھا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی اس مہم کے سب سے بڑے ذمہ دار ہیں۔ وہ مسلمانوں کو کافر بنانے میں بڑی خصوصیت اور امتیاز کے مالک تھے۔ ادھر علمائے دیوبند نے شروع ہی سے اپنے لیے بطور مستقل یہ اصول بنا لیا ہے کہ بحد امکان وہ بریلوی حضرات کے الزاموں اور کفری فتوؤں کا جواب دیکر مسلمانوں کے باہمی انتشار و افتراق میں اضافہ کا سبب نہیں بنیں گے بلکہ خاموشی کا طریقہ اپنائیں گے اور خاموش رہ کر دین کی خدمت میں لگے رہیں گے۔ چنانچہ وہ اپنے اس فیصلے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے اور آج بھی اس پر قائم ہیں۔ البتہ اتنا انھوں نے ضرور کیا کہ جب کبھی بریلویوں کی تکفیری مہم اپنی تیزی میں انتہا کو جا پہنچی جس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں نوبت جنگ و جدال تک پہونچ گئی تو ایسے نازک وقت میں فتنۂ و فساد کو ختم کرنے کے لیے جماعت دیوبند کے کچھ علماء نے اپنی جماعت پر لگائے ہوئے بے بنیاد الزامات کو حقیقت ظاہر کرنے کیلیے کبھی کبھی مناظرے بھی کیے اور کتابیں اور رسالے بھی لکھے اور اس کو بھی انھوں نے محض اپنی جماعت کے دفاع اور صفائی دینے کی حد تک ہی رکھا۔ بریلویوں پر حملے انھوں نے ایسے مواقع پر بھی نہیں کیے۔ مدتوں سے یہی سلسلہ جاری تھا۔ لیکن ادھر

چند برس سے بریلوی حضرات نے اہل دیوبند کے خلاف ملک میں آندھی اور طوفان کے انداز میں کفر کے فتوؤں کی ایسی مہم چلا رکھی ہے کہ مسلمانوں کی تمام آبادیاں اس سے سخت متأثر ہو گئی ہیں ان کا سکون تاراج ہو گیا ہے اور ہزاروں لاکھوں مسلم گھرانوں میں پھوٹ، انتشار اور عداوتیں پھیل پڑی ہیں، اور آج مسلم قوم کو جن بڑے مسائل کا سامنا ہے ان میں دیوبندیت و بریلویت کا نزاع سب سے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے سے خطوط آ رہے ہیں کہ بریلوی حضرات آپ کی جماعت کو کافر کہتے ہیں۔ ان کو مسجدوں سے نکالتے ہیں اور بات بات پر تو جداری پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ آپ لوگ خاموش ہیں۔ مگر خاموش رہنے سے عام مسلمانوں کی پریشانی ہرگز دور نہیں ہو سکتی ان کا جواب دیجیے، ان کے الزاموں کی اصل حقیقت ظاہر کیجیے تا کہ یہ مصیبت دور ہو۔ بریلویت، دیوبندیت کے اختلاف کو سب سے زیادہ ہوا دینے والی "زلزلہ" نامی کتاب چند برس پہلے بریلویوں کی طرف سے شائع ہوئی تھی جس کا تفصیلی جواب ہم "بریلوی فتنہ کا نیا روپ" کے نام سے کتابی شکل میں دے چکے ہیں۔ اگر بریلوی علماء کا مقصد بات کو سمجھنا ہوتا تو اس کتاب سے ان کے اشکالات ختم ہو گئے ہوتے اور اس کے بعد یہ جھگڑا بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا۔ لیکن ان کی روش بتلاتی ہے کہ وہ فتنہ کو محض فتنے کے ہی لیے اٹھانا چاہتے ہیں۔ کسی قسم کے شک اور شبہ کی بنا پر وہ یہ ہنگامہ برپا نہیں

کر رہے ہیں اور اب [illegible] مسلمانوں کا انتشار حد سے بڑھتا جاتا ہے اس لیے [illegible] پڑا ہے کہ اپنی صفائی دینے کی روش کو چھوڑ کر ہم بریلوی عقائد کی اصلیت اور دین میں انکی [illegible] کی کوششوں کو تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے پیش کریں تاکہ مسلمان ان کی اصلیت سے واقف ہو کر ان کو ان کے [illegible] روز روز کے جنگ وجدال اور فتنہ و فساد سے [illegible] نجات حاصل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کام ہمارے لیے بڑا ہی صبر آزما ہے۔ خصوصًا اسلیے بھی کہ ہمارے بزرگوں نے ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ ہم ابھی لکھ چکے ہیں۔ مگر موجودہ حالات میں ہمکو اس کے علاوہ مسئلہ کا دوسرا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اسی مقصد کے پیش نظر ہم نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ رسالہ تجلی میں یہ سلسلہ مستقل طور پر چلایا جائے۔ کیونکہ تجلی کا اصل مقصد شرک و بدعت کو مٹانا اور توحید وسنت کو فروغ دینا ہے اس لیے میں نے ایڈیٹر تجلی سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھکو تجلی میں لکھنے کی اجازت دیں۔ موصوف نے ازراہِ نوازش وکرم میری [illegible] درخواست کو قبول فرمالیا ہے۔ اب انشاءاللہ تجلی میں ہر ماہ یہ سلسلہ قائم رہے گا۔ بندۂ حقیر کی اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس تحریر کے ذریعہ ہمکو اپنے دین کی صحیح خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور اس کو مسلمانوں کے حق میں نفع بخش بناکر ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ (از عارف)

مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی خالص مشرکانہ ذہن کے آدمی تھے۔ [illegible] مشرکین عرب اور یہود ونصاریٰ کا اس زمانہ میں ان سے بڑا حامی اور وکیل کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا۔ انھوں نے دانستہ یا نادانستہ امت میں شرک پھیلانے کی مہم چلائی تھی۔ وہ انبیاء واولیاء کی مقدس ہستیوں کے بارے میں الوہیت کا وہی عقیدہ رکھتے تھے جو مشرکین عرب اپنے بتوں اور یہود ونصاریٰ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے بارے میں رکھتے تھے۔ [illegible] سبب ہے کہ جب وہ علماء دیوبند اور ان کے اکابر کی کتابوں میں [illegible] کا بیان دیکھتے۔ اور یہ دیکھتے تھے کہ اس میں خدا [illegible] کی الوہیت میں انبیاء و اولیاء کے شریک ہو[illegible] نے انکار کیا ہے اور ان کو بھی اللہ تعالیٰ کا بندہ ثابت کیا ہے تو خاں صاحب بریلوی کے مشرکانہ عقیدہ پر سخت چوٹ پڑتی۔ [illegible] میں آگ لگ جاتی اور وہ غصہ سے بے قابو ہو کر ان بیانات کو انبیاء واولیاء کی سخت توہین قرار دیتے [illegible] لکھنے والوں کو قطعی کافر ومرتد اور جہنمی [illegible]۔

مولانا احمد رضا خاں صاحب کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ ساری دنیا میں بس تنہا وہ اور ان کی جماعت ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کرتے ہیں اور آپ کا مرتبہ بڑھاتے ہیں۔ باقی سب مسلمان جماعتیں انبیاء واولیاء اور خصوصًا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ گھٹاتی اور ان کی توہین کرتی ہیں اور پھر اس دعویٰ کی بنا پر ان کا قطعی اعلان یہ بھی تھا کہ تنہا وہ اور ان کی جماعت ہی مسلمان اور مومن ہیں، باقی سب جماعتیں اور سارے مسلمان کافر ومرتد وزندیق وجہنمی ہیں۔

خاں صاحب بریلوی انبیاء واولیاء خصوصًا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو نرالا، امت سے بالکل جدا اور خالص مشرکانہ عقیدہ رکھتے تھے اس کے لیے انھوں نے ایسا جاذب قلب ونظر عنوان تجویز کیا ہے کہ اگر احتیاط اور غور وفکر سے کام نہ لیا جائے تو پھر ہر مسلمان کہلانے والا بے ساختہ اس کی طرف کھنچ جائے۔ یہ عنوان ہے "تعظیم رسول" صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ ہی سوچئے کون مسلمان اس مقدس ومحترم دعوت کو جس کا عنوان تعظیم رسول ہو قبول کرنے سے انکار کی جرأت کرے گا۔ مگر مولانا احمد رضا خاں صاحب اس حکمت عملی میں استاذی ...... کا درجہ حاصل نہیں کر سکے بلکہ [illegible] اور مقلدیت کا درجہ ہی ان کو نصیب ہو سکا کیونکہ [illegible] عقیدے کو خوبصورت عنوان دینے کی یہ ترکیب ان سے بہت پہلے شیعہ حضرات کو سوجھی تھی۔ جب انھوں نے "محبت اہل بیت" کا عنوان قائم کرکے باقی تمام صحابہ کرام خصوصًا خلفاء راشدین کو کافر ٹھہرانے کی مہم چلائی تھی اور ما[illegible] ترتیب میں

تو مرزا صاحب کی زندگی ہی میں مرزا غلام احمد نے اپنی جھوٹی نبوت کو حق ثابت کرنے کے لیے عظمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عجیب و غریب فلسفہ پیش کیا تھا۔ انھوں نے بڑے زور کے ساتھ کہا تھا کہ علماء اسلام جو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی تھے اور آپ کے بعد کوئی جدید نبی نہیں آسکتا تو یہ علماء اپنے اس اعلان سے ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بھاری توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یہ پیارے مصطفیٰ کی عظمت کو گھٹا رہے ہیں۔ کیونکہ پہلے نبیوں کے فیض سے ان کی امتوں میں نبی ہوتے تھے، پس اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ آپؐ کی امت میں کوئی جدید نبی نہیں آئے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اور نبیوں کا فیض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے بڑھ گیا کہ ان کے فیض سے نبی بن سکتا ہے اور آپ کے فیض سے نہیں بن سکتا اور ایسا اعتقاد رکھنا حضورؐ کی سخت توہین ہے اس لیے ضروری ہے کہ آپؐ کی امت میں نبی کے آنے کو ممکن مانا جائے اور کم از کم ایک نبی آپؐ کے بعد ضرور مبعوث ہو تاکہ عملاً اس کا ثبوت فراہم ہو جائے کہ آپؐ کے فیض سے بنا ہے۔ گویا مرزا صاحب کا نبوت کا دعویٰ اپنے کسی مقصد یا غرض کے لیے نہ تھا بلکہ حضورؐ کا مرتبہ بڑھانے کی فکر میں انھوں نے یہ دعویٰ کیا تھا، اور گویا یہ مرزا صاحب کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی پر احسان تھا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

ٹھیک یہی فلسفہ تعظیم حضورؐ کی ذات کے بارے میں مولانا احمد رضا خاں صاحب بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا بھی یہی ہے کہ اگر ہم پیارے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ عقیدہ رکھیں کہ آپ کائنات کے مالک و مختار نہیں ہیں بلکہ اللہ کی ساری مخلوق کی طرح آپؐ بھی اللہ ہی کے بندے ہیں، تو اس سے پیارے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ بہت گھٹ جائے گا اور اس سے آپ کی بڑی سخت توہین ہو جائے گی ـــــ اس لیے وہ اور ان کی جماعت کے علماء قرآن و حدیث اور امت کے سارے مفسرین و محدثین کے قطعی فیصلوں سے بالکل بے نیاز ہو کر اور ان سے منہ موڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے نام پر آپ کے مالک الملک متصرف کائنات، آسمانوں، زمینوں، جنت و دوزخ اور عرش اعظم کے مالک ہونے کا عقیدہ تجویز کرتے ہیں اور ہر مسلمان کے لیے اس پر اسی طرح ایمان لانا ضروری ٹھیراتے ہیں۔ عقیدے کا یہی جھگڑا ہے جس کو انھوں نے ہندوستان و پاکستان کی تمام مسلم آبادیوں میں پھیلا رکھا ہے۔ جو مسلمان یا جو گروہ اس عقیدے سے انکار کرتا ہے یہ لوگ اسے کافر و جہنمی کے خطاب سے نوازتے ہیں اور اس کو مسلمانوں سے خارج کرتے ہیں۔ ہم مولانا احمد رضا خاں صاحب اور ان کی جماعت کے علماء کے عقائد کا جائزہ لے کر دکھلانے کی کوشش کریں گے کہ یہ حضرات اپنے خود ساختہ عقیدے کی بدولت قرآن و سنت کی بتائی ہوئی حقیقی توحید سے کتنے دور اور مشرکین کے شرک میں ان کے کیسے ہمنوا اور شریک بن گئے ہیں۔

عقیدۂ مذکورہ کے بارے میں بریلوی علماء کے اقوال سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ اسلامی توحید کی حقیقت آپ کے سامنے پیش کر دیں تاکہ اس کو ذہن میں رکھیں اور آپ ان حضرات کے بیانات کا موازنہ کر سکیں اور بآسانی کسی نتیجہ پر پہونچ سکیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا شمار امت کے چیدہ محققین میں ہوتا ہے۔ ہم یہاں توحید و شرک کی حقیقت کے بارے میں شاہ صاحبؒ ہی کی تحقیق ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔ شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

واعلم ان للتوحید اربع مراتب : احداها حصر وجوب الوجود فیہ تعالیٰ فلا یکون غیرہ واجبًا۔ والثانیۃ حصر خلق العرش والسموات والارض وسائر الجواهر فیہ تعالیٰ۔ وهاتان المرتبتان لم تبحث الکتب الالٰهیۃ عنهما ولم یخالف فیهما مشرکو العرب ولا الیهود ولا النصاریٰ بل القرآن العظیم ناصّ علی ان هما من المقدمات المسلمہ عندهم والثالثۃ حصر

تدبیر السمٰوات والارض وما بینھما فیہ تعالیٰ
والرابعۃ انہ لا یستحق غیرہ العبادۃ وھما متشابکتان
متلازمتان لربط طبعی بینھما۔

شاہ صاحب کے اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

"توحید کے چار درجے ہیں۔ ایک درجہ یہ ہے کہ یہ حقیقت مانی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی واجب الوجود نہیں، تنہا وہی واجب الوجود ہے، باقی سب حادث اور مخلوق ہیں۔ دوسرا درجہ توحید کا یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ عرش، آسمان، زمین اور ان کے اندر کی ساری موجودات کا وہی پیدا کرنے والا ہے اور کوئی دوسرا اس کے پیدا کرنے میں اس کا شریک نہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں — (توراۃ، انجیل، زبور، قرآن وغیرہ) میں توحید کے ان دو درجوں کے بارے میں کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب میں سے کسی کو بھی توحید کے ان دونوں درجوں کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں رہا ہے، بلکہ قرآن کی صریح شہادت ہے کہ یہ سب مشرک اور گمراہ فرقے توحید کی ان دونوں حقیقتوں اور دونوں درجوں کو یکساں طور پر مانتے تھے (یعنی یہ سب اس حقیقت کو مانتے رہے ہیں کہ واجب الوجود، زمین و آسمان اور ساری کائنات کی خالق و مالک صرف اللہ کی ہستی ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے"۔

آگے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"تیسرا درجہ توحید کا یہ ہے کہ اس بات کو مانا جائے کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی ساری موجودات یعنی ساری کائنات اور اس کا پورا نظام اور اس کی تدبیر و انتظام صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اور چوتھا درجہ توحید کا یہ ہے کہ یہ بات مانی جائے کہ ہر قسم کی عبادت اور پرستش صرف اللہ کا حق ہے اور اس کے سوا کوئی عبادت اور بندگی کا مستحق نہیں"۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"توحید کے یہ دونوں آخری درجے باہم لازم و ملزوم ہیں، ان کے درمیان فطری اور عقلی رابطہ ہے (کیونکہ آدمی عبادت اور بندگی اس کی کرتا ہے جس کے بارے میں سمجھتا ہے کہ اس کا معاملہ اور بناؤ اور بگاڑ اس کے قبضہ میں ہے)

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:۔

"توحید کے انھیں دو آخری درجوں کے بارے میں مذہبی فرقوں اور گروہوں میں اختلاف رہا ہے (یعنی توحید سے انحراف انہی دو درجوں کے بارے میں غلط عقیدہ قائم کر کے کیا گیا ہے)"۔

آگے شاہ صاحب نے مشرکین کے مشہور تین گروہوں کے شرکیہ عقائد کی کچھ تفصیل فرمائی ہے جن میں ایک فرقہ ستارہ پرستوں کا ہے جو ستاروں کو کائنات میں متصرف مانتے ہیں اور اس تصرف کی بنا پر ان کو عبادت کا مستحق سمجھتے ہیں) دوسرا فرقہ نصاریٰ کا ہے جو مسیح علیہ السلام کو مافوق البشر بلکہ فوق الخلق مانتا ہے اور ان کے معجزات (مُردوں کے زندہ کرنے وغیرہ) کو ان کا فعل اور ان کا تصرف قرار دیتا ہے اور ان کو ابن اللہ اور ثالث ثلثہ کہتا ہے۔ تیسرا فرقہ مشرکین کا ہے، ان کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

والمشرکون وافقوا	اور مشرکین اتنی بات مانتے ہیں
المسلمین فی تدبیر	تو مسلمانوں سے متفق کہ دنیا
الامور العظام وفیما	کے بڑے بڑے معاملات اور
ابرم وجزم ولم یترك	وہ معاملات جن کے بارے
لغیرہ خیرۃ ولم	میں خود اللہ تعالیٰ نے کوئی قطعی
یوافقوھم فی سائر	فیصلہ فرما دیا ہے اور کسی دوسرے
الامور۔ ذھبوا الیٰ انّ	کے لیے اس میں اختیار کی کوئی

اوصالحين من قبلهم عبدوا الله وتقربوا اليه فاعطاهم الله الالوهية فاستحقوا العبادة من سائر خلق الله	گنجائش نہیں چھوڑی ہے. ان کی تدبیر یعنی ان کا نظام تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، لیکن دنیا کے باقی معاملات کے بارے میں ان کی رائے مسلمانوں سے مختلف ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان میں کچھ نیک اور بزرگ لوگ تھے۔ انھوں نے اللہ کی خوب عبادت کی اور اسکا خاص تقرب حاصل کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں الوہیت کا منصب عطا فرمادیا تو وہ اس کے مستحق ہوگئے کہ باقی مخلوق ان کی عبادت وبندگی کرے.
* * * * * * *	
* * * * * *	
* * * * *	
* * * *	
* * *	
* *	
(حجة البالغة - باب التوحيد صـ۵۹ـ)	

اور حقیقت شرک کے بیان میں مشرکین کے ایک طبقہ کا حال یہ بیان فرماتے ہیں :-

ومنهم من اعتقد ان الله هو السيد وهو المدبر لكنه قد يخلع بعض عباده لباس الشرف والتاله ويجعله متصرفا في بعض الامور المناصة (حجة الله البالغة باب حقيقة الشرك)	اور ان مشرکین میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنکا اعتقاد یہ ہے کہ اصل سردار اور مالک تو اللہ ہی ہے اور وہی کائنات کا سارا نظام چلا رہا ہے لیکن کبھی وہ اپنے بعض خاص بندوں کو شرف والوہیت کا اعزاز عطا فرمادیتا ہے اور بعض خاص امور میں ان کو متصرف بنادیتا ہے۔

دوسری جگہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مشرکین کے عقیدہ پر کلام فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

بل الحق انهم اعترفوا بتوحيد الخلق وتوحيد التدبير في الامور العظام وسلموا أن العبادة	حق یہ ہے کہ مشرکین خالق اور کائنات کے بڑے اور اہم امور کی تدبیر وانتظام کرنے میں اللہ کی یکتائی کے قائل اور معترف تھے
متلازمة معهما لما اشرنا اليه في تحقيق معنى التوحيد ...... يستعينون بغير الله في حوائجهم من شفاء المريض وغناء الفقير وينذرون لهم يتوقعون انجاح مقاصدهم بتلك النذور ويتلون اسماءهم رجاء بركتها. فاوجب الله تعالى عليهم ان يقولوا في صلاتهم اياك نعبد واياك نستعين وقال تعالى فلا تدعوا مع الله احدا وليس المراد من الدعاء العبادة كما قاله بعض المفسرين بل هو الاستعانة لقوله تعالى بل اياه تدعون فيكشف ما تدعون.	(اس میں وہ اس کا کسی کو شریک نہیں جانتے تھے) ...... وہ مشرکین اپنی ضرورتوں (مثلاً) شفاء مریض، غناء فقیر وغیرہ میں غیر اللہ سے مدد طلب کرتے تھے اور اپنے مقاصد کے پورا ہونے کی توقع کرتے ہوئے ان کی نذریں مانتے تھے اور بطور تبرک ان کے نام کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر واجب قرار دیا کہ وہ اپنی نمازوں میں "ایاک نعبد وایاک نستعین" کہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ولا تدعوا مع اللہ احدا" یعنی اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو، اور دعا سے مراد عبادت نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے بلکہ استعانت ہے، اللہ تعالیٰ کا قول اس کی دلیل ہے. فرمایا گیا ہے "بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون" یعنی (مصیبت کے وقت) تم صرف اللہ کو پکارتے ہو، تو وہ تمہاری پکار کو سنکر تمہاری تکلیف کو دور کرتا ہے۔
(حجة الله البالغه باب اقسام الشرك ص ۴۹)	

عقیدۂ توحید کی حقیقت اور توحید کے باب میں مشرکین کی گمراہی کی تفصیل حضرت شاہ صاحبؒ کے تفصیلی بیان سے آپنے ذہن نشین کرلی۔ اب دیکھئے قرآن خدا کی ہستی کے بارے میں مشرکین کا عقیدہ کیا بتاتا ہے اور ان کے شرک کی حقیقت کیا بیان فرماتا ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ مشرکین اس حقیقت کو تو مانتے تھے کہ زمین و آسمان اور ساری کائنات کا خالق و مالک صرف ایک اللہ ہی ہے، اس میں اس کا کوئی شریک و ساجھی نہیں اور خدا کے سوا انھوں نے جن ہستیوں کو معبود اور مددگار فرض کیا تھا، وہ ان کو خدا کی برابری کے درجہ پر نہیں رکھتے تھے، بلکہ معبود بنانے اور سہارا سمجھنے کے باوجود ان کو وہ خدا کی مخلوق، اس کی مملوک اور بندہ ہی سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا صرف یہ تھا کہ یہ اللہ کے پیارے اور محبوب ہیں۔ اللہ نے انھیں کچھ اختیارات دے دیے ہیں۔ ہم ان کی عبادت اور پوجا محض اس لیے کرتے ہیں تاکہ وہ ہم سے راضی ہو جائیں ہمارے کام بنا دیں اور ان کے وسیلے سے ہم خدا کے قریب ہو جائیں، بس یہی ان مشرکین کا شرک تھا اور دنیا کی اکثر مشرک قوموں کا یہی شرک رہا ہے۔ مشرکین عرب کے بارے میں قرآن مجید کا بیان پڑھیے اس میں مشرکین کا صاف اقرار نقل کیا گیا ہے کہ وہ کائنات کا خالق و مالک اور منتظم و متصرف بس ایک اللہ ہی کو مانتے تھے، اور اس میں اس کا کسی کو ساجھی نہیں سمجھتے تھے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۔

* * * * *

* * * * *

* * * *

آپ ان سے فرمائیے کہ بتلاؤ ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا رب کون ہے۔ وہ سب کہیں گے کہ یہ سب اللہ ہی کی ملک ہے آپ فرمائیے کہ پھر تم (شرک کے برے انجام سے) کیوں نہیں ڈرتے آپ ان سے کہیے کہ بتلاؤ کس کے ہاتھ میں ہے تمام چیزوں کا اختیار اور وہ جس کو چاہے پناہ دے سکتا ہے اور اس کی پکڑ سے کسی کو نہیں بچایا جا سکتا ہے اگر تم جانتے ہو (تو بتلاؤ) وہ کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے خاص ہے۔ آپ فرما دیجئے

(المومنون ع ۵) کہ پھر تم کیسے اندھے ہو رہے ہو۔

اور سورۂ یونس میں فرمایا گیا ہے:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۔ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ

* * * * *

* * * *

* * *

* * *

(یونس ع ۴)

اے پیغمبر آپ (ان مشرکوں سے) کہیے کہ (بتلاؤ) وہ کون ہے کہ جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے؟ یا (بتلاؤ) کون ہے جو تمہارے کانوں اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے اور کون ہے جو جاندار کو بے جان (چیز) سے نکالتا ہے اور بے جان (چیز) کو جاندار (چیز) سے نکالتا ہے اور کون ہے جو سارے کاموں کی تدبیر کرتا ہے (یعنی سارے عالم کا نظام کون چلا رہا ہے) تو وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ ان سب کاموں کا کرنے والا اللہ ہی ہے۔

اور سورۂ عنکبوت میں فرمایا گیا ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ

* * *

اگر آپ ان مشرکوں سے معلوم کریں کہ کس نے آسمان و زمین پیدا کیے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا ہے تو وہ کہیں گے کہ (یہ سب) اللہ ہی نے کیا ہے

اور ایک ہی آیت کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط

(عنکبوت ع ۶)

اگر آپ ان (مشرکوں) سے پوچھیں کہ (بتاؤ) کون ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیا تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ یہ سب اللہ ہی کرتا ہے

ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو کائنات کا تنہا خالق و مالک اور مدبر تسلیم کرتے تھے اور اگر ان سے پوچھا جاتا تھا تو وہ اس کا صاف اقرار کرتے تھے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خود قرآن گواہی دے رہا ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ ہی کو خالق و مالک و مدبر تسلیم کرتے تھے تو پھر ان کا دوسری ہستیوں کے بارے میں وہ کونسا اعتقاد تھا جس کی بنا پر ان کو قرآن نے مشرک ٹھیرایا، ہمیشہ کی دوزخ ان کا انجام بتایا۔ اس کو [illegible] قرآن ہی سے معلوم کیجئے۔

قرآن ان کے شرک کی حقیقت یہ بیان کرتا ہے:

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا	اور جن لوگوں نے اللہ کے علاوہ
مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ	حامی ٹھیرا لئے ہیں وہ کہتے ہیں ہم
مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا	نہیں عبادت کرتے ہیں ان کی مگر
إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ۔	صرف اس غرض سے کہ یہ ہم کو ایسے
(سورۂ زمر ع ۱)	ہیں اللہ کے نزدیک کر دینگے۔

گویا ان کو جو کچھ لینا تھا وہ خدا ہی سے لینا چاہتے تھے اور یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ہم کو خدا ہی دے گا کیونکہ وہی کائنات کا مالک ہے البتہ ان ہستیوں کو اس کا محبوب سمجھ کر کام بننے کا ذریعہ اور واسطہ سمجھتے تھے اور یہی سمجھ کر ان کو پکارتے اور ان کی پوجا کرتے تھے اور یہی ان کا شرک تھا۔

اور سورۂ یونس میں فرمایا گیا ہے:

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ	اور اللہ کے علاوہ عبادت
اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا	کرتے ہیں ایسوں کی جو نہ ان کا
يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ	برا کر سکیں اور نہ بھلا۔ اور وہ
شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ۔	کہتے ہیں کہ یہ سب اللہ کے یہاں
(سورۂ یونس ع ۲)	ہمارے سفارشی ہیں۔

یعنی وہ اپنے معبودوں کو خدا کا حقیقی شریک اور ساجھی نہیں جانتے تھے بلکہ اللہ کا مخلوق مانتے ہوئے ایسا سفارشی مانتے تھے جن کی سفارش رد نہیں ہوتی اور اس کا ان کو مستقل اختیار عطا کر دیا گیا ہے۔

اور حدیث شریف میں مشرکین کے تلبیہ کے الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔ وہ حج کے موقع پر اس طرح اللہ کو پکارتے تھے

لبیک لبیک	ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں۔ آپ کا
لا شریك	(ذاتی طور پر) کوئی شریک نہیں مگر
لك الا شريك	جس کو آپ نے تجویز کر لیا ہو آپ اس کے
هو لك تملكه	بھی مالک ہیں اور اس چیز کے بھی
وما ملك	حقیقتاً آپ ہی مالک ہیں جس کا
	وہ مالک بنا ہے۔

اس تلبیہ میں جس کو مشرکین حج کے موقع پر پڑھتے تھے صاف طور پر اس کا اقرار ہے کہ اے اللہ آپ وحدہٗ لاشریک ہیں اپنی ذات کے اعتبار سے آپ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ہاں صرف وہ ہستیاں جن کو آپ ہی نے خود اپنے کاروبار میں شریک قرار دیدیا ہو۔ پھر بھی وہ اور ان کی ملک دونوں آپ ہی کے محکوم ہیں۔ اور حکومت صرف آپ ہی کی ہے کسی اور کی نہیں ہے۔

مشرکین کے شرک کی حقیقت صرف یہ تھی جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کو نہ کسی چیز کا ذاتی مالک و مختار سمجھتے تھے نہ خدا کے برابر ان کو جانتے تھے بلکہ محض سفارشی اور خدا کی محکومی کے ساتھ اللہ کے کچھ اختیار ان کے لیے مانتے تھے اور یہی ان کا شرک تھا۔

اب شرک و توحید کی اس تفصیلی بحث کو ذہن میں رکھ کر آئیے اور دیکھیے کہ مولانا احمد رضا صاحب اور ان کی جماعت کے بڑے بڑے ذمہ دار اپنا عقیدہ کیا بتلاتے ہیں اور پھر انصاف سے سوچئے کہ جو عقیدہ وہ ظاہر کرتے ہیں اس کے بعد ان کے توحید پر قائم رہنے کی کوئی طبعی صورت ممکن ہے یا نعوذ باللہ یہ حضرات اللہ کے ایسے چہیتے ہیں کہ یہ جو بھی عقیدہ رکھیں ان کی توحید قائم رہے گی اور حقیقی شرک کی گندگی سے یہ پاک ہی رہیں گے؟۔

"بہار شریعت" بریلوی جماعت کی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب پر مولانا احمد رضا خاں صاحب کی تصدیق بھی ہے۔ اس کے شروع میں مصنف نے عقائد کا باب تحریر کیا ہے۔ اس میں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی کے بارے میں وہ اپنا اور اپنی جماعت کا حسب ذیل عقیدہ تحریر فرماتے ہیں:

عقیدہ: — حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ عزوجل کے نائب مطلق ہیں۔ تمام جہان حضورؐ کے تحت تصرف کر دیا گیا، جو چاہیں کریں، جسے جو چاہیں دیں۔ جس سے جو چاہیں واپس لے لیں۔ تمام جہان میں ان کے حکم کا پھیرنے والا کوئی نہیں، تمام جہان ان کا محکوم ہے اور وہ اپنے رب کے سوا کسی کے محکوم نہیں۔ تمام آدمیوں کے مالک ہیں۔ جو انھیں مالک نہ جانے حلاوت سنت سے محروم رہے۔ تمام زمین ان کی ملک ہے، تمام جنت ان کی جاگیر ہے۔ ملکوت السموات حضور کے زیر فرمان۔ جنت و نار کی کنجیاں دست اقدس میں دیدی گئیں۔ رزق و خیر اور ہر قسم کی عطائیں حضور ہی کے در سے تقسیم ہوتی ہیں۔ دنیا و آخرت حضور کے عطا کا ایک حصہ ہے۔ احکام تشریعیہ حضور کے قبضہ میں کر دیے گئے کہ جس پر جو چاہیں حرام فرما دیں اور جس کے لیے جو چاہیں حلال کر دیں اور جو فرض چاہیں معاف کر دیں (بہار شریعت حصہ اول صفحہ ۳۲)۔

اور بریلوی جماعت کے سب سے بڑے عالم بلکہ ان کی دانست میں اس صدی کے سب سے بڑے مجدد مولانا احمد رضا خانصاحب اپنا اور اپنی جماعت کا عقیدہ حضور کی ہستی سے متعلق یہ تحریر فرماتے ہیں:—

"ثانیاً ان کے سامنے (اہل دیوبند کے سامنے) یوں کہیے کہ یا رسول اللہ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفۂ اعظم و نائب اکرم و قاسم نعم کیا، دنیا کی کنجیاں، دین کی کنجیاں، خزانوں کی کنجیاں، مدد کی کنجیاں، نفع کی کنجیاں حضورؐ کے دست مبارک میں رکھیں، روزانہ دو وقت تمام امت کے اعمال حضورؐ کی بارگاہ میں پیش کراۓ۔ یا رسول اللہ میرے کام پر نظر رحمت فرمائیے۔ یا رسول اللہ اللہ کے حکم سے مدد و اعانت فرمائیے۔ اب ان لفظوں میں تو صراحتاً قدرت ذاتی کا انکار اور مظہریت عون الٰہی کی تصریح ہے۔ ان میں تو معاذ اللہ اس نا پاک گمان کی بو بھی نہیں آسکتی۔ یہ کہتے جائیے اور ان صاحبوں کے چہروں پر غور کرتے جائیے۔ اگر کشادہ پیشانی اسے سنیں اور انکار کراہت و غیظ ظاہر نہ ہوں جب تو خیر"

(برکات الامداد، مصنفہ مولانا احمد رضا خاں صاحب صفحہ ۱۹ و ۲۰)

اور مولانا اجمل شاہ صاحب سنبھلی رسالۂ اہل سنت سنبھل ماہ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ کی اشاعت میں لکھتے ہیں:

"اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضور سید انبیاء محبوب کبریاء، مالک ارض و سماء و شافع روز جزاء علیہ التحیۃ والثناء کی ذات ستودہ صفات کا ہمارے اندر مبعوث ہونا بہت بڑی نعمت ہے (رسالہ اہلسنت صفحہ ۵)

اس عبارت کے خط کشیدہ الفاظ آپ کی توجہ کے طالب ہیں۔

اسی رسالہ کے صفحہ ۴ پر وہ لکھتے ہیں:—

"پھر محسن بھی ایسا محسن جس کے جود و عطا کا ہر محسن دنیا محتاج، جس کے ابر سخا کا ہر مجازی مالک تشنہ، جس کے فضل و کرم کا تمام جہان سائل، کائنات کا ذرہ ذرہ جس کے دین کا طالب، عالم کا ہر موجود جس کی بارگاہ کا مستفیض، ہر شاہ و گدا جس کے آستانے کا بھکاری"۔

(رسالہ اہلسنت صفحہ ۴)

اور یہی مولانا اجمل شاہ صاحب اس رسالہ میں ایک مضمون کی ابتدا کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ——— تحریر کرتے ہیں:

وھو مالک العرش والکرسی والسموات والارضین (رسالہ اہلسنت ماہ ذی قعدہ ۱۳۵۴ھ)

(یعنی آپ عرش و کرسی اور آسمانوں اور زمینوں کے مالک ہیں)

اور اسی رسالہ میں ایک نعت شریف چھاپی گئی ہے جس کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

وہ شفیع المذنبیں ہیں قاسم ارزاق ہیں
ہے دو عالم کے سروں پر بار احسان حضور

بریلوی علماء کی چند عبارتیں یہاں نقل کی گئی ہیں

ان کی ہزاروں تصنیفات اسی قسم کے عقائد کا زندہ عجائب گھر ہیں۔ آئندہ بھی بہت سے اس قسم کے اقوال آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ پہلے ان منقولہ عبارتوں پر نظر ڈالیے۔ ان عبارتوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں اپنا یہ عقیدہ ظاہر کیا گیا ہے کہ تمام کائنات کی حکومت، جنت و دوزخ دینے کے اختیارات، حرام کو حلال کرنے کا اختیار سب کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمادیا ہے۔ مولانا احمد رضا صاحب والی عبارت میں دیکھیے انھوں نے صاف لکھا ہے کہ ہم یہ سب اختیارات اللہ کے دینے سے حضورؐ کی ذات میں مانتے ہیں، اس لیے یہ شرک ہرگز نہیں ہے۔ لیکن ہم قرآن و حدیث کے فرمان اور حضرت شاہ ولی اللہ کی عبارتوں سے ابھی ثابت کر چکے ہیں کہ مشرکین بھی اپنے معبودوں کے لیے جو اختیارات مانتے تھے وہ بھی ان کے ذاتی نہیں بلکہ اللہ ہی کے عطا کیے ہوئے مانتے تھے اور قرآن نے اسی کے شرک ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اس جگہ یہ ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ بریلوی حضرات اس موقع پر ایک تاویل بھی کیا کرتے ہیں جو لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ وہ تاویل یہ ہے کہ مشرکین یہ اعتقاد بتوں کے بارے میں رکھتے تھے اور اس طرح کی ساری آیتوں کا تعلق بتوں سے ہی ہے اور ہم یہ عقیدہ انبیاء و اولیاء کی صف میں ہستیوں کے بارے میں رکھتے ہیں، اس لیے ان آیتوں کا ہمارے عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ ان آیتوں کو انبیاء و اولیاء کے تذکرے میں لانا بھی ان کی سخت توہین ہے۔ اور ان کو نعوذ باللہ بتوں کے ساتھ شامل کر دینا ہے جو سخت کفر ہے اور یہ اہل دیوبند کی قرآن کے بارے میں سخت بددیانتی ہے۔ ہم اس تاویل کے بارے میں بھی مختصر طور پر کچھ عرض کر دینا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے اختیارات و الوہیت میں ذاتی عطائی کسی بھی طرح سے جس کسی دوسرے کو شریک کیا جائے گا تو وہ شرک ہی ہوگا اور اس میں کسی کی کوئی خصوصیت اور کسی کا کوئی استثناء نہ ہوگا۔ ہم یہاں بات کو مختصر کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب لکھتے ہیں:-

"جو شرک ہے وہ جس کے ساتھ کیا جائے شرک ہی ہوگا۔ اور ایک کے لیے شرک نہیں تو وہ کسی کے لیے شرک نہیں"

(برکات الامداد صفحہ ۱۹ و ۲۰)

اور مولانا اجمل شاہ صاحب بریلوی اپنی کتاب "رد سیف یمانی" میں لکھتے ہیں:-

"جس چیز کا اثبات (ثابت کرنا) کسی ایک کے لیے شرک ہے اس کا اثبات ہر ہر فرد مخلوقات کے لیے شرک ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک چیز کا اثبات بعض کے لیے شرک ہو اور بعض کے لیے نہ ہو" (رد سیف یمانی صفحہ ۲۰۹)

ہم تفسیروں اور اکابر امت کی کتابوں سے بھی اسکے بہت سے حوالے دے سکتے ہیں، مگر جن لوگوں کی جانب سے یہ الزام لگایا گیا ہے جب انھوں نے خود ہی اس کو تسلیم کیا ہے تو اب اس کے لیے مزید کسی ثبوت کے پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مولانا احمد رضا صاحب، مولانا امجد علی صاحب مصنف بہار شریعت اور مولانا اجمل شاہ صاحب کے مذکورہ بالا اقوال ذرا قرآن پاک کی کسوٹی پر جانچ کر دیکھیے کہ اس میں حق اور واقعیت کا کوئی پہلو نکلتا ہے یا یہ سب ایجاد بندہ ہے اور بالکل مشرکانہ عقائد ہیں جن کے ساتھ توحید کا باقی رہنا قطعاً محال اور بالکل ناممکن ہے۔ ہم یہاں بس چند آیتیں پیش کریں گے اور ان کا ترجمہ خود مولانا احمد رضا صاحب کا کیا ہوا نقل کریں گے تاکہ اس کے بعد ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہ جائے۔

ایک بار پھر ملاحظہ فرما لیں کہ مولانا احمد رضا صاحب مصنف بہار شریعت اور رسالہ اہلسنت کے مضمون نگار کے بیانات کو ذہن میں تازہ کر لیجیے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کائنات کے جملہ اختیارات، خدائی خزانوں کی کنجیاں

رزق کے خزانے، اور جنت اور دوزخ سب کچھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں دیئے گئے ہیں۔ اور اب اس کے بعد دیکھیے قرآن پاک اس سلسلہ میں کیا کہتا ہے:

سورۂ انعام میں فرمایا گیا ہے:-

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ	تم فرما دو میں تم سے نہیں کہتا میرے
خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ	پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ
الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ	یہ کہوں کہ میں آپ غیب جان
اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ	لیتا ہوں، اور نہ تم سے یہ کہوں
اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ.	کہ میں فرشتہ ہوں میں تو اسی
(سورۂ انعام)	کا تابع ہوں جو مجھے وحی آتی ہے

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے بریلوی جماعت کے مشہور عالم مولانا نعیم الدین صاحب مراد آبادی لکھتے ہیں:

"میرا دعوی یہ تو نہیں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں جو تم مجھ سے مال و دولت کا سوال کرو اور میں اس کی طرف التفات نہ کروں تو رسالت سے منکر ہو جاؤ"

دوسری آیت ملاحظہ ہو (ترجمہ خان صاحب بریلوی ہی کے قلم کا)

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا	اور نہ ان پر (کوئی گناہ ہے)
مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ	جو تمہارے حضور حاضر ہوں کہ
قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ	تم انہیں سواری عطا فرماؤ
عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ	تم سے یہ جواب پائیں کہ میرے
تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ	پاس کوئی چیز نہیں جس پر تمہیں
حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا	سوار کروں اس پر یوں واپس
يُنْفِقُوْنَ.	جائیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو ابلتے
	ہوں اس غم سے کہ خرچ کا
(سورۂ توبہ)	مقدور نہ پایا۔

صرف ترجمہ ہی کو دیکھ کر ہر صاحب عقل اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ خان صاحب بریلوی اور دوسرے بریلوی علماء کا عقیدہ جو وہ حضور کے بارے میں رکھتے ہیں، ان کے اپنے ترجمہ کے سراسر خلاف اور محض جہل اور من گھڑت ہے۔ مگر آپ فیصلے سے پہلے اس کی تفسیر مولانا مراد آبادی کی زبانی سن لیجیے دیکھیے وہ کیا کہتے ہیں۔

ارشاد فرماتے ہیں اور کیسی صفائی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ بس حد ہی کیجیے:

یہاں ترجمہ میں خان صاحب کے لئے پوری گنجائش تھی کہ وہ ترجمہ کے درمیان بریکٹ دے کر اس میں "ذاتی" کا لفظ بڑھا دیتے جیسا کہ انھوں نے قرآن پاک کی بہت سی آیتوں میں کیا بھی ہے۔ اس سے پڑھنے والا آسانی سے اس دھوکہ میں آجاتا کہ محمد کے پاس اللہ کا دیا تو سب کچھ تھا مگر ذاتی کچھ نہ تھا اور آپ نے ذاتی ہی کا انکار کیا ہے۔ اور اگر ترجمہ میں خان صاحب چوک گئے تھے تو یہ کام حاشیہ نگار کو ضرور ہی کرنا چاہئے تھا۔ کیونکہ انھوں نے حاشیہ تفسیر کے نام سے تو لکھا ہی اسی خدمت انجام دینے کے لیے۔ خیر یہ تو وہ جانیں کہ اس موقعہ پر انھوں نے یہ کار ربانی کس وجہ سے نہیں کی۔ لیکن یہاں ترجمہ اور تفسیر کے باوجود اس عقیدے پر قائم رہنا جو [illegible] نے اپنی کتاب [illegible] تحریر کیا ہے بڑی ہمت کی بات ہے اس [illegible] کی [illegible] دی جائے وہ اس کے [illegible] سمجھ میں [illegible] ہے گے ________ لیکن جو کچھ آپ کے ترجمہ اور تفسیر سے ثابت ہو رہا ہے اگر اسی کو اصل دیوبندی اور ان کے بزرگ مولانا اسمٰعیل شہید اپنی زبان سے ادا کر دیں تو فوراً وہ کفر اور توہین رسول کہلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ بتانے پر ہم کو آپ سے شکایت ضرور ہے۔

سورۂ جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری دنیا کے سامنے اپنے اختیارات کے بارے میں جس اعلان کا

سلہ شان نزول:- اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے چند حضرات جہاد میں جانے کے لیے [illegible] حضور سے سواری کی درخواست کی حضور نے فرمایا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے جس پر تمہیں سوار کروں [illegible]

حکم کیا گیا ہے وہ یہ ہے ۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۝ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۔	تم فرماؤ میں تو اپنے رب ہی کی بندگی کرتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھیراتا۔ تم فرماؤ میں تمہارے کسی برے بھلے کا مالک نہیں۔ تم فرماؤ ہرگز مجھے اللہ سے کوئی نہیں بچائے گا اور ہرگز اس کے سوا کوئی پناہ نہ پاؤں گا۔ مگر اللہ کے پیام اور اس کی رسالتیں۔

اس آیت کی تفسیر جو اور جیسے مولانا مراد آبادی نے کی ہے ذرا اس کا حال سن لیجیے اور یقین کیجیے کہ اس کو پڑھکر بہت مزا آئے گا اور آپ کے سامنے بریلوی جماعت کے ذمہ داروں کی دیانت داری کی حقیقت بھی پوری طرح آجائیگی دیکھیے آیت کے الفاظ جن کا ترجمہ بریلوی جماعت کے اعلیٰ حضرت نے یہ کیا ہے کہ "تم فرماؤ کہ میں تمہارے کسی برے بھلے کا مالک نہیں" یہ الفاظ بریلوی عقیدہ کے خلاف کیسا صریح اعلان ہے اور اس پر کیسی شدید ضرب لگاتا ہے اس کے بارے میں تو مراد آبادی صاحب کو تفسیر میں بہت کچھ لکھنا چاہئے تھا۔ یا تو وہ یہ کہتے کہ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ ہی غلط کر دیا ہے یا کسی طرح بات بنا دیتے کہ صاحب آیت منسوخ ہے۔ یا فرما دیتے آیت آیات متشابہات میں سے ہے جس کا صحیح مطلب اللہ ہی کو معلوم ہے اور ہم صرف اس پر ایمان لاتے ہیں۔ بہر حال کچھ نہ کچھ کہنا اس لیے ضروری تھا کہ جب تا جر اہل دیوبند حضور کے اختیارات کی بحث میں بریلویوں کے مقابلہ پر اس آیت کو ضرور پڑھتا ہے لیکن یہ سب کچھ درست دیکھا ہے مگر مراد آبادی بچارے کہتے تو کہاں تک کہتے۔ اس لیے انھوں نے آیت کے اس حصہ کی جس کا ترجمہ ان کے اعلیٰ حضرت نے تمہارے بھلے برے کا مالک نہیں کیا ہے [illegible] کوئی تفسیر ہی نہیں کی۔ خاموشی بچا ہیں ان کو اچھی ما [illegible] سے زیادہ محفوظ طریقہ خاں صاحب نے اختیار کیا تھا کہ انھوں نے سرے سے پورے قرآن ہی کی تفسیر لکھنے کا ارادہ نہیں کیا کیونکہ وہ اس سلسلہ کی مشکلات سے مولانا نعیم الدین صاحب سے بڑھ کر واقف تھے۔ پھر مولانا نعیم الدین صاحب نے قل لن یجیرنی من اللہ احد "تم فرماؤ ہرگز مجھے اللہ سے کوئی نہ بچائے گا" اس پر جو حاشیہ دیا ہے وہ یہ ہے "جیسا کہ صالح علیہ السلام نے فرمایا تھا فمن ینصرنی من اللہ ان عصیتہ"

حاشیہ یا تفسیر کا یہ طریقہ بہت عمدہ اور بریلی کی انوکھی ایجادات میں سے ایک ایجاد ہے کیونکہ اس سے حاشیہ کا فرض بھی ادا ہو جاتا ہے اور کوئی اردو خواں بات کو سمجھتا بھی نہیں۔ لیکن اگر اس کو بھی اردو میں ظاہر کر دیا جاتا تو ایسا کرنے سے مقدمہ اپنے گھر ملیۓ عقیدے کے خلاف ہو جاتا اور بات کے بننے کا سرے سے ارکان ہی ختم ہو جاتا اس لیے انھوں نے اردو لکھنے کی غلطی نہیں کی۔

یہاں تک تو ہوئی بریلوی ذمہ داروں کی بات مگر آپ ان کے معاملہ کو یہیں چھوڑ کر اب یہ دیکھ لیجیے کہ آیت کی تفسیر میں امت کے مفسرین کیا فرماتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان آیتوں کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

قل انما ادعوا ربی :- یعنی بگو کہ سوائے این نیست کہ من می خوانم پروردگار خود را تا ظلمت کدۂ دل مرا بنور تجلی خود مشرف بسازد ـــــ ولا اشرک بہ احداً ـــ یعنی دیگر شریک نمی کنم با او ہیچکس را چون من با او ہیچکس را شریک نمی کنم و بخواندن پروردگار خود مشغول شدم پس از دیگران کے روا تواند داشت کہ مرا بخوانند یا مرا با او شریک مقرر کنند و اکثر این ہر دو فرقہ از تو توقع نفع یا ضرر نے داشتہ ترا بخوانند و شریک مقرر کنند پس صاف قل انی لا املک لکم ضراً ولا رشداً ـــ یعنی بگو کہ بہ تحقیق من ہرگز مالک نیستم برائے شما ضررے و نہ تدبیرے و مطلب این را چنانچہ پیش از من و کلا رسل [illegible] جنبان و ارواح خالہ بنی آدم اہل دنیا را بہ طمع منفعتہا و [illegible] ضرر تہا می پرستند و خود را نزد آنہا مالک

نفع وضرر محسوس کنند، کہ حالا این دفتر کا خوردہ اگر از حادثہ مصیبتے بہ تو پناہ آرند و بخواہند کہ از غضب خدا وند در دامن تو پناہ می گیرند پوست پرکندہ قل انی لن یجیرنی من اللہ احد یعنی بگو بہ تحقیق من خود دریں حالت ام کہ ہرگز پناہ نمی تواند داد مرا از غضب خدا ہیچ کس ولن احد من دونہ ملتحدا یعنی وہرگز نخواہم یافت در وجدان خود ہیچ وقت سوائے خدا ہیچ جائے رجوع ومیلان تا بسوئے آں رجوع والتجا کنم۔

شاہ صاحب کی عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات اور اپنے اختیارات کے بارے میں یہ اعلان کرنے کا حکم فرمایا کہ:

"آپ فرما دیجئے کہ میں تو فقط اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں تاکہ میرے دل کے ظلمت کدہ کو اللہ تعالیٰ اپنی تجلی کے نور سے منور فرما دے اور میں اس کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہیں کرتا اور جب میں خود کسی کو اس کا شریک نہیں کرتا اور صرف اپنے پروردگار کو پکارنے میں لگا رہتا ہوں تو پھر میں دوسروں کے لیے کیسے جائز ٹھیرا سکتا ہوں کہ وہ خود مجھ ہی کو پکارنے لگیں یا مجھ کو اس کا شریک ٹھیرائیں اور اگر یہ دونوں جماعتیں (انسان اور جن) آپ سے کسی طرح کے نفع یا نقصان کی امید قائم کرکے آپ کو پکاریں اور آپ کو خدا کا شریک کریں تو آپ صاف فرما دیں کہ میں ہرگز تمہارے لیے کسی نقصان یا حاجت روائی کا مالک نہیں ہوں۔ جس طرح مجھ سے پہلے جنات کے وکیل اور سفیر اور انسانوں میں سے گمراہ روحوں نے دنیا والوں کو نفع کا لالچ اور ضرر کا خوف دلاکر اپنا فریفتہ بنا لیا تھا اور ان کے سامنے خود کو ان کے نفع اور ضرر کا مالک ظاہر کیا تھا، اب ان سب خرافات کا خاتمہ ہے اور اگر کسی حادثہ یا مصیبت سے یہ لوگ آپ کی پناہ کے طالب ہوں اور آپ سے امید قائم کریں کہ وہ آپ کے دامن میں پناہ حاصل کر لیں گے تو آپ صاف فرما دیجئے کہ میں تو خود اس حالت میں ہوں کہ مجھ کو ہرگز کوئی اللہ کے غضب سے نہ بچا سکے گا اور میں اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہ پا سکوں گا"

حضرت شاہ صاحب کی عبارت اتنی صاف ہے کہ اس پر کسی حاشیہ کی مطلق حاجت نہیں۔ اس عبارت میں شاہ صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قرآنی اعلان کی تشریح کی ہے کہ مجھ سے دنیا کا کوئی جن و بشر کسی کام کے بنانے بگاڑنے یا کسی قسم کے نفع نقصان کی امید وابستہ نہ کرے۔ میری آمد کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ اب تک جن ہستیوں کے بارے میں نفع نقصان کے اختیار کا گمراہانہ اعتقاد کر لیا گیا تھا میں اس گمراہانہ اور مشرکانہ عقیدہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر ساری دنیا کو خدائے واحد کی تنہا فرماں روائی کا درس دوں۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جن اختیارات کا میں ساری مخلوق سے انکار کرتا ہوں اس کا اثبات خود اپنی ذات کے لیے کرنے لگوں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی یہ تفسیر بریلوی علماء کے خانہ ساز عقیدہ پر ایسی ضرب کاری ہے کہ اس کے بعد اس کی بقا کا کوئی امکان نہیں رہ جاتا۔ لیکن اگر آدمی کسی چیز کے نہ ماننے ہی کا فیصلہ کرلے تو بات ہی دوسری ہے۔

آپ بہار شریعت والی عبارت میں بریلویوں کا یہ عقیدہ پڑھ چکے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ساری شریعت پر کلی اختیار دیدیا ہے جس کے لیے جو چاہیں حلال کریں اور جو چاہیں حرام کریں اور جس کو جو فرض چاہیں معاف فرما دیں۔ اب قرآن سے پوچھئے وہ کیا کہتا ہے۔ ہم ترجمہ اور تفسیر بریلی کے ان دونوں عالموں ہی کا نقل کریں گے۔

واقعہ پیش آیا کہ حضورؐ نے ایک موقعہ پر شہد استعمال نہ کرنے یا کسی جائز کام کو نہ کرنے کی قسم کھالی تھی، اس پر سورہ تحریم کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں۔

یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ	اے غیب بتانے والے (نبی)
مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ	تم اپنے اوپر کیوں حرام کیے لیتے ہو

ـلہ لفظ نبی سے قرآن پاک میں جہاں حضورؐ کی ذات مراد ہوتی ہے خاں صاحب اس کا ترجمہ غیب بتانے والے کرتے ہیں لیکن یہی لفظ جب دیگر انبیاء کے لیے آتا ہے تو وہ اسکا ترجمہ نبی کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ دیگر انبیاء علیہم السلام سے خاں صاحب کو کیا [illegible]

مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ	وہ چیز جو اللہ نے تمہارے لیے
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	حلال کی اپنی بیویوں کی مرضی
قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ	چاہتے ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان
لَكُمْ تَحِلَّةَ	ہے بے شک اللہ نے تمہارے لیے
اَيْمَانِكُمْ.	تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر فرما دیا

اس پر جو تفصیلی حاشیہ لکھا گیا ہے اس میں پہلے تو واقعہ کی تفصیل ہے اس کے آگے لکھتے ہیں:

"جو چیز اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کی یعنی ماریہ قبطیہ آپ انھیں اپنے اوپر کیوں حرام کیے لیتے ہیں۔ اپنی بیویوں حفصہ و عائشہ (رضی اللہ عنہما) کی رضا جوئی کیلئے"

آگے تحلۃ ایمانکم کے حاشیہ میں مولانا نعیم الدین صاحب لکھتے ہیں کہ یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے کفارہ ادا کیا۔ اگرچہ ایک روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے اس لیے کفارہ ادا نہیں کیا کہ آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ (لغزشیں) معفور ہیں ـــ مگر یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ باقی ہے کہ جب آپ کے قبضہ میں حرام و حلال کا پورا اختیار دے دیا گیا تھا اور شریعت آپ کی تحت تصرف کر دی گئی تھی تو پھر مفسرین نے اس تحقیق کی زحمت کیوں اٹھائی کہ آیا آپ نے کفارہ دیا یا نہیں اور نہیں دیا تو کیوں نہیں دیا۔ سیدھی بات یہ کیوں نہیں لکھتے کہ حضورؐ کے قبضہ و اختیار میں چونکہ حرام و حلال کا سارا اختیار دیدیا گیا تھا اس لیے آپ کے لیے کفارہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی پہلے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جس چیز کا اختیار خود اللہ ہی نے آپ کو دے دیا تھا اور آپ نے اللہ ہی کے دیئے سے اس اختیار کا استعمال بھی کیا تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے حلال کو حرام کرنے کے بارے میں آپ سے سوال کیوں فرمایا۔

بہرحال اس آیت کے ترجمہ اور تفسیر سے جو خود انہی کا لکھا ہوا ہے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ حضورؐ کے اختیارات کے بارے میں بریلوی علماء کا عقیدہ بالکل بے بنیاد محض ذہنی اور حدیث و قرآن کے صریح خلاف ہے پس جس کا بھی یہ عقیدہ ہو اس کو اس سے توبہ کرنی چاہیئے اور اپنی توحید کو شرک کی آلودگی سے پاک صاف کرنا چاہیئے۔

ایک اور آیت ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ بریلی کے ذمہ دار اور ان کی جماعت کے اعلیٰ حضرت اور صدر الافاضل یعنی خاں صاحب بریلوی اور مولانا نعیم الدین صاحب اپنے ذہنی اور غلط عقیدے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے نہ صرف مفسرین امت بلکہ عقل کے بھی بالکل خلاف کیسی عجیب تاویلیں کرتے ہیں اور ذرا بھی خیال ان کے دامنگیر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو سوچنے سمجھنے کے لیے عقل بھی عطا فرمائی ہے۔ وہ جب اس تفسیر کو دیکھیں گے تو اس کے لکھنے والوں کی عقل، علم اور دیانت کے بارے میں کس نتیجہ پر پہنچیں گے۔ آیت یہ ہے۔

قل لا املك لنفسي نفعًا	تم فرماؤ میں اپنی جان کے بھلے
ولا ضرًّا الا ما شاء الله	برے کا خود مختار نہیں مگر جو اللہ
ولو كنت اعلم الغيب	چاہے اور اگر میں غیب جان لیا کرتا
لاستكثرت من الخير	تو یوں ہوتا کہ میں نے بہت بھلائی
وما مسني السوء ان انا	جمع کر لی اور مجھے کوئی برائی نہ پہنچی
الا نذير و بشير لقوم	میں تو یہی ڈر اور خوشی سنانے
يؤمنون۔	والا ہوں انھیں جو ایمان رکھتے
(اعراف ع)	ہیں (اعراف)

پہلے تو یہ نوٹ کر لیجئے کہ ترجمہ میں جو مختار سے پہلے خود کا اضافہ کیا گیا ہے وہ اپنے ذہنی عقیدے کو بچانے اور یہ دکھلانے کے لیے کیا گیا ہے کہ دیکھئے تو اللہ کے عطا کرنے سے حضور ہر چیز کے مالک ہیں البتہ آپ کو بغیر عطائے الٰہی کے کسی چیز کے مختار ہونے سے انکار ہے۔ مگر ہم دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ مختار سے ساتھ خود کی یہ قید خاں صاحب نے اپنے گھر سے لگائی ہے۔ امت کے کسی ایک مستند مفسر کا بھی حوالہ نہیں دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس مفہوم کی طرف کوئی اشارہ تک بھی کیا ہو۔ مولانا نعیم الدین صاحب نے بھی اپنے حاشیہ میں اس کا کوئی ثبوت یا حوالہ نہیں دیا ہے جیسا کہ پوری تفسیر میں حوالوں سے وہ پوری طرح کنارہ کش رہے ہیں اب آپ مولانا نعیم الدین صاحب کا یہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیں حاشیہ ذرا لمبا ہے مگر ہم نقل کرنے پر اس لیے مجبور ہیں کہ معاملہ

ایک جماعت کے عقیدے سے متعلق ہے جو بہت ہی نازک بات ہے۔ اس لیے آپ بھی صبر و استقلال کے ساتھ اس کو گوارا فرمائیں۔ لکھتے ہیں:۔

"یہ کلام برا ہِ ادب و تواضع ہے۔ معنی یہ ہیں کہ میں اپنی ذات سے غیب نہیں جانتا، جو جانتا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی اطلاع اور اس کی عطا سے (خازن) حضرت مترجم قدس سرہ نے (فرمایا بھلائی جمع کرنا اور برائی پہنچنا اس کے اختیار میں ہو سکتا ہے جو ذاتی قدرت رکھے اور ذاتی قدرت وہی رکھے گا جس کا علم بھی ذاتی ہو کیونکہ جس کی ایک صفت ذاتی ہے اس کی تمام صفات ذاتی، تو معنی یہ ہوئے کہ اگر مجھے غیب کا علم ذاتی ہوتا تو قدرت بھی ذاتی ہوتی اور میں بھلائی جمع کر لیتا اور برائی نہ پہنچنے دیتا۔ بھلائی سے مراد راحتیں اور کامیابیاں اور دشمنوں پر غلبہ ہے اور برائیوں سے تنگی و تکلیف اور دشمنوں کا غالب آنا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بھلائی سے مراد سرکشوں کا مطیع اور نافرمانوں کا فرمانبردار اور کافروں کا مومن کر لینا ہو اور برائی سے بدبخت لوگوں کا باوجود دعوت کے محروم رہ جانا تو حاصل کلام یہ ہوگا کہ اگر میں نفع و ضرر کا ذاتی اختیار رکھتا تو اے منافقین و کافرین تمہیں سب کو مومن کر ڈالتا اور تمہاری کفری حالت دیکھنے کی تکلیف مجھے نہ پہنچتی"

ہم عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ اگر نا قابل فہم تاویلات سے بھرپور یہ حاشیہ عقلوں اور پاگلوں کے لیے نہیں بلکہ عقل رکھنے والے انسانوں کے لیے لکھا گیا ہے تو فرمائیے کہ اس سے کوئی معمولی سی سمجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی مطمئن ہو سکتا ہے۔ یہ کیسی نرالی منطق ہے کہ کسی کام کو وہی کر سکتا ہے جس کو اس کے کرنے کی ذاتی قدرت حاصل ہو۔ دنیا کا ہر آدمی بلکہ ہر جاندار کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے تو کیا وہ اپنی ذاتی قدرت سے ہی یہ سب کچھ کرتا ہے؟ اللہ کی دی ہوئی قدرت سے نہیں کرتا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ خود مولانا نعیم الدین صاحب نے جو یہ عجیب اور بالکل نرالا حاشیہ لکھا وہ یہ بھی ایک کام تھا بلکہ کارنامہ تو کیا یہ کارنامہ انھوں نے اللہ کی دی ہوئی قدرت سے نہیں اپنی ذاتی قدرت سے انجام دیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک اللہ کی دی ہوئی قدرت سے تو کوئی کام حضور بھی نہیں کر سکتے، دوسروں کی تو ہستی ہی کیا ہے۔ انھوں نے اس تفسیر کے لکھنے کے لیے جو وقت، جو ہاتھ، جو آنکھ اور جو قلم دوات اور کاغذ وغیرہ استعمال کیے وہ خدا کے دیے ہوئے تھے یا انھوں نے اپنے گھر میں بیٹھ کر خود پیدا کر لیے تھے۔ اگر خدا کے دیے ہوئے تھے تو وہ ان کے ذریعہ کوئی کام کیسے کر سکے۔ ہم حیران ہیں کہ کیا وہ حاشیہ لکھتے وقت مولانا نعیم الدین صاحب کو یہ یقین اور اطمینان حاصل تھا کہ اس دنیا میں سب احمق اور پاگل ہی بستے ہیں اور تمام دنیا بس جاہلوں ہی سے آباد ہے، اس لیے کوئی بھی اس مہمل تاویل کو سنکر کہنے والے کی عقل پر شبہ نہ کرے گا۔ بلکہ آنکھ بند کر کے اس پر آمنا وصدقنا پکارا اٹھے گا۔ اگر ان کا خیال یہی تھا تو ہم ان کی عقل کے بارے میں کچھ لکھنے سے اپنے قلم کو روکتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ

"بھلائی سے مراد راحتیں اور کامیابیاں اور دشمنوں پر غلبہ ہے۔ گویا حضور دشمنوں پر غلبہ اسی وقت پا سکتے تھے جب آپ میں ذاتی قدرت ہوتی۔ اور چونکہ ذاتی قدرت تھی نہیں اس لیے آپ نے دشمنوں پر غلبہ کبھی نہیں پایا پھر لطف کی بات یہ ہے کہ یہی مولانا نعیم الدین صاحب جو یہاں یہ لکھ رہے ہیں اپنی ایک کتاب میں جو انھوں نے اپنی تقویۃ الایمان کی تردید میں تحریر فرمائی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نے جنگ حنین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کیا۔ صورت ایسی پیش آئی کہ صحابہ کے قدم اکھڑ گئے۔ اس وقت بیشتر کافروں نے ہجوم کر کے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو

آپ اپنی سواری سے اتر آئے اور زمین سے ایک مشت خاک لے کر ان کے منہوں پہ ماری اور شاہت الوجوہ فرمایا۔ ان میں سے ہر آدمی کی دونوں آنکھوں میں مٹی بھر گئی اور وہ پیٹھ دے کر بھاگے"۔

اس کو لکھنے کے بعد کہتے ہیں، قربان اس تصرف خدا داد کے، کہ ایک مشت خاک سے لشکر گراں کو ہزیمت دی۔ اس کو کہتے ہیں فتح و شکست دینا۔ مسلمانوں کو فتح دی کفار کو شکست۔ اسی کو تقویۃ الایمان میں شرک بتایا گیا ہے واہیو! خدا رسول سے شرم کرو جس کا نام پاک محمد مصطفیٰ ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)، اس کے اختیار کا یہ عالم ہے ...

(الطیب البیان ص ۱۳۹ و ۱۴۰)

آیت مذکورہ کی تفسیر میں بتایا گیا ہے کہ بھلائی جمع کرنا اور برائی نہ پہنچانا اسی کے اختیار میں ہو سکتا ہے جو ذاتی قدرت رکھتا ہو ـــ مگر الطیب البیان کی عبارت میں بتایا گیا ہے کہ حضور نے خدا داد تصرف یعنی خدا کے عطا کیے ہوئے اختیار سے کام لے کر جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ دو بالکل متضاد عبارتیں اور وہ بھی کسی فروعی مسئلہ کے باب میں نہیں بلکہ بنیادی عقیدہ کے بارے میں ایک ہی ذہن اور ایک ہی قلم سے کیسے نکلیں۔ ان کے لکھتے وقت مصنف کو تضاد بیانی کا احساس کیوں نہیں ہوا! اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ شرک وہ ناپاک بلا ہے جو عقل کو بالکل چاٹ جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے جب عقل ہی نہ رہے تو معقول و غیر معقول، صحیح و سقیم اور درست و نادرست کے درمیان فرق و امتیاز کس طرح کیا جا سکتا ہے قرآن نے مشرکوں اور کافروں ہی کے بارے میں فرمایا ہے

لهم قلوب لا	ان کے دل ہیں مگر ان سے
یفقهون بها ولهم	سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں
اعین لا یبصرون بها	ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں
ولهم آذان لا یسمعون	ان کے کان ہیں مگر ان سے
بها اولئک کالانعام	سنتے نہیں۔ وہ ... کے
بل هم اضل اولئک	چوپاؤں کی مانند ہیں بلکہ ان
هم الغافلون	سے بھی بڑھ کر بھٹکے ہوئے اور
. . . .	یہی سب کے سب غافل ہیں
(اعراف ع)	بہرہ ہیں

اللہ تعالیٰ اس طرح کے عذاب سے سارے مسلمانوں کو اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے۔ (جاری)

چند اہم کتابیں

اسلام کیا ہے! از: مولانا محمد منظور نعمانی نہایت آسان زبان میں اور سہل دل نشیں و پر اثر انداز میں اسلامی تعلیمات کا جامع اور مکمل خلاصہ۔ صفحات ۲۵۶۔ قیمت مکمل ۴/۵۰

دین و شریعت از مولانا محمد منظور نعمانی۔ اس کتاب میں توحید آخرت، رسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اخلاق و معاملات، دعوت و جہاد، سیاست و حکومت اور احسان و تصوف کے مباحث پر ایسی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے کہ دل و دماغ اور عقل و وجدان ایمان و اطمینان سے معمور ہو جاتے ہیں۔ قیمت مع گرد پوش ۵/-

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے! از مولانا منظور نعمانی۔ یہ کتاب اہم اساسی قرآنی دعوت اور اس کی اہم تعلیمات کا ایک جامع مرقع ہے، جس میں سیکڑوں عنوانات کے تحت متعلقہ قرآنی آیات کو نہایت مؤثر اور دلپذیر تشریحات کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد گرد پوش ۷/- انگریزی ایڈیشن ۱۵/-

تذکرہ مجدد الف ثانی تلخیص و ترجمہ۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہی: امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی سوانح حیات ۲۲ قیمت مجلد مع گرد پوش ۱۲/-

تجلیات ربانی حصہ اول تلخیص و ترجمہ۔ مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی۔ پورے اسلامی ادب میں حضرت مجدد الف ثانی کے مکاتیب کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان مکاتیب میں احسان و تصوف، تعمیر باطن، حق و باطل میں امتیاز، جہاد فی سبیل اللہ اور اقامت دین کی تر و تیج۔ شریعت کی ترغیب اور امت مسلمہ کی عام رہنمائی

کا وہ سامان موجود ہے جس کی صدائے بازگشت نے گذشتہ تین چار صدیوں میں امت مصطفویہ کے حق میں اہبر کارواں کا کام انجام دیا ہے ساتھ ہی مولانا موصوف نے حاشیہ پر مکتوب الیہم کے حالات بھی کسی قدر تفصیل سے بیان کیے ہیں، جس نے اس کتاب کی اہمیت اور عظمت کو دو بالا کر دیا ہے۔ معیاری کتابت و طباعت، دیدہ زیب گرد پوش سے مزین۔ قیمت مجلد ۱۳/۵۰

مکتوبات خواجہ محمد معصوم

حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ اور خلیفہ حضرت خواجہ محمد معصوم

سرہندیؒ کے مکتوبات کا ذخیرہ جو حضرت خواجہ کے ارشاد و ہدایت کا پورے کام کا آئینہ دار ہے۔ آپ کے گرانقدر مکتوبات کو اردو زبان میں مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے تلخیص کیساتھ منتقل کیا ہے۔ مجلد ۷/۰

وصایا شیخ شہاب الدین سہروردی

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے وصایا

جو اپنے اندر بڑی کشش اور دلآویزی رکھتے ہیں۔ اب تک مخطوطا کی شکل میں عربی زبان میں تھے۔ مولانا نسیم احمد امروہی نے ان کا انتخاب کر کے اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ قیمت صرف ۱/۲۵

تذکرہ حضرت صوفی عبد الرب

حضرت سید محمد عبد الرب علیہ الرحمہ کے حالات زندگی

ان کے اللہ پر ایمان کامل اور ان کی بامقصد اور اصلاحی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اس تذکرہ میں ان کی چند منتخب اصلاحی نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ خوبصورت ٹائٹل سے مزین۔ قیمت صرف ۲/۰

انسانیت زندہ ہے

از مولانا محمد منظور نعمانی۔ کتابچہ پر مولانا موصوف کے چار مضامین کا

مجموعہ، جن میں سے ہر مضمون میں مولانا نے اپنی زندگی کا کوئی خاص سبق آموز اور پر اثر واقعہ بیان کیا ہے۔ جذبۂ انسانیت و اتحاد کی افزائش کے لیے بے حد مفید کتابچہ ہے۔ قیمت ۰/۹۰

فیصلہ کن مناظرہ

اکابر علماء دیوبند پر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے تکفیری الزامات

کا تحقیقی جواب۔ مولانا منظور نعمانی کے قلم سے۔ کتاب کے مقدمہ میں بریلوی کے اس تکفیری فتنہ کی حقیقت اور اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اہل حق کو اس سے کیسے نپٹنا چاہئے۔ قیمت ۲/۵۰

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات

از مولانا منظور نعمانی۔ حضرت شاہ شہیدؒ جیسی مقدس ہستی پر جس نے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے خون کا کفن پہنا، معاندین اہل بدعت نے خوف خدا سے بے نیاز ہو کر جو مکروہ الزامات لگائے ہیں ان کا تشفی بخش اور مدلل جواب۔ قیمت صرف ۲/۵۰

بریلوی فتنہ کا نیا روپ

از: مولانا محمد عارف سنبھلی۔ (استاد دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ارشد القادری صاحب کی تصنیف "زلزلہ" کا تنقیدی جائزہ اور تحقیقی جواب۔ ہر بحث قابل دید، بصیرت افروز اور باطل سوز ہے بالخصوص "علم غیب" اور کائنات میں تصوف کے عقیدہ کی جو تنقیح کی گئی ہے وہ عوام اور اہل علم سب کے لیے اس کتاب کا خاص تحفہ ہے آخر میں بریلوی فتنہ کی تاریخ و تعارف پر ایک مفصل مضمون ہے۔ شروع میں مولانا محمد منظور نعمانی کا ایک مکتوب گرامی ہے جو اس کتاب کا پیش لفظ ہے۔ قیمت چھ روپے ۶/۰

قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟ اور مسئلہ نزول مسیح و حیات مسیح

یہ کتاب مولانا محمد منظور نعمانی کے قادیانیت پر چار اہم مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان تمام مضامین میں قرآن و حدیث اور عقل کی روشنی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل عام فہم پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ رد قادیانیت پر ایک مدلل کتاب ہے۔ قیمت مجلد مع گرد پوش ۳/۰

حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت

تالیف: مولانا سید ابو الحسن علی ندوی۔ تبلیغی تحریک کے بانی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی مکمل سوانح حیات۔ مولانا کی شخصیت ان کے عادات و اخلاق، ان کے امتیازی اوصاف، ان کے خاص افکار و نظریات، ان کی دینی دعوت کا پس منظر، اس کا ارتقاء اور اس کے اصول و طریق کار کو سمجھنے کے لیے بے مثال کتاب ہے۔ قیمت ۲/۵۰

ملنے کا پتہ

مکتبہ تجلی دیوبند

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی

فن اصول تفسیر ——— ایک جائزہ

قرآن پاک کو ایک دائمی پیغام حیات اور آفاقی لائحہ عمل تسلیم کرنے کے بعد امت مسلمہ پر خصوصاً علماء کرام پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دنیا کے نت نئے مسائل و مشکلات کا حل قرآن پاک کی روشنی میں تلاش کریں، اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ قرآن فہمی کا واحد راستہ فن تفسیر ہے حضرت ایاسؒ بن معاویہ تفسیر قرآن کی اہمیت ایک مثال دے کر واضح کرتے ہیں، فرماتے ہیں:-

مثل الذین یقرأون القران وهم لایعلمون تفسیره کمثل قوم جاءهم کتاب من ملکهم لیلاً ولیس عندهم مصباح فتداخلتهم روعة لایدرون ما فی الکتاب ومثل الذی یعرف التفسیر کمثل رجل جاءهم المصباح وقرأوا ما فی الکتاب مقدمتان فی علوم القرآن ص ۲۱۲

جو لوگ تفسیر سے واقفیت کے بغیر قرآن پاک پڑھتے ہیں، ان کی حالت اس قوم کی طرح ہے جس کے پاس رات کو بادشاہ کا فرمان آیا ہو، لیکن اس کے پاس اس کے پڑھنے کے لئے چراغ نہ ہو ... جس کے نتیجے میں اس قوم کے اندر خوف سمایا ہوا ہے اور جو لوگ تفسیر سے واقف ہیں، ان کی حالت اس قوم کی طرح ہے جس کے پاس چراغ ہو اور اس نے فرمان پڑھ لیا ہو۔

بلاشبہ ایک دور تھا جس کے اندر تفسیر کے طور پر چند الفاظ کہنے پر بھی کچھ لوگ تفسیر بالرای کا حکم لگایا کرتے تھے لیکن ہمارے قدیم علماء و مفسرین نے تفسیر بالرای کی حقیقت کو واضح کرکے اس بے جا الزام کے پرخچے اڑا دیے، غزالیؒ، ابن تیمیہؒ، بدرالدینؒ زرکشی، جلال الدین سیوطی وغیرہ وغیرہ نے اپنی تحریروں سے تفسیر صحیح اور تفسیر بالرای کے فرق کو واضح کیا،

اصول تفسیر کی ضرورت

لیکن تفسیر کا دروازہ کھولنے کے بعد اس کے اس کے اصول و قواعد کا لحاظ نہ کرنا بہت سے فتنوں کو پیدا ہونے کا سبب بن جاتا ہے اور ان اصول و قواعد کے مدون و مرتب نہ ہونے کی وجہ سے اسلام کے معاندین اور قرآن کے نادان دوستوں کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی حسب منشا قرآن کی تاویل و تحریف کریں۔ چنانچہ شروع سے لے کر اس وقت تک اگر ایک طرف ایسی تفسیریں آئیں جو

اصول وقواعد کی روشنی میں، احادیث وآثار کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئیں ہیں، تو دوسری طرف ایسی تفاسیر کی بھی کمی نہیں ہے جن کو تحریف وتفسیر بالرای کا مصداق کہا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں قرآن کا طالب علم جب تفاسیر کا مطالعہ کرتا ہے تو وسیوں اقوال اور متعارض تشریحات کو دیکھ کر انتخاب وتطبیق میں اس کی قوت فیصلہ جواب دے جاتی ہے کیونکہ اس کے سامنے وہ اصول وقواعد نہیں ہوتے ہیں جن کے ذریعہ بآسانی فیصلہ کرسکتا ہے۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض جلد باز طبیعتوں کے لئے یہ بات قرآن سے بے رغبتی کا باعث بن جاتی ہے۔

غلط فہمیوں کا ازالہ

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ صحابہ، تابعین نیز قدیم مفسرین کے یہاں تفسیر قرآن کے سلسلے میں اصول وقواعد نہیں تھے، کیونکہ یہ دعویٰ تو تفسیر سے عدم واقفیت کا ایک واضح ثبوت ہوگا۔ متقدمین کی تفسیروں کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ان حضرات کے یہاں کیسے تلے اصول تھے۔ جن کی وہ پابندی کرتے تھے۔ لیکن سوء اتفاق سے وہ اصول اب تک فنی شکل میں یکجا موزوں نہیں کئے گئے جس کی وجہ سے بہت سی تفاسیر میں بعض قواعد دانستہ یا نادانستہ طور پر نظر انداز کردیئے گئے۔ ضرورت ہے کہ ان اصول وضوابط کو متقدمین کے کلام کی روشنی میں اکٹھا کردیا جائے تاکہ مفسرین اور تفاسیر کے مطالعہ کرنے والے ان کو کسوٹی کے طور پر استعمال کرسکیں۔

اصولِ تفسیر کا دائرہ بحث

فن اصول تفسیر میں بنیادی طور پر دو چیزیں زیر بحث آتی ہیں۔ اول مفسرین کی اصطلاحات دوم علوم قرآنیہ کے اصولی مسائل۔

(۱) اصطلاحات مفسرین ہر فن کے اندر کچھ مخصوص اصطلاحات ہوتی ہے جن سے واقفیت کے بغیر اصحاب فن کا کلام سمجھنا اور ان کے کلام میں تطبیق پیدا کرنا دشوار ہوتا ہے اسی طرح مفسرین کی جو کچھ اصطلاحات چلی آرہی ہیں جن سے ناواقف ہونے کی بناپر بسا اوقات مفسرین کے کلام میں ٹکراؤ معلوم ہوتا ہے۔ ان اصطلاحات کی وضاحت اور ان میں پیدا ہونے والی تدریجی تبدیلیوں کی نشاندہی اصول تفسیر کا ایک اہم جز ہے۔

(۲) علوم قرآنیہ کے اصولی مسائل اصول تفسیر کا ایک اہم جزیہ بھی ہے کہ اہم ترین علوم قرآنیہ پر اصولی انداز کی بحث کی جائے۔ اور جزئیات وتفصیلا سے اعراض کیا جائے۔ مثلاً علوم قرآنیہ میں ایک اہم فن اسباب نزول ہے اس فن کے سلسلے میں اس طرح کی بحث کی جائے۔ کہ تفسیر میں اسباب نزول کی کتنی اہمیت ہے؟ آیت مورد نزول تک محدود رہے گی۔ یا الفاظ میں تعمیم دیکھ کر آیت کے مصداق میں وسعت پیدا کی جائے گی؟ اسباب نزول کو پیش نظر رکھ کر آیت کو کس حد تک مقید کرسکتے ہیں؟

اسی انداز کے ایک مسئلہ کو زیر بحث لاکر علامہ انورشاہ کشمیریؒ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ فرماتے ہیں۔

"ان القرآن قد یکون له معنی بالنظر الی سیاقه فاذا نظر الی شان نزوله یظهر معنه معنی آخر"

فیض الباری اول ص۱۶۳ (قرآن پاک کی آیت کے سیاق وسباق کے اعتبار سے بھی ایک معنی نکلتے ہیں۔ لیکن جب شان نزول کو دیکھے تو دوسرا معنی ظاہر ہوسکتے ہیں)

غرضیکہ اسی طرح کے اصولی مسائل زیر بحث لائے جائیں۔ تفصیلات کو (اسباب نزول کا احاطہ)

ہر آیت کے مکانِ نزول کی تعیین وغیرہ) فنِ اسبابِ نزول کے لئے چھوڑ دیا جائے۔

اسبابِ نزول کی طرح غریب القرآن بھی ایک عظیم الشان فن ہے۔ اس پر اس انداز سے گفتگو کی جائے کہ قرآن کے لغات کو حل کرنے میں احادیث کا کتنا دخل ہے؟ ادبِ جاہلیت کا کتنا دخل ہے؟ اگر ادبِ جاہلیت سے ایک معلوم ہوتا ہو لیکن احادیث دوسرے معنی کی نشاندہی کر رہی ہوں تو کیا حل ہوگا؟ لیکن غریب القرآن سے متعلق تمام احادیث و آثار کو جمع کرنا۔ قرآن کے غرائب کو اشعارِ جاہلیت کی روشنی میں حل کرنا، اور اس طرح دوسرے تفصیلی کام فنِ غریب القرآن کے دائرہ بحث میں داخل ہیں۔

اسی طرح ناسخ و منسوخ وغیرہ کے بارے میں بھی اصولی کلام ہوگا مثلاً قرآن کا نسخ کن ادلہ سے ہو سکتا ہے؟ نسخ کا معنی کیا ہے؟ ناسخ و منسوخ میں کیا کیا شرطیں ہونی چاہئیں؟ منسوخ آیت نسخ کے بعد کس پوزیشن میں رہ جاتی ہے؟

ان دونوں بنیادی چیزوں کے علاوہ اور بہت سے اصولی مسائل بھی زیرِ بحث آئیں گے مثلاً اسرائیلی روایات کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیئے اور اس قسم کے دوسرے مسائل

اختلافِ رائے اصولِ تفسیر کے موزوں ہونے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ تمام اصول و قواعد میں سارے مفسرین کا اتفاق نہیں ہے بلکہ جس طرح دوسرے فنون میں اصحابِ فن کے نقطہائے نظر میں اختلاف ہوتا ہے اسی طرح بہت سے بہت سے قواعد میں ہمارے مفسرین بھی مختلف مکاتبِ فکر میں بٹے ہوئے ہیں کیونکہ اختلاف ضروری اور فطری چیز ہے اور حدود میں رہتے ہوئے اختلاف کرنا باعثِ رحمت بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآن و حدیث کی آپس میں نسبت اور ایک دوسرے کے مرتبے کے بارے میں مسلمانوں کے دو عظیم مذاہب (حنفیہ و شافعیہ) میں اختلاف ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری اس مسئلے کے بارے میں فرماتے ہیں "ان الشافعیۃ جعلوا القرآن کالمتن والحدیث کالشرح فاخذوا المراد من المجموع ونحن اخذنا بالقرآن اولاً ثم اوجبنا العمل بالحدیث ثانیا فوضعنا ھذا فوق تلبتہ" شوافع نے قرآن کو متن کی حیثیت دی اور حدیث کو شرح کی اور دونوں کو مجموعے کو پیشِ نظر رکھ کر مصداق متعین کیا اور ہم نے (احناف نے) اولاً قرآن ثانیاً حدیث پر عمل واجب کیا لہٰذا ہم نے حدیث کو اس کے مرتبہ میں رکھا) فیض الباری اول ص ۲۳۵-۲۳۶

خلاصہ یہ ہے کہ اختلاف اصولِ تفسیر کے اندر بھی ہے اور بہت سے مسائل میں شدید علمی معرکے ہیں۔ چنانچہ ایک جماعت کا جھکاؤ روایات کی طرف زیادہ ہے دوسرے گروہ کے میلان ادبِ عربی کی طرف زیادہ ہے۔ یہ میلانات کوئی غیر معقول چیز نہیں ہیں بشرطیکہ دوسرے پہلو کو نظر انداز نہ کیا جائے اور تصویر کے دونوں رخ سامنے رہیں۔ تصویر کے دونوں رخوں کو سامنے نہ رکھا جائے تو ذہن کے اندر ہزار قسم کے وساوس ابھرا بھاریں گے اور بڑی حد تک وہ اعتماد بھی مجروح ہوگا جس کے بغیر مذہب کی دنیا آباد نہیں ہو سکتی

اگلے صفحہ کی سرخی بغلی تھی لیکن کاتب نے عنوان سمجھکر لکھدی ہے

فن اصول تفسیر کا سرمایہ

فنِ اصول تفسیر کے مبیشتر مسائل متفرق طور پر اسلامی لٹریچر میں موجود ہیں۔ کچھ اصول علوم قرآنیہ کی کتابوں کے ذیل میں درج ہیں۔ کچھ اصول تفاسیر میں مذکور ہیں۔ نیز اس فن کا اچھا خاصا مواد اصول فقہ شرح احادیث وغیرہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ لیکن اس فن کو ایک مستقل فن بنانے کی جد وجہد بہت کم ہوئی ہے۔ چنانچہ میری معلومات کی حد تک چند ہی کتابیں ہیں جن کو اہمیت دی جا سکتی ہے۔

پہلی کتاب علامہ ابن تیمیہؒ کی مقدمۃ فی اصول التفسیر کے نام سے ملتی ہے اس کتاب کے اندر علامہ ابن تیمیہؒ نے اصول تفسیر کے بعض اہم مسائل پر بڑی شرح و بسط اور احتیاط و اعتدال کے ساتھ کلام کیا ہے۔ مثلاً متقدمین کے تفسیری اختلافات کو دور کرنے کے لئے انھوں نے جو اصول و قواعد پیش کئے ہیں وہ بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کیلئے تریاق کی حیثیت رکھتے ہیں اور علامہ کی ایک منفرد بحث ہے۔

لیکن انھوں نے بہت سے مسائل کو چھیڑا بھی نہیں ہے جبکہ ان کے پیش نظر تمام اصول و قواعد کو جمع کرنا نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی کتاب کے شروع میں کتاب تصنیف کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "اما بعد فقد سألنی بعض الاخوان

ان اکتب له مقدمة تتضمن قواعد کلیة تعین علی فهم القرآن ومعرفة تفسیره ومعانیه والتمییز فی منقول ذلك ومعقوله بین الحق وانواع الاباطیل والتنبیه علی الدلیل الفاصل بین الاقاویل فان الکتب المصنفة فی التفسیر مشحونة بالغث والسمین والباطل الواضح والحق المبین"

مقدمۃ فی اصول التفسیر ص۴ طبع اول مطبع ترقی دمشق

(مجھ سے بعض بھائیوں نے التماس کیا کہ ان کے ایک مقدمہ کے اندر ایسے قواعد کلیہ لکھوں جو فہم قرآن اور تفسیر کی واقفیت میں مدد و معاون ثابت ہوسکیں اور ان کے ذریعے تفسیر کی منقولات اور معقولات کے اندر حق و باطل میں تمیز پیدا ہو نیز مختلف اقوال میں فیصلہ کن دلائل ہاتھ آجائیں کیونکہ تفسیری کتابیں قوی و ضعیف، حق و باطل ہر طرح کے اقوال سے بھری ہوئی ہیں)

علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی دوسری کتابوں اور رسالوں میں بھی بعض اہم قواعد کو واضح کیا ہے۔

لہٰذا ہم ان کو الفضل للمتقدم کے مطابق اس فن کا بانی قرار دے سکتے ہیں۔

علامہ ابن تیمیہؒ کے بعد قرآنیات پر مسلسل کام ہوتا رہا۔ لیکن اصول تفسیر کے بارے میں کوئی ایسی خدمت انجام نہیں دی گئی۔ جس کو بنیادی اہمیت دی جائے یہاں تک کہ شہرہ آفاق محدث اور اسلامی فلاسفر شاہ ولی اللہؒ کی کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر کے منظر عام پر آتی ہے جو کہ اپنے موضوع پر یکتا اور بےنظیر کتاب ہے کیونکہ اس کتاب کے اندر اصول تفسیر کے اکثر و بیشتر مسائل پر اختصار و اعتدال کیساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور شاہ صاحبؒ کا یہ کلام "و امیدوارم از عنایت حضرت باری آنست که طالب علمان را بمجرد فہم ایں قواعد راہے وسیع در فہم معانی کتاب اللہ کشادہ که اگر عمرے در مطالعہ تفاسیر یا گذرانیدن آنہا بر مفسران میسر بر ندبآں ضبط و ربط بدست نیارند،، ص۲ طبع رحیمیہ دیوبند (باری تعالیٰ کی عنایت سے امید ہے کہ محض ان قواعد کے سمجھنے سے طالب علموں کے سامنے قرآن پاک کے معانی کے سمجھنے کے سلسلے میں کشادہ راستہ کھل جائے گا۔ اگر عمر تفاسیر کے مطالعہ کرنے میں یا مفسرین سے پڑھنے میں لگا دیں تب بھی اس کو مربوط طریقے پر حاصل نہیں کر سکتے)

مبالغہ آمیزی اور تعلی پر مبنی نہیں ہے بلکہ حقیقت کا اظہار ہے۔

اگر اصول تفسیر کو ایک موزوں و مرتب فن مان لیا جائے تو اس کی تدوین کا سہرا شاہ ولی اللہؒ کے سر باندھا جائے گا۔ اور ہم سید سلیمان ندوی کے قول "مقالات سلیمان جز ۲ ص۲۹ الفوز الکبیر کو اصول تفسیر کا متن کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ شاہ صاحب نے بڑی حد تک اس فن کے اصول و قواعد بیان کر دیئے ہیں اور اس حد و ادب کی نشاندہی کر دی

خلاصہ یہ کہ شاہ صاحب کا یہی کارنامہ ان کو زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔

شاہ صاحبؒ کے بعد کافی عرصہ تک خاموشی رہی کوئی اہم کتاب اس موضوع پر سامنے نہیں آئی آخر کار مولانا عبدالحمیدؒ فراہی نے اپنا زور قلم علوم قرآنیہ پر صرف کیا اور ان کی ایک تحقیقی کتاب التکمیل فی اصول التاویل سامنے آئی۔

اگرچہ مولانا عبدالحمیدؒ فراہی کے اصولوں میں کلام کرنے کی گنجائش ہے خاص طور پر ان کے یہاں ادب کی تفسیر میں غیر معمولی دخل اندازی اور بظاہر روایات سے یکگونہ بے اعتنائی ایک بہت بڑے مکتب فکر کے نزدیک قابل اعتراض بنی ہوئی ہے اس کے باوجود اصول تفسیر اور قرآنیات کے سلسلے میں ان کی دقت نظر کا کوئی انصاف پسند آدمی انکار نہیں کر سکتا۔

موصوف نے تفسیری ذخائر کا ایک عرصہ تک تنقیدی جائزہ لیا اور مفسرین کی بہت سی لغزشوں کی نشاندہی کی۔ انھوں نے التکمیل میں "اصول التاویل اولی بان یجعل فنا مستقلا" "بیان الخلل الفاحش الذی وقع فی طریق تعلیم الدین من جعل علم التاویل مقصورا علی الفقہ" "وغایۃ ھذا العلم ھو المنع عن التفسیر بالرای" وغیرہ عناوین کے تحت اصول تفسیر کی افادیت اور اس کے اغراض و مقاصد کو استدلالی رنگ میں واضح کیا ہے۔

لیکن فن کو پورے طور پر مرتب کرنے سے پہلے ہی موصوف اللہ کو پیارے ہوگئے۔ پھر ان کی تصانیف مثلاً التکمیل فی اصول التاویل، فاتحہ نظام القرآن، دلائل النظام، اسالیب القرآن

ہے کہ [illegible] اصول تفسیر کا [illegible] سامنے آجاتا ہے اور بہت سے اصول و قواعد منضبط طور پر مل جاتے ہیں۔

(بشکریہ آئین)

مولانا مودودی کی مجلس

س ۔ بعض مذہبی عناصر معاشرے میں اسلام کی بجائے جاہلیت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ ہمارے ساتھی بھی بن جاتے ہیں اور یوں ہم اُن کے بارے میں بھی اسلامی نظام اور سالمیت پاکستان کے ہونے کا تاثر دیتے ہیں کہیں ہم نے جاہلیت سے مفاہمت تو نہیں کرلی۔

ج ۔ جاہلیت سے مفاہمت اور چیز ہے اور بعض لوگوں کے ساتھ تصادم اور مزاحمت سے بچنے کی کوشش کرنا دوسری چیز ہے ہم اپنی حد تک پوری کوشش کرتے ہیں کہ کسی کے ساتھ تصادم کی نوبت نہ آئے، اس کے باوجود بعض عناصر زبردستی لڑتے ہیں لیکن ہماری اپنی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کوئی شخص بھی جو اسلام کا کام کررہا ہے یا اسلام کا نام لیکر کام کر رہا ہے اس کے ساتھ کوئی نزاع پیدا نہ ہو۔ اگر ہم اپنا رویہ ٹھوس رکھیں۔ کسی کے اوپر حملہ نہ کریں، کسی کو گالی نہ دیں اور اس کے باوجود اگر کوئی ہمارے خلاف زبان کھولتا ہے۔ الزامات یا طعنوں کی بوچھار کرتا ہے تو یہ اس کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ ہمارا کوئی نقصان نہیں، جو لوگ حقائق کا شعور رکھتے ہیں اور اسلام کی صحیح سمجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ کوئی دھوکا نہیں کھائیں گے۔ عوام الناس کی بات الگ ہے وہ تو یہ دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں کہ یہ لوگ بھی اسلام کا نام لیتے ہیں اور وہ گروہ بھی اسلام کا نام لے رہا ہے تو پھر یہ ایک دوسرے کے خلاف بات کیوں کرتے ہیں؟ اب اگر ہم کسی کے خلاف بات نہیں کریں گے تو عوام کو ہم سے نہیں بلکہ ایسے عناصر سے ہی شکایت پیدا ہوگی۔

س ۔ اسلامی تحریک کن مراحل سے گذر چکی ہے اور کامیابی کی منزل پر پہنچنے سے پہلے ابھی کن مراحل سے گزرے گی؟

ج ۔ اسلامی تحریک مسلسل مخالفتوں کے طوفان میں کام کرتی رہی ہے اور یہ ساری مدت ایسی کشمکش کے عالم میں گزری ہے کہ کبھی مراحل گننے کی فرصت ہی نہیں ملی کہ کتنے مراحل طے ہوئے اور کتنے ہونے باقی ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر ہم ایک ہی مرحلے سے گزر رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہم خلق خدا کو زیادہ سے زیادہ اسلام کے نظام سے روشناس کریں اور ان غلط فہمیوں کو رفع کریں زندگی کے مختلف مسائل پر اسلامی احکامات کو منطبق کر کے ان کے ذہن کے مطابق انھیں سمجھا دیں کہ اسلامی نظام نہ صرف قابلِ عمل ہے بلکہ یہ بھی اچھی طرح واضح کردیں کہ وہ کس طرح قابلِ عمل ہے۔ اس کے ساتھ ہم لوگوں کے اندر یہ جذبہ پیدا کریں کہ وہ اس کو قائم کرنے کے لئے اپنی جان و مال صرف کرنے کو تیار رہیں۔ یہ مرحلہ ۱۹۴۱ء سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے مسلسل رہا ہے۔ دوسرا مرحلہ اگر آئے گا تو انشاء اللہ وہ مرحلہ ہوگا جس میں ہم کامیابی کے قریب ہوں گے۔ اس وقت کامیابی کے آثار خود ہی نظر آجائیں گے۔ موجودہ حالات میں اس کے آثار اتنے دور ہیں کہ واضح طور پر نظر نہیں آتے اور نہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کب تک وہ مرحلہ آئیگا۔ آپ لوگ بھی اس خیال میں نہ رہیں کہ وہ جلدی سے لایا جاسکتا ہے بلکہ جس طرح ہم نے اس جدوجہد میں تیس پینتیس سال گزارے ہیں۔ اسی طرح آپ کو بھی تیار رہنا چاہیئے آپ بھی برسوں اسی طرح جدوجہد کرتے رہیں اور اللہ تعالےٰ سے دعا کرتے رہیں کہ وہ مشکلات کو رفع کرے اور اتنی طاقت دے کہ اس کے دین کو اس زمین پر قائم کرسکیں۔

س ۔ ٹیلی ویژن کے ذریعے گھر گھر میں فحاشی اور دہریت کی تبلیغ کی جارہی ہے۔ اس ماحول میں جب تحریکِ اسلامی کے نئے متاثرین اور کارکنانِ جماعت کے ذمہ دار رفقا کے ہاں ٹی، وی کو نصب شدہ دیکھتے ہیں تو انھیں سخت دھچکا لگتا ہے۔ بانیٔ جماعت کی حیثیت سے آپ اس مشکل مسئلہ میں رہنمائی فرمائیں۔

ج :- میں خود اس معاملہ میں زیادہ پریشان ہوں واقعہ یہ ہے کہ جب آدمی کسی ایسے معاشرہ میں رہتا ہو جو بگڑ گیا ہو تو وہ اگر اس کی خرابیوں سے خود بھی بچ جائے تو اپنی اولاد کو بچانا اس کے لئے سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ اب اگر وہ اولاد کو بچانے کی کوشش یہ کرے کہ ان پر جبر کرے تو اس طرح ہو سکتا ہے کہ ان میں بغاوت پیدا ہو جائے اور کشیدگی اور تلخی کی فضا طول کھینچتی چلی جائے اور اولاد انتظار کرنے لگے کہ والد ماجد کا انتقال ہو تو کھل کھیلیں ——— تو ایسے حالات میں آدمی کو بہت سی چیزوں میں صبر کرنا ہوتا ہے۔ اپنی حد تک پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ آدمی اپنے گھر میں اس بلا کو نہ آنے دے لیکن آجائے تو میرے خیال میں سخت رویہ اختیار کرنے سے معاملہ بگڑے گا۔ سنورے گا نہیں۔ سمجھانے کی کوشش جاری رکھنی چاہیئے، لیکن بڑے توازن اور حکمت کے ساتھ ——— ایک معاشرہ جب ان معاملات سے گزر رہا ہو تو کسی کے ہاں ٹیلی ویژن کی چھتری دیکھ کر آپ یہ خیال نہ کریں کہ وہ خود اس بات پر راضی ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے ہاں فحش پھیلانے والی یہ چیز آئے اور موجود رہے۔ فی الحقیقت کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ کون آدمی کن کن مشکلات سے گزر رہا ہے کیا کیا دقتیں اس کو پیش آرہی ہیں اور اپنے گھر کو اس فتنے سے بچانے کے لئے وہ کیا کیا جتن کرتا رہا ہے اور اب بھی کر رہا ہے ———

بہرحال یہ ایک فتنہ ہے اور ہر ایک کوشش کرنی چاہیئے کہ جہاں تک ہو سکے خود بھی اس سے بچے اور دوسروں کو بھی بچائے ———

پھر آپ یہ بھی دیکھیں کہ مسئلہ صرف ٹیلی ویژن کا نہیں ہے۔ اگر ٹیلی ویژن گھر میں نہ بھی آنے دیا جائے تو اس ریڈیو کا کیا علاج جو ہمارے چاروں طرف بج رہا ہے اور نہایت فحش گانے پھیلا رہا ہے ہم اس شور سے اپنے کانوں کو نہیں بچا سکتے۔ تو یہ تو ایک بگڑے ہوئے معاشرے میں رہنے کے وہ نقصانات ہیں جن کا سامنا کرنے کا مسئلہ ہم سب کو درپیش ہے۔

س : اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل ہونے کے بعد بھی شیطان بعض دفعہ جاہلیت کی زندگی کی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے اس سے کیسے بچا جائے؟

ج :- اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ شیطان اپنا کام چھوڑ دے تو یہ کبھی نہیں ہوگا۔ اس کا کام تو قیامت تک رہے گا۔ آپ کے سپرد جو خدمت کی گئی ہے وہ یہ ہے آپ برابر اس کا مقابلہ کریں اور اس کو پچھاڑنے کی کوشش کریں۔ آپ اتنی طاقت اپنے اندر پیدا کریں کہ آخر کار وہ آپ کے سامنے سپر ڈال دے۔ یہ تو ایک کشمکش ہے جو زندگی بھر ایک مسلمان کو شیطان سے کرنی ہے۔ جس وقت بھی آپ محسوس کریں کہ شیطان کا کچھ برا اثر ہو رہا ہے تو فوراً سنبھلیں اور فوراً اللہ سے مدد مانگیں کہ وہ آپ کو اس سے بچنے کی طاقت عطا فرمائے۔ دعا کے ساتھ ساتھ آپ خود بھی پورے خلوص سے یہ کوشش کریں کہ شیطان کے اثر میں ہم نہ آئیں وہ دعا بالکل بیکار ہے کہ جس کے ساتھ آدمی خود کوئی کوشش نہ کرے اور صرف یہی چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کر کے اسے نیکی کے راستے پر ڈال دے چاہے وہ خود شیطان کے راستے پر جا رہا ہو ——— صحیح طریقہ یہی ہے کہ خود بھی کوشش کرنی چاہیئے اور اللہ سے مدد بھی مانگنی چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی مدد یقیناً آتی ہے۔ اگر آدمی خلوص عمل کے ساتھ دعا کرے۔

اب میں مختصر طور پر آپ سے یہ کہوں گا کہ مقصد آپ کے ہاں بھی یہی ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ چند روز ساتھ مل کر ایک جگہ رہیں۔ اپنی کمزوریوں کو ایک دوسرے کی مدد سے دور کریں اپنے اندر ایک دوسرے کی مدد سے وہ خوبیاں پیدا کریں جو دوسروں میں پائی جاتی ہیں اور اپنے ان خیالات کو جن کی وجہ سے ہم نے ایک مقصد حیات اپنایا ہے زیادہ سے زیادہ پختہ کریں۔ اپنی معلومات کو وسیع کریں اور جس نظریئے کو لے کر چل رہے ہیں۔ اس نظریئے کے بارے میں پوری پوری بصیرت حاصل کریں۔ یہ مقصد ان تربیت گاہوں کا ہوتا ہے، اخلاقی بھی اور علمی بھی۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگوں نے اس تربیت گاہ کے دوران میں یہ فائدہ ضرور اٹھایا ہوگا اور یہ محسوس کیا ہوگا کہ تربیت گاہ میں آپ کا آنا آپ کے لئے کتنا مفید ثابت ہوا ہے۔ اس سلسلہ کو آپ برابر جاری رکھیں۔

دوسری چیز جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے

کہ اس وقت نظامِ تعلیم کو اور زیادہ بگاڑا جا رہا ہے۔ نصاب کو اور زیادہ خراب کیا جا رہا ہے۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ ایسے استادوں کو لاکر مسلط کیا جائے۔ یا ایسے حکام کو لاکر یونیورسٹی پر مسلط کیا جائے جو اخلاق کے لحاظ سے بگڑے ہوئے ہوں اور خیالات کے لحاظ سے بگاڑ پھیلا رہے ہوں پھر اس کے ساتھ ساتھ پوری کوشش یہ ہو رہی ہے کہ غنڈہ گردی کر کے جو صحیح الخیال نوجوان ہیں ان کو دبا دیا جائے اور طلبہ کی بڑی تعداد کو گمراہ کر کے غلط راستوں پر لے جایا جائے اس صورتِ حال میں آپ لوگوں کے اندر بڑی استقامت ہونی چاہیے۔ بڑا حوصلہ ہونا چاہیے۔ صبر ہونا چاہیے۔ بے صبری یا جلد بازی کر کے آپ اپنا کام بگاڑ سکتے ہیں۔ اگر آپ کے اندر کمزوری آجائے تو اس کے بعد آپ ایک قدم پیچھے ہٹائیں گے تو میلوں آپ کو پسپا ہوتے چلے جانا پڑے گا۔ اس وجہ سے آپ کے اندر یہ مضبوطی بھی ہونی چاہئے خواہ کتنی ہی تکلیفیں آپ کو پہونچائی جائیں، آپ کو ڈرایا جائے دھمکایا جائے، نقصان پہونچایا جائے، لیکن آپ اپنی جگہ سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹیں بلکہ برابر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہیں اور یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر کسی شخص کے اندر اعلیٰ درجے کے اخلاق موجود ہوں اور جو خیالات وہ پیش کرتا ہو ان کے لئے اس کے پاس علمی اور عقلی حیثیت سے مضبوط دلائل بھی ہوں تو غنڈہ گردی کر کے اس کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ غنڈہ گردی ایک ایسی چیز ہے جس سے لوگوں کو مرعوب تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے دل نہیں جیتے جا سکتے۔ بلکہ غنڈہ گردی وہ چیز ہے جس سے ہر اس آدمی کے دل میں، کہ جس میں ذرہ برابر بھی شرافت کی خو بو موجود ہو، نفرت پیدا ہوتی ہے، جو نفرت طلبہ کے دل میں اس غنڈہ گردی سے قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے، وہ آپ کے اعلیٰ اخلاق اور صبر و استقامت کا انعام بن سکتی ہے۔ آپ طلبہ سے کہئے کہ کیا کسی ملک کی بھلائی ایسے لوگوں کے ہاتھوں سے ہو سکتی ہے جو اس کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اس طرح تباہ کر رہے ہوں اور ان کے درمیان اس طرح کانٹے بو رہے ہوں ——— آپ زیادہ سے زیادہ طلبہ کو اپنا ہم خیال بنائیں۔ صرف اس پر اکتفا نہ کریں کہ انتخابات کے موقع پر وہ آپ کو ووٹ دیتے ہیں اور آپ یونین کے انتخاب جیت جاتے ہیں۔ پوری کوشش کیجئے کہ زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو واقعی اپنا ہم خیال بنایا جائے جس مقصدِ حیات کی سچائی کا آپ کو یقین ہے اس مقصدِ حیات کی سچائی کو ان تک پہنچائیے۔ وہ محض ووٹ دینے والے نہ ہوں بلکہ اس نظریئے کے بھی قائل ہوں جسے ہم پوری دنیا میں پھیلانا چاہتے ہیں۔ ان کے دل میں واقعی یہ خواہش پیدا ہو اور وہ اس کے لئے کوشاں ہوں کہ اس ملک کے اندر خدا کا دین عملاً غالب ہو آپ ایک ایک چیز کی نشاندہی کر کے بتائیں کہ کس طرح نظامِ تعلیم کو، تعلیم دینے والے کو، تعلیمی ماحول کو خراب کیا جا رہا ہے اور آپ کس طرح ان خرابیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے خود بخود طلباء میں اصلاحِ احوال کی خواہش پیدا ہوگی۔ آپ کے پاس پروگرام ہونا چاہیئے کہ آپ طلبہ کو بتائیں کہ ہم جس چیز کو غلط سمجھتے اور غلط کہتے ہیں اس کے ساتھ یہ بھی بتاتے ہیں کہ کیا صحیح ہے؟ اگر آپ یہ بتائیں کہ صحیح کیا ہے اور دلیل کے ساتھ بتائیں تو یہ سب ان کے دل جیت لینے والی چیز ہوگی ——— اسی طرح اگر آپ کا کیریکٹر مضبوط ہو۔ آپ صحیح اخلاق کے ساتھ لوگوں سے پیش آئیں اور آپ کے اندر وہ کمزوریاں نظر آئیں جن کی دوسروں کے ہاں نشاندہی ہوتی ہے، تو پھر یقیناً آپ کے اخلاقی اثرات بھی پھیلیں گے اور اس کے علمی اور ذہنی اثرات بھی مرتب ہوں گے یہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جو لوگ تخریب کرنے والے ہیں ان کا چراغ اسی وقت جل سکتا ہے جب تک اصلاح کرنے والے اصلاح کی صلاحیت، یا قابلیت اور اصلاح کرنے کے لئے جو کیریکٹر درکار ہے وہ نہ رکھتے ہوں ——— اور جب ان صلاحیتوں سے آپ خالی ہیں ان کا چراغ جلتا رہیگا ——— لیکن اگر یہ قابلیت آپکے اندر اخلاقی حیثیت سے بھی موجود ہو اور علمی حیثیت سے بھی تو پھر رفتہ رفتہ ان کا چراغ جلنا مشکل ہو جائیگا [illegible] کا چراغ جل اٹھیگا ——— یہاں تک کہ پھر ان کا اپنا ماحول [illegible] سکے مسلسل جگر [illegible] انتھک محنت کی ضرورت ہے آپکو اپنے نصب العین کیلئے اپنی تمام طاقتیں، تمام صلاحیتیں، اپنی ساری قابلیتیں زیادہ سے زیادہ صرف کرکے کوشش کرنا چاہئے جتنا زیادہ کوئی شخص آپ کو اس [illegible] آتا ہو زیادہ اسکو آپ کے [illegible] اور [illegible] کا اثر قبول کرتے [illegible] جاتے ہیں کہ جات [illegible]

سید اسعد گیلانی

معیارِ فضیلت

ہر اجتماعیت میں فرد کے لئے ایک معیارِ فضیلت ہوتا ہے جس کو اختیار کر کے کوئی فرد شرف حاصل کرتا اور ترک کر کے دوچار ہوتا ہے عالمگیر سچائیاں بلاشبہ سب کیلئے اعزاز کا مشترک سرمایہ ہوتی ہیں، لیکن اس معاملہ میں بھی اسلام اور کفر کے تصوراتِ شرف و اعزاز اور معیارِ فضیلت میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور یہ فرق الٰہی ہدایات سے فیض یاب ہونے یا ان ہدایات سے محروم ہونے کا فرق ہے۔

الٰہی ہدایات سے محروم انسانی معاشرے میں فضیلت کا معیار ہمیشہ غیر معمولی صفات کی بنا پر رہا ہے، معمول سے بڑھی ہوئی ہر صفت نے انسانی ذہن کو ہمیشہ قوت سے اپنی طرف کھینچا ہے اور انسان کے ساتھ اپنے غیر معمولی جذبات عزت و نفرت یا خوف و حقارت وابستہ کرنے پر مجبور ہوتا رہا ہے۔ پرانی تہذیبوں اور تاریخ انسانی میں مختلف معاشروں کے تصوراتِ عبودیت پر بھی اگر نظر ڈالی جائے تو عجیب و غریب قسم کے خاکے مرتب ہو کر سامنے آتے ہیں۔ یونانی علم الاصنام اور ہندو میتھالوجی کا سرسری مطالعہ ہمارے سامنے [illegible] تصوراتِ فضیلت کے معیار لاتا ہے جن کی تعداد کا گننا ایک امر محال ہے۔ انسان کے لئے اپنے دور جاہلیت اور بے شعوری میں ہر غیر معمولی چیز اور صفت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا اس کا ایک عام طرز عمل رہا ہے، خدا کی ہدایت سے محروم حالت میں ہر غیر معمولی حسین، دلکش، قوی یا نافع، مضر، خوفناک، ہیبت ناک، چمکدار، قیمتی اور نایاب

چیز کے سامنے سرِ عبودیت جھکا دینا انسان کے دورِ جاہلیت کی ایک معمولی لیکن افسوسناک یادگار ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کے ہاں غیر معمولی صفات کی ہر چیز دیوتاؤں میں شامل ہوتی چلی گئی اور فضیلت کا یہ معیار اتنا وسیع ہوا کہ پیپل، [illegible] چوپائے، حسین عورتیں، ظالم مرد، آتش فشاں پہاڑ، دریا، بارش برسانے والے بادل، سمندر، چاند، سورج، ستارے، زمین اور نہ معلوم کیا کیا کچھ ان کی ذہنی پستی سے سند فضیلت حاصل کر کے مقام عبودیت پر فائز ہوتے چلے گئے۔ ان کے ہاں جو غیر معمولی آمادہ دیوتا اور دیوی ہی بن کر رہا، یونانیوں نے بھی اسی طرح دیوی اور دیوتا بنائے رہے یہاں تک کہ ان کے اپنے آباؤ اجداد جو ذرا نیک اور مشہور ہو سکے وہ بھی ان کے صنم خانوں کی زینت بن گئے یہ خالص مشرکانہ معیارِ فضیلت رہا ہے۔ حضرت ابراہیم بھی معرفت الٰہی کے جن تدریجی مراحل میں گزرے ہیں ان مدارج میں بھی چمکتی ہوئی اور بڑی چیز معیارِ فضیلت کے سامنے آئی۔

" ھذا ربی ھذا اکبر " سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے

ہم پھر مختلف معاشروں میں فضیلت کے اس معیار کو مختلف انداز اور مختلف شکلوں میں پاتے ہیں۔ قبائلی زندگی میں سب سے زیادہ فضیلت اس کی رہی جو فنونِ سپہ گری میں طاق اور شجاعت میں بہادری میں نامور رہے بعض لوگوں کے نزدیک کسی مخصوص خاندان یا برادری یا نسل میں پیدا ہونا وجہ فضیلت سمجھا جاتا رہا کسی نے کسی خاص قوم سے وابستگی، کسی خاص ملک کی پیدائش کسی

خاص خطۂ زمین سے تعلق کو وجہ فضیلت قرار دے لیا۔ کسی نے رنگ کی سرخی اور سفیدی، زردی اور سیاہی کو ہی انسانی بڑائی اور چھٹائی، فضیلت اور کہتری کا معیار قرار دے لیا۔ کسی کے نزدیک کسی دریا کے پار کسی پہاڑ کی چوٹی یا کسی سمندر کے کنارے کی رہائش ہی بزرگی کے لئے دلیل بن گئی۔

پھر ملوکیت کے دور سے گذر کر آج کی سرمایہ دارانہ جمہوریتوں میں اب فضیلت کا پیمانہ زر ہو گیا ہے، کاریں، بنگلے، بھاری بینک بیلنس، کلبوں کی ممبریاں، پارٹیوں کی شرکت، اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں رہنا ہی وجہ افتخار بن گیا اور کسی کے گھٹیا سمجھے جانے کے لئے یہ بہت کافی قرار پایا کہ اس کے پاس عمدہ سے عمدہ سوٹ نہ ہوں اور وہ بہتر سے بہتر ہوٹلوں میں دوستوں کو دعوت نہ دے سکتا ہو۔ اور نہ ہی آج کی زر کشی کی تفریحات اور روپے کے مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتا ہو

پھر ان ہی سرمایہ دارانہ لادینی جمہوریتوں میں علم و فن کے اس استعمال کو بھی قابل فخر اور موجب افتخار سمجھا جاتا ہے کہ آدمی پوری خوبصورتی سے جھوٹ بول سکتا ہو، اور اس جھوٹ کو سچ کے لبادے میں پیش کرنے کی مہارت تامہ رکھتا ہو۔ مکاری اور عیاری میں طاق ہو فریب اور دھوکے میں ید طولیٰ رکھتا ہو، وعدہ صرف اس لئے کرے کہ اسے پورا کرنا مقصود نہ ہو، اور اس اخلاقی اقدار اس کے نزدیک محض اضافی حیثیت رکھتی ہو۔ ایسا شخص ایک عمدہ ڈپلومیٹ اور معزز سیاست داں سمجھا جاتا ہے اور اس کا یہ حق ہو جاتا ہے کہ وہ ملکی اور قومی معاملات میں ماہرانہ، قائدانہ اور لیڈرانہ حصہ لے اور قوم اور ملک کی رہنمائی کرے۔

جدید تصور قومیت میں آکر نسل، رنگ، وطن اور زبان کو مستقل معیار فضیلت بنا لیا گیا ان معیاروں کی اوٹ میں ہر گورے کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ کالے اور زرد رنگ کو ختم کر دے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ دوسری قوم کے زن و مرد کو توپوں سے اڑا دے، ہر ملک کو حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ دوسرے ملک کی زمینوں اور باغات کو آگ میں جھونک دے۔ اور ہر زبان بولنے والے کو حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ دوسری زبان بولنے والوں کو کتوں سے بھی بدتر سمجھے۔ اگر ہم ان معیاروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں تو ان کا کھوٹ پوری طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی خاص سرزمین پر پیدا ہونے کے باوجود کئی ہزار مربع میل کے رقبہ کو اپنا وطن قرار دے سکتا ہے تو وہ اسی دلیل کی رو سے سارے کرۂ ارض کو اپنا وطن کیوں نہیں قرار دے سکتا؟ اگر ایک ہی خیال مختلف زبانوں میں ادا ہو سکتا ہے اور مختلف زبانیں بولنے والے اس ایک خیال پر متفق ہو سکتے ہیں تو پھر زبان کو افتراق و جدائی کا مظہر قرار دینا بہت بڑی کوتاہی ہے انسان میں اصل قوت کار اس کی روح ہے جسم نہیں اور روح کا کوئی رنگ نہیں ہے۔ جس طرح ہم سرخ اور سفید گائے کے دودھ میں فرق نہیں کرتے اسی طرح کالے اور گورے انسانوں میں بھی اس کے رنگ کی بنا پر فرق کرنا سب سے بڑی کوتاہ بینی ہے۔ اسی طرح نسل کا افتخار بے معنی ہے۔ اگر ہم نسل کے سلسلے کو آخری حدود تک لے جائیں تو سب انسانوں کے رشتے ان کے پہلے باپ اور ماں سے جا ملتے ہیں۔ اس طرح فضیلت کے ان معیاروں کا کھوکھلا پن کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

اسی لئے فضیلت کے ان لاتعداد معیاروں کے ڈھیر پر اسلام یک قلم خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ وہ اپنا ایک نرالا فلسفۂ فضیلت اور نرالا ہی معیار بزرگی رکھتا ہے۔ وہ تمام ایچ پیچ اور فضیلت کے ان بودے پیمانوں کو توڑ کر اپنا الگ پیمانہ پیش کرتا ہے۔ وہ عین اس عالم وجود کے وسط میں حیاتِ انسانی کے سینے پر اپنا میزانِ فضیلت گاڑ دیتا ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ — تم میں سب سے معزز وہی ہے جو سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا ہے

حضورؐ نے فرمایا "پرہیزگاری کے سوا اور کسی چیز کی بنا پر ایک شخص کو دوسرے شخص پر فضیلت نہیں سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔"

فرمایا "کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر تم سب آدم کی اولاد ہو۔" فتح مکہ کے موقع پر یہ سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ، خون اور مال کا ہر دعویٰ، آج سب کے سب آج میرے ان قدموں کے نیچے ہے۔"

پھر فرمایا

"اے لوگو تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے بنے تھے، نسب کے لئے کوئی فخر نہیں ہے عربی کو عجمی پر [illegible]

کوئی فخر نہیں ہے تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

اسلام نے فضیلت کے تمام غیر الٰہی نظریات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ نسل کے بُت پر اس نے یہ کہہ کر ضرب لگائی۔

خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ	"خدا نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا
وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ	کیا پھر اُن سے اس کا جوڑا پیدا کیا
مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً	اور ان دونوں سے بہت مردوں اور عورتوں
(النساء)	کو دنیا میں پھیلا دیا۔"

مزید ارشاد ہوا۔

"اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو درحقیقت تم میں سب سے معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔" (سورہ الحجرات)

حضورؐ نے فرمایا:۔

جس نے عصبیت پر جان دی وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے عصبیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

مزید فرمایا:۔ "وہ شخص ہم میں سے جو لوگوں کو عصبیت کی طرف بلاتا ہے۔"

غرض بحیثیت انسان اور آدم کی اولاد ہونے کے اسلام میں کسی شخص کو کسی دوسرے شخص پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اسلامی معاشرے میں انسان کے بنیادی حقوق سب کے لئے مساوی اور برابر ہیں۔ اسلامی نظام میں کسی کے بچوں کو اس لئے بہترین تعلیمی اور رہائشی سہولتیں میسر نہیں آسکتیں کہ وہ بچے امیر المومنین کے بچے ہیں اور کسی کے بچے صرف اس لئے گلیوں میں خاک چھانتے نہیں پھر سکتے کہ وہ کسی غریب کی اولاد ہیں۔ اسلام میں ہر فرد کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ تمام امتیازات سے قطع نظر اپنا حصہ وصول کرے اور اپنے طبعی جسم کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی ضروریات کو حاصل کرے ریاست کے قانون میں دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔

خاندان اور قوم کے فخر کے غباروں میں سے بھی اسلام نے ہوا نکال دی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "اے عبد المطلب کی اولاد اپنے نفسوں کو آگ سے بچاؤ کیونکہ میرا رشتہ تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔" پھر فرمایا "اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ دوزخ سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر، کیونکہ میرا رشتہ تجھ کو خدا کے ہاں مفید نہیں ہو سکتا۔

لیکن اگر کچھ مفید ہو سکتا ہے اور جو کسی کے لئے وجہِ فضیلت بن سکتا ہے۔ تو وہ "تقویٰ" ہے چنانچہ اسلام کے ہر داعی، حضرت نوحؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت زکریاؑ سب نے اپنے اپنے دور میں اپنی اپنی قوم کو اللہ کی عبادت اور اس کے تقویٰ کی طرف ہی بلایا۔

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حکم ہوا: "اے چادر لپیٹنے والے کھڑا ہو اور لوگوں کو ڈرا۔"

چنانچہ اللہ کی عبادت اور بندگی ہی وہ ایک معیار ہے جو انسان اور انسان میں فرق پیدا کرتی ہے۔ بحیثیت انسان کے ایک کافر بھی اور ایک مومن بھی، ایک سرکش بھی اور ایک اطاعت گزار بھی دونوں خدا کے بندے ہیں۔ لیکن بحیثیت بندوں کے ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ عبادت کا مطلب صرف رکوع و سجود اور تسبیح و تہلیل تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ بھی خدا کی اطاعت اور بندگی سے باہر نہ ہو اور خدا کی عین مرضی کے مطابق کام کرے انفرادیت اور شخصیت ہی نہیں بلکہ اجتماعیت میں بھی انسان کی سیاست، معیشت اور معاشرت کی گاڑی اسی کی اطاعت کی پٹڑی پر چلے۔

اس انفرادی اور اجتماعی عبادت کو بجا لانے کے سلسلے میں جس سعی و جہد، جس ذوق و شوق، جس عشق و محبت جس ایثار اور جان نثاری کا اظہار کسی شخص سے ہوگا اسی قدر فضیلت کے ترازو میں اس کا وزن زیادہ نکلے گا۔

لیکن عبادت کو خالص اور زندگی کے ہر پہلو پر اثرات جاری کرنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایمان ہے اللہ تعالیٰ کی تمام صفات پر پورا یقین و اعتماد، اس کی رزاقی پر مکمل بھروسہ اس کے عالم الغیب ہونے پر پورا یقین اس رحیم و کریم ہونے پر اعلیٰ درجہ کا توکل، اس کے [illegible]

جو اللہ دین ہونے پر سچے دل سے پختہ یقین اس کے احکام پر عمل کرنے کا انتہائی ذوق و شوق اور ان سے انحراف کرنے سے شدید خوف و ہراس، اس کی حرام کردہ چیزوں سے کلی اجتناب اور اس کے اوامر پر عمل کرنے کی بے انتہا تڑپ اس کی پسند کو دل سے اچھا پسند سمجھنا، اور اس کی ناپسند کو اپنی روح کی گہرائیوں سے ناپسند کرنا، اس کی وفاداری کے مقابلہ میں دوسری تمام وفاداریوں کو ہیچ سمجھنا اور اس کی اطاعت کو تمام اطاعتوں پر حاوی کر دینا۔ غرض ایمان کی ان ٹھوس بنیادوں پر عمل استوار کرنا ہی حقیقی مسلم ہونا ہے۔ اللہ کے حکم کے تحت کسی سے جڑ جانا اور اسی کے حکم کے تحت کسی سے کٹ جانا اور عمل کے ہر گوشے سے اس بات کا اظہار ہونا کہ اس کے دل و دماغ کے کسی کونے میں غیر الٰہی تعبد و اطاعت کا کوئی اثر باقی نہیں رہا ہے۔ مسلم ہونے کی ان ضروری شرائط کے ساتھ جب اللہ کے ڈر اور خوف کی اتنی آمیزش ہو جائے کہ انسان ہر دم اس کے احکام پر عمل کرنے کے لئے کمربستہ رہے، اس کے ہر فعل سے مکمل اطاعت خداوندی کا اظہار ہو، اسے خدا کے ہاں جواب دہی کا احساس ایک جیتا جاگتا جذبہ اور ایک زندہ بولتی حقیقت ہو، اس کی حس اتنی تیز ہو کہ وہ خدا کے حکم سے خفیف سے خفیف غیر شعوری انحراف کو بھی اپنے نفس کی دنیا میں جانچے اور اسے وہیں قتل کر دینے پر آمادہ رہے، وہ پوری ذمہ داری سے اپنی زندگی کا بار بار جائزہ لے اور ہر گھڑی محاسبہ کرے کہ اس کی کوئی حرکت منشائے الٰہی کے خلاف نہ ہو تو اسی کیفیت کا نام تقویٰ ہے اور اسی پر فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ اسی تقویٰ کو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے معیارِ فضیلت قرار دیا ہے اور اسی کیفیت کو سندِ بزرگی عطا کی گئی ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ کی نارا[illegible] سے بچو۔ [illegible] کے غضب سے ڈرتا ہے ۔ پورا پورا [illegible] پرہیزگاری مراتب کو [illegible] [illegible] کے اخلاق اچھے [illegible] [illegible] ہو [illegible] کے [illegible]"

ایک [illegible] نے [illegible] اور نیک حاکم کو جنتی قرار دیا۔ [illegible] مسلمانوں کے ساتھ مہربانی کرنے والے، نرم دل آدمی، عیال دار، پاکدامن اور سوال سے بچنے والے کو بھی جنت کی خوشخبری دی۔ اس لئے کہ یہ صفات تقویٰ کی ضرورت، شرائط، گزر ہے، شعور، آوارہ گرد، تنقیصات کرنے والے اور دھوکہ دینے والے کو دوزخ کی وعید سنائی گئی، اس لئے کہ یہ صفات تقویٰ کی عین ضد ہیں۔

پھر فرمایا: "جس کو آخرت کا خیال ہو اللہ اس کے سارے کام درست کر دے گا اور جو دنیا کے غم میں پریشان ہو اللہ اس کے سارے کام پراگندہ کر دے گا۔"

فرمایا: "معاہدہ پورا کرو۔ خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔"

فرمایا: "جاہلیت کے تمام مفاخر بند کئے جاتے ہیں۔"

ایک موقع پر فرمایا: "خدا کے نزدیک معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔"

اسلام کے پیشِ نظر صالح افراد کو چن چن کر اوپر لانا ضروری ہے تاکہ دنیا میں اصلاح کریں اور امن قائم کریں اور انسانوں کو انسانیت کا سبق دیں۔ تقویٰ کے اس معیار پر اگر ایک حبشی بھی پورا اترتا ہے تو وہی امیر بننے کا حق دار ہے۔ حضور نے فرمایا: "اگر تم پر کسی حبشی کو بھی امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہیں چلائے تو اس کی بات ماننا اور اطاعت کرنا۔"

پھر کسی فاجر کی قیادت قبول کرنے سے منع فرمایا: "کوئی اجڈ گنوار کسی مہاجر کا امام نہ بنے اور نہ کوئی فاجر شخص کسی پارسا مومن کا۔"

قرآن میں فرمایا گیا:

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔

"اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی دوست اور محبوب نہ رکھو اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو محبوب رکھیں اور تم میں سے جو کوئی ان کو محبوب رکھے گا وہ ظالموں میں شمار ہوگا۔"

فرمایا گیا: "جو اپنے عہد کو پورا کریں اور اللہ تعالیٰ سے ڈریں تو اللہ ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

تم ہو [illegible]

عبودیت، میرا مرنا اور جینا سب کچھ اللہ کے لئے ہے اور سب سے پہلے میں اس کی اطاعت میں سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

حکم ہوا " اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو کہ تمہیں اس سے ملنا ہے "

(سورہ بقرہ) اللہ سے ڈرو وہ جلد حساب چکانے والا ہے۔"

(سورہ مائدہ)

یہ احکام انسان کو اس کے معیارِ فضیلت کی طرف بلاتے ہیں چنانچہ اس معیار سے ہٹ کر اگر کوئی یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ وہ فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اسے جہنم کی آگ نہ چھوئے گی یا فلاں بزرگ سے اس کا رشتہ ہے اس لئے وہ اسے چھڑا لیں گے یا محض مسجد بنوا کر یا عید میلاد کا جلسہ کروا کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے تقویٰ کا حق ادا کر دیا اور پھر اپنی ساری زندگی کو بکری کے لئے لئے پھرے اور جو جس طرح چاہے اس کی زندگی کو چند ٹکوں کے عوض استعمال کرے تو اس قسم کا فالج زدہ تقویٰ تو شاید ہی خدا کی میزانِ عدل میں کوئی وزن پا سکے۔ اصل تقویٰ تو وہی ہے کہ انسان کی زندگی کا اندر اور باہر ان حدود کے اندر ہے جو خدا اور ان کے رسول نے مقرر فرما دی ہیں۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابیؓ بن کعب سے تقویٰ کا مفہوم پوچھا۔ انھوں نے فرمایا " امیر المؤمنین آپ کبھی ایسے راستے سے گزرے ہیں جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں؟"

حضرت عمرؓ نے فرمایا " ہاں"

حضرت ابیؓ نے پوچھا " آپ وہاں سے کیسے گزرتے ہیں؟"

حضرت عمرؓ نے فرمایا " دامن سمیٹ کر اور بچا کر گزر جاتا ہوں۔"

حضرت ابیؓ نے فرمایا " یہی تقویٰ ہے۔"

یعنی انسان خدا کے احکام کی خلاف ورزی سے بچ بچ کر حدودِ شریعت کے اندر رہتا ہوا زندگی گزارے۔ اس طرح اسلام نے فضیلت و بزرگی کے تمام جاہلی پیمانوں کو توڑ پھوڑ دیا اور اپنے معیارِ فضیلت پر جو معاشرہ تعمیر کی اس میں ایران کے سلمان بھی تھے جو اپنے آپ کو ابنِ اسلام کہتے تھے اور جن کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ سلمانؓ ہم اہلِ بیت میں سے ہیں۔ اس میں بلالِ حبشی تھے جن کا لقب شاہانِ ایران کے ... کے ... بھی تھے جن کے متعلق حضرت

عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ بلالؓ ہمارے آقا کے غلام اور ہمارے آقا ہیں۔ اس میں روم کے صہیبؓ بھی تھے جنہیں حضرت عمرؓ نے اپنی جگہ امامت کے لئے کھڑا کیا تھا۔ اس میں حضرت ابوحذیفہؓ کے غلام حضرت سالمؓ بھی تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے انتقال کے وقت فرمایا کہ آج وہ زندہ ہوتے تو میں انھیں خلافت کے لئے نامزد کرتا۔ اس میں زیدؓ بن حارثہ ایک غلام بھی تھے جن سے رسولِ کریمؐ نے اپنی پھوپھی کی لڑکی کو بیاہ دیا تھا۔ اس میں حضرت زید کے بیٹے حضرت اسامہ بھی موجود تھے جنھیں رسول کریمؐ نے ایسے لشکر کا سردار بنایا تھا جس میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر فاروق جیسے صحابہ کبار موجود تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا کہ " اسامہ تجھ سے اور اس کا باپ تیرے باپ سے افضل ہے۔"

فتح مکہ کے موقع پر خود قریش نے قریش پر غلبہ حاصل کیا تھا اور ایک اعلیٰ تر مقصد کے لئے خود انہوں کو مغلوب کیا تھا۔

ایک غزوہ میں عبداللہ بن اُبی مشہور منافق نے کہا تھا " مدینہ میں پہنچ کر جو ہم میں عزت والا ہوگا وہ ذلت والے کو نکال باہر کرے گا۔" اور جب اس بات کی خبر اس کے لڑکے عبداللہؓ کو ہوئی تو انھوں نے مدینہ پہنچ کر باپ کا راستہ روک لیا اور تلوار سونت کر کہا کہ " تو مدینہ میں نہیں گھس سکتا جب تک رسول اللہؐ اجازت نہ دیں، تو کہتا ہے جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو نکال باہر کرے گا تو تجھے معلوم ہو کہ عزت صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے ہے۔" حضورؐ کے حکم پر ہی انہوں نے اپنے باپ کو شہر میں داخل ہونے دیا۔

ایک موقع پر جبکہ حضورؐ قریش کے کچھ سرداروں کو دعوتِ اسلام دے رہے تھے اور اس مجلس میں ابوجہل، عتبہ اور شیبہ جیسے اکابرِ قریش بھی تھے کہ حضرت ابن مکتومؓ نابینا صحابی تشریف لائے اور حاضرین کو نہ دیکھنے کی وجہ سے حضورؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ حضورؐ نے سردارانِ قریش کو دعوتِ اسلام دینے کے خیال سے حضرت ابن مکتومؓ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس پر تادیبی آیات نازل ہوئیں۔

یہ تھا وہ معاشرہ جو اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ

کے اصول پر تعمیر ہوا تھا اور جس اصول پر اگر کوئی اسٹیٹ وجود میں آتا ہے تو اس کے کارکن، اس کے جج، اس کے حاکم اور اس کے سپاہی بالکل مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں حتیٰ کہ آج کا ایک قاضی بھی اپنے موجودہ اخلاق کے ساتھ اسلامی عدالت کا کلرک اور چپڑاسی کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اسلام جانی بوجھی اچھائیوں اور نیکیوں کو معروف کا نام دے کر ان پر انسان کو اکساتا ہے اور جو لوگ اس مقصد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں انھیں بھلا آدمی اور متقی قرار دیتا ہے اور اسی طرح جانی بوجھی ہوئی برائیوں کو منکر کا نام دے کر انسانوں کو ان سے روکتا ہے اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کو بُرے لوگ اور فاسق و فاجر قرار دیتا ہے۔ یہی وہ میزانِ فضیلت ہے جو اسلام نے زمانے کے سینہ میں ہمیشہ کے لئے گاڑ دی ہے۔ اور جسے اس لئے تا قیامت قائم کر دیا گیا ہے تاکہ بنی نوع انسان اس میں اپنے آپ کو تول سکیں۔ اسی میں تول کر اپنے حاکموں نمایندوں کو مقرر کریں۔ اسی میں تول کر وہ کسی کو معزز قرار دیں اور اگر کسی کو گرا ہوا سمجھیں۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اسی میزان کو اپنے درمیان سے اکھاڑ دیا جو خیر امتہ کے مخاطب تھے اور جنھیں شہداء علی الناس کا منصب دیا گیا تھا ظاہر ہے کہ اس کے بعد اگر دنیا گمراہی میں سیلوں دور نکل گئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ جب رہنما ہی منزل کھو بیٹھے تو راہرو کی منزل سے دوری حیرت انگیز نہیں ہے۔ اسی میزانِ فضیلت سے ہٹ کر دنیا نے نسل اور رنگ اور وطن اور زبان کو قومیت کی بنیاد بنایا اور پھر اسی بنا پر ہزاروں جنگیں لڑی ہیں اور تباہیوں کے سیل امنڈا منڈ کر آئے ہیں اور انسانیت کو خاک و خون میں نہلا کر لے گئے ہیں۔ نسل انسانی نے ہزار بار تباہی کا سامنا کیا ہے اور ہزار بار وہ پھر اسی تباہی کے منبع کی طرف لپک کر گئی ہے۔ اس لئے کہ امن و عدالت اور ریاستی و صداقت کے ترازو میں انسانوں کا تلنا موقوف ہو گیا ہے اور فضیلت کے پیمانے اب بگاڑ ہی رائج ہو گئے ہیں جو ہمیشہ گمراہ انسانوں کے من بھاتے پیمانے رہے ہیں یعنی جاہلی عصبیت کے ترازو ہیں۔ ان ترازوؤں میں تل تل کر انسان ایک دوسرے پر ایٹم بم اور مشین گنیں لے لے کر دوڑتے ہیں اور ہر وقت تاک میں لگے رہتے ہیں کہ کب ان کا داؤ لگے اور وہ حریف کے کیمپ کو شعلوں کے حوالے کر دیں۔

اس عصبیت اور قوم پرستی نے ایسے لوگ جو سب سے زیادہ شریر، فسادی، ناخدا ترس، مکار و شاطر، وعدہ خلاف اور فریبی تھے۔ ہر جگہ ہر قوم میں انسانی گروہوں پر مسلط کر دیئے ہیں۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک زمین کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں ایسے بھیڑیئے اور ڈاکو اقتدار کی باگیں ہاتھوں میں لئے بیٹھے ہوں جن کے ذہن دن رات یہی سوچنے میں مصروف ہیں کہ وہ کس طرح دنیا پر آگ کی بارش کر سکیں اور کس طرح انسانوں کی پوری پوری آبادیاں ایک ہی وار میں ہلاک کر سکیں۔ جن کے ایجادات کا سب سے بڑا کمال انسانوں کو ہلاک کرنا، زیادہ سے زیادہ تباہ کرنا، اور انتہائی سرعت سے ختم کرنا ہو۔ جن کی سائنس نے اب تک سب سے بڑے کمالات ہلاکت انسانی میں ہی دکھائے ہیں جن کی تہذیب ہلاکت، بناوٹ اور دکھاوے کے سوا اور کچھ نہیں ہے جن سے بڑا ظالم اور خونخوار ڈاکو آج تک زمانے میں نہیں پیدا ہوا اور جن سے بڑا آدم خوار بھی کوئی نہیں ہوا۔ جو سب سے بڑے درندے اور بھاری قاتل ہیں۔ آج دنیا کی سربراہی انہیں کے ہاتھوں میں ہے امریکہ میں وہ ایٹم بم بنا رہے ہیں اور روس میں وہ خلائی جہاز تیار کر رہے ہیں کہ کب دنیا میں آگ و خون کا کھیل شروع ہو اور وہ اپنے اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ایک بار پھر دنیا کو جہنم زار بنا دیں یہ صرف اس لئے ہے کہ اسلام کی پیش کردہ میزانِ فضیلت گر گئی ہے اور اس میں دنیا کی قومیں تو الگ ہیں خود مسلمانوں نے بھی اپنے آپ کو اور اپنے اکابرین کو تولنا چھوڑ دیا ہے۔ اس میزان کی عدم موجودگی نے دنیا کی سب سے اونچی صف میں سب سے زیادہ خونخوار اور بداخلاق لوگوں کو جمع کر دیا ہے

تاریخ گواہ ہے کہ زمانے کا دامن ایسے لوگوں سے کبھی خالی نہیں رہا ہے جنھوں نے بار بار اس میزانِ فضیلت کو قائم کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ حضرت امام حسینؓ نے دیکھا کہ اسلام کے نظامِ امامت میں تقویٰ کی میزان گرا کر اس کی جگہ نسل کا معیار قائم کیا جا رہا تھا اور اگرچہ اس وقت قرآنی قوانین ریاست کا آئین تھے۔ تمام فیصلے شریعت کے ماتحت ہی ہوتے تھے لیکن امام حسینؓ انسانوں کے درمیان فضیلت کے ترازو کا اتنا سا

جہاد بھی برداشت نہ کر سکے اور ڈٹ گئے میدان میں جا ہلی ملت کو جاہلیت کو چیلنج کر دیا اور بہتر پاکباز ساتھیوں کے ساتھ فلاح انسانیت کے اس سنہری اصول کے لئے جان دے دی۔

منصور عباسی کے دور میں کوڑوں کی مار نے امام ابو حنیفہؒ کا خون ایڑیوں تک بہا دیا لیکن انہوں نے فضیلت کے لئے تقویٰ کو ہی معیار قرار دیا۔ امام احمد بن حنبلؒ بیس سال تک مسلسل مار کھاتے رہے اور شدید سزائیں بھگتتے رہے لیکن انہوں نے حق کو اس لئے نہیں چھوڑ دیا کہ اس کی مخالفت ایک بادشاہ کی طرف سے کی جا رہی تھی۔ اسی معیار کے قیام کے لئے امام ابن تیمیہؒ نے جیل میں جان دے دی۔ ابراہیم نخعیؒ اسی معیارِ فضیلت کا اظہار کر کے منصور عباسی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے اسی معیارِ فضیلت کو قائم کرنے کے لئے جہانگیر کی جیل میں دن رات گزارے۔ امام غزالیؒ نے تو بادشاہ کے روبرو صاف صاف کہہ دیا "تیرے گھوڑوں کی گردن سازِ زریں سے ٹوٹ گئی تو کیا ہوا؟ مسلمانوں کی گردن تو فاقہ کشی کی مصیبت سے ٹوٹ گئی"

اسی میزانِ بزرگی کو پھر نصب کرنے کے لئے بالاکوٹ کے شہیدوں نے جانیں دیں۔ آج اسی میزانِ فضیلت کو قائم کرنے کا دعویٰ لے کر جو لوگ اس ملک میں کام کر رہے ہیں ان کی دعوت یہ ہے کہ دنیا کی باگ ڈور جو فساق و فجار کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے یہی تمام فتنوں کا منبع ہے۔ وہ تمام بندگانِ خدا کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں ایک نصب العین کے ساتھ اپنی تمام قوتیں لے کر اٹھیں اور دنیا کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھوں سے چھین لیں جن کے ہاتھوں میں اقتدار کا رہنا دنیا کی تباہی ہے۔ وہ ہاتھ چاہے غیر مسلموں کے ہوں جن کے لئے سب کچھ حلال ہے اور چاہے مسلمانوں کے ہوں جنہوں نے اپنے لئے ہر حرام کو حلال کر لیا ہے۔ بہر حال اب دنیا کے امن کے لئے اور فلاحِ انسانیت کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ لوگ آگے آئیں جو خدا سے ڈرنے والے اور آخرت میں جواب دہی کا پورا پورا احساس رکھنے والے ہوں، جو نیک اور صالح ہوں۔ اور وہ لوگ پیچھے ہٹیں جنہوں نے اپنے نفس کے سامنے فتنوں کے سارے دروازے کھول رکھے ہیں اور حق کے دشمنوں کو شیطان نے اپنا گھر بنا رکھا ہے۔ اگر دنیا کو تباہی کی طرف جانے سے روکنا ہے اور اگر خدا کی زمین کو انسانی خون سے لالہ زار ہونے سے بچانا ہے۔ اگر مسلمانوں میں اپنے معروف کے علمبردار ہونے اور منکر کے ختم کرنے والے ہونے کا احساس باقی ہے اور خدا کے ہاں جواب دہی کا تصور بھی موجود ہے تو پھر کرنے کا کام یہی ہے کہ وہ لوگ جو خدا کے مقرر کردہ اس میزانِ فضیلت کو قائم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہوں وہ اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ جس دن یہ ہوگا اس زمین پر خدا کی مرضی اس دن پوری ہوگی۔

(بشکریہ امین)

ہیبت حق کی دو لہریں

ہم خوش نصیب ہیں کہ ایک نصب العین رکھتے ہیں۔
لیکن یہ بھی جان لینا چاہیے کہ اپنے نصب العین کے اولین مخاطب ہم خود ہیں۔
ہمارے مقصدِ حیات کا تقاضا ہی یہ ہے کہ سب سے بڑھکر ہمیں اپنا محاسبہ کرنا ہے۔
یہ کوئی مجبوری نہیں ہے لیکن ایک ضرورت ضرور ہے کہ اس کارزارِ حیات میں ہم اپنے آپ کو نہ بھول جائیں۔

ہم جانتے ہیں کہ جس چیز کو ہم نے اپنا مقصدِ حیات قرار دیا ہے، مقصدِ حیات اسی کو ہونا چاہیئے۔
ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ جس نصب العین کو اپنا کر ہم چل رہے ہیں، نصب العین اگر ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے۔
ہم اپنی سچائی سے باخبر ہیں۔
اور اسی لئے ہر اہم موڑ پر ہم اپنا جائزہ لینے کے پابند ہیں۔
ہمیں قدم قدم پر دیکھنا ہے کہ کیا ہم نے اپنا سب کچھ اس نصب العین کو سونپ دیا ہے یا اپنے لئے بھی کچھ بچا رکھ چھوڑا ہے۔
اس چیز کو سمجھنا کچھ مشکل بھی نہیں ہے
اگر کوئی آپ کی ذات پر حملہ کرتا ہے اور آپ بھڑک اٹھتے ہیں۔
اگر کسی چوٹ کی زد آپ پر پڑتی ہے تو آپ غیظ و غضب سے کانپ اٹھتے ہیں۔
تو تسلیم کر لیجیے کہ ابھی آپ نے اپنے لئے بہت کچھ بچا رکھ چھوڑا ہے۔
ابھی بنیادی اہمیت آپ کی نگاہ میں آپ کی اپنی ذات کی ہے۔
اگر ایسا ہے تو یقین فرمائیے ابھی آپ نے اپنا سب کچھ اپنے نصب العین کو نہیں سونپا۔
اور یوں نہ صرف آپ کے مقصدِ حیات کے تقاضے آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہیں بلکہ آپ اپنی تاریخ کے سنہرے اوراق بھی بھلا دیتے ہیں۔
آپ بھلا دیتے ہیں کہ یہاں تو منہ پر تھوک دینے والوں کی جاں بخشی کر دی جاتی ہے۔
اور اس لئے جاں بخشی کر دی جاتی ہے کہ اگر مومن کو کبھی اپنی ذات پر کسی حملے کے مقابلے میں تلملانے کی اجازت دے دی جائے تو پھر حق کے لئے تڑپ اٹھنا کس کے حصے میں آئے گا۔

تو آیئے کچھ دیر کیلئے رک کر یہ دیکھیں کہ اپنی ذات — اور اپنے نصب العین کے درمیان ہم کہاں کھڑے ہیں۔ اور جہاں ہمارے قدم رک گئے ہیں وہ مقام بلند ہے یا پست ؟

مجیب ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

مسائل ہی مسائل

سوال :- بوسے کا مسئلہ

بندہ چونکہ ان پڑھ ہے۔ لیکن علم سیکھنے کا از حد شوق ہے لیکن جتنا دین کے نزدیک ہوتا جاتا ہے میرے عزیز دوست واقربا مجھے وہابی کے الفاظ سے پکارتے ہیں پچھلے دنوں یہاں سنی جماعت (سنی جماعت) کا بڑا مشہور ومعروف علماء اسکندر آباد ضلع میانوالی میں آیا تو مجھے بھی دوستوں نے مجبور کیا کہ چلو آج ہماری جماعت کا مشہور عالم ہے تم کو اس کی تقریر سنوالائیں۔ کیونکہ تم وہابی ہوئے جاتے ہو۔ بندہ وہاں گیا اس کی تقریر سنی تقریر میں چند ایسے فقرون کی مجھے سمجھ نہیں آئی جو کہ جواب کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ سوالات لفظ بلفظ شائع ہوں۔

بوسالینا مجنوں سے ثابت ہے۔

مولانا گامن شاہ نے بوسالینا لیلی مجنوں کے عشق سے ثابت کیا ہے کہ مجنوں نے جنگل میں لیلے کے کتے کے پاؤں چومے تھے تو ہم لوگ بھی بزرگوں کی قبروں کا بوسا لے سکتے ہیں یہ ناجائز ہیں۔ یعنی ہاتھوں پاؤں کا بوسا لینا سب جائز ہیں۔

جواب باصواب

مولانا گامن شاہ نے کیا فرمایا تھا کوئی روایت ایسے ثابت ہے؟ کہ مجنوں غریب کو جب کئی ہفتے تک لیلیٰ کا بوسہ نصیب نہیں ہوا تو اس نے اضطرار کی حالت میں سگِ لیلے کو آغوش میں لے کر خوب چوما۔ چونکہ مجنوں اپنے فن میں امام وقت مانا گیا ہے لہٰذا اس کی سنت تمام اہلِ دل کے لئے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ مشہور بزرگ خواجہ بربط علی نقشبندی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "رموز العاشقین" میں ثابت کیا ہے کہ مجنوں سرتاج الاولیاء تھے اور سگِ لیلے کے جس حصۂ بدن کو ان کے ہونٹ چھوتے تھے اس پر دوزخ کی آنچ حرام ہوئی۔

اسی بناء پر بدایوں کے ایک ہفت ہزاری شیخ جامن شاہ نے میلاد النبی ؐ کے ایک جلسے میں یہاں تک ثابت کیا کہ مجنوں چونکہ خود لیلے کے رخسار اور ماتھے کے بوسے لیا کرتا تھا اسلئے مریدوں کے لئے پیر کے رخساروں تک کا بوسہ نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے۔

دوسرے ہفت ہزاری شیخ چلغن شاہ نے اس پر مزید اضافہ کیا کہ پیر کی اولاد تک کا بوسہ جائز ہے۔ اس پر کسی نے جلسے ہی میں سوال کیا تھا:-

"اگر لڑکی ہو تو پھر؟"

"کچھ پرواہ نہیں۔ لڑکی، لڑکا سب برابر۔"

"اگر جوان ہو تو پھر؟"

"لیلیٰ بھی جوان ہی تھی ——— ارے بدبخت تم وہابی معلوم ہوتے ہو۔"

بیچارہ سائل بوکھلاکر ناناکرتا رہ گیا مگر اتنے ہی میں اہلِ سنت والجماعت نے اس کی خاصی مرمت کردی تھی۔

الحاصل بوسے میں کوئی قباحت نہیں۔ اسی لئے یورپ اور امریکہ میں بوسے نے بہت ترقی کی ہے۔

البتہ ایک سوال مولانا گامن شاہ سے ضرور کیجئے لیلےٰ کے کتے اور بزرگوں کی قبروں میں کتنی مطابقت ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بزرگوں کے ہاتھ پاؤں اور سگِ لیلیٰ کے ہاتھ پاؤں کو یکساں قرار دے رہے ہوں۔ توبہ، توبہ۔ خدا کی پناہ۔

(۲) حیاۃ النبیؐ

اور حیاۃ النبیؐ کے مسئلے پر بتایا کہ حضور پاک کا جنازہ نہیں پڑھا گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں۔

جواب باصواب

ویسے تو حدیث کی کتابوں میں بہتری روایتیں موجود ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ حضورؐ کو کفن پہنا کر گھر ہی میں ایک تخت پر رکھا گیا اور پھر چھوٹی چھوٹی جماعتیں جاجاکر نمازِ جنازہ پڑھتی رہیں لیکن جب مولانا گامن شاہ جیسا فلک رسیدہ "علماء" یہ کہتا ہے کہ حضور کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی تو ظاہر ہے یہ حدیثیں غلط ہی ہوں گی۔ ہم سے مولانا محمد نے، ان سے خواجہ ڈلڈل نے اور ان سے صوفی مسرت نے روایت کیا ہے کہ جب کوئی ولی اللہ ایک بات کہدے تو اس کے مقابلے میں حدیث تو کیا قرآن کا اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔

تو یہ کس گدھے نے کہدیا کہ حضورؐ اپنی قبر میں زندہ نہیں ہیں زندگی کو تو وہابی بھی مانتے ہیں مگر ان کی کھوپڑی میں چونکہ گوبر گم ہے اس لئے وہ یہ نہیں مانتے کہ یہ زندگی بالکل دنیا جیسی زندگی ہے۔ نہ یہ مانتے ہیں کہ دنیا کے کسی بھی پردے سے پکارو حضور فوراً سن لیتے ہیں۔ ملّا نے ان بدبختوں سے بہتیرا کہا کہ جب کافروں کا بنایا ہوا ریڈیو ہزاروں میل دور کی آواز سنا دیتا ہے تو ہمارے حضور کیوں نہ سنیں گے —— لیکن ان کی عقل ایسی موٹی ہے کہ ہر عقیدے کے لئے قرآن وحدیث سے دلیل مانگتے ہیں۔ اب ان بدنصیبوں کو کون سمجھائے کہ حدیث وقرآن پرانے ہوچکے۔ ان کی تمام صداقتیں بریلی اور بدایوں کے شیوخ وعلماء کے دبیز جبوں میں منتقل ہوگئی ہیں۔ معارف دریافت کرنے ہوں تو ان سے دریافت کرو۔ حدیث وقرآن کیلئے پھرتے ہو۔

(۳) علم غیب

علم غیب ہونے کا انھوں نے یہ ثبوت دیا کہ ایک دفعہ حضور پاک کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور عورت نے کہا کہ آپ اللہ کے واقعی رسول ہیں۔ عورت نے برقعہ میں ننھا منّا بچہ چھپایا ہوا تھا تو جنابؐ نے فرمایا کہ میرے رسول ہونے کا ثبوت بچہ سے پوچھو جو تم نے برقعہ میں چھپایا ہے عورت برقعہ اٹھاکر بچہ کو دیکھا تو بچہ رو رہا تھا اور کلمہ طیبہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں انھوں نے کسی حدیث کا ذکر نہیں کیا۔

ان مذکورہ بالا سوالات کو میرا عقل صحیح تو تسلیم نہیں کرتا لیکن دوستوں کے مجبور کرنے پر آپ کی طرف لکھ رہا ہوں۔ مولانا گامن شاہ تحصیل بھکر ضلع میانوالی کے رہنے والے ہیں۔

جواب باصواب

حدیث کا ذکر وہابی کرتے ہیں۔ مولانا گامن شاہ نے اگر خالی روایت بیان کردی اور حدیث کا ذکر نہیں کیا تو کیا یہی دلیل ہے ان کے اصلی اہلِ سنت والجماعت ہونے کی۔ "تحریز السالکین فی احوال العارفین" میں دادے پیر خواجہ عشرت علی کا فرمودہ نقل ہوا ہے کہ حضور عالم الغیب اور حاضر وناظر تھے۔ خود حضورؐ نے اپنے صحابی سے فرمایا کہ میں ازل سے ابد تک ہر چیز کا علم رکھتا ہوں اور قیامت تک ہر شخص میری نظر میں رہے گا چاہے کہیں بھی ہو جو لوگ میرے اوصاف کا انکار کریں گے [illegible] اور یوپی میں ایک شیطانی لبتی کا نام دیوبند ہوگا جس سے یہ

لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح جنم لیں گے۔"

اب اگر آپ وہابی ہوں گے تو خواہ مخواہ شور مچائیں گے کہ صاحب کس حدیث میں آیا ہے اور کونسا صحابی تھا جس سے حضورؐ نے یہ بات کہی۔ ایسا کہتے ہی آپ کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ کیونکہ اہلِ سنت والجماعت آپ پر پل پڑیں گے وہابیت کی سب سے بڑی نشانی تو یہی ہے کہ بزرگوں کی بات اینٹ داں کے بغیر نہ مانی جائے۔ ملاً اسی وہابیت کے چکر سے نکل کر عین ملین سنی حنفی بن چکا ہے۔ اب چین ہی چین ہے۔ پیران کلیر کے میلے میں زنان عاشقان اولیاء کا لطف صحبت اٹھا کر تو اور بھی اظہر من الشمس ہوگیا کہ وہابیت میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ وہابی نالائق تو اب بھی یہی دقیانوسی بکواس کرتے پھرتے ہیں کہ عرسوں کے میلوں میں گا بجا کر اہلِ دل کی تواضع کرنے والی عورتیں رنڈیاں ہیں جن سے دل نہیں لگانا چاہیئے۔ مگر شیخ اکبر خواجہ قندیلی سہروردی نے اپنے اکیسویں وعظ میں فرمایا کہ گانے بجانے والیاں جب عقیدت سے چل کر درگاہوں کے عرسوں میں پہونچتی ہیں تو فرشتے ان کے سارے پچھلے گناہ دھو ڈالتے ہیں اور درگاہ سے ایک ایک میل دور تک برکاتِ مجیبہ کا ایک ہالہ بن جاتا ہے جس میں جو بھی داخل ہوا مثل طفلک نوزائیدہ پاک ہوا۔ لہٰذا وہاں ڈیرہ تنبو لگانے والیوں اور گا بجا کر اہلِ دل کی خاطر مدارات کرنے والیوں کو ہر آئینہ زنان عاشقانِ اولیاء رکھنا چاہیئے اور خاص عرسوں کے دنوں میں ان سے ہر طرح کا فیض صحبت اٹھانے اور کسب لذت کرنے میں از لسکر کوئی مضائقہ نہیں۔

"ہر طرح کا؟" — ایک مودودیئے نے سوال کیا تھا؟ — میں نے مرتبی کی طرف دیکھا — انھوں نے اپنے مریدوں کی طرف دیکھ کر غضب ناک آواز میں فرمایا۔

"درحقیقت وہابی معلوم ہوتا ہے — دھکے دے کر نکال دو اسے"

لیکن پھر وہ مرمت ہوئی تھی بھائی صاحب کی کہ مہینوں پلنگ پر پڑے رہے تھے۔

خیر یہ تو ہر لمبا دعرض پڑے تو مولانا گامن شاہ سے بیعت ہو جاؤ، نہ عرض پڑے تو گھر بیٹھے یہ معلومات کرلو ہاں بات مولانا کی گامن شاہ کی کیسی ہے اور فلاں بات کیسی سخت وہابیت اور مودودیت کی دلیل ہے۔ اگر اہلِ سنت والجماعت نے گھیر لیا تو وہ مار ماریں گے کہ کوئی کی طرح کو سکتے پھرو گے۔

سوال۔ اسلام اور سوشلزم میں کیا فرق ہے؟

جواب۔ وہی جو ہونا چاہیئے۔ اسلام الف سے شروع ہوتا ہے اور سوشلزم س سے۔

یہی فرق اتنا زیادہ ہے کہ کسی اور فرق کی تلاش بالکل ضروری نہیں۔ ہاں دونوں کے آخر میں میم ضرور ہے۔ اس بنا پر کبھی کبھی ان کے بعض جزئیات میں ایسی ہی مشابہت نظر آتی ہے جیسے انسان اور بندر میں۔ مشابہت سے دھوکا کھانا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ شاید اسی لئے ڈراون نے یہ بشارت بنی نوع انسان کو دی تھی کہ تم بندر کی اولاد ہو۔

ڈراون اللہ کو پیارا ہوا۔ یا عین ممکن ہے کہ شیطان کو پیارا ہوا ہو۔ بہرحال خدا نظیر سے بچائے۔ اس کے کتنے ہی سعادت مند مرید آج بھی موجود ہیں جو یہ مسلک رکھتے ہیں کہ سچا سوشلزم ڈراون کی تھیوری کو تسلیم کئے بغیر نہیں پایا جا سکتا۔

احقر کا خیال ہے کہ اسلام اور سوشلزم کے فرق پر سر کھپانے کے عوض نون تیل ادرک کے تازہ ترین نرخوں پر غور و عش کیا جائے تو صحت میں اضافہ ہوگا اور سوشلزم کے معارف و رموز آپ سے آپ کھلتے چلے جائیں گے۔ واللہ الموفق۔

سوال:۔ اسلام اور کمیونزم میں کیا فرق ہے؟

جواب:۔ فرض کیجیے میں آپ سے پوچھوں ہاں اور نہیں میں کیا فرق ہے تو آپ خود سوچئے کہ جواب دیتے ہوئے آپ کو کتنی شرم آئے گی۔ شرم شرافت کی علامت ہے آپ یقیناً شریف ہی ہوں گے — شریف نہ ہوئے تو ایسے سوال پر سائل کے سر میں اینٹ مار سکتے ہیں۔

ویسے شاید آپ نے غور نہیں کیا کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں تو عورت اور مرد تک کا فرق مشتبہ ہوگیا ہے۔ بھلا اسلام اور کمیونزم کا فرق آسانی سے کیسے سمجھ میں آسکتا ہے۔ خاکسار تو

بس اتنا ہی جانتا ہے کہ اپنے جنّت نشان دیس میں ایسے بھی پیارے کیمونسٹ پائے جاتے ہیں جنھوں نے مارکس اور لینن کے نام ضرور سنے ہیں مگر ان کے سمجھے نہیں کرسکتے۔ حد ہے کہ کچھ دنوں تک صوفی تبریا قبلی کیمونسٹ پارٹی میں شامل رہے ہیں۔ وہ قرب الیکشن کا زمانہ تھا (قرب قیامت کا نہیں) ہر قوالی کے بعد حید حاضرین سے یہ دعا ضرور کراتے کہ اے مشائخ کی پاک روحو، اب کی تو کیمونسٹ پارٹی کو جتا ہی دو کئی بار اس مقصد کے لئے انھوں نے ختم خواجگان بھی کرایا تھا۔

کسی نے پوچھا کہ بھلا صوفی صاحب آپ کیمونسٹ کدھر سے ہیں۔؟

فرمانے لگے ——— مارکس اور انجیل غریبوں کے ہمدرد تھے، انسانیت کے محسن تھے۔"

پوچھنے والا حیران رہ گیا ——" انجیل ——— یہ بھلا کون تھا؟"

صوفی صاحب اکڑ کر بولے ——— ایک پیغمبر تھا سیاسی پیغمبر۔ روس میں پیدا ہوا تھا۔"

سائل مسکرایا ——" آپ غالباً انجلز کی بات کر رہے ہیں۔"

ایک ہی بات ہے۔ تھے تو ہمدردی ———"

"آپ کو غلط اطلاع دی گئی ہے ——"

"ائیں" صوفی نے اسے گھورا پھر اپنے ارادت مندوں کی طرف دیکھ کر بولے ——— یہ خبیث وہابی معلوم ہوتا ہے۔"

سائل نے جلدی سے کہا ——— نہیں وہابی تو میری سات پشتوں میں بھی کوئی نہیں ہوا۔"

صوفی صاحب نے طویل "ہوں" کہتے ہوئے اس انداز میں گردن ہلائی جیسے کسی ملزم کے انکار جرم پر تھانے دار صاحب گردن ہلا کر کہتے ہیں کہ ہاں ہاں تم تو بڑے پارسا ہو۔ ابھی کرتے ہیں تمہاری مزاج پرسی۔

"ہوا کیوں نہیں ——— اچھا بتاؤ غوث الاعظم حاضر و ناظر ہیں یا نہیں؟"

ناظرحسن تو ہمارے حلقے کے پٹواری کا نام ہے جناب ——— وہ بھلا غوث الاعظم کیسے ہو سکتا ہے۔"

"دیکھا دیکھا" ——— صوفی صاحب ارادتمندوں کی طرف دیکھ کر کھلکھلائے "کیسا پاگل بن رہا ہے۔" پھر سائل سے استفسار کیا ——" اچھا بتاؤ جنت و دوزخ، روزی و صحت یہ سب چیزیں آجکل کس کی تحویل میں ہیں۔"

"آجکل کا تو پتہ نہیں۔ سنا ہے پہلے یہ چیزیں اوپر والے کے قبضے میں ہوا کرتی تھیں۔"

بس کھل گئی پول ——— پاجی کہتا ہے میں وہابی نہیں ہوں۔"

"جی ہاں میں وہابی نہیں ہوں۔"

"ہے کیسے نہیں۔ اہل سنت والجماعت کا تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ جنّت و دوزخ وغیرہ سب حضرت غوث الاعظم کی تحویل میں ہیں۔"

"گستاخی معاف میں غوث الاعظم کی نہیں مارکس اور انجلز کی بات کر رہا ہوں۔"

گستاخی معاف کیسے ——— بدبخت پہلے تو گستاخی کرتا ہے پھر کہتا ہے گستاخی معاف۔ ارے دیکھ کیا رہے ہو ——— صوفی صاحب نے ارادتمندوں کی طرف رخ کر کے کہا ———" مار کے نکالو اس دوزخی کو پھر فرش کا وہ حصہ اچھی طرح دھو ڈالنا جس پر اس روسیاہ کے پیر پڑے ہیں۔"

سائل "ذرا سنئے تو" کہتا رہ گیا اور دو پہلوان ٹائپ مجاوروں نے اسے اٹھا کر درگاہ سے باہر پھینک دیا۔

ایسے تو خیر بہت قصّے ہیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسلام اور کیمونزم میں کیا فرق ہے۔ تو اے پیارے بھائیو مجھ نالائق سے کیا پوچھتے ہو۔ اگر سوال ضروری ہے یعنی کسی حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے تو کم سے کم پچاس روپے بھیجو تاکہ صوفی بدرالحسن غزالی سے حاضرات کرا کے مارکس وغیرہ کی روح کو حاضر کیا جائے اور وہی صاف صاف بتائیں کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ صوفی صاحب اگرچہ بے خصا ہیں اور اپنی زوجہ سے پیرا بہدہ کرلینے کے [illegible] کی آنچ سے تو سنا ہے کہ فولاد بھی پگھل جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال :۔ سوشلزم کے اصولوں سے ہمیں آگاہ کیجیے۔

جواب :۔ پہلا اصول :۔ طلوع آفتاب سے پہلے "یا سوشلزم" کی تین تسبیحیں۔ اس کے بعد ناشتہ جس میں صرف انڈوں اور پراٹھوں پر اکتفا کیا جائے۔ دودھ نصف کلو لے سکتے ہیں۔

دوسرا اصول :۔ اگر تم سے سوشلزم کے معنی دریافت کئے جائیں تو سمجھ لو کہ دریافت کرنے والا رجعت پسند اور سوشلزم دشمن ہے۔ اس کے منہ نہ لگو۔ لگنا ہی پڑے تو ایسی اصطلاحات میں جواب دو جن کا مفہوم سمجھنے کے لئے اسے ڈکشنریوں میں سر مارنا پڑے، خبردار ان الّوؤں کے سامنے سوشلزم کی حقیقت سے پردہ نہ اٹھانا، اٹھایا تو خود تمہارا پردہ اٹھ جائے گا۔

تیسرا اصول :۔ تحریر و تقریر میں کثرت سے درج ذیل الفاظ استعمال کرو۔ مزدور، محنت کش، پرولتاری غریب، مصیبت زدہ، استحصال کا شکار۔

ان لفظوں کا استعمال کرتے ہوئے تمہاری آواز فرطِ غم سے بھرّا جانی چاہیئے۔ آنسو بھی نکل آئیں تو کیا کہنے نہ نکلیں تو کم سے کم رومال آنکھوں تک ضرور لے جاؤ اور چہرے پر ایسے آثار پیدا کرو جیسے آنسو ضبط کرنے کے سلسلہ میں تمہارے دل، جگر، آنتیں، معدہ، پھیپھڑے سب خون ہوئے جا رہے ہیں۔

مزید الفاظ یہ ہیں :۔ سرمایہ دار، منافع خور، بورژوا، رجعت کش، ظلمت پسند وغیرہ وغیرہ

ان الفاظ کی ادائیگی میں آواز نہایت بلند لہجہ بے حد تلخ اور ہاتھوں کی مٹھیاں کسی ہوئی ہونی چاہئیں۔ تم میں فطرتاً اداکاری کی صلاحیت کم ہے تو فلمیں کثرت سے دیکھو۔ انھیں دیکھ کر تنہائی میں ریہرسل کیا کرو۔ تنہائی میں صرف بیوی کو شریک کرسکتے ہو۔ بشرطیکہ وہ بھی سوشلزم پر ایمان رکھتی ہو۔ غیر سوشلسٹ بیویاں بعض اوقات بیوی برہم ہو ... کی بات کہہ جاتی ہیں جس سے سوشلزم کی ... ہو جاتی ہے۔

چوتھا اصول :۔ [illegible] بکواس ہے۔ [illegible]

حسد کی ولادت حرص کے پیٹ سے ہوتی ہے لہٰذا جہاں تک ہو سکے عوام میں حرص و حسد کے جذبات ابھارو انھیں یقین دلاؤ کہ سوشلسٹ سماج میں دولت مندوں کی کوٹھیاں اور کاریں اور تجوریاں، مزدوروں اور محنت کشوں میں بانٹ دی جائیں گی۔ روس اور چین میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔

کوئی اس بارے میں تمہیں جھوٹا کہے تو برداشت کرو۔ جھوٹ اور سچ کی اصطلاحیں بورژوا طبقوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ ہر وہ سچ ناپاک ہے جس سے سوشلزم کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو۔

پانچواں اصول :۔ "قومیانے" کی اصطلاح بار بار استعمال کرو۔ استعمال کرتے وقت تمہارے چہرے پر ویسا ہی جذبۂ احترام ہونا چاہیئے جیسا پجاریوں کے چہروں پر بتوں کے آگے اور مسلمانوں کے چہروں پر قرآن کی تلاوت کے وقت ہوتا ہے۔ اس اصطلاح کی تقدیس عوام کے سینوں میں اتار دو انھیں یقین دلاؤ کہ ہر مرض کی دوا یہی ہے۔ اسی سے ہر مزدور کو آخر کار موٹر اور کوٹھی اور ہر طرح کا سامان عیش مل کر رہے گا ویسے "قومیانہ" چونکہ اردو لفظ ہے اس لئے اس کا رعب کم پڑتا ہے زیادہ تر "نیشنلائز" کا لفظ استعمال کرو۔

اور بھی اصول ہیں، مگر پہلے انھیں از بر کر لو بعد میں اور بتائے جائیں گے۔ اللہ مددگار ہے۔

ویسے سوشلزم ہمارے یہاں بڑی تیزی سے آرہا ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ بندۂ ناچیز بھی سوشلزم کی بھینٹ چڑھ گیا تو قبر پر قوالی ضرور کرا دینا تاکہ سند رہے۔ اور بوقت ضرورت کام آئے۔ پیشگی جزاک اللہ

سوال۔ نسبندی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب۔ نسبندی کے بارے میں میری رائے سے زیادہ بہتر صوفی تبلیغ حسین کی رائے ہو سکتی ہے جو بحالت صوم بدالانیل کے ایک چھوڑ کے پیدا ہوئے تھے اور جنھوں نے پانچ سال کی عمر میں فارسی زبان میں ... [illegible]

[illegible]

نزع کی حالت میں ساڑھے تین منٹ تک ایک لاجواب تقریر کی تھی ساڑھے تین منٹ کی مختصر مدت میں انھوں نے اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ پر روشنی ڈالنے اور تصوف اور صوفیاء کا مکمل تعارف کرلینے کے بعد ارشاد فرمایا تھا کہ کافی عرصہ پہلے میرے قلب مبارک پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ میرے بعد ولایت کا سلسلہ منقطع کر دیا جائیگا میں بالکل اسی طرح خاتم الاولیاء ہوں جس طرح حضور خاتم الانبیاء تھے لیکن اگر اتفاقاً پروردگار کو میں نے ولایت کے نعمتوں سے کسی کو سرفراز کرنا ہی چاہا اور ولایت کے سلسلہ کو دنیا میں باقی رکھنے ہی کی ٹھانی تو قسم ہے زمانے کے ادلتے بدلتے حالات کی کہ ولایت کے مستحق صرف صوفی تبلیغ ہی قرار پائیں گے اس لئے کہ تصوف اور رنگ ولایت ان کے رگ و پے میں قدرتاً اس طرح رچا بسا ہوا ہے جیسے پھول میں خوشبو پانی میں ٹھنڈک اور آگ میں حرارت پیوست ہوتی ہے

شیخ برہان کی یہ تقریر ٹیپ ریکارڈ کر لی گئی تھی اور یہ اپنے وقت کا سب سے بڑا معجزہ ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ان کی ساڑھے تین منٹ کی تقریر خود بخود پھیل کر ۲ گھنٹے کی تقریر میں تبدیل ہو گئی۔

خلقت خدا آج بھی برابر اس تقریر سے مستفیض ہوتی رہتی ہے اور اسی تقریر کو دلیل حق سمجھ کر ولایت کی ذمہ داریاں صوفی تبلیغ کے حوالہ کر دی گئی تھیں۔ آج وہ اپنے وقت کے کامیاب ترین شیخ ہیں۔ ان سے بڑا بزرگ اس وقت روئے زمین پر موجود نہیں ہے خدا انھیں عمر نوح عطا کرے۔ حقیقت یہ ہے ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوگا اسے دس ہزار صوفی بھی مل کر پورا نہ کر سکیں گے۔

الغرض نسبندی کے بارے میں ان کا مبارک خیال یہ ہے کہ حالات زمانہ کی نزاکت کے پیش نظر اس کو اختیار کرنا از بس ضروری ہے۔ انھوں نے کسی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ جس زمانہ میں بچے ماں کے پیٹ سے سرکش اور فلمی اداکار بن کر پیدا ہوں اس زمانہ میں بچوں کی آمد پر بند باندھنا انتہائی ناگزیر ہوگا اور جو لوگ ان حالات میں بھی بچوں کی پیداوار بڑھانے میں سر کھپا رہے ہوں گے دنیا انھیں وہابی گمان کرنے پر مجبور ہوگی۔ اور وہابی وہ لوگ ہیں کہ جن کے عقائد کی بدبو سے میدان حشر میں ہر شخص پریشان ہوگا۔ شافعی محشر اپنی پناہ میں رکھے۔

انھوں نے اسی انداز کی چند تقریریں ہمارے علاقے میں کی تھیں ان تقریروں سے بڑا اثر ہوا اور کثیر قسم کے دہاڑیوں نے بھی نسبندی کرا ڈالی۔ اللہ کا فضل ہے کہ ہمارے دیوبند کے بعض ارباب جبہ و دستار نے بھی ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اب گر بہ ملت کی رائے بھی یہی ہے کہ نسبندی کرا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں لہٰذا ناچیز فقیر بھی یہ ارشاد فرمانے پر مجبور ہے کہ نسبندی کراؤ اور ضرور کراؤ جو لوگ نسبندی کی مخالفت کر رہے ہیں انھیں پکا وہابی سمجھو اور سچے وہابی کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ ہر وقت اسلام اسلام کی رٹ لگائے رکھتا ہے اور ایسے ہی لوگوں نے ہمارے مقدس بھارت میں تعصبات کے بیج بوئے ہیں۔ خدا ان کی عقلوں سے زنگ دور کر کے ان میں تازگی پیدا کرے اور انھیں جمعیۃ العلماء کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جو توفیق خداوندی اور بفضل رسول ہر رنگ میں ڈھلنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

سوال ۔ میری بیوی وہابن ہو گئی ہے میں کیا کروں؟

جواب ۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے، واقعی آپ بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ ایک مرتبہ منشی مردار ید کی بیوی بھی وہابی بن گئی تھی۔ منشی جی روتے پیٹتے چونٹے شاہ کے مزار پر پہونچے اور ناک رگڑ کر کہا میری بیوی کو عذاب آخرت سے بچاؤ وہاں سے اشارہ ہوا کہ جا صوفی دلدار سے مل وہ تجھے کوئی راستہ بتائیں گے۔ منشی جی صوفی دلدار کے مکان پر پہونچے جو صاحب کشف والہام تھے اور جن کے تقوے کی دھوم سے ہر گلی گونج رہی تھی، انہوں نے غور و فکر کرنے اور حاضرات سے مشورہ کرنے کے بعد فرمایا۔

جا اپنی بیوی کو لا ہم اسے فاختہ بنا کر افریقہ کے جنگل میں بھیجیں گے چند ہفتوں صبر کر وہ خود ہی ٹھیک ہو کر تجھ سے آ ملے گی، چنانچہ وہ اپنی بیوی کو ان کی خدمت میں رکھ گئے اور انھوں نے فاختہ بنا کر افریقہ کے جنگل میں بھیج دیا۔ ایک مہینہ بعد جب وہ واپس آئی تو پکی حنفی بن چکی تھی اور وہابیوں کو ایک سانس میں گالیاں دیا کرتی تھی۔ میری رائے میں تم بھی یہی کرو۔ اپنی بیوی کو صوفی دلدار کے حوالہ کر دو وہ اسے فاختہ بنا کر افریقہ کے جنگلات میں روانہ کریں گے۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے پر نکل آئیں گے اور وہ تائب ہو کر تم سے آ ملے گی۔

فقط والسلام

رقم کے بارے میں بعض علماء کی رائے تو یہ ہے کہ اسے بینک ہی میں چھوڑ دینا چاہیے، اس لیے کہ سود کا وصول کرنا بھی اسی طرح ناجائز ہے جس طرح اس کا استعمال کرنا ناجائز ہے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ بینک سے ملنے والی سود کی رقم کو وصول کر لینا چاہیے، وہیں چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ رقم کفار و مشرکین اور فساق و فجار لوگوں کے ہتھے چڑھے یا بینک ہی میں پڑی سڑتی رہے۔ ان علماء کا مشورہ یہ ہے کہ بینک سے سود کی رقم وصول کر لینی چاہیے لیکن اس کو اپنی ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں بلکہ وصول کرنے کے بعد بہت زیادہ نادار اور مفلس لوگوں کے حوالہ کر دینی چاہیے۔

ہمارے خیال میں دوسرے علماء کی رائے زیادہ قرین صواب ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ان گنت گھرانے ایسے ہیں جن میں غربت و ناداری اور فقر و فاقہ کی بھیانک تاریکیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مختلف طریقوں سے ان گھرانوں کی مدد کرنا ضروری ہے۔ بینک کی سود کی رقم ایسے گھرانوں کو سونپنا یا اس کے ذریعہ سے غریب و نادار لڑکیوں کے بیاہ شادی کا بندوبست کر دینا کوئی گناہ نہیں کہلا سکتا۔

لیکن بینک سے ہاتھ آنے والی سود کی رقم کو دینی درسگاہوں میں کھپا دینے کا مشورہ محتاط علماء کی نگاہوں میں قرین صواب نہیں ہو سکتا۔ طلباء کتنے ہی غریب اور تنگ دست کیوں نہ ہوں ان کے پیٹوں میں سود کی رقم اتار دینا بہر اعتبار غلط در غلط ہوگا، خواہ سطحی قسم کے علماء اس کو طلباء کے لیے جائز ہی کیوں نہ سمجھیں۔

زکوٰۃ و صدقات ہی کے لقموں نے ہمارے طلباء میں جو بے شرمی اور بداخلاقی پیدا کی ہے وہ کسی آنکھ سے ڈھکی چھپی نہیں۔ انھیں سود کی رقم کھلانے کا کھلا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی بے شرمی اور طوطا چشمی میں اضافہ ہو اور ان کے اندر دوسری نوع کی اور بہت سی خرابیاں پیدا ہو جائیں، اور لطافت علمی فنا کے گھاٹ اتر کر رہ جائے جو پاکیزہ روزی سے پیدا ہوتی ہے اور ناجائز قسم کی روٹیاں کھانے سے باقی نہیں رہ سکتی۔ مال کے طلباء مستقبل کے ملاء ہوتے ہیں۔ ان کی پرورش سود کی رقم سے کرنا کسی بھی اعتبار سے مفید اور سود مند نہیں ہو سکتا غیرت مند قوم یہ گوارہ نہیں کر سکتی کہ ان کے دین کے محافظین ناجائز رقوم سے پروردہ ہوں۔ ممکن ہے کہ امام صاحب کے فرمانے کا مطلب یہ رہا ہو کہ سود کی رقم درسگاہوں کے اسفل حصوں میں کھپائی جا سکتی ہے۔ مثلاً نالیوں اور پاخانوں وغیرہ میں۔ اگر امام صاحب کے فرمانے کا مطلب یہی تھا تو انھوں نے ہرگز غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ سود کی رقم درسگاہوں کے اسفل حصوں میں لگائی جا سکتی ہے۔ دوسرے علماء نے بھی اس کی اجازت دی ہے۔ خدا کرے امام صاحب کے فرمانے کا مطلب یہی ہو۔

لیکن خدانخواستہ اگر امام صاحب کے ارشادات کا حاصل یہ ہے کہ دینی درسگاہوں کے تمام شعبوں میں سود کی رقم لگا دینا جائز ہے، اعلیٰ اور اسفل کی کوئی تخصیص نہیں تو پھر انھوں نے بلاشبہ علماء کی رائے سے ہٹ کر ایک الگ رائے قائم کی ہے جو بہر لحاظ قابل مذمت ہے۔

غلط قسم کے مسائل بیان کرنا بھی ایک جرم ہی ہے لیکن یہ جرم کیونکہ ازراہِ جہالت سرزد ہوا ہے لہٰذا ان کی امامت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

کشمیری علماء کی تصنیف کردہ اس کتاب کی زیارت ہم بھی کرنا چاہتے ہیں جس میں سود کی رقم کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہمیں ضرور بھیجیے۔ برائے تنقید نہیں تو بطور تبرک ہی سہی۔

سوالات

ارسال کرتے ہوئے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں اور اپنا پتہ بھی ضرور تحریر کر دیں۔ اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ سوالات مختصر اور خوشخط لکھے ہوئے ہوں ——— بسا اوقات کچی تحریر میں لکھے سوالوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے ——— جواب طلب امور کے لیے پتہ لکھا ہوا لفافہ ارسال فرمائیں صرف ٹکٹ بھیجنا کافی نہیں ہوگا

(ادارہ)

مولانا عتیق احمد قاسمی بستوی

کھرے کھوٹے

النبی الخاتم (عربی)

- از۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی
- ناشر۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ
- کاغذ عمدہ۔ کتابت، طباعت معیاری۔ صفحات ۹۰
- قیمت درج نہیں۔

قادیانیت کا فتنہ جن خطرناک نتائج کا حامل ہے اس سے اہل علم اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں، اس فتنہ کی تباہ کاریوں کو بھانپ کر غلام احمد قادیانی کے معاصر علماء نے پوری جدوجہد کے ساتھ اس فتنہ کا مقابلہ کیا۔ علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہم اللہ نے تصنیف و تالیف، تحریر و تقریر، مناظرہ و چیلنج، غرضیکہ ہر طریقہ پر اس فتنہ کی بیخ و بن کھودنے کی کوشش کی۔ ان حضرات کی پرخلوص جدوجہد کے نتیجے میں کچھ دنوں کے لئے یہ فتنہ دب گیا تھا لیکن قادیانی اپنے مذہب کی خاموش تبلیغ میں مصروف رہے۔ اسلام دشمن حکومتوں کی امداد سے اعلیٰ پیمانے پر لٹریچر شائع کرکے سستے داموں اور مفت تقسیم کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اچھا خاصا طبقہ ان سے متاثر ہو گیا۔ خاص طور پر پاکستان میں ان کے اثرات بڑھے۔ چنانچہ حالات کی نزاکت دیکھ کر علماء نے بھی اپنی جدوجہد تیز کر دی۔ پاکستان کے علماء نے مولانا محمد یوسف بنوری کی زیر قیادت تحریک چلائی جس نے مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ حکومت پاکستان نے تمام مکاتب فکر کے علماء کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا۔ ادھر رابطہ عالم اسلامی نے بھی قادیانیت کو اسلام دشمن تحریک قرار دے کر قادیانیوں کے غیر مسلم ہونے کا ریزولیوشن منظور کیا۔

دلائل کے میدان میں قادیانیت کا دیوالیہ پن ہمارے علماء بہت پہلے واضح کر چکے ہیں۔ علامہ انور شاہ کشمیری اور ان کے تلامذہ نیز مولانا محمد علی مونگیری وغیرہ نے عربی اور اردو میں اس قدر علمی مواد فراہم کر دیا ہے کہ اب مزید کدوکاوش کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

پاکستان اور ممالک عربیہ میں رسوا ہونے کے بعد قادیانیوں کی زیادہ تر توجہ ہندوستان کی طرف مرکوز ہو گئی۔ مختلف مقامات پر ان کے مراکز قائم ہو چکے ہیں۔ لٹریچر دھڑا دھڑ چھپ رہا ہے۔۔ اب اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ قادیانیت کے خلاف لکھی ہوئی علماء ہند کی تصانیف از سر نو شائع کی جائیں۔ نیز ہلکے پھلکے سلیس، عام فہم کتابچے تیار کرا کے گھر گھر پہونچائے جائیں تاکہ قادیانیت ہندوستان کے اندر اپنے پنجے نہ جما سکے۔ مولانا عامر عثمانیؒ نے ردقادیانیت کا آغاز کر دیا تھا لیکن افسوس موت نے آپ کو مہلت نہ دی اور یہ کام تشنۂ تکمیل رہ گیا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی کتاب القادیانی والقادیانیۃ۔ نے پہلی بار ممالک عربیہ کے عوام کو اس فتنہ سے روشناس کرایا تھا۔

زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی اہم کڑی ہے۔ مولانا علی میاں مدظلہٗ نے ایک نئے انداز سے ختم نبوت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ نے تفصیلی جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ ختم نبوت کا اعتقاد ختم ہوتے ہی مذہب اسلام کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور قرآن و حدیث کی اہمیت دل سے نکل جائے گی۔ موصوف نے تاریخ مذاہب کی روشنی میں اس عقیدہ کی اہمیت و ضرورت کو واضح کیا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اس مذہب کی ساخت، اس کی تعلیمات خود بخود ختم نبوت کے عقیدہ کا تقاضا کرتی ہیں۔

بہرحال یہ کتاب بہت مفید ہے۔ خدا کرے کہ اعلان کے مطابق جلد از جلد ..... اردو اور انگریزی میں چھپ جائے تاکہ غیر عربی داں اہل علم بھی اس سے استفادہ کرسکیں۔

اردو کی ترقی میں ہمارا حصہ

• از۔ م، ع، باسط • کاغذ مناسب
• قیمت۔ چار روپے • پتہ:۔ م، ع باسط
بلاک ۲۱ درگا کالونی پوسٹ جالنہ۔ ضلع اورنگ آباد۔

یہ کتاب مصنف کے تیرہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین کے اندر اردو داں طبقے کو اردو کی ترقی دینے کے لئے مفید مشورے دیئے گئے ہیں۔ مضامین سائنسی ہیں جن کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

اردو کے سلسلے میں خود حامیان اردو کی سستی و غفلت کا شکوہ ہے، بلاشبہ حکومت نے اب تک اردو کو اس کا صحیح مقام نہیں دیا۔ ارباب حکومت کو بھی اس کا احساس ہے اور وہ متعدد بار اس کا اعتراف بھی کر چکے ہیں لیکن اردو داں طبقہ کو بھی بے قصور نہیں کہا جاسکتا۔ جو لوگ اردو کی حمایت میں گلے جارہے ہیں۔ اردو کی حمایت میں مضامین پر مضامین، کتابوں پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔۔ وہ خود بھی اپنے بچوں کو اردو تعلیم نہیں دلا پاتے حکومت نے جو تھوڑی بہت سہولیات دے رکھی ہیں۔ ان سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے، کالجوں میں اردو کے طلباء نہ ہونے کی بنا پر متعدد جگہوں پر اردو کی کلاسیں توڑ دی گئیں۔ آخر یہ سب اردو سے بے اعتنائی نہیں تو اور کیا ہے۔

مصنف نے مختلف مضامین میں یہ بتایا ہے کہ اس وقت حکومت نے اردو کو کیا سہولیات دی ہیں؟ اور اردو داں طبقہ اس سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ مصنف کے اکثر مشورے بہت عمدہ ہیں۔ حامیان اردو کو اس پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

م، ع، باسط صاحب نے اس پر بھی زور دیا ہے کہ اردو کے اندر سائینٹفک اور سائنسی موضوعات پر زیادہ سے زیادہ لکھا جانا چاہیئے۔ کیونکہ اب سائنٹفک دور آرہا ہے لہٰذا اردو کو ایک مقبول اور عوامی زبان بنانے کے لئے سائنٹفک موضوعات پر زیادہ سے زیادہ لٹریچر درکار ہے۔ موصوف کی یہ بات بھی درست ہے کہ اردو کو علمی زبان بنانے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف علوم و فنون پر اردو میں کتابیں اور مضامین لکھے جائیں۔ محض ادبی موضوعات پر کتابوں کا ڈھیر لگا کر موجودہ زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔ فلسفہ، سائنس، جغرافیہ، طبقات الارض بہت سے علوم ہیں جن سے وغیرہ بارے میں اردو کے اندر مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔ مذہبیات پر بھی معنی اور عام فہم اردو میں کتابیں کم ہیں۔ اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مصنف کی ایک تجویز ہے "اردو کے تمام رسائل درجانہ سال میں اپنے ایک شمارے کو سائنس نمبر کی شکل میں شائع کریں" یہ تجویز فی نفسہ بہت عمدہ ہے لیکن ہر ایک رسالہ کے لئے یہ تجویز قابل عمل نہیں ہے۔ مثلاً مذہبی پرچے بہت کم تعداد میں ہیں۔ تعداد کی کمی کی وجہ سے یہ رسائل مذہبی ضروریات کو بھی پورا نہیں کر پاتے، چہ جائیکہ وہ دیگر موضوعات پر مکمل شمارہ شائع کریں۔ ہاں ادبی رسائل بکثرت ہیں۔ گھسے پٹے موضوعات پر بار بار قلم اٹھاتے رہتے ہیں ان کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہیں۔

کتاب کے اندر مجموعی اعتبار سے زبان اور کتابت کی غلطیاں بہت کم ہیں۔ چند اغلاط درج ذیل ہیں:۔

ص۸ پر دلچسپ کو دلچپ ....

ص۱۰ میں اردو .... دال کو دو سطروں میں لکھا ہے حالانکہ یہ بات اصول املا کے خلاف ہے ص۲۳ پر مستشرقوں کا سین غائب ہے۔ ص۱۰ پر عدالت العالیہ صحیح لفظ عدالت عالیہ ہے ص۲۹ پر علوم جدیدہ صحیح لفظ علوم جدیدہ یا جدید علوم ہے۔ ص۳۳ پر فرض کی راکی دم کاتب صاحب نے بہت لمبی کردی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ڈ ل را لکھ رہے ہیں۔ ص۳۵ میں یہ الفاظ کھل پڑھ جاتے ہیں "اہم حصہ لیتی ہے"۔

ص۲۸ میں دو باتیں ایسی درج ہیں جو ہمارے خیال میں غلط ہیں لہٰذا ان دونوں باتوں پر تنبیہ کرنا ضروری ہے۔

اس میں م، ع باسط صاحب کا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ یہ مضمون انگریزی سے ترجمہ ہے۔

(۱) "صاف ظاہر ہے کہ پیغمبر [illegible] کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہئے؟ مضمون نگار نے [illegible] کرنے [illegible] ہے اس کی [illegible]

سمجھ سکے، ان کی پوری عبارت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کا مفہوم یہ ہے کہ جس حالت پر آدمی پیدا ہوا تھا اس حالت پر رہنا شلاً آدمی ننگا پیدا ہوا تھا تو وہ ننگا ہی رہے۔ لباس نہ پہنے ۔ وغیرہ مگر ہاتھ نہ لگائے جس طرح آجکل کے ہپی کر رہے ہیں ۔ [illegible]ت کا یہ مفہوم لے کر یہ کہاوت بلاشبہ قطعی غلط ہو جاتی ہے لیکن اس کہاوت کا یہ مفہوم سمجھنا ہی صحیح نہیں ہے۔

کہاوت کا صحیح مفہوم جاننے کے لئے یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ پیدائشی طور پر انسان بعض چیزوں کو پسند کرتا ہے اور بعض کو ناپسند اگر ماحول اثر انداز نہ ہو تو خالی الذہن بچہ اپنی طبیعت سے ان چیزوں کو اختیار کر لے گا۔ بالفاظ دیگر انسان کی پیدائشی خواہشات اور میلانات کو فطرت کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں مختلف چیزوں کو فطرت میں شمار کیا گیا ہے۔ مثلاً مونچھ کترنا ۔ داڑھی رکھنا، ختنہ کرانا وغیرہ ۔

کہاوت کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اگر پیدائشی میلانات کو اختیار کرے، بیجا تکلفات کا پابند ہونے کے بجائے سادہ اور بے تکلف زندگی گذارے تو اس کے لئے بہتر ہو ع

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

(۲) "اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غیر مہذب انسانوں کے مقابلے میں تہذیب یافتہ انسان زیادہ عرصے تک زندہ رہتے ہیں"۔ تاریخ و حیاتیات کے ماہرین اس بات کو تسلیم کرنے پر شاید تیار نہ ہوں ۔

مجموعی طور پر کتاب بہت عمدہ ہے ۔ اردو کی ترقی کے لئے مصنف نے اچھی تجاویز پیش کی ہیں ۔

تہذیب و تمدن اور اس کے اصول و ابتدائیات

• مصنف ایس اے سیف اللہ • کتابت طباعت گھٹیا • کاغذ متوسط • ناشر بزم ادیب الہ آباد • قیمت مجلد

کتاب [illegible] مصنف نے مواد فراہم کئے [illegible]

لیکن زبان و بیان نے کتاب کی قدر و قیمت بہت کم کر دی ہے خصوصاً کتاب کے ابتدائی حصہ میں بہت فرسودہ اور ژولیدہ زبان کا استعمال ہے۔ نامانوس الفاظ کی بھرمار ہے ۔ آگے بڑھتے جایئے زبان میں پہلی سی ژولیدگی نہیں ہے ۔ بلکہ نسبتہً شگفتہ اور عام فہم زبان ہے۔ کاتب نے کتاب کا رہا سہا وقار بھی ختم کر دیا ہے۔ کتاب کے بہت کم صفحات اس قسم کے ہوں گے جن کے اندر کوئی غلطی نہ ہو۔ اکثر و بیشتر تو ایک ہی صفحہ کے اندر متعدد اغلاط ہیں۔ اگر زبان و بیان اور کتابتی اغلاط کو جمع کیا جائے تو مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے ۔ یہاں بطور نمونہ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

صفحہ ۳ پر مذاہب فکر کے بعد رائے کا لفظ زیادہ ہے۔ صفحہ ۳ میں ہے اسی بات کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہو جائیگی۔ صحیح اس طرح ہے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی۔ صفحہ ۲ کے آخری سطر میں لفظ متفکون استعمال کیا ہے حالانکہ یہ لفظ اردو کے اندر استعمال نہیں ہے صفحہ ۹ پر ہے "اجنبیت کا دھاکا ایسا بیٹھا" صحیح یہ ہے "اجنبیت کی دھاک ایسی بیٹھی"۔ نیز ماحول کی طرف دوبار لکھ دیا گیا ہے صفحہ ۱۰ پر جملہ ہے (ایسی نئی نئی قوموں سے سابقہ جو اپنی شکل و شمائل میں یورپ اور مغربی ایشیا کے باشندوں سے بالکل مختلف تھا، اس جملہ کے اندر تین غلطیاں ہیں سابقہ کے بعد پڑا چھوٹ گیا ہے۔ شکل کو مشکل لکھدیا ہے۔ مختلف تھیں ہونا چاہیئے تھا اور اسی صفحہ کے اندر مہذب کو مہذتب لکھا ہے صفحہ ۱۱ پر اقسام کو القسام لکھدیا ہے۔ غیر یورپی میں یورپی کی را چھوٹ گئی صفحہ ۱۲ پر چھ غلطیاں ہیں صفحہ ۱۳ پر ایک جملہ ہے (اس لئے نہ اس کوئی نتیجہ فکر یہ دنیا کو پہونچا نہ فائدہ بخشا) اس جملہ کا مفہوم سمجھانے کیلئے غالباً مصنف کو خود قارئین کے پاس جانے کی زحمت اٹھانی پڑے ......

...... اسی صفحہ میں لکھتے ہیں طبقہ اول میں آٹھ قومیں ہیں اور [illegible] وقت صرف چھ کا ذکر کیا ہے مثلاً میں (دیگر اقوام کے) کے بعد چند الفاظ چھوٹ گئے ہیں۔ جملہ بالکل ہی نامکمل ہے صفحہ [illegible] زنجت کے بعد اگرچہ کے بجائے چونکہ ہونا چاہیے

اگر اسی طرح تمام اغلاط [illegible]

تذکرے [illegible]

حاوی کو ہادی لکھا۔ صفحہ پر تین غلطیاں ہیں استفادہ کو استفادہ لکھا۔ حکمار کا املا حکماں کی صورت میں کیا۔ اس کا تدریس دیا جاتا تدریس کے بجائے درس ہونا چاہیئے۔ صفحہ پر ارسطو کو ارسطون لکھا ہے۔ صفحہ ۸۹ میں شہرت منسوب ہے کے بجائے شہر منسوب ہے صحیح ہے۔

کاتب نے الفاظ میں جو غلطیاں کی ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں۔ ساتھ ہی کتابت کے اصول کو بھی خوب پامال کیا ہے۔ مثلاً عنوان اور عبارت کو بسا اوقات اس طرح گھلا ملا کر لکھا ہے کہ دونوں میں تمیز نہیں ہو پاتی اس کی مثالیں آپ کو صفحہ ۲۴/۲۵، صفحہ ۹۱ وغیرہ پر مل سکتی ہیں۔ کبھی کبھی بلا وجہ سطریں چھوڑ دی گئیں ہیں۔ مثلاً صفحہ ۳، صفحہ وغیرہ میں۔

اچھا اب آخری حصہ کو ملاحظہ فرمایئے صفحہ میں فلسفیانہ نظریئے کے بجائے فلسفہ نظریئے لکھا ہے۔ صفحہ ۱۷۳ میں ختم کر دیتا ہے کے بجائے جنم دیتا ہے ہونا چاہیئے۔ دیکھئے کاتب نے مفہوم کو کس طرح الٹ دیا صفحہ میں طبقوں کو ایک طبقوں لکھا ہے صفحہ ۱۸۴ میں مسخ کو مسیح کر کے مسیح بنا دیا ہے۔ عجب مسیحائی ہے۔ صفحہ ۱۸۵ میں اس فلسفہ کو سامنے لکھ کر کے بجائے رکھ کر ہونا چاہیئے، رکھ کر کے بجائے اکھاڑ کر صحیح ہے صفحہ ۱۸۸ پر تاریک خیالی کے بجائے تاریخ خیالی لکھ دیا ہے آخر دونوں میں کیا مناسبت۔

غرضیکہ یہ کتاب زبان و بیان، کتابت و طباعت کی غلطیوں سے بھری پڑی ہے۔ ان خامیوں کی وجہ سے اتنی اہم کتاب اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھی ہے۔ مصنف صاحب ہماری تنقیدی گرفت پر حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ یہ تو ہمارا فرض تھا جس کو انجام دینا ضروری تھا۔ امید ہے کہ آئندہ زبان و بیان اور کتابت و طباعت کی غلطیوں سے پاک صاف کر کے کتاب کو نیا وجود بخشا جائے گا تاکہ کتاب صحیح معنوں میں مفید ثابت ہو سکے۔

نشانِ راہ

- مصنف :- مولانا ابوالحسن علی ندوی
- کتابت طباعت عمدہ • صفحات ۳۲
- قیمت • پیسے • شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے ۱۹۴۳ء میں لکھنؤ کے اندر منعقد شدہ ایک اجتماع میں نشانِ راہ کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا تھا اسی مقالہ کو کتابچہ کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ ملک کی تقسیم سے مسلمانوں کے لئے جو مشکلات و مسائل پیدا ہونے والے تھے۔ اپنی فراست ایمانی سے ان کا جائزہ لیا ہے اور مذہب کی حفاظت نیز ہندوستان میں اپنے لئے اہم مقام پیدا کرنے کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ مولانا نے دسیوں سال پہلے ہندوستان کے مستقبل کی جو تصویر کشی کی تھی وہ ایک حقیقت بن کر سامنے۔ مولانا کا بیان کردہ لائحہ عمل آج بھی مسلمانوں کے نشانِ راہ ہے۔

بہر حال مجموعی اعتبار سے کتاب بہت مفید ہے بعض مقامات پر کتابت کی غلطیاں ہیں مثلاً صفحہ ۷ سطر ۴ میں لفظ حقارت کو اس طرح لکھ دیا کہ پڑھنا مشکل ہے۔ صفحہ ۷ سطر ۷ پر رندان بادہ خوار سے پہلے زاہد کا اضافہ بے محل معلوم ہوتا ہے صفحہ ۱۷ سطر ۱۲ میں کاتب نے یا پریس نے تبلیغ کی غین کا سرہی غائب کر دیا ہے صفحہ ۱۸ سطر ۴ میں تعداد کی تا، کے نقطوں کو غائب کرنے کے ساتھ تا کے شوشے کو کافی لمبا کر دیا ہے

اسی طرح بعض اور کتابتی غلطیاں موجود ہیں۔ ان کی آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کرانی چاہیئے۔ کتاب کی افادیت ۱۹۴۸ء کی طرح اب بھی باقی ہے لیکن ایک جگہ مصنف صاحب نے ایسی بات فرمائی ہے کہ جس سے کوئی تاریخ داں مشکل سے اتفاق کر سکتا ہے۔ مولانا رقمطراز ہیں :-

> مزید برآں حکومت کے سامنے کوئی اخلاقی یا مذہبی دعوت نہ تھی اور نہ کوئی زندگی کا فلسفہ یا نظام تمدن کسی تہذیب کی داعی نہ تھی۔ اس کے جو کچھ تہذیبی اثرات اس ملک میں پھیلے وہ زیادہ تر اس کے سیاسی اقتدار و بالاتری کے نتیجہ کے طور پر یا محض بعض اہل علم اور مسلمان اہل دعوت کی دعوت تبلیغ کے اثر سے تھے جو مسلمانوں کی پستی کا علاج یہی سمجھتے تھے کہ وہ حاکم قوم کی تہذیب و تمدن کو اختیار کر کے کچھ بلندی حاصل کر لیں۔ وغیرہ وغیرہ حسن ایک دفتری نظام حکومت تھا جو کہ مرحلے

دفتری نظم ونسق سے دلچسپی تھی۔ اس کے سامنے
نہ تو تاریخ کا کوئی دور تھا جس کا احیاء اس کے
مدِ نظر ہو۔ نہ مستقبل کے لئے ذہن وتہذیب کا
کوئی سانچہ بنانا ان کے مقاصد میں تھا، ص۱۔

معلوم نہیں مولانا علی میاں جیسے مورخ نے انگریزی حکومت کے بارے میں مذکورہ بالا رائے کس طرح قائم کی۔ بلاشبہ انگریزوں کا اولین مقصد حکومت کرنا تھا لیکن ان حضرات کے بیانات اور طرزِ عمل سے یہ بات بالکل آئینہ کی طرح صاف ہوجاتی ہے کہ عیسائی تہذیب وتمدن اور انکا عقائد کی اشاعت بھی ان کا دوسرا بنیادی مقصد تھا۔ اہلِ برطانیہ کے عزائم کو واضح کرنے کے لئے ہم صرف برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر مینگلس کی تقریر کے بعض جملے نقل کردینا ضروری سمجھتے ہیں جو انھوں نے آغاز ۱۸۵۷ء میں پارلیمنٹ کے دارالعوام میں کہے تھے۔

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیرنگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے۔ اور اس میں تساہل نہ کرنا چاہیئے۔" (حکومت خوداختیاری ص۱۳۶ اور علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے۔ حصہ اول ص۲۶)

مجموعی طور پر کتاب مفید اور قابلِ مطالعہ ہے۔

تبرکات

- مولف ومترجم۔ نورالحسن راشد کاندھلوی۔
- کتابت وطباعت غنیمت۔
- طابع وناشر: مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ ضلع مظفرنگر
- قیمت چار روپے ۵۰ پیسے

یہ کتاب اکابر کے نو خطوں کا مجموعہ ہے۔ ایک خط حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا ہے اور باقی آٹھ خطوط مولانا رشید احمد گنگوہی صاحبؒ کے ہیں۔ اکثر خطوط فارسی زبان میں ہیں۔ مولف نے ان کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ مکاتیب میں جن حضرات کے نام آئے ہیں مولف نے بڑی عرق ریزی اور جستجو سے ان کے حالات جمع کردیئے ہیں۔ ان حواشی نے کتاب کی افادیت میں چار چاند لگادیئے ہیں۔ آخر میں پندرہ ۱۵ صفحات پر مشتمل انڈیکس میں اشخاص، مقامات کتابیات کی طرف اشارہ ہے۔

مولف نے اپنی محنت اور سلیقہ مندی سے اس کتاب کو بہت مفید اور مکمل بنا دیا ہے۔ یہ کتاب سلسلۂ امدادیہ کے وابستگان کے لئے خصوصاً اور تمام اہلِ علم کے لئے عموماً قیمتی تحفہ ہے۔ لیکن بھول چوک انسان کے لئے لازمی ہے۔ دوسری کتابوں کی طرح اس میں بھی اغلاط موجود ہیں۔ امید ہے کہ اگلے ایڈیشن میں ان کی اصلاح کرلی جائے گی۔

زیرِ نظر کتاب میں یہ حادثہ اکثر ہوا ہے کہ دو تین لفظوں کو اس طرح ملا کر لکھ مارا ہے جس سے ایک معلوم ہوتے ہیں۔ نقطوں کی اصلاح کی خاص ضرورت ہے ص۹ سطر ۱ میں پابہ زنجیر نہ کردے کو عجیب طرح ملا کر لکھ دیا ہے ص۹ سطر (۲) میں اثر پذیری کی جگہ تاثیر یا اثرانگیزی ہونا چاہیئے۔ ص۹ سطر (۱۴) میں ہے (ان قدیم مجموعوں سے لگا نہیں کھاتے) لگا نہ کھانا لوکل زبان ہے، عام علمی کتابوں میں اس کا استعمال شاذونادر ملتا ہے۔ ص۹ سطر ۱۸، ۱۹ حکیم الامت کے لفظ حکیم کو ایک سطر میں لکھا ہے اور الامت کو دوسری سطر میں۔ حالانکہ اصول کتابت کی رو سے دونوں کو ایک سطر میں ہونا چاہیئے ص۱۱ ۱۲، ۱۳ میں ہے (اس وقت کے عام کرایہ وغیرہ کیا تھے) صحیح یہ ہے (اس وقت کے عام کرائے وغیرہ کیا تھے) ص۱۳ سطر ۹ لفظ زندگی کو بری طرح بگاڑ دیا ہے ص۱۳ سطر ۱۰ میں ذخائر علمیہ سے پہلے اسے کا لفظ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ ص۱۳ سطر ۱۳، ۱۴ میں ہے (متفرق اشخاص کو چند سکوں کے عوض فروخت کردیا) یہ جملہ مبہم ہے۔ واضح جملہ یہ ہے۔ (چند اشخاص کے ہاتھ چند سکوں کے عوض فروخت کردیا) ص۲۳ سطر ۱۵ میں اس لئے مکرر آگیا ہے، سطر ۱۹ میں ہے (آپ خدا کے فضل سے مردان الٰہی میں ہو) آپ اور ہو میں جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔ عبارت اس طرح ہونی چاہیئے (آپ خدا کے فضل سے مردان الٰہی میں ہیں) یا (تم خدا کے فضل سے مردان الٰہی میں ہو) ص۳۲ سطر ۱۴ میں لفظ مرافع استعمال کیا ہے۔ حالانکہ صحیح مرافعہ یا مرافع ہے۔ سطر ۱۵ میں لفظ پھر بری طرح بگڑ گیا

ہے صفحہ سطر ۹ میں مراصل ہے حالانکہ صحیح لفظ مراحل ہے۔
صفحہ ۲۲ سطر ۱۲ میں امیر احمد رامپوری کے بعد لفظ نے چھوٹ گیا ہے صفحہ ۲۶ سطر ۱۸ پر کاتب نے (اندھا ہوگیا) لکھا ہے۔ سیاق و سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں (اندھا ہوگا) ہونا چاہیئے صفحہ ۲۶ سطر ۵ پر ہے ماذاحا، صحیح لفظ ماذحا ہے صفحہ ۶۹ سطر ۱۶ میں حاجی سید عابدین دیوبندی کو مولانا لکھا ہے جس سے غلط فہمی ہونے کا اندیشہ ہے۔ حاجی صاحب مرحوم بڑے پائے کے بزرگ تھے باضابطہ مولانا عالم نہیں تھے۔

کتاب کے اندر ایک حیرت انگیز غلطی یہ پائی جاتی ہے کہ اکثر جگہ بزرگوں کے نام کے آگے نہ رحمۃ اللہ علیہ لکھا اور نہ لفظ رحمۃ اللہ علیہ کی زحمت گوارہ کی ہے اس روش سے مولف کے بارے میں کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا۔ آئندہ ایڈیشن میں احتیاط برتی جائے۔

عالمی تاریخ

- مولانا محمد عثمان فاضل دارالعلوم دیوبند
- کتابت طباعت متوسط، کاغذ اچھا • قیمت تین روپے
- ملنے کا پتہ:۔ محمد عثمان معروفی مدرس جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور۔ اعظم گڈھ (یو پی)

یہ کتاب مختلف قسم کی معلومات کا مجموعہ ہے جس کو ایک مرتب کشکول کہا جا سکتا ہے۔ مصنف نے بڑی کاوش وجدوجہد سے عالمی تاریخ واسلامی تاریخ کی مفید ترین خبروں کو یکجا کر دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ دریا کو کوزے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے تو بیجا نہیں ہوگا غرضیکہ کتاب بہت سی تاریخوں کا نچوڑ ہے اور دسیوں کتابوں کا مغز ہے۔ اس کے اندر اسلامی حکومتوں کی مکمل تاریخ اہم واقعات کے سنین اور شہرۂ آفاق شخصیتوں کی تاریخ وفات اور قسم کی دوسری مفید چیزیں ہیں آخر میں مختلف انداز کی جنتریاں بھی شامل ہیں۔

کتابت کی غلطیاں تو ہیں ہی لیکن کہیں کہیں واقعات بیانی میں بھی چوک ہوگئی ہے مثلاً:۔

(۱) خلافت بنی عباس کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا تجربہ میں لانا ضروری تھا کہ بغداد سے خلافت ختم ہونے کے بعد مصر میں کب خلافت قائم ہوئی (خواہ برائے نام ہو) اور وہاں کون کون خلفاء ہوئے۔ (۲) سلطنت عثمانیہ کے ذکر میں یہ لکھنا مناسب تھا کہ تیمور لنگ کی بایزید یلدرم سے کب ٹکر ہوئی (۳) برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور حکومت کے ذیل میں دوسرے اہم واقعات کے ساتھ ساتھ قیام دارالعلوم دیوبند کا ذکر بھی مناسب تھا (۴) تفاسیر کا ذکر بہت نامکمل ہے۔ تفسیر ابن جریر، روح المعانی وغیرہ کا ذکر نہ کرنا حیرت انگیز ہے (۵) اصول تفسیر کے تحت مقدمہ فی اصول التفسیر لابن تیمیہ، التکمیل فی اصول التاویل للفراہی جیسی بنیادی کتابوں کا ذکر ہونا چاہیئے تھا (۶) الفقہ الاکبر کا تذکرہ فقہ کے بجائے عقائد کی کتابوں میں ذکر کرنا چاہیئے۔ دبوسی کی الاسرار بھی غالباً اصول فقہ کی کتاب ہے (۷) فتاوے کے ذیل میں فتاوی عالمگیری کا ذکر ضرور ہونا چاہیئے تھا (۸) حجۃ اللہ البالغہ عقائد کے بجائے اسرار حکم کی کتاب ہے (۹) تاریخ کے اندر تاریخ بغداد۔ تاریخ ابن عساکر وغیرہ کا ذکر ہونا چاہیئے تھا (۱۰) علم نحو کے اندر سیبویہ کی الکتاب کا ذکر نہیں ہے (۱۱) مراکز علمی کے اندر مکتبہ آصفیہ حیدرآباد، مکتبہ آزاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا تذکرہ ہونا چاہیئے تھا (۱۲) شہرۂ آفاق اشخاص کی فہرست میں بہت سے شہرۂ آفاق اشخاص کا ذکر نہیں ہے اور غیر مشہور افراد کا نام آگیا ہے۔ اس انتخاب میں بڑی بے انصافی ہوئی ہے۔ چند وہ شہرۂ آفاق اشخاص جن کا تذکرہ نہیں ہے۔ ابوبکر صدیق رض، عمر فاروق رض، مولانا اشرف علی تھانوی رح، امام حسن رض، مولانا شبیر احمد عثمانی رح، لینن، شاہ فیصل وغیرہ۔ چند ان افراد کے نام جن کی شہرت صرف علاقائی ہے عالمی اشخاص میں ان کا ذکر مناسب نہیں۔ مولانا اسلام الحق مرحوم۔ مولانا محمد طاہر معروفی۔ مولانا علی احمد بھیروی، مولانا عبداللطیف نعمانی (۱۳) میم کی تختی میں حضرت سعد بن وقاص کا تذکرہ غلط ہے (۱۴) تجارت کرنے والے انبیاء میں نبی اکرم کا ذکر بھی ہونا چاہیئے تھا۔

چند عبارت پر کتابت کی غلطیاں۔ صفحہ سطر ۵ میں ہے (رکھنے کا جی نہیں چاہتا) صحیح یہ ہے (رکھنے کو جی نہیں چاہتا) صفحہ سطر ۱۱ (اس پر اغماس فرمائیں) صحیح یہ ہے (اس سے اغماض فرمائیں)، صفحہ کی آخری سطروں میں حرف بہت مٹ گئے ہیں صفحہ سطر ۱۸ میں قائم رہی سے پہلے لفظ حکومت چھوٹ گیا صفحہ سطر ۱۹

میں محمد غوری کا نام مکرر آگیا ہے صلا سطر۴ پر درد دلیش صف صحیح لفظ درویش صفت ہے۔ ص۳۲ سطر۸ میں ہمایوں کی سن وفات واضح نہیں ہے۔ ص۳۲ سطر میں موتی مسجد کو موتی مسجد لکھدیا ہے ص۳۲ سطر۵ میں بدمیوں کی واؤ غائب ہے ص۴۵ سطر۶ میں لغات کا لفظ تقریباً مٹ گیا ہے۔ تنسیخ کی بھی یہی گت بنی ہے

ص۶۶ سطر۲ میں آلفیہ کی کتابت خراب ہوگئی ہے ص۱۰ پر بہار کی آبادی لکھتے ہوئے کوئی ہندسہ زیادہ ہوگیا ہے جس کی وجہ سے حیرت انگیز طور پر ۶۱۰۷۵۷۶۴ اہم، آبادی ہوگئی ہے جب کہ یوپی (جو آبادی میں ہر صوبے سے آگے ہے) کی کل آبادی صرف ۷۳۷۴۶۴۱ ہے۔ ص۱۰ میں افریقہ کے بعض اسلامی ممالک کے زیر عنوان ایسے ملکوں کو بھی گنا یا گیا ہے جس میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بہت کم ہے مثلاً موزمبیق، رہوڈیشیا، کانگو، کینیا، ان ملکوں کو اسلامی ملک شمار کرنا غلط ہے۔

آئندہ ایڈیشن میں اس قسم کی غلطیوں کی تصحیح کرلینی چاہیئے

لہٰذا مجموعی اعتبار سے کتاب بہت عمدہ ہے۔ ہم مصنف کو اس مفید ترین کتاب پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ موصوف آئندہ ایڈیشن کو اصلاح و تصحیح کے بعد شائع کریں گے جب کتاب کا نام عالمی تاریخ رکھدیا ہے تو چاہیئے کہ آفاقی ذہن سے کر اس کو مرتب کیا جائے۔ تاکہ مضامین موضوع اور حقائق کے مطابق ہوں

معرفت الٰہیہ یا خدا کی پہچان

● افادات۔ حضرت علامہ شاہ عبدالغنی پھولپوری نور اللہ مرقدہ خلیفہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح۔
● کتابت، طباعت عمدہ ● ناشر کتب خانہ امدادالغرباء سہارنپور ● قیمت مجلد ۱۴/۸۷

حضرت تھانوی رح کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے آپ نے جو تجدیدی کارنامے انجام دیئے ہیں ہر ایک کے سامنے ہیں۔ درس و تدریس، مواعظ و افتاء تصنیف و تالیف کے علاوہ ارشاد و تلقین کی راہ سے آپ نے بہتیرے لوگوں کو پروان چڑھایا۔ آپ کی صحبت میں رہ کر ہزاروں نفوس کی اصلاح ہوئی آپ کے تربیت یافتہ علماء میں ایک اچھی خاصی تعداد ان حضرات کی ہے جو خود بھی ارشاد و تلقین کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان خوش نصیب خلفاء میں سر فہرست مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری کا نام نامی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب موصوف کے افادات کا مجموعہ ہے جس کو آپ کے ایک خاص مرید جناب حکیم محمد اختر صاحب نے سلیقہ کے ساتھ مرتب کردیا ہے۔ مرتب مقدمہ میں لکھتے ہیں "یہ کتاب معرفتِ الٰہیہ دراصل مولانا شاہ پھولپوری کے ۱۶ سال کی مختلف مجالس کے ارشاد و تقاریر کا مجموعہ ہے جس کو احقر نے قلمبند کرلیا تھا۔ یہ علوم و ارشادات بعض تو درس بخاری کے وقت میں ہوئے بعض بصورت جلسہ و خطاب عام ہوئے بعض مجلس احباب خصوصی میں بصورت ملفوظات ہوئے۔ بعض علوم درس مثنوی مولانائے روم کے وقت ارشاد ہوئے الخ

اس قدر بکھرے ہوئے مضامین کو سلیقے کے ساتھ کتابی صورت مرتب کرنا مرتب کا بہت بڑا کمال ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ منتشر افادات کا مجموعہ ہونے کے بجائے ایک موضوع پر غور و خوض کے بعد تصنیف کی ہوئی کتاب ہے۔ تصوف کی عام کتابوں کے برخلاف زبان سلیس اور سلجھی ہوئی ہے۔ مغلق الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کا استعمال بہت کم ہے۔ غرضیکہ یہ کتاب ظاہری خوبیوں سے مکمل طور پر مزین ہے۔ زبان صاف و شستہ، تعبیرات آسان، انداز بیان جاذب قلب اور عبارت رواں دواں ہے۔

کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی پہچان کے ذرائع اور طریقوں کا تفصیل کے ساتھ بیان ہے۔ دوسرے حصہ میں اس بات کی تفصیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پہچان کے بعد بندوں پر عبدیت اور فنائیت کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ دونوں حصوں کے مجموعی صفحات ۲۱۲ ہیں کتاب کے ابتدائی ۵۹ صفحات میں مولانا عبدالغنی پھولپوری کی سوانح عمری ہے۔ کتاب کے اندر بکثرت مختلف آیتوں کی لطیف اور نادر تفسیر آگئی ہیں۔ بہت بڑی تعداد میں مثنوی مولانا روم کے اشعار اور ان کا ترجمہ و تشریح آگئی ہے۔

غرضیکہ یہ کتاب ہر خاص و عام کے لئے مفید ہے۔ اس کو پڑھکر عظمت و جلال خداوندی کا اندازہ ہوتا ہے اور اللہ جل شانہ کی معرفت

[illegible] قدری [illegible] اسی طرح [illegible]
[illegible] بعض مقامات [illegible] نے [illegible]
[illegible] کر کمائی ہے۔

کتاب کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات بار بار کھٹکتی ہے کہ مصنف نے احادیث و روایات میں چھان بین سے کام نہیں لیا ہے۔ کتاب کے [illegible] ایسی احادیث و روایات ذکر کر دی گئی ہیں جن کو محدثین و [illegible] موضوع تک کہتے ہیں مثلاً (۱) حضرت ایوب کے جسم مبارک سے جب کیڑے نکلنا چاہتے تو آپ محبت کی وجہ سے ان کو نکلنے دیتے تھے۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام اپنی لغزش پر اس قدر روئے کہ آپ کے آنسوؤں سے چھوٹے چھوٹے چشمے پیدا ہو گئے اور اسی پانی سے اللہ تعالیٰ نے خوشبودار پھول پیدا فرمائے۔ ص ۳۹، ۱۴۰، ۱۸۹

شجاعة قبل الحرب موتوا قبل ان تموتوا۔ حب الدنیا راس کل خطیئة۔ کو حدیث کہا گیا ہے حالانکہ محدثین اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

تصحیح کا بے انتہا اہتمام کرنے کے باوجود کتابتی اغلاط رہ گئی ہیں۔ اسی طرح بعض مقامات پر تعبیر میں اخلاق اور نامانوس الفاظ کا استعمال ہو جاتا ہے اس کی مثالیں اس کتاب میں بھی نادر نہیں ہیں ص ۱۳ سطر ۱ پر ہے "مجموعہ علوم و معارف میں ترتیب دینے سے" صحیح جملہ یہ ہے "مجموعہ علوم و معارف کو ترتیب دینے سے"، ص ۱۳ سطر ۳ میں ہے "وارد علیہ" صحیح لفظ ہے "دارد علیہ" ص ۱۶ سطر ۲۵ پر ہے "قطبی کا امتحان ایک بار حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے لیا تھا" یہاں لفظ تھانوی کی ضرورت نہیں تھی۔ ...... ص ۲۲ سطر ۹ میں حکیم صاحب کا نام واضح نہیں ہے ص ۲۲ سطر ۱۷ پر ہے "تہجد کے بعد ۱۲ تسبیح غالباً بارہ سو بارہ ہزار ہو" ص ۲۷ سطر ۱۰ میں "کشتی" صحیح لفظ "کشتی" ہے ص ۲۸ سطر ۳ میں لفظ جمع بالکل خراب ہو گیا ہے ص ۳۵ سطر ۱۰ میں ہے "اپنے اعمال اور معمولات سے ...... عمل پیرا ہیں" صحیح یہ ہے "اپنے اعمال اور معمولات پر ...... عمل پیرا ہیں" ص ۴۲ سطر ۳ لفظ سپنا کا سین پر پیش لگا ہے حالانکہ سپنا سین کے زیر کے ساتھ ہے ص ۴۵ سطر ۱۶ میں جناب اشرف صاحب کے بعد "نے" کا اضافہ ہونا چاہیے ص ۷۳ سطر ۱۵ پر جملہ "شکر زبان تلاش کرنے لگتا ہے" سمجھ میں نہیں آتا ص ۷۳ سطر ۲۳ لفظ بنانے خراب ہو گیا ہے۔ ص ۷۵ سطر ۱ میں فطرتاً حالانکہ اردو میں یہ لفظ

[illegible] اس طرح [illegible] آخری سطر کے اوپر والی سطر میں "ہی" کٹ گیا ہے۔ ص ۸۷ میں آخری سطر کے اندر ہے "تیر کا پتران ہونا" حالانکہ لفظ پتران اردو میں استعمال نہیں ہے۔ ص ۹۸ سطر ۱۴ میں ہے "خیر و شر کے مالک حقیقی حق تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے"۔ مناسب اس طرح چاہیے "خیر و شر کی مالک حقیقی حق تعالیٰ ہی کی ذات پاک ہے"۔ [illegible] سطر ۲ پر ہے "زانوئے ادب طے کرتے ہیں" صحیح یہ ہے "زانوئے ادب تہ کرتے ہیں۔"

ص ۱۰۲ سطر ۱۶ میں لفظ "تلاوت" واضح نہیں ہے۔ ص ۱۰۶ سطر ۹ پر ہے "خار فین قعر دریائے جلال کی مچھلیاں ہیں"۔ لفظ قعر یہاں کچھ ثقیل محسوس ہوتا ہے ص ۱۸۹ آخری سطر میں ہے "بوسیدہ پوستین" صحیح لفظ "بوسیدہ" ہے ص ۲۲۵ سطر ۱۵ میں لفظ مٹاتے کٹ رہا ہے ص ۲۳۲ سطر ۳ میں "عیدہ" کی بار کا نقطہ غائب ہے ص ۲۷۱ پر سطر ۱۴ کا ایک تہائی حصہ بالکل مٹ کر رہ گیا ہے۔ اسی قسم کی اور کتابت و طباعت کی اغلاط ہیں۔ اگلے ایڈیشن میں ان کی اصلاح کر لی جائے۔

ص ۲۰۱ پر آیت غلط لکھ دی گئی ہے "وان لنا الاجرا ان کنا نحن الغالبین" آیت اس طرح ہے "ان لنا لاجرا ان کنا نحن الغالبین"۔